اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُھُمْ لِذِکْرِ اللّٰہِ

کیا ایمان والوں کیلئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

هُدًی لِّلنَّاسِ

جدید اسلوب میں تفسیری نکات پر مشتمل

تفسیر روح القرآن

(سُوْرَۃُ یُوْسُفَ) ...... تا ...... (سُوْرَۃُ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ)

(جلد: ٦)

مؤلف

ڈاکٹر مولانا محمد اسلم صدیقی

ایم۔اے۔پی ایچ۔ڈی

Marfat.com

اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُھُمْ لِذِکْرِ اللّٰہِ

کیا ایمان والوں کیلئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

هُدًی لِلنَّاسِ

جدید اسلوب میں تفسیری نکات پر مشتمل

تفسیر روح القرآن

(سُوْرَۃُ یُوْسُفَ) ...... تا ...... (سُوْرَۃُ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ)

(جلد: ۶)

مؤلف

ڈاکٹر مولانا محمد اسلم صدیقی

ایم۔اے،پی ایچ۔ڈی

Marfat.com

(ایک ضروری گزارش)

بعض احباب کے اصرار پر ادارہ هُدًی لِلنَّاسِ نے اس کتاب کا نام "دروس القرآن" کی بجائے "تفسیر روح القرآن" تجویز کیا ہے۔ اس کتاب کی بیشتر جلدیں چونکہ دروس القرآن کے نام سے چھپ چکی ہیں اس لئے اپنے قارئینِ کرام کو کسی خلطِ مبحث یا غلط فہمی سے بچانے کیلئے یہ گزارش ضروری معلوم ہوتی ہے کہ وہ مناسب سمجھیں تو اپنے پاس نسخوں میں نام کی تبدیلی کر لیں، اور اگر کہیں کتاب کے اندر سابقہ نام کا ذکر آئے تو اسے بھی نئے نام سے بدل دیں۔

109516

Marfat.com

جملہ حقوق بحق مؤلف محفوظ ہیں

نام کتاب : تفسیر روح القرآن
مؤلف : ڈاکٹر مولانا محمد اسلم صدیقی
ناشر : ادارہ هُدًی لِلنَّاسِ
کمپوزنگ : زاہد حسین
پرنٹرز : محمد ندیم پرنٹنگ پریس، لاہور
تاریخ اشاعت دوئم : جنوری 2012ء
تعداد : 1000
قیمت : 700 روپے

ملنے کا پتہ

۱۔ 343- مہران بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور۔ فون 042-35426800
۲۔ ادارہ اسلامیات نئی انارکلی لاہور۔
۳۔ مکتبہ ادارہ معارف اسلامی منصورہ لاہور۔
۴۔ ادارہ منشورات ملتان روڈ بالمقابل منصورہ لاہور۔
۵۔ ۳۔ کورٹ سٹریٹ، لوئر مال لاہور۔ فون: 042-37248676-37320961
ہیڈ آفس: منصورہ ملتان روڈ لاہور۔ 042-35417074
۶۔ ادارہ البدر پبلی کیشنز 23 راحت مارکیٹ اردو بازار لاہور۔
موبائل: 0300-8485030 فون: 042-37225030

Marfat.com

Marfat.com

صاحب تالیف

نام: ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی ابن مولانا فضل کریم صدیقی
(بانی دارالعلوم ربانیہ)

ولادت: 4 اپریل 1940ء

تعلیم: ۱......حافظِ قرآنِ مجید
۲......تکمیل درسِ نظامی، جامعہ اشرفیہ لاہور
۳......فاضل عربی، پنجاب بورڈ
۴......بی۔اے، پنجاب یونیورسٹی
۵......ایم۔اے، گولڈ میڈلسٹ، پنجاب یونیورسٹی
۶......پی۔ایچ۔ڈی، پنجاب یونیورسٹی
۷......فاضل مدینہ یونیورسٹی

تدریس: ۱......ادب، تفسیر اور حدیث کی تدریس، مرکز علوم اسلامیہ منصورہ، لاہور
۲......وزیٹنگ پروفیسر ہیلی کالج، پنجاب یونیورسٹی
۳......وزیٹنگ پروفیسر انسٹیٹیوٹ آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی
۴......وزیٹنگ پروفیسر شعبہ اسلامیات برائے ایم۔اے کلاسز
۵......وزیٹنگ پروفیسر اسلامک سنٹر برائے ایم فل

خطابت: ۱......خطیب جامع مسجد نیلا گنبد، لاہور (ایک مختصر وقت کے لیے)
۲......خطیب اسلام آباد یونیورسٹی، اسلام آباد
۳......خطیب جامع مسجد، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

Marfat.com

مناصب: ۱.....چیئرمین شعبہ مساجد پنجاب یونیورسٹی، لاہور

۲.....چیئرمین ادارہ ھدیً اللناس، لاہور

تالیفات: دروسِ قرآن

۱..... سورۃ الفاتحہ

۲..... سورۃ البقرہ (جلد اول)

۳..... سورۃ البقرہ (جلد دوم)

۴..... سورۃ آلِ عمران

۵..... سورۃ النساء

۶..... سورۃ المائدہ

۷..... سورۃ الانعام

۸..... سورۃ الاعراف

۹..... سورۃ الانفال، التوبہ، یونس، ھود (زیرِ طبع)

۱۰..... سورۃ یوسف، الرعد، ابراھیم، الحجر، النحل، بنی اسرائیل)

۱۱..... خطباتِ صدیقی (جلداول)

۱۲..... خطباتِ صدیقی (جلددوم)

۱۳..... خطباتِ صدیقی (جلدسوم)

۱۴..... معرفتِ حق کا سفر

Marfat.com

فہرست

(سورۃ یوسف، الرعد، ابراھیم، الحجر، النحل، بنی اسرآءیل)

سُوْرَۃُ یُوْسُفَ

سُوْرَۃُ یُوْسُفَ کا تعارف 1
سورت کا نام 1
زمانہ نزول 1
اس سورت کا نزول آنحضرت ﷺ کی نبوت کی دلیل ہے 1
تاریخی وجغرافی حالات 3
سُوْرَۃُ یُوْسُفَ 5
کتاب مبین کا مفہوم 6
اہلِ عرب پر احسان 6
قرآنِ کریم الفاظ سمیت نازل ہوا ہے، اس کی دلیل 6
اَحْسَنَ الْقَصَصِ کا مفہوم 7
حضرت یوسفؑ کا خواب 8
حضرت یعقوبؑ کی بیٹے کو ہدایت 9
خواب کی تعبیر 10
ایک تنبیہ 13
برادرانِ یوسف کا حسد 13
بھائیوں کی مشاورت 14
بھائیوں کا فیصلہ 14
باپ کو فریب 15
کنویں میں حضرت یوسف پر وحی 16
بھائیوں کے جھوٹے عذر 17
حضرت یعقوبؑ کا اعلیٰ کردار 17
حضرت یوسفؑ کی زندگی کا نیا موڑ 20
حضرت یوسفؑ کو مستقبل کی ذمہ داریوں کیلئے تیار کیا گیا 20
قرآنِ کریم کے اسلوب میں ایک اشکال کا ازالہ 21
اَشُدَّہٗ، حکم اور علم کا مفہوم 21

Marfat.com

زلیخا کا جامِ ہوس، حضرت یوسفؑ کی دوسری آزمائش 22
عصمتِ انبیاء کا مفہوم 24
برہان سے کیا مراد ہے 24
دامِ ہوس سے نکلنے کی کوشش 25
زلیخا کے الزام کا جواب 25
مِنْ كَيْدِكُنَّ کا مفہوم 26
قرآنِ کریم اور بائبل کے بیانات کا تقابل 27
زلیخا کی دھمکی 31
تین نکات 31
چند حقائق 32
آزمائشوں کا تیسرا دور 35
جیل کے دوساتھی 35
جیل میں حضرت یوسفؑ کی شخصیت کا احترام 36
خوابوں کی تعبیر سے پہلے اپنا تعارف 36
توحید کا تقاضا بے ایمان لوگوں سے ترکِ تعلق 37
دعوتِ توحید 38
مصیبت میں اشتراک بھی تعلق کی بنیاد ہے 39
دعوت میں حکمت 39
خوابوں کی تعبیر 40
ضمیر کا مرجع 41
اللہ تعالیٰ مسبب الاسباب ہے 43
بادشاہ کا خواب اور درباریوں کا جواب 43
شاہی ساقی کی پیشکش 43
شاہی ساقی کی حضرت یوسفؑ کی خدمت میں حاضری اور درخواست 44
خواب کی تعبیر 45
بادشاہ کی دعوت اور حضرت یوسفؑ کا جواب 47
بیگماتِ مصر کے واقعہ کی تحقیق 49
تحقیقات کے مطالبے کا سبب 49
جو ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہوتا ہے 50
حضرت یوسفؑ سے بادشاہ کی گرویدگی اور اس کا سبب 50
حضرت یوسفؑ کا مطالبہ 51
ایک سوال اور اس کا جواب 51

Marfat.com

حضرت یوسفؑ کا کلی اقتدار	52
خوب کاروں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ	53
برادرانِ یوسف کی حضرت یوسفؑ کی خدمت میں حاضری	55
بھائیوں کو حضرت یوسفؑ کی ترغیب	56
بھائیوں کا خواب	57
حضرت یوسفؑ کا احسان	57
بیٹوں کی گزارش اور باپ کا جواب	58
بھائیوں کی خوشی	58
باپ کا بیٹوں سے عہد	60
ایک مصلحت آمیز ہدایت	60
تقدیر اور تدبیر کا باہمی تعلق	61
بھائیوں پر افشائے راز	64
چند ابتدائی باتیں	65
بعض ضروری امور کی وضاحت	67
اپنی صفائی اور حضرت یوسفؑ پر الزام	69
حضرت یوسفؑ کی خوشامد	69
حضرت یوسفؑ کا جواب	70
بھائیوں کی مشاورت	72
تسویل کا مفہوم	73
حضرت یوسفؑ کے غم میں شدت کی وجہ	74
بیٹوں کی ملامت	75
حضرت یعقوبؑ کا پُر از حکمت جواب	75
بھائیوں کی لجاجت	76
حضرت یوسفؑ کا کمالِ اخلاق اور مروت	77
افشائے راز	77
اعترافِ حق	78
حضرت یوسفؑ کا عفو و درگزر	79
انبیائے کرام کے معجزات حق ہیں	79
پیراہنِ یوسفؑ کی خوشبو	82
اہلِ خانہ کی بے بصیرتی	82
سوال کا جواب	83
باپ سے استغفار کی درخواست	83

Marfat.com

حضرت یوسفؑ سے ملاقات 84
خواب کی تعبیر 85
حضرت یوسفؑ کا حُسنِ اخلاق 85
بنی اسرائیل کی تعداد کی وضاحت 85
سجدہ کا مفہوم 86
حضرت یوسفؑ کا اداءِ شکر اور دعا 87
آپؐ کی نبوت کی دلیل 88
آنحضرت ﷺ کو تسلی 89
مشرکین کے ایمان نہ لانے کا حقیقی سبب 90
آیت کے دو مفہوم: دیدۂ عبرت سے محرومی، شفعاء پر تکیہ 92
کوتاہی فکر انجام سے بے پروائی 93
میرا راستہ دعوت الی اللہ ہے، شرک نہیں 93
دو اعتراضات اور ان کے جواب 94
اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا سے استدلال 95
عذابِ الٰہی کے باب میں اللہ کا قانون 96
قرآن کی حقیقت اور اس میں بیان کردہ واقعات کی حیثیت 97

☆☆☆☆

سُوْرَۃُ الرَّعْدِ

سُوْرَۃُ الرَّعْدِ کا تعارف 98
سورت کا نام 98
نزول 98
زمانۂ نزول 98
مرکزی مضمون 99
سُوْرَۃُ الرَّعْدِ 100
قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا احسان بھی ہے اور وارننگ بھی 102
قرآن کریم کی اہمیت 102
مکی سورتوں کے عمومی موضوعات 103
اللہ تعالیٰ کی مثالوں سے توحید و آخرت پر استدلال 103
ایک باطل عقیدہ کی تردید 104
کائنات کے فرمانروا کے ایک ہونے پر دلیل 106
آخرت پر دلیل 106

Marfat.com

زمین کی نشانیوں سے استدلال 107
تخالف و توافق کے قانون سے استدلال 108
توافق و تخالف کے قانون کی ہمہ گیری 108
زمین کی نشانیوں کے ایک اور پہلو کی طرف اشارہ 109
تعجب کے قابل اصل بات 110
انسان مجموعۂ اضداد ہے 111
انسان کی زندگی کا مقصد 111
مشرکین کے مطالبہ کا جواب 112
اللہ تعالیٰ کی صفتِ علم کا اظہار 115
سابقہ مضمون کی مزید تاکید 116
کارکنانِ قضاء وقدر بھی انسان کی نگرانی کرتے ہیں 117
اللہ تعالیٰ اور بندوں کے درمیان فیصلہ کن قانون 117
آفاق کی بعض نشانیوں کی طرف اشارہ 118
انسان کے بگاڑ کے اسباب 118
نتیجہ خیز پکارنا صرف اللہ کو پکارنا ہے 120
ہر چیز کی تکوینی شہادت 120
مشرکین کے اعتقادی تضاد سے استدلال 121
فیصلہ کن اعلان 123
بعض حقائق کا استحضار 123
آنحضرت ﷺ کو تسلی اور قریش مکہ کو تنبیہ 127
اولوالالباب کی پہلی صفت 128
عہدِ الست کا مفہوم 128
دوسری صفت 131
تیسری صفت 132
چوتھی صفت 132
پانچویں صفت 133
چھٹی صفت 133
ایسے اولوالالباب کا انجام 134
ان کا اعزاز 134
ایمان نہ لانے والوں کی صفات 135
ایمان نہ لانے کا ایک سبب 135
کفار کا مطالبہ اور اس کا جواب 137

Marfat.com

انابت الی اللہ کی وضاحت 138
مطالبۂ معجزات کا جواب ایک اور پہلو سے 139
سابقہ مضمون کی تاکید و تکمیل 140
تاخیر عذاب کی حکمت 143
شرک کی تردید میں ایک دلیل 144
ایک سوال کا جواب 145
جنت کی تمثیل 145
اعتراض اور اس کا جواب 146
قرآن کی حیثیت 147
خطاب آنحضرت ﷺ سے، عتاب مشرکین پر 147
دو اعتراضات اور ان کا جواب 148
مشرکین کو وارننگ 150
مسلمانوں کو تسلی اور مشرکین کو وارننگ ایک دوسرے پہلو سے 150
مشرکین کی چالیں کوئی معنی نہیں رکھتیں 151
آنحضرت ﷺ کی رسالت کی گواہی 151

☆☆☆☆

سُوْرَةُ اِبْرٰهِيْمَ

سُوْرَةُ اِبْرٰهِيْمَ کا تعارف 152
سورت کا نام 152
مقام نزول 152
زمانہ نزول 152
سورت کے مضامین 153
سُوْرَةُ اِبْرٰهِيْمَ 154
اللہ تعالیٰ کا احسان 157
ہدایت وضلالت کے باب میں سنت الٰہی 157
حضرت موسیٰ ؑ کی سرگزشت سے استدلال 158
حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تقریر 161
قوم نوح اور عاد کے بعد کی بعض قوموں کا حوالہ 162
تعجب انگیز سوال 163
قوم کے اعتراضات کا جواب 164
ہمارا سرمایہ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ ہے 165

Marfat.com

کفار کی دھمکی اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے تسلی 167
وَاسْتَفْتَحُوْا کا قائل کون ہے؟ 168
مشرکین کے اعمال کی تمثیل 169
قریش کو وارننگ 169
لیڈروں کا جواب 170
محشر میں شیطان کا اعتراف 172
مومن کا انجام 173
کلمۂ طیبہ کی وضاحت 174
کلمۂ خبیثہ کی وضاحت 175
کلمہ طیبہ مومن کیلئے ثبات قدم کا باعث ہے 176
اَلَمْ تَرَ کا مخاطب اور قریش کو تنبیہ 178
مسلمانوں کو پیغام 179
انسانوں پر مزید احسانات 180
حضرت ابراہیمؑ کی دعا کے چند نکات 182
خاندان ابراہیمی کی تاریخ کے چند اوراق 184
اس وادی میں قیام کا مقصد 185
ادب پہلا قرینہ ہے 186
سابقہ احسانات کا حوالہ 186
مقصد میں سرگرم ہونے کی دعا 187
آنحضرت ﷺ کو تسلی 189
تاریخ کی یاددہانی 190
باردگر تسلی 191
آخری پیغام 192

☆☆☆☆

سُوْرَةُ الْحِجْرِ

سُوْرَةُ الْحِجْرِ کا تعارف 193
سورت کا نام 193
زمانۂ نزول 193
مضامین 193
سُوْرَةُ الْحِجْرِ 194
قرآن مبین کا مفہوم 195

Marfat.com

رُبَمَا کی تحقیق 196
کافروں کا پچھتاوا 196
دین سے بیزاری کا حقیقی سبب 197
ایک سوال کا جواب 198
قریش کی گری ہوئی حرکت کی حقیقت 198
جنوں کی دلیل 199
فرشتے کب اترتے ہیں 199
قریش کی گالی کا جواب 200
استہزا ہر قوم کا شیوہ 201
نشانیاں دیکھ کر بھی ایمان نصیب نہیں ہوتا 201
آسمانوں میں اللہ تعالیٰ کی پھیلی ہوئی نشانیاں 203
برج سے کیا مراد ہے 203
شیاطین کی شرانگیزی سے بچاؤ کا انتظام 204
سن گن لینے والے 204
زمین پر اللہ تعالیٰ کی چند نشانیاں 205
اللہ تعالیٰ کی قدرت وحکمت کی ایک اہم نشانی 205
مزید ایک نشانی 205
وسائل رزق کا پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے 206
توازن وتناسب کی طرف اشارہ 206
ربوبیت کا مزید تذکرہ 207
مذکورہ حقائق کا لازمی تقاضا 208
صفتِ علم کا بیان 208
مشکل الفاظ کی تشریح 210
دلائلِ آفاق کے بعد دلائلِ انفس سے استدلال 211
جنات کی خلقت کا آغاز 212
فرشتوں سے سجدہ کرانے کا مقصد اور سجدہ کا مفہوم 213
آدم وابلیس کی سرگزشت 214
ابلیس کی گمراہی کا سبب اور اس کا ہدف 214
صراطِ مستقیم سے مراد؟ اور ابلیس کی مہلت کی حد؟ 215
جہنم کی وسعت اور اس میں لے جانے والے مہلکات 215
متقین کا انجام 217
اللہ تعالیٰ کی رحیمی سے متعلق غلط فہمی کا ازالہ 218

Marfat.com

تاریخ کی شہادت........ 219
حضرت ابراہیمؑ کا حُسنِ طلب........ 219
فرشتوں کی یقین دہانی........ 220
حضرت ابراہیمؑ کا اظہارِ حقیقت........ 220
حضرت ابراہیمؑ کا اندیشہ........ 220
فرشتوں کا جواب........ 221
حضرت لوطؑ اور فرشتے........ 223
حضرت لوطؑ کو ہدایات........ 223
حضرت لوطؑ کے گھر پر غنڈوں کا حملہ........ 224
بدمعاشوں کو سمجھانے کی انتہائی کوشش........ 224
عذرِ گناہ بدتر از گناہ........ 225
نازک جذبات کے حوالے سے سمجھانے کی کوشش........ 225
گناہ کا نشہ ہر چیز پر غالب آجاتا ہے........ 226
نزولِ عذاب........ 227
قومِ لوط کے بعد دوسری معذب قوموں کا اجمالی تذکرہ........ 228
اصحاب الحجر سے مراد........ 230
ایک سوال کا جواب........ 230
آیات سے مراد........ 230
قومِ ثمود کا فنِ تعمیر........ 231
مضبوط مکان بھی انہیں نہ بچا سکے........ 231
آنحضرت ﷺ کو تسلی........ 232
دو اعتراضوں کا جواب........ 233
سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ سے کیا مراد ہے........ 233
آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کو تسلی........ 234
مقتسمین سے کیا مراد ہے........ 236
تبلیغ میں تیزی اور صراحت پیدا کرنے کا حکم........ 237
آنحضرت ﷺ کی حفاظت کا وعدہ........ 238
کفار کی بدگوئی کے مقابلہ میں تسبیح تحمید اور نماز کا حکم........ 239

☆☆☆☆

Marfat.com

سُوْرَةُ النَّحْلِ

سُوْرَةُ النَّحْلِ کا تعارف	240
سورت کا نام	240
زمانۂ نزول	240
مرکزی مضمون	241
سُوْرَةُ النَّحْلِ	242
عذاب مانگنے والوں کو وعید	243
ایک غلط فہمی کا ازالہ	244
روح کا مفہوم	245
ایک اعتراض کا جواب	245
ایک لطیف نکتہ	246
اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور سے نہ ڈرنے کی دلیل	246
اللہ تعالیٰ کا کمالِ قدرت اور انسان کی بے بضاعتی	247
آیاتِ الٰہی کی طرف اشارہ	248
اللہ تعالیٰ کی مزید نعمتوں کا ذکر	249
ایک اور پہلو سے چوپایوں کا ذکر	250
مزید ایک عظیم نعمت اور احسان کا ذکر	250
فیضانِ ربوبیت	253
نسخے سے فائدہ کون اٹھاتا ہے	254
دلیلِ تخالف	254
سمندر کی نعمتوں کا ذکر	255
مزید نعمتوں کا ذکر	256
مذکورہ حقائق کے لازمی نتائج	257
اللہ تعالیٰ کی بے پایاں نعمتوں کی طرف اشارہ	257
مشرکین کو وعید	258
منکرین کے انکار کا سبب غرور ہے	260
منکرین کو تہدید	260
قرآنِ کریم کے اثرات روکنے کیلئے قریش کی تدبیر	261
گزشتہ قوموں کے احوال سے مشرکین کو وارننگ	264
قیامت کے دن مشرکین کی رسوائی	264
عذابِ قبر	265
متقین کا رویہ	267

Marfat.com

تاریخ سے سبق لینے کی دعوت	267
مشرکینِ مکہ کے اعتراض کا جواب	269
ہر رسول کی دعوت اللہ ہی کی بندگی ہے	271
قانونِ ضلالت	271
آنحضرت ﷺ کو تسلی	272
بگاڑ کا اصل سبب	272
قیامت کی عقلی و اخلاقی ضرورت	273
اللہ تعالیٰ کا کمالِ قدرت	274
قیامت کیلئے ایک اخلاقی مثال	275
ایک اعتراض کا جواب	277
اللہ تعالیٰ کے رسول کی حیثیت مبین کی ہے	278
عذاب سے بے فکری پر اظہار تعجب	279
توحید پر ایک تکوینی دلیل	280
توحید ایک حقیقت ہے اس پر اللہ تعالیٰ کی شہادت	282
وَاصِب کا معنی	283
توحید پر دلیل	283
توحید پر انفسی دلیل	284
اللہ تعالیٰ پر افترا	285
شرک انتہائی گری ہوئی حرکت ہے	286
سب سے بڑھ کر جرم	286
شرک کا دھرا گھناؤنا پن	287
صنف نازک سے متعلق بعض قبائل کا رویہ	287
مشرکین کا ایک اور جرم	288
مطالبۂ عذاب کا جواب اور آنحضرت ﷺ کو تسلی	290
مشرکین کی حماقتیں اور خوش فہمیاں	291
آنحضرت ﷺ کو مزید تسلی	292
ان کے کفر پر اڑنے کا سبب شیطان کا تزئینِ اعمال ہے	292
آنحضرت ﷺ کی منصبی ذمہ داری	293
توحید کی دلیلِ تخالف	294
جنت بعد الموت پر دلیل	294
وحی الٰہی حیات بخش ہے	294
ربوبیت کا فیضان دودھ کی صورت میں	296
ربوبیت کے کچھ اور مظاہر	296

Marfat.com

وحی کا مفہوم 297
اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور وحدانیت کی دلیل 298
شہد سے متعلق بعض غور طلب نکات 298
انسان کی ذات اور اس پر ہونے والی تبدیلیوں سے استدلال 299
انسان کے رویئے سے استدلال 301
بیوی بچوں کی نعمت بھی اللہ تعالیٰ کی عطا ہے 302
ایمان بالباطل کی تفصیل 303
صفاتِ الٰہی کے باب میں تمثیل سے احتراز کی ہدایت 303
اللہ تعالیٰ کی بیان کردہ تمثیل 304
ایک دوسری تمثیل 304
مشرکینِ مکہ کی نارسائیوں پر تنبیہ 306
اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا اظہار 308
اللہ تعالیٰ کی فضائی نعمتوں کا ذکر 308
فیضانِ ربوبیت کا ذکر 309
مزید چند نعمتوں کا ذکر 310
رسولؑ اتمامِ حجت کا آخری ذریعہ ہے 314
خودسروں کا انجام 314
مشرکین اور شریکوں میں تو تکار 315
مشرک کے لیڈروں کیلئے مزید عذاب 316
امت وسط کا فریضۂ منصبی شہادتِ حق 317
سابقہ آیات سے ربط 321
اس آیت کی اہمیت 322
عدل کا مفہوم 323
احسان کا مفہوم 323
اہلِ قرابت کو دینے کا حکم 324
فحشاء کا مفہوم 325
منکر کا مفہوم 326
بغی کا مفہوم 326
ایفائے عہد پر زور 327
قریش کے معاہدوں کی ایک بری مثال 327
مسلمانوں کو ایک اور بداخلاقی سے بچنے کی ہدایت 329
اشتراء اور ثمن قلیل کا مفہوم 329

Marfat.com

اہلِ ایمان کیلئے بشارت 330
غلط فہمیوں کا ازالہ 331
شیطانی فتنوں سے پناہ مانگنے کی ہدایت 333
مومنوں پر شیطان کا اثر نہیں ہوتا 333
ایک اعتراض اور اس کا جواب 335
قرآن ایک ہی مرتبہ نازل کیوں نہیں ہوا؟ 336
آنحضرت ﷺ پر الزام کا جواب 337
ہدایت سے متعلق اللہ تعالیٰ کا قانون 338
ارتداد اور عزیمت و رخصت 339
ارتداد کا سبب اور اس کا انجام 340
اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں کی تصویر 341
آخرت کی یاد دہانی 344
قریہ سے مراد؟ اس میں تین آراء 345
سابقہ مضمون کی تائید 346
ملتِ ابراہیمؑ میں حلال و حرام 347
ایک غلط فہمی کا ازالہ 347
میتہ سے متعلق احکام کی وضاحت 348
غیر اللہ کیلئے نامزدگی کی تین صورتیں 349
نذر لغیر اللہ کا مسئلہ 351
تحلیل و تحریم کا حق صرف خدا کا ہے 352
اعتراض کا جواب 353
یہود پر ان کی سرکشی کی وجہ سے بعض جانور حرام کر دیئے گئے 353
رحمت کا دریچہ 354
حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تعارف 356
سبت کا ملتِ ابراہیمؑ سے کوئی تعلق نہیں 358
اس آیت کا پس منظر 359
حکمت کا ایک پہلو 359
حکمتِ تبلیغ کی جان تین چیزیں 361
حکمتِ تبلیغ کا ایک اور پہلو 362
مکارمِ اخلاق کی تعلیم 364
صبر اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہوتا ہے 364
غلبے کی نوید 365

Marfat.com

سُوْرَةُ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ

سُوْرَةُ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ کا تعارف 366
سورت کا نام 366
سُوْرَةُ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ 369
واقعہ معراج پر اعتراضات اور ان کا جواب 372
اس واقعہ میں مخفی بعض حکمتیں 373
واقعہ معراج کی تفصیلات 374
آنحضرتؐ اور آپؐ کی امت پر فضل و کرم کی بارش 378
کفار کا ردِ عمل 379
آیت کا ربط 381
بنی اسرائیل کی تاریخ اور درسِ عبرت 382
یہود کی تاریخ کا دوسرا دور 385
بنی اسرائیل کیلئے آخری موقعہ 386
امت مسلمہ کی قسمت قرآنِ کریم سے وابستہ ہے 386
مخالفین کا طرزِ عمل 389
ہدایت کے حصول کیلئے یہ نشانیاں کافی ہیں 390
انسانوں کی فلاح و خسران کا مدار حُسنِ کردار پر ہے 391
ایک اور رعد آسا اعلان 392
قوموں کی تباہی کا آخری سبب 393
اعمال کے متعلق سنت الٰہی 394
کافر اور مومن سب کو رزق اللہ تعالیٰ دیتا ہے 395
اونچ نیچ میں حکمت 396
توحید ہی بنیاد ہے 396
عبادت اللہ تعالیٰ کا حق ہے 398
انسانوں میں سب سے پہلا حق والدین کا ہے 399
والدین کے تین حقوق میں سے پہلا حق حُسنِ سلوک ہے 399
بڑھاپے میں آنے والی تبدیلیاں 400
والدین کا دوسرا حق اطاعت ہے 400
رضاعی والدین بھی حُسنِ سلوک کے مستحق ہیں 401
حضرت اویس قرنیؓ 402
ماں باپ کی خدمت اور جہاد 403

Marfat.com

والدین کی اطاعت قانوناً بھی ضروری ہے اور اخلاقاً بھی 403
تیسرا حق دُعا کرنا ہے 404
بعد از وفات والدین کے حقوق 405
والدین کی اطاعت کی دنیوی برکات 407
اہلِ قرابت کے حقوق 408
صلہ رحمی کی اہمیت 409
قطع رحمی دنیا و آخرت میں خسارے کا سبب ہے 412
آیت کا شانِ نزول 415
یتیموں کا مسکینوں کے حقوق 416
مسافر کے حقوق 419
اکرامِ ضیف 420
فضول خرچی کی ممانعت 421
ایک نادر ہدایت 422
اعتدال کی ہدایت 422
قتلِ اولاد کی ممانعت 425
منہیات میں سب سے پہلے قربتِ زنا کا ذکر 426
قتل کی ممانعت اور اسلامی قانون کا مزاج 427
مالِ یتیم کی حرمت 428
ایفائے عہد کی ہدایت 428
ایفائے کیل ووزن کی ہدایت 429
ظن و گمان کی بجائے علم کی پیروی کی ہدایت 429
غرور و تکبر کی ممانعت 429
شرک کی بدترین صورت 431
جمود فسادِ عقل کا باعث ہوتا ہے 431
تصریف کا مفہوم 433
توحید پر ایک عقلی اور واقعاتی دلیل 434
اللہ تعالیٰ ہر شرک سے منزہ ہے 435
تمام کائنات اللہ تعالیٰ کی تنزیہہ کرتی ہے 435
ہدایت سے متعلق اللہ تعالیٰ کا قانون 437
آیات کا شانِ نزول 437
دشمنوں کی نظر سے مستور رہنے کا ایک عمل 438
آنحضرت ﷺ کی باتیں قریش برے ارادوں سے سنتے تھے 439

Marfat.com

مشرکین کا اصل مرض 440
بعث بعد الموت پر دلیل 440
مخالفتوں کے ہجوم میں مسلمانوں کو صبر کی تلقین 443
حکمتِ تبلیغ 444
تفضیلِ انبیاء میں صحیح نقطۂ نظر 445
دو باتیں 446
ایک غلط فہمی کا ازالہ 446
عذاب سے متعلق سنت اللہ 447
منہ مانگے معجزات نہ بھیجنے کی حکمت 448
ہدایت کیلئے چند نشانیوں کا ذکر 449
کفار کے انکار کا اصل سبب 452
اَرَءَیْتَکَ کا مفہوم 453
ابلیس کے عزائم 453
شیطان کے اضلال کی وسعت 454
مخلص بندوں کا تسلی 455
انعاماتِ الٰہی کی فراوانی 456
انسان کی ناشکری 456
اللہ تعالیٰ کے باغیوں سے چند سوالات 457
انسان کو ذمہ داری کی یاد دہانی 458
یوم حساب کی ہولناکی 460
دنیا کی بے بصیرتی آخرت میں اندھے پن کا سبب بنے گی 461
قریش کی سازشیں اور گھناؤنی تجاویز 461
توجہ طلب باتیں 462
عصمتِ انبیا کا مفہوم 463
ہجرت کی طرف اشارہ 463
نماز کا حکم دینے کی وجہ 465
نمازوں کی فرضیت 466
اوقاتِ صلوٰۃ کے تعین میں حکمت 467
تہجد کا معنی 467
نماز تہجد فرض ہے یا نفل 468
نماز تہجد نفل ہے یا سنت موکدہ 469
تہجد کی تعداد رکعات 469

Marfat.com

نمازِ تہجد کی کیفیت 470
عَسٰی کا مفہوم 470
آنحضرت ﷺ کو تسلی اور مقامِ محمود کا وعدہ 470
ہجرت کی دُعا اور اس کا مفہوم 472
ایک اور دُعا 472
حق کی فتح اور باطل کی شکست کا اعلان 473
قرآن اہلِ ایمان کیلئے رحمت اور ظالموں کیلئے محرومی ہے 474
انسان کا رویہ 475
ہدایت قبول نہ کرنے والوں سے آخری بات 475
روح سے متعلق سوال کا جواب سیاق وسباق کی روشنی میں 477
روح کا مفہوم روایات کی روشنی میں 478
تطبیق کی عاجزانہ کوشش 479
وحی تصرف غیبی اور اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے 479
قرآن کریم کا حیرت انگیز چیلنج 480
اللہ تعالیٰ کی بے پایاں رحمت اور انسانی رویہ 482
ایمان کیلئے قریش کی شرائط 482
نبی کی بشریت ایمان کے راستے کی رکاوٹ 485
انبیا کے بشر ہونے کی حکمت 486
معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کرنے کی ہدایت 486
ہدایت کیلئے اللہ تعالیٰ کی سنت 487
قیامت سے انکار کا نتیجہ 488
قیامت کیلئے وقت مقرر ہے 488
قریش کی نِجست پر چوٹ 489
حضرت موسیٰؑ کو دیئے گئے معجزات اور فرعون پر ان کا اثر 491
ایک دوسری تفسیر 492
حضرت موسیٰؑ کا فرعون کو جواب 493
قریش کیلئے آئینہ 493
دعوت کے سلسلے میں آنحضرتؐ کی ذمہ داری 494
قرآن کے بتدریج اترنے کی حکمت 494
صالحین اہلِ کتاب کے رویئے سے آنحضرتؐ کو تسلی اور قریش سے بے نیازی 495
آیت کا شانِ نزول اور مفہوم 496
اتمامِ حجت اور اعلانِ حق 497

Marfat.com

Marfat.com

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْآ اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ

کیا ایمان والوں کے لیے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

هُدًى لِّلنَّاس

سُوْرَةُ يُوْسُف

Marfat.com

Marfat.com

تعارف

سُوْرَۃُ یُوْسُفَ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سورۃ کا نام

قرآن پاک کی بیشتر سورتوں کے نام کسی موضوع سے متعلق نہیں بلکہ محض شناخت کیلئے ہیں لیکن اس سورت کا نام حضرت یوسف علیہ السلام کے نام پر اس لئے رکھا گیا ہے کہ اس میں مناسب تفصیل کے ساتھ آپؑ کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ اس سورت کی آیتوں کی تعداد 111 ہے۔ اس میں 1600 کلمے، 7166 حروف اور 12 رکوع ہیں۔

زمانۂ نزول

مفسرین نے نزدیک یہ بات مُسلّم ہے کہ یہ سورت مکہ معظمہ میں نازل ہوئی۔ البتہ زمانے کا ٹھیک تعین مشکل ہے، لیکن اگر سورت کی اندرونی شہادتوں اور قرائن سے استفادہ کیا جائے تو یہ بات یقین تک پہنچ جاتی ہے کہ اس سورت کے نزول کا زمانہ وہی ہے جب قریش مکہ کی جانب سے آنحضرت ﷺ کی مخالفت میں انتہائی شدت آ چکی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ وہ ہے جب حضرت ابوطالب انتقال کر چکے تھے اور حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بھی اللہ تعالیٰ کو پیاری ہو چکی تھیں۔ اس کے بعد اشرافِ قریش نے آنحضرت ﷺ کو ختم کرنے کے منصوبے باندھنے شروع کر دیئے اور آپؐ کی دعوت کو یکسر روکنے کیلئے ایسے سوالات کرنے شروع کر دیئے جس کے بارے میں ان کا گمان یہ تھا کہ آنحضرت ﷺ اس کا جواب دے نہیں پائیں گے۔ چنانچہ انہیں سوالوں میں سے ایک سوال یہ تھا کہ بنی اسرائیل کا مصر منتقل ہونے کا سبب کیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ قریش نے یہ سوال یہود کی انگیخت پر کیا ہوگا۔ قریش کے اگرچہ یہود سے زیادہ تعلقات نہیں تھے لیکن یہود اسلام دشمنی کے باعث قریش کو اپنے قریب محسوس کرتے تھے اور اسلام دشمنی ان کے نزدیک ایک مشترکہ مضمون کی حیثیت رکھتی تھی۔ چنانچہ جیسے جیسے اسلام کی دعوت آگے بڑھتی جا رہی تھی اور آنحضرت ﷺ پر ایمان لانے والوں کا حلقہ وسیع ہوتا جا رہا تھا، ویسے ویسے دور رہتے ہوئے بھی یہود کے اضطراب میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور وہ ہر نئی صورتحال سے باخبر رہنے کی کوشش کرتے تھے اور قریش مکہ کو ایسے سوالات مہیا کرنے کی کوشش کرتے تھے جن کا جواب ان کے خیال میں آنحضرت ﷺ کیلئے ممکن نہیں تھا۔ پیشِ نظر سوال بھی ایک ایسا ہی سوال تھا کیونکہ یہود جانتے تھے کہ اہلِ مکہ بلکہ تمام جزیرۂ عرب کے رہنے والے یہود کی تاریخ سے بالکل ناواقف اور بے نیاز واقع ہوئے ہیں انہیں اگر کوئی دلچسپی ہے تو ملتِ ابراہیم اور اولادِ اسماعیل سے ہے۔

اس سورت کا نزول آنحضرت ﷺ کی نبوت کی دلیل

نبی کریم ﷺ بھی ایک عرب اور قریشی ہونے کے لحاظ سے وہی معلومات رکھتے تھے جو عام قریشیوں کی تھیں اور آپؐ کے علم کے ذرائع بھی وہی تھے، جو باقی اہلِ مکہ کے تھے۔ اس لئے جس طرح باقی اہلِ مکہ یا عرب یہود کی تاریخ سے دلچسپی نہ ہونے کی وجہ سے بے خبر اور ناواقف تھے، اسی طرح

Marfat.com

آنحضرت ﷺ بھی ان کی تاریخ سے ناواقف تھے۔ یہود نے قریش کی معرفت یہ سوال اس لئے کیا تھا کہ اس سے محمد (ﷺ) کا بھرم کھل جائے گا۔ وہ جب اس کا جواب نہیں دے پائیں گے جبکہ ان کا دعویٰ ہے کہ مجھ پر وحی اترتی ہے تو لوگ سمجھ جائیں گے کہ یہ نبوت کا دعویٰ محض ایک بہروپ ہے جو انہوں نے اختیار کر رکھا ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی چال ان پر الٹ دی۔ اللہ تعالیٰ ہی اپنی حکمتوں کو جانتا ہے۔ عام طور پر نزول وحی کا طریقہ یہ رہا ہے کہ کبھی چند آیتیں نازل ہوتیں اور کبھی ایک یا دو رکوع نازل ہو جاتے۔ بعض چھوٹی سورتیں مکمل شکل میں نازل ہوئی ہیں، لیکن ایک ایسی سورت جو 12 رکوع پر مشتمل ہے اس کا ایک ہی وقت میں نازل ہونا، پھر آنحضرت ﷺ کی زبان پر اس کا جاری ہو جانا اور آپ کی یادداشت میں اس کا منضبط ہو جانا یہ ایک غیر معمولی واقعہ ہے، جو نبی کریم ﷺ کی نبوت کی دلیل ہے۔ چنانچہ ایک ہی نشست میں عام لوگوں کے سامنے جب آپ نے اس پوری سورت کو پڑھ کر سنایا تو لوگ انگشت بدنداں رہ گئے۔ ان کے مبہوت ہونے اور حیران ہونے کے کئی اسباب تھے۔

۱۔ 12 رکوع پر مشتمل سورت کا ایک وقت میں آنحضرت ﷺ پر اترنا اور آپ کا اس کو یاد کر لینا اور اسی وقت لوگوں کو پڑھ کر سنا دینا یہ ایک ایسا واقعہ ہے جو انسانی بساط سے باہر معلوم ہوتا ہے۔

۲۔ اس میں حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی کے تمام اہم واقعات کو ایک نظم و ترتیب کے ساتھ بیان کرنا جس سے پہلی آسمانی کتابیں بھی خالی ہیں بجائے خود حیران کر دینے والی بات ہے۔

۳۔ پھر ان واقعات کو اس صورتحال پر چسپاں کر دینا جو اس وقت آنحضرت ﷺ کو درپیش تھی۔

مکی زندگی کے آخری سالوں میں قریشِ مکہ نے دارالندوہ میں آپ کے قتل کے مشورے شروع کر رکھے تھے۔ مختلف تجاویز زیرِ غور تھیں، لیکن یہ بات طے تھی کہ اب آپ کو تبلیغ و دعوت کیلئے مزید مہلت نہیں دی جائے گی۔ شہر سے نکال دیا جائے گا اور یا آپ کو قتل کر دیا جائے گا۔ اس صورت میں قریشِ مکہ کو ایک آئینہ دکھایا جا رہا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے رسول کے بارے میں کوئی نیا فیصلہ کرنے نہیں جا رہے ہو، تم سے پہلے بھی ایسے لوگ گزرے ہیں جنہوں نے بعض اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کو مصیبتوں میں مبتلا کیا، لیکن ان کی تدبیریں اللہ تعالیٰ کی مشیت کا راستہ نہ روک سکیں۔ برادرانِ یوسف نے حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنے راستے سے ہٹانے کیلئے کنویں میں پھینکا اور اس کے بعد وہ مطمئن ہو گئے کہ یوسف یا تو کنویں میں مر جائے گا اور یا کوئی قافلہ اسے نکال کر لے جائے گا اور غلام بنا کر بیچ دے گا اور ہم ہمیشہ کیلئے اس سے نجات پا جائیں گے، لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ دکھایا کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت انسانی تدبیروں پر ہمیشہ غالب رہتی ہے۔ برادرانِ یوسف کا حضرت یوسف علیہ السلام کو کنویں میں پھینکنا، ان کے خاتمے کی ایک تدبیر تھی، لیکن اللہ تعالیٰ نے اسی خطرناک اقدام کو حضرت یوسف علیہ السلام کیلئے کامرانیوں کا پہلا زینہ بنا دیا۔

زلیخا نے حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنی خواہشات کا آلہٗ کار بنانا چاہا۔ وہ تقویٰ کی تصویر بن گئے۔ زلیخا نے اس سرتابی کی سزا دیتے ہوئے انہیں جیل بھجوا دیا اور صاف صاف کہا کہ جب تک تم میری خواہشات کو پورا کرنے کا ارادہ نہیں کرو گے اس وقت تک تم جیل میں رہو گے۔ زلیخا نے اس طرح سے اپنے انتقام کی آگ ٹھنڈی کی لیکن اللہ تعالیٰ کی مشیت نے اسی کو مزید کامیابیوں کا ذریعہ بنا دیا اور آپ قید خانے سے نکل کر سیدھے ایوانِ حکومت میں داخل ہوئے۔

قریش کو یہ آئینہ دکھا کر یہ بتانا مقصود ہے کہ تم جس طرح اللہ تعالیٰ کے آخری نبی کو ختم کرنے پر تلے ہوئے ہو، اللہ تعالیٰ کی مشیت تم سے بہت زیادہ طاقتور ہے۔ تمہاری ساری کوششیں ناکام ہوں گی اور نبی کریم ﷺ درجہ بدرجہ اپنی کامیابیوں کی طرف بڑھتے جائیں گے اور پھر جس طرح ایک وقت آیا کہ برادرانِ یوسف اپنے بھائی کے سامنے عفو و درگزر کی بھیک مانگتے ہوئے نظر آئے، اسی طرح ایک وقت آئے گا تم بھی نبی کریم ﷺ کے سامنے اپنی زندگی کی بھیک مانگتے ہوئے دکھائی دو گے۔ چنانچہ حالات نے ان میں سے ایک ایک بات کو سچا ثابت کیا۔

آنحضرت ﷺ کی زبان مبارک پر وحی الٰہی کا جاری ہونا اور تاریخ بنی اسرائیل کے ایک ایک گوشے کو حق و صداقت کے ترازو میں تول تول کر تاریخ کے حوالے کرنا بجائے خود اس بات کی دلیل ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے نبی ہیں اور آپ پر وحی اترتی ہے۔

Marfat.com

سورۂ یوسف کا ایک ایک باب جہاں قریشِ مکہ کیلئے نصیحت وعبرت کے دروازے کھولتا ہے وہیں نبی کریم ﷺ کیلئے تسلی اور اطمینان کا باعث بھی ہے۔ آپؐ کو بتایا جا رہا ہے کہ آپؐ یقیناً بہت اذیتوں کا سامنا کر رہے ہیں، آپؐ کیلئے حالات نہایت دگرگوں ہیں، لیکن یوسفؑ کی تاریخ آپؐ کیلئے اطمینان کا باعث ہونی چاہئے کہ کس طرح ان کیلئے ہر دکھ اور ہر تکلیف کامیابی اور کامرانی کا پیش خیمہ ثابت ہوئی، اس لئے آپ کو نہایت اطمینان رکھنا چاہئے کہ مصائب کا دور ختم ہونے والا ہے۔ عنقریب آپؐ مدینہ ہجرت فرمائیں گے اور وہاں نئی تاریخ آپؐ کا انتظار کر رہی ہے۔

تاریخی وجغرافی حالات

اس قصے کو سمجھنے کیلئے ضروری ہے کہ مختصراً اس کے متعلق کچھ تاریخی وجغرافی معلومات بھی ناظرین کے پیش نظر رہیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام، حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹے، حضرت اسحاق علیہ السلام کے پوتے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پر پوتے تھے۔ بائبل کے بیان کے مطابق (جس کی تائید قرآن کے اشارات سے بھی ہوتی ہے) حضرت یعقوب علیہ السلام کے 12 بیٹے، 4 بیویوں سے تھے، حضرت یوسف علیہ السلام اور ان کے چھوٹے بھائی بن یمین ایک بیوی سے، اور باقی 10 دوسری بیویوں سے۔

فلسطین میں حضرت یعقوب علیہ السلام کی جائے قیام حبرون (موجودہ الخلیل) کی وادی میں تھی جہاں حضرت اسحاق علیہ السلام اور ان سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام رہا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی کچھ زمین سکم (موجودہ نابلس) میں بھی تھی۔

بائبل کے علما کی تحقیق اگر درست مانی جائے تو حضرت یوسف علیہ السلام کی پیدائش 1906 قبل مسیح کے لگ بھگ زمانے میں ہوئی اور 1890 ق م کے قریب زمانے میں وہ واقعہ پیش آیا جس سے اس قصہ کی ابتداء ہوتی ہے، یعنی خواب دیکھنا اور پھر کنویں میں پھینکا جانا۔ اس وقت حضرت یوسف علیہ السلام کی عمر 17 برس کی تھی، جس کنویں میں وہ پھینکے گئے وہ بائبل اور تلمود کی روایات کے مطابق سکم کے شمال میں دوتن (موجودہ دُثان) کے قریب واقع تھا، اور جس قافلے نے انہیں کنویں سے نکالا وہ جلعاد (شرق اردن) سے آ رہا تھا اور مصر کی طرف عازم تھا۔ (جلعاد کے کھنڈرات بھی دریائے اردن کے مشرق میں وادی الیابس کے کنارے واقع ہیں۔)

مصر پر اس زمانہ میں پندرھویں خاندان کی حکومت تھی جو مصری تاریخ میں چرواہے بادشاہوں (HYKSOS KINGS) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ عربی النسل تھے اور فلسطین وشام سے مصر جا کر 2 ہزار برس قبل مسیح کے لگ بھگ زمانہ میں سلطنت مصر پر قابض ہو گئے تھے۔ عرب مؤرخین اور مفسرین قرآن نے ان کیلئے "عمالیق" کا نام استعمال کیا ہے جو مصریات کی موجودہ تحقیقات سے ٹھیک مطابقت رکھتا ہے۔ مصر میں یہ لوگ اجنبی حملہ آور کی حیثیت رکھتے تھے اور ملک کی خانگی نزاعات کے سبب سے انہیں وہاں اپنی بادشاہی قائم کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ یہی سبب ہوا کہ ان کی حکومت میں حضرت یوسف علیہ السلام کو عروج حاصل کرنے کا موقع ملا اور پھر بنی اسرائیل وہاں ہاتھوں ہاتھ لئے گئے، ملک کے بہترین زرخیز علاقے میں آباد کئے گئے اور ان کو وہاں بڑا اثر ورسوخ حاصل ہوا کیونکہ وہ ان غیر ملکی حکمرانوں کے ہم جنس تھے۔ پندرھویں صدی قبل مسیح کے اواخر تک یہ لوگ مصر پر قابض رہے اور ان کے زمانے میں ملک کا سارا اقتدار عملاً بنی اسرائیل کے ہاتھ میں رہا۔ اسی دور کی طرف سورۂ مائدہ آیت 20 میں اشارہ کیا گیا ہے اِذْ جَعَلَ فِیْکُمْ اَنْبِیَآءَ وَجَعَلَکُمْ مُّلُوْکًا اس کے بعد ملک میں ایک زبردست قوم پرستانہ تحریک اٹھی جس نے ہکسوس اقتدار کا تختہ الٹ دیا۔ اڑھائی لاکھ کی تعداد میں عمالقہ ملک سے نکال دیئے گئے۔ ایک نہایت متعصب قبطی النسل خاندان برسر اقتدار آ گیا اور اس نے عمالقہ کے زمانہ کی یادگاروں کو چن چن کر مٹا دیا اور بنی اسرائیل پر ان مظالم کا سلسلہ شروع کیا جن کا ذکر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے میں آتا ہے۔

مصری تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ان چرواہے بادشاہوں نے مصری دیوتاؤں کو تسلیم نہیں کیا تھا بلکہ اپنے دیوتا شام سے اپنے ساتھ لائے تھے اور ان کی کوشش یہ تھی کہ مصر میں ان کا مذہب رائج ہو۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید حضرت یوسف علیہ السلام کے ہم عصر بادشاہ کو "فرعون" کے نام سے

Marfat.com

یادنہیں کرتا کیونکہ ''فرعون'' مصر کی مذہبی اصطلاح تھی اور یہ لوگ مصری مذہب کے قائل نہ تھے لیکن بائبل میں غلطی سے اس کو بھی ''فرعون'' ہی کا نام دیا گیا ہے۔شاید اس کے مرتب کرنے والے سمجھتے ہوں گے کہ مصر کے سب بادشاہ ''فراعنہ'' ہی تھے۔

موجودزمانہ کے محققین جنہوں نے بائبل اور مصری تاریخ کا تقابل کیا ہے، عام رائے یہ رکھتے ہیں کہ چرواہے بادشاہوں میں سے جس فرمانروا کا نام مصری تاریخ میں اپوفیس (APOPHIS) ملتا ہے، وہی حضرت یوسف علیہ السلام کا ہم عصر تھا۔

مصر کا دارالسلطنت اس زمانہ میں ممفس (منف) تھا جس کے کھنڈر قاہرہ کے جنوب میں 14 میل کے فاصلے پر پائے جاتے ہیں۔حضرت یوسف علیہ السلام 17، 18 سال کی عمر میں وہاں پہنچے۔دو تین سال عزیز مصر کے گھر رہے۔آٹھ نو سال جیل میں گزارے۔30 سال کی عمر میں ملک کے فرمانروا ہوئے اور 80 سال تک بلاشرکت غیرے تمام مملکت مصر پر حکومت کرتے رہے۔اپنی حکومت کے نویں یا دسویں سال انہوں نے حضرت یعقوب علیہ السلام کو اپنے پورے خاندان کے ساتھ فلسطین سے مصر بلالیا اور اس علاقے میں آباد کیا جو دمیاط اور قاہرہ کے درمیان واقع ہے۔بائبل میں اس علاقے کا نام جشن یا گوشن بتایا گیا ہے۔حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے تک یہ لوگ اسی علاقے میں آباد رہے۔بائبل کا بیان ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے 110 سال کی عمر میں وفات پائی اور انتقال کے وقت بنی اسرائیل کو وصیت کی کہ جب تم اس ملک سے نکلو تو میری ہڈیاں اپنے ساتھ لے کر جانا۔

یوسف علیہ السلام کے قصے کی جو تفصیلات بائبل اور تلمود میں بیان کی گئی ہیں ان سے قرآن کا بیان بہت کچھ مختلف ہے، مگر قصے کے اہم اجزاء میں تینوں متفق ہیں۔ہم اپنے حواشی میں حسب ضرورت ان اختلافات کو واضح کرتے جائیں گے۔ (تفہیم القرآن)

Marfat.com

اٰيَاتُهَا ۱۱۱	سُوْرَةُ يُوْسُفَ مَكِّيَّةٌ	رُكُوْعَاتُهَا ۱۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓرٰ قف تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۟ قف ﴿١﴾ اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ
تَعْقِلُوْنَ ﴿٢﴾ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَاۤ اَوْحَيْنَاۤ
اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ ۖۗ وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ ﴿٣﴾
اِذْ قَالَ يُوْسُفُ لِاَبِيْهِ يٰۤاَبَتِ اِنِّيْ رَاَيْتُ اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّ
الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَاَيْتُهُمْ لِيْ سٰجِدِيْنَ ﴿٤﴾ قَالَ يٰبُنَيَّ لَا تَقْصُصْ
رُءْيَاكَ عَلٰۤى اِخْوَتِكَ فَيَكِيْدُوْا لَكَ كَيْدًا ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ
عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿٥﴾ وَكَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ
الْاَحَادِيْثِ وَيُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَعَلٰۤى اٰلِ يَعْقُوْبَ كَمَاۤ اَتَمَّهَا
عَلٰۤى اَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿٦﴾

رکوع: ۱۔ (الف، لام، را۔ یہ آیتیں ہیں واضح کتاب کی۔ہم نے اس کو عربی قرآن بنا کر اتارا تاکہ تم سمجھو۔ہم آپ کو ایک بہترین سرگزشت سناتے ہیں، اس قرآن کی بدولت جو ہم نے آپ کی طرف وحی کیا ہے۔اس سے پہلے بیشک آپ اس سے ناآشنا تھے۔یاد کرو جب یوسف (علیہ السلام) نے اپنے والد سے کہا کہ ابا جان، میں نے خواب میں گیارہ ستارے اور چاند اور سورج دیکھے ہیں، میں نے انہیں دیکھا ہے کہ وہ میرے آگے سربسجود ہیں۔آپ نے فرمایا کہ اے میرے بیٹے تم اپنا خواب اپنے بھائیوں

Marfat.com

سے بیان نہ کرنا ورنہ وہ تمہارے خلاف سازش کریں گے۔ بیشک شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔ اور اسی طرح تمہارا رب تمہیں برگزیدہ کرے گا اور تمہیں باتوں کی حقیقتوں تک پہنچنا سکھائے گا۔ اور تم پر اور آلِ یعقوب پر اپنی نعمت تمام کرے گا جس طرح اس نے اس سے پہلے تمہارے اجداد ابراہیم اور اسحاق پر اپنی نعمت تمام کی۔ بیشک تمہارا پروردگار سب کچھ جاننے والا، بہت دانا ہے۔)

الٓرٰ تِلْکَ اٰیٰتُ الْکِتٰبِ الْمُبِیْنِ ۝ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِیًّا لَّعَلَّکُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝

(الف، لام، را۔ یہ آیتیں ہیں واضح کتاب کی۔ ہم نے اس کو عربی قرآن بنا کر اتارا تاکہ تم سمجھو۔)　(سورۃ یوسف: ۱،۲)

الٓرٰ : حروف مقطعات ہیں اور حروف مقطعات پر ہم سورۃ البقرہ کے آغاز میں بحث کر چکے ہیں۔

کتابِ مبین کا مفہوم

پیشِ نظر آیات ایک ایسی کتاب کی ہیں جو اپنے بیان اور استدلال میں سورج کی طرح روشن اور بدیہیات کی طرح واضح ہیں۔ اس کی ہر بات اپنے اندر روشنی کا اتنا سامان رکھتی ہے کہ باہر سے اسے ثبوت کی ضرورت نہیں۔ پورا قرآنِ پاک آپ کے سامنے ہے۔ کہیں سے بھی نکال کے دیکھ لیجئے، قرآنِ پاک کا اسلوب اپنی ایک مخصوص شان رکھتا ہے۔ اس کے الفاظ ہر قسم کی کمزوری سے پاک ہیں۔ الفاظ کا دروبست نہایت محکم ہے۔ جملوں کی ساخت اور ان کی ترتیب فصاحت و بلاغت کا آئینہ ہے۔ اس کا اندازِ بحث نہایت دلنشیں، تمام الجھنوں کو دور کرنے والا اور طبیعتوں کیلئے تشفی بخش ہے۔ کتابِ مبین کا یہ مفہوم اس صورت میں ہے جب مبین کو لازمی مانا جائے اور اگر اسے متعدی قرار دیا جائے تو پھر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ کتاب حق و باطل کو ظاہر کرنے والی اور انہیں کھول کھول کے بیان کر دینے والی ہے۔ اس کا انداز کہیں بھی حق و باطل میں سمجھوتہ کرنے کا نہیں بلکہ یہ حق و باطل کو اس طرح کھول کر بیان کرتا ہے کہ ان میں کہیں بھی آمیزش کا اندیشہ نہیں رہتا۔

اہلِ عرب پر احسان

آیت نمبر ۲ میں فرمایا گیا ہے کہ ہم نے اسے عربی قرآن بنا کر اتارا۔ اس میں اَنْزَلْنٰهُ کی ضمیر کا مرجع قرآن بھی ہو سکتا ہے اور قصہ یوسفؑ بھی۔ اگر قصہ یوسفؑ مراد لیا جائے تو پھر مطلب یہ ہوگا کہ تم نے چونکہ عرب ہوتے ہوئے قصہ یوسفؑ کے بارے میں استفسار کیا ہے تو ہم نے بھی اس کا جواب عربی میں اتارا تاکہ تمہیں سمجھنے میں دشواری پیدا نہ ہو، کیونکہ تمہاری زبان عربی ہے اور تم کسی اور زبان سے واقف نہیں ہو۔ اور دوسری صورت یہ ہے کہ اس کا مرجع قرآنِ کریم کو ٹھہرایا جائے تو پھر اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ ہم نے تمہارے لئے جو قرآنِ کریم اتارا ہے وہ عربی زبان میں اتارا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ وہ جب بھی کوئی رسول کسی قوم میں بھیجتا ہے تو اس پر جو کتاب اتارتا ہے وہ اس قوم کی زبان میں ہوتی ہے۔ اور رسولؑ بھی بالعموم اس قوم کی طرف بھیجا جاتا ہے جو اس کی ہم زبان ہوتی ہے تاکہ وہ قوم کتاب کو بھی سمجھ سکے اور رسول کی تعلیم و تبیین سے بھی فائدہ اٹھا سکے۔ نبی کریم ﷺ یوں تو ساری دنیا کی طرف تشریف لائے لیکن آپؐ کی براہِ راست بعثت عربوں میں ہوئی اور انہیں کو امت کے ہراول دستے کے طور پر تیار کیا گیا۔ سو جس طرح معلم اور متعلم کے درمیان زبان کی بیگانگی، افادہ اور استفادہ میں رکاوٹ بنتی ہے اسی طرح رسول اور امت میں بھی زبان کا اختلاف دین کے قبول کرنے اور اس کے سمجھنے میں بہت بڑی رکاوٹ بن جاتا ہے۔ اس لئے پروردگار نے دوسری جگہ قرآنِ پاک میں ارشاد فرمایا کہ ہم نے جب بھی کوئی رسول بھیجا تو ان کی قوم کی زبان میں بھیجا تاکہ وہ اپنی بات کو ان کے سامنے واضح کر سکے۔

قرآنِ کریم الفاظ سمیت نازل ہوا ہے، اس کی دلیل

ہمیں اس آیت سے ایک الجھن کے ازالے میں بھی مدد ملتی ہے جو عام طور پر مستشرقین کی طرف سے پیدا کی جاتی ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نبیوںؑ پر جو کتابیں اتری ہیں ان میں صرف مفہوم اور معنی یا خیال ان کے دل پر نازل کیا جاتا تھا جسے وہ اپنی زبان اور اپنے الفاظ میں ان کے

Marfat.com

سامنے پیش کرتے تھے۔ یہ کسی طرح بھی ممکن نہیں ہے کہ کتاب اپنے لفظوں سمیت پیغمبر کے دل پر نازل کی جائے۔ معلوم ہوتا ہے کہ عیسائی اور یہودی بھی اپنی کتابوں کے بارے میں یہی تصور رکھتے ہیں اور اس لئے ان کے تراجم کو کتاب کا قائم مقام سمجھتے ہیں لیکن مسلمانوں کے نزدیک وحی کا ہرگز یہ مفہوم نہیں۔ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ نبی کریم ﷺ پر قرآنِ کریم کا مفہوم نازل نہیں ہوا بلکہ اس کے الفاظ بھی نازل ہوئے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور کلام نظم و معنی سے مل کر بنتا ہے، لیکن مستشرقین مسلسل جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کے ذہنوں میں یہ بات انڈیلتے رہتے ہیں کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ الفاظ بھی اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل ہوئے ہوں۔ روزگارِ فقیر کے مصنف نے اپنی کتاب میں ایک واقعہ لکھا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ لاہور کے ایک کالج میں علامہ اقبالؒ مدعو تھے۔ پرنسپل نے دورانِ تقریب علامہؒ سے آ کر کہا کہ آپ تقریب ختم ہوتے ہی چلے نہ جائیے، مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنا ہے۔ چنانچہ تقریب کے بعد وہ علامہ کو ایک طرف لے کر بیٹھ گئے اور پوچھنے لگے کہ میں نے سنا ہے کہ مسلمان قرآنِ کریم کے بارے میں یہ یقین رکھتے ہیں کہ وہ اسی طرح یعنی لفظ و معنی سمیت حضرت محمد ﷺ پر نازل ہوا تھا، کیا آپ کا بھی یہی عقیدہ ہے؟ علامہ کہنے لگے کہ ہاں میں اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ آنحضرت ﷺ کے دل پر الفاظ اور مفہوم دونوں ایک ساتھ نازل ہوئے تھے۔ پرنسپل نے کہا یہ عجیب بات ہے آپ اتنے پڑھے لکھے آدمی ہیں اور پھر بھی اس طرح کی باتوں پر یقین رکھتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ کہنے لگے کہ حضرت محمد ﷺ تو اللہ تعالیٰ کے رسولؐ تھے، میں ان کا ایک ادنیٰ امتی ہوں، میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ مجھ پر بنے بنائے اشعار نازل ہوتے ہیں تو اپنے ذاتی تجربہ کے پیشِ نظر میں اس بات سے کیسے انکار کر سکتا ہوں کہ نبی کریم ﷺ پر الفاظ سمیت وحی نازل نہیں ہوتی تھی۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ ہم نے قرآنِ کریم کو عربی میں نازل کیا۔ ایک معمولی آدمی بھی جانتا ہے کہ کسی کتاب کا عربی یا فارسی یا انگریزی ہونے کا یہ مطلب ہے کہ وہ کتاب اس زبان میں نازل کی گئی ہے کیونکہ عربی، فارسی اور انگریزی زبان کی صفات ہیں، خیال اور مفہوم کی نہیں۔ کسی آدمی کے بارے میں اگر یہ کہا جائے کہ وہ عربی بولتا ہے یا لکھتا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ عربی میں سوچتا ہے بلکہ اس کا مطلب عربی زبان ہوتا ہے کہ اس کے بولنے اور لکھنے کی زبان عربی ہے۔ قرآنِ کریم کو اللہ تعالیٰ نے عربی میں نازل کیا ہے اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اسے عربی زبان میں نازل کیا گیا ہے اور اس کے الفاظ عربی ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور کلام میں نظم و معنی دونوں شامل ہوتے ہیں اور اس کو عربی زبان میں اس لئے نازل کیا گیا ہے تاکہ عرب کے لوگو! تم اسے سمجھ سکو۔

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ ۖ وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ ۝

(ہم آپ کو ایک بہترین سرگزشت سناتے ہیں، اس قرآن کی بدولت جو ہم نے آپ کی طرف وحی کیا ہے۔ اس سے پہلے بیشک آپ اس سے ناآشنا تھے۔) (سورۃ یوسف: ۳)

اَحْسَنَ الْقَصَصِ کا مفہوم

پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں اَحْسَنَ الْقَصَصِ میں دو صورتوں کا احتمال ہے۔ ایک یہ کہ اَلْقَصَصِ . قصّ سے مصدر ہے اس کا معنی ہے کسی چیز کا تتبع کرنا ہے، یعنی پیچھا کرنا۔ قرآنِ کریم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کا قول نقل کیا گیا ہے کہ انہوں نے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایک تابوت میں رکھ کر دریائے نیل میں بہا دیا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بہن سے کہا وقالت لاخته قصيه کہ اس تابوت کے پیچھے پیچھے جاؤ، دیکھو یہ کدھر جاتا ہے۔ قصہ بیان کرنے والا بھی چونکہ ایک ترتیب سے بیان کرتا ہے اس لئے اس کو قاصّ کہتے ہیں۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ قصص اسم ہے جو قصہ اور سرگزشت کا ہم معنی ہے۔ پہلی صورت میں اَحْسَنَ الْقَصَصِ کا معنی ہوگا کہ ہم تمہیں بہترین پیرائے میں قصہ سناتے ہیں۔ اور دوسری صورت میں معنی ہوگا، ہم تمہیں بہترین قصہ سناتے ہیں۔ رہی یہ بات کہ اس قصے کو بہترین کیوں قرار دیا گیا؟ جو شخص بھی اس سورت کو غور سے پڑھے گا، اس کے سامنے اس کا اَحْسَنَ الْقَصَصِ ہونا خود بخود کھلتا چلا جائے گا۔ اس کے احسن القصص ہونے کی دو جہتیں ہیں۔ ایک جہت تو ہے اس واقعہ کے اجزاء کے اندر اور دوسری جہت ہے اس کے مقاصد کے اندر۔ جہاں تک اس کے مقاصد کا تعلق ہے وہ اگرچہ متعدد اور متنوع ہیں لیکن ان میں ایک تو بہت واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت جب کسی کام کا فیصلہ کر لیتی ہے تو پھر اس کے اسباب خود بخود اس طرح فراہم ہوتے

Marfat.com

ہیں کہ دیکھنے والی نگاہ جس واقعہ کو اس کا مخالف سمجھتی ہے اسی سے مشیت کی موافقت پیدا ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ مثلاً حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اپنے عزیز اور باکمال بھائی کو راستے سے ہٹانے بلکہ نیست و نابود کرنے کیلئے کنویں میں پھینکا تا کہ وہ وہاں بھوکا پیاسا مر جائے اور یا کوئی قافلہ اسے نکال کر لے جائے اور غلام بنا کر بیچ ڈالے۔ دیکھنے والی نگاہ بھی سمجھتی تھی کہ برادرانِ یوسف اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں گے، لیکن ان کا یہ مجرمانہ فعل اللہ تعالیٰ کی مشیت یعنی یوسف علیہ السلام کی کامیابیوں کا پہلا زینہ ثابت ہوا۔ وہ اگر آپ کو کنویں میں نہ پھینکتے تو ظاہر ہے کہ آپ کبھی بھی مصر جانے کا ارادہ نہ کرتے۔ اسی طرح زلیخا نے انتقام کی آگ بجھانے کیلئے آپ کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے بھیجا اور اس طرح نعوذ باللہ آپ کی ذلت کا سامان کیا، لیکن وہی جیل آپ کیلئے تختِ مصر کا راستہ بن گئی۔ آپ بلندیوں کے زینے چڑھتے ہوئے مصر کی حکومت پر فائز ہو گئے۔

اس سے بتانا مقصود یہ ہے کہ مشرکینِ مکہ کو معلوم ہونا چاہئے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی مشیت اور اس کی قدرت حضرت یوسف علیہ السلام کو بے سروسامانی میں تختِ مصر کا مالک بنا سکتی ہے تو نبی کریم ﷺ تو آخری نبی ہیں جن کے بعد کسی اور کو دنیا کی ہدایت کیلئے آنا نہیں۔ آپؐ کی زندگی میں اور آپؐ کی وساطت سے ایک کامیاب اسلامی انقلاب آپؐ کی بعثت کا منطقی نتیجہ ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کی مشیت اس کیلئے اسی طرح اسباب فراہم کرے گی جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام کیلئے کیئے گئے۔ تم ان کے قتل کے منصوبے باندھتے رہو، ان کا ملک میں رہنا مشکل کر دو، ان کیلئے اور بھی جو مشکلات پیدا کر سکتے ہو، کرو۔ آپؐ کو اللہ تعالیٰ ایسا عروج اور ایسی کامرانی عطا فرمائے گا جو اس سے پہلے کبھی کسی کو نصیب نہ ہو سکی۔

دوسری جہت اس واقعہ کے اجزاء کے اندر ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا لڑکپن میں آزمائشوں میں ڈالا جانا اور پھر انہی آزمائشوں کا کامرانیوں کے ذرائع میں تبدیل ہو جانا، مصر میں ایک اچھا ٹھکانا دستیاب ہونا، پھر وہیں خوشیوں کے مرکز سے غموں کا پھوٹنا اور جیل تک پہنچ جانا، پھر آپؑ کے جیل کے ساتھیوں کا رہا ہو جانا اور آپ کی قید کا دراز ہو جانا۔ ان قدم قدم بدلتے ہوئے حالات میں سے آپ کی پختہ سیرت و کردار کا پیدا ہونا اور آپؑ کے کمالات کی شہرت کا پھیلنا، نہ جیل کی اذیتوں کا آپؑ کو کمزور کرنا اور نہ حسن کی فرمائشوں کا آپؑ کو بدراہ کرنا، اسی طرح کے کئی اور واقعات اور اس میں حیران کن تبدیلیاں اس واقعہ کو اَحۡسَنَ الۡقَصَصِ ثابت کرنے کیلئے کافی ہیں۔ اس میں جہاں آپؐ کی نبوت کے دلائل ہیں وہیں قریشِ مکہ کیلئے بھی عبرت کا سامان ہے۔

اس آیت کے آخر میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے کوئی شخص بھی اس طرح درخواست نہیں کر سکتا کہ ہمیں فلاں بات کا جواب دے دیا جائے یا فلاں بات کی حقیقت کھول دی جائے۔ یہ حق پروردگار نے صرف اپنے رسولوں کو دیا ہے۔ وہ اپنی تبلیغی ضرورتوں کے حوالے سے یا کسی اور پہلو سے اگر کسی بات میں اللہ تعالیٰ کی رہنمائی کی ضرورت محسوس کرتے ہیں تو وہ پروردگار سے براہِ راست درخواست کرتے ہیں تو کسی رسول کی بعثت کے بعد چونکہ وحیِ الٰہی کا نزول جاری ہوتا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ اس درخواست کا جواب بھی عنایت فرماتے ہیں۔ چنانچہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ مشرکینِ مکہ نے آپؐ سے حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں جو سوال کیا اس کا جواب اس لئے انہیں دیا جا رہا ہے کہ اب قرآن نازل ہو رہا ہے اور انسانوں میں اللہ تعالیٰ کا ایک رسول موجود ہے اور اس پر وحی اتر رہی ہے، اس کی برکت سے یہ احسن القصص آپؐ کو سنایا جا رہا ہے، ورنہ اس احسن القصص کے بارے میں آپؐ بھی کچھ نہیں جانتے تھے۔ آپؐ کی زبان پر اس احسن القصص کی تفصیلات کا وحیِ الٰہی کے ذریعے جاری ہو جانا یہ آپؐ کی نبوت کی ایسی دلیل ہے جس سے کوئی بدترین دشمن ہی انکار کر سکتا ہے۔

اِذۡ قَالَ یُوۡسُفُ لِاَبِیۡهِ یٰۤاَبَتِ اِنِّیۡ رَاَیۡتُ اَحَدَ عَشَرَ کَوۡکَبًا وَّالشَّمۡسَ وَالۡقَمَرَ رَاَیۡتُهُمۡ لِیۡ سٰجِدِیۡنَ ۝۴

(یاد کرو جب یوسف (علیہ السلام) نے اپنے والد سے کہا کہ ابا جان، میں نے خواب میں گیارہ ستارے اور چاند اور سورج دیکھے ہیں، میں نے انہیں دیکھا ہے کہ وہ میرے آگے سربسجود ہیں۔) (سورۃ یوسف:۴)

حضرت یوسفؑ کا خواب

پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں اس اَحۡسَنَ الۡقَصَصِ کی تمہید بیان کی جا رہی ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا ابھی بچپن گزر رہا تھا لیکن ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات کے مصداق بچپن ہی میں آپؑ کے عادات و خصائل نہایت پاکیزہ تھے۔ شکل و صورت میں تو اللہ تعالیٰ نے آپؑ کو غیر معمولی حسن سے

Marfat.com

نوازا تھا جو دیکھتا وہ پیار کرتا۔ لیکن آپ کی عادتیں بھی دوسرے بچوں سے مختلف اور آنے والے باکمال مستقبل کی غماز تھیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام چونکہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر تھے، اس لئے ان سے زیادہ گہری نظر اور کس کی ہو سکتی تھی، اس لئے وہ روز بروز محسوس کرنے لگے تھے کہ میرے بیٹوں میں یوسفؑ وہ بیٹے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ اس کے آباؤ اجداد کی وراثتِ نبوت کو آگے بڑھائے گا۔ اس لئے آپؑ کو سب سے زیادہ ان سے پیار تھا اور ان پر زیادہ نظر تھی کہ اچانک اس ہونہار بیٹے نے ایک دن اپنے ابا جان سے کہا کہ میں نے خواب میں گیارہ ستاروں، سورج اور چاند کو دیکھا ہے، لیکن کچھ دیر رکنے کے بعد پھر کہا کہ میں نے انہیں دیکھا ہے کہ وہ مجھے سجدہ کر رہے ہیں۔ ایک تو خواب بجائے خود چونکا دینے والا ہے اور پھر اس کے سنانے کا انداز اس سے بھی زیادہ حیران کن ہے۔ آپؑ ابھی بچے ہیں اور بچوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ جب کوئی حیران کن بات دیکھتے ہیں تو اسے اپنے ہمجولیوں کو سب سے پہلے سناتے ہیں اور اگر اس بات میں ان کے نفس کو غذا ملتی ہو یعنی ان کی بڑائی ثابت ہوتی ہو تو پھر تو وہ ہر جاننے والے سے کہتے پھرتے ہیں اور اپنی بڑائی کا اظہار بھی کرتے ہیں، لیکن حضرت یوسف علیہ السلام نے کسی اور کو خواب سنانے کی بجائے نہایت خاموشی سے اپنے ابا جان کو یہ خواب سنایا جبکہ بچے عام طور پر ایسی باتیں اپنے باپوں سے چھپاتے ہیں۔ اور پھر اپنے ابا جان سے بھی کہتے ہوئے عجیب انداز اختیار کیا کہ آدھی بات کہہ کے رک گئے۔ یعنی یہ کہہ کر کہ میں نے صرف گیارہ ستارے اور سورج اور چاند دیکھے ہیں تو خاموش ہو گئے۔ گویا آپؑ کو جھجک نے پکڑ لیا اور طبعی شرافت و نجابت بولنے سے مانع ہو گئیں۔ یقیناً یہ سوچنے لگے ہوں گے کہ اس میں ایک تعلّی کا پہلو ہے۔ والد صاحب کہیں یہ گمان نہ کریں کہ میں کسی پندار میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ اس لئے کچھ دیر کیلئے رکے، لیکن پھر جھجکتے ہوئے بات کو یہ سوچ کر پورا کیا کہ بات کا مکمل کرنا بھی بہر حال ضروری ہے، ورنہ اسے جھوٹ سمجھا جائے گا۔

قَالَ يٰبُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُءْيَاكَ عَلٰٓى اِخْوَتِكَ فَيَكِيْدُوْا لَكَ كَيْدًا ۭ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝

(آپ نے فرمایا کہ اے میرے بیٹے تم اپنا خواب اپنے بھائیوں سے بیان نہ کرنا ورنہ وہ تمہارے خلاف سازش کریں گے۔ بیشک شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔) (سورۃ یوسف:۵)

حضرت یعقوب علیہ السلام کی بیٹے کو ہدایت

حضرت یعقوب علیہ السلام چونکہ اللہ تعالیٰ کے نبی تھے اس لئے وہ اس خواب کی تعبیر یقیناً سمجھتے ہوں گے، لیکن آپؑ نے اس کی تعبیر کی بجائے وہ بات کہی جس کا کہنا نہایت ضروری تھا۔ آپ جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام کی پیشانی سے ابھرتے ہوئے نور کو پہچانتے تھے اور آپ کی عادات و خصائل میں پیغمبرانہ جھلک دیکھ رہے تھے اسی طرح آپ اپنے دس بیٹوں کو بھی اچھی طرح جانتے پہچانتے تھے۔ وہ اگرچہ ایک پیغمبر کے بیٹے تھے اور حضرت یوسف علیہ السلام کے سوتیلے بھائی تھے لیکن ان کے اندر اپنے عزیز باپ کی بہت کم خوبیاں جگہ بنا سکی تھیں۔ وہ عام نوجوانوں جیسے جوان تھے اور ان کی سوچ بھی عام انسانوں جیسی تھی۔ وہ معمولی باتوں سے برے اثرات لینے والے لوگوں میں سے تھے۔ اس لئے آپؑ نے سب سے پہلے اس بات پر تنبیہ کرنا ضروری سمجھا کہ بیٹا اپنا یہ خواب، اپنے بھائیوں کے سامنے مت بیان کرنا۔ خواب میں چونکہ آنے والے عظیم مستقبل کی جھلک دکھائی دیتی ہے، وہ اس کی وجہ سے حسد میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔ نااہل لوگوں کی یہ خصلت ہوتی ہے کہ وہ اپنی کمزوریوں کو دور کرنے کی بجائے ہمیشہ اہل فضائل سے حسد کرنا شروع کر دیتے ہیں اور اپنی حماقت سے یہ سمجھتے ہیں کہ شاید ہم ان کی وجہ سے ان جیسے نہیں ہو سکے۔ پھر وہ سازشوں کا راستہ اختیار کرتے ہیں کیونکہ شیطان ان کو اسی راستے پر چلا کر انہیں خیر اور بھلائی کے راستے سے اور دور لے جاتا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں کے درمیان حسد ہی نے یہ نتیجہ دکھایا تھا کہ ایک بھائی نے دوسرے کو قتل کر دیا اور وہ تاریخ کا بہت بڑا سبق بن گیا۔

وَكَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ وَيُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَعَلٰٓى اٰلِ يَعْقُوْبَ كَمَآ اَتَمَّهَا عَلٰٓى اَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ ۭ اِنَّ رَبَّكَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝

(اور اسی طرح تمہارا رب تمہیں برگزیدہ کرے گا اور تمہیں باتوں کی حقیقتوں تک پہنچنا سکھائے گا۔ اور تم پر اور آلِ یعقوب پر اپنی نعمت تمام کرے گا جس طرح اس نے اس سے پہلے تمہارے اجداد ابراہیم اور اسحاق پر اپنی نعمت تمام کی۔ بیشک تمہارا پروردگار سب کچھ جاننے والا، بہت دانا ہے۔) (سورۃ یوسف:۶)

Marfat.com

خواب کی تعبیر

حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے صاجزادے سے خواب سن کر جان گئے کہ یہ سچا خواب ہے اور رویائے صادقہ نبوت کی تمہید ہوتے ہیں۔ ہمیشہ اللہ تعالیٰ پیغمبروںؑ کو نبوت دینے سے پہلے سچے خواب دکھاتا ہے۔ اس طرح سے انہیں آہستہ آہستہ وحی الٰہی سے مانوس کیا جاتا ہے۔ آنحضرت ﷺ بھی فرماتے ہیں کہ حضرت جبرائیل امینؑ کے میرے پاس آنے سے پہلے میں ایسے سچے خواب دیکھتا تھا کہ دن نکلتے ہی تعبیر سامنے آجاتی تھی۔ اس لئے حضرت یعقوب نے فرمایا کہ بیٹا جس طرح اللہ تعالیٰ نے تمہیں یہ سچا خواب دکھایا ہے اسی طرح وہ تمہیں اپنی خصوصی نعمت یعنی نبوت سے نوازے گا۔ اور یہ نعمت جس طرح آپؑ پر ہوگی اسی طرح آلِ یعقوب پر بھی ہوگی، یعنی اس کا فیضان سب تک پہنچے گا اور ممکن ہے یہ سلسلۂ نبوت خاندان میں دیر تک چلے گا اور یہ وہی اللہ تعالیٰ کا انعام اور احسان ہے جو اس سے پہلے تمہارے اجداد حضرت ابراہیم اور حضرت اسحاق علیہما السلام پر ہو چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں نبوت اور رسالت سے نوازا اور مزید یہ بھی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں بات کی تہہ تک اترنے کا سلیقہ بھی سکھائے گا۔ یعنی تمہیں تعبیر کا ملکہ بھی عطا فرمائے گا اور اب جو تم نے خواب دیکھا ہے تم خود جان لوگے کہ اس کی اصل تعبیر کیا ہے۔ چنانچہ قرآنِ کریم بیان کرتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حالات کی کئی گردشوں کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام کو مصر کا اقتدار عطا فرمایا اور اس کے چند سالوں کے بعد انہوں نے اپنے والدین، اپنے بھائیوں اور اپنے خاندان کو مصر میں بلالیا۔ اور انہوں نے اپنے والدین اور بھائیوں کو تخت پر بلایا اور وہ خود اپنی مسند پر فروکش تھے۔ والدین کے تخت پر پہنچنے کے وقت یقیناً وہ تعظیم کیلئے اٹھے ہوں گے لیکن والدین بھی رسمِ دنیا کے مطابق تعظیمی طور پر حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے جھکے تو اس وقت حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا یٰٓاَبَتِ ھٰذَا تَاْوِیْلُ رُءْیَایَ مِنْ قَبْلُ اے اباجان یہ میرے اس خواب کی تاویل ہے جو میں نے پہلے دیکھا تھا۔

اللہ تعالیٰ انبیائے کرام کو جو ذہنی اور روحانی صلاحیتیں عطا فرماتا ہے ان میں صفائے قلب اور ذہنی بالیدگی غیر معمولی حد تک عطا فرمائی جاتی ہے اور یہی وہ صلاحیت ہے جس سے خوابوں کی تعبیر کا راستہ کھلتا ہے۔ اس لئے عمومی طور پر ہر پیغمبر تعبیر خواب کے وصف سے متصف ہوتا ہے، لیکن حضرت یوسف علیہ السلام کی یہ صلاحیت معلوم ہوتا ہے کہ اعجاز کی حد کو پہنچی ہوئی تھی۔ چنانچہ یہی وہ کمال ہے جس نے آپؑ کیلئے اقتدار کا راستہ صاف کیا۔ اس کے بعد واقعہ کی ابتداء ہو رہی ہے اور اس سے پہلے پروردگار اپنی دو صفات کی طرف اشارہ فرما رہے ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ علیم ہے۔ دنیا کے سامنے درجہ بدرجہ اور رفتہ رفتہ عقدے کھلتے اور نئے نئے حالات پیش آتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کے علم میں آغاز سے انجام تک پہلے ہی سب کچھ ہوتا ہے اور دوسری یہ بات کہ جس ترتیب اور حکمت سے یہ واقعات وقوع پذیر ہوتے ہیں اس میں اللہ تعالیٰ کی جابجا حکمت کا اظہار ہوتا ہے تاکہ انسان اس پر غور کریں اور دین کے اسرار کو سمجھیں۔

ہم نے حضرت یوسف علیہ السلام کا خواب اور ان کے والد ماجد کا ردِ عمل مندرجہ بالا آیات میں پڑھا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو اپنے ہونہار بیٹے کے روشن مستقبل کی اس خواب کے ذریعے ایک جھلک نظر آئی اور آپ نے اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ اللہ تعالیٰ حضرت یوسف علیہ السلام کو نبوت عطا فرمائے گا اور ان کے واسطے سے ان کے آباؤ اجداد پر نعمتیں تمام کرے گا۔ ساتھ ہی احتیاطاً یہ بھی فرمایا کہ اپنے بھائیوں کو یہ خواب نہ سنانا ورنہ وہ حسد کے مارے تمہارے خلاف سازشیں کریں گے۔ جو شخص بھی حضرت یعقوب علیہ السلام اور حضرت یوسف علیہ السلام کے حالات پڑھتا ہے اور ان کے پاکیزہ کردار سے واقف ہے وہ قرآنِ کریم کے اس بیان کو انتہائی فطری اور واقعات کے مطابق بلکہ واقعات کا عکاس خیال کرتا ہے لیکن عجیب بات ہے کہ بائبل اور تلمود کا بیان قرآنِ کریم کے اس بیان سے بالکل مختلف ہے۔ ان کا بیان یہ ہے کہ حضرت یعقوب نے خواب سن کر بیٹے کو خوب ڈانٹا اور کہا کہ اچھا اب تو یہ خواب دیکھنے لگا ہے کہ میں اور تیری ماں اور تیرے سب بھائی تجھے سجدہ کریں گے۔ قارئین کرام دونوں حوالوں کے سامنے رکھیں اور پھر فیصلہ کریں کہ حضرت یعقوبؑ کی پیغمبرانہ سیرت سے قرآنِ کریم کا بیان زیادہ مناسبت رکھتا ہے یا بائبل اور تلمود کا؟

Marfat.com

لَقَدْ كَانَ فِيْ يُوْسُفَ وَاِخْوَتِهٖۤ اٰيٰتٌ لِّلسَّآئِلِيْنَ ۝٧ اِذْ قَالُوْا
لَيُوْسُفُ وَاَخُوْهُ اَحَبُّ اِلٰۤى اَبِيْنَا مِنَّا وَنَحْنُ عُصْبَةٌ ؕ اِنَّ اَبَانَا
لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنِ ۚ ۝٨ اقْتُلُوْا يُوْسُفَ اَوِ اطْرَحُوْهُ اَرْضًا يَّخْلُ لَكُمْ
وَجْهُ اَبِيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ قَوْمًا صٰلِحِيْنَ ۝٩ قَالَ قَآئِلٌ
مِّنْهُمْ لَا تَقْتُلُوْا يُوْسُفَ وَاَلْقُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ يَلْتَقِطْهُ بَعْضُ
السَّيَّارَةِ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ۝١٠ قَالُوْا يٰۤاَبَانَا مَا لَكَ لَا تَاْمَنَّا عَلٰى
يُوْسُفَ وَاِنَّا لَهٗ لَنٰصِحُوْنَ ۝١١ اَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا يَّرْتَعْ وَيَلْعَبْ
وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝١٢ قَالَ اِنِّيْ لَيَحْزُنُنِيْۤ اَنْ تَذْهَبُوْا بِهٖ وَاَخَافُ
اَنْ يَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ وَاَنْتُمْ عَنْهُ غٰفِلُوْنَ ۝١٣ قَالُوْا لَئِنْ اَكَلَهُ
الذِّئْبُ وَنَحْنُ عُصْبَةٌ اِنَّاۤ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ۝١٤ فَلَمَّا ذَهَبُوْا بِهٖ وَ
اَجْمَعُوْۤا اَنْ يَّجْعَلُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ ۚ وَاَوْحَيْنَاۤ اِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ
بِاَمْرِهِمْ هٰذَا وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝١٥ وَجَآءُوْۤ اَبَاهُمْ عِشَآءً يَّبْكُوْنَ ؕ ۝١٦
قَالُوْا يٰۤاَبَانَاۤ اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَتَرَكْنَا يُوْسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا
فَاَكَلَهُ الذِّئْبُ ۚ وَمَاۤ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا صٰدِقِيْنَ ۝١٧
وَجَآءُوْ عَلٰى قَمِيْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ ؕ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ

Marfat.com

أَنفُسُكُمْ أَمْرًا ۖ فَصَبْرٌ جَمِيلٌ ۖ وَاللَّهُ الْمُسْتَعَانُ عَلَىٰ مَا تَصِفُونَ ﴿١٨﴾
وَجَاءَتْ سَيَّارَةٌ فَأَرْسَلُوا وَارِدَهُمْ فَأَدْلَىٰ دَلْوَهُ ۖ قَالَ يَا بُشْرَىٰ
هَٰذَا غُلَامٌ ۚ وَأَسَرُّوهُ بِضَاعَةً ۚ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِمَا يَعْمَلُونَ ﴿١٩﴾ وَ
شَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُودَةٍ وَكَانُوا فِيهِ مِنَ الزَّاهِدِينَ ﴿٢٠﴾

رکوع: ۲۔ (بیشک یوسفؑ اور اس کے بھائیوں کے قصہ میں پوچھنے والوں کیلئے بہت سی نشانیاں ہیں۔اس وقت کو یاد کرو جب برادرانِ یوسفؑ نے کہا کہ یوسفؑ اور اس کا بھائی ہمارے باپ کو ہم سے زیادہ پیارے ہیں حالانکہ ہم ایک جتھہ ہیں۔بیشک ہمارا باپ ایک کھلی ہوئی غلطی میں مبتلا ہے۔یوسفؑ کو قتل کر دو یا اسے کسی علاقے میں دور پھینک دو تو تمہارے باپ کی ساری توجہ تمہاری ہی طرف ہو جائے گی اور اس کے بعد نیک قوم بن جانا۔ان میں سے ایک کہنے والے نے کہا کہ یوسفؑ کو قتل نہ کرو اور اس کو کسی اندھے کنویں میں پھینک دو۔کوئی راہ چلتا قافلہ اس کو نکال لے جائے گا۔اگر تم کچھ کرنے والے ہو۔انہوں نے کہا اے ہمارے باپ، کیا بات ہے کہ یوسفؑ کے معاملے میں آپ ہم پر اعتماد نہیں کرتے حالانکہ ہم اس کے بڑے ہی خیر خواہ ہیں۔کل اس کو ہمارے ساتھ بھیجئے، ذرا چرے چگے اور کھیلے کودے اور ہم اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہوں گے۔حضرت یعقوب علیہ السلام نے کہا کہ مجھے غم میں ڈال دیتی ہے یہ چیز کہ تم اسے لے جاؤ اور ڈرتا ہوں کہ اس کو بھیڑیا کھا جائے جبکہ تم اس سے غافل ہو۔انہوں نے کہا کہ اگر اس کو بھیڑیا کھا گیا جبکہ ہم ایک جتھہ ہیں تب تو ہم اس صورت میں نہایت ہی نامراد ثابت ہوں گے۔ (پھر جب (بڑے اصرار سے) وہ یوسفؑ کو لے گئے اور سب نے یہ طے کر لیا کہ اسے کسی گہرے کنویں کی تاریک تہہ میں ڈال دیں اور (عین اس وقت) ہم نے یوسفؑ کی طرف وحی کی کہ تم ان کو ان کی کارستانی سے آگاہ کرو گے جبکہ ان کو کچھ خیال بھی نہ ہوگا۔اور وہ آئے اپنے باپ کے پاس کچھ رات گئے، روتے ہوئے۔بولے کہ اے ہمارے باپ! ہم ایک دوسرے سے دوڑ میں مقابلہ کرتے ہوئے دور نکل گئے اور یوسفؑ کو ہم نے اپنے سامان کے پاس چھوڑا۔پس اسے بھیڑیا کھا گیا اور آپ نہیں مانیں گے ہماری بات، اگرچہ ہم سچے ہیں۔وہ اس کے کرتے پر جھوٹ موٹ کا خون بھی لگا لائے۔حضرت یعقوب نے فرمایا کہ (ایسا نہیں) بلکہ یہ تو تمہارے جی کی گھڑی ہوئی بات ہے، میں صبر جمیل کروں گا اور جو کچھ تم بیان کرتے ہو اس پر اللہ تعالیٰ سے مدد مانگوں گا۔ادھر ایک قافلہ آیا تو اہلِ قافلہ نے پانی لانے کیلئے اپنے سقے کو بھیجا۔اس نے ڈول ڈالا تو پکار اٹھا، خوشخبری ہو یہ تو ایک لڑکا ہے اور انہوں نے اسے ایک پونجی سمجھ کر چھپا دیا اور اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا ہے جو کچھ وہ کر رہے تھے۔اور انہوں نے اس کو ایک حقیر قیمت کے بدلے میں بیچ ڈالا، چند دراہم کے عوض۔اور وہ اس کے معاملے میں بالکل بے پرواہ تھے۔)

لَقَدْ كَانَ فِي يُوسُفَ وَإِخْوَتِهِ آيَاتٌ لِّلسَّائِلِينَ ﴿٧﴾
(بیشک یوسف اور اس کے بھائیوں کے قصہ میں پوچھنے والوں کیلئے بہت سی نشانیاں ہیں۔) (سورۃ یوسف:۷)

Marfat.com

ایک تنبیہ

یہ آیت آئندہ آیت سے شروع ہونے والی سرگزشت کیلئے تمہید ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں مشرکین کا سوال بظاہر بنی اسرائیل کی تاریخ سے متعلق ہے لیکن قرآنِ کریم انہیں اس واقعہ کے آئینہ میں اس وقت حق و باطل کے سلسلے میں برپا ہونے والی کشمکش کے حوالے سے جو سوالات ذہنوں میں پیدا ہو رہے تھے ان کی طرف توجہ دلا رہا ہے اور ان کو یہ باور کرا رہا ہے کہ تم اگر غور سے ان واقعات کو دیکھو تو تمہیں ان سوالوں کا جواب مل جائے گا جو تمہارے ذہنوں میں کشمکش برپا کئے ہوئے ہیں۔ تم دیکھ رہے ہیں نبی کریم ﷺ کی بعثت سے سرزمینِ مکہ میں ایک عجیب کشمکش پیدا ہوگئی ہے جس میں وقت کے ساتھ ساتھ شدت پیدا ہوتی جارہی ہے۔ داعی الی الحق کے سامنے دنیا بھر میں تنی ہوئی کفر کی سیاہ چادر کو اتار کر حق کے نور سے اجالا کرنا پیشِ نظر ہے اور حال یہ ہے کہ مکہ کے گلی کوچے اس کی دعوت کیلئے بند ہو چکے ہیں۔ قریش آپ کے قتل کے منصوبے باندھ رہے ہیں اور وہ اسلام کو کسی طور برداشت کرنے کیلئے تیار نہیں۔ ایسی صورتحال میں سوچنے والے ذہن سوچتے ہیں کہ اسلام کا اور اس کے داعی کا مستقبل کیا ہے؟ وہ کب تک اس صورتحال کا مقابلہ کرے گا؟ اور کس طرح اس کیلئے کامیابی کے راستے کھلیں گے؟ قرآنِ کریم توجہ دلا رہا ہے کہ تمہارے ان سوالوں کا جواب اس سرگزشت میں موجود ہے، اس لئے اسے غور سے سنو۔

اِذْقَالُوْا لَيُوْسُفُ وَاَخُوْهُ اَحَبُّ اِلٰٓى اَبِيْنَا مِنَّا وَنَحْنُ عُصْبَةٌ ؕ اِنَّ اَبَانَا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنِ ۨ ۝۸

(اس وقت کو یاد کرو جب برادرانِ یوسف نے کہا کہ یوسفؑ اور اس کا بھائی ہمارے باپ کو ہم سے زیادہ پیارے ہیں حالانکہ ہم ایک جتھہ ہیں۔ بیشک ہمارا باپ ایک کھلی ہوئی غلطی میں مبتلا ہے۔) (سورۃ یوسف:۸)

عُصْبَةٌ کے معنی جماعت، گروہ اور جتھہ کے ہیں۔ خاص طور پر وہ گروہ جن کے درمیان خون کا اشتراک پایا جاتا ہو۔

برادرانِ یوسفؑ کا حسد

حضرت یوسفؑ کے بھائی سے مراد ان کے چھوٹے حقیقی بھائی بن یمین ہیں جو ان سے کئی سال چھوٹے تھے۔ ان کی پیدائش کے وقت ان کی والدہ کا انتقال ہوگیا اور باقی دس بھائی مختلف ماؤں سے تھے، لیکن یہ دونوں بھائی ایک ماں سے اور سب سے چھوٹے اور ماں کی طرف سے یتیم تھے۔ اس کی وجہ سے باپ کی ان دونوں پر زیادہ نظر شفقت رہتی تھی اور حضرت یوسف علیہ السلام پر اگرچہ وہ بن یمین سے کئی سال بڑے تھے زیادہ توجہ ہونے کی وجہ ان کی پیغمبرانہ صفات تھیں اور ان کے باقی دس بھائی ایک تو عمر کی اس حد کو پہنچ چکے تھے جب وہ اپنے معاملات کے فیصلے خود کرنے کی پوزیشن میں تھے اور بھرپور جوان ہونے کی وجہ سے اپنے اوپر اعتماد بھی رکھتے تھے لیکن یہ بات ان کیلئے بہرحال محسوس کرنے والی تھی کہ ہمارے والد کی وہ توجہ ہم پر نہیں ہے جو ہمارے چھوٹے بھائیوں پر ہے حالانکہ ذرا غور کرنے سے وہ خود بھی اس بات کو سمجھ سکتے تھے کہ ان کو ہمارے باپ کی توجہ کی جس قدر ضرورت ہے ہمیں نہیں اور مزید یہ بات بھی کہ جہاں تک حضرت یوسفؑ کا معاملہ ہے وہ اپنی من موہنی شکل وصورت کے ساتھ ساتھ انتہائی دل میں اتر جانے والی سیرت و کردار کا حامل ہے۔ اور اس کی پیاری پیاری عادتیں باپ کا دل جیتنے کیلئے کافی ہیں اور اس کے برعکس ہم جیسی کچھ کمزوریوں کا شکار ہیں وہ ہم بھی جانتے ہیں۔ لیکن وہ ان باتوں کو سمجھنے کی بجائے ان کے پیشِ نظر ایک ہی بات تھی جو بدویانہ قبائلی زندگی کی ایک حقیقت تھی۔ قبائلی زندگی میں جہاں کوئی ملکی قانون نہیں ہوتا اور صرف طاقت اور قوت اپنا لوہا منواتی اور اپنی عزت کرواتی ہے وہاں طاقت کا سرچشمہ بڑی تعداد میں جوان اولاد کا ہونا ہے اور ہم ایک دو نہیں، اکٹھے دس کبرو جوان ہیں اور ہماری وجہ سے ہمارے باپ کو قبائل میں ایک قوت حاصل ہے۔ کسی کو ہماری طرف میلی آنکھ سے دیکھنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ اس لحاظ سے ہونا تو یہ چاہئے کہ ہمارے والد کو ہمارا زیادہ لحاظ ہو اور شفقت کی نگاہیں ہم پر مرتکز رہیں۔ لیکن معاملہ اس کے برعکس ہے کہ شفقت انہیں حاصل ہے جو ان کی طاقت نہیں بلکہ کمزوری کا باعث ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے والد بڑھاپے کی وجہ سے سٹھیا گئے ہیں اور وہ صحیح فیصلہ کرنے سے محروم ہوگئے ہیں۔

Marfat.com

اُقْتُلُوْا یُوْسُفَ اَوِ اطْرَحُوْہُ اَرْضًا یَّخْلُ لَکُمْ وَجْہُ اَبِیْکُمْ وَتَکُوْنُوْا مِنْۢ بَعْدِہٖ قَوْمًا صٰلِحِیْنَ ۝

(یوسفؑ کو قتل کردو یا اسے کسی علاقے میں دور پھینک دو تو تمہارے باپ کی ساری توجہ تمہاری ہی طرف ہو جائے گی اور اس کے بعد نیک قوم بن جانا۔) (سورۃ یوسف:۹)

بھائیوں کی مشاورت

باپ کی توجہ سے محرومی کا علاج اس کے سوا اور کوئی نہیں کہ تم یوسفؑ کو قتل کر دو اور یا اسے کسی ایسی سرزمین میں پھینک دو جہاں سے وہ واپس نہ آسکے۔اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جب یوسفؑ نہ رہے گا جو ہمارے راستے کا کانٹا ہے تو پھر ہمارے والد کی ساری توجہ ہماری طرف ہوگی۔جب وہ دیکھیں گے کہ قدرت نے ایک بیٹا واپس لے لیا ہے، وہ اگرچہ سب سے قیمتی ہیرا تھا لیکن اب اس کے نہ رہنے کے بعد مجھے ان سے دل لگانا چاہئے جو اس جیسے نہ سہی لیکن ہی تو میرے بیٹے اور ساتھ ہیں بیٹوں نے یہ بھی کہا کہ اس کے بعد تم اپنے حالات کو درست کر لینا۔پہلے اگر گھر سے غائب رہتے ہو یا باپ کی خدمت میں کمی کرتے ہو تو اب باپ کے سامنے رہنے کی کوشش کرنا اور زیادہ سے زیادہ خدمت بجالانا۔اور وہ تمام کام کرنا جن سے یہ سمجھ لیا جائے کہ تم نے بھی اپنے بھائی کے صدمے سے سبق سیکھا ہے اور اب پہلے سے نیک ہو گئے ہو۔

قَالَ قَآئِلٌ مِّنْھُمْ لَا تَقْتُلُوْا یُوْسُفَ وَاَلْقُوْہُ فِیْ غَیٰبَتِ الْجُبِّ یَلْتَقِطْہُ بَعْضُ السَّیَّارَۃِ اِنْ کُنْتُمْ فٰعِلِیْنَ ۝

(ان میں سے ایک کہنے والے نے کہا کہ یوسفؑ کو قتل نہ کرو اور اس کو کسی اندھے کنویں میں پھینک دو۔کوئی راہ چلتا قافلہ اس کو نکال لے جائے گا۔اگر تم کچھ کرنے والے ہو۔) (سورۃ یوسف:۱۰)

بھائیوں کا فیصلہ

ان بھائیوں میں سے کسی ایک نے کہا جو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کیلئے نرم گوشہ رکھتا تھا۔بعض مفسرین نے اس کا نام شمعون لکھا ہے کہ اگر تم یوسفؑ کے بارے میں کچھ کرنے کا فیصلہ کر ہی چکے ہو اور تمہیں باپ کی بے التفاتی واقعی نا قابل برداشت معلوم ہوتی ہے تو پھر یوسفؑ کو قتل کرنے کی بجائے اسے کسی گہرے تاریک کنویں میں پھینک دو۔ غَیٰبَۃٌ کنویں کی تہہ کو اور جُبٌّ کچے کنویں کو کہتے ہیں۔اسی طرح جُبٌّ اس کنویں کو بھی کہتے ہیں جو بہت گہرا ہو اور اس میں پانی زیادہ ہو۔

صحرائی راستوں میں جہاں سے قافلے گزرتے رہتے تھے اس طرح کے کنویں کھودے جاتے تھے جو عام حالات میں تو استعمال نہیں ہوتے تھے لیکن جب کوئی قافلہ گزرتا تو وہ پانی کی وجہ سے چند دن کیلئے وہاں رک جاتا۔اس طرح سے وہاں رونق ہو جاتی۔اور اگر کوئی قافلہ نہ گزرتا تو وہ ایک بے آباد اور سنسان جگہ شمار ہوتی۔جرائم پیشہ لوگ ایسے مواقع پر کسی کو ٹھکانے لگانا چاہتے تو ان کنوؤں سے کام لیتے۔کہنے والے کا منشا یہ تھا کہ تمہارا اصل مقصد تو صرف یہ ہے کہ تم کسی طرح یوسفؑ کو اپنے اور والد کے درمیان سے ہٹا دو۔اس کیلئے قتل کرنا کیا ضروری ہے، کسی کنویں میں پھینک دو۔یہاں سے قافلے گزرتے رہتے ہیں، تجارتی قافلے بھی اور خانہ بدوشوں کے بھی۔کوئی نہ کوئی قافلہ پانی لینے کیلئے رکے گا، پانی لینے کیلئے جب ڈول ڈالے گا تو اندر سے بچہ شور مچائے گا تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ نیچے تو کوئی انسان ہے تو وہ اسے نکال لیں گے، اور کہیں لے جا کر اسے غلام بنا کے بیچ ڈالیں گے۔کیونکہ اس زمانے میں بردہ فروشی تو عام ہوتی تھی۔اس طرح بچے کی جان بھی بچ جائے گی اور تمہارے پہلو کا کانٹا بھی نکل جائے گا۔معلوم ہوتا ہے کہ اسی مشورے پر اتفاق ہو گیا۔اگلی آیات میں اس کیلئے جو سکیم بنائی گئی اس کا ذکر ہے۔

Marfat.com

قَالُوْا یٰۤاَبَانَا مَالَکَ لَا تَاْمَنَّا عَلٰی یُوْسُفَ وَاِنَّا لَهٗ لَنٰصِحُوْنَ ﴿۱۱﴾ اَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا یَّرْتَعْ وَیَلْعَبْ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴿۱۲﴾
قَالَ اِنِّیْ لَیَحْزُنُنِیْۤ اَنْ تَذْهَبُوْا بِهٖ وَاَخَافُ اَنْ یَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ وَاَنْتُمْ عَنْهُ غٰفِلُوْنَ ﴿۱۳﴾ قَالُوْا لَئِنْ اَكَلَهُ الذِّئْبُ وَنَحْنُ
عُصْبَةٌ اِنَّاۤ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿۱۴﴾ (سورۃ یوسف : ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴)

(انہوں نے کہا اے ہمارے باپ، کیا بات ہے کہ یوسفؑ کے معاملے میں آپ ہم پر اعتماد نہیں کرتے حالانکہ ہم اس کے بڑے ہی خیر خواہ ہیں۔ کل اس کو ہمارے ساتھ بھیجئے، ذرا چرے چگے اور کھیلے کودے اور ہم اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہوں گے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے کہا کہ مجھے غم میں ڈال دیتی ہے یہ چیز کہ تم اسے لے جاؤ اور ڈرتا ہوں کہ اس کو بھیڑیا کھا جائے جبکہ تم اس سے غافل ہو۔ انہوں نے کہا کہ اگر اس کو بھیڑیا کھا گیا جبکہ ہم ایک جتھہ ہیں تب تو ہم اس صورت میں نہایت ہی نامراد ثابت ہوں گے۔)

باپ کو فریب

برادرانِ یوسفؑ اپنے تیار کردہ منصوبے کے مطابق اپنے والدِ گرامی کی خدمت میں حاضر ہوئے تو بات کہنے کا انداز ایسا اختیار کیا جس سے ان کی بدنیتی کی بھنک پڑنا بھی مشکل تھا۔ کہنے لگے کہ ابا جان بیٹوں کو ہمیشہ گھر میں تو نہیں رکھا جاتا، باہر گھومنے پھرنے سے ہی ہمت اور توانائی آتی ہے لیکن عجیب بات ہے کہ آپ یوسفؑ کو گھر میں بٹھائے رکھتے ہیں اور محض اس وجہ سے ہمارے ساتھ نہیں جانے دیتے کہ ہم خدانخواستہ اس کے دشمن ہیں۔ وہ ہمارا بھائی ہے، ہم اس کے دشمن کیسے ہو سکتے ہیں۔ نجانے آپؑ ہم پر اعتماد کیوں نہیں کرتے۔ ہم تو ہر لحاظ سے اس کے خیر خواہ ہیں۔ آپؑ اسے ہمارے ساتھ بھیجئے، ہم مل کے پکنک منائیں گے۔ کھیلیں گے، کودیں گے، کھائیں پئیں گے، رتع کا معنی تو ہوتا ہے چرنا چگنا، لیکن اس کا صحیح مفہوم پکنک کے لفظ ہی سے ادا ہوتا ہے اور قبائلی زندگی میں سیر و تفریح کا یہی سب سے اچھا ذریعہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ شعراء جاہلیت اکثر بڑے اہتمام سے اس کا ذکر کرتے ہیں۔ اور رہی یہ بات کہ آپ کو یوسفؑ کے بارے میں فکر مندی ہے تو ہم وعدہ کرتے ہیں کہ ہم ہر لحاظ سے اس کی حفاظت کریں گے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کہ اس کے جانے میں تو کوئی حرج نہیں لیکن میرے دل میں یہ غم آئے بغیر نہیں رہتا۔ جب میں یہ سوچتا ہوں کہ تم اسے ساتھ لے جاؤ اور وہاں تم حسبِ عادت کھیل کود میں لگ جاؤ اور اسے بھول جاؤ اور کہیں دوڑتے بھاگتے دور نکل جاؤ اور پیچھے سے بھیڑیا آکر اسے کھا جائے اور تمہیں خبر ہی نہ ہو کہ کیا قیامت گزر گئی۔ برادرانِ یوسفؑ نے کہا کہ ہم دس کی تعداد میں ایک پورا جتھہ ہیں۔ اگر ہماری موجودگی میں بھیڑیا اسے کھا جائے تو پھر ہم سے زیادہ نامراد اور کون ہوگا۔ اگر دس آدمی مل کر ایک بھیڑیئے کو نہ روک سکیں اور اپنے بھائی کی جان نہ بچا سکیں تو وہ زندگی میں اور کون سا بھلا کام کر سکتے ہیں۔ وہ تو یقیناً نامرادوں کا گروہ ہے۔

ان آیات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ برادرانِ یوسفؑ نے بڑے اصرار کے ساتھ اپنے والدِ گرامی کو یوسفؑ کو ساتھ بھیجنے پر آمادہ کیا تھا۔ چنانچہ والد کی اجازت سے وہ یوسفؑ کو ساتھ لے گئے اور وہاں جا کر جو کیا وہ ایک الگ کہانی ہے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ بائبل اور تلمود کا بیان اس سے بالکل مختلف ہے، ان کی روایت یہ ہے کہ برادرانِ یوسفؑ اپنے مویشی چرانے کیلئے سکم کی طرف گئے تھے اور ان کے پیچھے خود حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان کی تلاش میں حضرت یوسفؑ کو بھیجا تھا۔ اندازہ کیجئے کہ وہ باپ جو اپنے بیٹوں پر اعتماد کرنے کو تیار نہیں، اسی لئے اپنے چھوٹے بیٹے کو ان کے ساتھ بھیجنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ وہ جانتا ہے کہ وہ اپنے بھائی سے حسد کرتے ہیں۔ بایں ہمہ آپ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کی تلاش میں بھیجا۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ حضرت یعقوب نے جانتے بوجھتے حضرت یوسفؑ کو موت کے منہ میں دھکیلا۔ آپ قرآن اور بائبل کے مندرجات کو سامنے رکھیں اور پھر فیصلہ کریں کہ کون سا بیان مناسبِ حال اور دل کو لگتا ہے۔

فَلَمَّا ذَهَبُوْا بِهٖ وَاَجْمَعُوْۤا اَنْ یَّجْعَلُوْهُ فِیْ غَیٰبَتِ الْجُبِّ ۚ وَاَوْحَیْنَاۤ اِلَیْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِاَمْرِهِمْ هٰذَا وَهُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵﴾

(پھر جب (بڑے اصرار سے) وہ یوسفؑ کو لے گئے اور سب نے یہ طے کر لیا کہ اسے کسی گہرے کنویں کی تاریک تہہ میں ڈال دیں اور (عین اس وقت) ہم نے یوسفؑ کی طرف وحی کی کہ تم ان کو ان کی کارستانی سے آگاہ کرو گے جبکہ ان کو کچھ خیال بھی نہ ہوگا۔) (سورۃ یوسف: ۱۵)

Marfat.com

کنویں میں حضرت یوسفؑ پر وحی

برادرانِ یوسفؑ نے جب اپنے والد گرامی کو بہت اصرار سے آمادہ کرلیا تو پھران کی اجازت سے حضرت یوسفؑ کو ساتھ لے گئے۔ آبادی سے اس زمین کا فاصلہ جتنا بھی ہو جہاں وہ عموماً اپنے جانور چرانے کیلئے جاتے تھے وہ یقیناً حضرت یوسفؑ کیلئے نہایت اذیت ناک ثابت ہوا ہوگا۔ کیونکہ ان ظالموں نے جن کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا اور جو اپنے بھائی کی جان لینے پر تلے ہوئے تھے انہوں نے یقیناً آبادی سے نکلتے ہی بھائی کو مارنا پیٹنا شروع کیا ہوگا۔ فقرے کسے جاتے ہوں گے، تکلیف دہ باتیں کہی جاتی ہوں گی، باپ کی محبت بھری باتوں کا حوالہ دے کر توہین کی جاتی ہوگی۔ یوسفؑ بیچارے ان ظالموں میں سے کبھی ایک کی طرف دیکھتے ہوں گے کبھی دوسرے کی طرف، لیکن کوئی رحم کھانے کو تیار نہ ہوا ہوگا۔ اسی طرح کنویں کی منڈیر پر پہنچے، ان کے گلے میں رسہ ڈالا اور کنویں میں لٹکا دیا۔ جب درمیان میں پہنچے تو رسہ کاٹ دیا۔ اندھا اور گہرا کنواں اور یوسفؑ اس میں اسیر جبکہ وہ آج تک باپ کی آغوش کے عادی رہے تھے اور کبھی انہوں نے کسی تکلیف کا منہ تک نہ دیکھا تھا۔ نجانے اس وقت ان کے دل میں کیا گزر رہی ہوگی لیکن اللہ تعالیٰ کی رحمت کا کیا کہنا کہ وہ کبھی اپنے بندوں کو فراموش نہیں کرتا۔ بعض روایات میں ہے کہ جب آپ کو کنویں میں پھینکا گیا تو حضرت جبرائیل کو حکم ہوا اَدْرِکْ عَبْدِی کہ جاؤ میرے بندے کو سنبھالو۔ دیکھنا اسے چوٹ نہ لگنے پائے۔ حضرت جبرائیلؑ آسمانوں سے بھاگے اور حضرت یوسفؑ کے پانی یا زمین تک پہنچنے سے پہلے انہیں اپنے پروں پر اٹھالیا۔ لیکن اس کی اجازت نہ تھی کہ انہیں لے کر باہر نکل آتے۔ چوٹ سے تو محفوظ رکھا لیکن قید کو باقی رکھا۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے اس کی طرف وحی کی، یعنی یوسفؑ کے دل میں یہ بات ڈالی کہ یوسفؑ گھبرانا نہیں، یہ وقتی تکلیف ہے، گزر جائے گی۔ لیکن ایک بات یاد رکھنا کہ ہم اپنی قدرت سے تمہیں ایسی قدر و منزلت سے نوازیں گے اور ایسا بلند مرتبہ عطا کریں گے کہ ایک وقت آئے گا جب تیرے یہ بھائی تیرے سامنے ہاتھ پھیلائے کھڑے ہوں گے اور اس وقت تو انہیں ان کا ظلم یاد دلائے گا۔ ان کی زیادتیوں کا ذکر کرے گا اور انہیں تصور بھی نہیں ہوگا۔ چنانچہ اسی سورہ میں آگے چل کر بتایا گیا ہے کہ ایک وقت آیا جب برادرانِ یوسفؑ غلہ لینے کیلئے حضرت یوسفؑ کے پاس پہنچے جب وہ عزیز مصر کی حیثیت اختیار کر چکے تھے۔ بھائی کہہ رہے تھے کہ آپ ہم پر غلہ صدقہ کیجئے، اللہ تعالیٰ صدقہ کرنے والوں کو بہترین جزاء دیتا ہے، تو تب حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا **ھل علمتم ما فعلتم بیوسف** کہ تمہیں معلوم ہے تم نے یوسفؑ کے ساتھ کیا کیا تھا، تب انہوں نے اپنی غلطیوں کا اعتراف کیا اور معافی مانگی۔ یہاں اسی کا ذکر کیا جا رہا ہے کہ آج تم کنویں میں پڑے ہو، تمہارے بھائی اپنے تئیں تم سے چھٹکارا پا چکے ہیں۔ وہ کبھی تصور میں بھی نہیں لا سکتے کہ یوسفؑ زندہ رہیں گے اور کبھی اقتدار تک پہنچیں گے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا کرم دیکھئے کہ جو بات کئی سالوں کے بعد جا کر ہونے والی تھی اسے محض تسلی کیلئے حضرت یوسفؑ پر وحی کیا گیا۔

بائبل اور تلمود اس ذکر سے بالکل خالی ہیں کہ اس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت یوسف علیہ السلام کو کوئی تسلی بھی دی گئی تھی۔ البتہ اس کی بجائے تلمود یہ بیان کرتی ہے کہ جب حضرت یوسفؑ کنویں میں ڈالے گئے تو وہ بہت بلبلائے اور خوب چیخ چیخ کر انہوں نے بھائیوں سے فریاد کی۔ قرآن کا بیان ہمیں یہ بتاتا ہے کہ حضرت یوسفؑ بچپن اور لڑکپن میں ہی ایسی صفات کے حامل تھے جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ نوجوان آئندہ چل کر تاریخ انسانی کی عظیم ترشخصیت ثابت ہوگا اور تلمود کے پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ صحرا کے چند بدو ایک لڑکے کو کنویں میں پھینک رہے ہیں اور وہ لڑکا چیخ چیخ کر فریاد کر رہا ہے لیکن ان ظالموں کو رحم نہیں آتا، حتیٰ کہ وہ لڑکا کنویں میں پھینک دیا جاتا ہے۔

وَجَآءُوْٓ اَبَاهُمْ عِشَآءً يَّبْكُوْنَ ﴿١٦﴾ قَالُوْا يٰٓاَبَانَآ اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَتَرَكْنَا يُوْسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَاَكَلَهُ الذِّئْبُ ۚ وَمَآ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا صٰدِقِيْنَ ﴿١٧﴾ وَجَآءُوْ عَلٰى قَمِيْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ ۭ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ۭ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ۭ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ ﴿١٨﴾ (سورۃ یوسف: ۱۶، ۱۷، ۱۸)

(اور وہ آئے اپنے باپ کے پاس کچھ رات گئے، روتے ہوئے۔ بولے کہ اے ہمارے باپ! ہم ایک دوسرے سے دوڑ میں مقابلہ کرتے ہوئے دور نکل گئے اور یوسفؑ کو ہم نے اپنے سامان کے پاس چھوڑا۔ پس اسے بھیڑیا کھا گیا اور آپ نہیں مانیں گے ہماری بات، اگرچہ ہم سچے ہیں۔ وہ اس کے کرتے پر جھوٹ موٹ کا خون بھی لگا لائے۔ حضرت یعقوبؑ نے فرمایا کہ (ایسا نہیں) بلکہ یہ تو تمہارے جی کی گھڑی ہوئی بات ہے، میں صبر جمیل کروں گا اور جو کچھ تم بیان کرتے ہو اس پر اللہ تعالیٰ سے مدد مانگوں گا۔

Marfat.com

بھائیوں کے جھوٹے عذر

برادرانِ یوسفؑ اپنے بھائی کو کنویں میں پھینکنے کے بعد ظاہر ہے اپنے باپ کا سامنا نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے رات گہری ہونے تک وہیں رکے رہے۔ پھر رات کا ایک حصہ گزر جانے پر گھر لوٹے تو باہر سے ہی رونا پیٹنا شروع کر دیا تاکہ باپ کو یقین دلایا جاسکے کہ ہم اس حادثے سے بری ہیں۔ ہم سے غلطی یہ ہوئی کہ ہم آپس میں دوڑ لگاتے ہوئے دور نکل گئے اور یوسفؑ کو ہم نے چونکہ سامان کے پاس چھوڑا تھا تو اسے تنہا دیکھ کر بھیڑیئے کو حملہ کرنے کا موقع مل گیا اور وہ اسے کھا گیا۔ ہمیں اس بات کا انتہائی دکھ ہے کہ ہم اپنے بھائی کو بچا نہ سکے اور مزید دکھ کی بات یہ ہے کہ آپ ہم پر کسی طرح اعتماد کرنے کیلئے تیار نہیں حالانکہ ہم نے جو کچھ کہا ہے ہم اس میں بالکل سچے ہیں اور مزید انہوں نے اپنے بات کو پختہ کرنے کیلئے یہ بھی حرکت کی کہ حضرت یوسفؑ کا کُرتا کسی جانور کے خون میں ڈبو کر لے آئے اور یہ ظاہر کیا کہ یہ حضرت یوسفؑ کا خون ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کُرتا بالکل صحیح سلامت تھا، ہر دیکھنے والا حیران تھا کہ وہ بھیڑیا کیسا تھا جو کُرتے والے کو کھا گیا لیکن اس کے کُرتے پر خراش تک نہ آئی۔

حضرت یعقوبؑ کا اعلیٰ کردار

بیٹوں کے جھوٹ موٹ بہانے سن کر حضرت یعقوبؑ جان گئے کہ یہ بھیڑیئے کی کارستانی نہیں بلکہ بھائیوں کا ظلم ہے جو اپنے بھائی کو کھا گیا ہے، لیکن آپؑ نے بجائے اس پر بے صبری دکھانے اور جزع فزع کرنے کے نہایت وقار سے یہ کہا کہ میں اللہ تعالیٰ سے صبر جمیل کی توفیق مانگتا ہوں اور تمہارے نفسوں نے ایک بہت بڑے کام کو جس طرح آسان کر دیا ہے میں اس کیلئے بھی اللہ تعالیٰ سے مدد چاہتا ہوں لیکن بائبل اور تلمود نے اس واقعہ کو جس طرح بیان کیا ہے اور حضرت یعقوبؑ کے تأثر کا جو نقشہ کھینچا ہے اس سے تو ایسا لگتا ہے کہ حضرت یعقوبؑ جلیل القدر پیغمبر نہیں بلکہ معمولی انسان ہیں جو کسی بھی حادثے کا شکار ہو کر ہوش و حواس کھو دیتا ہے۔ بائبل کا بیان ہے کہ تب یعقوب نے اپنا پیراہن چاک کیا اور ٹاٹ اپنی کمر سے لپیٹا اور بہت دنوں تک اپنے بیٹے کیلئے ماتم کرتا رہا۔ اور تلمود کا بیان ہے کہ یعقوب بیٹے کی قمیض پہچانتے ہی اوندھے منہ زمین پر گر پڑا اور دیر تک بے حس و حرکت پڑا رہا۔ پھر اٹھ کر بڑے زور سے چیخا کہ ہاں یہ میرے بیٹے ہی کی قمیض ہے اور وہ سالہا سال تک یوسفؑ کا ماتم کرتا رہا۔ اندازہ فرمائیے کہ قرآن کریم حضرت یعقوبؑ کو ایک باوقار، صاحب فراست، حلیم اور بردبار اور اللہ تعالیٰ کی رضا پر راضی رہنے والے پیغمبرؑ کے طور پر پیش کرتا ہے اور بائبل اور تلمود ایک کم ظرف انسان کی صورت میں۔

وَجَآءَتْ سَيَّارَةٌ فَأَرْسَلُوا وَارِدَهُمْ فَأَدْلٰى دَلْوَهٗ ؕ قَالَ يٰبُشْرٰى هٰذَا غُلٰمٌ ؕ وَأَسَرُّوْهُ بِضَاعَةً ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍۢ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُوْدَةٍ ۚ وَكَانُوْا فِيْهِ مِنَ الزّٰهِدِيْنَ ﴿۲۰﴾

(ادھر ایک قافلہ آیا تو اہلِ قافلہ نے پانی لانے کیلئے اپنے سقے کو بھیجا۔ اس نے ڈول ڈالا تو پکار اٹھا، خوشخبری ہو یہ تو ایک لڑکا ہے اور انہوں نے اسے ایک پونجی سمجھ کر چھپا دیا اور اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا ہے جو کچھ وہ کر رہے تھے۔ اور انہوں نے اس کو ایک حقیر قیمت کے بدلے میں بیچ ڈالا، چند درہم کے عوض۔ اور وہ اس کے معاملے میں بالکل بے پروا تھے۔) (سورۃ یوسف:۱۹، ۲۰)

اس کی تشریح کیلئے صاحب تفہیم القرآن کا یہ نوٹ کافی ہے۔

اس معاملہ کی سادہ صورت یہ معلوم ہوتی ہے کہ برادرانِ یوسف حضرت یوسف علیہ السلام کو کنویں میں پھینک کر چلے گئے تھے۔ بعد میں قافلے والوں نے آکر ان کو وہاں سے نکالا اور مصر لے جا کر بیچ دیا۔ مگر بائبل کا بیان ہے کہ برادرانِ یوسفؑ نے بعد میں اسماعیلیوں کے ایک قافلے کو دیکھا اور چاہا کہ یوسفؑ کو کنویں سے نکال کر ان کے ہاتھ بیچ دیں۔ لیکن اس سے پہلے ہی مدین کے سوداگر انہیں کنویں سے نکال چکے تھے۔ ان سوداگروں نے حضرت یوسفؑ کو بیس روپے میں اسماعیلیوں کے ہاتھ بیچ ڈالا پھر آگے چل کر بائبل کے مصنفین یہ بھول جاتے ہیں کہ اوپر وہ اسماعیلیوں کے ہاتھ حضرت

Marfat.com

یوسفؑ کو فروخت کرا چکے ہیں۔ چنانچہ اسماعیلیوں کے بجائے پھر مدین ہی کے سوداگروں سے مصر میں انہیں دوبارہ فروخت کراتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو کتاب پیدائش باب ۳۷۔ آیت ۲۵ تا ۲۸ و آیت ۳۶)۔ اس کے برعکس تلمود کا بیان ہے کہ مدین کے سوداگروں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو کنویں سے نکال کر اپنا غلام بنالیا پھر برادرانِ یوسفؑ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کے قبضہ میں دیکھ کر ان سے جھگڑا کیا۔ آخر کار انہوں نے بیس درہم قیمت ادا کر کے برادرانِ یوسفؑ کو راضی کیا۔ پھر انہوں نے بیس ہی درہم میں حضرت یوسف علیہ السلام کو اسماعیلیوں کے ہاتھ بیچ دیا اور اسماعیلیوں نے مصر لے جا کر انہیں فروخت کیا۔ یہیں سے مسلمانوں میں یہ روایت مشہور ہوئی ہے کہ برادرانِ یوسفؑ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو فروخت کیا تھا لیکن واضح رہنا چاہئے کہ قرآن اس روایت کی تائید نہیں کرتا۔

وَقَالَ الَّذِى اشْتَرٰىهُ مِنْ مِّصْرَ لِامْرَاَتِهٖٓ اَكْرِمِىْ مَثْوٰىهُ عَسٰٓى
اَنْ يَّنْفَعَنَآ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا ۚ وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِى الْاَرْضِ ۡ
وَلِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ۗ وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ
وَلٰـكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗٓ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا
وَّعِلْمًا ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۲۲﴾ وَرَاوَدَتْهُ الَّتِىْ هُوَ فِىْ
بَيْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ ؕ قَالَ
مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّىْٓ اَحْسَنَ مَثْوَاىَ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۳﴾
وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ؕ كَذٰلِكَ
لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ ؕ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۲۴﴾
وَاسْتَبَقَا الْبَابَ وَقَدَّتْ قَمِيْصَهٗ مِنْ دُبُرٍ وَّاَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَا
الْبَابِ ؕ قَالَتْ مَا جَزَآءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْٓءًا اِلَّآ اَنْ يُّسْجَنَ اَوْ
عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۲۵﴾ قَالَ هِىَ رَاوَدَتْنِىْ عَنْ نَّفْسِىْ وَشَهِدَ شَاهِدٌ
مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَهُوَ

Marfat.com

مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۲۶﴾ وَاِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَكَذَبَتْ
وَهُوَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۲۷﴾ فَلَمَّا رَاٰ قَمِيْصَهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ قَالَ اِنَّهٗ
مِنْ كَيْدِكُنَّ ؕ اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ ﴿۲۸﴾ يُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ٚ
وَاسْتَغْفِرِيْ لِذَنْۢبِكِ ۚۖ اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخٰطِـِٕيْنَ ﴿۲۹﴾

رکوع: ۳۔ (کہا مصر کے اس شخص نے جس نے یوسفؑ کو خریدا تھا اپنی بیوی سے اسے عزت واحترام سے ٹھہراؤ، بعید نہیں کہ یہ ہمارے لئے مفید ثابت ہو یا ہم اسے بیٹا بنالیں اور اس طرح ہم نے یوسفؑ کو سرزمینِ مصر میں قرار بخشا اور تا کہ ہم اسے خوابوں کی تعبیر سکھائیں اور اللہ تعالیٰ اپنے ہر کام پر غالب ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ جب حضرت یوسفؑ پہنچے اپنے پورے جوبن کو تو ہم نے انہیں قوتِ فیصلہ اور علم عطا کیا اور ہم اسی طرح نیک لوگوں کو جزاء دیتے ہیں۔ اور ڈورے ڈالنے لگی اس پر وہ عورت جس کے گھر میں آپ تھے کہ ان سے مطلب برآری کرے اور (ایک روز) اس نے تمام دروازے بند کر دیئے اور کہنے لگی، آ جا۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا، اللہ تعالیٰ کی پناہ۔ وہ میرا رب ہے، اس نے مجھے بہت عزت کی جگہ دی ہے۔ بیشک ظالم فلاح نہیں پاتے۔ اور عورت نے تو اس کا قصد کر ہی لیا تھا اور وہ بھی اس کا قصد کر لیتا، اگر اس نے اپنے رب کی واضح نشانی نہ دیکھ لی ہوتی، ہم نے ایسا ہی کیا تا کہ ہم اس سے برائی اور بے حیائی کو دور رکھیں، بیشک وہ ہمارے برگزیدہ بندوں میں سے تھا۔ وہ دونوں آگے پیچھے دروازے کی طرف بھاگے اور زلیخا نے یوسفؑ کا کُرتا پیچھے سے پھاڑ دیا اور دونوں نے زلیخا کے شوہر کو دروازے پر پایا۔ وہ بولی کہ کیا سزا ہے اس شخص کی جو تیری بیوی کے ساتھ بُرائی کا ارادہ کرے۔ بجز اس کے کہ وہ قید خانہ میں ڈالا جائے یا وہ کوئی دردناک تکلیف بھگتے۔ حضرت یوسفؑ نے کہا اسی نے مجھے پھسلانے کی کوشش کی اور زلیخا کے خاندان والوں میں سے ایک گواہ نے گواہی دی کہ اگر یوسفؑ کا کُرتا آگے سے پھٹا ہوا ہے تو وہ سچی ہے اور یوسفؑ جھوٹا ہے۔ اور اگر اس کے کُرتا پیچھے سے پھٹا ہوا ہے تو وہ جھوٹی ہے اور یہ سچا ہے۔ تو جب اس نے اس کا کُرتا پیچھے سے پھٹا ہوا دیکھا تو بول اٹھا کہ یہ بیشک تمہاری ہی کارستانی ہے اور بیشک تمہارے چرتر بہت بڑے ہوتے ہیں۔ یوسفؑ اس سے اعراض کرو اور (اے زلیخا تو اپنے گناہوں کی معافی مانگ، بیشک تو ہی خطا کاروں میں سے ہے۔)

وَقَالَ الَّذِی اشْتَرٰىهُ مِنْ مِّصْرَ لِامْرَاَتِهٖۤ اَكْرِمِیْ مَثْوٰىهُ عَسٰۤى اَنْ یَّنْفَعَنَاۤ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا ؕ وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِیُوْسُفَ فِی الْاَرْضِ ٘ وَلِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ ؕ وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰۤى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۲۱﴾

(کہا مصر کے اس شخص نے جس نے یوسفؑ کو خریدا تھا اپنی بیوی سے اسے عزت واحترام سے ٹھہراؤ، بعید نہیں کہ یہ ہمارے لئے مفید ثابت ہو یا ہم اسے بیٹا بنالیں اور اس طرح ہم نے یوسفؑ کو سرزمینِ مصر میں قرار بخشا اور تا کہ ہم اسے خوابوں کی تعبیر سکھائیں اور اللہ تعالیٰ اپنے ہر کام پر غالب ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔) (سورۃ یوسف:۲۱)

Marfat.com

حضرت یوسفؑ کی زندگی کا نیا موڑ

جس شخص نے حضرت یوسف علیہ السلام کو قافلے والوں سے خریدا، بائبل کی شہادت کے مطابق اس کا نام فوطیفار تھا اور وہ حکومت کا ایک معزز عہدہ دار اور بعض روایات کے مطابق شاہی باڈی گارڈ کا افسر اعلیٰ تھا۔ تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے جیسے ہی حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھا تو وہ آپؑ کی پیشانی پر سعادت کے آثار اور آپؑ کے چہرے پر بے پناہ حسن کی علامات دیکھ کر سمجھ گیا تھا کہ یہ لڑکا غلام نہیں ہے بلکہ قافلے والے کہیں سے اسے اغواء کر کے لے آئے ہیں۔ یقیناً اس لڑکے کا کسی بڑے خاندان سے تعلق ہے۔ اس لئے اس نے اپنی بیوی کو جس کا نام ایک روایت میں راحیل لیا گیا ہے اور تلمود میں سے زلیخا کے نام سے یاد کیا گیا ہے ہدایت کی کہ اس لڑکے سے غلاموں جیسا سلوک نہ کرنا بلکہ اسے عزت و اکرام سے جگہ دینا، یہ دکھوں کا مارا لڑکا بکتا ہوا یہاں پہنچ گیا ہے لیکن حقیقت میں یہ کسی بڑے خاندان کا چشم و چراغ معلوم ہوتا ہے۔ اگر اسے مناسب ماحول میسر آیا تو اس کی مضمر صلاحیتیں یقیناً بروئے کار آئیں گی تو ممکن ہے اس کی صلاحیتوں سے ہمیں فائدہ پہنچے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کی من موہنی شکل کی طرح اس کی عمدہ خصائل و عادات ہمیں اسے بیٹا بنانے پر اکسائیں، اگر اس گھر میں اس کے ساتھ عمدہ سلوک ہوا ہوگا تو بیٹا بن جانے کے بعد اس کی یاد اسے پریشان نہیں کرے گی۔ لیکن اگر ہم نے اسے غلاموں کی طرح رکھا تو بیٹے جیسی عزت ملنے کے بعد بھی اس کے پہلو کی کسک اسے ہمیشہ پریشان رکھے گی۔

حیرانی کی بات ہے کہ بھائیوں نے تو اپنے چھوٹے بھائی سے پیچھا چھڑانے کیلئے اسے کنویں کی نذر کر دیا اور مطمئن ہو بیٹھے کہ وہ یا تو مر گیا ہوگا اور یا کہیں ذلت سے زندگی گزار رہا ہوگا۔ اس بات کا تو تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا کہ یوسفؑ کسی شاہی خاندان میں بکتے ہوئے پہنچیں گے لیکن وہاں انہیں ماں باپ کی شفقت ملے گی اور بیٹوں جیسی عزت ملے گی اور گھر کی خوشحالیاں ان کی زندگی کے ارمان پورا کرنے کیلئے کافی ہوں گی لیکن یہ سب کچھ ہو کے رہا کیونکہ اللہ تعالیٰ کو یہی منظور تھا اور اس کی مشیت یہ فیصلہ کر چکی تھی کہ یوسفؑ کو جس کارِ عظیم کیلئے مصر لایا گیا ہے اس کے اسباب فراہم کئے جائیں۔

حضرت یوسفؑ کو مستقبل کی ذمہ داریوں کیلئے تیار کیا گیا

حضرت یوسف علیہ السلام کو مصر میں جس طرح ایک صالح انقلاب برپا کرنا تھا جو اقتدار کو ہاتھ میں لئے بغیر ممکن نہ تھا اس کیلئے نہایت ضروری تھا کہ آپؑ کے اندر وہ سمجھ بوجھ، وہ ژرف نگاہی اور وہ بلند نگاہ پیدا ہو جس سے آپؑ آسانی سے حالات کو سمجھ سکیں۔ آپؑ کے دل و دماغ میں وہ پاکیزگی اور وہ بالیدگی پیدا ہو جس سے آپؑ ہر بات کو گہرائی میں اتر کر جان سکیں۔ چنانچہ ان صلاحیتوں کو پیدا کرنے کیلئے ضروری تھا کہ آپ مصر کی سوسائٹی کو قریب سے دیکھیں، ان کا آقا جو افسر اعلیٰ تھا جب ان سے مصر کے بڑے بڑے لوگ ملنے کیلئے آئیں تو یہ ان کی باتوں اور رویوں سے وہ سب کچھ اخذ کریں جن کی انہیں آئندہ ضرورت پیش آنے والی تھی۔

آپ کا بچپن اور لڑکپن جس ماحول میں گزرا تھا وہ ایک قبیلے کا ماحول لیکن نبوت کا گھرانہ تھا جس میں ایک طرف آزاد زندگی کا تصور، عزت نفس کی پاسداری، سہاروں کی عدم احتیاج اور بڑے سے بڑے خطرے سے ٹکرا جانے کا حوصلہ جیسی صفات قبیلے کی وراثت کے طور پر پہلے ہی آپ میں موجود تھیں اور دوسری طرف بلند کردار اور پاکیزہ اخلاق اور اپنے پروردگار کی قدرتوں کا ہر دم استحضار ایسی صفات کی نعمت آپؑ کو گھر کے ماحول سے میسر آچکی تھی۔ چنانچہ عزیزِ مصر کے گھر پہنچ کر جب نبوی خصائل، قبائل کی خصوصیات اور جدید زندگی کے اوصاف و کمالات آپؑ کے اندر جمع ہونے لگے اور آپؑ کی جوانی ان کی غمازی کرنے لگی تو آپؑ ایک ایسے جوانِ رعنا کی شکل اختیار کر گئے کہ جس کی نظیر مصر میں تو کیا کسی جگہ بھی ممکن نہ تھی۔ قدرت نے آپؑ کو پیدائشی طور پر ظاہری حسن سے حصہ وافر عطا فرمایا تھا اور پیغمبرانہ صفات آپؑ میں آپؑ کے عظیم باپ کی تربیت نے پیدا کر دی تھیں اور جدید دور کی خوبیاں عزیزِ مصر کے گھر نے آپؑ کے اندر تیزی سے ابھاریں۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ اگر ایک طرف نامناسب نظریں آپؑ کی طرف اٹھنے لگیں تو دوسری طرف آپؑ کی صلاحیتوں سے متاثر ہو کر عزیزِ مصر نے آپؑ کو اپنی جاگیر بلکہ تمام معاملات کا منتظم بنا دیا۔ بائبل کا بیان ہے کہ اس نے آپؑ کو اس حد تک خودمختاری دی کہ سب کو یوسفؑ کے ہاتھ میں چھوڑ دیا اور سوا روٹی کے جسے وہ کھا لیتا تھا اسے اپنی کسی چیز کا ہوش نہ تھا۔ (پیدائش۔۶)

Marfat.com

قرآنِ کریم کے اسلوب میں ایک اشکال کا ازالہ

قرآنِ کریم کا اسلوب عجیب واقع ہوا ہے کہ بعض دفعہ ایسے جملوں کو حذف کر دیتا ہے جو قاری اپنے ذہن پر تھوڑا سا زور دے تو سمجھ آ سکتے ہیں اور ایسے جملے کا ذکر کر دیتا ہے جو اگرچہ محذوف جملے کا قرینہ ہوتا ہے لیکن حقیقت میں کسی اور حقیقت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہوتا ہے۔ اس آیتِ کریمہ میں بھی وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْاَرْضِ اور اس طرح ہم نے یوسفؑ کو عزیزِ مصر کے گھر پہنچا کر ان کیلئے مصر میں پاؤں جمانے کا موقع پیدا کر دیا اور اس کے بعد ایک جملہ حذف کر دیا گیا اور بعد کے آنے والے جملہ سے پہلے حرف عطف لا کر اشارہ کر دیا کہ اس سے پہلے معطوف علیہ محذوف ہے اور وہ محذوف تھوڑا سا غور کرنے سے سمجھ میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو ایک ایسے گھر میں ٹھکانہ دیا جہاں رہ کر وہ اپنے آنے والی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کیلئے سمجھ بوجھ پیدا کر سکتے تھے، حالات کو سمجھ سکتے تھے اور مصر کی سوسائٹی کے مزاج کو جان کر اس میں آگے بڑھنے کے راستے نکال سکتے تھے اور پھر اگلے جملے میں وہ بات فرمائی جس میں بتانا مقصود یہ ہے کہ اگرچہ مذکورہ صلاحیتیں بھی حضرت یوسفؑ کی ضرورت تھیں لیکن ان کا اصل کمال جو انہیں مصر کے تخت تک پہنچانے والا تھا وہ تعبیر کا علم تھا۔ چنانچہ وہاں ہم نے انہیں تعبیر کا علم بھی عطا کیا اور ہر بات کو گہرائی میں اتر کر سمجھنے کی صلاحیت بھی عطا فرمائی۔ ظاہری نگاہ رکھنے والا آدمی ان آیات کو پڑھ کر محسوس کرتا ہے کہ یہ کوئی افسانوی سی باتیں ہیں جن کا حقیقی زندگی سے کوئی خاص تعلق نہیں لیکن اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اپنے کام پر غالب ہے۔ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کر لیتا ہے تو اسے روکنے والا کوئی نہیں۔ حالات چاہے کیسے بھی ہوں انہیں میں موافقت پیدا کرنا اور انہیں حسبِ حال بناتے چلے جانا اللہ تعالیٰ کی قدرت سے کچھ بعید نہیں، وہ ہر چیز پر غالب ہے لیکن جو لوگ صرف اسباب پر نگاہ رکھتے ہیں وہ ان چیزوں کو نہیں جانتے۔

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗۤ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۲۲﴾ (سورۃ یوسف : ۲۲)

(جب حضرت یوسفؑ پہنچے اپنے پورے جوبن کو تو ہم نے انہیں قوتِ فیصلہ اور علم عطا کیا اور ہم اسی طرح نیک لوگوں کو جزا دیتے ہیں۔)

اَشُدّ، حکم اور علم کا مفہوم

اَشُدّ کا لفظ عربی زبان میں کمال اور جوبن کو کہتے ہیں۔ آدمی کا کمال اور جوبن اس کی جوانی ہے اور یا وہ زمانہ ہے جب اس کی عمر اور خیالات میں پختگی آ جائے۔ قرآنِ کریم نے اسے دونوں معنی میں استعمال کیا ہے۔ جوانی کیلئے تو اس کا استعمال عام ہے البتہ دوسرے معنی میں غالباً سورۂ لقمان میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً آیت کے اس ٹکڑے میں اَشُدّ کو فکری کمال اور سن و سال کی پختگی کے معنی میں لیا گیا ہے۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں دونوں معنی لئے جا سکتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام جب پختگی کی عمر کو پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے آپؑ کو حکم اور علم عطا فرمائے۔ قرآنِ کریم میں عام طور پر حکم سے مراد اقتدار بھی ہوتا ہے اور قوتِ فیصلہ بھی۔ اور علم سے مراد نبوت ہوتی ہے۔ نبوت عموماً 40 سال کی عمر میں ملتی ہے اس لئے اس کا یہ مطلب لیا جا سکتا ہے کہ آپؑ کی عمر جب 40 سال کی ہوئی تو آپؑ کو نبوت دی گئی اور اقتدار دیا گیا۔ ہمارے قدیم اور جدید مفسرین میں سے بہت سے بزرگوں نے یہی مفہوم مراد لیا ہے، لیکن اس ناچیز کے خیال میں یہ بات کھٹکتی ہے کیونکہ تورات کی روایت کے مطابق جب حضرت یوسف علیہ السلام کنویں میں پھینکے گئے تو آپ کی عمر 17 سال تھی۔ غالباً 20 سال کی عمر میں آپ کو جیل میں ڈالا گیا۔ تقریباً 10 سال جیل میں گزرے اور 30 سال کی عمر میں آپ کو اقتدار ملا۔ اس لحاظ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ 30 سال کی عمر میں جب آپؑ کو اقتدار ملا اسی وقت آپؑ کو نبوت بھی دی گئی لیکن قرآنِ کریم اس رکوع میں جس ترتیب سے حالات کو بیان کر رہا ہے اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ زلیخا کا آپؑ کی طرف بدنیتی سے متوجہ ہونا آپ کی نبوت کے بعد کا واقعہ ہے، پھر اس کے بعد جیل کا واقعہ پیش آیا اور 10 سال بعد آپؑ اقتدار کو پہنچے۔ زیرِ بحث آیت کی رو سے تو نبوت اور اقتدار 20 سال کی عمر میں مل جانا چاہیے جو تاریخی ترتیب کے بالکل برعکس ہے۔ اس ناچیز کے گمان میں تورات کے بیان میں بنیادی غلطی پائی جاتی ہے۔ اس میں چونکہ بیشتر

Marfat.com

چیزیں مختلف وقتوں میں لکھنے والوں نے اپنے تصورات کے مطابق لکھی ہیں۔ اس لئے اس میں ہر جگہ غلطی کا امکان ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو جب کنویں میں ڈالا گیا تو تورات کے مطابق آپ کی عمر 17 سال تھی۔ ذرا اندازہ فرمائیے کہ عام معمول کے مطابق 15 سال کا لڑکا بالغ ہو جاتا ہے، لیکن قبیلے کی کھلی فضا اور خالص غذا میں یقیناً 15 سال سے بلوغت کا امکان ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام کو بھائیوں نے یہ کہہ کر اپنے والد ماجد کو ترغیب دی کہ آپ یوسفؑ کو ہر وقت گھر میں بٹھائے رکھتے ہیں، اسے ہمارے ساتھ جانے دیجئے، باہر جا کر کچھ کھائے گا چگے گا اور کھیلے کودے گا تو اسے تفریح ملے گی۔ غور فرمائیے کون 17 سال کا صحت مند نوجوان ہے جو گھر میں باپ کے گھٹنے کے ساتھ لگ کے بیٹھا رہے اور وہ بھی ایک پیغمبر کا بیٹا جو خوبرو بھی ہے تنومند بھی وہ 17 سال کی عمر میں یقیناً اس قابل ہے کہ اکیلے بھیڑیوں کا مقابلہ کر سکے اور جہاں جانا چاہے کوئی اس کیلئے مانع نہ ہو۔ اس لئے اس رکوع کے پڑھنے کے بعد یہ باور کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام اس وقت 17 سال کے ہوں گے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپؑ اس وقت ایک لڑکے کی عمر میں تھے اور جب مصر میں پہنچے تو تب بھی آپؑ کی حیثیت ایک خوبرو بھولے بھالے لڑکے کی تھی جسے دیکھ کر عزیز مصر نے کہا کہ ہو سکتا ہے کہ اس سے ہمیں فائدہ پہنچے یا ہم اس کو بیٹا بنا لیں۔ ایسی امیدیں ہمیشہ بچوں یا لڑکوں سے کی جاتی ہیں، جوان تو اپنی راہ متعین کر چکے ہوتے ہیں، ان سے سمجھدار لوگ کبھی بڑی امیدیں نہیں لگاتے اور مزید یہ بات بھی کہ آپؑ پر جو زلیخا فریفتہ ہوئیں یقیناً آپ کے جوانی کے حسن نے اسے متاثر کیا ہوگا۔ اگر آپؑ اس وقت پختہ عمر یعنی ڈھلتی عمر کو پہنچ چکے ہوتے تو اس میں جوان اور خوشحال گھر کی خاتون کیلئے دل کھو دینے کی کون سی بات تھی۔ اس لئے اس آیتِ کریمہ کا وہ معنی جو پہلی نظر میں متبادر ہوتا ہے، وہی یہاں مراد ہے اور علم سے مراد وہ علم ہے جو مصری سوسائٹی میں راستہ نکالنے، ان کی روایات کو سمجھنے اور ان کے معروفات کو جاننے کیلئے ضروری تھا اور حکم سے مراد وہ فیصلہ کن قوت ہے جو ایک ایسے نوجوان کو ملنی چاہئے جو اجنبی ملک میں بغیر کسی قرابت کے سہارے کے اور بغیر کسی برادری کی پشت پناہی کے اپنا مقام و مرتبہ بنانے اور اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کا راستہ کھولنے کیلئے تگ و دو کر رہا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ ساری صلاحیتیں حضرت یوسف علیہ السلام کو عطا فرمائیں لیکن یہ آپؑ کی خصوصیت نہیں، یہ عنایات ہر اس شخص کے نصیب میں ہو سکتی ہیں جو حضرت یوسف علیہ السلام کی طرح مقامِ احسان پر فائز ہو کر اپنا نام محسنین میں لکھوا لیتا ہے۔

وَرَاوَدَتْهُ الَّتِي هُوَ فِي بَيْتِهَا عَنْ نَّفْسِهِ وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ ؕ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّيْٓ اَحْسَنَ مَثْوَايَ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۳﴾

(اور ڈورے ڈالنے لگی اس پر وہ عورت جس کے گھر میں آپ تھے کہ ان سے مطلب برآری کرے اور (ایک روز) اس نے تمام دروازے بند کر دیئے اور کہنے لگی، آ جا۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا، اللہ تعالیٰ کی پناہ۔ وہ میرا رب ہے، اس نے مجھے بہت عزت کی جگہ دی ہے۔ بیشک ظالم فلاح نہیں پاتے۔) (سورۃ یوسف:۲۳)

زلیخا کا دامِ ہوس، حضرت یوسفؑ کی دوسری آزمائش

حضرت یوسف علیہ السلام شفقتِ پدری کی ٹھنڈی چھاؤں میں زندگی گزار رہے تھے کہ بھائیوں کے حسد نے انہیں کنویں تک پہنچایا۔ وہاں سے اللہ تعالیٰ کی قدرت نے دستگیری کی تو بکتے بکاتے مصر پہنچ گئے۔ یہ پہلا ابتلا تھا جس میں حضرت یوسف علیہ السلام کو مبتلا کیا گیا اور آپ اس میں نہایت کامیابی اور کامرانی کے ساتھ گزر گئے۔ مصر میں اللہ تعالیٰ نے ایک عافیت کدہ دیا، ہر طرح کی سہولتیں بہم پہنچائیں، ایسی ایسی دنیاوی نعمتوں سے شادکام فرمایا جن کا پہلے کبھی تصور بھی نہیں ہوا تھا لیکن یہیں سے دوسری آزمائش نکلی کہ عزیزِ مصر کی بیوی جسے اس کے شوہر نے حسنِ سلوک کی ترغیب دی تھی اور یہ امید دلائی تھی کہ یہ لڑکا ممکن ہے کل کو ہمارا بیٹا ثابت ہو۔ لیکن اس کی جوانی کے ناجائز جذبات نے بالکل ایک دوسرا رخ اختیار کر لیا جسے ماں کی نگاہ سے دیکھنا چاہئے تھا اسے عاشقِ ناشاد کی نگاہ سے دیکھنا شروع کر دیا۔ چنانچہ اس کیلئے اس نے آہستہ آہستہ حالات پیدا کرنے شروع کر دیئے باتوں باتوں میں حضرت یوسفؑ کو اپنے قریب لانے کی کوشش شروع کر دی۔ طریقے طریقے سے یوسفؑ کے سامنے

109516

Marfat.com

عشوہ طرازیاں دکھائی جاتیں۔ راود کا مصدر مراودۃ ہے جس کا معنی ہوتا ہے آہستہ آہستہ کسی کو محبت کے دام میں پھانسنا، اس کے گھر کے چکر لگانا، باتوں کیلئے موقع تلاش کرنا، بہانے بہانے سے تحائف بھیجنا، پہلودار باتیں کرنا۔ حضرت یوسفؑ چونکہ شرم وحیا کے پتلا تھے اور نہایت عالی ظرف بھی، وہ ہمیشہ ایک فاصلہ رکھتے تھے اور جیسے جیسے آپؑ پر جوانی وارد ہوتی جارہی تھی، ویسے ویسے آپؑ احتیاط کے تقاضوں کو اور زیادہ ملحوظ رکھنے لگے تھے اور ادھر زلیخا کا حال اس کے بالکل برعکس تھا۔ یہ دور رہنا چاہتے تھے، وہ قریب آنے کی فکر میں تھی۔ جب اس نے دیکھا کہ یوسفؑ شاید میری دبی خواہشوں کی زبان کو سمجھنے سے قاصر ہیں اور میرے غمزہ وادا کو نا جانے کیا مفہوم پہناتے ہیں، تو ایک دن بے صبر ہو کر اس نے آخری اقدام کا فیصلہ کرلیا۔ حضرت یوسفؑ کو اپنی خواب گاہ میں بلایا، وہ حکم کے پابند پہنچ گئے، انہیں ایک جگہ ٹھہرا کر خواب گاہ میں کھلنے والے سارے دروازے مغلق کردیئے اور کہا ھَیۡتَ لَکَ اس کے اعراب کے بارے میں قیل وقال کی گئی ہے، لیکن حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی واضح روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے انہیں اسی طرح سکھایا تھا۔ اس کا معنی ہے، آجا۔ یہ وہ آخری کلمہ ہے جس کے بعد فاصلے مٹ جاتے ہیں۔ یہ گناہ کی انتہائی دعوت تھی، حضرت یوسفؑ جس کا تصور بھی گناہ سمجھتے تھے اور اس دعوت کی شدت کا عالم یہ تھا کہ ایک طرف خواب گاہ کا ماحول نہایت رومان پرور اور پھر حسن برہنہ یلغار پر تلا ہوا اور چاروں طرف کے دروازے بند، بے بسی کا عجیب عالم، ایسے ماحول میں حضرت یوسفؑ یا حضرت یوسفؑ جیسا ہی کوئی بچ سکتا تھا ورنہ کسی دوسرے زاہد سے زاہد آدمی کے بارے میں بھی توقع کرنا بہت مشکل ہے۔ اب آپؑ کے سامنے دو ہی راستے تھے، پہلا راستہ تھا کہ آپ نے زلیخا کو سمجھانے کی کوشش کی، آپؑ نے اس کی دعوتِ گناہ کے جواب میں فرمایا: معاذ اللہ! اللہ تعالیٰ کی پناہ۔ میں ایسے گناہ سے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتا ہوں اور اس کی پناہ ہی ہے جو ایسے ماحول میں مجھے گناہ سے بچا سکتی ہے۔ وہی میرا رب ہے، میں جس کی پناہ چاہتا ہوں، اس نے مجھے کیسے برے حالات سے، کیسے اچھے حالات تک پہنچایا، کیا اس کی نعمتوں کا شکر یہ ہے کہ میں ایک ایسے جرم کا ارتکاب کروں جو اس کی نگاہ میں بہت بڑا گناہ ہے۔ جو مفسرین یہاں رب سے رب ہی مراد لیتے ہیں، ان کا کہنا یہ ہے کہ گناہ سے بچنے کیلئے کسی انسان کا سہارا کسی عام انسان کیلئے بھی روا نہیں۔ چہ جائیکہ پیغمبر اس کی درخواست کرے۔ اس لئے یہاں ربی سے مراد رب کائنات ہی ہے، عزیز مصر نہیں۔ دوسرے مفسرین کا کہنا یہ ہے کہ سورۃ یوسفؑ میں صرف یہ ایک جگہ نہیں بلکہ دوسرے مقامات پر بھی رب کا لفظ آقا اور بادشاہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اس لئے یہاں بھی اگر آقا کے معنی میں لیا جائے تو قرآنِ کریم کے استعمال کے عین مطابق ہے۔ رہی یہ بات کہ غیر اللہ سے پناہ طلب کیوں کی جائے تو بات دراصل یہ نہیں، بات یہ ہے کہ یہاں زلیخا کو سمجھانا مقصود ہے کہ تم جس گناہ کی طرف مجھے دعوت دے رہی ہو، میں اس کی طرف اس لئے نہیں بڑھ سکتا کہ تمہارا خاوند میرا آقا ہے، اس نے مجھے اپنے گھر میں بہترین ٹھکانا دیا ہے، اس نے مجھے عزت واکرام سے نوازا ہے تو اس کی بیوی سے گناہ کا ارادہ بھی بہت بڑی خیانت ہے، یہ کام میں نہیں کرسکتا۔ اگر اس کے سامنے اللہ تعالیٰ کے حوالے سے بات کی جاتی تو یہ تو بھینس کے سامنے بین بجانے والی بات ہوتی۔ البتہ اس کے خاوند کے حوالے سے اس سے بات مفید ہو سکتی تھی۔ شاید وہ اس سے یہ سمجھنے پر مجبور ہو جائے کہ ایک ایسا نوجوان جو غلام بن کر ہمارے گھر میں آیا، اس پر میرے شوہر کے چند سالہ احسانات ہیں، وہ تو اس کا اس حد تک لحاظ کرے اور میں جو اس کی بیوی ہوں اس کے جائز نکاح میں ہوں، اس نے مجھے گھر کی ملکہ بنا رکھا ہے اور میں اس کی تمام جائیداد کی مالک بنی بیٹھی ہوں تو کس قدر عجیب بات ہے کہ میں خیانت کرتے ہوئے ذرا سوچنے کی زحمت نہیں کرتی۔ مزید حضرت یوسفؑ نے کہا کہ میں اپنی حیثیت کا ناجائز استعمال کرکے اور اپنے آقا کی حیثیت کو فراموش کرکے ظلم نہیں کرسکتا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ظالموں کو کبھی فلاح نہیں دیتا۔

وَلَقَدۡ هَمَّتۡ بِهٖ ۚ وَهَمَّ بِهَا لَوۡلَاۤ اَنۡ رَّاٰ بُرۡهَانَ رَبِّهٖ ؕ كَذٰلِكَ لِنَصۡرِفَ عَنۡهُ السُّوۡٓءَ وَالۡفَحۡشَآءَ ؕ اِنَّهٗ مِنۡ عِبَادِنَا الۡمُخۡلَصِيۡنَ ﴿۲۴﴾ (سورۃ یوسف : ۲۴)

(اور عورت نے تو اس کا قصد کر ہی لیا تھا اور وہ بھی اس کا قصد کر لیتا، اگر اس نے اپنے رب کی واضح نشانی نہ دیکھ لی ہوتی، ہم نے ایسا ہی کیا تا کہ ہم اس سے برائی اور بے حیائی کو دور رکھیں، بیشک وہ ہمارے برگزیدہ بندوں میں سے تھا۔)

Marfat.com

عصمتِ انبیا کا مفہوم

اس آیتِ کریمہ میں سب سے پہلی بات یہ فرمائی گئی ہے کہ زلیخا نے تو گناہ کا پختہ ارادہ کر رکھا تھا کیونکہ اس کے ساتھ لام اور قد کے دو لفظ تاکید کیلئے آئے ہیں جو ارادے کی پختگی کو ظاہر کرتے ہیں، لیکن حضرت یوسف علیہ السلام بھی گناہ کا ارادہ کر گزرتے، اگر آپ اپنے رب کا برہان نہ دیکھ لیتے۔ اس سے پہلی بات تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نبی انسان ہوتے ہیں اور ان کے اندر بھی وہ تمام جذبات اور داعیات موجود ہوتے ہیں جو انسان کو گناہ پر آمادہ کرتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ گناہ نہیں کرتے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی نہ کوئی برہان اور دلیل ہمیشہ ان کی رہنمائی کرتی ہے اور عصمت ہمیشہ نگرانی کرتی ہے جس کی وجہ سے طاقت ہونے کے باوجود بھی گناہ کا ارتکاب ان سے کبھی نہیں ہوتا اور اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ ان میں سرے سے فرشتوں کی طرح گناہ کی صلاحیت ہی موجود نہیں ہوتی تو پھر ان کیلئے معصومیت کوئی امتیاز کی بات نہیں رہ جاتی۔ اس لئے کہ جو شخص ایک کام کو کر ہی نہیں سکتا وہ یہ کہے کہ میں یہ کام نہیں کرتا تو اس میں خوبی کی کیا بات ہے۔ اندھا اگر یہ دعویٰ کرے کہ میری نگاہ کبھی نہیں بہکتی اور بہرہ یہ کہنے لگے کہ میری قوتِ سماعت نے آج تک کبھی کسی بری بات پر کان نہیں لگائے تو ہر شخص سن کے ہنسے گا کہ تمہارے پاس تو اس کی صلاحیت ہی موجود نہیں تو تم کس برتے پر پاکیزگی کا دعویٰ کرتے ہو۔ حضرت یوسف علیہ السلام بھی جوانِ رعنا تھے اور ان کے اندر پوری طرح جذبات موجزن تھے، زلیخا بھی جوان تھی، فرق دونوں میں یہ تھا کہ ایک پر گناہ حاوی تھا اور دوسرا گناہ پر حاوی تھا۔ گناہ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔

برہان سے کیا مراد ہے

رہی یہ بات کہ برہانِ رب سے کیا مراد ہے۔ بعض لوگوں نے تو ایسی باتیں کہی ہیں جو اپنے اندر اعجازی شان رکھتی ہیں۔ ان میں سے ایک بات یہ بھی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے دیکھا کہ دیوار پر حضرت یعقوب علیہ السلام کی تصویر نظر آرہی ہے اور وہ انگلی دانتوں میں دبائے حضرت یوسفؑ کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ دلیل اور برہان تھی جسے آپ نے دیکھا، لیکن مشکل یہ ہے کہ اس بات کی سند نہ قرآنِ کریم میں ہے اور نہ حدیثِ پاک میں۔ ایسی بات کا ظہور ناممکن نہیں لیکن بے سند بات کہنا ایک بڑی جسارت ہے۔ اس لئے ہمارے جمہور کی رائے یہ ہے کہ اس سے مراد وہی برہان اور دلیل ہے جس کا ذکر پہلی آیت میں کیا گیا ہے کہ میں اپنے آقا کی بیوی کے ساتھ ایسی حرکت کا سوچ بھی نہیں سکتا کیونکہ یہ تو اپنے آقا کے ساتھ صریح خیانت اور اس کے احسانات کی ناشکری ہوگی۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم اپنے پیغمبروں کو اسی طرح کوئی نہ کوئی دلیل دکھاتے ہیں جس سے ہر گناہ اور ہر بے حیائی کو ان سے دور رکھتے ہیں۔ چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام سے بھی ہم نے اس بے حیائی کو دور رکھا، کیونکہ وہ ہمارے برگزیدہ بندوں میں سے تھے۔

وَاسْتَبَقَا الْبَابَ وَقَدَّتْ قَمِيْصَهٗ مِنْ دُبُرٍ وَّ اَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَا الْبَابِ ؕ قَالَتْ مَاجَزَآءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْٓءًا اِلَّآ اَنْ يُّسْجَنَ اَوْعَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۲۵﴾ قَالَ هِىَ رَاوَدَتْنِىْ عَنْ نَّفْسِىْ وَ شَهِدَشَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّمِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَهُوَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۲۶﴾ وَاِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّمِنْ دُبُرٍ فَكَذَبَتْ وَهُوَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۲۷﴾ فَلَمَّا رَاٰقَمِيْصَهٗ قُدَّمِنْ دُبُرٍ قَالَ اِنَّهٗ مِنْ كَيْدِكُنَّ ؕ اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ ﴿۲۸﴾ يُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ۜ وَاسْتَغْفِرِىْ لِذَنْۢبِكِ ۚ اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخٰطِئِيْنَ ﴿۲۹﴾

(وہ دونوں آگے پیچھے دروازے کی طرف بھاگے اور زلیخا نے حضرت یوسفؑ کا کُرتا پیچھے سے پھاڑ دیا اور دونوں نے زلیخا کے شوہر کو دروازے پر پایا۔ وہ بولی کہ کیا سزا ہے اس شخص کی جو تیری بیوی کے ساتھ بُرائی کا ارادہ کرے۔ بجز اس کے کہ وہ قید خانہ میں ڈالا جائے یا وہ کوئی دردناک تکلیف بھگتے۔ حضرت یوسفؑ نے کہا اسی نے مجھے پھسلانے کی کوشش کی اور زلیخا کے خاندان والوں میں سے ایک گواہ نے گواہی دی کہ اگر حضرت یوسفؑ کا کُرتا آگے سے پھٹا ہوا ہے تو وہ سچی ہے اور یوسفؑ جھوٹا ہے۔ اور

Marfat.com

اگر اس کے کرتا پیچھے سے پھٹا ہوا ہے تو وہ جھوٹی ہے اور یہ سچا ہے۔ تو جب اس نے اس کا کرتا پیچھے سے پھٹا ہوا دیکھا تو بول اٹھا کہ یہ بیشک تمہاری ہی کارستانی ہے اور بیشک تمہارے چرتر بہت بڑے ہوتے ہیں۔ یوسفؑ اس سے اعراض کر و اور (اے زلیخا تو اپنے گناہوں کی معافی مانگ، بیشک تو ہی خطا کاروں میں سے ہے۔) (سورۃ یوسف: ۲۵،۲۶،۲۷،۲۸،۲۹)

دامِ ہوس سے نکلنے کی کوشش

میں سابقہ آیت کی تشریح میں عرض کر چکا ہوں کہ زلیخا نے جب حضرت یوسفؑ کو اپنی خواب گاہ میں بلا کر دروازے بند کر لئے اور آپؑ کو کھلی دعوتِ گناہ دی تو اب آپؑ کے سامنے بچنے کیلئے دو ہی راستے تھے۔ ایک یہ کہ آپ زلیخا کو سمجھاتے۔ چنانچہ گزشتہ آیت میں ہم اس کی تفصیل پڑھ چکے ہیں۔ اور دوسرا راستہ وہ تھا جس کا ذکر اس آیتِ کریمہ میں کیا جا رہا ہے کہ آپؑ کسی طرح اس سے دامن بچا کر بھاگ نکلیں لیکن مشکل یہ درپیش تھی کہ دروازے مقفل تھے اور ہاتھ کی ضرب سے انہیں توڑا نہیں جا سکتا تھا۔ لیکن حضرت یوسفؑ نے سوچا کہ میرا کام صرف دروازوں تک بھاگ کے جانا ہے، اس کے بعد دروازوں کا کھولنا، یہ اللہ تعالیٰ کا کام ہے اور اس کی قدرت سے کوئی چیز بعید نہیں۔ چنانچہ آپؑ اللہ تعالیٰ کے بھروسے پر دروازے کی طرف بھاگے۔ زلیخا ہر صورتحال کا سامنا کرنے کیلئے تیار تھی۔ وہ بھی فوراً آپؑ کے پیچھے لپکی تا کہ آپؑ کو پکڑ کر روک سکے۔ آپؑ تو اس کے ہاتھ نہ آئے لیکن آپؑ کے پیراہن کا پچھلا حصہ اس کے ہاتھ آ گیا اور اسے اس نے پھاڑ ڈالا۔ جیسے ہی دونوں دروازے پر پہنچے تو دروازہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے کھل گیا۔ لیکن پریشانی کی بات یہ ہوئی کہ دونوں نے دیکھا کہ دروازے پر صاحبِ خانہ کھڑے ہیں۔ زلیخا معلوم ہوتا ہے کہ بلا کی ذہین، حاضر دماغ اور طبیعت کی تیز تھی۔ بجائے پریشان ہونے کے اس نے فوراً اپنے شوہر سے کہا کہ اس آدمی کی کیا سزا ہو سکتی ہے جو گھر میں غلام بن کے آئے اور اپنے آقا کی عدم موجودگی میں اس کی عزت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کرے اور پھر خود ہی جواب دیتے ہوئے کہا کہ اس کی سزا میں دو رائے نہیں ہو سکتیں۔ یا تو اسے جیل بھیج دیا جائے اور یا اسے دردناک سزا دی جائے۔

زلیخا کے الزام کا جواب

زلیخا نے جو صورتحال پیدا کر دی تھی اس کے پیشِ نظر اب یہ کسی طرح ممکن نہ تھا کہ حضرت یوسفؑ خاموش رہتے کیونکہ خاموشی کا مطلب اعترافِ گناہ ہوتا اور آنے والے مستقبل میں جو عظیم ذمہ داری حضرت یوسفؑ کو ادا کرنا تھی اس میں تو اصل قوت ہی آپؑ کا بے عیب کردار تھا۔ کیونکہ نبوت کا دعویٰ جس کا سراسر تعلق غیب سے ہے اس کی کوئی چیز اگر دلیل بن سکتی ہے تو وہ صرف یہ بات ہے کہ نبوت کا داعی ایسا شخص ہے، جس نے زندگی میں نہ کبھی جھوٹ بولا ہے، نہ اس سے کبھی کسی اور گناہ کا صدور ہوا ہے۔ اس کی زندگی بادِ بہاری کی طرح گزری ہے۔ جس سے ہمیشہ لوگوں نے فائدہ تو اٹھایا ہے لیکن کبھی اس میں گناہ یا ظلم کی کجی نہیں دیکھی۔ اور اس موقع پر حضرت یوسفؑ کی خاموشی آپؑ کی سیرت و کردار کیلئے ایک ایسا داغ چھوڑ دیتی جو کبھی دھل نہیں سکتا تھا۔ اس لئے آپ نے اس کے شوہر کے سامنے برملا فرمایا کہ میں نے تیرے گھر میں کسی خیانت کا ارادہ نہیں کیا کیونکہ میں خائن اور بد کردار نہیں۔ البتہ تیری بیوی نے مجھ پر ڈورے ڈالے اور مجھے بہکانے کی کوشش کی۔ اور آج اس نے مجھے بے بس کر کے اپنی خواہش پر قربان کرنا چاہا اور میں اپنے کردار کی عظمت اور اپنے ایمان کو سلامت لے کر باہر کو بھاگا تا کہ میں اس طلسم سے نکل سکوں اور باہر آپؑ سے سامنا ہو گیا۔ حضرت یوسفؑ کے بیان نے معاملے کو پیچیدہ کر دیا۔ ایک طرف زلیخا کا الزام ہے اور دوسری طرف حضرت یوسفؑ کی طرف سے صرف بے گناہی کا دعویٰ نہیں بلکہ زلیخا پر الزام بھی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ان دونوں میں سچا کون ہے، فیصلہ کون کرے؟ ممکن ہے اس موقع پر گھر کے نوکر چاکر بھی جمع ہو گئے ہوں۔ گھر کے کچھ بزرگ افراد بھی موقع کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے وہاں پہنچ گئے ہوں۔ عزیزِ مصر نے اسی میں بہتری سمجھی کہ اس وقت تو اس معاملے کو ٹال دیا جائے لیکن پھر کسی دوسرے وقت میں اس نے اپنے خاندان کے بزرگوں کو جمع کر کے یہ معاملہ ان کے سامنے رکھا تو تب زلیخا کے خاندان میں سے ایک بزرگ نے جو ہمیشہ ایسے موقعوں پر فیصلہ کن بات کہا کرتا تھا، قرینے کی بات کہی کہ یہ اتفاق ہے کہ ہماری آنکھوں کے سامنے یوسفؑ کا پیراہن موجود ہے جو پھٹا ہوا ہے اور اس کا حوالہ بھی سارے ہی دے رہے ہیں۔ اس پیراہن کو دیکھ لیا جائے کہ وہ کہاں سے پھٹا ہے۔ آگے سے یا پیچھے سے۔ اگر وہ آگے سے پھٹا ہے تو مطلب صاف ہے کہ گناہ کیلئے اقدام یوسفؑ کی طرف سے ہوا

Marfat.com

ہے اور زلیخا نے اپنے بچاؤ کیلئے یوسفؑ سے کشمکش کی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اس کے پیراہن کا اگلا حصہ پھٹ گیا ہے۔ لیکن اگر پیراہن پیچھے سے پھٹا ہے تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ یوسفؑ گناہ سے بچنے کیلئے باہر کو بھاگے اور زلیخا نے تعاقب کرتے ہوئے پیچھے سے ان کا پیراہن پھاڑ ڈالا۔ اس صورت میں گناہ کا بار زلیخا پر ہوگا۔ بعض بزرگوں کا خیال ہے کہ عزیزِ مصر کے خاندان میں سے کسی بچے نے جو ابھی پنگھوڑے میں دودھ پی رہا تھا، اس نے گواہی دی اور وہی بات کہی جس کا قرآنِ کریم نے ذکر کیا ہے۔ اگر اس بات کو تسلیم کرلیا جائے تو یہ یقیناً حضرت یوسفؑ کا معجزہ ہوگا اور اللہ تعالیٰ کی قدرت سے یہ بات کوئی بعید بھی نہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ہمارے سرمایہ قرآن وسنت میں اس کیلئے کوئی سند موجود نہیں۔

فیصلہ کسی بڑے بزرگ نے کیا ہو یا کسی بچے نے یہ بات کہی ہو، دونوں صورتوں میں بات کو دلیل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے جسے عقلِ سلیم تسلیم کرتی ہے۔ چنانچہ اس فیصلے کو تسلیم کرتے ہوئے زلیخا کے خاوند نے اپنی بیوی کو ڈانٹتے ہوئے کہا کہ یہ تمہارا ہی چرتر ہے اور تم عورتوں کے چرتر اور فریب ہمیشہ بہت فتنہ پرور ہوتے ہیں۔ تم نے اپنے طور پر تو بات بنانے کی کوشش کی لیکن آخر حقیقت کھل گئی اور اس گواہی نے ثابت کردیا کہ یہ سراسر تمہاری حرکت ہے، تم نے گناہ کا ارادہ کیا اور یوسفؑ کو بھی اس میں پھانسنا چاہا۔

مِنْ کَیْدِکُنَّ کا مفہوم

مِنْ کَیْدِکُنَّ میں ضمیر جمع کی ہے حالانکہ یہ بات صرف زلیخا سے کہی جارہی ہے۔ موقع کے لحاظ سے ضمیر واحد ہونی چاہیئے۔ اس لئے اہلِ علم نے اس کے مختلف مطالب سمجھے ہیں۔ بعض لوگوں نے اس کا یہ مطلب لیا ہے کہ مصر میں اس وقت جو تہذیب عروج پر تھی اس میں تہذیب مغرب کی طرح عورتوں کو ترجیح حاصل تھی اور اس ماحول میں میاں بیوی کے تعلقات کی نوعیت اس طرح کی ہوگئی تھی کہ شوہر صریحاً اپنی بیوی کی بے حیائی دیکھ کر بھی کھل کر اسے ڈانٹ نہیں سکتا تھا۔ چنانچہ زلیخا کے میاں نے اس یقین کے باوجود کہ زلیخا نے بے حیائی کے ارتکاب کی کوشش کی، کھل کر کچھ کہنے کی بجائے جمع کے صیغے میں لپیٹ کر بات نبٹانے کی کوشش کی اور دوسرے لفظوں میں یہ بھی کہہ دیا کہ تم نے جو حرکت کی ہے یہ کوئی نئی بات نہیں، تم عورتوں کے ایسے ہی چرتر ہیں جو ہر سوسائٹی میں دکھائی دیتے ہیں۔

بعض دوسرے اہلِ علم نے اس کا یہ مطلب سمجھا ہے کہ شوہر نے اپنی بیوی کو ڈانٹتے ہوئے معاملہ صرف بیوی تک محدود نہیں رکھا بلکہ پوری صنفِ نازک کو اس کا ہدف بنایا ہے۔ گویا کہ کہنے والے کے خیال میں زلیخا جس صنف سے تعلق رکھتی ہے یعنی عورتوں سے، وہ صنف ایسی مکروہ صنف ہے جس کے فریب اور چرتروں سے کسی کو بھی امان نہیں۔ اس طرح سے کہنے والے نے پوری صنفِ نازک کی توہین کی ہے اور یہ وہ طرزِ فکر ہے جسے مردوں کے معاشرے کی خصوصیت کہا جاتا ہے۔

بعض اور اہلِ علم کا خیال یہ ہے کہ اس میں ضمیر یقیناً جمع کی ہے لیکن مراد اس سے تمام عورتیں نہیں ہیں بلکہ یہ اظہار کا ایک اسلوب ہے کہ جب آدمی انتہائی غصے میں ہوتا ہے تو وہ عموماً واحد کے بجائے جمع کے الفاظ میں بات کرتا ہے۔ اس سے ایک تو غصے کی شدت کو ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے اور دوسرا یہ کہنا ہوتا ہے کہ تم نے ایک ایسی حرکت کی ہے جس نے تمہاری پوری صنف کو مبغوض بنا کے رکھ دیا ہے۔

غصے کے اظہار سے عزیزِ مصر کی طبیعت میں کسی حد تک سکون آیا تو اس نے یوسفؑ کو تسلی دیتے ہوئے کہا کہ یوسفؑ تم زلیخا کی حرکتوں پہ نہ جاؤ، تم اطمینان سے اپنا کام جاری رکھو اور زلیخا سے اعراض کرو اور بیوی کو ڈانٹتے ہوئے کہا کہ گواہی سے یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ تم ہی خطا کار ہو۔ اس لئے اپنی خطا سے توبہ کرو اور مغفرت طلب کرو۔ مغفرت طلب کرنا یا استغفار، یہ صرف مسلمانوں ہی کا شیوہ نہیں بلکہ غیر مسلم بھی ہمیشہ اپنے گناہوں کی معافی چاہتے اور بخشش مانگتے ہیں، فرق صرف یہ ہے کہ مسلمان اپنے اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتا ہے اور غیر مسلم دیوتاؤں سے کرتے ہیں یا جن قوتوں کو انہوں نے اپنا معبود بنا رکھا ہے۔ یہاں بھی شاید یہی مراد ہے۔

Marfat.com

قرآنِ کریم اور بائبل کے بیانات کا تقابل

قرآنِ کریم کا بیان آپ نے پڑھ لیا ہے لیکن بائبل نے اس قصے کو جس بھونڈے طریقے سے بیان کیا ہے، ہم اسے تفہیم القرآن سے نقل کر رہے ہیں تاکہ آپ کو اندازہ ہو سکے کہ قرآن اور دوسری کتابوں میں کیا فرق ہے۔

"تب اس عورت نے اس کا پیراہن پکڑ کر کہا کہ میرے ساتھ ہم بستر ہو، وہ اپنا پیراہن اس کے ہاتھ میں چھوڑ کر بھاگا اور باہر نکل گیا۔ جب اس نے دیکھا کہ وہ اپنا پیراہن اس کے ہاتھ میں چھوڑ کر بھاگ گیا تو اس نے اپنے گھر کے آدمیوں کو بلا کر ان سے کہا کہ دیکھو وہ ایک عبری کو ہم سے مذاق کرنے کیلئے ہمارے پاس لے آیا ہے۔ یہ مجھ سے ہم بستر ہونے کو اندر گھس آیا اور میں بلند آواز سے چلانے لگی۔ جب اس نے دیکھا کہ میں زور زور سے چلا رہی ہوں تو اپنا پیراہن میرے پاس چھوڑ کر بھاگا اور باہر نکل گیا اور وہ اس کا پیراہن اس کے آقا کے گھر لوٹنے تک اپنے پاس رکھے رہی...... جب اس کے آقا نے اپنی بیوی کی وہ باتیں جو اس نے اس سے کہیں سن لیں کہ تیرے غلام نے مجھ سے ایسا ایسا کیا تو اس کا غضب بھڑکا اور یوسفؑ کے آقا نے اس کو لے کر قید خانے میں جہاں بادشاہ کے قیدی بند تھے ڈال دیا۔ (پیدائش ۳۹:۱۲-۲۰)

خلاصہ اس عجیب وغریب روایت کا یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے جسم پر لباس کچھ اس قسم کا تھا کہ ادھر زلیخا نے اس پر ہاتھ ڈالا اور ادھر وہ پورا لباس خود بخود اتر کر اس کے ہاتھ میں آ گیا۔ پھر لطف یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام وہ لباس اس کے پاس چھوڑ کر یونہی برہنہ بھاگ نکلے اور ان کا لباس (یعنی ان کے قصور کا ناقابل انکار ثبوت) اس عورت کے پاس ہی رہ گیا۔ اس کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام کے مجرم ہونے میں آخر کون شک کر سکتا تھا۔

یہ تو ہے بائبل کی روایت۔ رہی تلمود، تو اس کا بیان ہے کہ فوطیفار نے جب اپنی بیوی سے یہ شکایت سنی تو اس نے حضرت یوسف علیہ السلام کو خوب پٹوایا، پھر ان کے خلاف عدالت میں استغاثہ دائر کیا اور حکام عدالت نے حضرت یوسف علیہ السلام کی قمیض کا جائزہ لے کر فیصلہ کیا کہ قصور عورت کا ہے کیونکہ قمیض پیچھے سے پھٹی ہے نہ کہ آگے سے۔ لیکن یہ بات ہر صاحب عقل آدمی تھوڑے سے غور وتامل سے بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ قرآن کی روایت تلمود کی روایت سے زیادہ قرینِ قیاس ہے۔ آخر کس طرح یہ باور کر لیا جائے کہ ایسا بڑا ایک ذی وجاہت آدمی اپنی بیوی پر اپنے غلام کی دست درازی کا معاملہ خود عدالت میں لے گیا ہوگا۔

یہ ایک نمایاں ترین مثال ہے۔ قرآن اور اسرائیلی روایات کے فرق کی جس سے مغربی مستشرقین کے اس الزام کی لغویت صاف واضح ہو جاتی ہے کہ محمد (ﷺ) نے یہ قصے بنی اسرائیل سے نقل کر لئے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ قرآن نے تو ان کی اصلاح کی ہے اور اصل واقعات دنیا کو بتائے ہیں۔

وَقَالَ نِسْوَةٌ

فِي الْمَدِينَةِ امْرَاَتُ الْعَزِيزِ تُرَاوِدُ فَتٰهَا عَنْ نَّفْسِهٖ ۚ قَدْ شَغَفَهَا
حُبًّا ؕ اِنَّا لَنَرٰهَا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۳۰﴾ فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ اَرْسَلَتْ
اِلَيْهِنَّ وَاَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَاً وَّاٰتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّيْنًا

Marfat.com

وَقَالَتِ اخْرُجْ عَلَيْهِنَّ ۚ فَلَمَّا رَاَيْنَهٗۤ اَكْبَرْنَهٗ وَقَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ
وَقُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا ۭ اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ ﴿۳۱﴾ قَالَتْ
فَذٰلِكُنَّ الَّذِيْ لُمْتُنَّنِيْ فِيْهِ ۭ وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ
فَاسْتَعْصَمَ ۭ وَلَىِٕنْ لَّمْ يَفْعَلْ مَآ اٰمُرُهٗ لَيُسْجَنَنَّ وَلَيَكُوْنًا مِّنَ
الصّٰغِرِيْنَ ﴿۳۲﴾ قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَيَّ مِمَّا يَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَيْهِ ۚ
وَاِلَّا تَصْرِفْ عَنِّيْ كَيْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَيْهِنَّ وَاَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۳۳﴾
فَاسْتَجَابَ لَهٗ رَبُّهٗ فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ
الْعَلِيْمُ ﴿۳۴﴾ ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا رَاَوُا الْاٰيٰتِ لَيَسْجُنُنَّهٗ حَتّٰى
حِيْنٍ ﴿۳۵﴾ ع

رکوع: ۴۔ (اور شہر کی عورتیں کہنے لگیں کہ عزیز کی بیوی اپنے نوجوان غلام پر ڈورے ڈال رہی ہے تاکہ اس سے مطلب براری کرے۔ یوسفؑ کی محبت اس کے دل میں گھر کر گئی ہے۔ ہم اس کو کھلی گمراہی میں دیکھ رہی ہیں۔ جب زلیخا نے ان کی یہ مکارانہ باتیں سنیں تو اس نے انہیں بلا بھیجا اور ان کیلئے تکیہ دار مجلس آراستہ کی اور ضیافت میں ہر ایک کے آگے ایک چھری رکھ دی اور یوسفؑ کو کہا کہ نکل آ وان کے سامنے۔ پس جب ان عورتوں نے یوسفؑ کو دیکھا اس کی عظمت سے مبہوت رہ گئیں اور وارفتگی کے عالم میں اپنے ہاتھ کاٹ بیٹھیں اور کہہ اٹھیں کہ سبحان اللہ، یہ انسان نہیں بلکہ یہ تو کوئی معزز فرشتہ ہے۔ زلیخا نے کہا کہ یہ ہے وہ جس کے بارے میں تم مجھے ملامت کیا کرتی تھیں، بخدا میں نے اسے بہت پھسلایا لیکن وہ بچا ہی رہا، اگر یہ میرا کہنا نہ مانے گا تو قید کیا جائے گا اور بہت ذلیل وخوار ہوگا۔ یوسفؑ نے دعا کی اے میرے رب قید خانہ کی صعوبتیں مجھے زیادہ پسند ہیں اس گناہ سے جس کی طرف لوگ مجھے بلاتے ہیں اور اگر تو نے ان کے چرتر کو مجھ سے دفع نہ کیا تو میں ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا اور جذبات سے مغلوب ہو جانے والوں میں سے ہو جاؤں گا۔ تو اس کے رب نے اس کی دعا قبول فرمائی اور دور کر دیا اس سے ان عورتوں کے مکروفریب کو، بیشک وہ سننے والا، جاننے والا ہے۔ پھر ان لوگوں کو یہ سوجھی کہ ایک مدت کیلئے اسے قید کر دیں حالانکہ وہ صریح نشانیاں دیکھ چکے تھے۔)

Marfat.com

وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِينَةِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ تُرَاوِدُ فَتٰهَا عَنْ نَّفْسِهٖ ۚ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا ؕ اِنَّا لَنَرٰهَا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۳۰﴾

(اور شہر کی عورتیں کہنے لگیں کہ عزیز کی بیوی اپنے نوجوان غلام پر ڈورے ڈال رہی ہے تاکہ اس سے مطلب براری کرے۔ یوسفؑ کی محبت اس کے دل میں گھر کر گئی ہے۔ ہم اس کو کھلی گمراہی میں دیکھ رہی ہیں۔) (سورۃ یوسف:۳۰)

عزیز کے معنی مقتدر اور زبردست کے ہیں۔ اس لفظ کا اطلاق مقتدرِ اعلیٰ پر بھی ہوتا ہے اور اونچے درجے کے بااختیار افسروں پر بھی۔ زلیخا کا خاوند چونکہ شاہی باڈی گارڈ کا افسرِ اعلیٰ تھا اور اس کا شمار صاحبِ اختیار لوگوں میں ہوتا تھا اس لئے مصر کی عورتوں نے اسے عزیز کے نام سے یاد کیا۔

"قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا" شغف اس سیاہ نکتہ کو کہتے ہیں جو دل کے وسط میں ہوتا ہے، اس لحاظ سے جملے کا معنی ہوگا کہ یوسفؑ کی محبت زلیخا کے دل کی گہرائیوں تک پہنچ گئی ہے جس کی وجہ سے وہ ہر طرح کے خطرات سے بے نیاز ہوگئی اور لوگوں کی ملامت بھی اس کے دل کی گہرائیوں تک اترنے میں ناکام رہی۔

زلیخا کے عشق کی خبریں آہستہ آہستہ شہر میں پھیلنے لگیں اور شہر کی وہ معزز سوسائٹی جس کا تعلق اصحابِ اقتدار کی بیگمات سے ہوتا ہے انہیں ویسے بھی ایک دوسرے کے حالات کی ٹوہ لگانے کی عادت ہوتی ہے اور پھر مختلف سوشل تقریبات میں روزروز کی شمولیت سے کسی بڑے گھر کا راز، راز نہیں رہتا اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مصر جو اس زمانے کا سب سے متمدن ملک سمجھا جاتا تھا اس کے شہروں کی تہذیب اور اس کی اعلیٰ سوسائٹی کی بودوباش مغربی تہذیب سے کسی طرح کم نہ تھی۔ مغرب جسے اپنی ترقی کی علامت سمجھتا ہے اور مغرب کی عورتیں جس چیز کو اپنی آزادی سمجھتی ہیں یہ آج کے دور کی چیز نہیں بلکہ مصر میں آج سے چار ہزار سال پہلے پوری طرح کارفرما تھی۔ وہاں کسی معزز خاتون کا، کسی معزز شخص کے ساتھ محبت کا تعلق پیدا کر لینا یا اعلیٰ سوسائٹی میں مردوزن کا آزادانہ اختلاط اور بے حجابانہ میل جول قابلِ اعتراض نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ یہ سب چیزیں اس تہذیب کا حصہ تھیں جو اس وقت مصر کے اعلیٰ گھرانوں میں رائج ہو چکی تھی۔ چنانچہ زلیخا کا یہ عشق بھی اس لحاظ سے معزز گھروں کا موضوع نہیں بنا تھا کہ زلیخا نے کسی برائی کا ارتکاب کیا ہے۔ البتہ اس میں تعجب کی بات یہ تھی کہ زلیخا ایک زرخرید غلام سے عشق کا اظہار کر رہی ہے اور وہ غلام کسی طرح بھی اس کے دامِ فریب میں آنے کیلئے تیار نہیں۔ چنانچہ جب یہ چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ زلیخا جو اپنے آپ کو بہت ذہین وفطین اور عشوہ طراز سمجھتی ہے۔ وہ اپنے غلام کو رام نہیں کر سکی۔ اگر وہ غلام ایسا ہی سرپھرا تھا تو یہ اس کے عشق میں مبتلا کیسے ہوگئی اور پسِ پردہ یہ ادعا بھی جھلکتا تھا کہ اگر ہم اس کی جگہ ہوتیں تو غلام کی کیا مجال تھی کہ ہماری خواہش سے انکار کرتا۔

فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ اَرْسَلَتْ اِلَيْهِنَّ وَاَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَاً وَّاٰتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّيْنًا وَّقَالَتِ اخْرُجْ عَلَيْهِنَّ ۚ فَلَمَّا رَاَيْنَهٗٓ اَكْبَرْنَهٗ وَقَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ وَقُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا ؕ اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ ﴿۳۱﴾

(جب زلیخا نے ان کی یہ مکارانہ باتیں سنیں تو اس نے انہیں بلا بھیجا اور ان کیلئے تکیہ دار مجلس آراستہ کی اور ضیافت میں ہر ایک کے آگے ایک چھری رکھ دی اور یوسفؑ کو کہا کہ نکل آ ان کے سامنے۔ پس جب ان عورتوں نے یوسفؑ کو دیکھا اس کی عظمت سے مبہوت رہ گئیں اور وارفتگی کے عالم میں اپنے ہاتھ کاٹ بیٹھیں اور کہہ اٹھیں کہ سبحان اللہ، یہ انسان نہیں بلکہ یہ تو کوئی معزز فرشتہ ہے۔) (سورۃ یوسف:۳۱)

آیتِ کریمہ کے ایک ایک جملے پر غور کیجئے، قرآن کریم کا اسلوب اگرچہ کسی بھی واقعہ کو واقعہ کے طور پر بیان کرنا نہیں ہوتا ہم اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو اس میں واقعہ کے تمام اجزا موجود ہوتے ہیں۔ لیکن زور ان باتوں پر ہوتا ہے جو انسانی ہدایت کیلئے ضروری ہیں۔ اس آیتِ کریمہ میں بھی جس واقعہ کو بیان کیا گیا ہے بظاہر اس کے تمام اجزا کو قابلِ ذکر نہیں سمجھا گیا لیکن غوروفکر سے ایسے تمام اجزا سامنے آجاتے ہیں جن سے مکمل واقعہ سمجھ میں آسکتا ہے۔ غور فرمائیے کہ سب سے پہلی بات یہ فرمائی گئی ہے کہ جب زلیخا نے ان کے مکر کے بارے میں سنا حالانکہ وہ بظاہر ایک سیدھی سادی بات کہہ رہی تھیں کہ زلیخا جیسی معزز آدمی کی بیگم کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ ایک غلام سے عشق لڑائے اور محبت کی پینگیں بڑھائے۔ لیکن مکر کے لفظ نے اس میں محذوف کڑیوں کی طرف اشارہ کر دیا ہے کہ زنانِ مصر جو باتیں کہہ رہی تھیں، حقیقت میں ان کی باتوں کے پیچھے ان کی یہ خواہش کارفرما تھی کہ ہمیں کسی طرح زلیخا کے گھر میں جانے کا موقع ملے اور وہاں جا کر ہم اپنی قاتل قسم کی عشوہ طرازیوں سے اس نوجوان کو گھائل کر کے رکھ دیں جو کسی طرح زلیخا کے

Marfat.com

دامِ فریب میں آنے کیلئے تیار نہیں۔ اس طرح سے اس نوجوان کی پاک دامنی کا بھرم بھی کھل جائے گا اور زلیخا کو بھی اپنی اوقات معلوم ہو جائے گی۔ چنانچہ یہی وہ ادعا ہے جو ان کی باتوں کے پیچھے مضمر ہے۔ زلیخا نے غالباً اسی کو ان کا مکر قرار دیا ہے۔ زلیخا چونکہ حضرت یوسفؑ کے بارے میں اپنے تجربے کی بنیاد پر مکمل آگاہی رکھتی تھیں انہیں خوب معلوم تھا کہ اس نوجوان کی عفت وعصمت کو پامال کرنا کسی کے بس کی بات نہیں اور ساتھ ساتھ انہیں یہ بھی یقین تھا کہ بیگماتِ مصر کو اپنی فتنہ خیز اداؤں پر ہزار غرہ سہی لیکن وہ نہیں جانتیں کہ یوسفؑ کا حُسن کس قدر پاکیزہ اور کس قدر ہوشربا ہے۔ چنانچہ اس معاملے میں ان کی اوقات انہیں سمجھانے کیلئے اپنے گھر آنے کی دعوت دی اور اشرافِ مصر کی تقریبات کے طریقے پر چاندنی کا فرش بچھایا گیا، گاؤ تکیے رکھے گئے اور پر تکلف دعوت کا اہتمام کیا گیا۔ مصر کے آثارِ قدیمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی مجالس میں تکیوں کا عام استعمال تھا اور وہ اپنے کھانے میں چھریوں کا بھی استعمال کرتے تھے۔ چنانچہ ہر مہمان کے سامنے ہر پلیٹ میں چھری بھی رکھی گئی تاکہ وہ اپنی مرضی سے جس چیز کو کاٹنا چاہیں اسے کاٹ کر کھائیں۔ چنانچہ جب مجلس آراستہ ہوگئی اور بیگمات کھانے پینے میں مصروف ہوگئیں، قہقہے اچھلنے لگے، بے تکلفی کی فضا ماحول پر چھا گئی تو اچانک زلیخا نے یوسفؑ کو کہیں قریب ہی بٹھا رکھا تھا، اشارہ کیا کہ تم بھی مجلس میں چلے آؤ۔ وہ حکم کے پابند ہونے کی وجہ سے ان خواتین کے سامنے پہنچے جو اپنے حُسن کے مکمل اسلحے کے ساتھ مسلح تھیں، انہوں نے جیسے ہی حضرت یوسفؑ کو دیکھا تو دو چیزوں نے ان کو مبہوت کر کے رکھ دیا۔ ایک تو یہ بات کہ یوسفؑ کا غیر معمولی حُسن ان کیلئے چونکا دینے والا تھا۔ انہوں نے اپنی تقریبات میں ایک سے ایک بڑھ کر حسین مرد دیکھے تھے جو خود اپنی اداؤں سے عورتوں کو مسحور کرنے کی کوشش کرتے اور اگر کسی خاتون کی جانب سے ہلکا سا بھی اشارہ ہو جائے تو انہیں زمین پر بچھ جانے میں بھی تامل نہیں ہوتا تھا، لیکن ادھر معاملہ بالکل برعکس تھا کہ یوسفؑ کا حُسن بجائے خود اس طرح کا تھا کہ جس کے سامنے احتیاط اور وقار کے تمام دامن چھوٹ چھوٹ جا رہے تھے اور دل سینوں سے نکلے جاتے تھے۔ ہر دیکھنے والی خاتون محسوس کر رہی تھی کہ آسمان سے چاند اتر آیا، لیکن وہ یہ دیکھ کر حیران اور پریشان ہو رہی تھیں کہ وہ ماہِ کنعان اور حُسن کا پیکر آنکھ اٹھا کر بھی کسی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کر رہا تھا۔ ظاہری حُسن کے ساتھ سیرت واخلاق کی پاکیزگی حُسن کی دلربائی میں اضافہ کر دیتی ہے۔ بیگماتِ مصر کیلئے اس طرح کا تجربہ پہلا تجربہ تھا کہ ایک حُسن کا پیکر جوانِ رعنا صحت وتوانائی کی مجسم مثال اور اس کے ساتھ ساتھ آنکھوں میں حیا اور اداؤں میں عفت اور سیرت وکردار میں ایسی پختگی کہ جسے ہزار کوششوں سے بھی شکستہ نہ کیا جا سکے۔ اس کا فوری اثر تو یہ ہوا کہ ان عورتوں نے حضرت یوسفؑ کے حُسنِ خداداد میں مسحور ہو کر اپنے ہاتھ زخمی کر لئے۔ چھریاں بجائے پھلوں پہ چلنے کے انگلیوں پر چل گئیں، لیکن جب اس طرح کی مر مٹنے والی حرکتوں سے بھی حضرت یوسفؑ پر کوئی اثر نہ ہوا تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک ایک کر کے حضرت یوسفؑ کی طرف بڑھیں اور اسے اپنے جلو میں لے کر سمجھانے لگیں کہ یوسفؑ تم خوش نصیب ہو کہ عزیزِ مصر کی بیوی تم پر جان دیتی ہے، تمہیں اپنے دل کا شہزادہ سمجھتی ہے، وہ تمہارے لئے سب کچھ کرنے کو تیار ہے، لیکن تمہاری یہ بے رخی اور بے اعتنائی اس کے دل کو خون کر رہی ہے لیکن ساتھ ساتھ ایسی حرکتیں بھی کی جا رہی تھیں جس میں اشارے تھے کہ اگر تم ادھر دیکھنا پسند نہیں کرتے تو ہماری طرف دیکھو، ہم میں سے ہر ایک دوسرے سے بڑھ کر قیامت ہے۔ لیکن جب ان باتوں میں سے بھی کسی بات کا اثر نہ ہوا تو پکار اٹھیں، حاشاللہ! یہ کلمہ تنزیہ ہے، یعنی پاک ہے وہ ذات جس نے اے یوسفؑ تجھ جیسا انسان پیدا کیا اور زلیخا کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگیں کہ زلیخا یہ انسان نہیں، یہ تو کوئی معزز فرشتہ ہے ورنہ کوئی انسان حُسن کی ایسی بے حجابانہ دعوت کو رد کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

بعض اہلِ علم کا خیال ہے کہ حضرت یوسفؑ کو معزز فرشتہ قرار دینا ان کے سیرت وکردار کے پاکیزگی کی جانب اشارہ ہے کیونکہ فرشتوں ہی میں یہ وصف ہے کہ وہ کبھی کسی برائی کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ لیکن بعض دوسرے اہلِ علم کا خیال یہ ہے کہ اشارہ حضرت یوسفؑ کے ملکوتی حُسن کی طرف تھا کیونکہ عوام میں یہ بات مشہور ہے کہ فرشتے چونکہ نور سے پیدا ہوئے ہیں اس لئے بہت زیادہ حسین ہیں، لیکن بعض مفسرین نے ان دونوں معنوں کو مراد لیتے ہوئے کہا کہ جس طرح فرشتے گناہوں سے معصوم ہیں اسی طرح ہماری زبان میں ملکوتی حُسن کا بھی چرچا ہے اور اس سے مراد وہ حُسن ہوتا ہے جس پر کسی گناہ کی آلودگی کا داغ نہ ہو۔

قَالَتْ فَذٰلِكُنَّ الَّذِيْ لُمْتُنَّنِيْ فِيْهِ ۭ وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ ۭ وَلَىِٕنْ لَّمْ يَفْعَلْ مَآ اٰمُرُهٗ لَيُسْجَنَنَّ وَلَيَكُوْنًا مِّنَ الصّٰغِرِيْنَ ۝۳۲ (سورۃ یوسف : ۳۲)

(زلیخا نے کہا کہ یہ ہے وہ جس کے بارے میں تم مجھے ملامت کیا کرتی تھیں، بخدا میں نے اسے بہت پھسلایا لیکن وہ بچا ہی رہا، اگر یہ میرا کہنا نہ مانے گا تو قید کیا جائے گا اور بہت ذلیل وخوار ہوگا۔)

Marfat.com

زلیخا کی دھمکی

زلیخا نے جب دیکھا کہ بیگمات کی ساری کاوشیں ناکام ہوگئیں، نہ ان کا سمجھانا بجھانا کام آیا، نہ ان کی عشوہ طرازیاں اسے بہکا سکیں۔ اس نے فاتحانہ انداز میں کہا کہ دیکھ لیا تم نے، اس شخص کو جس پر میں جان دیتی ہوں اور جس کے بارے میں تم مجھے ملامت کرتی ہو۔ ایک طرف تمہارا کہنا یہ ہے کہ عزیز کی بیوی غلام پر مرمٹی ہے جو باعثِ شرم ہے اور دوسری طرف یہ الزام کہ کس قدر ناکام ہے زلیخا کہ غلام کو بھی ڈھب پہ نہ لاسکی۔ اب تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ وہ غلام ہے یا حُسن کی دنیا کا بادشاہ ہے۔ کون ہے جو اس کے حُسن سے مسحور نہیں ہوگا اور دوسری طرف تمہیں یہ بھی اندازہ ہوگیا کہ اسے اپنے ڈھب پہ لانا ایسا آسان نہیں جیسا تم سمجھ رہی تھیں۔ لیکن میں اب صاف کہے دیتی ہوں کہ اگرچہ آج تک میرے بہلاوے اور پھسلاوے ناکام رہے ہیں لیکن اب میں مزید برداشت نہیں کروں گی۔ اب اگر اس نے میرا حکم نہ مانا اور میری خواہش کی تعمیل نہ کی تو اسے جیل جانا پڑے گا اور ذلیل وخوار ہونا ہوگا۔

تین نکات

زلیخا کے قول سے تین باتیں مترشح ہوتی ہیں (1) کہ زلیخا اپنی سوسائٹی کی تمام بیگمات کے سامنے نہ صرف اپنے عشق کا اعتراف کر رہی ہے بلکہ ساتھ ہی ساتھ یوسفؑ کو وارننگ بھی دے رہی ہے کہ اب اسے ہر قیمت پر میری خواہش کی تعمیل کرنا ہوگی۔ اس میں بظاہر جو بات کھٹکتی ہے وہ یہ ہے کہ ایک شادی شدہ عورت کبھی بھی اس بات کو پسند نہیں کرتی کہ میرا کسی کے ساتھ معاملہ افشا ہو۔ اس سے ایک تو عزت باقی نہیں رہتی اور دوسرا یہ کہ خاوند کیسے برداشت کرے گا کہ اس کی بیوی دوسروں کے ساتھ عشق لڑاتی پھرتی ہے۔ لیکن اسے اس بات کی کوئی پرواہ معلوم نہیں ہوتی۔ اس سے مصر کی مہذب سوسائٹی کا انداز سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ جس طرح آج مغرب میں لڑکیاں شوق سے اپنی سہیلیوں کو اپنے فرینڈز کی تصویریں دکھاتی ہیں اور اس پر فخر کرتی ہیں اور شادی شدہ عورتیں بھی اس بات میں کوئی قباحت نہیں سمجھتیں کہ شوہر کے ساتھ ساتھ کسی دوسرے مرد کے ساتھ دوستی بھی چلتی رہے۔ یہی حال مصر کی سوسائٹی کا بھی تھا۔ (2) مصر کی سوسائٹی میں معلوم ہوتا ہے کہ غلاموں کے کوئی حقوق نہیں تھے۔ کوئی بھی بڑا آدمی اپنے غلام پر کوئی بھی الزام لگا کر بڑی آسانی سے اسے جیل بھیج سکتا تھا اور غلاموں کیلئے اپنی صفائی کیلئے عدالت سے رجوع کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں تھا۔ اس لئے ان پر جو بھی الزام لگا دیا جاتا تھا وہ ایک حقیقت بن جاتا تھا اور وہ بیچارے زندگی بھر زبان بند رکھ کر اس ذلت کا عذاب برداشت کرتے رہتے تھے۔ (3) زلیخا کے اعتراف میں یوسفؑ کی مضبوط سیرت کا اعتراف بھی ہے کیونکہ اس کے حُسن کی تمام رعنائیاں یوسفؑ کی پاکدامنی کو شکست دینے میں ناکام ہوجانے کے بعد اب وہ طاقت کا راستہ اختیار کرنے کا فیصلہ کر رہی ہے اور طاقت کے استعمال میں جو اصل سزا ہے وہ جیل جانا ہے۔ اور اگلی آیتِ کریمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسفؑ کو جیل بھیج دیا گیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ زلیخا اپنے تمام حربوں میں ناکام رہی اور حضرت یوسف علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے حفظ وامان میں برائی کے اس جال سے بچ کر نکل گئے۔

قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْٓ اِلَیْهِ ۚ وَاِلَّا تَصْرِفْ عَنِّیْ كَیْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَیْهِنَّ وَاَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِیْنَ ﴿۳۳﴾

(یوسفؑ نے دعا کی اے میرے رب قید خانہ کی صعوبتیں مجھے زیادہ پسند ہیں اس گناہ سے جس کی طرف لوگ مجھے بلاتے ہیں اور اگر تو نے ان کے چرتر کو مجھ سے دفع نہ کیا تو میں ان کی طرف مائل ہوجاؤں گا اور جذبات سے مغلوب ہوجانے والوں میں سے ہوجاؤں گا۔) (سورۃ یوسف: ۳۳)

Marfat.com

چند حقائق

اس آیتِ کریمہ میں پہلی ہی نظر میں چند حقیقتیں اپنی طرف متوجہ کرلیتی ہیں جن میں سب سے پہلی حقیقت یہ ہے کہ ایک مومن کا مزاج جو ایمان وعمل کے سائے میں تیار ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ کسی صورت میں بھی گناہ سے کمپرومائز نہیں کرتا۔ ایک طرف گناہ کے بہکاوے اور خوش عیشیاں ہوں اور دوسری طرف تکلیفیں منہ کھولے کھڑی ہوں تو ایک مومن گناہ سے سازگاری کی بجائے تکلیف کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ اپنے اللہ تعالیٰ سے تکلیف یا آزمائش کبھی نہیں مانگنی چاہئے لیکن اگر گناہ سے بچنے کیلئے تکلیف کے راستے کیلئے بھی دعا کرنی پڑے تو وہ اس سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ اہلِ دنیا ہزار سمجھائیں کہ دیکھو اس برائی کے ذریعے تم ایک روشن مستقبل کے مالک بن سکتے ہو اور انکار کی صورت میں تمہارا سب کچھ تباہ ہو سکتا ہے، لیکن ایک مومن کیلئے اس بات کی کوئی گنجائش نہیں کہ وہ گناہ کا راستہ اختیار کرے چاہے اس کی کچھ بھی قیمت دینی پڑے۔ وہ طریقہ جو ہمارے شعرا اور ادیبوں نے اختیار کیا ہے کہ گناہ کی ترغیبات اور گناہ کے محرکات کی موجودگی کو گناہ کے جواز کی دلیل بنالیتے ہیں ایک مومن کے مزاج میں اس کیلئے کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔

یہاں دیکھ لیجئے کہ زلیخا نے گناہ نہ کرنے کی صورت میں حضرت یوسف علیہ السلام کو جیل جانے کی دھمکی دی تو انہوں نے اپنے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ مجھے جیل کی سختیاں گناہ کی لذتوں سے ہزار درجہ زیادہ پسند ہیں لیکن ہمارے نیک نام شعرا کا عالم یہ ہے کہ وہ حُسن وشباب کو اس طرح کی غذا فراہم کرتے ہیں جس سے گناہ کی رغبت بڑھتی ہے۔ ہمارے ایک مقبول شاعر کے اشعار ہیں:

حسین جلوہ ریز ہوں ادائیں فتنہ خیز ہوں
ہوائیں عطر بیز ہوں تو شوق کیوں نہ تیز ہوں
نگار ہائے فتنہ گر کوئی اِدھر کوئی اُدھر
ابھارتے ہوں عیش پر تو کیا کرے کوئی بشر

لیکن حضرت یوسف علیہ السلام یہ کہتے سنائی دیتے ہیں کہ ایسے حالات میں بھی بشر کے سامنے ایک ہی راستہ ہے کہ وہ گناہ پر لعنت بھیجے اور اس کی خاطر جیل بھی جانا پڑے تو سنتِ یوسفی کو زندہ کرے۔

دوسری حقیقت جو سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ گھروں کی بیگمات اس وقت وہ زبان بولتی ہیں جو زبان زلیخا بول رہی ہے اور وہ رویہ اختیار کرتی ہیں جو زلیخا اختیار کرچکی ہے۔ جب اس قوم کی سوسائٹی اور اس کا معاشرہ گناہ میں ڈوب چکا ہوتا ہے۔ اس معاشرے میں ہر گھر میں زلیخا پیدا ہو جاتی ہے۔ گھروں کے دروازے برائی کیلئے کھل جاتے ہیں۔ گناہ کی دعوت کسی ایک زلیخا کی طرف سے نہیں بلکہ ہر گھر، ہر ادارے اور ہر ذریعہ ابلاغ سے گونجنے لگتی ہیں۔ ایسے معاشرے میں رفتہ رفتہ گناہ کی کھٹک اور کسک دم توڑ جاتی ہے۔ حکومت کے عمال بھی اس گناہ کے داعی بن جاتے ہیں۔ اس لئے اس آیتِ کریمہ میں باوجود اس کے کہ بات زنانِ مصر کی ہو رہی ہے لیکن صیغہ جمع مذکر غائب کا لایا جارہا ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ بات ایک گھر کی نہیں یا صرف بیگمات کی نہیں بلکہ پورا معاشرہ اس آگ میں جل رہا ہے۔ اس آیت کو دیکھتے ہوئے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہر دور کے مسلمان نوجوانوں کیلئے سنتِ یوسفی یہ ہے کہ برائی کی دعوت کسی صورت اور کسی طرف سے بھی دی جارہی ہو، وہ کھل کے اور ڈنکے کی چوٹ پر یہ بات کہیں کہ ہم مومن ہیں، ہم اس راستے پہ نہیں چل سکتے اور اگر اس کیلئے ہمیں جیل بھی جانا پڑے تو ہم سنتِ یوسفی کو زندہ کرتے ہوئے جیل جانے کیلئے بھی تیار ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سیل کی تیزی کو مضبوط بند ہی روک سکتا ہے، معمولی رکاوٹیں نہیں روک سکتیں۔ اسی طرح جب برائی سیل کی صورت اختیار کرجائے تو پھر جوانوں کے بے روک جذبے ہی اس کا راستہ روک سکتے ہیں، معمولی نصیحتوں سے برائی کے سیلاب کبھی نہیں رکتے۔

اس آیت کے دوسرے جملے سے جو حضرت یوسف علیہ السلام کی دعا کا دوسرا حصہ ہے اس سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک مردِ مومن جس طرح کسی برائی سے سازگاری پیدا نہیں کرتا اور وہ ہر شیطانی ترغیب کے سامنے مضبوط دیوار بن کے کھڑا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح وہ اپنی ذات اور اپنی نیکی کے پندار میں بھی مبتلا نہیں ہوتا۔ اس کی ذات پر نیکی کا رنگ جتنا گہرا ہوتا چلا جاتا ہے اور وہ برائی کی ترغیبات کے مقابلے میں جس قدر ثابت قدم رہتا ہے اسی حد تک بلکہ اس سے بڑھ کر اس کے اندر انکساری اور عاجزی آتی چلی جاتی ہے۔ اسے اپنی بشری کمزوریوں کا احساس روز بروز بڑھتا جاتا ہے۔ اس

Marfat.com

کے یقین میں اضافہ ہوتا جاتا ہے کہ میں اپنی ذات میں کچھ بھی نہیں۔ اگر مجھ سے کوئی نیکی کا کام ظہور پذیر ہوا ہے یا میں کسی برائی کی ترغیب کا مقابلہ کر سکا ہوں تو یہ سراسر اللہ تعالیٰ کی توفیق ہے۔ اس کی سوچ کا انداز ہمیشہ یہ ہوتا ہے:

کیا فائدہ فکرِ بیش و کم سے ہوگا
ہم کیا ہیں جو کوئی کام ہم سے ہوگا
جو ہوا، ہوا کرم سے تیرے
جو ہوگا ترے کرم سے ہوگا

فَاسْتَجَابَ لَهُ رَبُّهُ فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ ۚ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿٣٤﴾ (سورۃ یوسف : ۳۴)

(تو اس کے رب نے اس کی دعا قبول فرمائی اور دور کر دیا اس سے ان عورتوں کے مکر و فریب کو، بیشک وہ سننے والا، جاننے والا ہے۔)

حضرت یوسف علیہ السلام نے گزشتہ آیتِ کریمہ میں جو دعا مانگی تھی کہ الٰہی ان عورتوں کے مکر و فریب سے مجھے نجات دے دے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس دعا کو قبول فرمایا۔ جب تک وہ باہر رہے، اللہ تعالیٰ نے انہیں استقامت عطا فرمائی اور جب انہیں جیل بھیج دیا گیا تو اب جیل کی دیواریں ان کی پاکدامنی کی دیواریں بن گئیں۔

ثُمَّ بَدَا لَهُم مِّن بَعْدِ مَا رَأَوُا الْآيَاتِ لَيَسْجُنُنَّهُ حَتَّىٰ حِينٍ ﴿٣٥﴾ (سورۃ یوسف : ۳۵)

(پھر ان لوگوں کو یہ سوجھی کہ ایک مدت کیلئے اسے قید کر دیں حالانکہ وہ صریح نشانیاں دیکھ چکے تھے۔)

جب مصر کے سربرآوردہ اشراف نے دیکھا کہ ہر گھر میں یوسفؑ کے چرچے ہو رہے ہیں اور ہر خاتون کی زبان پر اس کے حُسن کی داستانیں ہیں اور ہر تعلیم یافتہ اور مہذب خاتون کسی نہ کسی طرح یہ چاہتی ہے کہ یوسفؑ سے راہ و رسم پیدا کرے اور ادھر زلیخا کے ہیجان میں بھی کوئی فرق پیدا نہیں ہو رہا تو باوجود اس کے کہ سوسائٹی کے تمام بڑے افراد یوسفؑ کی پاکدامنی اور اپنی بیگمات کی آوارہ نگاہی کی علامتیں جابجا دیکھ چکے تھے اور انہیں یقین تھا کہ یوسفؑ ہر لحاظ سے بے گناہ ہے اور محض ان کی بدنامی کیلئے ان کے چرچے کئے جا رہے ہیں تا کہ وہ ہمارے راستے پر چل نکلے۔ انہوں نے اسی میں عافیت سمجھی کہ یوسفؑ کو ایک عرصے کیلئے جیل بھیج دیا جائے تا کہ آہستہ آہستہ صورتحال خود بخود سکون پذیر ہو جائے۔ لوگ رفتہ رفتہ اس قصے کو بھول جائیں گے اور زلیخا کا ہیجان بھی وقت کے ساتھ ساتھ سکون پذیر ہو جائے گا۔ چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام کو ایک غیر معین عرصہ کیلئے جیل بھیج دیا گیا۔

وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيَانِ ۖ قَالَ أَحَدُهُمَا إِنِّي أَرَانِي
أَعْصِرُ خَمْرًا ۖ وَقَالَ الْآخَرُ إِنِّي أَرَانِي أَحْمِلُ فَوْقَ رَأْسِي خُبْزًا
تَأْكُلُ الطَّيْرُ مِنْهُ ۖ نَبِّئْنَا بِتَأْوِيلِهِ ۖ إِنَّا نَرَاكَ مِنَ الْمُحْسِنِينَ ﴿٣٦﴾
قَالَ لَا يَأْتِيكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقَانِهِ إِلَّا نَبَّأْتُكُمَا بِتَأْوِيلِهِ قَبْلَ أَن
يَأْتِيَكُمَا ۚ ذَٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِي رَبِّي ۚ إِنِّي تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ

Marfat.com

لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۳۷﴾ وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ
اٰبَآءِیْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ؕ مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِكَ
بِاللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ ؕ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا وَعَلَى النَّاسِ
وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۳۸﴾ يٰصَاحِبَیِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ
مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ؕ ﴿۳۹﴾ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ
دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ
اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا
اِلَّآ اِيَّاهُ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ
لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۰﴾ يٰصَاحِبَیِ السِّجْنِ اَمَّآ اَحَدُكُمَا فَيَسْقِیْ رَبَّهٗ
خَمْرًا ۚ وَاَمَّا الْاٰخَرُ فَيُصْلَبُ فَتَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْ رَّاْسِهٖ ؕ
قُضِیَ الْاَمْرُ الَّذِیْ فِيْهِ تَسْتَفْتِيٰنِ ؕ ﴿۴۱﴾ وَقَالَ لِلَّذِیْ ظَنَّ اَنَّهٗ
نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِیْ عِنْدَ رَبِّكَ ؗ فَاَنْسٰهُ الشَّيْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ
فَلَبِثَ فِی السِّجْنِ بِضْعَ سِنِيْنَ ﴿۴۲﴾

رکوع: ۵۔ ۱) اور حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ دو اور جوان بھی جیل خانہ میں داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ میں اپنے آپ کو خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں شراب نچوڑ رہا ہوں اور دوسرے نے کہا کہ میں اپنے آپ کو دیکھتا ہوں کہ میں اپنے سر پر روٹیاں اٹھائے ہوئے ہوں جس میں سے پرندے کھا رہے ہیں، آپ ہمیں اس کی تعبیر بتائیے، بیشک ہم آپ کو محسنین میں سے سمجھتے ہیں۔ حضرت یوسفؑ نے کہا یہاں جو کھانا تمہیں ملتا ہے اس کے آنے سے پہلے میں تمہیں ان خوابوں

Marfat.com

کی تعبیر بتادوں گا۔ یہ علم ان علوم میں سے ہے جو میرے رب نے مجھے سکھائے۔ میں نے ان لوگوں کے مذہب کو چھوڑا ہے جو اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں رکھتے اور آخرت کے یہی لوگ منکر ہیں۔ میں نے اپنے بزرگوں ابراہیم، اسحاق اور یعقوب کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ ہمیں حق نہیں کہ ہم کسی چیز کو اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرائیں، یہ اللہ تعالیٰ کا ہم پر اور لوگوں پر فضل ہے، لیکن اکثر لوگ شکر گزار نہیں ہوتے۔ اے میرے جیل کے دونوں ساتھیو! کیا الگ الگ بہت سے رب بہتر ہیں یا وہ ایک اللہ تعالیٰ جو سب پر غالب ہے۔ تم اسے چھوڑ کر بندگی نہیں کرتے ہو، مگر چند ناموں کی جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ چھوڑے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی کوئی دلیل نہیں اتاری۔ اختیار واقتدار صرف اللہ تعالیٰ ہی کا ہے۔ اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو۔ یہی ٹھیٹھ سیدھا طریقِ زندگی ہے، مگر اکثر لوگ نہیں جانتے۔ اے زنداں کے ساتھیو! تم میں سے ایک تو اپنے آقا کو شراب پلائے گا، رہا دوسرا تو اس کو سولی دی جائے گی، پھر پرندے اس کا سر نوچ نوچ کر کھائیں گے، فیصلہ ہو گیا اس بات کا جس کے بارے میں تم پوچھ رہے تھے۔ اور کہا حضرت یوسف علیہ السلام نے اس شخص سے جس کے متعلق انہیں خیال تھا کہ وہ ان دونوں میں سے رہا ہو جائے گا کہ اپنے آقا سے میرا ذکر کرنا تو شیطان نے اس کو اپنے آقا سے ذکر کرنا بھلا دیا۔ پس یوسف علیہ السلام کئی سال جیل میں پڑے رہے)۔

وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيٰنِ ؕ قَالَ اَحَدُهُمَآ اِنِّيْٓ اَرٰىنِيْٓ اَعْصِرُ خَمْرًا ۚ وَقَالَ الْاٰخَرُ اِنِّيْٓ اَرٰىنِيْٓ اَحْمِلُ فَوْقَ رَاْسِيْ خُبْزًا تَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْهُ ؕ نَبِّئْنَا بِتَاْوِيْلِهٖ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۳۶﴾ (سورۃ یوسف : ۳۶)

(اور حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ دو اور جوان بھی جیل خانہ میں داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ میں اپنے آپ کو خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں شراب نچوڑ رہا ہوں اور دوسرے نے کہا کہ میں اپنے آپ کو دیکھتا ہوں کہ میں اپنے سر پر روٹیاں اٹھائے ہوئے ہوں جس میں سے پرندے کھا رہے ہیں، آپ ہمیں اس کی تعبیر بتایئے، بیشک ہم آپ کو محسنین میں سے سمجھتے ہیں۔)

آزمائشوں کا تیسرا دور

حضرت یوسف علیہ السلام کے جیل جانے سے آپؑ کی آزمائشوں کا تیسرا دور شروع ہوا۔ پہلا دور آپؑ کیلئے بے بسی اور کسمپرسی کا دور تھا جس میں آپؑ کو بیچا گیا، آپؑ پر غلامی کا داغ لگا لیکن آپؑ نے نہایت خاموشی سے اس دور کی ایک ایک کلفت کو برداشت کیا۔ دوسرا دور آپؑ کی سیرت و کردار کا امتحان تھا۔ آپؑ مسلسل کئی سال تک ایک طرف حالات کو سمجھنے میں زندگی کے نشیب و فراز پہچاننے اور انسانوں سے معاملہ کرنے کی سمجھ بوجھ پیدا کرتے رہے اور ساتھ ہی ساتھ وقت کے ساتھ ساتھ گناہ کی ترغیبات بھی آپؑ کی طرف دراز ہوتی گئیں۔ آپؑ کی بھرپور جوانی اور آپؑ کا ملکوتی حسن آپؑ کیلئے بہت بڑی آزمائش ثابت ہوا جس کے خریداروں میں صرف زلیخا ہی نہیں مصر کے معزز گھرانوں کی دیگر بیگمات بھی تھیں لیکن اللہ تعالیٰ کی مدد سے آپؑ اپنے شرم و حیا کے تقاضوں کے مطابق نہایت استقامت کے ساتھ وقت گزارتے رہے حتیٰ کہ اسی پاکدامنی کی سزا کے طور پر آپؑ کو جیل بھیج دیا گیا۔

جیل کے دو ساتھی

جس جیل میں آپ کو رکھا گیا تھا اس میں دو مزید نوجوان آپؑ کے ساتھ ہی جیل میں داخل ہوئے۔ قرآن کریم نے اس کی تصریح نہیں کی کہ یہ دو نوجوان کون تھے، لیکن بائبل اور تلمود وغیرہ کی روایات سے مختلف باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ کہیں تو یہ کہا گیا ہے کہ ان میں سے ایک بادشاہ کی مجلسِ نا ؤنوش اور عیش و طرب کا نگران تھا اور دوسرا سرکاری مہمان خانے کا انچارج تھا۔ بعض روایات میں ہے کہ ان دونوں میں سے ایک شاہِ مصر کے ساقیوں کا سردار تھا اور دوسرا شاہی نانبائیوں کا افسر۔ یہ دونوں کس قصور میں جیل بھیجے گئے تھے، اس میں بھی اختلاف کیا گیا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ بادشاہ کے خلاف ایک سازش تیار ہوئی تھی جس میں پیشِ نظر یہ تھا کہ بادشاہ کو کسی تقریب میں زہر دے دیا جائے اور یہ دونوں نوجوان بھی اس سازش میں شریک تھے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ ایک دعوت کے موقع پر روٹیوں میں کچھ کرکراہٹ پائی گئی اور شراب کے ایک گلاس میں مکھی نکل آئی۔ اس جرم میں دونوں کو قید خانہ میں بھیج دیا گیا۔

Marfat.com

جیل میں حضرت یوسفؑ کی شخصیت کا احترام

قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ دونوں نوجوان چند سال تک حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ جیل میں رہے اور شب و روز آپؑ کے معمولات دیکھنے کا موقع ملا۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام جیل میں جس طرح کثرت سے عبادت کرتے تھے اسی طرح قیدیوں کے معاملات میں بھی دلچسپی لیتے تھے۔ ان کے دکھ درد میں شریک ہوتے اور ہر مشکل وقت میں کام آنے کی کوشش کرتے۔ کوئی قیدی بیمار ہو جاتا تو اس کی تیمارداری میں کوئی کمی نہ چھوڑتے اور جیل کے انتظامات کی بہتری میں بھی آپؑ ہمیشہ جیل کے عمال کا ساتھ دیتے۔ چنانچہ آپؑ کی خدمت خلق، آپ کی عبادت گزاری اور آپؑ کی خداخوفی کی اس قدر شہرت تھی کہ سب قیدی اور جیل کے حکام آپؑ کو نہایت پارسا اور خدا رسیدہ سمجھتے تھے۔ بائبل میں ہے کہ قید خانے کے داروغہ نے سب قیدیوں کو جو قید میں تھے یوسفؑ کے ہاتھ میں سونپا اور جو کچھ وہ کرتے تھے، اسی کے حکم سے کرتے تھے اور قید خانے کا داروغہ سب کاموں کی طرف سے جو اس کے ہاتھ میں تھے بے فکر تھا۔ (پیدائش: ۳۹، ۲۲، ۲۳)

حقیقت یہ ہے کہ گلاب کا پھول ویرانے میں ہو یا باغ میں، وہ اپنی خوشبو سے ہمیشہ پہچانا جاتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے نیک بندے بھی مور کی طرح ہوتے ہیں، وہ جہاں بھی پر پھیلا دیتے ہیں وہیں حُسن آرائی ہو جاتی اور نیکیوں کی بہار آجاتی ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے نبیؑ اور اہلِ مصر کی اصلاح کیلئے اٹھنے والے تھے۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ جس ماحول میں بھی رہیں، ماحول ان کی خوبیوں سے ناآشنا رہے۔ چنانچہ ان نوجوانوں کا یہ کہنا کہ ہم آپ کو محسنین میں سے سمجھتے ہیں، آپ کی عظمت، دیانت اور سچائی کا اعتراف تھا۔

دونوں نے خواب دیکھا، دونوں حضرت یوسف علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ایک نے کہا کہ میں نے اپنے آپ کو خواب میں شراب کشید کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ دوسرے نے کہا کہ میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ میں اپنے سر پر روٹیاں اٹھائے ہوئے ہوں اور پرندے اُچک اُچک کر روٹیاں کھا رہے تھے۔ آپ ہمیں ان خوابوں کی تعبیر بتلا دیجئے چونکہ آپ اللہ تعالیٰ کے نہایت نیک بندے ہیں، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو بعض دفعہ ایسی سمجھ عطا فرماتا ہے کہ وہ خواب کی تعبیر معلوم کر لیتے ہیں۔ ان نوجوانوں کو یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ حضرت یوسفؑ کوئی پیشہ ور نجومی ہیں نہ ماہر علمِ افلاک۔ لیکن آپ سے عقیدت کے باعث وہ یہ خیال کر رہے تھے کہ جس طرح کا علم و تقویٰ اللہ تعالیٰ نے انہیں دے رکھا ہے، کوئی بڑی بات نہیں کہ وہ علمِ تعبیر سے بھی آشنا ہوں۔

قَالَ لَا یَاْتِیْکُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِہٖٓ اِلَّا نَبَّاْتُکُمَا بِتَاْوِیْلِہٖ قَبْلَ اَنْ یَّاْتِیَکُمَا ؕ ذٰلِکُمَا مِمَّا عَلَّمَنِیْ رَبِّیْ ؕ اِنِّیْ تَرَکْتُ مِلَّۃَ قَوْمٍ لَّا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَھُمْ بِالْاٰخِرَۃِ ھُمْ کٰفِرُوْنَ ﴿۳۷﴾ وَاتَّبَعْتُ مِلَّۃَ اٰبَآءِیْٓ اِبْرٰھِیْمَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ ؕ مَا کَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِکَ بِاللّٰہِ مِنْ شَیْءٍ ؕ ذٰلِکَ مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ عَلَیْنَا وَعَلَی النَّاسِ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَشْکُرُوْنَ ﴿۳۸﴾

(حضرت یوسفؑ نے کہا یہاں جو کھانا تمہیں ملتا ہے اس کے آنے سے پہلے میں تمہیں ان خوابوں کی تعبیر بتا دوں گا۔ یہ علم ان علوم میں سے ہے جو میرے رب نے مجھے سکھائے۔ میں نے ان لوگوں کے مذہب کو چھوڑا ہے جو اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں رکھتے اور آخرت کے یہی لوگ منکر ہیں۔ میں نے اپنے بزرگوں ابراہیم، اسحاق اور یعقوب کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ ہمیں حق نہیں کہ ہم کسی چیز کو اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرائیں، یہ اللہ تعالیٰ کا ہم پر اور لوگوں پر فضل ہے، لیکن اکثر لوگ شکر گزار نہیں ہوتے۔) (سورۃ یوسف: ۳۷، ۳۸)

خوابوں کی تعبیر سے پہلے اپنا تعارف

حضرت یوسف علیہ السلام نے دونوں نوجوانوں کے خواب سن کر یہ فرمایا کہ میں تمہیں خوابوں کی تعبیر بتلاؤں گا لیکن تمہیں کچھ دیر انتظار کرنا ہوگا۔ رہی یہ بات کہ انتظار کتنی دیر تک کرنا ہوگا، آپؑ نے اس کی ایک مدت مقرر کر دی تاکہ نوجوان جو اپنے خواب کی وجہ سے پریشان ہیں، ان کی پریشانی میں کمی ہو جائے اور جیل کی زندگی میں چونکہ حوالہ دینے کی چیزیں بہت کم ہوتی ہیں، اس لئے آپؑ نے اس چیز کا حوالہ دیا جو تمام قیدیوں کی روزانہ زندگی کا

Marfat.com

معمول تھا۔ یعنی تمہیں جیل کی طرف سے جو کھانا دیا جاتا ہے اور تمہیں معلوم ہے کہ وہ کس وقت دیا جاتا ہے اس سے پہلے پہلے میں تمہیں تعبیر بتا دوں گا۔

حضرت یوسفؑ دیکھ رہے ہیں کہ دونوں نوجوان آپؑ کی عقیدت سے سرشار ہیں اور ساتھ ہی اپنے خوابوں کی وجہ سے پریشان بھی۔ عقیدت نے ان کے اندر حضرت یوسفؑ پر اعتماد پیدا کیا ہے۔ اور پریشانی نے ضرورت پیدا کر دی ہے۔ جہاں یہ دونوں چیزیں جمع ہو جائیں، وہاں یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ بات کہنے والے کی بات پر توجہ نہ دی جائے۔ چنانچہ آپؑ نے پیغمبرانہ بصیرت سے کام لیتے ہوئے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا اور ان دونوں کو ان کے خوابوں کی تعبیر بتانے سے پہلے یہ ضروری سمجھا کہ ان کی زندگی کیلئے جو چیز سب سے زیادہ ضروری ہے وہ انہیں بتائی جائے۔

آپؑ چونکہ پہلی دفعہ ان دونو جوانوں کے سامنے اللہ تعالیٰ کا دین پیش کر رہے تھے اس لئے نہایت ضروری تھا کہ سب سے پہلے اپنا تعارف کرواتے اور جس علم کی وجہ سے ان دونوں نوجوانوں کو حضرت یوسفؑ سے خاص تعلق پیدا ہوا تھا اس کے اصل ماخذ بیان کرتے۔ چنانچہ آپؑ نے ان سے فرمایا کہ جس علم کی مدد سے میں تمہیں تمہارے خوابوں کی تعبیر بتلاؤں گا یہ علم ان علوم میں سے ہے جس کی تعلیم مجھے میرے رب نے دی ہے۔ یہ علم انسانی واسطوں سے نہیں ملتا، اس کا سرچشمہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور وہ یہ علم انہیں عطا کرتا ہے جنہیں وہ رسالت و نبوت سے نوازتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمہیں اس بات کا یقین کر لینا چاہئے کہ میں اللہ تعالیٰ کا نبی ہوں اور اسی وجہ سے میں تمہیں خوابوں کی تعبیر بتاؤں گا۔ لیکن اس کیلئے انتہائی ضروری یہ ہے کہ آدمی ان لوگوں سے ترک تعلق کرے اور ان راہوں پر چلنے سے اجتناب کرے جن راہوں پر وہ لوگ چلتے ہیں جو اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں رکھتے۔ مجھے جو اللہ تعالیٰ نے نوازا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے ان تمام لوگوں سے اپنا تعلق توڑ لیا ہے جو اللہ تعالیٰ کو ماننے سے انکار کرتے ہیں اور جس کا نتیجہ یہ ہے کہ انہیں اس بات سے بھی انکار ہے کہ کبھی آخرت بھی آئے گی، قیامت بھی بپا ہوگی اور ہمیں اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہی کرنا ہوگی۔ تو جو شخص نہ آخرت کو تسلیم کرے اور نہ اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھے اس کی حیثیت ایک خودرو پودے کی ہے جو زمین سے خود بخود اگتا ہے اور آنے جانے والوں کے پاؤں میں مَل دَل کے ختم ہو جاتا ہے۔ انسان اشرف المخلوقات ہے یہ کوئی خودرو پودا نہیں۔ اس کی زندگی کے کچھ مقاصد ہیں۔ ان ہی کے حوالے سے قیامت کے دن باز پرس ہوگی۔ کامیابی پر اللہ تعالیٰ کے انعام سے نوازا جائے گا اور ناکامی پر جہنم میں جانا پڑے گا۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں رکھتے ان کے نزدیک یہ تصور نا قابل قبول ہے کہ کبھی ایک ایسا دن بھی آئے گا جب اپنے ایک ایک لمحے اور ایک ایک عمل کا حساب دینا ہوگا۔ میں چونکہ اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتا ہوں اور آخرت میں جوابدہی سے ڈرتا ہوں اس لئے میں نے ایسے تمام لوگوں سے تعلق توڑ لیا ہے جو نہ خدا پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ آخرت کو مانتے ہیں۔ میں نے سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے کہ مجھے زندگی اس طرح گزارنی ہے جو ایمان باللہ کا تقاضا ہے اور جس سے آخرت میں جوابدہی آسان ہو جائے۔

توحید کا تقاضا بے ایمان لوگوں سے ترکِ تعلق

دوسری آیت میں فرمایا گیا ہے کہ میں نے بے ایمان لوگوں سے ترک تعلق کر کے اس مِلت کا راستہ اختیار کیا ہے جو حضرت ابراہیم، اسحاق اور یعقوب علیہم السلام کی مِلت کہلاتی ہے۔ یہ پہلا موقع ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنا تعارف کرایا ہے کہ میرا تعلق مِلت ابراہیم سے ہے اور میں اس عظیم خاندان کی ایک کڑی ہوں۔ یہ مت سمجھو کہ میں اللہ تعالیٰ کے دین کی بات کر کے کوئی نئی بات کہہ رہا ہوں بلکہ یہ وہی بات ہے جو میرے بزرگ اور میرے آباؤ اجداد اہلِ دنیا جن کے نام سے واقف ہے کہتے رہے ہیں۔ اور کوئی تعجب کی بات نہیں کہ یہ دونوں نوجوان بھی ان بزرگوں کے ناموں سے واقف ہوں۔

توحید کی تاریخی عظمت کو واضح کرنے کے بعد ایک ایسی بات فرمائی جو عقل و حکمت کا تقاضا ہے کہ جہاں تک توحید کا تعلق ہے یہ ایسی بات ہے جو دنیا کیلئے نئی نہیں۔ اس لئے یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی ہمارا خالق و مالک ہے۔ وہی ہمیں رزق دیتا ہے، اسی نے زندگی کے امکانات پیدا کئے ہیں، قدم قدم پر جس کی قدرت اور حکمت کے شواہد موجود ہیں، ساری کائنات اسی سے اپنی زندگی کی بھیک مانگتی ہے، لیکن جہاں تک شرک کا تعلق ہے جسے لوگوں نے اپنا رکھا ہے کہ کہیں اللہ تعالیٰ کی ذات میں کسی کو شریک کیا جا رہا ہے اور کہیں اس کی صفات اور حقوق میں، حالانکہ جس شخص کے دماغ میں تھوڑی سی عقل بھی ہے اور وہ آفاق و انفس کے دلائل کو سمجھ سکتا ہے تو وہ اس غلط فہمی میں کبھی مبتلا نہیں ہو سکتا کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی اور خدا بھی ہو سکتا ہے اور کسی میں وہ صفات بھی ہو سکتی ہیں جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہیں اور کوئی مخلوق پر ویسے حقوق کا دعویٰ کر سکتا ہے جو حقوق اللہ تعالیٰ کے ہیں۔ یہ سراسر

Marfat.com

ایک انہونی خلافِ فطرت اور عقل کے خلاف بات ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا ہم پر احسان ہے کہ میرے اور میرے آباؤ اجداد نے کبھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرایا۔ شرک کی کسی شکل میں بھی کبھی ملوث نہیں ہوئے۔ لیکن اکثر لوگ بجائے اللہ تعالیٰ کی اس نعمت پر شکر ادا کرنے کے وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں۔ انسانوں پر اس کے فضل واحسان کا حال یہ ہے کہ اس نے انسانوں کو وہ تمام صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں جن سے وہ توحید اور شرک میں فرق کرسکتا ہے۔ دلائلِ آفاق وانفس کو سمجھ سکتا ہے اور اس سے نتائج بھی اخذ کرسکتا ہے۔ اور مزید کرم اس کا یہ ہے کہ وہ زبردستی کسی پر ہدایت نہیں ٹھونستا، اپنی عقل استعمال کرنے کی دعوت دیتا ہے اور جو باتیں عقل سے بالا ہیں ان میں رہنمائی کیلئے اپنے رسول مبعوث کرتا اور اپنی کتابیں اتارتا ہے۔ لیکن دکھ کی بات یہ ہے کہ لوگ اللہ تعالیٰ کے احسانات پر شکر ادا کرنے کی بجائے شرک کا راستہ اختیار کرکے اس کی ناشکری کرتے ہیں۔

یٰصَاحِبَیِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَیْرٌ اَمِ اللّٰہُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۳۹﴾ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلَّاۤ اَسْمَآءً سَمَّیْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِیَّاهُؕ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۴۰﴾

(اے میرے جیل کے دونوں ساتھیو! کیا الگ الگ بہت سے رب بہتر ہیں یا وہ ایک اللہ تعالیٰ جو سب پر غالب ہے۔ تم اسے چھوڑ کر بندگی نہیں کرتے ہو، مگر چند ناموں کی جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ چھوڑے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی کوئی دلیل نہیں اتاری۔ اختیار واقتدار صرف اللہ تعالیٰ ہی کا ہے۔ اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو۔ یہی ٹھیٹھ سیدھا طریقِ زندگی ہے، مگر اکثر لوگ نہیں جانتے۔) (سورۃ یوسف:۳۹،۴۰)

دعوتِ توحید

ان آیات کی ترتیب انتہائی حیران کن اور نہایت فطری ہے۔ غور کیجئے کہ دونو جوان جو حضرت یوسف علیہ السلام کی پاکیزہ زندگی کو دیکھ کر آپؑ کی عقیدت سے بہرہ یاب ہوتے ہیں، آپؑ کی بصیرت کا تجربہ کرکے آپؑ پر اعتماد کا اظہار کرتے ہیں باوجود اس کے کہ آپؑ نے کبھی ان سے علم تعبیر کے حوالے سے کوئی بات نہیں کی، لیکن وہ آپؑ کی شخصیت سے اس حد تک متاثر ہیں کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ایک آپؑ ہی ہیں جو انہیں ان کے خوابوں کی تعبیر بتا سکتے ہیں۔ اس کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے محض ان کے اظہارِ عقیدت کو اپنا سرمایہ نہیں بنایا بلکہ آپؑ نے اسے اللہ تعالیٰ کے دین کی تبلیغ کیلئے استعمال کرنے کے موقع میں تبدیل کردیا۔ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر چونکہ اللہ تعالیٰ کا دین لوگوں تک پہنچانے کیلئے مبعوث کئے جاتے تھے، اس لئے ان کی سب سے بڑی حرص یہ ہوتی ہے کہ جس طرح ممکن ہوسکے اللہ تعالیٰ کے دین کو لوگوں کے دماغوں میں اتارا جائے۔ اس لئے وہ نہایت حکمت سے موقع پیدا کرتے ہیں اور پھر اس سے فائدہ اٹھا کر دین کی تبلیغ کرتے ہیں۔ حضرت یوسفؑ کی شخصیت نے یہ موقع پیدا کیا اور آپؑ نے اس سے فائدہ اٹھا کر پہلی ہی فرصت میں ان کے سامنے دین کی دعوت رکھی۔

اس دعوت میں بھی ہمیں ایک تدریج نظر آتی ہے۔ آپؑ نے فوراً انہیں دین کی بنیادی باتوں کی دعوت دینا شروع نہیں کی بلکہ سب سے پہلے اپنا تعارف کرایا اور اس تعارف میں علم تعبیر کو بنیاد بنایا کہ جس اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ علم عطا فرمایا ہے اسی نے مجھے نبوت بھی عطا فرمائی ہے اور یہ علم اسی نبوت کی ہی ایک شاخ ہے۔ اپنی بات میں استحکام پیدا کرنے کیلئے آپؑ نے حق سے اپنی وابستگی اور بے دینی سے لاتعلقی کا اس طرح ذکر فرمایا کہ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دین کے راستے پر چلنے کیلئے ان لوگوں سے ترکِ تعلق کرنا پڑتا ہے جو اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں رکھتے اور ان لوگوں سے رشتہ جوڑنا پڑتا ہے جو اس راستے کے مشعل بردار گزرے ہیں اور مزید یہ بھی فرمایا کہ میں نے یہ راستہ محض آباؤ اجداد کی عقیدت کی بناء پر اختیار نہیں کیا بلکہ عقلِ عام کا فتویٰ بھی یہی ہے۔ وہ توحید کا اثبات کرتی ہے اور شرک کا ابطال کرتی ہے۔

Marfat.com

مصیبت میں اشتراک بھی تعلق کی بنیاد ہے

دل ودماغ کو پوری طرح ہموار کر لینے کے بعد آپؑ نے ان نوجوانوں سے اس طرح خطاب فرمایا جو دلنوازی کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ اے میرے قید اور جیل کے ساتھیو! اس میں کس قدر یگانگت اور پیار ہے۔ انسانی فطرت یہ ہے کہ ایسے چند آدمی جو آپس میں کوئی تعلق نہ رکھتے ہوں لیکن اگر کسی مشترک مصیبت میں گرفتار ہو جائیں تو مصیبت کا اشتراک ان کے درمیان تعلق کی بنیاد بن جاتا ہے اور اگر پہلے سے کوئی تعلق موجود ہو تو مصیبت اس تعلق میں کئی گناہ اضافہ کر دیتی ہے۔ اقبال مرحوم نے اپنی والدہ کے انتقال پر جو مرثیہ لکھا اس میں اس صدمے میں اشتراک کو دو بھائیوں میں محبت کے اضافے کا سبب قرار دیا۔

تخم جس کا تو ہماری کشتِ جاں میں بو گئی
شرکتِ غم سے وہ الفت اور محکم ہو گئی

دعوت میں حکمت

اس محبت آفریں خطاب سے ان نوجوانوں کو اپنی قربت کا احساس دلاتے ہوئے اپنی بات کا آغاز کیا۔ اس میں اگرچہ توحید کی دعوت اور اس کا اثبات ہے لیکن اس کا انداز براہِ راست نہیں بلکہ عمومی اور عقل عام پر مبنی ہے۔ وہ دونوں چونکہ بادشاہ کے ملازم تھے اور بادشاہ کے عتاب کے باعث وہ جیل پہنچے تھے۔ ان سے زیادہ یہ بات کون سمجھ سکتا تھا کہ ایک آدمی کا ایک آقا ہونا چاہئے یا دو۔ اور اگر دو آقا ہوں اور محکوم اور ملازم ایک ہو تو اس غریب پر کیا گزرتی ہے اور اس کی شخصیت پر کیسے زخم لگتے ہیں ان دونوں کیلئے ان باتوں کا سمجھنا بہت آسان تھا۔ اس لئے ان سے پوچھا کہ بتاؤ ایک سے زیادہ رب اور وہ بھی متفرق اور الگ الگ بہتر ہیں یا ایک اللہ تعالیٰ جو قہار ہے۔ قہار کا مطلب یہ ہے کہ وہ سب پر غالب ہے۔ اس کے دائرۂ اختیار واقتدار سے کوئی باہر نہیں۔ وہ ایسا کنٹرولر ہے کہ کائنات میں سے کوئی مخلوق بھی اس کے تکوینی حکم سے سرتابی نہیں کر سکتی۔ کائنات میں ایسے خدا اور ایسے آقا کی موجودگی میں جو سب پر غالب ہو کسی اور کی موجودگی کا کیا جواز ہے اور مزید یہ کہ اس ایک خدا کے وجود پر تمام اہلِ دنیا متفق ہیں۔ کیونکہ اس کا وجود انسان کی فطرت کی آواز، عہدِ الست کی پکار اور اقوام کی شہادت سے مستند ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے تو یقیناً صحیح ہے کہ اس کا وجود ابدہ البدیہیات ہے۔ اس کے ثبوت کیلئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ البتہ اس کی ذات یا اس کے اختیار واقتدار میں کسی شریک کو تسلیم کرنے کیلئے بڑی مضبوط دلیل کی ضرورت ہے اور ایسی کوئی دلیل انسان کے پاس موجود نہیں تو غور کیجئے کہ ایسی بے سروپا بات جس کی نہ عقل تائید کرے اور نہ فطرت اسے مانے۔ اسے اپنے اوپر مسلط کر لینے کا کیا جواز ہے۔

شرک کی تردید کے حوالے سے حضرت نے اپنے دونوں ساتھیوں کو براہِ راست متوجہ کرتے ہوئے فرمایا کہ تم لوگ جن شخصیات یا جن قوتوں کی پوجا کرتے ہو، کیا تم نے کبھی ان کی حقیقتوں پر غور کیا ہے۔ ان کے تم نے مختلف نام رکھے ہوئے ہیں۔ کسی کو ان داتا کہتے ہو، کسی کو غریب نواز کا نام دے رکھا ہے، کہیں مختلف ناموں سے مختلف دیویوں اور دیوتاؤں کی پوجا ہوتی ہے، لیکن تم کچھ نہیں جانتے کہ جن کی پوجا کر رہے ہو، یہ کون ہیں۔ بلا سوچے سمجھے کچھ نام ہیں جن کی پوجا کی جا رہی ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جس گھر میں لکشمی دیوی آ جائے وہ امیر ہو جاتا ہے لیکن آپ پوچھ کے دیکھ لیجئے کہ یہ لکشمی دیوی کیا شے ہے۔ بے حقیقت ناموں کے پیچھے چلنا اور اپنے آپ کو ان ناموں پر قربان کر دینا اس سے بڑھ کر جہالت کی اور کیا بات ہوگی۔ عقل بھی سوال کرتی ہے کہ ایک خدا جو سب پر غالب اور حاوی ہے اور جس کے انتظام وانصرام سے کوئی ذرہ بھی باہر نہیں، آخر اس کی موجودگی میں دوسروں کی غلامی کا قلادہ گلے میں ڈالنا کون سی عقل مندی کی بات ہے، لیکن تمہارے آباؤ اجداد نے محض اپنے وہم سے کچھ نام رکھ چھوڑے ہیں اور تم اپنے باپ دادا کی لکیر کو پیٹتے چلے آ رہے ہو۔

آنکھیں کھول کر کائنات کا مطالعہ کرو کیا اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کا حکم بھی کارفرما دکھائی دیتا ہے۔ عناصرِ قدرت کیا اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کے حکم سے اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ زمین وآسمان کی بے شمار قوتیں جو صرف اللہ تعالیٰ کے علم میں ہیں کیا اس کے سوا کسی اور کے حکم کی پابند ہیں۔

Marfat.com

جن وانس، ملائکہ، چرند پرند اور حشرات الارض تک کوئی مخلوق نہیں جسے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور رزق دیتا ہو۔ جب کائنات کی ایک ایک مخلوق اسی کی محتاج اور اسی کے احکام کی تکوینی طور پر پابند ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ جن وانس جنہیں اللہ تعالیٰ نے فی الجملہ آزادی بخشی ہے اور اس بات کا اختیار دیا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے فیصلہ کرے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا دین، اس کی اطاعت اور اس کی بندگی اختیار کریں گے یا غیر اللہ کی، تو پھر اس کا کیا جواز ہے کہ وہ تکوینی طور پر تو اللہ تعالیٰ کی بندگی کریں اور تشریعی طور پر غیر اللہ کی بندگی اپنے اوپر مسلط کرلیں، کیونکہ جس طرح اختیار واقتدار تکوینی طور پر اللہ تعالیٰ کا ہے اسی طرح تشریعی طور پر اللہ تعالیٰ کا ہے۔ اسی نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو۔ یہی وہ دینِ قیم اور ٹھیٹھ اور سیدھا راستہ ہے جو فوز وفلاح اور جنت کی طرف جاتا ہے لیکن اکثر لوگ ایسی سیدھی بات کو جاننے کی کوشش نہیں کرتے اور ساری عمر پیچ در پیچ پگڈنڈیوں میں ٹامک ٹوئیاں مارتے رہتے ہیں۔

اس طرح سے حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے جیل کے ساتھیوں کے سامنے اللہ تعالیٰ کے دین کی دعوت رکھی۔ بنیادی تفصیلی مسائل چھیڑنے کی بجائے اپنی بات کو توحید کے اثبات اور شرک کی مذمت تک محدود رکھا۔ براہِ راست ان کے خیالات اور عقائد پر تنقید سے گریز فرمایا اور شرک کے بارے میں جو تنقیدی باتیں فرمائیں انہیں دلآزاری کے ہر شائبے سے محفوظ رکھا اور اپنی بات کو اس طرح عقلی پیمانوں سے ناپ کے پیش کیا جس کا انکار کرنا ان کیلئے آسان نہ رہا۔

يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ اَمَّآ اَحَدُكُمَا فَيَسْقِيْ رَبَّهٗ خَمْرًا ۚ وَاَمَّا الْاٰخَرُ فَيُصْلَبُ فَتَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْ رَّاْسِهٖ ۭ قُضِيَ الْاَمْرُ الَّذِيْ فِيْهِ تَسْتَفْتِيٰنِ ﴿۴۱﴾ (سورۃ یوسف : ۴۱)

(اے زنداں کے ساتھیو! تم میں سے ایک تو اپنے آقا کو شراب پلائے گا، رہا دوسرا تو اس کو سولی دی جائے گی، پھر پرندے اس کا سرنوچ نوچ کر کھائیں گے، فیصلہ ہوگیا اس بات کا جس کے بارے میں تم پوچھ رہے تھے۔)

انبیاء علیہم السلام چونکہ لوگوں کی اصلاح کیلئے مبعوث ہوتے ہیں اس لئے سب سے زیادہ جو خیال ان کے ذہن پر حاوی رہتا ہے وہ تبلیغ ودعوت ہے۔ جب بھی اس کا موقع نکلتا ہے وہ اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے بھی اس موقع کو غنیمت سمجھا تو پہلے ان کے سامنے توحید کی دعوت کو پیش کیا اور اس کے بعد ان کے خوابوں کی تعبیر بتلائی۔

خوابوں کی تعبیر

جس شخص نے یہ خواب دیکھا تھا کہ وہ شراب نچوڑ رہا ہے اس کے خواب کی تعبیر یہ بتلائی کہ تم اپنے منصب پر بحال ہو جاؤ گے اور دوبارہ اپنے آقا کو ناؤ ونوش کی مجلس میں شراب پلانے کی خدمت انجام دو گے۔ اور جس شخص نے یہ خواب دیکھا تھا کہ وہ سر پر روٹیاں اٹھائے ہوئے ہے اور پرندے اس کے سر پر رکھی ہوئی روٹیاں اُچک اُچک کر کھا رہے ہیں۔ اس کی تعبیر یہ بتلائی کہ تمہیں پھانسی دی جائے گی اور تمہاری لاش دنوں تک پھانسی پر لٹکی رہے گی اور پرندے سر کا گوشت نوچ نوچ کر کھائیں گے۔ اور آخر میں فرمایا کہ یہ ہے تمہارے ان خوابوں کی تعبیر جن کے بارے میں تم نے مجھ سے پوچھا تھا، میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔

وَقَالَ لِلَّذِيْ ظَنَّ اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ ۡ فَاَنْسٰىهُ الشَّيْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ فَلَبِثَ فِي السِّجْنِ بِضْعَ سِنِيْنَ ﴿۴۲﴾

(اور کہا حضرت یوسف علیہ السلام نے اس شخص سے جس کے متعلق انہیں خیال تھا کہ وہ ان دونوں میں سے رہا ہو جائے گا کہ اپنے آقا سے میرا ذکر کرنا تو شیطان نے اس کو اپنے آقا سے ذکر کرنا بھلا دیا۔ پس یوسف علیہ السلام کئی سال جیل میں پڑے رہے۔) (سورۃ یوسف:۴۲)

جیل کے دونوں ساتھیوں میں سے جس کے بارے میں آپؑ کو یقین تھا کہ وہ رہائی پائے گا اور اپنے منصب پر بحال ہو جائے گا اور بادشاہ کی قربت اسے دوبارہ میسر آئے گی، اسے آپؑ نے فرمایا کہ تم اپنے بادشاہ سے میرا ذکر کرنا۔ ذکر کرنے سے مطلب یہ ہے کہ جو کچھ تم نے

Marfat.com

یہاں میرے بارے میں دیکھا اور جانا ہے اور جس طرح میں نے تمہارے خوابوں کی تعبیر بتائی ہے، یہ سب باتیں اپنے آقا سے کہنا تاکہ جب بھی دربار میں ایسی کوئی ضرورت پیدا ہو تو وہ مجھ سے رابطہ کرنے کی کوشش کرے۔ اس طرح شاید کوئی رہائی کی شکل نکل آئے۔ اور یا اس کا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ تم میرے بارے میں جو جذبات رکھتے ہو ان کا ذکر اپنے آقا سے کرنا اور یہ بھی کہنا کہ ایسا خدا رسیدہ اور نیک نفس انسان محض الزامات کی نذر ہو کر جیل میں بند ہے اور کوئی اس کی داد فریاد سننے والا نہیں کیونکہ امراءِ شہر نے اس کیخلاف سمجھوتہ کر رکھا ہے۔ لیکن یہ شخص جب اپنے منصب پر بحال ہوا تو اسے شیطان نے یہ بات بھلا دی جو حضرت یوسف علیہ السلام نے اس سے کہی تھی کہ اپنے آقا کے پاس میرا ذکر کرنا۔ بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام نے اپنی رہائی کیلئے بادشاہ کے ساقی کو ذریعہ بنانا چاہا، حالانکہ انبیاء کرام کا جو مقام و مرتبہ ہے اس کے پیشِ نظر یہ بات مناسب نہیں تھی کہ آپ اللہ تعالیٰ سے فریاد کرنے کی بجائے بندوں کو رہائی کا ذریعہ بناتے۔ چنانچہ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ وہ مزید چند سال جیل میں پڑے رہے اور اس کی تائید میں ایک حدیث بھی پیش کی جاتی ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر یوسفؑ وہ بات نہ کہتے جو انہوں نے رہا ہونے والے سے کہی تو وہ کئی سال تک جیل میں نہ پڑے رہتے۔ اس سلسلے میں گزارش یہ ہے کہ جہاں تک حدیث کا تعلق ہے ہمارے آئمہ تفسیر اور محدثین نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے، اس لئے ایک پیغمبرؑ کے بارے میں اسے قبول نہیں کیا جاسکتا۔ رہی یہ بات کہ کسی شخص کو اپنی رہائی کا ذریعہ بنانا بات توکل کے خلاف ہے، یہ سراسر غلط ہے۔ توکل کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آدمی ہاتھ پاؤں توڑ کے بیٹھ جائے اور جائز تدابیر بھی اختیار نہ کرے جبکہ عدل وانصاف کے تمام دروازے بند ہو چکے ہوں۔ البتہ یہ بات توکل کیخلاف ہے کہ آدمی حالات سے دل شکستہ ہو کر ناجائز تدابیر اختیار کرنے لگے۔ جائز تدابیر اختیار کرنا اور امکانی مساعی کو بروئے کار لانا لیکن بھروسہ اللہ تعالیٰ پر رکھنا اور اسی سے مانگتے رہنا عین توکل ہے۔

ضمیر کا مرجع

فَاَنْسٰهُ الشَّيْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ بعض لوگوں کا گمان ہے کہ فَاَنْسٰهُ کی ضمیر کا مرجع حضرت یوسف علیہ السلام ہیں۔ اس لحاظ سے اس کا مطلب یہ ہوگا کہ یوسف علیہ السلام کو شیطان نے اللہ تعالیٰ کی یاد بھلا دی۔ اس لئے انہوں نے یہ بات رہا ہونے والے شخص سے کہی۔ یہ بات عقل اور نقل دونوں کے خلاف ہے۔ پیغمبر کبھی اس طرح کی غلطی کا ارتکاب نہیں کرتے۔ حضرت یوسفؑ تو کئی سال جیل میں پڑے رہے لیکن انہوں نے کبھی اپنے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے سامنے اپنی بے بسی کا اظہار نہیں کیا۔ اس ضمیر کا مرجع رہا ہونے والا شخص ہے وہ یہ بات بھول گیا کہ مجھے اپنے آقا سے حضرت یوسف علیہ السلام کی بات کہنا تھی۔ رہی یہ بات کہ آپؑ کئی سال مزید جیل میں رہے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آپؑ کو اس بات کی سزا دی گئی بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کو ابھی اور چند سال آپؑ کو جیل میں رکھنا منظور تھا تاکہ جس کارِ عظیم کیلئے آپ کو تیار کیا جارہا تھا اس کی تربیت مکمل ہوسکے۔

وَقَالَ الْمَلِكُ اِنِّیْۤ اَرٰی سَبْعَ
بَقَرٰتٍ سِمَانٍ یَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّسَبْعَ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ
وَّاُخَرَ یٰبِسٰتٍ ؕ یٰۤاَیُّهَا الْمَلَاُ اَفْتُوْنِیْ فِیْ رُءْیَایَ اِنْ كُنْتُمْ
لِلرُّءْیَا تَعْبُرُوْنَ ﴿۴۳﴾ قَالُوْۤا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ ۚ وَمَا نَحْنُ بِتَاْوِیْلِ
الْاَحْلَامِ بِعٰلِمِیْنَ ﴿۴۴﴾ وَقَالَ الَّذِیْ نَجَا مِنْهُمَا وَادَّكَرَ بَعْدَ

Marfat.com

أُمَّةٍ أَنَا أُنَبِّئُكُم بِتَأْوِيلِهِ فَأَرْسِلُونِ ﴿٤٥﴾ يُوسُفُ أَيُّهَا الصِّدِّيقُ
أَفْتِنَا فِي سَبْعِ بَقَرَاتٍ سِمَانٍ يَأْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَسَبْعِ
سُنبُلَاتٍ خُضْرٍ وَأُخَرَ يَابِسَاتٍ لَّعَلِّي أَرْجِعُ إِلَى النَّاسِ
لَعَلَّهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿٤٦﴾ قَالَ تَزْرَعُونَ سَبْعَ سِنِينَ دَأَبًا فَمَا
حَصَدتُّمْ فَذَرُوهُ فِي سُنبُلِهِ إِلَّا قَلِيلًا مِّمَّا تَأْكُلُونَ ﴿٤٧﴾ ثُمَّ
يَأْتِي مِن بَعْدِ ذَٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ يَأْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ
لَهُنَّ إِلَّا قَلِيلًا مِّمَّا تُحْصِنُونَ ﴿٤٨﴾ ثُمَّ يَأْتِي مِن بَعْدِ ذَٰلِكَ
عَامٌ فِيهِ يُغَاثُ النَّاسُ وَفِيهِ يَعْصِرُونَ ﴿٤٩﴾

رکوع: ۶۔ (اور (ایک عرصہ کے بعد) بادشاہ نے کہا کہ میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ سات موٹی گائیں ہیں جنہیں سات دُبلی گائیں کھا رہی ہیں اور سات سبز خوشے ہیں اور دوسرے سات سوکھے ہوئے ہیں۔ اے درباریو! میرے خواب کی مجھے تعبیر بتاؤ۔ اگر تم خوابوں کی تعبیر دیتے ہو۔ درباریوں نے کہا یہ خواب پریشاں ہے اور ہم پریشان خوابوں کی تعبیر کے عالم نہیں۔ اور (اس وقت) وہ شخص بولا جو بچ گیا تھا دونوں میں سے اور ایک مدت کے بعد اسے یاد آیا کہ میں آپ لوگوں کو اس کی تعبیر بتاؤں گا، پس مجھے (قیدخانہ تک) جانے دیجئے۔ اے یوسفؑ، اے راست باز! بتایئے ہمیں (اس خواب کی تعبیر) کہ سات موٹی تازی گائیں ہیں انہیں کھا رہی ہیں سات لاغر گائیں اور سات خوشے ہیں سرسبز اور دوسرے سات خوشے ہیں خشک۔ تاکہ میں اپنے لوگوں کے پاس جواب لے کر واپس جاؤں، شاید وہ آپؑ کے علم وفضل کو جان لیں۔ آپؑ نے فرمایا، تم سات سال برابر کاشت کرو گے، تو جو تم کاٹو گے اسے رہنے دو اس کے خوشوں میں، مگر تھوڑا سا (ضرورت کیلئے نکال لو) جسے تم کھاؤ۔ پھر آئیں گے اس خوشحالی کے بعد سات سال بہت سخت۔ وہ کھا جائیں گے جو ذخیرہ تم نے پہلے جمع کر رکھا ہوگا، ان کیلئے، مگر تھوڑا سا جو تم محفوظ کر لو گے، پھر آئے گا اس عرصہ کے بعد ایک سال جس میں لوگوں کی فریادرسی ہوگی اور لوگ ان میں انگور نچوڑیں گے۔)

وَقَالَ الْمَلِكُ إِنِّي أَرَىٰ سَبْعَ بَقَرَاتٍ سِمَانٍ يَأْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَسَبْعَ سُنبُلَاتٍ خُضْرٍ وَأُخَرَ يَابِسَاتٍ ۖ يَا أَيُّهَا الْمَلَأُ أَفْتُونِي فِي رُؤْيَايَ إِن كُنتُمْ لِلرُّؤْيَا تَعْبُرُونَ ﴿٤٣﴾ قَالُوا أَضْغَاثُ أَحْلَامٍ ۖ وَمَا نَحْنُ بِتَأْوِيلِ الْأَحْلَامِ بِعَالِمِينَ ﴿٤٤﴾ وَقَالَ الَّذِي نَجَا مِنْهُمَا وَادَّكَرَ بَعْدَ أُمَّةٍ أَنَا أُنَبِّئُكُم بِتَأْوِيلِهِ فَأَرْسِلُونِ ﴿٤٥﴾

Marfat.com

(اور (ایک عرصہ کے بعد) بادشاہ نے کہا کہ میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ سات موٹی گائیں ہیں جنہیں سات دُبلی گائیں کھا رہی ہیں اور سات سبز خوشے ہیں اور دوسرے سات سوکھے ہوئے ہیں۔ اے درباریو! میرے خواب کی مجھے تعبیر بتاؤ۔ اگر تم خوابوں کی تعبیر دیتے ہو۔ درباریوں نے کہا یہ خوابِ پریشاں ہے اور ہم پریشان خوابوں کی تعبیر کے عالم نہیں۔ اور (اس وقت) وہ شخص بولا جو بچ گیا تھا دونوں میں سے اور ایک مدت کے بعد اسے یاد آیا کہ میں آپ لوگوں کو اس کی تعبیر بتاؤں گا، پس مجھے (قید خانہ تک) جانے دیجئے۔ (سورۃ یوسف:۴۳،۴۴،۴۵)

اللہ تعالیٰ مسبب الاسباب ہے

حضرت یوسف علیہ السلام تقریباً دس سال تک جیل میں رہے اور وقت کے اندھے قانون نے کبھی پلٹ کر آپؑ کی طرف نہ دیکھا۔ آپؑ چونکہ عزیزِ مصر اور بعض دیگر معززین شہر کی سازش کا شکار ہوئے تھے جنہوں نے اپنی بیگمات کو قابو رکھنے کیلئے حضرت یوسفؑ کی قربانی دے ڈالی اور آپؑ کو پسِ دیوارِ زنداں بھیج کر بظاہر اس بات کا انتظام کرلیا کہ ہماری بیگمات کی بے راہ روی نے ہمارے خاندانوں پر جو بدنامی کے داغ لگائے ہیں یوسفؑ کے منظر سے ہٹ جانے سے آہستہ آہستہ مٹ جائیں گے۔ جب لوگوں کو یہ معلوم ہوگا کہ یوسف کو جیل میں بھیج دیا گیا ہے تو عام لوگ اس سے یہ نتیجہ اخذ کریں گے کہ وہ یقیناً قصوروار ہوگا اس لئے اس کو جیل بھیجا گیا۔ اور جو لوگ حقیقت کو جانتے ہیں وہ بھی رفتہ رفتہ ان واقعات کو بھول جائیں گے۔

حضرت یوسف علیہ السلام اجنبی دیس میں تھے جہاں آپؑ کا کوئی قرابت دار نہ تھا۔ غلامی کا داغ آپؑ پر لگ چکا تھا۔ شہر کے بڑے لوگوں نے راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کرلیا تھا ایسی صورتحال میں جیل میں آپؑ کا پرسانِ حال کون ہوتا اور کیونکر قانون آپ کی مدد کو پہنچتا۔ ایک رہا ہونے والا شخص جو آپ کا حد درجہ عقیدت مند تھا اس سے ایک گونہ امید پیدا ہوئی تھی لیکن وہ بھی جیل سے نکلتے ہی اپنے معمولات میں ایسا کھویا کہ اسے کبھی آپؑ کی یاد نہ آئی۔ ان حالات میں بظاہر اس کا کوئی امکان نہ تھا کہ آپؑ کبھی بھی جیل سے نکل سکیں گے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے اپنے فیصلے ہیں وہ جب کسی چیز کا فیصلہ کرلیتا ہے تو اس کیلئے اسباب بھی خود ہی فراہم کردیتا ہے۔ انہی اسباب میں بادشاہ کے خواب کو شمار کرنا چاہیے۔

بادشاہ کا خواب اور درباریوں کا جواب

بائبل اور تلمود سے معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ اپنے خواب سے نہایت پریشان تھا۔ چنانچہ اس نے صرف اپنے اہلِ دربار ہی کے سامنے نہیں بلکہ ملک بھر کے ماہرینِ تعبیر کو جمع کرکے سب کے سامنے اپنا خواب سنایا اور کہا کہ تم اگر تعبیر کا علم جانتے ہو تو مجھے میرے خواب کی تعبیر دو۔ سب نے بہ یک زبان کہا کہ یہ خواب، خوابِ پریشاں معلوم ہوتے ہیں۔ خوابِ پریشاں ایسے خوابوں کو کہتے ہیں جو عام طور پر معدے کے بخارات کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ سوءِ ہضم کی وجہ سے بعض دفعہ آدمی رات کو الٹے سیدھے خواب دیکھتا ہے جن کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔ بادشاہ کے دربار میں حاضر ہونے والوں نے ان خوابوں کو ایسے ہی خواب قرار دیا۔ اس لئے انہوں نے اس کی تعبیر بتانے سے معذرت کی۔

شاہی ساقی کی پیشکش

اَضْغَاث ضغث کی جمع ہے۔ پھولوں کے گلدستے یا گھاس پھوس اور خس وخاشاک کے گٹھے کو کہتے ہیں۔ اسی طرح یہ لفظ بے حقیقت باتوں اور خبروں کے مجموعے پر بھی بولا جاتا ہے۔ پھر اسی سے اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ کی ترکیب پیدا ہوگئی اور یہ لفظ ان افکارِ پریشاں پر بولا جانے لگا جو انسان نیند کی حالت میں دیکھتا ہے اور جس کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔ ملک بھر سے آئے ہوئے دانشوروں اور ماہرینِ تعبیر نے جب اس طرح اپنی بے بسی اور بے خبری

Marfat.com

کا اظہار کیا تو بادشاہ کی پریشانی میں اور اضافہ ہو گیا۔ اس موقع پر بادشاہ کی مجلسِ عیش وطرب کے نگران کو اچانک حضرت یوسف علیہ السلام یاد آئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے تخلیہ میں بادشاہ کے سامنے صورتحال کی وضاحت کیلئے اپنی سرگزشت بیان کی اور تفصیل سے بتایا کہ میں نے جیل میں خواب دیکھا تھا اور حضرت یوسفؑ نے میرے خواب کی تعبیر بتائی تھی اور میں اسی تعبیر کے مطابق آج آپ کی خدمت بجالا رہا ہوں۔ اور پھر حضرت یوسفؑ کے بارے میں یقیناً اس نے وہ سب عقیدت مندانہ باتیں کہی ہوں گی جو وہ حضرت یوسفؑ کیلئے اپنے دل میں رکھتا تھا۔ اور آپؑ کی پاکیزہ زندگی اور آپؑ کی دانائی اور ہوش مندی کے بارے میں ایک ایک بات بادشاہ کے گوش گزار کی ہو گی۔ اور اس کی طرح اسے امید دلائی کہ آپؑ پریشان نہ ہوں مجھے آپ جیل خانہ جانے کی اجازت دیجئے۔ میں یوسفؑ سے مل کر اس خواب کی تعبیر معلوم کرتا ہوں۔ وہ یقیناً اس خواب کی تعبیر جانتے ہوں گے۔

یُوسُفُ اَیُّهَا الصِّدِّیْقُ اَفْتِنَا فِیْ سَبْعِ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ یَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّسَبْعِ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّاُخَرَ یٰبِسٰتٍ ۙ لَّعَلِّیْۤ اَرْجِعُ اِلَى النَّاسِ لَعَلَّهُمْ یَعْلَمُوْنَ ﴿۴۶﴾ (سورۃ یوسف : ۴۶)

(اے یوسفؑ، اے راست باز! بتائیے ہمیں (اس خواب کی تعبیر) کہ سات موٹی تازی گائیں ہیں انہیں کھا رہی ہیں سات لاغر گائیں اور سات خوشے ہیں سرسبز اور دوسرے سات خوشے ہیں خشک۔ تاکہ میں اپنے لوگوں کے پاس جواب لے کر واپس جاؤں، شاید وہ آپؑ کے علم وفضل کو جان لیں۔)

شاہی ساقی کی حضرت یوسفؑ کی خدمت میں حاضری اور درخواست

بادشاہ کے ساقی نے جیل پہنچتے ہی حضرت یوسف علیہ السلام سے ملاقات کی اور آپؑ سے جن الفاظ میں خطاب کیا اور آپؑ نے آنے والے کے ساتھ جس طرح رویہ اختیار کیا، یہ دونوں باتیں قابلِ توجہ ہیں۔ آنے والا بادشاہ کا مقرب ہونے کی وجہ سے ایک بڑی حیثیت کا مالک ہے۔ لیکن وہ جس احترام کے ساتھ ایک قیدی سے مخاطب ہو رہا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کردار میں کس قدر عظمت اللہ تعالیٰ نے رکھی ہے۔ وہ اس سے پہلے جیل میں آپؑ کے ساتھ محبوس رہنے کی وجہ سے آپؑ کے طرزِ عمل اور آپؑ کی پاکبازی کو دیکھ چکا تھا۔ اس لئے اسے اس بات کا انتہائی یقین تھا کہ آپؑ کوئی پیشہ ور نجومی نہیں کہ اٹکل پچو سے کوئی بات بتا دیں بلکہ آپؑ اپنے قول وعمل میں نہایت راست باز اور اعلیٰ درجے کے سچے انسان ہیں۔ اس لئے اس بات کا تو وہم بھی نہیں ہو سکتا کہ آپؑ کوئی غلط بات کہیں گے۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ جیل میں نہ جانے قیدیوں کی کتنی بڑی تعداد ہو گی اور ان میں سے بیشتر لوگوں کا آپؑ سے واسطہ پڑتا ہو گا۔ اور اگر تلمود کے بیان کو پیشِ نظر رکھیں تو یوں کہنا چاہئے کہ جیل کے داروغہ نے جیل کا تمام انتظام وانصرام اور قیدیوں کے معاملات آپؑ ہی کے حوالے کر رکھے تھے۔ اور ان میں وقتاً فوقتاً لوگ جیل سے رہا بھی ہوتے ہونگے۔ تو جس طرح کا تاثر حضرت یوسفؑ کے بارے میں یہ بادشاہ کا ساقی لے کر گیا اور جس کا وہ نہایت ادب سے اظہار کر رہا ہے باقی جانے والے بھی یقیناً ایسا ہی عقیدت آمیز تاثر ساتھ لے کر باہر جاتے ہوں گے۔ اور باہر کی فضا میں اس معصوم اور پاکباز قیدی کے بارے میں کیسے خیالات پھیلتے ہوں گے۔

آنے والے نے حضرت یوسفؑ کو نہایت شاندار الفاظ میں خطاب کے بعد کہا کہ بادشاہ نے ایک خواب دیکھا ہے کہ سات موٹی گائیں ہیں جنہیں سات دُبلی پتلی گائیں کھا رہی ہیں۔ اور سات سرسبز خوشے ہیں اور دوسرے سات سوکھے ہوئے خوشے ہیں، آپ اس کی صحیح تعبیر فرمائیے۔ ملک بھر کے اہلِ علم نے چونکہ اس کی تعبیر سے بے خبری کا اظہار کیا ہے بلکہ وہ ان خوابوں کو افکارِ پریشاں قرار دے رہے ہیں جس نے بادشاہ کی پریشانی میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔ آپؑ اس کی تعبیر بتائیے تاکہ میں واپس جا کر لوگوں کو وہ تعبیر بتا سکوں اور اس سے یہ بھی ممکن ہے کہ وہ لوگ آپؑ کے مقام ومرتبہ کو سمجھ سکیں اور اس طرح میں بادشاہ کے حضور آپؑ کے بارے میں کوئی بات کہہ سکوں۔

یہ آنے والا وہ شخص ہے جس سے حضرت یوسفؑ نے یہ کہا تھا کہ موقع غنیمت دیکھ کر اپنے بادشاہ سے میرے متعلق بات کرنا، لیکن اس نے سالوں تک اس بات کو بھلائے رکھا۔ اب وہ ایک مدت کے بعد پلٹ کے آیا تو کوئی اور ہوتا تو اس کے ساتھ درشتی سے پیش آتا، لیکن حضرت یوسفؑ نے اس سے اس بات کا تذکرہ تک نہیں کیا۔ اور نہ آپؑ نے کوئی ایسی شرط لگائی کہ پہلے میری رہائی کا فیصلہ کرو، میں اس کے بعد تعبیر بتاؤں گا۔ آپؑ نے بغیر کسی تامل کے اور بغیر کوئی شرط عائد کئے خواب کی تعبیر بتا دی۔

Marfat.com

قَالَ تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِيْنَ دَاَبًا ۚ فَمَا حَصَدْتُّمْ فَذَرُوْهُ فِيْ سُنْۢبُلِهٖٓ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تَاْكُلُوْنَ ﴿٤٧﴾ ثُمَّ يَاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ
ذٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ يَّاْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تُحْصِنُوْنَ ﴿٤٨﴾ ثُمَّ يَاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَامٌ فِيْهِ يُغَاثُ
النَّاسُ وَفِيْهِ يَعْصِرُوْنَ ﴿٤٩﴾ (سورة یوسف : ۴۷، ۴۸، ۴۹)

(آپ نے فرمایا، تم سات سال برابر کاشت کرو گے، تو جو تم کاٹو گے اسے رہنے دو اس کے خوشوں میں، مگر تھوڑا سا (ضرورت کیلئے نکال لو) جسے تم کھاؤ۔ پھر آئیں گے اس خوشحالی کے بعد سات سال بہت سخت۔ وہ کھا جائیں گے جو ذخیرہ تم نے پہلے جمع کر رکھا ہوگا، ان کیلئے، مگر تھوڑا سا جو تم محفوظ کر لو گے، پھر آئے گا اس عرصہ کے بعد ایک سال جس میں لوگوں کی فریادرسی ہوگی اور لوگ ان میں انگور نچوڑیں گے۔)

خواب کی تعبیر

بادشاہ کے ساقی نے بادشاہ کے خواب کی تعبیر پوچھی تھی لیکن حضرت یوسف علیہ السلام نے صرف تعبیر پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ آپؑ نے اس صورتحال سے نکلنے کی تجویز بھی دی اور پھر تبشیر بھی دی۔ یعنی خوشخبری سنائی کہ اس کے بعد حالات بدلیں گے۔

آپؑ نے اس خواب کی تعبیر یہ بیان فرمائی کہ سات موٹی گائیوں سے مراد پہلے سات سال ہیں جن میں تم معمول کے مطابق برابر کاشت کرو گے۔ مصر چونکہ ایک زرعی ملک ہے اور اس وقت بھی زرعی ملک تھا جس کی گزر بسر کا زیادہ تر دارومدار بارشوں اور دریا پر تھا۔ بارشیں ہوتیں، دریائے نیل میں پانی آتا، زمین سیراب ہوتی تو فصلیں لہلہانے لگتیں اور پورے ملک کی غذائی ضرورتیں پوری ہو جاتیں۔ اسی کی طرف خواب میں اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے سات سال بارشیں ہوں گی اور تمہارے یہاں خوب پیداوار ہوگی لیکن سات سال کے بعد بارشوں کے رک جانے کے باعث اور دریائے نیل کے خشک ہو جانے کی وجہ سے خشک سالی کا آغاز ہو جائے گا۔ اور یہ خشک سالی سات سال تک چلے گی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ملک میں قحط پڑ جائے گا۔ پھر ایک سال آئے گا جب خشک سالی ختم ہوگی، خوب بارشیں برسیں گی اور بارشوں کے نتیجہ میں تیل دینے والے بیج اور رس دینے والے پھل اور میوے خوب پیدا ہوں گے اور مویشی بھی اچھا چارہ ملنے کی وجہ سے خوب دودھ دینے لگیں گے۔ یہ تو ہے اس خواب کی تعبیر۔

تعبیر سے تو صرف ایک عقدہ حل ہوا کہ بادشاہ نے جو خواب دیکھا ہے اس کا مفہوم کیا ہے۔ لیکن اس کے بعد جو اصل سوال ہے وہ یہ ہے کہ خشک سالی میں جب ملک قحط کا شکار ہو جائے گا تو لوگوں کی غذائی ضروریات کہاں سے فراہم کی جائیں گی۔ قحط تو چند دنوں کا بھی بستیاں اجاڑ دیتا ہے، سات سال کا قحط تو ملک بھر کی آبادی کیلئے تباہ کن ثابت ہو سکتا ہے۔ اس کی اگر آج سے فکر نہ کی گئی تو پھر اس وقت کیا ہوگا۔ چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام نے تعبیر کے ساتھ ہی پیدا ہونے والے مسائل کا حل بھی بتایا۔ آپؑ نے فرمایا پہلے سات سالوں میں جتنا غلہ پیدا ہو اس کو محفوظ کرنے کے انتظامات کئے جائیں، صرف اتنے خوشوں سے غلہ نکالا جائے جتنی ملک کیلئے ضرورت ہے اور راشن بندی کے ذریعے نہایت احتیاط سے ملک کے ایک ایک فرد کو ضرورت کے مطابق غلہ دیا جائے۔ باقی گندم کی پوری فصل خوشوں میں چھوڑ دی جائے۔ دانہ جب خوشے اور بالوں سے الگ ہوتا ہے تو موسم کے بعض دفعہ اثرات اسے خراب بھی کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر وہ بالوں کے اندر رہتا ہے تو نہ اس کو سُرسُری لگتی ہے اور نہ اسے کیڑا لگتا ہے۔ اس لئے باقی انتظامات کے ساتھ یہ تجویز دی کہ غلے کو خوشوں سے الگ نہ کیا جائے بجز اس مقدار کے جو غذائی ضرورت کو پورا کرنے کیلئے لازمی ہے۔ اور یہ بھی اشارہ دے دیا کہ اگر پوری احتیاط کے ساتھ غلے کی حفاظت کی جائے تو قحط سالی کے سات سال بھی آسانی سے گزر سکتے ہیں۔ پھر اس پر خوشخبری سناتے ہوئے یہ کہا کہ سات سال خوشحالی کے اور سات سال قحط سالی کے گزرنے کے بعد پندرھواں سال پھر خوشحالی کا آئے گا۔ اور اس میں پروردگار کی طرف سے بارشیں برسائی جائیں گی اور ہر لحاظ سے لوگوں کی فریادرسی کی جائے گی۔ اور پیداوار ایسی بھرپور ہوگی کہ انگور نچوڑنے والے انگور نچوڑیں گے، پھلوں کا رس پینے والے پھلوں کے رس سے شادکام ہوں گے اور ہر طرح کی غذائی ضرورتوں کی فراوانی ہوگی۔

Marfat.com

وَقَالَ الْمَلِكُ

ائْتُونِي بِهِ ۖ فَلَمَّا جَاءَهُ الرَّسُولُ قَالَ ارْجِعْ إِلَىٰ رَبِّكَ
فَاسْأَلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ اللَّاتِي قَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ ۚ إِنَّ
رَبِّي بِكَيْدِهِنَّ عَلِيمٌ ﴿٥٠﴾ قَالَ مَا خَطْبُكُنَّ إِذْ رَاوَدتُّنَّ يُوسُفَ
عَن نَّفْسِهِ ۚ قُلْنَ حَاشَ لِلَّهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِن سُوءٍ ۚ
قَالَتِ امْرَأَتُ الْعَزِيزِ الْآنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ أَنَا رَاوَدتُّهُ
عَن نَّفْسِهِ وَإِنَّهُ لَمِنَ الصَّادِقِينَ ﴿٥١﴾ ذَٰلِكَ لِيَعْلَمَ أَنِّي
لَمْ أَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَأَنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي كَيْدَ الْخَائِنِينَ ﴿٥٢﴾

وَمَا أُبَرِّئُ نَفْسِي ۚ إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ إِلَّا مَا رَحِمَ
رَبِّي ۚ إِنَّ رَبِّي غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٥٣﴾ وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي بِهِ أَسْتَخْلِصْهُ
لِنَفْسِي ۖ فَلَمَّا كَلَّمَهُ قَالَ إِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِينٌ أَمِينٌ ﴿٥٤﴾ قَالَ
اجْعَلْنِي عَلَىٰ خَزَائِنِ الْأَرْضِ ۖ إِنِّي حَفِيظٌ عَلِيمٌ ﴿٥٥﴾ وَكَذَٰلِكَ
مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ يَتَبَوَّأُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَاءُ ۚ نُصِيبُ
بِرَحْمَتِنَا مَن نَّشَاءُ ۖ وَلَا نُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ﴿٥٦﴾ وَلَأَجْرُ
الْآخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ ﴿٥٧﴾ ع

Marfat.com

رکوع: ۷۔ اور (یہ تعبیر سنتے ہی) بادشاہ نے کہا تو اس کو میرے پاس لاؤ۔ پس جب قاصد اس کے پاس آیا تو آپؑ نے فرمایا کہ لوٹ جاؤ اپنے بادشاہ کے پاس اور اس سے دریافت کرو کہ حقیقت حال کیا تھی ان عورتوں کی جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے تھے۔ بیشک میرا رب ان کے مکروفریب سے خوب آگاہ ہے۔ بادشاہ نے ان عورتوں کو بلا کر) کہا، تمہارا کیا ماجرا ہے جب تم نے یوسفؑ کو پھسلانے کی کوشش کی۔ وہ بولیں حَاشَ لِلّٰہِ ہم نے اس میں کوئی بُرائی نہیں دیکھی۔ عزیز کی بیوی بولی اب حق آشکارہ ہو گیا۔ میں نے اس کو پھسلانے کی کوشش کی۔ بیشک وہ راست بازوں میں سے ہے۔ (یوسفؑ نے کہا) یہ میں نے اس لئے کہا تھا تا کہ وہ جان لے کہ میں نے اس کی غیر حاضری میں اس کی خیانت نہیں کی اور بیشک اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں کو ہدایت نہیں دیتا۔ میں اپنے نفس کو بری نہیں قرار دیتا بیشک نفس تو بُرائیوں ہی کا حکم دینے والا ہے، مگر جب میرا رب رحم فرمائے۔ بیشک میرا رب بخشنے والا رحم فرمانے والا ہے۔ اور بادشاہ نے کہا، اس کو میرے پاس لاؤ، میں اس کو اپنا معتمدِ خاص بناؤں گا۔ پھر جب بادشاہ نے حضرت یوسفؑ سے بات کی تھی تو کہا اب آپ ہمارے یہاں بااقتدار اور معتمد ہوئے۔ حضرت یوسفؑ نے کہا مجھے ملک کے ذرائع آمدنی پر مامور کیجئے، میں حفاظت کرنے والا بھی ہوں اور علم بھی رکھتا ہوں۔ اور اس طرح ہم نے اس سرزمین میں یوسفؑ کیلئے اقتدار کی راہ ہموار کی۔ وہ اس میں جہاں چاہے متمکن ہو۔ ہم اپنے فضل سے جس کو چاہتے ہیں نوازتے ہیں۔ اور ہم خوبکاروں کے اجر کو ضائع نہیں کرتے۔ اور آخرت کا اجر کہیں بہتر ہے ان لوگوں کیلئے جو ایمان لائے اور تقویٰ پر قائم رہے۔)

وَقَالَ الْمَلِکُ ائْتُوْنِیْ بِهٖ ۚ فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُوْلُ قَالَ ارْجِعْ اِلٰی رَبِّکَ فَسْئَلْهُ مَابَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِیْ قَطَّعْنَ اَیْدِیَهُنَّ ؕ اِنَّ رَبِّیْ بِکَیْدِهِنَّ عَلِیْمٌ ﴿۵۰﴾ (سورة یوسف : ۵۰)

اور (یہ تعبیر سنتے ہی) بادشاہ نے کہا تو اس کو میرے پاس لاؤ۔ پس جب قاصد اس کے پاس آیا تو آپؑ نے فرمایا کہ لوٹ جاؤ اپنے بادشاہ کے پاس اور اس سے دریافت کرو کہ حقیقت حال کیا تھی ان عورتوں کی جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے تھے۔ بیشک میرا رب ان کے مکروفریب سے خوب آگاہ ہے۔)

بادشاہ کی دعوت اور حضرت یوسفؑ کا جواب

بادشاہ کو جب تعبیر بتائی گئی تو اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ وہ یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ نہ صرف خواب کی تعبیر بتائی گئی ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اس مصیبت سے عہدہ برآ ہونے کی تجویز بھی دی گئی ہے اور مزید یہ کہ اس کے بعد آنے والے سال کی تبشیر بھی، جس کا بظاہر کوئی تعلق خواب سے معلوم نہیں ہوتا۔ چنانچہ اس نے شدت تاثر میں فوراً حکم دیا کہ اسے میرے پاس لے کے آؤ۔ چنانچہ بادشاہ کا قاصد شاہی فرمان لے کر، یوسفؑ کے پاس پہنچا۔ یہاں اگر اس کے بعد وقفہ ہو تو ہر سوچنے والا ذہن یہی سمجھے گا کہ یوسفؑ کو جیسے ہی پیغام ملا ہوگا، اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ ہوگی۔ کیونکہ ایک معصوم اور مظلوم شخص جسے ازراہ ظلم کئی سالوں تک پسِ دیوارِ زنداں رکھا گیا ہو اور جس کی کوئی دادفریاد سننے والا بھی نہ ہو اس کیلئے بادشاہ کی طرف سے یہ پیغام کہ میرے پاس پہنچو، ایک ایسی نعمت غیر مترقبہ ہے جس کی خوشی کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ بائبل اور تلمود میں اسی فطری طرزِ بیان کو سامنے رکھ کر قصہ گوئی سے کام لیا ہے، لیکن وہ یہ بات بھول گئے ہیں کہ بادشاہ اور اس کے قاصد کو معاملہ جس شخص کے ساتھ ہے وہ عام فرد نہیں بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کا پیغمبر ہے۔ پیغمبر اپنی سطح سے کبھی نیچے نہیں گرتا۔ قرآن کریم نے جس طرح اسے بیان کیا ہے وہ پیغمبرانہ شان کے عین مطابق ہے۔ لیکن بائبل کا بیان ہے کہ بادشاہ کی طلبی پر حضرت یوسفؑ فوراً چلنے کیلئے تیار ہو گئے۔ حجامت بنوائی، کپڑے بدلے اور دربار میں جا حاضر ہوئے۔ تلمود نے اس سے بھی زیادہ گھٹیا انداز میں اس منظر کو بیان کیا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ بادشاہ نے اپنے کارندوں کو حکم دیا کہ یوسفؑ کو میرے حضور پیش کرو۔ اور یہ بھی ہدایت کردی کہ دیکھو ایسا کوئی کام نہ کرنا کہ لڑکا گھبرا جائے اور صحیح تعبیر نہ دے سکے۔ چنانچہ شاہی ملازموں نے یوسفؑ کو قید خانے سے نکالا، حجامت بنوائی، کپڑے بدلوائے اور دربار میں لا کر

Marfat.com

پیش کر دیا۔ بادشاہ اپنے تخت پر بیٹھا تھا۔ زروجواہر کی چمک دمک اور دربار کی شان دیکھ کر یوسفؑ ہکا بکارہ گیا۔ اور اس کی آنکھیں خیرہ ہونے لگیں۔ شاہی تخت کی سات سیڑھیاں تھیں۔ قاعدہ یہ تھا کہ جب کوئی معزز آدمی بادشاہ سے کچھ عرض کرنا چاہتا تو وہ چھ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جاتا اور بادشاہ سے ہمکلام ہوتا تھا اور جب ادنیٰ طبقہ کا کوئی آدمی شاہی مخاطبہ کیلئے بلایا جاتا تو وہ نیچے کھڑا رہتا اور بادشاہ تیسری سیڑھی تک اتر کر اس سے بات کرتا۔ یوسفؑ اس قاعدے کے مطابق نیچے کھڑا ہوا اور زمین بوس ہو کر اس نے بادشاہ کو سلامی دی اور بادشاہ نے تیسری سیڑھی تک اتر کر اس سے گفتگو کی۔

بائبل اور تلمود کے دونوں بیان آپ کے سامنے ہیں۔ اندازہ فرمائیے، حضرت یوسف علیہ السلام نسلاً بنی اسرائیل میں سے ہیں اور بنی اسرائیل ہی کے پیغمبر ہیں لیکن جس طرح بائبل اور تلمود نے دربار میں ان کی حاضری کی منظر کشی کی ہے اسے دیکھ کر کون اندازہ کر سکتا ہے کہ یہ انداز کسی پیغمبر کا ہو سکتا ہے۔ پیغمبر تو دنیا میں یہ سکھانے کیلئے آتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کے سامنے سر نہیں جھک سکتا اور کسی اور سے امیدیں نہیں باندھی جا سکتیں۔ حضرت یوسفؑ نے اسی جاہ و جلال کے ساتھ جیل کاٹی، یہ کیسے ممکن تھا کہ اب انہیں عزت سے دربار میں لایا جا رہا ہے تو وہ اس طرح خود سپردگی کا اظہار کرتے جس سے معلوم ہوتا کہ آپؑ کی سطح کسی عام آدمی سے بلند نہیں۔

بائبل اور تلمود کے بالکل برعکس قرآن کریم نے جس طرح اس واقعہ کو بیان کیا ہے وہ پیغمبرانہ شان کی عکاسی کرتا ہے۔ آپؑ کے پاس جیسے ہی قاصد پہنچا، آپؑ اپنی رہائی کی خبر سن کر خوشی سے بے قابو نہیں ہوئے بلکہ آپؑ نے نہایت تحمل اور بردباری کے ساتھ صرف یہ فرمایا کہ اپنے آقا کے پاس واپس جاؤ اور جا کر ان سے کہو کہ مجھے جس جرم میں جیل بھیجا گیا تھا پہلے اس کی تحقیق کریں۔ ان عورتوں کو بلا کر پوچھیں جنہوں نے عزیزِ مصر کے گھر مجھے دیکھتے ہی اپنے ہاتھ کاٹ لئے تھے۔ ان سے معلوم کیجئے کہ ایسا کیوں ہوا تھا اور اس کے پیچھے کیا سازش تھی؟ اور اس پر میرا ردِعمل کیا تھا۔ جب تک اس معاملے کا فیصلہ نہیں ہو جاتا میں اس وقت تک باہر نہیں آ سکتا۔ اندر میں لوگوں کی زبانوں سے محفوظ ہوں۔ باہر نکلوں گا تو جس طرح مجھے بدنام کیا گیا ہے وہ لوگ جو حقیقت سے واقف نہیں ہیں وہ مجھے اسی بدنامی کی نگاہ سے دیکھیں گے۔ ایک مصلح اور ایک پیغمبر کی حقیقی قوت اس کا بے عیب کردار ہوتا ہے۔ داغدار سیرت و کردار ایک ایسی کمزوری ہے جو کسی بڑے مقصد کیلئے انسان کو کھڑا نہیں ہونے دیتی۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے جن الفاظ میں اپنے معاملے کی انکوائری کرنے کا کہا وہ بھی قابلِ غور ہے۔ آپؑ نے یہ نہیں فرمایا کہ مجھ پر جو الزام لگایا گیا تھا اس کی حقیقت کیا تھی بلکہ آپ نے یہ کہا کہ ان عورتوں سے یہ معلوم کیجئے کہ جب انہوں نے یوسفؑ کو بہکانے کی کوشش کی تو اس کی اصل حقیقت کیا تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بادشاہ اس بات سے بے خبر نہیں تھا کہ بڑے گھروں کی کچھ بیگمات نے اس طرح ایک شریف نوجوان کو پھانسنے اور بہکانے کی کوشش کی تھی کیونکہ اگر معاملہ یہ نہ ہوتا تو حضرت یوسفؑ کے الفاظ مختلف ہوتے۔

اس آیت میں ایک اور بات بھی نہایت سبق آموز ہے، وہ یہ کہ اصل بنائے فساد تو زلیخا کی ذات تھی، اسی نے سب سے پہلے آپؑ پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کی اور آپؑ نے جب اپنی پاکدامنی پر استقامت دکھائی اور اس کے گناہ کی ہر دعوت کو رد کر دیا تو وہ انتقام پر اتر آئی، لیکن آپؑ نے بادشاہ کے نام پیغام میں دوسری عورتوں کا ذکر تو کیا لیکن زلیخا کی طرف اشارہ تک بھی نہیں کیا۔ اس کی وجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ آپؑ کی عالی ظرفی نے اسے گوارا نہ کیا کہ جس خاتون کے شوہر نے آپؑ کو اپنے گھر میں عزت دی بجائے غلام بنا کے رکھنے کے گھر کا مالک بنا دیا۔ گھر اور جاگیر کا تمام انتظام آپؑ کے سپرد کر دیا۔ اس کی بیوی نے اگر بے راہ روی اختیار کی تو وہ خود بھی اس سے واقف ہے۔ مجھے بہر حال ایسی کوئی بات نہیں کہنی چاہئے جس سے اس کی عزت پر حرف آ جائے کیونکہ اس کی بیوی بہر حال اس کی عزت ہے۔

قَالَ مَا خَطْبُكُنَّ اِذْ رَاوَدْتُّنَّ يُوْسُفَ عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوْٓءٍ ؕ قَالَتِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ الْـٰٔنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ ۫ اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۵۱﴾ (سورۃ یوسف : ۵۱)

(بادشاہ نے ان عورتوں کو بلا کر) کہا تمہارا کیا ماجرا ہے جب تم نے یوسفؑ کو پھسلانے کی کوشش کی۔ وہ بولیں حَاشَ لِلّٰہِ ہم نے اس میں کوئی برائی نہیں دیکھی۔ عزیز کی بیوی بولی اب حق آشکارہ ہو گیا۔ میں نے اس کو پھسلانے کی کوشش کی۔ بیشک وہ راست بازوں میں سے ہے۔)

Marfat.com

بیگمات مصر کے واقعہ کی تحقیق

بادشاہ نے بیگمات مصر کو بلا کر صورتحال دریافت کی۔ قرآن کریم کے الفاظ میں دونوں باتوں کا احتمال ہے کہ بادشاہ نے ان بیگمات کو اپنے حضور میں طلب کیا ہو اور براہِ راست ان سے استفسار کیا ہو یا اپنے قاصد کے ذریعے اس معاملے کی تحقیق کروائی ہو۔ صورتحال کچھ بھی ہو مقصد صرف یہ ہے کہ اس واقعہ کی تحقیق بادشاہ نے اپنی نگرانی میں کروائی۔ جواب میں بیگمات مصر نے اعتراف کیا کہ ہم نے یوسفؑ میں ایسی کسی کمزوری کا شائبہ بھی نہیں پایا۔ ان میں زلیخا بھی موجود تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک ان کے اندر کا ضمیر زندہ تھا، اس لئے وہ ضمیر کی ملامت سے مجبور ہو کر بول اٹھیں کہ اب جبکہ ہر بات کھل گئی ہے اور حق پوری طرح واضح ہو گیا ہے تو میں اس بات کا اعتراف کرتی ہوں کہ میں نے یوسفؑ کو بہکانے کی کوشش کی۔ یہ بیگمات مصر تک معاملہ بھی میری وجہ سے پہنچا۔ انہیں بھی میں نے گھر میں دعوت دی تھی۔ اس لئے جو کچھ ذمہ داری ہے وہ مجھ پر عائد ہوتی ہے۔ جہاں تک یوسفؑ کا تعلق ہے وہ یقیناً راست باز لوگوں میں سے ہے۔

اندازہ فرمائیے کہ جب اس معاملے کی خبر باہر لوگوں تک پہنچی ہوگی تو ان پر اس کے کیا اثرات ہوئے ہوں گے۔ مصر کا طبقۂ خواص اور ان کی بیگمات تو یوسفؑ سے پہلے ہی شناسا تھے۔ یوسفؑ کی عظمت ان سے پہلے ہی اپنا آپ منوا چکی تھی۔ البتہ انہوں نے اپنی بدنامی سے بچنے کیلئے آپؑ کو زنداں کی نذر کر دیا۔ زلیخا کا جواب بتاتا ہے کہ جس طرح وہ ضمیر کی ملامت کا شکار تھی ممکن ہے طبقۂ امراء کے باقی لوگ بھی ایسے ہی احساسات رکھتے ہوں۔ لیکن لوگوں میں جب یہ خبریں پہنچیں کہ ایک نوجوان ہے جسے دس سال کی قید کے بعد رہائی مل رہی ہے لیکن اسے اپنی رہائی سے زیادہ اپنے اوپر لگے ہوئے الزامات سے براءت کی فکر ہے۔ ایسا حوصلہ مند اور بلند کردار آدمی مصر کی مٹی نے کیسے پیدا کر دیا۔ یہاں تو ایسی جنس نہیں پائی جاتی۔ یقیناً انہیں حضرت یوسفؑ سے عقیدت پیدا ہو گئی ہوگی اور ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی یقیناً صحیح ہے کہ بادشاہ اس سے پہلے تعبیر اور یوسفؑ کی خوبیاں سن کر ان کا معترف ہو چکا تھا اور اب جب اس نے حضرت یوسفؑ کی بے نیازی اور بلند ہمتی دیکھی اور عورتوں سے ان کی راست بازی کا اعتراف سنا تو پہلے اگر وہ معترف تھا تو اب گرویدہ ہو گیا۔ اور اس کی گرویدگی کا اندازہ آگے آنے والی اس کی گفتگو سے ہوتا ہے۔

ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ ﴿۵۲﴾ وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ ۭ اِنَّ رَبِّيْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۵۳﴾ (سورۃ یوسف : ۵۲، ۵۳)

(یوسفؑ نے کہا) یہ میں نے اس لئے کہا تھا تاکہ وہ جان لے کہ میں نے اس کی غیر حاضری میں اس کی خیانت نہیں کی اور بیشک اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں کو ہدایت نہیں دیتا۔ میں اپنے نفس کو بری نہیں قرار دیتا بیشک نفس تو برائیوں ہی کا حکم دینے والا ہے، مگر جب میرا رب رحم فرمائے۔ بیشک میرا رب بخشنے والا رحم فرمانے والا ہے۔)

تحقیقات کے مطالبے کا سبب

یہ بات معلوم ہوتا ہے حضرت یوسف علیہ السلام نے اس وقت فرمائی جب انہیں عزیزِ مصر کی بیوی اور بیگمات مصر کے اعتراف کی خبر پہنچی۔ اور ساتھ ہی اس بات کی بھی کہ ان سب نے اس بات کا برملا اعتراف کیا ہے کہ حضرت یوسفؑ نے آج تک جو کچھ کہا اور کیا اس میں کہیں بھی جھوٹ کا شائبہ نہ تھا۔ وہ نہایت راست باز آدمی ہیں جو کچھ ان کے خلاف الزامات کی دھول اڑائی گئی وہ سب ہمارا کیا دھرا تھا۔ اس پر حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ فرمایا کہ میرا مقصد نہ تو اپنی پاکدامنی کی تشہیر تھا اور نہ بیگمات اور زلیخا کو بدنام کرنا مقصود تھا بلکہ یہ میں نے اس لئے کیا تاکہ بادشاہ یا عزیزِ مصر کو معلوم ہو جائے کہ میں نے عزیزِ مصر کے گھر میں رہ کر اس کی عزت پر ڈاکہ نہیں ڈالا۔ وہ میرا محسن تھا اور کوئی شریف آدمی بھی اپنے محسن کی عزت پر حملہ نہیں کرتا۔ میرے ارادے میں بھی کبھی فتور نہیں آیا۔ اس لئے میں کہہ سکتا ہوں کہ میں نے کبھی اس کی امانت میں خیانت نہیں کی۔ یہ بات ثابت کرنا میری طرف سے ضروری تھا ورنہ اگر میں خاموشی سے باہر آجاتا تو یہ بدنامیاں میرا پیچھا کرتیں اور میں لوگوں کی اصلاح کا کام کبھی نہ کر سکتا۔ اور لوگوں کی بداخلاقی پر کبھی تنقید نہ کر سکتا۔

Marfat.com

جو ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہوتا ہے

معلوم ہوتا ہے اس کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام کو خیال آیا کہ میں نے اگرچہ جو کچھ کیا ایک ضرورت کے تحت کیا، تب بھی اس میں ایک ادعا معلوم ہوتا ہے۔ گویا میں اپنے آپ کو بہت پارسا سمجھتا ہوں اور اپنی پارسائی کو شہرت دینا چاہتا ہوں حالانکہ کسی نیک سے نیک آدمی کو بھی اپنی نیکی پر گھمنڈ نہیں ہونا چاہئے۔ اسی احساس کے تحت انہوں نے فوری طور پر فرمایا کہ میں اپنے نفس کو گناہوں سے بالاتر نہیں سمجھتا۔ نفس میرے ساتھ بھی لگا ہوا ہے اور دوسرے لوگوں کی طرح یہ مجھے بھی برائی کی راہ سجھا سکتا ہے۔ اس لئے مجھے اگر اس برائی سے بچنے کا موقع ملا ہے تو یہ محض اللہ تعالیٰ کی توفیق ہے اور میرے رب کا فضل و کرم ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اس کی توفیق کسی شخص پر بھی بے سبب نہیں ہوتی۔ اس کا قانون یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب کسی بندۂ مومن کو شیطان گناہ کی دعوت دیتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے بھروسے پر اس گناہ سے بچنے کی کوشش کرتا ہے اور عزم صمیم کر لیتا ہے کہ کچھ بھی ہو جائے میں شیطان کے جال میں نہیں پھنسوں گا تو پھر اللہ تعالیٰ اس بندۂ مومن کی ضرور مدد کرتا ہے۔ وہ اس کیلئے بچ نکلنے کے راستے آسان کر دیتا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص محض خواہش رکھتا ہے کہ میں گناہ میں آلودہ نہ ہوں لیکن اس سے بچنے کی کوئی کوشش نہیں کرتا بلکہ گناہ کی ترغیبات کے ساتھ بہتا چلا جاتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ بجائے اس کو گناہ سے بچانے کے برائی اس کیلئے آسان کر دیتے ہیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام اسی قانون کی طرف اشارہ فرما رہے ہیں کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے مدد مانگی اور اس کے بھروسے پر برائی کیخلاف کھڑے ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ مجھے ہر طرح کی ترغیب دی گئی اور ہر طرح کی ترہیب سے کام لیا گیا۔ لیکن جب میں نیکی کے ارادے میں پختہ نکلا تو اللہ تعالیٰ نے میری دستگیری فرمائی اور ہر طرح کے حالات میں مجھے ہر طرح کے گناہ میں آلودہ ہونے سے محفوظ رکھا کیونکہ میرا رب غفور بھی ہے اور رحیم بھی۔

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي بِهِ أَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِي ۖ فَلَمَّا كَلَّمَهُ قَالَ إِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِينٌ أَمِينٌ ﴿۵۴﴾

(اور بادشاہ نے کہا، اس کو میرے پاس لاؤ، میں اس کو اپنا معتمدِ خاص بناؤں گا۔ پھر جب بادشاہ نے حضرت یوسفؑ سے بات کی تھی تو کہا اب آپ ہمارے یہاں با اقتدار اور معتمد ہوئے۔) (سورۃ یوسف: ۵۴)

حضرت یوسفؑ سے بادشاہ کی گرویدگی اور اس کا سبب

بادشاہ کے خواب کی تعبیر ملک کا کوئی صاحب علم نہ بتا سکا تو شاہی ساقی کے کہنے پر حضرت یوسف علیہ السلام سے تعبیر معلوم کی گئی۔ آپؑ نے بغیر کسی تامل کے نہ صرف خواب کی تعبیر بیان کی بلکہ آنے والے ناگفتہ بہ حالات سے عہدہ برآ ہونے کی تجویز بھی دی تو بادشاہ کیلئے یہ ایک حیران کن بات تھی کہ جس بات کا جواب پورے ملک کے دانشوروں سے نہ بن پڑا، اس کا جواب ایک قیدی نے اس سلیقے سے دیا ہے اور پھر حالات کو کنٹرول کرنے کیلئے ایسی تجویز دی ہے کہ جس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے تو بادشاہ کو یقین ہو گیا کہ یہ نوجوان یقیناً غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک ہے۔ چنانچہ اس نے اپنے قاصد کو یوسفؑ کو دربار میں لانے کیلئے بھیجا۔ لیکن حضرت یوسفؑ نے بجائے اس عزت افزائی پر خوش ہونے کے نہایت وقار سے فرمایا کہ پہلے اس جرم کی تحقیق کی جائے جس کی پاداش میں مجھے جیل بھیجا گیا تھا۔ تو بادشاہ کو ایک اور اچنبھا ہوا کہ یہ نوجوان معلوم ہوتا ہے کہ اپنے زمانہ سے بہت بلند واقع ہوا ہے۔ وہ جیل میں ہونے کے باوجود شاہانہ جاہ و جلال کا مالک ہے۔ نہ اسے کوئی ترغیب رام کر سکتی ہے اور نہ ترہیب اس کے پاؤں میں تزلزل پیدا کر سکتی ہے تو اس کے دل میں یوسفؑ کیلئے اور قدر و منزلت پیدا ہوئی۔ اور پھر جب بیگمات مصر نے بادشاہ کے استفسار پر یوسفؑ کی بلند کرداری کی گواہی دی تو یوسفؑ کیلئے اس کی گرویدگی میں اور اضافہ ہو گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ یہ نوجوان اگر ایک طرف غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک ہے تو دوسری طرف سیرت و کردار کی پاکیزگی میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ اور تیسری طرف اس کی بے نیازی کا عالم یہ ہے کہ کوئی لالچ اسے اس کے موقف سے ہٹا نہیں سکتا۔

خواب کی تعبیر آنے والے دنوں کے بارے میں اسے پہلے ہی فکر مند بنا چکی تھی۔ اور ملک کے حالات بھی کوئی بہت بہتر نہیں تھے۔ تو اس کے ذہن نے یہ فیصلہ کیا کہ آج کے دور کا اگر کوئی مردِ کار ہو سکتا ہے تو وہ یہی شخص ہے، میں کیوں نہ اسے اپنا معتمدِ خاص بنا لوں اور اس کے ناخنِ تدبیر سے نہ

Marfat.com

صرف ملک کے حالات کو بہتر کروں بلکہ آنے والے حالات میں بھی اس کی ذہانت وفطانت سے کام لوں۔ چنانچہ حکم دیا کہ یوسفؑ کو میرے پاس لاؤ تا کہ میں اسے اپنا معتمدِ خاص بناؤں۔ چنانچہ آپ کو بادشاہ کے پاس لایا گیا۔ دونوں میں ملاقات ہوئی۔ بادشاہ نے ملکی حالات پر حضرت یوسفؑ سے گفتگو کی۔ یقیناً اس میں ملک کے انتظامی، دینی اور اخلاقی مسائل بھی زیر بحث آئے ہوں گے اور ہر طرح کے معاملے پر حضرت یوسفؑ نے اپنی رائے دی ہوگی۔ اس سے پہلے تو بادشاہ بعض حیران کن باتوں سے یوسفؑ کا گرویدہ تھا اب جب اسے ملاقات کا موقع ملا اور تفصیل سے باتیں ہوئیں تو تب اسے حضرت یوسفؑ کے بارے میں صحیح صورتحال جاننے کا موقع ملا۔ اس نے جیسا کچھ اندازہ کیا تھا، حضرت یوسفؑ کو اس سے کہیں بڑھ کر پایا۔ چنانچہ پہلے تو اس کا خیال صرف یہ تھا کہ میں اسے اپنے لئے خاص کرلوں گا، وہ میرا معتمد بن کے رہے گا اور اس کی حیثیت میرے مشیر کی ہوگی، لیکن اب اس نے بے ساختہ پیشکش کی کہ ہم آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ آپؑ اس ملک کا اقتدار سنبھالیں۔ آپؑ مکین بھی ہیں اور امین بھی۔ بائبل میں کہا گیا ہے کہ فرعون نے یوسفؑ سے کہا (سو تو میرے گھر کا مختار ہوگا اور میری ساری رعایا تیرے حکم پر چلے گی، فقط تخت کا مالک ہونے کے سبب سے میں بزرگ تر ہوں گا...... دیکھ میں تجھے سارے ملکِ مصر کا حاکم بناتا ہوں...... اور تیرے حکم کے بغیر کوئی آدمی اس سارے ملکِ مصر میں اپنا ہاتھ یا پاؤں ہلانے نہ پائے گا۔ (پیدائش:۔۴۱، ۳۹، ۴۵) اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ آپ کو مکین اور امین کہہ کر جس بات کی پیشکش کی گئی تھی اس کا مفہوم کیا تھا۔

قَالَ اجۡعَلۡنِیۡ عَلٰی خَزَآئِنِ الۡاَرۡضِ ۚ اِنِّیۡ حَفِیۡظٌ عَلِیۡمٌ ﴿۵۵﴾ (سورۃ یوسف : ۵۵)

(حضرت یوسفؑ نے کہا مجھے ملک کے ذرائع آمدنی پر مامور کیجئے، میں حفاظت کرنے والا بھی ہوں اور علم بھی رکھتا ہوں۔)

حضرت یوسفؑ کا مطالبہ

گزشتہ آیت میں بیان کردہ پیشکش کے جواب میں حضرت یوسفؑ نے کہا میں اقتدار سنبھالنے کیلئے تیار ہوں لیکن اس کیلئے ضروری ہے کہ ملک کے تمام ذرائع اور وسائل جن کا تعلق آمدنی سے ہے اور جن کی وجہ سے ملک چلتا ہے انہیں میرے حوالے کر دیجئے کیونکہ عام طور پر دیکھا یہ گیا ہے کہ جب کبھی ریاستیں بہتر لوگوں کو کسی بھلائی کی خاطر اپنے اختیارات میں شریک کرتی ہیں تو عموماً مالی اختیارات انہیں نہیں دیئے جاتے کیونکہ حقیقت میں جس شخص کے ہاتھ میں مالی امور ہوتے ہیں اصل اختیار اسی کے پاس ہوتا ہے۔ بعض لوگوں نے خزائنِ ارض کے الفاظ اور آگے چل کر غلہ کی تقسیم کا ذکر دیکھ کر قیاس کیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو شاید افسرِ خزانہ یا افسرِ مال یا قحط کمشنر یا وزیرِ مالیات یا وزیرِ خوراک کی قسم کا کوئی عہدہ دیا گیا تھا۔ لیکن ہم بائبل سے جو حوالے دے چکے ہیں اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس سے مراد سلطنتِ مصر کا مکمل اقتدار تھا۔ تورات کی پیدائش ۴۱ اور ۴۴ میں ہے کہ پھر فرعون نے یوسفؑ سے کہا دیکھ میں نے تجھے ساری زمینِ مصر پر حکومت بخشی اور فرعون نے اپنی انگشتری اپنے ہاتھ سے نکال کر یوسفؑ کے ہاتھ میں پہنا دی۔ تب اس کے آگے منادی کی گئی کہ سب ادب سے رہو اور اس نے اسے مصر کی ساری مملکت پر حاکم کیا اور یوسفؑ کو کہا میں فرعون ہوں اور تیرے حکم کے بغیر مصر کی ساری زمین میں کوئی انسان اپنا ہاتھ یا پاؤں نہ اٹھائے گا۔

ایک سوال اور اس کا جواب

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت یوسفؑ نے یہ اختیارات کس غرض کیلئے مانگے تھے۔ انہوں نے اپنی خدمات اس لئے پیش کی تھیں کہ ایک کافر حکومت کے نظام کو اس کے کافرانہ اصول وقوانین ہی پر چلائیں یا ان کے پیشِ نظر یہ تھا کہ حکومت کا اقتدار اپنے ہاتھ میں لے کر ملک کے نظام تمدن و اخلاق وسیاست کو اسلام کے مطابق ڈھال دیں۔ صاحب تفہیم القرآن نے اس کے جواب میں ایک نوٹ لکھا ہے، ہم اس سے استفادہ کرتے ہیں۔

اس سوال کا بہترین جواب وہ ہے جو علامہ زمخشری نے اپنی تفسیر "کشاف" میں دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

Marfat.com

''حضرت یوسفؑ علیہ السلام نے اجعلنی علٰی خزائن الارض جو فرمایا تو اس سے ان کی غرض صرف یہ تھی کہ ان کو اللہ تعالیٰ کے احکام جاری کرنے اور حق قائم کرنے اور عدل پھیلانے کا موقع مل جائے اور وہ اس کام کو انجام دینے کی طاقت حاصل کر لیں جس کیلئے انبیاءؑ بھیجے جاتے ہیں۔ انہوں نے بادشاہی کی محبت اور دنیا کے لالچ میں یہ مطالبہ نہیں کیا تھا بلکہ یہ جانتے ہوئے کیا تھا کہ کوئی دوسرا شخص ان کے سوا ایسا نہیں ہے جو اس کام کو انجام دے سکے۔''

اور سچ یہ ہے کہ یہ سوال دراصل ایک اور سوال پیدا کرتا ہے جو اس سے بھی زیادہ اہم اور بنیادی سوال ہے اور وہ یہ ہے کہ حضرت یوسفؑ علیہ السلام آیا پیغمبر بھی تھے یا نہیں؟ اگر پیغمبر تھے تو کیا قرآن میں ہم کو پیغمبری کا یہی تصور ملتا ہے کہ اسلام کا داعی خود نظام کفر کو کافرانہ اصولوں پر چلانے کیلئے اپنی خدمات پیش کرے؟ بلکہ یہ سوال اس پر بھی ختم نہیں ہوتا، اس سے بھی زیادہ نازک اور سخت ایک دوسرے سوال پر جا کر ٹھہرتا ہے، یعنی یہ کہ حضرت یوسفؑ علیہ السلام ایک راستباز آدمی بھی تھے یا نہیں؟ اگر راستباز تھے تو کیا ایک راستباز انسان کا یہی کام ہے کہ قید خانے میں تو وہ اپنی پیغمبرانہ دعوت کا آغاز اس سوال سے کرے کہ ''بہت سے رب بہتر ہیں یا وہ ایک اللہ تعالیٰ جو سب پر غالب ہے۔'' اور بار بار اہلِ مصر پر بھی واضح کر دے کہ تمہارے ان بہت سے متفرق خود ساختہ خداؤں میں سے ایک یہ شاہِ مصر بھی ہے اور صاف صاف اپنے مشن کا بنیادی عقیدہ یہ بیان کرے کہ ''فرمانروائی کا اقتدار خدائے واحد کے سوا کسی کیلئے نہیں ہے۔'' مگر جب عملی آزمائش کا وقت آئے تو وہی شخص خود اس نظام حکومت کا خادم بلکہ ناظم اور محافظ اور پشت پناہ تک بن جائے جو شاہ مصر کی ربوبیت میں چل رہا تھا اور جس کا بنیادی نظریہ ''فرمانروائی کے اختیارات خدا کیلئے نہیں بلکہ بادشاہ کیلئے ہیں'' تھا؟

حقیقت یہ ہے کہ اس مقام کی تفسیر میں دور انحطاط کے مسلمانوں نے کچھ اسی ذہنیت کا اظہار کیا ہے جو کبھی یہودیوں کی خصوصیت تھی۔ یہ یہودیوں کا حال تھا کہ جب وہ ذہنی و اخلاقی پستی میں مبتلا ہوئے تو پچھلی تاریخ میں جن جن بزرگوں کی سیرتیں ان کو بلندی پر چڑھنے کا سبق دیتی تھیں ان سب کو وہ نیچے گرا کر اپنے مرتبے پر اتار لائے تاکہ اپنے لئے اور زیادہ نیچے گرنے کا بہانہ پیدا کریں۔ افسوس کہ یہی کچھ مسلمانوں نے بھی کیا۔ انہیں کافر حکومتوں کی چاکری کرنی تھی مگر اس پستی میں گرتے ہوئے اسلام اور اس کے علمبرداروں کی بلندی دیکھ کر انہیں شرم آئی، لہٰذا اس شرم کو مٹانے اور اپنے ضمیر کو راضی کرنے کیلئے یہ اپنے ساتھ اس جلیل القدر پیغمبر کو بھی خدمتِ کفر کی گہرائی میں لے گرے جس کی زندگی دراصل انہیں یہ سبق دے رہی تھی کہ اگر کسی ملک میں ایک اور صرف ایک مردِ مومن بھی خالص اسلامی اخلاق اور ایمانی فراست و حکمت کا حامل ہو تو وہ تن تنہا مجرد اپنے اخلاق اور اپنی حکمت کے زور سے اسلامی انقلاب برپا کر سکتا ہے اور یہ کہ مومن کی اخلاقی طاقت (بشرطیکہ وہ اس کا استعمال جانتا ہو اور اسے استعمال کرنے کا ارادہ بھی رکھتا ہو) فوج اور اسلحہ اور سروسامان کے بغیر بھی ملک فتح کر سکتی ہے اور سلطنتوں کو مسخر کر لیتی ہے۔

وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ ۚ يَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ ۚ نُصِيْبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَآءُ وَلَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۶﴾ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿۵۷﴾

(اور اس طرح ہم نے اس سرزمین میں یوسفؑ کیلئے اقتدار کی راہ ہموار کی۔ وہ اس میں جہاں چاہے متمکن ہو۔ ہم اپنے فضل سے جس کو چاہتے ہیں نوازتے ہیں۔ اور ہم خوبکاروں کے اجر کو ضائع نہیں کرتے۔ اور آخرت کا اجر کہیں بہتر ہے ان لوگوں کیلئے جو ایمان لائے اور تقویٰ پر قائم رہے۔) (سورۃ یوسف:۵۶،۵۷)

حضرت یوسفؑ کا کلی اقتدار

حضرت یوسفؑ اور بادشاہ کی ملاقات کے بعد جب حضرت یوسفؑ نے بادشاہ کی اقتدار کی پیشکش قبول کر لی تو پروردگار نے اس آیت میں اس کی وضاحت فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا: کہ اس طرح سے ہم نے حضرت یوسف علیہ السلام کو مکمل طور پر مصر کا حکمران بنا دیا۔ ملک کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جو آپؑ کے اقتدار سے باہر ہو۔ آپؑ جہاں چاہتے، جا سکتے تھے۔ اپنا ٹھکانہ بنا سکتے تھے، کسی جگہ بھی فروکش ہو سکتے تھے، ہر جگہ کا دورہ کر سکتے تھے اور ہر جگہ کے نظم و نسق میں تبدیلی پیدا کر سکتے تھے۔ ہمارے قدیم مفسرین نے اس کا یہی مفہوم سمجھا ہے کہ حضرت یوسفؑ اس طرح مطلق العنان حکمران بن گئے تھے کہ اگر آپؑ چاہتے تو فرعون کو بھی اپنا زیردست بنا سکتے تھے۔ مجاہدؒ کا قول نقل کیا گیا ہے جو مشہور آئمہ تفسیر میں سے ہیں کہ بادشاہِ مصر نے حضرت یوسفؑ کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا تھا۔

Marfat.com

خوب کاروں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ

آیت کریمہ کے دوسرے حصے میں دو حقیقتیں واضح فرمائی گئی ہیں۔ ایک تو یہ کہ درحقیقت تمام اختیار واقتدار اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جب کسی کو اپنے فضل ورحمت سے نوازنا چاہے تو کوئی اس کا ہاتھ پکڑنے والا نہیں۔ وہ ایک قیدی کو زنداں سے نکال کر تختِ حکومت پر پہنچانے کا فیصلہ کرلے تو اس کی قدرت ومشیت سے کوئی بعید نہیں اور دوسری یہ بات کہ اس کے راستے پر چلنے والے چاہے کیسے ہی حالات میں مبتلا کیوں نہ ہوں اور کیسی کیسی آزمائشوں سے انہیں واسطہ کیوں نہ پڑے اگر وہ اس میں استقامت کا ثبوت دیں تو اللہ تعالیٰ کبھی ان کا اجر ضائع نہیں کرتا۔ دنیا میں بھی صلہ دیتا ہے اور آخرت میں تو صلہ نہ ملنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ کسی کو دنیا میں کس طرح کا صلہ دیا جائے اور اسے کس حال میں رکھا جائے اور جہاں تک آخرت میں صلہ کا تعلق ہے اس میں سب کیلئے جنت کی نوید سنائی گئی ہے۔ البتہ مدارج مختلف ہوسکتے ہیں۔ دوسری آیت میں یہ فرمایا کہ اہلِ ایمان کو اس بات کا یقین رکھنا چاہئے کہ صلہ تو اللہ تعالیٰ دنیا میں بھی دیتا ہے لیکن آخرت کا اجر وہ اس سے کہیں بڑھ کر ہے اور یہ انہیں لوگوں کا حصہ ہے جو ایمان پر ثابت قدم رہیں اور اللہ تعالیٰ کی ہر طرح کی نافرمانی سے لرزاں اور ترساں رہیں۔

وَجَآءَ إِخْوَةُ

يُوسُفَ فَدَخَلُوا عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهُ مُنْكِرُونَ ﴿٥٨﴾ وَلَمَّا
جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ قَالَ ائْتُونِي بِأَخٍ لَكُمْ مِنْ أَبِيكُمْ ۚ أَلَا
تَرَوْنَ أَنِّي أُوفِي الْكَيْلَ وَأَنَا خَيْرُ الْمُنْزِلِينَ ﴿٥٩﴾ فَإِنْ لَمْ تَأْتُونِي
بِهِ فَلَا كَيْلَ لَكُمْ عِنْدِي وَلَا تَقْرَبُونِ ﴿٦٠﴾ قَالُوا سَنُرَاوِدُ عَنْهُ
أَبَاهُ وَإِنَّا لَفَاعِلُونَ ﴿٦١﴾ وَقَالَ لِفِتْيَانِهِ اجْعَلُوا بِضَاعَتَهُمْ فِي
رِحَالِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَعْرِفُونَهَا إِذَا انْقَلَبُوا إِلَىٰ أَهْلِهِمْ لَعَلَّهُمْ
يَرْجِعُونَ ﴿٦٢﴾ فَلَمَّا رَجَعُوا إِلَىٰ أَبِيهِمْ قَالُوا يَا أَبَانَا مُنِعَ مِنَّا الْكَيْلُ
فَأَرْسِلْ مَعَنَا أَخَانَا نَكْتَلْ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ﴿٦٣﴾ قَالَ هَلْ
آمَنُكُمْ عَلَيْهِ إِلَّا كَمَا أَمِنْتُكُمْ عَلَىٰ أَخِيهِ مِنْ قَبْلُ ۖ فَاللَّهُ

Marfat.com

خَيْرٌ حٰفِظًا ۖ وَّهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿٦٤﴾ وَلَمَّا فَتَحُوْا مَتَاعَهُمْ
وَجَدُوْا بِضَاعَتَهُمْ رُدَّتْ اِلَيْهِمْ ؕ قَالُوْا يٰۤاَبَانَا مَا نَبْغِيْ ؕ هٰذِهٖ
بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ اِلَيْنَا ۚ وَنَمِيْرُ اَهْلَنَا وَنَحْفَظُ اَخَانَا وَنَزْدَادُ كَيْلَ
بَعِيْرٍ ؕ ذٰلِكَ كَيْلٌ يَّسِيْرٌ ﴿٦٥﴾ قَالَ لَنْ اُرْسِلَهٗ مَعَكُمْ حَتّٰى تُؤْتُوْنِ
مَوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ لَتَاْتُنَّنِيْ بِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ يُّحَاطَ بِكُمْ ۚ فَلَمَّاۤ اٰتَوْهُ
مَوْثِقَهُمْ قَالَ اللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ ﴿٦٦﴾ وَقَالَ يٰبَنِيَّ
لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ ؕ
وَمَاۤ اُغْنِيْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ عَلَيْهِ
تَوَكَّلْتُ ۚ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ﴿٦٧﴾ وَلَمَّا دَخَلُوْا مِنْ حَيْثُ
اَمَرَهُمْ اَبُوْهُمْ ؕ مَا كَانَ يُغْنِيْ عَنْهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ اِلَّا حَاجَةً
فِيْ نَفْسِ يَعْقُوْبَ قَضٰىهَا ؕ وَاِنَّهٗ لَذُوْ عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنٰهُ وَلٰكِنَّ
اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٦٨﴾ ع

رکوع: ۸۔ (اور ایک روز آ نکلے برادرانِ یوسفؑ پھر وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے سو آپ نے انہیں پہچان لیا لیکن وہ آپ کو پہچان نہ سکے۔ سو جب اس نے ان کا سامان تیار کر لیا تو فرمایا کہ اب کے اپنے سوتیلے بھائی کو بھی میرے پاس لانا، کیا تم دیکھتے نہیں کہ میں کس طرح پیمانہ پورا بھر کر دیتا ہوں اور میں کتنا بہتر مہمان نواز ہوں۔ اور اگر تم اسے نہ لے کے آئے تو نہ تمہارے لئے میرے پاس غلہ ہے اور نہ تم میرے پاس پھٹکنا۔ انہوں نے کہا ہم اس کے بارے میں اس کے باپ کو راضی کرنے کی کوشش کریں گے اور ہم ضرور ایسا کریں گے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے غلاموں کو حکم دیا کہ ان کا دیا ہوا مال (خاموشی سے) سے ان کی خورجیوں ہی میں ڈال دو، کہ جب وہ اپنے اہل و عیال میں پہنچیں اس کو پہچانیں تا کہ وہ لوٹ کے آئیں۔ پھر جب وہ اپنے باپ کے پاس واپس لوٹے تو عرض کرنے لگے کہ اے ہمارے ابا جان ہم سے غلہ روک دیا

Marfat.com

گیا ہے، سو آپ ہمارے ساتھ ہمارے بھائی کو بھیجئے تاکہ ہم غلہ لا سکیں اور ہم اس کی حفاظت کا عہد کرتے ہیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے جواب میں فرمایا: کیا میں اعتماد کروں تم پر، اس کے بارے میں۔ بجز اس کے کہ جیسے میں نے اعتماد کیا تھا تم پر، اس کے بھائی کے بارے میں اس سے پہلے۔ پس اللہ تعالیٰ ہی بہتر حفاظت کرنے والا ہے اور وہ سب سے بڑھ کر رحم فرمانے والا ہے۔ اور جب انہوں نے اپنا سامان کھولا تو دیکھا کہ ان کی پونجی بھی ان کو لوٹا دی گئی ہے تو وہ کہنے لگے کہ ابا جان! ہمیں اور کیا چاہئے، یہ ہماری پونجی بھی ہمیں لوٹا دی گئی ہے۔ اب ہم ضرور جائیں گے اور اپنے اہلِ خانہ کیلئے رسد لے کر آئیں گے اور اپنے بھائی کی حفاظت کریں گے اور ایک بار شتر غلہ زیادہ حاصل کریں گے۔ یہ غلہ بہت تھوڑا ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے کہا: میں بن یامین کو ہرگز تمہارے ساتھ نہیں بھیجوں گا جب تک تم میرے ساتھ خدا کے نام پر عہد نہ کرو کہ تم اسے ضرور میرے پاس لے کر آؤ گے۔ الا یہ کہ تم بے بس کر دیئے جاؤ۔ پس جب وہ لے آئے آپؑ کے پاس اپنا پختہ وعدہ تو آپؑ نے فرمایا کہ جو قول و قرار ہم کر رہے ہیں اللہ تعالیٰ اس پر نگہبان ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے کہا کہ اے میرے بیٹو! تم سب ایک ہی دروازے میں سے (شہر میں) داخل نہ ہونا بلکہ مختلف دروازوں سے داخل ہونا اور میں اللہ تعالیٰ کے مقابل میں تمہارے کچھ کام نہیں آسکتا۔ حکم صرف اللہ تعالیٰ کیلئے ہے۔ میں نے اسی پر بھروسہ کیا ہے اور اسی پر بھروسہ کرنے والوں کو بھروسہ کرنا چاہئے۔ اور جب وہ داخل ہوئے جہاں سے ان کے باپ نے انہیں حکم دیا تھا تو وہ اللہ تعالیٰ کے مقابل میں ان کے کچھ کام آنے والا نہ تھا، مگر (یہ احتیاطی تدبیر) یعقوبؑ کے دل میں ایک خیال تھا جو اس نے پورا کر لیا۔ بیشک وہ اس علم سے بہرہ ور تھا جو ہم نے اس کو سکھایا لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے۔)

وَجَآءَ اِخْوَةُ يُوْسُفَ فَدَخَلُوْا عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ﴿۵۸﴾ (سورۃ یوسف : ۵۸)

(اور ایک روز آنکلے برادرانِ یوسفؑ پھر وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے سو آپؑ نے انہیں پہچان لیا لیکن وہ آپ کو پہچان نہ سکے۔)

برادرانِ یوسفؑ کی حضرت یوسفؑ کی خدمت میں حاضری

گزشتہ آیت سے پیوستہ آیت میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو مصر کے اقتدار تک پہنچا دیا اور آپؑ نے حالات کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے خاص طور پر زمین کے وسائل اور خزائن اپنی تحویل میں لینے کی درخواست کی کیونکہ بادشاہ کے خواب کی تعبیر کے مطابق ملک میں جو صورتحال چند سالوں کے بعد پیش آنے والی تھی آپ کے سوا کسی کو اس کا ادراک تھا اور نہ اس کے حل کرنے کی صلاحیت تھی۔ چنانچہ ملک کی بھلائی کیلئے اللہ تعالیٰ نے آپ کیلئے ایسے حالات پیدا کئے جس کی وجہ سے ملک کے وسائل آپ کی گرفت میں آگئے۔ چنانچہ آپ نے آنے والے خطرناک حالات کا مقابلہ کرنے کیلئے تمام ممکن احتیاطی تدابیر کو بروئے کار لانا شروع کیا۔ بنجر زمینیں آباد کرائیں، لوگوں کو کاشتکاری میں محنت کرنے پر آمادہ کیا، پیداوار کی حفاظت کیلئے جگہ جگہ ملک میں گودام تعمیر کئے۔ جو غلہ فوری ضرورت سے زائد ہوتا اسے خوشوں ہی میں چھوڑنے کا اہتمام کیا تاکہ اسے ہر طرح کے کیڑے سے محفوظ رکھا جاسکے۔ چنانچہ پہلے سات سال خوب بارشیں ہوئیں جس کے نتیجے میں بھرپور پیداوار پیدا ہوئی۔ لوگوں کی ضرورت سے بچا کر گودام غلے سے بھر دیئے گئے اور اس طرح آئندہ سات سالوں میں قحط سالی کی جو مصیبت پیش آنے والی تھی اس کی پیش بندی کا اہتمام کیا گیا۔ چنانچہ پہلے سات سال گزرنے کے بعد جب دوسرے سات سال شروع ہوئے، بارشیں برسنا بند ہوگئیں، پانی کے ذخیروں میں کمی آنا شروع ہوگئی، دریائے نیل پایاب ہوکر رہ گیا بلکہ آہستہ آہستہ خشک ہوتا چلا گیا، ہر طرف ویرانی برسنے لگی، قحط سالی نے بسیرا کر لیا لیکن حضرت یوسف علیہ السلام کی گزشتہ سالوں میں پیش بندی کی وجہ سے مصر قحط کے اثرات سے محفوظ رہا اور آپ کے حسنِ انتظام کی وجہ سے اہلِ مصر کیلئے ہر شخص کی ضروریات کیلئے غلہ مہیا ہونے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی لیکن قحط سالی کے اثرات صرف مصر تک محدود نہیں تھے بلکہ خشک سالی نے اڑوس پڑوس کے ممالک کو بھی

Marfat.com

اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ وہاں چونکہ ایسی کوئی پیش بندی نہیں کی گئی تھی اس لئے وہاں قحط نے بری طرح اپنے پنجے گاڑ دیئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ بھوکوں مرنے لگے، لیکن رفتہ رفتہ جب ان ملکوں میں مصر کی خوشحالی اور حُسنِ انتظام کی خبریں پہنچیں اور یہ بھی معلوم ہوا کہ وہاں کا حکمران ایک ایسا خدا ترس آدمی ہے جسے صرف اپنے ملک کے رہنے والوں کی ہی فکر نہیں بلکہ بیرونی ممالک کے آنے والے انسانوں کی ضروریات کو بھی وہ اپنی ذمہ داری سمجھتا ہے۔ چنانچہ لوگوں نے مصر کا رخ کرنا شروع کیا۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے اس صورتحال سے عہدہ براہونے کیلئے راشننگ کا سسٹم شروع کیا۔ ہر شخص کو اس کی ضرورت کے مطابق ایک معین مقدار میں غلہ دیا جانے لگا اور بیرون ملک سے آنے والوں کیلئے یہ پابندی لگائی گئی کہ وہ عام راشن ڈپوؤں سے غلہ حاصل نہیں کر سکیں گے بلکہ انہیں براہ راست حضرت یوسف علیہ السلام سے اس کی منظوری لینا ہوگی اور منظوری کے بعد ہر شخص کو ایک بارِ شتر دیا جائے گا۔ چنانچہ اسی پابندی کی وجہ سے جب آپؑ کے بھائی قحط سالی سے تنگ آ کر مصر میں غلہ لینے کیلئے پہنچے تو انہیں حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے پیش ہونا پڑا۔ چنانچہ جیسے ہی برادرانِ یوسف آپؑ کے سامنے آئے تو آپؑ نے انہیں دیکھتے ہی پہچان لیا کیونکہ جب انہوں نے آپؑ کو کنویں میں پھینکا تھا تو وہ عمروں کے فرق کے ساتھ بھرپور جوانیوں کے حامل تھے۔ اب اگرچہ وہ پختہ عمر کو پہنچ رہے تھے لیکن ماہ وسال کی گردش نے ان میں کوئی ایسی تبدیلی پیدا نہیں کی تھی کہ آپ انہیں پہچان نہ سکتے لیکن آپؑ کی شکل وصورت میں واضح تبدیلی پیدا ہو چکی تھی کیونکہ جب آپؑ اپنے گھر سے جدا ہوئے تو آپؑ الہڑ عمر کے لڑکے تھے۔ ابھی آپؑ کی مسیں بھی نہیں بھیگی تھیں اور ابھی شباب آپؑ کے چہرے سے ہویدا نہیں ہوا تھا۔ تقریباً ربع صدی کا زمانہ گزرنے کے بعد آپؑ کے بھائی آپؑ کو اس حال میں دیکھ رہے تھے کہ جس معصوم لڑکے کو انہوں نے کنویں میں پھینکا تھا وہ اب جوانی کی حدود سے نکل رہا تھا۔ لڑکپن اور جوانی اپنا خاص انداز رکھتے ہیں اور جب ایک شخص عمر کی پختگی کو چھو رہا ہو تو اس کی شکل وصورت میں ایسی تبدیلی کا آنا ناگزیر ہے جس سے پہچان اور شناخت میں دشواری پیدا ہو اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی کہ وہ اپنے اس بھائی کے بارے میں جسے انہوں نے کنویں میں پھینک کر اپنے راستے سے ہٹا دیا تھا کہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ وہ شاہانہ لباس میں ملبوس تختِ سلطنت پر فائز ہوگا اور سینکڑوں ملازم اور غلام اس کی چاکری بجالا رہے ہوں گے۔ اس لئے وہ آپؑ کی پہچان میں بالکل ناکام رہے اور وہ یہی سمجھتے رہے کہ ہم ایک ایسے حکمران کے سامنے کھڑے ہیں جس سے ہمارا کوئی رشتہ کبھی نہیں رہا۔

وَلَمَّا جَهَّزَهُم بِجَهَازِهِمْ قَالَ ائْتُونِي بِأَخٍ لَّكُم مِّنْ أَبِيكُمْ ۚ أَلَا تَرَوْنَ أَنِّي أُوفِي الْكَيْلَ وَأَنَا خَيْرُ الْمُنزِلِينَ ﴿٥٩﴾ فَإِن لَّمْ تَأْتُونِي بِهِ فَلَا كَيْلَ لَكُمْ عِندِي وَلَا تَقْرَبُونِ ﴿٦٠﴾ (سورۃ یوسف : ۵۹، ۶۰)

(سو جب اس نے ان کا سامان تیار کر لیا تو فرمایا کہ اب کے اپنے سوتیلے بھائی کو بھی میرے پاس لانا، کیا تم دیکھتے نہیں کہ میں کس طرح پیمانہ پورا بھر کر دیتا ہوں اور میں کتنا بہتر مہمان نواز ہوں۔ اور اگر تم اسے نہ لے کے آئے تو نہ تمہارے لئے میرے پاس غلہ ہے اور نہ تم میرے پاس پھٹکنا)۔

بھائیوں کو حضرت یوسفؑ کی ترغیب

معلوم ہوتا ہے کہ بیرونِ ملک سے آنے والے ہر شخص کو اپنے اہلِ خانہ کی تفصیل بتانا پڑتی تھی اور پھر ہر شخص کیلئے ایک بارِ شتر غلہ دیا جاتا تھا۔ اسی حوالے سے یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اپنے اہلِ خانہ کے بارے میں بھی بتایا کہ ہم دس تو آپ کے سامنے ہیں لیکن ایک ہمارے والد ماجد ہیں جو بڑھاپے کی وجہ سے سفر نہیں کر سکتے اور دوسرے ہمارے ایک اور چھوٹے بھائی ہیں جنہیں ہم اپنے والد صاحب کی دیکھ بھال کیلئے گھر چھوڑ آئے ہیں۔ ہمیں ان کے حصے کا بھی غلہ عطا فرمایئے۔ اس پر یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ تمہارے والد صاحب کی کمزوری اور بڑھاپا واقعی ایک ایسا عذر ہے جس کی وجہ سے وہ سفر نہیں کر سکتے اس لئے ہم ان کے حصے کا غلہ ضرور دیں گے لیکن جہاں تک تمہارے بھائی کا تعلق ہے اس کے حصے کا غلہ اس وقت تو ہم دے رہے ہیں لیکن آئندہ اسے ساتھ لے کے آنا ورنہ ہم اس کے حصے کا غلہ نہیں دیں گے بلکہ اسے نہ لانے کی صورت میں ہمارے قریب بھی نہ پھٹکنا کیونکہ اس کے نہ آنے کا مطلب یہ ہوگا کہ تم ہم سے جھوٹ بول رہے ہو اور ساتھ ہی اس کے ترغیب بھی دی اور ترہیب سے بھی کام لیا۔ ترغیب دیتے ہوئے فرمایا کہ تم دیکھ نہیں رہے کہ میں بیرونِ ملک سے آنے والوں کے ساتھ کس قدر محبت اور مروت سے پیش آتا ہوں کہ انہیں پیمانہ بھر کے غلہ دیتا ہوں۔ اس لئے تمہیں اپنے بھائی کو ساتھ لے کے آنا چاہئے اور ترہیب کرتے ہوئے فرمایا کہ ان

Marfat.com

حالات میں کہ غلہ تمہاری ایسی ضرورت ہے جس سے تم صرف نظر نہیں کر سکتے لیکن اس کے باوجود بھی اگر تم بھائی کو لے کے نہ آئے تو پھر میرے قریب آنے کی کوشش نہ کرنا کیونکہ میں جھوٹ بولنے والوں کو برداشت نہیں کرتا۔

قَالُوْا سَنُرَاوِدُ عَنْهُ اَبَاهُ وَاِنَّا لَفٰعِلُوْنَ ﴿٦١﴾ (سورۃ یوسف : ٦١)

(انہوں نے کہا ہم اس کے بارے میں اس کے باپ کو راضی کرنے کی کوشش کریں گے اور ہم ضرور ایسا کریں گے۔)

بھائیوں کا خواب

سَنُرَاوِدُ کا مصدر مراودت ہے۔ اس کے معنی ہوتے ہیں بہلانا پھسلانا یعنی دوسرے کو سخن سازی، ملائمت یا دلیل سے قائل کرنے کی کوشش کرنا۔ برادرانِ یوسفؑ چونکہ حضرت یوسفؑ کے معاملے میں ایک خیانت کا ارتکاب کر چکے تھے۔ انہوں نے اپنے والد ماجد کو آپؑ کی حفاظت کا پورا یقین دلایا تھا اور پھر وعدہ شکنی کرتے ہوئے ان کے ساتھ جو کچھ کیا وہ ہم پیچھے پڑھ چکے ہیں۔ وہ اپنی اس کرتوت سے پوری طرح باخبر تھے۔ اسی احساس کے تحت انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو یقین دلایا کہ ہم بن یامین کے والد ماجد کو ہر ممکن طریقے سے یقین دلائیں گے کہ ہم ان کے بیٹے کی حفاظت کریں گے تاہم ممکن ہے وہ ہماری بات پر اعتبار نہ کریں (کیونکہ ان کے دل کا چور بار باران کے اندر یہ اندیشہ پیدا کر رہا تھا) لیکن ہم ہر صورت میں اپنی سی کوشش کر دیکھیں گے۔ اگر اس کے باوجود بھی ہمارے ساتھ بیٹے کو بھیجنے کیلئے تیار نہ ہوئے تو پھر ہمیں معذور سمجھا جائے۔

وَقَالَ لِفِتْيٰنِهِ اجْعَلُوْا بِضَاعَتَهُمْ فِيْ رِحَالِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَعْرِفُوْنَهَآ اِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓى اَهْلِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿٦٢﴾

(حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے غلاموں کو حکم دیا کہ ان کا دیا ہوا مال (خاموشی سے) سے ان کی خورجیوں ہی میں ڈال دو، کہ جب وہ اپنے اہل وعیال میں پہنچیں اس کو پہچانیں تا کہ وہ لوٹ کے آئیں۔) (سورۃ یوسف:٦٢)

حضرت یوسفؑ کا احسان

حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنے بھائیوں کی زبانی یہ معلوم ہو چکا تھا کہ ان کے مالی حالات نہایت مخدوش ہیں۔ بنا بریں اس بات کا اندیشہ تھا کہ وہ مالی مشکلات کی وجہ سے دوبارہ غلہ لینے کیلئے نہ آسکیں اور حضرت یوسف علیہ السلام شدید خواہش رکھتے تھے کہ کسی طرح ان کا چھوٹا بھائی ان کے پاس پہنچ جائے تا کہ اسے بھائیوں کی ایذا رسانی سے محفوظ رکھا جا سکے۔ چنانچہ اس کے حل کے طور پر انہوں نے اپنے غلاموں کو حکم دیا کہ جو پونجی انہوں نے غلہ لینے کیلئے پیش کی ہے اسے چپکے سے ان کے سامان میں ڈال دیا جائے تا کہ اپنے گھر جا کر جب وہ سامان کھولیں تو اس میں اپنی پونجی پا کر وہ نہایت خوش ہوں گے اور اب واپسی کا ارادہ کرنے میں انہیں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی اور اس خوشی اور حُسنِ سلوک کی وجہ سے وہ اپنے بھائی کو لانے میں مزید کوشش کریں گے۔

فَلَمَّا رَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَبِيْهِمْ قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مُنِعَ مِنَّا الْكَيْلُ فَاَرْسِلْ مَعَنَآ اَخَانَا نَكْتَلْ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴿٦٣﴾ قَالَ هَلْ اٰمَنُكُمْ عَلَيْهِ اِلَّا كَمَآ اَمِنْتُكُمْ عَلٰٓى اَخِيْهِ مِنْ قَبْلُ ۭ فَاللّٰهُ خَيْرٌ حٰفِظًا ۠ وَّهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿٦٤﴾

(پھر جب وہ اپنے باپ کے پاس واپس لوٹے تو عرض کرنے لگے کہ اے ہمارے ابا جان ہم سے غلہ روک دیا گیا ہے، سو آپؑ ہمارے ساتھ ہمارے بھائی کو بھیجئے تا کہ ہم غلہ لا سکیں اور ہم اس کی حفاظت کا عہد کرتے ہیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے جواب میں فرمایا: کیا میں اعتماد کروں تم پر، اس کے بارے میں۔ بجز اس کے کہ جیسے میں نے اعتماد کیا تھا تم پر، اس کے بھائی کے بارے میں اس سے پہلے۔ پس اللہ تعالیٰ ہی بہتر حفاظت کرنے والا ہے اور وہ سب سے بڑھ کر رحم فرمانے والا ہے۔) (سورۃ یوسف: ٦٣، ٦٤)

Marfat.com

بیٹوں کی گزارش اور باپ کا جواب

برادرانِ یوسف جب سفر سے واپس اپنے گھر پہنچے اور باپ کی خدمت میں حاضری دی تو سفر کی روداد سناتے ہوئے انہوں نے بتایا کہ اس سفر کا سب سے اہم واقعہ یہ ہے کہ آئندہ کیلئے ہمیں غلہ سے محروم کردیا گیا ہے کیونکہ وہاں ہر شخص کو حاضری کی بنیاد پر غلہ ملتا ہے۔ جب ہم نے عزیزِ مصر کو بتایا کہ ہم گھر کے بارہ افراد ہیں، دس آپ کے سامنے ہیں اور ایک ہمارے والد ماجد ہیں جو بڑھاپے کی وجہ سے سفر نہیں کرسکتے اور ایک ہمارا چھوٹا بھائی ہے جسے والد کی دیکھ بھال کیلئے ہم گھر چھوڑ آئے ہیں۔ تو عزیزِ مصر نے کہا کہ اس دفعہ تو میں تمہاری بات کا اعتبار کر کے تمہیں بارہ افراد کا غلہ دے رہا ہوں لیکن آئندہ کیلئے اپنے چھوٹے بھائی کو ساتھ لے کر آؤ کیونکہ اس کیلئے سفر نہ کرنے کا کوئی عذر نہیں اور اگر تم بھائی کو ساتھ لے کر نہ آئے جبکہ تمہیں ایک ایک آدمی کیلئے غلے کی ضرورت ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم جھوٹ بولتے ہو اور میں جھوٹوں کو ہرگز غلہ دینے کا روادار نہیں۔ اب اگر ہمیں غلہ لینے کیلئے جانا ہے اور یقیناً ہماری ضرورت کا یہی تقاضا ہے تو پھر بن یامین کو ساتھ لے جانا ضروری ہے ورنہ عزیزِ مصر ہمیں منہ لگانے کیلئے بھی تیار نہ ہوگا۔ اس لئے آپ بن یامین کو ہمارے ساتھ بھیجئے، ہم وعدہ کرتے ہیں کہ ہم ہر طرح اس کی حفاظت کریں گے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان کا مطالبہ سن کر فرمایا کہ اگر میں تمہارے وعدے پر اعتماد کر کے اسے تمہارے ساتھ بھیج دوں تو یہ اعتماد ایسا ہی ہوگا جیسا اس سے پہلے میں یوسفؑ کے بارے میں اعتماد کر کے ایک خطرناک غلطی کرچکا ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کچھ دیر رک کر فرمایا کہ اگر حالات کا جبر ایسا ہی ہے کہ بن یامین کو ضرور بھیجا جائے تو پھر میں اسے تمہارے اعتماد پر نہیں بھیجوں گا بلکہ اس یقین کے ساتھ بھیجوں گا کہ اللہ تعالیٰ ہی حفاظت کرنے والا ہے، اس کی ذات نہایت رحیم و کریم ہے۔ پہلے ایک زخم اگر مجھے پہنچ چکا ہے تو اب ان شاء اللہ تعالیٰ مزید کسی آزمائش میں وہ مجھے مبتلا نہیں فرمائے گا اور میری حفاظت کرے گا۔

وَلَمَّا فَتَحُوْا مَتَاعَهُمْ وَجَدُوْا بِضَاعَتَهُمْ رُدَّتْ اِلَيْهِمْ ؕ قَالُوْا يٰۤاَبَانَا مَا نَبْغِيْ ؕ هٰذِهٖ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ اِلَيْنَا ۚ وَنَمِيْرُ اَهْلَنَا وَنَحْفَظُ اَخَانَا وَنَزْدَادُ كَيْلَ بَعِيْرٍ ؕ ذٰلِكَ كَيْلٌ يَّسِيْرٌ ﴿۶۵﴾ (سورۃ یوسف : ۶۵)

(اور جب انہوں نے اپنا سامان کھولا تو دیکھا کہ ان کی پونجی بھی ان کو لوٹا دی گئی ہے تو وہ کہنے لگے کہ ابا جان! ہمیں اور کیا چاہئے، یہ ہماری پونجی بھی ہمیں لوٹا دی گئی ہے۔ اب ہم ضرور جائیں گے اور اپنے اہلِ خانہ کیلئے رسد لے کر آئیں گے اور اپنے بھائی کی حفاظت کریں گے اور ایک بارِ شتر غلہ زیادہ حاصل کریں گے۔ یہ غلہ بہت تھوڑا ہے۔)

بھائیوں کی خوشی

والد صاحب کے ساتھ گفتگو سے فارغ ہو کر اپنے سامان کی طرف متوجہ ہوئے تاکہ جو غلہ مصر سے لے کے آئے ہیں اسے سنبھال سکیں۔ چنانچہ جیسے ہی انہوں نے غلہ اپنے کجاووں سے نکالا تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ غلے کی جو قیمت انہوں نے ادا کی تھی وہ ان کے سامان میں رکھ دی گئی ہے، گویا ان کی تمام پونجی انہیں واپس کردی گئی ہے اور غلہ احسان کے طور پر دیا گیا ہے۔ وہ اگرچہ عزیزِ مصر کا حُسنِ سلوک دیکھ کر پہلے بھی متاثر تھے لیکن یہ تو انہیں خیال بھی نہ تھا کہ ہم سے غلے کی قیمت تک نہ لی جائے گی۔ چنانچہ اپنی پونجی کو دیکھتے ہی خوشی سے کِھل اٹھے۔ فوراً اپنے والد گرامی کی طرف متوجہ ہوئے۔ کہا ابا جان! ہماری لئے اصل مسئلہ غلے کی قیمت کی فراہمی ہے جس کی وجہ سے ہمیں غلے کیلئے جانے میں شدید تامل ہوتا ہے۔ دیکھئے یہ پونجی بھی ہمیں عزیزِ مصر نے واپس کردی ہے، اب ہمیں اور کیا چاہئے۔ انہوں نے خوشی سے بے قابو ہوتے ہوئے کہا کہ اب تو ہم ضرور جائیں گے اور اپنے اہل و عیال کیلئے رسد لے کر آئیں گے۔ نَمِیْرُ مَارَ یَمِیْرُ سے ہے۔ اس کا معنی ہے اپنی اہل و عیال کیلئے ضروریات کا فراہم کرنا۔ اس سے پہلے معطوف علیہ محذوف ہے۔ اب ہم ضرور جائیں گے اور سامانِ رسد لے کر آئیں گے۔ رہا، عزیزِ مصر کا مطالبہ کہ چھوٹے بھائی کو ساتھ لے کر آؤ تو ہم اپنے بھائی کو بھی ساتھ لے کر جائیں گے اور اس کی حفاظت کریں گے۔ وہ اپنے سامان میں اپنی پونجی پا کر اس حد تک خوش تھے کہ ان کی ایک ایک بات سے خوشی پھوٹتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

Marfat.com

قَالَ لَنْ اُرْسِلَهٗ مَعَكُمْ حَتّٰى تُؤْتُوْنِ مَوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ لَتَاْتُنَّنِیْ بِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ یُّحَاطَ بِكُمْ ۚ فَلَمَّاۤ اٰتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ قَالَ اللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِیْلٌ ﴿۶۶﴾ (سورة یوسف : ٦٦)

(حضرت یعقوب علیہ اسلام نے کہا: میں بن یامین کو ہرگز تمہارے ساتھ نہیں بھیجوں گا جب تک تم میرے ساتھ خدا کے نام پر عہد نہ کرو کہ تم اسے ضرور میرے پاس لے کر آ ؤ گے۔ الا یہ کہ تم بے بس کر دیئے جاؤ۔ پس جب وہ لے آئے آپؑ کے پاس اپنا پختہ وعدہ تو آپؑ نے فرمایا کہ جو قول وقرار ہم کر رہے ہیں اللہ تعالیٰ اس پر نگہبان ہے۔)

باپ کا بیٹوں سے عہد

حضرت یعقوب نے فرمایا کہ ایک بارِ شتر غلہ کے بدلے میں، میں اپنے بیٹے کو بھیجنے کیلئے ہرگز تیار نہیں، لیکن اگر تمہیں زیادہ ہی اصرار ہے تو پھر تم مجھ سے اللہ تعالیٰ کے نام پر ایک پختہ عہد کرو کہ تم ہر قیمت پر اپنے چھوٹے بھائی کو واپس اپنے ساتھ لاؤ گے۔ بجز اس کے کہ تمہیں کہیں گھیر لیا جائے، تم حالات کی گرفت میں آجاؤ یا کسی وجہ سے دشمن تمہیں پکڑ لے یا حکومت تمہیں گرفتار کرلے تو ایسی صورت میں تمہارا عذر مسموع ہوسکتا ہے ورنہ یہی سمجھا جائے گا کہ تم نے نقضِ عہد کیا ہے۔ چنانچہ تمام بیٹوں نے بیک وقت اللہ تعالیٰ کے نام پر اپنی بات کا پختہ عہد دیا کہ ہم بھائی کی حفاظت میں کوئی کوتاہی نہیں کریں گے۔ اس پر حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کہ ہم جو آپس میں قول وقرار کر رہے ہیں اور تم مجھے ایک عہد دے رہے ہو اس پر اللہ تعالیٰ نگران ہے۔ وہ سن رہا ہے اور دیکھ رہا ہے اور کل ہم سب سے اس کے بارے میں پوچھا جائے گا۔

وَقَالَ یٰبَنِیَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ ؕ وَمَاۤ اُغْنِیْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ عَلَیْهِ تَوَكَّلْتُ ۚ وَعَلَیْهِ فَلْیَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ﴿۶۷﴾ (سورة یوسف : ٦٧)

(حضرت یعقوب علیہ السلام نے کہا کہ اے میرے بیٹو! تم سب ایک ہی دروازے میں سے (شہر میں) داخل نہ ہونا بلکہ مختلف دروازوں سے داخل ہونا اور میں اللہ تعالیٰ کے مقابل میں تمہارے کچھ کام نہیں آسکتا۔ حکم صرف اللہ تعالیٰ کیلئے ہے۔ میں نے اسی پر بھروسہ کیا ہے اور اسی پر بھروسہ کرنے والوں کو بھروسہ کرنا چاہیے۔)

ایک مصلحت آمیز ہدایت

برادرانِ یوسفؑ جب عازمِ سفر ہونے لگے تو والدِ گرامی نے بلا کر کچھ نصیحتیں فرمائیں۔ ان میں سے ایک نصیحت یہ تھی کہ جب تم مصر پہنچو تو شہر میں ایک دروازے سے داخل نہ ہونا بلکہ شہر کے مختلف دروازوں میں ایک ایک دو دو کر کے داخل ہونا۔ اس سے ہمیں پہلی بات یہ سمجھ میں آتی ہے کہ اس وقت معمول کے مطابق شہر کی ایک فصیل تھی جس میں مختلف دروازے تھے۔ باہر سے آنے والوں کو کسی نہ کسی دروازے سے داخل ہونا پڑتا تھا اور دروازوں پر یقیناً حکومت کی جانب سے محافظ بھی مقرر ہوں گے اور وہ یقیناً باہر سے آنے والے ہر شخص کو تحقیق وتفتیش کی نگاہ سے دیکھتے ہوں گے۔ بالخصوص ایسے لوگ جو بیرونِ ملک سے آئیں اور ان کا تعلق قبائلی علاقے سے ہو تو ان پر یقیناً محافظوں کی خصوصی نگاہ رہتی ہوگی کیونکہ عموماً حکومتوں کو قبائلی علاقوں کے لوگوں کی طرف سے شکایات رہا کرتی ہیں۔ متحدہ ہندوستان میں انگریز حکومت ہمیشہ قبائلی علاقے کو شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھتی رہی ہے۔ اسی حوالے سے حضرت یعقوب علیہ السلام نے بیٹوں کو نصیحت فرمائی کہ تم قبائلی علاقے کے رہنے والے ہو اور پھر تمہیں اللہ تعالیٰ نے شہریوں کی نسبت زیادہ قد کاٹھ، مضبوط صحت اور خوبصورتی عطا کی ہے۔ تم گیارہ کی تعداد میں جب ایک ساتھ کسی دروازے میں داخل ہونے کی کوشش کرو گے تو خواہی نخواہی نگاہیں تمہاری طرف اٹھیں گی۔ ایسی صورتحال مختلف امکانات پیدا ہوسکتے ہیں۔ مثلاً سرکاری کارندے آپ لوگوں کو خطرناک سمجھ کر گرفتار کرنے کی کوشش

Marfat.com

کریں یا اوباش لوگ آپ لوگوں کی وضع قطع دیکھ کر یہ سمجھیں کہ یہ کوئی کاروباری اور خوشحال لوگ معلوم ہوتے ہیں اس لئے آپ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کریں۔ اس طرح کے امکانات کے پیش نظر آپؑ نے فرمایا کہ الگ الگ دروازوں سے داخل ہونے کی صورت میں تم ایسے کسی بھی نقصان سے بچ سکتے ہو۔ بعض اہل علم کا خیال یہ ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے بیٹوں کو نظر بد سے بچانے کیلئے یہ حکم دیا اور آنحضرت ﷺ کے ارشاد سے ثابت ہوتا ہے کہ نظر حق ہے۔ ایک روایت میں آپؐ سے مروی ہے کہ نظر بد انسان کو قبر میں اور اونٹ کو ہانڈی میں پہنچا دیتی ہے۔ اس لئے آنحضرت ﷺ ان کلمات طیبات سے دم فرمایا کرتے تھے اَعُوْذُ بِکَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّةِ مِنْ کُلِّ شَیْطٰنٍ وَّهَامَّةٍ وَمِنْ کُلِّ عَیْنٍ لَامَّةٍ اسی لئے ہدایت کی گئی ہے کہ جس شخص کو اپنے متعلق یہ خیال ہو کہ اس کی نظر لگتی ہے تو اسے چاہئے کہ جب کسی چیز کو دیکھے اور وہ پسند آئے تو کہے تَبَارَکَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ اَللّٰهُمَّ بَارِکْ فِیْهِ اور جس کو نظر کی وجہ سے تکلیف پہنچے تو جس کی نظر سے تکلیف ہوئی ہو اسے غسل کرنے کا حکم دیا جائے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے اس نصیحت کے ساتھ یہ تنبیہ بھی فرمائی کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ محض ایک احتیاطی تدبیر ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ یہ تدبیر تمہیں تقدیر سے بچا سکتی ہے۔ اگر خدا نے تمہارے لئے کوئی چیز لکھ دی ہے تو وہ اٹل ہے، اسے روکنے اور بدلنے کا کسی کو اختیار نہیں کیونکہ اس کائنات میں اصل اختیار صرف اللہ تعالیٰ کا ہے، حکم صرف اسی کا چلتا ہے۔ میں بھی اسی پر بھروسہ کرتا ہوں اور جو لوگ بھی بھروسہ کرنا چاہتے ہیں انہیں اللہ تعالیٰ ہی پر بھروسہ کرنا چاہئے۔ لیکن بھروسہ اور توکل کا مطلب ترکِ تدبیر ہرگز نہیں۔ جو ممکن تدبیر ہو سکتی ہو اسے ضرور بروئے کار لایا جائے لیکن بھروسہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہو، اسی کا نام توکل ہے۔

توکل کا یہ مطلب ہے کہ خنجر تیز رکھ اپنا
پھر اس خنجر کی تیزی کو مقدر کے حوالے کر

وَلَمَّا دَخَلُوْا مِنْ حَیْثُ اَمَرَهُمْ اَبُوْهُمْ ؕ مَا کَانَ یُغْنِیْ عَنْهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ اِلَّا حَاجَةً فِیْ نَفْسِ یَعْقُوْبَ قَضٰهَا ؕ وَاِنَّهٗ لَذُوْ عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنٰهُ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۶۸﴾ (سورۃ یوسف : ۶۸)

(اور جب وہ داخل ہوئے جہاں سے ان کے باپ نے انہیں حکم دیا تھا تو وہ اللہ تعالیٰ کے مقابل میں ان کے کچھ کام آنے والا نہ تھا، مگر (یہ احتیاطی تدبیر) یعقوبؑ کے دل میں ایک خیال تھا جو اس نے پورا کرلیا۔ بیشک وہ اس علم سے بہرہ ور تھا جو ہم نے اس کو سکھایا لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے۔)

تقدیر اور تدبیر کا باہمی تعلق

بیٹے اسی طرح شہر میں داخل ہوئے جیسے حضرت یعقوبؑ نے ان کو ہدایت کی تھی اور وہ یقیناً ہر طرح کے شر سے محفوظ بھی رہے۔ اس سے یہ غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے کہ بیٹوں کا ہر طرح کے شر سے محفوظ رہنا شاید باپ کی احتیاط پر مبنی ہدایت کی وجہ سے تھا۔ اس لئے اس غلط فہمی کو دور کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ حضرت یعقوبؑ نے جو کچھ کہا وہ محض حفاظت کے پہلو سے ایک تدبیر تھی جو ان کے دل میں آئی اور بیٹوں نے سعادت مندی دکھاتے ہوئے اس پر عمل کیا، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہ تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ کی تقدیر میں بیٹوں کیلئے کوئی ناخوشگوار فیصلہ لکھا جا چکا تھا تو حضرت یعقوب کی تدبیر اسے روک سکتی تھی، ایسا ہرگز نہیں۔ کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کتنا ہی مقرب کیوں نہ ہو اسے یہ اختیار ہرگز حاصل نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر کے سامنے دم مار سکے۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں جتنا عظیم ہے اتنا ہی زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا اور اس کے فیصلوں پر مطمئن رہنے والا ہے۔ حضرت یعقوبؑ نے تو گزشتہ آیت کریمہ میں اس عقدے کو کھول دیا تھا کہ حکم تو صرف اللہ تعالیٰ کا چلتا ہے، ہر چیز کا اختیار اسے حاصل ہے لیکن ہمیں اس نے تدابیر اختیار کرنے کا حکم دے رکھا ہے۔ ہم اس بات کے پابند ٹھہرائے گئے ہیں کہ ہم اپنے امکانات کی حد تک ہر کام کیلئے تدبیر کریں لیکن بھروسہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پر رکھیں، اپنے وسائل پر کبھی بھروسہ نہ کریں۔ یہی وہ علم ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت یعقوب علیہ السلام کو دے رکھا تھا ورنہ دنیا میں ہمیشہ یک رخے لوگ بستے ہیں جو تدبیر ہی کو سب کچھ سمجھتا ہے وہ تقدیر کو ایک واہمہ خیال کرتا ہے اور جو تقدیر ہی کو سب کچھ سمجھتا ہے وہ ترکِ تدبیر پر عمل کر کے اپنے آپ کو عضوِ معطل بنا کے رکھ دیتا ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی یہاں تعریف فرمائی گئی ہے کہ آپؑ اصل حقیقت سے باخبر تھے

Marfat.com

اس لئے اگر آپ نے ایک طرف تدبیر اختیار کرنے کا حکم دیا تو ساتھ ہی توکل اور بھروسہ اللہ تعالیٰ پر کرنے کی تعلیم دی اور یہ یقین دلایا کہ آدمی کو اپنی تدبیر بروئے کار لاتے ہوئے اس بات پر یقین رکھنا چاہئے کہ ہوگا وہی جو اللہ تعالیٰ کی تقدیر میں ہے کیونکہ اس کی تقدیر کو کوئی نہیں بدل سکتا۔ البتہ وہ خود اپنی تقدیر کا پابند نہیں، تقدیر اس کی پابند ہے۔

وَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ اٰوٰۤى اِلَيْهِ
اَخَاهُ قَالَ اِنِّیْۤ اَنَا اَخُوْكَ فَلَا تَبْتَىٕسْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۶۹﴾ فَلَمَّا
جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ جَعَلَ السِّقَايَةَ فِیْ رَحْلِ اَخِيْهِ ثُمَّ اَذَّنَ
مُؤَذِّنٌ اَيَّتُهَا الْعِيْرُ اِنَّكُمْ لَسٰرِقُوْنَ ﴿۷۰﴾ قَالُوْا وَاَقْبَلُوْا عَلَيْهِمْ مَّاذَا
تَفْقِدُوْنَ ﴿۷۱﴾ قَالُوْا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ وَلِمَنْ جَآءَ بِهٖ حِمْلُ بَعِيْرٍ
وَّاَنَا بِهٖ زَعِيْمٌ ﴿۷۲﴾ قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَّا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِی الْاَرْضِ
وَمَا كُنَّا سٰرِقِيْنَ ﴿۷۳﴾ قَالُوْا فَمَا جَزَآؤُهٗۤ اِنْ كُنْتُمْ كٰذِبِيْنَ ﴿۷۴﴾ قَالُوْا
جَزَآؤُهٗ مَنْ وُّجِدَ فِیْ رَحْلِهٖ فَهُوَ جَزَآؤُهٗ ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِی
الظّٰلِمِيْنَ ﴿۷۵﴾ فَبَدَاَ بِاَوْعِيَتِهِمْ قَبْلَ وِعَآءِ اَخِيْهِ ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا
مِنْ وِّعَآءِ اَخِيْهِ ؕ كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ ؕ مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ
فِیْ دِيْنِ الْمَلِكِ اِلَّاۤ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ؕ وَ
فَوْقَ كُلِّ ذِیْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ ﴿۷۶﴾ قَالُوْۤا اِنْ يَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ
لَّهٗ مِنْ قَبْلُ ۚ فَاَسَرَّهَا يُوْسُفُ فِیْ نَفْسِهٖ وَلَمْ يُبْدِهَا لَهُمْ ۚ قَالَ
اَنْتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا ۚ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَصِفُوْنَ ﴿۷۷﴾ قَالُوْا يٰۤاَيُّهَا الْعَزِيْزُ اِنَّ

Marfat.com

لَهٗۤ اَبًا شَيْخًا كَبِيْرًا فَخُذْ اَحَدَنَا مَكَانَهٗ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۷۸﴾
قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اَنْ نَّاْخُذَ اِلَّا مَنْ وَّجَدْنَا مَتَاعَنَا عِنْدَهٗۤ ۙ اِنَّاۤ
اِذًا لَّظٰلِمُوْنَ ﴿۷۹﴾

رکوع: ۹۔ (جب برادرانِ یوسف حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس پہنچے تو حضرت یوسفؑ نے اپنے بھائی کو اپنے پاس جگہ دی۔ فرمایا میں تمہارا بھائی ہوں، پس اب غمزدہ نہ ہو، ان حرکتوں پر جو یہ کیا کرتے تھے۔ پس جب ان کا سامان تیار کرادیا، پانی پینے کا پیالہ اپنے بھائی کے کجاوے میں رکھوادیا، پھر ایک منادی نے آواز دی کہ اے قافلہ والو! تم لوگ چور ہو۔ برادرانِ یوسف نے ان کی طرف پلٹ کر پوچھا، تمہارے کیا چیز گم ہوئی ہے۔ انہوں نے کہا ہم شاہی پیمانہ نہیں پارہے اور جو اس کو لائے گا اس کیلئے ایک بارِ شتر غلہ ہے اور میں اس کا ضامن ہوں۔ انہوں نے کہا خدا کی قسم آپ لوگ جانتے ہیں کہ ہم اس ملک میں اس لئے نہیں آئے کہ فساد برپا کریں اور ہم چوری کرنے والے لوگوں میں سے نہیں ہیں۔ انہوں نے کہا اگر تم جھوٹے ثابت ہوئے تو اس چوری کرنے والے کی کیا سزا ہے۔ وہ بولے اس کی سزا یہ ہے کہ جس کے کجاوے میں چیز ملے وہ اس کی سزا میں دھرلیا جائے۔ ہم ایسے ظالموں کو اسی طرح سزا دیا کرتے ہیں۔ پس اس نے ابتدا کی ان کے تھیلوں سے تفتیش کی اپنے بھائی کے تھیلے سے پہلے، پھر اس کو اپنے بھائی کے تھیلے سے برآمد کرلیا۔ اس طرح ہم نے یوسفؑ کیلئے تدبیر کی، اس کیلئے مناسب نہ تھا کہ وہ بادشاہ کے قانون کی رو سے اپنے بھائی کو پکڑے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ چاہے۔ ہم جس کو چاہتے ہیں درجے پر درجے بلند کرتے ہیں اور ہر علم والے سے بالاتر ایک علم والا ہے۔ بھائیوں نے کہا اگر اس نے چوری کی ہے (تو کوئی تعجب کی بات نہیں) اس سے پہلے اس کا ایک بھائی بھی چوری کر چکا ہے، پس اس بات کو یوسفؑ تعالیٰ نے اپنے دل میں چھپالیا، اس کو ان پر ظاہر نہیں ہونے دیا، دل میں کہا تم خود ہی بدقماش لوگ ہو اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو تم بیان کر رہے ہو۔ وہ کہنے لگے اے عزیز! اس لڑکے کا باپ بہت بوڑھا ہے تو آپ اس کی جگہ ہم میں سے کسی کو روک لیجئے، ہم آپؑ کو نہایت ہی محسن سمجھتے ہیں۔ عزیزِ مصر نے کہا! اللہ تعالیٰ کی پناہ، اس بات سے کہ ہم اس کے سوا کسی کو پکڑیں جس کے پاس ہم نے اپنی چیز پائی ہو۔ اس صورت میں ہم نہایت ظالم ٹھہریں گے۔)

وَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ اٰوٰۤى اِلَيْهِ اَخَاهُ قَالَ اِنِّيْۤ اَنَا اَخُوْكَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۶۹﴾

(جب برادرانِ یوسف حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس پہنچے تو حضرت یوسفؑ نے اپنے بھائی کو اپنے پاس جگہ دی۔ فرمایا میں تمہارا بھائی ہوں، پس اب غمزدہ نہ ہو، ان حرکتوں پر جو یہ کیا کرتے تھے۔) (سورۃ یوسف:۶۹)

Marfat.com

بھائی پر افشائے راز

برادرانِ یوسف جب اپنے چھوٹے بھائی کو ساتھ لے کر مصر میں حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس پہنچے تو اسرائیلی روایات کے مطابق حضرت یوسفؑ نے انہیں بڑی عزت واحترام سے ٹھہرانے کا حکم دیا۔ ایک ایک کمرے میں دو دو بھائیوں کو ٹھہرایا گیا۔ بن یامین اکیلے رہ گئے اور آپ کو تنہا ایک کمرے میں ٹھہرایا گیا۔ آپ تنہائی میں نہایت افسردہ بیٹھے تھے کہ حضرت یوسفؑ کو ان کی افسردگی کی اطلاع ملی تو آپؑ نے انہیں اپنے پاس بلا بھیجا اور ان سے ان کی افسردگی کا سبب پوچھا تو بن یامین نے بتایا کہ میرے تمام بھائی دو دو ایک کمرے میں ٹھہرے ہیں۔ میں افسردہ اس بات سے ہوں کہ کاش میرا بھائی یوسفؑ زندہ ہوتا تو وہ آج میرے ساتھ ٹھہرتا، مجھے اپنے بھائی کی یاد کی وجہ سے تنہائی زیادہ افسردہ کر رہی ہے۔ تب حضرت یوسفؑ نے ان سے فرمایا کہ میں تمہارا بھائی ہوں۔ اس پر انہیں جیسی خوشی ہوئی ہوگی اس کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ یقیناً دونوں نے ساری رات گزرے وقتوں کی یادوں میں گزاری ہوگی۔ حضرت یوسفؑ نے اپنے دکھوں کی کہانی سنائی ہوگی اور بن یامین نے وہ سب کچھ بتایا ہوگا جو سوتیلے بھائی ان کے ساتھ کرتے رہے تھے۔ اس پر حضرت یوسفؑ نے فرمایا کہ برے دن گزر گئے، اب تمہیں افسردہ نہیں ہونا چاہئے، غموں کو دل سے نکال دو، اب میں تمہیں اکیلا نہیں چھوڑوں گا اور تمہارے سوتیلے بھائی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے اور ممکن ہے اس موقع پر وہ تدبیر بھی بتادی گئی ہو جس پر عمل کر کے بن یامین کو اپنے پاس روکا جاسکتا تھا۔ چنانچہ اگلی آیات میں اسی تدبیر کا ذکر ہے۔

فَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ جَعَلَ السِّقَايَةَ فِيْ رَحْلِ اَخِيْهِ ثُمَّ اَذَّنَ مُؤَذِّنٌ اَيَّتُهَا الْعِيْرُ اِنَّكُمْ لَسٰرِقُوْنَ ﴿٧٠﴾ قَالُوْا
وَاَقْبَلُوْا عَلَيْهِمْ مَّاذَا تَفْقِدُوْنَ ﴿٧١﴾ قَالُوْا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ وَلِمَنْ جَآءَ بِهٖ حِمْلُ بَعِيْرٍ وَّاَنَا بِهٖ زَعِيْمٌ ﴿٧٢﴾ قَالُوْا
تَاللّٰهِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَّا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِي الْاَرْضِ وَمَا كُنَّا سٰرِقِيْنَ ﴿٧٣﴾ قَالُوْا فَمَا جَزَآؤُهٗٓ اِنْ كُنْتُمْ كٰذِبِيْنَ ﴿٧٤﴾ قَالُوْا
جَزَآؤُهٗ مَنْ وُّجِدَ فِيْ رَحْلِهٖ فَهُوَ جَزَآؤُهٗ ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿٧٥﴾ فَبَدَاَ بِاَوْعِيَتِهِمْ قَبْلَ وِعَآءِ اَخِيْهِ ثُمَّ
اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِّعَآءِ اَخِيْهِ ؕ كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ ؕ مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ
نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ؕ وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ ﴿٧٦﴾

(پس جب ان کا سامان تیار کرا دیا، پانی پینے کا پیالہ اپنے بھائی کے کجاوے میں رکھوا دیا، پھر ایک منادی نے آواز دی کہ اے قافلہ والو! تم لوگ چور ہو۔ برادرانِ یوسف نے ان کی طرف پلٹ کر پوچھا، تمہارے کیا چیز گم ہوئی ہے۔
انہوں نے کہا ہم شاہی پیمانہ نہیں پار ہے اور جو اس کو لائے گا اس کیلئے ایک بار شتر غلہ ہے اور میں اس کا ضامن ہوں۔
انہوں نے کہا خدا کی قسم آپ لوگ جانتے ہیں کہ ہم اس ملک میں اس لئے نہیں آئے کہ فساد برپا کریں اور ہم چوری کرنے والے لوگوں میں سے نہیں ہیں۔ انہوں نے کہا اگر تم جھوٹے ثابت ہوئے تو اس چوری کرنے والے کی کیا سزا ہے۔ وہ بولے اس کی سزا یہ ہے کہ جس کے کجاوے میں چیز ملے وہ اس کی سزا میں دھر لیا جائے۔ ہم ایسے ظالموں کو اسی طرح سزا دیا کرتے ہیں۔ پس اس نے ابتدا کی ان کے تھیلوں سے تفتیش کی اپنے بھائی کے تھیلے سے پہلے، پھر اس کو اپنے بھائی کے تھیلے سے برآمد کر لیا۔ اس طرح ہم نے یوسفؑ کیلئے تدبیر کی، اس کیلئے مناسب نہ تھا کہ وہ بادشاہ کے قانون کی رو سے اپنے بھائی کو پکڑے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ چاہے۔ ہم جس کو چاہتے ہیں درجے پر درجے بلند کرتے ہیں اور ہر علم والے سے بالاتر ایک علم والا ہے۔) (سورۃ یوسف: ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶)

Marfat.com

چند ابتدائی باتیں

ان آیتوں کو سمجھنے سے پہلے چند باتوں کا ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام ابھی اپنا معاملہ اپنے بھائیوں پر ظاہر نہیں کرنا چاہتے بلکہ انہیں ٹٹولنا چاہتے ہیں کہ کیا ان کے اندر کوئی تبدیلی آئی ہے یا نہیں اور دوسری یہ بات کہ آپ نے ایک ترکیب کے ذریعے اپنے چھوٹے بھائی کو اپنے پاس بلا لیا۔ اب نہ تو بھائی واپس اپنے سوتیلے بھائیوں کے ساتھ جانا چاہتا ہے اور نہ آپ اسے بھیجنے کے روادار ہیں کیونکہ آپؑ محسوس کر رہے ہیں کہ یہ ظالم بھائی غلے کی حرص میں بن یامین کو ساتھ تو لے آئے ہیں لیکن واپس جاتے ہوئے اس کے ساتھ کیا سلوک کریں اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ممکن ہے پھر حضرت یوسفؑ والی کہانی دہرائیں۔ اس لئے عافیت اسی میں ہے کہ بن یامین کو واپس نہ جانے دیا جائے لیکن بن یامین کو روکنے میں سب سے بڑی رکاوٹ بادشاہ کا پیشتر سے رائج قانون ہے کہ کسی غیر ملکی کو بغیر کسی جرم کے روکا نہیں جا سکتا۔ حضرت یوسف علیہ السلام اس قانون کی مخالفت نہیں کرنا چاہتے۔ ایک تو اس لئے کہ یہ بادشاہ کا نافذ کردہ قانون ہے اور دوسرا اس لئے کہ یہ سراسر عدل وانصاف پر مبنی ہے۔ اور اگر بن یامین پر کوئی فرضی جرم عائد کر دیا جائے جو اس کے روکنے میں معاون ہو سکے۔ اگرچہ اس میں بن یامین کا اعتماد بھی شامل ہو تو اس پر سزا بھی ہو سکتی ہے۔ سزا کی صورت میں بجائے اس کے کہ بن یامین حضرت یوسفؑ کے پاس رہیں انہیں جیل میں رہنا پڑے گا۔ اور پھر ایسا الزام سراسر جھوٹ پر مبنی ہوگا اور حضرت یوسف علیہ السلام ایسے کسی جھوٹ کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے۔ اس لئے آپؑ نے ایک ایسا راستہ نکالا جس میں آپ جھوٹ بولنے سے بھی بچ گئے، بادشاہ کا قانون بھی ٹوٹنے سے محفوظ رہا اور بن یامین کے روکنے کی صورت بھی نکل آئی۔

اس میں جس تدبیر سے کام لیا گیا اسے اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب فرمایا، گویا وہ اللہ تعالیٰ کا احسان تھا جس کا امکان یوسف علیہ السلام کیلئے پیدا کیا گیا۔ اب ان آیات کو دیکھئے:

برادرانِ یوسف کے استحقاق کے مطابق ان کا سامان تیار کر دیا گیا۔ گیارہ بھائیوں کیلئے الگ الگ سامان باندھ دیا گیا اور اونٹوں پر لاد دیا گیا۔ جب یہ اپنا قافلہ لے کر روانہ ہوئے تو اچانک پیچھے سے آواز دینے والے نے آواز دی کہ قافلے والو! رک جاؤ، تم لوگ چور ہو۔ اس سے بظاہر ذہن اس طرف جاتا ہے کہ جو پیالہ مفقود ہوا تھا شاید اس کی چوری کا ان پر الزام لگایا جا رہا ہے حالانکہ وہ پیالہ حضرت یوسف علیہ السلام کے اشارے سے بن یامین کے سامان میں رکھا گیا تھا تو اسے چوری کہنا اور اس کا انتساب قافلے والوں کی طرف کرنا بجائے خود ایک جھوٹ ہے۔ اہلِ علم نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق اس کی توجیہ کرنے کی کوشش کی ہے حالانکہ بات بالکل واضح ہے کہ ندا دینے والے نے ان سے یہ نہیں کہا کہ تم نے پیالہ چرایا ہے بلکہ یہ کہا ہے کہ تم چور ہو اور کہا بھی یوسف علیہ السلام کی طرف سے ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ان کی طرف چوری کی نسبت پیالے کے حوالے سے نہیں کی گئی بلکہ جو کچھ انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ کیا تھا اس کی طرف کی گئی ہے کہ وہ اپنے والد گرامی سے حضرت یوسفؑ کی حفاظت کا وعدہ کر کے آپؑ کو ساتھ لے کر گئے وہاں حفاظت کرنے کی بجائے وعدے میں خیانت کرتے ہوئے انہیں کنویں میں پھینک دیا اور پھر جھوٹ موٹ آپ کا پیراہن کسی جانور کے خون میں رنگ کر آ کر یہ بیان دیا کہ یوسفؑ کو بھیڑیا کھا گیا۔ یہ وہ چوری تھی جس کی وجہ سے انہیں چور کہا گیا۔ دراصل زبان کے اسلوب میں اظہار کا ایک ذریعہ ہے جسے توریہ کہتے ہیں جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کہنے والا ایک بات کہتا ہے جس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں، کہنے والا اس کا مطلب اور لیتا اور سننے والا اور۔ اگر ایسی بات میں جھوٹ کی آمیزش نہ ہو اور مقصود اس سے حق کی معاونت ہو تو یہ جائز ہے۔ اس کی چھوٹی سے مثال یوں سمجھئے کہ مولانا محمد قاسمؒ نانوتوی کی گرفتاری کیلئے 1857ء میں پولیس جا بجا چھاپے مار رہی تھی۔ کسی نے انہیں مخبری کی کہ وہ اس وقت فلاں مسجد میں تشریف رکھتے ہیں۔ پولیس نے وہاں آ کر چھاپہ مارا۔ آپ سے ہی پوچھا کہ یہاں مولوی محمد قاسم صاحب بھی ہیں۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئے اور فرمانے لگے کہ ابھی تو یہاں تھے۔ پولیس فوراً باہر لپکی۔ وہ اس کا مطلب یہ سمجھے کہ وہ ابھی باہر نکلے ہیں اور مولانا کا مطلب یہ تھا کہ میں جن قدموں سے پیچھے ہٹا ہوں انہیں نشانات پر ابھی مولانا کھڑے تھے۔

Marfat.com

اب مولانا کے کہنے کا مطلب اور تھا اور وہ بھی صحیح تھا اور جو سمجھنے والوں نے سمجھا وہ بھی صحیح تھا۔اسی طرح کے توریہ سے حضرت یوسف علیہ السلام نے بھی کام لیا۔اس کا فائدہ صرف یہ ہوا کہ قافلہ رک گیا۔ برادرانِ یوسفؑ نے پلٹ کر پوچھا کہ تمہاری کیا چیز گم ہوئی ہے تو جواب دینے والوں نے یہ نہیں کہا کہ ہمارا پیالہ چوری ہوا ہے بلکہ یہ کہا کہ ہم پیالہ گم پا رہے ہیں۔ چنانچہ جب ان کے سامان کی تلاشی لی گئی تو بن یامین کے سامان سے وہ پیالہ مل گیا۔اس لحاظ سے برادرانِ یوسفؑ نے خود ہی سمجھ لیا اور تمام دیکھنے والے بھی یہ سمجھ گئے کہ یہ لڑکا اس پیالے کو چرانے کا مجرم ہے۔ چنانچہ انہیں بھائیوں سے پوچھا گیا کہ تم بتاؤ کہ جو شخص کسی کی چیز چراتا ہے تم اسے کیا سزا دیتے ہو۔ انہوں نے کہا ہمارے قانون میں اس کی سزا یہ ہے کہ جس کی اس نے چوری کی ہے اسے اس کے حوالے کر دیا جائے اور وہ غلام بن کے اس کے پاس رہے۔اس طرح سے بن یامین کو اپنے پاس روکنے کی ایک صورت پیدا ہوگئی اور صورت ایسی پیدا ہوئی جسے خود برادرانِ یوسفؑ نے پیدا کیا۔ان کی زبان سے ایک ایسی تدبیر کا ظاہر ہونا جو سراسر حضرت یوسفؑ کیلئے مفید مطلب تھی اور جس پر عمل کر کے بادشاہ کا قانون بھی شکست نہیں ہوتا تھا اسے اللہ تعالیٰ نے وہ تدبیر قرار دیا ہے جسے خود پروردگار کی قدرت نے برادرانِ یوسفؑ کی زبان سے ادا کرایا اور اسی کے مطابق بن یامین کو حضرت یوسفؑ اپنے پاس روکنے میں کامیاب ہوگئے۔آخر میں فرمایا کہ ہم جس کے چاہتے ہیں درجات بلند کرتے ہیں اور ہر علم والے کے اوپر ایک علم والا ہے۔اس میں حضرت یوسفؑ کے مراتبِ بلند کی طرف بھی اشارہ ہے اور مشرکینِ مکہ پر ایک تعریض بھی ہے کہ وہ آنحضرت ﷺ کی تبلیغ و دعوت کے مقابلے میں اپنی عقل کے فیصلوں پر کلیۃً انحصار کر رہے تھے اور اسی کو اپنی علم و دانش کا سرمایہ سمجھ رہے تھے۔انہیں بتایا جا رہا ہے کہ تمہیں حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعات سے اندازہ ہو جانا چاہئے کہ حقیقی علم صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے،اس کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ مستقبل کے پردوں میں کیا چھپا ہوا ہے۔تم آج بظاہر اسلام کا مستقبل تاریک دیکھ رہے ہو لیکن تمہیں نہیں معلوم کہ اسی تاریکی سے روشنی پھوٹنے والی ہے۔

ان آیات کی ضروری وضاحت تو اس حد تک کافی ہے، تاہم بعض امور ایسے ہیں جو بعض ذہنوں میں خلجان کا باعث ہو سکتے ہیں۔اس لئے ہم ان کی وضاحت کیلئے صاحبِ تفہیم القرآن سے استفادہ کرتے ہیں۔

بعض ضروری امور کی وضاحت

(۱) عام طور پر اس آیت کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ ''یوسفؑ بادشاہ کے قانون کی رو سے اپنے بھائی کو نہ پکڑ سکتا تھا'' یعنی مَا کَانَ لِیَاْخُذَ کو مترجمین و مفسرین عدم قدرت کے معنی میں لیتے ہیں نہ کہ عدم صحت اور عدم مناسبت کے معنی میں ہیں۔لیکن اول تو یہ ترجمہ و تفسیر عربی محاورے اور قرآنی استعمالات دونوں کے لحاظ سے ٹھیک نہیں ہے کیونکہ عربی میں عموماً مَا کَانَ لَهٗ بمعنی مَا یَنْبَغِیْ لَهٗ، مَا صَحَّ لَهٗ، مَا اسْتَقَامَ لَهٗ، وغیرہ آتا ہے اور قرآن میں بھی یہ زیادہ تر اسی معنی میں آیا ہے۔مثلاً مَا کَانَ اللّٰهُ اَنْ یَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ. مَا کَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِکَ بِاللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ مَا کَانَ اللّٰهُ لِیُطْلِعَکُمْ عَلَی الْغَیْبِ. مَا کَانَ اللّٰهُ لِیُضِیْعَ اِیْمَانَکُمْ فَمَا کَانَ اللّٰهُ لِیَظْلِمَهُمْ. مَا کَانَ اللّٰهُ لِیَذَرَ الْمُؤْمِنِیْنَ عَلٰی مَآ اَنْتُمْ عَلَیْهِ. مَا کَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ یَّقْتُلَ مُؤْمِنًا ۔دوسرے اگر اس کے وہ معنی لئے جائیں جو مترجمین و مفسرین بالعموم بیان کرتے ہیں تو بات بالکل مہمل ہو جاتی ہے۔بادشاہ کے قانون میں چور کو نہ پکڑ سکنے کی آخر وجہ کیا ہو سکتی ہے؟ کیا دنیا میں کبھی کوئی سلطنت ایسی بھی رہی ہے جس کا قانون چور کو گرفتار کرنے کی اجازت نہ دیتا ہو؟

(۲) اللہ تعالیٰ نے شاہی قانون کیلئے ''دین الملک'' کا لفظ استعمال کر کے خود اس مطلب کی طرف اشارہ فرما دیا ہے جو مَا کَانَ لِیَاْخُذَ سے لیا جانا چاہئے۔ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کا پیغمبر زمین میں ''دین اللہ'' جاری کرنے کیلئے مبعوث ہوا تھا نہ کہ ''دین الملک'' جاری کرنے کیلئے۔اگر حالات کی مجبوری سے اس کی حکومت میں اس وقت تک پوری طرح دین الملک کی جگہ دین اللہ تعالیٰ جاری نہ ہو سکا تھا۔تب بھی کم از کم پیغمبر کا اپنا کام تو یہ نہ تھا کہ اپنے ایک شخصی معاملہ میں دین الملک پر عمل کرے۔لہٰذا حضرت یوسف علیہ السلام کا دین الملک کے مطابق اپنے بھائی کو نہ پکڑنا اس بنا پر نہیں تھا کہ دین الملک میں ایسا کرنے کی گنجائش نہ تھی بلکہ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ پیغمبر ہونے کی حیثیت سے اپنی ذاتی حد تک دین اللہ تعالیٰ پر عمل کرنا ان کا فرض تھا اور دین الملک کی پیروی ان کیلئے قطعاً نامناسب تھی۔

Marfat.com

(۳) قانون ملکی (LAW OF THE LAND) کیلئے لفظ ''دین'' استعمال کر کے اللہ تعالیٰ نے معنی دین کی وسعت پوری طرح واضح کردی ہے۔اس سے ان لوگوں کے تصورِ دین کی جڑ کٹ جاتی ہے جو انبیاء علیہم السلام کی دعوت کو صرف عام مذہبی معنوں میں خدائے واحد کی پوجا کرانے اور محض چند مذہبی مراسم وعقائد کی پابندی کرا لینے تک محدود سمجھتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ انسان تمدن، سیاست، معیشت، عدالت، قانون اور ایسے ہی دوسرے دنیوی امور کا کوئی تعلق دین سے نہیں ہے، یا اگر ہے بھی تو ان امور کے بارے میں دین کی ہدایات محض اختیاری سفارشات ہیں جن پر اگر عمل ہو جائے تو اچھا ہے ورنہ انسانوں کے اپنے بنائے ہوئے اصول وضوابط قبول کر لینے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ سراسر گمراہانہ تصورِ دین، جس کا ایک مدت سے مسلمانوں میں چرچا ہے، جو بہت بڑی حد تک مسلمانوں کو اسلامی نظامِ زندگی کے قیام کی سعی سے غافل کرنے کا ذمہ دار ہے، جس کی بدولت مسلمان کفر و جاہلیت کے نظامِ زندگی پر نہ صرف راضی ہوئے بلکہ ایک نبی کی سنت سمجھ کر اس نظام کے پرزے بننے اور اس کو خود چلانے کیلئے بھی آمادہ ہو گئے، اس آیت کی رو سے قطعاً غلط ثابت ہوتا ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ صاف بتا رہا ہے کہ جس طرح نماز، روزہ اور حج دین ہے اسی طرح وہ قانون بھی دین ہے جس پر سوسائٹی کا نظام اور ملک کا انتظام چلایا جاتا ہے۔ لہٰذا اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ اور وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وغیرہ آیات میں جس دین کی اطاعت کا مطالبہ کیا گیا ہے اس سے مراد صرف نماز، روزہ ہی نہیں ہے بلکہ اسلام کا اجتماعی نظام بھی ہے۔ جس سے ہٹ کر کسی دوسرے نظام کی پیروی خدا کے ہاں ہرگز قبول نہیں ہوسکتی۔

(۴) سوال کیا جاسکتا ہے کہ اس سے کم از کم یہ تو ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت تک مصر کی حکومت میں ''دین الملک'' ہی جاری تھا۔ اب اگر اس حکومت کے حاکمِ اعلیٰ حضرت یوسف علیہ السلام ہی تھے، جیسا کہ تم خود پہلے ثابت کر چکے ہو، تو اس سے لازم آتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام، خدا کے پیغمبر، خود اپنے ہاتھوں سے ملک میں ''دین الملک'' جاری کر رہے تھے۔ اس کے بعد اگر اپنے ذاتی معاملہ میں حضرت یوسف علیہ السلام نے ''دین الملک'' کی بجائے شریعت ابراہیمی پر عمل کیا بھی تو اس سے فرق کیا واقع ہوا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام مامور تو دین اللہ جاری کرنے ہی پر تھے اور یہی ان کا پیغمبرانہ مشن اور ان کی حکومت کا مقصد تھا، مگر ایک ملک کا نظام عملاً ایک دن کے اندر نہیں بدل جایا کرتا۔ آج اگر کوئی ملک بالکلیہ ہمارے اختیار میں ہو اور ہم اس میں اسلامی نظام قائم کرنے کی خالص نیت ہی سے اس کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیں، تب بھی اس کے نظامِ تمدن، نظامِ معاشی، نظامِ سیاست اور نظامِ عدالت وقانون کو بالفعل بدلتے بدلتے برسوں لگ جائیں گے اور کچھ مدت تک ہم کو اپنے انتظام میں بھی سابق قوانین برقرار رکھنے پڑیں گے۔ کیا تاریخ اس بات پر شاہد نہیں ہے کہ خود نبی کریم ﷺ کو بھی عرب کے نظامِ زندگی میں پورا اسلامی انقلاب برپا کرنے کیلئے نو دس سال لگے تھے؟ اس دوران میں خاتم النبیین ؐ کی اپنی حکومت میں چند سال شراب نوشی ہوتی رہی، سود لیا اور دیا جاتا رہا، جاہلیت کا قانونِ میراث جاری رہا، پرانے قوانینِ نکاح وطلاق برقرار رہے، بیوعِ فاسدہ کی بہت سی صورتیں عمل میں آتی رہیں اور اسلامی قوانین دیوانی و فوجداری بھی اول روز ہی بتمام وکمال نافذ نہیں ہو گئے۔ پس اگر حضرت یوسف علیہ السلام کی حکومت میں ابتدائی آٹھ نو سال تک سابق مصری بادشاہت کے کچھ قوانین چلتے رہے ہوں تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے اور اس سے یہ دلیل کیسے نکل آتی ہے کہ خدا کا پیغمبر مصر میں خدا کے دین کو نہیں بلکہ بادشاہ کے دین کو جاری کرنے پر مامور تھا۔ رہی یہ بات کہ جب ملک میں دین الملک جاری تھا ہی تو آخر حضرت یوسف علیہ السلام کی اپنی ذات کیلئے اس پر عمل کرنا کیوں شایانِ شان نہ تھا، تو یہ سوال بھی نبی کریم ﷺ کے طریقہ پر غور کرنے سے بآسانی حل ہو جاتا ہے۔ نبی کریم ﷺ کی حکومت کے ابتدائی دور میں جب تک قوانین اسلامی جاری نہ ہوئے تھے، لوگ پرانے طریقے کے مطابق شراب پیتے رہے مگر کیا حضور ؐ نے بھی پی؟ لوگ سود لیتے دیتے تھے، مگر کیا آپ نے بھی سودی لین دین کیا؟ لوگ متعہ کرتے رہے اور جمع بین الاختین کرتے رہے مگر کیا حضور ؐ نے بھی ایسا کیا؟ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ داعی اسلام کا عملی مجبوریوں کی بنا پر احکام اسلامی کے اجراء میں تدریج سے کام لینا اور چیز ہے اور اس کا خود اس تدریج کے دور میں جاہلیت کے طریقوں پر عمل کرنا اور چیز۔ تدریج کی رخصتیں دوسروں کیلئے ہیں۔ داعی کا اپنا یہ کام نہیں ہے کہ خود ان طریقوں میں سے کسی پر عمل کرے جن کے مٹانے پر وہ مامور ہوا ہے۔

قَالُوْٓا اِنْ يَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ ۚ فَاَسَرَّهَا يُوْسُفُ فِيْ نَفْسِهٖ وَلَمْ يُبْدِهَا لَهُمْ ۚ قَالَ اَنْتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا ۚ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَصِفُوْنَ ﴿۷۷﴾

Marfat.com

(بھائیوں نے کہا اگر اس نے چوری کی ہے (تو کوئی تعجب کی بات نہیں) اس سے پہلے اس کا ایک بھائی بھی چوری کر چکا ہے، پس اس بات کو یوسفؑ نے اپنے دل میں چھپا لیا، اس کو ان پر ظاہر نہیں ہونے دیا، دل میں کہا تم خود ہی بدقماش لوگ ہو اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو تم بیان کر رہے ہو۔) (سورۃ یوسف: ۷۷)

اپنی صفائی اور حضرت یوسفؑ پر الزام

برادرانِ یوسف نے جب دیکھا کہ بن یامین چوری کے جرم میں ماخوذ ہو گیا ہے تو انہیں خیال پیدا ہوا کہ عزیزِ مصر بن یامین کی چوری سے یقیناً یہ تاثر لے گا کہ ہم سب بدقماش لوگ ہیں۔ ایک بھائی اگر چوری میں پکڑا جاتا ہے تو باقی بھائیوں کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے کہ وہ کس طرح کی خصلتوں کے مالک ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنی براءت کرتے ہوئے ایک ایسی بات کہی جو انتہائی غلط بھی تھی اور نازیبا بھی۔ کہا سرکار! آپ ہمارے بارے میں بدگمانی نہ کیجئے، ہم خاندانی لوگ ہیں اور ہم اس طرح کی رذیل حرکت کبھی نہیں کر سکتے۔ یہ لڑکا ہمارا حقیقی بھائی نہیں ہے، اس لئے یہ خاندانی کردار کا حامل بھی نہیں ہے۔ یہ ہمارا سوتیلا بھائی ہے اس نے یہ خصلتیں اپنی ماں سے لی ہیں۔ اس کا ایک اور بھائی بھی اسی طرح چوری کے جرم میں پکڑا گیا تھا تو اس نے اگر یہ حرکت کی ہے تو یہ دودھ کا اثر ہے، کوئی نئی بات نہیں۔ البتہ آپ اسے ہمارا بھائی سمجھ کر ہمارے بارے میں کوئی بری رائے قائم نہ کیجئے۔ حضرت یوسفؑ نے جب سنا کہ وہ ان پر چوری کا الزام لگا رہے ہیں تو انہیں یقیناً اس سے دلی اذیت ہوئی لیکن وہ اسے دل ہی میں پی گئے، کوئی ایسی بات زبان پہ لانا گوارا نہ کیا جس سے ان بھائیوں کو شبہ ہوتا کہ یہی یوسفؑ ہے۔ البتہ اپنے جی میں یہ ضرور کہا کہ تم بہت بدقماش اور بدخصلت لوگ ہو۔ دوسروں پر سراپا بہتان باندھتے ہو، خود ظلم کرتے ہو لیکن اس کا احساس تک نہیں رکھتے۔ رہی یہ بات کہ جو تم کہہ رہے ہو اس کی حقیقت کیا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے بارے میں خوب جانتا ہے کہ کس نے چوری کی اور کون بہتان باندھ رہا ہے تو بجائے انہیں سرزنش کرنے کے انہیں عزت سے واپس جانے کی اجازت دے دی۔ اس سے حضرت یوسف علیہ السلام کے ظرف کی بلندی اور اعلیٰ اخلاق کا اندازہ ہوتا ہے۔

قَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الْعَزِيْزُ اِنَّ لَهٗٓ اَبًا شَيْخًا كَبِيْرًا فَخُذْ اَحَدَنَا مَكَانَهٗ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۷۸﴾

(وہ کہنے لگے اے عزیز! اس لڑکے کا باپ بہت بوڑھا ہے تو آپ اس کی جگہ ہم میں سے کسی کو روک لیجئے، ہم آپ کو نہایت ہی محسن سمجھتے ہیں۔) (سورۃ یوسف: ۷۸)

حضرت یوسفؑ کی خوشامد

برادرانِ یوسف نے جب دیکھا کہ معاملہ بہت بگڑ گیا ہے۔ بن یامین کے سامان سے پیالہ پکڑے جانے کے بعد صرف عزت ہی کو نقصان نہیں پہنچا بلکہ بن یامین کی واپسی بھی ناممکن ہو گئی ہے۔ ہم اپنے والد ماجد کو جس طرح پختہ عہد دے کر آئے تھے کہ ہم ہر صورت میں بھائی کو ساتھ لے کے آئیں گے تو اب ہم کس منہ سے ان کے پاس جائیں۔ ایک ہی راستہ نظر آیا کہ عزیز کی خوشامد کی جائے۔ چنانچہ انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اے عزیز! یعنی سرکار، آپ ہمارے بھائی کو نہ روکئے کیونکہ اس کا باپ بے حد عمر رسیدہ اور نہایت کمزور آدمی ہے۔ وہ جب دیکھے گا کہ میرا چھوٹا بیٹا واپس نہیں آیا تو وہ شاید اس صدمے کو برداشت نہ کر پائے۔ اس لئے آپ براہ کرم ہم میں سے کسی کو گرفتار کر لیجئے اور بن یامین کو ہمارے ساتھ جانے دیجئے۔

قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اَنْ نَّاْخُذَ اِلَّا مَنْ وَّجَدْنَا مَتَاعَنَا عِنْدَهٗٓ ۙ اِنَّآ اِذًا لَّظٰلِمُوْنَ ﴿۷۹﴾

(عزیزِ مصر نے کہا! اللہ تعالیٰ کی پناہ، اس بات سے کہ ہم اس کے سوا کسی کو پکڑیں جس کے پاس ہم نے اپنی چیز پائی ہو۔ اس صورت میں ہم نہایت ظالم ٹھہریں گے۔) (سورۃ یوسف: ۷۹)

Marfat.com

حضرت یوسفؑ کا جواب

بھائیوں کی درخواست پر حضرت یوسفؑ علیہ السلام نے فرمایا کہ ہم اس بات سے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتے ہیں کہ ہم کسی ایسے شخص کو پکڑیں جس سے ہمیں کوئی شکایت نہیں۔ ہم تو اس شخص کو پکڑیں گے جس سے ہمیں اپنا پیالہ ملا ہے، اگر ہم کسی اور کو اس کی جگہ گرفتار کریں تو یہ انصاف نہیں، ظلم ہوگا۔ تو ہم ظلم سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتے ہیں۔ اس میں حضرت یوسفؑ علیہ السلام کی احتیاط ملاحظہ کیجئے، آپ یہ نہیں کہتے کہ ہم اس شخص کو کیسے چھوڑ دیں جس نے ہماری چوری کی ہے بلکہ اس کی بجائے آپ یہ کہتے ہیں کہ ہم اس شخص کو نہیں چھوڑ سکتے جس کے سامان میں ہم نے اپنا پیالہ پایا ہے۔ اس طرح سے آپ نے بن یامین پر چوری کا الزام نہیں لگایا کیونکہ آپ حقیقتِ حال سے واقف تھے۔

فَلَمَّا اسْتَيْـَٔسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِيًّا ۭ قَالَ كَبِيْرُهُمْ
اَلَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنَّ اَبَاكُمْ قَدْ اَخَذَ عَلَيْكُمْ مَّوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ وَمِنْ
قَبْلُ مَا فَرَّطْتُّمْ فِيْ يُوْسُفَ ۚ فَلَنْ اَبْرَحَ الْاَرْضَ حَتّٰى يَاْذَنَ لِيْٓ
اَبِيْٓ اَوْ يَحْكُمَ اللّٰهُ لِيْ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿٨٠﴾ اِرْجِعُوْٓا اِلٰٓى اَبِيْكُمْ
فَقُوْلُوْا يٰٓاَبَانَآ اِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ ۚ وَمَا شَهِدْنَآ اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا وَمَا
كُنَّا لِلْغَيْبِ حٰفِظِيْنَ ﴿٨١﴾ وَسْـَٔلِ الْقَرْيَةَ الَّتِيْ كُنَّا فِيْهَا وَالْعِيْرَ
الَّتِيْٓ اَقْبَلْنَا فِيْهَا ۭ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿٨٢﴾ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ
اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ۭ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ۭ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَنِيْ بِهِمْ
جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿٨٣﴾ وَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰٓاَسَفٰى
عَلٰي يُوْسُفَ وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيْمٌ ﴿٨٤﴾
قَالُوْا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ يُوْسُفَ حَتّٰى تَكُوْنَ حَرَضًا اَوْ
تَكُوْنَ مِنَ الْهٰلِكِيْنَ ﴿٨٥﴾ قَالَ اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ

Marfat.com

إِلَى اللَّهِ وَأَعْلَمُ مِنَ اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿٨٦﴾ يَا بَنِيَّ اذْهَبُوا فَتَحَسَّسُوا
مِنْ يُوسُفَ وَأَخِيهِ وَلَا تَيْأَسُوا مِنْ رَوْحِ اللَّهِ ۖ إِنَّهُ لَا يَيْأَسُ
مِنْ رَوْحِ اللَّهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْكَافِرُونَ ﴿٨٧﴾ فَلَمَّا دَخَلُوا عَلَيْهِ قَالُوا
يَا أَيُّهَا الْعَزِيزُ مَسَّنَا وَأَهْلَنَا الضُّرُّ وَجِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُزْجَاةٍ
فَأَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ وَتَصَدَّقْ عَلَيْنَا ۖ إِنَّ اللَّهَ يَجْزِي الْمُتَصَدِّقِينَ ﴿٨٨﴾
قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَا فَعَلْتُمْ بِيُوسُفَ وَأَخِيهِ إِذْ أَنْتُمْ جَاهِلُونَ ﴿٨٩﴾
قَالُوا أَإِنَّكَ لَأَنْتَ يُوسُفُ ۖ قَالَ أَنَا يُوسُفُ وَهَٰذَا أَخِي ۖ قَدْ
مَنَّ اللَّهُ عَلَيْنَا ۖ إِنَّهُ مَنْ يَتَّقِ وَيَصْبِرْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ
الْمُحْسِنِينَ ﴿٩٠﴾ قَالُوا تَاللَّهِ لَقَدْ آثَرَكَ اللَّهُ عَلَيْنَا وَإِنْ كُنَّا
لَخَاطِئِينَ ﴿٩١﴾ قَالَ لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ۖ يَغْفِرُ اللَّهُ لَكُمْ ۖ وَهُوَ
أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ ﴿٩٢﴾ اذْهَبُوا بِقَمِيصِي هَٰذَا فَأَلْقُوهُ عَلَىٰ وَجْهِ
أَبِي يَأْتِ بَصِيرًا وَأْتُونِي بِأَهْلِكُمْ أَجْمَعِينَ ﴿٩٣﴾ ع

رکوع: ۱۰۔ (جب وہ یوسفؑ سے مایوس ہو گئے تو آپس میں مشورہ کرنے الگ ہوئے۔ ان کے بڑے بھائی نے کہا، کیا تم نہیں جانتے کہ تمہارے باپ نے اللہ تعالیٰ کے نام پر تم سے مضبوط قول وقرار لیا ہے۔ اور اس سے پہلے یوسفؑ کے معاملے میں جو تقصیر تم کر چکے ہو (وہ بھی تمہارے علم میں ہے) سو میں تو نہیں چھوڑوں کو اس زمین کو جب تک مجھے میرے والد اجازت نہ دیں، یا اللہ تعالیٰ میرے لئے کوئی فیصلہ نہ فرمائے اور وہی بہترین فیصلہ فرمانے والا ہے۔ تم لوٹ جاؤ اپنے باپ کی طرف پھر عرض کرواے ہمارے محترم باپ بیشک آپ کے بیٹے نے چوری کی ہے اور ہم نے وہی بات کہی ہے جو ہمارے علم میں آئی اور ہم غیب

Marfat.com

کے نگہبان نہیں ہیں۔ اور آپ اس بستی کے لوگوں سے بھی پوچھ لیجئے جس میں ہم رہے ہیں اور اس قافلے سے بھی جس میں ہم آئے ہیں اور ہم بالکل سچے ہیں۔ حضرت یعقوبؑ نے یہ سن کر کہا بلکہ تمہارے لئے تمہارے نفسوں نے یہ بات آراستہ کردی ہے، اب صبر ہی زیبا ہے۔ امید ہے اللہ تعالیٰ ان سب کو میرے پاس لائے گا، بیشک وہی علیم وحکیم ہے۔ اور حضرت یعقوبؑ نے ان سے منہ پھیرا اور کہا، ہائے یوسفؑ۔ اور غم سے آپ کی آنکھیں سفید پڑگئیں اور آپ غم کی وجہ سے گھٹے گھٹے رہنے لگے۔ وہ بولے اللہ تعالیٰ کی قسم! آپ ہمیشہ یوسفؑ ہی کو یاد کرتے رہیں گے۔ یہاں تک کہ از کار رفتہ ہو کر رہ جائیں گے یا ہلاک ہی ہو جائیں گے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا، میں اپنی پریشانی اور اپنے غم کا شکوہ اللہ تعالیٰ ہی سے کرتا ہوں اور میں جانتا ہوں اللہ تعالیٰ کی جانب سے وہ باتیں جو تم نہیں جانتے۔ اے میرے بیٹو! جاؤ یوسفؑ اور اس کے بھائی کی تلاش کرو۔ اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس تو بس کافر ہی ہوتے ہیں۔ جب وہ حضرت یوسفؑ کے پاس پہنچے تو انہوں نے کہا اے عزیز! ہمیں اور ہمارے اہل وعیال کو قحط سالی سے بڑی تکلیف پہنچی اور ہم تھوڑی سی پونجی لے یوسفؑ کر حاضر ہوئے ہیں تو آپ ہمیں غلہ بھی پورا دیجئے اور ہم کو صدقہ بھی عنایت فرمائیے، اللہ تعالیٰ صدقہ کرنے والوں کو بدلہ عطا فرماتا ہے۔ حضرت یوسفؑ نے کہا کیا تمہیں معلوم ہے جو تم نے یوسفؑ اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا، جب تم جاہل تھے۔ وہ کہنے لگے، کیا آپ ہی یوسفؑ ہیں؟ حضرت یوسفؑ نے کہا، کہ ہاں! میں یوسفؑ ہوں اور یہ میرا بھائی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہم پر احسان فرمایا۔ جو شخص بھی تقویٰ اختیار کرتا اور صبر کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔ برادرانِ یوسفؑ کہنے لگے، اللہ تعالیٰ کی قسم! اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہم پر برتری بخشی اور بیشک ہم ہی غلطی پر تھے۔ حضرت یوسفؑ نے کہا آج تم پر کچھ الزام نہیں، اللہ تعالیٰ تم کو معاف کرے۔ وہ ارحم الراحمین ہے۔ میرا یہ کرتا لے جاؤ، میرے باپ کے چہرے پر ڈال دیجئے، وہ بینا ہو جائیں گے۔ اور تم لوگ اپنے تمام اہل وعیال کے ساتھ میرے پاس آجاؤ۔)

فَلَمَّا اسْتَيْـَٔسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِيًّا ۗ قَالَ كَبِيْرُهُمْ اَلَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنَّ اَبَاكُمْ قَدْ اَخَذَ عَلَيْكُمْ مَّوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ وَمِنْ قَبْلُ مَا فَرَّطْتُّمْ فِىْ يُوْسُفَ ۚ فَلَنْ اَبْرَحَ الْاَرْضَ حَتّٰى يَاْذَنَ لِىْٓ اَبِىْٓ اَوْ يَحْكُمَ اللّٰهُ لِىْ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ۝٨٠

(جب وہ یوسفؑ سے مایوس ہوگئے تو آپس میں مشورہ کرنے الگ ہوئے۔ ان کے بڑے بھائی نے کہا، کیا تم نہیں جانتے کہ تمہارے باپ نے اللہ تعالیٰ کے نام پر تم سے مضبوط قول وقرار لیا ہے۔ اور اس سے پہلے یوسفؑ کے معاملے میں جو تقصیر تم کر چکے ہو (وہ بھی تمہارے علم میں ہے) سو میں تو نہیں چھوڑوں گا اس زمین کو جب تک مجھے میرے والد اجازت نہ دیں، یا اللہ تعالیٰ میرے لئے کوئی فیصلہ نہ فرمائے اور وہی بہترین فیصلہ فرمانے والا ہے۔) (سورۃ یوسف: ۸۰)

بھائیوں کی مشاورت

حضرت یوسفؑ علیہ السلام کے جواب سے مایوس ہو کر بھائی ایک طرف مشورے کیلئے بیٹھ گئے۔ ان کے بڑے بھائی نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ تمہیں خوب معلوم ہے کہ تمہارے والد کسی قیمت پر بن یامین کو بھیجنے کیلئے تیار نہ تھے، انہیں ہم پر بالکل بھروسہ نہ تھا لیکن حالات سے مجبور ہو کر انہوں نے اس شرط پر چھوٹے بھائی کو ہمارے ساتھ بھیجا کہ تم میرے ساتھ ایک مضبوط عہد کرو کہ تم ہر قیمت پر اپنے بھائی کی حفاظت کرو گے اور جب تک تم میں زندگی اور آزادی ہے تم اپنے بھائی کو پیچھے چھوڑ کر نہیں آؤ گے۔ اور تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ تم اس سے پہلے یوسفؑ کے بارے میں بھی عہد شکنی کر چکے ہو اور آج تک تمہارا باپ کے سامنے اعتماد بحال نہیں ہو سکا۔ اس لئے مجھ میں تو ہمت نہیں ہے کہ میں اپنے باپ کا سامنا کر سکوں۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ بن یامین کی رہائی تک میں سرزمینِ مصر کو نہیں چھوڑوں گا۔ الا یہ کہ میرے والد مجھے واپس بلا لیں یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی فیصلہ ہو جائے۔

Marfat.com

قرآنِ کریم نے ان کے بڑے بھائی کیلئے کبیر کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس میں مفسرین نے اختلاف کیا ہے کہ اس کبیر سے مراد عمر میں بڑا ہے یا کہ عقل ورائے میں بڑا۔ عمر میں بڑا تو روبیل تھا اور عقل ورائے میں یہوذا کی اہمیت تسلیم کی جاتی تھی۔ بعض اہل علم نے کبیر کے لفظ سے استدلال کرتے ہوئے یہ رائے دی ہے کہ اگر یہاں مجرد عمر کی بڑائی کا اظہار مقصود ہوتا تو اس کیلئے کبیر کی بجائے اکبر کا لفظ زیادہ موزوں تھا۔ اس لئے ان کا خیال یہ ہے کہ اس سے مراد روبیل نہیں بلکہ یہوذا ہے۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس بھائی کے دل میں یوسفؑ کیلئے شروع سے نرم گوشہ پایا جاتا تھا۔ چنانچہ جب بھائیوں نے یوسفؑ کو قتل کرنے کا ارادہ کیا تو اس نے مخالفت کرتے ہوئے یہ رائے دی کہ اسے قتل مت کرو، البتہ کنویں میں ڈال دو، کوئی گزرنے والا قافلہ انہیں نکال کرلے جائے گا۔

اِرْجِعُوْٓا اِلٰٓی اَبِیْکُمْ فَقُوْلُوْا یٰٓاَبَانَآ اِنَّ ابْنَکَ سَرَقَ ۚ وَمَا شَهِدْنَآ اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا وَمَا كُنَّا لِلْغَيْبِ حٰفِظِيْنَ ﴿۸۱﴾
وَسْـَٔلِ الْقَرْيَةَ الَّتِىْ كُنَّا فِيْهَا وَالْعِيْرَ الَّتِىْٓ اَقْبَلْنَا فِيْهَا ۭ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۸۲﴾

(تم لوٹ جاؤ اپنے باپ کی طرف پھر عرض کرواے ہمارے محترم باپ بیشک آپ کے بیٹے نے چوری کی ہے اور ہم نے وہی بات کہی ہے جو ہمارے علم میں آئی اور ہم غیب کے نگہبان نہیں ہیں۔ اور آپ اس بستی کے لوگوں سے بھی پوچھ لیجئے جس میں ہم رہے ہیں اور اس قافلے سے بھی جس میں ہم آئے ہیں اور ہم بالکل سچے ہیں۔) (سورۃ یوسف :۸۱، ۸۲)

یہوذا نے بھائیوں کو مشورہ دیا کہ میں تو یہاں سے کسی قیمت پر نہیں جاؤں گا۔ البتہ تم اپنے باپ کے پاس لوٹ جاؤ اور انہیں جا کے صاف صاف بتاؤ کہ آپ کے صاحبزادے نے وہاں یہ گل کھلایا ہے، وہ چوری کے الزام میں پکڑا گیا ہے۔ حقیقت تو اللہ تعالیٰ جانتا ہے کیونکہ اس نے ہمارے سامنے چوری نہیں کی البتہ پیالہ اس کے سامان سے برآمد ہوا اس ثبوت کی موجودگی میں ہم اس کی رہائی کیلئے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ منت سماجت کی، آپ کے بڑھاپے کا واسطہ دیا لیکن عزیزِ مصر نے ہماری کوئی بات قبول نہیں کی۔ ہمیں گمان ہے کہ آپ کو ہماری بات کا اعتبار نہیں آئے گا کہ ہم نے شاید اپنی طرف سے کوئی جھوٹ گھڑ لیا ہو تو آپ تحقیق کر لیجئے ان بستی والوں سے پوچھئے جس بستی میں ہماری رہائش رہی ہے۔ ان قافلے والوں سے معلوم کر لیجئے جس قافلے کے ساتھ ہم آئے ہیں۔ بستی والے اور قافلے والے دونوں گواہی دیں گے کہ ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں سچ کہہ رہے ہیں اس لئے آپ ہمیں معذور سمجھئے اور ہمارا عذر قبول فرمائیے۔

قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ۭ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ۭ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَنِيْ بِهِمْ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿۸۳﴾

(حضرت یعقوبؑ نے یہ سن کر کہا بلکہ تمہارے لئے تمہارے نفسوں نے یہ بات آراستہ کر دی ہے، اب صبر ہی زیبا ہے۔ امید ہے اللہ تعالیٰ ان سب کو میرے پاس لائے گا، بیشک وہی علیم و حکیم ہے۔) (سورۃ یوسف :۸۳)

تسویل کا مفہوم

سَوَّلَتْ کا مصدر تسویل ہے۔ یہ تزئین اور تسہیل کیلئے بولا جاتا ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے کہا کہ تعجب کی بات ہے کہ ایک بہت بڑی بات کو تمہارے نفسوں نے اس قدر آراستہ کیا کہ تم کس آسانی سے اسے اپنی زبانوں پر لے آئے۔ تم جانتے ہو کہ بن یامین کس حُسنِ کردار کا مالک ہے۔ اس کی تربیت کیسے پاکیزہ ماحول میں ہوئی ہے۔ وہ کبھی چوری کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ یہ سب کچھ جاننے کے باوجود تم کس آسانی سے اس کی طرف چوری کے جرم کو منسوب کر رہے ہو۔ حقیقت کچھ بھی ہو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یوسفؑ کے بعد بن یامین کا غلام بنا لیا جانا میرے لئے بہت بڑا صدمہ ہے اور پھر یہوذا کا اس کی وجہ سے پردیس میں رک جانا مزید صدمے کی بات ہے۔ یوسفؑ کا صدمہ ہی کیا کم تھا کہ ان صدموں نے پرانے زخموں میں ٹیس پیدا کر دی ہے۔ لیکن مجھے کسی سے شکایت نہیں، میرے لئے تو صبر جمیل سب سے بہتر ہے۔ یہاں نکرہ موصوف مبتدا کی جگہ آیا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے۔ صبر جمیل اس کیفیت کو کہتے ہیں جس میں غم اور صدمے سے دل کے بیشک ٹکڑے ہو جائیں اور بیشک آنکھوں سے آنسو رکنے نہ پائیں لیکن اظہارِ غم میں بے

Marfat.com

صبری کو راستہ نہ ملے۔ دل کا اطمینان ہاتھ سے نہ جانے پائے۔ دل میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی شکایت پیدا نہ ہو۔ آدمی اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتے ہوئے ان صدمات کو برداشت کرنے کی کوشش کرے بلکہ برداشت بھی اللہ تعالیٰ ہی سے مانگے اور اچھے دنوں کی امید اپنے اللہ تعالیٰ سے اور توانا کردے۔ چنانچہ اسی صبر جمیل کا شاید نتیجہ ہے کہ اتنے بے پناہ صدموں کے حملے کے باوجود یاس اور ناامیدی حضرت یعقوب کے قریب نہیں آنے پائے۔ آپ چونکہ محرم اسرار الٰہی ہیں اس لئے آپ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر کبھی آزمائشوں کا اتنا بوجھ نہیں ڈالتا جو ان کیلئے ناقابل برداشت ہو۔ پے در پے صدموں نے میری کمر توڑ دی ہے۔ نئے صدمے میری ہمت کیلئے بہت بڑا امتحان ہیں۔ میں اللہ تعالیٰ کی سنت سے آگاہی کے باعث یہ امید رکھتا ہوں کہ اب آزمائشوں کی رات کٹنے والی ہے۔ امید کی صبح طلوع ہونے میں اب زیادہ دیر نہیں۔ مجھے اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ وہ نہ صرف یہوذا اور بن یامین کو میرے پاس لائے گا بلکہ یوسفؑ بھی ایک دن میرے سامنے ہوں گے۔ علم وحکمت کا مالک تو وہی ہے لیکن جس طرح ہر رات کی ایک صبح ضرور ہوتی ہے اسی طرح ہر صدمے کی ایک امید ہوتی ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ وہ صبح امید اب طلوع ہوا ہی چاہتی ہے۔

وَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَ قَالَ يٰاَسَفٰى عَلٰى يُوْسُفَ وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيْمٌ ﴿۸۴﴾

(اور حضرت یعقوب نے ان سے منہ پھیرا اور کہا، ہائے یوسفؑ۔ اور غم سے آپ کی آنکھیں سفید پڑ گئیں اور آپ غم کی وجہ سے گھٹے گھٹے رہنے لگے۔) (سورۃ یوسف :۸۴)

حضرت یوسفؑ کے غم میں شدت کی وجہ

بیٹوں سے یہ باتیں کرنے کے بعد آپؑ نے ان سے پشت پھیری اور تخلیہ میں جا بیٹھے۔ اس نئے صدمے نے حضرت یوسفؑ کے غم کو بھی تازہ کردیا۔ صدمہ تو بن یامین کا بھی بہت تھا لیکن اس کی نوعیت دوسری تھی۔ یہوذا کی جدائی بھی گوارا نہ تھی۔ لیکن اس کی کیفیت بھی ایسی شدید نہ تھی۔ یوسفؑ کا غم سب غموں پر حاوی تھا۔ ایک تو اس لئے کہ آج تک اس کا معاملہ زندگی اور موت کے درمیان معلق تھا۔ زندگی کا خیال امید کی شمع جلا دیتا ہے اور موت کا تصور غم کو اور گہرا کردیتا ہے۔ اور مزید یہ بات بھی کہ حضرت یوسفؑ علیہ السلام سے حضرت یعقوب علیہ السلام کی محبت صرف ایک باپ کی بیٹے سے محبت نہیں تھی بلکہ حضرت یعقوبؑ ان کے آئینہ میں جمالِ خداوندی دیکھتے تھے۔ ان کی پیشانی پر سعادت کا نور روشن تھا۔ ان کا پاکیزہ باطن اور روشن مستقبل ان کی یاد کو اور سنگین کردیتا تھا۔ اس لئے تخلیہ میں جاتے ہیں بے ساختہ زبان پر ہائے یوسفؑ کا لفظ آیا۔ لیکن اپنے بچوں کے سامنے ہائے کہنا گوارا نہ کیا۔ اس فرق کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ ایک مومن اپنے ہر صدمے میں اللہ تعالیٰ ہی سے مدد مانگتا ہے اور اللہ تعالیٰ ہی سے اپنے غم کی کہانی کہتا ہے۔ اسی کے سامنے آنسو بہاتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اسی آغوش سے مجھے وہ امرت مل سکتا ہے جو میرے تمام غموں کا مداوا ہوسکتا ہے کیونکہ:

جس نے دیا ہے درد وہی چارہ گر بھی ہے
کہنی ہے چارہ گر سے ہی خود چارہ گر کی بات

ممکن ہے آپ کے ذہن میں یہ خیال آئے کہ مسلسل رونے سے آنکھوں کا سفید پڑ جانا اور غم سے گھٹے گھٹے رہنا یہ تو بظاہر بے قراری اور بے صبری معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت میں یہ بے صبری نہیں بلکہ فطرت کا اظہار ہے۔ پیغمبر اپنے تمام کمالات اور حوصلہ مندیوں کے باوجود بہرحال انسان ہوتے ہیں اور

یہ تو انسان کی فطرت کا تقاضا ٹھہرا
چوٹ لگتی ہے تو اک آہ نکل جاتی ہے

ان کی فطرت کی سلامتی انسانوں کو ہمدردی اور غمگساری کا سبق دیتی ہے اور ان کا صبر استقلال اور استقامت کا درس دیتا ہے۔ وہ صدمے پر روتے ہیں لیکن صرفؔ اللہ تعالیٰ کے سامنے دوسروں کے سامنے وہ اپنے غم کا اظہار نہیں ہونے دیتے۔ اس لئے وہ گھٹے گھٹے سے رہتے ہیں۔ غم جوش مارتا

Marfat.com

ہے لیکن وہ اس کو ظاہر ہونے کی اجازت نہیں دیتے۔ آپ کے اہل خانہ چونکہ ان حقائق سے آگاہ نہ تھے اس لئے جب انہوں نے آپ کو دیکھا کہ آپ ابھی تک یوسفؑ کو یاد کر رہے ہیں تو انہوں نے بہ ظاہر ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

قَالُوْا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ يُوْسُفَ حَتّٰى تَكُوْنَ حَرَضًا اَوْ تَكُوْنَ مِنَ الْهٰلِكِيْنَ ﴿۸۵﴾

(وہ بولے اللہ تعالیٰ کی قسم! آپ ہمیشہ یوسفؑ ہی کو یاد کرتے رہیں گے۔ یہاں تک کہ از کار رفتہ ہو کر رہ جائیں گے یا ہلاک ہی ہو جائیں گے۔) (سورۃ یوسف:۸۵)

بیٹوں کی ملامت

تَـاللّٰهِ کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کی قسم ''تا'' عربی زبان میں ''وَ'' کی طرح قسم کیلئے بھی آتا ہے۔ تَـفْتَؤُا، لاتـزال کے معنی میں ہے یعنی ہمیشہ۔ ''حرض'' اس آدمی کو کہتے ہیں جو ہلاکت کے قریب ہو جائے اور کسی کام کے قابل نہ رہے۔

بیٹوں نے جب اپنے والد ماجد کو حضرت یوسفؑ کی یاد میں آہیں بھرتے ہوئے سنا تو بجائے اس کے کہ انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوتا اور کہیں تنہائی میں اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرتے وہ اپنے حسد کے جذبے کے تحت اپنے والد کو بظاہر تو ہمدردی سے نصیحت کرنے لگے لیکن حقیقت میں ملامت کرنے لگے کہ آخر آپ کب تک یوسفؑ کی یاد میں اپنی زندگی برباد کرتے رہیں گے۔ ایک واقعہ تھا ہو گیا، کیا دنیا سے لوگ چلے نہیں جاتے تو پسماندگان ان کیلئے اپنی زندگی اجیرن تو نہیں بنا لیتے۔ اب غور کیجئے کہ اس صدمے کی وجہ سے آپ نے اپنا کیا حال بنا لیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اگر آپ نے اپنے آپ پر قابو نہ پایا اور اس صدمے کی گرفت سے نہ نکلے تو آپ یا تو حواس کھو بیٹھیں گے یا عضو معطل ہو کے رہ جائیں گے اور یا پھر اپنے آپ کو ہلاک کر لیں گے۔ آپ کی اپنی زندگی کیلئے بہتر یہ ہے کہ آپ اس صدمے کو بھولنے کی کوشش کریں۔ اپنے لئے زندگی گزاریں، یوسفؑ کیلئے زندگی نہ گزاریں۔

قَالَ اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۶﴾

(حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا، میں اپنی پریشانی اور اپنے غم کا شکوہ اللہ تعالیٰ ہی سے کرتا ہوں اور میں جانتا ہوں اللہ تعالیٰ کی جانب سے وہ باتیں جو تم نہیں جانتے۔) (سورۃ یوسف:۸۶)

حضرت یعقوبؑ کا پُر از حکمت جواب

حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کی نصیحت کے جواب میں فرمایا کہ تم مجھے میرے حال پر چھوڑ دو، تمہیں میرے رونے دھونے پر اعتراض ہے حالانکہ میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کے سامنے آہ و زاری نہیں کرتا کیونکہ میں خوب جانتا ہوں کہ میری پریشانی اور میرا غم اللہ تعالیٰ ہی کی رحمت سے دور ہو سکتا ہے، وہی میرا ملجا و ماویٰ ہے۔ میں یہ بات جانتا ہوں کہ مخلوق کے سامنے آہ و زاری کرنا بے صبری ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اس بے صبری سے روکا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنے پریشانیوں کا اظہار نہ صرف کہ قابل ملامت نہیں بلکہ عین عبادت ہے۔ جس طرح غیر اللہ کے سامنے کسی بھی کمزوری کا اظہار ایمان کی کمزوری ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کے سامنے غیر معمولی استقلال اور استقامت کا اظہار اور آنکھوں سے آنسو بہانے سے احتراز اسے ناراض کر دینے کا باعث ہے۔ وہ جب بھی اترتا ہے ٹوٹے ہوئے دلوں میں اترتا ہے۔ وہ جب بھی خوشی سے سنتا ہے تو اپنے بندوں کی بے قراریوں کو سنتا ہے۔ اسے بندوں کی دعائیں اور بندوں کا مانگنا بیزار نہیں کرتا بلکہ خوش کرتا ہے کیونکہ ایک بندے کا بندگی ہی اصل سرمایہ ہے۔ جو شخص غم سے ٹوٹ پھوٹ کر اللہ تعالیٰ کے سامنے مصنوعی استقامت کا اظہار کرتا ہے وہ آخر کیا چاہتا ہے، شاعر نے خوب کہا:

Marfat.com

اس قدر بھی ضبطِ غم اچھا نہیں
توڑنا ہے حُسن کا پندار کیا؟

آپ نے فرمایا: میں جانتا ہوں اللہ تعالیٰ کی ایسی حکمتوں کو جنہیں تم نہیں جانتے۔ مجھے خوب معلوم ہے کہ بندہ جب مایوسی کے قریب پہنچنے لگتا ہے لیکن وہ اللہ تعالیٰ سے امید کا رشتہ ٹوٹنے نہیں دیتا تو بالآخر اللہ تعالیٰ اس کا ہاتھ تھام لیتا ہے۔ وہ اپنے بندوں کو آزماتا ہے لیکن جب ان کی قوتِ برداشت جواب دینے لگتی ہے تو پھر اس کی رحمت دامن تھام لیتی ہے۔ اس لئے

يٰبَنِيَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَاَخِيْهِ وَلَا تَايْـَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا يَايْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۷﴾

(اے میرے بیٹو! جاؤ یوسفؑ اور اس کے بھائی کی تلاش کرو۔ اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس تو بس کافر ہی ہوتے ہیں۔) (سورۃ یوسف: ۸۷)

میرے دل میں امید کا چراغ روشن ہے۔ میں محسوس کر رہا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دکھوں کے دن ختم ہونے والے ہیں۔ اس لئے تم مایوسی کو چھوڑو اور جا کر یوسفؑ اور اس کے بھائی کو تلاش کرو۔ اور یاد رکھو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے کبھی مایوس نہ ہونا کیونکہ اس کی رحمت سے مایوس کافر ہوتے ہیں، صاحبِ ایمان نہیں ہوتے۔ تم نے اگر اخلاص کے ساتھ پوری تندہی سے اپنے بھائیوں کو تلاش کیا تو مجھے امید ہے کہ رحمتِ الٰہی ضرور ہمارے شاملِ حال ہوگی۔

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلَيْهِ قَالُوْا يٰۤاَيُّهَا الْعَزِيْزُ مَسَّنَا وَاَهْلَنَا الضُّرُّ وَجِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجٰىةٍ فَاَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ وَتَصَدَّقْ عَلَيْنَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَجْزِي الْمُتَصَدِّقِيْنَ ﴿۸۸﴾ (سورۃ یوسف : ۸۸)

(جب وہ حضرت یوسفؑ کے پاس پہنچے تو انہوں نے کہا اے عزیز! ہمیں اور ہمارے اہل وعیال کو قحط سالی سے بڑی تکلیف پہنچی اور ہم تھوڑی سی پونجی لے کر حاضر ہوئے ہیں تو آپ ہمیں غلہ بھی پورا دیجئے اور ہم کو صدقہ بھی عنایت فرمایئے، اللہ تعالیٰ صدقہ کرنے والوں کو بدلہ عطا فرماتا ہے۔)

ضُرّ اس تکلیف کو کہتے ہیں جو بھوک اور قحط وغیرہ کے سبب سے پہنچتی ہے۔
بِضَاعَةٍ مُّزْجٰىةٍ ایسی ردی اور حقیر پونجی کو کہتے ہیں جسے کوئی قبول کرنا پسند نہ کرے۔

بھائیوں کی لجاجت

گزشتہ آیتِ کریمہ میں حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو بھائیوں کی تلاش میں جانے کیلئے کہا تھا اور یہ بھی نصیحت فرمائی تھی کہ تم بظاہر یوسفؑ کی طرف سے مایوس ہو لیکن ایک مومن کو کبھی مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ تم اخلاص اور تندہی سے کوشش کرو، ممکن ہے اللہ تعالیٰ ہمارے حال پر رحم فرمائے۔ قرآنِ کریم نے اس بات کی وضاحت نہیں فرمائی کہ باپ کی نصیحت کی وجہ سے بیٹوں نے سفر کا ارادہ کیا یا بھوک اور قحط کے باعث وہ مصر جانے پر مجبور ہوئے۔ سبب کچھ بھی ہو وہ مصر پہنچے اور قاعدے کے مطابق حضرت یوسفؑ علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت یوسفؑ علیہ السلام کو عزیز کے لفظ سے خطاب کیا۔ گزشتہ آیات میں بھی بعض جگہ آپؑ کیلئے عزیز کا لفظ استعمال ہوا۔ اس سے بعض لوگوں کو خیال پیدا ہوا ہے کہ عزیز حکومتِ مصر میں کسی منصب کا نام تھا جس پر زلیخا کا شوہر فائز تھا۔ اس کے مر جانے کے بعد حضرت یوسفؑ علیہ السلام کا اس منصب پر تقرر ہوا۔ اس لئے آپؑ کو عزیزِ مصر کے خطاب سے یاد کیا جانے لگا لیکن بعض محققین کا خیال ہے کہ عزیز کسی منصب کا عنوان نہیں بلکہ ہر صاحبِ اقتدار کیلئے اس لفظ کا استعمال ہوتا تھا جیسے ہمارے یہاں ہر مقتدر آدمی کو سرکار کہہ کر مخاطب کرنے کا رواج رہا ہے۔ اس آیتِ کریمہ میں بھی معلوم ہوتا ہے کہ بھائیوں نے بھی آپؑ کو سرکار کہہ کر

Marfat.com

پکارا اور نہایت لجاجت کے ساتھ عرض پرداز ہوئے کہ ہم اور ہمارا خاندان قحط سالی کی صعوبتوں میں مبتلا ہیں۔ ہم آپؑ کے شکرگزار ہیں کہ آپؑ بیرون ملک رہنے والوں کو بھی قیمتاً غلہ عنایت فرماتے ہیں لیکن ہمارا حال یہ ہے کہ ہمارے پاس قیمت ادا کرنے کیلئے بھی مناسب معاوضہ نہیں بلکہ ہم اپنے ساتھ غلے کی قیمت کے طور پر جو پونجی لے کر آئے ہیں وہ تو ایسی حقیر اور کم قیمت پونجی ہے کہ جسے کوئی بھی لینا پسند نہ کرے۔ لیکن آپؑ کے حُسنِ سلوک نے ہمیں حوصلہ دیا کہ جیسی کیسی پونجی بھی ہمارے پاس ہے اسے ہم آپؑ کی خدمت میں پیش کر دیں اور مزید یہ درخواست بھی کریں کہ آپ ہماری پونجی کو نہ دیکھیں بلکہ ہماری ضرورت کو دیکھ کر ہمیں پورا غلہ عنایت فرمائیں اور مزید ہمیں صدقہ سے بھی نوازیں کیونکہ جو غلہ قانون کے مطابق ملے گا وہ ہماری ضرورتوں کیلئے کفایت نہیں کرتا۔ اس لئے آپ صدقہ کے طور پر بھی مزید کرم فرمائی کریں۔ یقیناً اللہ تعالیٰ صدقہ کرنے والوں کے اجر و ثواب کو ضائع نہیں کرتا۔

قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوْسُفَ وَاَخِيْهِ اِذْ اَنْتُمْ جٰهِلُوْنَ ﴿۸۹﴾ (سورۃ یوسف : ۸۹)

(حضرت یوسفؑ نے کہا کیا تمہیں معلوم ہے جو تم نے یوسفؑ اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا، جب تم جاہل تھے۔)

حضرت یوسفؑ کا کمالِ اخلاق اور مروت

حضرت یوسفؑ علیہ السلام نے جب بھائیوں کی بے کسی، بے بسی اور لجاجت آمیز لہجہ دیکھا تو دل پہ ایک چوٹ لگی۔ آپ چونکہ کریم بھائی تھے اور مکارمِ اخلاق کے پیکر تھے آپؑ کو یہ دیکھ کر نہایت دکھ ہوا کہ میرے یہ بھائی جو کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے اور بڑے طنطنے کے لوگ تھے، آج اس حد تک پریشان ہیں کہ نہ صرف معمولی پونجی کے بدلے میں پورا غلہ مانگ رہے ہیں بلکہ اس کے ساتھ صدقے کیلئے درخواست بھی کر رہے ہیں تو آپ کی مروت نے پسند نہیں کیا کہ اب میرے درمیان اور بھائیوں کے درمیان جو اجنبیت کا پردہ تھا وہ باقی رہے۔ چنانچہ آپؑ نے تمام حجابات اٹھاتے ہوئے فرمایا، کہ تمہیں کچھ معلوم ہے تم جو کچھ یوسفؑ اور اس کے بھائی کے ساتھ کر چکے ہو لیکن ساتھ ہی انہیں شرمندگی سے بچانے کیلئے فرمایا، کہ میں جانتا ہوں کہ تم نے جو کچھ کیا وہ جہالت کے باعث کیا۔ جہالت سے مراد یہاں بے خبری یا بے علمی نہیں بلکہ جذبات سے مغلوبیت ہے۔ تم اپنے جذبۂ حسد سے ایسے مغلوب ہوئے کہ تم اس بات کو بھول گئے کہ تمہارے بھائیوں کا تمہارے ساتھ خون کا رشتہ ہے۔ تم نے صرف یہ دیکھا کہ ہمارے والد ماجد یوسفؑ اور اس کے بھائی کو زیادہ چاہتے ہیں تو تم نے باپ کی توجہ حاصل کرنے کیلئے یوسفؑ کو راستے سے ہٹا دینے کا فیصلہ کر لیا۔ بھائیوں نے جیسے ہی دیکھا کہ عزیز یوسفؑ کا نام لے رہا ہے تو وہ سمجھ گئے کہ ہو نہ ہو یہی یوسفؑ ہے ورنہ اسے کیسے خبر ہو سکتی ہے کہ ہم کون لوگ ہیں اور ہمارے کسی بھائی کا نام یوسفؑ بھی تھا۔ اور ہم نے اس کے اور اس کے بھائی کے ساتھ زیادتی کی تھی۔

قَالُوْٓا ءَاِنَّكَ لَاَنْتَ يُوْسُفُ ۭ قَالَ اَنَا يُوْسُفُ وَھٰذَآ اَخِيْ ۡ قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا ۭ اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۹۰﴾ (سورۃ یوسف : ۹۰)

(وہ کہنے لگے، کیا آپؑ ہی یوسفؑ ہیں؟ حضرت یوسفؑ نے کہا، کہ ہاں! میں یوسفؑ ہوں اور یہ میرا بھائی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہم پر احسان فرمایا۔ جو شخص بھی تقویٰ اختیار کرتا اور صبر کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔)

افشائے راز

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ پہلی ملاقاتوں میں وہ جب حضرت یوسفؑ علیہ السلام کو دیکھتے تھے تو انہیں اس کے خدوخال میں یوسفؑ کی جھلک محسوس ہوتی تھی، اس کے طور اطوار میں یوسفؑ کا شبہ ہوتا تھا۔ لیکن وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ شاہانہ لباس میں ملبوس جو شخص مصر جیسے متمدن ملک کے تخت پر بیٹھا حکومت کر رہا ہے وہ یوسفؑ ہو سکتا ہے۔ کہاں کنعان کا وہ کنواں جس میں حضرت یوسفؑ کو پھینکا گیا تھا اور کہاں مصر کا تخت۔ ان کا تصور اتنی لمبی مسافت طے نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے ان کے ذہن میں اس کے یوسفؑ ہونے کا خیال بھی پیدا ہوتا تھا تو وہ اسے جھٹک دیتے تھے۔ اب جیسے ہی حضرت

Marfat.com

یوسفؑ علیہ السلام نے یوسفؑ اور بن یامین کے بارے میں سوال کیا تو انہیں یقین ہو گیا کہ یہی یوسفؑ ہے۔ اس لئے فوراً بول اٹھے کہ کیا واقعی آپ ہی یوسفؑ ہیں۔ حضرت یوسفؑ نے تمام حجابات اٹھاتے ہوئے فرمایا کہ ہاں، میں ہی یوسفؑ ہوں اور یہ میرا بھائی ہے۔ تم مجھے جس حال میں دیکھ رہے ہو یہ سراسر اللہ تعالیٰ کا کرم اور اس کی عطا ہے۔ اس نے ہم پر احسان فرمایا اور یہ مقام اور منصب مجھے عطا ہوئے۔ چونکہ آپ پیغمبرانہ اخلاق کے مالک تھے اس لئے نہ تو کوئی ایسی بات فرمائی جس سے انہیں شرمندگی ہوتی اور نہ ایسی بات فرمائی جس سے خود پسندی کی بو آتی اور فخر کا اظہار ہوتا۔ اس لئے آپؑ نے اپنی بات کہنے کی بجائے بطور اصول یہ بات فرمائی کہ اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ جو شخص بھی تقویٰ کا راستہ اختیار کرتا ہے یعنی وہ پوری طرح اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے سامنے ڈال دیتا ہے، اپنے آپ کو اس کے سپرد کر دیتا ہے اور زندگی اس طرح گزارتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت تمام تعلقات پر غالب رہتی ہے۔ غیر مشروط اطاعت صرف اللہ تعالیٰ کی ہوتی ہے، زبان سے اسی کے احسانات کا ذکر ہوتا ہے۔ انگ انگ سے اس کے شکر کا اظہار ہوتا ہے اور اسے کے دیئے ہوئے مقصدِ زندگی کو منزل قرار دے کر اسی کی طرف سفر جاری رہتا ہے۔ اور جو اس راستے میں مشکلات پیش آتی ہیں انہیں اس راستے کی سنتیں سمجھ کر خندہ پیشانی سے برداشت کرتا ہے تو کوئی ایسا شخص ہو یا ایسے افراد اللہ تعالیٰ تعالیٰ ان کی مساعی کو نہ صرف قبول کرتا ہے بلکہ ان کے اجر وثواب کو کبھی ضائع نہیں کرتا۔ لیکن اس کیلئے لازمی شرط یہ ہے کہ تقویٰ اور صبر کا رشتہ احسان سے بندھا ہوا ہو۔ آدمی جو بھی نیکی کا کام کرے، اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کرے، آنحضرت ﷺ کی سنت کو حرزِ جان بنائے، ہر چھوٹے بڑے کام سے پہلے اس کے ذہن میں یہ بات رہنی چاہیئے کہ میں اپنے خدا کے سامنے ہوں اور اپنے خدا کو دیکھ رہا ہوں اور اگر اس مقام پر نہ پہنچ سکے تو اس بات کا یقین تو بہر حال رکھے کہ میرا اللہ تعالیٰ مجھے دیکھ رہا ہے۔ جو شخص ان مضبوط احساسات کے ساتھ زندگی گزارتا ہے وہ یقیناً اللہ تعالیٰ کا مقرب ہو جاتا ہے۔ وہ جب تک دنیا میں ہے اس کے ہر عمل کے پیچھے اللہ تعالیٰ کی قوت کارفرما ہوتی ہے۔ اور جب وہ قیامت کے دن اٹھایا جائے گا تو کامرانیاں اس کے جلو میں چلیں گی اور فرشتے اس کو جنت کے دروازوں پر خوش آمدید کہیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ جو بات اس آیت کے آخر میں فرمائی گئی ہے یعنی تقویٰ، صبر اور احسان، یہ سورت کا مرکزی مضمون ہے۔ یہی بات سمجھانے کیلئے حضرت یوسفؑ علیہ السلام کے تمام واقعات بیان کئے گئے۔ ان کا ہر عمل تقویٰ کی تصویر ہے۔ انہوں نے زندگی عزیمت اور صبر کے ساتھ گزاری اور ہر قدم اٹھانے اور ہر بات کہنے سے پہلے یقیناً ان کو یہ مقام حاصل رہا ہے کہ وہ اپنے اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ انہیں دیکھ رہا ہے۔

قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَاِنْ كُنَّا لَخٰطِـِٕيْنَ ﴿۹۱﴾ (سورۃ یوسف : ۹۱)

(برادرانِ یوسفؑ کہنے لگے، اللہ تعالیٰ کی قسم! اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہم پر برتری بخشی اور بیشک ہم ہی غلطی پر تھے۔)

اعترافِ حق

یاد ہوگا کہ برادرانِ یوسفؑ کو جو حضرت یوسفؑ علیہ السلام پر سب سے زیادہ غصہ تھا وہ اس بات پر تھا کہ ہمارے والد آخر یوسفؑ کو ہم پر ترجیح کیوں دیتے ہیں، ان کی تمام شفقت اور عنایت یوسفؑ ہی کیلئے کیوں ہے، اس میں ایسی کیا بات ہے کہ ہمارے والد اسے زیادہ چاہتے ہیں حالانکہ ہم دس بھائی ہیں۔ قبائلی زندگی کے حوالے سے اس شخص کو زیادہ عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا اور ہمیشہ اس کے سامنے احترام کی نگاہیں بچھی رہتی ہیں جس کے بیٹے جوان اور بڑی تعداد میں ہوتے ہیں کیونکہ قبائلی زندگی میں طاقت اور قوت کے زور سے اپنے آپ کو منوایا جاتا ہے اور جوان بیٹے ہی ہر شخص کی طاقت ہوتے ہیں۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ہم ایک پورا جتھہ ہیں، طاقت اور قوت سے بھرپور لیکن ہمارے والد کو بجائے ہمیں ترجیح دینے کے ہمیشہ ہر بات میں یوسفؑ کی فکر رہتی ہے۔ اسی حسد اور اسی غلط فہمی نے ان سے وہ ظلم کروایا جس کا کوئی جواز نہ تھا۔ لیکن اب جبکہ بھائیوں نے تختِ حکومت پر یوسفؑ کو فائز دیکھا تو نہایت لجاجت اور شرمندگی سے اعتراف کرتے ہوئے کہنے لگے کہ ہم آج اللہ تعالیٰ اور خلقِ خدا کے سامنے اعتراف کرتے ہوئے کہہ رہے ہیں کہ ہمارے والد صاحب یوسفؑ کو جس طرح ہم پر ترجیح دیتے تھے وہ یقیناً حق بجانب تھے۔ ترجیح اور برتری کی حقیقت کو نہ سمجھنے کے باعث بھائیوں نے جو ظلم کیا آج اللہ تعالیٰ نے یوسفؑ کو تختِ حکومت پر بٹھا کر ان کے سامنے یہ بات ثابت کر دی کہ یوسفؑ اپنی معنوی اور روحانی خصوصیات کے باعث ہر طرح سے ترجیح پانے کے لائق تھے۔

Marfat.com

قَالَ لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ۖ يَغْفِرُ اللَّهُ لَكُمْ ۖ وَهُوَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ ﴿٩٢﴾ اذْهَبُوا بِقَمِيصِي هَٰذَا فَأَلْقُوهُ عَلَىٰ وَجْهِ أَبِي يَأْتِ بَصِيرًا وَأْتُونِي بِأَهْلِكُمْ أَجْمَعِينَ ﴿٩٣﴾ (سورۃ یوسف : ۹۲، ۹۳)

(حضرت یوسفؑ نے کہا آج تم پر کچھ الزام نہیں، اللہ تعالیٰ تم کو معاف کرے۔ وہ ارحم الراحمین ہے۔ میرا یہ کرتا لے جاؤ، میرے باپ کے چہرے پر ڈال دیجئے، وہ بینا ہو جائیں گے۔ اور تم لوگ اپنے تمام اہل وعیال کے ساتھ میرے پاس آ جاؤ۔)

حضرت یوسفؑ کا عفو ودرگزر

بھائیوں نے جب اپنے جرم کا اعتراف کر لیا تو باوجود اس کے کہ حضرت یوسفؑ علیہ السلام کو انہوں نے بے حد اذیتیں پہنچائی تھیں اور وہ خود بھی سمجھتے تھے کہ ہم جو کچھ یوسفؑ کے ساتھ کر چکے ہیں اس کے بعد شاید معافی کی کوئی صورت نہ ہو، لیکن حضرت یوسفؑ علیہ السلام کی بلند ظرفی اور آپ کا حُسنِ اخلاق دیکھئے کہ بجائے انہیں ملامت کرنے یا سزا دینے کے آپؑ نے فرمایا، آج تم پر کوئی گرفت نہیں اور تم پر کوئی ملامت نہیں، میں تو اللہ تعالیٰ سے بھی دعا کرتا ہوں کہ وہ بھی تمہیں تمہارے گناہ بخش دے کیونکہ وہ سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔ وہ شب و روز بندوں کی سرکشی دیکھتا ہے لیکن کبھی گرفت نہیں کرتا اور اگر بندے کی جانب سے اعترافِ جرم اور توبہ کی کوشش ہو تو وہ گناہ کو مٹا دیتا ہے اور پاکیزہ زندگی عطا کرتا ہے۔ میں بھی اسی کی توفیق سے تمہیں معاف کرتا ہوں۔

معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تمام نبیؑ ایسے ہی اخلاق سے متصف ہوتے ہیں۔ ان کی تربیت چونکہ براہ راست اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے اس لئے ان کے اخلاق اللہ تعالیٰ کے اخلاق کا پرتو ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فتح مکہ کے موقع پر جب وہ تمام لوگ جن میں سے ایک سے ایک بڑھ کر مجرم تھا اور جنہوں نے آپؐ پر اور آپؐ کے ساتھیوںؓ پر زیادتی کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ آپؐ جب بیت اللہ تعالیٰ سے باہر تشریف لائے تو بیت اللہ تعالیٰ کی دہلیز پر کھڑے ہو کر آپؐ ان سے مخاطب ہوئے۔ پوچھا کہ تم جانتے ہو کہ میں تمہارے ساتھ کیا کرنے والا ہوں۔ وہ دشمن اور ایمان سے محروم ہونے کے باوجود آپؐ کے مزاج شناس تھے۔ کہنے لگے کہ آپ کریم ابن کریم ہیں۔ اس لئے ہم آپؐ سے عفو ودرگزر کی امید رکھتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ میں تم سے وہی بات کہوں گا جو میرے بھائی یوسفؑ نے اپنے بھائیوں سے کہی تھی کہ جاؤ تم سب آزاد ہو، آج تم پر کوئی الزام نہیں، اللہ تعالیٰ تمہیں معاف کرے، وہ سب سے بہتر رحم کرنے والا ہے۔

انبیائے کرام کے معجزات حق ہیں

حضرت یوسفؑ علیہ السلام بن یامین سے سن چکے تھے کہ میرے والد ماجد کی آنکھیں میرے صدمے میں بے نور ہو چکی ہیں۔ اور اس صدمے کا آغاز اس وقت ہوا جب بھائیوں نے انہیں کنویں میں پھینکا اور ان کا کُرتا کسی جانور کے خون میں ڈبو کر باپ کے سامنے جا کے پیش کر دیا کہ یہ پیراہن یوسفؑ کا ہے جسے بھیڑیا کھا گیا ہے اور یہ یوسفؑ کے خون سے لت پت ہو گیا ہے۔ چنانچہ اس پیراہن نے مدتوں آپ کو خون رلایا۔ ممکن ہے آپ نے وہ پیراہن محفوظ رکھا ہو اور گاہے ماہے اسے دیکھ کر تسلی حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہوں۔ تو جس پیراہن نے غم دیا اور آنکھوں کی بینائی لے لی، آج اسی یوسفؑ کا دوسرا پیراہن جو آپ کے جسم سے مس کر چکا تھا وہ حضرت یوسفؑ نے اپنے بھائیوں کو دیا کہ جاؤ، جا کر میرا یہ کُرتا حضرت یعقوب کے علیہ السلام کے چہرے پر ڈال دینا، ان شاء اللہ تعالیٰ وہ بینا ہو جائیں گے اور ان کی کھوئی ہوئی نظر واپس آ جائے گی۔ جو لوگ معجزاتِ انبیاء کے قائل نہیں، وہ عام طور پر یہ تاویل کرتے ہیں کہ جب کسی شدید صدمے سے آدمی کے جسم کے کسی حصے کو نقصان پہنچتا ہے جبکہ اس کا تعلق انسانی دماغ سے ہو تو اگر ویسے ہی شدید خوشی اس شخص کو اچانک پہنچے تو بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اس نقصان کی تلافی ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ پیراہنِ یوسفؑ سے ہی آپ کی آنکھیں سفید ہوئی تھیں۔ دوسرے پیراہن نے آ کر جب انتہائی خوشی دی تو آنکھیں درست ہو گئیں اور ان کی بینائی واپس آ گئی۔ یہ بات قیاس کے اعتبار سے کیسی بھی صحیح کیوں نہ ہو، ہمیں اس کی احتیاج نہیں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ بزرگانِ دین کی کرامات اور انبیائے کرام کے معجزات برحق ہیں تو پھر ہمیں کسی

Marfat.com

ظنی توجیہ کی ضرورت کیا ہے؟ حضرت یوسفؑ علیہ السلام نے بھائیوں سے مزید فرمایا کہ تم سب اہل خانہ کو لے کر میرے پاس مصر میں آ جاؤ۔ اس میں اگر چہ والدین کا ذکر نہیں لیکن ان کے ذکر کی چنداں ضرورت بھی نہیں کیونکہ حضرت یوسفؑ ﷺ اصل مقصود تو وہی ہیں۔ انہیں کی وجہ سے بھائیوں کی ناز برداری کی جا رہی ہے۔ تو جو چیز سلسلۂ کلام میں غایت وضاحت کی حامل ہو، وہ ذکر کی محتاج نہیں ہوتی۔

وَلَمَّا فَصَلَتِ

الْعِيْرُ قَالَ اَبُوْهُمْ اِنِّيْ لَاَجِدُ رِيْحَ يُوْسُفَ لَوْلَآ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ ﴿۹۴﴾
قَالُوْا تَاللّٰهِ اِنَّكَ لَفِيْ ضَلٰلِكَ الْقَدِيْمِ ﴿۹۵﴾ فَلَمَّآ اَنْ جَآءَ الْبَشِيْرُ
اَلْقٰىهُ عَلٰى وَجْهِهٖ فَارْتَدَّ بَصِيْرًا ۚ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ ۚ اِنِّيْٓ
اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۹۶﴾ قَالُوْا يٰٓاَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَآ
اِنَّا كُنَّا خٰطِئِيْنَ ﴿۹۷﴾ قَالَ سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ
الرَّحِيْمُ ﴿۹۸﴾ فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ اٰوٰٓى اِلَيْهِ اَبَوَيْهِ وَقَالَ
ادْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ﴿۹۹﴾ وَرَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَى
الْعَرْشِ وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا ۚ وَقَالَ يٰٓاَبَتِ هٰذَا تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ
مِنْ قَبْلُ ۫ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّيْ حَقًّا ؕ وَقَدْ اَحْسَنَ بِيْٓ اِذْ اَخْرَجَنِيْ
مِنَ السِّجْنِ وَجَآءَ بِكُمْ مِّنَ الْبَدْوِ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ الشَّيْطٰنُ
بَيْنِيْ وَبَيْنَ اِخْوَتِيْ ؕ اِنَّ رَبِّيْ لَطِيْفٌ لِّمَا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ
الْحَكِيْمُ ﴿۱۰۰﴾ رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ
الْاَحَادِيْثِ ۚ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۫ قف اَنْتَ وَلِيّٖ فِي الدُّنْيَا

Marfat.com

وَالْاٰخِرَةِ ۚ تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ ﴿۱۰۱﴾ ذٰلِكَ مِنْ
اَنْۢبَآءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْهِ اِلَیْكَ ۚ وَمَا كُنْتَ لَدَیْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْۤا
اَمْرَهُمْ وَهُمْ یَمْكُرُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ وَمَاۤ اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ
بِمُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۰۳﴾ وَمَا تَسْـَٔلُهُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ
لِّلْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۰۴﴾

رکوع: ۱۱۔ (اور جب قافلہ چلا تو ان کے والد ماجد نے کہا کہ اگر تم لوگ مجھے خبطی نہ قرار دو تو میں یوسفؑ کی خوشبو محسوس کر رہا ہوں۔ (اہل خانہ) کہنے لگے کہ اللہ تعالیٰ کی قسم آپ ابھی تک پرانے خبط ہی میں مبتلا ہیں۔ پس جب یوں ہوا کہ خوشخبری دینے والا آیا اور اس نے کُرتا آپ کے چہرے پر ڈال دیا تو آپ دوبارہ بینا ہو گئے تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے کہا کہ کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ انہوں نے کہا کہ اے ہمارے والدِ گرامی! ہمارے گناہوں کی مغفرت کیلئے دعا فرمائیے، بیشک ہم ہی خطا کار تھے۔ والد نے کہا کہ میں عنقریب تمہارے لئے اپنے رب سے مغفرت کی دعا کروں گا۔ بیشک وہی بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ پھر جب یہ لوگ یوسفؑ کے پاس پہنچے تو حضرت یوسفؑ نے اپنے والدین کو خاص اپنے پاس جگہ دی اور (اپنے سب کنبے والوں سے) کہا، آپ سب مصر میں داخل ہو جائیں، اللہ تعالیٰ نے چاہا تو امن وچین سے رہو گے۔ اور حضرت یوسفؑ نے اپنے والدین کو اوپر تخت پر بٹھایا اور سب حضرت یوسفؑ کے سامنے سجدے میں گر گئے۔ حضرت یوسفؑ نے کہا، ابا جان! یہ ہے میرے اس خواب کی تعبیر جو میں نے پہلے دیکھا تھا۔ میرے رب نے اسے سچا ثابت کر دکھایا۔ اس نے مجھ پر احسان کیا جب اس نے مجھے قید خانے سے نکالا اور آپ لوگوں کو صحرا سے لا کر مجھ سے ملایا بعد اس کے کہ شیطان میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان فساد ڈال چکا تھا۔ بیشک میرا رب جو کچھ چاہتا ہے اس کیلئے نہایت باریک بین اور دقیقہ رس ہے۔ بیشک وہی جاننے والا اور حکمت والا ہے۔ اے میرے رب تو نے مجھے حکومت بخشی اور باتوں کی تعبیر کے علم میں سے بھی سکھایا۔ اے آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے تو ہی دنیا اور آخرت میں میرا کارساز ہے۔ میرا خاتمہ اسلام پر کر اور مجھے نیکوکاروں کے زمرہ میں شامل فرما۔ یہ سرگزشت غیب کی خبروں میں سے ہے جسے ہم تمہاری طرف وحی کر رہے ہیں۔ اور تم تو ان کے پاس اس وقت موجود نہیں تھے جب انہوں نے ایک رائے پر اتفاق کیا اور وہ سازش کر رہے تھے۔ اور ان میں سے اکثر ایمان لانے والے نہیں ہیں، اگرچہ آپ اُن کے ایمان کی کتنی ہی حرص کریں۔ اور آپ اُن سے اس (تبلیغ ودعوت) پر کوئی معاوضہ تو طلب نہیں کر رہے ہو۔ یہ تو بس دنیا والوں کیلئے ایک یاد دہانی ہے۔)

Marfat.com

وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيرُ قَالَ أَبُوهُمْ إِنِّي لَأَجِدُ رِيحَ يُوسُفَ لَوْلَا أَنْ تُفَنِّدُونِ ﴿٩٤﴾ (سورۃ یوسف : ۹۴)
(اور جب قافلہ چلا تو ان کے والد ماجد نے کہا کہ اگر تم لوگ مجھے خبطی نہ قرار دو تو میں یوسفؑ کی خوشبو محسوس کر رہا ہوں۔)

"تفنّد" کسی کو حواس باختہ یا بے وقوف سمجھ کر اس کی رائے اور بات کو لایعنی قرار دینے کو کہتے ہیں۔

پیراہنِ یوسفؑ کی خوشبو

برادرانِ یوسفؑ کا قافلہ جو اپنے ساتھ یوسفؑ کے مل جانے کی انتہائی مسرت آمیز خبر لے کر روانہ ہوا تھا، ابھی وہ ابتدائی مراحل میں تھا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے کنعان میں اپنے گھر بیٹھے ہوئے اہلِ خانہ سے کہا کہ میں تم سے ایسی بات کہنے لگا ہوں جس کے بارے میں مجھے اندیشہ ہے کہ تم مجھے یہ کہو گے کہ آپ تو سٹھیا گئے ہیں، اس لئے ایسی باتیں کہتے ہیں جسے عقل کبھی قبول نہیں کر سکتی۔ لیکن میں تمہیں پورے وثوق سے یہ کہتا ہوں کہ میں یوسفؑ کی خوشبو محسوس کر رہا ہوں، ممکن ہے یوسف علیہ السلام کے جسم سے کوئی خاص خوشبو آتی ہو جو اب تک حضرت یعقوب علیہ السلام کو یاد تھی اور آپؑ نے اسی خوشبو کو محسوس کیا اور یا آپ اسے بطور محاورہ کے استعمال کیا ہے۔ خوشبو محسوس کرنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میرے حواس اس شخص کی موجودگی کو محسوس کر رہے ہیں اور وہ عنقریب مجھ تک پہنچنے والا ہے۔

قَالُوا تَاللَّهِ إِنَّكَ لَفِي ضَلَالِكَ الْقَدِيمِ ﴿٩٥﴾ (سورۃ یوسف : ۹۵)
(اہلِ خانہ) کہنے لگے کہ اللہ تعالیٰ کی قسم آپ ابھی تک پرانے خبط ہی میں مبتلا ہیں۔)

اہلِ خانہ کی بے بصیرتی

اہلِ خانہ نے وہی کہا جس کا حضرت یعقوب علیہ السلام کو اندیشہ تھا کیونکہ ان کیلئے یہ بات بعید از عقل تھی کہ کوئی شخص اتنی دور سے اپنے بیٹے کی خوشبو سونگھ محسوس کر سکتا ہے۔ اس لئے انہوں نے کہا کہ آپ برسوں سے اسی خبط میں مبتلا ہیں کہ یوسفؑ ضرور آئیں گے۔ ربع صدی کا زمانہ گزر گیا، کہیں اس کی بھنک نہیں پڑ سکی، اگر وہ زندہ ہوتا تو آج تک اس کی کوئی خبر تو ملتی، لیکن آپ ان باتوں کی طرف دھیان دینے کیلئے تیار نہیں بلکہ آپ کو تو ایک لگن لگی ہوئی ہے کہ یوسفؑ سے ملاقات ضرور ہوگی اور اب آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں یہ اسی لگن اور کھٹک کا نتیجہ ہے۔

فَلَمَّا أَنْ جَاءَ الْبَشِيرُ أَلْقَاهُ عَلَى وَجْهِهِ فَارْتَدَّ بَصِيرًا ۖ قَالَ أَلَمْ أَقُلْ لَكُمْ ۚ إِنِّي أَعْلَمُ مِنَ اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿٩٦﴾
(پس جب یوں ہوا کہ خوشخبری دینے والا آیا اور اس نے کُرتا آپؑ کے چہرے پر ڈال دیا تو آپؑ دوبارہ بینا ہو گئے تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے کہا کہ کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔) (سورۃ یوسف :۹۶)

حضرت یعقوب علیہ السلام بیٹے کی خوشبو پا کر سرتا پا انتظار تھے کہ کب یوسفؑ کی اطلاع ملتی ہے یا یوسفؑ خود آتے ہیں اور اہلِ خانہ آپؑ کو از کار رفتہ سمجھ کر آپ کی بات کو وہم سمجھ کر جھٹلا چکے تھے کہ اسی اثناء میں قافلے کے پہنچنے سے پہلے حضرت یوسفؑ کا قاصد پیراہن لے کر پہنچ گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسفؑ یا قافلے والوں نے ایک تیز رفتار آدمی کو پیراہنِ یوسفؑ دے کر پہلے روانہ کر دیا تا کہ وہ قافلے سے پہلے آپ کو خوشخبری پہنچا سکے اور پیراہن سے آپؑ کی بینائی کا سامان کر سکے۔ چنانچہ جیسے ہی وہ خوشخبری دینے والا پہنچا تو اس نے حسبِ ہدایت حضرت یوسفؑ کا پیراہن آپ کے چہرے پر ڈال دیا۔ پیراہن ڈالنے کی دیر تھی کہ آپؑ اچھے بھلے بینا ہو گئے اور آپؑ کی بینائی درست ہو گئی۔ تب آپؑ نے اہلِ خانہ سے کہا کہ میں تم سے نہیں کہتا تھا کہ میرا اللہ تعالیٰ سے جو تعلق ہے وہ تمہارا نہیں۔ اور میں اللہ تعالیٰ کے بارے میں جو کچھ جانتا ہوں تم نہیں

Marfat.com

جانتے۔ مجھے اچھی طرح علم ہے کہ پروردگار اپنے بندوں کو آزمائشوں میں ضرور ڈالتا ہے لیکن وہ انہیں کبھی محروم نہیں کرتا۔ جب وہ آزمائشوں میں تقویٰ اور صبر سے اپنے آپ کو آراستہ رکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے ان کی امید روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ چنانچہ میں نے بھی امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ تو بالآخر پروردگار نے میری امیدوں کو بار آور کیا۔

سوال کا جواب

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یوسفؑ علیہ السلام کئی گھنٹوں تک تین میل کے فاصلے پر ایک کنویں میں پڑے رہے لیکن حضرت یعقوب علیہ السلام کو ان کی خوشبو نہیں آئی۔ اور اب جبکہ وہ سینکڑوں میل دور مصر میں حکمرانی کر رہے ہیں تو آپ نے ان کی خوشبو محسوس کر لی، آخر یہ کیا راز ہے؟ شیخ سعدی مرحوم نے ''گلستان'' میں اپنے مخصوص انداز میں اس کا ذکر کیا ہے، ہم انہیں سے مستعار لیتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں۔

یکے پرسید زاں گم کردہ فرزند — کہ اے روشن گہر پیر خردمند
زمصرش بوئے پیراہن شمیدی — چرادر چاہِ کنعانش ندیدی
بگفت احوال ما برقِ جہانست — دمِ پیدا دمِ دیگر نہاں است
گہے برطارِ اعلیٰ می نشینیم — گہے بر پشتِ پائے خود نبینیم
اگر درویش برحالے بماندے — سرِ دست از دوعالم برفشاندے

ایک آدمی نے اس بزرگ سے پوچھا جس کا بیٹا گم ہو چکا تھا کہ اے روشن گہر اور عقل مند بزرگ! آپ نے اپنے بیٹے کے پیراہن کی خوشبو مصر سے سونگھ لی لیکن کنعان کے کنویں میں آپ اسے کیوں نہ دیکھ سکے۔ اس مردِ بزرگ یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام نے کہا ہمارا حال دنیا میں چمکنے والی بجلی کی طرح ہے، کبھی وہ ظاہر ہوتی ہے اور کبھی چھپ جاتی ہے، کبھی تو ہمیں ایک اونچے بالا خانے پر بٹھا دیا جاتا ہے اور (ہم سب کچھ دیکھتے ہیں) اور کبھی اپنے پاؤں کی ایڑی کا بھی ہوش نہیں ہوتا۔ اگر درویش ہمیشہ ایک ہی حال پر رہتا تو پھر وہ دنیا میں نہ رہ سکتا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تعالیٰ اپنے پیغمبروںؑ کو مخصوص قوتیں عطا کرتا ہے جو دوسرے لوگوں سے انہیں ممتاز کرتی ہیں لیکن یہ قوتیں ان کی ذاتی نہیں ہوتیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی عطا اور اس کی دین ہوتی ہیں۔ کبھی وہ انہیں ایسے بلند مراتب پر بٹھا دیتا ہے کہ دنیا ہاتھ کی لکیروں کی طرح ان کے سامنے ہوتی ہے۔ اور کبھی بعض معاملات سے بے خبر بھی رکھتا ہے اور یہ دونوں طرح کی کیفیات اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہوتی ہیں۔ وہ جس کیفیت سے چاہتا ہے اپنے مقبول بندوں کو متکیف کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ چونکہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی آزمائش کرنا چاہتے تھے اس لئے تین میل کے فاصلے پر کنویں میں حضرت یوسفؑ علیہ السلام کی خبر نہ دی لیکن جب آپ آزمائشوں میں سرخرو نکلے تو وہ بیٹا جسے غلام بنا کر بیچا گیا تھا اسے نہ صرف اللہ تعالیٰ نے حکمرانی دی بلکہ وہی باپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور نورِ نظر بنا۔

قَالُوْا يٰٓاَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَآ اِنَّا كُنَّا خٰطِـِٕيْنَ ﴿٩٧﴾ قَالَ سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿٩٨﴾

(انہوں نے کہا کہ اے ہمارے والدِ گرامی ہمارے گناہوں کی مغفرت کیلئے دعا فرمائیے، بیشک ہم ہی خطا کار تھے۔ والد نے کہا کہ میں عنقریب تمہارے لئے اپنے رب سے مغفرت کی دعا کروں گا۔ بیشک وہی بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔) (سورۃ یوسف: ۹۷، ۹۸)

باپ سے استغفار کی درخواست

برادرانِ یوسفؑ نے جب اپنی آنکھوں سے حضرت یوسفؑ علیہ السلام کا مقام و مرتبہ دیکھا تو انہیں اپنی غلطیوں کا احساس ہوا۔ وہ یہ سمجھ گئے کہ حضرت یوسفؑ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے یہاں خاص تقرب کے حامل ہیں۔ اور ادھر اپنے باپ کو جس طرح ہمیشہ پُر امید دیکھا اور بالآخر اللہ تعالیٰ نے ان کی امیدوں کو بار آور کیا تو انہیں یقین ہو گیا کہ ہمارے والد عام انسانوں جیسے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ تب وہ اپنے والد

Marfat.com

ماجد سے کہنے لگے کہ ہم جان گئے ہیں کہ ہم ہی خطا کار تھے۔ نہ ہم نے یوسفؑ کے مرتبے کو پہنچانا اور نہ آپؑ کے مقام کو جان سکے۔ اس لئے آپؑ ہمارے لئے اللہ تعالیٰ سے خصوصی مغفرت کی دعا کریں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کہ میں عنقریب تمہارے لئے اللہ تعالیٰ سے معافی چاہوں گا۔ کہنے کا مطلب یہ تھا کہ میں جب خصوصی طور پر اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مصروف ہوتا ہوں اور میرا جو دعا اور مناجات کا خاص وقت ہے میں اس میں تمہارے لئے اللہ تعالیٰ سے استغفار کروں گا۔ اور مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں معاف کر دے گا کیونکہ وہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔ اس سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کو اگر اپنے گناہوں کا احساس ہو جائے اور وہ واقعی اس پر نادم ہو تو اسے چاہئے کہ وہ خود بھی رو رو کر اللہ تعالیٰ سے معافی چاہے اور کسی اللہ تعالیٰ والے کے پاس اگر جایا جا سکتا ہو تو اس سے بھی دعا کی درخواست کرے۔ اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عبادت کا خاص وقت اور عبادت کی مخصوص جگہ بھی قبولیتِ دعا میں مؤثر ہوتی ہے۔

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰی یُوْسُفَ اٰوٰۤی اِلَیْهِ اَبَوَیْهِ وَقَالَ ادْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِیْنَ ﴿٩٩﴾ (سورۃ یوسف : ۹۹)

(پھر جب یہ لوگ یوسفؑ کے پاس پہنچے تو حضرت یوسفؑ نے اپنے والدین کو خاص اپنے پاس جگہ دی اور (اپنے سب کنبے والوں سے) کہا، آپ سب مصر میں داخل ہو جائیں، اللہ تعالیٰ نے چاہا تو امن وچین سے رہو گے۔)

حضرت یوسفؑ سے ملاقات

قرآنِ کریم نے اپنے اسلوب کے مطابق ایسی باتیں حذف کر دی ہیں جو سیاقِ کلام سے خود بخود سمجھ میں آ سکتی ہیں۔ یہ بات اپنے تئیں بالکل واضح ہے کہ برادرانِ یوسفؑ کا قافلہ جب اپنے گھر پہنچا اور والدین کو حضرت یوسفؑ کا پیغام پہنچایا کہ آپ سب لوگ میرے پاس تشریف لے آئیں تو نورِ نظر کو جلد از جلد دیکھنے کی بے چینی کے باوجود تیاری میں کچھ دن تو لگے ہوں گے۔ اس کے بعد تلمود کی روایت کے مطابق جو گاڑیاں حضرت یوسفؑ علیہ السلام نے انہیں لینے کیلئے بھیجی تھیں ان پر سوار ہو کر تمام اہل خانہ جن کی تعداد تورات کے بیان کے مطابق ۶۸ تھی مصر کو روانہ ہو گئے۔ جب حضرت یوسفؑ علیہ السلام کو ان کے مصر کے قریب پہنچنے کی اطلاع ہوئی تو تورات کی روایت کے مطابق وہ لاؤ لشکر اور اپنے امراء کے ہمراہ ان کے استقبال کیلئے تشریف لائے بلکہ ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مصر بھر میں ان کی آمد کی شہرت پھیل چکی تھی۔ اس لئے شہر میں زور شور سے ان کے استقبال کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ تمام آبادی خوشیوں کے ہجوم میں ڈوبی ہوئی تھی۔ حضرت یوسفؑ نے اپنے امراء سمیت باہر نکل کر آپ کا استقبال کیا۔ چنانچہ جب یہ لوگ حضرت یوسفؑ سے ملے تو معلوم ہوتا ہے حضرت یوسفؑ علیہ السلام نے اپنے والدین کو خاص طور پر اپنے پاس جگہ دی یعنی اپنے محل میں اپنے ساتھ رہنے کی ان سے گزارش کی اور باقی سارے خاندان کو مصر میں داخل ہونے کی ہدایت کی اور ساتھ ہی اطمینان دلایا کہ آپ ماشاء اللہ تعالیٰ مصر میں خوش وخرم رہیں گے اور حوادث روزگار آپ کو پریشان نہیں کر سکیں گے۔ پھر ان تمام لوگوں کے جلو میں آپ اپنے دربار میں تشریف لائے۔

وَرَفَعَ اَبَوَیْهِ عَلَی الْعَرْشِ وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا ۚ وَقَالَ یٰۤاَبَتِ هٰذَا تَاْوِیْلُ رُءْیَایَ مِنْ قَبْلُ ۫ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّیْ حَقًّا ؕ وَقَدْ اَحْسَنَ بِیْۤ اِذْ اَخْرَجَنِیْ مِنَ السِّجْنِ وَجَآءَ بِكُمْ مِّنَ الْبَدْوِ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ الشَّیْطٰنُ بَیْنِیْ وَبَیْنَ اِخْوَتِیْ ؕ اِنَّ رَبِّیْ لَطِیْفٌ لِّمَا یَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ ﴿١٠٠﴾ (سورۃ یوسف : ۱۰۰)

(اور حضرت یوسفؑ نے اپنے والدین کو اوپر تخت پر بٹھایا اور سب حضرت یوسفؑ کے سامنے سجدے میں گر گئے۔ حضرت یوسفؑ نے کہا، ابا جان! یہ ہے میرے اس خواب کی تعبیر جو میں نے پہلے دیکھا تھا۔ میرے رب نے اسے سچا ثابت کر دکھایا۔ اس نے مجھ پر احسان کیا، جب اس نے مجھے قید خانے سے نکالا اور آپ لوگوں کو صحرا سے لا کر مجھ سے ملایا بعد اس کے کہ شیطان میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان فساد ڈال چکا تھا۔ بیشک میرا رب جو کچھ چاہتا ہے اس کیلئے نہایت باریک بین اور دقیقہ رس ہے۔ بیشک وہی جاننے والا اور حکمت والا ہے۔)

Marfat.com

خواب کی تعبیر

دربار شاہی میں پہنچنے کے بعد تمام مہمانوں کو درجہ بدرجہ ان کی مسندوں پر بٹھایا گیا لیکن حضرت یوسفؑ نے اپنے والدین سے تخت پر بیٹھنے کی استدعا کی۔ پھر آپؑ شاہی جلال کے ساتھ جب تخت پر رونق افروز ہوئے تو معمول کے مطابق تمام اہل دربار تعظیماً سجدے میں گر گئے۔ انہیں دیکھ کر آپؑ کے والدین اور آپؑ کے بھائی بھی سجدہ ریز ہو گئے۔ جب ان لوگوں نے سجدے سے سر اٹھایا تو حضرت یوسفؑ علیہ السلام نے اپنے والدِ گرامی سے کہا کہ ابا جان! یہ ہے میرے اس خواب کی تعبیر (جو حضرت سلمان فارسیؓ کی روایت کے مطابق) میں نے ۴۰ سال پہلے دیکھا تھا۔ اس وقت یہ خواب محض ایک خیال معلوم ہوتا تھا، لیکن آپؑ کی بصیرت نے ایک درخشاں مستقبل کی جھلک ضرور دیکھ لی تھی اسی لئے بھائیوں کے حسد سے بچانے کیلئے آپ نے مجھے نصیحت کی تھی کہ اسے اپنے بھائیوں کو نہ بتانا۔ آج دیکھ لیجئے، اللہ تعالیٰ نے میرے خواب کو ایک حقیقت بنا دیا۔ لیکن اس حقیقت تک پہنچنے کیلئے مجھے جن صعوبتوں سے واسطہ پڑا اور جن گھاٹیوں سے گزرنا پڑا وہ اگر چہ ایک تکلیف دہ داستان ہے لیکن اس میں بھی قدرت مجھ پر بار بار احسان کرتی رہی۔ آپؑ نے مجھے بھائیوں کے حسد سے بچانا چاہا۔ لیکن میں بھائیوں کے حسد ہی کا نشانہ بنا۔ انہوں نے یہ سمجھا کہ انہوں نے مجھے ٹھکانے لگا کر راستہ سے ہٹا دیا لیکن کسے خبر تھی کہ اسی کنوئیں سے میرے لئے کامیابیوں کا سورج طلوع ہو گا۔ مجھے غلام بنایا گیا تو اللہ تعالیٰ نے مجھے اسی واسطے سے ایک بڑے گھر کا قیام عطا فرمایا۔ گھر کی مالکن نے میرے ایمان میں نقب لگانا چاہی لیکن جب میں اس میں ثابت قدم رہا تو مجھے جیل بھیج کر اس نے اور دوسری بیگمات مصر نے بظاہر اپنا انتقام لیا اور یہ سمجھا کہ یہ خودسر نوجوان اب ہمیشہ خودسری کی سزا بھگتتا رہے گا لیکن اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے مجھے جیل سے نکالا اور تختِ شاہی تک پہنچایا۔ پھر مزید اس کا کرم یہ ہے کہ آپؑ کو صحرا سے نکال کر یہاں آنے کی توفیق بخشی۔

حضرت یوسفؑ کا حُسنِ اخلاق

حضرت یوسفؑ علیہ السلام کے اخلاق کی بلندی دیکھئے کہ وہ اپنے تمام کنبے کی آمد کو اللہ تعالیٰ کی نعمت قرار دے رہے ہیں۔ ان کے والدین کی تشریف آوری تو یقیناً ان کیلئے نعمت غیر مترقبہ تھی۔ لیکن جہاں تک بھائیوں کا تعلق ہے وہ تو ان کے خون کے پیاسے رہ چکے تھے لیکن آپؑ بجائے اس کے کہ ان کی دشمنی کا ذکر کریں اور انہیں اس کے ذمہ دار ٹھہرا کر ان پر ملامت کے تیر برسائیں۔ اس کے برعکس یہ فرما رہے ہیں کہ میرے اور بھائیوں کے درمیان جو ناگوار صورتحال پیدا ہوئی یہ سب کچھ شیطان کا کیا دھرا تھا۔ بھائیوں کو شیطان نے ایسا بہکایا کہ وہ خیر و شر میں تمیز نہ کر سکے۔ لیکن میں ان کی آمد کو بھی اللہ تعالیٰ کا انعام سمجھتا ہوں۔ وہ بہر حال میرے بھائی ہیں، میرے خون کا حصہ ہیں۔ اس لئے میں ان کے حق قرابت کو کیسے بھول سکتا ہوں۔ لیکن ساتھ ہی فرمایا کہ میرا رب لطیف ہے، وہ بہت باریک بین اور بے حد دقیقہ رس ہے۔ وہ جب کسی پر انعامات کرنا چاہتا ہے تو بظاہر اس پر جو مصیبتیں اترتی ہیں ان کے اندر سے راحت رسانی کے سامان پیدا کر دیتا ہے۔ وہ محرومیوں اور مایوسیوں میں امیدوں کے پھول اگا دیتا ہے۔ وہ بظاہر ناکامیوں میں کامیابیوں کی سحر طلوع کر دیتا ہے۔ نگاہیں کچھ دیکھ رہی ہوتی ہیں لیکن اس کی قدرت سے کچھ اور ظہور پذیر ہوتا ہے۔ میں بظاہر حوادث کا شکار ہوا لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں حوادث سے تخت و تاج کا راستہ نکالا۔ ہم ظاہر بین لوگ اپنی نارسائیوں کو علم اور اپنی کوتاہیوں کو حکمت سمجھ بیٹھتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں علیم اور حکیم صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔

بنی اسرائیل کی تعداد کی وضاحت

گزشتہ دو آیتوں میں دو باتیں ایسی گزری ہیں جو کسی حد تک تفصیل طلب ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ بائبل سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل جب مصر آئے ہیں تو ان کی تعداد ۶۸ تھی۔ لیکن جب تقریباً ۵۰۰ سال بعد انہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر سے لے کر نکلے تو بائبل کی روایت کے مطابق دوسرے سال بیابانِ سینا میں جب ان کی گنتی کرائی گئی تو صرف قابلِ جنگ مردوں کی تعداد ۶ لاکھ ۳ ہزار ۵۰ ۳ تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عورت، مرد اور بچے سب ملا کر کم از کم ۲۰ لاکھ ہوں گے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ایک خاندان محض تناسل کے ذریعہ سے اتنا بڑھ سکتا ہے۔ اہل علم اس سے انکار کرتے ہیں۔ قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل نے حضرت یوسفؑ کی زندگی اور ان کے بعد تقریباً چار صدیوں تک مصر میں حکومت کی۔ چونکہ یہ لوگ پیغمبروںؑ

Marfat.com

کی اولاد تھے اور اپنا ایک مستقل دین رکھتے تھے۔ یقیناً انہوں نے مصر کی غیر مسلم آبادی میں بھی تبلیغ و دعوت سے کام لیا ہوگا۔ ان کی تبلیغ کے نتیجے میں جو لوگ مسلمان ہوئے انہوں نے یقیناً اپنا تہذیب و تمدن بھی مسلمانوں جیسا اختیار کرلیا ہوگا اور بالکل اپنے آپ کو بنی اسرائیل کا ہم رنگ بنالیا ہوگا۔ جب مصر میں بنی اسرائیل کی حکومت کو زوال آیا اور غیر مسلموں کی حکومت قائم ہوگئی تو انہوں نے تمام مسلمانوں کو جن کا تعلق بنی اسرائیل سے تھا یا مصر کے دوسرے خاندانوں سے، دین کی یکسانی کے باعث اسرائیلی کہنا شروع کردیا جس طرح مختلف ممالک میں آج بھی غیر عرب مسلمانوں کو بھی محض دین کے اشتراک کی وجہ سے محمڈن کہا جاتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ جن لوگوں نے مصر سے ہجرت کی، ان میں نسل کے اعتبار سے بنی اسرائیل اور مذہب کے اعتبار سے بنی اسرائیل دونوں شریک تھے۔ البتہ بائبل سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر مسلم تو انہیں اسرائیلی کہتے تھے لیکن خود بنی اسرائیل انہیں اجنبی شمار کرتے تھے اور انہیں پردیسی کے لفظ سے یاد کیا جاتا تھا۔ مثلاً تورات میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جو احکام دیئے گئے ان میں ہم کو یہ تصریح ملتی ہے۔

''تمہارے لئے اور اس پردیسی کیلئے جو تم میں رہتا ہے نسل در نسل سدا ایک ہی آئین رہے گا، خدا کے آگے پردیسی بھی ویسے ہی ہوں جیسے تم ہو، تمہارے لئے اور پردیسیوں کیلئے جو تمہارے ساتھ رہتے ہیں ایک ہی شرع اور ایک ہی قانون ہو۔'' (گنتی ۱۵:۱۵۔۱۶)

کہنا صرف یہ ہے کہ تورات نے بنی اسرائیل کی جو تعداد ذکر کی ہے اس میں صرف بنی اسرائیل ہی شمار نہیں کئے گئے بلکہ وہ لوگ بھی شامل ہیں جو دوسرے نسلوں سے تعلق رکھتے تھے لیکن دین میں یکسانی کے باعث اسرائیلی کہلاتے تھے۔

اسی تناظر میں ایک اور بات بھی قابل توجہ ہے، وہ یہ کہ اگر بنی اسرائیل کی تعداد حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں ۲۰ لاکھ کے لگ بھگ تھی تو آج تو ان کی تعداد کئی کروڑ ہونی چاہئے جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ آج بھی ان کی تعداد کروڑوں میں نہیں بلکہ لاکھوں میں ہے۔ حیرانی کی بات ہے کہ آخر ہزاروں سالوں میں ان کی تعداد میں اضافہ ہونے کی بجائے کمی کیوں ہوگئی ہے۔ حقیقت کا علم تو اللہ تعالیٰ کو ہے لیکن بظاہر یوں محسوس ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے سے لے کر نبی کریم ﷺ کے زمانے تک تاریخی شہادت کے مطابق یہ قوم بار بار اللہ تعالیٰ کے عذاب کا شکار ہوئی اور ان کی بداعمالیوں کے باعث جب بھی ان پر عذاب آیا تو ایک بہت بڑی تعداد اس کا شکار ہوتی رہی ہے۔ اور دوسرا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ کئی صدیوں تک یہ قوم خانہ جنگی کا شکار رہی۔ اسی خانہ جنگی میں ان کی حکومتیں تقسیم ہوتی رہیں اور پھر ایک دوسرے پر چڑھائی کے نتیجے میں حکومتیں مٹتی رہیں۔ نبی کریم ﷺ کے بعثت مبارکہ سے انہیں سنبھلنے کا موقع دیا گیا۔ جن لوگوں نے اسلام قبول کیا ان کی تاریخ مسلمانوں کی تاریخ بن گئی اور جو لوگ یہودیت پر قائم رہے موجودہ اسرائیل حکومت قائم ہونے سے پہلے ہمیشہ عیسائی حکومتوں کے ذریعہ ان کا قتل عام ہوتا رہا اور یہ اپنی بداعمالیوں کی پاداش میں کبھی حکومتوں اور کبھی عوام کے غیظ و غضب کا نشانہ بنتے رہے۔ البتہ یہ بات ریکارڈ پر موجود ہے کہ جب بھی ان کو کبھی محفوظ اور مامون زندگی ملی ہے تو وہ ہمیشہ مسلمان حکومتوں میں ملی۔ لیکن یہ اپنی عقربی فطرت کے باعث ہمیشہ مسلمانوں کو نقصان پہنچاتے رہے۔

سجدہ کا مفہوم

دوسری بات جو دوسری آیت کے ضمن میں قابل توجہ ہے وہ حضرت یوسفؑ علیہ السلام کے سامنے والدین اور بھائیوں کا سجدہ ریز ہونا ہے۔ بعض لوگوں نے اس سجدہ کو اصطلاحی سجدہ کے معنی میں لے کر غیر اللہ تعالیٰ کیلئے سجدے کے جواز کی دلیل بنایا ہے۔ لیکن یہ ایک ایسا خیال ہے جسے نرم سے نرم لفظوں میں کفر یا گمراہی قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس لئے کہ نبی کریم ﷺ نے واضح الفاظ میں غیر اللہ کو سجدہ کرنے سے منع فرمایا۔ آپؐ کا ارشاد ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو سجدہ روا ہوتا تو میں بیوی کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔ جب ایک صحابیؓ نے جو حیرہ ریاست سے لوٹ کے آئے تھے، آنحضرت ﷺ سے عرض کیا کہ حضور! میں نے دوسرے ممالک میں دیکھا ہے کہ لوگ اپنے حکمرانوں کو سجدہ کرتے ہیں۔ آپؐ ہمیں اجازت دیجئے کہ ہم آپؐ کو سجدہ کیا کریں۔ تو آپؐ نے فرمایا کہ میری وفات کے بعد کیا تم میری قبر کو سجدہ کرو گے۔ انہوں نے کہا ہرگز نہیں کیونکہ آپؐ ہی نے اس سے منع فرمایا ہے۔ تو فرمایا کہ پھر اب مجھے سجدہ کیوں کرو گے۔ آپؐ کے کہنے کا مطلب شاید یہ تھا کہ سجدہ اس ذات کیلئے جائز ہے جسے کبھی زوال نہیں، وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔

Marfat.com

بعض لوگوں نے اس کی تاویل یہ کی ہے کہ جس سجدہ سے منع کیا گیا ہے وہ سجدۂ عبادت ہے۔ لیکن جہاں تک سجدۂ تعظیمی کا تعلق ہے وہ پہلی شریعتوں میں جائز رہا ہے۔ ہماری شریعت چونکہ مکمل شریعت ہے اور ہم پر اللہ تعالیٰ نے دین کو مکمل کر دیا ہے اس لئے اب ہر طرح کا سجدہ غیر اللہ کیلئے حرام قرار دیا گیا ہے۔ لیکن یہ بات صحیح معلوم نہیں ہوتی کیونکہ بائبل جو کہ پہلی شریعتوں کا مجموعہ ہے اس میں بتایا گیا ہے کہ بابل کی اسیری کے زمانے میں جب اخسویرس بادشاہ نے ہامان کو اپنا امیر الامراء بنایا اور حکم دیا کہ سب لوگ اسے سجدۂ تعظیمی بجالایا کریں تو مردکی نے جو بنی اسرائیل کے اولیاء میں سے تھے یہ حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ تلمود میں اس واقعہ کی شرح کرتے ہوئے اس کی جو تفصیل دی گئی ہے وہ پڑھنے کے لائق ہے۔

"بادشاہ کے ملازموں نے کہا آخر تو کیوں ہامان کو سجدہ کرنے سے انکار کرتا ہے۔ ہم بھی آدمی ہیں مگر شاہی حکم کی تعمیل کرتے ہیں۔ اس نے جواب دیا تم لوگ نادان ہو کیا ایک فانی انسان جو کل خاک میں مل جانے والا ہے اس قابل ہو سکتا ہے کہ اس کی بڑائی مانی جائے۔ کیا میں اس کو سجدہ کروں جو ایک عورت کے پیٹ سے پیدا ہوا؟ کل بچہ تھا، آج جوان ہوا ہے۔ کل بوڑھا ہوگا اور پرسوں مر جائے گا۔ نہیں! میں تو اس ازلی اور ابدی خدا ہی کے آگے جھکوں گا جو حیی و قیوم ہے۔۔۔۔۔ وہ جو کائنات کا خالق اور حاکم ہے میں تو بس اس کی تعظیم بجالاؤں گا اور کسی کی نہیں۔"

یہ تقریر نزول قرآن سے تقریباً ایک ہزار سال پہلے ایک اسرائیلی مومن کی زبان سے ادا ہوئی ہے اور اس میں کوئی شائبہ تک اس تخیل کا نہیں پایا جاتا کہ غیر اللہ کو کسی معنی میں سجدہ کرنا جائز ہے۔

صحیح بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہاں سجدہ اصطلاحی سجدہ کے معنی میں استعمال نہیں ہوا بلکہ محض جھکنے کے معنی میں آیا ہے۔ قدیم تہذیب میں یہ عام طریقہ تھا اور آج بھی بعض ملکوں میں اس کا رواج ہے کہ کسی کا شکریہ ادا کرنے یا کسی کا استقبال کرنے یا محض سلام کرنے کیلئے سینے پر ہاتھ رکھ کر کسی حد تک آگے کی طرف جھکتے تھے۔ اس جھکاؤ کیلئے عربی زبان میں سجدہ اور انگریزی میں "BOW" کے الفاظ استعمال کئے جاتے تھے۔ بائبل میں بکثرت اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق ایک جگہ لکھا ہے کہ انہوں نے اپنے خیمہ کی طرف تین آدمیوں کو آتے دیکھا تو وہ ان کے استقبال کیلئے دوڑے اور زمین تک جھکے۔ عربی میں اسی کو سجد الی الارض سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ممکن ہے اس آیت کریمہ میں بھی سجدے سے مراد زمین کی طرف جھکنا ہو، لیکن اگر کوئی شخص اس سجود سے اصطلاحی سجدہ ہی مراد لے جب بھی کوئی خاص فرق نہیں پڑتا کیونکہ سجدہ بجائے خود شرک نہیں بلکہ شرک کے اشباہ و قوالب میں سے ہے اور یہ اشباہ و قوالب حتمی طور پر آخری اور کامل دین یعنی اسلام میں حرام قرار دیئے گئے ہیں۔

رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ۚ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۣ اَنْتَ وَلِيّٖ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۰۱﴾ (سورۃ یوسف : ۱۰۱)

(اے میرے رب تو نے مجھے حکومت بخشی اور باتوں کی تعبیر کے علم میں سے بھی سکھایا۔ اے آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے تو ہی دنیا اور آخرت میں میرا کارساز ہے۔ میرا خاتمہ اسلام پر کر اور مجھے نیکوکاروں کے زمرہ میں شامل فرما۔)

حضرت یوسفؑ کا اداءِ شکر اور دعا

حضرت یوسف علیہ السلام نے جب دیکھا کہ تمام اہل درباران کے سامنے جھکے ہوئے ہیں اور آپؑ کے والدین اور بھائی بھی آپؑ کے ساتھ موجود ہیں اور دور دور تک آپؑ کے حکم کے خلاف سر ہلانے والا کوئی نہیں، تو اللہ تعالیٰ کے انعامات کی یہ بارش دیکھ کر آپؑ اللہ تعالیٰ کی حمد و سپاس میں ڈوب گئے اور بندوں کی طرف سے رخ پھیر کر اللہ تعالیٰ کی طرف رخ کر لیا اور عرض گزار ہوئے، اے میرے رب! میں ایک بے بسی کی تصویر غلام بن کر اس شہر میں آیا تھا۔ تیری عنایت کا کیا کہنا کہ تو نے مجھے اس ملک کی حکومت عطا کی۔ تو نے مجھے خوابوں کی تعبیر اور باتوں کی تہہ تک اترنے کا ملکہ سکھایا۔ اے آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے، میں اس ملک کا حکمران ہو کر بھی اپنے آپ کو کچھ نہیں سمجھتا، تو ہی میرا کارساز اور میرا سرپرست ہے۔ تیری طاقت میرا سہارا ہے۔ مجھے تیری ذات پر بھروسہ ہے۔ میری زندگی اور موت تیرے قبضہ میں ہے۔ تو نے جس طرح مجھے زندگی میں نعمتیں بخشی ہیں اور اقتدار عطا کیا ہے مجھے اپنے فرمانبردار کی حیثیت سے دنیا سے لے جانا اور اپنی اطاعت گزاری پر میرا خاتمہ کرنا اور مجھے ان نیک لوگوں کے زمرے میں

Marfat.com

شامل فرمانا جن کا نام اور یاد بعد کے لوگوں میں تو نے باقی رکھی ہے۔ مسلم اور صالح کا لفظ عام نیک آدمی کیلئے بھی استعمال ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے انتہائی مقرب اور فرمانبردار لوگوں کیلئے بھی۔ یہ لفظ واحد ہے لیکن اس کے معنی اور مفہوم میں بڑی وسعت ہے۔ اور اس کا مصداق جہاں اللہ تعالیٰ کا ہر فرمانبردار بندہ ہے وہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسے برگزیدہ لوگ بھی ہیں۔

ذٰلِکَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْهِ اِلَیْکَ ۚ وَمَا کُنْتَ لَدَیْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْٓا اَمْرَهُمْ وَهُمْ یَمْکُرُوْنَ ۝۱۰۲

(یہ سرگزشت غیب کی خبروں میں سے ہے جسے ہم تمہاری طرف وحی کر رہے ہیں۔ اور تم تو ان کے پاس اس وقت موجود نہیں تھے جب انہوں نے ایک رائے پر اتفاق کیا اور وہ سازش کر رہے تھے۔) (سورۃ یوسف :۱۰۲)

آپؑ کی نبوت کی دلیل

حضرت یوسفؑ علیہ السلام اور ان کے خاندان کی یہ سرگزشت آپؐ سے ہزاروں سال پہلے کی ہے۔ جب برادرانِ یوسف آپؑ کیخلاف باہم مشورہ کر رہے تھے اور کوئی قتل کا مشورہ دے رہا تھا اور کوئی کنویں میں پھینکنے کا۔ تو بالآخر وہ اپنی ایک رائے پر جمع ہوگئے کہ انہیں کنویں میں پھینک دیا جائے۔ اور یہ درحقیقت ایک سازش تھی کہ انہیں ختم کر دیا جائے تاکہ باپ کی تمام توجہ ہماری طرف ہو جائے۔ جب یہ سب کچھ ہو رہا تھا تو اے پیغمبر آپ تو ان کے پاس نہیں تھے کہ آپؐ جان سکتے کہ انہوں نے کیا مشورے کئے اور کیا فیصلہ کیا۔ یہ تو بالکل ایک ایسی داستان ہے جو آپؐ کے احاطۂ علم سے باہر کی چیز ہے۔ اگر جو اس کا ذکر بائبل میں کیا گیا ہے لیکن آپؐ چونکہ اُمی محض ہیں، آپؐ لکھ پڑھ نہیں سکتے۔ اس لئے آپؐ اسے پڑھ کر بھی معلوم نہیں کر سکتے تھے اور عرب کے رہنے والے بھی ان باتوں سے قطعاً ناواقف تھے کیونکہ حضرت یوسف علیہ السلام اور بنی اسرائیل کی تاریخ سے عربوں کو کبھی کوئی واسطہ نہیں رہا۔ اس کے باوجود آپ نے ان کے سوال کرنے پر ایک ہی نشست میں ان کے سامنے جس طرح تاریخ کے کئی ابواب کھول کر رکھ دیئے ہیں۔ کتنی باتیں ہیں جس میں آپ نے بائبل کی اصلاح کی ہے۔ اور کتنے حکمت کے موتی ہیں جن سے بائبل خاموش ہے۔ اور آپؐ نے خاص طور پر ان پر زور دیا ہے۔ یہ آپؐ کی نبوت کی ایک واضح اور روشن دلیل ہے کہ ادھر قریش نے آپؐ سے سوال کیا اور ادھر آپؐ نے سوال کے جواب میں حیرت انگیز طور پر تاریخ کھول کر ان کے سامنے رکھ دی جبکہ پورے جزیرۂ عرب میں اس کا جاننے والا کوئی نہ تھا اور کتنی ہی باتیں آپؐ نے ایسی بیان کیں جس سے بائبل خاموش تھی یا اس کا بیان غلط تھا۔

وَمَآ اَکْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِیْنَ ۝۱۰۳ (سورۃ یوسف : ۱۰۳)

(اور ان میں سے اکثر ایمان لانے والے نہیں ہیں، اگرچہ آپ ان کے ایمان کی کتنی ہی حرص کریں۔)

گزشتہ آیتِ کریمہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اب جبکہ قریش کو اپنے سوال کا مُسکت جواب مل گیا ہے تو اب ان کے ایمان لانے میں کیا تاخیر ہو سکتی ہے۔ لیکن اس آیتِ کریمہ میں صاف فرمایا جا رہا ہے اور یہ بجائے خود آپؐ کی نبوت کی دلیل ہے کہ اس صورتحال کے تقاضے کچھ بھی ہوں لیکن ہم آپؐ کو بتاتے ہیں کہ ان لوگوں کی اکثریت اب بھی ایمان نہیں لائے گی۔ سورۂ یوسفؑ کا ایک ایک لفظ ان کے ایمان کا تقاضا کرتا ہے اور آپ کی نبوت کیلئے حجت ہے۔ اور خود آپؐ کی خواہش اور حرص ان کے ایمان کیلئے دعا گو ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا وسیع علم آپؐ کو خبر دے رہا ہے کہ ان کی اکثریت اب بھی ایمان نہیں لائے گی۔ کیونکہ ان کے اندر کی قبولیتِ ایمان کی صلاحیت مر چکی ہے۔ وہ اس کی حقانیت کو جانتے ہیں لیکن ماننے سے محروم ہیں۔

وَمَا تَسْئَلُهُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِکْرٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ ۝۱۰۴ (سورۃ یوسف : ۱۰۴)

(اور آپ ان سے اس (تبلیغ و دعوت) پر کوئی معاوضہ تو طلب نہیں کر رہے ہو۔ یہ تو بس دنیا والوں کیلئے ایک یاد دہانی ہے۔)

Marfat.com

آنحضرت ﷺ کو تسلی

اس آیت میں آنحضرت ﷺ کو تسلی دی جا رہی ہے کہ اگر یہ لوگ ایمان نہیں لاتے تو آپؐ کیلئے اس میں پریشانی کی کیا بات ہے کیونکہ آپؐ تو ایمان کی نعمت مفت بانٹ رہے ہیں اور ان سے کوئی معاوضہ طلب نہیں کر رہے ہیں۔ وہ اگر اسے قبول نہیں کرتے تو وہ خود اللہ تعالیٰ کے دین سے محروم رہیں گے اور دنیا اور آخرت میں اس کا خمیازہ بھگتیں گے۔ آپؐ کوئی کاروبار تو نہیں کر رہے ہیں کہ آپؐ کا کاروبار خسارے کا شکار ہو جائے گا اور آپؐ کے معاوضے میں کمی آ جائے گی۔ نبی کی حیثیت سے آپؐ کی ذمہ داری ہے کہ آپؐ اللہ تعالیٰ کا دین ان تک پہنچا ئیں، سو آپؐ نے اس میں تو کوئی کمی نہیں کی۔ اب اگر وہ قبول نہیں کرتے ہیں تو اس کا خمیازہ وہ خود بھگتیں گے، آپؐ کو اس میں دل گرفتہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ
عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ﴿۱۰۵﴾ وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ
اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ ﴿۱۰۶﴾ اَفَاَمِنُوْٓا اَنْ تَاْتِيَهُمْ غَاشِيَةٌ مِّنْ
عَذَابِ اللّٰهِ اَوْ تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۰۷﴾
قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِىْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۚ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ
اتَّبَعَنِىْ ۭ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۰۸﴾ وَمَآ
اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِىْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى ۭ
اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ
مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اتَّقَوْا ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۰۹﴾
حَتّٰٓى اِذَا اسْتَيْـَٔسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا
جَآءَهُمْ نَصْرُنَا ۙ فَنُجِّىَ مَنْ نَّشَآءُ ۭ وَلَا يُرَدُّ بَاْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ

Marfat.com

الْمُجْرِمِيْنَ ﴿١١٠﴾ لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ۭ مَا كَانَ حَدِيْثًا يُّفْتَرٰى وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿١١١﴾

رکوع: ۱۲۔ (آسمانوں اور زمین میں کتنی ہی نشانیاں ہیں جن پر سے یہ لوگ گزرتے رہتے ہیں اس حال میں کہ ان سے اعراض کررہے ہوتے ہیں۔ اور ان میں سے اکثر اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں لاتے مگر اس طرح کہ ساتھ ہی اس کے شریک بھی ٹھہرائے ہوئے ہیں۔ کیا یہ مطمئن ہیں کہ خدا کے عذاب کی کوئی آفت انہیں دبوچ نہ لے گی یا قیامت ان پر اچانک نہ آجائے گی اور وہ اس سے بالکل بے خبر ہوں۔ کہہ دیجئے! یہ ہے میری راہ، میں اللہ تعالیٰ کی طرف بلاتا ہوں پوری بصیرت کے ساتھ۔ میں بھی اور وہ لوگ بھی جنہوں نے میری پیروی کی ہے اور اللہ تعالیٰ پاک ہے اور شرک کرنے والوں سے میرا کوئی واسطہ نہیں۔ ہم نے تم سے پہلے بھی آدمی ہی بھیجے انہیں بستیوں والوں میں سے، ہم ان کی طرف وحی کرتے تھے، کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھتے کہ کیا انجام ہوا ان لوگوں کا جو ان سے پہلے تھے اور دارِ آخرت ان لوگوں کیلئے بہتر ہے جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا تو تم سمجھتے نہیں۔ حتیٰ کہ جب رسول اپنی قوموں سے مایوس ہوگئے اور لوگوں نے یہ گمان کیا کہ ان کو جھوٹ ڈراوے سنائے گئے تو ان کو ہماری مدد آپہنچی۔ پس نجات ملی ان کو جن کو ہم نے نجات دی اور ہمارا عذاب مجرموں سے ٹالا نہیں جاسکتا۔ ان کی سرگزشتوں میں بڑا سامانِ عبرت ہے عقل والوں کیلئے یہ قرآنِ کریم کوئی گھڑی ہوئی چیز نہیں ہے بلکہ تصدیق ہے اس چیز کی جو اس سے پہلے موجود ہے اور تفصیل ہے ہر چیز کی اور ہدایت و رحمت ہے ایمان لانے والوں کیلئے۔)

وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ﴿١٠٥﴾ (سورۃ یوسف : ۱۰۵)

(آسمانوں اور زمین میں کتنی ہی نشانیاں ہیں جن پر سے یہ لوگ گزرتے رہتے ہیں اس حال میں کہ ان سے اعراض کررہے ہوتے ہیں۔)

مشرکین کے ایمان نہ لانے کا حقیقی سبب

گزشتہ رکوع کے اختتام پر حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعات بھی اختتام کو پہنچ گئے۔ سوال بنی اسرائیل اور حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں تھا۔ اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ اسی رکوع کے اختتام پر سورۂ یوسف ختم کردی جاتی لیکن مزید ایک رکوع کا اضافہ ہمیں یہ بتلاتا ہے کہ قرآنِ کریم انبیائے کرام کے واقعات یا تاریخی قصص کو تاریخ کے طور پر بیان نہیں کرتا بلکہ یہ کتابِ ہدایت ہے اور اس میں آنے والی ہر بات انسانوں کی ہدایت کیلئے ہوتی ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی سرگزشت از اول تا آخر عبرت و موعظت کا مرقع ہے۔ واقعات کو اس طرح سے بیان کیا گیا ہے کہ اس کی ایک ایک سطر بولتی ہوئی نصیحت ہے۔ چنانچہ اسی تناظر میں واقعات کے اختتام کے بعد ایک رکوع کا اضافہ صرف اس لئے کیا گیا ہے کہ جس مقصد کیلئے یہ واقعات بیان کئے گئے ہیں انہیں مزید اجاگر کیا جائے اور قرآنِ کریم کا جو اصل مقصد ہے اس کو ذہنوں میں اتارنے کی کوشش کی جائے۔ چنانچہ اس حوالے سے جب ہم سورۂ یوسف پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی سرگزشت اللہ تعالیٰ کے وجود، اس کی قدرت، اس کی

Marfat.com

مشیت اور اس کی حکمت کا مجموعہ ہے۔ جس میں قدم قدم پر محسوس ہوتا ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے توکل پر اور اس کی اطاعت کا عہد کرتے ہوئے زندگی گزارنے کا فیصلہ کر لیتا ہے اللہ تعالیٰ کی نصرت کس طرح اس کو تھام لیتی ہے اور مصائب کے ہجوم میں کس طرح اس کی دستگیری کرتی ہے۔ اہل دنیا یہ سمجھتے ہیں کہ اس شخص کو دنیا نے دھتکار دیا ہے لیکن اس وقت اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں جب وہ دیکھتے ہیں کہ وہی دھتکارا ہوا شخص کامرانیوں کی منازل طے کرتا ہوا تخت و تاج کا مالک ٹھہرتا ہے۔ حضرت یوسفؑ کی داستان اللہ تعالیٰ کی قدرت کی ایسی ہی نشانیوں سے بھرپور ہے جو قدم قدم پر اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، اس کی بے کراں قدرت اور اس کی الوہیت پر ایسے دلائل سے مرصع ہے جس کے بعد پیغمبر کی دعوت کو تسلیم نہ کرنے کا کوئی جواز باقی نہیں رہ جاتا۔ لیکن جب تاریخ کا طالب علم یہ دیکھتا ہے کہ اہل مکہ نے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا، اپنے کانوں سے سنا لیکن ان کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ وہ اپنے کفر اور شرک میں جس طرح پہلے گڑے ہوئے تھے اس میں کہیں دراڑ واقع نہ ہوئی تو سوچنے والا دماغ سُن ہو کر رہ جاتا ہے کہ آخر یہ ماجرا کیا ہے کہ یہ اتنی عظیم نشانیاں ان پر اثر انداز کیوں نہیں ہوتیں۔ پیش نظر آیتِ کریمہ میں اسی بات کا جواب دیا گیا ہے کہ تم جن لوگوں کو بظاہر دیکھتے ہو کہ وہ آنکھیں کھول کھول کر نشانیوں کو دیکھتے ہیں۔ نشانیوں کا مطالبہ کرتے ہیں اور پھر انہیں اپنے کانوں سے سنتے ہیں لیکن ان کی روش میں کوئی تغیر نہیں آتا تو اس کا سبب اصل میں یہ ہے کہ وہ ظاہر میں تو نشانی کو دیکھتے ہیں لیکن اس کی حقیقت پر غور کرنے کی زحمت کبھی نہیں کرتے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی ہر مخلوق کو ایک چیز سمجھتے ہیں اور چیز کے سراپا میں ڈوب جاتے ہیں۔ وہ ہر چیز کو ایک نشانی نہیں سمجھتے کہ وہ حقیقت کی طرف سفر کرنے کی کوشش کرتے۔ دیکھنے کو تو جانور بھی دیکھتا ہے اور وہ ہر چیز کے مصرف کو بھی جانتا ہے۔ ایک گائے چارے کو دیکھتی ہے تو یہ جانتی ہے کہ چارہ پیٹ بھرنے کیلئے ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ اسے کھا کر فارغ ہو جاتی ہے لیکن انسان اور حیوان کے دیکھنے میں فرق ہونا چاہئے۔ حیوان صرف اپنے حواس سے کام لیتا ہے اور حواس کا کام صرف اتنا ہے کہ وہ ہر چیز کا مصرف واضح کر دے۔ انہیں اس سے کوئی غرض نہیں کہ اس کی اصل حقیقت کیا ہے لیکن انسان کو اللہ تعالیٰ نے حواس کے ساتھ ساتھ سوچنے والا دماغ اور گہرائی میں اترنے والی عقل بھی عطا کی ہے۔ اگر یہ عقل خواہشات نفس کی اسیر ہو کر نہ رہ جائے اور اس پر مفادات کی چادر نہ تان دی جائے تو یہ ہر چیز کی حقیقت کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ گلاب کا پھول دیکھنے والے کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ ہاتھوں کا لمس اس کی نزاکت اور ملائمت کو محسوس کر کے جھوم اٹھتا ہے۔ نگاہ اس کے رنگ میں ڈوب جاتی ہے اور قوتِ شامہ اس کی خوشبو کی داد دیتی ہے لیکن اس پھول کے پیچھے کوئی حقیقت بھی کارفرما ہے یا نہیں، حواس اس کے بارے میں کوئی رہنمائی نہیں کرتے اور جس نے اپنی عقل کو نارسائی کی زنجیریں پہنا رکھی ہیں وہ زیادہ سے زیادہ یہ سمجھتا ہے کہ اس سے گل قند تیار کی جاسکتی ہے تاکہ قوتِ ہضم میں معاون ہو۔ لیکن جسے اللہ تعالیٰ نے حقیقت شناس بنایا ہے وہ صرف اس کی نزاکت، اس کے رنگ اور اس کی خوشبو ہی میں محدود نہیں رہتا وہ سوچتا ہے کہ جس چیز کی نزاکت، رنگ اور خوشبو مجھے حیران کیے دے رہی ہے اس کا پیدا کرنے والا کس شان کا مالک ہوگا۔ وہ پھول سے آگے بڑھ کر پھول کو پیدا کرنے والے کے بارے میں سوچتا ہے۔ اہل مکہ کا بھی اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہ حقیقت شناسی کی صلاحیت سے محروم ہو چکے تھے۔ وہ ہر چیز کو نشانی کے طور پر نہیں، چیز کے طور پر دیکھتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ بڑی سے بڑی نشانی پر سے گزرتے ہیں لیکن اس کی حقیقت پر غور کرنے کی زحمت کبھی نہیں کرتے۔ یہ ایک ایسا مرض ہے جس کا شکار افراد بھی ہوتے ہیں اور اقوام بھی۔ اگر اس کی فکر نہ کی جائے تو افراد ہی نہیں اقوام بھی اپنی منزل سے دور ہٹتی چلی جاتی ہیں۔ اقبالؒ نے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا:

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ سمجھے وہ نظر کیا

تکلیف دہ بات یہ ہے کہ اس مرض کا شکار صرف عوام نہیں ہوتے بلکہ اہل علم اور اہل دانش بھی ہوتے ہیں۔ اور آج کے دور میں جن قوموں کو علم و دانش میں ترقی کا بڑا دعویٰ ہے وہ اس ظاہر بینی اور سطح پرستی کا زیادہ شکار ہیں۔ تباہ شدہ بستیاں، ناگہانی حوادث کا شکار قومیں ترقی یافتہ قوموں کی ہدف بنی ہوئی ہیں۔ ان کی کھدائیاں ہو رہی ہیں، ہر پتھر کے پیچھے جھانکنے کی کوشش کی جارہی ہے، ہر ٹوٹے ہوئے برتن کی کھال ادھیڑی جارہی ہے لیکن ان تمام کاوشوں کے پیچھے صرف یہ فکر کارفرما ہے کہ ان کا کلچر تلاش کیا جائے۔ اس سے کوئی غرض نہیں کہ انہیں عبرت کا موضوع بنایا جائے۔ ہمارا یہ ملک جسے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کے نام پر لیا گیا ہے یہاں بھی موہنجوداڑو اور ہڑپہ میں یہی کچھ ہو رہا ہے۔ انور مسعود نے ٹھیک کہا:

Marfat.com

عبرت کی اک چھٹانک برآمد نہ ہو سکی
کلچر نکل پڑا ہے ٹنوں کے حساب سے

حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے کسی نے پوچھا کہ آپ کو معرفتِ حق کی دولت کیسے ملی؟ کہا شہتوت کے پتے سے۔ سائل نے حیران ہو کر کہا وہ کیسے؟ آپؓ نے فرمایا کہ بکری شہتوت کے پتے شوق سے کھاتی ہے اور مینگنیاں کر دیتی ہے۔ ہرن شہتوت کے پتے سے غذا حاصل کرتا ہے تو اس کی ناف سے کستوری نکلتی ہے اور ریشم کا کیڑا شہتوت کا پتا کھاتا ہے تو ریشم بنتا ہے۔ اگر شہتوت کے پتے میں کوئی ذاتی صلاحیت ہوتی تو وہ ہر جگہ مینگنیاں بن جاتا یا کستوری اور یا ریشم۔ لیکن وہ کہیں کستوری بنتا ہے اور کہیں ریشم۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کو مختلف شکلیں دینے والا کوئی اور ہاتھ ہے جو ان کے پیچھے کارفرما ہے، وہی ہاتھ میرے اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ہے۔ دیکھ لیجئے کہ حضرت علیؓ نے شہتوت کے پتے سے اپنے رب کو پہچانا۔

وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ ﴿۱۰۶﴾ (سورۃ یوسف : ۱۰۶)
(اور ان میں سے اکثر اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں لاتے مگر اس طرح کہ ساتھ ہی اس کے شریک بھی ٹھہرائے ہوئے ہیں۔)

آیت کے دو مفہوم: دیدۂ عبرت سے محرومی، شفعاء پر تکیہ

حقیقت تو اللہ تعالیٰ جانتا ہے لیکن بظاہر اس آیتِ کریمہ کے دو مطلب ذہن میں آتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ انسان کی بدنصیبی کا حال یہ ہے کہ اگر وہ مخلوقات کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ کو بطور خالق تسلیم بھی کر لیتا ہے اور مان لیتا ہے کہ واقعی ایک اللہ تعالیٰ ہے جو اس کائنات کا خالق و مالک ہے، لیکن ساتھ ہی وہ بہت سی قوتوں کو اللہ تعالیٰ کا شریک بھی ٹھہراتا ہے۔ کسی نے اس کی ذات میں شریک ٹھہرایا، کسی نے صفات میں اور کسی نے حقوق میں۔ یہ بدنصیبی صرف اس بات کا نتیجہ ہے کہ وہ زمین و آسمان کی نشانیوں کو عبرت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے ورنہ انہیں شرک کیلئے کہیں گنجائش نہ ملتی۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ مشرکین مکہ جو رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے کیلئے تیار نہیں اور آپ کی دعوت کو قبول کرنے کیلئے آمادہ نہیں حالانکہ وہ اللہ تعالیٰ کو تسلیم کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کو اپنا خالق مانتے ہیں، اسے کائنات کا مالک سمجھتے ہیں، لیکن نبی کریم ﷺ کی دعوت کو خالصتاً قبول کرنے کیلئے اس لئے تیار نہیں کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے کئی شریک بنا رکھے ہیں اور ان شرکاء کو اللہ تعالیٰ کے یہاں شفعاء کا درجہ دیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اگر واقعی قیامت آ ہی گئی اور وہاں ہمیں اپنا حساب دینا پڑا تو ہمیں اس کی کیا فکر ہے جنہیں ہم نے زندگی بھر پکارا اور پوجا اور ان کے نام کی قربانیاں دیں اور ان کی جے پکاری، یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ ہمیں اللہ تعالیٰ کی بازپرس سے پناہ نہ دیں۔ وہ ہمیں جہنم کے عذاب سے محفوظ نہ رکھیں۔ مشرکینِ مکہ عام طور پر فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں مانتے تھے اور ان کی عبادت کرتے تھے اور انہیں اس بات کا یقین تھا کہ بیٹیاں اپنے باپ کو ہمیشہ زیادہ پیاری ہوتی ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ نے ہمیں کسی وجہ سے پکڑا تو بیٹیاں ضد کر کے ہمیں چھڑا لیں گی۔ شفاعت کا یہ جھوٹا تصور درحقیقت جزا و سزا کے تصور کے بالکل برعکس ہے۔ اسلام تو اس بات پر زور دیتا ہے کہ تم جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔ ہر نیکی کی جزا ملے گی اور ہر برائی کی سزا ملے گی۔ ہر شخص اپنی چھوٹی بڑی نیکی اور برائی کو دیکھے گا اور اسی کے مطابق اس کا انجام ہو گا اور یہی وہ تصور ہے جو انسان کو اپنی اصلاح پر آمادہ کرتا ہے لیکن اگر اسے یہ بتا دیا جائے کہ تم جو چاہے کچھ بھی کرتے پھرو کوئی تمہیں پکڑنے والا نہیں۔ اور اگر پکڑے بھی گئے تو تمہارے سفارشی تمہیں چھڑا لیں گے۔ تو اندازہ فرمایئے اس کے بعد ایمان و عمل کی کیا قدر و قیمت رہ جاتی ہے۔ مشرکینِ مکہ اسی شرک کی وجہ سے نبی کریم ﷺ پر ایمان لانے کیلئے تیار نہیں ہوتے تھے۔ آپ انہیں عذاب سے ڈراتے لیکن وہ اپنے مصنوعی سہاروں کی وجہ سے کسی ڈراوے کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔

اَفَاَمِنُوْٓا اَنْ تَاْتِيَهُمْ غَاشِيَةٌ مِّنْ عَذَابِ اللّٰهِ اَوْ تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۰۷﴾
(کیا یہ مطمئن ہیں کہ خدا کے عذاب کی کوئی آفت انہیں دبوچ نہ لے گی یا قیامت ان پر اچانک نہ آ جائے گی اور وہ اس سے بالکل بے خبر ہوں۔) (سورۃ یوسف: ۱۰۷)

Marfat.com

کوتاہیٔ فکر انجام سے بے پروائی

اس آیتِ کریمہ میں معلوم ہوتا ہے کہ دو باتوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، ایک تو یہ کہ یہ لوگ اپنے شرکاء اور شفعاء پر اس حد تک بھروسہ کر چکے ہیں کہ انہیں اس بات کا کوئی اندیشہ نہیں کہ اچانک ان پر عذاب آدھمکے یا قیامت آجائے، کوئی سی بھی صورت ہو یہ سمجھتے ہیں کہ ہم جن کے دامن گرفتہ ہیں اور جن سے ہم نے عقیدت کا رشتہ باندھ رکھا ہے وہ ہماری دستگیری کریں گے اور ہمیں ایسی ہر مصیبت سے بچالیں گے حالانکہ ایمان تو بہت بڑی بات ہے معمولی عقل رکھنے والا آدمی بھی جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے عذاب یا اس کی قیامت سے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں بچا سکتا۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ آج کے علم و دانش نے سب سے زیادہ جس چیز کو نقصان پہنچایا ہے وہ اللہ تعالیٰ کا خوف اور اس کا ڈر ہے۔ یعنی اس کی طرف سے آنے والے عذاب کا ڈر اور اس کی قیامت کا خوف۔ آج کا دانشور اس کو محض ایک ڈراوا یا ڈھکوسلہ سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک جنت یا جہنم بھی مفروضے کے سوا کچھ نہیں۔ ہمارا بہت بڑا شاعر یہ بات کہہ چکا ہے:

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

دوسری بات جس کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے وہ یہ ہے کہ انسان زندگی کی رواروی میں یہ بات بھول جاتا ہے کہ مجھے اپنے انجام کی فکر ہونی چاہیے۔ وہ اپنے حال کو دائم خیال کرتا ہے۔ جس طرح جی رہا ہے اسے کبھی خیال نہیں گزرتا کہ اس میں کوئی تبدیلی بھی آسکتی ہے حالانکہ اس کے سامنے آئے دن جنازے اٹھتے ہیں، تخت و تاج اچھلتے ہیں، عظمتیں سرنگوں ہوتی ہیں، چھوٹے خاندان بڑے خاندانوں کی جگہ لے لیتے ہیں اور بڑے خاندانوں کے چشم و چراغ گرد راہ بن جاتے ہیں۔ اس کے باوجود انسان اپنے بارے میں غور کرنے کی زحمت نہیں کرتا۔ اس آیتِ کریمہ میں انسان کو متنبہ کیا گیا ہے کہ کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ کوئی ناگہانی آفت اچانک آسکتی ہے، زلزلے کا کوئی جھٹکا آبادیوں کو ویرانوں میں بدل سکتا ہے۔ لیکن انسان کی بے بصیرتی ایک ایسی اٹل حقیقت بن چکی ہے کہ جسے تبدیل کر دینا شاید آسان نہیں۔ لیکن یہ روش نہ پہلے کسی کو آسودہ کر سکی ہے اور نہ آئندہ کسی کو زندگی دے سکے گی۔

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۭ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۰۸﴾

(کہہ دیجئے! یہ ہے میری راہ، میں اللہ تعالیٰ کی طرف بلاتا ہوں پوری بصیرت کے ساتھ۔ میں بھی اور وہ لوگ بھی جنہوں نے میری پیروی کی ہے اور اللہ تعالیٰ پاک ہے اور شرک کرنے والوں سے میرا کوئی واسطہ نہیں۔) (سورۃ یوسف: ۱۰۸)

میرا راستہ دعوت الی اللہ ہے، شرک نہیں

شرک کی مکمل تردید کے بعد آنحضرت ﷺ کو حکم دیا گیا کہ آپ اعلان کر دیجئے کہ یہ ہے میرا راستہ جس میں شرک کی کوئی گنجائش نہیں۔ تم نے نہ جانے عقیدت کے رشتے کس کس سے باندھ رکھے ہیں لیکن میں صرف اللہ تعالیٰ کی طرف بلاتا ہوں۔ میں بھی اور وہ لوگ بھی جنہوں نے میری پیروی کی ہے۔ وہی ہمارا ملجا و ماویٰ ہے، وہی ہمارا معبود و مسجود ہے، وہی ہمارا الٰہ اور حاکمِ حقیقی ہے، ہماری محبت کا حوالہ ہے، وہی ہمارے دلوں پر حکمران ہے، وہی ہماری تنہائیوں کا نگہبان ہے، ہم اسی کے سامنے دستِ سوال دراز کرتے ہیں اور اسی کے سامنے سر جھکاتے ہیں، ہم اسی کے بندے اور اسی کے خلیفہ ہیں، اس کی زمین پر اس کی شریعت کو نافذ کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ یہ ہمارا جذباتی فیصلہ نہیں نہ مذہبی عقیدت کا جوش ہے بلکہ ہمارا یہ فیصلہ کامل بصیرت کی بنیاد پر ہے۔ ہم حجت اور برہان کی بنیاد پر یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر طرح کے شرک سے پاک ہے۔ شرک کی کوئی آلائش اس کے قریب بھی نہیں پھٹک سکتی۔ خالق اور مخلوق میں مشابہت کی کوئی سی قسم بھی کیسے پیدا ہو سکتی ہے۔ اس لئے میں صاف اعلان کرتا ہوں کہ میں مشرکین میں سے نہیں، میرا شرک سے کوئی رشتہ نہیں اور میں ہر طرح کے شرک سے اپنی مکمل براءت کا اعلان کرتا ہوں۔

Marfat.com

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِیْٓ اِلَیْھِمْ مِّنْ اَھْلِ الْقُرٰی ؕ اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرُوْا کَیْفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ ؕ وَلَدَارُ الْاٰخِرَۃِ خَیْرٌ لِّلَّذِیْنَ اتَّقَوْا ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۰۹﴾ (سورۃ یوسف : ۱۰۹)

(ہم نے تم سے پہلے بھی آدمی ہی بھیجے انہیں بستیوں والوں میں سے، ہم ان کی طرف وحی کرتے تھے، کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھتے کہ کیا انجام ہوا ان لوگوں کا جو ان سے پہلے تھے اور دارِ آخرت ان لوگوں کیلئے بہتر ہے جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا تو تم سمجھتے نہیں۔)

دو اعتراضات اور ان کے جواب

اس آیتِ کریمہ میں مشرکینِ مکہ کے دو اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے۔ ان کا پہلا اعتراض یہ تھا کہ انسانوں ہی میں سے ایک انسان کو نبوت کے منصب پر کیونکر فائز کر دیا گیا ہے جبکہ نبوت اور رسالت کا منصب ایک عظیم تر منصب ہے۔ دنیا میں رہنے والا دنیا کی آلودگیوں سے آلودہ شخص باقی انسانوں کی طرح کم مائیگی کا شکار اور اپنے اندر ہزاروں تضادات رکھنے والا، خواہشات کا اسیر، کوتاہیوں اور کمزوریوں کے حصار میں رہنے والا اتنے بڑے منصب پر فائز کیسے ہو سکتا ہے؟ اگر کوئی دنیا کا کام ہوتا تو دنیا کا کوئی آدمی بھی اس کیلئے مناسب ہو سکتا تھا لیکن ایک کام جس کا رشتہ اللہ تعالیٰ کی ذات سے بندھا ہوا ہے۔ جس کی زبان سے خدا بولتا ہے جس پر فرشتے اترتے اور وہ فرشتوں سے باتیں کرتا اور ان کی باتیں سنتا ہے۔ وہ عالمِ غیب کی خبریں دینے والا آخر ایک آدمی کیسے ہو سکتا ہے۔

دوسرا اعتراض یہ تھا کہ چلئے اگر انسانوں کی ہدایت کیلئے کسی انسان یا آدمی ہی کو بھیجنا ضروری تھا تو کم از کم اسے ایک غیر معمولی آدمی ہونا چاہئے تھا۔ یہ کیا ہوا کہ وہ جن بستیوں کی طرف ہادی بن کے آیا ہے اس نے ایک مدت انہیں بستیوں میں چلتے پھرتے اور رہتے ہوئے گزاری۔ اس کا بچپن وہیں گزرا، لڑکپن کی عمر بھی وہیں کٹی، جوانی کی بہاریں بھی وہیں آئیں، اب وہیں رہتے رہتے کہولت کی عمر بھی شروع ہو گئی۔ اسی کو اٹھا کر نبوت کے منصب پر بٹھا دیا گیا ہے اور لوگوں کو حکم دے دیا گیا کہ اس کی اطاعت کرو، اس کی سنو اور اس کی مانو، اسی میں تمہاری دنیا اور آخرت کی بھلائی ہے۔

قرآن کریم نے یہاں بھی اور دوسرے مواقع پر بھی ان باتوں کا جواب دیا ہے۔ جواب میں واقعاتی طرزِ استدلال اختیار کیا گیا جو نہایت سادہ بھی ہے اور نہایت مؤثر بھی۔ ارشاد فرمایا کہ تم یہ بتاؤ کہ ہم نے محمد ﷺ کو جو رسول بنا کے بھیجا ہے تو کیا یہ تاریخِ ہدایت کا پہلا واقعہ ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس دنیا میں جو پہلا انسان آیا وہ پہلا نبی اور رسول تھا اور پھر جیسے جیسے انسانوں کی ہدایت کیلئے ضرورت پیدا ہوتی رہی تو کسی نہ کسی انسان ہی کو یہ فریضۂ منصبی عطا کیا جاتا رہا۔ تمہیں بتاؤ نوح، ابراہیم، موسیٰ، ہود اور لوط علیہم السلام کیا انسان نہیں تھے۔ تم ان کو رسول کے طور پر جانتے ہو اور تمہیں یقین ہے کہ یہ انسانی ہدایت کیلئے آئے تھے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام تو تمہارے جدِ امجد ہیں اور حضرت اسماعیل علیہ السلام ان کے وہ بڑے صاحبزادے ہیں قریش جن کی براہِ راست اولاد ہیں جن کی اپنی قبر اور ان کی والدہ محترمہ کی قبر خود مکہ معظمہ میں ہے۔ ان کو تم رسول بھی مانتے ہو اور انسان بھی مانتے ہو تو آخر محمد کریم ﷺ کے بارے میں تمہیں کیوں اشتباہ لاحق ہو گیا ہے اور تمہیں ان کا انسان ہونا نبوت کے منافی کیوں دکھائی دیتا ہے۔

یہ تم جانتے ہو کہ رسول انسانوں کی ہدایت کیلئے آتے ہیں اور ہدایت کیلئے جس طرح نصیحت مؤثر ہوتی ہے اس سے بڑھ کر عمل اور زندگی کا رویہ مؤثر ہوتا ہے۔ آپ اگر کسی کے سامنے پاکدامنی پر وعظ کہیں تو یقیناً اس کا کسی نہ کسی حد تک اثر ہوگا لیکن جو اثر حضرت یوسفؑ علیہ السلام کی پاکیزہ جوانی کے واقعات سے ہوتا ہے وہ ظاہر ہے کہ پاکدامنی کے وعظ سے نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ کے راستے میں استقامت اور استقلال تقریر کی صورت میں بھی بیان کیا جا سکتا ہے اور اس کا اثر بھی ہوتا ہے۔ لیکن کیا اس قدر اثر ہو سکتا ہے جتنا طائف کے پتھروں کی بارش میں آنحضرت ﷺ کی استقامت اور استقلال کو دیکھ کر ہوتا ہے۔ اگر یہ امرِ واقعہ ہے کہ عملی ہدایت کے بغیر ہدایت کا باب مکمل نہیں ہوتا تو پھر ذرا غور کیجئے کہ اگر انسانوں کی ہدایت کیلئے کسی فرشتے کو بھیجا جاتا تو وہ تو سرے سے نظر ہی نہ آتا۔ نہ اسے بھوک لگتی، نہ اسے زخم لگتے، نہ اسے پیاس پریشان کرتی، نہ پتھروں کی بارش میں اس کا خون بہتا۔ گویا عملی ہدایت کیلئے جن جن چیزوں کی ضرورت ہے ان میں سے کوئی چیز بھی اس سے وقوع پذیر نہ ہوتی تو انسان اس سے کیا ہدایت حاصل کرتا۔ وہ

Marfat.com

صبر کی تلقین کرتا تو لوگ پوچھتے صبر کی عملی صورت کیا ہے۔ وہ استقامت پر وعظ کہتا تو لوگ اس کی زندگی میں استقامت ڈھونڈتے، وہ پاکدامنی کی باتیں کرتا تو لوگ حیران ہوتے کہ ایسی شخصیت کیلئے پاکدامن رہنا کیا مشکل ہے جسے جنس کی ہر طرح کی آلودگیوں سے بے بہرہ پیدا کیا گیا ہے۔ اس لئے یہ بات مانے بغیر چارہ نہیں کہ انسانی ہدایت کیلئے کسی جن یا فرشتے کا آنا خلافِ عقل ہی نہیں، ہدایت کی ضرورت کے بھی خلاف ہے۔ اس لئے جب بھی کوئی نبیؑ آیا وہ انسانوں ہی میں سے اٹھایا گیا ہے۔

رہا دوسرا اعتراض کہ کسی انسان ہی کو بھیجنا تھا تو کسی غیر معمولی انسان کو بھیجا ہوتا۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ انہیں میں سے ایک جانے پہچانے شخص کو نبوت دے دی گئی۔ عجیب بات یہ ہے کہ جس چیز کو نبیؑ کی صداقت کی دلیل ہونا چاہئے اسی کو نبوت کا متضاد قرار دے دیا گیا۔ کمال تو یہ ہے کہ جس قوم کی طرف کوئی رسول آیا وہ اسی قوم کا ہمیشہ ایک فرد رہا۔ انہیں میں وہ پلا بڑھا اور جوان ہوا، انہیں میں اس نے زندگی کے معاملات کئے۔ قوم کے بیشتر افراد اس کے شب و روز سے اچھی طرح آگاہ رہے۔ چنانچہ جب اس نے نبوت کا دعویٰ کیا تو اپنی سچائی ہی کو اپنی دلیل کے طور پر پیش کیا۔ آنحضرت ﷺ نے بھی کوہِ صفا پر چڑھ کر سب سے پہلے اپنی قوم سے یہی مشکل ترین سوال کیا کہ اے آلِ غالب بتاؤ کہ تم مجھے صادق سمجھتے ہو کہ کاذب۔

کہا سب نے قول آج تک کوئی تیرا
کبھی ہم نے جھوٹا سنا اور نہ دیکھا
کہا گر سمجھتے ہو تم مجھ کو ایسا
تو باور کرو گے اگر میں کہوں گا
کہ فوجِ گراں پشتِ کوہِ صفا پر
پڑی ہے کہ لوٹے تمہیں گھات پا کر
کہا تیری ہر بات کا یاں یقیں ہے
کہ بچپن سے صادق ہے تو اور امیں ہے
کہا گر مری بات یہ دلنشیں ہے
تو سمجھو خلاف اس میں اصلاً نہیں ہے
کہ سب قافلہ یاں سے ہے جانے والا
ڈرو اس سے جو وقت ہے آنے والا

غور فرمایئے کہ آنحضرت ﷺ جو سید الرسل ہیں آپؐ نے اپنی ذاتی زندگی کو اپنی نبوت کی دلیل بنایا۔ اگر آپؐ مکہ معظمہ کے رہنے والے وہیں کے پلے بڑھے اور ان لوگوں کے جانے پہچانے نہ ہوتے اور آپؐ قریش ہی کے ایک فرد نہ ہوتے تو آپؐ ان سے یہ سوال کیسے کر سکتے تھے۔ اسی حکمت و دانش کے تحت اللہ تعالیٰ نے ہر نبیؑ اور رسولؑ کو اسی قوم اور انہیں بستیوں کی طرف رسولؑ بنا کر بھیجا جن کی طرف اس کی بعثت ہوئی تھی۔

اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا سے استدلال

اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا۔ الخ، سے دو باتیں فرمائی جا رہی ہیں کہ تمہیں یہ اعتراض ہے کہ نبی کریم ﷺ کو مکہ معظمہ کے باسیوں میں سے ایک باسی ہونے کے باوجود رسول بنا کر کیوں اٹھا دیا۔ پوچھا گیا ہے کہ کیا تمہیں اس زمین کے گوشوں میں چلنے پھرنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ کیا تم ان کھنڈرات پر سے نہیں گزرے جن میں رہنے والی قومیں اللہ تعالیٰ کے عذاب کا شکار ہو چکی ہیں۔ کیا تم ان کی تاریخ سے واقف نہیں ہو، کیا تمہیں معلوم نہیں کہ ان کی طرف آنے والے پیغمبران قوموں سے نسلی رشتہ رکھتے تھے۔ وہ قومیں اگر انسانوں پر مشتمل تھیں تو یہ بھی انہیں میں سے ایک انسان تھے۔ تم بتاؤ موسیٰؑ آخر کون تھے، اسماعیل کن کا نام ہے۔ مسیح کس شخصیت کو کہتے ہیں۔ کیا یہ انسان نہیں تھے اور کیا یہ انہیں بستیوں کے رہنے والے نہیں تھے؟ اگر تم ان بستیوں کی تاریخ سے واقف ہو تو پھر تمہیں اس پر اعتراض کیوں ہے کہ محمد ﷺ کو نبوت کیوں دی گئی ہے۔

Marfat.com

دوسری بات یہ فرمائی جارہی ہے کہ تمہیں درحقیقت اس بات پر غور کرنا چاہئے کہ جن قوموں کی طرف اللہ تعالیٰ کے رسول آئے اور پھر ان قوموں نے تمہاری طرح کج بحثیوں اور کٹ حجتیوں سے کام لے کر ایمان لانے سے انکار کردیا۔ نتیجہ اس کا تمہارے سامنے ہے کہ ان بستیوں کے کھنڈرات، ان کے تباہ شدہ آثار خود اپنا نوحہ کہتے ہوئے سنائی دیتے ہیں۔ وہاں کا ذرہ ذرہ یہ گواہی دیتا ہے کہ جو لوگ دنیا پر مرتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کے رسولوںؑ پر ایمان نہیں لاتے ان کی دنیا ان کیلئے دار العذاب بن جاتی ہے۔ لیکن جو لوگ اللہ تعالیٰ کے رسول پر ایمان لا کر اپنی زندگیاں سنوار لیتے ہیں ان کی دنیا بھی سنور جاتی ہے اور آخرت کا گھر جو دنیا سے بدرجہا بہتر ہے وہ تو ہے ہی ان لوگوں کیلئے جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتے اور اس سے ڈرتے ہیں۔ کیا تم ان باتوں پر غور نہیں کرتے۔

حَتّٰٓی اِذَا اسْتَیْـَٔسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْٓا اَنَّھُمْ قَدْ کُذِبُوْا جَآءَھُمْ نَصْرُنَا ۙ فَنُجِّیَ مَنْ نَّشَآءُ ۭ وَلَا یُرَدُّ بَاْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِیْنَ ﴿۱۱۰﴾ (سورۃ یوسف : ۱۱۰)

(حتیٰ کے جب رسولؑ اپنی قوموں سے مایوس ہو گئے اور لوگوں نے یہ گمان کیا کہ ان کو جھوٹ ڈراوے سنائے گئے تو ان کو ہماری مدد آ پہنچی۔ پس نجات ملی ان کو جن کو ہم نے نجات دی اور ہمارا عذاب مجرموں سے ٹالا نہیں جاسکتا۔)

نبی کریم ﷺ قریشِ مکہ کو ان کی سرکشی اور کفر پر ضد کو دیکھتے ہوئے جب اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈراتے تو بجائے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرنے کے وہ اس کا تمسخر اڑاتے اور جیسے جیسے اس پر دن گزرتے جاتے، ویسے ویسے ان کا تمسخر تیز ہوتا جاتا۔ وہ مسلمانوں کو یہ کہہ کر چڑاتے کہ جس عذاب سے تم ہمیں ڈراتے ہو، آخر وہ عذاب کہاں رکا ہوا ہے، وہ ہم پر پہنچنے میں کیوں نہیں آتا۔ اس آیتِ کریمہ میں براہِ راست قریشِ مکہ کو جواب دینے کی بجائے نزولِ عذاب کا اصول بیان کیا جارہا ہے کہ عذاب کوئی معمولی بات نہیں جو معمولی باتوں پر آجائے۔ یہ تو قوموں کو جڑ سے اکھاڑ دینے کا ذریعہ ہے۔ اس لئے اس کا فیصلہ، فیصلہ کن وقت پر ہوتا ہے اور وہ وقت وہ ہوتا ہے جس کا ذکر اس آیتِ کریمہ میں کیا گیا ہے۔

عذابِ الٰہی کے باب میں اللہ تعالیٰ کا قانون

اللہ تعالیٰ کے رسولؑ دنیا کی اصلاح کیلئے تشریف لاتے ہیں اور ان کی اصلاح کے سلسلے میں اپنی ہمتوں اور توانائیوں کا آخری قطرہ تک نچوڑ دیتے ہیں۔ لوگوں سے ان کی رحمت اور مودّت کا عالم یہ ہوتا ہے کہ وہ بجائے اللہ تعالیٰ سے عذاب کی دعا کرنے کے وہ اپنی قوم کو عذاب سے بچانے کیلئے دعائیں کرتے ہیں۔ لیکن جب وہ ایک خاص مرحلے پر پہنچ کر محسوس کرتے ہیں کہ اب ان لوگوں میں قبولیتِ ایمان کے تمام امکانات دم توڑنے لگے ہیں اور انہوں نے مکمل طور پر خودکشی کا فیصلہ کرلیا ہے تب وہ اللہ تعالیٰ سے قوم پر عذاب نازل کرنے کی دعا کرتے ہیں۔ اسی کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ جب رسول اپنی قوم سے مایوس ہو جاتے ہیں یعنی ان کی کوششیں دم توڑنے لگتی ہیں اور انہیں کہیں بھی اپنی دعوت کا جواب ملنے کی امید باقی نہیں رہ جاتی۔ جس طرح دودھ بلونے والی خاتون جب تک مکھن کی آخری پھٹکی کی بھی امید رکھتی ہے تو وہ دودھ بلونے سے رکتی نہیں۔ لیکن جب وہ یہ دیکھتی ہے کہ جتنا مکھن تھا وہ نکل آیا باقی چھاچھ کے سوا اور کچھ نہیں تو پھر وہ مایوس ہو کر ہاتھ چلانا بند کردیتی ہے اور چھاچھ پھینک دیتی ہے کیونکہ مقصود مکھن نکالنا تھا۔ جب وہ نکل آیا اور مزید مکھن کی امید نہ رہی تو اب ہاتھ ہلانا بیکار ہے۔ یہی حال پیغمبروںؑ کی دعوت و تبلیغ کا بھی ہے۔ جب انہیں لوگوں کی قبولیت کی طرف سے مایوسی ہونے لگتی ہے اور لوگوں کی جرأتوں کا عالم یہ ہوتا ہے کہ وہ بار بار پیغمبرؑ پر طنز کرتے ہیں کہ تم جو ہمیں عذاب کے ڈراوے دیتے رہے ہو وہ جھوٹ کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ تب اللہ تعالیٰ کی جانب سے مدد آجاتی ہے یعنی اس کی طرف سے عذاب نازل ہو جاتا ہے۔ لیکن عذاب اچانک نہیں آتا کہ پیغمبر اور اس پر ایمان لانے والے بھی عذاب کی گرفت میں آجائیں بلکہ پیغمبر اور اس پر ایمان لانے والوں کو نکال لیا جاتا ہے۔ اب عذاب اس شان سے اترتا ہے کہ ساری دنیا مل کر بھی اس کا راستہ نہیں روک سکتی۔ مجرم اس کا مقابلہ کرنے کی کوشش کریں یا آہ وزاری کریں اسے واپس نہیں کیا جاسکتا۔ جو قوم اس کا ہدف بنتی ہے وہ اس قوم کی جڑ اکھاڑ دیتا ہے۔ جس سرزمین پر وہ اترتا ہے وہ سرزمین مدتوں نحوست اگلتی ہے، اس کے گردوپیش میں بربادی کے سوا کچھ نہیں رہ جاتا۔

Marfat.com

لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ۭ مَا كَانَ حَدِيْثًا يُّفْتَرٰى وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿١١١﴾ (سورۃ یوسف : ۱۱۱)

(ان کی سرگزشتوں میں بڑا سامانِ عبرت ہے عقل والوں کیلئے یہ قرآنِ کریم کوئی گھڑی ہوئی چیز نہیں ہے بلکہ تصدیق ہے اس چیز کی جو اس سے پہلے موجود ہے اور تفصیل ہے ہر چیز کی اور ہدایت و رحمت ہے ایمان لانے والوں کیلئے۔)

قرآن کی حقیقت اور اس میں بیان کردہ واقعات کی حیثیت

اس آیتِ کریمہ میں سب سے پہلی بات یہ فرمائی گئی ہے کہ حضرت یوسفؑ علیہ السلام کے واقعات دیگر انبیائے کرام کے واقعات کا حصہ ہیں کیونکہ تمام انبیاء کرام ایک ہی سلسلۂ ہدایت کی کڑیاں ہیں اور ان کے واقعات بھی ایک ہی مقصد کی سلک میں پروئے ہونے کی وجہ سے باہم پیوست ہیں۔ ان واقعات کو قرآنِ کریم تاریخ کے طور پر بیان نہیں کرتا اور نہ یہ مقصد ہے کہ لوگ ان سے تفریح حاصل کریں بلکہ ان واقعات میں سے ان باتوں کو چھانٹ چھانٹ کر بیان کیا جاتا ہے جن میں انسانوں کیلئے ہدایت و عبرت ہے۔ عبرت کے حصول کیلئے چونکہ عقلِ سلیم کی ضرورت ہے اس لئے یہ واقعات عقل والوں کیلئے تو عبرت کا باعث ہوتے ہیں باقی لوگ شاید ان سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ جب قریشِ مکہ کے جواب میں آنحضرت ﷺ نے حضرت یوسفؑ علیہ السلام کی ساری زندگی کے وہ اہم واقعات جن میں ہمارے لئے عبرت و نصیحت تھی ایک ہی نشست میں سورۂ یوسفؑ کی صورت میں بیان کر دیئے تو قریشِ مکہ نے ایمان لانے کی بجائے یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ پوری سورت در حقیقت محمد ﷺ نے خود اپنی طرف سے گھڑ لی ہے۔ اس لئے قرآنِ کریم نے اس کا ابطال کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ کوئی گھڑی ہوئی باتیں نہیں ہیں بلکہ یہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ ہیں اور اگر مزید اطمینان چاہتے ہو تو پھر تم پہلی آسمانی کتابیں اٹھا کے دیکھو ان میں انجیل، تورات اور زبور تو تمہارے سامنے ہیں۔ ان میں جو چیزیں تحریف اور ترمیم سے بچ گئی ہیں، قرآنِ کریم ان کی تصدیق کرتا ہے۔ اس لحاظ سے قرآنِ کریم ایک ایسی کسوٹی ہے جس سے ہم صحیح یا غلط کا فیصلہ کر سکتے ہیں اور مزید یہ کہ ہدایت و عبرت کیلئے جس جس چیز کی ضرورت ہے قرآنِ کریم نے اس کی پوری تفصیل بیان فرما دی ہے۔ ہر چیز کی تفصیل سے مراد ہدایت کی ہر چیز کی تفصیل ہے جو قرآنِ کریم کا اصل موضوع ہے۔ اس کا یہ مقصود ہرگز نہیں کہ دنیا بھر کے علوم و فنون کی تفصیل قرآنِ کریم میں موجود ہے۔ مزید فرمایا کہ در حقیقت یہ کتاب انسانوں کی ہدایت کیلئے آئی ہے۔ اس میں انفرادی ہدایت بھی ہے اور اجتماعی ہدایت بھی۔ اس میں معاشرتی اصول بھی ہیں اور معاشی اصول بھی، اس میں سیاست کے آداب بھی سکھائے گئے ہیں اور حکومت کے طریقے بھی، اس میں قوم کی شیرازہ بندی کیلئے آئین اور دستور کی ضرورت کو بھی پورا کیا گیا ہے اور احساسات کی پاکیزگی کیلئے پند و نصائح سے بھی کام لیا گیا ہے۔ انسان جب ایمان لانے کے بعد قرآنِ کریم کی تعلیمات سے مستفید ہونے کی کوشش کرتا ہے تو قرآن اس کی زندگی کی ہدایت بن جاتا ہے۔ اور جب وہ اس ہدایت کے مطابق ہر شعبۂ زندگی کو استوار کرنے کی کوشش کرتا ہے تو یہ قرآن اس کیلئے رحمت ثابت ہوتا ہے۔

صدق اللہ العظیم

Marfat.com

Marfat.com

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْآ اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ

کیا ایمان والوں کے لیے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

هُدًى لِّلنَّاس

سُوْرَةُ الرَّعْدِ

Marfat.com

تعارف

سُوْرَةُ الرَّعْدِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سورت کا نام

اس سورۃ کا نام الرعد ہے۔اس کی آیت نمبر 13 میں الرعد کا لفظ آیا ہے اسی نسبت سے اس کا نام الرعد رکھ دیا گیا ہے۔یہ بات اس سے پہلے ایک سے زیادہ مرتبہ واضح کی جا چکی ہے کہ ہر سورت کے اوپر جو لفظ لکھا گیا ہے وہ سورت کا نام ہے عنوان نہیں۔کسی بھی مضمون یا کسی باب یا کسی کتاب کی پیشانی پر جو لفظ لکھا جاتا ہے وہ بالعموم اس کا عنوان ہوتا ہے اور اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ اس مضمون میں اس عنوان سے متعلق بحث کی جائے گی اور اس کے مالہ وما علیہ کو واضح کیا جائے گا لیکن ہر سورت کی پیشانی پر جو لفظ لکھا گیا ہے وہ عنوان نہیں بلکہ نام ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ یہ لفظ یا یہ نام اس سورت کی شناخت ہے۔جب بھی سورت کے حوالے سے یہ نام لیا جائے گا تو مراد اس سے یہ سورت ہوگی۔اس کا معنی مراد نہیں ہوگا کیونکہ اسم کا معنی نہیں دیکھا جاتا، اس کا معنی اور مفہوم خود اس کا مسمّٰی ہوتا ہے۔چنانچہ اسی اصول کے تحت الرعد بھی اس سورت کا نام ہے۔اس کی آیات کی تعداد 43 ہے۔یہ 855 کلمات اور 3506 حروف پر مشتمل ہے اور اس کے 6 رکوع ہیں۔

نزول

یہ سورت مکی ہے یا مدنی یعنی یہ ہجرت سے پہلے نازل ہوئی ہے یا ہجرت کے بعد۔علماء میں اس حوالے سے مختلف رائے پائی جاتی ہیں۔حضرت ابن عباسؓ سے دونوں قول مروی ہیں۔اس لئے بعض مصاحف میں اس سورت کو مدنی لکھا گیا ہے۔علامہ آلوسیؒ نے اس اختلاف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ مجموعی طور پر یہ سورت مکی ہے لیکن اس کی بعض آیات ہجرت کے بعد نازل ہوئی ہیں۔اس لئے ان کی نسبت سے بعض لوگوں نے اسے مدنی قرار دے دیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس سورت کے مضامین مکی سورتوں سے بہت مناسبت رکھتے ہیں۔اس کے بنیادی موضوعات وہی ہیں جو مکی سورتوں کے موضوعات ہیں۔اس لئے اس کے اندرونی قرائن یہ بتانے کیلئے کافی ہیں کہ یہ سورت مدنی نہیں بلکہ مکی ہے۔بعض اہل علم کے نزدیک تو اس کی کوئی آیت بھی مکی نہیں ہے۔اس بارے میں حتمی بات کہنا بہت مشکل ہے لیکن اگر انداز بیان اور مضمون بجائے خود ایک مستحکم قرینہ کی حیثیت رکھتا ہے تو پھر اس بات میں بڑا وزن محسوس ہوتا ہے۔

زمانہ نزول

رکوع 4 اور رکوع 6 کے مضامین شہادت دیتے ہیں کہ یہ سورت بھی اسی دور کی ہے جس میں سورۂ یونس، ہود اور اعراف نازل ہوئی ہیں۔یعنی زمانۂ قیام مکہ کا آخری دور۔اس سورت کو غور سے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کو دین کی دعوت دیتے ہوئے ایک عرصۂ دراز گزر چکا ہے اور مشرکین مکہ بجائے اس کے کہ اس دعوت کیلئے اپنی آغوش کھول دیں وہ روز بروز اپنی مخالفتوں اور ایذا رسانیوں میں اضافہ کرتے چلے جا رہے ہیں۔ان

Marfat.com

کی رستم رانیوں سے نہ آنحضرت ﷺ کی ذات گرامی محفوظ ہے اور نہ مسلمانوں کیلئے کوئی جائے پناہ۔ مسلمان اپنی جان اور ایمان بچانے کیلئے ایک سے زیادہ مرتبہ دوسرے ممالک کی طرف ہجرت کر چکے ہیں۔ آپ خونِ جگر پی پی کر نہایت ہمدردی اور خیر خواہی سے اللہ تعالیٰ کا دین مشرکین کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ وہ بجائے اس کے کہ سنجیدگی سے غور کریں ان کے مطالبات روز بروز بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ وہ یہ چاہتے ہیں کہ ہمیں کوئی ایسا معجزہ دکھایا جائے جسے دیکھنے کے بعد ہمارے لئے ایمان لانے کے سوا کوئی چارہ نہ رہے اور مسلمان بھی چونکہ مخالفین کی اذیت رسانیوں سے تھکے جا رہے ہیں اس لئے وہ بھی دل سے یہ چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کیلئے تو ایسی کوئی بات مشکل نہیں۔ کیا حرج ہے اگر ان کے سامنے ایسی کوئی نشانی ظاہر کر دی جائے لیکن پروردگار بار بار ان کے سامنے اپنی سنت اور اپنے قانون کو واضح کر رہا ہے کہ ہم کسی قوم کو ایمان دینے کیلئے ایسی کوئی نشانی دکھانا پسند نہیں کرتے جس سے وہ مجبور ہو کر ایمان لے آئیں کیونکہ جس طرح جبراً کسی کو ایمان سے محروم نہیں رکھا جا سکتا۔ اسی طرح بالجبر کسی کو ایمان کی دولت نہیں دی جا سکتی۔ یہ تو انسان کی انسان کی قوتِ تمیز اور اس کے فہم و شعور کا امتحان ہے۔ وہ اپنی آزادانہ رائے سے خیر کا راستہ اختیار کرتا ہے یا شر کا۔ اور مزید یہ بات بھی کہ یہ لوگ جو آئے دن نئی سے نئی نشانیوں کا مطالبہ کرتے ہیں ان کے پیشِ نظر یہ بات نہیں ہے کہ وہ اس نشانی کی مدد سے حق کو پہچاننا چاہتے ہیں۔ اگر آدمی حق کی پہچان کیلئے نشانیوں کی تلاش میں ہو تو کائنات کا ذرہ ذرہ اس کیلئے نشانی ہے۔ ہوا کا ہر جھونکا اسے کسی کی خبر دیتا ہے، سورج کی ہر کرن کسی کا پیغام بن کر آتی ہے۔ یہ لوگ تو محض آنحضرت ﷺ کو زچ کرنے کیلئے عجیب و غریب نشانیوں کا مطالبہ کرتے ہیں۔ یہ اور اس طرح کے دوسرے مضامین جو اس سورت میں بیان ہوئے ہیں وہ یہ بتانے کیلئے کافی ہیں کہ اس سورت کا زمانہ نزول قیامِ مکہ کا آخری زمانہ ہے۔

مرکزی مضمون

اس سورت کا مرکزی مضمون وہی ہے جو باقی مکی سورتوں کا ہے۔ یعنی اس میں بنیادی اسلامی عقائد پر زور دیا گیا ہے کیونکہ عقیدہ وہ بنیاد ہے جس پر کسی بھی نظریاتی عمارت کی دیواریں اٹھائی جاتی ہیں۔ بنیاد جتنی مضبوط ہوگی وہ اتنی ہی بڑی عمارت کا بوجھ اٹھا سکے گی۔ اسلام کے بنیادی عقائد توحید، رسالت اور آخرت ہیں۔ چنانچہ اس سورت میں دیگر مکی سورتوں کی طرح متنوع دلائل سے ان عقائد کو ثابت کیا گیا ہے۔ ان سے پھوٹنے والے مکارمِ اخلاق اور خصائل حمیدہ کو نمایاں کیا گیا ہے۔ اس کے مقابل میں کفر اور شرک کی مذمت کی گئی ہے اور ان کے مفاسد کو کھول کر بیان کیا گیا ہے۔

کیونکہ اسم یوں تو یہ سورت تمام مکی سورتوں سے ہم آہنگ ہے، لیکن سورۂ یوسف سے اس کی مناسبت بالکل ایسے ہے جیسے دو جڑواں چیزیں ہوتی ہیں کہ دونوں سورتوں میں بنیادی عقائد کے اثبات کے ساتھ ساتھ ان کرداروں کو نمایاں کیا گیا ہے جو ان عقائد کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ سورۂ یوسف میں ان کرداروں اور ان کی کامیابیوں کو حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعات کی صورت میں بیان فرمایا گیا ہے اور اس سورت میں عقل و فطرت کے دلائل سے انھیں مبرہن کیا گیا ہے۔

بلاشبہ اس سورت میں منطقی استدلال سے کام لیا گیا ہے لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ اس سے صرف دماغوں کو مطمئن کرنا مقصود ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ کہیں تخویف اور ترہیب سے کام لیا گیا ہے۔ اور کہیں ترغیب اور مشفقانہ تلقین سے کام لیا گیا ہے تاکہ عام لوگ جو منطقی استدلال سے زیادہ فائدہ نہیں اٹھا سکتے، ایمان کے قریب آ سکیں۔

زندگی کے سدھار کیلئے کوئی بھی نظریہ یا کسی نظام پر مبنی دعوت کو لے کر جب آپ اٹھتے ہیں تو جہاں قدم قدم پر آپ کی مخالفت ہوتی ہے وہیں آپ کی دعوت میں شبہات بھی پیدا کئے جاتے ہیں اور اعتراضات کی دھول بھی اڑائی جاتی ہے۔ چنانچہ اس سورت میں ہم دیکھتے ہیں کہ دعوت کا سیل اپنی فطری بہاؤ کے ساتھ رواں دواں بھی رہتا ہے، لیکن چلتے چلتے کبھی رک کر شبہات کا ازالہ بھی کیا جاتا ہے اور اعتراضات کے جوابات بھی دیے جاتے ہیں لیکن ان کا انداز ایسا حکیمانہ ہوتا ہے کہ شبہ دور بھی ہو جاتا ہے اور اعتراض کا جواب بھی آ جاتا ہے۔ لیکن اس کی تلخی اپنا اثر دکھانے سے عاجز رہ جاتی ہے۔ جس آدمی میں تھوڑی سی بھی سنجیدگی اور عقل کی پختگی پائی جاتی ہے وہ یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہتا کہ داعی الی اللہ کے لب و لہجہ میں جو درد پایا جاتا ہے اس میں میری ذات کی بھلائی کے سوا کچھ نہیں۔ اور جب حالات قابو سے باہر ہونے لگتے ہیں اور مسلمان پلٹ پلٹ کر اللہ تعالیٰ کی رحمت کو تلاش کرنے لگتے ہیں تو پھر انھیں سورتوں میں ایسی آیات بھی نازل کی گئی ہیں جن میں انھیں تسلی دی گئی ہے اور ساتھ یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ مستقبل کی کامرانیاں تمھارے لئے ہیں۔

Marfat.com

اٰيَاتُهَا ۴۳	سُوْرَةُ الرَّعْدِ مَكِّيَّةٌ	رُكُوْعَاتُهَا ٦

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓمّٓرٰ قف تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ ط وَالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ
وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝١ اَللّٰهُ الَّذِيْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ
بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ
وَالْقَمَرَ ط كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ط يُدَبِّرُ الْاَمْرَ يُفَصِّلُ
الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ ۝٢ وَهُوَ الَّذِيْ مَدَّ الْاَرْضَ
وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْهٰرًا ط وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ
فِيْهَا زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ ط اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ
لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝٣ وَفِي الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّجَنّٰتٌ مِّنْ
اَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ وَّنَخِيْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَيْرُ صِنْوَانٍ يُّسْقٰى بِمَآءٍ
وَّاحِدٍ قف وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ فِي الْاُكُلِ ط اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ
لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝٤ وَاِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ ءَاِذَا
كُنَّا تُرٰبًا ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ط ۝٥ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ ج
وَاُولٰٓئِكَ الْاَغْلٰلُ فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ ج وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ج هُمْ

Marfat.com

فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۞٥ وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ وَقَدْ
خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثُلٰتُ ۭ وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ
عَلٰي ظُلْمِهِمْ ۚ وَاِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيْدُ الْعِقَابِ ۞٦ وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّ
لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ۞٧

رکوع: ۱ (ا ل م ر۔ یہ کتابِ الٰہی کی آیات ہیں اور جو کچھ تمھارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے وہ بالکل حق ہے لیکن اکثر لوگ نہیں مان رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے آسمانوں کو بلند کیا بغیر ایسے ستونوں کے جو تمہیں نظر آئیں، پھر وہ اپنے تختِ سلطنت پر جلوہ فرما ہوا اور اس نے سورج اور چاند کو مسخر کیا۔ ان میں سے ہر ایک، ایک وقتِ معین کیلئے گردش کرتا ہے۔ وہی کائنات کا انتظام فرماتا ہے، وہ نشانیاں کھول کھول کر بیان کرتا ہے، شاید کہ تم اپنے رب کی ملاقات کا یقین کرو۔ اور وہی ہے جس نے زمین کو بچھایا اور اس میں پہاڑ اور دریا بنائے اور ہر قسم کے پھلوں کی دو دو قسمیں اس میں پیدا کیں۔ وہ رات کو دن پر اڑھا دیتا ہے، بیشک ان چیزوں کے اندر ان لوگوں کیلئے نشانیاں ہیں جو غور کریں۔ اور زمین میں پاس پاس زمین کے خطے ہیں، انگوروں کے باغات ہیں، کھیتی ہے اور کھجور کے درخت ہیں جن میں سے کچھ جڑواں ہیں اور کچھ اکہرے۔ سب ایک ہی پانی سے سیراب کئے جاتے ہیں لیکن ہم پیداوار میں ایک کو دوسرے پر ترجیح دے دیتے ہیں۔ بیشک اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کیلئے جو عقل سے کام لیں۔ اگر تمہیں تعجب کرنا ہے تو تعجب کے قابل لوگوں کا یہ قول ہے جب ہم مر کر مٹی ہو جائیں گے تو ہم از سرِ نو وجود میں آئیں گے، یہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کا انکار کیا، یہی لوگ ہیں جن کی گردنوں میں طوق پڑے ہوئے ہیں، یہی لوگ جہنمی ہیں اور جہنم میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور یہ لوگ خیر سے پہلے شر کیلئے آپ سے جلدی مچائے ہوئے ہیں حالانکہ گزر چکی ہیں ان سے پہلے عبرتناک مثالیں اور بیشک آپ کا رب ان کی زیادتیوں کے باوجود ان سے درگزر کرنے والا بھی ہے اور بیشک آپ کا رب سخت سزا دینے والا بھی ہے۔ (اور جن لوگوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا وہ کہتے ہیں کہ اس نبی پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں اتاری گئی، تم تو بس ایک خبردار کر دینے والے ہو اور ہر قوم کیلئے ایک ہادی ہے۔)

الٓمّٓرٰ ۣ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ ۭ وَالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۞١
(ا ل م ر۔ یہ کتابِ الٰہی کی آیات ہیں اور جو کچھ تمھارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے وہ بالکل حق ہے لیکن اکثر لوگ نہیں مان رہے ہیں۔) (سورۃ الرعد:۱)

Marfat.com

قرآنِ کریم اللہ تعالیٰ کا احسان بھی ہے اور وارننگ بھی

ا ل م ر۔ حروفِ مقطعات ہیں۔اس کی تفصیلی بحث ہم سورۃ البقرہ کے آغاز میں کرچکے ہیں۔اب یاددہانی کیلئے سورۃ البقرہ کو نکال کر دیکھ لیا جائے۔ تِلْکَ اٰیٰتُ الْکِتٰبِ۔ ’’تِلْکَ‘‘ اسمائے اشارہ میں سے ہے۔ان کی دو قسمیں ہیں،قریب اور بعید۔ہم سورۃ البقرہ کے آغاز میں ذٰلِکَ کے حوالے سے اسمائے اشارہ کی ان دونوں قسموں پر تفصیل سے عرض کرچکے ہیں کہ فصیح عربی میں اسمِ اشارہ قریب اور اسمِ اشارہ بعید کا کیا مفہوم ہے اور آیتِ کریمہ میں اسے کس مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے۔الکتاب سے مراد بعض لوگ مجموعۂ کتبِ آسمانی لیتے ہیں۔لفظ میں اگرچہ اس کی بھی گنجائش ہے لیکن حقیقت میں یہاں الکتاب سے مراد وہ کتاب ہے جس کے نزول کا پہلی آسمانی کتابوں میں وعدہ کیا گیا تھا اور بعض کتبِ الٰہی میں اس کی خصوصیات بھی بیان کی گئی تھیں۔یہاں الکتاب کے ذکر سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ایک تو یہ کہ مسلمانو! تمہیں اپنی قسمت پر ناز کرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر وہ کتاب نازل کی ہے اور یہ اس کتاب کی آیات ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے کسی زمانے میں انسانوں کی کسی نسل پر نازل کرنے کا وعدہ فرمایا تھا اور یہ بتلایا تھا کہ وہ کتاب آخری کتاب ہوگی،اس کے بعد آسمان زمین سے کبھی ہم کلام نہیں ہوگا۔اس کتاب کے نزول کے ساتھ وحیِ الٰہی کا سلسلہ رک جائے گا کیونکہ جس ذات بابرکاتؐ پر وہ کتاب نازل ہوگی وہ آخری نبیؐ اور رسولؐ ہوں گے۔اور جس امت کو اس کتاب کا حامل بنایا جائے گا وہ آخری امت ہوگی کیونکہ یہ کتاب اللہ تعالیٰ کی طرف سے آخری موعظت،آخری نصیحت،آخری ہدایت اور انسانی مسائل کے حل کیلئے آخری نسخۂ شفا بن کے آئے گی اور وہی کتاب بالآخر رحمت کا موجب ہوگی۔اس لئے اس پر ایمان لانے والوں کو اس حوالے سے اچھی طرح اپنی ذمہ داری کو محسوس کرنا ہوگا۔ اگر اس کتاب کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے اور اس کا حق ادا کرنے اور اس کے نفاذ میں کوئی کوتاہی کی گئی تو سوچ لیجیے امت کی قسمت پر اس کے کیا اثرات پڑ سکتے ہیں۔اس لحاظ سے دیکھا جائے یہ کتاب اگر ایک طرف اللہ تعالیٰ کا احسان ہے تو دوسری طرف ایک دھمکی بھی ہے کہ اس کا حق ادا کروگے اور اس کی ذمہ داریاں نبھاؤ گے تو پھر یہ دنیا بھی تمہاری اور آخرت بھی تمہاری۔اور اگر اس میں کوتاہی کروگے تو پھر سوچ لو کہ اس کا انجام کتنا خطرناک ہوگا۔اس میں مشرکینِ مکہ کیلئے تعریض بھی ہے کہ تم نے اس کتاب کو جس طرح تنقید کا نشانہ بنا رکھا ہے تمہارے لئے یہ دل لگی کا سامان ہے۔لیکن تمہیں اندازہ نہیں کہ تم اس کتاب کی عظمت کو نظرانداز کرکے ایک خوفناک انجام کی طرف بڑھ رہے ہو۔

یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت کیلئے جب بھی کوئی کتاب نازل فرمائی اور کسی رسول کو بھیجا تو اس پر اس آخری نبی کی صفات بھی اتاری گئیں۔ان تمام باتوں کا ذکر کیا گیا ہے جس سے آنے والے پیغمبر کی شناخت آسان ہوسکتی تھی۔اسی طرح یہ آخری کتاب جو آپؐ پر نازل کی جانی والی تھی اس کی ضروری صفات بھی ان پیغمبروں پر نازل کی گئیں اور پھر ان سے آنے والے پیغمبر اور اس پر اترنے والی کتاب پر ایمان لانے اور نصرت کرنے کا عہد لیا گیا۔اس آیتِ کریمہ میں اشاراتی انداز میں ان تمام باتوں کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔

قرآنِ کریم کی اہمیت

اس کتاب کی اہمیت کو واضح کرنے کیلئے مزید فرمایا اور اس میں خطاب آنحضرت ﷺ سے فرمایا گیا کہ جو کتاب آپؐ کی طرف نازل کی گئی ہے۔آپؐ کے واسطے سے آپؐ کے مخالفین کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اسے آپؐ کے رب نے نازل کیا۔اولاً تو اس کتاب کا اپنا شکوہ اور اس کے پیرایۂ بیان کی عظمت بجائے خود دل ہلادینے کیلئے کافی ہے۔لیکن جن خالی دماغوں پر اس کتاب کی عظمت نہیں کھلتی انہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ یہ کتاب ہم نے نازل کی ہے۔اور تمہیں ذرا رک کر مراقبہ کرنا چاہیے کہ ہم کون ہیں؟ ہم تمہارے خالق و مالک ہیں،ہم تمہارے رازق ہیں،تمہاری زندگی اور موت ہمارے قبضے میں ہے،ہم ساری کائنات کے شہنشاہِ مطلق ہیں،تکوینی طور پر کائنات کا ذرہ ذرہ ہمارے تابع فرمان ہے،ہماری قدرتوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں،ہمارا علم بے حد وسیع ہے،ہمارے لشکروں کی کوئی انتہا نہیں،ہماری رحمت ہر چیز پر غالب ہے۔اس لئے ہم کافروں کو بھی روزی دیتے ہیں لیکن جب ہمارا غضب بھڑکتا ہے تو اس سے بچانے والا بھی کوئی نہیں۔پتھروں کو چونکہ ہماری عظمت مستحضر ہے۔اس لئے ہماری خشیت اور ہمارے خوف سے ان میں شگاف پڑ جاتے

Marfat.com

ہیں، ان سے نہریں رواں ہوجاتی ہیں اور اگر یہ قرآن ہم کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو ہماری خشیت کی وجہ سے وہ ریزہ ریزہ ہوجاتا۔ لیکن تم کبھی اس بات پر غور نہیں کرتے کہ جو کتاب ہمارا پیغام ہے، اس کے ساتھ روا رکھا جانے والا اچھا یا برا سلوک وہ ہماری ذات کے ساتھ سلوک ہے۔ ہر پیغام اپنے پیغام بھیجنے والے کی نسبت سے عظیم ہوتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے عظیم پیغمبر ہیں لیکن فرعون کے دربار میں ان کی ہر بات کو خندۂ استہزا سے اڑا دیا جاتا ہے کیونکہ ان کے پیچھے کوئی قوت نہیں۔ اور فرعون کی لغویات کو بھی وزن دیا جاتا ہے کیونکہ وہ مصر کے تخت وتاج کا مالک ہے۔ قرآنِ کریم کی ایک ایک آیت انسانی دلوں پر اس لئے اثر انداز نہیں ہوتی کہ ہم اجنبی زبان میں اسے پڑھتے ہوئے نہ سمجھتے ہیں اور نہ اس طرف دھیان جاتا ہے کہ یہ کلام کس کا ہے۔ اس لئے پروردگار نے اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ہمیں دیکھو کہ ہم کیا ہیں یا قومِ عاد یا قومِ ثمود سے پوچھ لو کہ ہم استخفاف کرنے والوں سے کیا سلوک کرتے ہیں پھر شاید تمہیں اندازہ ہوسکے کہ قرآنِ کریم کی عظمت کیا ہے۔

مزید فرمایا کہ یہ بھی یاد رکھو کہ اس قرآنِ کریم میں جو بات ارشاد فرمادی گئی ہے وہ سرتاپا حق ہے۔ اس میں جس بات کی خبر دی گئی ہے وہ شدنی ہے۔ اس کا ہر دعویٰ ثابت، مدلل اور مبرہن ہے، لیکن اکثر لوگ قرآنِ کریم کی عظمت کو نہ سمجھتے ہوئے اور جو کچھ اس میں ارشاد فرمایا گیا ہے اس کی حقیقی قدر و قیمت کو نہ پہچانتے ہوئے اس پر ایمان نہیں لاتے۔

مکی سورتوں کے عمومی موضوعات

اگلی آیت سے چونکہ وہ دلائل شروع ہورہے ہیں جن سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ نبی کریم ﷺ جن باتوں کی طرف تمہیں بلا رہے ہیں، وہ باتیں بالکل برحق اور مسلمہ حقیقت ہیں۔ مکی سورتوں میں چونکہ ان باتوں کا بیان متعدد دفعہ آیا ہے اس لئے یہاں انھیں بیان نہیں کیا گیا۔ وہ تین باتیں ہیں جن کی طرف آپ دعوت دے رہے تھے۔ وہ یہ ہیں (1) کہ خدائی پوری کی پوری اللہ تعالیٰ کی ہے۔ کائنات میں اس کے سوا کوئی اور مالک نہیں۔ اس لئے اس کے سوا کوئی بندگی و عبادت کا مستحق بھی نہیں۔ (2) اس زندگی کے بعد دوسری زندگی بھی ہے جس میں ہم سب کو اپنے اعمال کی جوابدہی کرنی ہوگی۔ (3) میں اللہ تعالیٰ کا رسولؐ ہوں اور جو کچھ پیش کررہا ہوں اپنی طرف سے نہیں بلکہ خدا کی طرف سے پیش کررہا ہوں۔ یہی تین باتیں ہیں جنھیں ماننے سے لوگ انکار کررہے تھے اور انھیں تین باتوں کے اثبات کیلئے اور لوگوں کے شبہات و اعتراضات کو رفع کرنے کیلئے آئندہ آیات میں دلائل پیش کئے جارہے ہیں۔

اَللّٰہُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَھَا ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ کُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی ؕ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّکُمْ بِلِقَآءِ رَبِّکُمْ تُوْقِنُوْنَ ② (سورۃ الرعد : ۲)

(اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے آسمانوں کو بلند کیا بغیر ایسے ستونوں کے جو تمہیں نظر آئیں، پھر وہ اپنے تختِ سلطنت پر جلوہ فرما ہوا اور اس نے سورج اور چاند کو مسخر کیا۔ ان میں سے ہر ایک، ایک وقتِ معین کیلئے گردش کرتا ہے۔ وہی کائنات کا انتظام فرماتا ہے، وہ نشانیاں کھول کھول کر بیان کرتا ہے، شاید کہ تم اپنے رب کی ملاقات کا یقین کرو۔)

اللہ تعالیٰ کی مثالوں سے توحید و آخرت پر استدلال

قرآنِ کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ کہ مشرکینِ عرب اللہ تعالیٰ کے وجود کے منکر نہ تھے، وہ اللہ تعالیٰ ہی کو اپنا اور تمام کائنات کا خالق سمجھتے تھے۔ حقیقت میں اسی کو رزق رساں اور اسی کو مشکل اور مصیبت میں کام آنے والا جانتے تھے۔ اس لئے ان کا اصل جرم یہ نہیں تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے وجود یا اس کے خالق ہونے کے منکر تھے بلکہ ان کی خرابی یہ تھی کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہراتے تھے۔ چنانچہ بظاہر قرآنِ کریم ان آیات میں جو دلائل دے رہا ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس ذات کو تم اپنا خالق سمجھتے ہو اس کی یہ یہ شانیں ہیں، یہ اس کی صفات ہیں اور یہ اس کی قدرتیں ہیں اور یہ یہ اس کی مخلوقات ہیں اور اس طرح اسے اپنی مخلوقات پر گرفت حاصل ہے۔ تو جس خالق و مالک کی یہ شانیں ہوں اس

Marfat.com

کے ساتھ کسی اور کو شریک بنانے کا کیا جواز ہے اور اسے کائنات کا نظام چلانے کیلئے کسی اور کی شرکت کی کیا ضرورت ہے، لیکن اگر ان دلائل پر گہری نظر سے غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اس کائنات کا ایک ہی خالق و مالک اور ایک ہی متصرف اور ایک ہی مدبر ہے اسی طرح یہ دلائل اس بات پر بھی دلالت کرتے ہیں کہ اس پورے نظام کا ایک فرمانروا ہے۔ ہم اپنے چاروں طرف مخلوق کو دیکھتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس مخلوق کا ایک خالق ہے۔ ہم اپنے تمام اطراف میں ایک نظم اور ترتیب دیکھتے ہیں۔ اجرام فلکی میں ہمیں حیرت انگیز نظم نظر آتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نظم کا ایک ناظم ہے۔ ہمیں کائنات کا مشاہدہ اس نتیجے تک پہنچاتا ہے کہ تمام کائنات میں ایک تکوینی قانون کارفرما ہے جس نے ہر مخلوق کو باندھ رکھا ہے اور ہر مخلوق اس کی پیروی کرنے پر مجبور ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں ایک حکمران ہے جس نے سب پر اپنا قانون نافذ کر رکھا ہے کیونکہ یہ ممکن نہیں ہے کہ نظم بغیر ناظم کے، قانون بغیر حکمران کے، حکیم بغیر حکمت کے، ربوبیت بغیر رب کے اور مخلوق بغیر خالق کے ہو۔ اسے نہ عقلِ سلیم تسلیم کرتی ہے اور نہ دنیا کا چلن قبول کرتا ہے۔ کہنا یہ ہے کہ جو دلائل اس کی وحدانیت اور توحید پر دلالت کرتے ہیں وہی اس کے وجود پر بھی دلالت کرتے ہیں۔ اس لئے قرآنِ پاک کے دلائل اگر شرک کے ابطال کیلئے کافی ہیں تو وہی ملاحدہ کے الحاد کیلئے بھی شافی ہیں۔

اس آیتِ کریمہ میں روئے سخن چونکہ قریش کی طرف ہے اور میں عرض کر چکا ہوں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے وجود کے منکر نہ تھے۔ البتہ اس کی صفات میں دوسری قوتوں کو شریک مانتے تھے۔ اس لئے ان کے معتقداتِ باطلہ کو دیکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی ذات کو زیرِ بحث لانے کی بجائے اللہ تعالیٰ کی صفات کے حوالے سے بات کی جا رہی ہے۔ اور بطورِ خاص اس کی عظیم قدرت و حکمت کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے۔ ارشاد فرمایا گیا ہے: اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے آسمانوں کو اس طرح بلند فرمایا ہے کہ ان کے قیام کیلئے کہیں بھی ستون کھڑے دکھائی نہیں دیتے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آسمانوں کی چھت اس طرح تانی گئی ہے کہ وہ ایسے ستونوں پر کھڑی ہے جو دکھائی نہیں دیتے۔ عمد، عماد کی بھی جمع ہے اور عمود کی بھی۔ کس قدر حیرت انگیز بات ہے کہ یہ عظیم شامیانہ ظاہری ستونوں پر نہیں بلکہ جذب و کشش کے ایسے ستونوں پر کھڑا ہے جسے دیکھنے سے نگاہیں عاجز ہیں اور صرف آسمان ہی کیا بے شمار اجرامِ فلکی ہیں جو آسمان سے متعلق ہیں۔ ان میں سے ایک ایک کرّہ اپنے حجم میں اس قدر عظیم ہے کہ زمین اس کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتی اور اس فضائے بسیط میں کوئی سہارا ان کو تھامنے والا نہیں۔ ایک غیر محسوس طاقت نے انہیں ان کے مقام اور مدار میں روک رکھا ہے جسے دیکھنے اور سمجھنے سے عقل عاجز ہے۔ پھر ان آسمانوں کی وسعتوں اور بلندیوں کو آج تک کوئی نہ جان سکا۔ اللہ تعالیٰ کی کتابیں ہمیں یہ علم دیتی ہیں کہ اس فضائے بسیط کے اوپر سات آسمانوں کا وجود ہے، لیکن سائنس ابھی تک اس کا ادراک نہیں کر سکی۔ البتہ بعض سائنسدانوں کا یہ کہنا کہ سرے سے آسمانوں کا کوئی وجود نہیں، یہ سراسر جہالت کی دلیل ہے کیونکہ اہلِ علم کے نزدیک یہ بات مُسلّم ہے کہ عدمِ علم عدمِ وجود کو مستلزم نہیں ہوتا۔ سائنس اگر اب تک آسمانوں کے وجود کا ادراک نہیں کر سکی تو اسے اپنی بضاعتی کا اعتراف کرنا چاہیے نہ کہ اسے دلیل بنا کر آسمانوں کے وجود سے انکار کر دیا جائے۔ سائنس کی نارسائی کا عالم تو یہ ہے کہ فضائے بسیط میں آج تک سائنس جن کُرّوں کو دریافت کر چکی ہے اس کے بارے میں بھی وہ کیا جانتی ہے۔ اگرچہ انسان خلاء میں کمندیں ڈال چکا ہے لیکن ابھی تک خلائی علم کی ابجد میں گھوم رہا ہے۔ اس کے اپنے اعتراف کے مطابق کتنے ستارے ہیں جن کی روشنی آج تک زمین پر نہیں پہنچ سکی۔ اس سے کائنات کی وسعتوں کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ بھی اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اس کے مقابلے میں انسانی علم کس قدر درماندہ اور نارسا ہے۔

ایک باطل عقیدہ کی تردید

ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ ''پھر وہ اپنے تختِ سلطنت پر جلوہ فرما ہوا'' اس جملے سے پروردگار نے مشرکینِ مکہ کے ایک باطل عقیدہ کی تردید فرمائی ہے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایک ایسی کائنات جس کے اور چھور کا کوئی اندازہ نہیں، وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا شاہکار ہے کیونکہ وہی کائنات کی ہر چیز کا خالق و مالک ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کائنات کو اس کی وسعتوں سمیت پیدا کرنے کے بعد کہیں چھپ کر بیٹھ گیا ہے۔ اب اس کے انتظام و انصرام سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اور ویسے بھی اگر عقل سے سوچا جائے تو پوری کائنات میں بکھری ہوئی مخلوقات کی متنوع ضرورتوں

Marfat.com

ورنگارنگ معاملات کی دیکھ بھال اور فراہمی ایک ذاتِ خداوندی سے کس طرح ممکن ہے۔ اس نے یقیناً اپنے بہت سے اختیارات ان قوتوں کے حوالے کردیے ہیں جو اس کے قرب کے حامل ہیں۔ اس لئے اپنی ضرورتوں کو حاصل کرنے اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کیلئے ضروری ہے کہ ہم ان قوتوں کو خوش رکھنے کی کوشش کریں جن کے ہاتھوں میں اللہ تعالیٰ نے اپنے اختیارات دے رکھے ہیں۔ چنانچہ وہ تمام مخلوقات کے معاملات کی دیکھ بھائی کر رہی ہیں اور اللہ تعالیٰ کائنات کے کسی گوشے میں آرام فرمارہا ہے۔ اور یا اپنے عرشِ معلٰی پر دادِ حکومت دے رہا ہے۔ اس گمراہی کی تردید میں ارشاد فرمایا: کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات کی تمام مخلوقات کو پیدا کر کے دوسروں کے رحم وکرم پر نہیں چھوڑا بلکہ کائنات کی تخلیق کے ساتھ ہی وہ تختِ حکومت پر جلوہ افروز ہوا۔ یعنی تخلیق اور کائنات کا نظام سنبھالنے میں کوئی فاصلہ نہیں ہے۔ ادھر تخلیق مکمل ہوئی، ادھر اس کے ایک ایک گوشے کا انتظام سنبھال لیا گیا۔ کیونکہ جو ذات اس کائنات کی خالق ہے اور مخلوقات کو پیدا کرنے والی ہے وہی ان کی رب اور حاکم بھی ہے اور وہ اپنے تختِ سلطنت سے اپنی تمام رعایا اور مخلوق کی حالت کو دیکھ بھی رہی ہے اور ان کی ضرورتوں کو پورا بھی کر رہی ہے۔ تو جو ذات تختِ سلطنت پر فائز ہو کر مکمل قدرت وقوت کے ساتھ نظامِ حکومت چلا رہی ہے اسے کیا ضرورت ہے کہ وہ اپنی خدائی میں کسی کو شریک کرے۔ اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ پوری کائنات کا نظام تنہا نہیں چلاسکتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو عاجز سمجھتا ہے حالانکہ عجز اور ناتوانی خدائی صفات کے بالکل برعکس صفات ہیں۔ جو عاجز ہوگا وہ خدا نہیں ہوسکتا، جس کی قدرت کہیں جاکے رک جاتی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ادھورا خدا ہے۔ پھر یہ بتانے کیلئے کہ اللہ تعالیٰ کس طرح پوری کائنات کا نظام چلا رہا ہے اور کس طرح اس کے احکام کے سامنے ایک ایک ذرہ بے بس اور سرتاپا اطاعت ہے۔ ارشاد فرمایا: وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ''اور اس نے سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے، یعنی ایک قانون کا پابند بنایا ہے۔'' یعنی اگر تم یہ دیکھنا چاہو کہ کس طرح کائنات کی ایک ایک چیز اس کے احکام کی تابع ہے اور کوئی چھوٹی بڑی طاقت ان کے احکام سے سرتابی نہیں کرسکتی تو تم سورج اور چاند کو دیکھو جو روزانہ تمہاری آنکھوں کے سامنے چمکتے اور ڈوب جاتے ہیں۔ تمہارے دن کی ہماہمی سورج کے وجود سے ہے اور تمہاری شب کی لذت وگداز چاند کی چاندنی سے ہے۔ انسان کا تمام وظیفۂ حیات اور سرگرمیٔ کار سورج اور چاند کے طلوع و غروب سے ہے۔ سورج تو اللہ تعالیٰ کی ایک ایسی مخلوق ہے جس سے ہماری زندگی کا چولہا جلتا ہے، اسی سے ہماری کھیتیاں پکتی ہیں اور ہماری خوراک کا نظام ہوتا ہے، یہی سمندر سے ہمارے لئے بادل اٹھاتا ہے جو زمین کی سیرابی کا کام کرتے ہیں، پھر چاند پھلوں میں مٹھاس اور دانے میں گداز پیدا کرتا ہے اور پھر دونوں کی حرکت ہماری زندگی کے تمام معاملات کو ایک توازن دیتی ہے۔ زمین کی دو حرکتیں ہیں، ایک اپنے گرد جو 24 گھنٹوں میں مکمل ہوتی ہے اور دوسری آفتاب کے گرد، جو 365 دن لیتی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق زمین کو آفتاب سے جدا ہوئے آج 2 ارب صدیاں گزر چکی ہیں، لیکن ان گردشوں میں ایک سیکنڈ کا فرق نہیں آیا، ورنہ علماء ہیئت کے تمام حساب غلط ہوجاتے۔ اپنے گرد زمین ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گھوم رہی ہے اور آفتاب کے گرد 68 ہزار میل فی گھنٹہ کے حساب سے۔ اگر اس کی پہلی رفتار کو 10 گنا کم کردیا جائے تو شب وروز 10 گنا لمبے ہوجائیں گے۔ جون میں 140 گھنٹے کا گرم دن زمین کو جھلس کر رکھ دے گا اور جنوری کی اتنی طویل رات ہر شے کو منجمد کردے گی۔ اور اگر اسے بڑھا دیا جائے تو ہر شے کا وزن کم ہوتا جائے گا۔ اور جب یہ رفتار 16 ہزار 200 میل فی گھنٹہ پر پہنچے گی تو کسی چیز میں کوئی وزن نہیں رہے گا۔ ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا درختوں اور مکانوں کو گرا دے گا اور ہاکی کا بال ہٹ ہونے کے بعد ہوا میں اڑ جائے گا اور پھر کبھی واپس نہیں آئے گا۔ زمین سورج سے تقریباً 9 کروڑ 29 لاکھ میل دور ہے۔ اگر فاصلہ کم ہوتا تو ہم گرمی سے مرجاتے اور زیادہ ہوتا تو سردی سے مرجاتے۔ کرۂ زمین کا رخ آفتاب کی طرف بالکل سیدھا نہیں بلکہ 23 درجہ کے قریب ایک طرف جھکا ہوا ہے۔ یہی جھکاؤ موسموں کا سبب ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہر دن پچھلے دن جیسا ہوتا اور ہم سردی گرمی، بہار اور برسات کے مناظر، غذاؤں اور پھلوں سے محروم ہوجاتے۔ سورج اور چاند دونوں اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت میں اس طرح بندھے ہوئے ہیں کہ دونوں میں سے کوئی ایک بھی اپنے کسی فرض سے انحراف کی جرأت نہیں کرسکتا۔ سورۂ یٰسین میں فرمایا گیا ہے'' کہ ہم نے چاند کی منزلیں مقرر کردی ہیں، وہ انھیں منزلوں کے مطابق سرگرم سفر رہنے پر مجبور ہے اور سورج کی مجال نہیں کہ وہ چاند کو جا پکڑے یا اس سے آگے نکل جائے اور نہ رات دن سے آگے نکل سکتی ہے، ہر ایک اپنے مدار میں گردش کر رہا ہے۔ ان دونوں کی گردش، ان کی کارکردگی اپنے فرائض میں غیر معمولی پابندی، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ اور اس

Marfat.com

کی مخلوقات کا ایک ایک فرد اس کے تکوینی نظام میں جکڑا ہوا ہے، اور کسی کو بھی اس کے حاکمانہ اقتدار کے مقابلے میں دم مارنے کی مجال نہیں۔ ایسی صورتحال میں یہ کیونکہ ممکن ہے کہ انسان یا جن اپنی ضرورتوں کی فراہمی کیلئے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی اور کو شریک بنالیں۔ اور یہ سمجھیں کہ جب تک دوسروں کو اللہ تعالیٰ کا شریک نہیں بنایا جائے گا ہماری ضرورتیں پوری نہیں ہوسکتیں اور کائنات کا نظام ٹھیک طرح سے چل نہیں سکتا۔

کائنات کے فرمانروا کے ایک ہونے پر دلیل

کُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی ط اس سارے نظام کی ہر چیز ایک وقتِ مقرر تک کیلئے چل رہی ہے۔ جس طرح کائنات کی ایک ایک مخلوق کا اللہ تعالیٰ کے احکام کے تحت فرائض انجام دینا اور اس کے نظام کا کل پرزہ بن کے رہنا اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ یہاں ایک ہی فرمانروا ہے، یہ کائنات مختلف دیوتاؤں کی رزم گاہ نہیں۔ یہاں صرف ایک کی مرضی چلتی ہے، کسی اور کو دخل دینے کی جرأت نہیں، یہاں صرف ایک احکم الحاکمین ہے، کسی اور کی حکومت کی کوئی گنجائش نہیں۔ اسی طرح اس کائنات کے تمام اجزاء اور اس میں کام کرنے والی تمام قوتیں اس بات پر بھی دلالت کررہی ہیں کہ اس نظام کی کوئی چیز غیر فانی نہیں۔ ہر چیز کیلئے ایک وقت مقرر ہے جس کے اختتام تک وہ چلتی ہے اور جب اس کا وقت آن پورا ہوتا ہے تو وہ مٹ جاتی ہے۔ سورج ایک وقت تک روشنی بکھیرتا ہے، پھر پردۂ شب میں محجوب ہوجاتا ہے۔ چاند ایک وقت تک اپنی تابانیوں سے حُسن بکھیرتا ہے اور پھر درماندہ ہو کے رہ جاتا ہے۔ بہار ایک وقت کیلئے آتی ہے اور پھر زوال کا شکار ہوجاتی ہے۔ خزاں جب مسلط ہوتی ہے تو ایسا لگتا ہے کہ ہر رونق کو نگل جائے گی، لیکن پھر اسی کے بطن سے شگوفے پھوٹنے لگتے ہیں۔ سورج اور چاند بظاہر صدیوں سے اپنی ڈیوٹی انجام دے رہے ہیں اور ان میں کوئی تبدیلی نہیں آئی، لیکن سائنسدان کہتے ہیں کہ سورج کی قوت میں رفتہ رفتہ کمی آرہی ہے اور ایک بہت بڑے فلسفی کا قول ہے کہ کائنات کا رجحان زوال کی طرف ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ایک نہ ایک دن اس کائنات پر قیامت چھا جائے گی۔ اور قرآن کریم کا وہ قول حقیقت بن کر سامنے آجائے گا کہ ایک دن سورج بے نور ہوجائے گا۔ کہنا یہ ہے کہ جس طرح کائنات کی ایک ایک چیز اور زمین و آسمان کی ایک ایک مخلوق الگ الگ زوال پذیر ہے، اسی طرح یہ نظام مجموعی طور پر بھی زوال کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس عالمِ طبیعی کی مجموعی ساخت یہ بتارہی ہے کہ ایک دن سب کچھ زوال کا شکار ہوجائے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر طلوع ہونے والا دن قیامت کی صداقت پر دلیل بنتا جارہا ہے تو قرآنِ کریم کا قیامت کے وقوع پر بار بار زور دینا وہ عقل کا عین تقاضا ہے جسے آج سمجھنا بظاہر مشکل نظر آتا ہے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اس کے امکانات بڑھتے چلے جارہے ہیں۔

آخرت پر دلیل

اللہ تعالیٰ کی قدرت و حکمت کے مظاہر کے حوالے سے اب تک جو کچھ آیتِ کریمہ کی وضاحت میں عرض کیا گیا، اس کے بعد یہ بات چنداں مخفی نہیں رہتی کہ اس عالم کا خالق و مدبر ایک ہی ہے۔ اور کسی اور کیلئے اس جہان کے خلق و تدبیر میں کوئی دخل نہیں۔ البتہ اگر ہم اس آیتِ کریمہ میں مزید غور کریں تو ایک اور بات بھی کھل کر سامنے آجاتی ہے جو عام ذہنوں کیلئے کسی حد تک مخفی ہے، لیکن ایسی بھی مخفی نہیں کہ پروردگار نے اس کا لحاظ فرماتے ہوئے بطورِ خاص اس کی طرف اشارہ فرمایا۔ ارشاد ہوا، کہ اللہ تعالیٰ یہ نشانیاں اس لئے کھول کھول کر بیان فرماتا ہے کہ شاید تم اپنے رب کی ملاقات پر یقین کرلو، کہ جب تم اس بات پر غور کرو کہ جس پروردگار کی بے پناہ قدرت کا عالم یہ ہے کہ وہ آسمانوں کو بغیر ستونوں کے کھڑا کرسکتا ہے اور ان میں ایسے ایسے اجرامِ فلکی کو معلق کرسکتا ہے جن کے تھامنے کیلئے بظاہر اسباب کوئی صورت ممکن نہیں۔ اور پھر مخلوقات کی رزق رسانی کیلئے کیسے کیسے حیرت انگیز انتظامات برپا کرسکتا ہے، اس سے کیا یہ ممکن نہیں کہ وہ ایک دن ساری مخلوقات کو موت کا شکار کردے۔ اور پھر ایک وقت گزرنے کے بعد تمام مخلوقات کو دوبارہ زندہ کردے اور اللہ تعالیٰ کی عدالت برپا کرے جس میں تمام انسانوں کو حساب کتاب کیلئے لا کھڑا کرے۔ یقیناً ایسا کرنا اس بے پناہ قدرتوں کے مالک کیلئے کوئی مشکل نہیں۔

زمین و آسمان کے اسی نظام میں جس چیز سے آدمی سب سے زیادہ حیران ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے جو اس کی ایک ایک مخلوق کی پیدائش سے ظاہر ہوتی ہے۔ آدمی کو یقین کرنا پڑتا ہے کہ اس کائنات کا پیدا کرنے والا انتہا درجے کا حکیم ہے۔ اس کا کوئی کام بھی حکمت سے خالی نہیں۔

Marfat.com

اس سے یہ بات بہت بعید معلوم ہوتی ہے کہ وہ نوعِ انسانی کو ایک ذی عقل وشعور اور صاحبِ اختیار وارادہ مخلوق بنانے کے بعد اور اپنی زمین کی بے شمار چیزوں پر تصرف کی قدرت عطا کرنے کے بعد اس کے کارنامۂ زندگی کا حساب نہ لے، اس کے ظالموں سے باز پرس اور اس کے مظلوموں کی دادرسی نہ کرے، اس کے نیکوکاروں کو جزاء اور اس کے بدکاروں کو سزا نہ دے۔ ایسا ہونا کسی حکیم سے تو ہرگز ممکن نہیں۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو پھر یہ کیونکہ ممکن ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جیسی حکیم ودانا ذات ایک نہ ایک دن قیامت لا کر انسانوں کے معاملات کا حساب کتاب نہ لے۔ اس کی حکمت ودانش کا یقیناً یہ تقاضا ہے کہ وہ ایک نہ ایک روز قیامت برپا کر کے ہر نیکی کی جزاء دے اور ہر برائی کی سزا دے۔

وَهُوَ الَّذِیْ مَدَّ الْاَرْضَ وَ جَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ وَ اَنْهٰرًا ؕ وَ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِیْهَا زَوْجَیْنِ اثْنَیْنِ یُغْشِی الَّیْلَ النَّهَارَ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ۝۳ (سورۃ الرعد : ۳)

(اور وہی ہے جس نے زمین کو بچھایا اور اس میں پہاڑ اور دریا بنائے اور ہر قسم کے پھلوں کی دو دو قسمیں اس میں پیدا کیں۔ وہ رات کو دن پر اڑھا دیتا ہے، بیشک ان چیزوں کے اندر ان لوگوں کیلئے نشانیاں ہیں جو غور کریں)۔

زمین کی نشانیوں سے استدلال

سابقہ آیتِ کریمہ میں آسمان کی نشانیوں سے اللہ تعالیٰ نے توحید اور آخرت پر استدلال فرمایا ہے۔ اب زمین کی نشانیوں سے استدلال فرمایا جا رہا ہے۔ جس زمین پر ہم رہتے ہیں اسے پروردگار نے کب پیدا فرمایا، یہ ایک ایسی بحث ہے جس کا پہلا صفحہ انسان کے ہاتھ سے گم ہو چکا ہے۔ سائنسدانوں کا خیال یہ ہے کہ کوئی بہت بڑا ستارہ سورج کے پاس سے گزرا اور اس کے زورِ کشش سے سورج کے چند ٹکڑے الگ ہو کر گھومنے لگے، ان میں سے ایک ٹکڑا زمین تھی جسے دوسرے ستاروں کے زورِ کشش نے آہستہ آہستہ متوازن کر دیا۔ جب یہ زمین سورج سے جدا ہوئی ہے تو اس کا درجۂ حرارت 12 ہزار فارن ہائٹ تھا۔ آہستہ آہستہ اس میں کمی ہوئی۔ جب اس کا درجۂ حرارت 4 ہزار فارن ہائٹ پر آیا تو اللہ تعالیٰ نے پانی پیدا فرمایا اور مدتوں اس پر بارشیں ہوتی رہیں اور پھر اس کو پھیلا کر انسانوں کے رہنے کے قابل بنا دیا گیا۔ یہ سائنسی تحقیق کہاں تک صحیح ہے، اس سے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ ہم اتنی بات یقین سے جانتے ہیں کہ جس پروردگار کی بے پناہ قدرت نے سورج اور چاند کو تخلیق فرمایا اسی نے زمین کو بھی پیدا فرمایا۔ یہ ایک چپٹا گول کُرّہ ہے لیکن اسے اس طرح پھیلا دیا گیا ہے کہ وہ ہر طرح سے انسانی رہائش کے قابل ہو گیا ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ نہ اسے لوہے کی طرح سخت بنایا کہ کوئی لیٹنے والا اس پر لیٹ نہ سکے اور نہ اسے ربڑ کی طرح نرم بنایا کہ اس پر رہنے والے اس کے اندر دھنس جائیں۔ زمین کی سطح بظاہر بڑی سخت ہے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ایک تھکا ہوا آدمی بغیر بستر کے بھی اس پر لیٹ جائے تو وہ اسے آرام مہیا کرتی ہے اور وہ گہری نیند میں ڈوب جاتا ہے۔ بستر اور نرم بستر کی ضرورت انسان کی سہولت پسند طبیعت نے پیدا کی ہے ورنہ زمین کی آغوش کو اللہ تعالیٰ نے آغوشِ مادر کی طرح آرام دہ اور راحت رساں بنایا ہے۔ اس کے میدانی علاقوں میں لہلہاتی فصلیں اور بہتے ہوئے دریا اس کے ہموار ہونے کی کھلی شہادت دیتے ہیں۔ صحراؤں میں سفر کرنے والے اس کی بے کراں وسعتوں کو دیکھ کر اس کے نشیب وفراز کا تصور بھی نہیں کر سکتے لیکن یکسانی اور ہم رنگی چونکہ انسان کے ذوقِ لطیف پر گراں گزرتی ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس میں نشیب وفراز بھی پیدا فرمائے اور اپنی قدرت کے اظہار کیلئے بلند وبالا پہاڑوں کی میخیں گاڑ دی ہیں جنہیں دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ زمین کی نگرانی اور اسے سنبھالنے کا فریضہ شاید ان کے حوالے کیا گیا ہے لیکن بعض جگہ جب ان کی کھدائی ہوتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اگر ایک طرف پہاڑی سلسلے اپنے خوبصورت لوازمات سمیت انسان کے ذوقِ لطیف کا جواب ہیں تو دوسری طرف نہ جانے انسانوں کیلئے کتنے دفینے اور خزینے ہیں جن کے یہ امین ہیں۔ پھر انھیں میدانی علاقوں اور پہاڑی علاقوں کے بیچ بیچ دریا رواں کر دیے گئے جو ایک طرف زمین کی آبیاری کا سبب ہیں تو دوسری طرف انسان کے جمالیاتی ذوق اور دعوتِ نظارہ کی تسکین کا سبب بھی ہیں۔

Marfat.com

تخالف و توافق کے قانون سے استدلال

مزید غور کرنے سے حکمتوں کے مزید گوشے سامنے آتے ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ زمین اور آسمان، ہوا اور پانی، دریا اور پہاڑ بظاہر آپس میں مزاج کے اعتبار سے کتنے مختلف ہیں بلکہ دونوں ایک دوسرے سے متضاد معلوم ہوتے ہیں اور ان میں پیدا کی جانے والی صلاحیتیں ایک دوسرے سے متخالف دکھائی دیتی ہیں، لیکن حیرانی کی بات یہ ہے کہ پروردگار نے انھیں متخالف عناصر کو ایک دوسرے کا ہمنوا اور مددگار بنا دیا ہے۔ سورج کی کرنیں بظاہر پانی کا خاتمہ کرتی ہیں لیکن یہی کرنیں پانی کے ڈول بھر بھر کر فضاء میں ابر کی چادریں بچھا دیتی ہیں۔ ہوا کا کام ہر سامنے آنے والی چیز کو اڑانا ہے لیکن وہ ابر سے پانی برسانے کا کام کرتی ہیں۔ زمین کی مٹی پانی کی دشمن ہے اور پانی کو نگل جانا چاہتی ہے، لیکن یہی زمین پانی کو چوس کر ہر بوئے جانے والے غلے کو سیراب کرتی ہے اور زائد پانی کو اگل کر ندی نالوں میں پہنچا دیتی ہے۔ گرمی ننھے منے پودے کی نزاکت کی دشمن ہے لیکن وہ اسے جلانے کی بجائے اس میں سختی پیدا کرتی ہے تا کہ وہ غلے کا بوجھ اٹھانے کے قابل ہو سکے۔ سورج کی کرنیں پھلوں کو پکاتی ہیں اور غلے کے دانوں کو موسم کا مقابلہ کرنے کے قابل بناتی ہیں۔ اس طرح سے ہم قدم قدم پر دیکھتے ہیں کہ متخالف عناصر آپس میں ایک دوسرے کے موافق رہ کر ایک دوسرے کی معاونت کرتے ہیں اور اس مجموعی مفاد کو سامنے لاتے ہیں جس کیلئے انھیں پیدا کیا گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایک زمین کے اوپر اور ایک آسمان کے نیچے متخالف عناصر کا پیدا کرنا اور پھر انھیں سے موافق ذمہ داریوں کا ادا کروانا، متضاد عناصر میں ایسی سازگاری پیدا کرنا کہ وہ مفوضہ امور میں ایک دوسرے کے دست و بازو ثابت ہوں، کیا یہ امر اس بات پر دلالت نہیں کرتا کہ جس طرح اس کائنات کا خالق ایک ہے، اسی طرح اس کائنات کے امور کی تدبیر کرنے والا اس کے ہر کام کی دیکھ بھال کرنے والا، اس کے چھوٹے بڑے فیصلے کرنے والا وہ بھی ایک ہی خداوند ذوالجلال ہے۔ پوری کائنات میں ایک نظام کارفرما ہے جس کا سررشتہ ایک ہی کے ہاتھ میں ہے۔ یہ ایک ہی پروردگار کی سلطنت ہے اور ایک ہی کا حکم یہاں کارفرما ہے۔ یہ کائنات مختلف الاغراض دیوتاؤں کی رزم گاہ نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ کائنات اور اس کا نظم ایک دن کیلئے باقی نہ رہ سکتا۔

توافق و تخالف کے قانون کی ہمہ گیری

وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ کائنات میں توافق اور تخالف کا جو قانون کارفرما ہے یہ اسی کی ہمہ گیری کی طرف اشارہ ہے۔ جس طرح کائنات کے بڑے بڑے عناصر میں یہ قانون کارفرما ہے، اسی طرح ایک ایک پھل اور ایک ایک دانے کے اندر بھی جاری و ساری ہے۔ دانۂ گندم کو دیکھ لیجیے اس کی ظاہری ہیئت بھی دو حصوں میں تقسیم ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ قدرت اس سے جب ایک سوئی نکالتی ہے تو ان دونوں حصوں سے یکساں کام لیتی ہے۔ دونوں اس بات سے انکار نہیں کرتے کہ ہم الگ الگ حیثیتوں کے مالک ہیں تو ہم ایک چیز کو جنم کیوں دیں۔ ایسا لگتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام نباتات میں بھی زوجین کا قانون نافذ کیا ہے۔ جس طرح مرد اور عورت دو الگ الگ شخصیتیں ہونے کے باوجود دونوں مل کر ایک شخصیت کو جنم دیتے ہیں جس میں دونوں شخصیتوں کی خصوصیات اور چاہتیں جمع ہوتی ہیں اور دونوں کی شخصیت ایک دوسرے کے بغیر نامکمل رہتی ہیں۔ صنفِ نازک میں اللہ تعالیٰ نے وہ سب کچھ رکھ دیا ہے جو صنفِ قوی کی چاہت ہے اور مرد میں وہ سب کچھ رکھ دیا گیا ہے جو عورت کی طلب کا جواب ہے۔ دونوں ہر لحاظ سے ایک دوسرے کے مساوی لیکن متغائر شخصیتیں ہیں۔ لیکن ان میں تکمیل اس وقت پیدا ہوتی ہے جب اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق اور اس کے تکوینی نظام کے تحت ایک دوسرے کا لباس بن جاتے ہیں۔ اسی طرح نباتات میں بھی اللہ تعالیٰ نے نر اور مادہ کی تقسیم رکھی ہے۔ ایک ہی پودا جو نر ہو یا مادہ کبھی پھل نہیں دیتا تاوقتیکہ دوسرا پودا کہیں قریب یا بعید موجود نہ ہو۔ یا ہوا کہیں سے نر کے بیج لا کر مخالف پودے کے خوشے میں داخل نہ کر دے۔ رات اور دن کو بھی اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے کیلئے جوڑا بنایا ہے اور دونوں ایک دوسرے کے بغیر نامکمل ہیں اور دونوں ایک دوسرے پر لپٹے ہوئے چلے آتے ہیں۔ یہ تخالف اور موافق عناصر کامل کر قدرت کے امرِ مطلوب کو انجام دینا یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ کائنات کے ایک ایک ذرے کے پیچھے ایک حکیم کی حکمت، ایک قادر کی قدرت، ایک علّام کا علم اور ایک حاکم کی حکومت کام کر رہی ہے۔ اس نے جس طرح ہر چیز کو جوڑا جوڑا بنایا ہے، اسی طرح اس نے دنیا کا بھی ایک جوڑا بنا کر

Marfat.com

کائنات کے اس نظام کو مکمل کیا ہے۔ جس طرح ہر جوڑا دوسرے کے بغیر نامکمل رہتا ہے اسی طرح دنیا بھی آخرت کے بغیر نامکمل رہتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی وہ حکمت جو زمین پر انسان کو بھیجتے ہوئے اس کے پیشِ نظر تھی وہ نامکمل رہے گی اور ان چیزوں کے اندر اللہ تعالیٰ کے خلق وتدبیر اور اس کی قدرت وحکمت اور اس کی توحید اور آخرت کی جو نشانیاں ہیں وہ اس وقت تک ناقابلِ فہم رہیں گی جب تک لوگ اللہ تعالیٰ کی آیات میں غور وفکر نہیں کریں گے۔

وَفِي الْأَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّجَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ وَّنَخِيْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَيْرُ صِنْوَانٍ يُّسْقٰى بِمَآءٍ وَّاحِدٍ وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ فِي الْاُكُلِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ④ (سورۃ الرعد : ۴)

(اور زمین میں پاس پاس زمین کے خطے ہیں، انگوروں کے باغات ہیں، کھیتی ہے اور کھجور کے درخت ہیں جن میں سے کچھ جڑواں ہیں اور کچھ اکہرے۔ سب ایک ہی پانی سے سیراب کئے جاتے ہیں لیکن ہم پیداوار میں ایک کو دوسرے پر ترجیح دے دیتے ہیں۔ بیشک اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کیلئے جو عقل سے کام لیں)۔

زمین کی نشانیوں کے ایک اور پہلو کی طرف اشارہ

اب ایک اور پہلو سے زمین کی نشانیوں کی طرف توجہ دلائی جارہی ہے۔ مقصود اس سے بھی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کی حاکمیت کی مطلق العنانیت کو بیان کرنا ہے۔ ارشاد فرمایا ہے کہ زمین پر غور کرو، تمہیں زمین مختلف حصوں میں بٹی ہوئی ملے گی، حالانکہ وہ ایک کُرّہ ہے اور اگر وہ سورج سے جدا ہوا ہے تو پھر اس کا مبدا بھی ایک ہے۔ اس لحاظ سے تو اس کو ظاہری شکل وصورت سے لے کر باطنی فوائد وخصوصیات تک یکساں ہونا چاہیے، لیکن عجیب بات ہے کہ زمین ایک فاصلے پر جا کر بعض دفعہ رنگ بدل لیتی ہے۔ اس کی مٹی کا رنگ بدل جاتا ہے اور اس کے خصائص بھی تبدیل ہوجاتے ہیں اور بعض دفعہ تو ایسا ہوتا ہے کہ زمین کا ایک حصہ اگر نباتات کے قابل ہے تو دوسرا حصہ مختلف دھاتوں کا دفینہ ہے۔ کہیں زمین کے نیچے آبِ شیریں بہہ رہا ہے اور کہیں کڑوا اور نمکین پانی۔ مزید حیرانی کی بات یہ ہے کہ زمین کے قریب قریب قطعات میں جہاں زراعت ہورہی ہے اس میں پیداوار باہمی عجیب وغریب تنوع کی حامل ہے۔ زمین کا ہر ٹکڑا دوسرے سے پیوست ہے لیکن ایک ٹکڑے میں کوئی چیز اُگ نہیں سکتی اور دوسرا ہے کہ پوری پیداوار دے رہا ہے۔ اور پھر باغات ہیں تو ایک ہی طرح نہیں، کہیں انگوروں کی بیلیں بہار دے رہی ہیں، کہیں مختلف قسم کی کھیتیاں ہیں، کہیں کھجوریں ہیں اور کھجوریں بھی سب اپنے وجود میں ایک جیسی نہیں، کہیں ایک ہی جڑ سے ایک ہی تنا پھوٹتا ہے اور کہیں ایک جڑ سے دو دو تنے پھوٹتے ہیں اور دونوں کا پھل ایک دوسرے سے مختلف ہے حالانکہ زمین کے تمام ٹکڑوں کو ایک ہی پانی سے سیراب کیا جارہا ہے اور جن درختوں کا پھل بظاہر ایک دوسرے کے مشابہ ہے وہ بھی پیداوار کی کمی بیشی میں اور مزے میں یکساں نہیں اور کسی کا پھل معیار کے مطابق ہوتا ہے اور کسی کا معیار سے فروتر۔ کیا یہ رنگا رنگی اور یہ تنوع اور یہ اختلاف اس بات پر دلالت نہیں کرتا کہ یہاں جو کچھ ہورہا ہے وہ آپ سے آپ نہیں ہورہا کیونکہ اگر آپ سے آپ ہوتا تو ایک ہی طرح سے ہوتا۔ اور نہ نیچر کا اندھا بہرہ قانون سب پر یکساں مسلط ہے۔ یہ صورتحال بول رہی ہے کہ ایک ہی خدائے علیم وحکیم اس پورے نظامِ کائنات کو اپنی نگرانی میں چلا رہا ہے۔ اور سارے عالمِ اسباب پر تنہا اسی کی حکمرانی ہے۔ وہ کسی قانون کا پابند نہیں بلکہ اس کائنات کا ہر تغیر اس کے قانون کا پابند ہے۔

وَاِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ؕ۬ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ الْاَغْلٰلُ فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ⑤ (سورۃ الرعد : ۵)

(اگر تمہیں تعجب کرنا ہے تو تعجب کے قابل لوگوں کا یہ قول ہے جب ہم مر کر مٹی ہوجائیں گے تو ہم از سرِ نو وجود میں آئیں گے، یہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کا انکار کیا، یہی لوگ ہیں جن کی گردنوں میں طوق پڑے ہوئے ہیں، یہی لوگ جہنمی ہیں اور جہنم میں ہمیشہ رہیں گے۔)

Marfat.com

تعجب کے قابل اصل بات

نبی کریم ﷺ جب مشرکین کے سامنے اپنی دعوت پیش فرماتے، انھیں اللہ تعالیٰ کی طرف بلاتے اور انھیں سمجھانے کی کوشش کرتے کہ تم اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہو اور مخلوق بھی ایسی جس کا باقی مخلوقات میں کوئی جواب نہیں، تو تم جیسی مخلوق کے بارے میں یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ اللہ تعالیٰ جیسی علیم و حکیم ذات تمہیں بے مقصد پیدا فرمائے گی اور تمہاری زندگیوں کا کوئی مقصد نہیں ہوگا۔ تم خودرو پودوں کی طرح مَل دَل کے ختم ہو جاؤ گے اور یا حیوانوں کی طرح کھا پی کر زندگی گزار دو گے اور ضروریاتِ زندگی کو زندگی کے مقاصد جانو گے اور حقیقی زندگی کا تمہیں کبھی شعور نہیں ہوگا اور تم اس بات پر یقین رکھو گے کہ ہم اس لئے زندہ ہیں تاکہ عیش و عشرت میں کھوئے رہیں اور اللہ تعالیٰ نے ہمیں جو بے شمار اور بیش بہا نعمتیں بخشی ہیں کبھی اللہ تعالیٰ کے سامنے اس کی جوابدہی نہ کرنی پڑے۔ کہا اگر تم یہ سمجھتے ہو تو تمہاری یہ بات انتہائی قابلِ تعجب ہے کیونکہ یہ کیسے ممکن ہے کہ جس انسان کو اللہ تعالیٰ نے حواس عطا کئے ہوں اور عقل جیسی نعمت عطا فرمائی ہو اور خیر و شر کے اختیار میں آزادی بخشی ہو اسے یونہی بے مقصد زندگی گزار کر زندگی ختم کرنے کا اختیار دے دیا جائے نہ اس سے نعمتوں کے بارے میں باز پرس کی جائے اور نہ اس سے زندگی کی آزادیوں کے بارے میں سوال کیا جائے اور اگر کوئی شخص ایسا سمجھتا ہے تو یہ یقیناً قابلِ تعجب ہے کیونکہ کہیں بھی ایسا ہونا ممکن نہیں ہوتا۔ آپ ایک شخص کو ملازم رکھتے ہیں، اسے خوبصورت رہائش دیتے ہیں، اس کی ایک معقول تنخواہ مقرر کر دیتے ہیں، اس کی ہر ضرورت وقت سے پہلے پوری کر دیتے ہیں، لیکن کبھی آپ اس سے یہ نہیں پوچھتے کہ تمہیں جو ذمہ داریاں دی گئی تھیں اور جن کی ادائیگی کے معاوضے کے طور پر تمہیں یہ ساری سہولتیں بخشی گئی تھیں تم نے ان ذمہ داریوں کی ادائیگی کیلئے کیا کیا۔ اگر چند روزہ زندگی اور چند روزہ ڈیوٹی کے بارے میں ایسا ہونا قابلِ تعجب ہے تو پوری انسانی زندگی اور اس کی ذمہ داریوں کے بارے میں ایسا ہونا کیونکر قابلِ تعجب نہیں ہوگا۔ اس لئے یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ تعجب کے قابل یہ بات نہیں ہے کہ ایک دن تمام انسانوں کو مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیا جائے گا اور ان کے ایک ایک عمل کا حساب ہوگا بلکہ تعجب کے قابل تو یہ بات ہے کہ تم یہ سمجھتے ہو کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ جب ہم مر کے مٹی ہو جائیں گے تو ہمیں از سرِ نو زندہ کیا جائے گا اور یہ کہنا قابل تعجب اس لئے بھی ہے کہ تم اپنے سر کی آنکھوں سے اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتوں کو دیکھتے ہو۔ تمہارے سامنے اس کی قدرتوں کا ظہور ہوتا ہے، تم نے سابقہ آیات میں اس کی بعض نشانیوں اور بعض قدرتوں کو خود ملاحظہ بھی کیا ہے، اس کے باوجود اگر کائنات کے فنا ہو جانے اور از سرِ نو اس کے وجود میں آ جانے کا تمہیں یقین نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے خدا کو سرے سے تسلیم ہی نہیں کیا کیونکہ جس خدا کا نقشہ قرآنِ کریم نے کھینچا ہے اور جسے تم خود کائنات کا خالق جانتے ہو اس کی قدرتوں کو دیکھتے ہوئے کوئی احمق سے احمق آدمی بھی یہ بات نہیں کہہ سکتا کہ جن عظیم قدرتوں کے مالک خدا نے پہلے یہ کائنات بنائی تھی اب وہ دوبارہ اسے کبھی نہیں بنا سکتا کیونکہ اس سے بڑی جہالت کی بات اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ بات اصل میں یہ ہے کہ تمہاری گردنوں میں جہالت، ہٹ دھرمی، خواہشاتِ نفس اور اپنے آباؤ اجداد کی اندھی تقلید کے طوق پڑے ہوئے ہیں۔ وہ تمہیں سر اٹھا کر اللہ تعالیٰ کی قدرتوں کو دیکھنے کا موقع ہی نہیں دیتے۔ اللہ تعالیٰ کی نشانیاں تو ہمارے گرد و پیش میں پھیلی ہوئی ہیں لیکن کچھ تمہارا کبر و غرور اور خود پرستی اور کچھ تمہاری خواہشات اور آباؤ اجداد کی اندھی تقلید سر اٹھا کر دیکھنے کی ہمت نہیں دیتی، تو جب تک آدمی آنکھیں نہ کھولے اور سر اٹھا کر نہ دیکھے تو چمکتے ہوئے سورج کی روشنی میں اسے دکھائی نہیں دیتا۔ ایسے لوگ اس قابل نہیں ہیں کہ جس طرح انھوں نے دنیا کی زندگی میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناقدری کی ہے اسی طرح آخرت میں بھی انھیں ناقدری کا موقع دیا جائے بلکہ یہ لوگ حق ناشناسی، کبر و غرور اور ناقدری کے باعث جہنم کا ایندھن بنیں گے اور ہمیشہ اس آگ میں جلیں گے۔

وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ وَقَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثُلٰتُ ؕ وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰى ظُلْمِهِمْ ۚ وَاِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ (سورة الرعد : ٦)

(اور یہ لوگ خیر سے پہلے شر کیلئے آپ سے جلدی مچائے ہوئے ہیں حالانکہ گزر چکی ہیں ان سے پہلے عبرتناک مثالیں اور بیشک آپ کا رب ان کی زیادتیوں کے باوجود ان سے درگزر کرنے والا بھی ہے اور بیشک آپ کا رب سخت سزا دینے والا بھی ہے۔)

Marfat.com

انسان مجموعۂ اضداد ہے

انسان کو اللہ تعالیٰ نے مجموعۂ اضداد بنایا ہے۔ اگر یہ خیر کے راستے پر چل پڑتا ہے تو فرشتے بھی اس کے دامن میں نماز پڑھنا فخر محسوس کرتے ہیں اور اگر یہ شر اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا راستہ اختیار کرتا ہے تو بعض دفعہ اس کی بداعمالیاں ہی نہیں بلکہ اس کی بداطواریاں بھی اس انتہا کو پہنچ جاتی ہیں کہ شیطان بھی اس کی نافرمانیوں اور اس کی بداطواریوں سے شرما جاتا ہے۔ اگر یہ صحیح راستے پر چلتا ہے تو وسعتِ کونین بھی اس کے سامنے سمٹ جاتی ہے۔ اور اگر یہ غلط راستے پر چل نکلتا ہے تو بدترینِ خلائق ثابت ہوتا ہے۔ جگر مرادآبادی نے ٹھیک کہا:

گھٹے اگر تو بس ایک مشتِ خاک ہے انساں
بڑھے تو وسعتِ کونین میں سما نہ سکے

انسان کی زندگی کا مقصد

نبی کریم ﷺ نے مشرکینِ مکہ کو مسلسل اللہ تعالیٰ کے راستے کی طرف بلایا اور کفر اور شرک کی خرابیاں اور نقصانات کھول کھول کر ان کے سامنے بیان فرمائے اور انھیں بتایا کہ جس پروردگار نے تمہیں پیدا فرمایا ہے اور تمھاری ہر طرح کی ضروریات پوری فرمائی ہیں اور تمہیں بیش بہا نعمتوں سے نوازا ہے اس نے تمھاری زندگی کا کوئی مقصد بھی مقرر کیا ہے اور زندگی گزارنے کیلئے مجھے اس نے ایک شریعت یعنی نظامِ زندگی دے کے بھیجا ہے۔ تم اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی اس کے مطابق اگر گزارو گے تو وہ دنیا میں بھی تم سے خوش ہوگا اور آخرت میں تمہیں جنت عطا فرمائے گا۔ لیکن اگر تم نے میری دعوت کو قبول نہ کیا اور شیطان کے راستے پر چلتے رہے اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانیاں جاری رکھیں تو کسی وقت بھی اس کا غضب عذاب کی صورت میں بھڑک سکتا ہے چنانچہ آپ بار بار کبھی نصیحت کی صورت میں اپنی دعوت پیش فرماتے، کبھی فہمائش سے کام لیتے اور کبھی اللہ تعالیٰ کے عذاب سے انھیں ڈراتے۔ جب اس پر ایک مدت گزری تو انھوں نے عذاب سے ڈرنے کی بجائے اسے ایک مذاق بنالیا اور بار بار کہتے کہ جس عذاب سے تم کئی سالوں سے ہمیں ڈرا رہے ہو، آخر وہ آ کیوں نہیں جاتا، وہ کہاں رک کر رہ گیا ہے۔ اندازہ فرمایئے کہ اللہ تعالیٰ کا نبی ان کی اصلاح کرنا چاہتا ہے، ان کے طور اطوار کو درست کرنا چاہتا ہے، ان کے اخلاق کو سدھارنا چاہتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے ٹوٹے ہوئے رشتے کو بحال کرنا چاہتا ہے اور انکار کی صورت میں جو عذاب آ سکتا ہے، اس سے بچانا چاہتا ہے لیکن ان لوگوں کا حال دیکھیے وہ بجائے اپنی حالت درست کرنے کے اللہ تعالیٰ کے عذاب کا مذاق اڑا رہے ہیں بلکہ بعض دفعہ خود دعا کرتے ہیں کہ اگر محمد ﷺ کی یہ بات صحیح ہے تو اے اللہ تعالیٰ ہم پر یہ عذاب نازل کردیجیے۔ عجیب بات یہ ہے کہ وہ اپنے تجارتی سفروں میں قومِ عاد، قومِ ثمود، قومِ مدین اور قومِ لوط کے کھنڈرات سے گزرتے رہتے ہیں۔ انھیں خوب معلوم ہے کہ ان کی سرکشی کے نتیجے میں ان پر اللہ تعالیٰ کا تباہ کن عذاب آیا، لیکن بجائے سنبھلنے کے وہ دلیر ہو کر عذاب ہی کا مذاق اڑانے لگے ہیں۔ ایسے رویئے پر ہونا تو یہ چاہیے کہ فوراً اللہ تعالیٰ کے غضب کا کوڑا ان پر برس جائے لیکن پروردگار کی رحمت کا کیا ٹھکانہ ہے کہ بے وقوف لوگ جس مہلتِ عمل سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ عذاب کا محض ڈراوا ہے، کوئی عذاب نہیں آئے گا۔ اسی مہلتِ عمل کو پروردگار اپنی رحمت قرار دے رہے ہیں کہ سرکش اور نافرمان لوگ اپنی سرکشی جاری رکھتے ہیں لیکن ہم ان کی اس زیادتی کے باوجود ان سے درگزر کے رویئے کو بدلتے نہیں۔ ممکن حد تک انھیں ڈھیل دیتے چلے جاتے ہیں کہ شاید وہ اپنے آپ کو بدل لیں اور اللہ تعالیٰ کے راستے پر آ جائیں، لیکن جب وہ کسی قیمت پر بھی راہِ راست اختیار نہیں کرتے تو پھر جس طرح اللہ تعالیٰ درگزر اور رحمت والا ہے اسی طرح وہ سخت عذاب دینے والا بھی ہے۔ پھر اس کا عذاب آتا ہے اور ایسی قومیں مٹی کا زرق ہو کے رہ جاتی ہیں اور تاریخ میں انھیں عبرت کے طور پر یاد رکھا جاتا ہے۔

وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَآ أُنزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِّن رَّبِّهِ ۗ إِنَّمَآ أَنتَ مُنذِرٌ ۖ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ﴿٧﴾ (سورۃ الرعد : ۷)

(اور جن لوگوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا وہ کہتے ہیں کہ اس نبی پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں اتاری گئی، تم تو بس ایک خبردار کردینے والے ہو اور ہر قوم کیلئے ایک ہادی ہے۔)

Marfat.com

مشرکین کے مطالبہ کا جواب

مشرکین نبی کریم ﷺ کی دعوت وتبلیغ کو ناکام کرنے اور بعض دفعہ آپؐ کو زچ کرنے کیلئے کبھی تو عذاب کا بار بار مطالبہ کرتے بلکہ اس کا مذاق اڑاتے اور کبھی یہ کہتے کہ اگر آپ واقعی اللہ تعالیٰ کے سچے نبی ہیں اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو رسالت دے کے بھیجا ہے تو پھر اپنے اللہ تعالیٰ سے درخواست کیجیے کہ وہ آپؐ کی دعا پر کوئی ایسی نشانی دکھائے جسے دیکھ کر ہم آپ کو ماننے پر مجبور ہو جائیں۔ کبھی وہ یہ کہتے کہ مکہ معظمہ کو میدانی علاقے میں تبدیل کر کے اسے چمن کی شکل دے دی جائے، کبھی کہتے کہ جابجا اس کے اندر سے چشمے جاری ہو جائیں، کبھی اسی طرح کی کسی اور بڑی نشانی کا مطالبہ کرتے۔ اور جب ان کے مطالبے کے جواب میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاموشی رہتی تو پھر وہ آپ کا مذاق اڑاتے۔ قرآن کریم نے بعض دوسری جگہ ان کے اس مطالبے کا جواب ایک اور پہلو سے دیا، وہ یہ ہے کہ جہاں تک نشانیاں دکھائے جانے کا تعلق ہے، تمھارے سامنے اور تمھارے گردوپیش میں نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ البتہ اس کیلئے دیدۂ بینا چاہیے۔ کائنات کی ایک ایک مخلوق اللہ تعالیٰ کی قوتِ تخلیق کی نشانی ہے۔ تمہیں بچپن سے لے کر موت تک حسبِ ضرورت جو غذائی ضروریات بہم پہنچائی جاتی رہی ہیں ان میں سے ایک ایک اس کے رب ہونے کی نشانی ہے۔ زمین وآسمان کا اپنے اپنے فرائض کو بجالانا اور چھوٹے بڑے کرّوں کا اپنے اپنے مدار میں محوِ گردش رہنا اور زمین کی قوتِ روئیدگی کا زمین کو غذا اور حُسن سے بھر دینا ان میں سے کون سی بات ہے جو اللہ تعالیٰ کی قدرتوں پر نشانی نہیں۔ انسان کا اپنا جسم، اس کی روح، اس کے احساسات، اس کے تخیلات، اس کا جمالیاتی ذوق، ان میں سے ایک ایک بات ایسی نشانی ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی صفات جھلکتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ لیکن ان تمام نشانیوں کے باوجود اگر تم منہ مانگی نشانی دیکھنا چاہتے ہو تو پھر یاد رکھو اللہ تعالیٰ کا ایک قانون ہے کہ جب کسی قوم کے مطالبے پر کوئی نشانی دکھائی جاتی ہے اور پھر وہ قوم اس نشانی کو دیکھنے کے بعد بھی ایمان نہیں لاتی تو پھر اس کو زندگی کی مہلت نہیں دی جاتی۔ جس طرح قومِ صالحؑ کو اونٹنی کی نشانی ان کے مطالبے پر دکھائی گئی لیکن جب وہ اس پر بھی ایمان نہ لائی تو انھیں عذاب کی نذر کر دیا گیا۔ لیکن اس آیتِ کریمہ میں ایک دوسری بات فرمائی گئی ہے کہ اے پیغمبرؐ آپؐ ان کے مطالبات پر نہ جائیے، اس دنیا کا ایک ایک گوشہ اور اس زمین کا ایک ایک ذرہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں سے معمور ہے۔ اگر یہ نشانی دیکھ کر ایمان لانے والے ہوتے تو اب تک ایمان سے محروم نہ ہوتے، کیونکہ:

ہر کہ دیدم در جہاں غیرے تو نیست
یا توئی یا خوئے تو یا بوئے تو

اس لئے آپؐ ان کے مطالبے کو نظرانداز کیجیے۔ آپؐ کا کام نشانیاں دکھانا نہیں بلکہ آپؐ کا کام انھیں خبردار کرنا ہے۔ آپ منذر بن کے آئے ہیں۔ آپؐ کی ذمہ داری یہ ہے کہ آپ اس راستے کی انھیں خبر دے دیں جو راستہ خیر اور فلاح کا راستہ ہے اور اس راستے سے انھیں ہٹانے کی کوشش کریں جو خسران کا راستہ ہے کیونکہ ہر قوم کیلئے ہم نے ایک ہدایت دینے والا بھیجا ہے اور آپؐ کو ہم نے اس قوم کیلئے ہادی بنایا ہے۔ آپؐ ان کیلئے ہدایت کا راستہ کھول چکے ہیں، آپؐ کی ذمہ داری ختم ہو چکی ہے، اب ان کا معاملہ اپنے اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے۔

اَللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰى وَمَا تَغِيْضُ الْاَرْحَامُ وَمَا تَزْدَادُ ۭ وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ ⑧ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْكَبِيْرُ الْمُتَعَالِ ⑨ سَوَاۗءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ

Marfat.com

الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ بِهٖ وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍۢ بِالَّيْلِ وَسَارِبٌۢ
بِالنَّهَارِ ﴿۱۰﴾ لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ
مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا
بِاَنْفُسِهِمْ ؕ وَاِذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ ۚ وَمَا لَهُمْ
مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ ﴿۱۱﴾ هُوَ الَّذِيْ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّ
طَمَعًا وَّيُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ ﴿۱۲﴾ ۚ وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ
وَالْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِيْفَتِهٖ ۚ وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيْبُ بِهَا
مَنْ يَّشَآءُ وَهُمْ يُجَادِلُوْنَ فِي اللّٰهِ ۚ وَهُوَ شَدِيْدُ الْمِحَالِ ﴿۱۳﴾ لَهٗ
دَعْوَةُ الْحَقِّ ؕ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ
بِشَيْءٍ اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ اِلَى الْمَآءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ ؕ وَ
مَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ﴿۱۴﴾ وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ﴿۱۵﴾ السجدة قُلْ
مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قُلِ اللّٰهُ ؕ قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ مِّنْ
دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ لَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا ؕ قُلْ هَلْ
يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۙ۵ اَمْ هَلْ تَسْتَوِي الظُّلُمٰتُ وَالنُّوْرُ ۚ۵
اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ خَلَقُوْا كَخَلْقِهٖ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ ؕ

Marfat.com

قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿١٦﴾ اَنْزَلَ مِنَ
السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا
رَّابِيًا ؕ وَمِمَّا يُوْقِدُوْنَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَآءَ حِلْيَةٍ اَوْ مَتَاعٍ
زَبَدٌ مِّثْلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ؕ فَاَمَّا الزَّبَدُ
فَيَذْهَبُ جُفَآءً ۚ وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ ؕ
كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ ﴿١٧﴾ لِلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمُ الْحُسْنٰى ؕ
وَالَّذِيْنَ لَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهٗ لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّ
مِثْلَهٗ مَعَهٗ لَافْتَدَوْا بِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ سُوْٓءُ الْحِسَابِ ۙ وَمَاْوٰىهُمْ
جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿١٨﴾

رکوع: ۲ (اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو (شکم میں) اٹھائے ہوئے ہوتی ہے کوئی مادہ اور وہ جانتا ہے جو کم کرتے ہیں رحم اور جو زیادہ کرتے ہیں اور ہر چیز اس کے نزدیک ایک اندازہ سے ہے۔ وہ جاننے والا ہے ہر پوشیدہ اور ہر ظاہر چیز کو، عظیم اور عالی شان ہے۔ (اس کے علم میں) سب یکساں ہیں، تم میں سے وہ بھی جو آہستہ بات کرتا ہے اور وہ بھی جو زور سے بولتا ہے، شب کی تاریکی میں چھپا رہتا ہے اور دن کے وقت چلتا پھرتا ہے۔ انسان کیلئے یکے بعد دیگرے آنے والے فرشتے ہیں اس کے آگے بھی اور اس کے پیچھے بھی۔ وہ نگہبانی کرتے ہیں اس کی، اللہ تعالیٰ کے حکم سے۔ اللہ تعالیٰ کسی قوم کے ساتھ اپنا معاملہ اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی روش میں تبدیلی نہ کرے۔ اور جب اللہ تعالیٰ کسی قوم پر کوئی آفت لانے کا ارادہ کر لیتا ہے تو وہ کسی کے ٹالے نہیں ٹل سکتی اور ان کا اس کے مقابل میں کوئی مددگار بھی نہیں بن سکتا۔ وہی ہے جو تمہیں دکھاتا ہے بجلی جو خوف بھی پیدا کرتی ہے اور امید بھی اور ابھارتا ہے بوجھل بادلوں کو۔ اور تسبیح کرتی ہے بجلی کی گرج اس کی حمد کے ساتھ اور فرشتے بھی اس کے ڈر سے اس کی تسبیح کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کڑکتی بجلیاں بھیجتا ہے پھر انھیں گراتا ہے جس پر چاہتا ہے اس حال میں کہ لوگ اللہ تعالیٰ کے بارے میں جھگڑ رہے ہوتے ہیں اور وہ بڑی ہی زبردست قوت والا ہے۔ اسی کو پکارنا سچ ہے، رہے وہ لوگ جن کو یہ اس کے سوا پکارتے ہیں۔ وہ انھیں کچھ بھی جواب نہیں دے سکتے۔ ان کا پکارنا ایسا ہی ہے کہ کوئی اپنے دونوں ہاتھ پانی کی طرف پھیلائے کہ وہ اس کے منہ میں پہنچ جائے۔ درانحالیکہ وہ کسی طرح اس کے منہ پر پہنچنے والا نہ ہو۔ ان کافروں کی فریاد محض صدا بصحرا ہوگی۔ اور اللہ تعالیٰ ہی کو سجدہ کر رہے ہیں جو بھی آسمانوں اور زمین میں ہے، خوشی سے اور مجبوراً اور ان کے سائے بھی (سجدہ ریز ہیں) صبح کے

Marfat.com

وقت بھی اور شام کے وقت بھی۔ اے پیغمبران سے پوچھئے آسمانوں اور زمین کا پروردگار کون ہے۔ کہہ دیجیے، اللہ تعالیٰ۔ ان سے پوچھیے تو کیا اس کے بعد تم نے اس کے سوا ایسے کارساز بنا رکھے ہیں جو خود اپنی ذات کیلئے بھی نہ کسی نفع پر کوئی اختیار رکھتے ہیں اور نہ کسی ضرر پر۔ ان سے پوچھئے کیا اندھے اور بینا دونوں یکساں ہیں یا کیا روشنی اور تاریکی دونوں برابر ہیں۔ کیا انھوں نے خدا کے ایسے شریک ٹھہرائے ہیں جنہوں نے اسی کی طرح خلق کیا ہے جس کے سبب سے ان کو خلق میں اشتباہ لاحق ہو گیا ہے۔ آپ کہہ دیجیے اللہ تعالیٰ ہی ہر چیز کو پیدا کرنے والا ہے۔ اور وہ ایک ہے سب پر غالب ہے۔ اس نے آسمان سے پانی اتارا تو وادیاں اپنے اپنے اندازے کے مطابق بہہ نکلیں، پھر سیلاب کی رو نے ابھرا ہوا جھاگ اٹھالیا اور جن چیزوں کو آگ کے اندر تپاتے ہیں، زیور بنانے کیلئے یا دیگر سامان بنانے کیلئے، اس میں بھی ویسا ہی جھاگ اٹھتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ حق و باطل کو ٹکراتا ہے، پس جھاگ تو رائیگاں چلا جاتا ہے لیکن جو چیز لوگوں کو نفع پہنچانے والی ہے وہ زمین میں ٹک جاتی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ تمثیلیں بیان کرتا ہے۔ جن لوگوں نے اپنے رب کی دعوت کو قبول کیا ان کیلئے انجام کار کی فیروزمندی ہے اور جن لوگوں نے اس کی دعوت قبول نہیں کی اگر ان کو وہ سب کچھ حاصل ہو جائے جو زمین میں ہے اور اسی کے برابر اور بھی تو وہ اسے فدیہ ہی میں دے ڈالیں، یہی لوگ ہیں جن کا حساب بُرا اور ان کا ٹھکانہ جہنم ہوگا۔ اور وہ کیا ہی بُرا ٹھکانہ ہے۔

اور وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے عہد کو اس کے باندھنے کے بعد توڑتے ہیں اور اس چیز کو کاٹتے ہیں جس کو اللہ تعالیٰ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے۔ اور زمین میں فساد مچاتے ہیں، یہی لوگ ہیں جن پر لعنت ہے۔ اور ان کیلئے بُرا گھر ہے۔)

اَللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰى وَمَا تَغِيْضُ الْاَرْحَامُ وَمَا تَزْدَادُ ؕ وَكُلُّ شَیْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ ۝٨

(اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو (شکم میں) اٹھائے ہوئے ہوتی ہے کوئی مادہ اور وہ جانتا ہے جو کم کرتے ہیں رحم اور جو زیادہ کرتے ہیں اور ہر چیز اس کے نزدیک ایک اندازہ سے ہے۔) (سورۃ الرعد : ۸)

اللہ تعالیٰ کی صفتِ علم کا اظہار

نوعِ انسانی میں تمام بگڑے ہوئے لوگوں کی عموماً اور مشرکینِ عرب کی خصوصاً عقیدہ کی خرابیوں کا سبب بنیادی طور پر یہ تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی صفات کا علم بہت حد تک گم کر چکے تھے۔ جن صفات کو تسلیم کرتے تھے ان میں بھی مخلوق کی نارسائیوں اور کوتاہیوں کی آمیزش پائی جاتی تھی۔ اللہ تعالیٰ کا پیغمبران کی ہدایت کیلئے جن باتوں کی انھیں دعوت دیتا تھا وہ اپنے عقل و فکر کے پیمانوں کے مناسب نہ پا کر انھیں ماننے سے انکار کر دیتے تھے اور اپنے سوالوں میں ایسا رویہ اختیار کرتے تھے جس سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات کے بارے میں نہایت ناتمام بلکہ غلط تصور رکھتے ہیں۔ یوں تو اللہ تعالیٰ کی ہر صفت کا غلط تصور انسان کی گمراہی کا سبب بنتا ہے لیکن اس کی صفتِ علم سے متعلق انسان اگر گمراہی کا شکار ہو جائے تو وہ زندگی کی بیشتر راہوں میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔ چنانچہ اسی حقیقت کے باعث پیشِ نظر آیتِ کریمہ اور اس کے بعد کی آیات میں بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے علم کے حوالے سے بعض حقائق کا اظہار فرمایا ہے۔ سب سے پہلے انسان کی اپنی حیثیت کو زیرِ بحث لا کر اسے آئینہ دکھایا گیا ہے تاکہ اسے اندازہ ہو سکے کہ میں اپنی ذاتی حیثیت میں کس قدر متضاد واقع ہوا ہوں کہ نہایت پستی سے مجھے اٹھایا گیا ہے، گندے پانی کے ایک قطرے سے میری نشوونما کا آغاز ہوا ہے اور پھر حیرت انگیز طریقوں سے میں ماں کے پیٹ میں مختلف شکلیں اختیار کرتا رہا ہوں۔ اور پھر ماں کے پیٹ اور دنیا میں آمد کا سبب بجائے خود انتہائی کربناک اور حیرت انگیز ہے۔ اپنی پختہ عمر کو پہنچ کر آج جبکہ میں عقل و شعور کی معراج کو چھو رہا ہوں تو مجھے کچھ احساس ہی نہیں کہ میری تخلیق اور نشوونما کا کس پستی سے آغاز ہوا اور آج کن بلندیوں کو چھو رہا ہے۔ اب میں قدم قدم پر اللہ تعالیٰ کے علم اور اس کی قدرت کو چیلنج کر رہا ہوں۔ چنانچہ اسی بنیادی کمزوری کو واضح کرنے کیلئے اللہ تعالیٰ اپنے علم کی وسعتوں کی ایک جھلک دکھا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ تو وہ ہے جو ہر حاملہ وجود، چاہے وہ انسان ہو یا حیوان، کے

Marfat.com

حمل کی ایک ایک تبدیلی سے آگاہ ہے۔ مادہ منویہ سے آغاز ہونے والا یہ سفر جس طرح عہد بعہد تغیرات سے گزرا ہے اور یہ تغیرات صرف جسم تک محدود نہیں بلکہ قسمت کا بناؤ و بگاڑ سعادت وشقاوت کی تقسیم، رزق کی تنگی اور وسعت، عمر کی کمی بیشی، ہر چیز پر محیط ہے، پھر دنیا میں انسان کے آنے کے بعد اس کا گرد و پیش مزید حیرت میں ڈالنے والا ہے۔ اس زمین پر جو کچھ پیدا کیا گیا ہے اس آیتِ کریمہ میں فرمایا گیا ہے کہ ایک مقدار سے پیدا کیا گیا ہے۔ انسان کو سب سے زیادہ ضرورت پانی کی ہے، تو میدانی علاقوں میں پانی کے دریا بہا دیے گئے ہیں اور زمین کو سمندروں نے گھیر رکھا ہے اور پہاڑوں پر سردیوں میں برف جمتی ہے اور گرمیوں میں پگھل کر ندی نالوں کی روانی کا باعث بنتی ہے۔ اس کے بعد غذا کی ضرورت ہے، تو اللہ تعالیٰ نے زمین کو قوتِ روئیدگی سے مالا مال کر دیا ہے اور عناصرِ فطرت کو ہر اس چیز کی نگرانی اور افزائش پر لگا دیا ہے جس سے انسانوں اور حیوانوں کو غذا ملتی ہے۔ انسان بعض دفعہ اپنی فکری نارسائی کے باعث اللہ تعالیٰ کی تخلیقات کے بارے میں غلط فہمی اور گمراہی کا شکار ہو جاتا ہے اور وہ بھول جاتا ہے کہ قضا و قدر کے کارکن انسانوں سے بہتر بجٹ بنانے کی قدرت رکھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ پروردگار نے زمین پر کتنے وسائل پیدا کیے، اس لئے کھانے والوں کی تعداد کتنی ہونی چاہیے۔ انسانی علم ایسے موقع پر غلطی کا شکار ہو سکتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کا علم ہر طرح کی غلطی سے پاک ہے۔

عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْكَبِيْرُ الْمُتَعَالِ ۝ (سورۃ الرعد : ۹)

(وہ جاننے والا ہے ہر پوشیدہ اور ہر ظاہر چیز کو، عظیم اور عالی شان ہے۔)

سابقہ مضمون کی مزید تاکید

یہ سابقہ مضمون کی مزید توضیح و تاکید ہے کہ یہ مت سمجھو کہ اللہ تعالیٰ تمہاری ظاہری ضرورتوں کو جانتا ہے اور تمہاری ظاہری ضرورتوں کو پورا کرتا ہے بلکہ وہ جس طرح ظاہر کو جانتا ہے اسی طرح وہ غیب کو بھی جانتا ہے۔ تمہیں کیا خبر کہ وہ کیا کیا چیزیں ہیں جنھیں تم دیکھ نہیں سکتے لیکن وہ تمہاری منفعت کا سامان ہیں۔ اسی طرح وہ کیا قوتیں ہیں جن سے تمہیں نقصان پہنچ سکتا ہے لیکن قدرت تمہیں ان سے بچائے ہوئے ہے۔ تمہارے علم کی بساط صرف سامنے کی دنیا تک ہے لیکن اس سقفِ نیلگوں کے پیچھے اور حواس کی دنیا سے ماورا اور احساس و خیال سے بالا بھی کوئی دنیا ہے جسے انسان نہیں جانتا، لیکن اللہ تعالیٰ کا علم اس پر بھی غالب اور حاوی ہے۔ زمین و آسمان کی کوئی چیز اس کے علم سے باہر نہیں اور یہ بھی ممکن نہیں کہ کوئی اپنی طاقت سے اللہ تعالیٰ کے علم کے خزانوں میں نقب لگا سکے کیونکہ وہ جس طرح علم میں بڑا ہے اسی طرح قوت میں بھی بڑا ہے اور اس کی بڑائی عظمت و احترام تک محدود نہیں بلکہ وہ متعال ہے اپنی عظمت اور اپنی قوت کے بل بوتے پر سب پر غالب ہے۔ ایک ایک ذرے سے لے کر ایک ایک عظیم کُرّے تک سب اس کے سامنے جھکے ہوئے سرنگوں اور سجدہ ریز ہیں۔

سَوَآءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ بِهٖ وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍۢ بِالَّيْلِ وَسَارِبٌۢ بِالنَّهَارِ ۝ (سورۃ الرعد: ۱۰)

(اس کے علم میں) سب یکساں ہیں، تم میں سے وہ بھی جو آہستہ بات کرتا ہے اور وہ بھی جو زور سے بولتا ہے، شب کی تاریکی میں چھپا رہتا ہے اور دن کے وقت چلتا پھرتا ہے۔)

اس کے علمِ محیط کا عالم یہ ہے کہ کوئی شخص آہستہ بات کرے یا زور سے بولے، وہ سب کو جانتا ہے اور سب کو سنتا ہے۔ اس کے یہاں سرگوشیاں اور رازداریاں کسی اخفا کا سبب نہیں بنتیں۔ کوئی دن کے اجالے میں گھومے پھرے اور کوئی رات کی تاریکیوں میں چھپ کے رہے، اللہ تعالیٰ کے علم کے سامنے سب یکساں ہیں۔ تاریکی ہمارے لئے پردہ ہے، اللہ تعالیٰ کیلئے کوئی چیز پردہ نہیں بن سکتی۔ وہ انسانوں کے پکڑنے میں اس لئے جلدی نہیں کرتا کہ اسے اس بات کا اندیشہ نہیں کہ کوئی مجرم کہیں چھپ کر ہماری نظروں سے اوجھل ہو جائے گا اور یا ہماری ڈھیل دینے سے وہ طاقت پکڑ لے گا اور پھر شاید دوبارہ اسے گرفت میں لانا مشکل ہو۔

Marfat.com

لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ؕ وَاِذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ ﴿۱۱﴾ (سورة الرعد : ۱۱)

(انسان کیلئے یکے بعد دیگرے آنے والے فرشتے ہیں اس کے آگے بھی اور اس کے پیچھے بھی۔ وہ نگہبانی کرتے ہیں اس کی، اللہ تعالیٰ کے حکم سے۔ اللہ تعالیٰ کسی قوم کے ساتھ اپنا معاملہ اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی روش میں تبدیلی نہ کرے۔ اور جب اللہ تعالیٰ کسی قوم پر کوئی آفت لانے کا ارادہ کرلیتا ہے تو وہ کسی کے ٹالے نہیں ٹل سکتی اور ان کا اس کے مقابل میں کوئی مددگار بھی نہیں بن سکتا۔)

کارکنانِ قضاوقدر بھی انسان کی نگرانی کرتے ہیں

انسان کی اپنی اصلاح کیلئے یہ بات کفایت کرتی ہے کہ وہ اس بات کا یقین پیدا کرے کہ اللہ تعالیٰ ہر حال میں اسے دیکھ رہا ہے اور اس کا کوئی عمل کسی لمحے میں بھی اللہ تعالیٰ کے علم سے باہر نہیں یہی یقین ہے جو انسان کو اپنی زندگی بدلنے پر مجبور کرتا ہے۔ چنانچہ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں اسی یقین کو مزید مستحکم کرنے کیلئے ارشاد فرمایا کہ صرف یہی بات کافی نہیں کہ انسان ہر وقت اللہ تعالیٰ کی نگاہوں میں ہے۔ اسے اس بات کا بھی یقین رکھنا چاہیے کہ فرشتے انہیں ہر وقت گھیرے رہتے ہیں۔ ان کا ہر عمل فرشتے محفوظ کرلیتے ہیں۔ وہ جو کہتے ہیں اسے بھی لکھا جاتا ہے اور جو کرتے ہیں اس کا بھی ریکارڈ تیار کیا جاتا ہے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ جو شخص سراسر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں ڈوبا رہتا ہے ظاہر ہے کہ اس کے ریکارڈ میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے سوا اور کیا ہوگا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی رحمت کے قربان جایئے یہاں یہ بھی فرمایا جارہا ہے کہ وہ فرشتے صرف اعمال ہی کو محفوظ نہیں کرتے بلکہ انسانوں کی حفاظت بھی کرتے ہیں۔ آسمان سے برسنے والے پتھر جنہیں شہابِ ثاقب کہا جاتا ہے کروڑوں کی تعداد میں ہر شب زمین پر برستے ہیں لیکن انسانوں کی حفاظت کا پروردگار نے ایسا انتظام کر رکھا ہے کہ کوئی پتھر انسانوں تک پہنچ نہیں پاتا۔ مزید اسی طرح کے خطرات ہیں جن سے انسانوں کو واسطہ پڑسکتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی قدرت انسان کی حفاظت کرتی ہے۔ انجیل میں ٹھیک کہا گیا ہے کہ "سمندروں کے کنارے کس نے باندھ رکھے ہیں" سمندر اپنی بے پناہ وسعت کے باوجود زمین پر یلغار کیوں نہیں کردیتا۔ معلوم ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کی وہ حفاظت جو سمندروں کو آگے نہیں بڑھنے دیتی ممکن ہے وہ فرشتوں ہی کی صورت میں ہو کیونکہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی حفاظت کیلئے فرشتے آگے پیچھے رہتے ہیں اور طرح طرح کے مصائب سے اسے بچاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایک روز ایک آدمی حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے پاس آیا اور عرض کی کہ قبیلہ مراد کے چند آدمی آپ کو قتل کرنے کی سازش کر رہے ہیں۔ اس لئے اپنی حفاظت کا اہتمام فرمایئے۔ اقلیم یقین ورضا کے فرمانروا نے فرمایا: ہر شخص کے ساتھ دو فرشتے ہوتے ہیں جو اس کی حفاظت پر مامور ہوتے ہیں۔ جب تک وہ مقررہ گھڑی نہ آجائے اور جب وہ ساعت آجاتی ہے تو وہ فرشتے تقدیرِ الٰہی کے سامنے سے ہٹ جاتے ہیں اور موت کا مقررہ وقت ایک ایسا مضبوط قلعہ ہے جس میں وقت سے پہلے کوئی داخل نہیں ہوسکتا۔

اللہ تعالیٰ اور بندوں کے درمیان فیصلہ کن قانون

قریشِ مکہ کو اپنی خوشحالی پر بڑا ناز تھا بلکہ وہ اپنی امارت و ثروت کو مسلمانوں کے مقابلے میں اپنے برسرِ حق ہونے کی دلیل سمجھتے تھے۔ اس آیتِ کریمہ میں اشارہ فرمایا جارہا ہے کہ جس طرح تمہاری بداعمالیوں کے باوجود فرشتے تمہاری حفاظت سے پہلوتہی نہیں کرتے اور اللہ تعالیٰ کی قدرت تمہیں حالات کے رحم وکرم پر نہیں چھوڑ دیتی، اسی طرح تمہاری موجودہ حالت بھی خدا کی دَین ہے۔ یہ تمہارے لئے ایک آزمائش ہے اور تم اپنی جہالت سے اسے انعام سمجھ رہے ہو، لیکن تمہیں یاد رہنا چاہیے کہ کوئی حالت بھی ہمیشہ نہیں رہتی۔ ہر چیز اللہ تعالیٰ کے قبضے میں ہے۔ جب کوئی قوم اپنی سرکشی میں انتہا کو پہنچ جاتی ہے تو پھر ان کی خوشحالی بدحالی میں تبدیل ہوجاتی ہے اور بعض دفعہ اسے عذاب کا شکار کردیا جاتا ہے اور اسی طرح جب کوئی قوم اپنے اعمال واطوار کی اصلاح کرلیتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے نبیؐ کی دعوت کو قبول کرلیتی ہے تو وہ چاہے غریب اور پسماندہ کیوں نہ ہو اللہ تعالیٰ اس کی حالت کو بدل دیتا ہے اور زمین کی

Marfat.com

حاکیت عطا فرماتا ہے۔ تمھاری قسمت آج ترازو میں ہے کہ تم اپنے لئے کیا فیصلہ کرتے ہو۔ اگر تم نے اپنی سرکشی کا رویہ نہ بدلا تو کسی وقت بھی اللہ تعالیٰ کا عذاب ٹوٹ سکتا ہے اور اگر تم نے اللہ تعالیٰ کے دین کی علمبرداری کا منصب سنبھال لیا اور اپنے آپ کو اس کے بندوں میں شامل کرلیا تو اللہ تعالیٰ تمہیں دنیا میں وسیع عزت وعظمت عطا فرمائے گا کیونکہ ہر قوم کے حالات کی تبدیلی اس کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ وہ اپنے اعمال کو جیسا بنالے گی اسی کے مطابق پروردگار اپنا سلوک بھی بدل لے گا۔ جب بھی کوئی بندہ شکایت کرتا ہے تو ادھر سے آواز آتی ہے:

جب میں کہتا ہوں کہ یا اللہ میرا حال دیکھ

حکم ہوتا ہے کہ اپنا نامۂ اعمال دیکھ

تمھارے لئے بہتر یہ ہے کہ تم عذاب کی نشانیوں کا مطالبہ کرنے کی بجائے اس سنتِ الٰہی کی روشنی میں اپنے حالات کا جائزہ لو۔ لیکن اگر تم نے اپنی حالت بدلنے کی طرف توجہ نہ دی تو پھر یاد رکھو جب اللہ تعالیٰ کسی قوم پر عذاب لانے کا فیصلہ کرلیتا ہے تو پھر اس کو ٹالنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ اور نہ کوئی ایسا کارساز اور مددگار رہتا ہے جو اس مصیبت میں کام آئے۔ مشرکینِ مکہ کی یہ سوچ کہ فرشتے انھیں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچالیں گے یا وہ بت کام آئیں گے جن کی یہ پوجا کرتے رہتے ہیں سراسر ایک مہمل خیال ہے، وہاں صرف ایمان وعمل کا سکہ چلتا ہے، ایسے وقت میں کوئی کسی کو بچا نہیں سکتا۔

هُوَ الَّذِیْ یُرِیْکُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّ طَمَعًا وَّیُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ ﴿۱۲﴾ (سورۃ الرعد : ۱۲)

(وہی ہے جو تمہیں دکھاتا ہے بجلی جو خوف بھی پیدا کرتی ہے اور امید بھی اور ابھارتا ہے بوجھل بادلوں کو۔)

آفاق کی بعض نشانیوں کی طرف اشارہ

اللہ تعالیٰ کی قدرت کی بے پناہی کو مزید نمایاں کرنے کیلئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ وہ ہے کہ جب تم تلی ہوئی گھٹا اور تنے ہوئے بادل کو دیکھتے ہو تو تمھارا دل بلیوں اچھلنے لگتا ہے کہ اب بارش ہوگی خشک میدانوں میں ہریاول کی صورت میں زندگی بہار دے گی، کھیتیاں لہلہائیں گی۔ ہر چیز میں زندگی کی رو دوڑ جائے گی، لیکن بارش سے پہلے جب بجلی چمکتی ہے تو ایک طرف اگر بارش کا تصور کرکے تمھارے دلوں میں امیدوں کے چراغ جلنے لگتے ہیں تو ساتھ ہی بادل کی کڑک تمھارے دلوں میں خوف بھی پیدا کرتی ہے کیونکہ امید وبیم کا سررشتہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ چاہے تو بادلوں کو رحمت کی گھٹا بنادے اور چاہے تو انھیں کے اندر سے طوفانِ نوح اُبل پڑے اور بجلیاں برس کر ہر چیز کو جلا کے بھسم کردیں، جس پروردگار کی قدرتوں کا یہ عالم ہے انسان جب اس کے بارے میں غفلت کا شکار رہتا ہے تو اس کا گردوپیش کبھی اس پر روتا ہے اور کبھی اس کی حماقتوں پر ہنستا اور مسکراتا ہے۔

وَیُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَالْمَلٰٓئِکَةُ مِنْ خِیْفَتِهٖ ۚ وَیُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَیُصِیْبُ بِهَا مَنْ یَّشَآءُ وَهُمْ یُجَادِلُوْنَ فِی اللّٰهِ ۚ وَهُوَ شَدِیْدُ الْمِحَالِ ﴿۱۳﴾ (سورۃ الرعد : ۱۳)

(اور تسبیح کرتی ہے بجلی کی گرج اس کی حمد کے ساتھ اور فرشتے بھی اس کے ڈر سے اس کی تسبیح کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کڑکتی بجلیاں بھیجتا ہے پھر انھیں گراتا ہے جس پر چاہتا ہے اس حال میں کہ لوگ اللہ تعالیٰ کے بارے میں جھگڑ رہے ہوتے ہیں اور وہ بڑی ہی زبردست قوت والا ہے۔)

انسان کے بگاڑ کے اسباب

انسان کے بظاہر بگڑنے کے جو اسباب ہیں ان میں ایک اہم ترین سبب انسان کا پیکرِ محسوس کا خوگر رہنا ہے۔ وہ بالعموم پردوں کے پیچھے جھانکنے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ پردوں ہی کو اصل قرار دے کر انھیں غیر معمولی حیثیت دے دیتا ہے۔ مظاہرِ فطرت یا مظاہرِ قدرت کے بارے میں انسانوں کے اعتقادات کا فساد اسی سبب سے پیدا ہوا ہے۔ وہ سورج کو چمکتا ہوا اور چاند کو دمکتا ہوا دیکھ کر انھیں کو قدرت کا سرچشمہ سمجھ لیتا ہے۔ پانی کی قوت اور منفعت

Marfat.com

کو دیکھ کر اس کو دیوتا مان لیتا ہے۔ وہ کبھی اس ذات کے بارے میں نہیں سوچتا جس نے ان کو قوتیں دے رکھی ہیں۔ پیشِ نظر آیت کریمہ میں بھی یہی بات فرمائی جارہی ہے کہ تم بادلوں کی گرج اور بجلی کی کڑک اور فرشتوں کے بارے میں عجیب وغریب اعتقادات رکھتے ہو۔ کاش تمہیں معلوم ہوتا کہ بادل جب گرجتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتا ہے اور بجلی جب چمکتی ہے تو اللہ تعالیٰ کی تحمید کرتی ہے اور جن فرشتوں کو تم اللہ تعالیٰ کے شریک بنا چکے ہو وہ ہر وقت فرمانبردار غلاموں کی طرح لرزاں وترساں اپنے فرائض ادا کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ وہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے جلال وجبروت کا تصور کر کے سہمے رہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ رعد وبرق کی اپنی حیثیت اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے لشکروں میں سے ایک لشکر ہے اور انسانوں کی نفع رسانی کیلئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے انھیں مقرر کیا گیا ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی کو ان لشکروں سے مارنا چاہتا ہے تو یہ بجلیاں بم بن کر ان پر برستی ہیں اور جو قوت وہیبت کے دعویدار دنیا کو اپنی قوت سے ڈراتے رہتے ہیں جب وہ اللہ تعالیٰ کی بجلیوں کے نشانے پر آتے ہیں انھیں پتہ ہی نہیں چلتا کہ کب ان کو ہدف بنا لیا گیا۔ اس لئے ان بجلیوں کے ضرر سے بچنے کیلئے رسول اللہ ﷺ نے ہمیں اسی حوالے سے اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرنے کا حکم دیا۔ ارشاد فرمایا کہ جب بادل گرجے اور بجلی کڑکے تو جو شخص یہ کلمات پڑھے اگر اس کو بجلی سے نقصان پہنچے تو اس کی دیت کا میں ذمہ دار ہوں۔ سُبْحَانَ مَنْ يُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِيْفَتِهٖ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْر

وَهُوَ شَدِيْدُ الْمِحَالِ: اہلِ علم نے اس کا ایک معنی تو یہ کیا ہے کہ وہ بڑی ہی زبردست قوت والا ہے جس کی بے شمار مخلوقات میں سے ایک ادنیٰ مخلوق اور جس کے ان گنت لشکروں میں سے ایک چھوٹا سا لشکر بڑے سے بڑے جبار کو ایک لمحے میں بھسم کر کے رکھ دے اس کی قوت کا کیا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ اور ایک دوسرا اس کا ترجمہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرف منسوب ہے کہ وہ بڑی ہی سخت گرفت والا ہے۔ اس لحاظ سے اس کا ایک شانِ نزول بھی بیان کیا جاتا ہے۔

حضرت حسنؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے عرب کے ایک نہایت سرکش کافر کو اسلام کی دعوت دینے کیلئے اپنے اصحاب کی ایک جماعت بھیجی۔ انھوں نے اس کو دعوت دی۔ کہنے لگا، محمد ﷺ کا رب کون ہے، جس کی تم مجھے دعوت دیتے ہو۔ کیا وہ سونے کا ہے یا چاندی کا؟ یا لوہے کا یا تانبے کا؟ مسلمانوں کو یہ بات بہت گراں گزری اور انھوں نے واپس جا کر سیّد عالم ﷺ سے عرض کیا کہ ایسا اکفر سیاہ دل سرکش دیکھنے میں نہیں آیا۔ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اس کے پاس پھر جاؤ۔ اس نے پھر وہی گفتگو کی اور اتنا اور کہا کہ میں محمد ﷺ کی دعوت قبول کر کے ایسے رب کو مان لوں جسے نہ میں نے دیکھا نہ پہچانا۔ یہ حضرات پھر واپس آئے اور انھوں نے عرض کیا کہ حضورؐ! اس کا خبث تو اور ترقی پر ہے۔ فرمایا، پھر جاؤ۔ بتعمیل ارشاد پھر گئے۔ جس پر اس سے گفتگو کر رہے تھے وہ ایسے ہی سیاہ دلی کی باتیں کر رہا تھا۔ ایک ابر آیا، اس سے بجلی چمکی اور کڑک پیدا ہوئی اور بجلی گری اور اس کافر کو جلا دیا۔ یہ حضرات اس کے پاس بیٹھے رہے۔ جب وہاں سے واپس ہوئے تو راہ میں انھیں اصحابِ اکرام کی ایک اور جماعت ملی۔ وہ کہنے لگے، کہیے وہ شخص جل گیا ہے۔ ان حضرات نے کہا، آپ صاحبوں کو کیسے معلوم ہوگیا؟ انھوں نے فرمایا، سیّد عالم ﷺ کے پاس وحی آئی ہے اور اس کے بعد یہ آیت پڑھی۔ (خزائن العرفان)

لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ ؕ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ بِشَيْءٍ اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ اِلَى الْمَآءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ ؕ وَمَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ﴿۱۴﴾ (سورة الرعد : ۱۴)

(اسی کو پکارنا سچ ہے، رہے وہ لوگ جن کو یہ اس کے سوا پکارتے ہیں۔ وہ انھیں کچھ بھی جواب نہیں دے سکتے۔ ان کا پکارنا ایسا ہی ہے کہ کوئی اپنے دونوں ہاتھ پانی کی طرف پھیلائے کہ وہ اس کے منہ میں پہنچ جائے۔ درانحالیکہ وہ کسی طرح اس کے منہ پر پہنچنے والا نہ ہو۔ ان کافروں کی فریاد محض صدا بصحرا ہوگی۔)

Marfat.com

نتیجہ خیز پکارنا صرف اللہ تعالیٰ کو پکارنا ہے

گزشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ کی وسعتِ علم اور بے پایاں قدرت کو مختلف پیرایوں سے بیان کر کے یہ ثابت فرمایا ہے کہ بلاشبہ انسانی زندگی میں کئی دفعہ ایسے مواقع آتے ہیں جب آدمی ظاہری اسباب سے مایوس ہو کر مسبب الاسباب کو پکارتا ہے یا ان قوتوں کو پکارتا ہے جن کے بارے میں اس نے یہ گمان کر لیا ہے کہ انھیں غیر معمولی قوتیں حاصل ہیں چاہے وہ پتھر کے بت ہوں یا انسانی شکلوں میں چلتے پھرتے اللہ تعالیٰ سے خاص تعلق کے دعویدار ہوں۔ چاہے وہ غیبی قوتیں ہوں جو انسان کی نظر سے اوجھل ہیں لیکن وہ ان کی قوتوں پر بے پناہ یقین رکھتا ہے۔ ان تمام کی طرف توجہ دلا کر ارشاد فرمایا جا رہا ہے کہ انسانو! تم خود ہی فیصلہ کرو کہ جب تم مدد کیلئے دستِ سوال دراز کرتے ہو اور اپنی بے بسی کا واسطہ دے کر اپنی بے بسی کا علاج چاہتے ہو تو کیا تمہیں دستِ سوال ایسی قوتوں کے سامنے پھیلانا چاہیے جو خود دوسروں کے دست نگر، زندگی سے تہی دامن اور ہر طرح کے اختیار سے عاجز ہیں انھیں پکارنے کی مثال تو ایسی ہے جیسے کوئی احمق کنویں میں منڈیر پر بیٹھ کر کنویں کے تلوے میں موجود پانی کی طرف ہاتھ پھیلا کر پانی سے درخواست کرے کہ میں پیاس سے مر رہا ہوں، میری حالت پر رحم کھا اور میرے منہ میں داخل ہو کر میری پیاس کو بجھا دے جبکہ اسے معلوم ہے کہ وہ پانی نہ دیکھتا ہے اور نہ سنتا ہے اور نہ وہ اس کے منہ تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہے۔ وہ زندگی بھر بھی اسے پکارتا رہے، پانی کبھی اس کے منہ تک نہیں آئے گا اور کبھی بھی اس کی پیاس سیرابی سے آشنا نہیں ہوگی۔ وہ کیسی ہی دلسوزی سے اپنی پیاس کا اظہار کرے اور کتنا ہی پھیپھڑوں کا زور لگا کر پانی کا نام لے لے کر پکارتا رہے اس کی آواز صدا بصحرا ہو کے رہ جائے گی۔ اگر غور کیا جائے تو پکارنے والے کی ناکامی کا سبب صرف یہ ہے کہ اس نے اسے پکارا جس کے پاس اس کی پکار کا جواب نہ تھا اور اس آستانے سے اس نے گریز کیا جس آستانے پر ہر ایک کو مرادیں ملتی اور ہر ایک کی قسمت بنتی اور سنورتی ہے۔

ممکن ہے کسی کو اس مثال میں اجنبیت کا احساس ہو لیکن قرآنِ کریم چونکہ ٹھیٹھ عربی زبان اور ٹھیٹھ عربی مزاج کے مطابق نازل ہوا ہے کیونکہ عرب ہی اس کی اولین مخاطب تھے اور انھی کی حیثیت اسلام کیلئے ہراول دستے کی تھی۔ ان کے جب ہم معروف کو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ عرب جب کسی شخص کو دیکھتے کہ وہ ایک بے فائدہ کوشش کر رہا ہے تو وہ اس کیلئے القابض علی الماء بطور ضرب المثل پیش کرتے تھے۔ امام لغت ونحو ابوعبیدہ نے بطور استشہاد یہ شعر بھی پیش کیا:

وَاِنِّیْ وَاِیَّاکُمْ وَشَوْقًا اِلَیْکُمْ
کَقَابِضِ مَاءٍ لَّمْ یَسَعْهُ الْاَنَامِلُ

وَلِلّٰهِ یَسْجُدُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ﴿۱۵﴾ السجدۃ (سورۃ الرعد: ۱۵)

(اور اللہ تعالیٰ ہی کو سجدہ کر رہے ہیں جو بھی آسمانوں اور زمین میں ہے، خوشی سے اور مجبوراً اور ان کے سائے بھی (سجدہ ریز ہیں) صبح کے وقت بھی اور شام کے وقت بھی۔)

ہر چیز کی تکوینی شہادت

یہ انسان کی کج فکری ہے کہ وہ اس قدر برخود غلط ہو جاتا ہے کہ کسی کے سامنے جھکنا بھی اسے گوارا نہیں ہوتا۔ وہ اپنے تئیں یہ سمجھتا ہے کہ مجھے جو اختیار اور اقتدار ملا ہے اس کی موجودگی میں میں کسی اور کی اطاعت کروں یا کسی کی ہدایت قبول کروں یا کسی کے سامنے جھکوں یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ میں بقدرِ استطاعت دوسروں کو اپنے سامنے جھکاؤں گا اور اپنی فرعونیت کا صور ہمت سے بڑھ کر پھونکنے کی کوشش کروں گا۔ لیکن ایسا شخص دو باتیں بھول جاتا ہے ایک تو یہ بات کہ جسے وہ اپنی فرعونیت سمجھتا ہے وہ درحقیقت ہوائے نفس کا اتباع ہے۔ وہ جو جی میں آتا ہے وہ کرتا ہے اور جسے اس کا دل کہتا ہے یہی درحقیقت اس کا معبود ہے۔ ایسے لوگ بعض دفعہ دوسروں سے زیادہ کمزور ثابت ہوتے ہیں اور دوسری بات جسے وہ نظر انداز کر دیتا ہے وہ یہ ہے کہ اگر وہ اپنی جسمانی قوتوں اور ضرورتوں پر غور کرے تو اسے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ قدم قدم پر اختیاری طور پر نہ سہی تکوینی طور پر اس ذات کا مطیع اور فرمانبردار ہے

Marfat.com

جس نے اس کو جسم و جان دیے اور قوتیں عطا کیں۔ ایک آدمی کو جب بھوک لگتی ہے تو وہ کھانے پر مجبور ہے، پیاس لگتی ہے تو پینے پر مجبور ہے، موسم کی شدت پریشان کرتی ہے تو پہننے پر مجبور ہے اور یہ کھانا پینا اور پہننا بھی اپنی مرضی سے نہیں بلکہ اسی کی مرضی سے ہوگا جس نے بھوک مٹانے، پیاس بجھانے کی صلاحیت پیدا کی۔ اسی طرح ایک آدمی جو اپنی زبان اور دل سے اللہ تعالیٰ کا اقرار اور اس کی تصدیق سے انکار کرتا ہے وہ بھی اس بات پر مجبور ہے کہ جب بولے تو زبان سے بولے اور جب تصدیق کرے تو دل سے کرے۔ اور یہ زبان سے بولنا اور دل سے تصدیق کرنا یہ وہ تکوینی قانون ہے جسے اللہ تعالیٰ نے مقرر کر رکھا ہے۔ اور ہر شخص اسی کا پابند ہے۔ اس نے حکم دے رکھا ہے کہ جب سوچو، دماغ سے سوچو۔ جب چلو، پاؤں سے چلو۔ جب محسوس کرو، تو حواس کے ذریعے محسوس کرو۔ اسی پر باقی تمام طبعی اور تکوینی قوانین کو قیاس کر لیجیے جس سے آدمی کو یقین کرنا پڑتا ہے کہ میں خواہی نخواہی اللہ تعالیٰ ہی کے احکام کی تعمیل کرنے پر مجبور ہوں اور کچھ نہیں تو آدمی اتنا ہی سوچے کہ زندگی کسی کی عطا ہے، میں جسے گزار رہا ہوں۔ اور اس کا گزرنا بھی اس کے پیدا کرنے والے کے ہاتھ میں ہے۔ اسی طرح ایک دن ایسا آئے گا جب میری زندگی کا دیا بجھا دیا جائے گا۔ میں ہزار کوشش کروں کہ مجھے زندگی کے چند لمحے اور مل جائیں لیکن ایسا ممکن نہیں ہوگا۔ یہی وہ بات ہے جس کے بارے میں اس آیتِ کریمہ میں ارشاد فرمایا جا رہا ہے کہ زمین و آسمان میں جو مخلوقات بھی آباد ہیں وہ طوعاً و کرہاً اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر مجبور ہیں۔ اطاعت سے مراد اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اس کے احکام کی اطاعت ہے۔ اس کی مثال دیتے ہوئے فرمایا کہ تم ہر چیز کے سائے کو دیکھ لو وہ صبح و شام اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ ریز ہیں۔ اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ ہر چیز کا سایہ مغرب یا مشرق کی طرف یہ ہمارا روز کا دیکھا جانے والا ماجرہ ہے۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ سجدے سے مراد اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اطاعت ہے۔ اس لحاظ سے بھی دیکھا جائے تو کائنات میں ایسی کونسی سے چیز ہے جو اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ احکام کی اطاعت کرنے پر مجبور نہیں۔ سورج چمکتا ہے، چاند دمکتا ہے، زمین بچھی ہوئی ہے اور یہ سب اپنے اپنے مدار میں گردش کر رہے ہیں۔ ان میں کوئی بھی اپنی اس روش سے سرتابی نہیں کرسکتا جس کا انھیں حکم دیا جا چکا ہے۔

قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قُلِ اللّٰهُ ؕ قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ لَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا ؕ قُلْ هَلْ يَسْتَوِى الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۙ اَمْ هَلْ تَسْتَوِى الظُّلُمٰتُ وَالنُّوْرُ ۚ اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ خَلَقُوْا كَخَلْقِهٖ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ ؕ قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَىْءٍ وَّهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۱۶﴾ (سورة الرعد : ١٦)

(اے پیغمبر ان سے پوچھیے آسمانوں اور زمین کا پروردگار کون ہے۔ کہہ دیجیے، اللہ تعالیٰ۔ ان سے پوچھیے تو کیا اس کے بعد تم نے اس کے سوا ایسے کارساز بنا رکھے ہیں جو خود اپنی ذات کیلئے بھی نہ کسی نفع پر کوئی اختیار رکھتے ہیں اور نہ کسی ضرر پر۔ ان سے پوچھیے کیا اندھے اور بینا دونوں یکساں ہیں یا کیا روشنی اور تاریکی دونوں برابر ہیں۔ کیا انھوں نے خدا کے ایسے شریک ٹھہرائے ہیں جنھوں نے اسی کی طرح خلق کیا ہے، جس کے سبب سے ان کو خلق میں اشتباہ لاحق ہوگیا ہے۔ آپؐ کہہ دیجیے اللہ تعالیٰ ہی ہر چیز کو پیدا کرنے والا ہے۔ اور وہ ایک ہے سب پر غالب ہے۔)

مشرکین کے اعتقادی تضاد سے استدلال

جب یہ بات واضح ہو چکی کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت بے پناہ ہے، اس کا علم بے پایاں ہے، کائنات کی ہر چیز تکوینی طور پر اسی کے سامنے سجدہ ریز ہے۔ جو لوگ اسے ماننے سے انکار کرتے ہیں طبعی اور جبلی طور پر اسی کے احکام کے تابع اور اسی کے بندے ہیں۔ اس وضاحت کے بعد کفار سے پوچھا جا رہا ہے کہ تم اگر اس وضاحت کو تسلیم کرتے ہو تو پھر بتاؤ آسمانوں اور زمین کا رب کون ہے۔ یہاں رب پروردگار اور مالک کے معنی میں استعمال ہوا ہے کہ جب یہ بات واضح ہوگئی کہ ہر مخلوق اسی کے تابع ہے اور اسی کا رزق کھا رہی ہے تو پھر اس میں کیا شبہ باقی رہ جاتا ہے کہ اس کائنات کا مالک بھی اللہ تعالیٰ ہے اور اس کا پروردگار اور رازق بھی اللہ تعالیٰ ہے۔ لیکن مشرکینِ مکہ سے جب یہ بات پوچھی گئی تو انھوں نے چپ سادھ لی، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ہم چونکہ اللہ تعالیٰ ہی کو خالق اور مالک جانتے ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ شرک بھی کرتے ہیں جبکہ یہ دونوں باتیں ایک ساتھ نہیں چل سکتیں۔ چنانچہ اس وجہ سے انھوں نے عافیت اسی میں بھی کہ اس سوال کا جواب ہی نہ دیا جائے۔ آنحضرت ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے ان کی

Marfat.com

خفت کوزبان دی اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ہی خالق و مالک ہے۔ جب اس پر وہ خاموش رہے تو اس کا مطلب یہ تھا کہ انھیں اس جواب سے کوئی اختلاف نہیں، تو تب اللہ تعالیٰ کے حکم سے آپ ؐ نے فرمایا کہ جب تمہیں یہ سب کچھ تسلیم ہے تو پھر تم نے اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر ایسے کارساز اور اولیاء کس طرح بنا لئے ہیں جو اپنے تئیں نہ کسی نفع کے مالک ہیں اور نہ ضرر کے، کیونکہ کوئی مخلوق بھی اپنے لئے جو نفع حاصل کرتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے امکانات اور وسائل سے حاصل کرتی ہے۔ اپنی ذات میں کوئی بھی کسی نفع نقصان کے حصول کا مالک نہیں۔

مندرجہ بالا تمام باتیں جنھیں قریشِ مکہ قبول کر چکے ہیں ان میں سے کوئی بات ایسی نہیں جو عقل اور فطرت کے خلاف ہو۔ جو شخص بھی کھلی آنکھوں سے اس کائنات کو دیکھتا ہے اسے جابجا اللہ تعالیٰ کی قدرت نظر آتی ہے۔ اور جو شخص اپنی عقل کے ذریعے اس کائنات میں غور کرتا ہے تو اسے اس کائنات کا نظم و ترتیب، اس کائنات کے ذرے ذرے میں پھیلی ہوئی حکمت اور کائنات کی ایک ایک مخلوق کی ضرورتوں کو بہم پہنچانے کیلئے اللہ تعالیٰ کی مشیت اور رحمت کی ہمہ گیر کارفرمائی اس بات کو ماننے پر مجبور کرتی ہے کہ حواس اور عقل کا فیصلہ اس کے سوا ممکن ہی نہیں کہ اس کائنات کا خالق و مالک ایک ہی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ ہے۔ کیونکہ حواس بھی اسی کی طرف رہنمائی کرتے ہیں اور عقل بھی اسی کا فتویٰ دیتی ہے، لیکن مشرکینِ مکہ کا عمل چونکہ سراسر اس کے خلاف تھا اس لئے ان سے پوچھا گیا کہ تم اپنے عقائد اور اعمال میں جس اندھے پن کا شکار ہو اور تمہیں اس پر اصرار بھی ہے تو کیا تمھارے نزدیک اندھا اور آنکھوں والا برابر ہوتا ہے۔ کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ ہاں تاریکی میں اندھا اور بینا برابر ہوتے ہیں۔ اس لئے فوراً فرمایا کہ کیا تاریکی اور روشنی برابر ہیں اور اگر اس کا جواب نفی میں ہے تو پھر تمہیں اپنی حالت پر نادم ہونا چاہیے۔ تاریکی کا مسافر بننے کی بجائے تمہیں روشنی کا مسافر بننا چاہیے۔ اور اگر گندگی کے کیڑے کی طرح (کہ وہ باہر رہنے کا تصور کر ہی نہیں سکتا) تم بھی ظلمتوں کے اسیر ہو کر رہ گئے ہو تو پھر یہ بتاؤ کہ جو لوگ ظلمت اور نور کے فرق کو جان چکے ہیں اور جن کے سامنے ظلمت کی حقیقت بھی کھل چکی ہے اور نور کی بھی، وہ آخر اپنی آنکھیں کہاں پھوڑ لیں۔ وہ کس طرح تاریکی کو نور قرار دے دیں اور نور کو تاریکی۔

ظلمات سے مراد وہ تمام گمراہیاں، تمام غلط خیالات اور خواہشاتِ نفس کے تمام مفاسد ہیں جنھیں انسانی فکر نے پیدا کیا ہے اور یا انبیائے کرام علیہم السلام کی دعوت کی مخالفت کے نتیجے میں قوموں نے از خود وہ راستے اختیار کئے ہیں اور نور سے مراد وہ روشنی ہے جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس کے نبیوں پر نازل ہوتی ہے جس میں صحیح فکر، صحیح علم، صحیح منزل اور صحیح راستے کی خبر دی جاتی ہے، جس میں علم و اخلاق کے رشتے کو جوڑا جاتا ہے اور جس میں کائنات سے اللہ تعالیٰ کے رشتے کی اور اللہ تعالیٰ سے کائنات کے رشتے کی وضاحت کی جاتی ہے۔ اور جس میں انسانی زندگی کی ایک ایک چول اپنی جگہ بٹھا دی جاتی ہے تو پھر مزید کسی رہنمائی کی ضرورت نہیں رہتی۔ ظلمتوں یعنی گمراہیوں کے راستے بیشمار ہیں۔ اس لئے ظلمات کو ہر جگہ جمع لایا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ کی انسانوں کیلئے رہنمائی ہمیشہ ایک ہی رہی ہے جسے انبیائے کرام ؑ پر اتارا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے نور کو ہمیشہ واحد لایا گیا ہے۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں بھی نور واحد استعمال ہوا حالانکہ اس کی جمع انوار عربی زبان میں نہ صرف مستعمل ہے بلکہ غیر فصیح بھی نہیں، لیکن یہ انسانی فکر اور عمل کا حادثہ ہے کہ انسان نے ایک نور کی رہنمائی پر کفایت نہ کرتے ہوئے فکری اور عملی ظلمتوں کو زندگی کا رہنماء بنا لیا ہے اور بڑی ڈھٹائی کے ساتھ انبیائے کرام ؑ کی دی ہوئی روشنی پر ان تاریکیوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ اسی ڈھٹائی کا نتیجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جیسی قادرِ مطلق ذات کے ساتھ ان قوتوں کو شریک بنا رکھا ہے جو اپنے لئے نفع و ضرر کی مالک بھی نہیں۔ اور فطرت اور وحیِ الٰہی کی روشنی کے مقابلے میں ظلمتوں کا اسیر بن کر بے بصری اور بے بصیرتی کا ثبوت دے رہے ہیں اور انھیں اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ ہم نے کس طرح نور پر ظلمتوں کو ترجیح دے دی ہے اور اپنے لئے اندھا پن اختیار کر لیا ہے۔

ان کی نادانیوں اور گمراہیوں کی داستان سمیٹتے ہوئے ارشاد فرمایا: کہ تم اللہ تعالیٰ کو بالاتفاق خالقِ کائنات جانتے ہو، اس کے باوجود تم نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کچھ دوسری قوتوں کو شریک بنا رکھا ہے تو کہیں اس کی یہ وجہ تو نہیں کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے ایک ایک چیز کو تخلیق فرمایا ہے اور وہ ساری کائنات کا خالق ہے، اسی طرح تمھارے شرکاء نے بھی کچھ چیزیں خلق کی ہیں اور اس طرح سے تم پر یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا کہ اس کائنات کا خالق اللہ تعالیٰ ہی ہے یا دوسرے شرکاء بھی، حالانکہ تم جانتے ہو کہ تم ایسی کسی الجھن میں مبتلا نہیں ہو بلکہ اللہ تعالیٰ کے خالق ہونے میں تمہیں کوئی اشتباہ نہیں تو پھر تم نے شرک کیلئے گنجائش کیسے نکالی۔

Marfat.com

فیصلہ کن اعلان

آیتِ کریمہ کے آخر میں مشرکینِ مکہ کی بے اعتدالیوں کا ذکر ختم کرتے ہوئے فیصلہ کن انداز میں آنحضرت ﷺ کو حکم دیا کہ، اے پیغمبر آپ ان مشرکین سے صاف صاف فرما دیجیے کہ اللہ تعالیٰ ہی ہر چیز کا خالق ہے اور تخلیق کائنات میں کسی کو کوئی دخل نہیں، کم از کم اس حد تک تم اللہ تعالیٰ کے معاملے میں عقیدہ کے اعتبار سے سچے ہو لیکن اس عقیدے کے جو لازمی نتائج ہیں نہ جانے تمہاری فکر وہاں پہنچنے سے کیوں رک جاتی ہے۔ بالکل سامنے کی بات ہے کہ جو ذات ساری کائنات کی خالق ہوگی وہی اس کائنات کی مدبر بھی ہوگی، وہی اس کائنات کی حاکمِ حقیقی بھی ہوگی۔ تنہا اسی ذات کا حکم کائنات میں جاری و ساری ہوگا۔ اس کائنات کے فیصلوں میں کوئی اس کا شریک نہیں ہوگا۔ اور دوسری یہ بات جو صرف لازمی نتیجہ کے طور پر نہیں بلکہ امر واقعہ بھی ہے کہ جس طرح ایک ہی ذات اس کائنات کی خالق ہے اور وہ ہر طرح کے شرک سے پاک ہے اسی طرح وہی اس کائنات کی قہار بھی ہے۔ قہار اس ہستی کو کہتے ہیں جو اپنے زور سے سب پر حکم چلائے اور سب کو مغلوب کر کے رکھے۔ کائنات میں کوئی مخلوق اس کے سامنے چوں چرا نہیں کر سکتی۔ نہ کوئی اس کی ذات میں شریک ہے، نہ صفات میں، نہ اختیارات میں اور نہ حقوق میں۔ یہ تینوں باتیں ایک دوسرے کیلئے لازم و ملزوم ہیں کہ جو ذات ساری کائنات کی خالق ہے وہ یقیناً واحد ہوگی کیونکہ کوئی مخلوق خالق نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح وہ قہار بھی ہوگی کیونکہ خالق کے سامنے مغلوب ہو کے رہنا تصورِ مخلوقیت کا لازم جزء ہے، کیونکہ اگر غلبۂ کامل خالق کو حاصل نہ ہو تو وہ خلق ہی کیسے کر سکتا ہے۔ اس لئے تینوں باتوں کا اعلان اس آیتِ کریمہ کے آخر میں آنحضرت ﷺ سے کرایا گیا کہ اللہ تعالیٰ ہی ہر چیز کا خالق ہے، وہی یکہ اور تنہا ہے، کوئی اس کا شریک نہیں اور وہی سب پر غالب ہے۔

اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا ؕ وَمِمَّا يُوْقِدُوْنَ عَلَيْهِ فِى النَّارِ ابْتِغَآءَ حِلْيَةٍ اَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ؕ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً ۚ وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِى الْاَرْضِ ؕ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ ؕ ﴿۱۷﴾ (سورة الرعد : ۱۷)

(اس نے آسمان سے پانی اتارا تو وادیاں اپنے اپنے اندازے کے مطابق بہہ نکلیں، پھر سیلاب کی رو نے ابھرا ہوا جھاگ اٹھا لیا اور جن چیزوں کو آگ کے اندر تپاتے ہیں، زیور بنانے کیلئے یا دیگر سامان بنانے کیلئے، اس میں بھی ویسا ہی جھاگ اٹھتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ حق و باطل کو ٹکراتا ہے، پس جھاگ تو رائیگاں چلا جاتا ہے لیکن جو چیز لوگوں کو نفع پہنچانے والی ہے وہ زمین میں ٹک جاتی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ تمثیلیں بیان کرتا ہے۔)

بعض حقائق کا استحضار

مکی زندگی میں اگر ایک طرف عقائد کی کشمکش جاری ہے تو دوسری طرف اس کشمکش نے حق و باطل میں ٹکراؤ کی صورت اختیار کر لی ہے۔ باطل ہر قیمت پر اہلِ حق کو ہزیمت دینے پر تلا ہوا ہے۔ مختلف قسم کے شبہات اٹھا کر حق کے بارے میں بدگمانیاں پیدا کی جا رہی ہیں اور اہلِ حق کو روح فرسا اذیتیں پہنچا کر توڑنے کی کوشش ہو رہی ہے اور ان اذیتوں اور ناگفتہ بہ حالات میں چونکہ کوئی تبدیلی نہیں آ رہی اس لئے مسلمانوں میں مایوسی پیدا کرنے کی بھی کوشش جاری ہے۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں ان تمام حوالوں سے قرآن کریم نے مسلمانوں کو اطمینان کا سامان بہم پہنچایا ہے اور اہلِ باطل کو آئینہ دکھایا ہے۔ ارشاد فرمایا، کہ تم اگر معنوی اور روحانی حقائق کو نہیں سمجھتے ہو تو ہم تمہیں ایک مثال سے سمجھاتے ہیں جو تمہاری آنکھوں دیکھی مثال ہے۔ تم نے بارہا دیکھا ہوگا کہ موسمِ برسات میں گھٹائیں اٹھتی ہیں، زمین کو زندگی دینے کیلئے بارشیں برستی ہیں، تیز بارش کے نتیجے میں وادیاں اور ندی نالے اپنی اپنی وسعت اور ظرف کے مطابق بہنا شروع کر دیتے ہیں۔ پانی جب سیل کی صورت اختیار کرتا ہے تو راستے میں آنے والے کوڑے کرکٹ کی رکاوٹ سے ایک جھاگ اٹھتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ جھاگ پانی کو بہنے سے روک دے گا اور زمین ویسی کی ویسی خشک اور بنجر رہ جائے گی لیکن ایسا نہیں ہوتا۔

Marfat.com

اس میں ہمیں تین باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ پہلی بات یہ کہ زمین کی زندگی کیلئے جب بھی بارش اترتی ہے تو بارش کی منفعت بخشی کیلئے ضروری نہیں کہ اسے رکاوٹیں پیش نہ آئیں کیونکہ جھلسی ہوئی زمین اولاً تو اس کو جھلس دینا چاہتی ہے اور ثانیاً کوڑے کرکٹ اور دوسری چیزوں کی رکاوٹیں اس کا راستہ روکنے کیلئے اپنا زور لگاتی ہیں جو جھاگ کی صورت میں نظر آتا ہے اور دوسری بات یہ کہ بارش کی منفعت بخشی کیلئے ضروری ہے کہ اس کے اندر اتنی رفتار اور اتنا زور ہو جو سیل کی صورت اختیار کر جائے تاکہ راستے میں حائل ہونے والی رکاوٹیں اس کا راستہ نہ روک سکیں۔ اور تیسری بات یہ کہ ندی نالے اور وادیاں اپنا اپنا ظرف اور اپنی اپنی وسعتوں کے دامن کشادہ رکھیں کیونکہ یہی سرمایہ سیل کی صورت آرائی کرتا ہے۔

اسی حقیقت کو مزید نمایاں کرنے کیلئے ایک دوسری مثال بھی دی گئی کہ سونے اور چاندی کے برتنوں کے بنانے کیلئے جب بھی سونے اور چاندی کو تپایا جاتا ہے تو یہ کبھی نہیں ہوا کہ آگ سونے اور چاندی کو ملمع اور میل سے صاف کر کے خالص کر دے۔ اور ملمع اور میل جھاگ کی صورت میں مدافعت کا عمل بروئے کار نہ لائیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہر منفعت بخش چیز اور ہر قابلِ قدر حقیقت کا منفعت بخش ہونا اسی وقت ثابت ہوتا ہے جب وہ ملمع اور میل کچیل سے صاف ہو اور یہ تنظیف اور تطہیر کا عمل بروئے کار نہیں آتا جب تک حالات کی شدت اسے تپا کر خالص نہیں کر دیتی۔

ان دونوں مثالیوں کو سامنے رکھئے اور پھر اس آیتِ کریمہ پر غور فرمائیے۔ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو بارش کی صورت وحی کی دولت عطا فرما کر بھیجا۔ وقت کے ساتھ ساتھ جب دعوت کی اس بارش نے قوت پکڑی اور سیل کی صورت اختیار کی تو باطل اور اہلِ باطل نے ہر ممکن طریقے سے اس کا راستہ روکا اور ان کی بڑھتی ہوئی مخالفت نے ایسی شکل اختیار کر لی جیسے سیلاب میں اٹھتے ہوئے جھاگ کی شکل ہوتی ہے اور دیکھنے والی نگاہ ایسا محسوس کرنے لگتی ہے کہ یہ جھاگ شاید سیل کو روک دے گا، لیکن اس سیل کو روکنا جھاگ کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ وقت کے ساتھ ساتھ جھاگ اڑ جاتا ہے اور پانی اپنی منفعت بخشی کے کام کو جاری رکھتا ہے۔ اس سے جہاں یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ تبلیغ و دعوت کی قوت کو ایک سیل کی طرح آگے بڑھنا چاہیے۔ اگر مخالفتیں زوروں پر ہوں تو اس کی مثبت قوتیں بھی اخلاص و عمل کے پورے زور کو بروئے کار لانے کی پابند ہیں لیکن اگر دل و دماغ بات کو سمجھنے کیلئے آمادہ ہوں تو پھر اس کی تیزی کو نغمگی میں بدل جانا چاہیے۔ بقول اقبال:

گزر جا بن کے سیلِ تندرَو کوہ و بیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

لیکن رک جانے اور ستانے کا کوئی موقع نہیں۔ تازہ دم ہونے کیلئے آرام ایک حقیقت ہے۔ لیکن کام سے غفلت اور مقصد سے لاتعلقی کا کوئی جواز نہیں۔ اس راہ میں نہ مصائب کی پرواہ کی جاتی ہے اور نہ بہلاوؤں پر کان دھرا جاتا ہے۔ فرض بار بار پکارتا ہے:

اے جوئے آب بڑھ کے ہو دریائے تند و تیز
ساحل تجھے عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول

نظریاتی تصادم اور حق و باطل کی کشمکش میں اگر ایک طرف سیل کی سی قوت ہونی چاہیے تاکہ وقت کی مفسد قوتیں اس کو تر نوالہ نہ سمجھ لیں اور ان کی فتنہ انگیزیاں ان میں اپنے مطلب کے لوگ تلاش نہ کر سکیں، تو ساتھ ہی ساتھ اہلِ حق میں حق کے نفاذ اور اظہار اور دوسرے لوگوں سے معاملات میں ایسی نرمی ہونی چاہیے کہ حریر اور پرنیاں شرما جائیں اور ان کی مروت اور دلآویزی اور لوگوں کے کام آنے کا جذبہ لوگوں کو یقین دلا دے کہ یہی لوگ ہیں جن سے یہ دھرتی آباد ہے۔ اہلِ باطل جب دنیا کو اپنی منڈیوں میں تبدیل کرنے کیلئے کوشاں ہوں اور دوسری قوموں سے ان کے تعلقات صرف اپنے مفاد کی قیمت پر ہوں تو اہلِ حق کو دیکھ کر لوگوں کو یقین آ جائے کہ یہ لوگ کچھ حاصل کرنے کیلئے سرگرداں نہیں بلکہ دوسروں کی ضرورتیں پورا کرنے کیلئے کوشاں ہیں۔ ایسی صورتحال میں اللہ تعالیٰ اہلِ حق کو سرفراز کرتا ہے اور اہلِ باطل کو سرنگوں کرتا اور مٹا دیتا ہے کہ اس کا اصول ہی یہ ہے کہ جھاگ باقی نہیں رہتا وہ اڑ جاتا ہے اور جو چیز نفع دیتی ہے اسے باقی رکھا جاتا ہے۔ زندگی کی دوڑ میں جہاں اصلح ہونا ضروری ہے وہیں انفع ہونا بھی ضروری بلکہ بقائی الحقیقت انفع کیلئے مقدر ہے۔

Marfat.com

لِلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمُ الْحُسْنٰى ؔ وَالَّذِيْنَ لَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهٗ لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّ مِثْلَهٗ مَعَهٗ لَافْتَدَوْا بِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ سُوْٓءُ الْحِسَابِ ۙ وَمَاْوٰهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۱۸﴾ (سورۃ الرعد : ۱۸)

(جن لوگوں نے اپنے رب کی دعوت کو قبول کیا ان کیلئے انجام کار کی فیروز مندی ہے اور جن لوگوں نے اس کی دعوت قبول نہیں کی اگر ان کو وہ سب کچھ حاصل ہو جائے جو زمین میں ہے اور اسی کے برابر اور بھی تو وہ اسے فدیہ ہی میں دے ڈالیں، یہی لوگ ہیں جن کا حساب برا اور ان کا ٹھکانہ جہنم ہوگا۔ اور وہ کیا ہی برا ٹھکانہ ہے۔)

گزشتہ آیتِ کریمہ میں جو بات تمثیلی انداز میں سمجھائی گئی ہے اسے سادہ اور واضح انداز میں ایک دوسرے پہلو سے بیان کیا جا رہا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ جو بارش وحیِ الٰہی کی صورت میں نازل ہو رہی ہے وہ تو اپنے منطقی اور حقیقی انجام کو پہنچ کر رہے گی۔ لیکن سوچنے کی بات مشرکینِ مکہ کیلئے ہے کہ وہ انکار کی صورت میں کس قدر ہولناک انجام سے دوچار ہوں گے۔ قبول کرنے والے تو اپنے بہترین انجام کو پہنچ جائیں گے لیکن انکار کرنے والے کس اذیت ناک صورتحال سے دوچار ہوں گے اس کا اندازہ صرف اتنی بات سے ہو سکتا ہے کہ وہ یہ چاہیں گے کہ جو کچھ ان کے پاس ہے اگر اتنا ہی اور ان کے پاس ہوتا تو وہ سب کو فدیہ میں دے کر اپنی جان بچانے کی کوشش کرتے۔ اس آیت کے بعض ضمنی افادات کی طرف صاحبِ تفہیم القرآن نے اشارہ کیا ہے ہم اس سے استفادہ کرتے ہیں۔

قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس طرح کا محاسبہ اپنے ان بندوں سے کرے گا جو اس کے باغی بن کر دنیا میں رہ رہے ہیں۔ بخلاف اس کے جنہوں نے اپنے خدا سے وفاداری کی ہے اور اس کے مطیع فرمان بن کر رہے ہیں ان سے ”حسابِ یسیر“ یعنی ہلکا حساب لیا جائے گا، ان کی خدمات کے مقابلے میں ان کی خطاؤں سے درگزر کیا جائے گا اور ان کے مجموعی طرزِ عمل کی بھلائی کو ملحوظ رکھ کر ان کی بہت سی کوتاہیوں سے صرف نظر کر لیا جائے گا۔ اس کی مزید توضیح اس حدیث سے ہوتی ہے جو حضرت عائشہؓ سے ابوداؤد میں مروی ہے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسولؐ اللہ تعالیٰ، میرے نزدیک کتاب اللہ تعالیٰ کی سب سے زیادہ خوفناک آیت وہ ہے جس میں ارشاد ہوا ہے کہ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ۔ ”جو شخص کوئی برائی کرے گا وہ اس کی سزا پائے گا۔“ اس پر حضورؐ نے فرمایا: عائشہؓ! کیا تمہیں معلوم نہیں کہ خدا کے مطیع فرمان بندے کو دنیا میں جو تکلیف بھی پہنچتی ہے حتیٰ کہ اگر کوئی کانٹا بھی اس کو چبھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے اس کے کسی نہ کسی قصور کی سزا قرار دے کر دنیا ہی میں اس کا حساب صاف کر دیتا ہے؟ آخرت میں تو جس سے بھی محاسبہ ہوگا وہ سزا پا کر رہے گا۔ حضرت عائشہؓ نے عرض کیا پھر اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا مطلب کیا ہے کہ فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا؟ ”جس کا نامۂ اعمال اس کے سیدھے ہاتھ میں دیا جائے گا اس سے ہلکا حساب لیا جائے گا۔“ حضورؐ نے جواب دیا، اس سے مراد پیشی ہے یعنی اس کی بھلائیوں کے ساتھ اس کی برائیاں بھی اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ضرور ہوں گی، مگر جس سے باز پرس ہوئی وہ تو بس سمجھ لو کہ مارا گیا۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص اپنے وفادار اور فرمانبردار ملازم کی چھوٹی چھوٹی خطاؤں پر کبھی سخت گرفت نہیں کرتا بلکہ اس کے بڑے بڑے قصوروں کو بھی اس کی خدمات کے پیشِ نظر معاف کر دیتا ہے لیکن اگر کسی ملازم کی غداری و خیانت ثابت ہو جائے تو اس کی کوئی خدمت قابلِ لحاظ نہیں رہتی اور اس کے چھوٹے بڑے سب قصور شمار میں آ جاتے ہیں۔

اَفَمَنْ يَّعْلَمُ اَنَّمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ اَعْمٰى ؕ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۱۹﴾ الَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَلَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ ﴿۲۰﴾ وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ

Marfat.com

مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَيَخَافُوْنَ سُوْٓءَ
الْحِسَابِ ﴿٢١﴾ وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ
وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً وَّيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ
السَّيِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ ﴿٢٢﴾ جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا
وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَالْمَلٰٓئِكَةُ
يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ ﴿٢٣﴾ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ
فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ﴿٢٤﴾ وَالَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ
بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَ
يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ ﴿٢٥﴾
اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ وَفَرِحُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا
وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ ﴿٢٦﴾

رکوع: ۳ (تو کیا جو شخص جانتا ہے کہ آپ پر جو کچھ نازل کیا گیا ہے آپ کے رب کی طرف سے وہ حق ہے۔ وہ اس شخص جیسا ہوسکتا ہے جو اندھا ہے۔ نصیحت صرف عقلمند ہی قبول کرتے ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ سے کئے ہوئے عہد کو پورا کرتے ہیں اور اپنے پیمان کو توڑتے نہیں۔ اور جو اس چیز کو جوڑتے ہیں جس کو اللہ تعالیٰ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے۔ اور اپنے رب سے ڈرتے رہتے ہیں اور سخت حساب کا اندیشہ رکھتے ہیں۔ اور جو لوگ اپنے رب کی رضا جوئی میں ثابت قدم رہے اور جنہوں نے نماز کا اہتمام رکھا اور جو کچھ ہم نے ان کو بخشا اس میں سے سرًا اور علانیۃً خرچ کیا اور جو بدی کو بھلائی سے دور کرتے ہیں، انجام کار کی کامیابی انھی کیلئے ہے۔ سدا بہار باغات جن میں وہ داخل ہوں گے اور وہ بھی جو اس کے اہل بنیں گے، ان کے آباؤ اجداد، ان کی ازواج اور ان کی اولاد میں سے اور فرشتے ہر دروازے سے ان پر داخل ہوں گے۔ اور کہیں گے کہ آپ لوگوں پر سلامتی ہو۔ بوجہ اس کے جو تم نے صبر کیا۔ بس کیا ہی خوب ہے انجام کار کی کامیابی۔ اور وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے عہد کو اس کے باندھنے کے بعد توڑتے ہیں اور اس چیز کو کاٹتے ہیں جس کو اللہ تعالیٰ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے۔ اور زمین میں فساد مچاتے ہیں، یہی لوگ ہیں جن پر لعنت ہے۔ اور ان

Marfat.com

کیلئے بُرا گھر ہے۔ اللہ تعالیٰ روزی کشادہ کر دیتا ہے، جس کیلئے چاہتا ہے۔ اور تنگ روزی دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور یہ دنیا کی زندگی پر خوش اور مسرور ہے۔ اور یہ دنیا کی زندگی آخرت کی زندگی کے مقابلے میں محض ایک متاعِ حقیر ہے۔)

اَفَمَنْ یَّعْلَمُ اَنَّمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ الْحَقُّ کَمَنْ ھُوَ اَعْمٰی ؕ اِنَّمَا یَتَذَکَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۱۹﴾

(تو کیا جو شخص جانتا ہے کہ آپ پر جو کچھ نازل کیا گیا ہے آپ کے رب کی طرف سے وہ حق ہے۔ وہ اس شخص جیسا ہو سکتا ہے جو اندھا ہے۔ نصیحت صرف عقلمند ہی قبول کرتے ہیں۔) (سورۃ الرعد:۱۹)

آنحضرت ﷺ کو تسلی اور قریشِ مکہ کو تنبیہ

اس آیتِ کریمہ میں نبی کریم ﷺ اور مسلمانوں کو تسلی دی جا رہی ہے۔ اور قریش مکہ کو آئینہ دکھانا مقصود ہے۔ قرآنِ کریم نے آنحضرت ﷺ کی تبلیغ ودعوت کے انداز کو اور کفار کی ہدایت کیلئے آپؐ کی دلسوزی کو جس طرح بیان فرمایا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپؐ لوگوں کی ہدایت کا کام محض ایک ذمہ داری سمجھ کر ادا نہیں فرما رہے تھے بلکہ لوگوں کی بھلائی اور ان کی زندگیوں میں خوش اطواری کا ورود اور آخرت کی فکر پیدا کرنے کی طلب آپؐ پر اس طرح حاوی ہوگئی تھی کہ آپؐ کی زندگی کے تمام معمولات اور آپؐ کے تمام احساسات پر اس نے غلبہ پا لیا تھا، جو کافر ایمان لانے سے انکار کرتا تھا، آپؐ کو چونکہ یقین تھا کہ اس کا انجام جہنم میں جلنا ہے تو آپ محسوس کرنے لگتے تھے کہ یہ شخص اپنے انجام کی طرف بڑھ رہا ہے۔ آگ کا ایک بڑا الاؤ ہے جو اس کا منتظر ہے اور یہ اپنی حماقت سے اس میں کود جانا چاہتا ہے۔ میں چونکہ اس کی تباہی اور بربادی دیکھ رہا ہوں اور میری اسے بچانے کی تمام کوششیں ناکام ہو رہی ہیں تو آپ کی طبیعت پر ایک غیر معمولی بار پڑتا تھا اور آپ کی روح زخمی ہونے لگتی تھی۔ اور آپؐ کی بالکل وہی کیفیت ہوتی تھی جو ایک ہمدرد انسان کی آگ میں جلتے ہوئے آدمی کو دیکھ کر ہوتی ہے۔ مزید پریشانی کی بات یہ تھی کہ کبھی کبھی آپؐ محسوس کرنے لگتے کہ قریش مکہ کا ہدایت قبول نہ کرنا اور خطرناک انجام کی طرف بڑھتے چلے جانا تبلیغ ودعوت میں شاید میری کسی کوتاہی کا نتیجہ ہے۔ اور میں شاید ان کو ہدایت دینے میں وہ محنت، وہ توجہ، وہ ہمدردی وغمگساری بروئے کار نہیں لا سکا جس کی انھیں ضرورت تھی۔ چنانچہ وہ ذاتِ خداوندی جو دلوں کے بھیدوں سے واقف ہے وہ آنحضرت ﷺ کے اس احساس کے پیشِ نظر جس نے آپؐ کو مضمحل کر کے رکھ دیا تھا تسلی دینے کی ضرورت محسوس کرتی ہے اور جابجا قرآنِ پاک میں ہم اسی حوالے سے تسلی پر مشتمل آیات کو نازل ہوتا ہوا دیکھتے ہیں۔ چنانچہ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں بھی نہایت دلنواز انداز میں آپؐ کو اطمینان دلایا جا رہا ہے کہ قریش مکہ کا راہ راست نہ اختیار کرنا آپؐ کی کسی کوتاہی کا نتیجہ نہیں بلکہ ان کی بدنصیبی کا نتیجہ ہے۔ انھیں آپؐ نے باقی انسانوں کی ہی طرح ہر ممکن طریقے سے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن انھوں نے اپنے دل ودماغ میں جو بُت سجا رکھے ہیں اور اپنے معمولات جن کاموں کی نذر کر رکھے ہیں اور اپنی ترجیحات جن حوالوں سے متعین کر رکھی ہیں اور اپنی خواہشات جن بداطواریوں کے تابع کر رکھی ہیں اس نے ان کے اندر ایک نئی شخصیت پیدا کر دی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ان کی عقلیں ماؤف ہوگئی ہیں، ان کے حواس نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے۔ یہ کہنے کو بینا ہیں لیکن حقیقت میں اندھے ہیں۔ یہ دنیا کی ہر حقیقت کو دیکھتے ہیں لیکن آخرت کی حقیقت ان کی نگاہوں سے مخفی رہتی ہے۔ یہ حواس کی زندگی کو عقل کی زندگی سمجھتے ہیں اور آنکھ کی روشنی کو دل کی روشنی پر ترجیح دیتے ہیں۔ جس طرح آنکھ کا اندھا بار بار ٹھوکر کھا کے گرتا ہے اور اسے منزل تک پہنچنا کبھی نصیب نہیں ہوتا اسی طرح دل کا اندھا بھی حقائق کی شناخت سے ہمیشہ محروم رہتا ہے۔ وہ ہر چیز کے ظاہر کو جانتا ہے لیکن اس کے باطن تک اترنا اسے کبھی نصیب نہیں ہوتا۔ وہ حیوانی زندگی کا اسیر ہو کر انسانی زندگی سے بے خبر رہتا ہے۔ اس کا میدانِ عمل پیٹ کی ضرورتوں تک محصور ہو جاتا ہے۔ وہ انسانیت کی ضرورتوں کا شعور کبھی پیدا نہیں کر سکتا۔ اس لئے اقبال بار بار ترغیب دیتا ہے:

دل کا نور کر خدا سے طلب
آنکھ کا نور دل کا نور نہیں

Marfat.com

ان لوگوں کے دل چونکہ اندھے ہو چکے ہیں اور اپنی مسلسل بداعمالیوں سے ان کے دلوں کا نور بجھ چکا ہے۔ یہ سبب ہے جس کی وجہ سے آپ کی دعوت ان کے دلوں تک نہیں اتر رہی۔ وہ پیٹ کی ضرورتوں کو تو سمجھتے ہیں لیکن دل کی ضرورتوں کو سمجھنا ان کے بس کی بات نہیں۔ آپ انھیں جو روشنی دکھانا چاہتے ہیں وہ اسے دیکھنے کی صلاحیت کھو چکے ہیں۔ اس لئے آپ کی دعوت کو قبول نہ کرنا وہ سراسر ان کے بے صلاحیت ہونے کا نتیجہ ہے، آپ کی دعوت میں کوئی کمی نہیں۔

ساتھ ہی ساتھ مشرکین کو آئینہ دکھایا جا رہا ہے کہ تم آنحضرت ﷺ کی دعوت کو رد کر کے یہ سمجھتے ہو کہ تم نے شاید کوئی کارنامہ انجام دیا ہے حالانکہ آنحضرت ﷺ کی دعوت انسانیت کی پکار ہے۔ انسانوں کی پیاسی روح کا جواب ہے۔ وہ تمھارے روشن مستقبل کی نوید ہے، وہ تمھاری فوز و فلاح کی ضمانت ہے۔ تم نے دن کی روشنی چھوڑ کر رات کی تاریکیوں کو پسند کیا۔ تمہیں اندازہ ہی نہیں کہ تم کس طرح حوادث کو دعوت دے رہے ہو۔ تم چونکہ دانشِ نورانی کی دولت سے تہی دامن ہو، اس لئے دانشِ برہانی ہی کو زندگی کی اساس اور زندگی کی رہنما سمجھتے ہو، تمہیں معلوم نہیں کہ علم و دانش انسان کا عظیم سرمایہ ہے۔ لیکن جب یہی دانش، دانشِ نورانی سے الگ ہو جاتی ہے تو پھر اس دانش کا کام اتباعِ ہویٰ کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ یہ ہوائے نفس کی وکیل بن کر انسانی اقدار کی تباہی کا باعث بن جاتی ہے۔ اس لئے قرآنِ کریم نے اس کے بعد وضاحت سے بتایا کہ حقیقی عقلمند کون لوگ ہیں۔

الَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَلَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ ﴿٢٠﴾ وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَيَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ ﴿٢١﴾ (سورة الرعد : ٢٠ . ٢١)

(جو اللہ تعالیٰ سے کئے ہوئے عہد کو پورا کرتے ہیں اور اپنے پیمان کو توڑتے نہیں۔ اور جو اس چیز کو جوڑتے ہیں جس کو اللہ تعالیٰ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے۔ اور اپنے رب سے ڈرتے رہتے ہیں اور سخت حساب کا اندیشہ رکھتے ہیں۔)

اولوالالباب کی پہلی صفت

وہ عقلمند جو اللہ تعالیٰ کے قرآن سے فائدہ اٹھاتے اور اللہ تعالیٰ کے دین کو قبول کرتے ہیں ان کی مختلف صفات ہیں۔ ان میں پہلی صفت یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے عہد کو پورا کرتے ہیں اور اس کے میثاق کو کبھی توڑنے کی جرأت نہیں کرتے۔ اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ اس سے مراد وہ عہد ہے جسے عہدِ الست کہا جاتا ہے۔

عہدِ الست کا مفہوم

عہد کے الفاظ پر غور کیجیے، پروردگار نے انسانوں سے پوچھا کہ کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ عہد لیتے ہوئے یہ نہیں فرمایا گیا کہ میں تمھارا خدا نہیں ہوں؟ یعنی پروردگار نے انسانوں سے اپنے اللہ تعالیٰ ہونے کا عہد نہیں لیا بلکہ اپنے رب ہونے کے بارے میں پوچھا اور سب نے اقرار کیا کہ ہاں آپ ہی ہمارے رب ہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ جب پروردگار نے نوعِ انسانی سے اپنے رب ہونے کا اقرار لیا تو یہ بات از خود انسانوں پر واضح ہوگئی کہ جس عظیم ذات کیلئے ہم ربوبیت کا عہد کر رہے ہیں وہی ہمارا اللہ تعالیٰ ہے اور یہ ایسی حقیقت تھی جس کا عہد لینے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ گمراہی کی ابتداء جب بھی ہوئی ہے وہ اللہ تعالیٰ کے انکار سے نہیں ہوئی بلکہ اس کے ربوبیت کے انکار سے ہوئی ہے۔ دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں گزری جس نے کبھی اللہ تعالیٰ کے وجود سے انکار کیا ہو اور اگر کبھی پروپیگنڈے یا غلط تعلیم کے زور سے زبانوں پر انکار جاری کر بھی دیا جائے تو حقیقت میں انسانی فطرت اسے قبول کرنے سے انکار کر دیتی ہے۔ جب بھی موقع آتا ہے اس کا اظہار ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ تاریخ میں ہم جتنی قوموں کا ذکر پڑھتے ہیں وہ مختلف قسم کے شرک میں تو ملوث رہی ہیں لیکن کبھی کسی قوم کے بارے میں تاریخ نے یہ نہیں لکھا کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کے وجود سے انکار کر دیا۔ ایک بڑی ذات جو کائنات کا مبداء و معاد ہے اسے ہر قوم نے قبول کیا چاہے اس کا نام کچھ بھی رکھا ہو۔ البتہ اس کے نیچے بے شمار رب بنا لئے

Marfat.com

کیونکہ ان کا گمان یہ تھا کہ ایک ایسی ذات جو آسمانوں کی بلندیوں پر متمکن ہے زمین کے آخری گوشے تک بسنے والے انسانوں کے حالات سے نہ آگاہ ہو سکتی ہے اور نہ ان کے معاملات میں مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔ اس لئے وہ اپنے اختیارات اپنے ماتحتوں میں تقسیم کر دیتی ہے تا کہ دنیا کا نظام چلتا رہے۔ یہیں سے شرک کی ابتداء ہوتی ہے۔ اس لئے یہاں یاد دلایا جا رہا ہے کہ ہم نے پہلے دن انسانوں سے اس بات کا عہد لیا تھا کہ تم میرے سوا کسی اور کو رب نہ ماننا یعنی میری ذات کے اقرار کے ساتھ ساتھ یہ بھی حرکت نہ کرنا کہ میرے اختیارات اور میری صفات میں کسی اور کو شریک کر دو۔ مشرکین مکہ دنیا بھر کے مشرکین کی طرح اسی گمراہی کا شکار تھے حتیٰ کہ بنی اسرائیل بھی حاملِ کتاب ہونے کے باوجود اس گمراہی سے محفوظ نہیں تھے اور آج کا انسان بھی روشنی، علم و ہنر کے باوجود اسی گمراہی کا شکار ہے۔ انھیں اللہ تعالیٰ کے وجود سے انکار نہیں اس کی یاد بھی کسی نہ کسی حد تک زندہ رہتی ہے۔ لیکن حلت و حرمت کا اختیار صرف اسی کے پاس ہے۔ اطاعتِ مطلقہ صرف اسی کا حق ہے۔ یہ وہ بات ہے جسے دنیا کی اکثریت قبول کرنے کیلئے تیار نہیں۔ اس کی ان صفات کو نہ جانے کن کن قوتوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ کہیں یہ اختیار پارلیمنٹ کو دیا گیا ہے، کہیں بادشاہت کو، کہیں آمریت کو اور کہیں خواہشِ نفس کو۔ بنی اسرائیل بھی اسی گمراہی کا شکار تھے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات کو مانتے تھے لیکن اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اختیار انھوں نے اپنے احبار اور رہبان کو دے رکھا تھا۔ عدی ابنِ حاتم طائی جب مسلمان ہونے کیلئے مدینہ آئے اور اپنے اطمینان کیلئے حضور نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انھوں نے آپؐ سے پوچھا کہ میں نے مسلمانوں سے یہ سنا ہے کہ قرآنِ کریم میں اہلِ کتاب کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ انھوں نے اپنے احبار اور رہبان کو رب بنا لیا ہے۔ میں عیسائی ہوں اس لئے میں اہلِ کتاب کے عقائد کو جانتا ہوں۔ ہم نے کبھی اپنے علما اور پیشواؤں کو رب نہیں بنایا، یہ سراسر ہم پر الزام ہے۔ آپ ﷺ نے عدی سے سوال کیا کہ کیا چیز حلال ہے اور کیا حرام؟ کیا جائز ہے اور کیا ناجائز؟ کیا ہونا چاہیے اور کیا نہیں ہونا چاہیے؟ اس کا فیصلہ آپ اللہ تعالیٰ کی کتاب سے کرتے ہیں یا اپنے علماء اور اپنے پیشواؤں کو آپ نے یہ اختیار دے رکھا ہے کہ وہ کتاب اللہ تعالیٰ سے ہٹ کر جو فیصلہ بھی دے دیں آپ اس کو دین کا درجہ دے دیتے ہیں؟ عدی نے جواب دیا کہ ہم نے یہ اختیارات واقعی اپنے علماء کو دے رکھے ہیں وہ اگر ایسا فیصلہ بھی کر دیں جو کتابِ خداوندی سے یکسر متصادم ہو تو ہم کتاب اللہ تعالیٰ کو نہیں مانتے بلکہ انھیں کے فیصلوں کی اطاعت کرتے ہیں۔ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا یہی معنی ہے کسی کو رب بنانے کا۔ مطلق قانون سازی، غیر مشروط حاکمیت اور غیر مشروط اطاعت یہ سراسر پروردگار کا حق ہے کیونکہ وہ ہمارا رب ہے جب یہ حق کسی اور کو دیا جائے گا تو وہ بھی رب بن جائے گا۔ چنانچہ اس آیتِ کریمہ میں اسی بات کی یاددہانی کی جا رہی ہے کہ ہم نے تم سے اس بات کا عہد لیا تھا کہ تم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو اپنا رب نہیں بناؤ گے لیکن تم نے جا بجا اس کے مقابلے میں رب بنا لئے جہاں منفعت کی امید نظر آئی یا کسی سے نقصان کا خوف ہوا تو اس کو اپنا رب بنا لیا۔ چاہے وہ دودھ دینے والی گائے ہو، پیاس بجھانے والا پانی ہو، سایہ دینے والا پیپل کا درخت ہو یا ضروریاتِ زندگی کی کفالت کرنے والی دولتِ دنیا ہو یا تختِ اقتدار پر فائز انسان ہوں یا تقدس کے پیکر ہوں ان میں سے ہر ایک چونکہ فیض رسانی اور فائدہ پہنچانے کی کسی نہ کسی صورت میں صلاحیت رکھتا ہے اس لئے اس کو ربوبیت کی سند دے دی گئی اور اگر کہیں سے خوف محسوس ہوا مثلاً سیلاب کی صورت میں تباہی پھیلانے والا پانی، کشتیوں کا راستہ روکنے والی چٹانیں، ڈسنے والے ناگ، تختِ اقتدار پر مسند نشیں فرعون اور نمرود، فضاء میں کڑکنے والی بجلیاں اور بادل، مظاہر فطرت اور مظاہر قدرت اور ایسی تمام زمینی اور آسمانی قوتیں جو انسان کیلئے خوف اور دہشت کا سبب بن سکتی تھیں ان سب کو ربوبیت کی مسند پر فائز کر دیا گیا۔

امتِ مسلمہ جو قیامت تک کیلئے اس عہد کی منادا ور مبلغ بنا کر اٹھائی گئی ہے خود اس کا حال دیکھئے کہ پورے عالمِ اسلام میں ایک ملک بھی ایسا نہیں جسے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت یعنی اس کی حاکمیتِ مطلقہ کا عملی طور پر اعتراف ہو۔ ہر جگہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ اگر کسی نہ کسی حد تک مسلمانوں میں عبادات کا عمل جاری ہے، اخلاقیات زندہ ہیں، انفرادی سطح پر نیکی سے وابستگی باقی ہے تو اسلامی تقاضوں کو پورا کرنے کیلئے بس یہی کچھ کافی ہے کوئی ضروری نہیں کہ ملک میں اسلامی قانون بھی نافذ ہو بلکہ مسلمانوں میں ایک ایسی معتدبہ تعداد بھی موجود ہے جو سرے سے اسلامی قانون کے وجود ہی کی منکر ہے حالانکہ اگر اسلامی قانون کے وجود سے انکار کر دیا جائے تو اس سے آپ سے آپ یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اسلام کا اجتماعیت سے کوئی رشتہ نہیں ہم انفرادی زندگی میں مسلمان ہیں اور ہمیں اسلام کی انفرادی زندگی کی ہدایات پر عمل کرنا چاہیے۔ رہے اجتماعی ادارے تو ان کیلئے ہمیں اللہ تعالیٰ نے آزاد چھوڑا ہے انھیں اپنی صوابدید

Marfat.com

کے مطابق جس طرح بھی چلایا جائے اس کا اسلام سے یا اسلام کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ یہی وہ گمراہی ہے جس کے ازالے کیلئے اللہ تعالیٰ نے تخلیقِ انسانی کے آغاز میں یہ عہد لیا تھا اور قرآنِ کریم میں وضاحت کے ساتھ اس کی یاددہانی کرائی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ عہد کہاں لیا گیا تھا اور اس کی کیفیت کیا تھی؟ حضرت عبداللہ تعالیٰ ابن عباسؓ کے حوالے سے یہ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ عہد حضرت آدم علیہ السلام کے زمین پر بھیجنے کے بعد عالمِ ارواح میں لیا گیا تھا لیکن بعض دیگر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ معاملہ تخلیقِ آدم کے موقع پر پیش آیا۔ اس وقت جس طرح فرشتوں کو جمع کر کے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرایا گیا اور زمین پر انسان کی خلافت کا اعلان کیا گیا اسی طرح پوری نسل آدم کو بھی جو قیامت تک پیدا ہونے والی تھی اللہ تعالیٰ نے بیک وقت وجود اور شعور بخش کر اپنے سامنے حاضر کیا تھا اور ان سے اپنی ربوبیت کی شہادت لی تھی۔ حضرت ابی ابن کعبؓ نے غالباً نبی کریم ﷺ سے استفادہ کر کے جو کچھ بیان کیا ہے وہ اس مضمون کی بہترین شرح ہے وہ فرماتے ہیں:

> ''اللہ تعالیٰ نے سب کو جمع کیا اور (ایک ایک قسم یا ایک ایک دور کے) لوگوں کو الگ الگ گروہوں کی شکل میں مرتب کر کے انھیں انسانی صورت اور گویائی کی طاقت عطا کی، پھر ان سے عہد و میثاق لیا اور انھیں جب اپنے اوپر گواہ بناتے ہوئے پوچھا کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں؟ انھوں نے عرض کیا ضرور آپ ہمارے رب ہیں۔ تب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں تم پر زمین و آسمان سب کو اور خود تمھارے باپ آدم کو گواہ ٹھہراتا ہوں تاکہ تم قیامت کے روز یہ نہ کہہ سکو کہ ہم کو اس کا علم نہ تھا۔ خوب جان لو کہ میرے سوا کوئی مستحقِ عبادت نہیں ہے اور میرے سوا کوئی رب نہیں ہے۔ تم میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرانا۔ میں تمھارے پاس اپنے پیغمبر بھیجوں گا جو تم کو یہ عہد و میثاق جو تم میرے ساتھ باندھ رہے ہو، یاد دلائیں گے اور تم پر اپنی کتابیں بھی نازل کروں گا۔ اس پر سب انسانوں نے کہا کہ ہم گواہ ہوئے آپ ہی ہمارے رب اور آپ ہی ہمارے معبود ہیں، آپ کے سوا کوئی ہمارا رب ہے نہ کوئی معبود۔''

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ ازلی میثاق فی الواقع عمل میں آیا بھی تھا تو کیا اس کی یاد ہمارے شعور اور حافظہ میں موجود ہے اور کیا ہم میں سے کوئی شخص بھی یہ جانتا ہے کہ آغازِ آفرینش میں وہ اپنے خدا کے سامنے پیش کیا گیا تھا اور اس سے یہ عہد لیا گیا تھا اور اگر کسی کو یاد نہیں تو پھر یہ عہد ہمارے خلاف حجت کیسے قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں مختلف باتیں کہی جاسکتی ہیں جن کا تعلق خارجی شواہد سے بھی ہے اور انسان کے اندر دبے ہوئے احساس سے بھی۔ جہاں تک خارجی شواہد کا تعلق ہے اس سلسلے میں گزارش ہے کہ خود انسانوں میں بہت سے ایسے افراد بھی ہیں جنھوں نے یہ اقرار کیا ہے کہ ہمیں یہ عہد پوری طرح یاد ہے۔ حضرت ذوالنون مصری نے فرمایا کہ یہ عہد و میثاق مجھے ایسا یاد ہے گویا اس وقت سن رہا ہوں اور بعض نے تو یہاں تک کہا ہے کہ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ جس وقت یہ اقرار لیا گیا میرے آس پاس میں کون کون لوگ موجود تھے، ہاں یہ ظاہر ہے کہ ایسے افراد شاذ و نادر کے درجہ میں ہیں، اس لئے عام لوگوں کے سمجھنے کی بات یہ ہے کہ بہت سے کام ایسے ہوتے ہیں جو بالخاصہ اثر رکھتے ہیں، چاہے وہ کام کسی کو یاد رہے یا نہ رہے بلکہ اس کی خبر بھی نہ ہو مگر وہ اپنا اثر چھوڑ جاتے ہیں، یہ عہد و اقرار بھی ایسی ہی حیثیت رکھتا ہے کہ دراصل اس اقرار نے ہر انسان کے دل میں معرفتِ حق کا ایک بیج ڈال دیا جو پرورش پا رہا ہے چاہے اس کو خبر ہو یا نہ ہو؛ اور اسی بیج کے پھل پھول ہیں کہ ہر انسان کی فطرت میں حق تعالیٰ کی محبت و عظمت پائی جاتی ہے خواہ اس کا ظہور بت پرستی اور مخلوق پرستی کے کسی غلط پیرایہ میں ہو، وہ چند بدنصیب لوگ جن کی فطرت ہی مسخ ہو کر ان کا عقلی ذائقہ خراب ہو گیا اور میٹھے کڑوے کی پہچان جاتی رہی ان کے علاوہ باقی ساری دنیا کے اربوں انسان اللہ تعالیٰ کی دھن اور خیال اور عظمت سے خالی نہیں، چاہے مادی خواہشات میں مبتلا ہو کر یا کسی گمراہ سوسائٹی میں پڑ کر وہ اس کو بھلا دیں، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے؟

كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ وفى بعض الروايات عَلٰى هٰذِهِ الْمِلَّةِ (اخرجه البخاري و مسلم)

ہر پیدا ہونے والا دینِ فطرت یعنی اسلام پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے ماں باپ اس کو دوسرے خیالات میں مبتلا کر دیتے ہیں۔

صحیح مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے بندوں کو حنفی یعنی ایک خدا کا ماننے والا پیدا کیا ہے پھر شیاطین ان کے پیچھے لگ گئے اور ان کو اس صحیح راستہ سے دور لے گئے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انسان اپنے سارے بگاڑ کے باوجود جب کبھی حالات کی گرفت میں آتا ہے اور اس کے مزعومہ سہارے ایک ایک کر کے ٹوٹنے لگتے ہیں تو پھر آخر ایک وقت آتا ہے کہ وہ تنہائی میں اس

Marfat.com

ان دیکھی ذات کو پکارتا ہے جسے اس کی عقل ودانش نے آج تک قبول کرنے سے انکار کیا تھا چونکہ اس کی عقت پر آج تک خواہشات، مفادات، وضعی علوم اور جدید فلسفوں کے پردے پڑے ہوئے تھے جس نے اس کی فطرت کو دبا رکھا تھا جیسے ہی تندی حالات کا ایک تیز جھونکا ان پردوں کو اٹھا کر دور پھینکتا ہے اور اس کی اصلی فطرت کو کام کرنے کا موقع ملتا ہے تو اس کے تحت الشعور دبا ہوا اللہ تعالیٰ کا تصور ابھر کر سامنے آ کھڑا ہوتا ہے اور یہ اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتا ہے اگر تھوڑا سا بھی تأمل کیا جائے تو یہ تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ یہ اسی عہدِ الست کی صدائے بازگشت ہے۔

دوسرا مطلب اس کا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک شخص کلمۂ شہادت پڑھنے کے بعد جب دائرۂ اسلام میں داخل ہو جاتا ہے تو اس کلمے کے صورت میں دراصل وہ اللہ تعالیٰ سے ایک عہد کرتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی الوہیت تسلیم نہیں کرے گا اور محمد کریم ﷺ کے سوا کسی کو اللہ تعالیٰ کا رسول نہیں مانے گا۔ یہ وہ عہد ہے جس میں انفرادی اور اجتماعی زندگی پوری طرح سمٹ جاتی ہے۔ اس کا کوئی گوشہ بھی اس کی وسعت سے باہر نہیں رہتا کیونکہ الوہیت میں حاکمیتِ مطلقہ، اطاعتِ کاملہ، ہمہ گیر بندگی اور عبدیتِ راسخہ کے تمام مفاہیم و جذبات شامل ہیں۔ اور انسانی زندگی کا کوئی گوشہ ان کی عملداری سے باہر نہیں۔ وہ عقلمند لوگ جن کی آنکھیں روشن ہیں اور جو رسول اللہ ﷺ کی دعوت کو اپنے دل کی آواز سمجھتے ہیں وہ ایسے ہی خیالات اور تصورات کے حامل ہوتے ہیں اور وہ ان پختہ تصورات میں کبھی شکست و ریخت پیدا نہیں ہونے دیتے۔

دوسری صفت

اگلی آیتِ کریمہ میں فرمایا: کہ ان عقلمندوں کی صفات میں سے دوسری صفت یہ ہے کہ وہ جس طرح اللہ تعالیٰ کے حقوق کی پاسداری کرتے ہیں اور ان کی بجا آوری میں کبھی تساہل سے کام نہیں لیتے اسی لئے بندوں کے جو حقوق ان پر بربنائے رشتۂ رحم عائد ہوتے ہیں ان کو بھی پوری فیاضی سے ادا کرتے ہیں۔ وہ جس طرح انسانیت کے رشتے کا پاس رکھتے ہیں اسی طرح بلکہ اس سے بھی بڑھ کر وہ حقِ قرابت کی ادائیگی کی فکر کرتے ہیں۔ وہ اس معاملے میں بالکل آنحضرت ﷺ کے ارشادات اور قرآنِ پاک کے فرامین کی تصویر ہیں۔ اس سلسلے میں آنحضرت ﷺ نے جو ارشادات فرمائے ہیں ان میں سے چند ایک کا ذکر اس اہم حقیقت کو سمجھنے کیلئے مدد و معاون ہو سکتا ہے۔ آپؐ کا ارشاد ہے جسے بخاری نے روایت کیا:

لَيْسَ الْوَاصِلُ الْمُكَافِئُ وَلٰكِنَّ الْوَاصِلُ اِذَا اِنْ قُطِعَتْ رَحِمُهٗ وَصَلَهَا صلہ رحمی کرنے والا وہ ہے کہ اگر اس سے قطع تعلق کی جائے تو پھر بھی وہ اس کو جوڑتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے:

قال قال رجل یارسول الله من احق بحسن صحابتی قال امک قال ثم من قال امک قال ثم من قال امک قال ثم من قال ابوک

کہ ایک شخص نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! میرے بہترین سلوک کا کون زیادہ مستحق ہے۔ فرمایا: تیری ماں۔ عرض کی، اس کے بعد کون؟ فرمایا: تیری ماں۔ پھر سوال کیا اس کے بعد، چوتھی مرتبہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا: تیرا باپ۔

حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے روایت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **ان من ابر البر صلة رجل اهل و د ابيه بعده ان يولى** حضورؐ نے فرمایا: کہ کسی آدمی کا اپنے باپ کے دوستوں کے ساتھ حُسنِ سلوک کرنا سب سے بڑی نیکی ہے۔

ایک موقع پر آنحضرت ﷺ سے پوچھا گیا، سب سے بہتر صدقہ کیا ہے؟ فرمایا: ایک بے مایہ آدمی کا اپنا پیٹ کاٹ کر اپنے ایک ایسے عزیز کو دینا جو اس کا نام لینے کا بھی روادار نہ ہو۔

ان احادیث سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اسلام نے صلہ رحمی پر کس قدر زور دیا ہے اور حقِ قرابت کی ادائیگی کی کس حد تک تاکید کی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلامی نقطۂ نگاہ سے خاندان اسلامی ریاست کی اساس ہے۔ خاندان جس قدر باہم پیوست، مضبوط اور توانا ہوگا، اسی قدر اسلامی معاشرہ اور اسلامی ریاست مضبوط اور توانا ہوگی۔ جس خاندان میں عزتِ نفس کی پرواہ کی جاتی ہو اور ہر شخص کو احترام میسر ہو اس معاشرے کے باہمی تعلقات ہر

Marfat.com

طرح کی الجھنوں اوراڑچنوں سے پاک ہوتے ہیں۔اس کا ایک ایک فرداپنے سے زیادہ دوسروں کے دکھ درد کا محافظ ہوتا ہے۔وہ اپنے بارے میں بعد میں سوچتا ہے،اپنے عزیزوں کے بارے میں پہلے سوچتا ہےاوراس میں بھی حیران کن بات یہ ہے کہ ایسے معاشرے کے تمام لوگ آپس میں جو بھلائیاں کرتے ہیں اورایثار و مروت سے کام لیتے ہیں،تو وہ اس طرح کسی پر احسان نہیں کرتے بلکہ وہ اپنے اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہتے ہیں کہ ہمارے ارادوں میں کوئی کمزوری واقع نہ ہو،ہم کسی خودغرضی اور ریا کی گرفت میں نہ آ جائیں۔وہ جب کسی کی مدد کرتے ہیں تواس کا بدلہ اللہ تعالیٰ سے چاہتے ہیں اور مدد لینے والے کے شکر گزار ہوتے ہیں کہ اس نے اسے اس قابل سمجھا۔قرآن کریم نے ان کے حُسنِ سلوک کی تصویر کشی کرتے ہوئے فرمایا:

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ○ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ○ اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا (۸.۱۰)

اپنے بہتر سے بہتر سلوک کے باوجود اس بات سے اندیشہ ناک رہتے ہیں کہ کہیں ان سے بری طرح حساب نہ لیا جائے۔لوگوں کے ساتھ ان کے معاملات کو اعلیٰ سے اعلیٰ معیار پر رکھ کر نہ جانچا جائے۔ہر ایثار کے پیچھے جو محرکات کام کرتے ہیں ان کی بخیہ گری نہ کی جائے کیونکہ انسان کی فطرت ہے کہ۔

چلے بچ کر کوئی کتنا وہ ٹھوکر کھا ہی جاتا ہے

وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً وَّيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ ﴿۲۲﴾ (سورۃ الرعد : ۲۲)

(اور جو لوگ اپنے رب کی رضا جوئی میں ثابت قدم رہے اور جنہوں نے نماز کا اہتمام رکھا اور جو کچھ ہم نے ان کو بخشا اس میں سے سرّاً اور علانیۃً خرچ کیا اور جو بدی کو بھلائی سے دور کرتے ہیں،انجام کار کی کامیابی انھی کیلئے ہے۔)

تیسری صفت

اولوالالباب کی کچھ مزید صفات بیان فرمائی جارہی ہیں کہ یہ وہ لوگ ہیں کہ جو اپنے رب کی خوشنودی کی راہ میں جو مشکلات پیش آتی ہیں ان پر صبر کرتے ہیں۔صبر کا معنی ہوتا ہے،جم جانا،اڑ جانا اور استقامت دکھانا اور پابندی کرنا۔اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے حصول کیلئے وہ جب اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق زندگی گزارنے کی کوشش کرتے ہیں تو انھیں قدم قدم پر ایسے حالات سے واسطہ پڑتا ہے جنھیں برداشت کرنا آسان نہیں ہوتا۔کبھی تو اقتدار اپنے احتساب کی زنجیروں میں جکڑ دینا چاہتا ہے اور کبھی بگڑا ہوا معاشرہ اسے اپنے اندر سے نکال پھینکنا چاہتا ہے۔کبھی خواہشات نفس زنجیر پا بن جاتی ہے اور کبھی بیوی بچوں کی فرمائشیں دل خون کرنے لگتی ہیں،کبھی اس کی منصبی قوت اس کیلئے حرام ذرائع کو آسان کر دیتی ہے۔ایسی صورت میں حرام ذرائع سے بچنا اور حلال پر اکتفا کرنا بہت بڑا امتحان بن جاتا ہے۔ایسے تمام مواقع پر اللہ تعالیٰ کے احکام کی پیروی،شیطان کی پیروی سے گریز،خواہشات نفس کی اطاعت سے انکار کرنے کیلئے صبر کی بہت بڑی قوت درکار ہوتی ہے۔استقامت کا ایسا جوہر جوان تمام محرکات کے سامنے دیوار بن کر حائل ہو جائے اللہ تعالیٰ کے یہ نیک بندے اپنے ایمان و عمل سے ہر ہر قدم پر یہ ثابت کر دیتے ہیں کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کی رضا سے زیادہ کوئی چیز عزیز نہیں۔نفس کے بہلاوے ہمارے صبر کو شکست نہیں دے سکتے۔

برو ایں دام بر مرغ دگر نہ
کہ عنقارا بلند است آشیانہ

چوتھی صفت

مزید یہ بھی فرمایا گیا کہ ان کی ایک صفت یہ ہے کہ وہ نماز کو قائم کرتے ہیں۔قائم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ جب نماز پڑھتے ہیں تو فرائض،واجبات،سنن اور آداب کی پابندی کرتے ہیں۔اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ اصحابِ اقتدار میں سے ہیں تو وہ اپنے دائرہ اقتدار میں

Marfat.com

احکامِ صلوٰۃ کا نفاذ کرتے ہیں۔ مسجدیں تعمیر ہوتی ہیں، آئمہ اور موذنوں کا تقرر ہوتا ہے، مساجد دین کے مراکز میں تبدیل ہو جاتی ہیں، ان کی دیکھ بھائی اور حفاظت کیلئے، مناسب عملہ مقرر ہوتا ہے، اپنے دائرہ اختیار میں ترکِ نماز جرم قرار دیا جاتا ہے، مسلمانوں کے دل و دماغ میں یہ بات اتارنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ نماز دراصل تذکیر بھی ہے اور عہدِ وفا کی تعمیر بھی۔ اس کی پابندی جس طرح اللہ تعالیٰ کے رشتے کو مضبوط سے مضبوط تر بناتی ہے اسی طرح بعض دیگر مکارمِ اخلاق کی تعمیر کا ذریعہ بھی بنتی ہے۔

پانچویں صفت

ان برگزیدہ لوگوں میں مزید ایک صفت یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو جو کچھ دے رکھا ہے اس میں سے سراً و علانیۃً دل کھول کر خرچ کرتے ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ موقع چھپا کے دینے کا ہو یا کھلے عام دینے کا ان کا ہاتھ ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔ "سراً" سے مراد زکوٰۃ کے علاوہ صدقات نافلہ کی ادائیگی ہے اور "علانیۃ" سے مراد زکوٰۃ ہے کیونکہ اموالِ ظاہرہ میں سے زکوٰۃ سب کے سامنے ادا ہونی چاہیے تاکہ دوسرے لوگوں کو بھی زکوٰۃ ادا کرنے کی طرف رغبت ہو اور انھیں اپنے فرض کا احساس ہو سکے، لیکن اموالِ باطنہ میں سے عطیات دیتے ہوئے عزتِ نفس کی پاسداری ضروری ہے اور وہ ہمیشہ اس کا لحاظ کرتے ہیں کہ کسی کی مدد کرتے ہوئے نہ اس کی عزتِ نفس پر چوٹ پڑے اور نہ اس کی حیثیت عرفی مجروح ہو۔

چھٹی صفت

مزید ان کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ برائی کو برائی سے نہیں بلکہ اس کو نیکی اور بھلائی سے دفع کرتے ہیں۔ وہ شر کا مقابلہ شر سے نہیں بلکہ خیر ہی سے کرتے ہیں۔ وہ ظلم کے مقابلے میں ظلم نہیں انصاف کرتے ہیں۔ دوسرے ان کے خلاف اگر جھوٹ بولیں تو وہ تب بھی اپنے سچ پر آنچ نہیں آنے دیتے۔ وہ خیانت کے مقابلے میں دیانت کا بول بالا کرتے ہیں۔ وہ آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد کی صحیح پیروی کرتے ہیں۔

لا تکونوا امعة تقولون اِن احسن الناس احسنا و اِن ظلمونا ظلمنا. ولٰکن وطنوا انفسکم، ان احسن الناس ان تحسنوا وان اساؤا فلا تظلموا

تم اپنے طرزِ عمل کو لوگوں کے طرزِ عمل کا تابع بنا کر نہ رکھو۔ یہ کہنا غلط ہے کہ اگر لوگ بھلائی کریں گے تو ہم بھلائی کریں گے اور لوگ ظلم کریں گے تو ہم بھی ظلم کریں گے۔ تم اپنے نفس کو ایک قاعدے کا پابند بناؤ۔ اگر لوگ نیکی کریں تو تم نیکی کرو۔ اور اگر لوگ تم سے بدسلوکی کریں تو تم ظلم نہ کرو۔

جن لوگوں میں یہ صفات پائی جاتی ہیں وہ اس قابل ہیں کہ انھیں آخرت کی راحتیں نصیب ہوں۔ آیتِ کریمہ میں عقبیٰ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس کا لغوی معنی ہوتا ہے، پیچھے آنا۔ کیونکہ ہر فعل کی جزاء اس کے پیچھے آتی ہے۔ اَلْعُقْبَہ کا معنی ہے جزاء۔ اگر جزاء اچھی ہو تو اس کیلئے العقبۃ، العقبیٰ، العاقبہ کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں اور اگر جزاء بُری ہو تو اس کیلئے العقوبۃ، المعاقبۃ اور العقاب کے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں۔

جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ ﴿۲۳﴾
سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ﴿۲۴﴾ (سورة الرعد : ۲۳، ۲۴)

(سدابہار باغات جن میں وہ داخل ہوں گے اور وہ بھی جو اُن کے اہل بنیں گے، اُن کے آباؤاجداد، ان کی ازواج اور ان کی اولاد میں سے اور فرشتے ہر دروازے سے ان پر داخل ہوں گے۔ اور کہیں گے کہ آپ لوگوں پر سلامتی ہو۔ بوجہ اس کے جو تم نے صبر کیا۔ بس کیا ہی خوب ہے انجام کار کی کامیابی۔)

Marfat.com

ایسے اولوالالباب کا انجام

گزشتہ آیات میں اولوالالباب کی صفات بیان کرنے کے بعد پروردگار نے ارشاد فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ آخرت کی راحتیں اور انجام کار کی کامیابی عطا فرمائے گا۔ اب اس آیتِ کریمہ میں اس کی تھوڑی سے تفصیل بیان کی گئی ہے کہ انھیں ایسے سدابہار باغات دیے جائیں گے جن پر کبھی خزاں کا سایہ بھی نہیں پڑے گا۔ بہار تو یہاں بھی آتی ہے اور بہار کے دنوں میں کیفیت یہ ہوتی ہے۔

جہاں چھپ گیا پردۂ رنگ میں
لہو کی ہے گردش رگِ سنگ میں

لیکن اِس بہار کو اُس بہار سے کوئی نسبت نہیں۔ یہاں کی بہار زوال اور خزاں سے محفوظ نہیں۔ یہاں جو کلی کھلتی ہے وہ مرجھاتی بھی ہے اور جو پھول مشامِ جاں کو معطر کرتا ہے اس کی پتیاں بکھرتی بھی ہیں، جو زمین مخملی لباس پہنتی ہے، وہاں چند دنوں کے بعد خاک بھی اڑتی ہے، لیکن قیامت کے دن جن باغوں میں یہ خوش نصیب داخل ہوں گے ان کی بہار پر کبھی خزاں نہیں آئے گی۔ وہاں کی خوشیاں ناپائیدار نہیں ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ انھیں ایسی خوشیاں بھی عطا کرے گا، عام ذہنوں تک جن کی رسائی بھی آسان نہیں۔ مثلاً ایک مہمان کیلئے حوصلہ منداور خوش اخلاق میزبان قسم قسم کے خوانِ نعمت سجاتا ہے اور ہر طرح سے مہمان کی لذتِ کام ودہن کا لحاظ رکھتا ہے۔ لیکن اس کی طرف تو کبھی دھیان بھی نہیں جاتا کہ اس کے ساتھ ایسے لوگوں کو ٹھہرایا جائے جن کا قیام اس کیلئے خوشی کا باعث ہو۔ جنت میں پروردگار ان خوش نصیبوں کیلئے اس بات کا بھی اہتمام کرے گا کہ جن لوگوں کا قرب ان کی خوشیوں میں اضافہ کرسکتا ہے اور جنھیں یہ اپنے وجود کا حصہ سمجھتے ہیں وہ بیشک جنت کے اس مقام میں رہنے کے قابل نہ ہو جس مقام میں یہ خوش نصیب ہوں گے۔ لیکن محض ان کی دلجوئی اور خوشی کیلئے ان کے آباؤاجداد، ان کی بیویوں اور ان کی اولاد کو بھی ان کے ساتھ رہنے کی اجازت دے دی جائے گی تاکہ ان کی خوشیاں ادھوری نہ رہیں اور ان کی مسرتوں میں کسی قسم کا جھول نہ رہے۔

ان کا اعزاز

پھر ان کامیاب لوگوں کے اعزاز کو بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ان کی عزت افزائی اور ان کی تحسین وتعریف کیلئے اللہ تعالیٰ فرشتوں کو حکم دے گا، وہ جنت کے بیشمار دروازوں میں سے ایک ایک دروازے سے داخل ہوں گے اور انھیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے سلامتی کا پیغام دیں گے۔ اور ساتھ ہی اس بات کا اظہار بھی کریں گے کہ تمہیں یہ سب کچھ اس لئے عطا ہو رہا ہے کیونکہ تم نے دنیا میں ہر مصیبت کے مقابلے میں، ہر بہلاوے کو رد کرنے میں اور بُرائی کے ہر محرک کو ناکام کرنے میں جو صبر دکھایا ہے آج پروردگار تمہیں اس کا بھرپور صلہ عطا فرما رہے ہیں۔ اور ذرا آنکھیں کھول کر دیکھو کہ اللہ تعالیٰ نے جو تمہیں صلہ اور انعام عطا فرمایا ہے وہ تمھارے انجام کی کامیابی ہے جس کی فکر نے تمہیں زندگی میں عیش سے دور رکھا تھا۔

وَالَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۙ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْۗءُ الدَّارِ ۝۲۵ (سورۃ الرعد : ۲۵)

(اور وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے عہد کو اس کے باندھنے کے بعد توڑتے ہیں اور اس چیز کو کاٹتے ہیں جس کو اللہ تعالیٰ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے۔ اور زمین میں فساد مچاتے ہیں، یہی لوگ ہیں جن پر لعنت ہے۔ اور ان کیلئے بُرا گھر ہے۔)

Marfat.com

ایمان نہ لانیوالوں کی صفات

گزشتہ آیات میں ان لوگوں کی صفات بیان کی گئی ہیں جو اللہ تعالیٰ کے دین کو قبول کرتے اور قرآن کریم سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور پھران کے شاندار انجام کو بیان فرمایا۔اب قرآن کریم کے اپنے اسلوب کے مطابق ان لوگوں کے حالات بیان کئے جارہے ہیں جو مذکورہ لوگوں کے بالکل برعکس ہیں اور پھران کے انجام کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ارشاد فرمایا: کہ جولوگ عہد الست یا عہد فطرت اور یا کلمۂ طیبہ کی صورت میں کئے ہوئے عہد کو توڑتے ہیں اور جن تعلقات اور رشتوں کو جوڑنے کا حکم دیا گیا ہے انھیں کاٹتے ہیں اور اس طرح سے زمین میں فساد برپا کرتے ہیں کیونکہ زمین میں فساد سے بچنے کی ایک ہی صورت ہے کہ اسلام کا نظامِ حق وعدل قائم کیا جائے۔اور یہ نظام دو بنیادی ستونوں پر کھڑا ہے۔ایک وحدتِ الٰہ اور دوسرا وحدتِ آدم یعنی ایک اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی شریک نہیں اور توحید ہی ہمارے دین کی اساس ہے۔اور انسانوں کی اصل حضرتِ آدمؑ ہیں، تمام انسان انھی کی اولاد ہیں۔اس لحاظ سے ان میں اونچ نیچ، تفاوت اور مختلف طبقات کے وجود کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔اور یہی دونوں گمراہیاں ہیں جنہوں نے زمین میں فساد برپا کیا ہے۔ چنانچہ جولوگ ایسی ہی گمراہیوں کے ذریعے زمین میں فساد برپا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور نظامِ حق وعدل کو قائم ہونے کا موقع نہیں دیتے، یہی لوگ لعنت کے مستحق ہیں۔اور قیامت کے دن بدترین انجام سے دوچار ہوں گے۔

اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ۭ وَفَرِحُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ ۝۲۶

(اللہ تعالیٰ روزی کشادہ کردیتا ہے، جس کیلئے چاہتا ہے۔اور تنگ روزی دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور یہ دنیا کی زندگی پر خوش اور مسرور ہے۔اور یہ دنیا کی زندگی آخرت کی زندگی کے مقابلے میں محض ایک متاعِ حقیر ہے۔) (سورۃ الرعد : ۲۶)

ایمان نہ لانے کا ایک سبب

مشرکینِ مکہ کو جن اسباب نے اسلام کو قبول کرنے سے روکا ان میں سے ایک سبب یہ تھا کہ وہ اپنی جہالت اور نادانی کی وجہ سے یہ سمجھتے تھے کہ دنیا کی خوشحالی اور خوش عیشی یہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی رضامندی کی دلیل ہے۔اور اس بات کی علامت ہے کہ اللہ تعالیٰ جسے دولت دیتا ہے اور جس کے رزق میں وسعت عطا فرماتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں برگزیدہ شخص ہوتا ہے۔اور جو شخص رزق کی تنگی میں مبتلا ہے اور اس کی زندگی بدحالی میں گزر رہی ہے اور غربت کے باعث کوئی شخص اس کی عزت نہیں کرتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں غیر مقبول ہے اور اس کے یہاں اس کا کوئی مقام ومرتبہ نہیں۔اس آیتِ کریمہ میں اس بنیادی گمراہی کی طرف توجہ دلائی جارہی ہے کہ کسی کے اچھا یا برا ہونے یا کسی کے عزیز یا ذلیل ہونے کا سبب اس کے رزق کی تنگی یا فراخی نہیں۔ رزق کی تنگی یا فراخی کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ایک دوسرے قانون سے ہے۔یہ درحقیقت ایک آزمائش ہے۔کسی کی آزمائش وسعتِ رزق سے ہوتی ہے اور کسی کی رزق کی تنگی سے۔کوئی صبر کے ذریعے آزمایا جاتا ہے اور کوئی شکر کے ذریعے۔لیکن جہاں تک عزت وذلت اور اللہ تعالیٰ کے یہاں قبول اور عدمِ قبول کا تعلق ہے اس کا رشتہ رزق سے نہیں بلکہ ایمان وعمل سے ہے، جس سے انسان کا کردار تشکیل پاتا ہے۔اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں عزت والا وہ ہے جو صاحبِ کردار اور متقی ہے۔ چاہے اسے دو وقت کا کھانا نصیب نہ ہو۔اور اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں وہ شخص ذلیل ہے جو کافر اور فاجر ہے۔چاہے وہ وقت کا حکمران ہی کیوں نہ ہو۔یہ بات ان لوگوں کی انتہائی حماقت سے تعلق رکھتی ہے کہ وہ رزق کی تنگی یا فراخی کو عزت یا ذلت کا سبب سمجھتے ہیں۔کاش وہ اس بات کو سمجھیں کہ حیاتِ دنیا اور دنیا کی دولت و ثروت حیاتِ آخرت کے مقابلے میں متاعِ قلیل کے سوا کچھ بھی نہیں۔

یہ مال و دولتِ دنیا یہ رشتۂ و پیوند
بتانِ وہم و گماں لا الٰہ الا اللہ
کیا ہے تو نے متاعِ غرور کا سودا
فریب سود و زیاں لا الٰہ الا اللہ

Marfat.com

وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا
لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِّن رَّبِّهِ ۗ قُلْ إِنَّ اللَّهَ يُضِلُّ مَن
يَشَاءُ وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَنْ أَنَابَ ﴿٢٧﴾ الَّذِينَ آمَنُوا وَتَطْمَئِنُّ
قُلُوبُهُم بِذِكْرِ اللَّهِ ۗ أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ ﴿٢٨﴾ الَّذِينَ
آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ طُوبَىٰ لَهُمْ وَحُسْنُ مَآبٍ ﴿٢٩﴾ كَذَٰلِكَ
أَرْسَلْنَاكَ فِي أُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِهَا أُمَمٌ لِّتَتْلُوَ عَلَيْهِمُ
الَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَهُمْ يَكْفُرُونَ بِالرَّحْمَٰنِ ۚ قُلْ هُوَ رَبِّي
لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ مَتَابِ ﴿٣٠﴾ وَلَوْ أَنَّ قُرْآنًا
سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ أَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْأَرْضُ أَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتَىٰ ۗ بَل
لِّلَّهِ الْأَمْرُ جَمِيعًا ۗ أَفَلَمْ يَيْأَسِ الَّذِينَ آمَنُوا أَن لَّوْ يَشَاءُ اللَّهُ
لَهَدَى النَّاسَ جَمِيعًا ۗ وَلَا يَزَالُ الَّذِينَ كَفَرُوا تُصِيبُهُم
بِمَا صَنَعُوا قَارِعَةٌ أَوْ تَحُلُّ قَرِيبًا مِّن دَارِهِمْ حَتَّىٰ يَأْتِيَ
وَعْدُ اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ ﴿٣١﴾ ع

رکوع: ۴ (اور جنہوں نے کفر کیا وہ کہتے ہیں کیوں نہیں اتاری گئی اس پر اس کے رب کی جانب سے کوئی نشانی۔ کہہ دیجیے! بیشک اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے۔ اور اپنی طرف رہنمائی ان لوگوں کی فرماتا ہے جو اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ جو ایمان لاتے ہیں اور جن کے دل اللہ تعالیٰ کے ذکر سے مطمئن ہوتے ہیں، سن لو کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر ہی سے دلوں کو طمانیت حاصل

Marfat.com

ہوتی ہے۔ جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے اچھے عمل کئے ان کیلئے خوشخبری ہے اور اچھا ٹھکانا ہے۔ اسی طرح ہم نے آپ ؐ کو ایک ایسی امت میں رسولؐ بنا کر بھیجا ہے جس سے پہلے بہت سی امتیں گزر چکی ہیں تا کہ آپ ؐ پڑھ کر سنائیں انھیں وہ کلام جو ہم نے آپ کی طرف وحی کیا ہے۔ ہر چند وہ خدائے رحمٰن کا انکار کر رہے ہیں فرما دیجئے کہ وہی میرا رب ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اسی پر میں نے بھروسہ کر رکھا ہے اور اسی کی طرف لوٹنا ہے۔ اور اگر کوئی ایسا قرآن بھی اترتا جس کے ذریعہ سے پہاڑ چلنے لگتے یا اس کے اثر سے زمین پھٹ جاتی یا مردوں سے اس کے ذریعہ بات کی جاسکتی (یہ قدرت سے بعید نہ تھا) بلکہ سب کام اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہیں۔ (بایں ہمہ وہ ایمان نہ لاتے) کیا نہیں جانتے وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو سب لوگوں کو ہدایت دے دیتا اور ان کافروں کو برابر کوئی نہ کوئی آفت ان کے اعمال کی پاداش میں پہنچتی رہے گی یا ان کی بستی کے قریب نازل ہوتی رہے گی یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے وعدے کے ظہور کا وقت آ جائے۔ بیشک اللہ تعالیٰ وعدہ خلافی نہیں کرتا۔)

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ ۝۲۷

(اور جنہوں نے کفر کیا وہ کہتے ہیں کیوں نہیں اتاری گئی اس پر اس کے رب کی جانب سے کوئی نشانی۔ کہہ دیجیے! بیشک اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے۔ اور اپنی طرف رہنمائی ان لوگوں کی فرماتا ہے جو اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔) (سورۃ الرعد: ۲۷)

کفار کا مطالبہ اور اس کا جواب

قرآنِ کریم کی مکی سورتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ جب وہ نبی کریم ﷺ کی دعوت اور آپ ؐ کے دلائل کے سامنے بے بسی محسوس کرنے لگتے تھے تو پھر ان کی زبانوں پر ایک ہی مطالبہ ہوتا تھا کہ آپ ؐ ہمیں کوئی ایسی محسوس نشانی یا حسی معجزہ دکھائیں جس کے بعد ہمیں انکار کرتے نہ بنے۔ اور اس کیلئے وہ اپنی طرف سے مختلف چیزیں تجویز کرتے تھے۔ کبھی کہتے کہ مکہ معظمہ پہاڑوں میں گھرا ہوا ایک شہر ہے جس میں کوئی میدانی علاقہ نہیں اور جس کے اڑوس پڑوس میں بھی کوئی کھیتی نہیں اُگتی۔ آپ ؐ اگر اللہ تعالیٰ کے نبیؐ ہیں تو اللہ تعالیٰ سے دُعا کریں کہ وہ اس شہر کو گلشن میں تبدیل کر دے۔ پہاڑوں کی بجائے اسے میدانی علاقہ بنا دیا جائے۔ یہاں کھیتیاں اُگیں، مختلف قسم کی پیداوار ہو، پانی کے چشمے رواں ہوں، سبزہ لہلہاتا ہو، ہرے بھرے درخت بہار دے رہے ہوں یا اور اسی قسم کے مطالبات اکثر آپ ؐ کے سامنے پیش کرتے رہتے تھے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہر نبی اللہ تعالیٰ سے اپنے خصوصی تعلق کو ثابت کرنے کیلئے معجزات دکھاتا ہے۔ یہ گویا اس کی طرف سے سندِ ماموریت ہوتی ہے۔ ہر نبی اور رسول کے معجزات اس کے اپنے زمانے کے غیر معمولی کمالات کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ جادو کے دور میں عصائے موسیٰ ہر طرح کے جادو کے طلسم کو توڑنے کیلئے عطا فرمایا گیا۔ طب و حکمت کے عروج کے دور میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ایسے کمالات عطا فرمائے گئے جس نے اس دور کی طب کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔ نبی کریم ﷺ ایک ایسے دور میں تشریف لائے جبکہ دنیا اپنے ارتقاء کی طرف بڑھ رہی تھی، علم اپنا دامن کھول رہا تھا، متمدن حکومتوں کا دور شروع ہو چکا تھا جن کیلئے تہذیب اور تمدن کے ساتھ ساتھ ایسے دستوری کمالات کی ضرورت تھی جو انسان کے شعوری ارتقاء کی تکمیل میں مدد دیں۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ کو سب سے بڑا معجزہ قرآنِ کریم دیا گیا جس نے فرد سے لے کر ریاست تک تمام ضرورتیں پوری کیں اور علم کے ان گوشوں میں رہنمائی کی جہاں اس سے پہلے انسان کی رسائی ممکن نہ تھی۔ مکے کے رہنے والے اپنی پسماندگی کے باعث قرآنِ کریم جیسی نعمت کا حق تو ادا نہ کر سکے البتہ وقتاً فوقتاً حسی معجزات کا مطالبہ کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ ان کے مطالبے کے جواب میں یہ فرمایا جا رہا ہے کہ ہدایت کا دارومدار نشانیوں پر ہوتا تو خود تمہارا اپنا وجود اللہ تعالیٰ کی نشانی ہے۔ تمہارے چاروں طرف بیشمار نشانیاں بکھری ہوئی ہیں۔ تم جس مخلوق کو بھی تھام کے بیٹھ جاؤ اس کا وجود تمہارے لئے دفترِ کردگار بن جائے گا۔ ہدایت کیلئے ضرورت نشانیوں کی نہیں بلکہ حُسنِ طلب کی ہے۔ توجہ الی اللہ کی ہے، جو شخص بغیر حُسنِ طلب کے نشانیوں پر اصرار کرتا رہے گا وہ ہدایت کو کبھی نہیں پا سکتا، لیکن

Marfat.com

جو آدمی سچی طلب کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوگا اس کیلئے اللہ تعالیٰ ہدایت کا دروازہ ضرور کھولے گا۔تم اگر ہدایت چاہتے ہو تو اپنے دلوں کا قبلہ درست کرو، اللہ تعالیٰ سے توفیق مانگو، وہ غیور خدا ہے، ناقدروں کو کبھی کوئی چیز نہیں دیتا۔اس کے یہاں سب سے بڑا سکہ جو کبھی کھوٹا نہیں ہوتا وہ انابت الی اللہ تعالیٰ ہے۔وہ اپنے اندر پیدا کرلو تو پھر تمہیں کسی مزید نشانی طلب کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ؕ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ﴿٢٨﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ طُوْبٰى لَهُمْ وَحُسْنُ مَاٰبٍ ﴿٢٩﴾ (سورة الرعد : ٢٨، ٢٩)

(جو ایمان لاتے ہیں اور جن کے دل اللہ تعالیٰ کے ذکر سے مطمئن ہوتے ہیں، سن لو کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر ہی سے دلوں کو طمانیت حاصل ہوتی ہے۔جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے اچھے عمل کئے ان کیلئے خوشخبری ہے اور اچھا ٹھکانا ہے۔)

انابت الی اللہ کی وضاحت

پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں گزشتہ آیتِ کریمہ میں بیان کردہ مضمون کی مزید وضاحت فرمائی جارہی ہے۔سابقہ آیت میں فرمایا کہ قریشِ مکہ کے ایمان نہ لانے کا سبب یہ نہیں ہے کہ انھیں منہ مانگی نشانیاں نہیں دکھائی جارہی ہیں۔اگر یہ کوئی حقیقی سبب ہوتا تو یہ خود مختلف وقتوں میں آنحضرت ﷺ کے کئی معجزات دیکھ چکے۔اور پھر ان کے گردوپیش میں اور ان کی ذات کے اندر نشانیوں کی کیا کمی ہے۔غوروفکر کی نگاہ چاہیے، نشانیاں تو ہر طرف بکھری ہوئی ہیں۔گھاس کی پتی سے لے کر آفتاب عالم تاب تک اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات کی نشانیاں ہی تو ہیں۔اسی طرح پہلی امتیں جو عذاب کا شکار ہوئیں ان پر عذاب اس وقت آیا جب انھوں نے منہ مانگے معجزات اور نشانیاں دیکھ کر بھی ایمان لانے سے انکار کردیا۔اور معجزات اور نشانیوں کو کبھی جادو قرار دیا اور کبھی شعبدہ بازی ٹھہرایا۔اگر ایمان کا سبب نشانیاں ہوتیں تو یقیناً سابقہ امتیں اور خود قریشِ مکہ اس سے محروم نہ رہتے۔

ایمان کیلئے انابت الی اللہ تعالیٰ کی ضرورت ہے۔جب تک ایک آدمی طلب صادق کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ نہیں ہوتا، ایمان لانے کا امکان بھی پیدا نہیں ہوتا۔پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں اس بات کی مزید وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ انابت وہ معتبر ہے جس کا نتیجہ اللہ تعالیٰ کو ماننا ہو اور ماننا بھی ایسا جس کے بعد دل کا ہر کانٹا نکل جائے۔تشکک اور ارتیاب کی کہر چھٹ جائے۔دل کے اندر روشنی کا ایسا دیپ جلے کہ دل کی تمام تاریکیاں دور ہوجائیں۔ایک ایسی قوتِ فیصلہ جنم لے جو تذبذب کے تمام راستوں کو بند کردے۔کیونکہ جب تک دل شبہات کا شکار رہتا ہے اور اس میں اشتباہات کے کانٹے اگتے رہتے ہیں اس وقت تک دل میں یقین کی قوت نہیں اترتی۔اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دل میں وہ پختگی پیدا نہیں ہوتی جو تمام اندیشہ ہائے دور و دراز کا خاتمہ کردے۔اور وہ اطمینان پیدا نہیں ہوتا جو ایمان لانے والے کی شخصیت کو آسودہ کردے۔یہ ایمان اور یقین، یہ پختگی اور یہ آسودگی اور یہ قوت اور یہ استقامت صرف اللہ تعالیٰ کے ذکر سے پیدا ہوتی ہے۔اور ذکر بھی وہ جو ذاتِ رسالت مآب ﷺ اور قرآنِ کریم کی تعلیم سے ملتا ہے۔یہ زبان کا وِرد بھی ہے اور زندگی کا عمل بھی۔یہ دل کی روشنی بھی ہے اور شخصیت کا رویہ بھی۔یہی وظیفہ بھی جب اللہ تعالیٰ کی یاد میں ڈھل جاتا ہے یا تنبیہ کی شکل اختیار کرجاتا ہے تو پھر مومن کے دل سے بیک وقت ایک ایسی قوت کا ظہور ہوتا ہے جس میں جمال بھی ہوتا ہے اور جلال بھی۔یہی وہ چیز ہے جو ہزار خطرات میں بھی انسان کو پریشان نہیں ہونے دیتی۔اور یہی وہ سہارا ہے جس کے ساتھ ٹیک لگانے والا کبھی ڈولتا نہیں۔اس لئے اس آیتِ کریمہ کے آخر میں فیصلہ کن انداز میں فرمایا کہ سنو، سننے والو! اگر ایک انسان کی اصل قوت دل کا اطمینان ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے ذکر کے سوا کسی اور حوالے سے کبھی نہیں ملتا۔اس لئے اللہ تعالیٰ کے ذکر کو حرزِ جان بناؤ، اس کی تعلیمات کو زندگی کا دستور بناؤ، اسی کی ذات وصفات کو زندگی کا اثاثہ اور قوت کا سرچشمہ جانو۔

یہی وہ آبِ حیات ہے جس سے سیرکام ہونے والا کبھی تشنگی کا شکار نہیں ہوتا۔یہ چونکہ زندگی کی سب سے بڑی حقیقت اور سب سے بڑی دولت ہے اسی لئے اگلی آیتِ کریمہ میں فرمایا گیا کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتے ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ کے ذکر سے دلوں کو زندہ کرلیتے ہیں ان کیلئے خوشخبری اور بہترین انجام ہے۔طوبیٰ مصدر ہے بشریٰ کے وزن پر، یہ طـــــاب سے ہے۔حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کے نزدیک اس کا معنی ہے، دل کی خوشی اور آنکھوں کی

Marfat.com

ٹھنڈک۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دل کا وہ یقین اور اطمینان جو ذکر اللہ تعالیٰ سے پیدا ہوتا ہے اس میں صرف ایک قوت نہیں ہوتی بلکہ اس میں دل کی خوشی اور آنکھوں کی ٹھنڈک بھی شامل ہوتی ہے۔یہ جمال وجلال کا ایک ایسا امتزاج ہے جسے خوبصورت تعبیر دیتے ہوئے اقبال نے کہا:

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

یا

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں

كَذٰلِكَ اَرْسَلْنٰكَ فِیْٓ اُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَآ اُمَمٌ لِّتَتْلُوَاۡ عَلَيْهِمُ الَّذِیْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَهُمْ يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ ؕ قُلْ هُوَ رَبِّیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ مَتَابِ ۝۳۰ (سورۃ الرعد : ۳۰)

(اسی طرح ہم نے آپ کو ایک ایسی امت میں رسول بنا کر بھیجا ہے جس سے پہلے بہت سی امتیں گزر چکی ہیں تا کہ آپ پڑھ کر سنائیں انھیں وہ کلام جو ہم نے آپ کی طرف وحی کیا ہے۔ہر چند وہ خدائے رحمٰن کا انکار کر رہے ہیں فرما دیجیے کہ وہی میرا رب ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں،اسی پر میں نے بھروسہ کر رکھا ہے اور اسی کی طرف لوٹنا ہے۔)

مطالبۂ معجزات کا جواب ایک اور پہلو سے

سابقہ آیات میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ مشرکینِ مکہ بار بار آپؐ سے عجیب وغریب نشانیوں کا مطالبہ کرتے تھے۔چنانچہ گزشتہ آیات میں ان کے مطالبوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ معجزات یا نشانیاں ایمان کا حتمی ذریعہ نہیں ہیں بلکہ ایمان لانے کا حقیقی سبب اطمینانِ قلب ہے اور پھر یہ بھی بتایا کہ اطمینان قلب کن چیزوں سے حاصل ہوتا ہے۔پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں یہ فرمایا جا رہا ہے کہ ہم نے آپ کو بھی کسی غیر معمولی نشانی کے بغیر رسول بنا کر بھیجا ہے۔یقیناً آپؐ سے بھی آپؐ کی قوم ایسے ہی مطالبات کرے گی۔اور آپؐ اور مسلمان ان کے مطالبات سے کبھی نہ کبھی کم وبیش متاثر ہوں گے۔اس لئے ابھی سے آپؐ کو چند باتیں پیشِ نظر رکھنی چاہئیں۔

1- ہر پیغمبر جس قوم کی طرف مبعوث ہوتا ہے۔وہ قوم اس کی امتِ دعوت کہلاتی ہے۔ایمان لانے والے اس لحاظ سے امتِ دعوت کہلاتے ہیں۔آپؐ اور آپؐ کی امت میں ہر ایک کیلئے ایک ایک نمونہ موجود ہے۔آپؐ کو سابقہ رسولوں کی دعوت پر غور کرنا چاہیے کہ ان کی دعوت کی اساس معجزات تھے یا اللہ تعالیٰ پر بھروسہ۔اور پھر یہ بات بھی کہ کیا ان کی امتیں منہ مانگے معجزات دیکھنے کے بعد مسلمان ہو جاتی تھیں۔آپ کو خوب معلوم ہے کہ اولوالعزم رسولوں نے معجزات کو ایک خاص حد سے زیادہ اہمیت نہیں دی۔بعض رسولوںؑ نے سندِ ماموریت کے طور پر معجزات ضرور دکھائے لیکن توجہ تمام تر تبلیغ ودعوت پر رکھی۔ان کی امتوں نے ہر چند ان سے قسم قسم کی نشانیاں مانگیں لیکن رسولوں نے ہمیشہ انھیں حقائق کی طرف متوجہ کیا اور اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرایا۔اس لئے آپؐ بھی ان کے مطالبات پر دھیان نہ دیجیے اور شب وروز اس کام میں لگے رہیے جو اصل آپؐ کی ذمہ داری ہے۔

2- مشرکینِ مکہ کو وارننگ دیتے ہوئے فرمایا کہ تم سے پہلے بھی امتیں گزری ہیں وہ تم سے بدرجہا علم ودولت اور قوت وشوکت پر فائق تھیں۔ان میں سے جن امتوں نے اللہ تعالیٰ کے رسولوںؑ کی دعوت پر کان نہیں دھرے بلکہ مخالفت میں بڑھتی چلی گئیں وہ بالآخر اللہ تعالیٰ کے عذاب کا شکار ہوئیں اور تاریخ میں آج عبرت کے طور پر زندہ ہیں۔تم نے اگر وہی روش اختیار کیے رکھی تو سوچ لو اس کا انجام کیا ہوگا۔

Marfat.com

3- اصل حیثیت کی وضاحت کے بعد نبی کریم ﷺ کو توجہ دلائی جا رہی ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں، رسول کا کام معجزات دکھانا نہیں نہ غیر معمولی قوتوں کا ظہور ہے بلکہ آپ کا اصل کام یہ ہے کہ آپ پر جو اللہ تعالیٰ کا کلام اتر رہا ہے جس میں زندگی کے حقائق بھی ہیں اور اوامر و نواہی پر مشتمل ایک شریعت بھی۔ دلائل و براہین سے عقائد کا اثبات بھی ہے اور شریعت کے احکام کی حکمت و دانش سے تسہیل بھی۔ ان میں سے ایک ایک چیز کو لوگوں کے سامنے اس طرح پڑھ کے سنانا جس طرح شاہی فرامین پڑھ کر سنائے جاتے ہیں، یہ آپ کا پہلا کام ہے، پھر اسی کی تعلیم و تبلیغ، اسی پر مبنی نظام کا نفاذ اور اسی کے مطابق لوگوں کے قلوب کا تزکیہ۔ آپ کے یہ وہ عظیم مناصب ہیں جن سے تمام انبیاء اور رُسل گراں بار رہے ہیں۔ آپ کی اس دعوت و تبلیغ کے مقابلے میں یہ ہر ممکن طریقے سے رکاوٹیں کھڑی کریں گے اور مختلف قسم کے اعتراضات بھی اٹھائیں گے۔ چنانچہ اس کی مثال دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: کہ یہ اللہ تعالیٰ کو مانیں گے لیکن اللہ تعالیٰ کے دوسرے نام رحمٰن کو ماننے سے انکار کر دیں گے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ابوجہل نے ایک دن نبی کریم ﷺ کو بیت اللہ تعالیٰ کے سائے میں دعا مانگتے ہوئے سنا۔ آپ یا اللہ اور یا رحمٰن کہہ کر پروردگار کو اپنی طرف متوجہ کر رہے تھے۔ وہ جاہل دوڑتا ہوا مشرکین کے پاس گیا اور کہنے لگا کہ محمد ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ رحمٰن کو شریک بنا لیا ہے اور اس کی بھی پوجا کرتے ہیں۔ چنانچہ بطور مثال اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ لوگ تو اس طرح کی گھٹیا حرکتیں بھی کریں گے لیکن آپ کا کام صرف یہ ہے کہ آپ ان کے مطالبات یا اس طرح کی خرافات کے جواب میں صاف صاف فرما دیجیے کہ اللہ تعالیٰ ہی میرا رب ہے، کوئی اس کا شریک نہیں، میرا اسی پر بھروسہ ہے، وہی میرا ملجا ہے۔ حالات کیسے بھی ہوں مجھے بہر صورت اسی کی طرف لوٹنا ہے، معجزات دکھانا میرا کام نہیں، یہ اسی کی حکمت و مشیت پر منحصر ہے، وہ چاہتا ہے تو معجزے دکھاتا ہے، نہیں چاہتا تو نہیں دکھاتا۔

وَلَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ اَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْاَرْضُ اَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتٰى ؕ بَلْ لِّلّٰهِ الْاَمْرُ جَمِيْعًا ؕ اَفَلَمْ يَايْئَسِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَهَدَى النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا تُصِيْبُهُمْ بِمَا صَنَعُوْا قَارِعَةٌ اَوْ تَحُلُّ قَرِيْبًا مِّنْ دَارِهِمْ حَتّٰى يَاْتِيَ وَعْدُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ﴿۳۱﴾ (سورة الرعد : ۳۱)

(اور اگر کوئی ایسا قرآن بھی اترتا جس کے ذریعہ سے پہاڑ چلنے لگتے یا اس کے اثر سے زمین پھٹ جاتی یا مردوں سے اس کے ذریعہ بات کی جا سکتی، (یہ قدرت سے بعید نہ تھا) بلکہ سب کام اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہیں۔ (بایں ہمہ وہ ایمان نہ لاتے) کیا نہیں جانتے وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو سب لوگوں کو ہدایت دے دیتا اور ان کافروں کو برابر کوئی نہ کوئی آفت ان کے اعمال کی پاداش میں پہنچتی رہے گی یا ان کی بستی کے قریب نازل ہوتی رہے گی یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے وعدے کے ظہور کا وقت آ جائے۔ بیشک اللہ تعالیٰ وعدہ خلافی نہیں کرتا۔)

سابقہ مضمون کی تاکید و تکمیل

گزشتہ آیتِ کریمہ میں ہم نے پڑھا ہے کہ غیر معمولی نشانیاں دیکھ کر لوگ ایمان نہیں لایا کرتے بلکہ ایمان کا اصل جوہر اگر طبیعت میں اتر کر روشنی دیتا ہے تو اس کا سبب صرف وہ تصورات ہیں جو اللہ تعالیٰ کا نبی اہلِ دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔ وہ جیسے جیسے دل و دماغ میں اترتے جاتے ہیں ویسے ویسے ایمان کی کھیتی دلوں میں بہار دینے لگتی ہے لیکن آنحضرت ﷺ کی تاریخ دعوت سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین مکہ شاید آپ کی تبلیغ و دعوت کے اثرات کو روکنے کیلئے بار بار آپ سے معجزات طلب کرتے تھے اور وہ بھی ایسے جس کا تقاضا ان کی طبیعتیں کرتی تھیں۔ ایک روز ابوجہل اور عبداللہ بن ابی امیہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور چند مطالبات پیش کئے کہ اگر مکہ کے پہاڑ دور ہٹ جائیں اور ہماری کھیتی باڑیوں کیلئے زمین فراخ ہو جائے، نیز اس میں چشمے اور نہریں جاری ہو جائیں اور قصیٰ (قریش کا جدِ اعلیٰ) قبر سے زندہ ہو جائے اور ہم بھی دوشِ ہوا پر سوار ہو کر شام و یمن میں

Marfat.com

تجارت کیلئے آیا جایا کریں تو پھر ہم آپؐ پر ایمان لے آئیں گے۔ اس کے جواب میں قرآنِ کریم کی آیت نازل ہوئی کہ اگر قرآنِ کریم کے اترنے کے ساتھ پہاڑ چلنے لگتے یا زمین میں ارتعاش پیدا ہو جاتا یا مردے زمین سے نکل کر باتیں کرنے لگتے تو تب بھی ان قریشیوں سے ایمان کی کوئی امید نہ تھی حالانکہ اللہ تعالیٰ کیلئے ایسی نشانیوں کا دکھا دینا کیا بعید ہے۔ ہر چیز اس کی قدرت کے سامنے عاجز ہے۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص ہدایت وضلالت کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ قانون سے باہر نہیں۔ وہ جس طرح کسی کو زبردستی ہدایت یافتہ نہیں بناتا، اسی طرح وہ زبردستی گمراہ بھی نہیں کرتا لیکن بعض مسلمانوں کے دل میں یہ خیال آئے بغیر نہیں رہتا تھا کہ ممکن ہے کہ اگر ان لوگوں کو غیر معمولی نشانیاں دکھا دی جائیں یہ راہ راست اختیار کر لیں اور اللہ تعالیٰ کا کلمہ پڑھنے لگیں۔ اس لئے وہ جی ہی جی میں تمنا کرتے کہ کاش ان کا مطالبہ تسلیم کر لیا جاتا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کے جواب میں فرمایا: اَفَلَمْ يَايْئَسِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا بعض اہلِ علم نے اس کا ترجمہ مایوس ہونا کیا ہے، لیکن حضرت عبداللہ ابن عباسؓ، مجاہدؒ اور حسنؒ سے اس کا ترجمہ اَفَلَمْ يَعْلَمُوْا منقول ہے یعنی ''کیا وہ نہیں جانتے۔'' علامہ قرطبی نے اس پر کئی اشعار سے استشہاد کیا ہے۔ ان میں سے رباح بن عدی کا یہ شعر ہے:

اَلَمْ يَيْئَسِ الْاَقْوَامُ اِنِّيْ اَنَا ابْنُهٗ

وَاِنْ كُنْتُ عَنْ اَرْضِ الْعَشِيْرَةِ نَائِيًا

کیا لوگ نہیں جانتے کہ میں اس کا بیٹا ہوں، اگرچہ میں قبیلہ کی سرزمین سے دور ہوں۔

کیا صاحب ایمان لوگ اس بات کو نہیں جانتے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی مشیت اور حکمت میں زبردستی لوگوں کو ایمان دینا ہوتا تو اس کی قدرت سے کیا بعید تھا کہ وہ سب لوگوں کو ایمان کی توفیق دے دیتا بلکہ ہر شخص کو پیدائشی طور پر صاحب ایمان پیدا کرتا لیکن اگر ایسا ہوتا تو سوال یہ ہے کہ جزاء وسزا کا ترتب کس بات پر ہوتا، نیکی اور بدی کی شناخت کیا ہوتی اور انسان کو ہدایت وضلالت کے معاملے میں یہ اختیار دیا گیا ہے اس کا امتحان کیسے ہوتا؟

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ بالکل نشانیاں ظاہر ہی نہیں فرماتا حالانکہ امتوں کی تاریخ جاننے والے جانتے ہیں اور خود قریش بھی جانتے تھے کہ ان کے کرتوتوں کی پاداش میں وقتاً فوقتاً انہیں بعض سزاؤں کا نشانہ بنایا جاتا ہے اور بعض دفعہ ان کے قرب وجوار کے لوگوں پر تنبیہات نازل ہوتی رہتی تھیں تاکہ لوگ غفلت سے جاگیں اور پیغمبر کی باتوں کو سمجھنے کی کوشش کریں لیکن انسان کی کمزوری یہ ہے کہ جب تک وہ کسی بڑی گرفت میں نہیں آتا اس کے اندر نہ قبولیت کی آنکھ کھلتی ہے اور نہ سنجیدگی پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے وہ اللہ تعالیٰ کے وعدے کو بھی ایک مذاق سمجھ کرٹالتا رہتا ہے۔ نتیجتاً ایسے غیر سنجیدہ لوگ اللہ تعالیٰ کے عذاب کا شکار ہوتے ہیں اور وہ عذاب ان کی قبر توڑ کے رکھ دیتا ہے۔

وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ

مِّنْ قَبْلِكَ فَاَمْلَيْتُ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ ۣ فَكَيْفَ

كَانَ عِقَابِ ﴿٣٢﴾ اَفَمَنْ هُوَ قَاۗىِٕمٌ عَلٰي كُلِّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ ۚ

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَاۗءَ ۭ قُلْ سَمُّوْهُمْ ۭ اَمْ تُنَبِّـــــُٔوْنَهٗ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي

الْاَرْضِ اَمْ بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ ۭ بَلْ زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا

مَكْرُهُمْ وَصُدُّوْا عَنِ السَّبِيْلِ ۭ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ

Marfat.com

مِنْ هَادٍ ۝٣٣ لَهُمْ عَذَابٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ
اَشَقُّ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ ۝٣٤ مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ
الْمُتَّقُوْنَ ۭ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۭ اُكُلُهَا دَآئِمٌ وَّظِلُّهَا ۭ تِلْكَ
عُقْبَى الَّذِيْنَ اتَّقَوْا ۖ وَّعُقْبَى الْكٰفِرِيْنَ النَّارُ ۝٣٥ وَالَّذِيْنَ
اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمِنَ الْاَحْزَابِ
مَنْ يُّنْكِرُ بَعْضَهٗ ۭ قُلْ اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ وَلَآ اُشْرِكَ
بِهٖ ۭ اِلَيْهِ اَدْعُوْا وَاِلَيْهِ مَاٰبِ ۝٣٦ وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا
عَرَبِيًّا ۭ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ
مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا وَاقٍ ۝٣٧ ع

رکوع: ۵ (اور تحقیق مذاق اڑایا گیا ہے رسولوں کا آپ سے پہلے بھی، تو میں نے کفر کرنے والوں کو ڈھیل دی، اور آخر کار ان کو پکڑ لیا تو دیکھو کیسا ہوا میرا عذاب۔ کیا وہ ذات جو ہر متنفس سے اس کے عمل پر محاسبہ کرنے والی ہے (اور وہ جو کسی چیز پر قدرت نھیں رکھتے یکساں ہیں) اور ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے شریک ٹھہرا رکھے ہیں، اے نبی ان سے کہہ دیجیے کہ ذرا ان کے نام تو بتاؤ، یا تم خدا کو ایسی چیزوں کی خبر دے رہے ہو جن کے زمین میں وجود سے وہ بے خبر ہے یا یونہی ہوائی بات کر رہے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں نے دعوتِ حق کو ماننے سے انکار کیا ہے ان کی مکاریاں خوشنما بنا دی گئی ہیں اور یہ لوگ راہِ حق سے روک دیے گئے ہیں، اور جن کو اللہ تعالیٰ گمراہ کر دے تو ان کو کوئی دوسرا ہدایت دینے والا نھیں۔ ان کیلئے دنیا کی زندگی میں بھی عذاب ہے اور آخرت کا عذاب اس سے بھی زیادہ سخت ہے اور ان کو اللہ تعالیٰ سے کوئی بچانے والا نھیں ہوگا۔ تمثیل اس جنت کی جس کا متقیوں سے وعدہ کیا گیا ہے، یہ ہے کہ اس کے نیچے ندیاں رواں ہوں گی، اس کا پھل دائمی اور اس کا سایہ لازوال، یہ انجام ہے ان لوگوں کا جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا اور کافروں کا انجام دوزخ ہے۔ اور جن لوگوں کو ہم نے کتاب عطا کی وہ اس چیز پر خوش ہیں جو اے پیغمبر آپؐ پر اتاری گئی ہے اور ان جماعتوں میں سے ایسے بھی لوگ ہیں جو اس کی بعض باتوں کو نھیں مانتے۔ اے نبی آپ کہہ دیجیے کہ مجھے تو حکم دیا گیا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ ہی کی بندگی کروں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤں۔ میں اسی کی طرف

Marfat.com

دعوت دیتا ہوں اور اسی کی طرف میرا رجوع ہے۔ اور اسی لئے ہم نے اس کتاب کو نازل کیا ہے، عربی زبان میں ایک فرمان کی حیثیت سے۔ اور اگر آپ نے (بفرضِ محال) اس علمِ صحیح کے آجانے کے بعد لوگوں کی خواہشات کی پیروی کی تو اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں نہ آپ کا کوئی مددگار رہوگا اور نہ کوئی بچانے والا۔)

وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَمْلَيْتُ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ ۗ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ﴿٣٢﴾

(اور تحقیق مذاق اڑایا گیا ہے رسولوں کا آپ سے پہلے بھی، تو میں نے کفر کرنے والوں کو ڈھیل دی، اور آخرکار ان کو پکڑ لیا تو دیکھو کیسا ہوا میرا عذاب) (سورۃ الرعد:۳۲)

تاخیرِ عذاب کی حکمت

سابقہ آیاتِ کریمہ میں مشرکینِ مکہ کی یہ روش بیان کی گئی ہے کہ وہ آنحضرت ﷺ کی دعوت کے اثرات کو روکنے کیلئے کبھی تو مختلف قسم کے اعتراضات کا سہارا لیتے ہیں اور کبھی اس بات کا مذاق اڑانے لگتے ہیں کہ تم ہمارے کفر اور ہمارے رویئے سے تنگ آکر ہمیشہ ہمیں عذاب کی دھمکی دیتے ہو اور اس دھمکی کو ایک مدت گزر گئی لیکن تمہارا وہ عذاب جو نہ جانے کب سے روانہ ہو چکا ہے آج تک ہم تک نہیں پہنچ سکا۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں ان کے اسی رویئے کو ہدفِ تنقید بناتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ تمہارا اپنی حماقت کے باعث پیغمبر کا مذاق اڑانا کوئی نئی بات نہیں۔ جب بھی انسانوں کی اصلاح کیلئے اللہ تعالیٰ نے کسی پیغمبرؑ کو مبعوث فرمایا ہے تو اس کے ساتھ انسانوں نے یہی معاملہ کیا ہے۔ رہی یہ بات کہ ان پر ان کے اعمال کی پاداش میں عذاب آگیا اور وہ تباہ کر دیے گئے، لیکن تم اب تک عذاب سے بچے ہوئے کیوں ہو؟ اس پر توجہ دلاتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ پہلی امتوں پر عذاب ان کے کفر سے فوراً بعد نہیں آگیا تھا بلکہ ہم ان کو مہلت پہ مہلت دیتے چلے گئے کہ شاید وہ اپنے رویئے کو سمجھنے کی کوشش کریں اور شاید اپنے چلن کو بدلیں لیکن جب وہ کسی طرح اپنی حالت کو بدلنے کیلئے تیار نہ ہوئے تو آخرکار اللہ تعالیٰ کے عذاب نے ان کی کمر توڑ دی۔ مشرکین کے ساتھ بھی یہی کچھ ہونے والا ہے لیکن یہ اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ اس نے ابھی تک ان کی مہلتِ عمل کی مدت کو ختم نہیں کیا۔ لیکن اگر انھوں نے اپنا رویہ نہ بدلا تو سابقہ امتوں کی طرح ان پر بھی گرفت آئے گی اور وہ گرفت ایسا عذاب ہوگا جو ان کی جڑ اکھاڑ دے گا۔ انھیں تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے ابھی تک انھیں مہلت کی صورت میں سنبھلنے کا موقع دے رکھا ہے۔ جب یہ موقع ہاتھ سے جاتا رہا تو پھر ان کی تاریخ بھی سابقہ امتوں کی طرح عبرت کا حوالہ بن جائے گی۔

اَفَمَنْ هُوَ قَآئِمٌ عَلٰى كُلِّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ ۚ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ ۗ قُلْ سَمُّوْهُمْ ۗ اَمْ تُنَبِّـُٔوْنَهٗ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِى الْاَرْضِ اَمْ بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ ۗ بَلْ زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مَكْرُهُمْ وَصُدُّوْا عَنِ السَّبِيْلِ ۗ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ﴿٣٣﴾

(کیا وہ ذات جو ہر متنفس سے اس کے عمل پر محاسبہ کرنے والی ہے (اور وہ جو کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتے یکساں ہیں) اور ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے شریک ٹھہرا رکھے ہیں، اے نبی ان سے کہہ دیجیے کہ ذرا ان کے نام تو بتاؤ، یا تم خدا کو ایسی چیزوں کی خبر دے رہے ہو جن کے زمین میں وجود سے وہ بے خبر ہے یا یونہی ہوائی بات کر رہے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں نے دعوتِ حق کو ماننے سے انکار کیا ہے ان کی مکاریاں خوشنما بنا دی گئی ہیں اور یہ لوگ راہِ حق سے روک دیے گئے ہیں، اور جن کو اللہ تعالیٰ گمراہ کردے تو ان کو کوئی دوسرا ہدایت دینے والا نہیں۔) (سورۃ الرعد:۳۳)

گزشتہ آیتِ کریمہ میں مشرکینِ مکہ کو ان کے فریبِ نظر پر توجہ دلاتے ہوئے فرمایا ہے کہ تم جس خود فریبی میں مبتلا ہو کہ چونکہ تم پر عذاب نہیں آرہا اس لئے عذاب کے آنے کی سرے سے کوئی حقیقت نہیں حالانکہ امرِ واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سرکش سے سرکش اور نافرمان سے نافرمان قوموں کو بھی پکڑنے میں جلدی نہیں کرتا بلکہ وہ انھیں سنبھلنے کیلئے مہلت دیتا رہتا ہے۔ اس کی پکڑ اس وقت آتی ہے جب مہلتِ عمل بھی بیکار ہو جاتی ہے، لیکن اس مہلت کے دور میں ایسا نہیں ہوتا کہ دعوت و تبلیغ کا سلسلہ روک دیا جائے۔ مہلت صرف گرفت میں ہوتی ہے، دعوت و تبلیغ کا کام جاری رہتا ہے۔ چنانچہ گزشتہ آیتِ کریمہ میں انھیں یہ بتا کر کہ تم مہلتِ عمل کے دور سے گزر رہے ہو اصل مضمون کو پھر بیان کرنا شروع فرما دیا گیا۔

Marfat.com

شرک کی تردید میں ایک دلیل

مشرکین کے فسادِ فکر وعمل کا سب سے بڑا سبب شرک میں آلودہ ہونا ہے۔ وہ آنحضرت ﷺ کی بے پناہ تبلیغی مساعی کے باوجود توحید کی حقیقت کو سمجھنے سے قاصر رہے۔ وہ اس بات کو سمجھ نہیں پا رہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اس کی صفات اور اس کے حقوق میں کسی کو شریک ٹھہرانے سے انسان کے فکر وعمل میں کیا تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں اور کس طرح سے تمام انسانی معاملات تلپٹ ہو کے رہ جاتے ہیں اس لئے اس بنیادی نقطے سے انہیں آگاہ کرنے کیلئے بڑے زوردار انداز میں لیکن نہایت اختصار کے ساتھ فرمایا گیا ہے کہ تم نے جس طرح بہت سے معاملات میں کچھ قوتوں کو اللہ تعالیٰ کا شریک بنا رکھا ہے کیا تم نے اس بات پر غور کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ہونے کیلئے لازماً خدا جیسا ہونا ضروری ہے۔ کائنات میں دو خداؤں کا ہونا جس طرح ممکن نہیں اسی طرح کسی ایسے شریک کا ہونا جو اپنی صفات اور حقوق میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ یکسانیت رکھتا ہو یہ بھی ممکن نہیں۔ خداوند ذوالجلال کی ذات تو وہ ہے جو کائنات کے ایک ایک ذرے سے واقف اور اور کائنات کا ایک ایک ذرہ اس کا محتاج ہے۔ ہر متنفس اسی سے زندگی کی بھیک مانگتا ہے اور اسی کی عطا اور بخشش سے سانس لیتا ہے۔ جس طرح زندگی اس کی مرہونِ منت ہے اسی طرح زندگی کی بقاء بھی اسی کی دین ہے۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے دل ودماغ کی بے پناہ قوتیں عطا فرمائی ہیں اور عجیب بات یہ ہے کہ اس کی تمام تر تفصیلات سے خود انسان بھی واقف نہیں۔ خیالات کے ہیجان میں بعض دفعہ خود انسان گم ہو جاتا ہے۔ وارداتِ قلبی میں بڑے سے بڑا انسان بھی اپنا راستہ گم کر بیٹھتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انسان بجائے خود ایک عالمِ اصغر ہے اور ایسے کروڑوں عالمِ اصغر ہیں جن میں سے ایک ایک کے خیال، تصور، فکر اور عمل کی تفصیل سے اللہ تعالیٰ کماحقہ واقف ہے۔ اور وہ اپنے صائب اور حقیقی علم کے مطابق ہر مخلوق کی ضروریات پوری فرما رہا ہے۔ اس کے ایک ایک عمل کا محاسبہ کر رہا ہے۔ پہاڑوں کی کھائیوں میں، سمندروں کی گہرائیوں میں اور صحراؤں کی وسعتوں میں بسنے والی ہر چھوٹی بڑی مخلوق اس کے رزق سے فیض یاب ہو رہی ہے۔ جس ذات کے علم وقدرت کی وسعت کا یہ عالم ہو اس کے مقابلے میں اجرامِ فلکی، مظاہر فطرت یا مقدس انسانوں میں سے کسی انسان کو اللہ تعالیٰ کا شریک بنانا خود انسان کے علم کی توہین ہے۔ ایسی بے سروپا بات اور ایسا نامعقول فیصلہ انسان اپنے معاملات میں کبھی گوارہ نہیں کرتا، چہ جائیکہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے بارے میں اس طرح کے اعتقادات رکھے جائیں جبکہ مخلوق کو اس سے کوئی نسبت ہی نہیں۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ انسانوں کی بہت بڑی تعداد نے اپنے تئیں اللہ تعالیٰ کے شریک بنا رکھے ہیں۔ یہ ایک ایسا انسانی حادثہ ہے کہ جس پر اظہارِ تأسف تو ہو سکتا ہے لیکن اس کی توجیہ نہیں ہو سکتی۔ اسی لئے کلامِ خداوندی میں یہاں وقفہ معلوم ہوتا ہے۔ وقفہ لفظوں میں تو نہیں لیکن انسانی فکر میں ضرور ہے کیونکہ انسانی فکر کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ مقدمات سے نتائج نکالتا ہے لیکن یہاں کسی نتیجے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، لیکن اس کے باوجود انسان ایسے راستے پر چل رہا ہے جس کیلئے اس کے پاس کوئی دلیل نہیں۔ اس لئے آنحضرت ﷺ سے فرمایا جا رہا ہے کہ آپؐ ان لوگوں سے پوچھئے جو دلیل کی قوت سے بے بہرہ ہو چکے لیکن مزعومہ عقائد کی ابجد سے نکلنے کو تیار نہیں کہ تم نے اپنے تئیں جو شریک بنا رکھے ہیں ان کے نام تو بتاؤ، کیونکہ نام ہی سے مسمّی کا تعارف ہوتا ہے تاکہ ہمیں بھی پتہ چلے کہ وہ کون لوگ ہیں جنھیں تم نے اللہ تعالیٰ کا شریک بنا رکھا ہے۔ اور اگر تمہارے پاس ان کے شریکِ خدا ہونے کی کوئی سند موجود ہے تو ہمیں بھی دکھاؤ اور اگر ایسی کوئی بات نہیں تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کو ایک ایسی بات کی خبر دے رہے ہو جس سے وہ اپنے بے پایاں علم کے باوجود ناواقف ہے۔ اور اگر تمہاری گمراہی تمہیں یہاں تک لے پہنچی ہے کہ تم اللہ کریم کے بارے میں ایسے تصورات رکھتے ہو تو پھر اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ درحقیقت تمہارے پاس اپنے باطل اعتقادات کی کوئی دلیل نہیں۔ تمہارے جی میں جو آتا ہے یا جو بات خیال میں آ جاتی ہے، وہ تم کہنا شروع کر دیتے ہو۔ تم کٹی ہوئی پتنگ کی طرح بے پر کی ہوائی باتوں پر یقین رکھتے ہو۔ اور تم جانتے ہو کہ ایسی باتوں کا علمی دنیا میں کوئی جواز نہیں۔

Marfat.com

ایک سوال کا جواب

سوال یہ ہے کہ جس بات کا علمی دنیا میں کوئی مقام نہ ہو اور عام انسانی معاملات میں بھی اس کا کوئی وقار نہ ہو یہ کیسے ممکن ہے کہ لوگ اس کے فریفتہ ہوں اور اپنی اس نامعقولیت پر جان تک دینے کیلئے تیار ہوں۔ اس آیت کے دوسرے حصے میں اس کا جواب دیا گیا ہے۔ بات درحقیقت یہ ہے کہ مذہبی طبقے میں بھی دو گروہ ہوتے ہیں، ایک ہے مشائخ اور علماء کا گروہ اور دوسرا طبقہ عوام سے تعلق رکھنے والے لوگ۔ علماء سوء اور دنیادار مشائخ اپنے دنیوی مفادات کیلئے جب دین کو ذریعہ بنا لیتے ہیں تو پھر ان کے پیش نظر دین نہیں ہوتا بلکہ ہوسِ زر ہوتی ہے۔ وہ ہوسِ زر میں مبتلا ہو کر اپنے دین کو دنیا طلبی میں اس طرح استعمال کرتے ہیں جس سے آہستہ آہستہ ان کا ضمیر مردہ ہو جاتا ہے اور عوام یہ سمجھ کر کہ یہ اتنے بڑے بڑے علماء اور مشائخ جن باتوں کو حق سمجھتے ہیں ان میں یقیناً حق کے سوا کوئی اور بات نہیں ہوگی۔ جب یہ دنیا کا دھندا ایک معمول بن جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس راستے پر چلنے والوں کو حقیقت شناسی سے محروم کر دیتا ہے۔ انھوں نے گمراہی کا جو راستہ اپنے لئے انتخاب کیا اللہ تعالیٰ اسی راستے کو ان کا مطلوب ومقصود بنا دیتا ہے۔ اور پھر ان کا ایک ایک عمل اس طرح ان کی نگاہوں میں مزین کر دیا جاتا ہے کہ وہ اس سے ہٹ کر کسی اور بات کو قبول کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ اللہ تعالیٰ کا راستہ ان کیلئے ممنوع قرار پاتا ہے۔ پیشوائی کی موروثی گدی ان کیلئے سب سے بڑی سند بن جاتی ہے اور وہ حق کے ہر راستے سے اس طرح محروم کر دیئے جاتے ہیں کہ ان کے دل و دماغ اس کے فہم وادراک سے عاجز ہو جاتے ہیں۔ ان کے اسلاف اگر علم وعمل میں جلالتِ شان کے بھی مالک تھے تو یہ ان کے مقابلے میں نہایت تہی دامن ثابت ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کیلئے شاید یہ کہنا غلط نہ ہو:

میراث میں آئی ہے انھیں مسندِ ارشاد
زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن

لَهُمْ عَذَابٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَقُّ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ ﴿٣٤﴾ (سورة الرعد: ٣٤)

(ان کیلئے دنیا کی زندگی میں بھی عذاب ہے اور آخرت کا عذاب اس سے بھی زیادہ سخت ہے اور ان کو اللہ تعالیٰ سے کوئی بچانے والا نہیں ہوگا۔)

جو لوگ پیغمبرؐ کی دعوت کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے اور جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ کا شریک بنا رکھا ہے ان کے اعتماد پر ہر بدعملی کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ کی مشیت نے فیصلہ کر لیا کہ دنیا میں ان پر عذاب بھیجا جائے تو یہ دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ کے عذاب کا شکار ہوں گے اور آخرت کا عذاب دنیا کے عذاب سے بھی کہیں زیادہ دکھ دینے والا اور شدید ہوگا۔ اور رہا ان کا یہ خیال کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک تو تمہیں انھیں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچا لیں گی، وہ ان کو کسی عذاب سے بچا نہیں سکیں گی۔

مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ۭ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۭ اُكُلُهَا دَاۗىِٕمٌ وَّظِلُّهَا ۭ تِلْكَ عُقْبَى الَّذِيْنَ اتَّقَوْا ڰ وَّعُقْبَى الْكٰفِرِيْنَ النَّارُ ﴿٣٥﴾ (سورة الرعد: ٣٥)

(تمثیل اس جنت کی جس کا متقیوں سے وعدہ کیا گیا ہے، یہ ہے کہ اس کے نیچے ندیاں رواں ہوں گی، اس کا پھل دائمی اور اس کا سایہ لازوال، یہ انجام ہے ان لوگوں کا جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا اور کافروں کا انجام دوزخ ہے۔)

جنت کی تمثیل

قرآن کریم نے اپنے اسلوب کے مطابق اہلِ دوزخ کے ذکر کے بعد اہلِ جنت کا ذکر فرمایا ہے۔ سب سے پہلے یہ ارشاد فرمایا کہ جہنم کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ نے جو جنت پیدا کر رکھی ہے اور جو جنت کے مستحق لوگوں کو ملے گی۔ وہ جنت باغات پر مشتمل ہے اور جس میں بیش قیمت محلات

Marfat.com

ہیں جیسا کہ قرآنِ کریم نے بعض دوسری آیات میں بیان فرمایا ہے، ان محلات کے نیچے سے یا ان کے چاروں طرف درختوں کے نیچے سے ایسی ندیاں اور نہریں رواں ہیں جن کا پانی کبھی خشک نہیں ہوگا۔ اس پانی کی سیرابی سے جو درخت توانا ہوں گے اگر وہ پھلدار ہیں تو ان کا پھل دائمی ہوگا۔ ایسا نہیں ہوگا کہ موسم کے گزرنے سے وہ پھل آنا بند ہوجائیں یا سڑ جائیں، وہاں کسی چیز کے سڑنے کی نوبت نہیں آئے گی۔ اور اگر وہ درخت سایہ دار ہیں تو ان کے سائے پر کبھی کوئی خزاں نہیں چھائے گی، ان کے سائے لازوال ہوں گے۔ پت جھڑ کا موسم ان پر کبھی نہیں آئے گا۔ اور یہ جنت مسکن ہوگا ان لوگوں کا جو تقویٰ جیسی دولت کے سرمایہ دار ہوں گے۔ جنہوں نے دنیا میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے پیشِ نظر دنیا کی ہر اس نعمت سے کنارہ کشی کی ہوگی جس سے اللہ تعالیٰ نے روکا ہے، آج انھیں جنت میں اسی اتقا کے بدلے میں جو نعمتیں عطا ہوں گی وہ دائمی اور ابدی ہوں گی۔ البتہ جو لوگ اللہ تعالیٰ سے کفر کا راستہ اختیار کریں گے ان کا انجام جہنم ہوگا۔

وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمِنَ الْاَحْزَابِ مَنْ يُّنْكِرُ بَعْضَهٗ ۭ قُلْ اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ وَلَآ اُشْرِكَ بِهٖ ۭ اِلَيْهِ اَدْعُوْا وَاِلَيْهِ مَاٰبِ ﴿۳۶﴾ (سورۃ الرعد : ۳۶)

(اور جن لوگوں کو ہم نے کتاب عطا کی وہ اس چیز پر خوش ہیں جو اے پیغمبر آپ پر اتاری گئی ہے اور ان جماعتوں میں سے ایسے بھی لوگ ہیں جو اس کی بعض باتوں کو نہیں مانتے۔ اے نبی آپ کہہ دیجیے کہ مجھے تو حکم دیا گیا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ ہی کی بندگی کروں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤں۔ میں اسی کی طرف دعوت دیتا ہوں اور اسی کی طرف میرا رجوع ہے۔)

اعتراض اور اس کا جواب

اس آیتِ کریمہ میں ایک ایسے اعتراض کا جواب دیا گیا ہے جو عموماً مشرکین کی طرف سے دہرایا جاتا تھا۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ نبی کریم ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے بہت سے نبیؑ اور رسولؑ مختلف امتوں میں آئے، ان میں سے بطورِ خاص اہلِ کتاب ہمارے سامنے موجود ہیں۔ مسلمانوں کا دعویٰ یہ ہے کہ اہلِ کتاب جن کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں وہ یقیناً اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی تھیں اور ان کتابوں میں نہ صرف نبی کریم ﷺ کی تشریف آوری کا ذکر ہے بلکہ آپؐ کی بعض علامات اور صفات بھی بیان کی گئی ہیں۔ ایسی صورتحال میں ہونا تو یہ چاہیے کہ اہلِ کتاب لپکتے ہوئے اس کتاب کی طرف آئیں اور دیوانہ وار آنحضرت ﷺ پر ایمان لائیں جبکہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ اہلِ کتاب نبی کریم ﷺ کی بے انتہا مخالفت کر رہے ہیں، اس کا جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ ہم نے جن کو کتاب دی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اشارہ نصاریٰ کی طرف ہے۔ ان میں ایسے لوگ موجود ہیں جو نبی کریم ﷺ پر ایمان بھی لائے اور قرآنِ کریم کی ایک ایک بات کو تسلیم بھی کیا۔ لیکن یہ وہ لوگ ہیں جو شمعون صفا کے پیروکار ہیں اور جو اپنے آپ کو نصاریٰ کہنے میں فخر محسوس کرتے ہیں اور جن کا ذکر قرآنِ کریم نے سورۃ مائدہ کی آیت ۸۲ میں کیا ہے۔ رہے وہ عیسائی جو اپنے آپ کو نصاریٰ کہلاتے ہوئے شرم محسوس کرتے ہیں اور جو اپنے آپ کو کرسچین کہتے ہیں وہ یقیناً نبی کریم ﷺ کی نبوت کو تسلیم نہیں کرتے۔ وَمِنَ الْاَحْزَابِ سے شاید وہی لوگ مراد ہیں۔ اس لئے آپ کو حکم دیا گیا کہ آپ صاف صاف اعلان کر دیجیے کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں صرف ایک اللہ تعالیٰ کی عبادت کروں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤں۔ میری توحید تثلیث کے ماننے والوں کی تائید کی محتاج نہیں۔ اس میں میں تو اللہ تعالیٰ ہی کی طرف دعوت دوں گا اور مجھے اسی کی طرف لوٹ کے جانا ہے۔

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا ۭ وَلَىِٕنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَاۗءَهُمْ بَعْدَمَا جَاۗءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا وَاقٍ ﴿۳۷﴾ (سورۃ الرعد : ۳۷)

(اور اسی لئے ہم نے اس کتاب کو نازل کیا ہے، عربی زبان میں ایک فرمان کی حیثیت سے۔ اور اگر آپ نے (بفرضِ محال) اس علمِ صحیح کے آجانے کے بعد لوگوں کی خواہشات کی پیروی کی تو اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں نہ آپ کا کوئی مددگار ہوگا اور نہ کوئی بچانے والا۔)

Marfat.com

قرآن کی حیثیت

گزشتہ آیتِ کریمہ میں ہم نے مشرکینِ مکہ کا اہلِ کتاب کے حوالے سے اعتراض بھی پڑھا اور اس کا جواب بھی۔ اب ایک دوسرے پہلو سے اسی اعتراض کا جواب دیا جارہا ہے کہ تم اپنی ساری انکار کی قوتیں اور شک وشبہ کے تمام طلسمات کو ایک طرف رکھ کر اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کرلو کہ قرآن کریم محض کتابوں میں ایک کتاب کا اضافہ نہیں بلکہ اس کی حیثیت فرمانِ الٰہی کی ہے جسے عربی زبان میں اس لئے اتارا گیا ہے تاکہ تم اس کے اولین مخاطب کی حیثیت سے اسے سمجھ سکو اور پھر اس کے مبلغ ومناد بن کر اٹھو۔ جب تک تم اس کی اس اصل حیثیت کو سمجھنے کی کوشش نہیں کروگے اس وقت تک مختلف بہانے تمہارا راستہ روکتے رہیں گے۔ کوئی کتاب جو نصیحت کیلئے لکھی جائے یا کسی علمی صداقت کے اثبات کیلئے، اس کیلئے ایک سے زیادہ آرا کا ہوجانا چنداں قابلِ تعجب نہیں، لیکن وہ نوشتہ جس کی حیثیت حاکمِ اعلیٰ کے فرمان کی ہو اس میں اس بات کی اجازت نہیں دی جاسکتی کہ تم اسے اپنی دماغی کاوشوں کا میدان بناؤ۔ فرمان کی حیثیت صرف تسلیم کرنے سے وجود میں آتی ہے۔ رہی یہ بات کہ اسے دماغ قبول کرتے ہیں یا نہیں، یہ بہت بعد کی بات ہے۔ اس لئے جب تک تم قرآنِ کریم کو فرمانِ الٰہی کا درجہ نہیں دوگے، اس وقت تک یہ قیل وقال ختم نہیں ہوگا۔

خطاب آنحضرت ﷺ سے، عتاب مشرکین پر

اس کے بعد آنحضرت ﷺ سے خطاب ہے جس میں بظاہر ایک ایسی بات کی وجہ سے آپ پر عتاب ہورہا ہے جس کا ثبوت کسی پیغمبر سے قطعاً ناممکن ہے۔ اس کے بارے میں قرآنِ کریم کے اُسلوب کا ایک نکتہ ذہن میں رہنا چاہیے، وہ یہ کہ جب کبھی کسی ایسی بات پر جس کا تعلق کفار سے ہو اللہ تعالیٰ کے پیغمبرؑ پر عتاب ہوتا ہو تو وہ عتاب دراصل پیغمبرؑ پر نہیں ہوتا بلکہ اس قوم پر ہوتا ہے جس کی طرف پیغمبرؑ مبعوث ہوتا ہے۔ یہاں بھی خطاب آنحضرت ﷺ سے ہے لیکن عتاب قریشِ مکہ پر ہے۔ ان کے رویئے اور انکار کی شناعت کو نمایاں کرنے کیلئے یہ اندازِ بیان اختیار کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کا انکار درحقیقت اسے تسلیم کرنے سے انکار، پیغمبر پر ایمان لانے سے انکار یہ اتنا بڑا جرم ہے کہ اگر کہیں اس کا صدور نبی سے بھی ہو جو بالکل ناممکن ہے تو اس پر بھی اللہ تعالیٰ کے عتاب کی بجلی گرے گی اور وہ بھی اس کے غضب سے محفوظ نہ رہ سکے گا۔ اور اللہ تعالیٰ تعالیٰ کی تمام عنایتِ خصوصی کا مورد ہونے کے باوجود اس کے عذاب سے نہ بچ سکے اور کوئی اس کو بچانے والا بھی نہ ہو۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا

مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً ۚ وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ

اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۗ لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ ﴿٣٨﴾ يَمْحُوا اللّٰهُ

مَا يَشَاۗءُ وَيُثْبِتُ ښ وَعِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ ﴿٣٩﴾ وَاِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ

بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ

وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ ﴿٤٠﴾ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا

Marfat.com

مِنْ اَطْرَافِهَا ؕ وَاللّٰهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهٖ ؕ وَهُوَ سَرِيْعُ
الْحِسَابِ ﴿۴۱﴾ وَقَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلِلّٰهِ الْمَكْرُ جَمِيْعًا ؕ
يَعْلَمُ مَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ ؕ وَسَيَعْلَمُ الْكُفّٰرُ لِمَنْ عُقْبَى
الدَّارِ ﴿۴۲﴾ وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَسْتَ مُرْسَلًا ؕ قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ
شَهِيْدًۢا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۙ وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ ﴿۴۳﴾

رکوع: ۶ (اور ہم نے آپؐ سے پہلے بھی کئی رسولؑ بھیجے اور ہم نے ان کو بیویاں اور اولاد بھی عطا فرمائی اور کسی رسول کی بھی یہ طاقت نہ تھی کہ اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر کوئی نشانی دکھا سکے۔ ہر چیز کے لیے ایک وقت اور ہر وقت کے لیے ایک نوشتہ ہے۔ اللہ تعالیٰ جو کچھ چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جس چیز کو چاہتا ہے باقی رکھتا ہے اور اصل کتاب اسی کے پاس ہے۔ اور اے نبیؐ جس برے انجام کی دھمکی ہم ان کو دے رہے ہیں اس کا کچھ حصہ یا تو ہم آپؐ کو دکھا دیں گے اور یا ہم آپؐ کو وفات دے دیں گے بس آپؐ پر صرف پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے اور حساب لینا ہمارا کام ہے۔ کیا یہ لوگ دیکھ نہیں رہے کہ ہم بڑھ رہے ہیں اس سر زمین کی طرف اس کے اطراف سے کم کرتے ہوئے اور اللہ تعالیٰ فیصلہ کرتا ہے اور کوئی اس کے فیصلے کو ہٹانے والا نہیں اور وہ بہت جلد حساب چکا دینے والا ہے۔ تحقیق چالیں چلی ہیں ان لوگوں نے جو ان سے پہلے تھے لیکن سب چالیں اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہیں وہ جانتا ہے کہ کون کیا کچھ کمائی کر رہا ہے اور یہ کافر جلد جان لیں گے کہ دارِ آخرت کی کامیابی کس کے لیے ہے۔ اور یہ کافر کہتے ہیں کہ آپؐ اللہ تعالیٰ کے رسولؐ نہیں ہیں، اے پیغمبرؐ ان سے کہہ دیجیے کہ کافی ہے اللہ تعالیٰ گواہ میرے اور تمہارے درمیان اور وہ لوگ جن کے پاس کتاب کا علم ہے۔)

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً ؕ وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ
لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ ﴿۳۸﴾ (سورۃ الرعد : ۳۸)

(اور ہم نے آپ سے پہلے بھی کئی رسول بھیجے اور ہم نے ان کو بیویاں اور اولاد بھی عطا فرمائی اور کسی رسول کی بھی یہ طاقت نہ تھی کہ اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر کوئی نشانی دکھا سکے۔ ہر چیز کے لیے ایک وقت اور ہر وقت کے لیے ایک نوشتہ ہے)

دو اعتراضات اور ان کا جواب

مشرکین مکہ نبی کریمؐ پر مختلف قسم کے اعتراضات کرتے تھے۔ قرآن کریم حکمت دعوت کے مطابق جب مناسب سمجھتا ہے تو ان کا جواب دیتا ہے یہاں بھی ایک اعتراض کا جواب دیا جا رہا ہے۔ اعتراض یہ ہے جسے قرآن کریم نے ذکر نہیں کیا لیکن اس کے جواب سے سمجھ میں آتا ہے۔ وہ یہ کہتے تھے کہ رسالت اور نبوت سراسر روحانی منصب ہے یہ اللہ تعالیٰ ایسے بندوں کو عطا کرتا ہے جو دنیا دار نہیں ہوتے ان کے حالات اہل دنیا جیسے نہیں ہوتے ان

Marfat.com

کی ضرورتیں اور چاہتیں اہل دنیا سے بالکل مختلف ہوتی ہیں ان کے اندر جنسی جذبات اور طبعی ضروریات نہیں ہوتیں اس کی وجہ سے نہ انھیں کھانے پینے کی حاجت ہوتی ہے کہ وہ اکتساب رزق پر مجبور ہوں اور دنیا داروں کی طرح ان کے بھی بیوی بچے ہوں حضرت محمد ﷺ ان کے بقول اس لیے نبیؑ اور رسولؑ نہیں ہوسکتے کیونکہ ان کی بیوی بھی ہے بچے بھی ہیں اور قرآن کریم نے دوسری جگہ قریش مکہ کے اعتراض کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ رسول کیسا ہے کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں کاروبار کے لیے دوڑا بھاگا پھرتا ہے چنانچہ اس آیت کریمہ کے پہلے جز میں اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ ہم نے محمد ﷺ کو روئے زمین پر پہلا نبی اور رسول بنا کر نہیں بھیجا بلکہ اس سے پہلے ہزار ہا نبیؑ تشریف لا چکے ہیں ان میں سے کتنے ایسے ہیں جنھیں تم تسلیم کرتے ہو اور بعضوں کی اولاد ہونے پر فخر کرتے ہو۔ حضرت ابراہیم، حضرت اسحٰق اور حضرت اسماعیل علیہم السلام کو کون نہیں جانتا۔ حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام سے کون ناواقف ہے یہ اللہ تعالیٰ کے عظیم رسولؑ تھے۔ یہ جلیل القدر شخصیات اللہ تعالیٰ کے رسولؑ بھی تھیں اور ساتھ ہی ان کے ساتھ وہ تمام ضروریات بھی لگی ہوئی تھیں۔ اس لیے تاریخ کے آئینہ میں غور سے دیکھو اور اپنی غلطی کو سمجھنے کی کوشش کرو۔

دوسرا اعتراض مشرکین مکہ کی طرف سے یہ کیا جاتا تھا کہ ہم نے اہل کتاب سے سنا ہے کہ قوموں کی طرف جتنے بھی رسولؑ آئے ہیں وہ اپنی سند ماموریت کے طور پر کوئی نہ کوئی معجزہ یا نشانی لے کر آئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب نبوت عطا کی گئی تو آپؑ کو عصائے موسیٰ اور ید بیضا کے نشانات دیے گئے اور آپؑ کو فرعون کی ہدایت کے لیے بھیجا گیا اسی طرح باقی انبیاءؑ اور رسلؑ کو بھی لیکن نبی کریم ﷺ کی تشریف آوری تک زمانہ ارتقائے معنوی، روحانی اور ذہنی کی بہت سی منزلیں طے کر چکا تھا پہلے کسی انسان کی غیر معمولی شخصیت کو تسلیم کرنے کے لیے اس شخصیت سے خلاف عادت امور کا ظہور ضروری سمجھا جاتا تھا اس کے بغیر کسی شخصیت کو غیر معمولی تسلیم کرنا یا اللہ تعالیٰ سے اس کے کسی تقرب کو مان لینا ممکن نہ تھا لیکن حضورؐ کی بعثت کے وقت سیرت و کردار کی غیر معمولی توانائیاں اور ماحول کے اثرات سے بلند ہو کر غیر معمولی صفات کا اظہار بڑی سے بڑی شعبدہ بازی سے بڑھ کر اثر انداز ہونے لگا۔ اب مقابلہ جادوگروں کے ساتھ نہیں بلکہ ماہرین علوم وفنون اور ادب کے تیور شناسوں سے تھا۔ اسی لیے آنحضرتؐ نے کوہ صفا پر چڑھ کر اپنے کردار کے بے عیب ہونے کی گواہی مانگی ہے اور اسی کو اپنی دلیل کے طور پر پیش فرمایا اور اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر اس آیت کریمہ میں یہ فرمایا کہ دنیا کی گمراہیوں میں سے بڑی بڑی گمراہیوں کا سبب آج تک یہ رہا ہے کہ اہل دنیا اللہ تعالیٰ اور پیغمبرؐ کی صفات میں فرق کو ملحوظ رکھنے کی صلاحیت سے بہرہ ور نہیں تھے اس لیے پیغمبرؐ میں ہمیشہ خدا کی صفات ڈھونڈتے تھے لیکن اب علمی ارتقاء کے بعد انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ پیغمبر کا کام ہدایت دینا ہے معجزات اور نشانیاں دکھانا نہیں یہ کام اللہ تعالیٰ کا ہے۔ جب قوم پیغمبر کی دعوت کو قبول کرنے سے انکار کرتی تھی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی تائید میں معجزات دکھائے جاتے تھے اور یا سزا کے طور پر عذاب بھیجا جاتا تھا لیکن یہ عذاب کب آئے گا اس کا ہر رشتہ اللہ تعالیٰ کے نبی کے ہاتھ میں نہیں، اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ تمہیں نبی سے ہدایت طلب کرنی چاہیے اور اگر تم نے اپنے آپ سے اس کو محروم کر لیا تو پھر اللہ تعالیٰ کے علم کے مطابق عذاب اپنے وقت پر آئے گا اور اگر معجزے کی ضرورت ہوئی تو اس کا ظہور بھی اپنے وقت پر ہوگا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے یہاں ہر چیز کے لیے ایک اجل ہے اور ہر اجل اس کی یہاں لکھی ہوئی ہے۔ اس کا نظام نہایت منضبط ہے اس کے ہاں تقدیم و تاخیر نہیں ہوتی۔

يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ ۚ وَعِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ ﴿۳۹﴾ (سورۃ الرعد : ۳۹)

(اللہ تعالیٰ جو کچھ چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جس چیز کو چاہتا ہے باقی رکھتا ہے اور اصل کتاب اسی کے پاس ہے۔)

اللہ تعالیٰ کے اختیار کا عالم یہ ہے کہ وہ جس طرح انسانوں کی قسمتیں بنانے میں آزاد ہے اور انھیں صلاحتیں دینے میں بھی کسی قید کا پابند نہیں۔ اسی طرح وہ انسانوں کو شریعت دیتے ہوئے سراسر اپنی مشیت کے مطابق کام کرتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ انسانی ارتقاء کے ساتھ ساتھ احکام کو کس طرح سفر کرنا چاہیے۔ چنانچہ اسی کے مطابق وہ اپنی کتابوں میں کبھی نسخ سے کام لیتا ہے اور کبھی ترمیم و تحریف سے حفاظت کا انتظام اٹھا دیتا ہے تاکہ انسانی ارتقا کی طرح کردار سازی اور تربیت کا عمل بھی اپنی طبعی رفتار سے آگے بڑھے لیکن علم کا اصل سرمایہ جسے ام الکتاب کہا گیا ہے یہ اسی کے ہاتھ میں رہتا ہے ہر محو و اثبات اور ہر اخراج و اندراج صرف اسی حکمت و مشیت کے تحت ہوتا ہے کسی دوسرے کا اس میں کوئی دخل نہیں۔ انسانوں کا کام اس کے بھیجے ہوئے پیغمبر اور نازل کردہ کتاب کا اتباع کرنا ہے آئندہ قسمت اور حالت کا فیصلہ اتباع کو دیکھ کر ہوگا۔

Marfat.com

وَاِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِىْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ ﴿۴۰﴾

(اور اے نبیؐ جس برے انجام کی دھمکی ہم ان کو دے رہے ہیں اس کا کچھ حصہ یا تو ہم آپ کو دکھا دیں گے اور یا ہم آپؐ کو وفات دے دیں گے بس آپؐ پر صرف پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے اور حساب لینا ہمارا کام ہے) (سورۃ الرعد:۴۰)

مشرکین کو وارننگ

اس آیت کریمہ میں خطاب اگرچہ نبی کریم ﷺ کو ہے لیکن سنانا مشرکین مکہ کو ہے۔ آنحضرت ﷺ کو تسلی دی جارہی ہے کہ آپؐ اس بات کی فکر میں نہ پڑیں کہ جو لوگ آپؐ کی دعوت کو قبول نہیں کر رہے ان کے ساتھ کیا ہوگا، اس کا تعلق ہرگز آپؐ سے نہیں۔ وہ اگر اپنی قسمت پھوڑ چکے ہیں تو آپؐ اس سے دل گرفتہ کیوں ہوں۔ مشرکین مکہ کو کہا جارہا ہے کہ تم یہ مت سمجھو کہ تمھاری یہ مہلت کھلی چھوٹ بن گئی ہے اور تم اسی طرح داد عیش دیتے رہو گے تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ تمھارا انجام دور نہیں اگر اپنے آپ کو بدل لو گے تو اپنے انجام کو بہتر کر لو گے اور اگر نہیں بدلو گے تو ممکن ہے کہ ہم عذاب کا کوئی حصہ آنحضرت ﷺ کی زندگی ہی میں تمہیں چکھا دیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ حضور ﷺ کو وفات دینے کے بعد تمہیں عذاب کے حوالے کر دیا جائے ابھی تک تو ہم پیغمبر کی ذمہ داری کے حوالے سے تمہیں مہلت دے رہے ہیں۔ اس کا کام پہنچانا ہے سو وہ بخوبی اپنی ذمہ داری ادا کر رہا ہے لیکن ایک وقت آئے گا جب پھر ہمارا انصاف حرکت میں آئے گا اور ہم تم سے حساب لیں گے۔ اور بہت بدنصیب ہے وہ شخص اور قوم جس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے حساب تک پہنچ جائے۔

نہ جا اس کے تحمل پر کہ بے ڈھب ہے گرفت اس کی
ڈر اس کی دیر گیری سے کہ ہے سخت انتقام اس کا

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَاْتِى الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ۭ وَاللّٰهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهٖ ۭ وَهُوَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۴۱﴾

(کیا یہ لوگ دیکھ نہیں رہے کہ ہم بڑھ رہے ہیں اس سرزمین کی طرف اس کے اطراف سے کم کرتے ہوئے اور اللہ تعالیٰ فیصلہ کرتا ہے اور کوئی اس کے فیصلے کو ہٹانے والا نہیں اور وہ بہت جلد حساب چکا دینے والا ہے۔) (سورۃ الرعد:۴۱)

مسلمانوں کو تسلی اور مشرکین کو وارننگ ایک دوسرے پہلو سے

اس آیت کریمہ میں بھی آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کے لیے تسلی ہے اور کفار مکہ کے لیے وارننگ ہے آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کو یہ کہہ کر تسلی دی جارہی ہے کہ آپ شاید یہ سمجھتے ہیں کہ چونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کفار پر عذاب نازل نہیں ہوا اور اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کو کھل کھیلنے کی اجازت دے دی گئی ہے۔ یہ آپؐ اور آپؐ کی دعوت کے ساتھ جو چاہیں سلوک کریں ان پر کوئی گرفت نہیں ہوگی یہ بات غلط ہے ہم اگرچہ براہ راست ان پر عذاب نازل نہیں کر رہے لیکن اگر انھیں دیدۂ بینا نصیب ہوتا تو وہ دیکھ سکتے تھے کہ کس طرح ان کا دائرہ اقتدار اور دائرہ رسوخ روز بروز سمٹتا جارہا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک دن ان کا مرکز اعصاب اور مرکز قوت یعنی مکہ معظمہ اسلامی قوت کے سامنے جھک جائے گا اور مشرکین مکہ کو واضح تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا جارہا ہے کہ اگر تم میں ہوش و خردمندی ہوتی تو بڑی آسانی سے محسوس کر سکتے تھے کہ آنحضرت ﷺ تنہا اللہ تعالیٰ کے دین کی دعوت کو لے اٹھے تھے، لیکن کفر کی ساری مخالفتوں کے باوجود ایک معتدبہ تعداد مکہ معظمہ میں اسلام قبول کر چکی ہے اور مکہ کے اطراف میں کوئی علاقہ اور کوئی آبادی ایسی نہیں جہاں اسلام کی دعوت کسی نہ کسی حد تک اثر انداز نہیں ہو چکی۔ مسلمان ہجرت کر کے حبشہ تک جا چکے ہیں اور اس طرح سے وقت کا ایک حکمران اسلام قبول کر چکا ہے اور اس کی قوم میں اسلام کے لیے ہمدردی پیدا ہو چکی ہے۔ مدینہ منورہ میں اسلام کی شعاعیں پہنچ چکی ہیں اور وہ دن دور نہیں جب مدینہ کی آغوش اسلام کے لیے کھل جائے گی۔ اس طرح دھیرے دھیرے اسلام مکہ کی طرف بڑھ رہا ہے اس سے ہر دیدۂ بینا رکھنے والا شخص آسانی سے دیکھ سکتا ہے۔ کہ اسلام مکہ کے اطراف کو فتح کرتا ہوا فاتحانہ مکہ کی طرف بڑھ رہا ہے اور وہ وقت دور نہیں جس کے لیے پیش گوئی کرتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے۔

Marfat.com

میں دریا کی روانی دیکھ کر جانباز کہتا ہوں
کہ دریا میں ہی دریا کے کنارے ڈوب جائیں گے

وَقَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلِلّٰهِ الْمَكْرُ جَمِيْعًا ۭ يَعْلَمُ مَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ ۭ وَسَيَعْلَمُ الْكُفّٰرُ لِمَنْ عُقْبَى الدَّارِ ﴿۴۲﴾
(تحقیق چالیں چلی ہیں ان لوگوں نے جو ان سے پہلے تھے لیکن سب چالیں اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہیں وہ جانتا ہے کہ کون کیا کچھ کمائی کر رہا ہے اور یہ کافر جلد جان لیں گے کہ دارِ آخرت کی کامیابی کس کے لیے ہے۔) (سورۃ الرعد:۴۲)

مشرکین کی چالیں کوئی معنی نہیں رکھتیں

بلاشبہ کفار مکہ دعوت اسلامی کے اثرات کو روکنے کے لیے ایک سے ایک بڑی تدبیر اور ایک سے ایک بڑی چال بروئے کار لا رہے ہیں لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہر دور میں کفر نے اسلام کا راستہ روکا ہے۔ جب بھی کوئی اللہ تعالیٰ کا رسولؐ اللہ تعالیٰ کے دین کو لے کر اٹھا ہے وقت کی مخالف قوتوں نے کبھی بھی اس دعوت کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کیا۔ کفر سے جو کچھ بن پڑا ہے انھوں نے اسے بروئے کار لانے میں کبھی کوتاہی نہیں کی لیکن حق و باطل کی کشمکش جلد ہی یہ بات واضح کر دیتی ہے کہ حق کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت ہوتی ہے کفر بظاہر بہت شور مچاتا ہے لیکن اس کی حیثیت سطح آب پر ابھرنے والے جھاگ سے زیادہ نہیں ہوتی۔ جھاگ رفتہ رفتہ اڑ جاتا ہے اور خالص دھات اور نفع دینے والی چیز باقی رہ جاتی ہے۔ حق کی بالادستی کے لیے اللہ تعالیٰ حق پر ایمان لانے والوں کا بھی امتحان لیتا ہے وہ اصحاب ایمان اور اصحاب کفر دونوں کے جذبوں اور دونوں کے محرکات سے واقف ہوتا ہے لیکن جب اہل ایمان اپنے اخلاص، صبر اور تقویٰ سے اپنی اہلیت ثابت کر دیتے ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ ان کے لیے غلبے کے امکانات کو پیدا فرما دیتا ہے۔ وہ دنیا میں بھی غالب آتے ہیں اور آخرت میں بھی انھی کے لیے سرخروئی ہوتی ہے وہ دنیا میں چونکہ کافر اس طرح کے وعدوں کا مذاق اڑاتے ہیں اس لیے اس آیت کریمہ میں فرمایا گیا کہ وہ آخرت میں دیکھ لیں گے کہ آخرت کی نعمتیں اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودیاں کس کے لیے ہیں۔

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَسْتَ مُرْسَلًا ۭ قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًۢا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۙ وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ ﴿۴۳﴾
(اور یہ کافر کہتے ہیں کہ تم خدا کے رسول نہیں ہو، اے پیغمبر ان سے کہہ دیجیے کہ کافی ہے اللہ تعالیٰ گواہ میرے اور تمھارے درمیان اور وہ لوگ جن کے پاس کتاب کا علم ہے۔) (سورۃ الرعد:۴۳)

آنحضرت ﷺ کی رسالت کی گواہی

ایسے مسکت اور قطعی دلائل سننے اور ناقابل انکار شواہد دیکھنے کے بعد بھی اگر یہ کفار اپنی ضد پر قائم ہیں کہ آپؐ اللہ تعالیٰ کے رسولؐ نہیں بلکہ آپؐ نے خواہ مخواہ اپنے آپؐ کو رسولؐ کی حیثیت سے پیش کیا ہے جبکہ رسولؐ ہونے کے لیے جس اثر و اقتدار کا ہونا ضروری ہے وہ آپؐ کے پاس ہرگز نہیں آنحضرت ﷺ سے فرمایا جا رہا ہے کہ آپؐ ایسے کافروں سے یہ کہہ دیجیے کہ کسی بات کی صحت کو جاننے کے لیے ہمیشہ دلائل و شواہد درکار ہوتے ہیں لیکن اگر یہ سرمایہ بھی تمھارے لیے ناکافی ثابت ہو رہا ہے تو پھر اس کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے کہ مجھے تو اللہ تعالیٰ نے رسول بنا کر بھیجا ہے اور اس کی طرف سے وحی کا اترنا اور میری نبوت کی دلیل میں بعض معجزات کا ظہور میری نبوت کے لیے کافی ہے۔ اور یہ گواہی وقت کے ساتھ ساتھ مزید اس طرح نکھرتی جا رہی ہے کہ منکرین کے لیے اس کا جواب ناممکن ہوتا جا رہا ہے اور اگر اس کی مزید گواہی دیکھنا ہو تو اس کے لیے اہل کتاب میں سے وہ انصاف پسند اور راست فکر لوگ کافی ہیں جو اپنی کتابوں کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ کے آخری رسولؐ کی نشانیاں دیکھ کر گواہی دیتے ہیں کہ آپؐ واقعی اللہ تعالیٰ کے رسولؐ ہیں اور پہلی آسمانی کتابوں نے آپؐ ہی کے آنے کی خبر دی تھی اور یہ اہل کتاب کے علماء ہیں جن کی طرف اوپر آیت نمبر 36 میں اشارہ فرمایا گیا ہے بعض اہل علم کا خیال یہ ہے کہ اس آیت کریمہ میں مَن عندہ سے مراد حضرت جبرائیل امین علیہ السلام ہیں لیکن صحیح بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ اس سے مراد اہل کتاب کے مومن بھی ہیں اور اس امت کے بھی۔

Marfat.com

Marfat.com

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْآ اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ

کیا ایمان والوں کے لیے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

هُدًى لِّلنَّاس

سُوْرَةُ اِبْرٰهِيْم

Marfat.com

Marfat.com

تعارف

سُوْرَةُ اِبْرٰهِيْمَ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سورة کا نام

اس سورت کا نام ابراہیم ہے۔ نام ہونے کا مطلب یہ ہے کہ یہ سورت اس نام سے پہچانی جاتی ہے، یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس سورت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حالاتِ زندگی مذکور ہیں۔ جس طرح ہر نام اپنے مسمّٰی پر دلالت کرتا ہے اسی طرح ابراہیم کا نام بھی اس سورت کی شناخت پر دلیل ہے۔ اس سورت میں ۷ رکوع ۵۲ آیتیں ۸۶۱ کلمات ۳ ہزار ۴۳۴ حروف ہیں۔

مقام نزول

یہ سورت مکی ہے اور مکہ معظمہ میں نازل ہوئی ہے۔ قرآن کریم کی تمام سورتیں مقام نزول کے اعتبار سے دو قسموں پر مشتمل ہیں جنھیں مکی اور مدنی کہا جاتا ہے۔ مکی کا مطلب یہ ہے کہ یہ سورت ہجرت سے پہلی نازل ہوئی ہے۔ قطع نظر اس سے کہ وہ مکہ معظمہ میں نازل ہوئی ہے یا مکہ معظمہ سے باہر اور مدنی کا مطلب یہ ہے کہ یہ سورت ہجرت کے بعد نازل ہوئی ہے قطع نظر اس سے کہ وہ مدینہ منورہ میں نازل ہوئی یا مدینہ سے باہر۔

زمانہ نزول

اس سورت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے نزول کا زمانہ وہ ہے جب دعوت الی اللہ کے راستے میں مشکلات کے پہاڑ کھڑے کردیے گئے تھے۔ اس سورت میں سابقہ امتوں کے حالات سے استشہاد کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ وہ قومیں اپنی قوت وشوکت کے زعم میں اللہ تعالیٰ کے رسولؐ کو دھمکیاں دیتی تھیں کہ اگر تم نے اپنی اس دعوت کے سلسلے کو بند نہ کیا تو ہم تمھیں اپنی سرزمین سے نکال باہر کریں گے اور یا تمھاری جینا اس حد تک مشکل کردیں گے۔ کہ تم اپنا دین چھوڑ کر ہماری جاہلیت میں پناہ لینے پر مجبور ہوجاؤ گے۔ ان باتوں کا تذکرہ یقیناً مشرکین مکہ کو یہ سمجھانے کے لیے کیا جارہا ہے کہ تم بھی ہمارے رسولؐ کو اسی طرح کی دھمکیاں دینے لگے ہو اور اس کی قید اور قتل کے منصوبے باندھنے لگے ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم سابقہ امتوں کی طرح تباہی کے راستے پر چل نکلے ہو۔ سابقہ امتوں کے حالات سے جو نتیجہ نکلتا ہے اسے مشرکین مکہ کے حالات پر چسپاں کرنا بجائے خود ایک ایسی اندرونی شہادت ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورت اس زمانے میں نازل ہوئی ہے جب قریش مکہ کی طرف سے آنحضرت کی ایذارسانی میں انتہائی شدت آچکی تھی اور آپؐ کو قتل کرنے کے منصوبے تیار کیے جارہے تھے۔ یہ زمانہ یقیناً مکی زندگی کے آخری سالوں سے تعلق رکھتا ہے اور اسی زمانے میں اس سورت کا نزول معلوم ہوتا ہے۔

Marfat.com

سورت کے مضامین

باقی مکی سورتوں کی طرح اس کے مضامین بھی اسلام کے بنیادی عقائد ہیں انھی عقائد کی پختگی اور انھیں دل و دماغ میں اتارنا مقصود معلوم ہوتا ہے۔ نیز نبی کریمؐ کی دعوت کو رد کر دینے کی صورت میں جو نتیجہ نکل سکتا تھا اس سے مشرکین کو آگاہ کرنا مطلوب ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ کسی بھی زندہ معاشرے میں دعوت کے مخاطب لوگوں کا رویہ یکساں نہیں رہتا ان میں مختلف نشیب و فراز آتے ہیں۔ اسی طرح دعوت کے مخاطب لوگوں میں انکار و اقرار اور شک و ارتیاب کی سطح بھی ایک جیسی نہیں رہتی قرآن کریم چونکہ کتاب ہدایت ہے وہ محض قانون کی کتاب نہیں نہ احکام کا مجموعہ ہے کہ جسے ایک سپاٹ اور خشک زبان میں ایک دفعہ مرتب کر کے لوگوں کے حوالے کر دیا جائے۔ اس کے کتاب ہدایت کے ہونے کا تقاضہ یہ ہے کہ لوگوں کے بدلتے رویوں کے ساتھ ساتھ اس کتاب کا پیرایۂ بیان بھی بدلتا چلا جائے۔ چنانچہ قرآن کریم میں اسی لیے ہم مختلف اسالیب دیکھتے ہیں اور ایک جیسے موضوعات میں لہجہ بھی مختلف ہوتا نظر آتا ہے۔ کہیں فہمائش کا انداز ہے اور کہیں زجر و توبیخ اور کہیں ترغیب سے کام لیا جا رہا ہے اور کہیں ترہیب سے۔

اس سورت میں ایک اور حیرت انگیز بات جو دکھائی دیتی ہے وہ یہ ہے کہ باوجود اس کے کہ یہ سورت اس زمانے میں نازل ہوئی ہے۔ جب کہ مخالفت انتہا کو چھو رہی تھی۔ اور مخالفین حق کی اس آواز کو مٹا دینے پر تلے ہوئے تھے۔ بایں ہمہ قرآن کریم انھیں تنبیہ کرتا ہوا کہتا ہے کہ تمہیں کچھ اندازہ بھی ہے کہ ہم ہر طرف سے تمھاری طرف بڑھتے ہوئے چلے آ رہے ہیں۔ اس سورت میں اس پیش گوئی کو واشگاف کر دیا گیا ہے۔ اور صاف صاف فرما دیا گیا ہے۔ کہ تمھاری حیثیت اور تمھارے نظریات کا بودا پن بالکل ایسے ہے جیسے گھورے پر اگا ہوا ایک شجرہ خبیثہ جو کہ بیک جنبش اکھاڑ کر پھینکا جا سکتا ہے۔ اور قرآن کریم کی دعوت اور نبی کریمؐ کی ہدایت ایک سدا بہار شجرہ طیبہ کی مانند ہے۔ جس کی جڑیں پاتال میں اتری ہوئی اور جس کی شاخیں فضائے آسمانی میں پھیلی ہوئی ہیں۔ تم بجائے اس کے ٹھنڈے سائے میں آنے کے جلا دینے والی دھوپ کے مسافر بننے پر اصرار کر رہے ہو۔ تمھارے سامنے مسلمانوں کی بے سروسامانی ہے اور اپنی قوت پر تمہیں بڑا بھروسہ ہے۔ اس کے بعد مختلف باطل قوتوں کے اعترافات کو بیان کیا گیا ہے اور ساتھ ساتھ تاریخ کے آئینے کی طرف متوجہ کیا جا رہا ہے۔ تاریخی دلائل کے ضمن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی سے استدلال کیا گیا ہے کیونکہ قریش مکہ کو بطور خاص ان کی ملت پر ہونے اور ان کے وارث ہونے کا بڑا دعویٰ تھا اور سورت کے آخر میں قیامت کا منظر پیش کیا گیا ہے تاکہ اگر مشرکین میں کچھ بھی خیر کا پہلو ہے تو وہ شاید اس سے متاثر ہو سکیں۔

Marfat.com

اٰيَاتُهَا ٥٢	سُوْرَةُ اِبْرٰهِيْمَ مَكِّيَّةٌ	رُكُوْعَاتُهَا ٧

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓرٰ قف كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى
النُّوْرِ ۙ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۙ (١) اللّٰهِ الَّذِيْ
لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ ؕ وَوَيْلٌ لِّلْكٰفِرِيْنَ مِنْ
عَذَابٍ شَدِيْدِ ۙ (٢) الَّذِيْنَ يَسْتَحِبُّوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ
وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ؕ اُولٰٓئِكَ فِىْ
ضَلٰلٍ بَعِيْدٍ (٣) وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ
لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ؕ فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ
وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (٤) وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اَنْ
اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ
اللّٰهِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ (٥) وَاِذْ قَالَ
مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ اَنْجٰىكُمْ مِّنْ
اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ وَيُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ

Marfat.com

وَیَسْتَحْیُوْنَ نِسَآءَكُمْ ؕ وَفِیْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِیْمٌ ﴿۶﴾

رکوع: ا۔ (ا.ل.ر. یہ ایک کتاب ہے جسے ہم نے آپؐ کی طرف نازل کیا تا کہ آپؐ لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لائیں۔ان کے رب کی توفیق سے اس خدا کے راستے پر جو زبردست اور اپنی ذات میں آپ محمود ہے اور آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب کا مالک ہے۔اور کافروں کے لیے ایک عذاب شدید کی تباہی ہے۔جو دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی راہ سے روکتے ہیں اور اس میں کجی پیدا کرنا چاہتے ہیں یہ لوگ بہت دور کی گمراہی میں ہیں۔ہم نے جو رسول بھی بھیجا اس کی قوم کی زبان میں بھیجا۔تا کہ وہ ان پر اچھی طرح واضح کر دے پس اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور وہی سب پر غالب ہے اور حکیم ہے۔اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنی نشانیوں کے ساتھ بھیجا (اور انھیں حکم دیا) کہ اپنی قوم کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف نکالو اور ان کو خدا کے یادگار ایام یاد دلاؤ۔بیشک ان کے اندر ثابت قدم رہنے والوں اور شکر کرنے والوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔اور یاد کرو جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا۔کہ اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کے اس احسان کو یاد رکھو کہ اس نے تمھیں آل فرعون سے نجات دی جو تمھیں نہایت برا عذاب چکھاتے تھے اور تمھارے بیٹوں کو ذبح کرتے تھے اور تمھاری عورتوں کو زندہ رکھتے تھے اور بیشک اس میں تمھارے رب کی جانب سے بہت بڑی آزمائش تھی۔)

الٓرٰ ۫ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَیْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ۬ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِیْزِ الْحَمِیْدِ ۙ﴿۱﴾ اللّٰهِ الَّذِیْ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَوَیْلٌ لِّلْكٰفِرِیْنَ مِنْ عَذَابٍ شَدِیْدِ ۙ﴿۲﴾ (سورۃ ابراہیم:۱۔۲)

(ا.ل.ر یہ ایک کتاب ہے جسے ہم نے آپؐ کی طرف نازل کیا تا کہ آپؐ لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لائیں۔ان کے رب کی توفیق سے اس خدا کے راستے پر جو زبردست اور اپنی ذات میں آپ محمود ہے اور آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب کا مالک ہے۔اور کافروں کے لیے ایک عذاب شدید کی تباہی ہے۔)

اس سورت کا آغاز (ا. ل. ر) سے کیا گیا جو حروف مقطعات میں سے ہے اور حروف مقطعات کی بحث ہم سورۃ البقرہ میں کر چکے ہیں۔استفادہ کے لیے اسے ایک نظر دیکھ لیا جائے۔

نہایت جامع الفاظ میں اس سورت کا تعارف کرایا گیا ہے۔تعارف میں سب سے پہلے اس سورت کو کتاب قرار دیا گیا ہے۔مراد یہ ہے کہ یہ اس عظیم کتاب یعنی قرآن کریم کا ایک حصہ ہے جسے لوح محفوظ میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا گیا ہے۔لوح محفوظ میں چونکہ اسے مستقل طور پر لکھ دیا گیا ہے اس لیے اسے کتاب سے یاد کیا جاتا ہے اور اسی نسبت سے اس کے مٹ جانے کے تمام واہمے ختم ہو گئے ہیں۔ممکن ہے اس کا تعلق پیش گوئی سے ہو کہ یہ ایک ایسی کتاب ہے جسے ایسے زمانے میں نازل کیا گیا ہے جو زمانہ نوشت وخواند اور لائبریوں کا زمانہ ہوگا جس میں پریس وجود میں آجائے گا جس میں کسی بھی یادداشت اور تحریر کو محفوظ رکھنے کے لیے بیسیوں اسباب پیدا ہو جائیں گے۔

تعارف میں دوسری بات یہ فرمائی گئی ہے کہ یہ بات کبھی نہیں بھولنی چاہیے کہ اسے ہم نے نازل کیا ہے۔اور قرآن کریم میں بعض دیگر مواقع پر یہ تصریح کر دی گئی ہے۔کہ یہ کتاب آخری کتاب ہے اور ہم نے اسے قیامت تک کی نوع انسانی کے لیے نازل کیا ہے۔اور اسی کے ساتھ وابستگی قوموں کے لیے عروج کا باعث ہوگی اور اس سے تعلق توڑ لینا تباہی اور بربادی کا باعث ہوگا۔

تعارف میں مزید یہ فرمایا گیا ہے کہ انسان کو زندگی کے سفر کے لیے ہمہ جہت اور ہمہ نوع روشنی کی ضرورت ہے اس کا فکری ارتقاء تحقیق وتجسس کی روشنی کا طالب ہے۔اس کے جذبات کی آسودگی ایک ایسی روشنی کی ضرورت محسوس کرتی ہے جس میں فطرت اور طبیعت الجھن اور اڑچن محسوس نہ کرے لیکن یہ انسان کی بدقسمتی ہے کہ وہ روشنی کی تلاش میں ہمیشہ اندھیروں میں ٹھوکریں کھاتا ہے اور اگر کہیں روشنی دکھائی دیتی بھی ہے تو اس کی حیثیت صحیح

Marfat.com

کاذب سے زیادہ نہیں ہوتی اس لیے انسان کو اطمینان دلانے کے لیے یہاں فرمایا گیا ہے کہ یہ کتاب درحقیقت ایک مینارۂ نور ہے جس سے ہمہ وقت روشنی کی کرنیں پھوٹتی ہیں اور انسانی راستوں کو روشن کرتی ہیں۔ آج جبکہ انسانی قافلہ تاریک راہوں میں ٹھوکریں کھا رہا ہے اللہ تعالیٰ کا نہایت کرم ہے کہ اس نے اس منبع نور کو نازل کیا ہے تاکہ آپ اس روشنی کی مدد سے لوگوں کو تاریکیوں سے نکالیں۔

اس آیت میں قابل غور بات یہ ہے کہ اس میں تاریکی کے لیے ظلمات یعنی جمع کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اور روشنی کے لیے نور کا لفظ جو واحد ہے۔ قرآن پاک کا استقصاء کر جائیے۔ آپ کو کہیں بھی نور کی جمع نہیں ملے گی حالانکہ عربی زبان میں نور کی جمع انوار شائع وذائع ہے لیکن ظلمات کو ہر جگہ جمع ہی استعمال کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فکری اور عملی گمراہیاں اور بے بصیرتی اور نارسائیوں کی تاریکیاں رنگارنگ اور بے شمار ہیں لیکن ہدایت کا راستہ ایک ہی ہے جس کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے نیکی اور بھلائی کا علم جو حضرت آدم علیہ السلام کو دیا گیا تھا ہر دور میں اسی کا نزول ہوتا رہا اور اب قرآن کریم کی شکل میں وہی نور اور روشنی اور وہی علم حق اس امت کو دیا جا رہا ہے۔ تاکہ زندگی کے کسی دائرے میں اس امت کو تاریکی کا احساس نہ ہو۔

آیت میں مذکور نور کے فہم کی تسہیل کے لیے ارشاد فرمایا کہ یہ نور انسانوں کے لیے کوئی اجنبی چیز نہیں بلکہ یہ وہی خدائے بزرگ و برتر کا راستہ ہے جسے صراط مستقیم بھی کہا گیا ہے۔ اور جسے پروردگار عالم نے اپنے رسولوںؑ کے واسطے سے ہمیشہ نوع انسانی کی ہدایت کے لیے واشگاف فرمایا اور حقیقت یہ ہے کہ اسی کا یہ حق ہے کہ وہ انسانوں پر یہ بات واضح کرے کہ تمھارے لیے حق کیا ہے اور باطل کیا ہے اور صحیح کیا ہے اور غلط کیا ہے کیونکہ زمین و آسمان میں جو کچھ ہے وہ سب اس کی ملکیت ہے مالک کو بجا طور پر اپنے مملوک کے لیے زندگی کی رہنمائی مہیا کرنا اس کی حدود و قیود مقرر کرنا اور اس کے مقاصد اور منہج کو کھول کر بیان کر دینے کا حق حاصل ہے۔

یہ بات واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی زندگی میں آسانی کے لیے روشنی مہیا فرمائی ہے اور وقتاً فوقتاً اپنے رسولؑ بھیج کر اس نے ترغیب کا سامان بھی کیا ہے اور تفہیم و تشریح کی ضرورت بھی پوری فرمائی ہے۔ لیکن اس سے استفادہ اور اس کی قبولیت کے لیے کسی پر جبر نہیں فرمایا ہر انسان کو آزاد چھوڑ دیا گیا ہے۔ کہ وہ چاہے تو اسے قبول کرے اور اپنی منزل مراد کو پالے اور چاہے اسے رد کر کے خسران کا راستہ اختیار کر لے۔ اور مزید یہ کہ اس راستے میں محض چاہت بھی کام نہیں دیتی نصیب اس کا کھلتا ہے اور ہدایت اس کو ملتی ہے جو چاہت کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ سے اس کے لیے توفیق مانگتا ہے اور ہر مشکل وقت میں اللہ تعالیٰ ہی کی طرف رجوع کرتا ہے لیکن جو لوگ اس کی طرف سے لاپروائی، غفلت یا اعراض کا رویہ اختیار کرتے ہیں ان کے لیے قدرت نے عذاب شدید کی تباہی اور خرابی رکھی ہے۔

الَّذِیْنَ یَسْتَحِبُّوْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا عَلَی الْاٰخِرَةِ وَیَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَیَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ؕ اُولٰٓئِكَ فِیْ ضَلٰلٍۭ بَعِیْدٍ ۝ (سورۃ ابراہیم: ۳)

(جو دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی راہ سے روکتے ہیں اور اس میں کجی پیدا کرنا چاہتے ہیں یہ لوگ بہت دور کی گمراہی میں ہیں۔)

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی بنیادی گمراہیوں اور خرابیوں کا ذکر فرمایا ہے جو آنکھیں رکھنے اور عقل اور شعور سے بہرہ ور ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ روشنی میں سفر کرنا پسند نہیں کرتے انھیں تاریکی کے دھکے اور اندھیروں کی کھائیاں گوارا ہیں۔ یہ چند بنیادی خرابیاں جب ان کے اندر پیدا ہو جاتی ہیں تو پھر انھیں میعادی بخار میں مبتلا شخص کی طرح شہد بھی کڑوا لگتا ہے ان کی سب سے پہلی خرابی یہ ہے کہ وہ حیات دنیا کو حیات آخرت پر ترجیح دیتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ یہ دنیا چند روزہ ہے فانی ہے اس کی ہر نعمت بے ثبات ہے اس کا ہر وعدہ فریب ہے اور آخرت ایک ہمیشہ کی زندگی ہے جسے کبھی ختم ہونا نہیں وہیں کی کامیابیاں اصل کامیابیاں ہیں اور وہیں کی ناکامیاں ہی اصل ناکامیاں ہیں۔ لیکن وہ نقد پر ادھار کو ترجیح دینے کے لیے تیار نہیں وہ نفع اجل کے لیے نفع عاجل کو حماقت سمجھتے ہیں انھیں اس بات کا یقین نہیں آتا کہ قیامت آئے گی انسان زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے آخرت کے نام سے ایک نئی دنیا بسے گی پہلی زندگی کا حساب کتاب ہوگا اور اسی حساب کے نتیجے میں جزا یا سزا کا فیصلہ ہوگا۔ وہ اسی موجودہ زندگی کو سب کچھ سمجھتے ہیں اس کی خوشیوں کا حصول ان کی زندگی کا مقصد ہے اور اس میں اس حد تک اندھے ہو گئے ہیں کہ نہ صرف کہ خود آخرت کے لیے کچھ کرنا نہیں

Marfat.com

چاہتے بلکہ دوسرے لوگوں کو بھی اللہ تعالیٰ کے راستے پر چلنے سے روکتے ہیں اور اگر کچھ لوگ اللہ تعالیٰ کے راستے کی طرف آنا چاہتے ہیں تو ان کے لیے نہ صرف فکری الجھنیں پیدا کرتے ہیں بلکہ فکری الجھنوں کے ساتھ ساتھ عملی کجرویاں بھی پیدا کرتے ہیں۔ نئے نئے ناموں سے نئی نئی گمراہیاں اختراع کرتے ہیں سفلی جذبات کو ابھارنے کے لیے تفریح کے نام سے نفس کے لیے نئے نئے پھندے تیار کرتے ہیں پروپیگنڈے کے زور سے انسان کی ہوس کو بے ہنگم بناتے ہیں لطف ولذت کے دلچسپ ذرائع سے انسانیت کی منزل کھوٹی کرتے ہیں اور اس راستے میں وہ غبار اڑاتے ہیں کہ انسان خواہشات نفس کو اپنا رہنما بنالیتا ہے۔ یہ صورتحال ایسے لوگوں کو ہدایت کے راستے سے اتنا دور لے جاتی ہے کہ وہاں سے واپس پلٹنا مشکل ہو جاتا ہے اسی کے لیے اس آیت میں ظلالم بعید کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوۡمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمۡ ؕ فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنۡ يَّشَآءُ وَيَهۡدِىۡ مَنۡ يَّشَآءُ ؕ وَهُوَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ ۝ (سورۃ ابراھیم : ۴)

(ہم نے جو رسول بھی بھیجا اس کی قوم کی زبان میں بھیجا تا کہ وہ ان پر اچھی طرح واضح کردے پس اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور وہی سب پر غالب ہے اور حکیم۔)

اللہ تعالیٰ کا احسان

ہم اس سے پہلے پڑھ چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ دنیا میں اپنے پیغمبر اس لیے بھیجتے ہیں تا کہ وہ لوگوں کو تاریکیوں سے روشنی میں لائیں اور گمراہیوں سے ہدایت کے راستے پر نکالیں اس کے لیے ایک طریقہ تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت سے کام لے کر ان کے دل ودماغ میں غیر معمولی طریقے سے پیغمبر کی دعوت کو اتار دیں۔ لیکن یہ طریقہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کے خلاف ہے اس نے سراسر تبلیغ ودعوت اور تعلیم وتلقین پر اس کی کامیابی کا انحصار رکھا ہے۔ ایسی صورت حال میں یہ بات ازبس ضروری تھی کہ پیغمبر اپنی دعوت کو اس زبان میں پیش کرتا جو زبان اس کی قوم سمجھ سکتی تا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے دین کی ایک ایک حقیقت کو ان پر واشگاف کر سکے اور کتاب اللہ تعالیٰ کی تعلیم کا ایک ایک گوشہ ان پر کھول سکے چنانچہ اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے اس احسان کا ذکر فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ ہم نے دنیا میں جب بھی کوئی رسول بھیجا ہے تو وہ اپنی قوم کی زبان بولتا ہوا آیا ہے تا کہ اس کی بات کو سمجھنے اور حقائق کا ادراک کرنے میں انھیں کوئی دشواری نہ ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی دوسری زبان میں کسی علم وفن کو سیکھ لینا مشکل تو ہے لیکن بہت دشوار نھیں لیکن جہاں تک انسانوں کی ہدایت اور ان کے مزاج کو بدلنا اور ان کی عادات واطوار کو نئے سانچے میں ڈھالنا احساسات سے کہنگی اور درشتی نکال کر تازگی اور ہمدردی وخیر خواہی کی جوت جگا دینا یقیناً ایک مشکل ترین کام ہے دوسری زبان کا فاصلہ طے ہوتے ہوتے بعض دفعہ انسان بیزار ہو جاتا ہے اس لیے یہ اللہ تعالیٰ کریم کا بے حد احسان ہے کہ اس نے اپنے رسولؐ ہمیشہ اس کی قوم کی زبان بولنے والے مزاج آشنا معروفات کو سمجھنے والے اور قوم کی تاریخ کے پس منظر اور پیش منظر جاننے والے بھیجے۔

ہدایت وضلالت کے باب میں سنت الٰہی

ایک طرف پیغمبر کی دل آویز شخصیت اس کا دل موہ لینے والا انداز گفتگو مزید اس کا بے عیب کردار پھر خاندانی عظمت ووجاہت اور پھر اس پر نازل ہونے والی پر ہیبت کتاب اور سب سے بڑھ کر اپنے مخاطبوں کے لیے اس کی ہمدردی وجاں فشانی کے باوجود اگر کوئی شخص یا کوئی قوم پیغمبر کی دعوت پر غور کرنے کے لیے تیار نھیں ہوتی بلکہ مخالفت میں بڑھتی چلی جاتی ہے تو ایسے لوگوں کے بارے میں پروردگار ارشاد فرماتے ہیں کہ اے پیغمبر آپ کو ان کے ایمان نہ لانے سے ہرگز پریشان نھیں ہونا چاہیے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ وہ ایمان کی دولت ایمان سے بے اعتنا لوگوں کو عطا نھیں کرتا۔ آپ کی

Marfat.com

کاوشوں میں کوئی کمی نہیں لیکن جولوگ اپنی لاپرواہی اور بے نیازی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے دین کی طرف آنا پسند نہیں کرتے اللہ تعالیٰ بھی ان کی قبولیت کی استعداد کو سلب کر لیتا ہے اس کے قانون میں صرف ان لوگوں کے لیے گنجائش ہے جو اللہ تعالیٰ سے مانگتے اور عاجزی کا اظہار کرتے ہیں۔ فیصلے اس کی مشیت اور حکمت سے ہوتے ہیں اور جب وہ فیصلہ کر لیتا ہے تو اسے کوئی روک نہیں سکتا نہ کوئی اسے ٹال سکتا ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۵ وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰمِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ۝ (سورۃ ابراھیم : ۵)

(اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنی نشانیوں کے ساتھ بھیجا (اور انھیں حکم دیا) کہ اپنی قوم کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف نکالو اور ان کو خدا کے یادگار ایام یاد دلاؤ۔ بیشک ان کے اندر ثابت قدم رہنے والوں اور شکر کرنے والوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔)

حضرت موسیٰؑ کی سرگزشت سے استدلال

اس آیت کریمہ میں پروردگار نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سرگزشت کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ انھیں بھی ہم نے اس مقصد کے لیے بنی اسرائیل میں بھیجا تھا کہ وہ انھیں تاریکیوں سے نور کی طرف نکالیں یعنی انھیں گمراہیوں سے ہدایت کی طرف لائیں اور زندگی کے معاملات میں وہ جن غلطیوں کا شکار ہو چکے ہیں اس کی اصلاح کریں اور اپنی جہالت سے وہ جس طرح اپنا تعلق اپنے اللہ تعالیٰ سے کمزور کر چکے ہیں اسے اسرِ نو توانا کریں۔ اور اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے یادگار ایام سے انھیں یاددہانی کرائیں۔ ایام اللہ ان دنوں کو کہتے ہیں جن دنوں میں عبرت و نصیحت کا کوئی بڑا واقعہ پیش آیا ہو۔ اللہ تعالیٰ کو ماننے والوں پر اس کی طرف سے کوئی غیر معمولی اعلان ہوا ہو یا اس کا انکار کرنے والی کوئی قوم عذاب کا شکار ہوئی ہو۔ ایسے واقعات کے سیاق و سباق اور اسباب کے ذکر سے قوم کو نصیحت کرنے اور عبرت دلانے میں ہمیشہ مدد ملتی ہے۔ اگر بصیرت گل نہ ہو چکی ہو اور قبولیت سلب نہ ہو چکی ہو تو انسان ہمیشہ انسانی زندگی کے واقعات سے سبق سیکھتا ہے وہ کتابی حقائق سے بھی استفادہ کرتا ہے لیکن اس سے بڑھ کر انسانی واقعات انسانوں کے دکھ اور انسانوں کی خوشیاں اس پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ تشنہ نے ٹھیک کہا تھا ؎

کتابوں کا لکھا تو عمر بھر پڑھتے رہے تشنہ
کبھی وہ بھی پڑھا ہوتا جو دیواروں پہ لکھا ہے

مزید فرمایا کہ موسیٰؑ اور اس کی قوم کی سرگزشت تم دیکھو گے کہ تمھیں اس سرگزشت میں دو کردار آگے بڑھتے ہوئے دکھائی دیں گے۔ ایک وہ جنھوں نے مخالف حالات میں صبر کے دامن کو تھامے رکھا۔ مشکلیں آئیں لیکن ان کے ثبات قدم میں لغزش نہ آئی۔ بڑی سے بڑی آزمائش پیش آئی لیکن انھیں جادۂ مستقیم سے نہ ہٹا سکی اور دوسرے وہ لوگ جنھیں اللہ تعالیٰ نے نعمتیں عطا فرمائیں اور انھوں نے نعمتیں پا کر بجائے بگڑنے کے شکر کا راستہ اختیار کیا وہ جیسے جیسے انعامات سے گراں بار ہوتے گئے ویسے ویسے ان کی مقصد سے لگن بڑھتی گئی اور ان کے اندر بجائے سرکشی آنے کے عاجزی اور فروتنی میں اضافہ ہوتا گیا تم اگر ان کی سرگزشت سے اے مکے والو کچھ سیکھنا چاہتے ہو تو حق کے سامنے سرکشی اختیار کرنے کی بجائے عاجزی اختیار کرو اور مسلمانوں سے کہا جا رہا ہے کہ تم ان قریش کی اذیتوں سے ہراساں ہونے کی بجائے صبر کا دامن اور مضبوطی سے تھام لو۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ اَنْجٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْۗءَ الْعَذَابِ وَيُذَبِّحُوْنَ اَبْنَاۗءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَاۗءَكُمْ ۭ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَاۗءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ۝ (سورۃ ابراھیم : ۶)

(اور یاد کرو جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا کہ اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کے اس احسان کو یاد رکھو کہ اس نے تمھیں آلِ فرعون سے نجات دی جو تمھیں نہایت برا عذاب چکھاتے تھے اور تمھارے بیٹوں کو ذبح کرتے تھے اور تمھاری عورتوں کو زندہ رکھتے تھے اور بیشک اس میں تمھارے رب کی جانب سے بہت بڑی آزمائش تھی۔)

Marfat.com

گزشتہ آیتِ کریمہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ ایک مومن کا اصل سرمایہ صبر اور شکر ہے۔ یہی دو ایسی بنیادی صفات ہیں جس سے باقی صفات جنم لیتی ہیں اور انھیں دونوں صفات کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نصرت و تائید نازل ہوتی ہے۔ چنانچہ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں انھیں صفات کے برگ و بار لانے کے حوالے سے تاریخی مثال کے طور پر بنی اسرائیل کی تاریخ کا ایک ورق الٹا گیا ہے، جس سے بتانا یہ مقصود ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جو اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر نبی ہیں کہ جن کی تشریف آوری اللہ تعالیٰ کی نعمت کا بہت بڑا اظہار ہے وہ جن دنوں پیدا ہوئے وہ بنی اسرائیل کیلیے نہایت آزمائش اور تکلیف کے دن تھے۔ لیکن انھوں نے اسے صبر سے گزارا اور اللہ تعالیٰ سے برابر تعلق قائم رکھا۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ اسی صبر کے نتیجے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کا غیر معمولی طریقے سے تحفظ ہوا، دشمن کے گھر آپؑ کی پرورش کا سامان کیا گیا اور پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ سے بنی اسرائیل کو نشاۃ ثانیہ ملی۔ اور یہ غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ایک گروہ، ایک بہت بڑی قوم کی صورت اختیار کر پایا۔ پھر ایک وقت آیا کہ ان کے اندر شکر کے جذبات پیدا ہونے کی بجائے ناشکری کی کیفیت پیدا ہونے لگی۔ چنانچہ اگلی آیات میں صبر کے ساتھ ساتھ شکر کی طرف توجہ دلائی جارہی ہے۔ ارشاد فرمایا:

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَىِٕنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَىِٕنْ كَفَرْتُمْ
اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ ۞7 وَقَالَ مُوْسٰٓى اِنْ تَكْفُرُوْٓا اَنْتُمْ وَمَنْ
فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ حَمِيْدٌ ۞8 اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُا
الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ ۛ وَالَّذِيْنَ مِنْ
بَعْدِهِمْ ۛ لَا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا اللّٰهُ ۭ جَاۗءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ
فَرَدُّوْٓا اَيْدِيَهُمْ فِيْٓ اَفْوَاهِهِمْ وَقَالُوْٓا اِنَّا كَفَرْنَا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ
بِهٖ وَاِنَّا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ۞9 قَالَتْ رُسُلُهُمْ
اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ يَدْعُوْكُمْ لِيَغْفِرَ لَكُمْ
مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُؤَخِّرَكُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ قَالُوْٓا اِنْ اَنْتُمْ
اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۭ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَصُدُّوْنَا عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ
اٰبَاۗؤُنَا فَاْتُوْنَا بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۞10 قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ

Marfat.com

نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ
عِبَادِهٖ ؕ وَمَا كَانَ لَنَآ اَنْ نَّاْتِيَكُمْ بِسُلْطٰنٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ
وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۱﴾ وَمَا لَنَآ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى
اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنَا سُبُلَنَا ؕ وَلَنَصْبِرَنَّ عَلٰى مَآ اٰذَيْتُمُوْنَا ؕ وَ
عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ﴿۱۲﴾ ع

رکوع: ۲۔ (اور یاد کرو جب تمھارے رب نے آگاہ کر دیا تھا کہ اگر تم شکر گزار رہے تو میں تمھیں مزید دوں گا اور اگر تم نے ناشکری کی تو میرا عذاب بھی بڑا سخت ہوگا۔ اور موسیٰؑ نے کہا کہ اگر تم اور وہ سارے لوگ جو روئے زمین پر ہیں ناشکری کرو گے تو خدا کا کچھ نہ بگاڑو گے۔ وہ بے نیاز اور ستودہ صفات ہے۔ کیا تمھیں ان لوگوں کی اطلاع نہیں پہنچی جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں۔ یعنی قوم نوح اور عاد اور ثمود اور وہ لوگ جو ان کے بعد گزرے، خدا کے سوا جنھیں کوئی نہیں جانتا۔ ان کے رسولؑ ان کے پاس روشن دلیلیں لے کر آئے۔ پس انھوں نے (از راہ تمسخر) اپنے ہاتھ اپنے منہ پر رکھ لیے۔ اور بولے کہ جس پیغام کے ساتھ تم بھیجے گئے ہو ہم اس کا انکار کرتے ہیں اور جس چیز کی تم ہمیں دعوت دیتے ہو ہم اس کے بارے میں سخت الجھن میں ڈال دینے والے شک میں ہیں۔ ان کے رسولوں نے کہا کیا تمھیں آسمانوں اور زمین کے وجود میں لانے والے اللہ تعالیٰ کے بارے میں شک ہے۔ وہ بلاتا ہے تاکہ تمھارے گناہوں کو بخش دے اور تمھیں ایک وقتِ معین تک مہلت دے دے۔ وہ کہنے لگے کہ تم تو ہمارے ہی جیسے آدمی ہو، تم چاہتے ہو کہ تم ہمیں روک دو۔ ان کی عبادت سے جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کیا کرتے تھے۔ پس تم ہمارے پاس کوئی کھلا ہوا معجزہ لاؤ۔ ان کے رسولوںؑ نے کہا کہ ہم ہیں تو تمھارے ہی جیسے آدمی، لیکن اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جن پر چاہتا ہے اپنا فضل فرماتا ہے۔ ہماری یہ طاقت نہیں کہ ہم تمھارے پاس کوئی معجزہ لے آئیں، مگر اللہ تعالیٰ کے حکم سے، اور ایمان لانے والوں کو اللہ تعالیٰ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہیے۔ اور ہم کیوں نہ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھیں جبکہ اس نے ہمیں ہمارے راستوں کی ہدایت بخشی ہے اور ہم اس پر یقیناً صبر کریں گے، تم جو بھی ایذا ہمیں پہنچاؤ گے۔ اور بھروسہ کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔)

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ ﴿۷﴾ وَقَالَ مُوْسٰٓى اِنْ تَكْفُرُوْٓا اَنْتُمْ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴿۸﴾ (سورۃ ابراھیم: ۷۔ ۸)

(اور یاد کرو جب تمھارے رب نے آگاہ کر دیا تھا کہ اگر تم شکر گزار رہے تو میں تمھیں مزید دوں گا اور اگر تم نے ناشکری کی تو میرا عذاب بھی بڑا سخت ہوگا۔ اور موسیٰ نے کہا کہ اگر تم اور وہ سارے لوگ جو روئے زمین پر ہیں ناشکری کرو گے تو خدا کا کچھ نہ بگاڑو گے۔ وہ بے نیاز اور ستودہ صفات ہے۔)

ان آیات کی تشریح میں صاحب تفہیم القرآن نے جو نوٹ لکھا ہے اسے یہاں ہم افادہ کے لیے نقل کر رہے ہیں۔
اس مضمون کی تقریر بائیبل کی کتاب استثناء میں بڑی شرح وبسط کے ساتھ نقل کی گئی ہے۔ اس تقریر میں حضرت موسیٰؑ اپنی وفات۔

Marfat.com

چندروز پہلے بنی اسرائیل کوان کی تاریخ کے سارے اہم واقعات یاددلاتے ہیں۔ پھر تورات کے ان تمام احکام کودہراتے ہیں جواللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعہ سے بنی اسرائیل کو بھیجے تھے۔ پھرایک طویل خطبہ دیتے ہیں جس میں بتاتے ہیں کہ اگرانھوں نے اپنے رب کی فرمانبرداری کی تو کیسے کیسے انعامات سے نوازے جائیں گے اوراگرنافرمانی کی روش اختیارکی تواس کی کیسی سخت سزادی جائے گی۔ یہ خطبہ کتاب استثناء کے ابواب نمبر ۴۔۶۔۸۔۱۰۔۱۱اور ۲۸تا۳۰ میں پھیلا ہواہے اوراس کے بعض بعض مقامات کمال درجہ موٴثر وعبرت انگیز ہیں۔ مثال کے طور پراس کے چند فقرے ہم یہاں نقل کرتے ہیں جن سے پورے خطبے کااندازہ ہوسکتاہے:

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تقریر

''سن اے اسرائیل! خداوند ہماراخداایک ہی خداوند ہے۔ تواپنے سارے دل اوراپنی ساری جان اوراپنی ساری طاقت سے خداوندا پنے خداکے ساتھ محبت رکھ۔ اور یہ باتیں جن کاحکم آج میں تجھے دیتاہوں تیرے دل پرنقش رہیں۔ اورتوان کواپنی اولاد کے ذہن نشین کرنااورگھربیٹھےاورراہ چلتے اور لیٹتے اوراٹھتے ان کاذکرکرنا''۔ (باب ۶۔آیات ۴۔۷)

''پس اے اسرائیل! خداوند تیراخداتجھ سے اس کے سوااورکیاچاہتاہے کہ توخداونداپنے خداکاخوف مانے اوراس کی سب راہوں پرچلے اوراس سے محبت رکھے اوراپنے سارے دل اورساری جان سے خداونداپنے خداکی بندگی کرے اورخداوند کے جو احکام اورآئین میں تجھ کوآج بتاتاہوں ان پرعمل کرے تاکہ تیری خیرہو۔ دیکھ آسمان اورزمین اورجوکچھ زمین میں ہے یہ سب خداوند تیرے خداہی کاہے''۔ (باب ۱۰۔آیات ۱۲۔۱۴)

''اوراگرتوخداونداپنے خداکی بات کوجان فشانی سے مان کراس کے ان سب حکموں پرجوآج کے دن میں تجھے دیتاہوں احتیاط سے عمل کرے توخداوند تیراخدادنیاکی سب قوموں سے زیادہ تجھ کوسرفرازکرے گا۔ اوراگرتوخداونداپنے خداکی بات سنے تو یہ سب برکتیں تجھ پرنازل ہوں گی اورتجھ کوملیں گی۔ شہرمیں بھی تومبارک ہوگااورکھیت میں بھی مبارک .... خداوند تیرے دشمنوں کوجوتجھ پرحملہ کریں تیرے روبروشکست دلائے گا......... خداوند تیرے انبارخانوں میں اورسب کاموں میں جن میں تو ہاتھ ڈالے برکت کاحکم دے گا......... تجھ کواپنی پاک قوم بناکررکھے گااوردنیاکی سب قومیں یہ دیکھ کرکہ توخداکے نام سے کہلاتا ہے تجھ سے ڈرجائیں گی۔ توبہت سی قوموں کوقرض دے گاپرخودقرض نہیں لے گااورخداوند تجھ کودم نہیں بلکہ سرٹھہرائے گااورتو پشت نہیں بلکہ سرفرازہی رہے گا''۔ (باب ۲۸۔آیات ۱۔۱۳)

''لیکن اگرتوایسانہ کرے کہ خداونداپنے خداکی بات سن کراس کے سب احکام اورآئین پرجوآج کے دن میں تجھ کودیتاہوں احتیاط سے عمل کرے تویہ سب لعنتیں تجھ پرہوں گی اورتجھ کولگیں گی۔ شہرمیں بھی تولعنتی ہوگااورکھیت میں بھی لعنتی .... خداوند ان سب کاموں میں جن کوتوہاتھ لگائے لعنت اورپھٹکاراوراضطراب کوتجھ پرنازل کرے گا......... وباتجھ سے لپٹی رہے گی......... آسمان جوتیرے سرپرہے پیتل کااورزمین جوتیرے نیچے ہے لوہے کی ہوجائے گی......... خداوند تجھ کوتیرے دشمنوں کے آگے شکست دلائے گا۔ توان کے مقابلہ کے لیے توایک ہی راستہ سے جائے گامگران کے سامنے سات سات راستوں سے بھاگے گا......... عورت سے منگنی توتوکرے گالیکن دوسرااس سے مباشرت کرے گا۔ توگھربنائے گالیکن اس میں بسنے نہ پائے گا۔ توتاکستان لگائے گاپراس کاپھل نہ کھاسکے گا۔ تیرابیل تیری آنکھوں کے سامنے ذبح کیاجائے گا......... بھوکا اورپیاسااورننگااورسب چیزوں کامحتاج ہوکرتواپنے ان دشمنوں کی خدمت کرے گاجن کوخداوند تیرے برخلاف بھیجے گااوروہ تیری گردن پرلوہے کاجوارکھے گاجب تک وہ تیراناس نہ کردے......... خداوند تجھ کوزمین کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک تمام قوموں میں پراگندہ کردے گا''۔ (باب ۲۸۔آیات ۱۵۔۶۴)

Marfat.com

اَلَمۡ يَاۡتِكُمۡ نَبَؤُا الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ قَوۡمِ نُوۡحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوۡدَ ۛؕ وَالَّذِيۡنَ مِنۡۢ بَعۡدِهِمۡ ۛؕ لَا يَعۡلَمُهُمۡ اِلَّا اللّٰهُ ؕ جَآءَتۡهُمۡ رُسُلُهُمۡ بِالۡبَيِّنٰتِ فَرَدُّوۡۤا اَيۡدِيَهُمۡ فِىۡۤ اَفۡوَاهِهِمۡ وَقَالُوۡۤا اِنَّا كَفَرۡنَا بِمَاۤ اُرۡسِلۡتُمۡ بِهٖ وَاِنَّا لَفِىۡ شَكٍّ مِّمَّا تَدۡعُوۡنَنَاۤ اِلَيۡهِ مُرِيۡبٍ ۞ (سورۃ ابراھیم : ۹)

(کیا تمہیں ان لوگوں کی اطلاع نہیں پہنچی جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں۔ یعنی قوم نوح اور عاد اور ثمود اور وہ لوگ جو ان کے بعد گزرے، خدا کے سوا جنھیں کوئی نہیں جانتا۔ ان کے رسول ان کے پاس روشن دلیلیں لے کر آئے۔ پس انھوں نے (از راہ تمسخر) اپنے ہاتھ اپنے منہ پر رکھ لیے۔ اور بولے کہ جس پیغام کے ساتھ تم بھیجے گئے ہو ہم اس کا انکار کرتے ہیں اور جس چیز کی تم ہمیں دعوت دیتے ہو ہم اس کے بارے میں سخت الجھن میں ڈال دینے والے شک میں ہیں۔)

قوم نوح اور عاد کے بعد کی بعض قوموں کا حوالہ

ان آیات میں خطاب اگرچہ عام انسانوں سے ہے لیکن روئے سخن مسلمانوں کی طرف معلوم ہوتا ہے۔ کفار کی طرف سے بڑھتی ہوئی اذیتوں کے باعث مسلمانوں کو تسلی دی جا رہی ہے اور ان سے یہ کہا جا رہا ہے کہ کفار کا رویہ ہزار قابلِ ملامت سہی لیکن تمہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ تم دنیا میں سب سے نازک کام یعنی حق کی نمائندگی کیلیے اٹھے ہو اور یہ ایک ایسا فریضہ ہے جس کی ادائیگی کیلیے ہر دور میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے رسولؑ آتے رہے ہیں۔ اور یہ عجیب بات ہے کہ ہر دور کی امتوں نے اپنی طرف بھیجے جانے والے رسولوں سے وہی سلوک کیا ہے جو مشرکین مکہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ کر رہے تھے۔ اس لیے مسلمانوں کو ایک تو اس بات سے مطمئن رہنا چاہیے کہ تم اس راستے میں ستائے جانے والے پہلے لوگ نہیں ہو کیونکہ:

زمانہ یونہی اپنے محسنوں کو تنگ کرتا ہے
وہ درسِ صلح دیتے ہیں یہ ان سے جنگ کرتا ہے

اور دوسری یہ بات کہ جن لوگوں کی تاریخ تم تک پہنچی ہے جس کا آغاز حضرت نوح علیہ السلام کی تاریخ سے ہوتا ہے اور جن میں مشہور قومیں عاد اور ثمود گزری ہیں۔ تم آج بھی ان کے کھنڈرات سے گزرتے ہو اور ان پر جس طرح اللہ تعالیٰ کا عذاب ٹوٹا اس کی تفصیلات سینہ بہ سینہ تم تک پہنچ چکی ہیں۔ کیا یہ تاریخ کی آگہی یہ اطمینان دینے کیلیے کافی نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے نبیؑ اور ان پر ایمان لانے والے ستائے ضرور جاتے ہیں لیکن بالآخر اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور نجات انھیں کا نصیب ہوتا ہے۔ اور جو قومیں ان کو ماننے سے انکار کرتی اور انھیں اذیتیں پہنچاتی ہیں انھیں بالآخر اللہ تعالیٰ کے عذاب کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ اور ساتھ ہی اس بات کی طرف اشارہ فرمایا کہ یہ چند قومیں ہیں جن کا تذکرہ تم نے قرآنِ کریم میں پڑھا لیکن یہ مت سمجھو کہ اللہ تعالیٰ کے رسولؑ صرف انھیں قوموں کی طرف آئے اور یہی قومیں انکار کی پاداش میں پکڑی گئیں بلکہ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اور بھی نجانے کتنی قومیں گزری ہیں جن کی طرف اللہ تعالیٰ کے رسولؑ آئے اور کہیں ان کی دعوت قبول کر لی گئی تو انسانوں کی قسمت سنور گئی اور جہاں اس کا انکار کیا گیا تو بالآخر خدا کے عذاب نے ان کی کمر توڑ دی۔

اس سے ہمیں یہ بات معلوم ہوتی ہے جس کی وضاحت قرآنِ کریم نے دوسرے مواقع پر بھی کی ہے کہ انسانوں کی کوئی قابلِ ذکر بستی یا ملک ایسا نہیں جہاں اللہ تعالیٰ نے کوئی ڈرانے والا نہ بھیجا ہو۔ یعنی ہر جگہ انسانی ہدایت کیلیے اللہ تعالیٰ کے رسولؑ آتے رہے۔ البتہ ان میں سے تذکرہ صرف ان رسولوںؑ کا کیا گیا ہے جو عام طور پر اپنے پیچھے ایک عالمگیر تحریک اور ہمہ گیر اثرات چھوڑ کر گئے ہیں۔ کتنی امتیں ہیں جو منصۂ شہود پر ابھریں اور ایک مدت کے بعد فنا ہو گئیں۔ ایسی قوموں کی تاریخ کا ذکر کرنا ظاہر ہے کہ کارِ عبث کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس لیے قرآنِ کریم نے ان کا تذکرہ کرنے سے گریز کیا ہے۔ لیکن جن رسولوں کی محنتوں نے امتوں کو بیدار کیا، زمانے کو نئی کروٹ دی اور نسلوں تک کیلیے اثرات چھوڑے اور سینہ بہ سینہ ان کے حالات بہت حد تک منتقل بھی ہوئے، قرآنِ کریم عموماً انھیں رسولوں اور انھیں کی امتوں کا تذکرہ کرتا ہے بلکہ ان کی زندگیوں کو بعد کی نسلوں کیلیے بطور نمونہ پیش کرتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس بات کا اظہار بھی کرتا ہے کہ حق کے نمائندہ صرف یہی لوگ نہیں ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے ہر قابلِ ذکر جگہ پر اپنے رسولؑ بھیجے ہیں تاکہ قیامت کے دن کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ ہماری طرف تو کوئی ڈرانے والا نہیں آیا تھا۔

Marfat.com

اور یہ بات بھی کسی حادثے سے کم نہیں کہ جب بھی کوئی رسول کسی قوم کی طرف آیا ہے تو انھوں نے ہمیشہ ان کا تمسخر اڑایا ہے۔ بعض دفعہ توہین آمیز سلوک کیا گیا۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہاں فرمایا گیا کہ انھوں نے اپنے ہاتھ اپنے منہ پر رکھ لیے، مقصود یہ تھا کہ ان کی حقیقت افروز باتوں کا مذاق اڑایا جائے اور یہ تأثر دیا جائے کہ کتنی لغو اور لایعنی باتیں ہیں جنھیں تم نبوت کے نام سے پیش کر رہے ہو حالانکہ ایسی باتیں ایک عام آدمی کی زبان سے زیب نہیں دیتیں۔ یہ ان کا توہین آمیز رویہ سراسر ایک کٹ حجتی اور جہالت کے سوا کچھ نہ تھا۔ اور دوسرا معنی اس کا یہ ہوسکتا ہے کہ جیسے ہی پیغمبروں نے اپنی قوموں کو اللہ تعالیٰ کی بندگی کی طرف دعوت دی اور انھیں بتایا کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک نہیں اور اس کے سوا نہ صرف کہ کسی اور کے سامنے سر نہیں جھکایا جاسکتا بلکہ کسی کی غیر مشروط اطاعت بھی نہیں کی جاسکتی تو انھوں نے محسوس کیا کہ یہ ایک ایسی بات کہی جارہی ہے جو ہماری بڑائی کے دعوؤں کو کھا جائے گی۔ انھوں نے اپنے پاؤں تلے سے زمین ہلتی ہوئی محسوس کی، وہ سمجھ گئے کہ یہ بات محض بات نہیں بلکہ تخت و تاج الٹنے کا ایک نسخہ ہے۔ اس لیے انھوں نے آگے بڑھ کر ان کے منہ پر ہاتھ رکھ دیے۔ یہ ایک محاورہ ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ خبردار اب ایک لفظ بھی آگے منہ سے نہ نکالنا، ورنہ زبان گدی سے کھینچ لی جائے گی کیونکہ تمھاری دعوت ممنوعہ علاقے میں داخل ہوچکی ہے اور اس کے بعد ٹھونک کر کہا کہ تم جو پیغام لے کے آئے ہو ہم کھلم کھلا اسے ماننے سے انکار کرتے ہیں۔ ہمیں تمھارے اس پیغام کے بارے میں پہلے ہی شک ہم تمھاری حیثیت کے بارے میں بھی یکسو نہیں تھے۔ لیکن جیسے جیسے تمھاری دعوت آگے بڑھی ہے ہمارے شک و شبہ کی شدت میں اور اضافہ ہوگیا ہے۔ تم تو معلوم ہوتا ہے اپنے اندر کچھ سیاسی عزائم بھی رکھتے ہو جنھیں مذہب کے راستے سے تم بروئے کار لانا چاہتے ہو۔

قَالَتْ رُسُلُهُمْ اَفِی اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ يَدْعُوْكُمْ لِيَغْفِرَ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُؤَخِّرَكُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ قَالُوْٓا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ؕ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَصُدُّوْنَا عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا فَاْتُوْنَا بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۝

(ان کے رسولوں نے کہا کیا تمھیں آسمانوں اور زمین کے وجود میں لانے والے اللہ تعالیٰ کے بارے میں شک ہے۔ وہ بلاتا ہے تاکہ تمھارے گناہوں کو بخش دے اور تمھیں ایک وقتِ معین تک مہلت دے دے۔ وہ کہنے لگے کہ تم تو ہمارے ہی جیسے آدمی ہو، تم چاہتے ہو کہ تم ہمیں روک دو۔ ان کی عبادت سے جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کیا کرتے تھے۔ پس تم ہمارے پاس کوئی کھلا ہوا معجزہ لاؤ۔) (سورۃ ابراھیم: ۱۰)

تعجب انگیز سوال

گزشتہ آیتِ کریمہ میں مخالفین نے جو کچھ کہا ان کی طرف بھیجے جانے والے رسولوں نے ان کے جواب میں تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ تم ہم سے جو کچھ کہہ رہے ہو اس کا تو مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کے بارے میں بھی سنجیدہ نہیں ہو۔ ایسا لگتا ہے کہ تمھیں اللہ تعالیٰ کی ذات یا اس کی صفات میں شک ہے حالانکہ اس بات کو تم بھی جانتے ہو کہ زمین و آسمان کا خالق اس کے سوا کوئی اور نہیں، ہم اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتے، ہم تو اسی کی نمائندگی کرتے اور اسی کی بات تم تک پہنچاتے ہیں۔ اور تم جانتے ہو کہ وہ ذات تو سراسر رحیم و کریم ہے جو اس کی طرف بڑھتا ہے، وہ آگے بڑھ کر اسے تھام لیتا ہے۔ وہ تمھیں پکار رہا ہے کہ تم اس پر ایمان لاؤ، اسے مانو اور پھر اسی سے مانگو تو اللہ تعالیٰ تمھارے ایمان قبول کرتے ہوئے تمھاری بخشش فرما دے گا اور تمھارے ساتھ مغفرت کا سلوک کرے گا۔ اور اس طرح سے دنیا میں تمھارے قیام میں اضافہ کردے گا۔ وہ مہلتِ عمل جس کا تعین قوموں کی عملی اور اخلاقی زندگی سے ہوتا ہے جب تم اپنے اعمال و اخلاق درست کرلو گے تو اللہ تعالیٰ زمین پر تمھارے قیام اور مہلتِ عمل میں اضافہ فرما دے گا۔ اور یہی وہ چیز ہے جو تمھیں عین مطلوب ہے۔ اس کے جواب میں کفار نے کہا کہ تم ہماری قسمت، ہماری عزت اور ہماری نجات کی باتیں کرتے ہو حالانکہ تم ہماری ہی طرح کے انسان ہونے کے سوا کچھ نہیں ہو۔ انسان، انسانوں کی قسمتیں بنانے یا بگاڑنے پر قادر نہیں۔ تم درحقیقت ہمیں ہمارے دین سے پھیرنا چاہتے ہو۔ اور تم چاہتے ہو کہ جنھیں ہمارے آباؤ اجداد پوجا کرتے تھے ہم انھیں چھوڑ دیں۔ لیکن اگر تمھیں اصرار ہے کہ تم واقعی اللہ تعالیٰ کے

Marfat.com

رسول ہوتو پھر کوئی ایسا کھلا کھلا اور روشن معجزہ لے کر آؤ جس سے ہمیں یقین ہو جائے کہ تم واقعی اللہ تعالیٰ کی طرف سے مبعوث ہوئے ہو اور تمھاری پشت پر اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے جسے قبول کرنا ہمارے لیے از بس ضروری ہے ورنہ اللہ تعالیٰ کا عذاب بھی آ سکتا ہے۔

قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَمَا كَانَ لَنَآ اَنْ نَّاْتِيَكُمْ بِسُلْطٰنٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۱﴾ وَمَا لَنَآ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنَا سُبُلَنَا ؕ وَلَنَصْبِرَنَّ عَلٰى مَآ اٰذَيْتُمُوْنَا ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ﴿۱۲﴾ (سورۃ ابراھیم : ۱۱،۱۲)

(ان کے رسولوں نے کہا کہ ہم ہیں تو تمھارے ہی جیسے آدمی، لیکن اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جن پر چاہتا ہے اپنا فضل فرماتا ہے۔ ہماری یہ طاقت نہیں کہ ہم تمھارے پاس کوئی معجزہ لے آئیں، مگر اللہ تعالیٰ کے حکم سے، اور ایمان لانے والوں کو اللہ تعالیٰ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہیے۔ اور ہم کیوں نہ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھیں جبکہ اس نے ہمیں ہمارے راستوں کی ہدایت بخشی ہے اور ہم اس پر یقیناً صبر کریں گے، تم جو بھی ایذا ہمیں پہنچاؤ گے۔ اور بھروسہ کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔)

قوم کے اعتراضات کا جواب

اللہ تعالیٰ کے رسولوں نے اپنی قوموں کی طرف سے اٹھائے گئے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ تم نے ہم پر یہ طعن توڑا ہے کہ ہم تو تمھاری طرح کے بشر اور انسان ہیں۔ اور بشر اللہ تعالیٰ کا رسول کیسے ہو سکتا ہے؟ رسالت ایک عظیم منصب ہے اور بشریت نہایت فروتر مقام۔ یہ دونوں اکٹھے کیسے ہو سکتے ہیں؟ یہ وہ غلط فہمی ہے جس نے بہت سے لوگوں کو ہدایت کی طرف آنے سے روکا۔ انسان بھی عجیب واقع ہوا ہے، اس کے بگاڑ کا ایک رنگ یہ ہے کہ وہ انسان ہوتے ہوئے ربوبیت کا دعویٰ کرنے لگتا ہے۔ اور دوسری طرف حال اس کا یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس قدر فروتر سمجھتا ہے کہ یہ تصور بھی اس کے نزدیک گناہ ہے کہ نبی بشر ہو سکتا ہے یا بشر نبی ہو سکتا ہے۔ حالانکہ معمولی عقل کا آدمی بھی یہ بات سمجھ سکتا ہے کہ آدم بشر تھے اور اللہ تعالیٰ نے انھیں مسجودِ ملائکہ بنایا جبکہ ملائکہ نورانی مخلوق ہیں اور باقی کوئی مخلوق تو ان دونوں مخلوقات سے شان میں بلند نہیں۔ اور مزید یہ بات کہ اللہ تعالیٰ کے رسول انسانوں کی ہدایت کیلیے آتے ہیں اور ہدایت ہمیشہ اپنے ہم جنس سے حاصل کی جاتی ہے کیونکہ ہدایت کیلیے ضروریات کا یکساں ہونا، احساسات کا یک رنگ ہونا اور فہم و شعور کے سرچشموں کا مشترک ہونا ضروری ہے۔ اگر ان بنیادی چیزوں میں فرق ہوگا تو افادہ اور استفادہ ناممکن ہو جائے گا۔ اگر انبیا فرشتے ہوتے تو وہ نہ انسانوں کو نظر آتے اور نہ انسان ان کو دیکھ سکتے۔ نہ انھیں بھوک لگتی کہ وہ روزے میں نمونہ بن سکیں اور نہ انھیں بیماری لاحق ہوتی کہ ان سے صبر سیکھا جا سکے۔ نہ انھیں زخمی ہونے کا ڈر ہوتا کہ ان سے شجاعت و استقامت کا سبق پڑھا جا سکے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے انسانوں میں ہی سے جس کو اس قابل جانا اسے نبوت دے کر احسان فرمایا۔ اس لیے کفار کا یہ کہنا کہ تم چونکہ انسان ہو اس لیے نبی نہیں ہو سکتے، یہ بے عقلی بھی ہے اور احسان ناشناسی بھی۔

کفار نے دوسری بات یہ کہی تھی کہ تم اگر واقعی پیغمبر ہو تو کھلم کھلا اور واضح قسم کا معجزہ ہمیں دکھاؤ جس سے ہمیں یقین ہو جائے کہ تم کوئی بڑی قدرتوں کے مالک ہو۔ اس کے جواب میں رسولوں نے کہا کہ ہم نے ایسی کسی بات کا دعویٰ کب کیا ہے؟ کہ ہم کوئی غیر معمولی قوت رکھتے ہیں۔ ہم تو صرف یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی وحی ہم پر اترتی ہے۔ وہ انسانی ہدایت کیلیے ہمارے لیے رہنما ہے، ہم اسی کی روشنی میں تمھاری اصلاح کرنے کیلیے اٹھے ہیں تو ہمارا کام تمھیں ہدایت دینا ہے، غیر معمولی معجزات دکھانا نہیں۔ اس کی قدرت کا سررشتہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جب چاہتا ہے تو ہمارے ہاتھوں کسی بھی غیر معمولی معجزے کا صدور ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کا دارومدار اس کی مرضی اور اس کی مشیت پر ہے ہم تو صرف اس کے نمائندہ ہیں۔ اس لیے جب وہ چاہے گا تو تمھیں کوئی معجزہ اور نشانی دکھا دے گا۔ لیکن اس کا اظہار یقیناً ہمارے ذریعے سے ہوگا تاکہ پتہ چلے کہ ہم واقعی اس کے رسول ہیں۔

Marfat.com

رسولوںؑ کی قوموں نے ہمیشہ اپنے پیغمبروںؑ کا تمسخر بھی اڑایا اور اذیتیں بھی پہنچائیں۔ اس لیے ان کی باتوں کا جواب دینے کے بعد ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ ہم جانتے ہیں کہ تم عجیب و غریب مطالبات ہمیشہ زچ کرنے کیلیے کرتے ہو، ورنہ حقیقت تم سے بھی مخفی نہیں۔ یاد رکھو ہم تمھارے اس رویئے کی وجہ سے اپنی ذمہ داری کی ادائیگی سے رکنے والے نہیں۔ ہم تمھاری ایذا رسانیوں پر صبر کریں گے۔

ہمارا سرمایہ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ ہے

اگلی آیت میں مزید ارشاد فرمایا: کہ تم جو چاہو تو کرو، ہمارا اصل سرمایہ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ اور توکل ہے۔ ہم نے اس دعوت کا کام اسی کے بھروسے پر شروع کیا ہے۔ اب اذیتوں کا مقابلہ بھی اسی کے بھروسہ پر کریں گے۔ ہماری اس دعوت کی کامیابی چونکہ سراسر اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ اسی پر ہم بھروسہ کرنا چھوڑ دیں جبکہ اسی نے ہم کو ہدایت دی اور وہی ہمارے لیے راستے آسان کرتا ہے اور پھر قاعدہ کلیہ کے طور پر ارشاد فرمایا کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتے ہیں انھیں ہر حال میں اللہ تعالیٰ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے کیونکہ ہدایت بھی اس کے قبضے میں ہے اور دلوں کا ہدایت پر مطمئن ہو جانا اور ہزار مشکلات کے باوجود دل میں شک و ارتیاب کا پیدا نہ ہونا یہ بھی سراسر اسی کے قبضے میں ہے۔ اس راستے کی ہر کامیابی کا سررشتہ اسی کے ہاتھ میں ہے۔ دنیا میں فیصلے بھی اس کی مرضی سے ہوتے ہیں اور آخرت میں فیصلے بھی اسی کی مرضی سے ہوں گے۔ تو پھر ایک مومن کیلیے اس کے سوا کیا چارۂ کار ہے کہ وہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ پر توکل کرے اور کبھی اس کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا
لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ؕ
فَاَوْحٰٓى اِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۳﴾ وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ
الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِيْ وَخَافَ
وَعِيْدِ ﴿۱۴﴾ وَاسْتَفْتَحُوْا وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ﴿۱۵﴾ مِّنْ وَّرَآىِٕهٖ
جَهَنَّمُ وَيُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ صَدِيْدٍ ﴿۱۶﴾ يَّتَجَرَّعُهٗ وَلَا يَكَادُ يُسِيْغُهٗ
وَيَاْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّمَا هُوَ بِمَيِّتٍ ؕ وَمِنْ وَّرَآىِٕهٖ
عَذَابٌ غَلِيْظٌ ﴿۱۷﴾ مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ
اِۨشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ ؕ لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا

Marfat.com

عَلٰى شَيْءٍ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ﴿۱۸﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ خَلَقَ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَاْتِ بِخَلْقٍ
جَدِيْدٍ ﴿۱۹﴾ وَّمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ﴿۲۰﴾ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِيْعًا
فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ
اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ؕ قَالُوْا لَوْ هَدٰىنَا
اللّٰهُ لَهَدَيْنٰكُمْ ؕ سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَجَزِعْنَآ اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ
مَّحِيْصٍ ﴿۲۱﴾

رکوع: ۳۔ (اور کہا ان لوگوں نے جنھوں نے کفر کیا، اپنے رسولوں ؑ سے۔ ہم تمہیں یقیناً اپنی سرزمین سے نکال دیں گے یا تمہیں لوٹنا ہوگا ہمارے دین میں۔ پس ان کے رب نے ان کی طرف وحی کی کہ ہم ظالموں کو ہلاک کر دیں گے۔ اور تمہیں ان کے بعد اس سرزمین میں آباد کریں گے۔ یہ انجام ہے ہر اس شخص کا جو میرے سامنے حاضری سے ڈرا، اور میری وعید سے اس نے خوف کھایا۔ اور انھوں نے فیصلہ چاہا اور ہر سرکش منکرِ حق نامراد ہو گیا۔ (اس نامرادی) کے بعد جہنم ہے۔ اور پلایا جائے گا اسے خون اور پیپ کا پانی۔ وہ بمشکل ایک ایک گھونٹ بھرے گا اور حلق سے نیچے نہ اتار سکے گا۔ اور ہر طرف سے اس پر موت بڑھ رہی ہوگی اور وہ مرنے والا نہ بنے گا۔ اور آگے ایک اور سخت عذاب اس کیلیے موجود ہوگا۔ ان لوگوں کے اعمال کی تمثیل جن لوگوں نے اپنے رب کے ساتھ کفر کیا ایسے ہے جیسے راکھ کا ڈھیر ہو جسے سخت آندھی کے دن تند ہوا اڑا کے لے جائے، وہ نہ حاصل کر سکیں گے ان اعمال سے جو انھوں نے کمائے، کچھ بھی۔ یہی دور کی گمراہی ہے۔ کیا تم نے غور نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا فرمایا ہے، اگر وہ چاہے تو تم سب کو ہلاک کر دے اور ایک نئی مخلوق لا بسائے اور یہ اللہ تعالیٰ کیلیے کوئی مشکل نہیں۔ اور (قیامت کے دن) اللہ تعالیٰ کے سامنے سب حاضر ہوں گے۔ تو کمزور لوگ، ان لوگوں سے جو بڑے بنے رہے، کہیں گے کہ ہم تو تمھارے تابع رہے ہیں تو کیا آج تم ہمیں بچا سکتے ہو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے۔ وہ جواب دیں گے، اگر اللہ تعالیٰ نے ہم کو ہدایت دی ہوتی تو ہم بھی تمہیں ہدایت کی راہ دکھاتے۔ اب ہمارے لیے یکساں ہے چیخیں، چلائیں یا صبر کریں، ہمارے لیے آج کوئی راہِ فرار نہیں۔)

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ؕ فَاَوْحٰٓى اِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۳﴾ وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِيْ وَخَافَ وَعِيْدِ ﴿۱۴﴾

(اور کہا ان لوگوں نے جنھوں نے کفر کیا، اپنے رسولوں علیہم السلام سے۔ ہم تمہیں یقیناً اپنی سرزمین سے نکال دیں گے یا تمہیں لوٹنا ہوگا ہمارے دین میں۔ پس ان کے رب نے ان کی طرف وحی کی کہ ہم ظالموں کو ہلاک کر دیں گے۔ اور تمہیں ان کے بعد اس سرزمین میں آباد کریں گے۔ یہ انجام ہے ہر اس شخص کا جو میرے سامنے حاضری سے ڈرا، اور میری وعید سے اس نے خوف کھایا۔) (سورۃ ابراھیم: ۱۳۔۱۴)

Marfat.com

کفار کی دھمکی اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے تسلی

معلوم ہوتا ہے کہ انسانی فطرت کبھی نہیں بدلتی۔ انسان جب کسی سچائی یا حقیقت کو نہ ماننے کا فیصلہ کر لیتا ہے تو شروع شروع میں دلائل کی جنگ لڑتا ہے۔ جب اس میں ناکام ہوتا ہے تو پھر وہ دھمکیوں اور اذیت رسانیوں پر اتر آتا ہے۔ مشرکینِ مکہ بھی یہی کر رہے تھے اور سابقہ امتوں کی تاریخ بھی ہمیں یہی بتلا رہی ہے کہ جب وہ دلائل کی جنگ میں پسپا ہو گئے تو انھوں نے اپنی طرف آنے والے رسولوںؑ کو ڈرانا دھمکانا شروع کیا کہ تم نے اپنا اگر یہ دعوتی عمل ختم نہ کیا اور تم نے ہماری قوم کے نوجوانوں کو ان کے عقائد سے گمراہ کرنے کا سلسلہ نہ روکا تو ہم اس سرزمین سے تمھیں نکال باہر کریں گے۔ تمھاری دعویٰ یہ ہے کہ ہم نے اس سرزمین کو اپنی بداعمالیوں کے باعث فساد سے بھر دیا ہے، لیکن ہمارا مشاہدہ یہ ہے کہ ہم ایک پرعیش زندگی گزار رہے ہیں۔ لیکن تمھاری تبلیغ و دعوت نے ہماری خوشیوں کو مکدر کر دیا ہے۔ تمھیں خوشی کی کوئی بات اچھی نہیں لگتی اور ہر بات میں کیڑے نکالنے لگتے ہو۔ اس صورتحال کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم ایک بستی یا ایک ملک میں اکٹھے نہیں رہ سکتے۔ تم چونکہ کمزور اور اقلیت میں ہو اس لیے ہم کسی نہ کسی دن تمھیں نکال باہر کریں گے۔ یہ وہی صورتحال ہے جیسا کہ قرآنِ کریم نے قومِ لوط کے بارے میں بتایا ہے کہ جب حضرت لوط علیہ السلام نے انھیں ان کی بے حیائی پر ٹوکا اور ان کے خلافِ فطرت عمل پر ان کو ملامت کی تو وہ آپس میں اکٹھا ہو کر کہنے لگے کہ آلِ لوط کو اپنی بستی سے نکال دو۔ یہ اپنے آپ کو بہت پاکباز سمجھتے ہیں اور دوسری بات یہ کہی کہ اگر تم ہماری بستی میں رہنا چاہتے ہو تو پھر تمھیں واپس اپنے دین میں آنا ہو گا۔ یعنی جو خرافات، ہذلیات، لغویات اور جہالت پر مبنی طور اطوار کو انھوں نے اپنا دین بنا رکھا تھا۔ تمھیں اس دین میں واپس آنا ہو گا۔ ان کا گمان یہ تھا کہ نبوت سے پہلے یہ رسولؐ ہمارے ہی دین پر تھے۔ نبوت کے بعد انھوں نے ہمارے دین کا انکار کر کے ارتداد کا راستہ اختیار کر لیا ہے حالانکہ امرِ واقعہ یہ ہے کہ پیغمبر نبوت سے پہلے بھی دین جہالت پر نہیں ہوتا وہ چونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی سے پہلے خاموش زندگی گزارتا ہے اور کسی بحث میں مبتلا نہیں ہوتا تو لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس لیے پیغمبروںؑ اور ان پر ایمان لانے والوں کو تسلی دی جا رہی ہے کہ آپ کافروں کی دھمکیوں کی پروا مت کریں۔ تبلیغ و دعوت کے حوالے سے آپ نے اپنا فرض خوب انجام دیا ہے۔ ہم نے انھیں تمھاری دعوت سے فائدہ اٹھانے کا موقع دیا، لیکن ان کے رویئے نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ نصیحت کی بات کو نہیں سمجھتے، اب انھیں مٹا دیا جائے گا اور ان کی جگہ پر ہم تمھیں آباد کریں گے۔ اس لیے کہ ہمارا قانون یہ ہے کہ جب حق و باطل کی کشمکش ہوتی ہے تو ہم اہلِ باطل کو زیادہ سے زیادہ مہلت دیتے ہیں تاکہ وہ پیغمبرؑ کی دعوت کو اچھی طرح سنیں اور پرکھیں لیکن جب اہلِ باطل بجائے دعوتِ حق کو قبول کرنے کے اسے مٹا دینے کیلیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں تو پھر ہم انھیں مزید مہلت نہیں دیتے۔ پھر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اہلِ حق نے اپنا فرض کہاں تک انجام دیا ہے۔ اور اگر یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ اہلِ حق اپنے پیغمبرؑ کی معیت میں اپنی تمام تر توانائیاں اس راستے میں صرف کر چکے ہیں اور اہلِ باطل کی اذیت رسانیوں پر انھوں نے صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا بلکہ انھیں فکر صرف ایک بات کی رہی کہ جب ہم اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہی کیلیے کھڑے کیے جائیں گے تو ہم کسی کمزوری کا شکار نہ ہو جائیں اور وہ ہمہ وقت اللہ تعالیٰ کی وعید، اس کی ناراضگی اور بالآخر اس کے عذاب سے لرزاں اور ترساں رہے ہیں تو پھر ہم ان اہلِ حق کو اہلِ باطل کو مٹا کر ان کی جگہ آباد کر دیتے ہیں۔ ان کی زمینوں کا انھیں وارث بنا دیتے ہیں اور زمین کے تمام خزانے ان کے حوالے کر کے ان کو زمین کا حاکم بنا دیتے ہیں۔

وَاسْتَفْتَحُوْا وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ﴿١٥﴾ مِّنْ وَّرَآئِهٖ جَهَنَّمُ وَيُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ صَدِيْدٍ ﴿١٦﴾ يَّتَجَرَّعُهٗ وَلَا يَكَادُ يُسِيْغُهٗ وَيَاْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّمَا هُوَ بِمَيِّتٍ ۭ وَمِنْ وَّرَآئِهٖ عَذَابٌ غَلِيْظٌ ﴿١٧﴾

(اور انھوں نے فیصلہ چاہا اور ہر سرکش منکرِ حق نامراد ہو گیا۔ (اس نامرادی) کے بعد جہنم ہے۔ اور پلایا جائے گا اسے خون اور پیپ کا پانی۔ وہ بمشکل ایک ایک گھونٹ بھرے گا اور حلق سے نیچے نہ اتار سکے گا۔ اور ہر طرف سے اس پر موت بڑھ رہی ہوگی اور وہ مرنے والا نہ بنے گا۔ اور آگے ایک اور سخت عذاب اس کیلیے موجود ہوگا۔) (سورۃ ابراہیم: ۱۵۔۱۶۔۱۷)

Marfat.com

وَاسْتَفْتَحُوْا کا فاعل کون ہے؟

وَاسْتَفْتَحُوْا کا فاعل انبیائے کرام بھی ہو سکتے ہیں اور کفار بھی۔ انبیائے کرام کے فاعل ہونے کی صورت میں مفہوم یہ ہوگا کہ جب کفار کی جانب سے اذیت رسانیوں کا سلسلہ ناقابل برداشت حد کو پہنچ جاتا ہے اور کفار انبیائے کرام کو دق کرنے کیلیے بار بار عذاب لانے کا مطالبہ بھی کرنے لگتے ہیں تو انبیائے کرام پر ایک ایسا وقت آتا ہے کہ جب وہ ان کے ایمان سے مایوس ہو کر اللہ تعالیٰ سے التجا کرتے ہیں کہ یا اللہ ہمارے اور ان کافروں کے درمیان فیصلہ فرمادے یعنی ان پر وہ عذاب نازل فرما جس کے یہ مستحق ہو چکے ہیں۔ جیسا کہ سورۂ اعراف میں انبیائے کرام کی دعا نقل کی گئی ہے رَبَّنَا افْتَحْ بَیْنَنَا وَبَیْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَاَنْتَ خَیْرُ الْفٰتِحِیْنَ (الاعراف۸۹) اے ہمارے رب ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ فرما دے اور تو بہترین فیصلہ فرمانے والا ہے۔ ایسی صورتحال میں اللہ تعالیٰ پیغمبروںؑ کی دعا قبول فرماتے ہوئے انھیں اور ان پر ایمان لانے والوں کو ہجرت کا حکم دیتا ہے اور مخالفین پر عذاب نازل فرمادیتا ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ وَاسْتَفْتَحُوْا کا فاعل کفار ہوں۔ اور کفار اپنے آپ کو حق پر سمجھتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے لگتے ہیں کہ یا اللہ اگر یہ پیغمبرؑ سچے ہیں تو آپ ہم پر عذاب نازل فرمایئے، جس سے یہ بات کھل جائے کہ ہم جھوٹے تھے اور پیغمبرؑ سچے۔ چنانچہ ان دونوں میں سے صورت کوئی بھی ہو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ معاملہ کچھ بھی ہو اور دعا کسی جانب سے بھی مانگی گئی ہو اس کی قبولیت کے بعد حق و باطل کے فیصلے کا وقت آ گیا ہے۔ چنانچہ حق کو غالب کر دیا گیا اور باطل کو مغلوب کر دیا گیا۔ اہلِ باطل اس طرح عذاب کا شکار ہوئے کہ ان میں سے ایک ایک شخص جو اپنے آپ کو جبر کی تصویر سمجھتا تھا اور جس نے حق کی دشمنی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا تھا، ان سب کو نامرادی کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ ان کی دنیا تباہ کر دی گئی، رسوائیاں ان کا مقدر بن گئیں اور یہ لوگ دنیا میں عبرت کا نشان بن گئے۔ لیکن اسی پر بس نہیں، ابھی آخرت کا عذاب ان کے انتظار میں ہے جہاں انھیں جہنم میں پھینکا جائے گا اور جب پیاس کی شدت سے یہ جان کنی میں مبتلا ہوں گے تو انھیں خون اور پیپ ملا پانی پینے کو دیا جائے گا۔ شدتِ پیاس سے ایک ایک گھونٹ کر کے اسے پینے کی کوشش کریں گے لیکن ان سے نگلا نہیں جائے گا۔ موت کے اسباب ہر طرف سے ان کی طرف بڑھ رہے ہوں گے۔ شدتِ عذاب جان لیوا ہوگی، آگ کی تپش اور جلن ہر چیز کو جلائے دے رہی ہوگی اور پیاس سے انتڑیاں ٹوٹ رہی ہوں گی اور یہ ان تمام ناقابلِ برداشت تکلیفوں سے نجات پانے کیلیے موت کی تمنا کریں گے لیکن انھیں موت نہیں آئے گی۔ اس شخص کی تکلیف اور اذیت کا کیا ٹھکانہ ہے کہ جسے موت کے سوا کوئی چیز عذاب سے نجات دینے والی نہ ہو لیکن اسے موت بھی نہ آئے۔ غالب نے اس کی شدت کو محسوس کرتے ہوئے ٹھیک کہا:

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
ناامیدی اس کی دیکھا چاہیے

آیت کے آخری جملے کو پڑھتے ہوئے دل ہول کھانے لگتا ہے کہ ایسے سخت عذاب اور سخت اذیت میں مبتلا ہونا بھی ان کافروں کی اصل سزا نہیں، بلکہ ان کی سزا بھی ان کے انتظار میں ہوگی جسے عذابِ غلیظ فرمایا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس عذاب کی غلظت اور شدت کا عالم کیا ہوگا۔

مَثَلُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ ِۨ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّیْحُ فِیْ یَوْمٍ عَاصِفٍ ؕ لَا یَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰى شَیْءٍ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِیْدُ ﴿۱۸﴾ (سورۃ ابراھیم : ۱۸)

(ان لوگوں کے اعمال کی تمثیل جن لوگوں نے اپنے رب کے ساتھ کفر کیا ایسے ہے جیسے راکھ کا ڈھیر ہو جسے سخت آندھی کے دن تند ہوا اڑا کے لے جائے، وہ نہ حاصل کر سکیں گے ان اعمال سے جو انھوں نے کمائے، کچھ بھی۔ یہی دور کی گمراہی ہے۔)

Marfat.com

مشرکین کے اعمال کی تمثیل

اللہ تعالیٰ نے انسانی فطرت میں خیروشر کے دونوں جذبے ودیعت کیے ہیں۔ ماحول اور والدین جس جذبے کو جلا دینے کا سامان کرتے ہیں وہی جذبہ دوسرے جذبے پر غالب آجاتا ہے اور انسان کی زندگی اسی کی عکاس بن جاتی ہے۔ اور اگر شعور کی عمر کو پہنچ کر انسان وحی الٰہی کی رہنمائی کو قبول کر لیتا ہے تو اسے اسلامی زندگی نصیب ہو جاتی ہے۔ لیکن جو لوگ وقت کی رواروی میں یا ہوائے نفس کی پیروی میں زندگی گزارتے ہیں ان میں اسلامی زندگی تو کبھی پیدا نہیں ہوتی البتہ کبھی کبھی عقل اور شعور ان کی دستگیری کرتے ہیں تو وہ انسانی بھلائی کے کاموں میں دلچسپی لینے لگتے ہیں۔ کبھی تو اس خیال سے کہ ان کی عقل انھیں رہنمائی دے رہی ہے اور کبھی شہرت اور نام کو زندہ رکھنے کی ہوس اور کبھی نیک نامی کو الیکشن میں کیش کرانے کی ضرورت ایسے کاموں کی داعی بنتی ہے۔ چنانچہ کتنے ایسے خدا کے منکر یا غلط مذاہب کے ماننے والے ہمیں نظر آتے ہیں جنھوں نے بڑے بڑے رفاہی کام سرانجام دیے۔ اکثر یہ سوال اٹھتا ہے کہ ان لوگوں کے نیک اعمال کا کیا ہوگا، کیا انھیں اس کی کوئی جزاء ملے گی یا نہیں؟ اس آیت کریمہ میں انھیں کے اعمال کی ایک مثال کے ذریعے وضاحت کی گئی ہے۔ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ ان کے نیک اعمال راکھ کے ڈھیر کی مانند ہیں جن میں قبولیت کی کوئی چنگاری نہیں۔ اعمال کرنے والے اپنے تئیں بڑا سرمایہ جمع کرتے ہیں لیکن اس کی حیثیت راکھ کے ڈھیر سے زیادہ نہیں ہوتی۔ راکھ کا ڈھیر اس کے سوا اور کیا حیثیت رکھتا ہے کہ اس وقت تک ایک جگہ پڑا رہتا ہے جب تک اس پر کوئی تیز ہوا نہیں چلتی اور جس دن کوئی آندھی اٹھے اور اس کی تیز ہوا کا جھونکا اس کے اوپر سے گزر جائے تو وہ اسے اڑا کر نجانے کہاں کہاں بکھیر دیتا ہے۔ اب ان کا یہ سارا سرمایہ منتشر راکھ کے ذرے ہیں جن کی کوئی قدروقیمت نہیں اور جس آندھی نے انھیں ذروں میں تبدیل کیا بلکہ انھیں راکھ کی صورت دی وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کیا ہوا کفر اور شرک ہے جس کی موجودگی میں کوئی عمل بھی نہ اپنی اصلی شکل اختیار کرتا ہے اور نہ اس کی قبولیت کا کوئی راستہ کھلتا ہے۔ ایسے اعمال چونکہ دنیا ہی کیلیے کیے جاتے ہیں اور دنیوی اغراض ہی سامنے ہوتی ہیں۔ اس لیے ایسے اعمال کو دنیوی ضرورتوں کیلیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ یہ نیک نامی کا ذریعہ بنتے ہیں۔ الیکشن میں کیش کرائے جاسکتے ہیں، لوگوں کی رائے بدلنے میں مؤثر ثابت ہوتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کے ہاں قبولیت کیلیے چونکہ ایمان ضروری ہے، اخلاص ضروری ہے اور نیت کو ہر غیر خدا سے پاک کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے اس کے یہاں ایسے اعمال کی پذیرائی نہیں ہوتی، چاہے وہ اپنی شکل وصورت میں کیسے ہی دلپسند کیوں نہ ہوں۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے بھی ایسے ہی کسی احساس کے تحت آنحضرت ﷺ سے پوچھا تھا کہ ابن جدعان نے اپنی زندگی میں بظاہر بڑے بھلے کام بھی کیے تھے، کیا اس کی بخشش نہیں ہوگی؟ آپؐ نے فرمایا، نہیں۔ اس لیے کہ اس نے کبھی اپنے پروردگار سے یہ نہیں کہا تھا کہ یا اللہ مجھے بخش دے۔ اس کے یہ بھلے کام صرف نیک نامی کے حصول کیلیے تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں اسے نیک نامی دے دی۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ ۙ ﴿۱۹﴾ وَّمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ﴿۲۰﴾ (سورۃ ابراھیم : ۱۹۔۲۰)

(کیا تم نے غور نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا فرمایا ہے، اگر وہ چاہے تو تم سب کو ہلاک کردے اور ایک نئی مخلوق لا بسائے اور یہ اللہ تعالیٰ کیلیے کوئی مشکل نہیں۔)

قریش کو وارننگ

اس آیت کریمہ میں قریشِ مکہ کو غوروفکر کی دعوت بھی دی گئی ہے اور ساتھ ساتھ وارننگ بھی۔ غوروفکر کے قابل بات یہ ہے کہ یہ دنیا نہ تو خودبخود وجود میں آئی ہے اور نہ اس کی تخلیق بےمقصد ہے، نہ کسی کھلنڈرے کا کھیل ہے، یہ ایک ایسی ذات کی تخلیق ہے جو حکیم ہے، جس کی حکمت کائنات کے ذرے ذرے سے عیاں ہے۔ اس نے کائنات کی بےشمار مخلوقات میں ایسے عوامل پیدا کر دیے ہیں کہ جن سے ان کی حکمت ودانش کا ظہور بھی ہوتا ہے اور مقصدِ حق کی نمود بھی۔ اب اگر واقعی اس کائنات اور بالخصوص انسانوں کو پیدا کرنے کا کوئی مقصدِ حق بھی ہے اور تمھاری زندگی کا اس مقصدِ حق سے دور کا

Marfat.com

بھی واسطہ نہیں بلکہ تم ایک حیوانی زندگی گزار رہے ہو جنھیں کھانے پینے، اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے فائدہ اٹھانے اور آرزوؤں میں بہلنے کے سوا اور کوئی کام نہیں، تو آخر اللہ تعالیٰ کو کیا پڑی ہے کہ ایسے انسان نما حیوانوں کو انسانوں کی سرزمین پر آباد رکھے۔ اس کی حکمت کا تقاضا تو یقیناً یہ ہوگا کہ انھیں تباہ کر کے ایسے لوگوں کو یہاں بسائے جو اللہ تعالیٰ کے مقصدِ حق کو نہ صرف پورا کرنے والے ہوں بلکہ اسی کیلیے مرنا جینا حاصلِ زندگی سمجھتے ہوں۔ اور یہ بھی یقین رکھو کہ یہ محض مفروضہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ بے مقصد لوگوں کو ہلاک کردے، بلکہ اس کی صفتِ عدل وقسط کا تقاضا بھی ہے۔ اس نے آج تک تمہیں سنبھلنے کا موقع دیا لیکن اب شاید وہ وقت دور نہیں جب تمہیں مٹا کر ایسے لوگوں کو بسایا جائے گا جو اللہ تعالیٰ کے عدل وقسط کو ہر شعبۂ زندگی میں نافذ کریں گے اور اللہ تعالیٰ کی زمین پر اللہ تعالیٰ کے مقصدِ حق کا ظہور ہوگا۔ اور یہ بھی یاد رکھو کہ کسی قوم کو اس دھرتی پر ہلاک کردینا اور دوسری قوم کو اس کی جگہ بسا دینا اللہ تعالیٰ کیلیے کوئی مشکل نہیں، اس کی قدرتیں بے پناہ ہیں جہاں عجز نام کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا۔ اس کی مثالیں دیکھنی ہوں تو قومِ عاد، قومِ ثمود اور قومِ لوط کو دیکھ لیجیے جن کے کھنڈرات پر تمھارے تجارتی قافلے گزرتے ہیں۔

وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِيْعًا فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ۭ قَالُوْا لَوْ هَدٰىنَا اللّٰهُ لَهَدَيْنٰكُمْ ۭ سَوَاۗءٌ عَلَيْنَآ اَجَزِعْنَآ اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِيْصٍ ۝ۧ21

(اور (قیامت کے دن) اللہ تعالیٰ کے سامنے سب حاضر ہوں گے۔ تو کمزور لوگ، ان لوگوں سے جو بڑے بنے رہے، کہیں گے کہ ہم تو تمھارے تابع رہے ہیں تو کیا آج تم ہمیں بچا سکتے ہو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے۔ وہ جواب دیں گے، اگر اللہ تعالیٰ نے ہم کو ہدایت دی ہوتی تو ہم بھی تمہیں ہدایت کی راہ دکھاتے۔ اب ہمارے لیے یکساں ہے چیخیں، چلائیں یا صبر کریں، ہمارے لیے آج کوئی راہِ فرار نہیں۔) (سورۃ ابراھیم:۲۱)

ویسے تو ہر اجتماعیت کی یہ کمزوری ہے کہ کوشش کے باوجود بھی انسان طبقات کو ختم نہیں کرسکتا۔ اس لیے طبقۂ امراء اور طبقۂ غرباء اور آگے چلنے والوں اور پیروی کرنے والوں کے دو مستقل گروہ ہر جگہ موجود ہیں۔ لیکن قبائلی زندگی میں ان کا وجود ہمیشہ سے مستحکم رہا ہے۔ قبیلے کا سردار اور اس کے قرب وجوار کے لوگ ایک خاص امتیاز کے حامل ہوتے ہیں اور دوسرے لوگ ان کی پیروی کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

لیڈروں کا جواب

گزشتہ آیتِ کریمہ میں قریش کو وارننگ دی گئی کہ تم نے جس طرح اپنی خدائی کا صور پھونک رکھا ہے، تمہیں اندازہ نہیں کہ کسی وقت بھی تمھاری وجود ہی خطرے میں پڑسکتا ہے اور اس آیتِ کریمہ میں ان کے پندار پر مزید چوٹ لگاتے ہوئے فرمایا جارہا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی گرفت نے تمہیں دنیا میں مہلت دے رکھی تو یہ مت بھولو کہ قیامت کے دن تم بہرصورت اس کے سامنے جوابدہی کیلیے لائے جاؤ گے۔ وہاں تم میں بڑے بھی موجود ہوں گے اور چھوٹے بھی۔ آگے چلنے والے بھی اور پیروکار بھی۔ یہاں تو کسی چھوٹے کو بڑے کے گریبان میں ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہیں ہوتی لیکن وہاں وہ لوگ جن کو تم نے کمزور بنا کے رکھا وہ اپنے نام نہاد عظمت کے دعویداروں کو جب میدانِ حشر میں اپنے سامنے دیکھیں گے تو وہ ان سے برملا کہیں گے کہ دنیا میں ہم نے ہر طرح سے تمھاری فرمانبرداری کی اور تمھارے اشاروں پر چلتے رہے۔ حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کے عظیم پیغمبروں علیہم السلام کی بات تمھارے مقابلے میں سننے سے انکار کردیا۔ تم نے ہمیں حکم دیا کہ ان کا مذاق اڑاؤ، ہم نے مذاق اڑایا۔ تم نے ہم سے کہا، ان پر پتھر برساؤ، ہم نے پتھر برسائے۔ ایک سے ایک بڑھ کر کمینہ حرکت تمھارے حکم سے کی۔ آج اسی کی پاداش میں ہم سب پکڑے گئے ہیں۔ ہم پوچھنا یہ چاہتے ہیں کہ کیا تم ہمیں آج بچانے کیلیے کچھ کرو گے یا نہیں۔ کیا اللہ تعالیٰ کے عذاب سے چھوٹنے کی کوئی صورت ممکن ہے؟ تو وہ ان کے لیڈرانِ کرام جواب دیں گے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے ہمیں ہدایت دی ہوتی تو ہم بھی تمہیں ہدایت دے دیتے۔ ہم نے ہدایت سے آزاد زندگی گزاری اور کسی کی پرواہ نہ کی اور تم نے بھی یہی کچھ کیا، سو آج ہم تمھارے لیے کچھ نہیں کرسکتے۔ اب ہمارے لیے رونا دھونا یا صبر کرنا برابر ہے۔ اب تو یہ جہنم ہمارا مقدر ہے جہاں صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں اور نہ یہاں کوئی راہِ فرار اختیار کی جاسکتی ہے۔

Marfat.com

وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ
وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ ؕ وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ
سُلْطٰنٍ اِلَّاۤ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْۤا
اَنْفُسَكُمْ ؕ مَاۤ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَاۤ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ ؕ اِنِّيْ كَفَرْتُ
بِمَاۤ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ ؕ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ
اَلِيْمٌ ۝٢٢ وَاُدْخِلَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ
مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ؕ تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا
سَلٰمٌ ۝٢٣ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ
طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ۝٢٤ تُؤْتِيْۤ اُكُلَهَا كُلَّ
حِيْنٍۢ بِاِذْنِ رَبِّهَا ؕ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ
يَتَذَكَّرُوْنَ ۝٢٥ وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةِ ۟اجْتُثَّتْ
مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ ۝٢٦ يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَيُضِلُّ اللّٰهُ
الظّٰلِمِيْنَ ۙ۫ وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ۝٢٧ ع

رکوع: ۴۔ (جب معاملے کا فیصلہ ہو چکے گا شیطان بولے گا بیشک اللہ تعالیٰ نے جو تم سے وعدہ کیا تھا وہ وعدہ سچا تھا۔ اور میں نے بھی تم سے وعدہ کیا تھا، پس میں نے تم سے وعدہ خلافی کی۔ اور مجھے تم پر کوئی اختیار نہیں تھا، مگر یہ جو میں نے تم کو

Marfat.com

دعوت دی اور تم نے فوراً میری دعوت قبول کر لی۔ سو تم مجھے ملامت نہ کرو بلکہ اپنے آپ کو ملامت کرو۔ نہ میں تمھاری فریاد رسی کر سکتا ہوں اور نہ تم میری فریاد رسی کر سکتے ہو۔ تم نے جو مجھے شریک بنالیا تو میں نے اس کا پہلے سے ہی انکار کر دیا، بیشک ظالموں کیلیے دردناک عذاب ہے۔ اور داخل کیے جائیں گے وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنھوں نے بھلے کام کیے ایسے باغوں میں جن کے نیچے ندیاں رواں ہوں گی ان میں وہ اپنے رب کے حکم سے ہمیشہ رہیں گے۔ ان کی دعا اس جنت میں ایک دوسرے پر سلام ہوگی۔ کیا آپ نے غور نہیں کیا کہ کس طرح تمثیل بیان فرمائی ہے اللہ تعالیٰ نے کلمہ طیبہ کی۔ وہ ایک شجرہ طیبہ کے مانند ہے جس کی جڑ زمین میں اتری ہوئی ہے اور جس کی شاخیں فضاء میں پھیلی ہوئی ہیں۔ وہ اپنا پھل ہر فصل میں اپنے رب کے حکم سے دیتا ہے اور بیان فرماتا ہے اللہ تعالیٰ مثالیں لوگوں کیلیے تا کہ وہ یاددہانی حاصل کریں۔ اور مثال کلمہ خبیثہ کی ایسی ہے جیسے ایک ناپاک درخت، اسے اکھاڑ لیا جائے زمین کے اوپر سے اور اس سے کچھ بھی قرار نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ ثبات قدم عطا فرمائے گا ان لوگوں کو جو ایمان لائے اس پختہ قول کی برکت سے دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی۔ اور اللہ تعالیٰ اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والوں کے اعمال رائیگاں کر دے گا۔ اور اللہ تعالیٰ جو چاہے کرتا ہے۔)

وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ ؕ وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّاۤ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ مَاۤ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَاۤ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ ؕ اِنِّيْ كَفَرْتُ بِمَاۤ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ ؕ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۲۲﴾ (سورة ابراهيم : ۲۲)

(جب معاملے کا فیصلہ ہو چکے گا شیطان بولے گا بیشک اللہ تعالیٰ نے جو تم سے وعدہ کیا تھا وہ وعدہ سچا تھا۔ اور میں نے بھی تم سے وعدہ کیا تھا، پس میں نے تم سے وعدہ خلافی کی۔ اور مجھے تم پر کوئی اختیار نہیں تھا، مگر یہ جو میں نے تم کو دعوت دی اور تم نے فوراً میری دعوت قبول کر لی۔ سو تم مجھے ملامت نہ کرو بلکہ اپنے آپ کو ملامت کرو۔ نہ میں تمھاری فریاد رسی کر سکتا ہوں اور نہ تم میری فریاد رسی کر سکتے ہو۔ تم نے جو مجھے شریک بنالیا تو میں نے اس کا پہلے سے ہی انکار کر دیا، بیشک ظالموں کیلیے دردناک عذاب ہے۔)

محشر میں شیطان کا اعتراف

ہم گزشتہ آیتِ کریمہ میں پڑھ چکے ہیں کہ قیامت کے دن میدانِ حشر میں آئمۂ کفر اور ان کے متبعین کے درمیان جب فیصلہ ہو چکے گا اور وہ اپنے اپنے انجام کو پہنچ جائیں گے تو شیطان کو خیال ہوگا کہ یہ لوگ اپنے جھگڑے سے فارغ ہونے اور اپنے ہولناک انجام کو دیکھ لینے کے بعد یقیناً میری طرف متوجہ ہوں گے کیونکہ وہ یہ بات جانتے ہیں کہ بُرائی کا اصل سرچشمہ میں ہوں، میں ہی دلوں میں وسوسے ڈالتا ہوں اور میں ہر طبقۂ خیال کے لوگوں میں گمراہی اور سرکشی کے جذبات پیدا کرتا ہوں۔ بُرے سے بُرے اعمال اور نہایت الجھے ہوئے افکار کو میں ہی دلوں میں مزین کرتا ہوں اور میری ہی کوششوں سے یہ لوگ ایسے افکار و اعمال کو اپنے لیے سرمایہ سمجھنے لگتے ہیں۔ اب جب ان کے سامنے ایک ایک بات کھل جائے گی۔ تو وہ ہر طرف سے مایوس ہو کر میرے پاس آئیں گے کہ تم نے ہماری آخرت تباہ کی اور دنیا میں کوئی صحیح فیصلہ ہمیں نہ کرنے دیا، اب تم بتاؤ کہ ہم اس مصیبت سے کیسے نجات پائیں، کیا تم ہماری اس سلسلے میں کوئی مدد کر سکتے ہو یا نہیں۔ اس سے پہلے کہ لوگ آگے بڑھ کر اس سے کچھ کہیں وہ خود ہی ان سے مخاطب ہو کر کہے گا کہ میں تمھارے سامنے اعتراف کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ تم سے وعدے کیے تھے کہ قیامت آئے گی، اعمال کا حساب کتاب ہوگا، نیکی پر جزاء ملے گی، بُرائی پر سزا ہوگی، صاحب ایمان جنت میں جائیں گے اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانیوں پر جہنم جانا پڑے گا۔ تم نے دیکھ لیا کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا ہے۔ اسی طرح میں نے بھی تم سے کچھ بہکانے کیلیے وعدے کیے تھے، وہ سب جھوٹے تھے۔ سراسر اپنی طرف متوجہ کرنے کا ایک ذریعہ تھا۔ تم نے اپنی خواہشات نفس کی تسکین کے لیے

Marfat.com

میری بات کو قبول کرلیا اور زندگی میں ان راہوں پر چلتے رہے جو تمھاری خواہشاتِ نفس کو پورا کرنے والی تھیں۔اب جبکہ انجام اس کا سامنے آیا ہے تو تم اس پر چیخ رہے ہو حالانکہ جب میں نے اپنی بات تمھارے سامنے رکھی تھی اور میں نے تم سے غلط وعدے کئے تھے تو تمھیں اس وقت سوچنا چاہیے تھا، اب مجھے ملامت کرنے کا کیا فائدہ۔ملامت کا جواز جب پیدا ہوتا ہے جب میں نے تم پر زبردستی کی ہو۔میرے پاس نہ کوئی زور تھا نہ کوئی حکومت۔محض ایک دعوت تھی، ایک بلاوا تھا جسے تم نے خوشدلی سے قبول کیا۔اب ہم دونوں ہی اس کی پاداش میں پکڑے گئے ہیں۔ ایسی صورتحال میں نہ میں تمھاری فریادرسی کرسکتا ہوں نہ تم میرے لیے فریادرس بن سکتے ہو۔رہی یہ بات کہ تم نے بہت سارے معاملات میں مجھے اللہ تعالیٰ کا شریک بنا رکھا تھا کہ تم میرے احکام کی ایسے ہی پیروی کرتے تھے جیسے اللہ تعالیٰ کے احکام کی پیروی کی جاتی ہے حالانکہ میں نے پہلے دن اس سے انکار کردیا تھا اور میں آج بھی اللہ تعالیٰ کا شریک ہونے سے انکار کرتا ہوں۔تم محض اپنی حماقت سے میرے اٹھائے ہوئے فتنوں کا ایندھن بنتے رہے ہو اور اپنے ہوائے نفس کی پیروی میں ان راہوں پر چلتے رہے ہو جو میں نے تمھارے لیے کھولی تھیں تاکہ تم راہ راست سے دور نکل جاؤ۔اس لیے آج اپنی بداعمالیوں اور بدکرداریوں کا بوجھ مجھ پر مت ڈالو۔

حقیقت یہ ہے کہ شیطان اپنے جس جرم کا قیامت کے دن اعتراف کرے گا وہ کوئی نئی بات نہیں، یہ انسان کی سادگی ہے کہ وہ اس کے جرم کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا۔آج بھی اگر آپ بنظرِ غائر دیکھیں تو آپ کو جابجا شیطان کی یہی روش نظر آئے گی۔وہ ایک نکمے اور نکھٹو نوجوان کو رہزنی یا نقب زنی کے ذریعے راتوں رات امیر بننے کی ترغیب دیتا ہے اور ایسا اس کے سامنے نقشہ کھینچتا ہے کہ وہ اسے زندگی کا نصب العین بنالیتا ہے لیکن جب وہ اس جرم میں پکڑا جاتا ہے تو شیطان اس کی مدد تو کیا کرے گا، دور کھڑا ہو کر مسکراتا ہے۔اسی طرح وہ بڑے سے بڑے جرم کیلیے آدمی کے اندر رغبت پیدا کرتا ہے، اسے ایسے ایسے سبز باغ دکھاتا ہے کہ جرم کرنے والا اس کے تاریک پہلو کو کبھی دیکھنے کی کوشش ہی نہیں کرتا۔لیکن جب وہ تاریک پہلو ہولناک صورت میں اس کے سامنے آتا ہے تو وہ شیطان اور اس کے کارندوں کو گالیاں دیتا ہے لیکن شیطان خوش ہوتا ہے کہ میں نے وہ کام کیا جو مجھے کرنا چاہیے تھا۔

آیتِ کریمہ کے آخر میں فرمایا گیا ہے کہ جو لوگ بھی اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اس کی فرمانبرداری کا راستہ چھوڑ کر کفر، شرک اور معصیت کا راستہ اختیار کرتے ہیں، وہ درحقیقت اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں، اپنے معاشرے پر ظلم کرتے ہیں، اپنے ماحول پر ظلم کرتے ہیں۔ایسے لوگوں کیلیے اللہ تعالیٰ کے یہاں عذابِ الیم ہے کیونکہ وہ اسی کے مستحق ہیں۔

وَاُدْخِلَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۭ تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ﴿٢٣﴾　(سورۃ ابراهیم : ۲۳)

(اور داخل کئے جائیں گے وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنھوں نے بھلے کام کئے ایسے باغوں میں جن کے نیچے ندیاں رواں ہوں گی ان میں وہ اپنے رب کے حکم سے ہمیشہ رہیں گے۔ان کی دعا اس جنت میں ایک دوسرے پر سلام ہوگی۔)

مومن کا انجام

قرآن کریم نے اپنے اُسلوب کے مطابق پہلے کفار، مشرکین اور معصیت کاروں کا انجام بیان فرمایا۔اب ان لوگوں کا انجام بیان فرمایا جارہا ہے جنھوں نے دنیا میں ایمان اور عملِ صالح کا راستہ اختیار کیا۔وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اور آخرت پر ایمان لائے۔اور ہر اس بنیادی عقیدے کو مانا جسے ماننے کا اسلام حکم دیتا ہے۔اور پھر اللہ تعالیٰ کی کتاب اور رسول اللہ ﷺ کی سنت پر پوری طرح عمل کر کے دکھایا اور اپنی خواہشاتِ نفس کی پیروی کی بجائے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے حصول کو ہمیشہ اپنا مقصد جانا۔اور رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ گرامی کو اپنا آئیڈیل اور اپنا محبوب سمجھا اور دنیا کی ہزاروں ترغیبات کے باوجود کبھی اسلامی شریعت سے سرِ مو ہٹنا پسند نہ کیا۔ان کیلیے قیامت کے دن ایسے محلات ہوں گے جو باغوں میں گھرے ہوئے اور جن کے نیچے سے ندیاں بہتی ہوں گی۔اور جس کی خوش عیشی، خوش باشی اور سرسبزی کا تصور بھی اس دنیا میں ممکن نہیں۔وہاں وہ چند روز کیلیے نہیں جائیں گے بلکہ وہ

Marfat.com

ان کیلیے ہمیشہ ہمیشہ کی قیام گاہ ہوگی جہاں وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے شاہی مہمان کی طرح ٹھہریں گے اور وہاں ان تمام نعمتوں سے شادکام ہونے والے وہ تنہا نہیں ہوں گے بلکہ اور بھی بے شمار افراد ہوں گے لیکن حیرانی کی بات ہے کہ اتنی بڑی تعداد ہونے کے باوجود ہر ایک کے دل میں دوسروں کیلیے درازی عمر اور سلامتی کی دعائیں ہوں گی۔ جب وہ بھی ایک دوسرے کو دیکھیں گے تو بے ساختہ ایک دوسرے کی سلامتی کیلیے اللہ تعالیٰ سے درخواست گزار ہوں گے۔

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِى السَّمَآءِ ﴿٢٤﴾ تُؤْتِىٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ بِاِذْنِ رَبِّهَا ؕ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿٢٥﴾ وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةِ ۨاجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ ﴿٢٦﴾ (سورۃ ابراھیم : ۲۴.۲۵.۲۶)

(کیا آپ نے غور نہیں کیا کہ کس طرح تمثیل بیان فرمائی ہے اللہ تعالیٰ نے کلمہ طیبہ کی۔ وہ ایک شجرہ طیبہ کے مانند ہے جس کی جڑ زمین میں اتری ہوئی ہے اور جس کی شاخیں فضا میں پھیلی ہوئی ہیں۔ وہ اپنا پھل ہر فصل میں اپنے رب کے حکم سے دیتا ہے اور بیان فرماتا ہے اللہ تعالیٰ مثالیں لوگوں کیلیے تا کہ وہ یاددہانی حاصل کریں۔ اور مثال کلمۂ خبیثہ کی ایسی ہے جیسے ایک ناپاک درخت، اسے اکھاڑ لیا جائے زمین کے اوپر سے اور اس سے کچھ بھی قرار نہ ہو۔)

اس آیتِ کریمہ میں نہایت محکم انداز میں انسانی ہدایت کیلیے چند بنیادی باتیں ارشاد فرمائی گئی ہیں۔ ہم ان باتوں کو ایک ترتیب سے عرض کرتے ہیں۔

کلمہ طیبہ کی وضاحت

1- کلمہ طیبہ کیا ہے؟ نبی کریم ﷺ نے لا الہ الا اللہ کو کبھی کلمہ طیبہ سے یاد فرمایا ہے اور کبھی اسے الکلمۃ الجامعۃ کہا ہے۔ یعنی وہ کلمہ جسے پڑھ کر آدمی دائرۂ اسلام میں داخل ہوتا ہے، جو ایمان کی بنیاد اور ایمان کی علامت ہے۔ آپ نے اسی کلمہ کے بارے میں مختلف باتیں ارشاد فرمائیں۔ قبائل کے سامنے دعوتِ اسلام پیش کرتے ہوئے اسی کلمے کو پیش فرمایا اور یہ کہا کہ اگر تم اسے قبول کرلو فَهُوَ حَظُّكُمْ فِى الدُّنْيَا وَفِى الْاٰخِرَةِ تو یہی تمھاری دنیوی قسمت ہے اور یہی اخروی۔ یعنی اسی کلمے کی بدولت تمہیں دنیا میں عزت حاصل ہوگی اور اسی کی بدولت آخرت میں سرخروئی نصیب ہوگی۔ بعض دوسرے مواقع پر لوگوں کو دعوتِ اسلام دیتے ہوئے فرمایا کہ اگر تم یہ کلمہ مجھے قبول کر کے دے دو تو اسی سے تم عربوں کے مالک بن جاؤ گے اور اسی سے عجم تمھارے سامنے جھک جائیں گے۔ یعنی عرب و عجم کی حکمرانی تمھارے قدموں میں ہوگی، اگر تم نے اس کلمے کا حق ادا کر دیا۔ اسی کو کلمۂ توحید بھی کہا جاتا ہے۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ اس کلمے سے مراد تو لا الہ الا اللہ ہے یعنی یہ بنیادی عقیدہ کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اِلٰہ نہیں کہ جس کے سامنے سر جھکایا جا سکے۔ جس سے علی الاطلاق مرادیں مانگی جا سکیں جس کی محبت اور نفرت انسانی تعلقات کا حوالہ ہو، جس کی غیر مشروط اطاعت واجب ہو، جو حاکمیت مطلقہ کا حق رکھتا ہو، جس کے مقابلے میں کسی کو قانون سازی کا حق نہ ہو۔ یہ وہ بنیادی تصورات ہیں جو اس کلمے کی صفات ہیں یا اس کے بنیادی اجزاء۔

2- اس کلمہ کی جلالتِ قدر اور تاثیر کلی میں کوئی شبہ نہیں، لیکن اس کے ساتھ شرط یہ ہے کہ اس کلمہ کو شجرۂ طیبہ کی حیثیت حاصل ہے۔ شجرۂ طیبہ کی دو صفات ہیں۔ اس کی جڑیں پاتال میں اتری ہوئی ہوتی ہیں اور اس کی شاخیں فضائے آسمانی میں لہراتی ہیں۔ وہ زمین سے بھی غذا لیتا ہے اور آسمان سے بھی۔ نظریاتِ فاسدہ کا کوئی طوفان اس کی جڑیں نہیں ہلا سکتا۔ اور خواہشات کا کوئی ہیجان اس کی بلندیوں پر غالب نہیں آ سکتا۔ یہ کلمہ ایک مومن کے دل کی آواز ہے، اس کے دل کی دھڑکن ہے اور اس کے جسم کی روح ہے۔ حضرت بلال ؓ کی طرح اگر کوئی دشمنِ حق کسی مومن کے سینے پر سِل رکھ کر اس کلمے کو اس کے سینے سے نکال نہیں سکتا۔ جیسے جیسے اسے اذیت دی جائے گی اس سے نکلنے والی آواز اللہ تعالیٰ احد کے سوا کچھ نہیں ہوگی۔ حضرت عمر ؓ کی بہن کی طرح عمرؓ جیسے پُر ہیبت آدمی کے سامنے کسی کمزوری کے اظہار کی بجائے یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتی کہ:

Marfat.com

بہن بولی عمرؓ ہم کو اگر تو مار بھی ڈالے
شکنجوں میں کسے یا بوٹیاں کتوں سے نچوالے
مگر اس دین حق سے ہم تو ہرگز پھر نہیں سکتے
بلندی معرفت کی مل گئی ہے گر نہیں سکتے

جب یہ کلمہ دل میں اتر جاتا ہے تو سمجھئے کہ ایک شجرۂ طیبہ ہے جو زمین کی پاتال میں اتر گیا۔ اب عقل اور فطرت سے اس کا رشتہ قائم ہو گیا۔ وہ برابر ان سے غذا بھی حاصل کرتا ہے اور ان میں پختگی کا باعث بھی بنتا ہے۔

3- شجرۂ طیبہ کی مانند اس کی اڑان اور اس کی پرواز وسعت آسمانی تک ہوتی ہے۔ آسمان سے برابر ترشحات نازل ہوتے ہیں۔ قدرت کا فیضان اس کے اندر وہ سوز و گداز پیدا کرتا ہے جسے خشیتِ الٰہی اپنا مسکن بنا لیتی ہے۔ فلسفے کی اڑان گھائیاں اور شیطنت کی کہانت سامانیاں اس پر اثر انداز ہونے سے قاصر ہو جاتی ہیں۔

4- شجرۂ طیبہ کی مانند اس کا سایہ گھٹنے میں نہیں آتا، اس کے پھلوں کی مٹھاس کبھی بگڑنے نہیں پاتی، اس کے پھلوں کا رسیلا پن کبھی گدلا نہیں ہونے پاتا، اس پر کبھی خزاں اثر انداز نہیں ہوتی، اس کے اثرات اور اس کے نتائج ابدی اور دائمی ہیں جس پر طبائع کے موسم بھی اثر نہیں ڈال سکتے۔

یہ نغمہ فصل گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں لا الہ الا اللہ

گوشت پوست کا انسان اسی کلمۂ طیبہ سے پہاڑوں جیسا استقلال سیکھتا ہے۔ اس کی اشکِ سحر گاہی سے عبادت میں نور پیدا ہوتا ہے، شیطانی قوتوں کے مقابلے میں اس کا ذکر شمشیر برہنہ بن کے ابھرتا ہے جو باطل کی قوتوں کو تار تار کر کے رکھ دیتا ہے۔ چنانچہ یہی وہ کلمۂ طیبہ آنحضرت ﷺ لے کر آئے اور چند ہی سالوں میں جاہلیت کی دھوپ کے جلے ہوئے لوگ اس کے گھنے سائے میں پناہ لینے لگے۔ دکھوں کے ستائے ہوئے لوگوں کو اسی کلمۂ طیبہ کے حامل دلوں نے آسودگی مہیا کی، اسی کا فیضانِ رحمت دیکھتے ہی دیکھتے جزیرۂ عرب پر گھنگھور گھٹا کی طرح چھا گیا، انسانیت کے مقدر کی وہ سحر طلوع ہوئی جس کی امید میں انسانیت نے صدیاں گزاری تھیں۔ جب تک مسلمان کا اصل سرمایہ یہی کلمہ طیبہ رہا تو وہ باطل کے مقابلے میں سب سے بڑی قوت اور دکھوں کے مقابلے میں سب سے بڑی رحمت تھا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی وہ سب سے بڑی نعمت ہے جو کل بھی انسان کی ضرورت تھی اور آج بھی انسان کی ضرورت ہے۔

نثار سیدِ کونینؐ پر مرے ماں باپ
سبق دیا بھی تو کیا لا الہ الا اللہ

کلمۂ خبیثہ کی وضاحت

اس کے مقابلے میں وہ کلمۂ خبیثہ جس کے پھل کفر، شرک اور ان پر مبنی عقائد و نظریات ہیں۔ اس کی مثال اس شجرۂ خبیثہ کی طرح ہے جس میں نہ پھول ہے، نہ پھل، نہ سایہ نہ غذا۔ ہاتھ لگایئے تو اس کے کانٹے ہاتھوں کو زخمی کرتے ہیں اور چکھئے تو زبان زہر آلود ہو جائے۔ اس کے قرب سے وہ بو اٹھے جس سے قوتِ شامہ ماؤف ہو کر رہ جائے۔ ایسے کلمات مختلف ادوار میں سر اٹھاتے رہے، ایسے جھاڑ جھنکار نہ جانے کتنی دفعہ انسانیت کی منزل کھوٹی کر چکے۔ تاریخ میں ان کے بے شمار نام ہیں، لیکن آج انھیں کی ترقی یافتہ شکل ہے جو انسانیت کیلئے سب سے زیادہ مہلک ثابت ہو رہی ہے، لیکن پراپیگنڈا اور ذرائع ابلاغ کا طلسم ایک ایسی مصیبت ہے جس نے ذہنوں کو پراگندہ بھی کیا ہے اور ماؤف بھی۔ لیکن ان سے پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جس طرح مزدکیت اپنی موت مرگئی اسی طرح اشتمالیت اور اشتراکیت بھی دم توڑتی جا رہی ہے اور جس طرح ساہوکاری نظام گالی بن چکا ہے اسی طرح سرمایہ دارانہ نظام بھی اپنی جگہ چھوڑتا نظر آتا ہے کیونکہ یہ وہ شجراتِ خبیثہ ہیں جنھوں نے زمین کے اوپر ایک ہنگامہ مچا رکھا ہے لیکن ان کی جڑیں گہری نہیں۔

Marfat.com

انتظار اس کا ہے کہ کب ان کو اکھاڑنے والے ہاتھ تیار ہوتے ہیں، کب وہ نسل اٹھتی ہے جو کلمۂ طیبہ کے سوز سے بہرہ ور ہو کر انسانوں کی بھلائی کیلیے ان کو جڑ سے اکھاڑنے کیلیے اٹھے گی۔ اس وقت دنیا کو معلوم ہو جائے گا کہ اس سراب کی فی الحقیقت کوئی حقیقت نہ تھی اور یہ درختوں کا رس چوسنے والی وہ خوبصورت آکاس بیل تھی جس کی زمین پر کوئی جڑ نہ تھی۔

یُثَبِّتُ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ ۚ وَیُضِلُّ اللّٰہُ الظّٰلِمِیْنَ ۙ وَیَفْعَلُ اللّٰہُ مَا یَشَآءُ ﴿۲۷﴾ (سورۃ ابراھیم : ۲۷)

(اللہ تعالیٰ ثباتِ قدم عطا فرمائے گا ان لوگوں کو جو ایمان لائے اس پختہ قول کی برکت سے دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی۔ اور اللہ تعالیٰ اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والوں کے اعمال رائیگاں کر دے گا۔ اور اللہ تعالیٰ جو چاہے کرتا ہے۔)

کلمہ طیبہ مومن کیلیے ثباتِ قدم کا باعث ہے

مذکورہ بالا آیات میں جس کلمۂ طیبہ کا ذکر ہوا ہے وہی کلمہ ہے جو ایک مومن کے ایمان کا ذریعہ اور اس کی سیرتِ صالح کا ضامن ہے۔ اللہ تعالیٰ اسی کی برکت سے ہر مومن کو ثبات و استقامت بخشتا ہے۔ اس پر یقین و ایمان جس درجے کا ہوگا اسی درجے کی نصرت و اعانت آزمائشوں میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے میسر آئے گی۔ جس خوش نصیب کو اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات کا استحضار نصیب ہو جاتا ہے، شیطان کا کوئی پھندا اس پر کارگر نہیں ہوتا۔ اور نبی کریم ﷺ کی سنت اس کے ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پاتی۔ حتیٰ کہ قبر اور حشر میں بھی اللہ تعالیٰ کی توفیق دستگیری فرمائے گی۔ قبر ایک مومن کیلیے پہلا مرحلہ ہے اور نہایت نازک مرحلہ ہے۔ چنانچہ وہاں بھی اللہ تعالیٰ کی توفیق ہی ایک مومن کے کام آئے گی اور حدیث شریف میں اسی آیت کے حوالے سے اسے بیان فرمایا گیا ہے۔ حضرت براء بن عازب سے مروی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا المسلم اذا سئل فی القبر یشھدان لا الہ الا اللہ و ان محمدا رسول اللہ فذلک قول اللہ تعالی یثبت اللہ الذین امنوا لایۃ یعنی قبر میں جب ایک مسلمان سے اس کے رب اور اس کے رسول اور اس کے دین کے متعلق سوال کیا جائے گا تو وہ جواب میں کہے گا اشھدان لاالہ الا اللہ و ان محمدا رسول اللہ اور یہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں فرمایا یثبت اللہ الذین امنو الایۃ اور حضرت عثمانؓ سے مروی ہے قال کان النبی صل اللہ علیہ وسلم اذا فرغ من دفن المیت وقف علیہ فقال استغفروا لاخیکم ثم سلوالہ التثبت فانہ الآن یسئال یعنی حضور ﷺ کا یہ معمول تھا کہ جب میت کو دفن کرنے سے فارغ ہوتے تو اس کے قریب کھڑے ہو جاتے اور سب کو فرماتے، اپنے بھائی کیلیے استغفار کرو اور اس کیلیے ثابت قدمی کی دعا مانگو کیونکہ اب اس سے پوچھا جا رہا ہے۔ حضرت سہل بن عمار فرماتے ہیں کہ میں نے یزید بن ہارون کو ان کی وفات کے بعد خواب میں دیکھا۔ میں نے پوچھا سنایئے اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ انھوں نے کہا قبر میں میرے پاس دو بڑے خوفناک اور سخت فرشتے آئے اور مجھ سے دریافت کیا مادینک و من ربک و من نبیک تیرا دین کیا ہے، تیرا رب کون ہے اور تیرا نبی کون ہے؟ فاخذت بلحیتی البیضاء وقلت المثلی یقال ھذا وقد علمت الناس جوابکما ثمانین سنۃ میں نے اپنی سفید داڑھی کو پکڑ کر کہا کیا میرے جیسے شخص سے تم اس قسم کے سوالات پوچھتے ہو۔ ۸۰ سال تک لوگوں کو تمہارے انھیں سوالات کے جوابات پڑھاتا رہا ہوں۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ جن دلوں میں کلمہ طیبہ اتر چکا ہے اللہ تعالیٰ کس طرح اس کلمہ طیبہ کے ذریعے قبر میں بھی انھیں ثابت قدمی عطا فرماتا ہے اور اسی طرح آخرت میں بھی اسی کلمے کی برکت سے ثباتِ قدم اور استقامت عطا فرمائے گا۔

Marfat.com

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ

اللّٰهِ كُفْرًا وَّ اَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ﴿۲۸﴾ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلَوْنَهَا ؕ وَبِئْسَ
الْقَرَارُ ﴿۲۹﴾ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا لِّيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ ؕ قُلْ تَمَتَّعُوْا
فَاِنَّ مَصِيْرَكُمْ اِلَى النَّارِ ﴿۳۰﴾ قُلْ لِّعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقِيْمُوا
الصَّلٰوةَ وَيُنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً مِّنْ قَبْلِ اَنْ
يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خِلٰلٌ ﴿۳۱﴾ اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ
وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ ﴿۳۲﴾ وَ
سَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ﴿۳۳﴾ ۚ
وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ؕ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ
اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ ﴿۳۴﴾ ع

رکوع: ۵۔ (کیا آپ نے ان لوگوں کی حالت پر غور نہیں کیا جنھوں نے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو کفر سے بدل دیا اور اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر یعنی جہنم میں لا اتارا، جس میں وہ داخل ہوں گے اور وہ بہت بُرا ٹھکانہ ہے اور انھوں نے اللہ تعالیٰ کے شریک ٹھہرائے تا کہ اس کے راستہ سے لوگوں کو گمراہ کر کے ہٹائیں۔ آپؐ کہہ دیجئے چند دن لطف اٹھا لو، بالآخر تمھاری ٹھکانہ جہنم ہے۔ آپؐ فرما دیجئے میرے ان بندوں کو جو ایمان لائے ہیں کہ وہ نماز کا اہتمام رکھیں۔ اور جو کچھ ہم نے ان کو عطا کیا ہے اس میں سے پوشیدہ اور علانیہ خرچ کریں۔ اس سے پیشتر کہ وہ دن آ جائے جس میں نہ خرید و فروخت ہوگی اور نہ دوستی کام آئے گی۔ اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، اور بلندی سے پانی اتارا، پھر نکالے اس پانی سے تمھارے رزق کیلیے مختلف قسم کے پھل۔ اور اس نے مسخر کر دیا تمھارے لیے کشتی کو تا کہ وہ سمندر میں اس کے

Marfat.com

حکم سے چلے اور تابع فرمان بنا دیا تمھارے لیے دریاؤں کو اور سورج اور چاند کو تمھاری نفع رسانی میں لگا دیا۔ دونوں ایک ہی انداز پر گردش میں ہیں اور مسخر کر دیا تمھارے لیے رات اور دن اور تمہیں اس نے ہر اس چیز سے عطا فرمایا جس کا تم نے اس سے سوال کیا اور اگر تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو گننا چاہو تو اس کو شمار نہ کر پاؤ۔ بیشک انسان بڑا ہی حق تلف، از حد ناشکرا ہے۔)

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ﴿۲۸﴾ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلَوْنَهَا ۭ وَبِئْسَ الْقَرَارُ ﴿۲۹﴾ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا لِّيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ ۭ قُلْ تَمَتَّعُوْا فَاِنَّ مَصِيْرَكُمْ اِلَى النَّارِ ﴿۳۰﴾

(کیا آپ نے ان لوگوں کی حالت پر غور نہیں کیا جنھوں نے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو کفر سے بدل دیا اور اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر یعنی جہنم میں لا اتارا، جس میں وہ داخل ہوں گے اور وہ بہت بُرا ٹھکانہ ہے اور انھوں نے اللہ تعالیٰ کے شریک ٹھہرائے تا کہ اس کے راستہ سے لوگوں کو گمراہ کر کے ہٹائیں۔ آپؐ کہہ دیجئے چند دن لطف اٹھا لو، بالآخر تمھاری ٹھکانہ جہنم ہے۔) (سورۃ ابراھیم: ۲۸۔۲۹۔۳۰)

اَلَمْ تَرَ کا مخاطب اور قریش کو تنبیہ

اس آیتِ کریمہ کے آغاز میں ہر اس شخص سے خطاب ہے جو حق و باطل کی اس کشمکش کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ ایک طرف آنحضرت ﷺ کی ذاتِ گرامی اور مسلمان ہیں، دوسری طرف قریش اور مکے کے عام لوگ۔ ان میں سے ہر ایک فرد کو متوجہ کر کے کہا جا رہا ہے کہ ذرا ان قریش کے طور اطوار کو دیکھو، یہ خود کو بہت سمجھدار سمجھتے ہیں اور ان کی نخوت اور تکبر کسی دوسرے کو قبول کرنے کیلیے تیار نہیں۔ بایں ہمہ حال ان کا یہ ہے کہ ان کے اس حال پر جتنا بھی تعجب کیا جائے کم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں اس سرزمین مکہ میں کیسی کیسی نعمتیں عطا فرمائیں اور پھر ان ہی میں سے آخری پیغمبر کو اٹھایا جو ان کے پاس ایک ایسا کلمہ طیبہ لے کے آئے جس میں ان کیلیے دل و دماغ کی بالیدگی بھی ہے، احساسات کی آسودگی بھی ہے، اخلاق کی توانائی بھی ہے، معاملات کی پاکیزگی بھی ہے، ایک دوسرے سے ہمدردی و خیر خواہی بھی ہے، اللہ تعالیٰ کی خشیت اور اس کا احساسِ بندگی بھی ہے اور جس کے نتیجے میں تمام دنیا پر اثر و نفوذ کے امکانات بھی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت کے وعدے بھی ہیں اور دنیا و آخرت میں استقامت اور استقلال کے نشانات بھی ہیں۔ ایک نئی زندگی ہے جس پر اللہ تعالیٰ کی رحمت کا سایہ ہے۔ لیکن ان بدنصیبوں نے اس نعمت عظمیٰ کی قدر کرنے کی بجائے اسے کفرانِ نعمت سے بدل ڈالا۔ قدم قدم پر اللہ تعالیٰ کی ناشکری کی، آنحضرت ﷺ کی دعوت کا راستہ روکا، مسلمانوں کو اذیتیں پہنچائیں اور اپنی قوم کو ایک ایسے راستے پر لے چلے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں دارالبوار یعنی ہلاکت کے گھر میں جا اتارا۔ اللہ تعالیٰ کے نبیؐ نے انھیں دنیوی اور اخروی کامیابیوں کے نہ صرف مژدے سنائے بلکہ خلافتِ ارضی کا انھیں مستحق بنایا اور جنت کی نعمتوں کا انھیں وارث ٹھہرایا۔ لیکن ان بدبختوں نے اللہ تعالیٰ کی یکتائی کو شرک سے ملوث کر ڈالا۔ اس کی وحدانیت کے مقابلے میں کئی کئی ہمسر لا کھڑے کیے۔ اور اس طرح سے ان کیلیے گمراہی اور بربادی کا ایک ایسا راستہ کھولا جس میں نہ فطرت کی آواز شامل ہے نہ عقل و دانش کی تائید۔ انسانیت کی اکائی کو نہ جانے کہاں کہاں تقسیم کر ڈالا۔ اپنے جیسی مخلوقات کو انسانوں کا معبود ٹھہرا کر انسان کی ایسی تذلیل کی کہ نہ اس کے اندر بلند عزمی باقی رہی اور نہ منزل کا شعور باقی رہا۔

قُلْ لِّعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خِلٰلٌ ﴿۳۱﴾ (سورۃ ابراھیم: ۳۱)

(آپ فرما دیجئے میرے ان بندوں کو جو ایمان لائے ہیں کہ وہ نماز کا اہتمام رکھیں۔ اور جو کچھ ہم نے ان کو عطا کیا ہے اس میں سے پوشیدہ اور علانیہ خرچ کریں۔ اس سے پیشتر کہ وہ دن آ جائے جس میں نہ خرید و فروخت ہوگی اور نہ دوستی کام آئے گی۔)

Marfat.com

مسلمانوں کو پیغام

قریش کو تنبیہ اور انذار کے بعد مسلمانوں کو نصیحت کی جارہی ہے اور بالواسطہ یہ بتانا مقصود ہے کہ قریش کے دن گنے جاچکے ہیں، یہ گرتی ہوئی دیوار کے نیچے بیٹھے ہیں جو کسی وقت بھی ان کو لے بیٹھے گی۔ مستقبل کے امین مسلمان ہیں۔ اس دھرتی کا اصل نمک یہی ہیں۔ مستقبل کا بوجھ اٹھانا ہے اور اسلام کا ہراول دستہ بن کر دنیا کو اسلام کی روشنی سے بہرہ ور کرنا ہے، تو انھیں اس بات کا احساس ہونا چاہیے کہ ان کے اندر معمولی کمزوری بھی تاریخ میں حوادث کا شگاف کھول دے گی، چونکہ آئندہ نسلوں کا دارومدار انھی پر ہے اس لیے وہ اپنا اچھی طرح جائزہ لیں کہ ان میں ایمان وعمل اور سیرت وکردار کا کوئی سقم باقی نھیں رہنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ سے ان کے تعلق کی استواری اور پائیداری کیلیے نماز کا اہتمام بے حد ضروری ہے۔ یہی وہ عبادت ہے جو بندے اور معبود میں حقیقی تعلق پیدا کرتی ہے۔ انسان کو اپنی حقیقت سے بھی آشنا کرتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی کبریائی سے بھی بہرہ ور رکھتی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے تعلق کے باعث وہ کسی کے سامنے جھکنا گوارا نھیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ سے ربط وضبط مضبوط ہونے کے باعث وہ کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نھیں کرتا۔ وہ حق اور اپنے جیسوں کے سامنے ایک عاجز بندہ ہوتا ہے، لیکن باطل اور اہلِ کفر کے سامنے ایک طوفان ہے جس کو روکا نھیں جاسکتا۔ ایک فولاد ہے جس کو نگلا نھیں جاسکتا۔ اس کی شخصیت دلآویز ہونے کے باوجود اپنے اندر وہ استقامت، وہ استقلال اور وہ عظمت رکھتی ہے جس کے سامنے بڑی سے بڑی بلندی ہیچ ہوجاتی ہے۔

دوسرا حکم دیا کہ مسلمان انفاق فی سبیل اللہ تعالیٰ کو زندگی کا ایک لازمی سامان سمجھیں۔ بظاہر مال ودولت انسانی ضرورتوں کا ضامن ہے لیکن حقیقت میں حق وباطل کی سربلندی جس طرح ایمان کا مطالبہ کرتی ہے اسی طرح انفاق کا مطالبہ بھی کرتی ہے۔ حق وباطل کی کشمکش میں افراد جانیں دے سکتے ہیں لیکن اسلحۂ جنگ مہیا نھیں کرسکتے۔ دفاع کیلیے قلعے وجود میں نھیں آسکتے تاوقتیکہ صاحبِ ایمان لوگوں کے دل انفاق کیلیے کھلے نہ ہوں۔ جذبۂ ایمان اور جذبۂ انفاق دونوں مل کر ایک ایسی قوت بنتے ہیں جس سے اسلام کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے راستے میں انفاق وہ معتبر ہے جس کے پیچھے اخلاص کی قوت ہو۔ اگر اخلاص کا مطالبہ یہ ہو کہ اسے سرًا دیا جائے تو اس پر عمل ضروری ہے۔ اور اگر مطالبہ یہ ہو کہ دوسروں کی ترغیب کیلیے علانیۃً دیا جائے تو پھر سب کے سامنے دینا اخلاص کی دلیل ہے۔

آیت کے آخر میں فرمایا کہ نماز کا اہتمام اور انفاق فی سبیل اللہ تعالیٰ کو یہ نہ سمجھو کہ یہ اسلامی انقلاب کی ضرورت ہے اور تمھاری طاقت کا راز اس میں ہے بلکہ عنداللہ تعالیٰ قیامت کے دن یہی توشۂ آخرت بھی ہے، جس دن کمائی کے تمام ذرائع ختم ہوجائیں گے، نہ کوئی کاروبار کام آئے گا اور نہ کوئی دوستی کام آئے گی اس دن یہی نماز اور یہی انفاق سرخروئی کا کام دیں گے اور جنت میں بلندیٔ درجات کا باعث ہوں گے۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِیَ فِی الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ ﴿۳۲﴾ وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآىِٕبَیْنِ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ ﴿۳۳﴾ وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ؕ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ ﴿۳۴﴾

(اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، اور بلندی سے پانی اتارا، پھر نکالے اس پانی سے تمھارے رزق کیلیے مختلف قسم کے پھل۔ اور اس نے مسخر کردیا تمھارے لیے کشتی کو تاکہ وہ سمندر میں اس کے حکم سے چلے اور تابع فرمان بنادیا تمھارے لیے دریاؤں کو اور سورج اور چاند کو تمھاری نفع رسانی میں لگادیا۔ دونوں ایک ہی انداز پر گردش میں ہیں اور مسخر کردیا تمھارے لیے رات اور دن اور تمھیں اس نے ہر اس چیز سے عطا فرمایا جس کا تم نے اس سے سوال کیا اور اگر تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو گننا چاہو تو اس کو شمار نہ کرپاؤ۔ بیشک انسان بڑا ہی حق تلف، از حد ناشکرا ہے۔) (سورۃ ابراھیم: ۳۲-۳۳-۳۴)

Marfat.com

انسانوں پر مزید احسانات

انسانی زندگی میں صحیح فیصلے کا دارومدار صرف اس بات میں ہے کہ آدمی اس کائنات میں اپنی حیثیت کا کیا تعین کرتا ہے، کائنات کے خالق و مالک کو کیا حیثیت دیتا ہے اور کس کی کبریائی کا حق تسلیم کرتا ہے اور کسے اس قابل سمجھتا ہے کہ علی الاطلاق قانون سازی کا حق کس کو ہے۔ جو شخص یہ سارے حقوق اللہ تعالیٰ کیلیے تسلیم کرلیتا ہے تو وہ صراطِ مستقیم کا مسافر بن جاتا ہے اور اس کی زندگی صحیح رخ اختیار کر لیتی ہے۔ لیکن جو شخص اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ نعمتوں سے متمتع ہوتا ہے۔ لیکن اس کی ملکیت، اس کے حقوق اور اس کی کبریائی کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہوتا بلکہ مختلف شرکاء کو مختلف نعمتوں پر تصرف کا حق دے دیتا ہے اور ان کے بہت سارے اختیارات کو جو در حقیقت اللہ تعالیٰ کے اختیارات ہیں ان کے ساتھ خاص کر دیتا ہے۔ اس طرح سے کائنات کی حاکمیت میں ایک ثنویت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کی حاکمیت میں اور حکمرانوں کا جواز پیدا ہو جاتا ہے۔ اور ایک ایسی صورتحال جنم لیتی ہے جو کسی معمولی ادارے میں بھی قابلِ قبول نہیں، چہ جائیکہ اللہ تعالیٰ اور اس کی کائنات اور اس کی مخلوقات کے بارے میں قابلِ قبول ہو۔ چنانچہ اس اہم ترین نکتہ کو واضح کرنے کیلیے اور قریش کی گمراہیوں کی بنیاد کو غلط ثابت کرنے کیلیے نہایت سادہ انداز میں پروردگار نے ان حقائق کو واشگاف بھی فرمایا اور نہایت پیار سے اپنی نعمتوں کا تذکرہ بھی کیا۔ ارشاد فرمایا، ذرا غور کرو تمھاری زندگی کیلیے اللہ تعالیٰ نے ایک گھر بنایا ہے جس میں زمین کا بچھونا بچھایا اور آسمان کی چھت تانی، پھر تمھاری غذا کی بہم رسانی کیلیے زمین کو قوتِ روئیدگی سے مالا مال کر دیا اور آسمان سے آبیاری کیلیے پانی اتارا، پھر پانی کو سیلانی اور بہاؤ بخشا تاکہ وہ آبیاری بھی کرے، پیاس بھی بجھائے، کپڑے دھونے کا کام بھی دے اور ندی نالوں کو بھی سیراب رکھے، پھر اسی زمین کی قوتِ روئیدگی سے کام لے کر اللہ تعالیٰ نے مختلف قسم کے تمھارے لیے پھل پیدا کیے۔ زمین پر مختلف قسم کے غلے اگائے اور تفکہ کیلیے مختلف قسم کے پھل پیدا فرمائے، سبزیوں کیلیے زمین پر بیلیں پھیلا دیں، مزید ضرورتوں کیلیے دریاؤں کی روانی انسانوں کے ہاتھ میں دے دی۔ تم لکڑی کے چند تختوں کو جوڑ کر دریا میں اتارتے ہو اور دریا کا پانی اپنی تمام تر طاقتوں کے باوجود تختے کا بوجھ اٹھانے سے انکار نہیں کرتا۔ پھر زندگی کی یکسانی کو رنگا رنگی میں تبدیل کرنے کیلیے شب و روز کا سلسلہ چلایا۔ سورج کی کرنیں دن کی ہمہمی اور سرگرمی کا باعث بنتی ہیں اور رات کو چاندنی کی حلاوت سکون کا سبب بنتی ہے۔ سورج کی گرمی زندگی کے تنور کو روشن رکھتی ہے۔ اور چاند کا نور اور حُسن دلوں کو ارمانوں سے معمور کر دیتا ہے اور ان دونوں کو اس طرح بندوں کی نفع رسانی کیلیے انسانوں کی خدمت پہ لگا رکھا ہے۔ صرف اتنی سی بات کیلیے کہ انسان کی غذا کا سامان ہونا چاہیے کتنے مظاہرِ قدرت ہیں جو شب و روز اس کام میں لگے ہوئے ہیں۔

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک درکار اند

تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری

(بادل، ہوا، چاند، سورج اور آسمان خدمت میں لگے ہوئے ہیں تاکہ تیری غذا تیرے ہاتھ میں آئے اور تو غفلت سے نہ کھائے۔)

مختصر یہ کہ انسانوں نے اللہ تعالیٰ سے اپنی ضرورتوں کیلیے جو کچھ مانگا اس نے عطا فرمایا اور مزید بھی اس قدر نعمتیں عطا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر تم میری نعمتوں کو گننا چاہو تو کبھی شمار نہ کر سکو گے۔ لیکن کس قدر دکھ کی بات ہے کہ انسان ایک سے ایک نعمت سے فائدہ اٹھاتا ہے لیکن نہ دوسروں کے حقوق پر دست درازی سے دریغ کرتا ہے اور نہ اللہ تعالیٰ کی ناشکری اور کفران سے باز آتا ہے اور یہی وہ طرزِ فکر اور طرزِ عمل ہے جس نے اس کو ایمان کی دولت سے محروم رکھا، حُسنِ عمل سے بیگانہ کر دیا اور اپنے مالک اور کائنات کے بارے میں ایسے غلط فیصلے کیے جنھوں نے زمین کو فساد سے بھر دیا اور انسان کی منزل کھوٹی کر دی۔

Marfat.com

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا
الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ﴿٣٥﴾ رَبِّ اِنَّهُنَّ
اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ ۚ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ
عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٣٦﴾ رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ
بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ
فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ
الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ ﴿٣٧﴾ رَبَّنَآ اِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِيْ وَمَا نُعْلِنُ ۗ
وَمَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ ﴿٣٨﴾
اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَهَبَ لِيْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ ۗ اِنَّ
رَبِّيْ لَسَمِيْعُ الدُّعَآءِ ﴿٣٩﴾ رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ ۖ
رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَآءِ ﴿٤٠﴾ رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ
الْحِسَابُ ﴿٤١﴾

رکوع: ۶۔ (یاد کرو جب ابراہیمؑ نے دعا کی تھی کہ اے میرے رب اس شہر کو امن والا بنا دے۔ اور مجھے اور میری اولاد کو بچالے اس بات سے کہ ہم بتوں کی پوجا کریں۔ اے ہمارے پروردگار! ان بتوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہی میں ڈالا ہے۔ اور جو کوئی میرے پیچھے چلا تو وہ میرا ہوگا اور جس نے میری نافرمانی کی (تو اس کا معاملہ تیرے سپرد ہے) بیشک تو غفور و رحیم ہے۔ (اے ہمارے رب! میں نے ایک بے آب و گیاہ وادی میں اپنی اولاد کے ایک حصے کو تیرے محترم گھر کے پاس لا بسایا ہے۔ اے ہمارے رب! یہ اس لیے تا کہ وہ نماز قائم کریں۔ پس تو لوگوں کے دلوں کو ان کا مشتاق بنا دے۔ اور انھیں پھلوں کا رزق عطا فرما تا کہ وہ تیرا شکر ادا کریں۔ اے ہمارے رب یقیناً تو جانتا ہے جو ہم دل میں چھپاتے ہیں اور جو ظاہر کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے کوئی چیز بھی مخفی نہیں، نہ زمین میں اور نہ آسمان میں۔ حمد اور شکر ہے اس اللہ تعالیٰ کا جس نے

Marfat.com

مجھے بڑھاپے میں اسماعیل اور اسحاق عطا فرمائے۔ بیشک میرا رب دعاؤں کا بہت سننے والا ہے۔ اے میرے رب! مجھے نماز کا قائم کرنے والا بنا اور میری اولاد میں سے بھی۔ اے ہمارے رب! میری التجا ضرور قبول فرما۔ اے ہمارے رب! مجھے اور میرے والدین کو اور مومنین کو اس دن بخش جس دن حساب قائم ہوگا۔)

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِیْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِیْ وَبَنِیَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ۝۳۵ رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ ۚ فَمَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّهٗ مِنِّیْ ۚ وَمَنْ عَصَانِیْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝۳۶ (سورة ابراهیم : ۳۵.۳۶)

(یاد کرو جب ابراہیم نے دعا کی تھی کہ اے میرے رب اس شہر کو امن والا بنا دے۔ اور مجھے اور میری اولاد کو بچا لے اس بات سے کہ ہم بتوں کی پوجا کریں۔ اے ہمارے پروردگار ان بتوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہی میں ڈالا ہے۔ اور جو کوئی میرے پیچھے چلا تو وہ میرا ہوگا اور جس نے میری نافرمانی کی (تو اس کا معاملہ تیرے سپرد ہے) بیشک تو غفور رحیم ہے۔)

حضرت ابراہیمؑ کی دعا کے چند نکات

اس آیت کریمہ میں چند باتوں کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے۔

1- گزشتہ آیات میں پروردگار نے ان عام احسانات کا ذکر کیا ہے جن سے انسانوں کو نوازا گیا ہے۔ اور اگر ان احسانات پر انسان کو غور کرنے کا موقع نصیب ہو جائے تو اسے اللہ تعالیٰ کی ناشکری اور نافرمانی کرتے ہوئے ہزار دفعہ شرم آئے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی نعمتیں استعمال تو مکمل ڈھٹائی سے کرتا ہے لیکن اسے ان پر غور کرنے کی فرصت بہت کم نصیب ہوتی ہے۔ چنانچہ اسی سوچ کو جاگر کرنے کیلیے جو انسان کی اصلاح کا سب سے بڑا ذریعہ ہے اب ان خصوصی احسانات کا ذکر کیا جا رہا ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی معرفت قریش پر کیے ہیں۔ قریش کو توجہ دلائی جا رہی ہے کہ تم میرے احسانات میں سے ایک ایک احسان کو متحضر کر کے دیکھو تب شاید تمہیں اندازہ ہو سکے کہ تمہاری یہ روبیہ کس قدر کفرانِ نعمت کا غماز ہے۔ ممکن ہے کہ اس توجہ دلانے سے قریش کے اندر شکر کا جذبہ ابھرے جو ان کی ہدایت کا سبب بنے۔

2- قریش میں عقیدے اور عمل کی جو خرابیاں پیدا ہوئیں اس کا بیشتر سبب ان کا اپنے آباؤ اجداد کی اندھی تقلید پر اصرار تھا۔ ان کا گمان کیا بلکہ یقین تھا کہ ان کے آباؤ اجداد نے جو عقائد اور شریعت ہمارے سپرد کی ہے وہ ٹھیک ملت ابراہیم ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے انھی بنیادوں پر وہ امت اٹھائی تھی جسے قرآن کریم میں امتِ مسلمہ کہا گیا ہے اور ہم چونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہیں اس لیے ہم سے بڑھ کر ان کی روایات، ان کے طور اطوار اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی تعلیمات کا محافظ اور کون ہو سکتا ہے۔ ہمارے آباؤ اجداد نے یقیناً جان دے کر ان کی حفاظت کی ہوگی۔ اس لیے عقیدہ اور عمل کی شکل میں ہم جو کچھ کر رہے ہیں یہ ملتِ ابراہیم کی صحیح تصویر ہے۔ پروردگار نے قرآن پاک کی اس آیت میں ان کے سامنے ملتِ ابراہیم کی صحیح تصویر کھینچی ہے تاکہ انھیں اپنی گمراہیوں کا اندازہ ہو سکے۔

3- گزشتہ آیات کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے احسانات کا ذکر فرمانے کے بعد آخر میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے احسانات کا کوئی شمار نہیں۔ اس نے انسان کی ہر ضرورت پوری کی اور اس کو وہ سب کچھ عطا کیا جو اس نے مانگا۔ لیکن اس کے باوجود انسان کا حال یہ ہے کہ وہ انتہائی ناشکرا اور ظالم ہے۔ پیشِ نظر آیت کریمہ میں ناشکرے انسانوں کے مقابلے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر فرما کر یہ بتلانا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بندوں میں ایسے لوگ بھی گزرے ہیں جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام تھے جنھوں نے زندگی کا ہر دکھ اٹھایا، ہر تکلیف برداشت کی، لیکن اپنی عبودیت پر کبھی آنچ نہ آنے دی۔ آپ نے محض اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل اور بندگی کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے اپنے نوزائیدہ بچے اور اپنی بیوی (جو شاہِ مصر کی شہزادی تھیں) کو ایک ایسی وادی میں منتقل کر دیا جس میں نہ سبزے کا نشان تھا اور نہ پانی کا۔ ہر طرف ویرانی اور موت کا پہرہ تھا جس میں بظاہر زندگی کا باقی رہنا محال نظر آتا تھا۔ لیکن جب آپؑ کو حکم دیا گیا کہ آپؑ ایسی بن کھیتی کی وادی میں اللہ تعالیٰ کا گھر تعمیر کریں اور وہیں اپنی اولاد کو آباد کریں تو آپ کی دوررس نگاہوں نے

Marfat.com

دیکھ لیا کہ اس وقت تو یہاں نہ کوئی مکان ہے اور نہ کوئی مکین، صرف ایک میں ہوں، میری اہلیہ اور اسماعیلؑ۔ لیکن میری دعائیں یقیناً رائیگاں نہیں جائیں گی، اللہ تعالیٰ کا گھر بے آباد اور بے وقار نہیں رہے گا۔ یہاں یقیناً ایک شہر آباد ہوگا۔ اس لیے آج کے دور میں جبکہ انسانیت حالتِ نزع میں ہے مجھے اس شہر کی آبادی کیلیے وہ کچھ مانگنا چاہیے جس کے بغیر شہر آباد نہیں ہوسکتے اور ہوجائیں تو رہ نہیں سکتے۔ اس لیے سب سے پہلی دعا یہ فرمائی کہ پروردگار اس شہر کو امن کا شہر بنادے۔ آج دنیا میں اگر کوئی جنس کمیاب ہے تو وہ امن ہے۔ درندے بھی جنگل میں اس حد تک بے قابو نہیں ہیں جس حد تک انسان بے قابو ہوچکا ہے۔ انسانی جان نہایت غیر محفوظ ہوچکی ہے۔ مال اور آبرو غیروں کا مال بن چکے ہیں۔ نیا شہر بھی ایسے ہی انسانوں سے آباد ہوگا، وہاں بھی سب سے کمیاب جنس یقیناً امن کی ہوگی۔ اس لیے پروردگار! میں جس شہر کی بنیاد رکھ رہا ہوں اسے امن کی دولت سے بہرہ ور فرما اور اس شہر کے باسیوں میں ایسا تعلق پیدا فرما کہ یہ ایک دوسرے کے ہمدرد و غمگسار ہوں اور اس شہر میں ایک ایسی فضا پیدا فرما کہ بڑے سے بڑا دشمن بھی ان پر ہاتھ نہ ڈال سکے۔ اور دوسری دعا یہ فرمائی کہ پروردگار مجھے اور میری اولاد کو بت پرستی سے محفوظ فرمانا۔ اللہ تعالیٰ کے پیغمبرؑ بت شکنی کیلیے تشریف لاتے ہیں۔ وہ خدا پرستی کی علامت ہوتے ہیں۔ ان سے کبھی کسی ایسی بات کا ظہور نہیں ہوتا جسے بت پرستی کہا جاسکے۔ بایں ہمہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنے لیے بھی یہ دعا فرمانا درحقیقت اس بات کا اظہار ہے کہ بت پرستی نے پوری دنیا کو اپنے دائرہ اثر میں لے رکھا ہے۔ کوئی شخص بھی اس سے محفوظ نظر نہیں آتا۔ اس لیے مجھے بھی اس سے محفوظ رکھ اور میری اولاد کو بھی اس سے بچا۔ اس سے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام صرف اپنی اولاد کو بت پرستی سے بچانا چاہتے ہیں۔ اولاد کے ذکر سے مقصود یہ ہے کہ اس شہر کا ایک ایک فرد میری امتِ دعوت میں ہونے کی وجہ سے مجھے ایسا ہی عزیز ہے جیسے اپنی اولاد عزیز ہوتی ہے۔ وہ گویا میری اولاد ہی میں سے ہے۔ اور دوسرا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ اس شہر میں غالب گمان یہ ہے کہ زیادہ تر لوگ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے ہوں گے۔ کیونکہ اس وقت وہی اس شہر کے باسی ہیں۔ آہستہ آہستہ ان کی اولاد پھیلے گی۔ ایک وقت آئے گا جب ان کی اولاد قبائل کی شکل اختیار کرجائے گی۔ انسانی پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ یقیناً ان میں عقیدہ و عمل کی خرابیاں بھی آئیں گی۔ ایسے بھی بدنصیب ہوں گے جو میرے طریقے سے ہٹ کے چلیں گے۔ اس لیے پروردگار میری دعا ہے کہ جو لوگ میری پیروی کریں وہ لوگ تو میرے ہیں ان کے ساتھ وہی سلوک فرما جو تو اپنے خاص بندوں کے ساتھ کرتا ہے۔ لیکن جو لوگ میری نافرمانی کریں ان کی نافرمانی کا تقاضا تو یہ ہے کہ وہ تیری رحمت سے دور ہوں۔ لیکن میں انسانوں کی کمزوریوں اور تیری رحمتوں کو دیکھ کر یہ امید رکھتا ہوں کہ تو ان کو اپنی رحمت سے دور نہیں کرے گا۔

اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبروں کے دلوں کو نجانے محبت، مودت اور رحمت کے کن سانچوں میں ڈھالتا ہے کہ وہ اپنی قوم کی طرف سے ہر طرح کی بے اعتدالیوں کو دیکھتے ہیں لیکن حتی الامکان یہ گوارا نہیں کرتے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی سزا کے مستحق ٹھہریں۔ ان سے بڑھ کر کوئی نہیں جانتا کہ کافر کیلیے رحمت اور بخشش کی دعا نہیں کی جاسکتی۔ بایں ہمہ ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح اپنی کافر قوم کیلیے بھی کوئی اگر نرم گوشہ ممکن ہوسکتا ہے تو اس کی سفارش ضرور کردیں۔

قرآنِ کریم (سورۃ المآئدہ آیت ۱۱۶) میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا وہ مکالمہ جو قیامت کے دن آپؑ کے اور پروردگار کے درمیان قوم کے حوالے سے ہوگا تفصیل سے دیا گیا ہے۔ جب انھیں معلوم ہوجائے گا کہ میری بدبخت قوم نے میرے دنیا سے اٹھائے جانے کے بعد مجھے اور میری ماں کو خدا بنالیا اور اس طرح سے ایک ایسے جرم کا ارتکاب کیا جو اللہ تعالیٰ کے یہاں ناقابلِ معافی ہے۔ ایسی صورت میں آپؑ کیلیے ممکن نہیں رہا کہ آپؑ اپنی قوم کیلیے کوئی سفارش فرماسکیں۔ تو آپؑ نہایت احتیاط سے عرض کریں گے کہ اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ اگر آپ ان کو عذاب دیں تو پروردگار وہ تیرے بندے ہیں۔ اور اگر تو ان کو معاف فرمادے تو غالب حکمت والا ہے۔ بیشک ان کا عقیدہ و عمل اس قابل نہیں۔ لیکن تیری قدرت کو کون روک سکتا ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ ایک دفعہ ساری رات یہ دعا پڑھتے رہے اور امت کے غم میں روتے رہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر پیغمبر ہیں وہ انبیاء کرام کے اسی ورثہ کے وارث ہیں۔ اسی لیے جو لوگ آپ کی نافرمانی کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک میں ملوث ہیں ان کیلیے بھی عذاب کی دعا نہیں فرماتے بلکہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دیتے ہیں لیکن ساتھ ہی یہ درخواست ضرور کرتے ہیں کہ پروردگار آپ بخشنے والے ہیں، آپ رحم فرمانے والے ہیں۔ کیا بڑی بات ہے اگر ان نافرمانوں کے ساتھ بھی رحم کا سلوک فرمائیں۔

Marfat.com

رَبَّنَآ اِنِّیْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْـِٕدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِیْٓ اِلَیْهِمْ وَ ارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ یَشْكُرُوْنَ ﴿۳۷﴾ (سورة ابراهيم : ۳۷)

(اے ہمارے رب! میں نے ایک بے آب و گیاہ وادی میں اپنی اولاد کے ایک حصے کو تیرے محترم گھر کے پاس لا بسایا ہے۔اے ہمارے رب! یہ اس لیے تا کہ وہ نماز قائم کریں۔پس آپ لوگوں کے دلوں کو ان کا مشتاق بنا دیں۔اور انھیں پھلوں کا رزق عطا فرما تا کہ وہ تیرا شکر ادا کریں۔)

خاندان ابراہیمی کی تاریخ کے چند اوراق

جس زمانے میں آپؑ نے مکہ معظمہ میں اللہ تعالیٰ کا گھر تعمیر کیا ہے،اس زمانے میں آپؑ کی رہائش فلسطین کے علاقے میں تھی جو ملک شام کا نہایت سرسبز علاقہ تھا۔یہاں کا موسم، یہاں کا سبزہ، یہاں کے پھل اور یہاں کی پیداوار دنیا کیلیے ایک مثال تھی۔اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی یہاں وہ فراوانی تھی کہ دوسرے ملکوں کی ضرورتیں بھی یہاں سے پوری ہوتی تھیں۔لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر حضرت ابراہیم کو حکم دیا کہ آپ اپنی اہلیہ حضرت ہاجرہ اور اپنے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کو لے کر اس وادیٔ غیر ذی زرع میں پہنچیں جہاں بظاہر زندگی بسر کرنے کی کوئی ضرورت میسر نہیں۔پورے علاقے میں گھاس کی پتی تک نہیں اگتی۔بارشیں کہیں قسمت سے ہوتی ہیں، دور دور تک کوئی پانی کا چشمہ تک نہیں،کوئی سائے کا سامان نہیں۔حکم دیا گیا یہاں اللہ تعالیٰ کا گھر تعمیر کرو۔چنانچہ اللہ تعالیٰ کا گھر تعمیر کیا گیا اور حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیلؑ کو یہیں رہنے کا حکم دیا گیا۔اور وقتاً فوقتاً حضرت ابراہیم علیہ السلام خود بھی تشریف لا کر یہاں قیام پذیر رہتے۔اب اسی شہر کی آبادی کیلیے دعائیں ہو رہی ہیں۔پہلے اس کیلیے امن مانگا گیا اور اب زندگی کی بقاء کا سروسامان مانگا جا رہا ہے۔عرض کیا جا رہا ہے کہ الٰہی میں نے اپنی اولاد کا ایک حصہ یہاں لا بسایا ہے لیکن تو جانتا ہے کہ یہاں کوئی چیز نہیں اگتی، تیری رحمت ہے کہ تو نے چاہِ زم زم کے نام سے پانی کا ایک سوتا جاری کر دیا ہے۔اس پانی کی برکت سے یقیناً آبادی کا امکان پیدا ہو جائے گا۔اسماعیل کی اولاد تو آہستہ آہستہ پھیلے گی لیکن یہاں سے گزرنے والے قافلوں کے دلوں کو ان کی طرف مائل فرما دے۔وہ یہاں اپنا بسیرا کرنا شروع کر دیں۔یہاں بظاہر تو دلچسپی کی کوئی چیز نہیں لیکن اگر تو ان کے دلوں میں اپنے گھر کی محبت پیدا کر دے گا تو پھر دکھ اٹھا کر بھی وہ لوگ یہاں رہنا پسند کریں گے۔اور ساتھ ہی ساتھ انھیں ان کے کھانے کی ضرورت پورا کرنے کیلیے الٰہی ان کو پھلوں کا رزق عطا فرما۔اس کے قرب و جوار میں کوئی ایسا علاقہ مہیا فرما جس میں ان کی ضرورت کے مطابق پھل پیدا ہو سکیں اور اگر ثمرات کو وسیع معنی میں لیا جائے تو پھر اس کا مطلب یہ ہو گا کہ ان کی ضرورت کی ہر چیز کی پیداوار یہاں پہنچنے کا سامان فرما۔چنانچہ حیرانی کی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تمام دعاؤں کو قبول فرمایا اور محض اپنے خصوصی فضل سے انھیں وہ سب کچھ دیا جو ان کی ضرورت تھا۔اس وقت کی دنیا بھی امن کی بری طرح محتاج تھی۔اللہ تعالیٰ نے اس سرزمین پر آنے والوں کے دلوں میں اپنے گھر کی ایسی عظمت اور ایسی چاہت پیدا کی کہ بنوجرہم کے قافلے نے جب وہاں پانی کا چشمہ اور ایک ماں بیٹے کا جھونپڑا دیکھا اور ساتھ اللہ تعالیٰ کا وہ گھر نظر آیا جس کی سادگی دنیا کی خوبصورتیوں کو شرمائے دے رہی تھی تو انھوں نے بھی اپنے خیمے وہاں لگا لیے۔اس طرح آہستہ آہستہ خیموں کا ایک شہر آباد ہو گیا۔یہ لوگ حضرت اسماعیل علیہ السلام پر ایمان لائے۔چنانچہ حضرت اسماعیل علیہ السلام نے انھیں میں شادی فرمائی۔چنانچہ یہ آپ کا سسرالی خاندان ٹھہرا۔اس طرح سے رفتہ رفتہ شہر وجود میں آیا۔اور اللہ تعالیٰ کے گھر کی عظمت اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی تعلیم نے ان کے دلوں میں یہ بات اتار دی کہ اس گھر کے چاروں طرف دور تک حرم کا علاقہ ہے۔جس میں کوئی جرم نہیں کیا جا سکتا۔اور کسی شخص کو نقصان نہیں پہنچایا جا سکتا۔حتیٰ کہ کسی جانور کو شکار تک نہیں کیا جا سکتا۔اور مزید یہ بات کہ اللہ تعالیٰ نے سال کے بارہ مہینوں میں چار مہینے حرمت والے مقرر فرمائے ہیں جن میں تین مسلسل ہیں یعنی ذی القعد، ذوالحج اور محرم اور چوتھا مہینہ رجب ہے۔ان چار مہینوں میں کوئی دنگا فساد نہیں ہو سکتا، کوئی لڑائی نہیں لڑی جا سکتی۔اس طرح سے پورے جزیرۂ عرب میں یہ بات مسلّم ہو گئی کہ تین مہینے حج کیلیے ہیں اور ایک مہینہ رجب کا عمرہ کیلیے۔اور انھیں چار مہینوں میں کاروبار بھی کیا جا سکتا ہے۔چنانچہ سال کے باقی آٹھ مہینے تو جیسے کیسے گزرتے لیکن

Marfat.com

ان چار مہینوں میں پورے جزیرہ عرب میں تجارتی سرگرمیاں اپنے عروج پر ہوتیں اور سب کا رخ اللہ تعالیٰ کے گھر کی طرف ہوتا۔ اس طرح سے اللہ تعالیٰ نے نجانے کہاں کہاں کا رزق اس شہر کے باسیوں کو مہیا فرمایا۔ اور جہاں تک لوگوں میں اس شہر اور اس کے رہنے والوں کے احترام کا تعلق ہے تو اسے اس وقت بھی محسوس کیا جاتا تھا اور آج بھی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ آج جبکہ مصروفیات کا ایک ہجوم ہے جس نے انسان کو جکڑ رکھا ہے۔ بایں ہمہ جو شخص ایک دفعہ حج یا عمرہ کر آتا ہے، وہ دوبارہ جانے کی ضرور کوشش کرتا ہے جبکہ وہاں کثرت سے جانے والوں نے ایسی مشکلات پیدا کر دی ہیں کہ وہاں نہ عمرہ کرنا آسان رہا ہے اور نہ مناسک حج کی ادائیگی آسان رہی ہے، لیکن عشاق کا قافلہ ہے جس میں کبھی کمی نہیں آتی بلکہ روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ ٹھیک کہا کسی نے:

کوئی تو بات ہے آخر میکدے میں ضرور
جو دور دور سے میخوار آ کے پیتے ہیں

اور ضروریات کی فراوانی کا حال یہ ہے کہ حرمین کے بازار دنیا کے ہر بڑے شہر سے زیادہ آباد ہیں۔ کوئی ضرورت کی چیز اور کوئی پھل ایسا نہیں جو ان بازاروں میں دستیاب نہ ہو۔ اور جہاں تک زمانہ ماضی کا تعلق ہے اس وقت بھی اس شہر کے مکینوں کو خاص ایک مرتبہ حاصل تھا۔ یہ کسی طرف بھی قافلۂ تجارت لے کر نکلتے تو کوئی قبیلہ بھی ان سے تعرض کرنے کی جرأت نہیں کرتا تھا بلکہ جس قبیلے کے پاس سے گزرتے وہ راستہ بتانے کیلیے انھیں بدرقہ مہیا کرتا اور لوگ ان کا احترام کرتے صرف اس لیے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے گھر کے متولی ہیں۔ اس لیے اگر ان کے ساتھ بدسلوکی کی جائے گی تو اس گھر کا مالک ہم سے ناراض ہو جائے گا۔

اس وادی میں قیام کا مقصد

یہاں ایک بات کی طرف توجہ دینا بہت ضروری ہے، وہ یہ کہ ابراہیم علیہ السلام نے اس شہر میں اپنی اولاد کی ضروریات کیلیے امن بھی مانگا، پھلوں کے رزق کیلیے بھی دعا کی اور یہ بھی گزارش کی کہ اس گھر کو مرجع خلائق بنا دے۔ اور اس شہر کے رہنے والوں کی محبت لوگوں کے دلوں میں پیدا فرما، لیکن جہاں تک اپنی اولاد کے اس شہر میں قیام کی غرض وغائت کا تعلق ہے اور جس مقصد کیلیے انھیں یہاں لایا گیا ہے وہ صرف ایک چیز ہے کہ وہ یہاں نماز قائم کریں کیونکہ مقصود اگر کھانے پینے کی نعمتوں کا حصول ہوتا اور زندگی کی لذتیں ہوتیں تو وہ فلسطین، شام اور عراق میں زیادہ مہیا تھیں۔ اس کیلیے یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی۔ یہاں رہنے کا مقصد تو صرف یہ ہے کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے گھر کے مجاور بن کے رہیں۔ اسی کی خدمت بجالائیں، اسی کو اپنی عبادتوں سے آباد رکھیں۔ اسی کیلیے اقامتِ صلوٰۃ کی وسیع اصطلاح کو استعمال کیا گیا۔ اقامتِ صلوٰۃ نماز پڑھ لینے کا نام نہیں بلکہ اس سے مراد نظامِ صلوٰۃ کا قائم کرنا ہے۔ کسی چیز کی اقامت اس کے مالہ وماعلیہ کو بروئے کار لانا ہوتا ہے۔ مثلاً اگر یہ کہا جائے کہ عدالت قائم ہوگئی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ عدالت کی عمارت بن گئی۔ جج کا تقرر ہوگیا، عملہ وجود میں آگیا، وکلاء آنے جانے لگے، استغاثہ سنا جانے لگا، مدعی اور مدعا علیہ کی ضرورتیں پوری ہونے لگیں اور انصاف ملنے لگا۔ اسی طرح اقامتِ صلوٰۃ سے مراد یہ ہے کہ مسجدیں بن گئیں، جماعتوں کا اہتمام ہوگیا، موذنوں کا تقرر ہوگیا، خطباء اور مدرسین لگا دیے گئے اور اس پورے نظام کے پیچھے ایک قوتِ حاکمہ کو بھی مقرر کر دیا گیا جو اس کی نگرانی بھی کرے اور اس کی اہمیت کو بھی منوائے۔ بازاروں اور گلی کوچوں میں نمازوں کی پابندی کرانے کیلیے لوگوں کا تقرر کر دیا گیا۔ یہ سب کچھ ہو چکنے کے بعد کہا جاسکتا ہے کہ اقامتِ صلوٰۃ ہوگئی۔

اس شہر کے رہنے والوں کو جسمانی اور روحانی ضرورتوں کے مہیا کر دینے کا مقصد یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں۔ شاکر اس گھوڑے کو کہتے ہیں جو گھاس کے چند تنکے کھا کر اور پانی کے چند گھونٹ پی کر اپنے مالک کی وفاداری میں جان لڑا دیتا ہے۔ یہاں کے رہنے والوں سے بھی یہی تقاضا ہے کہ حالات نامساعد بھی ہوں اور ضروریات کی کمیابی بھی ہو تب بھی اقامتِ صلوٰۃ اور اس گھر کی آبادی میں کوئی کمی نہیں آنی چاہیے۔

رَبَّنَآ اِنَّکَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِیْ وَمَا نُعْلِنُ ۭ وَمَا یَخْفٰی عَلَی اللّٰہِ مِنْ شَیْءٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ ﴿۳۸﴾

(اے ہمارے رب یقیناً تو جانتا ہے جو ہم دل میں چھپاتے ہیں اور جو ظاہر کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے کوئی چیز بھی مخفی نہیں، نہ زمین میں اور نہ آسمان میں۔) (سورۃ ابراہیم: ۳۸)

Marfat.com

ادب پہلا قرینہ ہے

اس میں دو باتوں کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔ایک تو یہ بات کہ پروردگار ہم اپنی جن ضرورتوں کے حوالے سے اور آنے والے دنوں میں اپنی اولاد کیلیے جو کچھ مانگ رہے ہیں ہم جانتے ہیں کہ ان میں کوئی بات ایسی نہیں جسے تو نہ جانتا ہو۔ہم جن باتوں کا اظہار کرتے ہیں تو انھیں بھی جانتا ہے اور جن باتوں کے اظہار کرنے سے قاصر رہ جاتے ہیں تو ان سے بھی آگاہ ہے۔دعا اس لیے نہیں کر رہے کہ آپ کے علم میں ان باتوں کو لایا جائے بلکہ اس سے مقصود اپنی عاجزی، اپنی احتیاج اور اپنی سرافگندگی کا اظہار ہے۔تیری ذات کو جس طرح عطا کرنا زیب دیتا ہے اور یہی تیری پہچان ہے اسی طرح ہمیں مانگنا، عجز کا اظہار کرنا اور اپنی کمزوریوں کو بیان کرنا زیب دیتا ہے اور یہ ہماری پہچان ہے۔

دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ آدمی بہت کچھ مانگنا چاہتا ہے لیکن بعض دفعہ حدِ ادب مانع ہوتی ہے اور آدمی چاہتے ہوئے بھی نہیں مانگ سکتا، کیونکہ محبت کی دنیا میں ادب کے تقاضوں کو ملحوظ رکھنا سب سے بڑی بات ہے۔کیونکہ:

ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں

اس لیے پروردگار ہمیں وہ کچھ عطا فرمایئے جو ہمارے لیے مناسب ہو۔ہم چاہیں اسے مانگ پائیں یا نہ مانگ پائیں کیونکہ تو جانتا ہے کہ ہمارے دل میں کیا کیا ہے۔اور ہماری قوت گویائی نے کہاں کہاں ہمارا ساتھ چھوڑا ہے اور ادب کے تقاضے کہاں کہاں مانع ہوئے ہیں۔اس لیے تو اپنے علم اور کرم کے مطابق ہمارے ساتھ سلوک فرما اور اپنی رحمتوں سے ہمیں نہال فرمادے۔

آیت کا دوسرا جملہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا جواب ہے اور یا آپ کیلیے تسلی کا باعث ہے کہ آپ اطمینان رکھیے، آپ کا رب آپ کی ہر ادا سے واقف ہے۔ہر حال کو جانتا ہے۔جو بات زبان پر ہے اسے سنتا ہے، جو الفاظ سے بیگانہ لیکن دل میں مچل رہی ہے وہ اسے بھی جانتا ہے، وہ آپ کی ضرورت اور اپنی رحمت کے مطابق آپ سے معاملہ کرے گا۔

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡ وَہَبَ لِیۡ عَلَی الۡکِبَرِ اِسۡمٰعِیۡلَ وَ اِسۡحٰقَ ؕ اِنَّ رَبِّیۡ لَسَمِیۡعُ الدُّعَآءِ ﴿۳۹﴾

(حمد اور شکر ہے اس اللہ تعالیٰ کا جس نے مجھے بڑھاپے میں اسماعیل اور اسحاق عطا فرمائے۔بیشک میرا رب دعاؤں کا بہت سننے والا ہے۔) (سورۃ ابراہیم:۳۹)

سابقہ احسانات کا حوالہ

حضرت ابراہیم علیہ السلام بارگاہِ الوہیت میں ہاتھ پھیلائے کھڑے ہیں اور دل پر عجیب کیفیتیں گزر رہی ہیں۔حضرت ابراہیم اللہ تعالیٰ کی رحمتوں سے بھی واقف ہیں اور اس کی بے نیازیاں بھی ان کے سامنے ہیں۔مانگتے مانگتے خیال آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے دعا کی قبولیت میں تردد کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔اس لیے کہ میری سابقہ زندگی میں اس نے جو قدم قدم پر عنائتیں فرمائی ہیں وہ بجائے خود اس بات کی دلیل ہیں کہ وہ میرے حال پر ہمیشہ مہربان رہا ہے۔اس کی عنائتوں کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ بڑھاپے میں جبکہ ہر شخص اولاد سے مایوس ہو جاتا ہے اس نے نہ صرف مجھے اولاد بخشی بلکہ ایسے دو بیٹے عطا فرمائے جو آگے چل کر ملکوں اور قوموں کیلیے وجہ افتخار ثابت ہوں گے۔حضرت اسماعیلؑ عرب کے جدِ امجد کے طور پر یاد کیے جائیں گے اور حضرت اسحاقؑ اپنے بیٹے حضرت یعقوبؑ کے واسطے سے ایک ایسی قوم کا حوالہ بنیں گے جو صدیوں تک قوموں کی امامت کا فریضہ انجام دے گی۔جس ذات نے اس سے پہلے بے مانگے ایسی نعمتیں عطا فرمائی ہیں اس کے بارے میں کیسے خیال کیا جا سکتا ہے کہ وہ اب میری گزارشات کو نظر انداز فرمائے گا۔وہ تو ہمیشہ سے دعا کا سننے والا اور ہمیشہ کیلیے دعا قبول کرنے والا ہے۔اس کا ابرِ رحمت نہ آج تک رحمت سے خالی ہوا ہے اور نہ آئندہ ہوگا۔

Marfat.com

رَبِّ اجْعَلْنِیْ مُقِیْمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ ۖۗ رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَآءِ ۝ رَبَّنَا اغْفِرْلِیْ وَلِوَالِدَیَّ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ یَوْمَ یَقُوْمُ الْحِسَابُ ۝ (سورۃ ابراھیم : ۴۰۔۴۱)

(اے میرے رب! مجھے نماز کا قائم کرنے والا بنا اور میری اولاد میں سے بھی۔اے ہمارے رب! میری التجا ضرور قبول فرما۔اے ہمارے رب! مجھے اور میرے والدین کو اور مومنین کو اس دن بخش جس دن حساب قائم ہوگا۔)

مقصد میں سرگرم ہونے کی دعا

یہ وہ آیتِ کریمہ ہے جسے بالعموم مسلمان نماز کے آخر میں دعا کے طور پر پڑھتے ہیں۔اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نماز میں اپنی اور اپنی اولاد کیلیے سرگرم رہنے کی دعا مانگی ہے، حالانکہ اس سے دو آیتیں پہلے دعا میں اس کا ذکر گزر چکا ہے۔بار دگر پھر اسی کی دعا کرنا اس کی اہمیت پر دلالت کرتا ہے، لیکن مزید غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے پروردگار کے حضور یہ درخواست کی تھی کہ میں نے اپنی اولاد کو تیرے حرمت والے گھر کے پاس اس لیے لا بسایا ہے تاکہ وہ اقامتِ صلوٰۃ کریں یعنی ان کے یہاں قیام کا مقصد صرف اقامتِ صلوٰۃ ہے۔اب اسی اقامتِ صلوٰۃ کے بروئے کار لانے کیلیے دعا مانگی جارہی ہے اور دعا میں فعل استعمال نہیں کیا گیا جو کسی عمل کے واقع ہونے پر دلالت کرتا ہے بلکہ اسمِ صفت لایا گیا ہے جس میں اہتمام اور استمرار کی شان پائی جاتی ہے اور جو عموماً انسان کی طبیعت ثانیہ بن جاتا ہے۔اللہ تعالیٰ سے طلب اس بات کی کی جارہی ہے کہ پروردگار مجھے اور میری اولاد کو اس طرح کا بنا دے کہ ہم سے نماز کا اہتمام اس طرح سے ظہور میں آئے جیسے چشمے سے پانی ابلتا ہے، جیسے سورج سے کرنیں پھوٹتی ہیں، جیسے چاند سے چاندنی ظہور پذیر ہوتی ہے۔اور صلوٰۃ چونکہ تمام نیکیوں کی جامع نیکی ہے اسی سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایفائے عہد کا جذبہ استوار ہوتا ہے اور اسی سے دن کے پانچ وقتوں میں تجدید عہد ہوتی ہے۔اس میں ایک مومن ان تمام کیفیات سے گزرتا ہے جو ایک مومن کا سرمایہ ہیں۔اور اس کی زبان پر وہ تمام تسبیحات جاری ہوتی ہیں جو اس کی بندگی کی علامت ہیں۔اسی لیے آدمی اپنی فروتنی اور اللہ تعالیٰ کی کبریائی کا اظہار کرتا ہے۔دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیے کہ یہ پوری زندگی کی تعبیر ہے۔اسی کی اہمیت کے پیشِ نظر دوبارہ عرض کیا گیا کہ اے ہمارے رب! ہماری یہ دعا قبول فرمانا۔کیونکہ اقامتِ صلوٰۃ یعنی اسلامی زندگی کی ذمہ داریاں ادا کرنا ایک نہایت کٹھن کام ہے جو ایک دو دن پر مشتمل نہیں بلکہ اس میں پوری زندگی مطلوب ہے۔یقیناً اس میں کہیں نہ کہیں کوتاہیاں ہوں گی، کہیں نہ کہیں لغزشیں ہوں گی۔اس لیے آخر میں اپنی، والدین کی اور مومنوں کی بخشش کیلیے دعا مانگی کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو اپنی بخشش اور عفو و درگزر میں جگہ عطا فرمائے۔

اس دعا میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے والدین کو بھی شریک کیا ہے۔قرآنِ کریم میں دوسری جگہ اس کی حقیقت بیان کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ وَمَا کَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِیْمَ لِاَبِیْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِیَّاهُ فَلَمَّا تَبَیَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنے باپ کیلیے معافی طلب کرنا صرف اس لیے تھا کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے والد سے استغفار کرنے کا وعدہ کیا تھا۔اور جب آپؑ پر یہ بات واضح ہوگئی کہ وہ اللہ تعالیٰ کا دشمن ہے تو وہ اس کے استغفار سے رک گئے۔معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اوپر اپنے والدین کیلیے جو دعا مانگی ہے، وہ اس ممانعت سے پہلے کی ہے، لیکن جب آپؑ کو روک دیا گیا تو پھر آپؑ نے اپنے والد کیلیے کبھی دعا نہیں مانگی۔

یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سرگزشت یہاں اس لیے بیان کی گئی ہے تاکہ قریش کو معلوم ہو کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کس مقصد کیلیے اللہ تعالیٰ کا گھر بنایا تھا اور کن امیدوں اور آرزوؤں سے آپؑ نے اپنی اولاد کو یہاں ٹھہرایا تھا اور ان کیلیے کیا کیا دعائیں مانگی تھیں۔اب اگر قریش میں معمولی عقل بھی باقی ہے تو وہ اپنی حالت اور ان دعاؤں کو سامنے رکھ کر غور کرسکتے ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے اپنی اولاد کیلیے جو نعمتیں مانگی تھیں وہ اس مقصد کے ساتھ مشروط تھیں جس کے ایفاء کیلیے انھیں یہاں بسایا گیا تھا، لیکن قریش کا رویہ عجیب ہے کہ ایک طرف نعمتوں پر قبضے کا دعویٰ ہے اور دوسری طرف ملتِ ابراہیم کے بنیادی تصور کے پرخچے اڑا دیے گئے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی تمام نعمتوں کو اپنے خیالی معبودوں کی طرف منسوب کرکے مطمئن ہو کر بیٹھ گئے ہیں۔

Marfat.com

وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ ۬ۚ اِنَّمَا
يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُ ۙ﴿۴۲﴾ مُهْطِعِيْنَ مُقْنِعِيْ
رُءُوْسِهِمْ لَا يَرْتَدُّ اِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ ۚ وَاَفْـِٕدَتُهُمْ هَوَآءٌ ؕ﴿۴۳﴾ وَاَنْذِرِ
النَّاسَ يَوْمَ يَاْتِيْهِمُ الْعَذَابُ فَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رَبَّنَآ اَخِّرْنَآ
اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ نُّجِبْ دَعْوَتَكَ وَنَتَّبِعِ الرُّسُلَ ؕ اَوَلَمْ تَكُوْنُوْٓا
اَقْسَمْتُمْ مِّنْ قَبْلُ مَا لَكُمْ مِّنْ زَوَالٍ ۙ﴿۴۴﴾ وَّسَكَنْتُمْ فِيْ مَسٰكِنِ
الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَتَبَيَّنَ لَكُمْ كَيْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ وَضَرَبْنَا
لَكُمُ الْاَمْثَالَ ﴿۴۵﴾ وَقَدْ مَكَرُوْا مَكْرَهُمْ وَعِنْدَ اللّٰهِ مَكْرُهُمْ ؕ وَاِنْ
كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ ﴿۴۶﴾ فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ
رُسُلَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ؕ﴿۴۷﴾ يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ
وَالسَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴿۴۸﴾ وَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ
يَوْمَئِذٍ مُّقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ ۚ﴿۴۹﴾ سَرَابِيْلُهُمْ مِّنْ قَطِرَانٍ وَّتَغْشٰى
وُجُوْهَهُمُ النَّارُ ۙ﴿۵۰﴾ لِيَجْزِيَ اللّٰهُ كُلَّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ
سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۵۱﴾ هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ وَلِيُنْذَرُوْا بِهٖ وَلِيَعْلَمُوْٓا
اَنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّلِيَذَّكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۵۲﴾ ع

Marfat.com

رکوع: ۷۔ (اور یہ خیال مت کرو کہ اللہ تعالیٰ بے خبر ہے ان کرتوتوں سے جو یہ ظالم کر رہے ہیں۔ وہ تو انھیں ڈھیل دے رہا ہے اس دن کیلیے جس میں نگاہیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی، وہ سر اٹھائے ہوئے بھاگ رہے ہوں گے، ان کی پلکیں جھپکنے نھیں پائیں گی اور ان کے دل اڑے جا رہے ہوں گے۔ اور خبردار کیجئے لوگوں کو اس دن سے جس دن ان پر عذاب آ دھمکے گا تو یہ اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے کہیں گے کہ اے ہمارے رب! ہمیں تھوڑی سی مہلت اور دے دے، ہم تیری دعوت قبول کرلیں گے اور رسولوں علیہم السلام کی پیروی کریں گے...... کیا تم اس سے پہلے قسمیں نھیں اٹھایا کرتے تھے کہ تمہیں یہاں سے کہیں جانا نھیں۔ اور تم ان لوگوں کی (متروکہ) بستیوں میں آباد رہے ہو جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم ڈھایا ہے اور یہ بات تم پر خوب واضح ہو چکی تھی کہ ہم نے ان کے ساتھ کیسا برتاؤ کیا تھا، اور ہم نے بھی بیان کی تھیں تمھارے لیے طرح طرح کی مثالیں۔ (اور انھوں نے اپنی ساری چالیں چلیں اور اللہ تعالیٰ کے پاس ان کی چالوں کا توڑ تھا، اگرچہ ان کی چالیں ایسی تھیں کہ اس سے پہاڑ بھی اپنی جگہ سے ٹل جاتے۔ آپ اللہ تعالیٰ کے بارے میں یہ خیال نہ کیجئے کہ وہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی کرنے والا ہے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ بڑا زبردست ہے، بدلہ لینے والا ہے۔ اس دن کو یاد رکھو جس دن یہ زمین دوسری زمین سے بدل دی جائے گی اور آسمان بھی (دوسرے آسمان سے بدل دیے جائیں گے) اور سب لوگ حاضر ہو جائیں گے اللہ تعالیٰ کے حضور میں جو ایک ہے اور سب کو سنبھالنے والا ہے۔ (اور تم اس دن مجرموں کو دیکھو گے، زنجیروں میں جکڑا ہوا۔ ان کے لباس تارکول کے ہوں گے۔ اور ان کے چہرے کو آگ ڈھانپ رہی ہوگی تاکہ اللہ تعالیٰ بدلہ دے ہر جان کو اس کی کمائی کا۔ بیشک اللہ تعالیٰ بڑی جلدی حساب چکانے والا ہے۔ (یہ (قرآن) لوگوں کیلیے ایک پیغام ہے تاکہ اس کے ذریعے انھیں خبردار کر دیا جائے اور تاکہ وہ جان لیں کہ صرف وہی ایک معبود ہے تاکہ عقلمند لوگ اس کو اچھی طرح ذہن نشین کرلیں۔)

وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ ۭ اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُ ۝۴۲ مُهْطِعِيْنَ مُقْنِعِيْ رُءُوْسِهِمْ لَا يَرْتَدُّ اِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ ۚ وَاَفْـِٕدَتُهُمْ هَوَاۗءٌ ۝۴۳ (سورۃ ابراھیم: ۴۲۔۴۳)

(اور یہ خیال مت کرو کہ اللہ تعالیٰ بے خبر ہے ان کرتوتوں سے جو یہ ظالم کر رہے ہیں۔ وہ تو انھیں ڈھیل دے رہا ہے اس دن کیلیے جس میں نگاہیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی، وہ سر اٹھائے ہوئے بھاگ رہے ہوں گے، ان کی پلکیں جھپکنے نھیں پائیں گی اور ان کے دل اڑے جا رہے ہوں گے۔)

مشکل الفاظ کی تشریح

تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُ. شخص البصر سے ہے۔ اس کا معنی ہے نگاہ کا ٹکٹکی لگ جانا، نگاہوں کا پھٹے کا پھٹا رہ جانا، مُهْطِعِيْنَ . هطع. هطوعا سے ہے، اس کا معنی ہوتا ہے ڈرتے اور کانپتے ہوئے تیزی سے آگے بڑھتے جانا۔ المقنع راسه اس آدمی کو کہتے ہیں جو اپنا سر اٹھائے ہوئے ہو۔

آنحضرت ﷺ کو تسلی

آیت میں خطاب بظاہر نبی کریم ﷺ سے ہے، لیکن اس میں جو شدید عتاب ہے اس کا تعلق قریش سے ہے۔ آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں سے کہا جا رہا ہے کہ قریش جو اذیت رسانیوں میں روز بروز دلیر ہوتے جا رہے ہیں اور آپ ؐ کی تمام تر کوششوں کے باوجود وہ راہ راست کی طرف راغب نھیں ہوتے بلکہ آپ ؐ کا منہ چڑاتے اور تمسخر اڑاتے ہیں اور اس پر پروردگار انھیں بظاہر کوئی سزا نھیں دے رہا ہے تو آپ ؐ یہ خیال نہ کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ان کے کرتوتوں سے واقف نھیں۔ یہ جو کچھ کر رہے ہیں ان کی ایک ایک بات اور ایک ایک حرکت اللہ تعالیٰ کی نگاہوں میں ہے۔ ہماری طرف سے گرفت میں تاخیر اس لیے نھیں کہ ہم انھیں معاف کر دینا چاہتے ہیں بلکہ تاخیر اس لیے ہے کہ ہم انھیں ایک سخت ترین عذاب کی طرف ڈھیل دیتے ہوئے لے

Marfat.com

جارہے ہیں اور وہ عذاب ایسا ہولناک ہوگا کہ اسے دیکھتے ہی ان کی آنکھیں پتھرا جائیں گی اور یہ سر اٹھائے ہوئے بے قابو ہو کر بھاگے چلے جارہے ہوں گے۔ اور انھیں اتنا ہوش نھیں ہوگا کہ وہ اپنے آپ کو روک سکیں یا اپنا جائزہ لے سکیں۔ خوف کی گرفت ان کے تمام حواس پر غالب آچکی ہوگی۔ ان کی آنکھیں جھپکنے سے عاجز ہو جائیں گی اور دل کے احساسات دہشت کی گرفت میں اپنی اصل حیثیت کھو چکے ہوں گے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس وقت کا نقشہ کھینچا جارہا ہے جب لوگ میدانِ حشر کی طرف بھاگ رہے ہوں گے اور کفار کی بھاگتے ہوئے یہ کیفیت ہوگی جس کی منظر کشی کی گئی ہے جنھیں اس آنے والے دن کا یقین نھیں، وہ تو ممکن ہے محض اس کو ڈراوا سمجھ کر نظر انداز کر دیں لیکن جس کے سامنے قیامت اور حشر حقیقتِ ثابتہ ہے اس کیلیے اس سے کوئی فرق نھیں پڑتا کہ دنیا میں پکڑنے کی بجائے آخرت تک انھیں مہلت کیوں دی گئی۔

وَاَنْذِرِ النَّاسَ يَوْمَ يَاْتِيْهِمُ الْعَذَابُ فَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رَبَّنَآ اَخِّرْنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ نُّجِبْ دَعْوَتَكَ وَنَتَّبِعِ الرُّسُلَ ۭ اَوَلَمْ تَكُوْنُوْٓا اَقْسَمْتُمْ مِّنْ قَبْلُ مَا لَكُمْ مِّنْ زَوَالٍ ﴿۴۴﴾ (سورۃ ابراھیم : ۴۴)

(اور خبردار کیجئے لوگوں کو اس دن سے جس دن ان پر عذاب آدھمکے گا تو یہ اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے کہیں گے کہ اے ہمارے رب! ہمیں تھوڑی سی مہلت اور دے دے، ہم تیری دعوت قبول کرلیں گے اور رسولوں کی پیروی کریں گے...... کیا تم اس سے پہلے قسمیں نھیں اٹھایا کرتے تھے کہ تمہیں یہاں سے کہیں جانا نھیں۔)

آنحضرت ﷺ سے فرمایا جارہا ہے کہ آج یہ کفارِ قریش اگر آپؐ کی بات مان کے نھیں دے رہے ہے تو آپؐ اس کی پرواہ نہ کریں۔ البتہ اپنی ذمہ داری کی ادائیگی کیلیے آنے والے عذاب سے ضرور ڈرائیں۔ اور انھیں اچھی طرح باخبر کر دیں کہ عذاب کا آنا تم سے دور نھیں لیکن تمہیں اندازہ نھیں کہ اس دن تمھاری بے بسی کس حال کو پہنچ چکی ہوگی۔ عذاب کا پہلا جھٹکا لگتے ہیں تمھاری یہ رعونت ہوا ہو جائے گی اور تم اللہ تعالیٰ سے عاجزی کرنے لگو گے کہ ہمیں ایک مختصر سی مدت کیلیے مہلت دے دی جائے۔ یعنی ہمیں مزید کچھ دن جینے کا موقع دیا جائے تاکہ ہم آپ کی دعوت کو قبول کرلیں کہ آپ نے سالوں تک جس بات کی طرف ہمیں بلایا ہے اور ہم نے اس کی پرواہ نھیں کی اس وقت تم اس کیلیے مہلت مانگو گے کہ ہمیں زندگی کا ایک اور موقع دیا جائے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی اس دعوت کو جسے پیغمبر لے کر آئے ہیں اسے قبول کرلیں اور رسولوںؑ کی پیروی کریں۔ لیکن اس کے جواب میں پروردگار ارشاد فرمائے گا کہ آج تم مزید مہلت مانگتے ہو، کل تک تمھاری حال یہ تھا کہ تمہیں دنیا سے چلے جانے کا یقین نھیں آتا تھا اور تم اس بات کو باور کرنے کیلیے تیار نھیں تھے کہ کبھی تمہیں بھی زوال آسکتا ہے بلکہ تم قسمیں کھا کھا کے یہ کہتے تھے کہ جس آنے والی زندگی سے تم ہمیں ڈراتے ہو وہ ایک بہکاوے کے سوا اور کچھ نھیں۔ اور تم کسی قیمت پر اپنی ضد سے ٹلنے والے نھیں تھے، اب آخر تمھاری وہ قسمیں اور وہ ڈینگیں کہاں گئیں جس نے تمہیں دنیوی زندگی میں نہ جانے کیا بنا رکھا تھا۔

وَّسَكَنْتُمْ فِيْ مَسٰكِنِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَتَبَيَّنَ لَكُمْ كَيْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ وَضَرَبْنَا لَكُمُ الْاَمْثَالَ ﴿۴۵﴾

(اور تم ان لوگوں کی (متروکہ) بستیوں میں آباد رہے ہو جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم ڈھایا ہے اور یہ بات تم پر خوب واضح ہو چکی تھی کہ ہم نے ان کے ساتھ کیسا برتاؤ کیا تھا، اور ہم نے بھی بیان کی تھیں تمھارے لیے طرح طرح کی مثالیں۔) (سورۃ ابراھیم:۴۵)

تاریخ کی یاددہانی

کفار کی آہ و بکاہ اور زندگی میں مہلت دینے کی درخواست پر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ تم تو اس طرح درخواست پیش کر رہے ہو جیسے تم اچانک پکڑے گئے ہو، حالانکہ ہر آنے والے رسولؑ نے تمہیں قیامت کی خبر دی اور دنیا کی بے ثباتی اور تمھاری زندگیوں کی ناپائیداری کا ہمیشہ تمہیں یقین دلایا اور مزید یہ کہ تمھارے سامنے ابھی تک ان آبادیوں کے کھنڈرات بکھرے ہوئے ہیں اور جن میں سے بعض آبادیوں میں تم سکونت بھی رکھتے ہو جن پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آچکا ہے اور جو اپنی بداعمالیوں کے باعث اپنے ہولناک انجام کو پہنچیں۔ ان کی تاریخ دیکھ کر اور ان کے حالات سن کر یہ جاننا کوئی مشکل نھیں تھا کہ تمہیں بھی ایک دن ایسے حالات سے سابقہ پیش آئے گا۔ لیکن تم نے کسی چیز کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا اور آج اس کا انجام تمھارے سامنے ہے۔

Marfat.com

وَقَدْ مَكَرُوْا مَكْرَهُمْ وَعِنْدَاللّٰهِ مَكْرُهُمْ ؕ وَاِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ ﴿۴۶﴾

(اورانھوں نے اپنی ساری چالیں چلیں اوراللہ تعالیٰ کے پاس ان کی چالوں کا توڑ تھا، اگرچہ ان کی چالیں ایسی تھیں کہ اس سے پہاڑ بھی اپنی جگہ سے ٹل جاتے۔) (سورۃ ابراھیم:۴۶)

حق و باطل کی کشمکش میں اہلِ باطل نے کبھی ایسا نھیں ہوا کہ اپنے ترکش کا کوئی تیر چلانے سے روک لیا ہواور اپنی کوئی ایسی تدبیر جس سے اسلامی قوت کونقصان پہنچایا جاسکتا ہواسے بروئے کارلانے سے احتراز کیا ہو۔ان کے دارالندوہ میں مشورے بہت سی زندگیوں کی تجربات کانچوڑاور بہت سے عقلمندوں کی کمالِ عقل کاظہور ہوتے تھے۔وہ اپنے تئیں خیال کرتے تھے کہ ہماری اس تدبیر کاجواب کسی سے ممکن نھیں ہوگا۔لیکن اللہ تعالیٰ کی تائید ونصرت اوراس کی تدبیروں کے سامنےان کی تمام تدبیریں دھری رہ گئیں۔اور بالآخراللہ تعالیٰ نے حق کوسرخرو کیااور باطل کورسوا کیا۔

فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ﴿۴۷﴾ (سورۃ ابراھیم : ۴۷)

(آپ اللہ تعالیٰ کے بارے میں یہ خیال نہ کیجئے کہ وہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی کرنے والا ہے۔یقیناً اللہ تعالیٰ بڑا زبردست ہے، بدلہ لینے والا ہے۔)

بارِ دگر تسلی

آنحضرت ﷺ کی تسلی کیلیے ایک تو سابقہ آیت میں یہ فرمایا گیا کہ آپ ان ظالموں کی تدبیروں اور سازشوں سے دلبرداشتہ نہ ہوں۔ ان لوگوں نے ہردور میں ایسی ہی چالیں چلیں۔لیکن جب اللہ تعالیٰ کی تائیدونصرت آئی توان کی ساری تدبیریں اکارت ہوکے رہ گئیں۔اللہ تعالیٰ کاوعدہ ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے رسولوںؑ اوران پرایمان لانے والوں کی مدد کرتا ہے۔ انا لننصرو الذین امنوا فی الحیوۃ الدنیا پروردگار کا یہ وعدہ آج بھی اپنی جگہ قائم ہے۔آپ یہ خیال نہ کریں کہ وہ اپنے وعدے کے خلاف بھی جاسکتا ہے۔البتہ وہ یہ بہتر جانتا ہے کہ پیغمبرؑ اوراس پرایمان لانے والوں کی مدد کاوقت کونسا ہے۔جیسے ہی وہ وقت آئے گا توپھرآپ دیکھیں گے کہ اس کی ہیبت اور غلبے کے سامنے کوئی نھیں ٹھہر سکے گااور جب وہ انتقام لے گاتوحق وعدل کاکوئی دشمن ایسا نھیں ہوگا جواپنے کیفرکردار کونہ پہنچے۔

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴿۴۸﴾ (سورۃ ابراھیم : ۴۸)

(اس دن کو یاد رکھو جس دن یہ زمین دوسری زمین سے بدل دی جائے گی اور آسمان بھی (دوسرے آسمان سے بدل دیے جائیں گے) اور سب لوگ حاضر ہوجائیں گے اللہ تعالیٰ کے حضور میں جوایک ہے اور سب کوسنبھالنے والا ہے۔)

جس طرح ایک ہمدرد وغمگسار باپ اپنے بگڑے ہوئے بیٹے کوراہِ راست پرلانے کیلیے کبھی پیرایۂ بیان بدلتا ہے اور کبھی لہجہ تبدیل کرتا ہے،کبھی الفاظ کوشہد میں ڈبو کے نکالتا ہے اور کبھی اسے خونِ جگر کی آب دیتا ہے۔مقصود یہ ہوتا ہے کہ کسی طرح بگڑا ہوا بچہ یا نوجوان بات کوسمجھنے کیلیے آمادہ ہوجائے۔پروردگار اپنے بندوں پرماں باپ سے بھی زیادہ رحیم وکریم ہے اوراس کے پیغمبر اسی رحم وکرم کے عکاس ہوتے ہیں۔اس لیے ان پرجوکتاب اترتی ہے وہ ان تمام اوصاف کی غماز ہوتی ہے۔چنانچہ پیشِ نظر آیات میں بھی ہم کچھ ایسی ہی کیفیت محسوس کرتے ہیں۔کبھی دنیا ہی میں آنے والے عذاب کا حوالہ دیا جارہا ہے،کبھی اپنے قانون اوراپنی سنت کے طرف اشارہ کرکے قریش کوتوجہ دلائی جارہی ہے اور کبھی قیامت کے تذکرے اوراس دن پیش آنے والے حالات سے طبیعتوں کونرم کرنے کی کوشش ہورہی ہے۔چنانچہ اس آیتِ کریمہ میں دعوتی تسلسل ہی کاایک پیرایہ بدل کرارشادفرمایا جارہا ہے کہ تم ہزارانکارکرولیکن یہ بات انکار سے ٹل نھیں سکتی کہ بہرحال موت آئے گی۔اورایک ہمہ گیر موت قیامت کی صورت اختیار کرجائے گی۔اس دنیا کی صف لپیٹ دی جائے گی اور تمہیں اپنی زندگی کے اعمال کی جواب دہی کیلیے عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کردیا جائے گا۔کاش تم اس دن اپنی بے بسی، اجنبیت اورتنہائی کومحسوس کرسکو کہ تمھارے پاؤں تلے جوزمین ہوگی وہ،وہ زمین نھیں ہوگی جس سے تم دنیا میں مانوس رہے ہو۔اوروہ آسمان نھیں ہوگا جس

Marfat.com

سے برستی ہوئی روشنی اور اترتے ہوئے حُسن کو تم دیکھنے کے عادی ہو۔ یہ تو دنیا ہی اور ہوگی۔ ہر چیز بدل دی جائے گی۔ اور پھر اس دن اپنی قبروں سے نکلنے والے اور میدانِ حشر کی طرف بڑھنے والے اس طرح بے محابا بڑھیں گے کہ نہ کوئی مددگار ساتھ ہوگا اور نہ کوئی سفارشی، نہ کوئی دلجوئی کرنے والا اور نہ کوئی سہارا دینے والا۔ واسطہ ہوگا تو صرف ایک اللہ تعالیٰ سے، جو اپنی الوہیت اور حاکمیت میں یکتا ہوگا۔

وَتَرَى الْمُجْرِمِينَ يَوْمَئِذٍ مُّقَرَّنِينَ فِي الْأَصْفَادِ ﴿٤٩﴾ سَرَابِيلُهُم مِّن قَطِرَانٍ وَتَغْشَىٰ وُجُوهَهُمُ النَّارُ ﴿٥٠﴾ لِيَجْزِيَ اللَّهُ كُلَّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ ۚ إِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ﴿٥١﴾ (سورۃ ابراھیم : ۴۹، ۵۰، ۵۱)

(اور تم اس دن مجرموں کو دیکھو گے، زنجیروں میں جکڑے ہوئے ان کے لباس تارکول کے ہوں گے۔ اور ان کے چہرے کو آگ ڈھانپ رہی ہوگی تاکہ اللہ تعالیٰ بدلہ دے ہر جان کو اس کی کمائی کا۔ بیشک اللہ تعالیٰ بڑی جلدی حساب چکانے والا ہے۔)

اندازہ فرمائیے کہ پروردگار تو حاکمیت کے جلال میں ہوگا اور پیش ہونے والے انسان مجرموں کی صورت زنجیروں اور بیڑیوں میں جکڑے ہوئے ہوں گے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ ان کے گلے میں طوق بھی ہوں گے تو یہ بھی غلط نہیں، کیونکہ اصفاد کا لفظ زنجیروں، بیڑیوں اور طوقوں سب پر بولا جاتا ہے۔ نہ اپنی مرضی سے چل سکیں گے، نہ سر اوپر اٹھا سکیں گے، نہ آسانی سے حرکت کر سکیں گے اور ذلت کا عالم یہ ہوگا کہ ان کا لباس تارکول کا ہوگا۔ سرابیل، سربال کی جمع ہے۔ یہ قمیض کو بھی کہتے ہیں اور لباس کو بھی۔ اور قطران گندھک پر بھی بولا جاتا ہے، لیکن عام طور پر تارکول پر بولا جاتا ہے۔ اور یہ دونوں ہی آتش پذیر مادے ہیں کہ ایک طرف تو شدتِ عذاب انتہا کو پہنچی ہوگی اور دوسری طرف ذلت کی بھی کوئی انتہا نہیں ہوگی۔ یہ دراصل بدلہ ہوگا ہر شخص کے اعمال کا۔ کیونکہ وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے مسجودِ ملائک بنایا لیکن اس نے اپنے آپ کو اس حد تک ذلیل کیا کہ بتوں کو اپنا مسجود بنا لیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے عزت راس نہ آئی اور ذلیل ہو کر اس نے خوشی محسوس کی۔ جس شخص نے زندگی میں اپنے لیے یہ رویہ اختیار کیا اسے قیامت کے دن یقیناً ایسی ہی سزا ملنی چاہیے تھی۔ یہ نہ سمجھا جائے کہ یہ شدت و ذلت کا عذاب اربوں کھربوں مخلوق کو دیا جا رہا ہوگا جبکہ ابھی اس کا تفصیلی حساب ہونے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ حساب کب تک ہو سکے گا۔ اس کے جواب میں فرمایا کہ تمہیں اس کا فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں، اللہ تعالیٰ بہت جلد حساب چکانے والا ہے۔ اس کی قدرت سے کچھ بعید نہیں۔ آنحضرت ﷺ نے محض اس بات کو قریب الفہم کرنے کیلیے فرمایا کہ اس سرعتِ حساب کو یوں سمجھو کہ صبح حساب شروع ہوگا اور دوپہر تک ختم ہو جائے گا۔

هَٰذَا بَلَاغٌ لِّلنَّاسِ وَلِيُنذَرُوا بِهِ وَلِيَعْلَمُوا أَنَّمَا هُوَ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ وَلِيَذَّكَّرَ أُولُو الْأَلْبَابِ ﴿٥٢﴾

(یہ (قرآن) لوگوں کیلیے ایک پیغام ہے تاکہ اس کے ذریعے انھیں خبردار کر دیا جائے اور تاکہ وہ جان لیں کہ صرف وہی ایک معبود ہے تاکہ عقلمند لوگ اس کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیں۔) (سورۃ ابراھیم :۵۲)

آخری پیغام

یہ قرآن تمام نوعِ انسانی کیلیے آخری پیغام ہے جسے قرآن کریم نے ایک دوسری جگہ موعظۃ من ربکم فرمایا ہے۔ انسانوں کی ہدایت اور ان کی بھلائی کیلیے اس سے بہتر کوئی نسخۂ شفا نہیں۔ ان کی تمام ترخرابیوں کا دارومدار اس بات پر ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو اِلٰہ ماننے سے انکار کرتے ہیں اور یا اسے اِلٰہ مان کر دوسری قوتوں کو اس کا شریک بناتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انسانی زندگی تار تار ہو کر رہ گئی۔ اب اس کی بقاء اور سدھار کی صرف یہی ایک صورت ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کو ایک ہی اِلٰہ، ایک ہی معبود، ایک ہی مشکل کشا، ایک ہی ہادی، ایک ہی رہنما، ایک ہی پرورش کرنے والا اور ایک ہی دنیا اور دین کیلیے رہنمائی دینے والا تسلیم کر لیا جائے۔ اور انسان عاجز ہو کر اس کے آستانے سے وابستہ ہو جائے۔ اور اس کے عقل و دانش کے پیکر بھی یہ تسلیم کر لیں کہ تمہاری عقل کو غذا بھی وہیں سے مل سکتی ہے۔ اور جہاں تمہاری عقل سپر انداز ہو جاتی ہے، اس دنیا کی رہنمائی بھی اس کو وہیں سے مل سکتی ہے۔ مختصر یہ کہ:

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری

Marfat.com

Marfat.com

اَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْآ اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ

کیا ایمان والوں کے لیے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

هُدًى لِّلنَّاس

سُوْرَةُ الْحِجْر

Marfat.com

Marfat.com

تعارف

سُوْرَةُ الْحِجْرِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سورۃ کا نام

اس سورۂ مبارکہ کا نام الحجر ہے۔آیت 80 کے فقرے كَذَّبَ اَصْحٰبُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِيْنَ سے ماخوذ ہے۔یہ 6رکوع اور 99 آیتوں پر مشتمل ہے۔اس کے کلمات کی تعداد 654اور حروف کی تعداد 2760 ہے۔

زمانۂ نزول

یہ سورت مکی ہے، یعنی یہ ہجرت سے پہلے اور مکہ معظمہ میں نازل ہوئی ہے۔انداز بیان سے مترشح ہوتا ہے کہ اس کا نزول سابقہ سورۃ ابراہیم کے متصل زمانے میں ہوا ہے۔سورۃ ابراہیم میں تہدید و وعید کفار کیلیے کسی حد تک مدھم انداز میں تھی۔وہ اس سورۃ میں بالکل کھل کر سامنے آ گئی ہے اور آنحضرت ﷺ کو جو تسلی کسی حد تک مجمل انداز میں دی جارہی تھی اور آپؐ کی دعوت کے حوالے سے دبے لفظوں میں آپؐ کو جو اطمینان دلایا جارہا تھا اب اس کی لے نمایاں ہوگئی اور لہجہ مستحکم ہوگیا۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دلائل و براہین سے جو اساسی باتیں ان کے دماغوں میں اتاری جارہی تھیں اور وہ ہر ممکن طریق سے اس سے ابا کررہے تھے اب ان دلائل کی فراوانی میں کمی کی جارہی ہے اور ان کے انکار کے انجام کو واضح طور پر ان کے سامنے لایا جارہا ہے۔مشرکین قریش نے جس طرح مسلسل ایک سے ایک بڑھ کر نشانی کا مطالبہ جاری رکھا ہوا تھا اب ان کی طرف سے صرف نظر کیا جارہا ہے اور آنحضرت ﷺ کو درخشاں مستقبل کی نوید سنائی جارہی ہے۔حق و باطل کی مسلسل کشمکش میں آنحضرت ﷺ کیلیے جو صورتحال پیش آرہی ہے اور جس کی وجہ سے بعض دفعہ آپ کی ہمتیں جواب دینے لگتی ہیں اس سورت میں آپ کو قدم قدم پر حوصلہ دیا جارہا ہے اور ہمت کو توانا کیا جارہا ہے۔

مضامین

مضامین اس سورۃ کے بھی وہی ہیں جو باقی مکی سورتوں کے ہیں البتہ ان کے بیان کرنے میں پہلے کی نسبت استعلا میں اضافہ ہوگیا ہے۔اب اگرچہ تفہیم کا انداز باقی ہے اور نصیحت بھی ساتھ ساتھ کی جارہی ہے لیکن زور اس بات پر دیا جارہا ہے کہ تم جو اسلام کو قبول کرنے سے اب تک قاصر رہے ہو تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تفہیم میں کمی رہی ہو یا نصیحت میں ہمدردی و خیرخواہی کم تھی یا کہیں علمی دلائل میں کمزوری تھی۔یہ سب باتیں اپنی جگہ موجود تھیں لیکن مشکل یہ تھی کہ تمہارے اندر وہ سنجیدہ رویہ موجود نہیں تھا جو کسی سنجیدہ بات کو سمجھنے کیلیے ضروری ہوتا ہے۔جب کوئی قوم مقصد حیات سے صرف نظر کرکے ضروریات زندگی اور خواہشاتِ نفس کو اپنا ہدف بنالیتی ہے اور اسی کیلیے رات دن محنت کرتی ہے اور اسی کو زندگی کا حاصل سمجھ کر سب کچھ اس کے قدموں میں ڈال دیتی ہے تو ایسی قوم کو تفہیم و تبیین اور دلائل کے زور سے کوئی بات سمجھانا آسان نہیں رہتا۔اب اس کیلیے ایک ہی راستہ ہے کہ انھیں تخویف و ترغیب کے ذریعے راہِ راست پر لانے کی کوشش کی جائے اور انھیں اس بات کا یقین دلا دیا جائے کہ اگر تم اپنی حالت بدلنے کیلیے تیار نہیں ہو تو پھر یاد رکھو کہ تمہاری تباہی تمہارے سر پر تلی کھڑی ہے۔

البتہ اس سورت میں ایک چیز خاصی نمایاں ہے کہ جابجا کفار کی طرف سے اٹھنے والے سوالوں کے جواب دیے گئے ہیں۔سوالوں کا ذکر نہیں کیا گیا لیکن جواب اس انداز میں دیا گیا ہے کہ سوال خود بخود سامنے آ کھڑا ہوتا ہے۔اس کا فائدہ یہ ہوا ہے کہ دعوت و تبلیغ کے راستے کے کئی کانٹے صاف ہوگئے اور قریش کی طرف سے بعض مطالبات کی قلعی کھول دی گئی ہے۔

Marfat.com

رُكُوْعَاتُهَا ٦	سُوْرَةُ الْحِجْرِ مَكِّيَّةٌ	اٰيَاتُهَا ٩٩

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓرٰ قف تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَقُرْاٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿١﴾
رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ ﴿٢﴾ ذَرْهُمْ يَاْكُلُوْا
وَيَتَمَتَّعُوْا وَيُلْهِهِمُ الْاَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿٣﴾ وَمَآ اَهْلَكْنَا
مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ ﴿٤﴾ مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ
اَجَلَهَا وَمَا يَسْتَاْخِرُوْنَ ﴿٥﴾ وَقَالُوْا يٰاَيُّهَا الَّذِيْ نُزِّلَ عَلَيْهِ
الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ ط ﴿٦﴾ لَوْ مَا تَاْتِيْنَا بِالْمَلٰٓئِكَةِ اِنْ كُنْتَ مِنَ
الصّٰدِقِيْنَ ﴿٧﴾ مَا نُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ اِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوْٓا اِذًا
مُّنْظَرِيْنَ ﴿٨﴾ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴿٩﴾ وَ
لَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ شِيَعِ الْاَوَّلِيْنَ ﴿١٠﴾ وَمَا يَاْتِيْهِمْ
مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿١١﴾ كَذٰلِكَ نَسْلُكُهٗ فِيْ
قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿١٢﴾ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَقَدْ خَلَتْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿١٣﴾
وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ فَظَلُّوْا فِيْهِ يَعْرُجُوْنَ ﴿١٤﴾
لَقَالُوْٓا اِنَّمَا سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُوْرُوْنَ ﴿١٥﴾ ع

Marfat.com

رکوع: ا۔ (ا ل ر...... یہ آیات ہیں کتابِ الٰہی اور ایک واضح قرآن کی۔ ۱) وہ وقت آئے گا جب یہ لوگ جنھوں نے کفر کیا ہے تمنا کریں گے کہ کاش وہ مسلمان ہوتے۔ ۲) چھوڑ دو انھیں وہ کھائیں پئیں اور عیش کریں اور غافل رکھے انھیں جھوٹی امید عنقریب جان لیں گے۔ ۳) ہم نے کسی بستی کو ہلاک نہیں کیا مگر یہ کہ اس کیلیے معین نوشتہ رہا ہے۔۴) کوئی قوم نہ اپنی مدت مقررہ سے آگے بڑھتی ہے اور نہ پیچھے ہٹتی ہے۔ ۵) اور یہ کہتے ہیں کہ اے وہ شخص جس پر یہ ذکر اتارا گیا ہے تم تو ایک مجنون ہو۔۶) اگر تم سچے ہو تو ہمارے پاس فرشتوں کو کیوں نہیں لاتے۔ ۷) ہم فرشتوں کو نہیں اتارا کرتے مگر حق کے ساتھ، اور انھیں اس کے بعد مزید مہلت نہیں دی جاتی۔ ۸) بیشک ہم ہی نے اتارا ہے اس ذکر (قرآنِ مجید) کو اور یقیناً ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔ ۹) اور ہم نے تم سے پہلے بھی اگلی امتوں میں رسولؑ بھیجے۔ ۱۰) تو جو رسولؑ بھی ان کے پاس آتا تو وہ اس کا مذاق ہی اڑاتے۔ ۱۱) ہم اسی طرح مجرموں کے دلوں میں اس کو اتارتے ہیں۔ ۱۲) یہ اس پر ایمان نہیں لائیں گے، اور گزر چکی ہے پہلوں کی یہی روش۔ ۱۳) اور اگر ہم ان پر آسمان کا کوئی دروازہ کھول بھی دیتے اور وہ سارا دن اس میں سے اوپر چڑھتے رہتے۔ ۱۴) تب بھی وہ یہی کہتے کہ ہماری آنکھیں مدہوش کردی گئیں، ہم ایسی قوم ہیں جن پر جادو کردیا گیا۔ ۱۵)

الٓرٰ تِلْکَ اٰیٰتُ الْکِتٰبِ وَقُرْاٰنٍ مُّبِیْنٍ ۞ (سورۃ الحجر : ۱)

(ا ل ر...... یہ آیات ہیں کتابِ الٰہی اور ایک واضح قرآن کی۔ ۱)

الٓـرٰ...... حروف مقطعات میں سے ہے۔ اس پر ہم کسی حد تک تفصیل سے سورۃ البقرہ کے آغاز میں عرض کر چکے ہیں۔ اس لیے اب اس کے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ یہ آیتِ کریمہ اس سورت کی مختصر تمہید ہے جس کے فوراً بعد اصل خطبہ شروع ہوگیا ہے۔ اس تمہید میں یہ فرمایا گیا ہے کہ اس سورت کی آیات جو تمھارے سامنے ہیں یہ الکتاب کی آیات ہیں، یعنی اس کتاب کی جس کا پہلی کتابوں میں پروردگار نے وعدہ فرمایا تھا کہ انسانی بھلائی کیلیے اللہ تعالیٰ ایک مفصل کتاب نازل فرمائیں گے اور یا اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ سورت اس کتاب کا حصہ ہے یعنی قرآنِ مجید کا کہ جو اپنی ذات میں مکمل کتاب کہلانے کی مستحق ہے۔ باقی جتنی کتابیں بھی اللہ تعالیٰ کی جانب سے اتاری گئی ہیں ان کی عظمت اور افادیت میں کوئی کلام نہیں۔ البتہ اس کتاب کے مقابلے میں ان کی حیثیت اس کتاب کے ابواب کی ہے۔ کیونکہ ان میں سے کسی کتاب میں بھی نہ آج کے مسائل کا ذکر ہے اور نہ ان کے حل کا اور نہ اس کے کسی باب میں تکمیلی شان پائی جاتی ہے۔

قرآنِ مبین کا مفہوم

اور دوسری بات یہ ارشاد فرمائی ہے کہ یہ قرآنِ مبین کی آیات ہیں۔ قرآنِ مبین کا معنی ہے واضح قرآن، جس کے سمجھنے میں کوئی الجھن اور دشواری نہ ہو۔ چنانچہ جب ہم قرآن کریم کو پڑھتے ہیں اس کی بہت سی صفات میں سے یہ صفت بہت نمایاں دکھائی دیتی ہے کہ قرآنِ کریم نے جن باتوں کو ایمانیات کا درجہ دیا ہے اور جن باتوں پر ایمان لانا ضروری ہے اور جن باتوں پر ہدایت کا دارومدار ہے اور جو انسانی زندگی میں کسی نہ کسی اہمیت کی حامل ہیں قرآنِ کریم جب انھیں بیان کرتا ہے تو اس کا بیان نہایت دلآویز، دل کو موہ لینے والا، الفاظ میں شان و شوکت کا حامل اور معنی میں دل میں اتر جانے والا ہوتا ہے۔ کیونکہ قرآنِ کریم ایسی زبان ہے جو نہایت آراستہ و پیراستہ اور شگفتہ زبان ہے۔ قدرت نے آج تک اس پر کہنگی کی پرچھائیں نہیں پڑنے

Marfat.com

دی۔اس کی فصاحت وبلاغت آج تک معجزانہ شان لیے ہوئے ہے۔وہ مشکل سے مشکل بات کو بیان کرتے ہوئے بھی الفاظ سے کھیلتا ہوا نہیں گزرتا۔ اس کی زبان عربی مبین ہے اور اس کا بیان، بیانِ مبین ہے۔اس کی ایک ایک بات اس کی صداقت کی دلیل ہے۔اس کی اندرونی شہادتیں اس قدر مکمل ہیں کہ اسے کسی بیرونی شہادت کی ضرورت نہیں۔اس کے باوجود جو لوگ اسے ماننے سے انکار کرتے ہیں اور اس کیلیے معجزات کی فرمائش کرتے ہیں وہ دراصل حقیقت کے منکر ہیں اور اپنی شامت کو دعوت دے رہے ہیں۔

رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ ۝ (سورة الحجر : ۲)

(وہ وقت آئیں گے جب یہ لوگ جنھوں نے کفر کیا ہے تمنا کریں گے کہ کاش وہ مسلمان ہوتے۔ ۲)

رُبَمَا کی تحقیق

رُبَّ حرفِ جار ہے اور یہ اسم پر داخل ہوتا ہے اور جب اسے فعل پر داخل کرنا ہو تو اس کے ساتھ مَـا کافہ لگا دیتے ہیں۔اس طرح رُبَـمَـا ہو جاتا ہے۔اس کے بعد یہ فعل پر بھی داخل ہو سکتا ہے۔ رُبَّ قلت کے معنی پر دلالت کرنے کیلیے وضع کیا گیا ہے یا کثرت پر دلالت کرنے کیلیے۔علماءِ نحو کا اس مسئلہ پر کافی اختلاف ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ اس کی اصل وضع معنی قلت کیلیے ہے۔لیکن کبھی کبھی یہ کثرت کے معنی پر بھی بولا جاتا ہے۔اس آیت میں کثرت کے معنی ہی کیلیے استعمال ہوا ہے۔علامہ ابوحیان کا پسندیدہ مذہب یہ ہے کہ رُبَّ محض اثباتِ شے پر دلالت کرتا ہے۔قلت وکثرت کا مفہوم سیاقِ کلام سے معلوم ہوتا ہے۔ رُبَّ اگرچہ ماضی پر ہی بکثرت داخل ہوتا ہے لیکن یہ سمجھ لینا کہ یہ مضارع پر داخل نہیں ہو سکتا، غلط ہے۔مضارع پر بھی داخل ہوتا ہے لیکن بہت کم مواقع پر۔

کافروں کا پچھتاوا

اس آیتِ کریمہ میں یہ فرمایا گیا ہے کہ آج یہ مکے کے سربرآوردہ لوگ غرور ورعونت کے ساتھ اس کتاب کا انکار کر رہے ہیں۔اسے سننے کے روادار نہیں۔جب پڑھی جاتی ہے تو مذاق اڑاتے ہیں لیکن بہت جلد ایسے وقت آئیں گے جب یہ تمنا کریں گے کہ کاش ہم نے سرِ تسلیم خم کر دیا ہوتا، کاش ہم ایمان لے آئے ہوتے اور کاش ہم نے اسلام قبول کر لیا ہوتا۔یہ وقت دنیا میں بھی آئیں گے اور آخرت میں بھی آئیں گے۔ فتح مکہ کے موقع پر جب آنحضرت ﷺ نے مکہ سے ایک فاصلے پر پہنچ کر رات کو جگہ جگہ آگ جلانے کا حکم دیا تو یوں معلوم ہوا کہ جیسے پورا جنگل آگ میں جل اٹھا ہے اور اس نے مکے کا محاصرہ کر لیا ہے۔مکے کے لوگ خوفزدہ ہو کر گھروں سے نکل کر اس آگ کو دیکھنے لگے لیکن مکے سے نکلنے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔بعض لوگوں نے آگے بڑھ کر اس آگ کی حقیقت معلوم کرنے کی کوشش کی، انھیں میں ابوسفیان بھی تھے۔حضرت عباسؓ غالباً پہرے پر تھے کہ انھوں نے ابوسفیان کو دیکھ لیا اور اپنی سواری پر پیچھے بٹھا کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں لے گئے۔تو آنحضرت ﷺ نے ابوسفیان سے پوچھا کہ کیا تمہیں ابھی بھی یقین نہیں آیا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں۔انھوں نے باوجود اس کے کہ ابھی وہ مسلمان نہیں ہوئے تھے جواب دیا کہ اگر اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور معبود ہوتا، آج وہ ہمارے کام آتا۔اس جواب میں کیا یہ تمنا مضمر محسوس نہیں ہوتی کہ کاش ہم مسلمان ہو چکے ہوتے۔اسی طرح فتح مکہ کے بعد جب آنحضرت ﷺ نے کعبۃ اللہ کے دروازے میں کھڑے ہو کر قریش کو خطاب فرمایا تو جب آپؐ نے ان سے یہ سوال کیا کہ بتاؤ آج میں تم سے کیا سلوک کرنے والا ہوں تو کیا ان میں سے ایک ایک شخص دل میں یہ خیال نہیں کر رہا تھا کہ کاش ہم مسلمان ہوتے، ہمیں یہ وقت نہ دیکھنا پڑتا۔اسی طرح قیامت کے دن بھی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کافر اس بات کی تمنا کریں گے۔ طبرانی نے حضرت جابرؓ سے ایک حدیث نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ میری امت کے کئی گنہگار دوزخ میں جائیں گے۔کچھ عرصہ بعد کافر انھیں طعنہ دیں گے کہ تم تو اپنے آپ کو مسلمان کہا کرتے تھے، لیکن تمہارا انجام بھی ہم سے مختلف نہیں۔تمہارے ایمان نے تمہیں کوئی نفع نہ

Marfat.com

دیا۔ چنانچہ ایک وقت آئے گا جب اللہ تعالیٰ ان گنہگاروں کو دوزخ سے نکالنے کا حکم دیں گے۔ چنانچہ جیسے ہی یہ دوزخ سے نکلیں گے کافر بھی کوشش کریں گے کہ ہم ان کے ساتھ نکل جائیں، لیکن مسلمانوں کے نکلتے ہی دروازے بند کر دیے جائیں گے۔ اس وقت کافر چیختے ہوئے کہیں گے، کاش ہم مسلمان ہوتے، تو اپنی کمزوریوں کی سزا بھگتنے کے بعد ہمیں بھی یہاں سے نکلنے کی اجازت مل جاتی۔

ذَرْهُمْ يَاْكُلُوْا وَيَتَمَتَّعُوْا وَيُلْهِهِمُ الْاَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ۝ (سورة الحجر : ۳)
(چھوڑ دو انھیں وہ کھائیں پئیں اور عیش کریں اور غافل رکھے انھیں جھوٹی امید عنقریب جان لیں گے۔ ۳)

دین سے بیزاری کا حقیقی سبب

جلد ہی وہ وقت آنے والا ہے جب یہ لوگ اپنے کفر پر پچھتائیں گے اور آرزو کریں گے کہ کاش ہم نے اسلام کا راستہ اختیار کیا ہوتا لیکن آج آپؐ جیسی عظیم شخصیت، آپؐ جیسا عظیم پیغمبر، آپؐ جیسی دعوت و نصیحت اور آپؐ جیسی گہری ہمدردی و موعظت کے باوجود یہ لوگ آپؐ کی بات سن کے نہیں دیں گے کیونکہ آپؐ کی دعوت زندگی کے بارے میں گہری بصیرت پر مبنی ہے۔ آپؐ ایک ایسی بات کی دعوت دے رہے ہیں جو اس طلسم رنگ و بو کی حقیقت کو جانے بغیر سمجھ نہیں آسکتی۔ حقیقت شناسی تو بہت دور کی بات ہے یہ لوگ ابھی تک بچپنے سے باہر نہیں نکلے۔ جس طرح ایک بچہ زندگی کی کسی حقیقت کی طرف متوجہ نہیں ہوتا اسے دلچسپی ہوتی ہے تو کھانے پینے کی چیزوں میں، مٹھائیوں میں یا کھلونوں میں، کیونکہ وہ زندگی کو اس کے سوا کچھ نہیں جانتا کہ یہ ایک کھیلنے کا موقع ہے، دل بستگی کے دن ہیں جو جی میں آجائے اسے حاصل کرنے کی ضد ہے اور ہر چیز پر کھلونے کی طرح قبضہ کرنے کا شوق ہے، ہر چیز کو ہتھیا لینے کی ہوس ہے۔ ظاہر ہے کہ جس کا زندگی کے بارے میں یہ تصور ہوگا وہ تو ظاہری زندگی کے لڑکپن سے بھی نکل نہیں پاتا، چہ جائیکہ باطنی اور معنوی زندگی کا سفر طے کرنے کیلیے تیار ہو جائے۔

زندگی چند حقائق کا نام ہے جس میں خوبصورتیاں بھی ہیں اور تلخیاں بھی، جس میں کچھ حاصل کرنے کی خواہشیں بھی ہیں اور کچھ کھو دینے کے حوصلے بھی۔ اس میں کچھ موہوم آرزوئیں بھی ہیں اور کچھ اولوالعزمیاں بھی۔ اس میں کامیابیوں کی رفعتیں بھی ہیں اور ناکامیوں کی عبرتیں اور حسرتیں بھی۔ یہ درحقیقت اپنے آپ کو کچھ بنانے کے دن ہیں۔ ایک آنے والی دنیا کی تیاری کے دن ہیں۔ اس میں شعور اور عقل کا قدم قدم پر امتحان بھی ہے۔ اور امیدوں اور آرزوؤں کا ہیجان بھی۔ زندگی کے ہر مرحلے پر غور و فکر کی دعوت ہے اور سوچ کے دائرے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جو شخص اس رنگا رنگ زندگی سے قوسِ قزح تو بنانا چاہتا ہے اور زندگی کی ضروریات اور خواہشات کو پورا کرنا تو چاہتا ہے لیکن اس کی حقیقت کو جاننے کی کوشش کرنا نہیں چاہتا۔ اور حقوق و فرائض کے تصور سے بھی دور بھاگتا ہے۔ ایسا شخص یا ایسی قوم اللہ تعالیٰ کے پیغمبرؑ کی دعوت سے کیا فائدہ اٹھا سکتی ہے۔ اس لیے نہایت فصاحت و بلاغت سے فرمایا کہ یہ لوگ اگر آپؐ کی دعوت پر کان نہیں دھرتے تو آپؐ کو اس پر دل گرفتہ نہیں ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ انھوں نے اپنے اندر کے وہ تمام سوتے خشک کر دیے ہیں جہاں سے پیغمبر کی دعوت کی قبولیت کی استعداد ابلتی ہے اور عقل و خرد کے وہ تمام پیمانے توڑ ڈالے ہیں جس میں خیر و شر اور حق و باطل کے حقائق تولے جاتے ہیں۔ البتہ ایک فکرمندی کی بات ضرور ہے کہ انسانیت کا یہ قافلہ نہ پہلے رکا ہے اور نہ اب رکے گا۔ لیکن ان کی قسمت دیکھ کر دل ڈوبنے لگتا ہے کہ جس طرح یہ زندگی گزار رہے ہیں، انھیں نہایت تلخ حقائق سے واسطہ پڑے گا اور ان کا انجام بھی وہی ہو کر رہے گا جو اس سے پہلے ایسی قوموں کا ہو چکا ہے۔

وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ ۝ مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَمَا يَسْتَاْخِرُوْنَ ۝
(ہم نے کسی بستی کو ہلاک نہیں کیا مگر یہ کہ اس کیلیے معین نوشتہ رہا ہے۔ ۴) کوئی قوم نہ اپنی مدت مقررہ سے آگے بڑھتی ہے اور نہ پیچھے ہٹتی ہے۔ ۵) (سورۃ الحجر: ۴۔۵)

Marfat.com

ایک سوال کا جواب

ان آیتوں میں ایک سوال کا جواب دیا گیا ہے جو طنز کی صورت میں اشراف قریش کی زبان پر رہتا تھا کہ اگر تم واقعی اللہ تعالیٰ کے نبی ہو اور تمہیں اللہ تعالیٰ نے اپنا خاص پیغام دے کر بھیجا ہے تو یہ معاملہ تو بہت نازک بھی ہے اور بہت سنگین بھی۔ اس پیغام کی قدر نہ کرنا بلکہ اس کا مذاق اڑانا نہ صرف ایک گناہ ہے بلکہ اتنا بڑا جرم ہے کہ جس سے بڑے جرم کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ پروردگارِ عالم شہنشاہِ کائنات ہے۔ وہ جب اپنے کسی پیغامبر کے ذریعے اپنا پیغام اہلِ زمین کے نام بھیجتا ہے تو یہ تو بالکل ایسے ہے جیسے کوئی بہت بڑا بادشاہ اپنے مقبوضہ ملک میں اپنی رعایا کے نام کوئی پیغام بھیجے اور رعایا نہ صرف اسے قبول کرنے سے انکار کرے بلکہ مسلسل اس کی توہین بھی کرے۔ اور اس کے لانے والے کی قدر و منزلت پہچاننے کی بجائے اس کا تمسخر اڑائے اور اس کو اذیتیں پہنچائے تو تصور کیجئے کہ ایسے ملک اور ایسے لوگوں سے بادشاہ کیا سلوک کرے گا۔ کیا وہ اولین فرصت میں ان کو سزا دینے کا انتظام نہیں کرے گا۔ خالقِ کائنات کا معاملہ تو اور بھی اہم ہے تو اگر تم واقعی اسی کے ایلچی ہو کے آئے ہو تو ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ہم نے جو رویہ تمہارے ساتھ اختیار کیا ہمیں اب تک اس کی سزا میں تباہ و برباد کر دیا جاتا لیکن ہم تو اب تک اپنی تمام تر گستاخیوں کے باوجود نہ صرف اپنی حالت پر قائم ہیں بلکہ روز بروز ہمارے حالات بہتر ہوتے جارہے ہیں اور تم اور تم پر ایمان لانے والے حالات کی گرفت میں آتے جارہے ہیں۔ اس کا جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ دنیا کے حکمران اپنے حوصلے، اپنی طاقت اور اپنی حکمت کے مطابق کام کرتے ہیں۔ ان کے ملک کا کوئی حصہ اگر ان کے احکام کی سرتابی کرتا ہے تو وہ اس خیال سے کہ کہیں وہ لوگ طاقت نہ پکڑ جائیں اور ہماری دسترس سے باہر ہو جائیں اور یا دوسرے لوگ ان سے متاثر ہو کر ان کے راستے پر نہ چل نکلیں۔ ان لوگوں کو سزا دینے میں جلدی کرتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ وہ انسانوں پر صرف حکومت ہی نہیں کرتا بلکہ وہ ان کا رب ہونے کی وجہ سے ربوبیت کا حق بھی ادا کرتا ہے۔ وہ اپنے بندوں کیلیے رحیم و کریم بھی ہے۔ اس لیے تا حدِ آخر وہ اپنے کرم کے تقاضوں سے صرفِ نظر نہیں کرتا اور مزید یہ کہ اس نے انسانوں اور جنوں کو رعایا کے طور پر صرف پابندِ قانون بنانے کی کوشش نہیں کی بلکہ اس نے انہیں عقل اور شعور دے کر فیصلے کی آزادی بھی بخشی کہ تم چاہو تو اللہ تعالیٰ کے قانون کی پابندی کرو اور چاہو تو تشریعی قانون کا انکار کر کے تکوینی قانون کی پیروی کرتے ہوئے اس کی زمین پر زندہ رہ سکتے ہو۔ اپنے اس فیصلے کی پابندی کرتے ہوئے وہ رسولؑ بھیجتا ہے، کتابیں اتارتا ہے، ان کے دل و دماغ کو ہموار کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے تاکہ وہ حتی الامکان اللہ تعالیٰ کے عذاب یا اس کی گرفت سے بچ جائیں۔ اور پھر اس کیلیے مہلت پہ مہلت دیتا چلا جاتا ہے کیونکہ ہوسکتا ہے کہ وہ اپنی جلد بازیوں سے کیے ہوئے فیصلوں پر پچھتاتے ہوئے راہِ راست اختیار کرلیں۔ اور یہ مہلتِ عمل اس نے ہر قوم کیلیے اس کی تخلیق کے ساتھ ہی لوحِ محفوظ میں محفوظ کر دی ہے۔ چنانچہ جب تک وہ مہلت ختم نہیں ہوتی اس وقت تک وہ اس قوم پر اپنا عذاب نہیں بھیجتا، لیکن جب وہ قوم اپنی مہلت کی عمر گزار دیتی ہے اور اپنے عمل سے پورے طور پر ثابت کر دیتی ہے کہ اس کے اندر کی قبولیت دم توڑ چکی ہے اور خیر کی قبولیت کا کوئی مادہ اس کے اندر باقی نہیں رہا تو پھر وہ قوم اپنے انجام کی گرفت میں اس طرح آتی ہے کہ نہ وہ اس سے بچ کر آگے بڑھ سکتی ہے اور نہ پیچھے رہ سکتی ہے اور یہ گرفت ایسی شدید ہوتی ہے کہ قوم کا ہر طبقہ برابر سطح پر اس کی گرفت میں آتا ہے۔

وَقَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْ نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ ۝٦ؕ لَوْ مَا تَاْتِيْنَا بِالْمَلٰٓئِكَةِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝٧

(اور یہ کہتے ہیں کہ اے وہ شخص جس پر یہ ذکر اتارا گیا ہے تم تو ایک مجنون ہو۔ ٦) اگر تم سچے ہو تو ہمارے پاس فرشتوں کو کیوں نہیں لاتے۔ ٧) (سورۃ الحجر: ٦-٧)

قریش کی گری ہوئی حرکت کی حقیقت

یہ قریشِ مکہ کے بگاڑ کی انتہا ہے کہ وہ آنحضرت ﷺ کو کسی مناسب طریقے سے خطاب کرنے کی بجائے طنزیہ انداز میں اور کسی حد تک حقارت کے ساتھ کہتے ہیں کہ اے وہ شخص جس پر یہ قرآن نازل کیا گیا یہ وہی انداز ہے جو عام طور پر کسی ناقابلِ ذکر آدمی سے کوئی بڑا آدمی بات کرتا ہوا اختیار کرتا ہے حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ اپنی ذاتی وجاہت، اپنے حسب نسب اور اپنی ہردلعزیزی کے باعث مکے بھر میں عزت کی نگاہ سے

Marfat.com

دیکھے جاتے تھے اور بعثت سے پہلے کوئی آدمی اس طرح آپ سے بات کرنے کی جرأت نہ کرسکتا تھا لیکن دعوت الی اللہ کا کام اس قدر مشکل اور تکلیف دہ کام ہے کہ اس کیلیے داعی کو سب کچھ داؤ پر لگانا پڑتا ہے۔اس کام کی کٹھن ذمہ داریاں اسے ہر ناگوار سے ناگوار بات بھی سننے پر مجبور کرتی ہیں۔رسالت کا فریضہ اسے ہر ایک کی بات سننے اور ہر ایک سے ہمدردی کرنے پر مجبور کرتا ہے۔وہ گالیاں سنتا ہے اور دعائیں دیتا ہے، وہ ہلکا کیا جاتا ہے لیکن شکایت نہیں کرتا۔لوگ اس صورتحال سے فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن اس کے سامنے کلمۃ الحق کی سربلندی کے سوا کوئی فکر نہیں ہوتی۔اسی صورتحال نے ان کو یہ جرأت دلائی جو اس ہلکے انداز میں طنز کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ تم تو ہمیں مجنون اور دیوانے معلوم ہوتے ہو کہ تم نے جس طرح اپنی ذات کو اس کام میں گم کردیا ہے اور اپنا نفع وضرر کا پیمانہ توڑ چکے ہو اور اپنی تکلیفوں کو محسوس کرنے کی بجائے صرف اسلام کا مستقبل تمہیں عزیز ہو کے رہ گیا ہے، یہ رویہ کسی عقلمند آدمی کا نہیں ہوتا۔مشکل یہ ہے کہ جب اقدار بدل جاتی ہیں اصول اور نظریات قدرومنزلت کھودیتے ہیں تو ہر چیز میں ایک انقلاب برپا ہوتا ہے۔خوب ناخوب ہوجاتا ہے اور ناخوب، خوب بن جاتا ہے۔قیمتی چیزیں بے قیمت ہوجاتی ہیں اور بے قیمت چیزوں کی قیمت لگنے لگتی ہے۔قریش بھی اسی بیماری کا شکار تھے۔وہ اس بات کو نہیں سمجھ سکتے کہ پیغمبر جس کام کی سربلندی کیلیے ہر چیز برداشت کررہا ہے وہ کام کتنا عظیم ہے اور اس کے مقابلے میں ذاتی احترام، مالی نقصانات، مستقبل کے اندیشے کوئی معنی نہیں رکھتے۔

جنوں کی دلیل

آپ کو مجنون ثابت کرتے ہوئے انھوں نے یہ دلیل دی کہ تم اپنے جس دعوے کیلیے ہر طرح کی قربانی دے رہے ہو، اگر اس دعوے میں کوئی سچائی ہوتی تو یقیناً اس کی تائید ونصرت کیلیے آسمان سے فرشتے اترتے، کیونکہ تم اللہ تعالیٰ کے رسولؐ ہو۔اور رسالت کا فیصلہ آسمان پر ہوتا ہے۔تم پر آسمان ہی سے کتاب اتر رہی ہے تو تمھاری تائید بھی آسمانی مخلوق فرشتوں کو کرنی چاہیے۔وہ تمھارے دائیں بائیں ہٹو بچو کہتے ہوئے نظر آئیں، تمھاری حفاظت کریں اور جو آدمی دست درازی کرے اس کے ہاتھ کاٹ دیں۔تمھارے راستے میں رکاوٹ بننے والی ہر طاقت کو کچل ڈالیں۔لیکن ان میں سے کوئی بات بھی نظر نہیں آتی تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے نبیؐ نہیں ہو۔

مَا نُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ اِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوْٓا اِذًا مُّنْظَرِيْنَ ۝۸ (سورۃ الحجر : ۸)

(ہم فرشتوں کو نہیں اتارا کرتے مگر حق کے ساتھ، اور انھیں اس کے بعد مزید مہلت نہیں دی جاتی۔ ۸)

فرشتے کب اترتے ہیں

یہ قریش کے سوال اور طنز کا جواب ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہمارے فرشتے یونہی بے مقصد زمین پر نہیں اتارے جاتے اور نہ وہ اس لیے اتارے جاتے ہیں کہ وہ زمین پر جاکر ان حقائق کو منکشف کردیں جن کی دعوت دینے کیلیے اللہ تعالیٰ کا نبیؐ آتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا منشا یہ ہے کہ لوگ اپنے فہم وشعور سے کام لے کر ان باتوں پر غور کریں جن کی دعوت لے کر اللہ تعالیٰ کا نبی مبعوث ہوتا ہے۔اللہ تعالیٰ کے نبیؐ پر صرف وہ فرشتے اترتے ہیں جو وحیِ الٰہی لے کے آتے ہیں اور یا وہ فرشتے جو اللہ تعالیٰ کے نبیؐ کی حفاظت کرتے ہیں۔اور اگر معرکۂ حق وباطل حرب وضرب تک پہنچ جائے تو پھر بعض دفعہ مسلمانوں کی نصرت کیلیے بھی فرشتے اترتے ہیں۔لیکن کسی موقع پر بھی بالعموم اللہ تعالیٰ کے پیغمبرؑ کے سوا کسی اور کو فرشتے نظر نہیں آتے۔لیکن اگر قوم کی طرف سے پیغمبر کی دعوت کو قبول کرنے کی جائے مخالفت شروع کردی جائے اور پھر یہ مخالفت بڑھتے بڑھتے اپنی انتہا کو پہنچ جائے اور ایک وقت آئے کہ قوم فیصلہ کرلے کہ اب اس نبیؐ اور اس کے ایمان لانے والوں کو زندہ نہیں چھوڑا جائے گا، اس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس قوم کی مہلتِ عمل ختم کرنے کا فیصلہ کردیا جاتا ہے اور فرشتوں کو حکم دیا جاتا ہے کہ جاؤ اس ظالم قوم کا تختہ الٹ ڈالو اور انھیں ہمیشہ کیلیے تہ وبالا کردو۔یہ ہے وہ بات جس کو حق کے لفظ سے اس آیتِ کریمہ میں تعبیر کیا گیا ہے کہ یہ حق یعنی فیصلہ لے کر اللہ تعالیٰ کے فرشتے اترا کرتے ہیں اور جب یہ فیصلہ آجاتا ہے تو پھر قوم کے کسی فرد کو ایک لمحے کی بھی مہلت نہیں دی جاتی بلکہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کیلیے تباہ وبرباد کردیے جاتے ہیں۔

Marfat.com

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴿۹﴾ (سورة الحجر : ۹)
(بیشک ہم ہی نے اتارا ہے اس ذکر (قرآنِ مجید) کو اور یقیناً ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔ ۹)

قریش کی گالی کا جواب

دو آیتیں پہلے ہم نے پڑھا ہے کہ قریش نے آنحضرت ﷺ کو اس بات پر مجنون قرار دیا کہ لوگ کہتے ہیں کہ اس پر قرآن نازل کیا گیا ہے۔ اس کا جواب آنحضرت ﷺ نے نہیں بلکہ خود پروردگار نے نہایت زوردار طریقے سے دیا ہے۔ اس مختصر آیت میں تین مرتبہ ضمیر متکلم کو استعمال کیا گیا جس سے تاکید بالائے تاکید ثابت ہوتی ہے اور پھر جمع متکلم کے صیغے کے ساتھ اس بات کا اعلان فرمایا جس کا مطلب یہ ہے کہ یقیناً یقیناً یقیناً ہم ہی نے اسے نازل کیا ہے۔ تم نے آنحضرت ﷺ کو جو گالی دی ہے وہ آپ کو نہیں بلکہ ہمیں دی ہے کیونکہ آپؐ نے نہ تو یہ کتاب خود مرتب کی ہے اور نہ ہم سے مانگ کر لی ہے۔ اس کی جو بھی ذمہ داری ہے وہ ہم پر ہے۔ البتہ اس کی تبلیغ اور اس کی تفہیم کی ذمہ داری جو رسول اللہ ﷺ ادا کر رہے ہیں وہ بھی ہم نے ان پر عائد کی ہے۔ اگر تمہیں اپنے پروردگار کی عظمت اور جلال کا کچھ بھی اندازہ ہے تو پھر تمہیں سوچنا چاہیے کہ تم نے ایک ایسی ہلکی بات کہہ کر اور قرآنِ کریم کا انکار کر کے کتنا بڑا جرم کیا ہے۔ تمہیں دو باتیں کبھی نہیں بھولنی چاہئیں کہ تم یہ سمجھتے ہو کہ تم نے اگر قرآنی دعوت کو قبول نہ کیا تو یہ دعوت رک جائے گی اور قرآنِ کریم کی فکر ختم ہو جائے گی، یہ خیالِ خام ہے کیونکہ سورۂ انعام آیت نمبر 89 میں پروردگار نے فرمایا کہ اگر یہ لوگ اس کا انکار کر دیں تو ہم یہ کام ایسے لوگوں کے سپرد کریں گے جو کبھی اس سے کفر نہیں کریں گے۔ چنانچہ قریش نے جب اسے قبول کرنے سے انکار کیا تو اللہ تعالیٰ نے انصار کے سینے اس کیلیے کھول دیے۔ چنانچہ یہ حقیقت آج تک پوری تابانیوں کے ساتھ روشن رہی ہے کہ جب بھی امتِ مسلمہ نے اللہ تعالیٰ کی اس امانت کے ساتھ خیانت کا ثبوت دیا اور اس ذمہ داری کی ادائیگی سے پہلوتہی کی تو اللہ تعالیٰ نے ایسے مسلمانوں کو مٹا دیا اور اس دور کی مضبوط کافر قوم کو اسلام کی ہدایت دے دی۔ گزشتہ صدیوں میں سب سے زیادہ نقصان تاتاریوں نے پہنچایا ہے۔ ایسا لگتا تھا کہ اسلامی تہذیب مکمل فنا کر دی گئی ہے اور اسلامی علوم فنا کے گھاٹ اتر گئے، لیکن زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ اللہ تعالیٰ نے اسی ظالم اور قاتل قوم کو اسلام قبول کرنے کی توفیق بخشی اور انہی کی اولاد نے خلافتِ عثمانیہ کا چراغ جلایا۔ اقبال نے اس کا ذکر کرتے ہوئے کہا:

ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

اور دوسری بات یہ نہیں بھولنی چاہیے کہ اس کتاب کو اللہ تعالیٰ نے اتارا ہے اور اسی نے اسکی حفاظت کی ذمہ داری اٹھائی ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ 14 صدیاں گزر گئیں لیکن اس کتاب کا ایک شوشہ نہ بدل سکا۔ اتنا طویل عرصہ دنیا کی کوئی کتاب اور کوئی دستاویز آج تک محفوظ نہیں رہی اور خود آسمانی کتابیں بھی جو یقیناً اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئیں لیکن ان کی حفاظت کا ذمہ چونکہ پروردگار نے نہیں اٹھایا تھا اس لیے وہ ترمیم اور تحریف سے محفوظ نہ رہیں۔ لیکن اس کتاب کو اللہ تعالیٰ نے صرف کتابت کے ذریعہ محفوظ نہیں رکھا جسے کسی وقت بھی اٹھایا جا سکتا ہے یا جلایا جا سکتا ہے بلکہ مسلمانوں کے سینے اس کیلیے مخزن اور مامن بنا دیے گئے۔ ہر سال رمضان المبارک میں کروڑوں لوگ اسے سنا کر اور سن کر اس کے محفوظ ہونے کی گواہی دیتے ہیں اور دشمنانِ دین بالخصوص مستشرقین اپنی تمام مساعی کے باوجود ایک لفظ کی تبدیلی نہ ثابت کر سکے۔ جن مستشرقین نے آنحضرت ﷺ کی زندگی پر مخالفانہ کتابیں لکھیں وہ بھی یہ تسلیم کیے بغیر نہ رہ سکے کہ دنیا میں قرآن کے علاوہ کوئی اور ایسی کتاب نہیں جس کا متن چودہ صدیوں تک ہر قسم کی تحریف سے یوں پاک رہا۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ شِيَعِ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۰﴾ وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۱۱﴾ كَذٰلِكَ نَسْلُكُهٗ فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۲﴾ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَقَدْ خَلَتْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۳﴾

(اور ہم نے تم سے پہلے بھی اگلی امتوں میں رسول بھیجے۔ ۱۰) تو جو رسول بھی ان کے پاس آتا تو وہ اس کا مذاق ہی اڑاتے۔ ۱۱) ہم اسی طرح مجرموں کے دلوں میں اس کو اتارتے ہیں۔ ۱۲) یہ اس پر ایمان نہیں لائیں گے، اور گزر چکی ہے پہلوں کی یہی روش۔ ۱۳) (سورة الحجر: ۱۰-۱۱-۱۲-۱۳)

Marfat.com

استہزا ہر قوم کا شیوہ

قرآنِ کریم کی تمام تر جلالتِ قدر اور غیر معمولی حفاظت کے باوجود جس کا اعتراف آپ نے گزشتہ آیت کی تشریح میں پڑھا، قرآنِ پاک پر ایمان نہ لانا کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ آنحضرت ﷺ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا جارہا ہے کہ ہم نے ہر امت کی اصلاح وہدایت کیلیے رسولؐ بھیجے اور کتابیں اتاریں مگر کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی قوم نے آسانی سے پیغمبرؑ کی دعوت کو قبول کرلیا ہو۔ ہر قوم نے پیغمبر کی دعوت کا مذاق اڑایا، تمسخر سے کام لیا بلکہ جو کچھ ان سے ہوسکا اپنی طرف سے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ اگر آپؐ کے ساتھ بھی یہ سب کچھ ہورہا ہے تو اس میں نئی بات کوئی نہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ایک دل میں دو چاہتیں، دو محبتیں کبھی اکٹھی پیدا نہیں ہوتیں۔ جس دل میں شیطانی خیالات اپنی جگہ بنا چکے ہوں، خواہشاتِ نفس نے بسیرا کرلیا ہو اور دنیا ترجیح پا چکی ہو اس دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت، اللہ تعالیٰ کے دین سے وارفتگی اور اللہ تعالیٰ کی کتاب کے اتباع کا جذبہ کبھی آسانی سے داخل نہیں ہوسکتا۔ یہ ندی کے دو کنارے ہیں جو جمع نہیں ہوسکتے۔ جو شخص دنیا ہی کو سب کچھ سمجھتا ہے اس کیلیے موت کا تصور اور آخرت کی باتیں ایک ایسے انگارے کی طرح ہیں جس سے خس وخاشاکِ دنیا جل کر خاکستر ہوجاتا ہے، ایسے لوگوں کو دین کی بات اور پیغمبرؑ کی دعوت سن کر آگ سی لگ جاتی ہے۔ اس لیے وہ کبھی ایمان لانے کی جرأت نہیں کرتے۔ ایمان اسی کو نصیب ہوتا ہے جو پیغمبرؑ کی دعوت پر غور کرتا ہے اور سنجیدگی سے سمجھنے کی کوشش کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ آہستہ آہستہ اس کے دل کو کھول دیتا ہے۔ اب وہی پیغمبرؑ کی دعوت جو اس کیلیے دل میں اترنے والی سلاخ کی طرح تھی، دل میں اترتی ہوئی شبنم بن جاتی ہے۔ وہ اسی کو اپنی گم گشتہ متاع سمجھ کر قبول کرتا ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جس پر صدیوں کی امتیں گواہی دے رہی ہیں۔ قریشِ مکہ بھی اس حقیقت سے باہر نہیں جاسکتے۔ انھیں جب تک اندر سے اٹھتی ہوئی آواز نہیں سنے گی، اس وقت تک وہ اپنی روش کو بدلنے پر قادر نہیں ہوں گے۔

وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِم بَابًا مِّنَ السَّمَاءِ فَظَلُّوا فِيهِ يَعْرُجُونَ ﴿١٤﴾ لَقَالُوا إِنَّمَا سُكِّرَتْ أَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُورُونَ ﴿١٥﴾ (سورة الحجر : ١٤.١٥)

(اور اگر ہم ان پر آسمان کا کوئی دروازہ کھول بھی دیتے اور وہ سارا دن اس میں سے اوپر چڑھتے رہتے۔ ۱۴) تب بھی وہ یہی کہتے کہ ہماری آنکھیں مدہوش کردی گئیں، ہم ایسی قوم ہیں جن پر جادو کردیا گیا۔ ۱۵)

نشانیاں دیکھ کر بھی ایمان نصیب نہیں ہوتا

جب تک قریش اور دیگر مشرکین سنجیدگی اور متانت سے آنحضرت ﷺ کی دعوت پر غور وفکر کیلیے آمادہ نہیں ہوتے اور وہ دنیا اور آخرت کی حقیقت پر تدبر سے کام نہیں لیتے اور قرآن کریم کی تعلیم کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے محض آپؐ کو زچ کرنے کیلیے نئے سے نئے معجزے اور نئی سے نئی نشانی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں اگر ہم ان کے سامنے آسمان میں کوئی دروازہ بھی کھول دیں کہ تم اگر نبی کریم ﷺ کی حقانیت کی دلیل کے طور پر کوئی نشانی دیکھنا چاہتے ہو تو لو ہم تمھارے لیے یہ دروازہ کھولے دیتے ہیں اور پھر وہ دن کے اجالے میں اس میں آتے جاتے بھی رہیں تب بھی وہ بجائے اس حق کو قبول کرنے کے یہ عذر کریں گے کہ ہم تو یہ جان ہی نہیں سکے کہ ہمیں کیا دکھایا جارہا ہے، ہمیں تو یوں لگتا ہے کہ ہماری نگاہیں بند کردی گئیں، ان پر جادو کردیا گیا، ہم بظاہر دروازے سے آئے گئے بھی لیکن کچھ نہیں دیکھ سکے بلکہ ہم تو اپنے آپ کو یوں محسوس کرتے ہیں کہ ہم تو مکمل طور پر جادو اور سحر کی زد میں ہیں اور جادو ہم پر غالب آچکا ہے۔ اس لیے ہم یہ اندازہ ہی نہیں کرسکتے کہ اصل حقیقت کیا ہے۔ یہ ہے سوچ ان لوگوں کی جو حقیقت کو حقیقت کے انداز میں دیکھنے کی بجائے ہر چیز کو اپنے مزعومات کی نگاہ سے دیکھتے اور اپنی خواہشات کے ترازو میں تولتے ہیں۔

Marfat.com

وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا وَزَيَّنَّاهَا لِلنَّاظِرِينَ ﴿١٦﴾ وَحَفِظْنَاهَا
مِنْ كُلِّ شَيْطَانٍ رَجِيمٍ ﴿١٧﴾ إِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَأَتْبَعَهُ
شِهَابٌ مُبِينٌ ﴿١٨﴾ وَالْأَرْضَ مَدَدْنَاهَا وَأَلْقَيْنَا فِيهَا رَوَاسِيَ
وَأَنْبَتْنَا فِيهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَوْزُونٍ ﴿١٩﴾ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا
مَعَايِشَ وَمَنْ لَسْتُمْ لَهُ بِرَازِقِينَ ﴿٢٠﴾ وَإِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا
عِنْدَنَا خَزَائِنُهُ وَمَا نُنَزِّلُهُ إِلَّا بِقَدَرٍ مَعْلُومٍ ﴿٢١﴾ وَأَرْسَلْنَا الرِّيَاحَ
لَوَاقِحَ فَأَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَسْقَيْنَاكُمُوهُ وَمَا أَنْتُمْ لَهُ
بِخَازِنِينَ ﴿٢٢﴾ وَإِنَّا لَنَحْنُ نُحْيِي وَنُمِيتُ وَنَحْنُ الْوَارِثُونَ ﴿٢٣﴾ وَلَقَدْ
عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِينَ مِنْكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَأْخِرِينَ ﴿٢٤﴾ وَإِنَّ
رَبَّكَ هُوَ يَحْشُرُهُمْ إِنَّهُ حَكِيمٌ عَلِيمٌ ﴿٢٥﴾

رکوع: ۲۔ (بیشک ہم نے آسمان میں برج بنائے ہیں اور ہم نے آراستہ کردیا ہے آسمان کو دیدۂ بینا رکھنے والوں کیلیے ۱۶)اور ہر شیطانِ مردود کی دراندازی سے ہم نے اس کو محفوظ کردیا ہے۔ ۱۷) ہاں، جو کوئی سن گن لینے کیلیے چوری چھپے کان لگاتا ہے تو ایک دمکتا شہاب اس کا تعاقب کرتا ہے۔ ۱۸) اور زمین کو ہم نے پھیلایا اور اس میں محکم پہاڑ گاڑ دیے اور اس میں ہر قسم کی چیزیں تناسب کے ساتھ اگائیں۔ ۱۹) اور ہم نے اس میں تمھاری معیشت کے سامان بھی رکھے اور ان کی معیشت کے بھی جن کے تم روزی دینے والے نہیں ہو۔ ۲۰) اور کوئی چیز ایسی نہیں جس کے خزانے ہمارے پاس نہ ہوں، لیکن ہم اس کو ایک معین اندازے کے ساتھ ہی اتارتے ہیں۔ ۲۱) پس ہم بھیجتے ہیں ہواؤں کو باردار بنا کر، پھر ہم آسمان سے پانی اتارتے ہیں، پھر ہم تمہیں اس سے سیراب کرتے ہیں، یہ تمھارے بس میں نہ تھا کہ تم اس کے ذخیرے جمع کر کے رکھتے۔ ۲۲) اور بیشک ہم ہی زندہ کرتے اور ہم ہی مارتے ہیں اور ہم ہی ان سب کے وارث ہیں۔۲۳) اور یقیناً ہم جانتے ہیں ان کو بھی جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں اور ان کو بھی جانتے ہیں جو بعد میں آنے والے ہیں۔ ۲۴) اور بیشک تمھارا پروردگار ہی ہے جو ان سب کو اکٹھا کرے گا۔اور بیشک وہ بڑا دانا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ ۲۵)

Marfat.com

وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّزَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ ﴿۱۶﴾ وَحَفِظْنٰهَا مِنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ﴿۱۷﴾ اِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۸﴾ (سورۃ الحجر : ۱۶۔۱۷۔۱۸)

(بیشک ہم نے آسمان میں برج بنائے ہیں اور ہم نے آراستہ کردیا ہے آسمان کو دیدۂ بینا رکھنے والوں کیلیے ۔ ۱۶) اور ہر شیطانِ مردود کی دراندازی سے ہم نے اس کو محفوظ کردیا ہے۔ ۱۷) ہاں، جو کوئی سن گن لینے کیلیے چوری چھپے کان لگاتا ہے تو ایک دمکتا شہاب اس کا تعاقب کرتا ہے۔ ۱۸)

آسمانوں میں اللہ تعالیٰ کی پھیلی ہوئی نشانیاں

اللہ تعالیٰ کے نبیوںؑ کی دعوت کے مخالفین نے جس بات سے انبیاءؑ کی دعوت کو ناکام کرنے کی کوشش کی ہے وہ آئے دن نئی سے نئی نشانیوں کا مطالبہ ہے۔ چنانچہ مشرکینِ مکہ بھی آنحضرت ﷺ سے کسی نہ کسی نشانی یعنی معجزے کا مطالبہ کرتے رہتے تھے۔ ظاہر ہے کہ معجزات دکھانا اللہ تعالیٰ کے نبیؑ کا کام نہیں، وہ تو دنیا میں انسانی ہدایت کیلیے مبعوث کیا جاتا ہے۔ البتہ پروردگار اپنے نبی کی تائید کیلیے جب چاہتا ہے کوئی معجزہ دکھا دیتا ہے لیکن امت کے مطالبوں میں کبھی کی نہیں آتی۔ اس آیتِ کریمہ میں ان کا مطالبات کے جواب میں یہ فرمایا جارہا ہے کہ تم اگر اللہ تعالیٰ کی نشانیاں دیکھنا چاہتے ہو تو اور اسی سے تمہارا ایمان وابستہ ہے تو ذرا آنکھیں کھول کے دیکھو کائنات کی وسعتوں میں اس کی کیا کمی ہے۔ سب سے پہلے آسمان کی طرف توجہ دلائی کہ دیکھو ہم نے آسمان میں کیسے برج بنائے اور کس طرح ہم نے دیدۂ بینا رکھنے والوں کیلیے آسمان کو آراستہ کیا۔ آسمان سے سورج نکلتا ہے تو خاکدانِ ارضی پر اپنے انوار کی بارش کرتا ہے۔ اپنی کرنوں سے زمین کے ایک ایک انچ کو روشن کردیتا ہے۔ چاند نکلتا ہے تو رات کی تاریکی کو اپنے حُسن کی خوبصورتی پہنا دیتا ہے۔ ستاروں کی قندیلیں اپنے حُسن کی الگ چمن آرائی کرتی ہیں، پھر ستاروں کا نظم و ترتیب اور ان کا آپس میں در و بست، حیرت انگیز آراستگی اور برجستگی کا اظہار کرتا ہے۔ جب صبح کے مطلعِ تاباں سے سورج کا ظہور ہوتا ہے تو صبح اس طرح آہستہ آہستہ گھونگٹ اٹھاتی ہے کہ آتشِ شوق بھڑک جاتی ہے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے عالم بقعۂ نور ہوجاتا ہے اور جب سورج واپسیں سفر اختیار کرتا ہے تو اپنے پیچھے لعلِ بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ جاتا ہے۔ قدم قدم پر دیکھنے والی نگاہ کہیں حیرت زدہ ہوتی ہے اور کہیں اٹک کے رہ جاتی ہے۔ لیکن اس کا معنوی حُسن اس کا اندرونی بندوبست، اس کا تکوینی نظام اور اس کے ملکوت جو انسانی حواس سے ماوراء ہیں اور جہاں آج تک سائنس کی نگاہ نہیں پہنچ سکی اور نہ اسے تصور اسے اپنے حصار میں لاسکا ہے۔ قرآنِ کریم اس سے کبھی کبھی پردہ اٹھاتا ہے، انھیں میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے آسمان میں برج بنائے ہیں۔

برج سے کیا مراد ہے

سوال یہ ہے کہ یہ برج کیا ہیں؟ برج عربی زبان میں ان چیزوں کو کہتے ہیں جو دور سے نمایاں ہوں۔ اسی لیے قلعہ اور محل پر برج کا لفظ بول دیا جاتا ہے۔ اہلِ عرب عام طور پر بڑے بڑے ستاروں کو جو دور سے نمایاں دکھائی دیتے ہیں برج کے لفظ سے یاد کرتے تھے۔ اس لیے ان میں سے بعض اہلِ علم نے اس سے سات بڑے بڑے سیارے مراد لیے ہیں۔ یونان کے ایک علمائے ہیئت نے سورج کے مدارِ حرکت کو بارہ حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا اور وہ ہر حصے کو برج کہتے تھے جن کے نام یہ ہیں: حمل، ثور، سرطان، اسد، سنبلہ، میزان، عقرب، قوس، جدی، دلو، جوزا اور حوت۔ اسی وجہ سے بعض مفسرین نے یہ سمجھا کہ قرآن کا اشارہ شاید انہی بروج کی طرف ہے اور بعض مفسرین نے اس سے سیارے مراد لیے، لیکن جب ہم ان آیات کو غور سے پڑھتے ہیں تو خیال پیدا ہوتا ہے کہ شاید اس سے مراد عالمِ بالا کے وہ خطے ہیں جن میں سے ہر خطے کو نہایت مستحکم سرحدوں نے دوسرے خطے سے جدا کر رکھا ہے۔ اگرچہ یہ سرحدیں فضاء بسیط میں غیر مرئی کھچی ہوئی ہیں لیکن ان کو پار کر کے کسی چیز کا ایک خطے سے دوسرے خطے میں چلا جانا سخت مشکل ہے۔ یہی وہ فصیلیں ہیں جن کی برکت سے جو شہابِ ثاقب روزانہ کی اوسط سے زمین کی طرف گرتے ہیں 10 کھرب وہ سب جل کر بھسم ہوجاتے ہیں اور بمشکل

Marfat.com

ایک زمین کی سطح تک پہنچ سکتا ہے۔ دنیا میں شہابی پتھروں کے جو نمونے پائے جاتے ہیں اور دنیا کے عجائب خانوں میں موجود ہیں جن میں سب سے بڑا 645 پونڈ کا ایک پتھر ہے جو گر کر 11 فیٹ زمین میں دھنس گیا تھا۔ اس کے علاوہ ایک مقام پر ساڑھے 26 ٹن کا ایک آہنی تودہ پایا گیا جس کے وہاں موجود ہونے کی کوئی توجیہ سائنسدان اس کے سوا نہیں کر سکے کہ یہ بھی آسمان سے گرا ہوا ہے۔ اندازہ کیجئے کہ اگر آسمان کے مختلف خطوں میں یہ مضبوط حصار نہ ہوتے جنھیں قرآنِ کریم نے برج قرار دیا ہے تو یہ برسنے والے شہابی پتھر درجہ بدرجہ ہر خطے کا کیا حشر کرتے اور زمین پر برسنے والی پتھروں کی بارش سے اہلِ زمین کا کیا انجام ہوتا۔ یہ حصار یعنی برج ہمیں دکھائی نہیں دیتے لیکن قرآنِ کریم کے انکشاف کے مطابق کائنات کے مختلف حصوں میں یہی حفاظت کا سب سے بڑا ذریعہ بھی ہیں اور خوبصورتی کا اظہار بھی، کیونکہ پروردگار نے یوں تو تمام آسمان کو نورانی قمقموں سے روشن کر رکھا ہے اور اہلِ زمین اسے دیکھ کے خوش ہوتے ہیں، لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ برج جنھیں ہم دیکھ نہیں سکتے لیکن ان کے اندر جو خاص طور پر حُسن آرائی کی گئی ہے وہ بھی آسمان کی زینت اور حُسن کا حصہ بن کر ہماری آنکھوں کو روشنی دیتی ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔

شیاطین کی شرانگیزی سے بچاؤ کا انتظام

دوسری آیتِ کریمہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جنات کی سرشت ایسی بنائی ہے کہ بلندی اور رفعت کی طرف اڑنا ان کی شاید سرشت میں داخل ہے۔ اس لیے وہ عموماً آسمان کی وسعتوں میں پرواز جاری رکھتے ہیں لیکن ان کی سرشت میں چونکہ شر کا مادہ غالب ہے اس لیے وہ ہر جگہ شیطنت کے اظہار کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ پروردگار نے کائنات کو ان کے شر کے اثرات سے بچانے کیلیے وسیع انتظامات کر رکھے ہیں۔ انھیں انتظامات میں سے یہ انتظام بھی ہے کہ ملاءِ اعلیٰ سے مختلف خطوں پر پتھروں یا شہابیات کی ایسی بارش ہوتی ہے کہ یہ جنات اپنی حدود سے آگے بڑھنے کا حوصلہ نہیں کر پاتے۔ زمانۂ حال کے مشاہدات سے یہ معلوم ہوا ہے کہ دوربین سے دکھائی دینے والے شہابِ ثاقب جو فضائے بسیط سے زمین کی طرف آتے نظر آتے ہیں ان کی تعداد کا اوسط 10 کھرب روزانہ ہے جن میں سے 2 کروڑ کے قریب ہر روز زمین کے بالائی خطے میں داخل ہوتے ہیں۔ ممکن ہے یہ انتظام اس لیے کیا گیا ہو تاکہ عالمِ بالا کی طرف شیاطین کی پرواز ناممکن بنا دی جائے۔

سن گن لینے والے

تیسری آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی بعثت کے بعد شیاطین کی عالمِ بالا تک رسائی بالکل ناممکن بنا دی گئی۔ پہلے وہ فرشتوں سے ملتے جلتے اور ان کے پاس منڈلاتے رہتے تاکہ کسی بات کا اگر علم ہو جائے تو کاہنوں کو جا کے زمین پر بتائیں اور یہ غیب دانی کا مذموم دھندا چلتا رہے، لیکن حضور نبی کریم ﷺ کی تشریف آوری کے بعد جب شرک کی جڑ ماری گئی تو اس کے وسائل بھی ختم کر دیے گئے، لیکن پھر بھی اگر کوشش کر کے کوئی شیطان کسی بات کی سن گن لینے کیلیے اوپر جانے کی کوشش کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے وہ آسمانی قلعے جو آسمانوں میں بنائے گئے ہیں ان میں ملائکہ کی فوجیں برابر مامور رہتی ہیں۔ وہ ان شیاطین کو آگے بڑھنے سے روکتی ہیں اور جب وہ شیطان وہاں سے بھاگتا ہے تو ایک دمکتا شہاب اس کا تعاقب کرتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح ایک قلعہ کی برجیوں پر مامور سپاہی دشمن کے آدمیوں پر کڑی نگاہ رکھتے ہیں، کسی اجنبی کو اپنی حدود کے اندر لانگنے کا موقع نہیں دیتے، اسی طرح خدا کے مامور ملائکہ ان جن شیاطین کو شہابِ ثاقب کا نشانہ بناتے ہیں۔

وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُوْنٍ ﴿۱۹﴾ (سورۃ الحجر: ۱۹)

(اور زمین کو ہم نے پھیلایا اور اس میں محکم پہاڑ گاڑ دیے اور اس میں ہر قسم کی چیزیں تناسب کے ساتھ اگائیں۔ ۱۹)

Marfat.com

زمین پر اللہ تعالیٰ کی چند نشانیاں

عالم بالا میں اپنی قدرت کے کمالات کا ذکر کرنے کے بعد اب انسان کو زمین کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے کہ آسمان کی وسعتیں تمہاری رسائی سے باہر ہیں لیکن زمین کو تم بہت حد تک دیکھ سکتے ہو۔ ذرا اس کی وسعتوں کا اندازہ کرو اور پھر اللہ تعالیٰ کی قدرت کو دیکھو کہ کیا اس کے ساتھ کسی اور شریک کی گنجائش ہے؟ زمین اس کی کائنات کا ایک چھوٹا سا کرہ ہے لیکن اس کی وسعت کا عالم یہ ہے کہ نہ جانے کب سے اس پر حضرت انسان بس رہا ہے اور کتنی نسلیں اس پر انسان کی گزر چکی ہیں۔ ہر رنگ، ہر نسل اور ہر نوع کی مخلوق اس پر آباد ہے، لیکن آج تک اربوں انسانوں کی موجودگی میں کبھی شکایت پیدا نہیں ہوئی کہ زمین کی وسعت انسانوں کی آبادی کے مقابلے میں تنگ پڑ گئی ہے۔ انسانوں کو ظلم خود انسانوں کو عاجز کر دے تو وہ ایک دوسری بات ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ وسائل حیرت انگیز حد تک ہمیشہ انسان کی ضرورتوں سے بڑھ کر رہے ہیں۔ اربوں انسان زمین پر بس رہے ہیں اور ابھی مزید کروڑوں کی گنجائش باقی ہے۔ اتنی بڑی زمین اور اس پر انسانی آبادی کا اتنا بوجھ اندیشہ ہو سکتا ہے کہ یہ زمین کسی طرف لڑھک ہی نہ جائے۔ اس کا انتظام پروردگار نے یہ کیا ہے کہ بڑے بڑے پہاڑوں کے لنگر ڈال دیے جو اس کے اندر میخوں کی طرح گڑے ہوئے ہیں۔ زمین کی مجال نہیں کہ وہ کسی طرف جھک جائے اور انسانی آبادی ناممکن ہو جائے، پھر زمین کے ایک تہائی پر اللہ تعالیٰ نے سمندر بسا رکھا ہے، لیکن سمندر کی مجال نہیں کہ وہ زمین پر چڑھ دوڑے۔ انسان نے کبھی غور نہیں کیا کہ سمندر کے کنارے کس نے باندھ رکھے ہیں۔ سمندر کے اندر اٹھتے ہوئے طوفانوں کو دیکھ کر آدمی خوفزدہ ہو جاتا ہے کہ اگر ان کا رخ زمین کی طرف ہو جائے تو اہلِ زمین کو کون بچا سکتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کا یہ انتظام ہے اور اس کی قدرت ہے کہ زمین کی وسعت اور انسان کی ضرورت میں کہیں تصادم نہیں ہوتا اور اگر کہیں ہوتا ہے تو وہ خود انسان کا پیدا کردہ ہوتا ہے اور یا وہ انسان کی عقل و دانش اور اس کے حوصلے کیلئے چیلنج ہوتا ہے۔ چنانچہ جب بھی انسان نے اس بات کو سمجھا اور اس چیلنج کو قبول کیا تو سمندر کو ہزاروں میل پیچھے ہٹا دیا۔

اللہ تعالیٰ کی قدرت و حکمت کی ایک اہم نشانی

آیت کے دوسرے حصے میں اللہ تعالیٰ کی قدرت و حکمت کے ایک اور اہم نشان کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو چیز بھی پیدا کی یا اگائی ہے اسے ایک اندازے اور ایک توازن کے ساتھ پیدا فرمایا ہے۔ جتنی اس نے جاندار مخلوق پیدا فرمائی ہے یہ دیکھ کے حیرت ہوتی ہے کہ جیسا کسی مخلوق کا ماحول ہے ویسی اسے جسمانی ساخت عطا فرمائی ہے اور ویسی اسے جسمانی اور ذہنی صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں اور جیسا اس کا جسم اور اس کی صلاحیتیں ہیں ویسا اسے ماحول دیا گیا ہے۔ مچھلی کو پانی میں پیدا کیا تو اسے تیرنے کی صلاحیت عطا فرمائی اور پرندے کو خشکی میں پیدا فرمایا تو اسے اڑنا سکھایا گیا۔ اور پھر جن کو پر دیے گئے انھیں قوت و مہارت پرواز دی گئی۔ اور جن کی روزی فضا میں بکھیری انھیں پر عطا کیے گئے، جنھیں جنگل میں پیدا کیا انھیں دوڑنا بھاگنا، شکار کرنا، اپنے نوکیلے دانتوں یا سینگوں سے دشمن کا مقابلہ کرنا سکھایا، بھٹ میں رہنا سکھایا اور بھٹ بنانا بھی سکھایا۔ پرندوں کو درختوں پر بٹھایا تو گھونسلا بنانے کی صلاحیت بھی عطا فرمائی۔ گرم علاقوں کے جانور آپ دیکھیں گے کہ سرد علاقوں میں نہیں ہوتے اور سرد علاقوں کے گرم علاقوں میں نہیں پائے جاتے۔ منطقۂ حارہ کا ریچھ منطقۂ باردہ میں نہیں ہوتا اور منطقۂ باردہ کا ریچھ منطقۂ حارہ میں نہیں ہوتا۔

مزید ایک نشانی

نباتات کی ہر نوع میں تناسل کی اس قدر طاقت ہے کہ اگر اس کے صرف ایک پودے ہی کی نسل کو زمین میں بڑھنے کا موقع دے دیا جائے تو چند سال کے اندر روئے زمین پر بس وہی نظر آئے، کسی دوسری قسم کی نباتات کیلئے کوئی جگہ نہ رہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی قدرت و حکمت کو دیکھئے کہ بے حساب نباتات اُگ رہی ہیں اور ہر نبات کی ایک مقدار مقرر کر دی ہے وہ اپنی مخصوص حد پر پہنچ کر رک جاتی ہے۔ اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ہر نبات اور ہر پودا

Marfat.com

اپنا جو مقصد رکھتا ہے اسے کبھی نہیں بھولتا۔ گندم کا پودا ہمیشہ گندم مہیا کرتا ہے، اسے کبھی انار کے دانے نہیں لگتے۔ اور آم کے درخت کو کبھی املی نہیں لگتی۔ ہر جانور کا جو قد و قامت مقرر کر دیا گیا ہے، وہ اس سے کبھی تجاوز نہیں کرتا۔ شیر بڑھ کر ہاتھی کا جسم اختیار نہیں کر سکتا اور ہاتھی اپنے جسم کو گھٹا کر بلی کی شکل اختیار نہیں کر سکتا۔ اس حکیمِ مطلق کے توازن کے ایسے قوانین ہیں جنھیں کبھی ہم نے بدلتے ہوئے نہیں دیکھا۔

وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ وَمَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ بِرٰزِقِيْنَ ﴿۲۰﴾ (سورۃ الحجر : ۲۰)

(اور ہم نے اس میں تمھاری معیشت کے سامان بھی رکھے اور ان کی معیشت کے بھی جن کے تم روزی دینے والے نہیں ہو۔ ۲۰)

وسائلِ رزق کا پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے

معیشت کھانے پینے کی چیزوں اور وسائلِ معاش کو کہتے ہیں۔ اس زمین پر ہم نے تمھارے لیے وسائلِ رزق پیدا کیے اور ان کیلیے بھی پیدا کیے ہیں جنھیں تم رزق نہیں دیتے۔ انسان عموماً اس غلط فہمی میں مبتلا ہوتا ہے کہ میں جو کچھ کرتا ہوں اور جو میری ضروریات ہیں میں انھیں خود فراہم کرتا ہوں۔ میں جو کچھ کماتا ہوں اس سے میں اپنی مختلف اشیائے ضرورت خریدتا ہوں۔ اس طرح سے گویا میں آپ اپنا رازق ہوں حالانکہ آدمی اگر ذرا گہری نظر سے دیکھے تو اسے یہ سمجھنا کوئی مشکل نہیں کہ تم جو پانی پیتے ہو اسے کس نے پیدا کیا ہے؟ تم جو غلہ کھاتے ہو اسے پیدا کرنے والا کون ہے؟ جن پھلوں سے کام و دہن کو لذت دیتے ہو انھیں وجود کس نے بخشا ہے؟ تم جو گوشت کھاتے ہو تو گوشت والے جانور کس کی مخلوق ہیں؟ جس زمین پر چلتے ہو اور جس زمین کی قوتِ روئیدگی سے تم فائدہ اٹھاتے ہو، یہ زمین کس نے پیدا کی ہے؟ خود تمھاری اپنی توانائی اپنی صلاحیتیں، اپنی ذہانت اور قوتِ کارکردگی کس کی عطا کردہ ہے؟ تمھارا کام صرف اتنا ہے کہ تم اس کی دی ہوئی صلاحیتوں سے کام لیتے ہو، اس کی عطا کردہ نعمتوں کو کھا لیتے ہو، اس کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھا لیتے ہو۔ ظاہر ہے یہ چیز تو رزق رسانی نہیں کہلاتی۔ اسی طرح تمھارے قبضے میں جو جانور ہے انھیں بھی تم رزق مہیا نہیں کرتے بلکہ ان کا رزق بھی اللہ تعالیٰ پیدا کرتا ہے۔ یہ ان گنت پرندے اور یہ جنگلی جانور، یہ سمندر میں بسنے والی بے انداز مخلوق، کیا ان کا کھانا تم مہیا کرتے ہو، انھیں بھی پروردگار ہی عطا کرتا ہے۔ البتہ تم ان سے فائدہ ضرور اٹھاتے ہو۔

وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗٓ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۲۱﴾ (سورۃ الحجر : ۲۱)

(اور کوئی چیز ایسی نہیں جس کے خزانے ہمارے پاس نہ ہوں، لیکن ہم اس کو ایک معین اندازے کے ساتھ ہی اتارتے ہیں۔ ۲۱)

توازن و تناسب کی طرف اشارہ

ہم چونکہ تمام مخلوقات کے رازق ہیں اس لیے رزق کے حوالے سے جن جن نعمتوں کی ضرورت ہے ان کے خزانے ہمارے پاس ہیں۔ کسی مخلوق کو کبھی اس کا گمان نہیں ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے پاس اس کے رزق میں کمی آ جائے گی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ کوئی آبی مخلوق ہو یا جنگلوں کی مخلوق، کیڑے مکوڑے ہوں یا فضائی جانور، کبھی کسی کو یہ شکایت پیدا نہیں ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے رزق میں کمی کر دی ہے یا اس کے خزانوں میں کوئی کمی آ گئی ہے اور ہمیں مناسب رزق نہیں پہنچ رہا۔ البتہ جب بھی کبھی شکایت پیدا ہوتی ہے تو انسانوں کی طرف سے ہوتی ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ایک تو انسان کی ناشکری اس کا ساتھ نہیں چھوڑتی، دوسرا وہ اس بات کو سمجھ نہیں پا رہا کہ زمین پر عدل و احسان کی حکومت قائم کرنا یہ اللہ تعالیٰ کا نہیں بندوں کا کام ہے۔ اللہ تعالیٰ کے خزانوں کی حفاظت اس کے دیے ہوئے رزق کی منصفانہ تقسیم یہ انسانوں کے فرائض میں شامل ہے۔ جب انسان انھیں بجا لانے میں کوتاہی کرتا ہے تو وہیں انسان کے رزق میں کمی آنا شروع ہو جاتی ہے۔ کسی کے گودام بھرے رہتے ہیں اور کوئی نانِ شبینہ کا محتاج ہوتا ہے ورنہ جہاں تک اللہ تعالیٰ کے خزانوں کا تعلق ہے آپ دیکھ لیجیے کہ انسانی ضرورتوں میں جو ضرورت سب سے مقدم ہے اور سب سے زیادہ ہے اس کے خزانے بھی سب سے زیادہ ہیں۔ پانی انسانی کی پہلی ضرورت ہے تو کون سی جگہ ایسی ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے

Marfat.com

پانی پیدا نہیں فرمایا۔ زمین کے نیچے پانی کے سوتے رواں ہیں، میدانی علاقوں میں دریا بہہ رہے ہیں، پہاڑی علاقوں میں چشمے ابلتے اور آبشاریں گرتی ہیں اور پھر مسلسل بارشوں سے ندی نالے بھی سیراب رہتے ہیں اور ہر جگہ کی ضرورتیں بھی پوری ہوتی ہیں۔ مزید براں یہ کہ پہاڑوں پر موسمِ سرما میں برف جمادی جاتی ہے جو موسمِ گرما میں پگھلتی ہے اور اس کا بہتا ہوا پانی ہر علاقے کی سیرابی کا کام کرتا ہے۔

انسان کی دوسری ضرورت اس کی خوراک ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس زمین کو جس پر انسان بستا ہے قوتِ روئیدگی سے معمور کر رکھا ہے۔ آپ اس کے پیٹ میں غلہ دفن کر کے دیکھئے، بجائے اس کو مارنے کے اسی سے زندگی اور روئیدگی کے آثار پیدا کر دیتا ہے جو بڑھتے بڑھتے پودا اور تنا بنتا ہے۔ پھر اسے خوشے لگتے ہیں اور ایک ایک دانہ سات سات سو دانے تک بار آور ہوتا ہے اور پھر اس غلے کی بار آوری اور غذا کی بہم رسانی میں عناصرِ قدرت میں سے کون سا ایسا عنصر ہے جو شریک نہیں ہوتا۔ پانی، بادل، ہوا، سورج اور چاند، آسمان، زمین اور فضا کون سی چیز ہے جو اس خدمت میں لگی ہوئی نظر نہیں آتی تا کہ انسان کو اس کی روزی میسر آئے اور وہ زندگی کے فرائض ادا کرنے کے قابل ہو سکے۔ مختصر یہ کہ تمام مخلوقات کی روزی دینے والی ذات صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اس کے پاس ہر چیز کے خزانے ہیں۔ نہ کوئی چیز کم ہوتی ہے اور نہ کوئی زیادہ ہوتی ہے۔ جب کمی ہوتی ہے تو اسی کے حکم سے ہوتی ہے اور جب زیادتی ہوتی ہے تو تب بھی اسی کے حکم سے ہوتی ہے۔ البتہ اس کے نتیجہ میں اس دنیا میں بڑی بڑی آفتیں برپا ہو جاتی ہیں۔ اور اس سے یہ بتانا مقصود ہوتا ہے کہ یہ دنیا نہ تو کسی اتفاقی حادثہ کے طور پر ظہور میں آ گئی ہے اور نہ یہ مختلف دیویوں اور دیوتاؤں کی بازی گاہ ہے۔

وَاَرْسَلْنَا الرِّيٰحَ لَوَاقِحَ فَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَسْقَيْنٰكُمُوْهُ ۚ وَمَآ اَنْتُمْ لَهٗ بِخٰزِنِيْنَ ﴿۲۲﴾

(پس ہم بھیجتے ہیں ہواؤں کو باردار بنا کر، پھر ہم آسمان سے پانی اتارتے ہیں، پھر ہم تمہیں اس سے سیراب کرتے ہیں، یہ تمہارے بس میں نہ تھا کہ تم اس کے ذخیرے جمع کر کے رکھتے۔ ۲۲) (سورۃ الحجر: ۲۲)

ربوبیت کا مزید تذکرہ

اوپر چند آیات سے زمین پر اللہ تعالیٰ کی قدرت کی بعض نشانیوں کو اس طرح بیان فرمایا جا رہا ہے جس میں جا بجا اس کی ربوبیت کی طرف اشارے بھی ہیں۔ اس آیت میں بھی اسی کی مزید وضاحت فرمائی گئی ہے۔ لیکن اس وضاحت کو عرض کرنے سے پہلے ایک لفظ کو واضح کرنا ضروری ہے تا کہ آیت کے مفہوم کو آسانی سے سمجھا جا سکے۔ آیت میں ہواؤں کیلئے لَوَاقِحَ کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کا معنی ہم نے باردار کیا ہے۔ عربی زبان میں نر اور مادہ کے ملاپ کی صورت میں جب نر مادہ میں مادۂ تولید ڈالتا ہے تو اسے القاح یا تلقیح کہا جاتا ہے۔ اس عمل کو حمل ٹھہرانا یا باردار کرنا کہتے ہیں۔ قدرت نے تمام مخلوقات میں نر اور مادہ پیدا کئے ہیں اور ان کے سلسلہ تناسل کیلئے اسی عمل کو ذریعہ بنایا ہے۔ آنحضرت ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے دنیا اس علمی تصور سے بالکل بیگانہ تھی۔ انسانوں اور حیوانوں کے بارے میں تو سب لوگ بچشم سر اسے دیکھتے تھے لیکن نباتات کے بارے میں افزائشِ نسل کا یہ طریقہ کسی کے حاشیۂ خیال میں بھی نہ تھا۔ چنانچہ قرآنِ کریم نے سب سے پہلے اسے بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمام اشیا کے جوڑے پیدا فرمائے ہیں جنھیں زمین اگاتی ہے۔ اور یہ بھی فرمایا کہ ایسی چیزوں کے بھی جوڑے پیدا فرمائے گئے ہیں جنھیں تم آج نہیں جانتے۔ لیکن جدید دور کا انسان ان میں سے بہت سی چیزوں کو جانتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس نے نام ان کے الگ الگ رکھے ہیں۔ چنانچہ نباتات میں آج ہر شخص جو زراعت کی ابجد سے بھی واقف ہے وہ جانتا ہے کہ کسی پھلدار درخت کو پھل نہیں آ سکتا تاوقتیکہ وہاں نر اور مادہ دونوں نہ ہوں۔ اور کوئی کھیتی بار آور نہیں ہو سکتی تاوقتیکہ وہاں یہ پراسس (Process) جاری نہ ہو۔ لیکن اس کا تصور تو آج بھی انسانوں کیلئے شاید اجنبی ہو کہ یہی پراسس (Process) اور طریقہ اللہ تعالیٰ نے بارش کیلئے ہواؤں میں بھی رکھا ہے۔ اس لیے ہواؤں کو لَوَاقِحَ کہا گیا ہے۔ علمائے تفسیر نے مختلف طریقوں سے اس کی وضاحت فرمائی ہے۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ ان ہواؤں کو لَوَاقِحَ اس لیے کہا گیا کہ یہ ہوائیں بارش کا پانی بادلوں کے مشکیزوں میں اٹھائے ہوئے آتی ہیں یا اس لیے کہ یہ بادلوں میں اس رطوبت کو ملاتی ہیں جس سے ان سے بارش ہونے لگتی ہے۔ اور یا اس لیے لَوَاقِحَ کہا گیا کہ یہ درختوں کو بار آور کرتی ہیں۔ بتانا مقصود یہ ہے کہ پانی جو تمہاری ضرورت ہے اور تمہاری کھیتیوں کی سیرابی کا ذریعہ ہے اور تمہاری خوراک کا دارومدار بالواسطہ اسی پر ہے تو اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کی یہ کرم فرمائی ہے

Marfat.com

کہ اس نے حیرت انگیز طریقے سے سمندر سے پانی اٹھایا، فضا میں ابر کی چادریں پھیلائیں اور پھر ہواؤں نے انھیں باردار کیا اور انھیں وہاں پہنچایا جہاں زمین کو پانی کی ضرورت تھی۔ اگر پروردگار یہ سارا پراسس (Process) اپنی قدرت اور اپنی ربوبیت سے وجود میں نہ لاتا تو تمہاری کھیتیوں کی سیرابی کا کوئی ذریعہ نہ ہوتا۔ ہر جگہ زمین پانی نہیں دیتی یا بعض دفعہ پانی اتنا گہرا ہوتا ہے کہ اس کا نکالنا آسان نہیں ہوتا۔ پانی نکل بھی آئے تو ضروری نہیں کہ وہ کھیتیوں کی سیرابی کے قابل بھی ہو۔ اور یہ بھی ممکن نہ تھا کہ تم اس پانی کے ذخیرے جمع کر کے رکھ چھوڑتے اور جب ضرورت پڑتی تو پانی برسا لیتے۔ یہ خدا ہی کا انتظام اور اس کی رحمت ہے کہ اس نے تمھارے لیے یہ حیرت انگیز انتظام کر رکھا ہے۔

وَاِنَّا لَنَحْنُ نُحْيٖ وَنُمِيْتُ وَنَحْنُ الْوٰرِثُوْنَ ﴿۲۳﴾ (سورة الحجر : ۲۳)

(اور بیشک ہم ہی زندہ کرتے اور ہم ہی مارتے ہیں اور ہم ہی ان سب کے وارث ہیں۔ ۲۳)

مذکورہ حقائق کا لازمی تقاضا

گزشتہ آیات میں نظامِ ربوبیت کی جن جن باتوں کا ذکر فرمایا گیا ہے ان کو لپیٹ کر اس آیت میں فرمایا جا رہا ہے کہ یہ سب کچھ ہم نے اس لیے عطا فرمایا ہے کیونکہ زندگی اور موت کے ہم ہی مالک ہیں۔ زندگی بھی ہم دیتے ہیں اور موت بھی ہم ہی دیتے ہیں۔ اور جب کسی قوم کو دنیا میں ختم کر دیا جاتا ہے تو اس کے وارث بھی ہم ہی ہیں۔ اسی طرح جب قیامت کا صور پھونکا جائے گا اور ہر چیز ختم کر دی جائے گی تب بھی اس کائنات کے وارث ہم ہی ہوں گے۔ کیونکہ ہر چیز کا مرجع و مولیٰ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ اس لیے اہلِ زمین کی وراثت کا حق کسی اور کو ہرگز نہیں۔ اور نہ کسی مخلوق کیلیے اور کوئی جائے پناہ ہے۔ اور اگر کسی نے کسی اور سے کوئی امید باندھ رکھی ہے تو یہ محض وہم ہے اس کی کوئی حقیقت نہیں۔

وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِيْنَ مِنْكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَاْخِرِيْنَ ﴿۲۴﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَحْشُرُهُمْ ؕ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۵﴾

(اور یقیناً ہم جانتے ہیں ان کو بھی جو تم میں سے پہلے گزر چکے ہیں اور ان کو بھی جانتے ہیں جو بعد میں آنے والے ہیں۔ ۲۴) اور بیشک تمھارا پروردگار ہی ہے جو ان سب کو اکٹھا کرے گا۔ اور بیشک وہ بڑا دانا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ ۲۵) (سورۃ الحجر: ۲۴-۲۵)

صفتِ علم کا بیان

اپنے کمالِ قدرت اور نظامِ ربوبیت کی بعض جہتوں کو بیان کرنے کے بعد اپنے علم کی وسعت کی طرف اشارہ فرمایا کہ جس طرح ہماری قدرت کی کوئی انتہا نہیں، اسی طرح ہمارے علم کی بھی کوئی انتہا نہیں۔ یہ مت سمجھو کہ اس وقت جو لوگ موجود ہیں اور زندگی کے فرائض ادا کر رہے ہیں، ہم صرف انھیں کو جانتے ہیں اور انھیں کے اعمال سے آگاہ ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہم جس طرح ماضی کے لوگوں کو جانتے ہیں اسی طرح ہم مستقبل کے لوگوں سے بھی آگاہ ہیں۔ ہمارے علم میں کوئی تقسیم نہیں۔ ماضی، حال اور مستقبل یہ انسانی علم کی صفات ہیں۔ ہمارا علمِ محیط سب پر حاوی ہے۔ ہم جس طرح حال کو جانتے ہیں ہم اس سے بڑھ کر ماضی اور مستقبل سے آگاہ ہیں۔ ذرا غور فرمایئے کہ وہ ذات جس نے انسانوں کو فہم و شعور عطا فرمایا، پھر ان کی معنوی اور ذہنی تربیت فرمائی اور ان کی زندگی کی ہر ضرورت کو پورا فرمایا۔ خیر و شر کے ہر پہلو کو واضح کیا، نفع و ضرر کے پیمانے ان کے ہاتھوں میں دیے اور پھر ان کے اعمال کی حفاظت میں زمانوں کو حائل نہیں ہونے دیا۔ ان تمام باتوں کا فطری تقاضا ہے کہ وہ ایک دن تمام انسانوں کو جمع کرے گا اور ان سے ان کی زندگی کا حساب لے گا تاکہ کوئی شخص اپنی محرومیوں کی شکایت نہ کرے اور کسی شخص کو اپنی ناقدری کا گلہ نہ ہو۔ جن کے حقوق پامال کیے گئے وہ اپنی پامالی کا صلہ پائیں اور جنھوں نے قربانیاں دیں وہ قربانیوں کے اجر سے نوازے جائیں۔ ہر ظلم کی تلافی ہو، کوئی جرم کرنے والا سزا سے نہ بچ سکے۔ یہ اس زندگی کا لازمی اور فطری تقاضا ہے اس کیلیے ضروری تھا کہ اللہ تعالیٰ بے پایاں علم کا مالک ہوتا، اس کی حکمت عدل و احسان کے امکانات کو بروئے کار لاتی۔ چنانچہ

Marfat.com

اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہونا کہ ہمارا علم ناقص ہے اور ہم تمام انسانی نسلوں کے اعمال سے پوری طرح واقف نہیں، اور ہم سب کے احوال سے واقف نہیں ہو سکتے۔ انسانی جزاء وسزا کا اصول کس طرح بروئے کار لایا جاسکتا ہے۔ اس لیے فرمایا کہ تمہیں خاطر جمع رکھنی چاہیے کہ ہم سب کے حالات سے واقف ہیں۔ جب ہم باز پرس کریں گے تو ہم زندگی کے کسی گوشے سے بھی ناواقف نہیں ہوں گے۔ ہر شخص کے ساتھ پورا انصاف ہوگا اور اپنے عمل کے مطابق ہم سب سے حساب لیں گے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ

مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُونٍ ﴿٢٦﴾ وَالْجَانَّ خَلَقْنَاهُ مِن قَبْلُ
مِن نَّارِ السَّمُومِ ﴿٢٧﴾ وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي خَالِقٌ بَشَرًا
مِّن صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُونٍ ﴿٢٨﴾ فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ
مِن رُّوحِي فَقَعُوا لَهُ سَاجِدِينَ ﴿٢٩﴾ فَسَجَدَ الْمَلَائِكَةُ كُلُّهُمْ أَجْمَعُونَ ﴿٣٠﴾
إِلَّا إِبْلِيسَ أَبَىٰ أَن يَكُونَ مَعَ السَّاجِدِينَ ﴿٣١﴾ قَالَ يَا إِبْلِيسُ
مَا لَكَ أَلَّا تَكُونَ مَعَ السَّاجِدِينَ ﴿٣٢﴾ قَالَ لَمْ أَكُن لِّأَسْجُدَ لِبَشَرٍ
خَلَقْتَهُ مِن صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُونٍ ﴿٣٣﴾ قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا
فَإِنَّكَ رَجِيمٌ ﴿٣٤﴾ وَإِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ إِلَىٰ يَوْمِ الدِّينِ ﴿٣٥﴾ قَالَ
رَبِّ فَأَنظِرْنِي إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ ﴿٣٦﴾ قَالَ فَإِنَّكَ مِنَ الْمُنظَرِينَ ﴿٣٧﴾
إِلَىٰ يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُومِ ﴿٣٨﴾ قَالَ رَبِّ بِمَا أَغْوَيْتَنِي لَأُزَيِّنَنَّ
لَهُمْ فِي الْأَرْضِ وَلَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿٣٩﴾ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ
الْمُخْلَصِينَ ﴿٤٠﴾ قَالَ هَٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيمٌ ﴿٤١﴾ إِنَّ

Marfat.com

عِبَادِیْ لَیْسَ لَكَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِیْنَ ﴿۴۲﴾ وَ اِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِیْنَ ﴿۴۳﴾ لَهَا سَبْعَةُ اَبْوَابٍ لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ ﴿۴۴﴾

رکوع: ۳۔ (بیشک ہم نے انسان کو پیدا کیا سڑے ہوئے بدبودار گارے کی کھنکھناتی ہوئی مٹی سے۔ ۲۶) اور جان کو ہم نے پیدا فرمایا اس سے پہلے آگ کی لپٹ سے۔ ۲۷) اور اس وقت کو یاد کرو جب آپ کے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں سڑے ہوئے گارے کی کھنکناتی ہوئی مٹی سے ایک بشر پیدا کرنے والا ہوں۔ ۲۸) تو جب میں اس کو مکمل کرلوں اور اس میں اپنی روح میں سے پھونک لوں تو تم اس کیلیے سجدے میں گر پڑنا۔ ۲۹) تو تمام فرشتوں نے سجدہ کیا۔ ۳۰) سوائے ابلیس کے، اس نے انکار کردیا کہ وہ سجدہ کرنے والوں کے ساتھ ہو۔ ۳۱) پروردگار نے پوچھا، اے ابلیس! تیرا کیا معاملہ ہے کہ تو سجدہ کرنے والوں کا ساتھ نہ دے۔ ۳۲) وہ بولا کہ میں ایک ایسے بشر کو سجدہ کرنے کو تیار نہیں جس کو تو نے سڑے ہوئے گارے کی کھنکناتی ہوئی مٹی سے پیدا کیا۔ ۳۳) اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ نکل جا یہاں سے تو مردود ہے۔ ۳۴) بیشک تجھ پر لعنت ہے روز جزا تک۔ ۳۵) کہنے لگا کہ اے میرے رب پھر مہلت دے مجھے اس دن تک جب مردے قبروں سے اٹھائے جائیں گے۔ ۳۶) فرمایا بیشک تو مہلت دیے ہوئے گروہوں میں سے ہے۔ ۳۷) جنھیں وقتِ مقرر کے دن تک مہلت دی گئی ہے۔ ۳۸) وہ بولا! اے میرے رب، چونکہ تو نے مجھے گمراہ کیا، میں زمین میں دنیا کو ان کی نگاہوں میں ضرور خوشنما بنادوں گا اور میں ان سب کو گمراہ کرکے چھوڑوں گا۔ ۳۹) سوائے تیرے ان بندوں کے جنھیں ان میں سے چن لیا گیا ہے۔ ۴۰) اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ سیدھا راستہ ہے جو میری طرف آتا ہے۔ ۴۱) بیشک میرے بندوں پر تیرا کوئی بس نہیں چلتا، مگر وہ جو گمراہوں میں سے تیری پیروی کرتے ہیں۔ ۴۲) بیشک جہنم ان سب کیلیے وعدہ کی جگہ ہے۔ ۴۳) اس کے سات دروازے ہیں، ہر دروازے کیلیے ان میں سے ایک حصہ مخصوص ہے۔ ۴۴)

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۲۶﴾ (سورۃ الحجر : ۲۶)

(بیشک ہم نے انسان کو پیدا کیا سڑے ہوئے بدبودار گارے کی کھنکناتی ہوئی مٹی سے۔ ۲۶)

مشکل الفاظ کی تشریح

اس آیتِ کریمہ میں کچھ مشکل الفاظ آئے ہیں، پہلے ان کے معنی سمجھ لیجئے۔ صَلْصَال: اس خشک شدہ کیچڑ کو کہتے ہیں جو خشک ہونے کے بعد بجنے لگے۔ حَمَاٍ: اس سیاہ کیچڑ کو کہتے ہیں جس کے اندر خمیر اٹھ جائے۔ مَّسْنُوْنٍ: بدبودار کیچڑ جس میں چکنائی پیدا ہوگئی ہو۔ اس کے علاوہ اس کا اطلاق اس قالب پر بھی ہوتا ہے جسے ایک خاص صورت میں ڈھالا گیا ہو۔

اہلِ لغت کے نزدیک مختلف حالتوں میں مٹی کے مختلف نام ہیں۔ پانی میں بھگونے سے پہلے اسے ''تراب'' کہتے ہیں۔ پانی میں بھیگ جائے تو اسے ''طین'' یعنی کیچڑ بولتے ہیں اور جب اس میں بو پیدا ہو جائے یا اسے کوئی صورت دے دی جائے تو اسے ''مسنون'' کہتے ہیں۔ اور جب وہ خشک ہو جائے تو ''صلصال'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اور جب اسے آگ میں پکا لیا جائے تو اسے ''فخار'' کہتے ہیں۔

Marfat.com

دلائلِ آفاق کے بعد دلائلِ انفس سے استدلال

گزشتہ رکوع میں پروردگار نے قریش کے روز روز کے نشانیوں کے مطالبے پر دلائلِ آفاق کا ذکر فرمایا جن میں سے آسمان کی چند مخلوقات کا ذکر فرمایا گیا اور اللہ تعالیٰ کی کمالِ قدرت اور کمالِ علم کو واضح فرمایا اور ساتھ ہی ساتھ ربوبیت کے بعض گوشوں کی بھی جھلک دکھائی گئی، پھر زمین اور اس سے متعلق نعمتوں کا ذکر فرمایا جس میں انسان کی غذا کا ساز و سامان رکھا گیا ہے اور اس کے ایسے حیرت انگیز گوشوں کو واضح فرمایا جن پر انسان بہت کم غور کرتا ہے۔ اب اس رکوع میں دلائلِ انفس سے کام لیا جا رہا ہے۔ انسان کے سامنے انسان کی اپنی تاریخ کو دہرایا جا رہا ہے جس سے اس کی شخصیت کے بعض ایسے مخفی گوشے واشگاف کئے جا رہے ہیں جو انسان کیلئے بیک وقت نصیحت اور عبرت کے بہت سے باب کھول دیتے ہیں۔ انہی ابواب میں سے ایک اہم ترین باب یہ ہے کہ قریش جس طرح تکبر اور نفرت کے ساتھ آنحضرت ﷺ کی دعوت پر ایمان لانے کی بجائے اس کا انکار کر رہے ہیں، انھیں سوچنا چاہیے کہ یہ رویہ کس کے اثر سے ان کے اندر پیدا ہوا ہے، ورنہ جہاں تک ان کے اپنے جسم و جان اور صلاحیتوں کا تعلق ہے اور ان کے عملِ پیدائش کا سوال ہے اور خاص طور پر ان کے جدِ امجد کو جن عناصر سے پیدا کیا گیا ہے انھیں دیکھ کر اور غور کر کے تو ان کے اندر عاجزی ابھرنی چاہیے اور انھیں سوچنا چاہیے کہ ہم لوگ جس طرح ایک حقیر پانی کے قطرے سے پیدا کئے گئے ہیں اور ہمارے جدِ امجد کو جس طرح کھنکھناتے ہوئے گارے سے پیدا کیا گیا تھا اور پھر اپنی پیدائش کے بعد جس طرح وہ باقی تمام مخلوقات کے بچوں کی نسبت سے بے دست و پا اور سرتاپا احتیاج بن کر پیدا ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے جس طرح قدم قدم پر اپنی صفتِ ربوبیت سے انھیں نوازا اور ان کے قدموں کے نیچے سے ان کیلئے غذا پیدا کی، ہر طرح کی زندگی کی آسائشوں سے انھیں بہرہ ور فرمایا گیا ان سب باتوں کو دیکھتے ہوئے کسی انسان کیلئے بھی اس بات کی گنجائش ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا شکر گزار بننے کی بجائے اس کے دین کی دعوت کے مقابلے میں صف آرا ہو جائے۔ انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ جب ابلیس نے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار کیا اور اس کی پاداش میں اسے وہاں سے نکلنے کا حکم ہوا اور راندۂ درگاہ کر دیا گیا۔ اس نے اپنی اس بربادی اور ذلت کا سبب حضرت آدم علیہ السلام کو سمجھا اور اللہ تعالیٰ کے سامنے بڑی بے حیائی اور ڈھٹائی کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے مہلتِ عمل مانگی اور اعلان کیا کہ میں سامنے سے، پیچھے سے، دائیں سے اور بائیں سے انسانوں پر حملہ آور ہوں گا۔ اور تیرے قریب ترین بندوں کے سوا کسی کو تیری شکر گزاری پر قائم نہیں رہنے دوں گا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کو مہلتِ عمل دے دی اور جو اس نے قوت مانگی وہ بھی دے دی گئی۔ قریش کا یہ رویہ اور یہ عمل اس کے اسی اعلان کا نتیجہ ہے۔ اس نے حضرت آدم علیہ السلام کی دنیا میں تشریف آوری سے لے کر قیامت تک آنے والے انسانوں کو گمراہ کرنے کی قسم کھا رکھی ہے۔ یہ جو کچھ آج قریش کہہ رہے ہیں، یہ اسی کی صدائے بازگشت ہے اور ان کا ہر عمل ابلیس کی خواہش کی تکمیل ہے۔ وہ خوش ہیں کہ ہمارے تکبر اور نخوت کو شاید غذا مل رہی ہے لیکن انھیں اندازہ نہیں کہ وہ ابلیس کے ارادوں کی تکمیل کر رہے ہیں۔ اور جن معمولی باتوں سے انھوں نے اپنے آپ کو دین کی قبولیت سے محروم رکھا ہے، وہ شیطان ہی کے رویئے کا ثمر ہے۔ اس نے سب سے پہلے اپنے مادۂ تخلیق کے حوالے سے اونچ نیچ کا سوال اٹھایا اور اسی کو عزت کا معیار بنا لیا۔ تم بھی غربت و امارت اور حسب و نسب کو فیصلہ کن کردار دے کر اپنے آپ کو خیر سے محروم کر چکے ہو۔ خود کہو کہ تمہارے اس رویئے کا جواز کیا ہے؟

پیشِ نظر آیتِ کریمہ پر غور کیجئے، اس آیت سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی ابتداء کیسے ہوئی ہے۔ اس کے الفاظ پر غور کرنے سے یہ تو ضرور مترشح ہوتا ہے کہ جس طرح باقی تمام جاندار پانی اور کیچڑ سے پیدا کئے گئے انسانی زندگی کی ابتداء بھی اسی سے ہوئی ہے۔ اور مزید یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کو اول وہلہ میں مٹی سے اٹھا نہیں کھڑا کیا گیا بلکہ ایک طویل پراسس ہے جس سے اسے گزارا گیا۔ لیکن ہمیں اس کی تفصیلات نہیں بتائی گئیں۔ اس کا قوام مٹی اور پانی سے تیار ہوا۔ اور پھر یہ مٹی اور پانی نہ جانے کب تک تیاری کے مراحل سے گزرے اور پھر ایک وقت آیا کہ جب یہ قوام تیار ہو گیا تو اسے قالب میں ڈھالا گیا، پھر موسم کے اثرات سے اسے خشک ہونے کا موقع دیا گیا۔ اور پھر ایک وقت آیا کہ جب اسے حرارت سے پکایا گیا۔ فخار کے لفظ سے اسی کی طرف طبیعت مائل ہوتی ہے اور شاید انسان میں آتشِ غضب کا جو مادہ رکھا گیا ہے وہ اسی کا پرتو ہو۔ یہ تو وہ پراسس ہے، ممکن ہے بعض اور مخلوقات بھی کم و بیش اسی طریقے سے وجود آشنا ہوئی ہوں۔ لیکن انسان اور باقی جانداروں میں جو ایک عظیم فرق محسوس ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ باقی تمام جانداروں کو ایک خاص سانچے میں ڈھالا گیا اور ایک خاص طریقے سے بنایا گیا لیکن کسی کے بارے میں یہ نہیں فرمایا گیا کہ پروردگار نے اسے دستِ

Marfat.com

قدرت سے بنایا ہو جبکہ ہر چیز اس کے دستِ قدرت کی محتاج ہے۔اور پھر اس کا تسویہ کیا گیا۔تسویہ انسان کیلیے ایک ایسا اعزاز ہے جس میں اس کی خوبصورت شکل وصورت، اس کے اندرونی اور بیرونی خصائص، اس کے نازک احساسات، اس کی جمالی اور جلالی قوتیں، اس کی خواہشات، اس کے نفس کی مختلف حالتیں، اس کے دل کی وسیع دنیا، اس کے حواس خمسہ، پھر اس کا شعور اور اس کا جوہر عقل یہ سب کچھ اس میں شامل ہے۔اس کی بعض چیزیں جو حیوانیت کیلیے ضروری ہیں وہ حیوانوں کو ضرور عطا کی گئیں لیکن ان کا کمال اور باقی صفات صرف انسان کا خاصہ ہے اور وہ اسی تسویہ کا ثمر ہے۔

ایک اور چیز جس نے انسانوں کو مقام ومرتبہ میں کہیں کا کہیں پہنچا دیا وہ انسان کا اخلاقی کمال ہے۔ چنانچہ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پروردگار نے یہ فرمایا کہ ہم نے پھر اپنی روح کا پرتو اس پر ڈالا۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسان اللہ تعالیٰ کے اخلاق کا امین بن گیا اور اس کے اندر وہ صفات پیدا ہوئیں جس کے سامنے پوری کائنات کی رعنائیاں بھی ہیچ دکھائی دیتی ہیں۔ان تمام گزارشات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انسان کا اگر چہ اپنے مادۂ تخلیق اور آغازِ تخلیق کے اعتبار سے حیوانات کے ساتھ اشتراک پایا جاتا ہے لیکن اس بات کا تو دور دور تک امکان نہیں کہ انسان حیوانی منازل طے کرتا ہوا بشریت کی حدود میں داخل ہوا جیسا کہ ڈارون کی تھیوری ہمیں رہنمائی دیتی ہے۔ ڈارون کے نزدیک انسان بندر کی ترقی یافتہ صورت ہے جبکہ قرآن کہتا ہے کہ انسان کی براہِ راست ابتداء ارضی مادوں سے ہوئی اور اس کے جدِ امجد کی تخلیق ایسی بجنے والی مٹی سے ہوئی جو پہلے بدبودار سیاہی مائل کیچڑ تھی۔ اس سے اس کا کالبد تیار ہوا پھر اس میں اللہ تعالیٰ نے خاص روح پھونکی۔ اسی روح کی وجہ سے اس کے سر پر خلافتِ ارضی کا تاج رکھا گیا۔اسی وجہ سے انسان مسجودِ ملائک بنا۔ ہم تفصیلات سے واقف نہیں لیکن انسانی تخلیق کے بارے میں قرآن کے اس نظریئے پر یقین رکھتے ہیں اور ہر مسلمان کو اسی پر یقین رکھنا چاہیے۔ ڈارون کا نظریہ اپنی موت مر چکا، کل تک اسے پوجنے والے آج علمی طور پر اسے متروک قرار دے چکے ہیں اور قرآنِ کریم کا نظریہ کل بھی روشن تھا، آج بھی روشن ہے اور ہمیشہ روشن رہے گا۔

وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ ﴿٢٧﴾ (سورۃ الحجر : ٢٧)

(اور جان کو ہم نے پیدا فرمایا اس سے پہلے آگ کی لپٹ سے۔ ٢٧)

جنات کی خلقت کا آغاز

"السَّمُوْمِ" گرم ہوا کو کہتے ہیں جس میں دھواں نہیں ہوتا۔اس کی نسبت چونکہ نار کی طرف کی گئی ہے اس لیے اس کا ترجمہ آگ کی لپٹ کیا گیا ہے۔یعنی یہ نارِ سموم ہے یعنی آگ کی لپٹ۔

اس آیتِ کریمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جنوں کو اللہ تعالیٰ نے آگ کی لپٹ یا لُو کی لپٹ یا ہوائے گرم سے پیدا کیا ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ جنات کو براہِ راست آگ سے پیدا نہیں کیا گیا بلکہ اس کے عنصرِ لطیف یعنی گرم ہوا سے پیدا کیا گیا۔اس سے پہلے کی آیت میں انسان کے مادۂ تخلیق کو بیان فرمایا گیا اور اس آیت میں جنوں کے مادۂ تخلیق کو۔ دونوں میں واضح فرق ہے۔ ایک نرا کثافت ہے اور دوسرا نرا لطافت۔ سڑا ہوا کھنکھناتا گارا ظاہر ہے ایک کثیف چیز ہے۔ آگ بجائے خود ایک لطیف چیز ہے لیکن پروردگار نے جنوں کو اس سے ایک عنصرِ لطیف نکال کر یعنی گرم ہوا سے پیدا فرمایا۔ آگ اپنی فطرت میں رفعت رکھتی ہے۔ وہ ہمیشہ اوپر کو جاتی ہے اور اس کی لپٹ میں تو اس سے بڑھ کر رفعت ہوگی اور مٹی کی فطرت میں قدرت نے پستی کی طرف گرنا لکھا ہے۔اسے آپ جب بھی اچھالیں وہ زمین کی طرف گرتی ہے اور پستی میں اترتی ہے۔ چنانچہ آگے چل کر آپ دیکھیں گے کہ مادۂ تخلیق کا یہی فرق گمراہی کا سبب بن گیا۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿٢٨﴾ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ﴿٢٩﴾ (سورۃ الحجر : ٢٨، ٢٩)

(اور اس وقت کو یاد کرو جب آپ کے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں سڑے ہوئے گارے کی کھنکناتی ہوئی مٹی سے ایک بشر پیدا کرنے والا ہوں۔ ٢٨) تو جب میں اس کو مکمل کرلوں اور اس میں اپنی روح میں سے پھونک لوں تو تم اس کیلیے سجدے میں گر پڑنا۔ ٢٩)

Marfat.com

فرشتوں سے سجدہ کرانے کا مقصد اور سجدہ کا مفہوم

ملائکہ یعنی فرشتے چونکہ کائنات کا نظام چلا رہے ہیں اور پروردگار نے مختلف ذمہ داریوں پر انھیں فائز کر رکھا ہے۔ وہی کارکنانِ قضا وقدر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کائنات کے تکوینی نظام کا بیشتر حصہ ان کے ذمہ داریوں سے چل رہا ہے۔ پروردگار نے جب یہ ارادہ فرمایا کہ میں زمین میں ایک بشر اور انسان کے نام سے ایک نئی مخلوق پیدا کر رہا ہوں اور اس کے سر پر خلافتِ ارضی کا تاج بھی رکھنے والا ہوں تو ایسا کرنے سے پہلے ضروری تھا کہ جو پاکیزہ مخلوق اور مقربینِ بارگاہِ الٰہی اس سے پہلے کائنات کا نظام چلا رہے تھے وہ اس نئی مخلوق کے بارے میں پوری طرح آگاہ ہو جائیں کہ وہ اپنے مادۂ تخلیق کے اعتبار سے کس قسم کی فطرت لے کر زمین پر جا رہا ہے۔ اور پھر اس مادۂ تخلیق کی کثافت کے باوجود میں جس طرح اس کا تسویہ کر رہا ہوں اور جن کمالات سے اسے نواز رہا ہوں انھیں بھی وہ اچھی طرح ملاحظہ کر لیں اور پھر انھیں یہ بھی معلوم ہو کہ میں اپنی خاص روح اس میں پھونک رہا ہوں۔ یعنی صفاتِ الٰہی کا ایک عکس یا پرتو اس پر ڈالنے والا ہوں۔ حیات، علم، قدرت، ارادہ، اختیار اور دوسری جتنی صفات انسان میں پائی جاتی ہیں جن کے مجموعہ ہی کا نام روح ہے یہ دراصل اللہ تعالیٰ ہی کی صفات کا ایک ہلکا سا پرتو ہے جو اس کالبدِ خاکی پر ڈالا گیا ہے۔ ان تمام باتوں کو پیشِ نظر رکھیں تا کہ جب انھیں حضرت آدمؑ کے سامنے جھکنے اور سجدہ کرنے کا حکم دیا جائے تو انھیں تأمل نہ ہو۔ آدمؑ کے سامنے ان کے سجدہ ریز ہونے کا مقصد یہ ہرگز نہیں کہ وہ اسے اپنا مسجود سمجھیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ کائنات کا نظام چلانے اور اپنی خلافت کی ذمہ داریاں احسن طریق سے انجام دینے کیلیے یہ ضروری ہے کہ کائنات کے کارکنان اس کے احکام کی تعمیل کریں۔ وہ جو کرنا چاہیں اس کیلیے آسانیاں مہیا کریں۔ اسی سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ فرشتوں کا حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنا دراصل ان کی جانب سے اس بات کا اظہار تھا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو زمین کی خلافت دے کر جس منصب پر فائز کیا ہے، ہم نہ صرف اسے تسلیم کرتے ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق ہم ہر ممکن طریق سے اس میں تعاون کریں گے۔ تو اس سے خود بخود یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انھیں حضرت آدم علیہ السلام کو مسجود بنانے کا حکم نہیں دیا جا رہا ہے بلکہ احترام اور ان کی سرکاری حیثیت کو تسلیم کرانے کا ایک ذریعہ تھا۔ اس کیلیے صرف یہی کافی تھا کہ ان کے سامنے سر جھکا لیا جائے۔ اس لیے بہت سے مفسرین کی یہ رائے ہے کہ یہاں سجدے سے مراد زمین پر سر رکھنا نہیں بلکہ احترام، عقیدت اور منصب کے تسلیم کیلیے سر جھکانا ہے اور اگر اس سے مراد زمین پر سر رکھنا ہی لیا جائے تو پھر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ سجدہ تو اللہ تعالیٰ کی ذات کو ہوگا لیکن حضرت آدم قبلہ کی طرح فرشتوں کے سامنے ہوں گے۔ ان کی حیثیت صرف جہت اور سمت کی ہوگی لیکن مسجود اللہ تعالیٰ کی ذات ہوگی۔ جیسے آج ہم نماز میں کعبۃ اللہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں۔ کعبۃ اللہ، اللہ تعالیٰ کے انوار کا مرکز ہے اس لیے وہ حد درجہ مسلمانوں کے نزدیک محترم ہے۔ لیکن سجدہ مسلمان اسے نہیں کرتے بلکہ اللہ تعالیٰ کو کرتے ہیں۔

فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ﴿۳۰﴾ اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۳۱﴾ قَالَ يٰٓاِبْلِيْسُ مَا لَكَ اَلَّا تَكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۳۲﴾ قَالَ لَمْ اَكُنْ لِّاَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهٗ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۳۳﴾ قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ ﴿۳۴﴾ وَّاِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ ﴿۳۵﴾ قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿۳۶﴾ قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ﴿۳۷﴾ اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ ﴿۳۸﴾

(تو تمام فرشتوں نے سجدہ کیا۔ ۳۰) سوائے ابلیس کے، اس نے انکار کر دیا کہ وہ سجدہ کرنے والوں کے ساتھ ہو۔ ۳۱) پروردگار نے پوچھا، اے ابلیس! تیرا کیا معاملہ ہے کہ تو سجدہ کرنے والوں کا ساتھ نہ دے۔ ۳۲) وہ بولا کہ میں ایک ایسے بشر کو سجدہ کرنے کو تیار نہیں جس کو تو نے سڑے ہوئے گارے کی کھنکھناتی ہوئی مٹی سے پیدا کیا۔ ۳۳) اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ نکل جا یہاں سے تو مردود ہے۔ ۳۴) بیشک تجھ پر لعنت ہے روز جزا تک۔ ۳۵) کہنے لگا کہ اے میرے رب پھر مہلت دے مجھے اس دن تک جب مردے قبروں سے اٹھائے جائیں گے۔ ۳۶) فرمایا بیشک تو مہلت دیے ہوئے گروہوں میں سے ہے۔ ۳۷) جنھیں وقتِ مقرر کے دن تک مہلت دی گئی ہے۔ ۳۸) (سورۃ الحجر: ۳۰۔۳۱۔۳۲۔۳۳۔۳۴۔۳۵۔۳۶۔۳۷۔۳۸)

Marfat.com

آدم وابلیس کی سرگزشت

قصۂ آدم وابلیس کی چونکہ پوری تفصیلات پر ہم سورۂ بقرہ اور بعض دوسرے مواقع پر بھی بحث کر چکے ہیں۔ اس لیے یہاں تفصیلات سے گریز کررہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے حکمِ سجدہ پر تمام فرشتے سجدہ ریز ہوگئے مگر ابلیس نے سجدہ نہیں کیا حالانکہ اس نے آج تک اللہ تعالیٰ کے کسی حکم سے کبھی سرتابی نہ کی تھی بلکہ کثرتِ عبادت کی وجہ سے تمام فرشتوں میں اس کی شہرت تھی۔ لیکن آج جب اسے امتحان پیش آیا جس میں اسے اپنی ذات اور اپنی نام نہاد عزت کو اللہ تعالیٰ کے حکم پر قربان کرنا تھا تو وہ اس میں بری طرح ناکام ہوا۔ چنانچہ جب اس سے پوچھا گیا کہ تو نے حضرتِ آدمؑ کو سجدہ کیوں نہیں کیا تو اس نے صاف کہا کہ میں ایسے بشر کے سامنے نہیں جھک سکتا جسے سڑے ہوئے گارے کی کھنکھناتی مٹی سے پیدا کیا گیا ہو جبکہ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا۔ آگ میں رفعت ہے اور مٹی میں پستی۔ رفعت پستی کے سامنے کیسے جھک سکتی ہے۔ قریش کیلیے بھی یہی بڑا امتحان تھا۔ ان کے وڈیرے اور ان کے رئیس آنحضرت ﷺ کی دعوت کو قبول کرنے کا مطلب یہ سمجھتے تھے کہ یہ تو ایک یتیم اور غریب آدمی کے سامنے جھکنے والی بات ہے بلکہ اسی پر بس نہیں، آپ جو تعلیمات لے کے آئے ہیں اس کے نتیجے میں تمام چھوٹے بڑے، غریب اور امیر حتیٰ کہ آقا اور غلام بھی ایک صف میں کھڑے ہوجاتے ہیں۔ تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ قریش اپنے تمام امتیازات سے دستبردار ہوجائیں گے اور ان کی حیثیت ایک عام عرب سے زیادہ نہیں ہوگی۔ یہ بات ان کیلیے قابلِ قبول نہ تھی، لیکن اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں جو درحقیقت سب سے بڑی بارگاہ ہے وہاں یہ مصنوعی بڑائیوں کے دعوے برداشت نہیں ہوتے۔ اس لیے فرمایا کہ تو یہاں سے نکل جا، اس لیے کہ تو آج سے راندۂ درگاہ ہے کہ کہاں تو تیرا یہ مقام کہ تو مقرب فرشتوں کے ساتھ رہتا تھا، لیکن اب تیری حیثیت یہ ہے کہ تو اگر خاص حد سے تجاوز کرنے کی کوشش کرے گا تو شہابوں کے پتھر تجھے سنگسار کردیں گے۔ اور قیامت تک تجھ پر لعنت برسے گی یعنی تو رحمت کی ہر بات سے محروم کردیا گیا ہے۔ جب اس نے دیکھا کہ آدم کو سجدہ نہ کرنے کا نتیجہ ہر طرح کی خیر سے محرومی ہے تو اس کے اندر کی شیطنت اور بھڑکی تو بجائے معافی مانگنے کے کہنے لگا کہ پروردگار مجھے قیامت تک کیلیے مہلت دے دیجیے یعنی میری زندگی اتنی طویل فرمادیجیے تاکہ میں تیرے بندوں کو گمراہ کرسکوں۔ پروردگار نے ارشاد فرمایا: کہ میں تجھے مہلت دیتا ہوں ایک ایسے دن تک جس کا ایک معین وقت ہے۔

قَالَ رَبِّ بِمَآ اَغْوَيْتَنِىْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِى الْاَرْضِ وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۳۹﴾ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۴۰﴾

(وہ بولا! اے میرے رب، چونکہ تو نے مجھے گمراہ کیا، میں زمین میں دنیا کو ان کی نگاہوں میں ضرور خوشنما بنادوں گا اور میں ان سب کو گمراہ کرکے چھوڑوں گا۔ ۳۹) سوائے تیرے ان بندوں کے جنھیں ان میں سے چن لیا گیا ہے۔ ۴۰) (سورۃ الحجر: ۳۹-۴۰)

ابلیس کی گمراہی کا سبب اور اس کا ہدف

اگر اللہ تعالیٰ کی بندگی کسی شخص میں عاجزی اور فروتنی پیدا نہیں کرتی تو پھر اس کی انا عام بگڑے ہوئے لوگوں سے بھی زیادہ خطرناک ہوجاتی ہے۔ ابلیس نے اللہ تعالیٰ جانے کتنے سالوں تک اللہ تعالیٰ کی بندگی کی اور عبادت میں مثال بن گیا، لیکن اس عبادت اور بندگی نے اس کے اندر بندوں جیسی صفات پیدا کرنے کی بجائے اس کی انانیت میں اضافہ کیا۔ وہ اپنے آپ کو نہ جانے کیا سمجھنے لگا۔ چنانچہ جیسے ہی ارضی اجزاء سے پیدا کی جانے والی ایک مخلوق کے سامنے اسے سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا تو اس کے اندر کی انا ایک طوفان بن کے اٹھی اور اس کے ہر نیک جذبے کو جلا کر رکھ دیا۔ وہ بھول گیا کہ میں اس سے پہلے کیا تھا۔ اب اس کے سامنے ایک ہی مقصد تھا کہ جس شخص کی وجہ سے مجھے یہ دن دیکھنا پڑا ہے، میں ہر ممکن طریقے سے اسے اور اس کی اولاد کو نقصان پہنچا کر اپنی تسکین کا سامان کروں۔ چنانچہ انانیت کی اسی آگ میں جلتے ہوئے اس نے اللہ تعالیٰ برحق کے سامنے بھی گستاخانہ رویہ اختیار کیا اور نہایت گستاخی سے بولا کہ میں جس گمراہی کے راستے پر پڑ گیا ہوں اس کی ذمہ داری مجھ پر نہیں بلکہ پروردگار آپ پر ہے۔ کیونکہ آپ نے مجھے ایک ایسی مخلوق کو سجدہ کرنے کا حکم دیا جو اپنے مادۂ تخلیق کے اعتبار سے مجھ سے نہایت فروتر تھی۔ مجھے آگ کی لپٹ سے پیدا کیا گیا جس کی فطرت اور جس کی ماہیت میں ایک پاکیزگی بھی ہے اور ایک برتری بھی۔ اور مجھے اس کے سامنے جھکنے کا حکم دیا گیا جو سرتاپا کثافت اور فروتنی کا نام ہے۔

Marfat.com

چنانچہ میں اس کا انتقام لینے کیلیے جو کرنا چاہتا ہوں، میں اسے چھپا کر نہیں رکھ سکتا کیونکہ میرے اندر ایک آگ لگی ہوئی ہے اور چھپا کر رکھوں بھی تو آپ سے کیا چھپایا جاسکتا ہے۔ میرا طریقِ واردات یہ ہوگا کہ میں دنیا میں جو کچھ ہے اسے آخرت کے مقابلے میں نہایت مزین کر کے دکھاؤں گا تاکہ انسان دنیا پر ریجھ جائے اور آخرت پر اسے ترجیح دے۔ اس کی ایک ایک نعمت پر جان دے اور اسی کو بنانے سنوارنے اور اسی کو زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے میں اپنی زندگی کھپا دے اور اس کے مقابلے میں آخرت کو محض ایک بہلاوا سمجھے۔ اور مزید یہ بھی کروں گا کہ انسان کے ہر عمل کو اس کے دل میں مزین کردوں گا۔ وہ برائی کرے گا، میں اسے نیکی بنا کے دکھاؤں گا۔ اور اس کی ہر غلط بات کو بھی میں دلائل کے انبار میں دبا دوں گا۔ اس کی ذات اس قدر میں اسے عزیز بنا دوں گا کہ اس کی تعمیر و ترقی کیلیے وہ انسانی آبادیوں کو تباہ کرنے، بچوں کو نیزوں پر اچھالنے اور ہر بڑے سے بڑے ظلم سے دریغ نہیں کرے گا اور اس طرح سے میں تمام انسانوں کو گمراہ کر کے رکھ دوں گا اور اس کیلیے میں جو محنت کروں گا (اس کی تفصیل سورۃ الاعراف میں گزر چکی ہے۔) اس کی کوئی انتہا نہیں ہوگی۔ البتہ میں یہ جانتا ہوں کہ میری یہ ساری کاوشیں تیرے مخلص بندوں پر اثر انداز نہیں ہوں گی۔ وہ میرے ہر حملے سے محفوظ رہیں گے اور میرے بڑے سے بڑے چرتر کا مقابلہ ان کیلیے مشکل نہیں ہوگا۔

قَالَ هٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيْمٌ ﴿۴۱﴾ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ﴿۴۲﴾

(اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ سیدھا راستہ ہے جو میری طرف آتا ہے۔ ۴۱) بیشک میرے بندوں پر تیرا کوئی بس نہیں چلتا، مگر وہ جو گمراہوں میں سے تیری پیروی کرتے ہیں۔ ۴۲) (سورۃ الحجر: ۴۱-۴۲)

صراطِ مستقیم سے مراد؟ اور ابلیس کی مہلت کی حد؟

پہلی آیتِ کریمہ میں فرمایا کہ یہی میرا سیدھا راستہ ہے اور سابقہ آیت کے مفہوم پر غور کریں تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ یہاں دراصل یہ فرمایا جارہا ہے کہ میرے ساتھ مکمل اخلاص کے ساتھ بغیر شرک کے اور بغیر ریا کے بندگی کی زندگی گزارنا یہ صراطِ مستقیم ہے۔ اور جو میرے بندے اس صراطِ مستقیم پر قائم رہتے ہیں ان پر شیطان کا کبھی غلبہ نہیں ہوتا۔ وہ میری شریعت سے انحراف نہیں کرتے تو شیطان کو حکم چلانے کا موقع نہیں ملتا۔ وہ اپنے دل میں میری محبت اور میرے خوف کے سوا کسی دوسرے کا تصور داخل نہیں ہونے دیتے تو شیطان کو ان کے نازک جذبات تک پہنچنے کا کوئی راستہ نہیں ملتا۔ اور ویسے بھی دوسری آیت میں یہ اشارہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ شیطان سے یہ کہا جارہا ہے کہ ہم نے تجھے قیامت تک کیلیے زندگی دے دی اور گمراہ کرنے کیلیے مہلت دے دی اور کسی حد تک اس کے وسائل بھی دے دیے۔ البتہ میرے جو بندے اخلاص کے ساتھ مجھ سے وابستہ رہیں گے تمہیں اس بات کا اختیار نہیں دیا کہ تم ان پر غلبہ پانے کی کوشش کرو۔ وہ تمہاری دسترس سے آزاد ہوں گے۔ تیری دسترس میں صرف وہ لوگ آئیں گے جو اللہ تعالیٰ کے راستے کو چھوڑ کر اس کے اخلاص کے رشتے کو توڑ کر گمراہی کی زندگی گزار رہے ہوں گے۔

وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۴۳﴾ لَهَا سَبْعَةُ اَبْوَابٍ لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ ﴿۴۴﴾

(بیشک جہنم ان سب کیلیے وعدہ کی جگہ ہے۔ ۴۳) اس کے سات دروازے ہیں، ہر دروازے کیلیے ان میں سے ایک حصہ مخصوص ہے۔ ۴۴) (سورۃ الحجر: ۴۳-۴۴)

جہنم کی وسعت اور اس میں لے جانے والے مہلکات

گزشتہ آیات میں ابلیس نے نہایت جسارت کے ساتھ پروردگار کے حضور میں کہا کہ میں تیرے بندوں کو ہر ممکن طریقے سے گمراہ کرنے کی کوشش کروں گا۔ پروردگار نے فرمایا کہ میں تمہیں اس کیلیے مہلت دے چکا ہوں، تمہارے جو جی میں آئے کرو، لیکن یہ یاد رکھو میرے مخلص بندوں پر تمہارا بس نہیں چلے گا۔ صرف وہ گمراہ لوگ ہوں گے جو تیرے داؤ و فریب کا شکار ہوں گے۔ لیکن تمہیں اس بات کا یقین رکھنا چاہیے

Marfat.com

کہ میں نے تم سب کیلیے جہنم تیار کر رکھا ہے۔تم اور تمھارے متبعین چاہے کتنی تعداد میں بھی ہوئے جہنم ان سب کیلیے کافی ہوگا۔اس کے سات دروازے ہیں اور بعض علماء کے نزدیک اس کے سات طبقے ہیں اور ہر طبقے کا ایک الگ دروازہ ہے۔ان سات طبقوں کے نام یہ ہیں جہنم، لظیٰ، الحطمہ ،السعیر ،السقر ،الجحیم الہاویہ۔اس آیتِ کریمہ میں فرمایا گیا ہے کہ جہنم کے مختلف دروازوں سے داخل ہونے والوں کی ایک خاص تعداد ہوگی اور تعداد کا تعین اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ان میں کوئی نہ کوئی درجہ بندی بھی ہے۔اب سوال یہ ہے کہ اس درجہ بندی کی بنیاد کس چیز پر ہوگی؟اس سلسلے میں کوئی حتمی بات کہنا تو ممکن نھیں، کیونکہ جہنم مفسدین کا مرکز ہے اور فساد کی کوئی ایک قسم نھیں۔فساد عقیدے میں بھی ہوتا ہے اور عمل میں بھی۔اور اگر بڑے بڑے فسادات کو شمار کر لیا جائے اور انھیں کو بنیاد بنایا جائے اس درجہ بندی کیلیے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ عقیدے کا سب سے بڑا فساد شرک ہے۔اور اعمال میں قطع رحم ہے، قتل ہے، زنا ہے، جھوٹی شہادت ہے، کمزوروں پر ظلم ہے اور بغی ہے۔اس طرح سے بڑے بڑے فسادات کی تعداد سات تک پہنچتی ہے۔ممکن ہے انھیں کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ نے ان کی درجہ بندی کی ہو۔حقیقت بہر حال اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نھیں کہ اس سے جہنم کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔اور ابلیس کی امت کے انجام کی بھی خبر ہو جاتی ہے۔

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ
جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿۴۵﴾ اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِيْنَ ﴿۴۶﴾ وَنَزَعْنَا مَا فِيْ
صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ ﴿۴۷﴾ لَا يَمَسُّهُمْ
فِيْهَا نَصَبٌ وَّمَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ ﴿۴۸﴾ نَبِّئْ عِبَادِيْٓ اَنِّيْٓ
اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۴۹﴾ وَاَنَّ عَذَابِيْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ ﴿۵۰﴾
وَنَبِّئْهُمْ عَنْ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ ﴿۵۱﴾ اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا
قَالَ اِنَّا مِنْكُمْ وَجِلُوْنَ ﴿۵۲﴾ قَالُوْا لَا تَوْجَلْ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمٍ
عَلِيْمٍ ﴿۵۳﴾ قَالَ اَبَشَّرْتُمُوْنِيْ عَلٰٓى اَنْ مَّسَّنِيَ الْكِبَرُ فَبِمَ
تُبَشِّرُوْنَ ﴿۵۴﴾ قَالُوْا بَشَّرْنٰكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقٰنِطِيْنَ ﴿۵۵﴾
قَالَ وَمَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖٓ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ ﴿۵۶﴾ قَالَ فَمَا
خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۵۷﴾ قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ﴿۵۸﴾

Marfat.com

اِلَّاۤ اٰلَ لُوْطٍؕ اِنَّا لَمُنَجُّوْهُمْ اَجْمَعِیْنَۙ(۵۹) اِلَّا امْرَاَتَهٗ قَدَّرْنَاۤ ۙ اِنَّهَا لَمِنَ الْغٰبِرِیْنَ۠(۶۰)

رکوع: ۴۔ (بیشک اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے باغوں اور چشموں میں ہوں گے۔ ۴۵) انھیں کہا جائے گا) تم داخل ہو جاؤ ان جنتوں میں سلامتی کے ساتھ بے خوف ہو کر۔ ۴۶) ان کے سینوں کی کدورتیں ہم نکال دیں گے وہ آمنے سامنے بھائی بھائی کی طرح تختوں پر براجمان ہوں گے ۴۷) اس میں نہ تو کوئی ان کو تکان لاحق ہوگی اور نہ وہ اس سے نکالے جائیں گے۔ ۴۸) میرے بندوں کو خبر دے دو کہ میں بہت ہی بخشنے والا مہربان ہوں۔ ۴۹) (اور یہ بھی بتا دو) کہ بیشک میرا عذاب بھی بڑا ہی دردناک ہے۔ ۵۰) اور انھیں ابراہیمؑ کے مہمانوں سے متعلق بھی آگاہ کر دو۔ ۵۱) جب وہ آپؑ کے پاس آئے تو انھوں نے کہا آپؑ پر سلام ہو۔ ابراہیم علیہ السلام نے کہا ہم تو آپ لوگوں سے اندیشہ ناک ہیں۔ ۵۲) مہمانوں نے کہا آپؑ کوئی اندیشہ نہ کریں، ہم آپؑ کو مژدہ سنانے آئے ہیں، ایک ذی علم بچے کی پیدائش کا۔ ۵۳) آپؑ نے کہا کہ کیا تم مجھے اس وقت خوشخبری دے رہے ہو جبکہ بڑھاپا مجھے لاحق ہو چکا ہے۔ تو کس بل پر بشارت دے رہے ہو۔ ۵۴) انھوں نے کہا ہم نے آپ علیہ السلام کو ایک امرِ واقعی کی بشارت دی ہے تو آپؑ ناامید ہونے والوں میں سے نہ ہوں۔ ۵۵) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا: کہ اپنے رب کی رحمت سے گمراہوں کے سوا اور کون ناامید ہو سکتا ہے؟ ۵۶) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا اے فرستادگانِ الٰہی! تمھاری مہم کیا ہے؟ ۵۷) فرشتوں نے کہا: ہم ایک مجرم قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں۔ ۵۸) مگر لوط کے گھر والے ہم ان سب کو بچا لیں گے۔ ۵۹) بجز اس کی بیوی کے، ہم نے اس کو تاک رکھا ہے، وہ بیشک پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہوگی۔ ۶۰)

اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّ عُیُوْنٍؕ(۴۵) اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِیْنَ(۴۶) وَ نَزَعْنَا مَا فِیْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِیْنَ(۴۷) لَا یَمَسُّهُمْ فِیْهَا نَصَبٌ وَّ مَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِیْنَ(۴۸)

(بیشک اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے باغوں اور چشموں میں ہوں گے۔ ۴۵) (انھیں کہا جائے گا) تم داخل ہو جاؤ ان جنتوں میں سلامتی کے ساتھ بے خوف ہو کر۔ ۴۶) ان کے سینوں کی کدورتیں ہم نکال دیں گے وہ آمنے سامنے بھائی بھائی کی طرح تختوں پر براجمان ہوں گے ۴۷) اس میں نہ تو کوئی ان کو تکان لاحق ہوگی اور نہ وہ اس سے نکالے جائیں گے۔ ۴۸)
(سورۃ الحجر: ۴۵۔۴۶۔۴۷۔۴۸)

متقین کا انجام

ابلیس اور اس کی پیروی کرنے والوں کا انجام بیان کرنے کے بعد اب ان لوگوں کے احوال کا ذکر ہو رہا ہے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے، خواہشات کی پیروی سے بچنے والے اور اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ ہی کے راستے پر ڈال دینے والے لوگ ہوں گے۔ یہ لوگ باغات میں اور چشموں میں ہوں گے، ان کی ایسی بستیاں بسائی جائیں گی جس میں باغوں کا گھنا سایہ اور رسیلے خوشبودار پھلوں کی جھکی ہوئی شاخیں کام و دہن کو لذت دینے کے ساتھ ساتھ مشامِ جان کو بھی معطر کر رہی ہوں گی۔ ان کے دائیں بائیں اور نیچے سے ندیاں رواں ہوں گی۔ مسرتوں کی گھٹائیں ان کے سر پر تلی کھڑی رہیں گی۔ انھیں کہا جائے گا ان بستیوں میں داخل ہو جاؤ، سلامتی تمھاری بلائیں لے گی اور تمھیں کسی قسم کا کوئی کھٹکا نہیں ہوگا۔ دنیا میں بڑی سے بڑی خوشی کو بھی زوال لاحق ہوتا ہے۔ اور بڑے سے بڑا آدمی بھی ایک دن فنا کے گھاٹ اتر جاتا ہے۔ لیکن جنت ایک ایسا مقام ہوگا جس میں طبیعت کے ناموافق کسی چیز کا ظہور نہیں ہوگا۔ خوشیوں کے چشمے ابلیں گے اور ہر خوشی اور راحت ابدی ہوگی۔ ٹھیک کہا کسی نے:

Marfat.com

بہشت آنجا کہ آزارے نہ باشد
کسے را باکسے کارے نہ باشد

انسانوں کے مزاج کا اختلاف ایک فطری حقیقت ہے۔ مہذب ترین لوگوں میں بھی مکمل ہم آہنگی کبھی نہیں ہوتی۔ نہایت شائستہ مجالس میں بھی شکر رنجی اور مزاج کی ناموافقت کا کوئی نہ کوئی سبب پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ جنت میں رہنے والے ایسے نادرِ روزگار لوگ ہوں گے کہ جن کے درمیان ناموافقت کی کوئی صورت نہیں رہے گی اور اگر دنیا میں کوئی ایسی بات طبیعتوں میں رہی بھی ہوگی تو اللہ تعالیٰ انھیں جنت میں بھیجنے سے پہلے ان کے دلوں سے ایسی ہر کدورت کو نکال باہر کریں گے۔ مختلف مزاج کے لوگ کبھی اگر اکٹھے ہو بھی جائیں تو ایک دوسرے سے دور یا منہ پھیر کر بیٹھتے ہیں لیکن یہ لوگ آمنے سامنے تختوں پر بھائیوں کی طرح براجمان ہوں گے۔ حضرت علیؓ کی طرف یہ قول منسوب ہے۔ آپؓ نے فرمایا: ارجو ان اکون انا و عثمان و طلحه و زبیر منهم میں امید کرتا ہوں کہ میں، عثمان، طلحہ، زبیر انھیں لوگوں میں سے ہوں۔ مزید فرمایا کہ آدمی کے ساتھ جو ضرورتیں لگی ہیں اور کوئی تکلیف بھی نہ ہو تو ضرورتوں کی فراہمی بجائے خود ایک تھکا دینے والی چیز ہے اور اگر یہ خیال بھی دامن گیر رہے کہ انسانوں کو کبھی کوئی نعمت ہمیشہ کیلئے نہیں ملتی تو یہ خیال ہی بجائے خود ایک عذاب سے کم نہیں۔ اس لیے فرمایا کہ وہاں انھیں نہ کسی مشقت سے واسطہ پڑے گا، نہ کسی طرح کی تکلیف سے، اور نہ انھیں اس جنت سے کبھی نکالا جائے گا بلکہ آنحضرت ﷺ نے ایک حدیث میں اس کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا: يُقَالُ لاهل الجنة ان لكم ان تصحوا ولاتمرضوا ابدا وان لكم ان تعيشوا فلا تموتوا ابدا و ان لكم ان تشبوا ولا تهرموا ابدا وان لكم ان تقيموا فلا تضعنوا ابدا اہلِ جنت سے کہہ دیا جائے گا کہ اب تم ہمیشہ تندرست رہو گے، کبھی بیمار نہ پڑو گے اور اب تم ہمیشہ زندہ رہو گے، کبھی موت تم کو نہ آئے گی اور اب تم ہمیشہ جواں رہو گے، کبھی بڑھاپا تم پر نہ آئے گا۔ اب تم ہمیشہ مقیم رہو گے، کبھی کوچ کرنے کی تمہیں ضرورت نہ ہوگی۔

نَبِّئْ عِبَادِيْٓ اَنِّيْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۴۹﴾ وَاَنَّ عَذَابِيْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ ﴿۵۰﴾

(میرے بندوں کو خبر دے دو کہ میں بہت ہی بخشنے والا مہربان ہوں۔ ۴۹) (اور یہ بھی بتا دو) کہ بیشک میرا عذاب بھی بڑا ہی دردناک ہے۔ ۵۰) (سورۃ الحجر: ۴۹۔ ۵۰)

اللہ تعالیٰ کی رحیمی سے متعلق غلط فہمی کا ازالہ

قریش کو خصوصاً اور باقی نوعِ انسانی کو عموماً یہ بتلانا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ کی دو صفات ہیں جو برابر برابر چلتی ہیں۔ ایک اس کی صفتِ رحم اور دوسری صفت سزا دینا اور عذاب نازل کرنا ہے۔ وہ اپنے فرمانبردار بندوں پر ہمیشہ رحم فرماتا ہے اور جن لوگوں کی طرف اللہ تعالیٰ کا کوئی رسول ہدایت لے کر آتا ہے اس رسولؐ کی مخاطب قوم کو اگر وہ ایمان نہیں لاتی تو ڈھیل پر ڈھیل دینا بھی اس کی صفتِ رحمت کا ظہور ہے۔ انسانوں کی سرکشی کا تقاضا تو یہ ہے کہ جب وہ اپنی سرکشی سے باز نہ آئیں تو انھیں تباہ کر دیا جائے لیکن اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحمت انھیں بجائے تباہ کرنے کے سنبھلنے کیلئے مہلت دیتی ہے۔ وہ اپنی حماقت کے باعث ہمیشہ عذاب کا مطالبہ کرتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ انھیں زیادہ سے زیادہ سنبھلنے اور غور و فکر کرنے کا موقع مہیا کرتا ہے۔ لیکن جب تمام تر رحمت کے باوجود وہ لوگ راہِ راست پر آنے کیلئے تیار نہیں ہوتے تو پھر آخر اللہ تعالیٰ کا عذاب ان کی کمر توڑ دیتا ہے۔ اس لیے اہلِ مکہ کو یہ بتایا جا رہا ہے کہ تم نے آج تک اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحمت کو دیکھا ہے۔ اس بے آب و گیاہ وادی میں قسم قسم کی نعمتوں کا ظہور اور پھلوں کے رزق کی بہم رسانی اور بیت اللہ تعالیٰ کو مرجع خلائق بنا دینا اور اسی گھر کے زیرِ اثر پورا جزیرۂ عرب جو نفرتوں کا مرکز بن چکا ہے اس میں حرم کو دارالامن کی حیثیت دے دینا اللہ تعالیٰ کی رحمت ہی کا ظہور ہے۔ اور اب سالوں سے اللہ تعالیٰ کے پیغمبرؐ کے خلاف جو رویہ انھوں نے اختیار کر رکھا ہے، اس پر خدا کا عذاب نہ آنا یہ بھی اسی کی رحمت کا نتیجہ ہے۔ لیکن یہ مہلت ہمیشہ کیلئے نہیں، ایک دن ختم ہو جائے گی۔ اس کے بعد کسی وقت بھی اللہ تعالیٰ کا عذاب آ سکتا ہے۔ تم نے آج تک اس کی رحمت کے مزے لوٹے ہیں، آنے والے دنوں کی فکر کرو اور اپنا رویہ بدلو۔ اور اگر تم نے اللہ تعالیٰ کے رسولؐ کی دعوت کو قبول نہ کیا تو پھر تمہیں اس عذابِ الیم سے کوئی نہ بچا سکے گا۔

Marfat.com

وَنَبِّئْهُمْ عَنْ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ ﴿۵۱﴾ اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ اِنَّا مِنْكُمْ وَجِلُوْنَ ﴿۵۲﴾ قَالُوْا لَا تَوْجَلْ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ﴿۵۳﴾ (سورة الحجر : ۵۱.۵۲.۵۳)

(اور انھیں ابراہیم کے مہمانوں سے متعلق بھی آگاہ کردو۔۵۱) جب وہ آپ کے پاس آئے تو انھوں نے کہا آپ پر سلام ہو۔ ابراہیم علیہ السلام نے کہا ہم تو آپ لوگوں سے اندیشہ ناک ہیں۔ ۵۲) مہمانوں نے کہا آپ کوئی اندیشہ نہ کریں، ہم آپ کو مژدہ سنانے آئے ہیں، ایک ذی علم بچے کی پیدائش کا۔ ۵۳)

تاریخ کی شہادت

سابقہ دو آیتوں میں ہم نے پڑھا کہ اللہ تعالیٰ بہت مہربان ہے اور ساتھ ہی یہ بات بھی کہ اس کا عذاب، عذاب الیم ہے۔ اب ان دونوں باتوں کی تائید میں تاریخ سے دو اہم واقعات بیان کئے جا رہے ہیں۔ ایک واقعہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کی دلیل ہے اور دوسرا اس کے عذاب الیم کا۔ رحمت کی دلیل کے طور پر حضرت اسحاق علیہ السلام کی پیدائش کی خوشخبری دی گئی۔ اور عذابِ الیم کی دلیل کے طور پر اگلوں آیتوں میں قوم لوط پر عذاب کی تفصیل بیان کی ہے۔ پیشِ نظر آیتوں میں صرف پہلے واقعہ کا ذکر ہے اور وہ بھی نہایت اختصار سے۔ اس کی تفصیل سورۂ ہود میں گزر چکی ہے کہ دو خوبصورت نوجوان مہمان بن کر اچانک حضرت ابراہیم علیہ السلام کے گھر پر تشریف لائے۔ انھوں نے آ کر آپؑ کو سلام کہا، یہ گویا اس بات کی علامت تھی کہ ہم آپؑ کیلیے سلامتی کا پیغام لائے ہیں، ہم آپؑ کے دشمن نہیں۔ آپؑ اگرچہ انھیں پہچان نہیں سکے کیونکہ ان کی شکلیں بالکل اجنبی لوگوں کی تھیں۔ لیکن یہ سمجھ کر کہ وہ شریف مہمان ہیں جلدی سے ان کیلیے کھانے کا انتظام کیا۔ جب کھانا ان کے سامنے چنا گیا تو انھوں نے ہاتھ بڑھانے سے گریز کیا۔ اس سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو تشویش پیدا ہوئی کیونکہ اس زمانے میں اگر کوئی مہمان میزبان کی ضیافت قبول نہیں کرتا تھا تو اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ وہ مہمان نہیں بلکہ دشمن ہے اور وہ کسی انتقام کیلیے آیا ہے۔ اس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مہمان سے کہا کہ ہم آپ کی اجنبیت اور آپ کے گریز سے آپ کی طرف سے اندیشوں میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ آنے والوں نے کہا کہ آپؑ ہماری طرف سے پریشان نہ ہوں، ہم تو آپؑ کیلیے خوشخبری لے کر آئے ہیں اور وہ خوشخبری یہ ہے کہ آپؑ کو اللہ تعالیٰ اس بڑھاپے میں ایک نہایت سمجھدار اور ذی علم بچہ عطا فرمائے گا۔ غلام کے ساتھ علیم کی صفت سے اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ اللہ تعالیٰ جو بیٹا آپؑ کو عطا فرما رہا ہے وہ صرف فرزند ہی نہیں ہوگا بلکہ وہ علمِ نبوت سے بھی سرفراز ہوگا۔ اس بات نے اس خوشخبری کی قدر و قیمت میں نجانے کتنا اضافہ کر دیا۔ بیٹا بھی اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے لیکن یہ تو ساری دنیا کو ملتے ہیں لیکن بیٹے کا پیغمبر ہونا ایک ایسی نعمت ہے جس سے کوئی کوئی سرفراز ہوتا رہا ہے۔

قَالَ اَبَشَّرْتُمُوْنِيْ عَلٰٓى اَنْ مَّسَّنِيَ الْكِبَرُ فَبِمَ تُبَشِّرُوْنَ ﴿۵۴﴾ (سورة الحجر : ۵۴)

(آپ نے کہا کہ کیا تم مجھے اس وقت خوشخبری دے رہے ہو جبکہ بڑھاپا مجھے لاحق ہو چکا ہے۔ تو کس بل پر بشارت دے رہے ہو۔ ۵۴)

حضرت ابراہیمؑ کا حُسنِ طلب

بیٹے کی خوشخبری سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نہایت مسرور ہوئے لیکن ساتھ ہی متعجب بھی، کہ کیا اس عمر میں مجھے اس نعمت سے نوازا جائے گا جبکہ میں بڈھا کھوسٹ ہو چکا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہو چکی ہیں۔ بظاہر اسباب تو اس بات کا کوئی امکان دکھائی نہیں دیتا۔ لیکن آپ کہتے ہیں تو یقیناً صحیح ہوگا لیکن یہ آپ کس بل پر کہہ رہے ہیں؟ ایک طرف خوشی اور دوسری طرف تعجب جس میں انکار کی کوئی گنجائش نہیں۔ البتہ اس بات کی طلب ضرور ہے کہ اس خبر کو پھر دہرایا جائے تاکہ تعجب دور ہو۔

Marfat.com

قَالُوْا بَشَّرْنٰكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقٰنِطِيْنَ ﴿٥٥﴾ (سورة الحجر : ۵۵)

(انھوں نے کہا ہم نے آپ کوایک امرِ واقعی کی بشارت دی ہے تو آپ ناامید ہونے والوں میں سے نہ ہوں۔ ۵۵)

فرشتوں کی یقین دہانی

فرشتوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اظہارِ تعجب کو بھی مایوسی پر محمول کیا۔ اس لیے کہ فرشتوں کے یہاں یقین اور اطاعت کے سوا اور کسی جذبے کا گزر نہیں ہوتا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے نبی وہ کامل ہوتے ہوئے بھی اسباب کی دنیا سے یکسر لاتعلق نہیں ہوسکتے۔ شاہ عبدالقادر صاحبؒ نے ٹھیک فرمایا کہ کاملین بھی اسباب کی کسی نہ کسی حد تک پرواہ کرتے ہیں تو فرشتوں نے کہا کہ ہم نے آپؑ کو جس بات کی خبر دی ہے وہ امرِ واقعی ہے۔ مستقبل میں اس کا ظہور ہو کے رہے گا۔ اس کے وقوع پذیر ہونے میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس لیے آپؑ کو اس کے بارے میں مایوسی کا اظہار نہیں کرنا چاہیے۔

قَالَ وَمَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖٓ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ ﴿٥٦﴾ (سورة الحجر : ۵۶)

(حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا: کہ اپنے رب کی رحمت سے گمراہوں کے سوا اور کون ناامید ہوسکتا ہے؟ ۵۶)

حضرت ابراہیمؑ کا اظہارِ حقیقت

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرشتوں کے خیال کو رد کرتے ہوئے فرمایا کہ آپ کا یہ سمجھنا کہ میں اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہوں، یہ بالکل غلط ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس تو صرف گمراہ لوگ ہوتے ہیں اور میں بفضلہٖ تعالیٰ اللہ تعالیٰ کا رسولؑ ہوں، گمراہ کیسے ہوسکتا ہوں۔ البتہ ازراہِ تعجب کسی بات کا اظہار یا کوئی سوال یہ انسانی صفات کا تقاضا ہے۔

قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ ﴿٥٧﴾ (سورة الحجر : ۵۷)

(حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا اے فرستادگانِ الٰہی! تمھاری مہم کیا ہے؟ ۵۷)

حضرت ابراہیمؑ کا اندیشہ

حضرت ابراہیم علیہ السلام بیٹے کی خوشخبری سن کر اپنے تئیں مطمئن بھی ہوئے اور مسرور بھی۔ لیکن ایک بات مسلسل ان کے دل میں کھٹک رہی تھی کہ اگر آپ صرف بیٹے کی خوشخبری کیلیے آئے ہیں تو اس کیلیے انسانی شکلوں میں باجماعت آنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے علاوہ بھی ان کے سامنے کوئی مہم ہے۔

قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ﴿٥٨﴾ اِلَّآ اٰلَ لُوْطٍ ؕ اِنَّا لَمُنَجُّوْهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿٥٩﴾ اِلَّا امْرَاَتَهٗ قَدَّرْنَآ ۙ اِنَّهَا لَمِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿٦٠﴾ (سورة الحجر : ۵۸۔۵۹۔۶۰)

(فرشتوں نے کہا: ہم ایک مجرم قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں۔ ۵۸) مگر لوط کے گھر والے ہم ان سب کو بچالیں گے۔ ۵۹) بجز اس کی بیوی کے، ہم نے اس کو تاک رکھا ہے، وہ بیشک پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہوگی۔ ۶۰)

Marfat.com

فرشتوں کا جواب

فرشتوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سوال کے جواب میں کہا کہ ہم مجرموں کی ایک قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں۔ یہ نہایت مختصر سا جواب ہے۔ اس سے معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کس قوم کا ارادہ رکھتے ہیں۔ لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام چونکہ قوم لوط سے واقف تھے اور اس وقت کی دنیا کے مذہبی حالات سے بے خبر نہیں تھے۔ اس لیے وہ خوب جانتے تھے کہ اس مجرم قوم سے مراد قوم لوط ہے جس نے جرائم کی انتہا کر رکھی ہے اور جس میں اب اصلاح کی کوئی امید باقی نہیں رہی۔ اس لیے صرف مجرمین کے لفظ سے آپؑ اس جواب کو پوری طرح سمجھ گئے۔ البتہ انھیں اس بات کی فکر ہوئی کہ وہاں تو حضرت لوطؑ اور ان کے بچے بھی ہیں۔ ممکن ہے کچھ لوگ ان پر ایمان بھی لائے ہوں، وہ بھی آل میں شامل ہوں۔ اس لیے فرشتوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پریشانی کو بھانپتے ہوئے فوراً کہا کہ آپ فکر نہ کیجیے، آلِ لوط کی ہمیں بھی فکر ہے، لیکن آپ اطمینان رکھیے ہم ان سب کو بچالیں گے۔ البتہ آلِ لوط میں چونکہ حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی بھی شامل ہے اور وہ آپؑ پر ایمان نہیں لائی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہم اس کے بارے میں پہلے ہی فیصلہ کر چکے ہیں کہ اسے باقی مجرم قوم کے ساتھ آلِ لوط سے الگ اسی بستی میں رہنا ہے اور جو عذاب قوم لوط پر آرہا ہے اسے بھی اسی عذاب کا شکار ہونا ہے۔

ایک دفعہ پھر فرشتوں کے جواب پر نظر ڈالیے اور ان کے الفاظ پر غور کیجیے تو آپ محسوس کریں گے کہ ان کے لہجے کے تیور بہت تیکھے ہیں۔ وہ ان کے جرائم کی وجہ سے سخت غصے میں ہیں۔ اس لیے بجائے ان کا نام لینے کے صرف مجرم قوم کہہ کر بات کو ختم کر دیتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں کے نزدیک ان کا حسب و نسب اس کے سوا کوئی اور باقی نہیں رہ گیا اور ان کی شناخت اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ مجرم قوم ہیں۔ اب ان کو اس دھرتی پر باقی نہیں رہنا چاہیے۔

ان الفاظ پر غور کرنے سے دوسری بات جو محسوس ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کو سنبھلنے کیلیے مہلت پہ مہلت دیتا ہے۔ لیکن جب مہلت کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے تو پھر انھیں سنبھلنے کا موقع نہیں دیا جاتا۔ پھر اللہ تعالیٰ کا قانون حرکت میں آتا ہے تو وہ کسی کو معاف نہیں کرتا۔ وہ اس طرح بے لاگ ہوتا ہے کہ نہ اس سے پیغمبرؑ کا بیٹا بچتا ہے اور نہ پیغمبرؑ کی بیوی چھوڑی جاتی ہے۔

فَلَمَّا جَآءَ اٰلَ لُوْطِ ٮِۨالْمُرْسَلُوْنَ ﴿۶۱﴾ قَالَ
اِنَّكُمْ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ﴿۶۲﴾ قَالُوْا بَلْ جِئْنٰكَ بِمَا كَانُوْا فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ ﴿۶۳﴾
وَاَتَيْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۶۴﴾ فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ
الَّيْلِ وَاتَّبِعْ اَدْبَارَهُمْ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ وَّامْضُوْا حَيْثُ
تُؤْمَرُوْنَ ﴿۶۵﴾ وَقَضَيْنَآ اِلَيْهِ ذٰلِكَ الْاَمْرَ اَنَّ دَابِرَ هٰٓؤُلَآءِ مَقْطُوْعٌ
مُّصْبِحِيْنَ ﴿۶۶﴾ وَجَآءَ اَهْلُ الْمَدِيْنَةِ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿۶۷﴾ قَالَ اِنَّ
هٰٓؤُلَآءِ ضَيْفِيْ فَلَا تَفْضَحُوْنِ ﴿۶۸﴾ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ ﴿۶۹﴾

Marfat.com

قَالُوْٓا اَوَلَمْ نَنْهَكَ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٧٠﴾ قَالَ هٰٓؤُلَآءِ بَنٰتِيْٓ اِنْ
كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ﴿٧١﴾ لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِيْ سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿٧٢﴾ فَاَخَذَتْهُمُ
الصَّيْحَةُ مُشْرِقِيْنَ ﴿٧٣﴾ فَجَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ
حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ﴿٧٤﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِيْنَ ﴿٧٥﴾
وَاِنَّهَا لَبِسَبِيْلٍ مُّقِيْمٍ ﴿٧٦﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٧٧﴾
وَاِنْ كَانَ اَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ لَظٰلِمِيْنَ ﴿٧٨﴾ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ وَ
اِنَّهُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِيْنٍ ﴿٧٩﴾

رکوع: ۵۔ (جب فرستادے آلِ لوط کے پاس پہنچے۔ ۶۱) تو حضرت لوط نے کہا آپ لوگ تو اجنبی معلوم ہوتے ہیں۔ ۶۲) فرشتوں نے کہا ہم آپ کے پاس وہی چیز لے کر آئے ہیں جس میں وہ شک کیا کرتے تھے۔ ۶۳) ہم آپ کے پاس حق لے کر آئے ہیں، اور ہم بلاشبہ سچ کہہ رہے ہیں۔ ۶۴) تو چلے جایئے اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ رات کے کسی حصے میں، اور خود ان کے پیچھے پیچھے چلیے اور کوئی تم میں سے پیچھے مڑ کر نہ دیکھے۔ اور چلے جایئے جہاں جانے کا تمہیں حکم دیا گیا ہے۔ ۶۵) اور ہم نے اپنے اس فیصلے سے حضرت لوط کو آگاہ کر دیا ہے کہ صبح ہوتے ہی ان لوگوں کی جڑ کاٹ دی جائے گی۔ ۶۶) اور اتنے میں شہر کے لوگ خوشیاں مناتے ہوئے آ گئے۔ ۶۷) آپ نے کہا کہ یہ لوگ میرے مہمان ہیں، تم لوگ مجھے رسوا نہ کرو۔ ۶۸) اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور مجھے ذلیل نہ کرو۔ ۶۹) وہ کہنے لگے کیا ہم نے تمہیں دوسروں کے معاملات میں دخل دینے سے روکا نہ تھا۔ ۷۰) حضرت لوط نے کہا کہ اگر تم کچھ کرنے ہی پر تلے ہوئے ہو تو یہ میری بیٹیاں ہیں۔ ۷۱) آپ کی جان کی قسم! یہ لوگ اپنی سرمستی میں اندھے ہوئے ہیں۔ ۷۲) پس آ لیا ان کو ایک سخت کڑک نے جب سورج نکل رہا تھا۔ ۷۳) پس ہم نے ان کی بستی کو زیروزبر کر دیا اور ہم نے ان پر برسائے کھنگر کے پتھر۔ ۷۴) بیشک اس سرگزشت میں بصیرت حاصل کرنے والوں کیلیے بڑی نشانیاں ہیں۔ ۷۵) اور یہ بستی ایک شاہراہِ عام پر ہے ۷۶) بیشک اس سرگزشت کے اندر اہلِ ایمان کیلیے بڑی نشانی ہے۔ ۷۷) بیشک ایکہ کے باشندے بھی اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے تھے۔ ۷۸) تو ہم نے ان سے بھی انتقام لیا اور یہ دونوں بستیاں کھلی شاہراہ پر واقع ہیں۔ ۷۹)

فَلَمَّا جَآءَ اٰلَ لُوْطِ ِۨ الْمُرْسَلُوْنَ ﴿٦١﴾ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ﴿٦٢﴾ قَالُوْا بَلْ جِئْنٰكَ بِمَا كَانُوْا فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ ﴿٦٣﴾
وَاَتَيْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿٦٤﴾ (سورة الحجر : ٦١.٦٢.٦٣.٦٤)

Marfat.com

(جب فرستادے آلِ لوط کے پاس پہنچے۔ ۶۱) تو حضرت لوطؑ نے کہا آپ لوگ تو اجنبی معلوم ہوتے ہیں۔ ۶۲) فرشتوں نے کہا ہم آپؑ کے پاس وہی چیز لے کر آئے ہیں جس میں وہ شک کیا کرتے تھے۔ ۶۳) ہم آپؑ کے پاس حق لے کر آئے ہیں، اور ہم بلاشبہ سچ کہہ رہے ہیں۔ ۶۴)

حضرت لوطؑ اور فرشتے

جب یہ فرشتے قوم لوط کی بستی میں حضرت لوط علیہ السلام کے گھر پر پہنچے اور حضرت لوط علیہ السلام سے ملاقات ہوئی تو حضرت لوطؑ انھیں پہچان نہیں سکے۔ البتہ انھیں دیکھ کر کہا کہ تم تو اجنبی لوگ معلوم ہوتے ہو کیونکہ تمھارا کوئی تعلق ان بستیوں سے معلوم نہیں ہوتا۔ فرشتوں نے کہا کہ آپؑ کو غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے، ہم درحقیقت انسان نہیں، فرشتے ہیں۔ اور ہم اس قوم پر وہ چیز لے کے آئے ہیں جس سے انھیں ہمیشہ انکار رہا۔ یعنی ہم ان کے پاس اللہ تعالیٰ کا عذاب لے کر آئے ہیں۔ آپؑ انھیں عذاب سے ڈراتے رہے ہیں اور انھوں نے ہمیشہ آپؑ کا تمسخر اڑایا اور اب کسی کو اس میں شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ ہم وہی حق یعنی عذاب لے کے آئے ہیں۔ اور ہم اس لحاظ سے بالکل سچے ہیں۔ اب آپؑ کو ہماری ان ہدایات پر عمل کرنا چاہیے جو اس عذاب سے بچنے کیلیے ضروری ہیں۔

فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ وَاتَّبِعْ اَدْبَارَهُمْ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ وَّامْضُوْا حَيْثُ تُؤْمَرُوْنَ ﴿۶۵﴾ وَقَضَيْنَآ اِلَيْهِ ذٰلِكَ الْاَمْرَ اَنَّ دَابِرَ هٰٓؤُلَآءِ مَقْطُوْعٌ مُّصْبِحِيْنَ ﴿۶۶﴾ (سورة الحجر : ۶۵۔۶۶)

(تو چلے جایئے اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ رات کے کسی حصے میں، اور خود ان کے پیچھے پیچھے چلیے اور کوئی تم میں سے پیچھے مڑ کر نہ دیکھے۔ اور چلے جایئے جہاں جانے کا تمہیں حکم دیا گیا ہے۔ ۶۵) اور ہم نے اپنے اس فیصلے سے حضرت لوطؑ کو آگاہ کر دیا ہے کہ صبح ہوتے ہی ان لوگوں کی جڑ کاٹ دی جائے گی۔ ۶۶)

حضرت لوطؑ کو ہدایات

عذاب کے آنے سے پہلے فرشتوں نے حضرت لوط علیہ السلام کو کچھ احتیاطی تدابیر بتائیں تاکہ آپؑ، آپؑ کی آل عذاب کے اثرات سے محفوظ رہیں۔ ہم اسی ترتیب سے اسے ذکر کرتے ہیں۔

1- رات کے کسی حصے میں اپنے اہل بیت کو لے کر نکل جایئے اور وہاں چلے جایئے جہاں جانے کا آپؑ کو حکم دیا گیا ہے۔

2- آپؑ اپنے اہل وعیال کے پیچھے پیچھے جایئے، جس طرح راعی اپنے گلے کے پیچھے پیچھے چلتا ہے تاکہ کوئی بھیڑ ریوڑ سے الگ رہ کر بھیڑیے کا شکار نہ ہو جائے۔

3- بستی سے نکلنے کے بعد کوئی شخص پیچھے پلٹ کر نہ دیکھے۔ تورات میں ہے کہ یہ ہدایت اس لیے دی گئی تھی کہ تم میں سے اگر کوئی پیچھے پلٹ کر دیکھے گا تو وہ پتھر کا ہو جائے گا۔ لیکن قرآنِ کریم نے ایسی کسی بات کا تذکرہ نہیں فرمایا اور نہ یہ بات اسلامی مزاج کے مطابق معلوم ہوتی ہے۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ یہ ہدایت اس لیے کی گئی تھی تاکہ اس بستی سے نکلنے والے محض ہجرت الی اللہ تعالیٰ کیلیے نکلیں، پیچھے پلٹ کر دیکھنے کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں جانے والے ابھی تک اپنا دل و دماغ اس بستی میں رکھتے ہیں جو بستی چند ساعتوں کے بعد اللہ تعالیٰ کے عذاب کا شکار ہونے والی ہے۔ مومن کے ایمان کا تو تقاضا یہ ہے کہ جب بھی اسے اللہ تعالیٰ کا حکم مل جاتا ہے تو وہ اس کی تعمیل میں دامن جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔

اگلی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام کو وحیِ الٰہی کے ذریعے بھی بتا دیا گیا تھا کہ صبح ہونے تک اس بستی پر خدا کا عذاب آ جائے گا اور یہ لوگ جو خود سری میں اپنی مثال آپ ہیں ایک ایسے عبرتناک انجام کو پہنچیں گے کہ لوگ ہمیشہ ان کے تذکرے سے عبرت پکڑیں گے۔

Marfat.com

وَجَآءَ اَھْلُ الْمَدِیْنَۃِ یَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿۶۷﴾ (سورۃ الحجر : ۶۷)

(اور اتنے میں شہر کے لوگ خوشیاں مناتے ہوئے آ گئے۔ ۶۷)

اس سے پہلی کی آیتوں میں بتایا گیا ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے بتا دیا گیا کہ اب اس قوم کی جڑ کاٹ دی جائے گی۔ اور فرشتوں نے بھی حضرت لوط علیہ السلام کو اپنے اہل وعیال کو لے کر شہر سے نکلنے کی ہدایت کی۔ اور یہ بھی کہا کہ رات کے ایک حصے میں خاموشی سے نکل جایئے کیونکہ اس قوم کی زندگی کی جڑ صبح تک کاٹ کر رکھ دی جائے گی۔ اور یہ لوگ اپنے ہولناک انجام کو جا پہنچیں گے۔

حضرت لوط ؑ کے گھر پر غنڈوں کا حملہ

قرآنِ کریم کا پڑھنے والا یہاں پہنچ کر حیران سا ہو کر رہ جاتا ہے کہ آخر اس قوم نے ایسا کون سا بڑا جرم کیا تھا کہ جس کی وجہ سے ان کو اتنی بڑی سزا دینے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ قرآنِ کریم میں یہ واقعات اگرچہ ایک ترتیب کے ساتھ نہیں آئے لیکن یہ بات واضح ہے کہ قرآن جس طرح بھی واقعات کو بیان کرتا ہے اس میں ایک مقصدی ترتیب ضرور ہوتی ہے اور عبرت ونصیحت کے کسی موقع کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ چنانچہ یہاں بھی عذاب کے ذکر کرنے کے بعد قوم کی حالت کا کسی حد تک ذکر فرمایا تاکہ اندازہ ہو سکے کہ وہ قوم اس ہولناک انجام تک کیوں پہنچی۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ آپ اس قوم کے اخلاقی زوال کا اندازہ کریں کہ انھیں جیسے ہی خبر ہوئی کہ حضرت لوط علیہ السلام کے گھر میں دو اجنبی مہمان آئے ہیں، وہ خوشیاں مناتے اور گناہ کے تصور میں ڈوبے ہوئے حضرت لوط ؑ کے گھر پہنچ گئے کہ آج ایک خوبصورت شکار ہاتھ آیا ہے، آج جی بھر کر دادِ عیش دیں گے۔ انھیں اس سے کوئی غرض نہ تھی کہ مہمان میزبان کی عزت ہوتا ہے اور میزبان اپنی عزت پر حرف نہیں آنے دیتا۔ معزز میزبان جان پر کھیل کر بھی اپنے مہمان کی عزت وحرمت کی حفاظت کرتا ہے۔ لیکن ان کی قوم تمام اخلاقی اقدار کو پامال کر چکی تھی۔ عزت وحرمت ان کے نزدیک محض ایک فلسفہ تھا جسے کسی وقت بھی پاؤں تلے روندا جا سکتا تھا۔ انھیں تو صرف اپنے سفلی جذبات کی تسکین کا سامان عزیز تھا۔ چنانچہ جیسے ہی انھوں نے سنا کہ ایسے دو مہمان آئے ہیں جو ہمارے سفلی جذبات کی تسکین کیلئے کافی ہیں تو وہ جھپٹتے ہوئے حضرت لوط ؑ کے گھر پہنچ گئے۔

قَالَ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ ضَیْفِیْ فَلَا تَفْضَحُوْنِ ﴿۶۸﴾ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ ﴿۶۹﴾ (سورۃ الحجر : ۶۸۔۶۹)

(آپ ؑ نے کہا کہ یہ لوگ میرے مہمان ہیں، تم لوگ مجھے رسوا نہ کرو۔ ۶۸) اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور مجھے ذلیل نہ کرو۔ ۶۹)

بدمعاشوں کو سمجھانے کی انتہائی کوشش

حضرت لوط علیہ السلام نے جب دیکھا کہ یہ بدمعاش لوگ اپنے ناپاک ارادے لے کر میرے گھر پہنچ گئے ہیں اور اپنے ناپاک ارادے میرے مہمانوں کے ساتھ پورا کرنا چاہتے ہیں تو آپ ؑ نے ہر ممکن طریقے سے انھیں روکنا چاہا اور سب سے پہلے وہ حوالہ دیا جو ہر قوم میں ہمیشہ قابلِ وقعت رہا ہے۔ عرب بھی اپنے مہمان کی عزت کی خاطر بڑے سے بڑے خطرے کو انگیخت کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے کہ یہ لوگ میرے مہمان ہیں اور مہمان کی عزت میزبان کی عزت ہوتی ہے اور تم اچھی طرح مہمان کی عزت کی قدر وقیمت کو جانتے ہو۔ اس کے باوجود اگر تم نے میرے مہمانوں کی عزت پامال کر دی تو ذرا سوچو کہ میں اپنے مہمانوں کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ اور اگر تمہیں مہمانوں کی عزت کا خیال نہیں تو پھر اللہ تعالیٰ سے ڈرو کیونکہ اللہ تعالیٰ بھی نہ تو کسی مہمان کی عزت سے کھیلنے کی اجازت دیتا ہے اور نہ اس فعلِ بد کی اجازت دیتا ہے جس ارادے سے تم میرے گھر پہنچے ہو۔ اور اگر میرے گھر میں یہ کھیل، کھیلا گیا تو میں دنیا میں معلمِ اخلاق بن کے آیا ہوں، بتاؤ اہلِ دنیا کی نگاہ میں میری کیا وقعت رہے گی۔ میں تو ان کے سامنے ذلیل ہو کر رہ جاؤں گا۔ وہ بجائے اس کے کہ اپنی اس حرکت پر نادم ہوتے اور حضرت لوط ؑ کی دردمندانہ اپیل کو درخورِ اعتنا سمجھتے، وہ الٹا آپ پر معترض ہوئے۔

Marfat.com

قَالُوْٓا اَوَلَمْ نَنْهَكَ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۷۰﴾ (سورة الحجر : ۷۰)

(وہ کہنے لگے کیا ہم نے تمھیں دوسروں کے معاملات میں دخل دینے سے روکا نہ تھا۔ ۷۰)

عذرِ گناہ بدتر از گناہ

اس آیت کے دو مطلب لیے جاتے ہیں ایک تو یہ کہ ہم نے تمھیں کیا اس بات سے منع نہیں کیا تھا کہ تمھارے پاس ایسے مہمان نہیں آنے چاہئیں اور اگر آئیں گے اور وہ ہمارے لیے مفید مطلب ہوں گے تو ہم اپنی مطلب براری کیلیے ان سے ضرور تعرض کریں گے کیونکہ جس طرح پھول سے ہمیشہ خوشبو سونگھی جاتی ہے اور پانی سے ہمیشہ پیاس بجھائی جاتی ہے، اسی طرح حسین لوگوں سے جنسی جذبات کی تسکین کی جاتی ہے۔ انھیں قدرت نے اسی کام کیلیے پیدا کیا ہے، تم ہمیں اس سے روکنے والے کون ہوتے ہو۔ یہ عزت وذلت کی باتیں سب جذباتی اور مصنوعی باتیں ہیں۔

دوسرا مطلب اس کا یہ ہوسکتا ہے کہ ہم نے تمھیں باہر کے لوگوں سے ساز باز رکھنے سے منع کیا تھا، لیکن اب ہم دیکھ رہے ہیں کہ باہر کے لوگ برابر تمھارے پاس آ جا رہے ہیں اور تم ان سے راہ ورسم رکھتے ہو۔ نجانے تمھارے عزائم کیا ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ تمھاری یہ روش ہمارے لیے خطرہ بن سکتی ہے۔ جنھیں تم اپنا مہمان کہتے ہو، یہ اجنبی لوگ ہمارے لیے کوئی مسئلہ بن سکتے ہیں۔ اس لیے ہم ان سے ضرور تعرض کریں گے۔ حیرانی کی بات ہے کہ ان بدمعاشوں نے اپنی بدمعاشی کیلیے ایک ایسا عذر تلاش کر لیا جس کی کوئی بنیاد نہ تھی۔ حضرت لوط علیہ السلام نے جب دیکھا کہ ان پر کوئی نصیحت اثر نہیں کر رہی اور جن رشتوں کی قدر وقیمت ہمیشہ قوموں میں مُسلّم رہی ہے یہ اسے بھی تباہ کر چکے ہیں۔ تو آپؑ نے اپنے فرض کی ادائیگی کیلیے آخری بات کہی جو ایک پیغمبر ہی کہہ سکتا ہے۔ ارشاد فرمایا کہ اگر تم اپنے جنسی جذبات کے ہاتھوں ایسے ہی مغلوب ہوگئے ہو تو جنسی جذبات کی تسکین کیلیے اللہ تعالیٰ نے عورتیں پیدا کی ہیں، مرد تو ان کاموں کیلیے پیدا نہیں کیے گئے۔ تمھاری فطرت چونکہ اندھی ہو چکی ہے اس لیے تم خلافِ فطرت افعال پر تل گئے ہو۔ تمھارے گھروں میں تمھاری بیویاں اس ضرورت کیلیے موجود ہیں۔ لیکن تمھاری بگڑی ہوئی فطرت تمھیں بیویوں سے تسکین دینے کیلیے کافی ثابت نہیں ہو رہی اور تم ایک ایسا راستہ تلاش کر چکے ہو جس سے بڑھ کر اخلاقی تباہی کا کوئی راستہ نہیں ہوسکتا۔ میں تمھیں آخری حد تک روکنے کی کوشش کر رہا ہوں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ اس کا انجام اچھا نہیں ہوگا۔

قَالَ هٰٓؤُلَآءِ بَنٰتِيْٓ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ﴿۷۱﴾ؕ (سورة الحجر : ۷۱)

(حضرت لوط نے کہا کہ اگر تم کچھ کرنے ہی پر تلے ہوئے ہو تو یہ میری بیٹیاں ہیں۔ ۷۱)

نازک جذبات کے حوالے سے سمجھانے کی کوشش

ان کی اخلاقی حس کو بیدار کرنے کیلیے حضرت لوط علیہ السلام نے ایک ایسی بات کہی جو وہی شخص کہہ سکتا ہے جس کا دل بری طرح ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا ہو جو ایک طرف مہمانوں کی حرمت کو بچانے کی فکر میں ہو اور دوسری طرف اپنی قوم کے اخلاقی زوال کے انجام کو دیکھ رہا ہو۔ ان کے اس ارشاد کا مطلب یہ نہیں تھا کہ تم اگر اپنے سفلی جذبات کے ہاتھوں ایسے ہی بے قابو ہوئے جاتے ہو تو میری بیٹیوں سے یہ آگ بجھالو، بلکہ ان کا مطلب یہ تھا کہ جو کچھ تم کرنا چاہتے ہو وہ اس قدر برا ہے کہ ایک غیرت مند باپ اپنی بیٹیاں پیش کر کے بھی اگر اسے روک سکے تو اسے ایسا کر گزرنا چاہیے۔ یہ ان کی اخلاقی حِس کو بیدار کرنے کیلیے ایک آخری کوشش تھی۔ لیکن انھوں نے صاف کہا کہ لوط تم جانتے ہو کہ ہم کیا چاہتے ہیں۔ ہمیں تمھاری بیٹیوں سے کوئی غرض نہیں کیونکہ ہماری دلچسپیاں لڑکوں سے ہیں، لڑکیوں سے نہیں۔

آج سے نصف صدی پیشتر کا انسان جب اس واقعہ کو پڑھتا ہوگا تو اس کیلیے قوم لوط کی انتہائی گری ہوئی اخلاقی حالت کو دیکھ کر صرف دکھ ہی نہیں ہوتا ہوگا بلکہ حیرت بھی ہوتی ہوگی کہ کیا کوئی قوم اس حد تک بھی گر سکتی ہے، لیکن آج مغرب کی روشن خیالی نے دنیا کو جو دن دکھائے ہیں ان میں

Marfat.com

پوری روشنی میں جابجا "گے سٹائل آف لائف" (Gay style of life) نظر آ رہا ہے۔ ان کے قانونی ادارے اس کو قانونی تحفظ دے چکے ہیں، ان کا لٹریچر اسے اپنے دامن میں جگہ دے چکا ہے۔ ان کی عائلی زندگی میں اسے ایک پیوند کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔ ان کے بڑے بڑے معزز اداروں کے سربراہ تک اس ذلیل ترین عادت کا شکار ہو چکے ہیں۔ اور وہاں اسے کوئی ذلت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔

قوم لوط اگر دو خوبصورت لڑکوں کو دیکھ کر بے لگام ہوگئی تو کیا ہمارے تفریحی اداروں میں ان کے تفریحی پروگراموں کے دوران حملوں کا ہونا اور تفریحی کردار ادا کرنے والی خواتین کو اٹھا کر لے جانے کی کوشش کرنا کہاں اچنبھے کی بات سمجھی جاتی ہے۔ آج انسان اپنے اخلاقی بگاڑ میں مہذب قوموں کو بھی پیچھے چھوڑ چکا ہے لیکن افسوس کہ ان سے روکنے والا کوئی لوط موجود نہیں۔ اور حضرت لوط جس اخلاقی قوت کے نمائندہ تھے وہ روز بروز کمزور پڑتی جارہی ہے۔ مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے قیامت تک یہ ذمہ داری سونپی تھی لیکن عالمِ اسلام کے بیشتر حکمران اور ہمارا اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ رفتہ رفتہ اس دلدل میں ڈوبتا جارہا ہے۔

لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِىْ سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿٧٢﴾ (سورۃ الحجر : ۷۲)

(آپ کی جان کی قسم! یہ لوگ اپنی سرمستی میں اندھے ہوئے ہیں۔ ۷۲)

گناہ کا نشہ ہر چیز پر غالب آجاتا ہے

حضرت لوط علیہ السلام کی کسی دلیل نے ان بدبختوں پر اثر نہیں کیا۔ آپؑ نے اپنا خونِ جگر نچوڑ ڈالا لیکن ان کی بدبختی میں شگاف نہ پڑ سکا۔ پروردگار ان کی اس کیفیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آنحضرت ﷺ سے فرماتے ہیں کہ اے پیغمبر! آپ کی عمر کی قسم، وہ لوگ ایک سرمستی کے نشے میں اندھے ہو چکے تھے۔ ان پر جنسی خواہشات اور سفلی جذبات اس حد تک غالب آچکے تھے کہ کوئی نصیحت کی بات ان پر اثر انداز نہیں ہوتی تھی۔ جس طرح شراب میں مخمور شخص ایک سے ایک بڑھ کر مضبوط دلیل پر ہنستا اور اس کا مذاق اڑاتا ہے، اس لیے کہ اس کا نشہ اس کی عقل پر غالب آچکا ہے۔ جنسی ہیجان اور بداخلاقی کا سرطان بھی ایسے ہی نشے ہیں جو قوموں کو اصابتِ فکر اور آخرت کے خیال سے بے نیاز کر دیتے ہیں۔ اسے سمجھنے کیلیے دور جانے کی ضرورت نہیں۔ ہمارا اپنا گرد و پیش اور ہماری اپنی قوم کے حکمران اور دانشور جس صورتحال سے دوچار ہیں وہ اس کی وضاحت کیلیے کافی ہیں۔ ہم کئی سالوں سے بسنت کے سرطان کا شکار ہو چکے ہیں۔ ہم تہذیبی اور سیاسی طور پر اسے نہ صرف قبول کر چکے بلکہ اس کے زیادہ سے زیادہ اظہار کرنے پر مجبور ہیں۔ اس کے نتیجے میں گلیوں میں خون بہتا ہے، سڑکوں پر قتلِ عام ہوتا ہے، اندھی گولیاں نجانے کتنے خاندانوں کو ہمیشہ کی محرومیاں دے جاتی ہیں۔ چھتوں پر اسلامی غیرت ماتم کرتی ہے۔ اور غیرت کے فانوس جلتے بجھتے ہیں۔ ٹرانسفارمر اڑتے ہیں، کروڑوں کا نقصان ہوتا ہے۔ ہر سال یہ سب کچھ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور سمجھانے والے ہمیں سمجھاتے ہیں، رونے والوں کی آہیں ہمارے کانوں تک پہنچتی ہیں، احتجاج کرنے والوں کی چیخیں ہمیں دور دور تک سنائی دیتی ہیں، اس کے باوجود بسنت اور عیاشی کا ایک نشہ ہے جو ہمیں کوئی بات نہ سننے دیتا ہے اور نہ سمجھنے دیتا ہے۔ ایسے ہی نشے میں وہ بھی مبتلا تھے۔

یہاں ایک بات کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے وہ یہ کہ قومیں جب اخلاقی زوال کا شکار ہوتی ہیں تو ان کا زوال اور انحطاط ہمہ جہتی ہوتی ہے بالخصوص جنسی آوارگی جب جوع البقر کی صورت اختیار کر لیتی ہے تو پھر زندگی کا کوئی شعبہ بھی اس سے محفوظ نہیں رہتا۔ قوم لوط بھی اسی ہمہ جہتی انحطاط کا شکار تھی۔ تلمود میں اس قوم کے جو حالات لکھے گئے ہیں ان کا ایک خلاصہ ہم یہاں تفہیم القرآن سے نقل کرتے ہیں جس سے کچھ زیادہ تفصیل کے ساتھ معلوم ہوگا کہ یہ قوم اخلاقی فساد کی کس انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ اس میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ایک عیلامی مسافر ان کے علاقے سے گزر رہا تھا۔ راستہ میں شام ہوگئی اور اسے مجبوراً ان کے شہر سدوم میں ٹھہرنا پڑا۔ اس کے ساتھ اپنا زادِ راہ تھا۔ کسی سے اس نے میزبانی کی درخواست نہ کی۔ بس ایک درخت کے نیچے اتر گیا۔ مگر ایک سدومی اصرار کے ساتھ اٹھا کر اسے اپنے گھر لے گیا۔ رات اسے اپنے ہاں رکھا اور صبح ہونے سے پہلے اس کا گدھا، اس کے زین اور مال تجارت سمیت اڑا دیا۔ اس نے شور مچایا مگر کسی نے اس کی فریاد نہ سنی بلکہ بستی کے لوگوں نے اس کا رہا سہا مال بھی لوٹ کر اسے نکال باہر کیا۔

Marfat.com

ایک مرتبہ حضرت سارہ نے حضرت لوطؑ کے گھر والوں کی خیریت دریافت کرنے کیلیے اپنے غلام الیعزر کو سدوم بھیجا۔ الیعزر جب شہر میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ ایک سدومی ایک اجنبی کو مار رہا ہے۔ الیعزر نے اسے شرم دلائی کہ تم بیکس مسافروں سے یہ سلوک کرتے ہو مگر جواب میں سربازار الیعزر کا سر پھاڑ دیا گیا۔

ایک مرتبہ ایک غریب آدمی کہیں سے ان کے شہر میں آیا اور کسی نے اسے کھانے کو کچھ نہ دیا۔ وہ فاقے سے بدحال ہو کر ایک جگہ گر پڑا تھا کہ حضرت لوطؑ کی بیٹی نے اسے دیکھ لیا اور اس کیلیے کھانا پہنچایا۔ اس پر حضرت لوطؑ اور ان کی بیٹی کو سخت ملامت کی گئی اور انھیں دھمکیاں دی گئیں کہ ان حرکتوں کے ساتھ تم لوگ ہماری بستی میں نہیں رہ سکتے۔

اس طرح کے متعدد واقعات بیان کرنے کے بعد تلمود کا مصنف لکھتا ہے کہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں یہ لوگ سخت ظالم، دھوکہ باز اور بدمعاملہ تھے۔ کوئی مسافر ان کے علاقے سے بخیریت نہ گزر سکتا تھا۔ کوئی غریب ان کی بستیوں سے روٹی کا ایک ٹکڑا نہ پا سکتا تھا۔ بارہا ایسا ہوتا کہ باہر کا آدمی ان کے علاقے میں پہنچ کر فاقوں سے مرجاتا اور یہ اس کے کپڑے اتار کر اس کی لاش کو برہنہ دفن کر دیتے۔ بیرونی تاجر اگر شامت کے مارے وہاں چلے جاتے تو برسرعام لوٹ لیے جاتے اور ان کی فریاد کو ٹھٹھوں میں اڑا دیا جاتا۔ اپنی وادی کو انھوں نے ایک باغ بنا رکھا تھا جس کا سلسلہ میلوں تک پھیلا ہوا تھا۔ اس باغ میں وہ انتہائی بے حیائی کے ساتھ علانیہ بدکاریاں کرتے تھے اور ایک لوط کی زبان کے سوا کوئی زبان ان کو ٹوکنے والی نہ تھی۔ قرآن مجید میں اس پوری داستان کو سمیٹ کر صرف دو فقروں میں بیان کر دیا گیا ہے کہ وَمِنْ قَبْلُ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ (وہ پہلے سے برے برے کام کر رہے تھے) اور اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُوْنَ السَّبِيْلَ وَتَاْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ (تم مردوں سے خواہش نفس پوری کرتے ہو، مسافروں کی راہ مارتے ہو اور اپنی مجلسوں میں کھلم کھلا بدکاریاں کرتے ہو؟)

فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُشْرِقِيْنَ ﴿٧٣﴾ فَجَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ﴿٧٤﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِيْنَ ﴿٧٥﴾ وَاِنَّهَا لَبِسَبِيْلٍ مُّقِيْمٍ ﴿٧٦﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٧٧﴾

(پس آلیا ان کو ایک سخت کڑک نے جب سورج نکل رہا تھا۔ ۷۳) پس ہم نے ان کی بستی کو زیروزبر کر دیا اور ہم نے ان پر برسائے کھنگر کے پتھر۔ ۷۴) بیشک اس سرگزشت میں بصیرت حاصل کرنے والوں کیلیے بڑی نشانیاں ہیں۔ ۷۵) اور یہ بستی ایک شاہراہِ عام پر ہے ۷۶) بیشک اس سرگزشت کے اندر اہلِ ایمان کیلیے بڑی نشانی ہے۔ ۷۷)
(سورۃ الحجر: ۷۳۔۷۴۔۷۵۔۷۶۔۷۷)

نزولِ عذاب

قومِ لوطؑ نے جب ہر طرح کی نصیحت سے منہ پھیرا اور اخلاقی انحطاط کی انتہا کو پہنچ گئی تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب آیا۔ ایک سخت کڑک اور ڈانٹ کی آواز نے پوری بستی کو کھیل کھیل کر دیا۔ جگر پھٹ گئے اور اس کے بعد اس عذاب نے کیا کیا صورت اختیار کی، وہ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ لیکن اس کا انجام یہ ہوا کہ اس بستی کو تہ وبالا کر دیا گیا۔ یعنی اس دھرتی کو الٹ دیا گیا اور اللہ تعالیٰ نے اس پر پتھروں کی بارش فرمائی۔

تیسری آیت میں فرمایا کہ اس واقعہ میں ان لوگوں کیلیے بڑی نشانیاں ہیں جو بصیرت حاصل کرنا چاہتے ہیں اور کسی عبرت انگیز چیز سے عبرت حاصل کرنا ان کی روش ہے۔ لیکن جو لوگ تباہ شدہ بستیوں کے کھنڈرات پر تفریح کیلیے جاتے ہیں ان کیلیے تو یہ محض قصے ہیں اور یا وہ اس لیے جاتے ہیں تاکہ وہاں کلچر تلاش کریں۔ ایسے لوگ اپنی پہلی بصیرت بھی گم کر بیٹھتے ہیں وہ جیسے جیسے کلچر کی تلاش میں آگے بڑھتے ہیں ویسے ویسے ایمان کی روشنی سے محروم ہوتے جاتے ہیں۔

اس کے بعد فرمایا کہ اے قریش کے لوگو! اگر آج بھی تم اس قوم کی تاریخ سے عبرت حاصل کرنا چاہو تو ان کی اجڑی ہوئی بستیاں شاہراہِ عام پر ہیں جہاں سے تمہارے قافلہ ہائے تجارت گزرتے ہیں۔ اس کے ایک ایک ذرے میں نشانیاں پنہاں ہیں لیکن اس شخص کیلیے جو ایمان لانا چاہتا ہو۔

Marfat.com

وَاِنْ كَانَ اَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ لَظٰلِمِيْنَ ﴿۷۸﴾ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ ۘ وَاِنَّهُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِيْنٍ ﴿۷۹﴾

(بیشک ایکہ کے باشندے بھی اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے تھے۔ ۷۸) تو ہم نے ان سے بھی انتقام لیا اور یہ دونوں بستیاں کھلی شاہراہ پر واقع ہیں۔ ۷۹) (سورۃ الحجر: ۷۸۔۷۹)

قوم لوط کے بعد دوسری معذب قوموں کا اجمالی تذکرہ

قوم لوط کی تباہی کے تذکرے کے بعد بعض دوسری قوموں کا اجمالی تذکرہ اور ان کی تکذیب کے انجام کو بیان کیا جا رہا ہے اور اس طرح سے نبی کریم ﷺ کو تسلی دی جا رہی ہے کہ آپؐ کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے وہ کوئی نئی بات نہیں، ہر پیغمبرؑ کے ساتھ اس کی قوم نے ہمیشہ یہی کچھ کیا ہے لیکن انجام کار وہ قوم اللہ تعالیٰ کے عذاب کا شکار ہوئی۔

اصحاب الایکہ سے مراد اصحاب مدین ہیں۔ اس قوم کا نام بنی مدیان تھا۔ ان کے مرکزی شہر کو مدین کہتے تھے اور ان کے پورے علاقے کو بھی اسی نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے یہ لوگ اصحاب مدین کہلائے۔ حضرت شعیب علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے رسول بنا کر ان کی طرف بھیجا۔ انھیں اصحاب الایکہ اس لیے کہا گیا کیونکہ ایکہ کا معنی جھاڑی اور بَن کے ہوتے ہیں۔ مدین کے پاس ایک بہت بڑا بَن بھی تھا۔ اس وجہ سے یہ لوگ اس نام سے معروف ہو گئے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ تبوک کا قدیم نام تھا اور آج کل ایک پہاڑی نالے کا نام ہے جو جبل اللوز سے وادیٔ افل میں آ کر گرتا ہے۔ ان کا علاقہ قوم لوط کی بستیوں سے بہت دور نہیں اور قوم لوطؑ ہی کی طرح حجاز سے فلسطین و شام جاتے ہوئے شاہراہِ عام پر پڑتا تھا۔ عربوں کے تجارتی قافلے ان قوموں کے کھنڈرات سے برابر گزرتے رہتے تھے۔ اس لیے قریش کو توجہ دلائی جا رہی ہے کہ جس طرح قومِ لوطؑ اور قومِ شعیبؑ کی قوم اور ان کی بستیاں اس وجہ سے تباہ کر دی گئیں کہ انھوں نے اپنے نبیوںؑ کی دعوت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا اور بجائے اللہ تعالیٰ کے خوف سے ڈر کے دعوت قبول کرنے کے انھوں نے مطالبۂ عذاب کو ایک مذاق بنا لیا تھا۔ بالآخر اسی عذاب نے انھیں آ پکڑا۔ تو تم بھی اگر یہی رویہ جاری رکھو گے تو تمھارا انجام بھی ان معذّب قوموں سے مختلف نہیں ہو گا۔

آیتِ کریمہ میں اِمَامٍ مُّبِيْنٍ کا لفظ آیا ہے اس کا معنی بھی سَبِيْلٍ مُّقِيْمٍ کی طرح کھلی شاہراہ، عام گزرگاہ اور چلتا راستہ ہے۔ راستہ چونکہ رہنما ہوتا ہے اس وجہ سے اس کیلیے امام کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

وَلَقَدْ كَذَّبَ اَصْحٰبُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۸۰﴾
وَاٰتَيْنٰهُمْ اٰيٰتِنَا فَكَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ ﴿۸۱﴾ وَكَانُوْا يَنْحِتُوْنَ
مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا اٰمِنِيْنَ ﴿۸۲﴾ فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُصْبِحِيْنَ ﴿۸۳﴾
فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۸۴﴾ وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ ۗ وَاِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ فَاصْفَحِ
الصَّفْحَ الْجَمِيْلَ ﴿۸۵﴾ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ ﴿۸۶﴾ وَلَقَدْ

Marfat.com

اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَ الْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ ﴿۸۷﴾ لَا تَمُدَّنَّ
عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ
وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۸﴾ وَقُلْ اِنِّيْٓ اَنَا النَّذِيْرُ
الْمُبِيْنُ ﴿۸۹﴾ كَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِمِيْنَ ﴿۹۰﴾ الَّذِيْنَ جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ
عِضِيْنَ ﴿۹۱﴾ فَوَرَبِّكَ لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۹۲﴾ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۳﴾
فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۹۴﴾ اِنَّا كَفَيْنٰكَ
الْمُسْتَهْزِءِيْنَ ﴿۹۵﴾ الَّذِيْنَ يَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَسَوْفَ
يَعْلَمُوْنَ ﴿۹۶﴾ وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ ﴿۹۷﴾
فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۹۸﴾ وَاعْبُدْ رَبَّكَ
حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ﴿۹۹﴾

رکوع: ۶۔ (اور حجر والوں نے بھی رسولوں کی تکذیب کی۔ ۸۰) اور ہم نے ان کو اپنی نشانیاں دیں، مگر وہ ان سے روگردانی ہی کرتے
رہے۔ ۸۱) وہ پہاڑوں کو کھود کر اپنے گھر بناتے تھے (اور) بے خوف وخطر رہا کرتے تھے۔ ۸۲) پس پکڑ لیا انھیں ایک خوفناک چنگھاڑ نے، جب وہ
صبح اٹھ رہے تھے۔ ۸۳) پس ان کے کام نہ آیا جو کچھ وہ کر رہے تھے۔ ۸۴) اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے غایت کے
ساتھ ہی پیدا کیا، بیشک قیامت آنے والی ہے، آپ ان سے خوبصورتی سے درگزر کریں۔ ۸۵) بیشک تیرا رب وہ بڑا پیدا کرنے والا اور بہت جاننے
والا ہے۔ ۸۶) ہم نے عطا فرمائی ہیں آپ کو سات آیتیں جو بار بار پڑھی جاتی ہیں اور قرآن عظیم بھی۔ ۸۷) آپ ان چیزوں کی طرف آنکھ اٹھا کر
بھی نہ دیکھئے جن سے ہم نے ان کے مختلف طبقوں کو بہرہ مند کر رکھا ہے اور ان کے حال پر رنجیدہ خاطر بھی نہ ہوں اور اپنی شفقت کے بازو اہلِ ایمان پر
جھکائے رکھیں۔ ۸۸) اور کہہ دیجئے! کہ میں تو بلاشبہ کھلا ڈرانے والا ہوں۔ ۸۹) اسی طرح ہم نے اتارا تھا ان تقسیم کر لینے والوں پر۔ ۹۰) جنھوں
نے قرآن کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیے۔ ۹۱) پس آپ کے رب کی قسم، ہم ان سب سے ضرور پوچھیں گے۔ ۹۲) ان اعمال سے متعلق جو وہ
کیا کرتے تھے۔ ۹۳) آپ کھول کر بیان کیجئے اس کو جس کا آپ کو حکم دیا گیا ہے اور مشرکوں سے منہ پھیر لیجئے۔ ۹۴) ہم کافی ہیں آپ کو مذاق
اڑانے والوں کے شر سے بچانے کیلئے۔ ۹۵) جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسرے معبود شریک کرتے ہیں۔ سو وہ عنقریب جان لیں گے۔ ۹۶) اور ہم
خوب جانتے ہیں کہ آپ کا دل تنگ ہوتا ہے ان باتوں سے جو کچھ وہ کہتے ہیں ۹۷) تو آپ اپنے رب کی اس کی حمد کے ساتھ تسبیح کریں اور سجدہ کرنے
والوں میں سے ہو جائیں۔ ۹۸) اور اپنے رب کی عبادت میں لگے رہیں یہاں تک کہ آپ کے پاس یقین آجائے۔ ۹۹)

Marfat.com

وَلَقَدْ كَذَّبَ اَصْحٰبُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿٨٠﴾ (سورۃ الحجر : ٨٠)
(اور حجر والوں نے بھی رسولوں کی تکذیب کی۔ ٨٠)

اصحاب الحجر سے مراد

''حجر'' شمالی عرب اور شام کے درمیانی علاقہ کو کہتے ہیں۔ یہ قوم ثمود کا مرکزی شہر تھا۔ اس کے کھنڈر مدینہ کے شمال مغرب میں موجودہ شہر ''العلا'' سے چند میل کے فاصلہ پر واقع ہیں۔ یہ علاقہ قوم ثمود کا مسکن تھا جن کے اندر حضرت صالح علیہ السلام کی بعثت ہوئی۔ مدینہ سے تبوک جاتے ہوئے یہ مقام شاہراہِ عام پر ملتا ہے اور قافلے اس وادی میں سے ہو کر گزرتے ہیں، مگر نبی کریم ﷺ کی ہدایت کے مطابق کوئی یہاں قیام نہیں کرتا۔ حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ غزوۂ تبوک کے سفر میں ہمارا گزر حجر کے علاقہ سے ہوا۔ ہم وہاں اترے، وہاں کے کنوؤں سے لوگوں نے پانی بھرا اور اسی کے ساتھ آٹا گوندھا تو حضور ﷺ نے حکم دیا کہ اس پانی کو انڈیل دو، جو آٹا اس پانی کے ساتھ گوندھا ہے اسے اونٹوں کے سامنے ڈال دو اور اس کنویں سے پانی لو جہاں سے حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی پانی پیا کرتی تھی۔ حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے ہمیں یہ بھی ارشاد فرمایا کہ ان لوگوں کے مکانوں میں جب تم داخل ہو جنھوں نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا تھا تو روتے ہوئے داخل ہو، ایسا نہ ہو کہ وہی عذاب تم پر بھی نازل ہو۔ حضور ﷺ کے اس ارشاد سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نافرمانوں کے آثار و دیار کو نہ پسند کرنا چاہیے اور اگر کبھی وہاں سے گزرنا پڑے تو اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگتے ہوئے گزرنا چاہیے۔

ایک سوال کا جواب

اس آیتِ کریمہ میں مرسلین کا لفظ استعمال ہوا ہے جو مرسل کی جمع ہے۔ اس کا مطلب بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اصحاب حجر نے کئی رسولوںؑ کی تکذیب کی تھی حالانکہ ان کی طرف صرف حضرت صالح علیہ السلام مبعوث ہوئے تھے اور آپ کی تکذیب تو صرف ایک رسول کی تکذیب ہے۔ اس میں جمع کا صیغہ لانے سے کیا مراد ہے؟ معلوم یہ ہوتا ہے کہ یہاں شاید اس بات کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جتنے رسولؑ بھی آئے ہیں ان سب کی دعوت ایک تھی۔ وہ سب ایک ہی ذات کے فرستادہ اور نمائندہ تھے۔ ان میں سے کسی ایک کا انکار بھی جس طرح اللہ تعالیٰ کا انکار ہے، اسی طرح سب رسولوں کا انکار بھی ہے۔ اس سے جہاں رسولوں میں وحدت فکر اور وحدت عمل کا اندازہ ہوتا ہے وہیں اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں سے کسی ایک رسولؑ کی تکذیب اپنے اندر کس قدر شدت رکھتی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں کتنا بڑا جرم ہے۔ اس سے قریش کو شاید یہ اشارہ دینا بھی مقصود ہو کہ اگر ہر رسول کا انکار اپنے اندر یہ معنی رکھتا ہے کہ گویا وہ سارے رسولوں کا انکار ہے تو نبی کریم ﷺ تو آخری رسول اور سید الرسل ہیں، ان کی تکذیب جرم ہونے کے حوالے سے کس قدر شدید ہوگی۔ تمہیں ایک لمحہ اس پر بھی سوچ لینا چاہیے۔

وَاٰتَيْنٰهُمْ اٰيٰتِنَا فَكَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ ﴿٨١﴾ (سورۃ الحجر : ٨١)
(اور ہم نے ان کو اپنی نشانیاں دیں، مگر وہ ان سے روگردانی ہی کرتے رہے۔ ٨١)

آیات سے مراد

اس آیتِ کریمہ میں قوم ثمود کے جرم تکذیب کی شناعت کو بیان کیا جا رہا ہے۔ کہنا یہ ہے کہ یہ مت سمجھو کہ ہم نے قوم ثمود کو محض تکذیب کے پہلے مرحلے ہی میں عذاب کا شکار کر دیا، ایسا ہرگز نہیں۔ ہمارے پیغمبر نے تو مسلسل انھیں سمجھایا عقلی اور فکری دلائل سے انھیں مطمئن کرنے کی کوشش کی اور ان میں سادہ لوح عوام کو حسی معجزات دکھا کر بھی ہر طرح سے یقین دلایا کہ دیکھو اس پیغمبر کے یہ معجزات اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے عظیم منصب کیلیے سندِ ماموریت کی حیثیت رکھتے ہیں تاکہ بطور رسول ان کی پہچان میں تمہیں غلطی نہ لگے۔ ان کی آنکھوں کے سامنے پہاڑ سے اونٹنی نکالی گئی جس کے پیچھے

Marfat.com

اس کا بچہ بھی تھا۔ پھر قوم کے ساتھ اس اونٹنی کے ایک ہی کنویں پر پانی پینے کی باریاں مقرر کی گئیں اور انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ وہ اونٹنی غیر معمولی پانی کی مقدار پی جاتی ہے اور بھی اس کے علاوہ یقیناً معجزات دکھائے گئے ہوں گے۔ ممکن ہے کچھ صحیفے بھی حضرت صالح علیہ السلام پر نازل کئے گئے ہوں، لیکن وہ قوم یہ سب کچھ دیکھ کر بھی اپنی اعراض کی عادت سے باز نہ آئی۔ وہ اپنے دینوی مشاغل اور دنیوی دلچسپیوں میں اس حد تک غرق ہو چکے تھے کہ اس کے علاوہ کوئی اور دلچسپی انھیں اپنی طرف متوجہ نھیں کر سکتی تھی۔ یہ انسان کی کمزوری ہے وہ جیسے جیسے خواہشاتِ نفس میں ڈوبتا جاتا اور اتباع ہوئی میں آگے بڑھتا چلا جاتا ہے ویسے ویسے اس کیلیے آخرت کی باتیں موت کا تصور اور اخلاقی اقدار قصۂ پارینہ بن جاتے ہیں۔ وہ اپنی آنکھوں سے دنیا سے جانے والوں کو دیکھتا ہے لیکن اسے اپنے انجام کی کبھی فکر نھیں ہوتی۔ وہ جب بھی سوچتا ہے دنیا کے عیش وعشرت کے بارے میں سوچتا ہے۔ اس کے اسباب میں ترقی کے بارے میں سوچتا ہے۔ یہ قوم بھی بری طرح اس گمراہی کا شکار ہو چکی تھی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی نشانی دیکھ کر بھی بجائے اس کے کہ ایمان کا راستہ اختیار کرتی ان کے اعراض میں اور اضافہ ہو گیا۔

وَكَانُوْا يَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا اٰمِنِيْنَ ﴿۸۲﴾ (سورة الحجر : ۸۲)
(وہ پہاڑوں کو کھود کر اپنے گھر بناتے تھے (اور) بے خوف وخطر رہا کرتے تھے۔ ۸۲)

قومِ ثمود کا فنِ تعمیر

اس دنیا میں ہمیشہ رہنے کے تصور نے انھیں یہ راستہ دکھایا تھا کہ پہاڑوں کو کھود کر گھر بنائے جائیں کیونکہ اس زمین پر اللہ تعالیٰ نے سب سے مضبوط کوئی مکان اگر تعمیر کیا ہے تو وہ پہاڑ ہیں جنھیں ان کی جگہ سے ہلانا آسان نھیں۔ صدیوں سے اپنی جگہ ایستادہ ہیں۔ مضبوط سے مضبوط مادۂ تعمیر سے بنے ہوئے مکانات بھی کہنگی یا حوادث شکار ہو کر زمین بوس ہو جاتے ہیں لیکن جب تک پہاڑ قائم ہیں اس میں کھدا ہوا گھر بھی قائم ہے کیونکہ دونوں کی استواری ایک دوسرے کے ساتھ قائم ہے اور انھیں اپنے اس فنِ تعمیر پر بے حد ناز تھا۔ قرآن کریم نے شاید ان کے اس فن کا بطورِ خاص ذکر کیا ہے۔ آٹھویں صدی ہجری میں ابنِ بطوطہ حج پر جاتے ہوئے یہاں سے گزرا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ یہاں سرخ رنگ کے پہاڑوں میں قوم ثمود کی عمارتیں موجود ہیں جو انھوں نے چٹانوں کو تراش خراش کر ان کے اندر بنائی تھیں۔ ان کے نقش ونگار اس وقت تک ایسے تازہ ہیں کہ جیسے آج بنائے گئے ہوں۔

فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُصْبِحِيْنَ ﴿۸۳﴾ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۸۴﴾ (سورة الحجر : ۸۳.۸۴)
(پس پکڑ لیا انھیں ایک خوفناک چنگھاڑ نے، جب وہ صبح اٹھ رہے تھے۔ ۸۳) پس ان کے کام نہ آیا جو کچھ وہ کر رہے تھے۔ ۸۴)

مضبوط مکان بھی انھیں نہ بچا سکے

انھیں اپنے پہاڑوں میں تراشیدہ مکانوں پر اتنا اعتماد تھا کہ وہ کسی حادثے کو بھی خاطر میں لانے کو تیار نہ تھے۔ نہایت بے خوف زندگی گزار رہے تھے کہ دنیا کا کوئی خطرہ ہمارے لیے خطرہ نھیں ہو سکتا کہ اچانک انھیں ایک چنگھاڑ نے آ پکڑا یعنی اللہ تعالیٰ کا عذاب آ گیا۔ عذاب چاہے زلزلے کی صورت میں آئے یا تیز آندھی کی شکل میں، ہمیشہ ایک چنگھاڑ ضرور سنائی دیتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا بھر کے حوادث نے ان پر حملہ کر دیا ہے۔ نہ ان میں کوئی نفس زندہ رہا نہ متاعِ حیات میں سے کوئی چیز سالم رہی، سب کچھ تباہ کر دیا گیا۔ جن گھروں پر انھیں اعتماد تھا کوئی ان کیلیے جائے پناہ نہ بن سکا۔

ان معذب قوموں کے تذکرے سے پروردگار بار بار انسانوں کو یاد دہانی کرتا ہے کہ اپنے انجام سے بے فکر نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ کی پکڑ کو معمولی نہ سمجھیں، وہ بہت بردبار اور حلیم ہے۔ اس کی رحمت اس کے غضب پر حاوی ہے لیکن جب انسانی بگاڑ اس کی کھینچی ہوئی حدود سے آگے نکلنے لگتا ہے تو پھر وہ کبھی معاف نھیں کرتا۔ پھر اس قوم کی کوئی صبح، صبح نھیں ہوتی بلکہ ہر صبح شام میں ڈوب جاتی ہے۔

Marfat.com

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ وَ اِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيْلَ ﴿۸۵﴾

(اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے غایت کے ساتھ ہی پیدا کیا، بیشک قیامت آنے والی ہے، آپ ان سے خوبصورتی سے درگزر کریں۔ ۸۵) (سورۃ الحجر:۸۵)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی

اب یہاں سے نبی کریم ﷺ کی طرف براہِ راست التفات ہے۔ یہ خاتمہ سورۃ کی آیات ہیں۔ اس کی تمہید یوں اٹھائی جا رہی ہے کہ ہم نے آسمانوں اور زمین اور جو کچھ اس کے درمیان ہے اس کو بے مقصد اور بے غایت پیدا نہیں کیا۔ یہ کسی کھلنڈرے کا کھیل نہیں کہ اس نے محض تفریح کیلیے یہ کائنات پیدا کی ہو اور تفریح کے مکمل ہو جانے کے بعد اسے توڑ پھوڑ کر پھینک دے گا۔ یہ کسی بچے کا بنایا ہوا گھروندا نہیں کہ جیسے ہی اس کا دل بھر جاتا ہے وہ گھروندا توڑ دیتا ہے۔ یہ تو ایک حکیم ذات کا بنایا ہوا کارخانہ ہے۔ جس نے ہر چیز کو احسن طریق سے پیدا فرمایا اور اس کا کوئی نہ کوئی مقصد متعین فرمایا۔ ہم اپنے گردوپیش میں عناصرِ قدرت اور عناصرِ فطرت کو کام کرتا ہوا دیکھتے ہیں، کوئی عنصر ایسا نہیں جس کے فرائض متعین نہ ہوں، جس کی حرکت کی کوئی جہت نہ ہو، جو اللہ تعالیٰ کے احکام کا پابند نہ ہو اور کوئی عنصر دوسرے عنصر کے کام میں دخل نہیں دیتا۔ ہر طرف خالقِ کائنات کی اطاعت نے ایک نظم و نسق، ایک ترتیب اور یکسانی و یک رنگی پیدا کر رکھی ہے اور یہ تمام عناصر کہیں الگ الگ اور کہیں مل کر کسی نہ کسی مقصد کی تعمیل میں لگے ہوئے ہیں۔ کائنات کی مقصد کے ساتھ یہ یکسانی اور یک رنگی اور خالقِ کائنات کے عائد کردہ فرائض کی تعمیل سے یہ بات بتانا مقصود ہے کہ انسان تو اس کائنات کا گلِ سرسبد ہے، اس کے سر پر خلافتِ ارضی کا تاج رکھا گیا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اس کی زندگی کا کوئی مقصد نہ ہو اور وہ یونہی بے ہنگم زندگی گزار کر دنیا سے واپس چلا جائے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان کی زندگی کا بھی ایک مقصد ہے جسے واضح اور برپا کرنے کیلیے اللہ تعالیٰ کے نبیؑ تشریف لاتے ہیں۔ وہ مسلسل انھیں اس مقصد کی تبلیغ کرتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں دکھ اٹھاتے ہیں لیکن ان کے مقصد سے انھیں آگاہ کرنے کیلیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتے۔ لیکن جب لوگ پیغمبرؑ کی تبلیغ و دعوت کے نتیجے کو قبول کرنے کی بجائے اس کی دشمنی پر تل جاتے ہیں اور اسی کو اذیتیں پہنچانا شروع کر دیتے ہیں تو اب ضابطے کے طور پر تو ضروری ہو جاتا ہے کہ انھیں سزا دی جائے۔ لیکن اللہ تعالیٰ چونکہ اپنی رحمت سے انھیں اس وقت تک ڈھیل دیتا چلا جاتا ہے جب تک ان میں ایک آدمی بھی اس قابل رہتا ہے کہ اس سے حق کی قبولیت کی امید کی جائے۔ رہی ان کی اذیتیں اور ان کی گستاخیاں تو اس کیلیے اپنے پیغمبر کو پروردگار برابر درگزر کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ جب تبلیغ و دعوت اس مرحلے تک پہنچتی ہے کہ ایک طرف کفر پیغمبر کے مقابلے میں اپنے سارے تیر آزما ڈالنا چاہتا ہے اور دوسری طرف اہلِ حق ان کی اذیت رسانیوں کے باعث مظلومیت کی آخرت حد کو پہنچ جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ پھر بھی عذاب بھیجنے میں جلدی نہیں کرتا، وہ اپنے پیغمبر کو یہ کہہ کر تسلی دیتا ہے کہ ہم نے اس کائنات کو بے مقصد پیدا نہیں کیا، یہاں ہر کام کرنے والے کی محنت کا صلہ ہے اور ہر بدچلن اور مفسد کی بداعمالیوں کی سزا ہے۔ لیکن اس کیلیے دنیا میں ہم جلدبازی نہیں کرتے، ہم ڈھیل دیتے ہیں۔ لیکن آخرت میں ہر ایک کو اپنے اعمال کی پاداش بھگتنا ہوگی۔ آخرت اس دنیا کا ایک لازمی تقاضا ہے۔ یہاں کے خیر و شر کا لازمی نتیجہ ہے۔ اس لیے آپ ان کی اذیت رسانیوں کے مقابلے میں انتہائی شریفانہ درگزر سے کام لیجیے۔ اور اس بات کا ایمان لانے والوں کو یقین دلا دیجیے کہ مقصدِ حق کا تقاضا یہ ہے کہ لوگ اپنے انکار کی پاداش میں عذاب کا شکار ہوں گے چاہے اللہ تعالیٰ کی جانب سے عذاب نازل کیا جائے اور چاہے مسلمانوں کے ہاتھوں ان کا خاتمہ کرا دیا جائے۔

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ ﴿۸۶﴾ (سورۃ الحجر : ۸۶)

(بیشک تیرا رب وہ بڑا پیدا کرنے والا اور بہت جاننے والا ہے۔ ۸۶)

Marfat.com

دو اعتراضوں کا جواب

اس آیت میں دو اعتراضوں کا جواب دیا گیا ہے۔ گزشتہ آیت میں یہ فرمایا گیا ہے کہ قیامت کا آنا یقینی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جس مقصد و غایت کے ساتھ کائنات کو پیدا کیا ہے اس کا لازمی تقاضا ہے کہ ایک نہ ایک دن قیامت آئے تا کہ اہلِ خیر کو خیر کا صلہ ملے اور اہلِ شر کو شر کی سزا ملے۔ مجرم اپنے جرائم کی سزا کو پہنچیں اور قربانی دینے والے اپنی قربانیوں کا صلہ پائیں۔ اس پر اعتراض کرنے والوں نے یہ اعتراض کیا کہ آپ ہمیں جس قیامت سے ڈراتے رہتے ہیں اس قیامت کا آنا کیسے ممکن ہے؟ اللہ تعالیٰ نے آج تک اربوں کھربوں مخلوق پیدا کی ہے اور ابھی مزید قیامت تک نہ جانے کتنی اور پیدا ہوگی۔ اس مخلوق کی پیدائش میں تو ہزاروں سال صرف ہوئے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک ہی دن میں قیامت کا صور پھونک دیا جائے اور تمام لوگ جو قیامت تک پیدا ہو چکے اور مر چکے وہ از سرِ نو زندہ ہو کر محشر میں پہنچ جائیں۔ چند ہزار آدمی ہوتے تو ہم پھر بھی یقین کر لیتے۔ بے شمار مخلوق کو از سرِ نو ایک ہی دن میں پیدا کر دینا، یہ سمجھ میں آنے والی بات نہیں۔ اور دوسرا اعتراض یہ کیا کہ اگر مان بھی لیا جائے کہ ہر شخص زندہ کیا جائے گا لیکن یہ کیسے باور کر لیا جائے کہ تمام انسانوں کے افکار و اعمال کا حساب بھی ہوگا کیونکہ افکار و اعمال کے حساب کیلیے ضروری ہے کہ ہر فکر اور ہر عمل کی تفصیلات سے آگاہی ہو۔ ایک انسان روزانہ ہزاروں اعمال کرتا ہے۔ اس کے زندگی بھر کے اعمال کا کون محاسبہ کر سکتا ہے۔ جب ایک آدمی کے اعمال کا یہ حال ہے تو تمام نوعِ انسانی کے اعمال کا کون تصور کر سکتا ہے۔ اس کا جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: کہ یہ تو تم تسلیم کرتے ہو کہ اللہ تعالیٰ خالق ہے اور اس نے کائنات کی بے شمار مخلوق کو پیدا فرمایا لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ صرف خالق ہی نہیں بلکہ خلاق ہے۔ خالق اگر اربوں کھربوں مخلوق پیدا کر سکتا ہے تو خلاق کیلیے اس سے کئی گنا زیادہ مخلوق پیدا کرنا کیا مشکل ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ علیم بھی ہے۔ وہ ہر انسان کے ایک ایک قول و فعل سے واقف ہے۔ انسان کیا وہ تو جنگل میں گرنے والے ایک ایک پتے سے بھی واقف ہے۔ سمندر میں حرکت کرنے والی ایک ایک مخلوق کی حرکت کو دیکھتا ہے۔ ویسے بھی سامنے کی بات ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ جو کسی چیز کو خلق کرے وہ اس سے پوری طرح آگاہ نہ ہو۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ کیا جس نے سب کو پیدا کیا، وہ ان سے بے خبر ہو سکتا ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَیْنٰکَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ ﴿۸۷﴾ (سورۃ الحجر : ۸۷)

(ہم نے عطا فرمائی ہیں آپ کو سات آیتیں جو بار بار پڑھی جاتی ہیں اور قرآنِ عظیم بھی۔ ۸۷)

سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ سے کیا مراد ہے

گزشتہ سے پیوستہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو اس بات سے تسلی دی کہ بظاہر حالات آپ ؐ یہ دیکھتے ہیں کہ کفر کی سرکشی میں آئے روز اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور اس کے نتیجے میں مسلمانوں کی بے بسی اور مظلومیت بڑھتی جا رہی ہے، لیکن درحقیقت ایسا نہیں کیونکہ زمین و آسمان کی پیدائش میں ایک مقصدِ حق کے ساتھ وابستگی شامل ہے اور یہی وابستگی اس کی زندگی میں طوالت کا باعث ہے۔ وقتی طور پر باطل ترقی کرتا نظر آتا ہے لیکن انجام کار باطل سرنگوں ہوتا ہے اور حق سرفراز ہوتا ہے۔ اس اصول کے تحت وہ وقت جلد آنے والا ہے جب آپ سرفراز ہوں گے اور آپ کے دشمن سرنگوں ہوں گے۔ اس وقت تک آپ ان کی زیادتیوں سے درگزر کیجیے۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے خلقِ عظیم عطا فرمایا ہے۔ وہی آپ ؐ کی اصل قوت ہے۔ آپ ؐ اس سے کام لیجیے۔ ان کی اذیتوں کے جواب میں دعائیں دیجیے۔ مزید فرمایا کہ اس لیے اس کے ازالے کیلیے ہم نے آپ ؐ کو ایک عظیم دولت عطا فرمائی ہے جو اہلِ کفر میں سے کسی کے پاس بھی نہیں۔ ہم نے آپ کو سات بار بار پڑھی جانے والی چیزیں عطا فرمائیں اور قرآنِ کریم عطا کیا۔ یہ وہ گنج شایگان ہے جس کی موجودگی میں دنیا کے مال و دولت کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنا بھی اس نعمت کی ناقدری کے مترادف ہے کیونکہ دنیا کی ہر نعمت فانی ہے جبکہ یہ نعمت باقی رہنے والی ہے۔ دنیا کی ہر نعمت کی ایک قیمت ہے اور اس نعمت کو کسی قیمت پر خریدا نہیں جا سکتا۔ اب سوال یہ ہے کہ اس سے مراد کون سی نعمت ہے؟ بعض اہلِ علم

Marfat.com

نے اس سے قرآنِ کریم کی وہ سات بڑی بڑی سورتیں مراد لی ہیں جن کی آیات کی تعداد ۲۰۰ کے لگ بھگ ہے، یعنی قرآنِ کریم کی پہلی سات سورتیں، لیکن صحیح بات یہ ہے کہ اس سے مراد سورۂ فاتحہ ہے کیونکہ بڑے بڑے جلیل القدر صحابہ کا یہی قول ہے۔ امام ترمذی نے حضرت ابو ہریرہؓ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا، الحمدلله ام القرآن و ام الکتاب و سبع المثانی ۔امام بخاری نے بھی آنحضرت ﷺ کا ایک ارشاد نقل کیا ہے۔ ام القرآن هی السبع المثانی و القرن العظیم. حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے اس کی وجہ تسمیہ یہ بتائی ہے کہ اسے ہر نماز میں دہرایا جاتا ہے اور ہر رکعت میں پڑھا جاتا ہے۔ اور قرآنِ عظیم سے مراد باقی سارا قرآنِ کریم ہے۔

بعض اہلِ علم کا خیال ہے کہ السبع المثانی سے مراد پورا قرآنِ کریم ہے اور دلیل ان کی یہ ہے کہ ''مثانی'' کا معنی دوہرایا جانے والا نہیں ہوتا بلکہ ان چیزوں کو کہتے ہیں جو دو دو کر کے آتی ہیں اور قرآنِ کریم میں سورۂ زمر کی آیت نمبر ۲۳ میں فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے بہترین کلام اتارا ہے، ایک متشابہ مثانی کتاب کی صورت میں، یعنی اس کی تمام سورتیں جوڑا جوڑا ہیں اور ہر سورت اپنا ایک مثنیٰ بھی رکھتی ہے۔ اس لحاظ سے اس سے سورۂ فاتحہ مراد لینا کسی طرح بھی مناسب نہیں۔ مزید ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ یہاں قرآنِ کریم نے سات کا ذکر کیا ہے تو اس سے یہ تو مراد ہو سکتا ہے کہ قرآنِ کریم کو سات حصوں میں تقسیم کیا جائے لیکن اس سے سورۂ فاتحہ مراد لینا اس لیے صحیح نہیں کیونکہ اس کی آیتیں سات نہیں بلکہ چھ ہیں۔ سات جب بنتی ہیں جبکہ بسم اللہ کو سورت کا جز قرار دیا جائے حالانکہ قرآن کا رسم الخط اس بات پر دلیل ہے کہ بسم اللہ سورت کا جز نہیں بلکہ الگ آیت ہے۔

اس سلسلے میں گزارش یہ ہے کہ امام ترمذی کی صحیح روایت اور امام بخاری کی دو مرفوع احادیث کے بعد کسی اور بات کا قائل ہونا اسی صورت میں ممکن ہے کہ جب حدیث کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جائے اور یا ان احادیث کو ناقابلِ تسلیم قرار دیا جائے جبکہ صحیحین کی کسی روایت کے بارے میں ایسی کسی بات کا قائل ہونے کیلیے بڑی مضبوط دلیل کی ضرورت ہے۔ رہی یہ بات کہ مثانی دو دو والی چیزوں کو کہتے ہیں اس کا معنی دوہرائی جانے والی نہیں ہوتا تو اس سلسلے میں گزارش یہ ہے کہ تفسیر مظہری نے حضرت ابن عباسؓ کا ایک قول نقل کیا ہے جس میں انھوں نے مثانی کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ لانها تثنی فی الصلوة فیقرأ فی کل رکعة اس لیے کہ اسے نماز میں دوہرایا جاتا ہے اور ہر رکعت میں پڑھا جاتا ہے۔ ابن عباسؓ اس کا ترجمہ دوہرائی جانے والی کرتے ہیں حالانکہ وہ نہ صرف اہلِ زبان نہیں بلکہ ادبِ عربی کے شناور بھی ہیں۔ البتہ اس بات سے انکار نہیں کہ اسے مثنیٰ کی جمع قرار دیا جا سکتا ہے اور سورۂ زمر کی آیت میں قرآنِ کریم کی تعریف میں اگر اس معنی میں یہ لفظ استعمال ہوا ہو تو انکار نہیں۔ لیکن اس سے صرف یہ ثابت ہوگا کہ جس طرح قرآنِ کریم کی یہ صفت ہے کہ اس کی سورتیں جڑواں بن کے آئی ہیں اور دوسری سورت پہلی سورت کا مثنیٰ بن کے آئی ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی صحیح ہے کہ مثانی سے مراد سورۂ فاتحہ بھی ہے اور وہاں اس کا معنی دوہرائی جانے والی ہے۔

سورۂ فاتحہ قرآنِ کریم کا دیباچہ ہے۔ اس میں اصولی طور پر ان تمام مضامین کی طرف اشارے ہیں جنھیں تفصیل سے قرآنِ کریم میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ ایک ایسا بیج ہے کہ دل و دماغ میں اگر صحیح طریقے سے اسے بو دیا جائے تو اس سے قرآنِ کریم کی فصل بارآور ہوتی ہے۔ اور اگر پورے قرآنِ پاک کے مضامین کو سمیٹ دیا جائے تو وہ سورۂ فاتحہ کی شکل اختیار کر جاتا ہے۔ اس لیے اس کو سب سے بڑی سورت قرار دیا گیا ہے۔ اور آنحضرت ﷺ نے اسے شفا فرمایا ہے۔

لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۸﴾

(آپ ان چیزوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھئے جن سے ہم نے ان کے مختلف طبقوں کو بہرہ مند کر رکھا ہے اور ان کے حال پر رنجیدہ خاطر بھی نہ ہوں اور اپنی شفقت کے بازو اہلِ ایمان پر جھکائے رکھیں۔ ۸۸) (سورۃ الحجر: ۸۸)

آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کو تسلی

اس آیتِ کریمہ میں نبی کریم ﷺ اور مسلمانوں کو مزید تسلی دی گئی ہے کیونکہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آپؐ اور آپؐ کے ساتھی بہت تلخ انداز میں حالات کی سنگینی کا شکار تھے۔ مشرکینِ مکہ کی اندھی مخالفت نے آپؐ کی زندگی دشوار کر دی تھی۔ تین سالہ مقاطعہ نے آپؐ لوگوں کے کاروبار بالکل تباہ

Marfat.com

کر دیے۔ آنحضرت ﷺ کا کاروبار تو کارِ نبوت کی انجام دہی میں ختم ہو کر رہ گیا تھا۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کا اثاثہ بھی اسی عظیم خدمت کی نذر ہو چکا تھا۔ معاشرتی مقاطعہ نے صنعت و حرفت اور دستکاری سے تعلق رکھنے والے لوگوں کا بھرکس نکال کے رکھ دیا تھا۔ خوشحال صحابہؓ بھی بدحالی کا شکار ہو چکے تھے۔ اور مزید تکلیف دہ قریش کا رویہ تھا کہ ان کی ایذا دہی سے کوئی چھوٹا بڑا بچا ہوا نہیں تھا اور ان کی زبانوں کے نشتر ہر ایک دل کو زخمی کیے دے رہے تھے۔ کسی کی عزت نفس سلامت نہیں تھی۔ ان حالات میں تسلی اور اطمینان کا امرت عطا کیا جا رہا ہے اور دلوں پر محبت کی شبنم برسائی جا رہی ہے کہ تمہارا اصل رابطہ قرآنِ کریم کے واسطے سے اللہ تعالیٰ سے ہونا چاہیے۔ وہ قدرتوں کا مالک ہے، خزانے اس کے قبضے میں ہیں، عزتیں وہی دینے والا ہے۔ اس نے تمہیں قرآنِ کریم کی شکل میں وہ دولت عطا فرمائی ہے جس سے آج پوری دنیا بے بہرہ ہے۔ اصل قدر و قیمت اس نعمت کی ہے جو تمہارا ہاتھوں میں ہے۔ رہی وہ چیزیں جن سے قریش اور دوسرے لوگ بہرہ ور ہیں ان کی حیثیت اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ جسے ہیروں کا خزانہ مل جائے وہ کبھی کوڑیوں کے ڈھیر کی طرف نہیں دیکھتا۔ قرآن کی صورت میں تمہارے پاس ہیروں کی کان موجود ہے۔ وہ وقت دور نہیں جب اسی قرآن کی بدولت تم خشکی اور تری پر غالب آ جاؤ گے۔ حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے خوب فرمایا کہ جس شخص کو دولتِ قرآن بخشی گئی اور اس نے کسی دنیادار کو دیکھا اور اس کے سیم و زر کو نعمتِ قرآن سے افضل خیال کیا تو اس نے بڑی بے انصافی کی۔ اس نے عظیم المرتبت چیز کو حقیر جانا اور حقیر چیز کو بڑا خیال کیا۔ حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے دورِ خلافت میں اس سے بھی بڑھ کر بات ارشاد فرمائی۔ ان اللہ یرفع بھذا الکتاب اقواماً ویضع بہ آخرین اللہ تعالیٰ اسی کتاب کے ذریعے قوموں کو اٹھائے گا اور اسی کے چھوڑنے کے نتیجے میں قوموں کو گرائے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کی عزت و ذلت کا سررشتہ اسی کتاب سے باندھ دیا گیا ہے۔ اس کتاب سے وفاداری اور اس کے حق کو ادا کرنا مسلمانوں کی عظمت کا ضامن ہے اور اس کی قدر و منزلت سے ناشناسی اور اس کے حقوق کی طرف سے تغافل مسلمانوں کے زوال اور ذلت کا باعث ہے۔ مسلمانوں کی پوری تاریخ اس پر از حکمت قول پر شاہد ہے۔

حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی روایت ہے کہ جو اس آیتِ کریمہ کے فہم میں معاون ہو سکتی ہے۔ ارشادِ نبوی ہے ازھد فی الدنیا یحبک اللہ وازھد فی ما ایدی الناس یحبک الناس دنیا سے بے رغبت ہو جا، اللہ تعالیٰ تجھ سے پیار کرے گا۔ اور جو کچھ لوگوں کے پاس ہے اس سے بے نیاز ہو جا۔ دنیا تیرا احترام کرے گی۔

اس آیت میں مزید فرمایا گیا وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ آپ ان کے حال پر دل گرفتہ نہ ہوں، ہم جانتے ہیں کہ ان کا کفر اور جہنم کی طرف تیز رفتاری سے ان کا سفر تمہیں خون کے آنسو رلاتا ہے۔ ان کی گالیوں کے جواب میں آپؐ انھیں دعائیں دیتے ہیں۔ وہ آپؐ کیلیے زندگی دشوار کر رہے ہیں اور آپؐ ان کی آخرت سنوارنے کیلیے راتوں کو اٹھ اٹھ کر اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگتے ہیں۔ اس طرزِ عمل نے آپؐ کی صحت کو بھی متاثر کیا ہے۔ اب آپؐ ان کی طرف سے کڑھنا اور پریشان ہونا چھوڑ دیں۔ یہ لوگ اس قابل نہیں۔

البتہ آپؐ اپنی تمام تر توجہات اور شفقتیں اپنے صاحبِ ایمان ساتھیوں کیلیے وقف کر دیں۔ انھیں دنیا نے ادھیڑ ڈالا ہے اور امرائے قریش کے طعنوں نے بری طرح ان کے دل زخمی کر دیے ہیں۔ اب آپؐ کی نگاہِ کرم ان کے دلوں کا سب سے بڑا سہارا ہے۔ انھیں اس طرح اپنے قریب رکھیے جیسے بچے اپنی ماں کی آغوش کے قریب ہوتے ہیں۔ ممکن ہے اللہ تعالیٰ کا عذاب زیادہ دور نہ ہو اور قریش اس کا ہدف بننے والے ہوں تو آپؐ اپنے جاں نثاروں کو اس طرح اپنے دامن کی چھاؤں میں رکھیے جس طرح مرغی اپنے بچوں کو اپنے پروں کے نیچے چھپا کے رکھتی ہے تاکہ آپؐ کے خادموں اور جاں نثاروں کو کوئی دکھ نہ پہنچے اور وہ محسوس کریں کہ جب ہمارے آقا اور ہمارے ماویٰ و ملجا ہمارے حال پر مہربان ہیں تو پھر ہمیں کس بات کی پرواہ ہے۔

وَقُلْ اِنِّيْٓ اَنَا النَّذِيْرُ الْمُبِيْنُ ﴿٨٩﴾ (سورۃ الحجر : ٨٩)

(اور کہہ دیجیے! کہ میں تو بلاشبہ کھلا ڈرانے والا ہوں۔ ٨٩)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت کا وقت شاید قریب آ رہا ہے۔ جب کافر اور مسلمان دونوں کے راستے الگ ہو جائیں گے۔ اس وقت مسلمانوں کا ماویٰ و ملجا صرف رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ گرامی ہو گی۔ اس لیے یہ حکم دینے کے بعد کہ اب آپؐ کا سایۂ رحمت ان پر جھکا رہنا چاہیے، کافروں کے حوالے سے یہ حکم دیا کہ اب آپ صاف صاف ان سے کہہ دیجیے کہ میں نے ہر ممکن طریقے سے تمہیں اللہ تعالیٰ کے دین کی طرف بلایا

Marfat.com

ہے۔اپنی ہمت سے بڑھ کرتمھاری دنیا اور آخرت سنوارنے کی کوشش کی لیکن تم نے قدم قدم پر میری مخالفت کی۔میرا ایک ایک احساس تمھاری مخالفت کی وجہ سے زخمی ہے۔اب میں تمھارے لیے صرف ڈرانے والا اور آگاہ کرنے والا ہوں کیونکہ تم نے سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیتیں تو کھو دی ہیں،اب میں دیکھ رہا ہوں کہ تم تباہی اور خطرے کے آخری کنارے پر ہو،اب میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ میں خطرہ خطرہ پکاروں اور تباہی کی دہائی دوں،شاید تم اسی سے متاثر ہو کر اپنا راستہ بدلنے کے بارے میں سوچ سکو۔

كَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِمِيْنَ ﴿٩٠﴾ الَّذِيْنَ جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِيْنَ ﴿٩١﴾ (سورة الحجر : ٩٠.٩١)

(اسی طرح ہم نے اتارا تھا ان تقسیم کر لینے والوں پر۔ ٩٠) جنھوں نے قرآن کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیے۔ ٩١)

مقتسمین سے کیا مراد ہے

مفسرین نے ان آیتوں کے مختلف مطالب بیان کیے ہیں۔بعض مفسرین کا خیال ہے کہ اس سے مراد اشراف قریش ہیں۔انھوں نے قرآنِ کریم کا راستہ روکنے اور لوگوں کو آنحضرت ﷺ سے بدگمان کرنے کیلیے عجیب طریقہ اختیار کیا۔ولید بن مغیرہ کو اس سازش کا سرغنہ ٹھہرایا گیا۔اس نے ایک اچھی خاصی تعداد میں لوگوں کی ڈیوٹیاں لگائیں اور ان کو مکہ کی مختلف وادیوں میں پھیلا دیا۔ممکن ہے یہ انتظام حج کے دنوں میں کیا گیا ہو۔ہر شخص کو ہدایت کی گئی کہ اس کی ملاقات جس اجنبی سے ہو اسے نبی کریم ﷺ اور آپ پر جو قرآن اترتا ہے دونوں کے بارے میں غلط فہمی میں مبتلا کیا جائے۔کوئی یہ کہے کہ محمد ﷺ دیوانے ہو گئے ہیں،کوئی انھیں مجنون قرار دے،کوئی انھیں شاعر کہے،کوئی انھیں کاہن کے طور پر متعارف کرائے۔اس طرح سے ہر شخص کوئی ایسی بات لوگوں کے ذہنوں میں ڈالے جس سے لوگ بدگمان ہو کر اس کے قریب جانے سے بھی گریز کریں۔یہ انھوں نے جس طرح علاقے تقسیم کر کے مختلف عنوانات سے آنحضرت کی مخالفت کا کام اپنے اپنے ذمہ لیا اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا جا رہا ہے کہ انھوں نے اپنے تئیں قرآن کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔علامہ قرطبی کے خیال میں مقتسمین سے مراد یہ لوگ ہیں،عاص بن وائل،عتبہ،شیبہ،ابوجہل،ابوالبختری،نضر بن حارث،امیہ بن خلف اور منبہ بن الحجاج۔

بعض دیگر مفسرین کی رائے یہ ہے کہ یہ آیتِ کریمہ اہلِ کتاب کے بارے میں نازل ہوئی اور فرمایا گیا کہ ہم نے یہ قرآنِ کریم اسی طرح آنحضرت ﷺ پر نازل کیا ہے جس طرح ہم اس سے پہلے اہلِ کتاب پر ان کی کتابیں نازل کر چکے ہیں۔ہر امت کی طرف اترنے والی کتاب ان کا قرآن ہی تھی۔چنانچہ انھوں نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔اہلِ تورات نے تورات کے ٹکڑے کیے اور اہلِ انجیل نے انجیل کے ٹکڑے کیے۔ٹکڑے کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ اس کی کسی آیت کو مانا اور کسی کا انکار کر دیا۔اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب بھی کوئی کتاب اترتی ہے وہ مکمل انسانی زندگی کی رہنما بن کے آتی ہے۔اس میں زندگی کے ہر شعبے کے بارے میں ہدایات دی جاتی ہیں،لیکن قومیں جب بگڑتی ہیں تو وہ ان ہدایات کو قبول کرتی ہیں جو ان کیلیے مفید مطلب ہوتی ہیں اور جن کیلیے کوئی بڑی قربانی نہ دینا پڑے اور باقی کتاب کو ماننے سے انکار کر دیتی ہیں۔یہود نے کسی حد تک عبادات اور کسی حد تک عائلی قوانین کو تسلیم کیا،لیکن حدود اللہ تعالیٰ کو ماننے سے انکار کر دیا۔یہی حال اہلِ انجیل کا بھی تھا اور آج مسلمانوں کا حال بھی اس سے مختلف نہیں۔اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو مکمل دین عطا فرمایا۔قرآن و سنت کی شکل میں زندگی کے ہر شعبے سے متعلق ہدایات عطا فرمائیں۔عبادات کا ایک نظام بخشا۔شخصی قوانین بھی دیے اور پبلک قوانین بھی۔اسلامی معاشرتی اصول بھی سکھائے اور اسلامی معیشت کی بنیادیں بھی فراہم کیں۔انسانوں میں مختلف انواع کو حقوق و فرائض سے بہرہ ور کیا۔تمدنی اور تہذیبی مسائل کو سلجھایا۔سیاست کے طور اطوار سکھائے،نظامِ عدل دیا اور اس کے تمام شعبے قائم کر کے دکھائے۔حکومت اور ریاست کی صحیح تعریف کی اور اس کے قیام کے طریقے سکھائے۔سیاست کے آداب واضح کیے اور تعلیم کا منہج اور مقصد واضح کیا۔زندگی کا کوئی شعبہ ایسا باقی نہیں رہا جس کیلیے رہنمائی نہ دی ہو۔لیکن مسلمانوں نے اسلام سے نظامِ عبادت،شخصی قوانین اور بعض معاشرتی قوانین کے سوا قرآن و سنت کی ہر طرح کی رہنمائی کا بائیکاٹ کر دیا۔حدود اللہ تعالیٰ پامال

Marfat.com

ہو کے رہ گئے۔ زندگی کا ہر شعبہ اسلام کی روشنی سے محروم ہو کر تاریکیوں میں ڈوب گیا۔ وہ امتِ مسلمہ جو کبھی تاریخ کی سب سے بڑی قوت تھی آج ایک تماشا بن کے رہ گئی ہے۔ چنانچہ اہلِ کتاب کے اسی رویئے کا ذکر کرتے ہوئے مسلمانوں کو توجہ دلائی گئی تھی اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ کیا تم کتاب کے اس ایک حصے کو مانتے ہو اور کتاب کے دوسرے حصے کا انکار کر دیتے ہو، جو قوم بھی ایسا کرتی ہے وہ دنیا میں رسوا ہوتی ہے اور آخرت میں بدترین عذاب میں ڈالی جائے گی۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں بھی ممکن ہے مسلمانوں کو اس کی طرف توجہ دلائی گئی ہو۔

فَوَرَبِّكَ لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿٩٢﴾ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿٩٣﴾ (سورة الحجر : ۹۲۔۹۳)

(پس آپ کے رب کی قسم، ہم ان سب سے ضرور پوچھیں گے۔ ۹۲) ان اعمال سے متعلق جو وہ کیا کرتے تھے۔ ۹۳)

اگر یہ باور کر لیا جائے کہ پہلی دونوں آیتیں یہود یا اہلِ کتاب کے بارے میں نازل ہوئی ہیں تو پھر اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ یہ آیتیں بھی یہود یا اہلِ کتاب ہی سے متعلق ہیں کیونکہ انھوں نے کتاب اللہ تعالیٰ کے احکام کی تقسیم کر کے اللہ تعالیٰ کی توہین کی ہے اور اپنے عمل سے یہ ثابت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ہر حکم اس قابل نہیں کہ اسے درخورِ اعتنا سمجھا جائے۔ اصل اتباع کے لائق تو ہماری خواہشِ نفس ہے، اللہ تعالیٰ کا جو حکم اس کے مطابق ہوگا اسے تسلیم کریں گے اور جو مطابق نہیں ہوگا اس کا انکار کر دیں گے یا اس پر عمل کرنے سے گریز کریں گے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ رویہ اللہ تعالیٰ کے یہاں انتہائی قابلِ گرفت ہے۔ چنانچہ نہایت زوردار الفاظ میں فرمایا کہ جو لوگ بھی اس رویئے کے مرتکب ہوئے ہیں ہم ان سے ضرور پوچھیں گے۔ اور انھوں نے جو کچھ بھی اللہ تعالیٰ کے احکام کے استخفاف میں حرکتیں کی ہیں وہ اللہ تعالیٰ سے مخفی نہیں۔ ہم ایک ایک حرکت کا حساب لیں گے اور اس پر انھیں سزا دیں گے۔

ہم یہ کہتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتے ہیں کہ اہلِ کتاب کا زمانہ تو بہت مدت ہوئی گزر گیا، آج ہر آنے والا دن اس امت کو پکار پکار کر کہہ رہا ہے:

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے

گزشتہ ڈیڑھ ہزار سال سے قیامت تک یہ امت جوابدہی کے کٹہرے میں کھڑی ہے۔ ہر دور کے مسلمانوں کو اپنے متعلق یہ دیکھنا ہوگا کہ کیا ہم اللہ تعالیٰ کی شریعت کے احکام کو ملک کا آئین وقانون بنا کر نافذ کر چکے ہیں یا نہیں اور اگر ہمارا رویہ بھی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل، نماز روزے سے متعلق احکام کی تعمیل سے آگے نہیں بڑھتی تو پھر ہم اللہ تعالیٰ کو کیا منہ دکھائیں گے اور اس کے سامنے کیسے جوابدہی کر سکیں گے۔

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿٩٤﴾ (سورة الحجر : ۹۴)

(آپ کھول کر بیان کیجئے اس کو جس کا آپ کو حکم دیا گیا ہے اور مشرکوں سے منہ پھیر لیجئے۔ ۹۴)

تبلیغ میں تیزی اور صراحت پیدا کرنے کا حکم

فَاصْدَعْ صدع سے ہے۔ اس کا معنی ہوتا ہے چیرنا۔ تو فَاصْدَعْ کا معنی ہے کھول کر، آشکارہ کر کے، اعلان کر کے بیان کیجئے۔ آنحضرت ﷺ کو حکم دیا جا رہا ہے کہ آپ چونکہ نذیرِ مبین بن کے آئے ہیں۔ اس لیے آپ ان کی ساری مخالفتوں کے باوجود اللہ تعالیٰ کے دین کو کھول کھول کر بیان کیجئے۔ ان کی مخالفتوں کو خاطر میں نہ لایئے۔ یہ مکے کے مشرک جو منصوبہ بندیاں کر رہے ہیں انھیں کرنے دیجئے۔ آپ ان سے اعراض کیجئے اور یکسر لاتعلق ہو جایئے کیونکہ اب دھیمے لہجے میں تبلیغ کرنے کا وقت گزر گیا۔ دلائل و براہین سے آپ اپنی بات کو پوری طرح واضح کر چکے اب تو انھیں آخری تنبیہ کی ضرورت ہے۔ اس لیے آپ پوری طرح اس تنبیہ کو واشگاف انداز میں ان کے کانوں تک پہنچا دیجئے۔

اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ ﴿٩٥﴾ الَّذِيْنَ يَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿٩٦﴾

(ہم کافی ہیں آپ کو مذاق اڑانے والوں کے شر سے بچانے کیلئے۔ ۹۵) جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسرے معبود شریک کرتے ہیں۔ سو وہ عنقریب جان لیں گے۔ ۹۶) (سورۃ الحجر: ۹۵۔۹۶)

Marfat.com

آنحضرت ﷺ کی حفاظت کا وعدہ

گزشتہ آیتِ کریمہ میں برملا تبلیغ کرنے اور اللہ تعالیٰ کے دین کی دعوت کو ہر کس و ناکس ہر چھوٹی بڑی مجلس اور ہر رئیس کے دربار تک پہنچانے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ تبلیغ و دعوت کے کام میں کچھ مزید تیزی اور مزید جرأت و جسارت پیدا کرنے کی ہدایت دی جارہی ہے جبکہ اس سے پہلے کی تبلیغ کا نتیجہ مسلمانوں کیلیے نا قابل برداشت ہوتا جارہا تھا اور مخالفین اس دعوت کو کچل دینے کے منصوبے باندھ رہے تھے اور اب جب اس میں مزید تیزی آئے گی تو یقیناً دوسری طرف سے ردعمل بھی شدید ہوگا۔ پہلے جو لوگ اس دعوت کا مذاق اڑاتے تھے اب نہ جانے وہ کیا کر گزریں۔ اس لیے آنحضرت ﷺ کو بطور خاص تسلی دیتے ہوئے فرمایا جارہا ہے کہ آپ اس بات کی پرواہ نہ کریں کہ مخالفین آپ کے ساتھ کیا سلوک کریں گے اور یا وہ آپ کو کیا سے کیا نقصان پہنچا دیں گے۔ تمسخر کی حد تک ہم برداشت کرتے رہے ہیں، اب اگر ان تمسخر کرنے والوں نے قدم آگے بڑھایا تو وہ قدم کاٹ دیا جائے گا۔ آپ کو اپنی مدافعت خود کرنے کی ضرورت نہیں، یہ ذمہ داری ہماری ہے اور ہم اس کو ادا کریں گے۔ آپ کو جس بات کی سزا دی جارہی ہے وہ صرف یہ ہے کہ آپ توحید کی دعوت کیوں دیتے ہیں اور ایک اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کو ضروری کیوں قرار دیتے ہیں اور ان کے مصنوعی شرکاء کو قبول کرنے کیلیے کیوں تیار نہیں۔ اس صورت میں ہمارے لیے تو اور بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم آپ کا تحفظ کریں کیونکہ آپ کو ہماری وجہ سے یہ سارے مصائب برداشت کرنا پڑ رہے ہیں اور مزید یہ بات بھی کہ مشرکین جو نہ جانے کس کس کو الٰہ بنا چکے ہیں، وہ اپنے شرک کی حفاظت اور اپنے مزعومہ شرکاء کی عزت کے بچاؤ کیلیے آپ کے درپے آزار ہیں تو ہمارے لیے بھی لازم ہے کہ ہم اپنے پیغمبر کی عزت و حرمت کی حفاظت کیلیے ان لوگوں کو سبق سکھائیں۔ چنانچہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جب بھی کسی کافر نے زبانی ایذا دہی سے آگے بڑھ کر آپؐ پر حملہ کیا اور آپؐ کی جان لینے کی کوشش کی تو فرشتوں نے آپؐ کی حفاظت کی۔ ابوجہل نے جب ایک دفعہ آپؐ کے سر کچلنے کی قسم کھائی کہ اگر محمد (ﷺ) نے آج کے بعد میرے سامنے سجدہ کیا تو میں فلاں فلاں بت کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں اس کا سر کچل دوں گا۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ صحنِ حرم میں نماز پڑھتے ہوئے جب سجدے میں گئے تو وہ ملعون جلدی سے پتھر اٹھا کر آپ کے سر پر مارنے کیلیے بڑھا لیکن پھر فوراً ہی پتھر اس کے ہاتھ سے گر گیا اور وہ دونوں ہاتھ مارتا ہوا جیسے اپنے آپ کو کسی چیز سے بچا رہا ہو چیختا ہوا پیچھے ہٹا۔ جب اشرافِ قریش نے پوچھا کہ تمہیں کیا ہوا؟ تو اس نے بتایا کہ میں جیسے ہی محمد (ﷺ) کے قریب پہنچا تو میں نے محسوس کیا کہ کچھ برچھے میری طرف بڑھ رہے ہیں، آگ زبانیں نکالے میری طرف آرہی ہے اور کوئی اونٹ ہے جو مجھے نگل جانا چاہتا ہے۔ اگر میں فوراً پیچھے نہ ہٹتا تو نہ جانے میرے ساتھ کیا ہو جاتا۔ جب آنحضرت ﷺ سے اس بارے میں پوچھا گیا تو آپؐ نے فرمایا کہ وہ فرشتے تھے جو میری حفاظت کرتے ہیں۔ اگر وہ ایک قدم بھی آگے بڑھتا تو اس کے پرزے اڑا دیے جاتے۔

آنحضرت ﷺ کو تسلی دینے کے بعد فرمایا گیا ہے کہ آپؐ ان کی طرف سے بالکل یکسو رہیں، یہ آپؐ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، البتہ ان کے ساتھ جو گزرنے والی ہے ابھی اس کے بتانے کا وقت نہیں آیا، یہ عنقریب خود جان لیں گے کہ ان کا انجام کیا ہوتا ہے۔ چنانچہ وقت نے زیادہ دیر انتظار نہیں کرایا۔ ہجرت کے آٹھویں سال مکہ فتح ہو گیا اور اس سے پہلے ہجرت کے دوسرے سال ہی جنگ بدر میں ان کے بڑے بڑے سردار مارے گئے اور جو باقی بچ گئے ان میں بیشتر فتح مکہ کے بعد مسلمان ہو گئے اور چند ایک ملک سے بھاگ گئے۔

وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ ﴿۹۷﴾ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۹۸﴾ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ﴿۹۹﴾ (سورة الحجر: ۹۷، ۹۸، ۹۹)

(اور ہم خوب جانتے ہیں کہ آپ کا دل تنگ ہوتا ہے ان باتوں سے جو کچھ وہ کہتے ہیں ۹۷) تو آپؐ اپنے رب کی اس کی حمد کے ساتھ تسبیح کریں اور سجدہ کرنے والوں میں سے ہو جائیں۔ ۹۸) اور اپنے رب کی عبادت میں لگے رہیں یہاں تک کہ آپؐ کے پاس یقین آجائے۔ ۹۹)

Marfat.com

کفار کی بدگوئی کے مقابلہ میں تسبیح تحمید اور نماز کا حکم

آنحضرت ﷺ جب مشرکین کو اللہ تعالیٰ کے دین کی طرف بلاتے اور اس کی توحید کی دعوت دیتے تو وہ آپ ؐ کی مخالفت میں جو منہ میں آتا کہہ گزرتے۔ اپنے بتوں کی حمایت میں اللہ تعالیٰ کی شان میں بھی گستاخی کرتے اور دین کے بنیادی عقائد کے بارے میں عجیب وغریب ہفوات بکتے۔ آنحضرت ﷺ کو اس سے حد درجہ تکلیف ہوتی۔ آپ ؐ کا سینہ صدمے سے بھر جاتا۔ چنانچہ اس صدمے کی شدت سے نکلنے اور دل کے اطمینان کیلیے آپ ؐ کو تدبیر بتائی جا رہی ہے کہ وہ جیسے ہی آپ کا دل دکھانے کی باتیں کریں آپ اس ذات بابرکات کی حمد وثنا کی تسبیح میں لگ جائیں جس کا نام دلوں کیلیے باعثِ سکون اور جس کی یاد دکھی دلوں کا مرہم ہے۔ اس بات کا سمجھنا کچھ مشکل نہیں کہ جب طبیعت پر ایسے خیالات کا ہجوم ہو جو طبیعت کو اچاٹ کر دینے والے اور دل کو زخمی کر دینے والے ہوں تو پھر دل کو محبوب کی یاد میں مصروف کر دینا چاہیے کیونکہ محبوب کی یاد اور محبوب کا وصل ایک ایسا نشہ ہے جس کے سامنے زندگی کا کوئی خیال یا دکھ ٹھہر نہیں سکتا اور اللہ تعالیٰ کے رسول ؐ کا سب سے عظیم محبوب اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا کوئی نہیں ہوتا۔ اس لیے حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ میں دنیا میں اگر کسی کو خلیل بناتا تو ابوبکرؓ کو بناتا، لیکن میرا خلیل صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ ایسے تکلیف دہ مراحل میں اللہ تعالیٰ کا ذکر اور اس کی یاد ہی کام آ سکتی ہے۔ اسی لیے حدیث میں آتا ہے کہ جب کبھی آپ ؐ غمگین ہوتے تو آپ حضرت بلالؓ سے فرماتے اَرِحْنِیْ یَا بِلَالُ. اے بلالؓ مجھے آرام پہنچاؤ۔ بلالؓ کہتے حضور ؐ کیسے آرام پہنچاؤں۔ آپ ؐ فرماتے، آذان کہو، تاکہ نماز پڑھوں، کیونکہ میرے دل کی راحت نماز میں ہے۔ شاید اس لیے فرمایا گیا کہ آپ نہ صرف کہ خود نماز کی طرف متوجہ ہوں بلکہ اپنے خادموں کے ساتھ نماز کا اہتمام فرمائیں تاکہ جب ادھر سے راحت واطمینان کی شبنم برسے تو آپ کے خادم بھی اس سے محروم نہ رہیں۔ مزید فرمایا کہ آپ بندگی اور عبادت اس وقت تک جاری رکھیں جب تک کہ یقین کا وقت نہیں آ جاتا، یعنی جب تک آنکھوں میں نم یا روشنی ہے اور نبض میں جنبش ہے، اس وقت تک اللہ تعالیٰ کی یاد جاری رہنی چاہیے کیونکہ اللہ والوں کی تو حقیقی زندگی یہی ہے اور موت اسی صورت میں آنی چاہیے کہ دل میں اللہ تعالیٰ سے ملنے کا شوق اور زبان پر اس کی رفاقت کا تذکرہ ہو۔ یہ اس صورت میں ہے جب یقین کا معنی موت کیا جائے۔ لیکن بعض اہلِ علم نے یقین سے مراد وہ وقت لیا ہے جب اسلام کو غلبۂ عمومی ملے گا، مکہ فتح ہو جائے گا اور کفر اور شرک کی قوتیں آنحضرت ﷺ کے سامنے ہاتھ باندھیں کھڑی ہوں گی اور لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ آنحضرت ﷺ نے جن جن باتوں کی خبر دی تھی ان میں سے ایک ایک بات حقیقت کے روپ میں جلوہ گر ہو کر لوگوں کے سامنے کھڑی ہے۔

صدق اللہ العظیم

Marfat.com

Marfat.com

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْآ اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ

کیا ایمان والوں کے لیے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

هُدًى لِّلنَّاس

سُوْرَةُ النَّحْلِ

Marfat.com

Marfat.com

تعارف

سُوْرَةُ النَّحْلِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سورت کا نام

اس سورت کا نام النحل ہے اور یہ آپ جانتے ہیں کہ یہ محض سورت کی شناخت کے لیے ہے، اس کے مضامین کا عنوان نہیں۔ اس سورت کی آیت نمبر 68 میں النحل کا لفظ استعمال ہوا ہے اور یہ نام اسی سے ماخوذ ہے۔ اس کی آیات کی تعداد 128، کلمات کی تعداد 2840 اور حروف کی تعداد 7707 ہے۔

زمانۂ نزول

یہ سورت بھی مکی سورتوں میں سے ہے یعنی ہجرت سے پہلے مکہ معظمہ میں نازل ہوئی ہے لیکن اس کے اندر ایسی اندرونی شہادتیں موجود ہیں جس سے اس کے زمانۂ نزول پر روشنی پڑتی ہے۔ مثلاً اس کی آیت نمبر 41 میں ان لوگوں کے بیرون مکہ ہجرت کرنے کا ذکر ہے جو اہل مکہ کے مظالم سے زار و نزار تھے اور جن کی قوتِ برداشت جواب دیتی جا رہی تھی، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورت اس زمانے میں نازل ہوئی ہے جبکہ اہلِ مکہ اور قریش کی جانب سے مسلمانوں کے لیے ایذا رسانی کی بھٹیاں پوری طرح جوش کھا رہی تھیں۔

آیت نمبر 106 میں یہ بحث اٹھائی گئی ہے کہ اگر کوئی شخص مظالم کی شدت کے باعث زبان سے کلمۂ کفر کہہ اٹھے لیکن اس کا دل ایمان پر پوری طرح قائم ہو، ایسے شخص کے بارے میں اسلام کیا حکم دیتا ہے؟ یہ گویا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بعض مسلمان اس صورتحال سے دوچار کر دیے گئے تھے۔ جب ان پر مسلط کیا جانے والا عذاب ناقابلِ برداشت حد کو چھونے لگتا تو عذاب اور تکلیف پہنچانے والے ان سے یہ کہتے کہ تم زبان سے کلمۂ کفر کہو یا آنحضرت ﷺ کی شان میں گستاخی کرو تو ہم تمہیں چھوڑ دیں گے۔ چنانچہ بعض دفعہ ایسا ہوا کہ بعض مضبوط ایمان والے مسلمان بھی انتہائی دکھ سے جان بچانے کے لیے کوئی نہ کوئی کلمہ کہہ بیٹھتے اور اس کے بعد انہیں شدید صدمہ ہوتا کہ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ اب ہمارا ایمان سلامت رہا ہے یا نہیں۔ اس سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اس سورت کا نزول اس وقت ہوا ہے جب مسلمان جو ایمان کا حقیقی نمونہ تھے انتہائی مظالم کے باعث ایسی ناگفتہ بہ صورتحال سے دوچار تھے۔

اس سورت کی آیات 112 اور 114 سے مترشح ہوتا ہے کہ قریش نے جب آنحضرت ﷺ کی مخالفت میں شدت اختیار کی اور دلائل کا جواب ظلم کی زبان میں دیا جانے لگا تو اللہ تعالیٰ نے قریش کو تنبیہ کرنے اور ان کی اکڑی ہوئی گردنوں کو خم کرنے کے لیے ان پر قحط نازل کیا۔ آسمان سے سورج آگ برسانے لگا اور بادل کا کوئی آوارہ ٹکڑا دور دور تک دکھائی نہ دیتا تھا۔ قحط کی شدت جب حد سے بڑھی تو عام لوگ بلبلا اٹھے۔ آنحضرت ﷺ سے التجا کی گئی کہ آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ یہ تکلیف ہم سے دور کر دے، ہم ان شاء اللہ آپ کی دعوت پر ہمدردانہ غور کریں گے۔ چنانچہ ان آیات

Marfat.com

سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا پر قحط کی شدت کو دور کر دیا، لیکن قریشِ مکہ کا رویہ بہتر ہونے کی بجائے اور زیادہ بگڑ گیا اور انھوں نے مسلمانوں پر اپنے غضب و ایذا دہی میں اور اضافہ کر دیا۔ یہ واقعہ مکے کے دعوتی دور کے آخری زمانے کا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سورت کا نزول قیامِ مکہ کے آخری سالوں میں ہوا ہے۔ اور ان شہادتوں سے فی الواقع اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

مرکزی مضمون

مکی سورتوں کا بنیادی موضوع مسلسل یہ رہا ہے کہ اہلِ دنیا نے اپنی اور کائنات کی زندگی کے بارے میں جو تصورات قائم کر رکھے ہیں وہ بنیادی طور پر ان کی تباہی کا باعث ہیں۔ اس سے بہیمیت میں اضافہ ہوتا ہے لیکن انسانی اقدار ایک ایک کر کے تباہ ہو جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا پیغمبر ان کے لیے ایسے نظریات اور احکام کا ایسا مجموعہ لے کے آتا ہے جس میں ان کی دنیوی اور اخری فلاح مضمر ہوتی ہے۔ اہلِ دنیا کے ان نظریات کو قبول نہ کرنے کے باعث حق و باطل کا معرکہ گرم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جیسے جیسے اس کی شدت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، ویسے ویسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اہلِ حق کی کامیابیوں اور کامرانیوں کے مژدے سنائے جاتے ہیں اور اہلِ باطل کو وارننگ دی جاتی ہے اور اہلِ حق کو یقین دلایا جاتا ہے کہ آخری فتح حق کی ہوگی اور باطل ہزیمت کا شکار ہوگا۔ چنانچہ اس سورت میں بھی اسی موضوع کو عمود اور مرکز کی حیثیت حاصل ہے۔ رہے دیگر مضامین اور موضوعات تو وہ تمام مکی سورتوں کے آپس میں ملتے جلتے ہیں۔ وہ اساسی تصورات جن پر ایک مومن کی پوری فکری اور عملی زندگی استوار ہوتی ہے انھیں کو پیرایہ بیان بدل بدل کر اور متنوع اسالیب کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ان کا تفصیلی بیان آیات کی تفسیر و وضاحت میں ان شاء اللہ تعالیٰ ہم اگلے صفحات میں پڑھیں گے۔

Marfat.com

آيَاتُهَا ١٢٨	سُوْرَةُ النَّحْلِ مَكِّيَّةٌ	رُكُوْعَاتُهَا ١٦

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَتٰۤى اَمْرُ اللّٰهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ١
يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖۤ
اَنْ اَنْذِرُوْۤا اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاتَّقُوْنِ ٢ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ٣ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ
نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ٤ وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا ۚ لَكُمْ
فِيْهَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ٥ وَلَكُمْ فِيْهَا جَمَالٌ حِيْنَ
تُرِيْحُوْنَ وَحِيْنَ تَسْرَحُوْنَ ۪ ٦ وَتَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ اِلٰى بَلَدٍ لَّمْ
تَكُوْنُوْا بٰلِغِيْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ ؕ اِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۙ ٧
وَّالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيْرَ لِتَرْكَبُوْهَا وَزِيْنَةً ؕ وَيَخْلُقُ مَا
لَا تَعْلَمُوْنَ ٨ وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ وَمِنْهَا جَآئِرٌ ؕ وَلَوْ شَآءَ
لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ ٩

Marfat.com

رکوع: ۱ (امرِالٰہی صادر ہو چکا ہے، پس اس کے لیے عجلت نہ کرو، وہ پاک ہے اور برتر ہے اس شرک سے جو وہ کر رہے ہیں۔ ۱) وہ اتارتا ہے فرشتوں کو روح دے کر اپنے حکم سے اپنے بندوں میں سے جن پر چاہتا ہے، اس ہدایت کے ساتھ کہ لوگوں کو آگاہ کر دو کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، پس تم مجھ ہی سے ڈرو۔ ۲) اس نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا فرمایا، وہ برتر ہے ان چیزوں سے جن کو یہ اس کا شریک گردانتے ہیں۔ ۳) اس نے انسان کو ایک ذراسی بوند سے پیدا کیا اور وہ دیکھتے دیکھتے ایک کھلا ہوا حریف بن کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ۴) اور چوپائے بھی اس نے تمھارے لیے پیدا کیے جن میں تمھارے لیے پوشاک بھی ہے اور خوراک بھی اور ان سے تم غذا بھی حاصل کرتے ہو۔ ۵) ان میں تمھارے لیے جمال ہے جبکہ تم ان کو شام کو گھر واپس لاتے ہو اور جس وقت کہ ان کے چرنے کو چھوڑتے ہو۔ ۶) اور وہ تمھارے بوجھ ایسے جگھوں پر پہنچاتے ہیں جہاں تم شدید مشقت کے بغیر پہنچنے والے نہیں بن سکتے، بیشک تمھارا رب بڑا ہی شفیق اور مہربان ہے۔ ۷) اور (اسی نے پیدا کیے) گھوڑے اور خچر اور گدھے تاکہ تم ان پر سوار ہو اور وہ زینت بھی ہیں اور وہ ایسی چیزیں بھی پیدا کرتا ہے جن کو تم نہیں جانتے۔ ۸) اور اللہ ہی کے ذمہ ہے سیدھا راستہ بتانا جبکہ راستے ٹیڑھے بھی موجود ہیں اگر وہ چاہتا تو سب کو ہدایت دے دیتا۔ ۹)

اَتٰۤی اَمْرُاللّٰہِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْہُ ؕ سُبْحٰنَہٗ وَتَعٰلٰی عَمَّا یُشْرِکُوْنَ ﴿۱﴾ (سورۃ النحل : ۱)

(امرِالٰہی صادر ہو چکا ہے، پس اس کے لیے عجلت نہ کرو، وہ پاک ہے اور برتر ہے اس شرک سے جو وہ کر رہے ہیں۔ ۱)

عذاب مانگنے والوں کو وعید

گزشتہ سورت میں یہ مضمون بار بار گزرا ہے کہ قریش کی سرکشی کو دیکھ کر نبی کریم ﷺ انھیں ہر ممکن طریقے سے سمجھانے کی کوشش فرماتے اور جب دیکھتے کہ ان کی گردنیں کسی طرح خم نہیں ہو رہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکنے کے لیے بالکل تیار نہیں بلکہ روز بروز وہ اپنی سرکشی اور دین دشمنی میں حدود سے تجاوز کرتے جا رہے ہیں اور کوشش ان کی یہ ہے کہ دعوت اِلی اللہ کے اس کام کو ہر ممکن طریقے سے ناممکن بنا دیا جائے، تو آنحضرت ﷺ نے انھیں آگاہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر تم نے اپنا رویہ نہ بدلا تو سابقہ معذب قوموں کی طرح ایک نہ ایک روز تم بھی اللہ تعالیٰ کے عذاب کا شکار ہو کے رہو گے۔ اتنی بڑی تنبیہ کے بعد ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ان پر ایک خوف طاری ہوتا اور وہ اپنے انجام کے بارے میں فکرمند ہوتے لیکن انھوں نے اس کے بالکل برعکس اس عذاب کو ایک مذاق بنا کے رکھ دیا۔ بار بار آنحضرت ﷺ سے پوچھتے کہ اگر قوموں کے انکار اور ان کی حد سے بڑھی ہوئی سرکشی کی وجہ سے خدا کا عذاب آتا ہے تو پھر ہم پر عذاب آنے میں تاخیر کیوں ہے۔ ہم تو کسی قیمت پر بھی تم پر ایمان لانے کے لیے تیار نہیں بلکہ ہم مقدور بھر تمھاری دعوت کو ناکام کرنے کے لیے اپنی مساعی جاری رکھے ہوئے ہیں۔ چنانچہ ان کے اس رویے کا جواب دیتے ہوئے پروردگار نے اس سورت کا آغاز ہی اس حوالے سے فرمایا ہے۔ بغیر کسی تمہید کے فرمایا کہ تم عذاب مانگتے ہو، عذاب تو اپنے وقت پر آئے گا اور اس وقت کو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے لیکن اس بات کو یقینی سمجھو کہ اس کے لیے اللہ تعالیٰ کا حکم صادر ہو چکا ہے۔ اس لیے بجائے اس کے کہ اسے مستقبل کے انداز میں ذکر کیا جاتا۔ ''اَتٰی'' فعل ماضی کی صورت میں لایا گیا ہے کہ اس حکم کا وقوع پذیر ہونا ایسا یقینی ہے کہ گویا کہ یہ حکم ماضی میں نافذ ہو چکا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہاں عذاب کا لفظ لانے کی بجائے ''امر'' کا لفظ لایا گیا ہے۔ امر سے مراد کیا ہے؟ معلوم یہ ہوتا ہے کہ یہ اس پراسس کی طرف اشارہ ہے جس کے نتیجے میں کسی قوم کے اوپر اللہ تعالیٰ کا عذاب آتا ہے۔ پراسس یہ ہے کہ جب کوئی قوم اللہ تعالیٰ کے رسول کی دعوت کو قبول کرنے سے انکار کرتی ہے تو پیغمبر اپنی تمام ممکن صلاحیتوں سے انھیں سمجھانے کی کوشش کرتا ہے لیکن جب ان کی مخالفت اندھی دشمنی میں تبدیل ہو جاتی ہے اور وہ پیغمبر کے قتل کے منصوبے باندھنے لگتے ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کو ہجرت کا حکم دیتا ہے۔ چنانچہ پیغمبر اور اس پر ایمان لانے والے اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت سے محفوظ جگہ پر پہنچا دیے

Marfat.com

جاتے ہیں اور اس کے بعد مخالفین کو دو طرح کی صورتحال سے سابقہ پیش آتا ہے۔ کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب آجاتا ہے۔ اس کے غیبی لشکر اس قوم پر حملہ آور ہوتے ہیں اور اس کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیتے ہیں اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ہجرت کرنے والے پیغمبر اور اس کے متبعین کو اللہ تعالیٰ ایسی قوت عطا فرماتے ہیں کہ وہ مخالفین کے مقابلے میں اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور ان سے دو دو رہ کر اپنے آپ کو روز بروز مضبوط سے مضبوط تر کرتے چلے جاتے ہیں تا آنکہ ایک وقت آتا ہے کہ ان مسلمانوں کے ہاتھوں ان دین کے دشمنوں کو تہہ تیغ کروایا جاتا ہے اور ایسا عموماً اس وقت ہوتا ہے جب مسلمانوں میں قبولیتِ حق کا سلسلہ بالکل مردہ نہیں ہونے پاتا۔ رسول اللہ ﷺ کو جب ہجرت کا حکم دیا گیا تو بظاہر یوں محسوس ہوتا تھا کہ مکے کا ذرہ ذرہ آپؐ کی دشمنی پر تلا ہوا ہے اور اہلِ مکہ نے آپؐ کے قتل کے تمام انتظامات مکمل کر لیے ہیں لیکن حقیقت میں اندر ہی اندر خفیہ طور پر دین کی قبولیت کا سلسلہ جاری تھا۔ حدیبیہ کے موقع پر حضرت ابو جندلؓ کا حالتِ اسلام میں اچانک مسلمانوں کے سامنے آجانا بجائے خود اس بات کی دلیل تھا کہ مکے کے اندر دعوت و تبلیغ اور قبولیتِ اسلام کا سلسلہ جاری ہے اور پھر جب آنحضرت ﷺ کی ذاتی اپیل پر بھی حضرت ابو جندلؓ کے والد نے بیٹے کو چھوڑ کر جانے سے انکار کر دیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند مہینوں کے بعد جب حضرت ابو بصیرؓ ساحلِ سمندر پر ٹھکانہ بنانے میں کامیاب ہو گئے تو حضرت ابو جندلؓ بھی چھپتے چھپاتے ان کے پاس جا پہنچے اور مکے کے جو لوگ در پردہ ایمان لا کر اپنے اہلِ خانہ کے مظالم کا شکار ہو رہے تھے وہ خفیہ طور پر آہستہ آہستہ ساحلِ سمندر پر پہنچنے میں کامیاب ہو گئے اور وہاں ٹھہر کر انھوں نے قریش کے تجارتی قافلوں پر حملے کرنے شروع کر دیے۔ قریش نے جب یہ دیکھا کہ 70 کے قریب سر پھرے نوجوان جو کسی نظم کے پابند نہیں اور ایسی جگہ قبضہ کر چکے ہیں جہاں وہ کسی وقت بھی نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ انھوں نے آنحضرت ﷺ سے درخواست کی ہم اپنے معاہدے کی وہ شق واپس لیتے ہیں جس میں کسی نو مسلم کو مدینہ طیبہ میں روکا نہیں جا سکتا بلکہ واپس کرنا ضروری ہے۔ آپ براہ کرم ان نوجوانوں کو مدینہ بلا لیجیے تاکہ ہمارے تجارتی راستے کھل سکیں۔

اگر دوسری قوموں کی طرح اہلِ مکہ پر عذاب آجاتا تو وہ تمام لوگ جو در پردہ ایمان لا چکے تھے جن میں آنحضرت ﷺ کے محترم چچا کا گھرانہ بھی شامل تھا، سب عذاب کا شکار ہو جاتے۔ اللہ تعالیٰ چونکہ چھپی باتوں کا جاننے والا ہے اس لیے اس نے مکمل عذاب بھیجنے کی بجائے مسلمانوں کے ہاتھوں ان لوگوں کو قتل کرانے کا انتظام کیا جو اسلام کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ تھے۔ یہ بھی عذاب ہی کی ایک صورت تھی، لیکن اس عذاب کو چونکہ دھیرے دھیرے آنا تھا تاکہ نو مسلموں کو اپنے حالات بہتر بنانے کا موقع ملتا رہے۔ یعنی اسلام کا قافلہ بھی بڑھتا رہے اور اسلام کے معاندین اپنے انجام کو بھی پہنچتے رہیں۔ چنانچہ ان کو پہلا جھٹکا جنگ بدر میں لگا جبکہ ان کی پہلی صف 70 افراد کی صورت میں تہہ تیغ کر دی گئی۔ ان کا ہر سر برآوردہ آدمی جو کفر کا ستون سمجھا جاتا تھا اور مسلمانوں کے لیے ایک بڑا چیلنج تھا وہ اس جنگ میں قتل ہو گیا۔ جو بدترین دشمن بچے رہے انھیں 8 ہجری میں فتح مکہ کے بعد چشمِ فلک نے اس حال میں دیکھا کہ وہ آنحضرت ﷺ کے سامنے کھڑے زندگی کی بھیک مانگ رہے تھے۔ یہ ہے وہ اللہ تعالیٰ کا حکم جس کا آغاز ہجرت سے ہوا اور چند ہی سالوں میں وہ اپنے فطری انجام کو پہنچ گیا۔ قوموں کی تاریخ میں 8 سال کا عرصہ نہایت ناقابلِ ذکر ہوتا ہے۔ کسی بھی مظلوم اور بے بس قوم کے لیے 8 سالوں میں اتنی طاقت حاصل کر لینا کہ وقت کے طاغوتوں کو شکست دے سکے اور ساڑھے 12 لاکھ مربع میل علاقے میں نہ صرف اللہ تعالیٰ کا دین بلند ہو بلکہ دورِ جاہلیت کا لادینی نظام مکمل طور پر ختم کر دیا جائے۔ اسباب کی دنیا میں اتنی محدود مدت میں اتنا بڑا انقلاب کبھی برپا نہیں ہوا۔ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کا امر تھا جسے بہر حال ہو کے رہنا تھا۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

آیتِ کریمہ کے دوسرے حصے سے ایک غلط فہمی کا ازالہ کیا جا رہا ہے۔ انھیں غلط فہمی یہ تھی کہ اسلام بڑے شد و مد سے شرک کی تردید کرتا ہے اور شرک کو ایک ایسی آلودگی قرار دیتا ہے جس میں آلودہ رہ کر کوئی آدمی جنت میں داخل نہیں ہو سکتا بلکہ یہ ایک ایسا آتش گیر مادہ ہے جس سے جہنم کی آگ دہکائی جائے گی۔ اور مزید فرمایا کہ دنیا میں شرک کی ہر نشانی کو مٹا دینے کے لیے رسول آتے رہے ہیں اور اس آخری رسول کی دعوت کا بھی اصل ہدف یہی نکتہ ہے لیکن تعجب کی بات ہے کہ ہم تو سرتاپا شرک میں دھنسے ہوئے ہیں اور توحید پر مبنی دعوت کو ہم کسی قیمت پر پنپنے کا موقع نہیں

Marfat.com

دے رہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ ہم پر اللہ تعالیٰ کا عذاب نہیں آتا۔ اس کا تو بدیہی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ شرک ایک حقیقت ہے، توحید محض ایک واہمہ ہے اور پیغمبر کی دعوت کی کوئی حقیقت نہیں۔ اس کے دعوے بے بنیاد ہیں۔ قرآنِ کریم اس غلط فہمی کے ازالے کے لیے فرما رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے پاک ہے کہ اس کا کسی کو شریک ٹھہرایا جائے۔ وہ ہر طرح اور ہر قسم کے شرک سے مبرا اور بلند ہے۔ تمہارے شرک میں ملوث ہونے کے باوجود جواب تک عذاب نہیں آیا تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ شرک اللہ تعالیٰ کو پسند ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ابھی تک اللہ تعالیٰ کے حکم کے بروئے کار آنے کا وقت نہیں آیا۔ وہ چونکہ اپنے بندوں کو پوری طرح سنبھلنے کا موقع دیتا ہے اور جب تک ان میں سمجھ بوجھ کی کچھ رمق باقی ہوتی ہے، اس وقت تک وہ عذاب نازل کرنے کی بجائے مہلت پر مہلت دیتا چلا جاتا ہے۔ چنانچہ تم بھی اسی مہلت کے دورانیے سے گزر رہے ہو۔ جلدی مت مچاؤ، اللہ تعالیٰ کے فیصلے اس کی مشیت اور حکمت کے مطابق ہوتے ہیں، بس اس کا انتظار کرو۔

يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ اَنْ اَنْذِرُوْٓا اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاتَّقُوْنِ ۝٢

(وہ اتارتا ہے فرشتوں کو روح دے کر اپنے حکم سے اپنے بندوں میں سے جن پر چاہتا ہے، اس ہدایت کے ساتھ کہ لوگوں کو آگاہ کردو کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، پس تم مجھ ہی سے ڈرو۔ ۲) (سورۃ النحل: ۲)

روح کا مفہوم

اس آیتِ کریمہ میں روح کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ روح سے مراد وحیِ الٰہی ہے۔ اور اسے روح کا نام شاید اس لیے دیا گیا ہے کہ جس طرح روح سے ہر جاندار زندہ اور طاقتور ہے اور اپنی زندگی کے معمولات انجام دیتا ہے، اسی طرح روحانی اور اخلاقی زندگی کے لیے بھی ایک روح کی ضرورت ہے جو اسے زندگی اور توانائی مہیا کرتی رہے اور وہ روح اللہ تعالیٰ کی طرف سے اترنے والی وحی ہے جس کی روشنی میں انسان زندگی کا سفر کرتا ہے اور تاریکیوں میں ٹاک ٹوئیاں مارنے کی بجائے زندگی کے معمولات کو اس طرح انجام دیتا ہے جیسے روشنی میں چلنے والا ہر قدم دیکھ بھال کے رکھتا ہے۔ وہ ہر راستے کو پہچانتا ہے اور ہر سنگِ میل سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ وحیِ الٰہی سے سرشار آدمی نہ اپنی ذات کی خود فراموشیوں میں کھوتا ہے اور نہ گردوپیش کی دلفریبیوں میں ڈوب جاتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی صلاحیتوں سے بھی وحی کی ہدایت کے مطابق فائدہ اٹھاتا ہے اور اپنے جذبات اور توانائیوں کو ان حدود میں محدود رکھتا ہے جس کی طرف وحیِ الٰہی رہنمائی کرتی ہے۔ دوسرے انسانوں سے اس کے معاملات اور دوسری ہر مخلوق سے اس کا رویہ وحیِ الٰہی کی رہنمائی میں متعین ہوتا ہے اس لیے اس میں نہ الجھن ہوتی ہے اور نہ کوئی اڑچن پیش آتی ہے۔ زندگی کسی صحرا میں گم ہونے کی بجائے کسی دبستان میں مسکراتی اور اپنا فرض انجام دینے لگتی ہے۔

ایک اعتراض کا جواب

اس آیتِ کریمہ میں مشرکینِ مکہ کے ایک اعتراض کا جواب بھی ہے۔ مشرکین بڑی بلند آہنگی کے ساتھ آنحضرت ﷺ پر یہ اعتراض کرتے تھے کہ نبوت ایک بہت بڑا اعزاز ہے جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس کے کسی بندے کو عطا ہوتا ہے۔ اولاً تو ہونا یہ چاہیے کہ یہ اعزاز کسی انسان کو نہیں بلکہ فرشتوں جیسی کسی معصوم مخلوق کو دیا جاتا لیکن اگر انسان ہی کو یہ خلعت پہنانا تھا تو پھر کیا اس کے لیے محمد (ﷺ) ہی باقی رہ گئے تھے جو نہ کسی قبیلے کے سردار ہیں اور نہ مال و دولت کے حوالے سے کوئی خاص شہرت رکھتے ہیں۔ یتیمی کا داغ لے کر پیدا ہوئے اور نہایت کسمپرسی میں زندگی گزاری۔ اگر یہ اعزاز کسی کو دینا ہی تھا تو کیا طائف اور مکے کے سردار اس کا زیادہ حق نہ رکھتے تھے۔ اس کے جواب میں فرمایا جا رہا ہے کہ نبوت ایک اعزاز بھی ہے اور ایک ذمہ داری بھی۔ لیکن یہ کسے ملنی چاہیے، اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اسے خوب معلوم ہے کہ کس کے اندر اس نے اس کٹھن ذمہ داری کے تحمل کی صلاحیت رکھی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات جو اپنے علمِ محیط اور قدرتِ کاملہ کے باعث کسی کے مشورے کی محتاج نہیں۔ نبوت جیسے نازک کام کے لیے

Marfat.com

دنیوی آلودگیوں میں پلنے والی مخلوق کا رآمد نہیں ہوسکتی، اس کے لیے وہ پاکیزہ روح، وہ معصوم فطرت، وہ خواہشوں سے مغلوب نہ ہونے والی عقل، وہ بلند اخلاق، وہ بے پایاں قوتِ پرواز درکار ہے جو صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوتی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے جس کو بھی نبوت دی ہے پہلے اس کے اندر سیرت و کردار کے یہ ہیرے کوٹ کوٹ کے بھرے ہیں۔ اس لیے تمہارا اس حوالے سے یہ خلطِ مبحث کوئی معنی نہیں رکھتا۔

مشرکینِ مکہ کبھی ترنگ میں آکر یہ بات بھی کہتے کہ محمد (ﷺ) کہتے ہیں کہ مجھ پر فرشتے اترتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ وہ فرشتے ہمیں نظر کیوں نہیں آتے؟ اور وہ ہم پر کیوں نہیں اترتے؟ اس کے جواب میں فرمایا جارہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے فرشتے یا تو وحیِ الٰہی لے کر اترتے ہیں اور یا عذاب لے کر نازل ہوتے ہیں۔ وحی تو تم پر اترنے سے رہی کیونکہ تم پیغمبر نہیں ہو۔ رہا عذاب تو وہ تو اپنے وقت پر آئے گا۔ اور اللہ تعالیٰ ہی کو منظور ہے وہ وقت کب آئے گا۔ اسے یقیناً فرشتے لے کر اتریں گے، لیکن اس وقت فرشتوں کو دیکھنا تمہارے لیے سودمند نہیں ہوگا، کیونکہ عذاب سے دوچار ہونے والا چیخ و پکار تو سن سکتا ہے، دیکھ کسی چیز کو نہیں سکتا۔

ایک لطیف نکتہ

آیت کے دوسرے حصے میں ایک لطیف نکتے کی طرف اشارہ فرمایا، وہ یہ کہ مشرکینِ مکہ کو نبی کریم ﷺ کی ذاتِ گرامی سے جو عناد پیدا ہوگیا تھا حالانکہ آپ بعثت سے پہلے مکے کی سب سے زیادہ ہردلعزیز شخصیت تھے۔ اس کا سبب صرف یہ تھا کہ آپ انھیں اللہ تعالیٰ کی الوہیت کی دعوت کیوں دعوت کیوں دیتے تھے۔ ہر طرح کے شرک کی تردید کیوں کرتے تھے۔ اس سے چڑ کر وہ بار بار آنحضرت ﷺ سے کسی نہ کسی نشانی دکھانے کا مطالبہ کرتے اور کبھی عذاب کی وعید کا تمسخر اڑاتے۔ چنانچہ یہاں فرمایا جارہا ہے کہ فرشتے ہمیشہ نبیوں پر وحی لے کے اترتے ہیں اور وہ اپنی مرضی سے نہیں اترتے اور نہ انسانوں کے مشورے سے اترتے ہیں بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے اترتے ہیں اور اس پر اترتے ہیں جسے اللہ تعالیٰ نبوت عطا فرماتا ہے۔ لیکن یہ بات یاد رکھو کہ وہ جب بھی کسی نبی پر وحیِ الٰہی لے کر نازل ہوتے ہیں تو انھیں صرف یہ پیغام دیتے ہیں کہ اب آپ کا کام انسانوں کو اللہ تعالیٰ سے ڈرانا اور خبردار کرنا ہے۔ اور یہ بنیادی بات ان کے دل و دماغ میں اتارنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اِلٰہ نہیں، کوئی حاجت روا اور مشکل کشا نہیں، کوئی غیر مشروط اطاعت کا مستحق نہیں، کوئی بے پناہ طاقتوں کا مالک نہیں، وہی سب کا مسجود اور وہی سب کا معبود ہے، اس کے سوا کوئی حاکمِ حقیقی نہیں، اس کے احکام کی بجاآوری سب کے لیے لازمی ہے، اس کا دیا ہوا دستور سب کی زندگی کا دستور ہے۔ تمھیں اسی کی اطاعت کرنی ہے اور اگر اطاعت میں کمی کروگے یا اس کے احکام سے سرتابی کروگے تو یہاں بھی اس کی گرفت آسکتی ہے اور قیامت کے دن تو وہ ایک ایک بات کا حساب لے گا۔ اس لیے ہر رسول اپنی امت سے کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم یہ ہے کہ تمھیں صرف مجھ ہی سے ڈرنا ہے، میرا ہی تقویٰ اختیار کرنا ہے، ظاہر و باطن میری ہی اطاعت کے نور سے منور کرنا ہے۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۳﴾ (سورۃ النحل : ۳)

(اس نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا فرمایا، وہ برتر ہے ان چیزوں سے جن کو یہ اس کا شریک گردانتے ہیں۔ ۳)

اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور سے نہ ڈرنے کی دلیل

گزشتہ آیتِ کریمہ میں پروردگار نے ارشاد فرمایا کہ ہم نے ہر پیغمبر کو یہ حکم دیا کہ وہ لوگوں کو باخبر کردیں کہ اللہ تعالیٰ کا حکم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور سے نہ ڈرا جائے اور اس کے سوا کوئی اور کو اِلٰہ نہ مانا جائے۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں اس کی دلیل بیان فرمائی کہ تم یہ تو مانتے ہو کہ آسمان و زمین کا خالق صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ وہ صرف خالق ہی نہیں بلکہ اس نے ہر چیز کو کسی نہ کسی مقصد اور غایت کے لیے خلق کیا۔ وہ ایک حکیم ذات ہے۔ اس کی حکمت سے یہ بات بعید ہے کہ وہ بے مقصد کسی چیز کی تخلیق کرے۔ اسی طرح اس نے تمہاری تخلیق بھی کی ہے اور تمہاری تخلیق کا مقصد اپنے پیغمبروں اور کتابوں کے ذریعے بار بار واشگاف فرمایا۔ اپنی آخری کتاب میں بھی صاف صاف فرمایا کہ میں نے انسانوں اور جنوں کو اس لیے پیدا کیا تا کہ وہ میری

Marfat.com

بندگی کریں۔ پہلی بات جو اس سے مترشح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ جب میں زمین وآسمان اور تمہارا خالق ہوں تو پھر بجا طور پر مجھے حق پہنچتا ہے کہ میں تم سے اپنی بندگی کراؤں، تم سے اطاعت کا خراج وصول کروں، کیونکہ جو ذات کسی کو وجود دیتی ہے وہی اس سے اطاعت لینے کا حق بھی رکھتی ہے۔اس پر اسے حکم چلانے کا بھی حق مل جاتا ہے۔اسی حق کے پیشِ نظر وہ انسانوں کو حکم دیتا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو اِلٰہ مت مانو اور اسی سے ڈرو تا کہ اس کی معصیت اور نافرمانی نہ کرسکو۔اور دوسری جو بات اس سے خود بخود نکلتی ہے وہ یہ کہ اس نے ہر چیز کو ایک مقصد دے کر پیدا کیا۔انسانوں کا بھی ایک مقصد ہے جیسے میں عرض کر چکا ہوں تو اس کی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ایک دن سب کو اٹھا کھڑا کرے اور اپنے دربار میں بلا کے پوچھے کہ بتاؤ تم نے زندگی میرے احکام کے مطابق گزاری یا اپنی خواہشات کی پیروی میں گزاری، کیونکہ مخلوق کو پیدا کرنا اور پھر اس سے کبھی جواب نہ مانگنا اور زندگی کا حساب نہ لینا اس کا تو صاف مطلب یہ ہے کہ پیدا کرنے والے نے پیدا کر کے ایک عبث کام کیا اور اللہ تعالیٰ جیسی حکیم ذات سے یہ توقع کرنا بجائے خود کفر ہے۔اس لیے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ (۲۳:۱۱۵) کیا تم نے گمان کرلیا ہے کہ ہم نے تمھیں فضول پیدا کیا ہے، اور تم ہماری طرف لوٹائے نہیں جاؤ گے کیونکہ جس تخلیق کے مقاصد کا لحاظ نہ کیا جائے اور اگر وہ مخلوق زندہ اور مکلف ہے تو اس کے اعمال کا حساب نہ لیا جائے اور اسے بالکل نہ پوچھا جائے کہ تو نے خدا کی عطا کردہ نعمتوں کا کیا حق ادا کیا اور زندگی کو کہاں خرچ کیا، جوانی کہاں کھودی، مال کیسے کمایا اور کہاں اڑایا، علم حاصل کیا یا نہیں، اور کیا تو اس کا کیا حق ادا کیا تو پھر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ پیدا کرنے والے نے اسے عبث پیدا کیا۔اس کا پیدا کرنے والا کوئی کھلنڈرا ہے جس نے محض کھیل کود کے لیے اس کی تخلیق کی ہے حالانکہ پروردگار فرماتا ہے وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ہم نے آسمانوں اور زمین کو کھیلتے ہوئے پیدا نہیں فرمایا بلکہ ایک مقصد کے ساتھ پیدا فرمایا۔

آیت کے دوسرے حصے میں فرمایا کہ مشرکینِ عرب عموماً قیامت کے آنے کا یقین نہیں رکھتے۔اس لیے وہ سمجھتے ہیں کہ ہم بھی یہاں مٹی ہو کر ختم ہوجائیں گے اور ہمارے اعمال بھی اور کہیں ان کی باز پرس نہیں ہوگی۔لیکن اگر بفرضِ محال ہمیں اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر ہونا ہی پڑا تو جن قوتوں کو ہم نے اللہ تعالیٰ کا شریک بنا رکھا ہے وہ یقیناً ہمیں اللہ تعالیٰ کی باز پرس سے بچالیں گی۔ان کو توجہ دلانے کے لیے فرمایا کہ تم کیسے احمق ہو تم مانتے ہو کہ زمین و آسمان اور اس کے اندر کی تمام مخلوقات کو اللہ تعالیٰ ہی نے پیدا فرمایا اور جن کو تم شریک کرتے ہو وہ بھی اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں۔تو کہاں اللہ تعالیٰ کی ذات اور کہاں تمھارے یہ شرکاء، کہاں خالق اور کہاں مخلوق۔اگر تمھیں اللہ تعالیٰ نے پکڑ لیا تو یہ تمھیں کیسے چھڑا لیں گے۔وہ تو خود اللہ تعالیٰ کے عذاب سے لرزاں و ترساں ہیں۔کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہر لحاظ سے بالا اور بلند ہے ان تمام قوتوں سے جنھیں لوگ اس کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں۔

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ۝ (سورۃ النحل : ۴)

(اس نے انسان کو ایک ذرا سی بوند سے پیدا کیا اور وہ دیکھتے دیکھتے ایک کھلا ہوا حریف بن کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ۴)

اللہ تعالیٰ کا کمالِ قدرت اور انسان کی بے بضاعتی

گزشتہ آیتِ کریمہ میں یہ فرمایا گیا ہے کہ ہم نے جسے بھی اپنا رسول بنا کے بھیجا اسے یہ حکم دیا کہ لوگوں پر جا کے یہ بات اچھی طرح واضح کردو کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی الوہیت کا سزاوار نہیں۔اور یہ بات بھی کہ اِلٰہ چونکہ صرف اللہ تعالیٰ ہے اور تم اس کے بندے اور غلام ہو۔اس لیے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور سے ڈرنے اور کسی اور کے سامنے جھکنے کا کوئی جواز نہیں۔انسان کی فطرت ہے کہ وہ اس سے ڈرتا ہے جس کی قوتیں بے پناہ ہوں۔اور جس سے آدمی کی احتیاج وابستہ ہو یعنی اس کے سامنے سر اٹھانے کی اس لیے مجال نہ ہو کہ وہ بہت قوتوں والا ہے۔اور اس سے تعلق توڑنے کی اس لیے ہمت نہ ہو کہ تمام احتیاجات اسی سے پوری ہوتی ہیں۔چنانچہ اسی پہلو کو سامنے رکھ کر پروردگار نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی بے پناہ قدرتوں کا عالم یہ ہے کہ اس نے ارض وسما پیدا کیے۔اور ان میں بسنے والی مخلوق اسی کے دسترخوانِ نعمت سے ریزہ چینی کررہی ہیں۔اس طرح اپنی کمالِ قدرت اور کمالِ ربوبیت کا ذکر فرمانے کے بعد فرمایا کہ انسانو! تم ایک مشتِ استخوان ہو۔اس کائنات میں تمھاری حیثیت کوئی قابلِ ذکر بھی نہیں۔اور اللہ تعالیٰ کی قوتوں کے مقابلے میں تم ذرۂ ناچیز

Marfat.com

سے بھی کم ہو۔اوراس کی ربوبیت کا ذرا سا تغافل تمھاری موت کے لیے کافی ہے۔اور پھر یہ دیکھو کیونکہ اس سے تمھاری بے بضاعتی کا بھی اندازہ ہوتا ہے اوراللہ تعالیٰ کی کمالِ قدرت کا بھی کہ اس نے تمھیں پانی کی ایک بوند سے پیدا کیا اور وہ بوند بھی ایسی جسے ناپاک کہا جاتا ہے،لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اسی بوند سے پیدا ہونے والا انسان جب خوبصورت شکل وصورت لے کر دنیا میں آتا اور پھر پروان چڑھتا ہے حتیٰ کہ بلوغ کی عمر کو پہنچ کر شعور سے بہرہ ور ہوتا اور صلاحیتوں سے بھرپور ہو جاتا ہے تو اپنے ہی مالک کے سامنے حریف اور جھگڑالو بن کر اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔اپنے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اوراس کی الوہیت کے مقابل دلائل دیتا اوراپنی بات پر اصرار کرتا ہے۔اس طرح سے اس کا حجت بازیاں کرنا اوراپنی غیر معمولی قوتوں کا اظہار کرنا ایک طرف تو اللہ تعالیٰ کے کمالِ قدرت پر دلالت کرتا ہے اور دوسرا اس کی ناپاک جسارت پر کہ جس نے اس کو سب کچھ دیا ہے اور پانی کی بوند سے پیدا کر کے ایسی صلاحیتوں کا پیکر بنایا ہے کہ اب کائنات کا گُل سرسبد اسے ہی کہا جاتا ہے،لیکن اسی عطا کرنے والے کے سامنے اکڑ کر کھڑا ہو گیا۔تصور کیجیے کہ وہ غلام جسے عزت وطاقت مل جائے اور وہ اپنے آقا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کی کوشش کرے تو دنیا میں اگر شرافت مٹ نہیں گئی تو ہر شریف آدمی اس کے بارے میں کیا رائے قائم کرے گا۔اورانسان کا معاملہ اپنے اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں تو اس سے بھی بڑھ کر سنگین ہے۔نہ اسے اللہ تعالیٰ کی قدرتوں کا احساس ہے، نہ اس کے احسانات کا پاس ہے اور نہ اپنی حدود کا شعور ہے۔وہ سب کچھ بھول کر سرکشی اور طغیانی کے راستے پر چل نکلا ہے۔لیکن یہ بھی امرواقع ہے کہ سب انسان یکساں نہیں ہیں۔اس لیے جن کے اندرانسانیت بالکل دم نہیں توڑ گئی اور قبولیت کی استعداد کی کچھ رمق بھی باقی ہے ان کے سامنے پروردگار اپنی ان نعمتوں کا ذکر فرماتا ہے جنھیں محسوس کرنا ان کے لیے کسی بڑی عقل کی ضرورت نہیں۔

وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا ۚ لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ وَّ مَنَافِعُ وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ۝ (سورۃ النحل : ۵)

(اور چوپائے بھی اس نے تمھارے لیے پیدا کیے جن میں تمھارے لیے پوشاک بھی ہے اور خوراک بھی اور ان سے تم غذا بھی حاصل کرتے ہو۔ ۵)

آیاتِ الٰہی کی طرف اشارہ

آیتِ کریمہ میں دِفْءٌ کا لفظ استعمال ہوا ہے جو چوپایوں کے بال اور اون وغیرہ پر بولا جاتا ہے۔اس سے عام طور پر عرب سردیوں سے بچنے کے لیے گرم لباس بناتے تھے۔اس لیے ہم نے اس کا ترجمہ پوشاک کیا ہے۔اون سے تو ظاہر ہے کہ کپڑا بنتا تھا۔البتہ بعض جانوروں کے بالوں سے خیمے وغیرہ بھی بنتے تھے۔اور یہ سب اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کے کرشمے اوراس کے احسانات ہیں جن کی طرف انسان کو توجہ دلائی جا رہی ہے کہ تمھارا مالک اور محسن تو وہ ہے جس نے تمھیں دیگر ہزاروں نعمتوں کے ساتھ ساتھ چوپایوں جیسی نعمت بھی عطا فرمائی کہ عرب جیسی سرزمین میں جہاں زندگی کے امکانات بہت کم ہیں جہاں صنعت نہ ہونے کے برابر ہے اور زراعت بھی بڑے محدود علاقوں تک محدود ہے۔عام انسانوں کی گزربسر کا ذریعہ چوپائے ہیں جن کے اون سے کپڑا بنتا ہے اور جن کے بالوں سے عرب کی چلچلاتی دھوپ سے بچنے کے لیے کھلے آسمان کے نیچے موسم کی شدت سے حفاظت کے لیے بالوں سے خیمے بنائے جاتے ہیں جو نہایت مضبوط ہوتے تھے اور پھر سفر وحضر میں انھیں جانوروں کے گوشت سے پیٹ کی آگ بجھائی جاتی ہے اور بھی نہ جانے کتنے فائدے ہیں جو ان سے اٹھائے جاتے ہیں۔

وَلَكُمْ فِيْهَا جَمَالٌ حِيْنَ تُرِيْحُوْنَ وَحِيْنَ تَسْرَحُوْنَ ۝ (سورۃ النحل : ٦)

(ان میں تمھارے لیے جمال ہے جبکہ تم ان کو شام کو گھر واپس لاتے ہو اور جس وقت کہ ان کو چرنے کو چھوڑتے ہو۔ ٦)

Marfat.com

اللہ تعالیٰ کی مزید نعمتوں کا ذکر

انسان کے اندر اللہ تعالیٰ نے مختلف احساسات رکھے ہیں، کبھی اس کے اندر یہ احساس ابھرتا ہے کہ میرے پاس اس قدر طاقت کا سامان ہونا چاہیے کہ لوگ میری طاقت کے سامان کو دیکھ کر مجھ سے خوف کھائیں۔ اور کبھی اس کے نازک جذبات کو جنبش ہوتی ہے تو وہ اپنے جمالیاتی ذوق کی تسکین کے لیے کچھ چیزوں کا اظہار کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ سابقہ آیتِ کریمہ میں جہاں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا اظہار ہے وہیں یہ بات بھی ہے کہ تم میں سے کتنے لوگ ہیں جن کے بڑے بڑے اصطبل مختلف قسم کے جانوروں سے معمور ہیں۔ یہی ان کی قوت کے سامان بھی ہیں اور اسی سے ان کی غذائی ضروریات بھی پوری ہوتی ہیں۔ اب ان کے جمالیاتی ذوق کی تسکین کے لیے فرمایا جارہا ہے کہ ہم نے ان کو مختلف قسم کے چوپائے دیے ہیں اور بعض لوگوں کے پاس وہ اس قدر فراوانی کے ساتھ ہیں کہ جب وہ صبح وشام چراگاہ جاتے ہوئے اور واپس آتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں تو عجیب خوبصورتی کا منظر ہوتا ہے۔ کیونکہ جس طرح مختلف اشیاء میں حُسن ہے، اس طرح چوپایوں میں بھی تو حُسن ہے۔ اگر چوپایوں میں حُسن نہ ہوتا تو لوگ کبھی مختلف جانور شوق سے نہ پالتے۔ حتیٰ کہ انسانوں نے تو درندے تک پال کر اپنے شوق کو تسکین دی ہے۔ پنجاب کی دیہاتی زندگی میں خوبصورت بیل بڑے زمینداروں کی خوشحالی اور دولت کی علامت بھی تھے اور ان کے جمالیاتی ذوق کی تسکین کا باعث بھی۔ اس طرح عربوں میں ہر طرح کے جانور ان کے لیے باعث فخر بھی تھا اور باعث تسکین بھی۔ بعض جانوروں کے بڑے بڑے ریوڑ جہاں ان کی خوشحالی کا منہ بولتا ثبوت تھے وہیں پوری آبادی ان کے حُسن میں ڈوب جاتی تھی۔ اسی طرح گھوڑوں کی بڑی تعداد ان کے رعب اور دبدبے اور قوت کی علامت تھی کیونکہ جس کے اصطبل گھوڑوں سے بھرے ہوئے ہوں اس کے سپاہیوں کی تعداد بھی اتنی ہی زیادہ ہوگی تو عام قبیلہ ایسے قبیلے کیخلاف کسی اقدام کی جرأت کیسے کرسکتا ہے۔

اِراحة کا معنی شام کو گلے کو چراگاہ سے گھر واپس لانے کے ہیں۔ اور سرح کہ معنی اس کو چرنے چگنے کے لیے صبح کو چھوڑنے کے ہیں۔ انداز بیان میں عام طور پر صبح کا ذکر پہلے ہوتا ہے اور شام کا بعد میں۔ لیکن اس آیتِ کریمہ میں شام کو گلے کے چراگاہ جانے کا ذکر پہلے ہے اور صبح کو گلے کے چراگاہ جانے کا ذکر بعد میں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس آیت میں جمالیاتی پہلو کے اظہار کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو شام کو جب جانور گھر واپس آتے ہیں تو چونکہ پیٹ بھر کے لوٹتے ہیں اس لیے تازہ دم ہوتے ہیں اور ان کی خوبصورتی اور رعنائی میں صبح کی نسبت اضافہ ہوچکا ہوتا ہے۔ اس لیے قرآنِ کریم نے شام کو لوٹنے کا ذکر پہلے کیا اور صبح کو جانے کا ذکر بعد میں فرمایا۔

وَتَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ اِلٰى بَلَدٍ لَّمْ تَكُوْنُوْا بٰلِغِيْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ ؕ اِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝۷

(اور وہ تمہارے بوجھ ایسے جگہوں پر پہنچاتے ہیں جہاں تم شدید مشقت کے بغیر پہنچنے والے نہیں بن سکتے، بیشک تمہارا رب بڑا ہی شفیق اور مہربان ہے۔ ۷) (سورۃ النحل: ۷)

اپنے فیضانِ ربوبیت کو مزید نمایاں کرتے ہوئے فرمایا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے جانور تمہارے جلال و جمال کے اظہار کا ذریعہ بنائے اسی طرح اس کا یہ بھی فضل وکرم ہے کہ اس نے ایسے جانور بھی پیدا فرمائے ہیں جو تمہارے لیے باربرداری کا کام کرتے ہیں۔ تمہاری سواری کے لیے اور تمہاری باربرداری کے لیے اونٹ جیسا جانور پیدا فرمایا کہ صحرا اور ریگستان میں جہاز کی طرح چلتا ہے کہ تین تین چار چار دنوں کے لیے بغیر کھائے پیئے سفر جاری رکھتا ہے۔ ایک دفعہ دیکھا ہوا راستہ بہت کم بھولتا ہے۔ ٹنڈ منڈ درخت بھی مل جائے تو اس کی سوکھی ٹہنیاں چبا جاتا ہے۔ جس طرح اس کے جبڑوں میں قدرت نے غیر معمولی طاقت رکھی ہے، اسی طرح اس کے معدے میں بھی حیرت انگیز قوت ہاضمہ رکھی گئی ہے۔ اس کا جسم بظاہر دیکھنے کو بے جوڑ سا معلوم ہوتا ہے اس لیے کہا جاتا ہے کہ اونٹ سے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی۔ لیکن افادیت کے اعتبار سے اس کی جسمانی صلاحیتیں حیرت انگیز طور پر انسانوں کے لیے مفید بنائی گئی ہیں۔ عرب کے ریگستان میں اگر اونٹ جیسا کوئی جانور پیدا نہ کیا جاتا تو عربوں کی زندگی اجیرن ہوجاتی۔ ان کے تجارتی قافلے بے بس ہوجاتے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ موسم تو پہلے ہی ان سے ناراض رہتا تھا اور راستے بھی بند ہوجاتے تو ان کی بربادی خطرناک حد تک گہری ہوجاتی۔ لیکن اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ہمیشہ ہی مہربان رہا ہے۔ اس نے زندگی کے تمام شعبوں میں اس طرح آسانیاں پیدا کی ہیں کہ انسان اپنی غفلت کے باعث عموماً اس کے شعور سے محروم رہتا ہے۔

Marfat.com

وَّالْخَیْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِیْرَ لِتَرْکَبُوْهَا وَزِیْنَةً ؕ وَیَخْلُقُ مَالَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۸﴾ (سورة النحل : ۸)

(اور (اسی نے پیدا کئے) گھوڑے اور خچر اور گدھے تاکہ تم ان پر سوار ہو اور وہ زینت بھی ہیں اور وہ ایسی چیزیں بھی پیدا کرتا ہے جن کو تم نہیں جانتے۔ ۸)

ایک اور پہلو سے چوپایوں کا ذکر

اب تک جتنی نعمتوں اور جتنے جانوروں کا ذکر ہوا وہ انسان کی ضرورت بھی ہیں اور ضرورتوں کی ادائیگی کا ذریعہ بھی۔ لیکن اب جن دو جانوروں کا ذکر کیا جارہا ہے یہ انسان کے لیے سواری بھی ہیں اور باعثِ زینت بھی۔ عرب میں عام طور پر سواری اور جنگی ضرورتوں کے لیے گھوڑے استعمال ہوتے تھے۔ اور یہی دونوں کام خچروں سے بھی لیے جاتے تھے کیونکہ خچر اور گھوڑے میں بہت تھوڑا فرق ہوتا ہے۔ عرب اگر چہ ان دونوں نسلوں کی خصوصیات تک پر نگاہ رکھتے تھے لیکن عام حوالوں سے یہ دونوں کام ان سے لیے جاتے تھے۔ اسی طرح یہ بڑے لوگوں کے لیے زینت کا باعث بھی تھے۔ ایک اچھی نسل کا صحت مند گھوڑا ایسے آدمی کو بھی اچھا لگتا ہے جو گھوڑوں سے زیادہ سروکار نہ رکھتا ہو۔ چہ جائیکہ عرب وہ تو گھوڑوں پر جان دیتے تھے۔ ان کی پرورش اور پرداخت میں بچوں کو بھوکا رکھ کر بھی انھیں کھلانا ضروری سمجھتے تھے۔ آج جس طرح ہمارا طبقۂ امراء گاڑیوں کے بیڑے پر فخر کرتا ہے اور کوٹھیوں کے بڑے بڑے پورچ میں لگی ہوئی گاڑیاں ان کا سر اونچا رکھ کر چلنے کا باعث بنتی ہیں۔ یہی حال عرب امراء کا بھی تھا۔ اس لیے قرآن کریم نے اسے زینت کا باعث قرار دیا۔ اور مزید فرمایا کہ افادیت، ضرورت، اہمیت، سواری اور زینت کے لیے ہم نے مختلف جانوروں کا ذکر کیا ہے جنھیں تم جانتے ہو اور جن پر تمھیں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ لیکن کچھ چیزیں یا کچھ جانور انھی ضرورتوں کے لیے ایسے بھی ہیں جو دنیا کے دیگر علاقوں میں اللہ تعالیٰ پیدا فرماتا ہے لیکن تم ان سے واقف نہیں ہو۔ وہ رب العالمین ہیں اس کی ربوبیت کا فیضان سب کے لیے ہے۔

اس کا ایک دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے وہ یہ کہ آج تو تمھاری ضرورتوں اور زینت آرائی کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ جانور پیدا کر رکھے ہیں لیکن تمھیں کیا خبر کہ مستقبل میں انھیں ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کیا کچھ پیدا فرمائے گا۔ آج ہم سواری، بار برداری اور زینت کے لیے وہ چیزیں اپنے پاس رکھتے ہیں کہ جن کا گزشتہ زمانے میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ انھیں تو انسان نے تخلیق کیا تھا، ہوائی جہاز اللہ تعالیٰ نے نہیں بنایا بلکہ انسان نے بنایا لیکن یہ خود فریبی ہے کیونکہ کسی بھی ایجاد اچانک آنے والا خیال وہ سائنسدان کا کمال نہیں ہوتا اللہ تعالیٰ کی عطا اور دین ہوتا ہے۔ نیوٹن نے باغ میں سیب گرتے نہ جانے کتنی دفعہ دیکھا ہوگا لیکن کبھی اس کے ذہن میں کششِ ثقل کا تصور نہیں آیا۔ اور جب آیا اور اس نے سائنس کے سامنے ترقی کے لامتناہی راستے کھول دیے تو وہ اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے آیا۔ جب اسے منظور ہوا کہ انسانی عقل پر اس عقدے کو واشگاف ہونا چاہیے تو اس نے نیوٹن کے دماغ میں اس کا القا کر دیا۔ اس طرح سے دنیا میں کوئی ایجاد بھی انسان کی نہیں اللہ تعالیٰ کی تخلیق کہی جا سکتی ہے۔

وَعَلَی اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِیْلِ وَمِنْهَا جَآئِرٌ ؕ وَلَوْ شَآءَ لَهَدٰکُمْ اَجْمَعِیْنَ ﴿۹﴾ (سورة النحل : ۹)

(اور اللہ تعالیٰ ہی کے ذمہ ہے سیدھا راستہ بتانا جبکہ راستے ٹیڑھے بھی موجود ہیں اگر وہ چاہتا تو سب کو ہدایت دے دیتا۔ ۹)

مزید ایک عظیم نعمت اور احسان کا ذکر

قَصْدٌ کا معنی ہے سیدھا اور قَصْدُ السَّبِیْلِ میں صفت اپنے موصوف کی طرف مضاف ہوگئی ہے۔ اس کا معنی ہے سیدھا راستہ۔ اور جَآئِرٌ کا معنی ہے ٹیڑھا میڑھا۔ گزشتہ آیات کریمہ میں انسان کی تخلیق پھر اس کی عطا کی جانے والی صلاحیتوں اور پھر اس پر کیا جانے والا فیضانِ ربوبیت اور ہر دور میں اسے لاحق ہونے والی ضرورتوں کا مہیا کیا جانا یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر نہایت مہربان ہے۔ انسانوں کو زندگی گزارنے کے لیے جن صلاحیتوں کی ضرورت تھی اور زندگی کی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے جن ذرائع کی حاجت تھی اس کی رحمت کا تقاضا ہوا کہ ان میں سے ایک ایک چیز انسان کو مہیا کی جائے۔ چنانچہ یہاں ایک سوال پیدا ہوا کہ اگر انسان کو دل و دماغ اور جسم وہ عطا ہوا جو اس کی ضرورت کے مطابق تھا اور

Marfat.com

نعمتیں وہ دی گئیں جو اس کے جسم کا تقاضا تھیں اور اس طرح وہ سب کچھ عطا کیا گیا جو اس کے احساسات کی مانگ اور ضرورت تھی۔ تو یہ کیسے ممکن تھا کہ پروردگار اسے یہ نہ بتاتا کہ تیرے پروردگار نے تیری زندگی کا مقصد کیا رکھا ہے اور اپنے پروردگار تک پہنچنے کا راستہ کیا ہے۔ اس کی رضا کے حصول کے لیے تمھیں کیا کرنا چاہیے جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ عقل کو غلط راستے پر ڈالنے کے لیے بہت سے اسباب موجود ہیں۔ ہدایت کے سیدھے راستے کو گم کرنے کے لیے بہت سے ٹیڑھے میڑھے راستے بھی پیدا کیے گئے ہیں۔ شیطانی قوتیں انسان کو بہکانے کے لیے ہر وقت کوشاں ہیں۔ تو اس کا تو لازمی تقاضا ہے کہ اللہ تعالیٰ کوئی ایسا محفوظ راستہ انسانوں کے لیے مہیا کر دیتا جس سے انسان آسانی سے صراطِ مستقیم پر چل سکتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے یہ بات بہت بعید تھی کہ وہ جسمانی ضرورتوں کو تو پورا کرے لیکن اخلاقی اور روحانی ضرورتوں کی طرف توجہ نہ دے۔ وہ فانی ضرورتوں کو تو سامنے رکھے لیکن اخروی ضرورتوں کو نظر انداز کر دے۔ وہ زندگی کے اسباب کے لیے تو راستے کھولے لیکن اپنی ذات تک پہنچنے کا کوئی راستہ نہ بتائے۔ اللہ تعالیٰ فرمایا ہے کہ یہ اس کی شان سے بہت بعید بات تھی۔ چنانچہ اس کے اپنے ذمہ یہ لازم کر لیا کہ وہ سیدھا راستہ یعنی صراطِ مستقیم انسان کے لیے کھولے گا۔ وہ اپنے پیغمبر بھیج کر انسانوں کو بتائے گا کہ تمھاری زندگی کا مقصد کیا ہے اور اسے حاصل کرنے کے صحیح طریقے کیا ہیں۔

کوئی شخص اس کے جواب میں یہ کہہ سکتا ہے کہ کیا یہ ممکن نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ پیدائشی طور پر انسان کے اندر ایک دیپ جلا دیتا جس سے انسان کبھی بگاڑ کے راستے پر نہ پڑتا۔ اسے پیدائشی طور پر ہدایت یافتہ اور سیدھی راہ پر چلنے والا بنا دیا جاتا۔ تو حق و باطل کی کشمکش جس میں کوئی کامیاب ہوتا ہے اور کوئی ناکام۔ انسان اس امتحان سے بچ جاتا لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ زمین پر انسان کو بھیجنا پھر اسے خلافت ارضی سے نوازنا، شیطانی قوتوں سے اسے باخبر کرنا اور اللہ تعالیٰ کے نبیوں کو بھیجنا اور آسمانوں سے کتابوں کا اتارنا اور اس طرح صراطِ مستقیم سے انسان کو باخبر کر دینا تاکہ وہ اپنی عقل، فہم اور شعور سے صحیح فیصلہ کرنے کی کوشش کرے اور اس امتحان میں پورا اترے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے کھول دیا ہے کہ اگر اس نے وحیِ الٰہی کی رہنمائی کو قبول کیا اور اس کے مطابق زندگی گزاری تو اللہ تعالیٰ نجات عطا فرمائے گا۔ اور اگر ایسا نہ ہوا تو پھر جزاء و سزا کے قانون کے تحت وہ اپنی بداعمالیوں کے باعث سزا میں گرفتار ہوگا۔ یہ وہ سکیم ہے جو پروردگار نے انسان کو پیدا کرنے سے پہلے منظور فرمائی اور اسے نافذ کر دیا۔ اور اگر سب کو ہدایت سے نواز دیا جاتا تو اللہ تعالیٰ کی یہ سکیم ناکام ہو جاتی۔

هُوَ الَّذِيٓ أَنزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۖ لَّكُم مِّنْهُ
شَرَابٌ وَمِنْهُ شَجَرٌ فِيهِ تُسِيمُونَ ﴿١٠﴾ يُنۢبِتُ لَكُم بِهِ الزَّرْعَ
وَالزَّيْتُونَ وَالنَّخِيلَ وَالْأَعْنَٰبَ وَمِن كُلِّ الثَّمَرَٰتِ ۗ إِنَّ فِي
ذَٰلِكَ لَءَايَةً لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ﴿١١﴾ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ
وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۖ وَالنُّجُومُ مُسَخَّرَٰتٌۢ بِأَمْرِهِۦٓ ۗ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ
لَءَايَٰتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ﴿١٢﴾ وَمَا ذَرَأَ لَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُخْتَلِفًا
أَلْوَٰنُهُۥٓ ۗ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَءَايَةً لِّقَوْمٍ يَذَّكَّرُونَ ﴿١٣﴾ وَهُوَ الَّذِي

Marfat.com

سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَأْكُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا وَّتَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْيَةً
تَلْبَسُوْنَهَا ۚ وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَ
لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۴﴾ وَاَلْقٰى فِى الْاَرْضِ رَوَاسِىَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ
وَاَنْهٰرًا وَّسُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵﴾ وَعَلٰمٰتٍ ؕ وَبِالنَّجْمِ هُمْ
يَهْتَدُوْنَ ﴿۱۶﴾ اَفَمَنْ يَّخْلُقُ كَمَنْ لَّا يَخْلُقُ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۱۷﴾
وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۸﴾
وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ
دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَخْلُقُوْنَ شَيْـًٔا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ ﴿۲۰﴾ ؕ اَمْوَاتٌ غَيْرُ
اَحْيَآءٍ ۚ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۙ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ﴿۲۱﴾ ع

۲ (وہی ہے جس نے آسمان سے پانی اتارا جس میں سے تم پیتے بھی ہو اور اسی سے وہ نباتات بھی اگتی ہیں جن میں تم مویشیوں کو چراتے ہو۔ ۱۰) وہی تمھارے لیے اسی زمین سے کھیتی، زیتون، کھجور، انگور اور ہر قسم کے پھل پیدا کرتا ہے، یقیناً ان تمام چیزوں میں قدرتِ الٰہی کی نشانی ہے اس قوم کے لیے جو غور و فکر کرتی ہے۔ ۱۱) اور اس نے رات اور دن سورج اور چاند کو تمھاری نفع رسانی میں لگا رکھا ہے، اور تمام ستارے بھی اسی کے حکم کے پابند ہیں، بیشک ان تمام چیزوں میں قدرتِ الٰہی کی نشانیاں ہیں اس قوم کے لیے جو عقل رکھتی ہے۔ ۱۲) اور زمین میں جو چیزیں تمھارے لیے گونا گوں قسموں کی پھیلائیں بیشک اس میں بھی بڑی نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو نصیحت قبول کرتے ہیں۔ ۱۳) اور وہی ہے جس نے سمندر کو تمھاری نفع رسانی میں لگا رکھا ہے تاکہ تم اس سے تازہ گوشت کھاؤ اور اس سے وہ زیور نکالو جو تم پہنتے ہو، اور تو دیکھتا ہے کشتیوں کو کہ موجوں کو سمندر میں چیر کر جا رہی ہیں اور تاکہ تم تلاش کرو اس کے فضل کو اور تاکہ اس کے شکر گزار بنو۔ ۱۴) اور اللہ تعالیٰ نے گاڑ دیے ہیں زمین میں اونچے اونچے پہاڑ تاکہ وہ تمھیں لے کر جھک نہ پڑے اور دریا جاری کر دیے اور راستے بنا دیے تاکہ تم اپنی منزل کی راہ پا سکو۔ ۱۵) اور راستوں پر علامتیں بنا دی ہیں اور ستاروں کے ذریعہ سے وہ راہ یاب ہوتے ہیں۔ ۱۶) کیا وہ ذات جس نے سب کچھ پیدا فرمایا اس کی مانند ہو سکتی ہے جس نے کچھ بھی نہیں بنایا کیا تم اتنا بھی غور نہیں کرتے۔ ۱۷) اور اگر تم اللہ

Marfat.com

کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو تم انھیں شمار نہیں کر سکتے، بیشک اللہ بڑا ہی بخشنے والا مہربان ہے۔ ۱۸) اور اللہ جانتا ہے جو تم چھپاتے ہو اور جو تم ظاہر کرتے ہو۔ ۱۹) اور جن کو یہ اللہ کے سوا پکارتے ہیں وہ کسی چیز کو پیدا نہیں کر سکتے، وہ تو خود مخلوق ہیں۔ ۲۰) وہ مردہ ہیں، وہ زندہ نہیں اور نہیں سمجھتے کہ کب انھیں اٹھایا جائے گا۔ ۲۱)

هُوَالَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً لَّكُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ وَّمِنْهُ شَجَرٌ فِيْهِ تُسِيْمُوْنَ ⑩

(وہی ہے جس نے آسمان سے پانی اتارا جس میں سے تم پیتے بھی ہو اور اسی سے وہ نباتات بھی اگتی ہیں جس میں تم مویشیوں کو چراتے ہو۔ ۱۰) (سورۃ النحل:۱۰)

فیضانِ ربوبیت

گزشتہ چند آیات سے اللہ تعالیٰ انسانوں پر اپنے احسانات کا ذکر فرما رہا ہے جن کا زیادہ تر تعلق اس کی شانِ ربوبیت سے ہے۔ اس کی تخلیقی صفات کا کمال یہ ہے کہ اس نے انسان کو گندے پانی کی ذراسی بوند سے پیدا فرمایا اور پھر اسے وہ کمالات عطا فرمائے کہ اس کی ذہنی صلاحیتوں کے سامنے دنیا انگشت بدنداں ہے۔ ایسی مفید اور عظیم تخلیق کے بعد اس کی بقا کے اسباب پیدا نہ کیے جاتے تو وہ ہلاکت کے گھاٹ اتر جاتا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے قسم قسم کی نعمتیں پیدا فرمائیں اور پھر نعمتوں کا حوالہ دے کر اس بات کی طرف توجہ دلائی کہ جس طرح ہم تمھاری غذائی ضرورتوں کے کفیل ہیں اسی طرح تمھاری ذہنی اور قلبی آسودگی کے لیے اسباب پیدا کرنا یہ بھی ہماری ذمہ داری ہے۔ اب پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں یہ فرمایا جا رہا ہے کہ تمھاری تخلیق اور پھر تمھاری بقا کے اسباب کے لیے اس نے آسمان سے پانی نازل فرمایا اور پھر ہر قسم کی حیات کے لیے پانی کو ذریعہ بنا دیا۔ اسی کو پی کر انسان اور حیوان زندہ ہیں اور اسی کی سیرابی سے تمام نباتات پیدا ہو رہی ہیں۔ اور پھر اسی کے فیضان سے انسانوں اور حیوانوں کی غذائی ضروریات بھی پیدا ہوتی ہیں۔ غلے کا ذکر تو اگلی آیات میں کیا جا رہا ہے یہاں فرمایا کہ اسی زمین اور اسی پانی سے وہ چیزیں اگتی ہیں جنھیں جانور کھاتے اور چرتے ہیں۔ بعض اہلِ علم نے شجر سے گھاس مراد لی ہے۔ اور اگر اس سے کھجور کا درخت مراد لے لیا جائے تو تب بھی کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ اور اسی سے جنگل اور جھاڑیاں بھی مراد لی جا سکتی ہے اور وہ بھی مویشیوں کے چرنے کے کام آتی ہے۔

يُنْۢبِتُ لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَالزَّيْتُوْنَ وَالنَّخِيْلَ وَالْاَعْنَابَ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ⑪

(وہی تمھارے لیے اسی زمین سے کھیتی، زیتون، کھجور، انگور اور ہر قسم کے پھل پیدا کرتا ہے، یقیناً ان تمام چیزوں میں قدرتِ الٰہی کی نشانی ہے اس قوم کے لیے جو غور و فکر کرتی ہے۔ ۱۱) (سورۃ النحل:۱۱)

اس نے جس طرح حیوانوں کے کھانے اور چرنے کے لیے گھاس اور مختلف قسم کی جھاڑیاں پیدا فرمائیں اسی طرح اس نے انسانوں کے لیے ان کی طبیعت اور ضرورت کے مطابق غلہ پیدا فرمایا اور غلے میں بھی تنوع پیدا فرمایا۔ کھانے کے لوازمات کے لیے زیتون جیسی نعمت پیدا فرمائی۔ اور لذتِ کام و دہن کے لیے کھجور اور انگور جیسے پھل پیدا فرمائے اور بھی قسم قسم کے پھل پیدا کیے تاکہ اگر طبیعت ایک دو پھلوں سے ابا کرتی ہے تو پھلوں سے خوانِ نعمت سجا دیا جائے اور ہر علاقے میں ان کی موسمی ضروریات کے مطابق پھل عطا فرمائے اور پھر مواصلات کا ایک نظام دے کر ملکوں ملکوں کا سفر آسان فرما دیا تاکہ ایک ملک کے پھل دوسرے ملک میں پہنچ سکیں۔ اس طرح سے ایک ایسا خوانِ نعمت سجا دیا گیا کہ جس میں تنوع بھی ہے اور تفکہ بھی۔ ان میں گوں ناگوں رنگ بھی ہیں اور بوقلموں مزے بھی، تاکہ ہر مزاج اور ہر طبیعت کی ضرورت پوری ہو سکے اور ان کی طبعی اور جسمانی تربیت میں کوئی کمزوری نہ رہنے پائے۔

وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۙ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌ ۢ بِاَمْرِهٖ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ⑫

(اور اس نے رات اور دن سورج اور چاند کو تمھاری نفع رسانی میں لگا رکھا ہے، اور تمام ستارے بھی اسی کے حکم کے پابند ہیں، بیشک ان تمام چیزوں میں قدرتِ الٰہی کی نشانیاں ہیں اس قوم کے لیے جو عقل رکھتی ہے۔ ۱۲) (سورۃ النحل:۱۲)

Marfat.com

اللہ تعالیٰ کے فیضانِ ربوبیت کی کیا انتہا ہے کہ اس نے جس طرح زمین پر انسانی غذاؤں اور تلکہات کا دسترخوان بچھا رکھا ہے اور حیوانوں کی ضروریات کے لیے بھی کوئی کمی نہیں رہنے دی۔ اسی طرح اس نے آسمانی مخلوقات کو بھی تمھاری ضرورتیں بہم پہنچانے میں لگا رکھا ہے۔ رات انسان کے سکون کے لیے اور دن اس کی سرگرمیوں کے لیے بنایا گیا۔ اور سورج اور چاند کو دن اور رات کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے لگایا گیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ان دونوں کو انسانی ضروریات میں اپنا کردار ادا کرنے کا پابند ٹھہرایا ہے۔ سورج صرف روشنی ہی مہیا نہیں کرتا بلکہ سمندر سے بھاپ اٹھا کر ابر کی چادریں بھی بچھاتا ہے اور آسمان پر ستاروں کے جلتے بجھتے دیے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صرف آسمانوں میں خوبصورتی میں اضافہ کا کام دے رہے ہیں۔ لیکن سائنس کی ترقیات نے اجرام فلکی کے بارے میں جو تفصیلات مہیا کی ہیں اس سے جہاں ان کے بے پناہ حجم اور بے پناہ طاقت کا اندازہ ہوتا ہے وہیں آسمانوں کی وسعتوں میں ان کی گردشوں اور اور حرکتوں سے زمین پر ان کے اثرات کا بھی اندازہ لگانے کی کوشش کی جارہی ہے اور پھر جس طرح سے یہ تمام چھوٹے بڑے سیارے، ستارے اور ثوابت اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل میں لگے ہوئے ہیں کہ ہزار ہا برسوں میں بھی ان کی طرف سے معمولی کوتاہی بھی سرزد نہیں ہوئی۔ اس میں غور و فکر کرنے والوں کے لیے کس قدر نشانیاں ہیں۔

وَمَا ذَرَاَ لَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۳﴾

(اور زمین میں جو چیزیں تمھارے لیے گوناگوں قسموں کی پھیلائیں بیشک اس میں بھی بڑی نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو نصیحت قبول کرتے ہیں۔ ۱۳) (سورۃ النحل:۱۳)

نسخے سے فائدہ کون اٹھاتا ہے

اس کا عطف سخرلکم کے نیچے ہے۔ ذرأ کا معنی خلق (پیدا کیا ہے) اس ارشاد ربانی کا مقصد یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے سورج، چاند اور ستاروں کو تمھاری خدمت کے لیے مسخر کر دیا ہے۔ اسی طرح اس سطح زمین پر جن چیزوں کو پیدا فرمایا، حیوانات، نباتات، معدنیات انھیں بھی تمھارے لیے مسخر فرما دیا لیکن ان سے فائدہ صرف وہی لوگ اٹھا سکتے ہیں جو عقل و فہم سے کام لینا جانتے ہیں ہوں۔ بے علموں اور بے فکروں کے لیے تو یہ انمول خزانے بے مصرف ہیں۔ پانی میں بجلی کی حیرت انگیز قوت پہلے دن سے موجود تھی، کرۂ ہوائی کی موجیں تیری آواز کو آناً فاناً دنیا کے گوشہ گوشہ میں پہنچانے کی اہلیت رکھتی تھیں۔ تیرے ریگستانوں کے نیچے پیٹرول کے سمندر موجزن تھے لیکن ان سے فائدہ اٹھانا تیرا کام تھا۔ اغیار نے اپنی انتھک کوششوں اور جانفشانیوں سے ان پنہاں قوتوں کا سراغ لگایا اور ان سے خوب خدمت لی، لیکن اے حامل قرآن، تیری سہل انگاری نے تجھے مہلت نہ دی کہ تو اپنی اس کتاب کا مطالعہ کرے، جس نے سب سے پہلے ان قوتوں کی تسخیر کی دعوت دی۔ تیرے فقیر حال مست اور تیرے امیر مال مست رہے۔ تیرے بلند ہمت اسلاف نے علم و حکمت کی جو چمن بندی کی تھی اس میں بہار آنے کا وقت آیا تو، تو اس سے غافل ہو گیا اور اس پر اغیار نے تسلط جما لیا۔ اہل ہمت ستاروں پر کمندیں ڈال رہے ہیں اور تجھے پتنگ بازی سے فرصت نہیں۔ کمر ہمت باندھ مستقل مزاجی سے محنت اور جفاکشی کو اپنا شعار بنا اور آگے بڑھ کر علم و دانش اور فن و حکمت کے کاروانوں کی قیادت سنبھال۔ موجودہ بے دین قیادت انسانیت کو اپنے رب سے دور کر رہی ہے اور اسے ہلاکت کی طرف لے جا رہی ہے۔ تیری مومنانہ قیادت جہاں انسانیت کے لیے امن و عافیت کی ضامن ہو گی وہاں بندے کا رشتہ اپنے رب سے استوار کرنے کا بھی باعث بنے گی۔ (ضیاء القرآن)

دلیلِ تخالف

مندرجہ بالا آیات میں جس طرح اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا ذکر فرمایا گیا ہے اسے پڑھنے کے بعد ذہن میں فوراً یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ان نعمتوں کو اگر غور سے دیکھا جائے تو ان میں بیشتر نعمتیں آپس میں تخالف کی نسبت رکھتی ہیں باہمی ان میں تضاد پایا جاتا ہے۔ لیکن جب ہم ان کو کائنات کی ذمہ داریاں نبھاتے اور انسانی کی خدمت کرتے ہوئے دیکھتے ہیں کہ کہیں بھی ان میں تخالف نہیں پایا جاتا۔ ہر کرّہ اور ہر مخلوق نہایت سعادت مندی کے ساتھ

Marfat.com

اسی خدمت پر لگی ہوئی ہے جس کا اسے حکم دیا گیا ہے۔ آگ اور پانی میں آپس میں تضاد سہی لیکن اپنی ذمہ داریاں کو ادا کرنے میں یہ تضاد کہیں نظر نہیں آتا۔ زمین اور آسمان باہمی متضاد ہیں لیکن انسان کے لیے غلہ اگانے کی دونوں یکساں خدمت انجام دیتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام کائنات اور اس کی ایک ایک مخلوق ایک اللہ تعالیٰ کے احکام کی بجا آوری میں جتی ہوئی ہے اور انھیں ایک ہی ذات کی طرف سے احکام ملتے ہیں اور ایک ہی بندگی بجالانا ان کی زندگی کا مقصد ہے۔ اس میں کسی دوسرے خدا یا کسی دیوتا کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔ یہ کائنات دیوتاؤں کی رزم گاہ نہیں بلکہ ایک اللہ تعالیٰ قادر و حکیم کی سلطنت ہے جس میں کسی دوسرے کو دم مارنے کی مجال نہیں۔

اس کائنات میں تفکر کرنے سے ایک دوسری بات جو سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کائنات کی تخلیق میں جس طرح اللہ تعالیٰ کی صفتِ تخلیق کی کارفرمائی نظر آتی ہے اسی طرح قدم قدم پر اس کی حکمت سے بھی واسطہ پڑتا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کائنات ایک حکیم کی مخلوق ہے اور ساتھ ہی یہ آواز بھی سنائی دیتی ہے رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا اے ہمارے رب تو نے کوئی چیز باطل پیدا نہیں کی۔ تو یہ کیسے ممکن ہے کہ انسان جیسی مخلوق جو تمام کائنات کی گلِ سرسبد ہے اسے بیکار پیدا کیا جاتا اور اس کی زندگی کا کوئی مقصد نہ ہو۔ یقیناً اسے ایک مقصدِ حق دے کر پیدا کیا ہے۔ ایک دن آئے گا جب وہ اس سے اسی مقصد کے حوالے سے باز پرس کرے گا۔

وَهُوَ الَّذِیْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا طَرِیًّا وَّ تَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْیَةً تَلْبَسُوْنَهَا ۚ وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِیْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۴﴾ (سورة النحل : ۱۴)

(اور وہی ہے جس نے سمندر کو تمھاری نفع رسانی میں لگا رکھا ہے تاکہ تم اس سے تازہ گوشت کھاؤ اور اس سے وہ زیور نکالو جو تم پہنتے ہو، اور تو دیکھتا ہے کشتیوں کو کہ موجوں کو سمندر میں چیر کر جا رہی ہیں اور تاکہ تم تلاش کرو اس کے فضل کو اور تاکہ اس کے شکرگزار بنو۔ ۱۴)

سمندر کی نعمتوں کا ذکر

اللہ تعالیٰ نے زمین پر جس طرح اپنا خوانِ نعمت سجا رکھا ہے اور آسمان سے جس طرح اہلِ زمین کے لیے خدمات مہیا کی جارہی ہیں ان کا ذکر فرمانے کے بعد اب پروردگار اپنی مملکت کی ایک اور جلوہ گاہ کی طرف توجہ دلا رہے ہیں کہ جس طرح میں زمین و آسمان کا خالق ہوں اور ان دونوں کو تمھاری خدمت پر لگا رکھا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے تمھارے لیے فیض رسانی میں کمی نہیں کر رہے اسی طرح سمندر بھی اس کی مخلوق اور اس کی مملکت کا ایک حصہ ہے۔ اور اسے بھی اس نے تمھاری خدمت اور فیض رسانی کے لیے پابند بنا رکھا ہے۔ سمندر کی طرف متوجہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سمندر میں اٹھنے والے طوفان بے پناہ قوتوں کے حامل ہوتے ہیں۔ اس میں بننے والے بھنور اپنی گرفت میں اپنا جواب نہیں رکھتے اور اس میں اٹھنے والی موجیں بحری جہازوں تک کو اچھال دیتی ہیں۔ اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے اس کی تمام قہرمانیوں اور قوتوں کو انسان کی خدمت میں لگا دیا ہے۔ مقصود اس سے یہ ہے کہ جس طرح تم زمین کے غذائی خزانوں سے بہرہ ور ہوتے ہو اسی طرح سمندر کی تازہ غذا یعنی مچھلی کے گوشت سے بھی فائدہ اٹھاؤ۔ جس طرح جی چاہے ان کا شکار کرو۔ اور اس طرح سے اپنی ضروریات کا سامان کرو۔ اور دوسرا مقصد یہ ہے کہ ہم نے اس میں تمھاری زینت کے لیے کچھ چیزیں بھی پیدا کر رکھی ہیں۔ انھیں اپنی کوشش سے حاصل کرو۔ عام طور پر تو یہ ہوتا ہے کہ سمندر کی موجیں خود موتیوں کو باہر اگل دیتی ہیں۔ اور سمندر کے کنارے سے لوگ ان موتیوں کو حاصل کر لیتے ہیں جو اپنی خوبی اور رعنائی کی وجہ سے انسانوں کی نگاہ میں بہت قیمت رکھتے ہیں۔

ذرا تفکر کی نگاہ سے دیکھیے کہ یہ مچھلی سمندر کے جس پانی میں جنم لیتی اور پروان چڑھتی ہے اور وہیں اس کی خوراک بھی ہے وہ پانی اتنا کھاری اور کڑوا ہے کہ ہونٹوں پر نہیں لگایا جا سکتا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی قدرت دیکھیے کہ مچھلی کے گوشت میں اس کا ذائقہ اور بدبو تک داخل نہیں ہونے پاتی۔ اور پھر سمندر بعض دفعہ جن موتیوں کو اچھالتا ہے کبھی آپ نے غور کیا ہے کہ کس طرح بارش کا ایک قطرہ سیپ کے پیٹ میں اترتا ہے وہ کس

Marfat.com

طرح اس کو لے کر سمندر کی تہہ میں چلی جاتی ہے۔ اور وہ بظاہر بے جان سے اس پانی کے ایک قطرے میں کیا عمل کرتی ہے کہ اس سے ایک چمکتا ہوا موتی برآمد ہوتا ہے جس سے سورج کی چمک بھی شرماتی ہے۔

مزید فرمایا کہ سمندر کی بے کرانی سے کون واقف نہیں، اس کی گہرائی سے کسے خوف نہیں آتا، اس میں اٹھنے والے طوفانوں کی تندی کا کون مقابلہ کر سکتا ہے، لیکن اس سب کے باوجود اللہ تعالیٰ نے سمندر کو اس بات کا حکم دے رکھا ہے کہ وہ انسانوں کی کشتیاں اور جہاز اس طرح اپنے سینے پر اٹھا کے رکھے کہ وہ اس کی موجوں کو چیرتے ہوئے آگے بڑھتے رہیں، لیکن ڈوبنے نہ پائیں۔ جس زمانے میں لکڑی کے ایک تختے پر انسان سفر کرتا تھا سمندر اس وقت بھی آمادۂ خدمت تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے پابند کر رکھا ہے۔ اور آج جبکہ بادبانی کشتیوں سے بھی آگے بڑھ کر بڑے بڑے بحری جہاز اپنی مشینوں کی قوت سے سمندر کو چیرتے ہوئے سفر کرتے ہیں تو تب بھی قرآن کریم کی یہی تعلیم ہے کہ ان مشینوں کی قوت پہ مت جاؤ اللہ تعالیٰ نے اگر تمھارے لیے سمندر کو مسخر نہ کر رکھا ہوتا تو سمندر کے سینے پر تمھاری مشینیں کبھی سفر کرنے کے قابل نہ ہوتیں۔ قرآنِ پاک کی شاید اسی تعلیم کا نتیجہ ہے کہ مسلمانوں نے عرصہ دراز تک سمندر کے بیشتر حصے پر حکومت کی۔ ترکوں کے بحری بیڑے کے سامنے کسی اور کا چراغ نہیں جلتا تھا۔ اسی کی طرف اقبال نے اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا:

تھا یہاں ہنگامہ ان صحرا نشینوں کا کبھی
بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی

اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ کولمبس کے جہاز کا ملاح بھی احمد نامی ایک مسلمان تھا۔ ان تمام نعمتوں کا ذکر کرنے کے بعد قرآن کریم کا صرف ایک مطالبہ ہے کہ ان تمام نعمتوں سے تمتع حاصل کرو، جی بھر کے فائدہ اٹھاؤ لیکن اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا مت بھولو۔ اور یہی وہ بات ہے جو انسانیت کا سرمایۂ افتخار ہے۔ انسان جیسے جیسے فطرت کی قوتوں پر قابض ہوتا جاتا ہے ویسے ویسے اس کے اندر سرکشی اور طغیانی آتی جاتی ہے۔ اس سرکشی کو روکنے کا ایک ہی ذریعہ ہے کہ اسے بندگی اور شکر کی زنجیر پہنائی جائے۔

وَاَلْقٰى فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ بِكُمْ وَاَنْهٰرًا وَّسُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵﴾ وَعَلٰمٰتٍ ؕ وَبِالنَّجْمِ هُمْ یَهْتَدُوْنَ ﴿۱۶﴾

(اور اللہ تعالیٰ نے گاڑ دیے ہیں زمین میں اونچے اونچے پہاڑ تا کہ وہ تمھیں لے کر جھک نہ پڑے اور دریا جاری کردیے اور راستے بنا دیے تا کہ تم اپنی منزل کی راہ پا سکو۔ ۱۵) اور راستوں پر علامتیں بنا دی ہیں اور ستاروں کے ذریعہ سے وہ راہ یاب ہوتے ہیں۔ ۱۶) (سورۃ النحل: ۱۵-۱۶)

مزید نعمتوں کا ذکر

اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق پر عموماً اور انسانوں پر خصوصاً مزید انعامات اور احسانات کا ذکر فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ زمین کو جب بچھایا گیا تو وہ دائیں بائیں جھکتی اور ڈولتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس پر پہاڑ گاڑ دیے اور اس طرح سے زمین کی حرکت کو منظم کیا اور اس کو استحکام بخشا۔ پہاڑوں کے لیے اس آیت میں رَوَاسِیَ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ رسا کا معنی ہوتا ہے جم جانا۔ اس لیے بندرگاہ کو بھی مرسیٰ کہتے ہیں۔ پہاڑ بھی چونکہ ایک جگہ جم کے کھڑے رہتے ہیں اور حرکت نہیں کرتے اس سے ان کو بھی رَوَاسِیَ کہا جاتا ہے۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ زمین کو جب پیدا کیا گیا تو وہ اضطراری طور پر کبھی دائیں اور کبھی بائیں ڈولتی رہتی تھی۔ اس پر پہاڑ گاڑ کر اس کا توازن برقرار کر دیا۔

مزید فرمایا کہ ہم نے زمین میں دریا رواں کر دیے اور دریاؤں کے ساتھ ساتھ قدرتی راستے بھی بن جایا کرتے ہیں کیونکہ عموماً لوگ پہلے وقتوں میں پانی کے قریب رہنے کی کوشش کرتے تھے تو دریاؤں کے کناروں پر لوگوں کی دلچسپیاں بھی ہوتی تھیں اور بہت سے مفادات بھی، تو اس کے ساتھ ساتھ آنے جانے کی وجہ سے راستوں کا بن جانا قرین قیاس ہے اور یہ بات بھی مسلمہ ہے کہ دریاؤں کے ساحل ہوں یا سمندروں کے ان

Marfat.com

کے قریب قریب ایسے راستے ضرور بن جاتے ہیں جو سراسر اللہ تعالیٰ کی عطا معلوم ہوتے ہیں اور پھر ان راستوں پر قدرتی طور پر کوئی نہ کوئی ایسی علامتیں نظر آتی ہیں جن کے حوالے سے راستوں کو یاد رکھنا آسان ہوجاتا ہے اور وہی سنگ میل کا کام بھی دیتے ہیں۔ لوگ انھیں کی مدد سے مسافت کا تعین بھی کرتے ہیں اور اس طرح انسان کو اپنی منزل کا تعین اور منزل تک پہنچنا آسان ہوجاتا ہے اور جو لوگ رات کو سفر کرتے ہیں آج تو خیر رہنمائی کے لیے بہت سے نشانات موجود ہیں لیکن پرانے وقتوں میں لوگ ستاروں کی مدد سے اپنے راستے تلاش کرتے تھے۔ یہ چیزیں چونکہ ہمارے علم کا حصہ نہیں رہیں تو ہمیں آج ان کے سمجھنے میں دشواری ہوتی ہے ورنہ پرانے بزرگ بالخصوص دیہات میں آج بھی ایسے مل جائیں گے جو ستاروں کو دیکھ کر منزل کا تعین بھی کرتے ہیں اور وقت بھی معلوم کرلیتے ہیں۔ ہم نے شماریات کے بعض اساتذہ کو دیکھا کہ وہ کبھی گھڑی اپنے پاس نہیں رکھتے تھے، اس کے باوجود وہ ٹھیک وقت بتاتے اور ٹھیک جہت کا تعین کرتے۔

اَفَمَنْ یَّخْلُقُ کَمَنْ لَّا یَخْلُقُ ؕ اَفَلَا تَذَکَّرُوْنَ ﴿۱۷﴾ (سورۃ النحل : ۱۷)

(کیا وہ ذات جس نے سب کچھ پیدا فرمایا اس کی مانند ہوسکتی ہے جس نے کچھ بھی نہیں بنایا کیا تم اتنا بھی غور نہیں کرتے۔ ۱۷)

مذکورہ حقائق کے لازمی نتائج

گزشتہ آیات کریمہ میں مختلف مخلوقات کا ذکر فرمایا گیا ہے جو پروردگار کی صفتِ تخلیق کا مظہر ہیں، جن میں سے خود انسان اس کی صفتِ تخلیق کا شاہکار ہے، لیکن عجیب بات ہے کہ انسانوں نے مخلوقات میں سے بعض کو اللہ تعالیٰ کا ہمسر قرار دے دیا ہے، بعض کے بارے میں یقین کرلیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی الوہیت میں شریک ہیں، بعض کو اللہ تعالیٰ کا اوتار بنادیا۔ مختلف طریقوں سے شرک کا یہ کاروبار آگے بڑھایا گیا۔ اللہ تعالیٰ ان کی ان حماقتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سوال کررہا ہے کہ نادانو! تم یہ بتاؤ کیا وہ پروردگار جس نے ساری کائنات کو خلق کیا وہ اس مخلوق کی طرح ہوسکتا ہے جس نے ایک مکھی تک پیدا نہیں کی۔ آخر ان دونوں میں کیا نسبت ہوسکتی ہے۔ ایک کمزور اور طاقتور برابر نہیں ہوسکتے، ایک غریب اور مالدار یکساں نہیں کہے جاسکتے، ایک حاکم اور محکوم کو ہم پلہ نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ تو خالق اور مخلوق کو ایک جیسا کیسے قرار دیا جاسکتا ہے اور مخلوق کے بارے میں یہ کیسے فرض کیا جاسکتا ہے کہ اس کے اندر خالق کی صفات آجائیں گی۔ ہدایت تو خیر اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے لیکن عقل اور سمجھ تو انسانی میراث ہے اور سب کا مشترکہ اثاثہ ہے۔ اسی عقل سے فتویٰ لے کر دیکھ لو کہ کیا وہ خالق اور مخلوق اور فانی اور باقی کو ایک دوسرے کی صفات میں شریک ٹھہرانے کی اجازت دیتی ہے لیکن اہلِ دنیا عجیب ہیں کہ برتری ہمیشہ عقل کو دیتے ہیں لیکن عقیدت اور بندگی کے فیصلے بے وقوفی سے کرتے ہیں۔ قرآنِ کریم کہتا ہے کہ کیا تم ایسی موٹی بات بھی سمجھنے کی صلاحیت کھوچکے ہو۔

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۸﴾ (سورۃ النحل : ۱۸)

(اور اگر تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو تم انھیں شمار نہیں کرسکتے، بیشک اللہ تعالیٰ بڑا ہی بخشنے والا مہربان ہے۔ ۱۸)

اللہ تعالیٰ کی بے پایاں نعمتوں کی طرف اشارہ

گزشتہ آیات میں جس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی پیدا کردہ مخلوقات کا ذکر فرمایا اسی طرح اپنی بے پایاں نعمتوں کی طرف بھی اشارے فرمائے۔ قسم قسم کی نعمتوں کا ذکر کیا جن کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ گویا آسمان سے نعمتیں برس رہی ہیں، زمین سے ابل رہی ہیں اور سمندروں سے اچھل رہی ہیں اور انسان ان سے نوازا جارہا ہے۔ ہر چھوٹی بڑی مخلوق ان نعمتوں سے فیض یاب ہورہی ہے۔ انھیں نعمتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ان نعمتوں کے علاوہ بھی تم بہت سی نعمتوں کو محسوس کرسکتے ہو۔ اور اگر تم کوشش کرو کہ ان نعمتوں کو شمار کرو تو تمہاری کوششیں جواب دے جائیں گی، تم ان نعمتوں کو شمار نہیں کرسکو گے۔ معمولی ہوش و خرد کا آدمی بھی نعمتوں کی قدر پہچانتا ہے اور وہ اپنے منعم اور محسن کے بارِ احسان سے کبھی غافل نہیں ہوسکتا۔ وہ ہر ممکن طریقے سے نیکی کا بدلہ نیکی سے اور احسان کا بدلہ احسان سے دینے کی کوشش کرتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی نعمتیں چونکہ انسان کے پورے جسم، پوری زندگی، پورے

Marfat.com

حواس، پوری عقل اور پوری شخصیت پر حاوی ہیں، اس لیے وہ بجائے ایک ایک نیکی کا بدلہ دینے کے اپنی پوری شخصیت کو اللہ تعالیٰ کے سامنے ڈال دیتا ہے اور خود سپردگی سے کام لیتے ہوئے اپنا سب کچھ اس کے حوالے کر دیتا ہے تا کہ اس کی نعمتوں کا کچھ نہ کچھ حق ادا ہو سکے۔ اسی کو ایمان اور احسان کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے اور ایک وقت آتا ہے کہ اپنی جان بھی اسی کی عظمت پر قربان کر دیتا ہے، لیکن جو شخص اس کی نعمتوں سے تو ہر طرح فائدہ اٹھاتا ہے لیکن نہ اس کی عظمت کو تسلیم کرتا ہے، نہ اس کی کبریائی کو مانتا ہے۔ وہ ہر طرح کے شرک اور ہر طرح کی معصیت کا ارتکاب کرنے کے باوجود محسوس تک نہیں کرتا کہ میں کتنا بڑا جرم کر رہا ہوں۔ اور اگر اللہ تعالیٰ کا رسول اس کے کفرانِ نعمت پر اسے ملامت کرتا یا توجہ دلاتا ہے تو وہ اس کی جان کا دشمن ہو جاتا ہے۔ ایسے شخص یا ایسی قوم کے لیے ہونا تو یہ چاہیے کہ اس پر اللہ تعالیٰ کا عذاب ٹوٹ پڑے اور اسے ہمیشہ کے لیے تباہ کر دیا جائے لیکن اللہ تعالیٰ چونکہ غفور اور رحیم ہے اس لیے وہ عذاب بھیجنے میں جلدی نہیں کرتا۔ وہ مہلت پہ مہلت دیتا ہے کہ شاید یہ نادان سنبھل جائے اور اپنی غلطیوں پر متنبہ ہو کر اپنی اصلاح کر لے۔ چنانچہ یہاں غفور اور رحیم اسی عنایت اور رحمت کی طرف اشارہ کرنے کے لیے آیا ہے۔

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ﴿۱۹﴾　(سورة النحل : ۱۹)

(اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو تم چھپاتے ہو اور جو تم ظاہر کرتے ہو۔ ۱۹)

مشرکین کو وعید

یہ مشرکینِ مکہ کے لیے وعید ہے۔ انھیں تنبیہ کی جا رہی ہے کہ تمھاری ساری نافرمانیوں اور اذیت رسانیوں کے باوجود اللہ تعالیٰ کا تم پر عذاب نہیں آیا حالانکہ تم بار بار اس کا تمسخر بھی اڑا چکے ہو تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ تمھاری یہ حرکتیں اللہ تعالیٰ کے علم میں نہیں۔ جو کچھ تم ہمارے پیغمبرؐ کے ساتھ علانیہ کر رہے ہو وہ تو سب کے سامنے ہے، اس سے تو مکے کا بچہ بچہ واقف ہے۔ اللہ تعالیٰ تو تمھارے منصوبوں سے بھی واقف ہے اور تمھاری سازشوں کو بھی جانتا ہے جو تم پیغمبرؐ اور اس کی پیش کردہ دعوت کو ناکام کرنے کے لیے کر رہے ہو۔ اس نے اگر ابھی تک گرفت نہیں کی تو اس کا سبب یہ نہیں کہ وہ ان باتوں سے بے خبر ہے اس کا سبب تو صرف یہ ہے کہ اس نے تمھیں مہلت دے رکھی ہے تا کہ تم اگر سنبھلنا چاہو تو سنبھل جاؤ، لیکن تمھاری کوئی حرکت اس کے علم سے باہر نہیں، اس کے ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے، جب وہ وقت آئے گا تو پھر اس کی گرفت میں تاخیر نہیں ہوگی۔

وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَخْلُقُوْنَ شَيْئًا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ ﴿۲۰﴾ اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ ۚ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۙ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ﴿۲۱﴾

(اور جن کو یہ اللہ تعالیٰ کے سوا پکارتے ہیں وہ کسی چیز کو پیدا نہیں کر سکتے، وہ تو خود مخلوق ہیں۔ ۲۰) وہ مردہ ہیں، وہ زندہ نہیں اور نہیں سمجھتے کہ کب انھیں اٹھایا جائے گا۔ ۲۱)　(سورۃ النحل: ۲۰۔۲۱)

یہ الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ یہاں خاص طور پر جن بناوٹی معبودوں کی تردید کی جا رہی ہے وہ فرشتے یا جن یا شیاطین یا لکڑی پتھر کی مورتیاں نہیں ہیں بلکہ اصحابِ قبور ہیں اس لیے کہ فرشتے اور شیاطین تو زندہ ہیں، ان پر اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ کے الفاظ کا اطلاق نہیں ہو سکتا اور لکڑی پتھر کی مورتیوں کے معاملہ میں بعث بعد الموت کا کوئی سوال نہیں ہے، اس لیے مَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ کے الفاظ انھیں بھی خارج از بحث کر دیتے ہیں۔ اب لامحالہ اس آیت میں اَلَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ سے مراد وہ انبیاء، اولیاء، شہدا، صالحین اور دوسرے غیر معمولی انسان ہی ہیں جن کو غالی معتقدین داتا، مشکل کشا، فریادرس، غریب نواز، گنج بخش اور نہ معلوم کیا کیا قرار دے کر اپنی حاجت روائی کے لیے پکارنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس کے جواب میں اگر کوئی یہ کہے کہ عرب میں اس نوعیت کے معبود نہیں پائے جاتے تھے تو ہم عرض کریں گے کہ یہ جاہلیتِ عرب کی تاریخ سے اس کی ناواقفیت کا ثبوت ہے۔ کون پڑھا لکھا نہیں جانتا ہے کہ عرب کے متعدد قبائل،

Marfat.com

ربیعہ، کلب، تغلب، قضاعہ، کنانہ، احرث، کعب، کندہ وغیرہ میں کثرت سے عیسائی اور یہودی پائے جاتے تھے اور یہ دونوں مذاہب بری طرح انبیاءؑ، اولیاؒ اور شہداء کی پرستش سے آلودہ تھے۔ پھر مشرکین عرب کے اکثر نہیں تو بہت سے معبود وہ گزرے ہوئے انسان ہی تھے جنھیں بعد کی نسلوں نے خدا بنالیا تھا۔ بخاری میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ ود، سواع، یغوث، یعوق، نسر، یہ سب صالحین کے نام ہیں جنھیں بعد کے لوگ بت بنا بیٹھے ہیں۔ حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ اساف اور نائلہ دونوں انسان تھے۔ اسی طرح کی روایات لات اور مناۃ اور عزیٰ کے بارے میں بھی موجود ہیں اور مشرکین کا یہ عقیدہ بھی روایات میں آیا ہے کہ لات اور عزیٰ اللہ تعالیٰ کے ایسے پیارے تھے کہ اللہ تعالیٰ جاڑا لات کے ہاں اور گرمی عزیٰ کے ہاں بسر کرتے تھے، سُبْحٰنَهٗ وَتَعَالٰی عَمَّا یَصِفُوْنَ۔ (تفہیم القرآن)

اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ

فَالَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ وَّهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۲۲﴾ لَا جَرَمَ اَنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ مَا یُسِرُّوْنَ وَمَا یُعْلِنُوْنَ ؕ اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِیْنَ ﴿۲۳﴾ وَاِذَا قِیْلَ لَهُمْ مَّاذَاۤ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ ۙ قَالُوْۤا اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ ﴿۲۴﴾ لِیَحْمِلُوْۤا اَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً یَّوْمَ الْقِیٰمَةِ ۙ وَمِنْ اَوْزَارِ الَّذِیْنَ یُضِلُّوْنَهُمْ بِغَیْرِ عِلْمٍ ؕ اَلَا سَآءَ مَا

رکوع: ۳ (تمھارا معبود ایک ہی معبود ہے، پر جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے دل منکر ہیں اور وہ مغرور ہیں۔ ۲۲) یقیناً اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو وہ چھپاتے ہیں اور جو وہ ظاہر کرتے ہیں، بیشک وہ تکبر کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ ۲۳) اور جب ان سے پوچھا جاتا ہے کہ تمھارے رب نے کیا چیز اتاری ہے تو کہتے ہیں کہ یہ تو پہلے لوگوں کے من گھڑت قصے ہیں۔ ۲۴) تا کہ وہ قیامت کے دن اپنے بوجھ بھی پورے اٹھائیں اور ان لوگوں کے بوجھ میں سے بھی حصہ بٹائیں جن کو یہ بغیر کسی علم کے گمراہ کر رہے ہیں۔ جان رکھو کہ نہایت ہی برا ہو گا وہ بوجھ جو یہ اٹھائیں گے۔ ۲۵)

اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَالَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ وَّهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۲۲﴾ (سورۃ النحل : ۲۲)

(تمھارا معبود ایک ہی معبود ہے، پر جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے دل منکر ہیں اور وہ مغرور ہیں۔ ۲۲)

Marfat.com

منکرین کے انکار کا سبب غرور ہے

قرآنِ کریم نے گزشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ کی الوہیت پر متعدد دلائل ذکر کرنے کے بعد آخری فیصلہ کن بات فرمائی ہے کہ انسانو! تم اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کے مظاہر دیکھ چکے ہو۔ تم اس کے بے پناہ علم کی وسعتوں کا نظارہ کر چکے۔ زمین و آسمان میں اس کی لامحدود حاکمیت کا نفاذ بھی دیکھ چکے، کائنات کی وسعتوں میں پھیلی ہوئی تمام مخلوقات کو اس کے سامنے سر جھکائے ہوئے بھی دیکھ چکے۔ اس کے بعد تمھیں اس کی الوہیت میں کیا شبہ ہے۔ اس کے علاوہ کون ہے جو اس کی خدائی میں شریک ہوسکتا ہے۔ تمھیں اسی نے مسجودِ ملائک بنایا، اسی نے مہر و مہ کو تمھاری خدمت میں لگایا، اسی نے عناصر فطرت کو تمھارے لیے مسخر کیا، تم اللہ تعالیٰ کی عظمتوں کو تو کیا سمجھتے اپنی عظمت کو بھی نہ جان سکے۔ جنھوں نے تمھیں سجدہ کیا انھیں کے سامنے تم سجدہ ریز ہو گئے، جو تمھاری خدمت پر لگائے گئے تم انھیں کے سامنے دستِ سوال دراز کرنے لگے، تم میں اگر کچھ بھی فہم و شعور ہے تو اس بات کو سمجھنے کی کوشش کرو کہ تمھارا اِلٰہ ایک ہی اِلٰہ ہے اور وہ، وہ ہے جس نے تمام کائنات کو پیدا فرمایا۔ مزید فرمایا کہ یہ بات ایسی ناقابلِ فہم نہیں اور نہ اسے سمجھنے کے لیے کسی بڑی عقل کی ضرورت ہے۔ جو لوگ اسے قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں ان کے انکار کا سبب یہ نہیں کہ ان کا دماغ اسے قبول نہیں کرسکتا بلکہ اس کا سبب یہ ہے کہ وہ قیامت کے آنے پر یقین نہیں رکھتے۔ انھیں اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہی کا یقین نہیں۔ وہ اسی دنیا کو سب کچھ سمجھتے ہیں اور اس دنیا میں ان کی دولت اور افرادی قوت نے انھیں مغرور بنا دیا ہے اور غرور ایک ایسی بیماری ہے یہ جس سر میں بھی داخل ہوجاتی ہے اس کی غور وفکر کرنے کی صلاحیتیں دم توڑ جاتی ہیں۔ وہ ہر چیز کی عظمت اور صداقت کو دولت و شہرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

لَاجَرَمَ اَنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ مَا یُسِرُّوْنَ وَمَا یُعْلِنُوْنَ ؕ اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِیْنَ ﴿۲۳﴾ (سورۃ النحل : ۲۳)

(یقیناً اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو وہ چھپاتے ہیں اور جو وہ ظاہر کرتے ہیں، بیشک وہ تکبر کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ ۲۳)

منکرین کو تہدید

اللہ تعالیٰ کے دین کو قبول نہ کرنے کے ان کے پاس بیسیوں بہانے ہیں، کبھی کسی بات پر اعتراض کرتے ہیں اور کبھی کسی بات میں مین میخ نکالتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ یقینی طور پر اس بات کو جانتا ہے کہ وہ کیا چھپا رہے ہیں اور کیا ظاہر کر رہے ہیں۔ وہ دل سے دین کی صداقت اور آنحضرت ﷺ کی سچائی پر یقین رکھتے ہیں لیکن ان کا غرور اور تکبر ان کے راستے میں حائل ہوجاتا ہے۔ وہ بار بار ان کے ذہن میں یہ بات ڈالتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسری قوتوں کو شریک کرنا صرف تمھارا گناہ تو نہیں، تمھارے آباؤ اجداد بھی تو یہی کچھ کرتے چلے آئے ہیں۔ یہ تمھارے لیے کیسے ممکن ہے کہ ایک شخص کے کہنے پر ان تمام قوتوں کو ماننے سے انکار کر دیا جائے جنھیں تمھارے آباؤ اجداد مانتے چلے آئے ہیں۔ ان کے سامنے سوال کسی چیز کے حق یا باطل ہونے کا نہیں بلکہ اصل سوال یہ ہے کہ اپنے آباؤ اجداد کے عقیدے اور ان کے چلن کو ایک شخص کے کہنے پر کیسے چھوڑ دیا جائے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوگا کہ ہم بھی گمراہ ہیں اور ہمارے آباؤ اجداد بھی گمراہ تھے۔ یہ ایک ایسی بات ہے جو ان کے اندر کا کبر اس کے ماننے پر آمادہ نہیں ہونے دیتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ متکبر لوگ جو حق کو صرف اس لیے قبول نہ کریں اور باطل کو اس لیے باطل نہ کہیں کہ اس سے ان کے آباؤ اجداد گمراہ ٹھہرتے ہیں اور ان کے تکبر پر چوٹ پڑتی ہے۔ ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ پسند نہیں فرماتے، یعنی ان سے نفرت کرتے ہیں اور انھیں سزا دیں گے۔

Marfat.com

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ مَّاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ ۙ قَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۲۴﴾ لِيَحْمِلُوْٓا اَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۙ وَمِنْ اَوْزَارِ الَّذِيْنَ يُضِلُّوْنَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ اَلَا سَآءَ مَا يَزِرُوْنَ ﴿۲۵﴾ (سورة النحل : ۲۴، ۲۵)

(اور جب ان سے پوچھا جاتا ہے کہ تمھارے رب نے کیا چیز اتاری ہے تو کہتے ہیں کہ یہ تو پہلے لوگوں کے من گھڑت قصے ہیں۔ ۲۴) تاکہ وہ قیامت کے دن اپنے بوجھ بھی پورے اٹھائیں اور ان لوگوں کے بوجھ میں سے بھی حصہ بٹائیں جن کو یہ بغیر کسی علم کے گمراہ کر رہے ہیں۔ جان رکھو کہ نہایت ہی برا ہوگا وہ بوجھ جو یہ اٹھائیں گے۔ ۲۵)

آیتِ کریمہ میں اَسَاطِیْرُ (Mythology) کا لفظ استعمال ہوا ہے جو اسطورہ کی جمع ہے۔ بے اصل اور بے حقیقت بات کو کہتے ہیں، جیسے ہم کسی ناقابلِ اعتبار بات کو افسانہ قرار دے دیتے ہیں۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس کی حقیقت میں کوئی حیثیت نہیں۔

قرآنِ کریم کے اثرات روکنے کے لیے قریش کی تدبیر

اس آیتِ کریمہ کا پس منظر یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی دعوت نے جب مکے سے باہر بھی اپنے اثرات پیدا کرنے شروع کیے اور خواص سے نکل کر عوام میں بھی اس کے چرچے ہونے لگے تو ایک نئی صورتحال یہ پیدا ہوئی کہ عوام نے خواص سے اس دعوت کی حقیقت کو جاننے کی کوشش شروع کر دی۔ جب بھی انھیں موقع ملتا وہ کسی اپنے وڈیرے یا کسی دولت مند سے پوچھتے کہ محمد (ﷺ) جس بات کی دعوت دیتے ہیں، آخر اس کی حقیقت کیا ہے۔ اسی طرح وہ امم ماضیہ میں سے جن امتوں پر عذاب آنے کا ذکر کرتے ہیں اور جن اسباب کی وجہ سے کرتے ہیں ان میں کہاں تک سچائی ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم بھی اسی خطرناک انجام کی طرف بڑھ رہے ہوں۔ اسی طرح جب حج کے موقع پر باہر سے لوگ آتے تو وہ بھی لوگوں سے سنی سنائی باتوں کی تحقیق کرنے کی کوشش کرتے اور وہ بھی اسی طرح کے سوالات کرتے۔ اشرافِ قریش نے محسوس کیا کہ یہ تو ہمارے لیے ایک مشکل پیدا ہوگئی ہے۔ چنانچہ انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ جب کبھی اس طرح کا کوئی سوال نبی اور اس کی دعوت کے بارے میں پوچھا جائے تو انھیں یقین دلانے کی کوشش کرو کہ اس دعوت کی کوئی حقیقت نہیں اور اس نبوت کا بھی کوئی اعتبار نہیں اور ماضی کے جن واقعات کو یہ پیغمبر بیان کرتا ہے ان کی کوئی حقیقت نہیں، وہ سینہ بہ سینہ پھیلنے والی ایسی کہانیاں ہیں جنھیں زیادہ سے زیادہ افسانہ کہا جا سکتا ہے۔ نہ ایسی کوئی قوم گزری اور نہ کسی پر عذاب آیا اور نہ اس نبوت اور نہ اس پر اترنے والی کتاب کی کوئی حقیقت ہے۔

اشرافِ قریش کی اس سازش اور کاوش کے جواب میں قرآنِ کریم انھیں ان کے انجام سے آگاہ کرتا ہے کہ انھیں شاید اس بات کا علم نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے دین کی دعوت کے بارے میں غلط فہمیاں پھیلانا اور اس طرح لوگوں کو حقیقت سے گمراہ کرنا اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ایک جرم ہے۔ قیامت کے دن جب یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے روبرو پیش ہوں گے تو جہاں انھیں اپنے اعمال کا حساب دینا ہوگا اور اس کی سزا بھگتنا ہوگی وہیں وہ ان لوگوں کی پاداش میں بھی پکڑے جائیں گے جنھیں انھوں نے گمراہ کیا تھا۔ اپنے بے ایمانی اور بدعملی کی سزا تو مکمل طور پر بھگتیں گے لیکن دوسروں کی بداعمالیوں کی سزا میں سے اتنا حصہ انھیں پہنچے گا جتنا ان کی گمراہی میں ان کی کوششیں شامل رہی ہوں گی کیونکہ اللہ تعالیٰ کا عدل کسی کے ساتھ بے انصافی نہیں کرتا۔ اپنے اعمال کا تو پوری طرح ہر فرد ذمہ دار ہے لیکن دوسرے کے اعمال کا وہ اتنا ہی ذمہ دار ہے جتنا اس کی گمراہی میں اس کا حصہ ہے اور رہا وہ شخص جو کسی کے کہنے پر گمراہ ہوا وہ اپنی ذمہ داری سے بچ نہیں سکے گا، گمراہ کرنے والے کو بھی سزا ملے گی لیکن گمراہ ہونے والا بھی اس لیے اپنی سزا میں پکڑا جائے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے عقل دی، فیصلے کی آزادی بخشی اور پیغمبر نے براہ راست اسے دعوت دی۔ صحیح فیصلہ تک پہنچنے کے تمام امکانات اسے میسر تھے لیکن اس نے اپنی ذمہ داری کا بوجھ اٹھانے کی بجائے دوسروں کا سہارا لیا تو یہ بجائے خود جرم ہے۔ اس لیے یہ اپنی ذمہ داری میں پکڑا جائے گا اور گمراہ کرنے والے اپنے جرم میں پکڑے جائیں گے۔ آخر میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ کاش یہ لوگ اس وقت غور کریں کہ جب یہ لوگ اپنے اپنے جرم میں پکڑے جائیں گے اور ان پر ان کے جرائم اور ان کی سزاؤں کا بوجھ لادا جائے گا تو کس قدر برا بوجھ ہوگا جسے آج یہ سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

Marfat.com

قَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَاَتَى اللّٰهُ بُنْيَانَهُمْ مِّنَ
الْقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَيْهِمُ السَّقْفُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَاَتٰىهُمُ الْعَذَابُ
مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿٢٦﴾ ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُخْزِيْهِمْ وَيَقُوْلُ
اَيْنَ شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تُشَآقُّوْنَ فِيْهِمْ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا
الْعِلْمَ اِنَّ الْخِزْيَ الْيَوْمَ وَالسُّوْٓءَ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿٢٧﴾ الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ
الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ۪ فَاَلْقَوُا السَّلَمَ مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ
سُوْٓءٍ ؕ بَلٰٓى اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿٢٨﴾ فَادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ
جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ فَلَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴿٢٩﴾ وَقِيْلَ
لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا مَاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ ؕ قَالُوْا خَيْرًا ؕ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا
فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ؕ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ ؕ وَلَنِعْمَ دَارُ
الْمُتَّقِيْنَ ﴿٣٠﴾ جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ
لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَآءُوْنَ ؕ كَذٰلِكَ يَجْزِي اللّٰهُ الْمُتَّقِيْنَ ﴿٣١﴾ الَّذِيْنَ
تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ ۙ يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ۙ ادْخُلُوا
الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿٣٢﴾ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ
الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِيَ اَمْرُ رَبِّكَ ؕ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ
وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿٣٣﴾

Marfat.com

فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۳۴﴾

رکوع: ۴ (دعوتِ حق کے خلاف) ان لوگوں نے بھی مکروفریب کیا جو ان سے پہلے تھے، تو اللہ نے ان کی عمارت جڑوں سے اکھاڑ دی، پس ان کے اوپر سے ان پر چھت آ پڑی اور ان پر عذاب وہاں سے آیا جہاں سے ان کو گمان بھی نہ تھا۔ ۲۶) پھر قیامت کے دن اللہ انھیں ذلیل وخوار کرے گا اور پوچھے گا کہ کہاں ہیں میرے وہ شریک جن کی حمایت میں تم لڑتے تھے، جن کو علم عطا ہوا وہ پکار اٹھیں گے، آج رسوائی اور بدبختی ہے کافروں کے لیے۔ ۲۷) ہاں انھیں کافروں کے لیے جو اپنے نفس پر ظلم کرتے ہوئے جب ملائکہ کے ہاتھوں گرفتار ہوتے ہیں تو (سرکشی چھوڑ کر) فوراً سپر ڈال دیتے ہیں کہ ہم تو کوئی برائی نہیں کر رہے تھے، ہاں بیشک اللہ تعالیٰ اچھی طرح باخبر ہے اس سے جو تم کرتے رہے ہو۔ ۲۸) پس اب جہنم کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ، اسی میں ہمیشہ رہنے والے بن کر۔ بیشک برا ٹھکانہ ہے غرور وتکبر کرنے والوں کے لیے۔ ۲۹) اور یوں ہی پوچھا گیا ان سے جو متقی تھے کہ تمھارے رب نے کیا چیز اتاری ہے تو وہ جواب دیتے ہیں، سراپا خیر۔ جن لوگوں نے بھلائی کی راہ اختیار کی ان کے لیے اس دنیا میں بھی بھلائی ہے اور دارِ آخرت تو اس سے کہیں بہتر ہے۔ اور کیا ہی خوب ہے پرہیزگاروں کا گھر۔ ۳۰) ہمیشہ رہنے کے باغ ہیں جن میں وہ داخل ہوں گے، ان کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، ان کے لیے ان میں وہ سب کچھ ہو گا جو چاہیں گے۔ اللہ تعالیٰ اہلِ تقویٰ کو اسی طرح صلہ دے گا۔ ۳۱) وہ متقی جن کی روحیں فرشتے قبض کرتے ہیں اس حال میں کہ وہ خوش ہوتے ہیں، اس وقت فرشتے کہتے ہیں، آپ لوگوں پر سلامتی ہو، جنت میں داخل ہو جائیے، اپنے اعمال کے صلہ میں۔ ۳۲) یہ لوگ تو بس اس بات کے منتظر ہیں کہ ان کے پاس فرشتے آئیں یا آپ کے رب کا (اٹل) حکم آ جائے۔ یوں ہی ان لوگوں نے بھی کیا تھا جو ان کے پیشرو تھے۔ اور اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھاتے رہے۔ ۳۳) تو ان کو ان کے کیے کی سزائیں پہنچیں اور گھیر لیا انھیں اس عذاب نے جس کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے۔ ۳۴)

قَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَاَتَى اللّٰهُ بُنْيَانَهُمْ مِّنَ الْقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَيْهِمُ السَّقْفُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَاَتٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۲۶﴾ (سورۃ النحل : ۲۶)

(دعوتِ حق کے خلاف) ان لوگوں نے بھی مکروفریب کیا جو ان سے پہلے تھے، تو اللہ تعالیٰ نے ان کی عمارت جڑوں سے اکھاڑ دی، پس ان کے اوپر سے ان پر چھت آ پڑی اور ان پر عذاب وہاں سے آیا جہاں سے ان کو گمان بھی نہ تھا۔ ۲۶)

مکر، سازش اور چال کو بھی کہتے ہیں اور خفیہ تدبیر کو بھی۔

Marfat.com

گزشتہ قوموں کے احوال سے مشرکین کو وارننگ

اشرارِ قریش کو سنا کر یہ فرمایا جا رہا ہے کہ تم سابقہ امتوں کے واقعات کو قصہ کہانیاں سمجھتے ہو اور انھیں افسانہ قرار دے کر بے اصل اور بے اعتبار ٹھہراتے ہو، تمھارا یہ رویہ کوئی نیا رویہ نہیں۔ جن قوموں پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آیا ان کا رویہ بالکل یہی تھا۔ وہ بھی دعوتِ حق کو روکنے اور اللہ تعالیٰ کے نبیوںؑ کو ناکام کرنے کے لیے ہر طرح کے مکروفریب سے کام لیتے تھے اور وہ اس انتظار میں رہتے تھے کہ انھیں موقع ملے تو وہ پیغمبر اور اس پر ایمان لانے والوں کو نیست و نابود کر دیں۔ پیغمبرؑ ان کی روز افزوں مخالفت کو دیکھ کر انھیں سمجھانے کی کوشش کرتے، حتیٰ کہ انھیں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈراتے تاکہ وہ اپنی سازشوں سے باز آ جائیں لیکن وہ بجائے رکنے یا سمجھنے کے ان کی ہر بات کا مذاق اڑاتے اور عذاب کو بھی ایک کھیل سمجھتے۔ اور جب بھی پیغمبرؑ یا کسی مسلمان سے سامنا ہوتا تو انھیں چھیڑتے ہوئے کہتے کہ کہاں ہے وہ تمھارا عذاب، وہ پہنچ کیوں نہیں پاتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ وہ اسی طرح کھیل اور تماشے میں لگے رہے اور پیغمبرؑ کی ہر بات کا مذاق اڑاتے رہے تا آنکہ اللہ تعالیٰ کا عذاب ان پر آ گیا اور وہ عذاب اس شان سے آیا کہ اپنے جن مضبوط مکانوں پر انھیں بہت ناز تھا ان کی بنیادیں جڑوں سے اکھاڑ دی گئیں اور پھر ان کی چھتیں ان کے سروں پر آ پڑیں۔ عام طور پر معذب قوموں پر جو عذاب آئے ہیں ان کی شکل یہی رہی کہ شدید زلزلے سے ان کی بنیادیں ہلائی گئیں جس سے دیواریں ڈھے گئیں اور پھر چھتیں ان کے سروں پر آ پڑیں کیونکہ زلزلوں کے ساتھ عام طور پر تیز آندھیاں بھی آئیں۔ اس کے بعد ان پر پتھروں کی بارش ہوئی۔ اس پورے پراسس کے نتیجے میں شہروں اور بستیوں کی شکل ایسے ویرانوں کی ہو گئی جیسے یہاں کبھی کوئی آباد نہیں رہا۔ یہ تو وہ عذاب ہے جو دنیا میں ان پر آیا لیکن وہ بڑا عذاب جو قیامت کو آئے گا وہ تو ابھی ان کے انتظار میں ہے۔

ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُخْزِيْهِمْ وَيَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَآءِ يَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تُشَآقُّوْنَ فِيْهِمْ ۭ قَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اِنَّ الْخِزْيَ الْيَوْمَ وَالسُّوْۗءَ عَلَي الْكٰفِرِيْنَ ﴿٢٧﴾ الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰۗىِٕكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ۠ فَاَلْقَوُا السَّلَمَ مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوْۗءٍ ۭ بَلٰٓى اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿٢٨﴾ (سورة النحل : ٢٧. ٢٨)

(پھر قیامت کے دن اللہ تعالیٰ انھیں ذلیل و خوار کرے گا اور پوچھے گا کہ کہاں ہیں میرے وہ شریک جن کی حمایت میں تم لڑتے تھے، جن کو علم عطا ہوا وہ پکار اٹھیں گے، آج رسوائی اور بدبختی ہے کافروں کے لیے۔ ٢٧) ہاں انھی کافروں کے لیے جو اپنے نفس پر ظلم کرتے ہوئے جب ملائکہ کے ہاتھوں گرفتار ہوتے ہیں تو (سرکشی چھوڑ کر) فوراً سپر ڈال دیتے ہیں کہ ہم تو کوئی برائی نہیں کر رہے تھے، ہاں بیشک اللہ تعالیٰ اچھی طرح باخبر ہے اس سے جو تم کرتے رہے ہو۔ ٢٨)

قیامت کے دن مشرکین کی رسوائی

کافر قوموں کے بڑے بڑے سردار اللہ تعالیٰ کے نبیؑ کی دعوت سے صرف اس لیے محروم رہتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو ہر لحاظ سے نبی سے فائق اور بلند سمجھتے ہیں۔ ان کے لیے یہ بات بہت مشکل ہے کہ اپنے سے کم مرتبہ شخص کی رہنمائی قبول کر کے اپنے آپ کو اس کے اتباع میں دے دیں۔ چنانچہ ان کی نخوت اور تکبر کی پہلی سزا تو عذاب کی شکل میں آتی ہے جب ان کی بستیاں تباہ و برباد کر دی جاتی ہیں اور وہ اس طرح لقمۂ اجل ہو جاتے ہیں کہ زمین پر ان کا نام و نشان بھی نہیں رہتا۔ اور دوسری سزا جس میں ان کے تکبر کو پوری طرح کچل دیا جاتا ہے وہ قیامت کو دی جائے گی جب اللہ تعالیٰ انھیں یہ کہہ کر ذلیل و رسوا کرے گا کہ بتاؤ کہاں ہیں میرے وہ شرکاء جن کی حمایت میں تم بات بات پر آستینیں چڑھا لیتے تھے اور تم ہر ایک سے ان سے لڑنے کے لیے تیار رہتے تھے آج وہ تمھاری مدد کے لیے کیوں نہیں آتے۔ اللہ تعالیٰ کے اس سوال پر معلوم ہوتا ہے کہ

Marfat.com

محشر میں ایک سناٹا طاری ہو جائے گا۔ وہ لوگ جو دنیا میں علم سے نوازے گئے یعنی اللہ تعالیٰ نے انھیں ایمان کی دولت بخشی وہ آپس میں ایک دوسرے سے کہیں گے کہ آج کا دن کفار کے لیے رسوائی کا دن ہے۔ وہ اپنے تئیں نہ جانے دنیا میں کیا سمجھتے تھے لیکن آج کفر نے ان کی زبانوں پر مہر لگادی ہے۔ آج وہ زبان کھولیں تو کس برتے پر، اور منہ کھولیں تو کس کے اعتماد پر۔

اس پر اللہ تعالیٰ مزید اضافہ کرتے ہوئے فرمائیں گے کہ یہ کافر تو وہ شخصیتیں ہیں کہ جب اپنے کفر میں گم اور نخوت میں پھنکارتے ہوئے حق کو ناکام کرنے کے لیے ہر ممکن تدبیر بروئے کار لارہے تھے تو فرشتوں نے انھیں آ پکڑا اور ان پر ہنٹر برساتے ہوئے ان کی جانیں نکالیں اور ساتھ ہی پوچھتے جارہے تھے کہ بتاؤ کہاں ہیں تمھارے وہ شریک جن پر تمھیں بہت بھروسہ تھا کہ وہ تمھیں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچالیں گے تو اس وقت ان متکبرین کا حال یہ ہوگا کہ ہر طرح کی نخوت اور کروفران کے دماغوں سے نکل جائے گا اور یہ فوراً ڈگیں ڈال دیں گے اور پھر اپنے بچاؤ کی کوئی تدبیر نہ پاکر جھوٹ بولنے کی کوشش کریں گے کہ ہم تو کوئی برائی نہیں کرتے تھے، نہ جانے آپ ہم پر ایسی تختی کیوں کررہے ہیں تو فرشتے جواب دیں گے کہ تمھیں یہ غلط فہمی ہے کہ تمھارا جھوٹ تمھیں بچالے گا اللہ تعالیٰ تمھارے کرتوتوں سے پوری طرح باخبر ہے اس لیے جھوٹ بول کر تم اصل حقیقت کو چھپا نہیں سکتے۔

فَادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ فَلَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ۝ (سورۃ النحل : ۲۹)

(پس اب جہنم کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ، اسی میں ہمیشہ رہنے والے بن کر۔ بیشک برا ٹھکانہ ہے غرور و تکبر کرنے والوں کے لیے۔ ۲۹)

کافروں کی جب جان نکالی جائے گی اور جس طرح ان کے ساتھ توہین آمیز سلوک ہوگا اسی وقت ان کو یہ بھی بتادیا جائے گا کہ اب تمھارے مقدر میں جہنم ہے، بس اب اسی کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ۔ جہنم میں داخلہ اگرچہ قیامت کے دن ہوگا لیکن اس کی خبر انھیں قبضِ روح کے ساتھ ہی دے دی جائے گی۔ پھر جہنم کے دروازوں کا بھی ذکر فرمایا تاکہ کافروں کو اس کی وسعت کا اندازہ ہو جائے اور یہ بھی بتادیا جائے گا کہ ہمارے یہاں عزت ان کو ملتی ہے جو ہمارے سامنے جھکتے ہیں، لیکن جو تکبر اختیار کرتے ہیں ان کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے

ان آیتوں میں چونکہ قبضِ روح کے بعد ملائکہ اور مرنے والوں کی گفتگو کا ذکر ہے جس سے عذاب و ثوابِ قبر کا تأثر ملتا ہے۔ اس پر صاحب تفہیم القرآن نے ایک مفصل نوٹ لکھا ہے، اسے ہم شکریہ کے ساتھ یہاں نقل کررہے ہیں۔

عذابِ قبر

یہ آیت اور اس کے بعد والی آیت جس میں قبضِ روح کے بعد متقیوں اور ملائکہ کی گفتگو کا ذکر ہے، قرآن مجید کی ان متعدد آیات میں سے ہے جو صریح طور پر عذاب و ثوابِ قبر کا ثبوت دیتی ہیں۔ حدیث میں ''قبر'' کا لفظ مجازاً عالمِ برزخ کے لیے استعمال ہوا ہے اور اس سے مراد وہ عالم ہے جس میں موت کی آخری ہچکی سے لے کر بعث بعد الموت کے پہلے جھٹکے تک انسانی ارواح رہیں گی۔ منکرین حدیث کو اس پر اصرار ہے کہ یہ عالم بالکل عدمِ محض کا عالم ہے جس میں کوئی احساس اور شعور نہ ہوگا اور کسی قسم کا عذاب یا ثواب نہ ہوگا لیکن یہاں دیکھیے کہ کفار کی روحیں جب قبض کی جاتی ہیں تو وہ موت کی سرحد کے پار کا حال بالکل اپنی توقعات کے خلاف پاکر سراسیمہ ہو جاتی ہیں اور فوراً سلام ٹھونک کر ملائکہ کو یقین دلانے کی کوشش کرتی ہیں کہ ہم کوئی برا کام نہیں کررہے تھے۔ جواب میں ملائکہ ان کو ڈانٹ بتاتے ہیں اور جہنم واصل ہونے کی پیشگی خبر دیتے ہیں۔ دوسری طرف اتقیاء کی روحیں جب قبض کی جاتی ہیں تو ملائکہ ان کو سلام بجالاتے ہیں اور جنتی ہونے کی پیشگی مبارکباد دیتے ہیں۔ کیا برزخ کی زندگی، احساس، شعور، عذاب اور ثواب کا اس سے بھی زیادہ کھلا ہوا کوئی ثبوت درکار ہے؟ اسی سے ملتا جلتا مضمون سورۂ نساء آیت نمبر 97 میں گزر چکا ہے جہاں ہجرت نہ کرنے والے مسلمانوں نے قبضِ روح کے بعد ملائکہ کی گفتگو کا ذکر آیا ہے اور ان سب سے زیادہ

Marfat.com

صاف الفاظ میں عذابِ برزخ کی تصریح سورۂ مومن آیت 45، 46 میں کی گئی ہے جہاں اللہ تعالیٰ فرعون اور آلِ فرعون کے متعلق فرماتا ہے کہ ''ایک سخت عذاب ان کو گھیرے ہوئے ہے، یعنی صبح و شام وہ آگ کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں، پھر جب قیامت کی گھڑی آجائے گی تو حکم دیا جائے گا کہ آلِ فرعون کو شدید تر عذاب میں داخل کرو۔''

حقیقت یہ ہے کہ قرآن اور حدیث، دونوں سے موت اور قیامت کے درمیان کی حالت کا ایک ہی نقشہ معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ موت محض جسم و روح کی علیحدگی کا نام ہے نہ کہ بالکل معدوم ہو جانے کا۔ جسم علیحدہ ہو جانے کے بعد روح معدوم نہیں ہو جاتی بلکہ اس پوری شخصیت کے ساتھ زندہ رہتی ہے جو دنیا کی زندگی کے تجربات اور ذہنی و اخلاقی اکتسابات سے بنی تھی۔ اس حالت میں روح کے شعور، احساس، مشاہدات اور تجربات کی کیفیت خواب سے ملتی جلتی ہوتی ہے۔ ایک مجرم روح سے فرشتوں کی باز پرس اور پھر اس کا عذاب اور اذیت میں مبتلا ہونا اور دوزخ کے سامنے پیش کیا جانا، سب کچھ اس کی کیفیت سے مشابہ ہوتا ہے جو ایک قتل کے مجرم پر پھانسی کی تاریخ سے ایک دن پہلے ایک ڈراؤنے خواب کی شکل میں گزرتی ہوگی۔ اسی طرح ایک پاکیزہ روح کا استقبال اور پھر اس کا جنت کی بشارت سننا، اور اس کا جنت کی ہواؤں اور خوشبوؤں سے متمتع ہونا، یہ سب بھی اس ملازم کے خواب سے ملتا جلتا ہوگا جو حسنِ کارکردگی کے بعد سرکاری بلاوے پر ہیڈ کوارٹر میں حاضر ہوا اور وعدۂ ملاقات کی تاریخ سے ایک دن پہلے آئندہ انعامات کی امیدوں سے لبریز ایک سہانا خواب دیکھ رہا ہو۔ یہ خواب یک لخت نفخ صورِ دوم سے ٹوٹ جائے گا اور یکا یک میدانِ حشر میں اپنے آپ کو جسم و روح کے ساتھ زندہ پا کر مجرمین حیرت سے کہیں گے کہ یٰوَیۡلَنَا مَنۡۢ بَعَثَنَا مِنۡ مَّرۡقَدِنَا (ارے یہ کون ہمیں ہماری خواب گاہ سے اٹھا لایا؟) (۵۲:۳۶) مگر اہلِ ایمان پورے اطمینان سے کہیں گے کہ ھٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحۡمٰنُ وَصَدَقَ الۡمُرۡسَلُوۡنَ (۵۲:۳۶) (یہ وہی چیز ہے جس کا رحمٰن نے وعدہ کیا تھا اور رسولوں کا بیان سچا تھا۔) مجرمین کا فوری احساس اس وقت یہ ہوگا کہ وہ اپنی خواب گاہ میں (جہاں بسترِ موت پر انھوں نے دنیا میں جان دی تھی شاید کوئی ایک گھنٹہ بھر سوئے ہوں گے اور اب اچانک اس حادثہ سے آنکھ کھلتے ہی کہیں بھاگے چلے جا رہے ہیں مگر اہلِ ایمان پورے ثباتِ قلب کے ساتھ کہیں گے کہ لَقَدۡ لَبِثۡتُمۡ فِیۡ کِتٰبِ اللّٰهِ اِلٰی یَوۡمِ الۡبَعۡثِ ۫ فَهٰذَا یَوۡمُ الۡبَعۡثِ وَلٰکِنَّکُمۡ کُنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ (اللہ تعالیٰ کے دفتر میں تم روزِ حشر تک ٹھہرے رہے ہو اور یہی روزِ حشر ہے مگر تم اس چیز کو جانتے نہ تھے۔) (تفہیم القرآن)

وَقِیۡلَ لِلَّذِیۡنَ اتَّقَوۡا مَا ذَاۤ اَنۡزَلَ رَبُّکُمۡ ؕ قَالُوۡا خَیۡرًا ؕ لِلَّذِیۡنَ اَحۡسَنُوۡا فِیۡ هٰذِهِ الدُّنۡیَا حَسَنَةٌ ؕ وَلَدَارُ الۡاٰخِرَةِ خَیۡرٌ ؕ وَلَنِعۡمَ دَارُ الۡمُتَّقِیۡنَ ﴿۳۰﴾ جَنّٰتُ عَدۡنٍ یَّدۡخُلُوۡنَهَا تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ لَهُمۡ فِیۡهَا مَا یَشَآءُوۡنَ ؕ کَذٰلِکَ یَجۡزِی اللّٰهُ الۡمُتَّقِیۡنَ ﴿۳۱﴾ الَّذِیۡنَ تَتَوَفّٰهُمُ الۡمَلٰٓئِکَةُ طَیِّبِیۡنَ ۙ یَقُوۡلُوۡنَ سَلٰمٌ عَلَیۡکُمُ ۙ ادۡخُلُوا الۡجَنَّةَ بِمَا کُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۳۲﴾

(اور یوں ہی پوچھا گیا ان سے جو متقی تھے کہ تمھارے رب نے کیا چیز اتاری ہے تو وہ جواب دیتے ہیں، سراپا خیر۔ جن لوگوں نے بھلائی کی راہ اختیار کی ان کے لیے اس دنیا میں بھی بھلائی ہے اور دارِ آخرت تو اس سے کہیں بہتر ہے۔ اور کیا ہی خوب ہے پرہیزگاروں کا گھر۔ ۳۰) ہمیشہ رہنے کے باغ ہیں جن میں وہ داخل ہوں گے، ان کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، ان کے لیے ان میں وہ سب کچھ ہوگا جو چاہیں گے۔ اللہ تعالیٰ اہلِ تقویٰ کو اسی طرح صلہ دے گا۔ ۳۱) وہ متقی جن کی روحیں فرشتے قبض کرتے ہیں اس حال میں کہ وہ خوش ہوتے ہیں، اس وقت فرشتے کہتے ہیں، آپ لوگوں پر سلامتی ہو، جنت میں داخل ہو جائیے، اپنے اعمال کے صلہ میں۔ ۳۲) (سورۃ النحل: ۳۰-۳۱-۳۲)

Marfat.com

متقین کا رویہ

پیچھے گزر چکا ہے کہ عوام جب خواص سے یا باہر سے آنے والے اہلِ مکہ سے پوچھتے تھے کہ جس نبی نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے اور وہ کہتا ہے کہ اس پر وحی اترتی ہے، وہ کیا چیز ہے اور اس کی وہ تعلیم کیا ہے جو وہ لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے، تو کفار اسے اگلے لوگوں کے قصے کہانیاں کہہ کر بے اعتبار ٹھہرانے کی کوشش کرتے تھے۔ اس آیتِ کریمہ میں بتلایا گیا ہے کہ باہر سے آنے والے بعض دفعہ کسی مسلمان سے پوچھ بیٹھتے تو وہ جواب میں نہایت عمدہ طریقے سے اس تعلیم کا لب لباب بیان کرتے اور ان کی خوبیاں پوچھنے والے کے سامنے واضح کرتے تھے۔ اور اس میں یہ بات خاص طور سے کہتے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی یہ ہدایت ہمارے لیے سرتاپا خیر ہی خیر ہے۔ اس میں انسانوں کے لیے بھلائی کے سوا کچھ نہیں۔ اور یہ بات بھی واضح کرتے کہ اس تعلیم نے اگرچہ انسان کے لیے جو منزل مقرر کی ہے وہ آخرت ہے لیکن وہ دنیوی ذمہ داریوں سے انسانوں کو فارغ قرار نہیں دیتا۔ اس لیے وہ اس بات کی تاکید کرتا ہے کہ جس شخص نے دنیا میں بھلائی کی یعنی دنیوی زندگی اس طرح گزاری جس طرح اللہ تعالیٰ کے پیغمبر نے تعلیم دی ہے تو اسے دنیا میں عزت وسرفرازی کی زندگی ملے گی۔ وہ نہایت آسودگی سے اپنی زندگی بسر کرے گا۔ اگر وہاں اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کو حکومت قائم کرنے کا موقع مل گیا تو وہ حکومت اہلِ زمین کے لیے رحمت ثابت ہوگی۔ غرض یہ تعلیم اور یہ ہدایت انفرادی زندگی کے لیے بھی سرتاپا رحمت ہے اور اجتماعی زندگی کے لیے بھی کامیابیوں کی نوید ہے اور بالآخر آخرت کا گھر اللہ تعالیٰ نے ایسے ہی متقی لوگوں کے لیے رکھا ہے جنھوں نے زندگی اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اطاعت میں گزاری اور ہر طرح کی آلودگیوں سے محفوظ رہے۔ قیامت کے بعد ان کا ٹھکانہ ایسے باغات ہوں گے جنھیں کبھی زوال نہیں ہوگا۔ ان کے نیچے سے ندیاں رواں ہوں گی اور حیران کن بات یہ کہ اہلِ جنت کو وہاں ہر وہ چیز ملے گی جس کی وہ خواہش کریں گے جبکہ دنیا میں بڑے سے بڑا حکمران بھی یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ اس کو وہ سب کچھ مل گیا جس کی اس نے خواہش کی۔ یہاں سے سکندر بھی خالی ہاتھ جاتے ہیں اور سپر پاور کہلانے والے بھی اپنی ناپاک امیدوں سمیت ہلاکت کے گڑھے میں اتر جاتے ہیں۔

مزید فرمایا کہ اہلِ تقویٰ کو دنیا میں بھی کامیابیاں ملیں گی اور آخرت میں بھی لیکن اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ ان کی موت اسی طرح آئے گی جیسے کافر کو آتی ہے۔ اس لیے یہ بات واضح کردی گئی کہ فرشتے جب ان کی روح قبض کریں گے تو وہ نہایت خوش وخرم اور موت کی ادنیٰ آلودگی سے بھی پاکیزہ ہوں گے۔ روح قبض کرنے والے فرشتے جب ان کے سامنے آئیں گے تو انھیں سلامتی کا مژدہ سنائیں گے اور اس میں یہ کہہ کر ان کی خوشیوں میں اضافہ کردیں گے کہ تمھیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ ملنے والا ہے یہ یقیناً اس کی عطا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ تمھارے اعمال کا صلہ بھی ہے۔

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِيَ اَمْرُ رَبِّكَ ؕ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝٣٣ فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝٣٤

(یہ لوگ تو بس اس بات کے منتظر ہیں کہ ان کے پاس فرشتے آئیں یا آپ کے رب کا (اٹل) حکم آجائے۔ یوں ہی ان لوگوں نے بھی کیا تھا جو ان کے پیشرو تھے۔ اور اللہ تعالیٰ نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھاتے رہے۔ ۳۳) تو ان کو ان کے کیے کی سزائیں پہنچیں اور گھیر لیا انھیں اس عذاب نے جس کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے۔ ۳۴) (سورۃ النحل: ۳۳-۳۴)

تاریخ سے سبق لینے کی دعوت

اچھے اور برے لوگوں کے طور اطوار اور ان کے انجام کا ذکر کردینے کے بعد یہ آخری نصیحت ہے جو نہایت ہمدردی سے کی جارہی ہے۔ کہنا یہ ہے کہ جہاں تک سمجھانے بجھانے اور دلائل سے قائل کرنے کا تعلق تھا اس میں تو کوئی کمی نہیں چھوڑی گئی۔ اس کے باوجود بھی اگر اہل مکہ ہدایت کا راستہ اختیار کرنے کے لیے تیار نہیں تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ انھیں صرف اس بات کا انتظار ہے کہ کب روح قبض کرنے والے فرشتے ان کے سروں پر

Marfat.com

آ کھڑے ہوں اور یا اللہ تعالیٰ کا عذاب آ جائے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ جب تک موت کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ لیں گے یا عذاب کا ایک جھٹکا انھیں ہلا نہیں ڈالے گا اس وقت تک وہ اپنا رویہ بدلنے کو تیار نہیں ہوں گے۔ مزید فرمایا کہ دنیا میں بدنصیب لوگ صرف یہی نہیں ہیں اس سے پہلے بھی ایسے لوگ گزر چکے ہیں۔ ان کا رویہ بھی ایسا ہی تھا۔ انھیں بھی ہر چند نصیحت کی گئی لیکن انھوں نے کسی نصیحت سے اثر قبول نہیں کیا۔ آخر اللہ تعالیٰ کا عذاب ان پر آ دھمکا اور ان کے کرتوتوں کی سزاؤں نے انھیں آ پکڑا اور جس عذاب کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے اسی عذاب نے انھیں گھیر لیا اور جب اللہ تعالیٰ کا عذاب آ جاتا ہے تو پھر اس سے کوئی مفر باقی نہیں رہتا۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا
مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ نَّحْنُ وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ دُوْنِهٖ
مِنْ شَيْءٍ ؕ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ فَهَلْ عَلَى
الرُّسُلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿٣٥﴾ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا
اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ هَدَى
اللّٰهُ وَمِنْهُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلٰلَةُ ؕ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ
فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿٣٦﴾ اِنْ تَحْرِصْ عَلٰى
هُدٰىهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ يُّضِلُّ وَمَا لَهُمْ مِّنْ
نّٰصِرِيْنَ ﴿٣٧﴾ وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ لَا يَبْعَثُ اللّٰهُ مَنْ
يَّمُوْتُ ؕ بَلٰى وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٣٨﴾ ۙ
لِيُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِيْ يَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا
اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰذِبِيْنَ ﴿٣٩﴾ اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ اِذَآ اَرَدْنٰهُ اَنْ نَّقُوْلَ
لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿٤٠﴾ ع

Marfat.com

رکوع: ۵ (اور کہا ان لوگوں نے جنھوں نے شرک کیا کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم اس کے سوا کسی چیز کو نہ پوجتے اور نہ ہمارے آباؤاجداداور نہ ہم اس کے بغیر کسی چیز کو حرام ٹھہراتے، ایسی ہی (بے سروپا) باتیں کیا کرتے تھے، ان کے پیشرو بھی۔ تو رسولوں پر واضح طور پہنچا دینے کے سوااور کوئی ذمہ داری نہیں۔ ۳۵) اور ہم نے ہر امت میں ایک رسول اس دعوت کے ساتھ بھیجا کہ اللہ ہی کی بندگی کرو اور طاغوت سے دور رہو، سو ان میں سے کچھ وہ لوگ تھے جنھیں اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی اور ان میں سے کچھ ایسے بھی تھے جن پر گمراہی مسلط ہو کے رہی، تم ملک میں چلو پھرو اور دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا۔ ۳۶) آپ خواہ کتنے ہی حریص ہوں ان کے ہدایت یافتہ ہونے پر مگر اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا جنھیں وہ (پیہم سرکشی کے باعث) گمراہ کر دیتا ہے اور ان کے لیے کوئی مدد کرنے والا نہیں۔ ۳۷) اور یہ پکی پکی اللہ کی قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ جو مر جاتا ہے اللہ اس کو نہیں اٹھائے گا، ہاں ضرور زندہ کرے گا یہ اس کے اوپر ایک لازمی وعدہ ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ ۳۸) یہ اس لیے ہے تا کہ وہ واضح کر دے ان پر اس چیز کو جس میں یہ اختلاف کر رہے ہیں اور تا کہ جن لوگوں نے کفر کیا ہے وہ خوب جان لیں کہ بلاشبہ وہی جھوٹے تھے۔ ۳۹) جب ہم کسی چیز کا ارادہ کرتے ہیں تو اتنا ہی ہمارا کہنا ہوتا ہے کہ ہم اس کو کہتے ہیں ہو جا، تو وہ ہو جاتی ہے۔ ۴۰)

وَقَالَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَیْءٍ نَّحْنُ وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَیْءٍ ؕ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۳۵﴾

(اور کہا ان لوگوں نے جنھوں نے شرک کیا کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ہم اس کے سوا کسی چیز کو نہ پوجتے اور نہ ہمارے آباؤاجداد اور نہ ہم اس کے بغیر کسی چیز کو حرام ٹھہراتے، ایسی ہی (بے سروپا) باتیں کیا کرتے تھے، ان کے پیشرو بھی۔ تو رسولوں پر واضح طور پہنچا دینے کے سوا اور کوئی ذمہ داری نہیں۔ ۳۵) (سورۃ النحل: ۳۵)

مشرکینِ مکہ کے اعتراض کا جواب

اس آیتِ کریمہ میں مشرکینِ مکہ کے اعتراض کو ذکر کیا گیا ہے اور اس کا جواب دیا گیا ہے۔ سورۃ الانعام میں بھی یہی سوال و جواب مختلف الفاظ اور مختلف اسلوب میں ذکر فرمایا گیا ہے۔ پس منظر اس کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے رسول کی دعوت کا بنیادی نقطہ، نقطۂ توحید ہے۔ یہی وہ نقطہ ہے جس سے باقی سارے دائرے نکلتے ہیں اور اسی میں آ کر جمع ہو جاتے ہیں۔ ہر رسول نے اس بات پر سب سے زیادہ زور دیا کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات، اپنی صفات، اپنے حقوق اور اپنے اختیارات میں بے مثال ہے۔ کوئی اس کا شریک اور سہیم نہیں۔ اسی طرح تحلیل اور تحریم چونکہ آئین سازی کا دوسرا نام ہے اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کی صفت ہے جس میں کوئی اس کا شریک نہیں ہو سکتا، جسے وہ حلال ٹھہرا دے اسے کوئی حرام نہیں کر سکتا اور جسے وہ حرام کر دے اسے کوئی حلال نہیں کر سکتا۔ اسی نکتے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اہلِ زمین پر اپنی شریعت نازل کرے اور انھیں اس کا پابند بنائے۔ قیامت کے دن نجات کا تمام تر دارومدار انھیں دونوں باتوں پر ہے جس نے اللہ تعالیٰ کو وحدہ لاشریک سمجھا اور اس کی ذات، صفات، حقوق اور اختیارات میں کسی کو شریک نہ کیا اور اسی کی شریعت کو حرفِ آخر جانا، نہ اس میں کوئی تحریف کی نہ ترمیم۔ ساری زندگی اسی کے اتباع میں گزاری، وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں نجات پائے گا اور سرخرو ہو گا۔ اور جس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا اور اپنی خانہ ساز شریعت تیار کی اور جس چیز کو چاہا حلال ٹھہرایا اور جس چیز کو چاہا حرام کر دیا، وہ قیامت کے دن ناکام و نامراد ہو گا اور ہمیشہ کے لیے جہنم کی

Marfat.com

نذر کر دیا جائے گا۔ مشرکینِ مکہ نے پیغمبر کی اس دعوت کو رد کرتے ہوئے کہا کہ تمھاری دعوت کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں شرک سب سے بڑا جرم ہے وہ ایسا کرنے والے کو معاف نہیں کرے گا۔ اور جس نے تحلیل اور تحریم کو خود اوڑھ کر خدائی مسند پر بیٹھنے کی کوشش کی وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بدترین عذاب کا شکار ہوگا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ہم تو صدیوں سے اس شرک کا ارتکاب کرتے چلے آرہے ہیں، آج جو ہمارا رویہ ہے یہی رویہ ہمارے آباؤ اجداد کا بھی تھا۔ اگر اللہ تعالیٰ کو ایسا ہی ناپسند ہے تو اس نے ہمارے آباؤ اجداد اور ہمیں زبردستی روک کیوں نہیں دیا۔ باوجود طاقت و قدرت رکھنے کے اسے ہمیں نہ روکنا اور ہمارے طرزِ عمل کو باقی رہنے دینا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ ہمارے طرزِ عمل سے خوش ہے اور جس طرح ہم زندگی گزار رہے ہیں وہ اس سے راضی ہے اور تم جو کچھ کہہ رہے ہو یہ تمھاری اپنے منہ کی باتیں ہیں جس کی کوئی حقیقت نہیں۔

مشرکینِ مکہ کو دراصل ایک بڑی غلط فہمی نے اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ انسانوں کو جس طرزِ عمل سے زبردستی روکا نہیں جاتا وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ طرزِ عمل ہے۔ گویا ان کے نزدیک مشیت اور رضا دونوں ایک چیز ہیں۔ اور پھر روکنا ان کے نزدیک وہ قابلِ اعتبار ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے طاقت شامل ہو۔ اس آیتِ کریمہ میں جواب دیتے ہوئے پروردگار نے پہلی یہ بات ارشاد فرمائی کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو یہ کوئی نئی بات نہیں۔ تم سے پہلی قومیں بھی جو اپنے بدترین انجام کو پہنچ چکی ہیں وہ بھی یہی بات کہتی تھیں۔ ایک طرف تو تمھارا حال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر پر جو عظیم کتاب اتاری ہے اسے تم اس لیے قابلِ قبول نہیں سمجھتے کہ اس میں پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں۔ پہلی گزری ہوئی امتیں جن پر عذاب آچکا ہے اور پہلے گزرے ہوئے رسول اور ان پر ایمان لانے والے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انعام کے مستحق ٹھہرے ان کے واقعات تمھاری نگاہ میں گزشتہ لوگوں کے افسانے ہیں جن کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیے کہ تمھاری جدت پسند طبیعت میں قیمتی سے قیمتی بات اور عظیم سے عظیم حوالہ جس پر قدامت کی مہر لگ چکی ہے وہ قبول کرنے کے لائق نہیں لیکن خود تمھارا رویہ کیا ہے، تم کون سے ماڈرن ثابت ہوئے ہو، تم وہی باتیں کہہ رہے ہو جن پر صرف قدامت کی نہیں بلکہ ضلالت کی بھی مہر ثبت ہو چکی ہے۔

تمھارے نزدیک روکنا وہ معتبر ہے جس میں جبر کا عنصر شامل ہو۔ رہا وہ طریقہ جو اللہ تعالیٰ نے اختیار کیا ہے کہ اس نے انسانوں کو عقل عطا کی، شعور بخشا اور فی الجملہ آزادی سے نوازا، پھر اللہ تعالیٰ کے رسول بھیجے اور کتابیں نازل کیں اور خیر و شر کو ان کے سامنے کھول دیا۔ بینات کے ساتھ حق و باطل میں فرق واضح کر دیا۔ ہدایت اور گمراہی میں کوئی اشتباہ باقی نہیں رہنے دیا تاکہ جو خیر کو اختیار کرے پورے اطمینان کے ساتھ اور پوری روشنی میں اختیار کرے۔ اب جو شخص بھی اپنی آزادی اور اختیار سے جو راستہ بھی اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے بروئے کار آنے کے اسباب اور امکانات پیدا فرما دیتا ہے۔ نہ وہ زبردستی کسی کو نیک بناتا ہے اور نہ وہ بالجبر کسی کو برائی پر لگاتا ہے۔ اپنی مرضی سے جو شخص جس راستوں پر چل نکلتا ہے وہ اس کے لیے آسانیاں پیدا کرتا چلا جاتا ہے اور یہ اس کی مشیت ہے۔ لیکن یہ بتانا اور واضح کرنا کہ وہ کن باتوں میں راضی ہے اور کن باتوں میں ناراض، اس کی وضاحت وہ اپنے پیغمبروں اور کتابوں سے کرتا ہے۔ پیغمبر ہر اس کام کی دنیا کو ہدایت کرتے ہیں جس کام میں اللہ تعالیٰ راضی ہو اور جس پر وہ قیامت کے دن جزاء دے گا اور ہر اس کام سے روکنے کی کوشش کرتے ہیں جس سے اللہ تعالیٰ ناراض ہے اور وہ قیامت کے دن اس کی سزا دے گا۔ رسولوں کا کام انھیں دونوں فرائض کو پوری تندہی، اخلاص اور جانکاہی سے انجام دینا ہے۔ ہم نے جتنے رسول بھیجے انھوں نے اس میں کوتاہی نہیں کی بلکہ بلاغِ مبین سے کام لیا یعنی کھلم کھلا ہر بات کو واضح کیا اور اب جو آخری رسول اے مشرکینِ مکہ تمھاری طرف مبعوث ہوئے ہیں وہ بھی اسی فرض کو انجام دے رہے ہیں لیکن تمھاری سرکشی اور ہٹ دھرمی اس راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے اور تم مشیت کا سہارا لے کر اس پر قائم رہنا چاہتے ہو۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ هَدَى اللّٰهُ وَمِنْهُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلٰلَةُ ۭ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ۝۳۶

(اور ہم نے ہر امت میں ایک رسول اس دعوت کے ساتھ بھیجا کہ اللہ تعالیٰ ہی کی بندگی کرو اور طاغوت سے دور رہو، سو ان میں سے کچھ وہ لوگ تھے جنھیں اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی اور ان میں سے کچھ ایسے بھی تھے جن پر گمراہی مسلط ہو کے رہی، تم ملک میں چلو پھرو اور دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا۔ ۳۶) (سورۃ النحل: ۳۶)

Marfat.com

ہر رسول کی دعوت اللہ تعالیٰ ہی کی بندگی ہے

یہ بات ثابت کرنے کے بعد کہ انسانوں کو ہدایت کا یہ طریقہ نہیں کہ انھیں زبردستی نیک یا بد بنایا جائے، یہ تو انسان کے فہم و شعور کی توہین ہے۔ ان کی ہدایت کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ رسولوں کی معرفت ہدایت اور گمراہی کو الگ الگ کر دیا جائے کہ لوگ آزادانہ مرضی سے جسے چاہیں اختیار کریں، اب اسی دلیل کو آگے بڑھاتے ہوئے فرمایا کہ اگر تم مذہب اور ہدایت کی تاریخ سے کچھ بھی واقف ہو تو تمھارے لیے یہ بات ماننے بغیر چارہ نہیں کہ ہم نے ہر امت میں کوئی نہ کوئی رسول ہدایت بھیجا۔ جہاں تک دھرتی پانی دیتی ہے اور انسانوں کی آبادیاں موجود ہیں وہیں وہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت دینے والے آئے اور عجیب بات یہ ہے کہ ان میں بیشتر ایک دوسرے سے ناواقف تھے۔ ان کا زمانہ بھی الگ الگ تھا اور علاقہ بھی مختلف تھا۔ بایں ہمہ کس قدر حیرانی کی بات ہے کہ ہر آنے والے رسول نے ایک ہی بات کہی کہ لوگو! اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اور طاغوت سے بچو۔ اور انھوں نے پوری طرح عبادت کا مفہوم بھی واضح کیا اور طاغوت کی بھی تعریف کی کہ عبادت اس بندگی کا نام ہے جس میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی اور شریک نہ ہو، جس میں تحلیل و تحریم صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہو، کوئی اس کی نہ صفات میں شریک ہو، نہ اس کے حقوق میں، اور نہ اس کے اختیارات میں۔ ہر شخص اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کا غلام سمجھے اور اس کی آقائی اور کبریائی میں کسی کو شریک نہ کرے۔ اور طاغوت ہر وہ سرکش قوت ہے جو اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں اپنی بندگی کروانے کی کوشش کرے۔ چاہے وہ کوئی شخص ہو یا کوئی ظالمانہ نظام ہو۔ ایسے جابر حکمرانوں اور ایسے استبدادی نظاموں کی بندگی سے اجتناب اور اللہ تعالیٰ کی ہی بندگی پر اصرار یہ ہر رسول کی دعوت کے بنیادی نکات رہے ہیں۔ انصاف کی بات کہیے کہ اس دعوت کی موجودگی میں کیا یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ شرک اور غلط لوگوں اور غلط نظاموں کی بندگی کو اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہے۔ یہ ایک ایسی بات ہے کہ جس سے زیادہ غلط بات دنیا میں شاید اور کوئی نہ ہو۔

قانونِ ضلالت

مشیت اور رضا میں فرق واضح کر دینے کے بعد مزید ایک اہم حقیقت کا انکشاف فرمایا جا رہا ہے، وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ایک قانونِ ضلالت بھی ہے جو اس کی گرفت میں آجاتا ہے اسے ہدایت نصیب نہیں ہوتی۔ وہ قانونِ ضلالت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خیر و شر کو سمجھنے کے لیے انسان کو عقل عطا فرمائی ہے، فہم و شعور دیا ہے اور خود فیصلہ کرنے کی آزادی دی ہے۔ جو شخص خواہشات کے اتباع میں اندھا بنا رہتا ہے اور اپنی عقل کو عقلِ خالص بنا کر استعمال نہیں کرتا اور یا بعض نام نہاد بڑے لوگوں کی پیروی میں اپنے آزادی کے حق سے دستبردار ہو جاتا ہے پھر انھی کی آنکھوں سے دیکھتا اور انھی کے دماغوں سے سوچتا ہے۔ ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا۔ ایسے شخص کے سامنے اللہ تعالیٰ کے رسول کی تبلیغ و دعوت بھی اپنا اثر دکھانے سے قاصر رہتی ہے۔ وہ بظاہر دعوت کا ہدف ہوتا ہے لیکن حقیقت میں اس کا دل و دماغ کسی اور کی گرفت میں ہوتا ہے۔ اس کی کیفیت بالکل ایسی ہی ہوتی ہے:

میں خیال ہوں کسی اور کا، مجھے سوچتا کوئی اور ہے
سرِ آئنہ مرا عکس ہے، پسِ آئنہ کوئی اور ہے

جب وہ مسلسل اپنی اس روش کو قائم رکھتا ہے اور پیغمبر کی دعوت سر پٹخ کے رہ جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ کا قانونِ ضلالت حرکت میں آتا ہے اور ہدایت سے اس کی محرومی کا فیصلہ کر دیا جاتا ہے، لیکن جو شخص کھلے دل و دماغ سے خالص ارادہ لے کر پیغمبر کی دعوت کی طرف بڑھتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے ہدایت عطا فرماتے ہیں۔

آخر میں ایک فیصلہ کن بات ارشاد فرمائی کہ مشرکینِ مکہ اگر یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی ہٹ دھرمی اور جاہلیتِ قدیمہ اللہ تعالیٰ کی رضا کی دلیل ہے اور ان کا پیغمبر کی دعوت کو قبول نہ کرنا صحیح طرزِ عمل ہے تو پھر وہ زمین میں چل پھر کے دیکھیں یعنی ان علاقوں کو دیکھیں جہاں سے ان کے قافلہ ہائے تجارت گزرتے ہیں جہاں قومِ عاد اور قومِ ثمود کی بستیاں ہیں جن کے کھنڈرات آج تک ان کی کہانیاں سناتے ہیں۔ ان کھنڈرات سے پوچھیں کہ ان پر اللہ تعالیٰ کا عذاب کیوں ٹوٹا؟ کیونکہ ان کے طرزِ عمل اور قریش کے طرزِ عمل میں کوئی فرق نہ تھا۔ وہ بھی اپنے رسولوں کے ساتھ وہی کچھ کر رہے تھے جو قریش کر رہے ہیں۔ اگر یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی رضا تھا تو پھر ان پر عذاب کا کوڑا کیوں برسا؟ اس سوال کا جواب ان کی گمراہیوں کے مفہوم کو ان پر کھول دینے کے لیے کافی ہے۔

Marfat.com

اِنْ تَحْرِصْ عَلٰى هُدٰىهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَايَهْدِيْ مَنْ يُّضِلُّ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۳۷﴾

(آپ خواہ کتنے ہی حریص ہوں ان کے ہدایت یافتہ ہونے پر مگر اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا جنھیں وہ (پیہم سرکشی کے باعث) گمراہ کردیتا ہےاوران کے لیےکوئی مددکرنے والانہیں۔ ۳۷) (سورۃ النحل:۳۷)

آنحضرت ﷺ کو تسلی

قریشِ مکہ کے مسلسل طرزِ عمل سے یقیناً آنحضرت ﷺ کو بہت آزردگی ہوتی تھی کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ہر نبی اپنی امت کی ہدایت کے لیے نہایت حریص ہوتا ہےاور آنحضرت ﷺ چونکہ آخری رسول تھے اس لیے ان کی ہدایت کے لیے آپؐ کی حرص اور حد سے بڑھی ہوئی خواہش ایک مثال کی حیثیت رکھتی تھی۔قریشِ مکہ ہر طرح کا لحاظ ختم کر چکے تھے اوران کی اذیت رسانیوں میں روز بروز اضافہ ہوتا جارہا تھا۔اس کے جواب میں بجائے اس کے کہ حضور ﷺ ان سے منہ پھیر لیتے، ان کے لیے آپ کی دعاؤں میں روز بروز اضافہ ہوتا جارہا ہے۔بعض دفعہ ساری ساری رات گزر جاتی۔ آنحضرت ﷺ کی اس دل گرفتگی کو دیکھتے ہوئے پروردگار تسلی دے رہے ہیں کہ آپ کا یہ جذبہ انتہائی قابلِ قدر ہے کہ سب لوگ ہدایت یافتہ ہوجائیں لیکن جولوگ اپنی مسلسل سرکشی اوراپنی آزادی کو استعمال نہ کرنے کے باعث قانونِ ضلالت کی گرفت میں آچکے ہیں وہ کسی طرح بھی ہدایت قبول نہیں کرسکتے کیونکہ ان کی قبولیت کی استعداد ان سے چھن چکی ہے۔وہ خواہشات میں ڈوب کر اور رؤسائے کفر کی پیروی میں اندھے ہوکر قبولیت کی استعداد سے محروم ہو چکے ہیں۔اس لیے اب انھیں دنیا کی کوئی طاقت ہدایت دے سکتی ہے نہ ہی اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچا سکتی ہے۔

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ لَا يَبْعَثُ اللّٰهُ مَنْ يَّمُوْتُ ؕ بَلٰى وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا وَّ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَايَعْلَمُوْنَ ﴿۳۸﴾

(اور یہ پکی پکی اللہ تعالیٰ کی قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ جو مر جاتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو نہیں اٹھائے گا، ہاں ضرور زندہ کرے گا یہ اس کے اوپر ایک لازمی وعدہ ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ ۳۸) (سورۃ النحل:۳۸)

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ اَیْ بَالَغُوْا فِی الْیَمِیْنِ وَاجْتَهَدُوْا یعنی انھوں نے قسم کھانے میں مبالغہ کیا اوراپنا پورا زور لگایا۔

بگاڑ کا اصل سبب

نبی کریم ﷺ کی بعثت کے وقت یوں تو ساری دنیا تعیشات اور گمراہیوں میں ڈوبی ہوئی تھی اور کسی کو اپنے انجام کے بارے میں سوچنے کی فکر نہ تھی لیکن خاص طور پر عرب کے رہنے والے اپنے بگاڑ میں انتہا کو پہنچ چکے تھے۔ان کے بگاڑ کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ ان میں بیشتر لوگ دنیا ہی کو سب کچھ سمجھتے تھے۔دوبارہ جی اٹھنا اور قیامت کا بپا ہونا اوراپنے اعمال کی اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہی اس کا تصور بھی ان کے نزدیک ممنوع تھا۔ان کے ذہنوں میں کسی طرح یہ بات نہیں آتی تھی کہ قیامت کیسے وقوع پذیر ہوسکتی ہے۔جو شخص مرجاتا ہے اس کی زندگی ختم ہوجاتی ہے۔آہستہ آہستہ اس کے جسم کو مٹی کھا جاتی ہے۔اور وہ مکمل طور پر فنا ہوجاتا ہے۔اور پھر ایسے مرنے والوں کی تعداد ایک دو نہیں، سینکڑوں اور ہزاروں نہیں، اربوں کھربوں سے بھی متجاوز ہے۔ایسی بے شمار مخلوق کو کہاں کہاں تلاش کیا جائے گا جبکہ ان کے نشانات بھی مٹ چکے ہوں گے۔جہاں تک ان کے اعمال کی جوابدہی کا تعلق ہے یہ تو بالکل ناممکن سی بات ہے کہ ایک شخص زندگی میں اربوں اعمال کرتا ہے اور اگر اس کے ذہنی اعمال کو شمار کیا جائے تو وہ شاید شمار سے بھی باہر ہوں۔ جب ایک شخص کے اعمال کا حال یہ ہے تو تمام مخلوقات کے اعمال کا شمار کیا ہوگا۔چنانچہ وہ ان میں سے ایک ایک چیز کو سامنے لاتے اور پھر لوگوں کو یقین دلاتے کہ قیامت کا تصور ایک ایسا تصور ہے جس کے وقوع پذیر ہونے کا کوئی امکان نہیں۔تو ہم ایک ایسی چیز کے حوالے سے اپنی زندگیوں کو بدمزہ کیسے بنا لیں جس کی حیثیت خواب وخیال سے زیادہ نہیں۔چنانچہ وہ پورے تحکم اور قطعیت کے ساتھ قسمیں کھا کھا کر لوگوں کو یقین دلاتے کہ قیامت نہیں آئے۔

Marfat.com

گی۔ اللہ تعالیٰ نے اسی زور کے ساتھ قیامت کے آنے کا اثبات فرمایا کہ تم کہتے ہو قیامت نہیں آئے گی جبکہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ قیامت ضرور آئے گی۔ تمہاری باتیں تمہارے توہمات ہیں جن کی کوئی حقیقت نہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کا وعدہ کبھی جھوٹا نہیں ہوتا۔ لیکن اکثر لوگ چونکہ ان حقائق سے جاہل ہیں اس لیے تم انھیں گمراہ کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہو۔

لِيُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي يَخْتَلِفُونَ فِيهِ وَلِيَعْلَمَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّهُمْ كَانُوا كَاذِبِينَ ﴿٣٩﴾

(یہ اس لیے ہے تا کہ وہ واضح کر دے ان پر اس چیز کو جس میں یہ اختلاف کر رہے ہیں اور تا کہ جن لوگوں نے کفر کیا ہے وہ خوب جان لیں کہ بلا شبہ وہی جھوٹے تھے۔ ۳۹) (سورۃ النحل:۳۹)

قیامت کی عقلی و اخلاقی ضرورت

اس آیتِ کریمہ میں حیات بعد الموت اور قیامِ قیامت کی عقلی اور اخلاقی دلیلیں ارشاد فرمائی گئی ہیں۔ عقل یہ جاننا چاہتی ہے کہ انسانوں نے ہر دور میں خیر وشر اور حق و باطل کے حوالے سے بے شمار نقطہ ہائے نگاہ اختیار کیے ہیں۔ ہر نقطۂ نگاہ کی وکالت میں بے شمار شخصیتوں نے اپنا رول ادا کیا پھر اپنے اپنے مؤقف کی حمایت میں زوردار دلائل بھی دیے ہیں اور بعض دفعہ طاقت بھی استعمال کی ہے۔ اسی کشمکش میں کبھی دولت لٹی ہے، کبھی پسینہ بہا اور کبھی خونریزی تک نوبت پہنچی۔ اللہ تعالیٰ کے نبیوں نے اپنے اپنے وقتوں میں آکر صحیح صورتحال واضح کرنے کی کوشش فرمائی لیکن اہلِ دنیا نے عموماً ان کے مؤقف کو قبول کرنے سے انکار کیا۔ عقل کا یہ تقاضا بالکل بجا ہے کہ جن باتوں پر اس حد تک کشیدگی پیدا ہوتی رہی ہے کبھی تو معلوم ہو کہ ان کی اصل حقیقت کیا ہے۔

اور دوسری بات یہ ارشاد فرمائی کہ ابھی تمہارے سامنے مکے کی سرزمین میں کلمۂ حق سر بلند ہوا۔ ایک نہایت دلآویز شخصیت نے اپنے یقین و عمل کا پورا سرمایہ اس پر لگا دیا۔ نہایت اخلاص کے ساتھ ایک ایک کے سامنے وہ کلمۂ حق رکھا گیا لیکن چند سعید لوگوں کے سوا بیشتر نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور پھر صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ جس شخص نے بھی اسے قبول کیا اسے جینا دوبھر کر دیا۔ اسے شہر میں رہنا ناممکن بنا دیا۔ غریبوں کو غربت کی سزا دی گئی، غلاموں کو ادھیڑا اکھیڑا گیا، عزت والوں کی عزتیں پامال ہو گئیں، کتنے لوگ جانیں بچانے کے لیے ہجرت کر گئے۔ کیا اخلاق یہ تقاضا نہیں کرتے کہ ظلم کے اس کاروبار کا کچھ تو نتیجہ سامنے آنا چاہیے۔ اگر ظالم ظلم کرتے رہیں اور مظلوم ظلم سہتے رہیں اور کچھ معلوم نہ ہو کہ ظلم اچھا ہے یا مظلومیت یا یہ دونوں برابر ہیں۔ ایک قربانی دیتا رہے اور دوسرا قربانی لیتا رہے اور کہیں بھی اس کا فیصلہ نہ ہو کہ ان دونوں رویوں میں کون سا رویہ صحیح ہے۔ تو پھر اس کے سوا کیا ہوگا کہ اس دنیا میں مظلوموں کی چیخوں اور آہوں کے سوا کچھ نہیں رہ جائے گا۔ طاقت کا بول بالا ہوگا، حقیقت سرنگوں ہو جائے گی، ظلم کے پھریرے لہرائیں گے، انسانی قدریں ایک ایک کر کے دم توڑ جائیں گی، لوگ اپنے جھونپڑوں میں پکار پکار کر تھک جائیں گے۔

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات

حاصل کلام یہ کہ عقل کا تقاضا بھی ہے اور اخلاق کا بھی، کہ مختلف نقطہ ہائے نظر کے اختلاف کی حقیقت بھی کھلے اور اخلاق اور بداخلاقیوں کے رویے میں کوئی حدِ فاصل بھی قائم ہو اور ایک دن ایسا آئے جب ان دونوں کو الگ الگ کھول دیا جائے اور یہ بات واضح ہو جائے کہ قریش کے وہ لوگ جنھوں نے حق کو قبول کرنے سے انکار کیا اور مسلمانوں پر مظالم توڑے وہ جھوٹے تھے۔

إِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ إِذَا أَرَدْنَاهُ أَنْ نَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ﴿٤٠﴾ (سورۃ النحل : ۴۰)

(جب ہم کسی چیز کا ارادہ کرتے ہیں تو اتنا ہی ہمارا کہنا ہوتا ہے کہ ہم اس کو کہتے ہیں ہو جا، تو وہ ہو جاتی ہے۔ ۴۰)

Marfat.com

اللہ تعالیٰ کا کمالِ قدرت

اس سے پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے کہ مشرکینِ مکہ کے لیے قیامت کا ماننا اس لیے مشکل ہو رہا تھا کہ وہ اسے ناممکن الوقوع سمجھتے تھے۔ ان کے تصور میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ تمام کائنات کا ایک دفعہ فنا ہو جانا پھر سب کا از سرِ نو وجود میں آنا، صدیوں کے مرے ہوئے انسانوں کا اسی شکل وصورت میں اٹھ کھڑا ہونا اور پھر حشر برپا ہونا ان میں سے کوئی بات بھی وقوع پذیر ہو سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ نادانو! تم اللہ تعالیٰ کے علم اور قدرت کو نہیں سمجھتے۔ اس کا علم ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور اس کی قدرت کے سامنے کوئی چیز ناممکن نہیں۔ وہ جب کسی کو پیدا کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اسے اس کی ضرورت نہیں ہوتی کہ پہلے وہ میٹریل فراہم کرے، پھر مزدور ڈھونڈے، پھر معمار تلاش کیے جائیں، اس کے لیے مناسب ماحول پیدا کیا جائے۔ اس کا کام صرف یہ ہے کہ جس چیز کو وہ پیدا کرنا چاہتا ہے اسے حکم دے کہ ہو جا، چنانچہ ہو جاتی ہے۔ پہلے بھی اس نے کائنات کی تمام مخلوقات کو اسی کلمۂ کُن سے پیدا فرمایا۔ قیامت بھی اسی کلمۂ کُن سے وجود میں آئے گی اور اس کا تمام پراسس اسی حکم کے تحت جاری وساری ہوگا۔ رہی یہ بات کہ ایک کلمۂ کُن سے ہر چیز پیدا کیسے ہو سکتی ہے تو اس کا سمجھنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک آدمی اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات پر یقین پیدا نہ کر لے۔

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا
ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۭ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ
لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿41﴾ الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰي رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿42﴾
وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ
الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿43﴾ بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ ۭ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ
الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿44﴾
اَفَاَمِنَ الَّذِيْنَ مَكَرُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ يَّخْسِفَ اللّٰهُ بِهِمُ الْاَرْضَ
اَوْ يَاْتِيَهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿45﴾ اَوْ يَاْخُذَهُمْ
فِيْ تَقَلُّبِهِمْ فَمَا هُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿46﴾ اَوْ يَاْخُذَهُمْ عَلٰي تَخَوُّفٍ ۭ
فَاِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿47﴾ اَوَلَمْ يَرَوْا اِلٰى مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ
شَيْءٍ يَّتَفَيَّؤُا ظِلٰلُهٗ عَنِ الْيَمِيْنِ وَالشَّمَاۗىِٕلِ سُجَّدًا لِّلّٰهِ وَهُمْ

Marfat.com

دٰخِرُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَلِلّٰهِ یَسْجُدُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ
مِنْ دَآبَّةٍ وَّالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا یَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۴۹﴾ یَخَافُوْنَ
رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ ﴿۵۰﴾ السجدۃ ۴ ع

رکوع: ۶ (اور جن لوگوں نے اللہ کی راہ میں ہجرت کی اس کے بعد کہ ان پر (طرح طرح کے) ظلم توڑے گئے، ہم ضرور ان کو دنیا میں بھی بہتر ٹھکانہ دیں گے اور آخرت کا اجر تو بہت بڑا ہے، کاش یہ جان لیتے۔ ۴۱) (یہ ان مہاجرین کے لیے ہے) جنھوں نے استقامت دکھائی اور اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ ۴۲) اور ہم نے نھیں بھیجا آپؐ سے پہلے (رسول بنا کر) مگر مردوں کو، ہم ان کی طرف وحی بھیجتے ہیں، پس تم پوچھو اہلِ علم سے، اگر تم خود نھیں جانتے۔ ۴۳) پہلے رسولوں کو بھی ہم نے) روشن نشانیاں اور کتابیں دے کر بھیجا۔ اور اسی طرح ہم نے آپؐ پر یہ ذکر نازل کیا تا کہ آپؐ لوگوں کے سامنے کھول کر بیان کریں جو ان کی طرف نازل کیا گیا ہے تا کہ وہ غور وفکر کریں۔ ۴۴) کیا وہ لوگ جو بری بری چالیں چل رہے ہیں اس بات سے بے خوف اور نڈر ہو گئے ہیں کہ اللہ ان کے سمیت زمین کو دھنسا دے یا ان پر عذاب وہاں سے آ دھمکے جہاں سے ان لوگوں کو گمان بھی نہ ہو۔ ۴۵) یا انھیں چلتے پھرتے پکڑ لے تو وہ اللہ کو عاجز کرنے والے نھیں ہیں ۴۶) یا انھیں پکڑ لے جبکہ وہ خوفزدہ ہو چکے ہوں، پس تمھارا پروردگار بڑا ہی شفیق اور رحیم ہے۔ ۴۷) کیا انھوں نے اللہ کی پیدا کی ہوئی ان چیزوں کو نھیں دیکھا جن کے سائے داہنی طرف اور بائیں طرف جھکتے ہیں۔ تابع ہیں اللہ کے اور اللہ کے روبرو عاجز ہیں۔ ۴۸) اور اللہ ہی کو سجدہ کرتے ہیں جتنے آسمانوں اور زمین میں جاندار ہیں اور فرشتے بھی۔ وہ سرتابی نھیں کرتے۔ ۴۹) وہ اپنے اوپر اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور وہی کرتے ہیں جس کا ان کو حکم ملتا ہے۔ ۵۰)

وَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا فِی اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً ۚ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ ﴿۴۱﴾
الَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰی رَبِّهِمْ یَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۴۲﴾ (سورة النحل : ۴۱، ۴۲)

(اور جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں ہجرت کی اس کے بعد کہ ان پر (طرح طرح کے) ظلم توڑے گئے، ہم ضرور ان کو دنیا میں بھی بہتر ٹھکانہ دیں گے اور آخرت کا اجر تو بہت بڑا ہے، کاش یہ جان لیتے۔ ۴۱) (یہ ان مہاجرین کے لیے ہے) جنھوں نے استقامت دکھائی اور اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ ۴۲)

قیامت کے لیے ایک اخلاقی مثال

منکرینِ قیامت کا ذکر کرنے کے بعد ان لوگوں کا ذکر کیا جا رہا ہے جو اسلام پر ایمان لائے پھر اسی کی پاداش میں مشرکینِ مکہ نے ان کا وطن میں رہنا مشکل کر دیا۔ چنانچہ وہ جان وتن کی حفاظت کے لیے وطن سے ہجرت کر گئے اور اب وہ مسافرت، اجنبیت اور پردیس کی صعوبتیں اٹھا رہے ہیں۔ ان کے ذکر سے سب سے پہلی بات مشرکینِ مکہ سے یہ کہی ہے کہ تم نے جن لوگوں کو اس حد تک ظلم کا نشانہ بنایا کہ وہ اپنا گھر بار چھوڑ کر دوسرے ملکوں میں

Marfat.com

پناہ لینے پر مجبور ہوئے۔ تو کیا تمھارا یہ ظلم اپنی سزا کو کبھی نہیں پہنچے گا۔ اور تم سمجھتے ہو کہ تمھاری یہ جفا کاریاں کبھی رنگ نہیں لائیں گی۔ تم قیامت کا انکار کر کے مزید کھل کھیلنا چاہتے ہو اور ہر طرح کی گرفت سے بے نیاز ہو کر مظلوموں کی زندگی اور عذاب بنانا چاہتے ہو۔

گزشتہ آیتِ کریمہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ قیامت کا آنا انسانی زندگی کا اخلاقی تقاضا بھی ہے کیونکہ انسان کی اخلاقی حس یہ چاہتی ہے کہ کبھی تو ظالم کو ظلم کی سزا ملے اور کبھی تو مظلوم کے دن پھریں۔ ایک دن ایسا ہونا چاہیے کہ جہاں ہر ظلم اپنی سزا سے گزرے، ہر گناہ اپنے برے انجام کو دیکھے۔ اگر ایسے کسی دن کا آنا یقینی نہ ہو تو دنیا کے بڑے بڑے لوگوں کو نہ ظلم سے روکا جا سکتا ہے اور نہ عیش و عشرت کی زندگی میں ڈوب جانے سے منع کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح اگر اس دن کا آنا یقینی نہ ہو تو اللہ تعالیٰ کے راستے میں حق کی سربلندی کے لیے کوئی کیوں گردن کٹوائے گا۔ خیر و بھلائی کے کام کے لیے کون اپنا وقت صرف کرے گا۔ غریب کی خاطر کون اپنے مال کی قربانی دے گا۔ اسی ایک دن کے اجر و ثواب کی امید اور شوق میں نسلیں قربان ہوتی چلی آئی ہیں۔ قربانیوں کی داستانیں دہرائی جاتی رہی ہیں، کیونکہ وہ خوب جانتے تھے کہ کل جب ہم اس کا اجر و ثواب دیکھیں گے تو تمنا کریں گے کہ کاش ہماری کھالیں قینچیوں سے کاٹی گئی ہوتیں اور آج ہم اس کا بیش از بیش صلہ پاتے۔ چنانچہ اسی اخلاقی تقاضے کو پورا کرنے کے لیے قیامت کا آنا بے حد لازمی ہے تاکہ مشرکینِ مکہ اپنے ظلم کی سزا پائیں اور در بدر ہجرت کرنے والے لوگ بیش از بیش صلے سے ہمکنار ہوں۔

اس آیت میں مزید فرمایا گیا کہ جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے راستے میں ہجرت کی ہے معلوم ہوتا ہے اس سے مراد ہجرتِ حبشہ ہے۔ انھیں ہم دنیا میں بھی بہترین ٹھکانہ عطا فرمائیں گے۔ چنانچہ واقعات نے ثابت کیا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ پورا ہو کے رہا۔ جو لوگ حبشہ ہجرت کر کے گئے اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے بھی آسانیاں پیدا فرمائیں اور پھر جب سب کے لیے دارِ ہجرت مدینہ کو قرار دیا گیا تو مدینہ ان کے لیے نہ صرف خیر و برکت کا مرکز بنا بلکہ وہ معمولی سا قصبہ جسے دنیا میں کوئی نہ جانتا تھا رفتہ رفتہ چند ہی سالوں میں عرب کا مرکزِ اعصاب بن گیا اور خلافتِ راشدہ میں تمام بڑی قوتوں کی قسمتوں کے فیصلے اسی شہر میں ہونے لگے اور یہاں کے درویش بڑے بڑے حکمرانوں کے تخت و تاج اچھالنے والے بنے اور مدینے کا قیام دینی اور دنیوی دونوں اعتبار سے خیر، شرافت، کرامت اور سرفرازی کی علامت بن گیا۔ وہ لوگ جو نانِ شبینہ کے محتاج تھے ان کے معاشرے میں زکوٰۃ وصول کرنے والا کوئی نہ ملتا تھا اور حکومت کی طرف سے ہر کس و ناکس کو سالانہ وظیفہ دیا جاتا تھا۔ حضرت فاروق اعظمؓ جب کسی مہاجر کو اس کا سالانہ وظیفہ دیتے تو فرماتے خُذْ بَارَکَ اللّٰهُ فِيْهِ هٰذَا مَا وَعَدَکَ اللّٰهُ فِی الدُّنْيَا وَمَا ذُخِرَلَکَ فِي الْاٰخِرَةِ اَفْضَلُ ثُمَّ تَلَا هٰـذِهِ الْاٰيَةَ یعنی یہ لے لو اللہ تعالیٰ اسے بابرکت کرے، یہ تو وہ ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے تجھ سے دنیا میں دینے کا وعدہ کیا تھا اور جو چیز آخرت میں دی جائے گی وہ اس سے بہت افضل ہے، پھر آپ یہ آیت پڑھتے۔

دوسری آیت میں ان ہجرت کرنے والوں کی تعریف فرمائی گئی کہ یہ لوگ جب تک اپنے وطن میں رہے اللہ تعالیٰ کے دین کی خاطر ہر طرح کی اذیتیں برداشت کرتے رہے اور ممکن حد تک استقامت دکھائی، لیکن جب ظالموں کا ظلم حد سے گزر گیا تو پھر انھوں نے وطن چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ ان کی ترجیح چونکہ اسلام تھا، وطن نہیں تھا اس لیے انھوں نے اسلام کی خاطر ہر اس تعلق کو توڑ دینے کا فیصلہ کیا جو اسلام کے راستے میں حائل ہوتا۔ بیوی بچے اگر مسلمان نہیں ہوئے تھے تو ان سے ترکِ تعلق کر لیا۔ اہلِ وطن چونکہ دشمنی پر اتر آئے تھے اس لیے وطن چھوڑا، راستے کی صعوبتیں برداشت کیں اور پردیس میں پہنچ کر محض اپنے دین کی حفاظت کے لیے شب و روز خدمتِ دین میں لگ گئے۔ انھیں کچھ معلوم نہ تھا کہ وطن سے نکل کر کیا گزرے گی۔ کوئی ٹھکانہ ملے گا بھی یا نہیں۔ محض اللہ تعالیٰ کے بھروسے پر دامن جھاڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ حق کے راستے پر استقامت اور حالات کی ناسازگاری پر اللہ تعالیٰ پر توکل اور بھروسہ یہی دو ہتھیار تھے جس سے انھوں نے ہر طرح کے حالات کا مقابلہ کیا۔ اس آیت میں اشارۃً یہ بھی بتا دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہی ہجرت قابلِ قبول ہے جس میں صبر یعنی استقامت اور توکل کی شان پائی جاتی ہو۔ اسی سے وہ استغناء اور بے نیازی پیدا ہوتی ہے جو انسان کو اندیشہ ہائے دور دراز سے مستغنی کر دیتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ دنیا میں بھی عزت سے رکھتا ہے اور آخرت میں اعلیٰ مقامات پر سرفراز فرمائے گا۔

Marfat.com

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۳﴾ بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ ؕ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۴۴﴾ (سورة النحل : ۴۳، ۴۴)

(اور ہم نے نہیں بھیجا آپؐ سے پہلے (رسول بنا کر) مگر مردوں کو، ہم ان کی طرف وحی بھیجتے ہیں، پس تم پوچھو اہلِ علم سے، اگر تم خود نہیں جانتے۔ ۴۳) (پہلے رسولوں کو بھی ہم نے) روشن نشانیاں اور کتابیں دے کر بھیجا۔ اور اسی طرح ہم نے آپؐ پر یہ ذکر نازل کیا تاکہ آپؐ لوگوں کے سامنے کھول کر بیان کریں جو ان کی طرف نازل کیا گیا ہے تاکہ وہ غور وفکر کریں۔ ۴۴)

ایک اعتراض کا جواب

قریشِ مکہ نے ایک سے زیادہ مرتبہ یہ اعتراض کیا کہ نبوت اور رسالت ایک عظیم منصب ہے۔ جس کی عظمت اس بات کو قبول نہیں کرتی کہ اس کا حامل کوئی انسان ہو۔ انسان پستیوں میں بسنے والا، خواہشات کی پیروی کرنے والا اور گناہوں میں ڈوبا رہنے والا ایک مٹی کا پتلا ہے، اس کی یہ مجال کہاں کہ وہ اتنے عظیم منصب کی ذمہ داریاں ادا کر سکے۔ اس کا اگر کوئی اہل ہوسکتا ہے تو وہ فرشتے ہیں جو نور سے پیدا ہوئے، اس لیے اپنی ذات میں نورانیت رکھتے ہیں اور معصوم ہونے کی وجہ سے ہر طرح کی آلائش سے پاک ہیں۔

چلیے بدرجہ آخر مان بھی لیا جائے کہ کوئی انسان اس کا رسولؐ ہوسکتا ہے تو وہ بھی ایسا انسان ہونا چاہیے جو بڑا مالدار، ذی وجاہت اور کسی بڑے قبیلے کا سردار ہو۔ آخر تم میں ایسی کیا بات ہے کہ تم یہ دعویٰ کرتے کہ تمھیں اللہ تعالیٰ نے اپنا رسول بنا کے بھیجا ہے۔

پروردگار اس کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ تمھارا یہ کہنا کہ انسانوں میں سے رسول نہیں ہوسکتا، یہ عقل کے بھی خلاف ہے اور تاریخ کے بھی۔ تمھارے پڑوس میں اہلِ کتاب رہتے ہیں، وہ صدیوں سے نبوت اور رسالت کی تاریخ بھی رکھتے ہیں اور اہلِ کتاب ہونے کا دعویٰ بھی۔ ان سے پوچھو کیا حضرت موسیٰ علیہ السلام انسان نہیں تھے، ان کے بعد حضرت ہارون علیہ السلام، حضرت یوشع علیہ السلام، پھر اپنے اپنے وقتوں میں حضرت داؤد علیہ السلام، حضرت سلیمان علیہ السلام، حضرت سموئیل علیہ السلام اور آخر میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کیا یہ سب انسان نہیں تھے۔ اگر یہ سب انسان تھے اور یقیناً تھے تو پھر تمھیں انسانیت اور نبوت میں تضاد کیوں نظر آتا ہے۔

فرشتے اللہ تعالیٰ کے نبیوںؑ اور رسولوںؑ پر وحی لے کر اترتے ہیں، خود نبیؑ یا رسولؑ نہیں ہوتے۔ اور یا پھر بگڑی ہوئی قوموں پر اللہ تعالیٰ کا عذاب لے کر نازل ہوتے ہیں۔ تم اگر فرشتوں کا مطالبہ کرتے ہو، وہ اللہ تعالیٰ کا پیغام لے کر نہیں، اللہ تعالیٰ کا عذاب لے کر اتر سکتے ہیں اور اس کے بعد کوئی جائے پناہ نہیں ہوگی۔

جہاں تک عقلی دلیل کا تعلق ہے تو وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نبی اور رسول انسانوں کی اصلاح کے لیے مبعوث ہوتے ہیں اور اصلاح کے لیے جہاں وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کتاب پہنچاتے اور پڑھاتے ہیں اسی طرح اس پر عمل کر کے بھی دکھاتے ہیں اور ان کا عمل ہی درحقیقت ان کی امت کی اصلاح کا اصل ذریعہ ہوتا ہے کیونکہ انسان کتابوں سے اس قدر نہیں سیکھتا جس قدر انسانوں کی زندگی سے سیکھتا ہے۔ جس طرح دیا دِیے سے جلتا ہے، اسی طرح انسانی زندگی، انسانی زندگی سے روشنی حاصل کرتی ہے۔

فرشتے اللہ تعالیٰ کی نورانی مخلوق ہیں، انھیں بھوک نہیں لگتی۔ بھوک میں وہ انسانوں کی کوئی رہنمائی نہیں کرسکتے۔ روزہ ان کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ ان کے اندر خواہشات کا مادہ نہیں رکھا گیا۔ درہم و دینار سے انھیں کوئی نسبت نہیں، تو وہ انسان کو زہد کی تعلیم کیا دیں گے۔ وہ کبھی زخمی نہیں ہوتے، کبھی انھیں جسمانی تکلیف نہیں پہنچتی، وہ کبھی قتل نہیں ہوتے، انھیں کبھی کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوتا، تو وہ صبر اور استقامت کا کیسے نمونہ پیش کرسکتے ہیں اور اس ضمن میں انسان ان سے کیا حاصل کرسکتے ہیں۔ ان کے اندر جنسی خواہشات نہیں رکھی گئیں۔ اسی وجہ سے وہ شادی نہیں کرتے تو انسان ان سے جنسی خواہشات پر غلبہ پانے کا کیا نمونہ حاصل کرسکتے ہیں اور وہ انسانوں کو عملی طور پر کیا سکھا سکتے ہیں کہ بیوی کے حقوق کس طرح ادا ہوتے ہیں اور ایک اچھا شوہر کیسا ہوتا ہے، اولاد کی تربیت کیسے کی جاتی ہے، بہترین باپ کے اوصاف کیا ہوتے ہیں۔ علیٰ ہٰذا القیاس آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ انسانوں کی رہنمائی کے لیے انسانوں کا آنا کس قدر ضروری اور کس قدر مفید ہے۔

Marfat.com

اس آیت میں مزید یہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ انبیاؑ چونکہ انسانوں کی تعلیم و تربیت کے لیے آتے ہیں تو ہم نے آپؐ کو بھی اسی مقصد کے لیے مبعوث فرمایا ہے۔ ہم نے آپ پر قرآنِ کریم اتارا ہے، یہ زندگی کی گائیڈ بک ہے جسے آپؐ کو اپنی امت کو سکھانا اور پڑھانا ہے۔ اس کے احکام کو عملی شکل دینی ہے۔ اس کے مجملات کو کھولنا ہے، اس کے مبہمات کو واضح کرنا ہے، اس کی تھیوری کو اپلائی کر کے پریکٹیکل شکل دینی ہے۔ اپنی عادات و اطوار، اپنے میل جول، ایک تہذیب، ایک تمدن اور ایک ثقافت کو وجود بخشنا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ قطعۂ زمین دے دے تو اس کتاب کی رہنمائی میں آپ نے اسے اسلامی ریاست کی شکل دینی ہے اور اس میں اسلام کو بطور آئین کے نافذ کرنا ہے۔ یہ تمام کام آپ نے اس لیے کرنے ہیں کہ آپ اس کتاب کے مبین ہیں۔ غور فرمائیے کہ کیا یہ فرائض انجام دینا کسی فرشتے کے بس کی بات ہے۔ فرشتے اللہ تعالیٰ کے تفویض کردہ فرائض کو باحسن طریق انجام دے رہے ہیں، لیکن انسانی احساسات کو سمجھنا، انسانی ضروریات کو جاننا اور پھر ان کے مطابق اللہ تعالیٰ کی کتاب کی روشنی میں ان کی رہنمائی کرنا، فرشتوں کی طبیعت اور ان کے مزاج سے بالکل الگ چیز ہے۔ اس لیے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ شاید یہ لوگ ان باتوں پر غور و فکر کریں اور اپنی غلطیوں کو سمجھ کر اللہ تعالیٰ کے دین کی طرف متوجہ ہوں۔

اللہ تعالیٰ کے رسولؐ کی حیثیت مبین کی ہے

آیتِ کریمہ میں مزید تدبر کرنے سے ایک اور بات کی طرف بھی رہنمائی ملتی ہے، وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے رسولؐ کی حیثیت کتاب کے مبین کی ہوتی ہے، جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے نبیؐ کا کام صرف کتاب امت تک پہنچا دینا نہیں بلکہ اس کی تعلیم اور اس کے احکامات کا انطباق اور اجتماعی زندگی میں اس کا نفاذ اور ایک ایک ادارے کی عملی تشکیل بھی ہے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے پوری طرح ان تمام ضرورتوں کو پورا کر کے دکھایا۔ آپ نے عدالتیں قائم کیں اور انصاف کرنے کا طریقہ سکھایا۔ آپ نے حق و باطل کے معرکے سر کیے اور امت کو جنگ کی تہذیب دی۔ اس کے مقاصد سے آگاہ کیا۔ ملٹری سپرٹ پیدا کی اور جنگ کو جہاد اور قتال فی سبیل اللہ تعالیٰ بنایا۔ حکومت کی اور اسے اللہ تعالیٰ کی امانت ثابت کیا۔ بندگی اور نیابتِ الٰہی کو اکٹھا کر کے دکھایا۔ امراء اور حاکموں کے فرائض اور آداب کو واضح فرمایا۔ غرض کہ عبادات سے لے کر زندگی کے تمام شعبوں تک آپ نے قرآنِ کریم کے ایک ایک حکم کو عملی تعبیر دی اور معاشرے پر اس کا انطباق کیا۔ یہ وہ چیز ہے جس کو سنت کہتے ہیں۔ جس طرح قرآنِ کریم کی آیات اسلامی قانون کی اساس ہو اسی طرح سنتِ رسولؐ بھی ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کو تشکیل دینے والی ہے۔ دونوں میں سے کسی ایک سے بھی صرفِ نظر نہیں کیا جاسکتا۔ ٹیکسٹ بک اور استاد کے تشریحی نوٹس دونوں سلیبس کا حصہ ہوتے ہیں اور ان میں سے کسی ایک کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا کیونکہ دونوں ہی مل کر اصل ضرورت کو پورا کرتے ہیں۔ اقیموا الصلوۃ قرآنی حکم ہے لیکن اس پر عمل کی صورت آرائی سنت نے کی کیونکہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ نماز ویسے پڑھو جیسے مجھے پڑھتا ہوا دیکھتے ہو۔ اس لیے جو شخص سنت کے بغیر قرآنِ کریم کو ماننے اور عمل کرنے پر اصرار کرتا ہے وہ درحقیقت قرآنِ کریم کو موم کی ناک بنا دینا چاہتا ہے اور ایک ایسی کتاب بنا دینا چاہتا ہے جس کے مکمل نظام کو کبھی اختیار نہیں کیا جاسکتا۔ سنتِ رسول سے امت کا انقطاع دراصل امت کو محروم الارث اور منقطع الاصل کرنے کی سازش ہے جس سے اللہ تعالیٰ اپنی پناہ میں رکھے۔

اَفَاَمِنَ الَّذِيْنَ مَكَرُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ يَّخْسِفَ اللّٰهُ بِهِمُ الْاَرْضَ اَوْ يَاْتِيَهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۴۵﴾
اَوْ يَاْخُذَهُمْ فِيْ تَقَلُّبِهِمْ فَمَا هُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿۴۶﴾ اَوْ يَاْخُذَهُمْ عَلٰى تَخَوُّفٍ فَاِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۴۷﴾

(کیا وہ لوگ جو بری بری چالیں چل رہے ہیں اس بات سے بے خوف اور نڈر ہو گئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کے سمیت زمین کو دھنسا دے یا ان پر عذاب وہاں سے آ دھمکے جہاں سے ان لوگوں کو گمان بھی نہ ہو۔ ۴۵) یا انھیں چلتے پھرتے پکڑ لے تو وہ اللہ تعالیٰ کو عاجز کرنے والے نہیں ہیں ۴۶) یا انھیں پکڑ لے جبکہ وہ خوفزدہ ہو چکے ہوں، پس تمہارا پروردگار بڑا ہی شفیق اور رحیم ہے۔ ۴۷) (سورۃ النحل: ۴۵۔۴۶۔۴۷)

Marfat.com

عذاب سے بے فکری پر اظہار تعجب

مشرکین کے اعتراضات کا جواب دینے کے بعد ان کے عام حالت پر اظہارِ تعجب کرتے ہوئے پروردگار فرماتا ہے کہ ایک طرف سے دعوتِ اسلامی کو روکنے کے لیے یہ لوگ ہم کے اعتراضات کرتے ہیں، بال کی کھال اتارتے اور مین میخ نکالتے ہیں اور دوسری طرف آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے لیے بدترین سازشوں میں لگے رہتے ہیں حالانکہ وہ اپنی آنکھوں سے ایسی نشانیاں دیکھ چکے ہیں جس کے بعد نبی کریم ﷺ کی رسالت سے انکار کرنا انتہائی ڈھٹائی کی بات ہے اور سوچنے والوں کے لیے تو یہی بات کفایت کرتی ہے کہ اس دعوت کو ایک ایسی شخصیت پیش کر رہی ہے جس کی سیرت اور کردار انتہائی اجلا اور جھوٹ اور خیانت کے ہر عیب سے پاک ہے اور مزید یہ کہ جن لوگوں نے اس دعوت کو قبول کیا ان کی استقامت یہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ اگر اسلام میں کوئی کجی ہوتی تو وہ لوگ اسلام پر قائم نہ رہ سکتے جن کو کفار نے ہر طرح کی اذیتیں پہنچا کر دیکھ لیا لیکن ان کے اخلاص اور وفاداری میں کوئی کمی نہ آئی۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مشرکینِ مکہ ان تمام شواہد کو دیکھنے کے باوجود اگر اپنی ہٹ سے باز نہیں آتے تو وہ شاید اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بے فکر ہو چکے ہیں۔ ان کو کوئی ایسی جائے پناہ میسر آ چکی ہے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ کوئی عذاب ان کا کوئی نقصان نہیں کر سکتا حالانکہ وہ اس بات کو جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے کوئی بعید نہیں۔ وہ جب چاہے ان کی آبادیوں سمیت انھیں زمین میں غرق کر سکتا ہے اور یا ان پر اس طرح عذاب لا سکتا ہے کہ انھیں اس کا شعور بھی نہ ہونے پائے یا اچانک اللہ تعالیٰ کی گرفت آ جائے اس حال میں کہ وہ اپنی رواروی اور زندگی کی ہماہمی میں مصروف ہوں۔ وہ زندگی کے معمولات اور سوشل تقریبات میں کھوئے ہوئے ہوں اور یا وہ خطرے کو محسوس کرتے ہوئے بچاؤ کی تدبیریں کر رہے ہوں کہ اللہ تعالیٰ انھیں اس طرح آ پکڑے کہ ان کی سب تدبیریں دھری رہ جائیں۔

خطرے اور تـخـوّف کی دو صورتیں ممکن ہیں اور یہ دونوں ہی اس کے معنی میں شامل سمجھی جاتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ پہلے عذاب کی نشانیاں نمودار ہوں جس سے انھیں یہ گمان ہو کہ شاید اللہ تعالیٰ کا عذاب آنے والا ہے۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ مسلسل کاروبار میں نقصان ہوتا جائے، کھیتیاں ویران ہونے لگیں، پیداوار گھٹنی شروع ہو جائے، ہر چیز میں ابتری پھیل جائے، معیشت کا پہیہ جام ہونے لگے، اسے عربی زبان میں تنقص کہا جاتا ہے۔ حضرت عمر فاروق ؓ کا ایک واقعہ اس پر دلالت کرتا ہے۔ آپ ؓ نے ایک دن برسرِ ممبر لوگوں سے پوچھا کہ لوگو! اَوْ یَاْخُذَھُمْ عَلٰی تَخَوُّفٍ کا کیا مطلب ہے؟ سب خاموش ہو گئے۔

> بنی ہذیل کا ایک بوڑھا اٹھا اور اس نے عرض کی اے امیر المومنین، یہ ہماری لغت ہے یہاں التخوّف کا معنی التنقص ہے یعنی آہستہ آہستہ کسی چیز کا گھٹتے چلے جانا۔ آپ نے پوچھا کیا یہ لفظ اس معنی میں عرب کے شعراء نے بھی استعمال کیا ہے۔ وہ بولا جی ہاں ہمارا شاعر ابو کبیر ہذلی اپنی اونٹنی کے متعلق کہتا ہے۔ جس کی اونچی کوہان کو سفر کی طوالت نے لاغر کر دیا تھا۔
>
> تـخـوّف الرحل تامکاً قرداً ☆ کما تـخـوّف عود النبعة السفن،
>
> کہ کجاوے نے میری اونٹنی کی موٹی تازہ اونچی کوہان کو گھسا کر کم کر دیا ہے جس طرح نبعہ درخت کی لکڑی گھسانے والا آلہ گھسا کر چھوٹا کر دیتا ہے۔ یہ شعر سن کر حضرت عمر فاروق ؓ نے فرمایا، لوگو! جاہلیت کے اشعار یاد کیا کرو۔ اس میں تمھاری کتاب کی تفسیر اور تمھارے کلام کے معانی ہیں۔ (قرطبی)

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جو ہر طرح عذاب دینے پر قادر ہے اور مشرکین کی حالت اس عذاب کا تقاضا بھی کرتی ہے۔ اس لیے پروردگار نے ان کی لاپرواہی اور جسارت پر تعجب کا اظہار بھی کیا۔ بایں ہمہ وہ لوگ اپنے معمول کی زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کے عیش و عشرت میں کوئی کمی نہیں ہوتی اور اللہ تعالیٰ قدرت رکھنے کے باوجود ان پر گرفت نہیں فرماتا، تو آخر اس کی وجہ کیا ہے۔ آیتِ کریمہ کے آخر میں اس کا جواب ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ تمھارا رب رؤف اور رحیم ہے۔ وہ نہایت مہربان اور نہایت رحم فرمانے والا ہے۔ اس کی رحمت کا تقاضا یہ ہے کہ تمھیں زیادہ سے زیادہ مہلت دی جائے۔ شاید کسی وقت تم ہدایت کی طرف پلٹ جاؤ، کوئی نصیحت تم پر اثر کر جائے۔ عذاب میں تاخیر اس کی رحمت کی دلیل ہے ورنہ کسی کام

Marfat.com

کوکرگزرنا اس کے لیے کوئی حیثیت نہیں رکھتا، وہ ایک لمحے میں ساری دنیا کو تباہ کرسکتا ہے لیکن قوموں کی تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ اس نے اس وقت تک کسی قوم پر عذاب نازل نہیں کیا جب تک کہ قبولیتِ ہدایت کے تمام سوتے خشک نہیں ہوگئے اور ہر طرح کی امید مرجھا نہیں گئی۔

اَوَلَمْ یَرَوْا اِلٰی مَاخَلَقَ اللّٰہُ مِنْ شَیْءٍ یَّتَفَیَّؤُا ظِلٰلُہٗ عَنِ الْیَمِیْنِ وَالشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰہِ وَھُمْ دٰخِرُوْنَ ۝

(کیا انھوں نے اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی ان چیزوں کو نہیں دیکھا جن کے سائے داہنی طرف اور بائیں طرف جھکتے ہیں۔ تابع ہیں اللہ تعالیٰ کے اور اللہ تعالیٰ کے روبرو عاجز ہیں۔ ۴۸) (سورۃ النحل:۴۸)

توحید پر ایک تکوینی دلیل

گزشتہ آیات میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی ہمہ گیری کا عالم یہ ہے کہ وہ اس بستی ہوئی دنیا کو جب چاہیے تہہ و بالا کردے، دھرتی کو الٹ دے یا اور مختلف طریقوں سے اہلِ زمین کو اپنی گرفت میں لے لے۔ اب اس آیت میں مشرکین کو مزید توجہ دلاتے ہوئے ایک تکوینی دلیل ارشاد فرمائی جارہی ہے کہ اللہ تعالیٰ صرف زمین پر بستے ہوئے انسانوں ہی پر قادر نہیں بلکہ کائنات کی کوئی چیز بھی جو اس نے پیدا فرمائی ہے یہاں تک کہ سایہ دار چیزوں کے سائے بھی حکمِ الٰہی کے مطیع و منقاد ہیں۔ ہر چیز کا سایہ زمین پر بچھا رہتا ہے ایسا لگتا ہے کہ وہ خدا کے آگے سجدہ ریز ہے۔ پھر وہ آہستہ آہستہ اٹھنا شروع ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ جب سورج سمت راس میں آتا ہے تو سایہ بالکل کھڑا ہوجاتا ہے۔ پھر جب سورج جھکنا شروع ہوتا ہے تو سایہ دوسری سمت میں زمین پر بچھنا شروع کردیتا ہے۔ اسی طرح ہر سایہ کے 24 گھنٹے رکوع و سجود میں گزرتے ہیں اور یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ سایہ کا سجدہ سورج کی بالکل مخالف سمت میں ہوتا ہے۔ سورج اگر پورب کی طرف ہے تو سایہ پچھم کی طرف پھیلے گا۔ اور اگر سورج پچھم کی طرف ہے تو سایہ کا پھیلاؤ پورب کی طرف ہوگا۔ یہ ایک لطیف اشارہ ہے اس حقیقت کی طرف کہ سایہ کی فطرت ابراہیمی ہے، آفتاب پرستی سے اس کو عار ہے۔

مشرک جاہلی قوموں میں سایہ کے متعلق بھی عجیب عجیب توہمات پائے جاتے ہیں۔ قرآنِ مجید ان سب کا قلع قمع کرکے بتاتا ہے کہ سارے سائے اور سایہ دار چیزیں قانونِ الٰہی کی محکوم ہیں۔ اسی پر بس نہیں بلکہ سایہ کے موجبات و مسببات حرکتِ سایہ کے اسباب اس سایہ کے خواص، یہ سب حکمِ الٰہی سے ہیں۔

اس سے اس جانب بھی اشارہ ہے کہ تمام جسمانی اشیاء چھوٹی ہوں یا بڑی، جاندار ہوں یا بے جان سب ایک ہمہ گیر قانون کی گرفت میں جکڑی ہوئی ہیں۔ کسی چیز کا سایہ ہونا اس کے مادی ہونے کی دلیل ہے اور مادی ہونا بندہ اور مخلوق ہونے کی علامت ہے اور کوئی مخلوق ایسی نہیں جس کی پیشانی پر بندگی کا داغ لگا ہوا نہیں۔ ہر مخلوق اپنے خالق کے سامنے محتاج بھی ہے اور سجدہ ریز بھی۔ اللہ تعالیٰ کی الوہیت میں اس کا کوئی ادنیٰ حصہ بھی نہیں۔ اس پروردگار کے سامنے بڑی سے بڑی مخلوق بھی سر ڈالے ہوئے عجز کی تصویر بنی رہتی ہے کیونکہ ایک مخلوق کے لیے عاجزی ہی اس کا اصل جوہر ہے۔

وَلِلّٰہِ یَسْجُدُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّۃٍ وَّالْمَلٰٓئِکَۃُ وَھُمْ لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ ۝ یَخَافُوْنَ رَبَّھُمْ مِّنْ فَوْقِھِمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ ۝ ۩ السجدۃ (سورۃ النحل : ۴۹، ۵۰)

(اور اللہ تعالیٰ ہی کو سجدہ کرتے ہیں جتنے آسمانوں اور زمین میں جاندار ہیں اور فرشتے بھی۔ وہ سرتابی نہیں کرتے۔ ۴۹) وہ اپنے اوپر اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور وہی کرتے ہیں جس کا ان کو حکم ملتا ہے۔ ۵۰)

توحید پر مزید زور دیتے ہوئے فرمایا کہ آسمانوں اور زمین میں جتنے بھی جاندار ہیں سب اللہ تعالیٰ ہی کو سجدہ کرتے ہیں حتیٰ کہ فرشتے بھی جن کو مشرکینِ عرب نے اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں بنا رکھا تھا اور انھیں اللہ تعالیٰ کے اختیارات میں شریک سمجھتے تھے اور یہ یقین رکھتے تھے کہ اگر اللہ تعالیٰ کسی کو سزا دینا چاہے اور بیٹیاں اڑ جائیں تو وہ اپنے باپ کو مجبور کردیں گی۔ اس طرح لوگ سزا سے بچ جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا ابطال کرتے ہوئے فرمایا کہ

Marfat.com

زمین وآسمان میں کوئی مخلوق بھی ایسی نہیں جو اللہ تعالیٰ کے احکام سے سرتابی کر سکے۔ فرشتے تو ہمہ وقت ہاتھ باندھے احکام کے انتظار میں کھڑے رہتے ہیں، جو حکم ملتا ہے بجا آوری کے لیے دوڑ پڑتے ہیں۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم یا اس کے منشا کی مخالفت کی جا سکتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے حکم سے سرتابی تو دور کی بات ہے، فرشتے اور دوسری مخلوقات تو ہر دم لرزاں و ترساں رہتی ہیں کہ کوئی بات منشاءِ ایزدی کے خلاف ان سے سرزد نہ ہو جائے۔ اس لیے وہ صرف ایک ہی بات کے پابند ہیں کہ ہر وہ کام کریں جس کا ہمیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم دیا جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی یہ شان نہیں کہ اس کی غیر مشروط اطاعت کی جائے اور اس کے سامنے سجدہ کیا جائے کیونکہ یہ حقوق صرف اس کے ہیں جو کائنات کا خالق ہے اور اس کے ہیں جو تمام مخلوقات کا الٰہ ہے۔ اگر کوئی اپنے طور پر اس کا دعویٰ کرتا ہے تو وہ دعویٰ آذری ہے۔

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری

وَقَالَ

اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰـهَيْنِ اثْنَيْنِ ۚ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَاِيَّايَ
فَارْهَبُوْنِ ﴿٥١﴾ وَلَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَهُ الدِّيْنُ
وَاصِبًا ۭ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَتَّقُوْنَ ﴿٥٢﴾ وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ
ثُمَّ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَاِلَيْهِ تَجْــــَٔــرُوْنَ ﴿٥٣﴾ ثُمَّ اِذَا كَشَفَ الضُّرَّ
عَنْكُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْكُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُوْنَ ﴿٥٤﴾ لِيَكْفُرُوْا بِمَآ
اٰتَيْنٰهُمْ ۭ فَتَمَتَّعُوْا ۣ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿٥٥﴾ وَيَجْعَلُوْنَ لِمَا لَا يَعْلَمُوْنَ
نَصِيْبًا مِّمَّا رَزَقْنٰهُمْ ۭ تَاللّٰهِ لَتُسْـَٔــلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَفْتَرُوْنَ ﴿٥٦﴾
وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ الْبَنٰتِ سُبْحٰنَهٗ ۙ وَلَهُمْ مَّا يَشْتَهُوْنَ ﴿٥٧﴾ وَاِذَا
بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ﴿٥٨﴾ ۚ
يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْۗءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ۭ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰي

Marfat.com

هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِی التُّرَابِ ؕ اَلَا سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴿۵۹﴾
لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ مَثَلُ السَّوْءِ ۚ وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ
الْاَعْلٰی ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۶۰﴾ ع

رکوع: ۷ (اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا دو معبود مت بناؤ، وہ تو صرف ایک ہی معبود ہے، پس فقط مجھ ہی سے ڈرو۔ ۵۱) اور اسی کا جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور اسی کی اطاعت ہمیشہ لازم ہے، تو کیا تم اللہ تعالیٰ کے سوا غیروں سے ڈرتے ہو۔ ۵۲) اور تمھارے پاس جو نعمت بھی ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے پھر جب تمھیں تکلیف پہنچتی ہے تو اسی سے تم فریاد کرتے ہو۔ ۵۳) پھر جب وہ تم سے تکلیف دور کر دیتا ہے تو تم میں سے ایک گروہ اپنے رب کے ساتھ شریک کرنے لگتا ہے۔ ۵۴) تاکہ ناشکری کرے اس چیز کی جو ہم نے ان کو بخشی ہے، پس اے ناشکرو لطف اٹھالو چند روز، تمھیں اپنا انجام معلوم ہوجائے گا۔ ۵۵) اور مقرر کرتے ہیں حصہ ان کے لیے جن کو یہ جانتے ہی نھیں ان چیزوں میں سے جو ہم نے ان کو دیں، اللہ کی قسم تم سے ضرور پوچھا جائے گا اس کے متعلق جو تم بہتان باندھا کرتے تھے۔ ۵۶) وہ ٹھہراتے ہیں اللہ کے لیے بیٹیاں، وہ ان چیزوں سے پاک ہے اور ان کے لیے تو وہ (بیٹے) ہیں جنھیں وہ پسند کرتے ہیں۔ ۵۷) اور جب ان میں سے کسی کو بیٹی کی خوشخبری سنائی جاتی ہے تو اس کا چہرہ سیاہ پڑجاتا ہے اور وہ گھٹا گھٹا رہتا ہے۔ ۵۸) اور وہ لوگوں سے چھپا پھرتا ہے اس بری خبر کے بارے جو اسے دی گئی ہے، سوچتا ہے کہ اس کو ذلت کے ساتھ رکھ چھوڑے یا اسے مٹی میں گاڑ دے، آہ! کتنا برا ہے وہ فیصلہ جو وہ کرتے ہیں۔ ۵۹) ان لوگوں کے لیے جو آخرت پر ایمان نھیں رکھتے، بری تمثیل ہے، اور اللہ کے لیے اچھی صفتیں ہیں اور وہ سب پر غالب بڑا دانا ہے۔ ۶۰)

وَقَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ ۚ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَاِيَّایَ فَارْهَبُوْنِ ﴿۵۱﴾ (سورة النحل : ۵۱)

(اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا دو معبود مت بناؤ، وہ تو صرف ایک ہی معبود ہے، پس فقط مجھ ہی سے ڈرو۔ ۵۱)

توحید ایک حقیقت ہے اس پر اللہ تعالیٰ کی شہادت

سابقہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے متنوع دلائل سے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ توحید اس کائنات کی اصل حقیقت ہے۔ شرک ایک عارضہ ہے جو کم علمی، کم عقلی یا دل و دماغ کے بگاڑ سے پیدا ہوتا ہے۔ اور پھر اس کی تائید میں کائنات کی ایک ایک چیز کا حوالہ دیا کہ دیکھو وہ کس طرح اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ ریز ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور اِلٰہ ہوتا یا کوئی اور خدا ہوتا تو کائنات میں کہیں اس کی بندگی ہوتی ہوئی نظر آتی۔ مخلوقات میں سے کوئی مخلوق اس کے سامنے بھی جھکتی اور سجدہ ریز ہوتی۔ عقل، نقل اور مشاہدہ تینوں اس بات پر متفق ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اِلٰہ نھیں۔ چنانچہ اس حقیقت کو واضح کر دینے کے بعد پروردگار فرماتا ہے اور حاکمانہ شان سے حکم دیتا ہے کہ خبردار اب دو اِلٰہ یا دو خدا مت بنانا۔ جب تم نے دلائل سے یہ بات سمجھ لی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اِلٰہ نھیں تو پھر کسی دوسرے اِلٰہ کا تصور اور عقیدہ انتہائی حماقت ہے، تو اس حماقت سے رک جاؤ اور پھر اس حکم کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس پر اپنی شہادت بھی ریکارڈ کروائی ہے کہ یاد رکھو اور اس میں کوئی شبہ ہی نھیں کہ اللہ تعالیٰ ہی ایک اِلٰہ ہے۔ اس کے سوا کوئی اِلٰہ نھیں اور اللہ تعالیٰ کی یہ شہادت ہر دور میں دو طریقوں سے انسانوں تک پہنچتی رہی ہے۔ ایک تو انبیاء کرام کی معرفت کیونکہ جتنے

Marfat.com

نبی دنیا میں آئے ہیں چاہے وہ دنیا کے کسی خطے میں ہوں اور بیشک انھوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تک نہ ہو، ان کے زمانے بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوں، ان کے بعثت کے مقام میں بیشک لمبی مسافت حائل ہو لیکن حیرانی کی بات یہ ہے کہ انھوں نے ہر حال میں اور ہر جگہ ایک ہی شہادت دی کہ کائنات کا الٰہ اور خدا ایک ہے، اس کے سوا کسی اور کی ہرگز گنجائش نھیں۔ تم ایک ہی خدا کی عبادت کرو، وہی ہمارا بھی رب ہے اور تمھارا بھی رب ہے۔ ہم نبی ہوتے ہوئے بھی اسی کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں اور تم بھی اسی کے سامنے سر جھکاؤ۔

دوسری شہادت اس نے ہر دور میں گرد و پیش پھیلی ہوئی اور خود انسان کے اندر پنہاں نشانیوں کے ذریعے دی اور جا بجا فرمایا کہ تم اپنی ذات کو دیکھو، تمھارے نفسوں میں جو حیرت انگیز صلاحیتیں، احساسات اور انفعالات پائے جاتے ہیں، تمھارا جسم جن عناصر سے وجود پذیر ہوا ہے، تمھیں جس طرح خوراک مہیا کی جارہی ہے اور جس طرح تمھاری شریانوں میں خون دوڑتا ہے اور پھر تمھارے دل و دماغ کی رعنائیاں جو بجائے خود جہانِ اصغر ہیں اور پھر تمھارے گرد و پیش میں پھیلی ہوئی دنیا جو زمین پر بھی ہے اور آسمانوں پر بھی اور ان کے درمیان بھی۔ آسمان کے بے شمار کُرّے اور ان کی گردش، سورج اور چاند کی منزلیں اور ان کے متعین مشاغل پھر تمام عناصر کا باہم متخالف ہونے کے باوجود نہایت اتحاد اور توافق کے ساتھ اپنی ذمہ داریاں ادا کرنا اور انسانی زندگی کے لیے سہولتیں بہم پہنچانا ان میں ایک ایک چیز اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی وحدانیت پر دلالت کرتی ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی وہ گواہی ہے جو کائنات کے وجود میں آنے سے لے کر آج تک دی جارہی ہے۔ اس شہادت نے باقی شہادات کی توثیق کی اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ اس کے بعد فرمایا کہ جب حقیقتِ ثابتہ یہ ہے تو پھر تمھیں یہ بات زیب نھیں دیتی کہ تم میرے سوا کسی اور سے ڈرو۔

اس آیتِ کریمہ میں یہ جو فرمایا گیا ہے کہ دو الٰہ مت بناؤ تو اس کا یہ مطلب ہرگز نھیں کہ تین چار بیشک بنالو، بلکہ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ واحد ہی نھیں یکتا ہے۔ اس کی صفت احد ہونا ہے۔ احد کے ساتھ کوئی دوسرا عدد نھیں لگ سکتا۔ جب آپ کسی کو واحد کہتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ چیز دو بھی ہو سکتی ہے لیکن جب آپ احد کہتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے ساتھ دوئی یا ثنویت کا تصور نا قابلِ قبول ہے۔ اس لیے اگر تم اللہ تعالیٰ کو مانتے ہو تو اس کی خدائی میں کسی دوسرے کا شریک کرنا ناممکن ہے۔

وَلَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَهُ الدِّیْنُ وَاصِبًا ؕ اَفَغَیْرَ اللّٰهِ تَتَّقُوْنَ ﴿۵۲﴾ (سورة النحل : ۵۲)

(اور اسی کا جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور اسی کی اطاعت ہمیشہ لازم ہے، تو کیا تم اللہ تعالیٰ کے سوا غیروں سے ڈرتے ہو۔ ۵۲)

وَاصِب کا معنی

آیت میں وَاصِبًا کا لفظ آیا ہے، اس کا معنی ہے ہمیشہ۔ قاعدہ یہ ہے کہ جب کسی کام کو ہمیشہ کیا جاتا ہے تو وہ لازمی ہو جاتا ہے ورنہ ہمیشہ کرنے کا کوئی مفہوم ہی نھیں۔ اس لیے اس کا ترجمہ لازم سے بھی کیا جاتا ہے۔

توحید پر دلیل

سابقہ آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے جس بات پر گواہی دی ہے یہ اس کی دلیل ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ کائنات میں جو کچھ ہے وہ اللہ تعالیٰ کی ملک ہے یعنی سب اس کے مملوک ہیں اور وہ سب کا آقا ہے۔ اسی طرح دنیا میں ہر چیز اس کی مخلوق ہے۔ وہ سب کا خالق ہے۔ جب دنیا کی ہر چیز اس کی مملوک اور اس کی مخلوق ٹھہری تو یہ بات خود بخود اس سے نکلی کہ دنیا کی ہر چیز پر اس کی اطاعت لازم ہے۔ وہ مخلوق کیا ہوئی جو اپنے خالق کی اطاعت نہ کرے اور وہ مملوک کیسا ہوا جو اپنے آقا کا حکم نہ مانے۔ مخلوق اور مملوک کے لیے اطاعت ایک لازمی امر اور ان کی حیثیت کا لازمی نتیجہ ہے۔ لیکن یہ کس قدر عجیب بات ہے کہ انسان کی عقل کا تو یہ فیصلہ ہے کہ مملوک کو اپنے آقا اور اپنے مالک اور مخلوق کو اپنے خالق کی اطاعت کرنا لازمی ہے۔ لیکن انسان کا

Marfat.com

طرزِ عمل اس کے بالکل برعکس ہے۔ وہ اطاعت کے بجائے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہے بلکہ اس کے احکام سے بغاوت کا رویہ اختیار کرتا ہے اور اس پر بھی مزید حیرت کی بات یہ ہے کہ بجائے اللہ تعالیٰ کے ڈرنے کے وہ ان سے ڈرتا ہے جس کا نہ وہ مملوک ہے اور نہ مخلوق ہے۔ اور ان کی مصنوعی قوتوں کو اپنے لیے خطرہ سمجھتا ہے اور ان کے خانہ ساز اقتدار کو اللہ تعالیٰ کے اقتدار سے بڑھ کر سمجھتا ہے۔ جن کی گرفت سے بچنے کے سو طریقے ہیں ان کے سامنے جھکتا ہے اور ان کے احکام بجالاتا ہے لیکن جس کی گرفت بے پناہ اور بے ڈھب ہے اور جو پکڑنے پہ آئے تو کوئی چھڑا نہیں سکتا۔ اس کی گرفت سے بے نیاز ہو کر من مانی زندگی گزارتا ہے۔ اس حماقت پر افسوس کا اظہار ہی کیا جاسکتا ہے۔

وَمَا بِكُم مِّن نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللَّهِ ثُمَّ إِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَإِلَيْهِ تَجْأَرُونَ ﴿۵۳﴾ (سورة النحل : ۵۳)

(اور تمہارے پاس جو نعمت بھی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے پھر جب تمہیں تکلیف پہنچتی ہے تو اسی سے تم فریاد کرتے ہو۔ ۵۳)

توحید پر انفسی دلیل

اس آیتِ کریمہ کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں مشرکین کی بے عقلی اور حماقت پر تعریض کی گئی ہے اور دوسرے جملے میں توحید پر انفسی دلیل قائم کی گئی ہے۔ سب سے پہلی بات یہ ارشاد فرمائی گئی ہے کہ تم اگر اپنی عقل پر تھوڑا سا زور دو تو باور کرلو گے کہ تمہارے پاس جو بھی نعمت ہے وہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ہے۔ تمہارا اپنا جسم اور اس کی توانائی، تمہارا دماغ اور اس کی رعنائی، تمہارا دل اور اس کی پہنائی، تمہارے حواس اور ان کی وسعت، تمہاری عقل اور اس کی گیرائی، تمہاری دولت اور اس کی پذیرائی، غرضیکہ کوئی نعمت ایسی نہیں جسے تمہیں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور نے عطا کیا ہو۔ تم تسلیم کرتے ہو کہ اللہ تعالیٰ ہی تمہارا خالق ہے تو ان میں سے کتنی نعمتیں ہیں جو تخلیق کے ساتھ عمل میں آئی ہیں اور پھر کتنی ایسی نعمتیں ہیں جو تمہاری قوتِ اکتساب کے برگ وبار ہیں۔ حقیقت میں دیکھا جائے کہ یہ اسی قوت کے نتائج ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے عطا کیا ہے۔ لیکن یہ بات کس قدر ستم ظریفی کی ہے کہ تم انھیں نعمتوں کی عطا میں نہ جانے کس کس کو شریک سمجھتے ہو۔ اور پھر نہ جانے کس کس کا تم نے حصہ مقرر کر رکھا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنی ذات میں ایسی پہیلی ہے جو عقل وقت سے بوجھتی ہے کہ اسے یہ تسلیم ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی ان نعمتوں کا عطا کرنے والا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی شرک کا عقیدہ بھی چھوٹنے نہیں پاتا۔ آخر اس دوعملی کا کیا جواز ہے۔ کسی نے سچ کہا کہ انسان عجیب واقعہ ہوا ہے کہ اکڑنے پہ آتا ہے تو احکم الحاکمین کے سامنے اکڑ جاتا ہے اور جھکنے پہ آتا ہے تو پتھر کے گھڑے ہوئے خداؤں کے سامنے جھک جاتا ہے۔

انسانی خرد کی تنگ دامانیوں کی داستان اپنی جگہ لیکن انسان کو اللہ تعالیٰ نے جو فطرتِ سلیمہ عطا کر رکھی ہے انسان کے بگاڑ کے ساتھ ساتھ اس کا بگاڑ بھی بڑھتا رہتا ہے لیکن جب کبھی ایسے حالات پیدا ہوجاتے ہیں جس میں مجبوراً اسے اپنی اصل حالت پر لوٹ کر کام کرنا پڑتا ہے تو وہ ٹھیک وہی کام کرتی ہے جس کے لیے اسے پیدا کیا گیا ہے۔ مثلاً ان لوگوں کی بگڑی ہوئی فطرت ہمیشہ ان کو شرک کے راستے پر چلاتی رہتی ہے۔ یہ کسی کشتی پر سوار ہوتے ہیں تو سواری سے پہلے بھی جل دیوتا کی نذر گزارتے ہیں اور پھر دورانِ سفر نہ جانے کس کس دیوتا، اوتار اور مظہرِ قدرت کی دہائی دیتے جاتے ہیں اور ان سے سلامتی کی دعائیں مانگتے ہیں۔ لیکن جب کشتی کسی طوفان کی گرفت میں آجاتی ہے تو پھر کشتی کے تمام مسافر بیک زبان پکار اٹھتے ہیں کہ اب اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور سننے والا نہیں، اس کے شریکوں کو پکار کے دیکھ لیا، کسی نے ہماری بات نہیں سنی، اب ایک ہی بارگاہ ہے، اسے پکارو، وہ یقیناً ہماری مدد کو پہنچے گا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم تمام شریکوں کو پکارتے ہو اور کہیں بھی شرک سے رکنے کا نام نہیں لیتے، لیکن جب ہر سہارا ناکام ہوجاتا ہے اور ہر طرف سے مایوس ہوجاتے ہو پھر تم اللہ تعالیٰ کو کیوں پکارتے ہو۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اصل فطرت کے اندر صرف ایک ہی خدا کا شعور ہے۔ یہ دوسرے دیوی دیوتا جو تم نے بنا رکھے ہیں اصل فطرت کے اندر ان کی کوئی جگہ نہیں۔ چنانچہ جب بھی فطرت کو صحیح کام کرنے کا موقع ملتا ہے تو یہ سب مصنوعی دیوی دیوتا غائب ہوجاتے ہیں اور صرف ایک ہی خدا باقی رہ جاتا ہے جس کا اعتقاد اصل فطرت کے اندر ودیعت ہے۔

Marfat.com

ثُمَّ إِذَا كَشَفَ الضُّرَّ عَنْكُمْ إِذَا فَرِيقٌ مِّنْكُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُوْنَ ﴿۵۴﴾ لِيَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ ۭ فَتَمَتَّعُوْا
فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۵۵﴾ (سورة النحل : ۵۴۔۵۵)

(پھر جب وہ تم سے تکلیف دور کر دیتا ہے تو تم میں سے ایک گروہ اپنے رب کے ساتھ شریک کرنے لگتا ہے۔ ۵۴) تا کہ ناشکری کرے اس چیز کی جو ہم نے ان کو بخشی ہے، پس اے ناشکرو لطف اٹھالو چندروز، تمھیں اپنا انجام معلوم ہو جائے گا۔ ۵۵)

جب اللہ تعالیٰ تمھارے دعائیں مانگنے اور آہ وزاری کرنے پر تمھاری مصیبت اور مشکل کو دور کر دیتا ہے تو کچھ زیادہ وقت نھیں گزرتا کہ تم میں سے ایک گروہ پھر اپنی ڈگر پر لوٹ جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ دیوی دیوتاؤں کو شریک کرنے لگتا ہے اور وہی پہلی کیفیت پھر لوٹ آتی ہے۔ یہ درست ہے کہ بعض دفعہ ایسے جھٹکے بعض انسانوں کو راہِ راست پر بھی لے آتے ہیں لیکن زیادہ تر لوگ حالات کے درست ہو جانے پر پھر اپنی پہلی حالت پر لوٹ جاتے ہیں اور اگر انھیں کوئی توجہ دلاتا ہے کہ دیکھو تمھیں اللہ تعالیٰ نے کتنی بڑی افتاد سے نکالا ہے، تم کتنی بڑی مصیبت میں گھر گئے تھے اور تمھارے تمام سہارے جواب دے گئے تھے، لیکن تم بجائے اپنی غلطی تسلیم کرنے کے اس کی کوئی نہ کوئی توجیہ تلاش کر لیتے ہو کہ یہ صحیح ہے کہ ہم نے اس مصیبت میں اللہ تعالیٰ کو بھی پکارا تھا لیکن یہ بھی امر واقعہ ہے کہ ہم نے فلاں فلاں کے نام کی دہائی دی تھی، ہم نے فلاں فلاں کی منت مانی تھی، ان ہی کی دستگیری ہمارے کام آئی۔ اگر اللہ تعالیٰ نے ہم پر کرم بھی فرمایا تو انھیں کے کہنے پر فرمایا۔ اس طرح ان کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا کیا ہے اس کا وہ انکار کر دے۔ بجائے اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کے کفرانِ نعمت کرے۔ پروردگار اس پر برہم ہو کر انھیں تنبیہ فرماتا ہے کہ نادانو! اور احسان فراموشو! تم اگر اپنا رویہ بدلنا نھیں چاہتے اور ناشکری سے باز نھیں آنا چاہتے تو ٹھیک ہے تمھارے پاس چند روزہ مہلت ہے۔ ان نعمتوں سے خوب فائدہ اٹھاؤ۔ لیکن عنقریب تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ تمھیں کیسے برے انجام سے واسطہ پڑتا ہے۔ جب جہنم کی ہولناکیاں تمھیں اپنے اندر کھینچ رہی ہوں گی تو اس وقت کوئی بچانے والا ہاتھ تمھیں بچانے کے لیے آگے نھیں بڑھے گا۔

وَيَجْعَلُوْنَ لِمَا لَا يَعْلَمُوْنَ نَصِيْبًا مِّمَّا رَزَقْنٰهُمْ ۭ تَاللّٰهِ لَتُسْــَٔـلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَفْتَرُوْنَ ﴿۵۶﴾

(اور مقرر کرتے ہیں حصہ ان کے لیے جن کو یہ جانتے ہی نھیں ان چیزوں میں سے جو ہم نے ان کو دیں، اللہ تعالیٰ کی قسم تم سے ضرور پوچھا جائے گا اس کے متعلق جو تم بہتان باندھا کرتے تھے۔ ۵۶) (سورۃ النحل:۵۶)

اللہ تعالیٰ پر افترا

آیتِ کریمہ میں لَا يَعْلَمُوْنَ کا فعل استعمال ہوا ہے۔ اس کے فاعل دو طرح سے ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس کا فاعل بت ہوں تو پھر اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ یہ مشرک لوگ اللہ تعالیٰ کے ساتھ جن بتوں کو شریک کرتے ہیں ان بتوں کو خبر بھی نھیں کیونکہ وہ زندگی نھیں رکھتے تو کسی چیز کی خبر کیسے رکھ سکتے ہیں۔ یہ اپنے مال و دولت یا اپنے مویشیوں میں ان بتوں کا حصہ مقرر کرتے ہیں جیسے مسلمانوں کے مال میں اللہ تعالیٰ کے حصے کے طور پر زکوٰۃ فرض کی گئی ہے، لیکن ان بتوں کو پتھر اور مردہ ہونے کی وجہ سے کچھ خبر نھیں کہ کوئی ہمارا پجاری بھی ہے جو پوجا پاٹ کا حق ادا کرتے ہوئے اپنی کمائی میں ہمارا حصہ مقرر کرتا ہے۔ اور دوسری صورت یہ ہے کہ اس کا فاعل خود مشرک ہو۔ پھر اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ جن دیوی دیوتاؤں یا اور قوتوں کو یہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک سمجھنے کی وجہ سے اپنی کمائی میں ان کا حصہ مقرر کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اس کی وجہ سے ہماری کمائی میں برکت ہوتی ہے اور یہی قربانیاں قیامت کے دن ہماری نجات کا باعث ہوں گی۔ یہ بالکل نھیں جانتے کہ جن کا وہ حصہ مقرر کر رہے ہیں ان کی حقیقت کیا ہے۔ انھوں نے کچھ لوگوں سے سن سنا کر دیوی دیوتاؤں کا تصور دل و دماغ میں بٹھالیا ہے، لیکن کیا ان کا کوئی وجود بھی ہے یا نھیں۔ اور کیا وہ انسانی معاملات میں دخیل بھی ہو سکتے ہیں یا نھیں۔ اور کیا اس دنیا میں ان کے کچھ اختیارات بھی ہیں یا نھیں۔ اس بارے میں یہ کچھ نھیں جانتے۔ اسی طرح بعض لوگوں نے فرشتوں یا جنات کے بارے میں کچھ تصورات بنا رکھے ہیں۔ لیکن وہ اس بات سے بالکل بے خبر ہیں کہ جنات کی حقیقت کیا ہے۔ اور فرشتے انسانوں کے معاملات میں دخل دے سکتے ہیں یا نھیں۔ لیکن عجیب ستم ظریفی ہے کہ ان کے بارے میں کچھ نہ جاننے کے باوجود نہایت اخلاص کے ساتھ اپنی کمائی میں ان کا حصہ رکھتے ہیں۔ اور ان نعمتوں میں ان کا حصہ رکھتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا کر رکھی ہیں۔

Marfat.com

شرک انتہائی گری ہوئی حرکت ہے

یوں تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا بجائے خود ایک بہت گری ہوئی حرکت ہے کیونکہ معمولی عقل کا آدمی بھی جو کچھ بھی قوت مشاہدہ رکھتا ہو۔اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اور اس کی وسعتوں سے بے خبر نہیں ہوسکتا۔وہ رات دن اسی کا دیا کھاتا ہے اور اسی کی نعمتوں سے متمتع ہوتا ہے۔اپنے چاروں طرف پھیلی ہوئی کائنات کو وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے سامنے بے بس دیکھتا ہے۔اور ہر زندہ مخلوق کو وہ اسی کے دسترخوان سے پھلتا پھولتا دیکھتا ہے۔اور اگر توہمات نے اس کی عقل کو مفلوج نہیں کر دیا تو وہ کہیں بھی خدا کی خدائی میں کسی غیرِ خدا کا کوئی مقام نہیں پاتا۔اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص اس کے باوجود بھی شرک کرتا ہے تو وہ یقیناً ہوش وحواس کی سلامتی اور عقل وخرد کی اصابت سے تہی دامن ہے اور وہ ایک ایسا جرم کر رہا ہے جس کی کسی انسان سے توقع نہیں ہونی چاہیے۔لیکن ان کے جس جرم کا ذکر اس آیتِ کریمہ میں کیا گیا ہے وہ تو اس سے بھی اپنی سفاہت وشناعت میں کہیں بڑھا ہوا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک اگر مفلوج عقل کی حرکت ہے تو ان قوتوں کو اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرانا جن کے بارے میں شریک کرنے والا کچھ نہیں جانتا تو اس کے بارے میں کیا کہا جاسکتا ہے۔اور پھر اسی پر بس نہیں کہ شریک کرنے والا شریک کی جانے والی قوتوں کے بارے میں بے خبر ہے بلکہ جن کو شریک کیا جارہا ہے وہ شریک کرنے والوں کی حرکتوں سے بھی بے خبر ہیں۔وہ یا تو باخبر ہونے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے اور یا صلاحیت رکھتے ہیں لیکن ان دونوں کا آپس میں کوئی رشتہ نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں سے کوئی مخلوق ایسی نہیں جو اسباب سے ماوراء ہو کر کسی دوسری مخلوق کے کام آسکے۔اور نہ کسی مخلوق کی یہ حیثیت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں عطا کرنے والے کے حصے کے ساتھ ساتھ اس کی اجازت کے بغیر کسی کا حصہ مقرر کر جاسکے۔

سب سے بڑھ کر جرم

مشرکین کے اس جرم کو دیکھ کر آدمی یہ سمجھتا ہے کہ ان کی یہ حرکتیں محض ان کی جہالت اور توہم پرستی کا نتیجہ ہیں اور انسان کو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبرؑ اور کتابیں بھیج کر چونکہ جہالت کو دور کرنے کا مکلف بنایا ہے اس لیے انھیں جہالت پر اڑے رہنے اور توہمات کا علاج نہ کرنے کی سزا ملے گی۔لیکن گہری نظر سے دیکھا جائے تو ان کا جرم اس سے بھی ایک قدم آگے ہے۔وہ یہ کہ جس طرح انھوں نے جہالت اور توہم پرستی سے شرک کا راستہ اختیار کیا جو بجائے خود ایک جرم ہے۔اسی طرح اس سے بڑھ کر انھوں نے یہ حرکت کی کہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتیں جن پر خدا کے سوا کسی اور کا حق نہیں کیونکہ وہی ان کا پیدا کرنے والا اور وہی ان کا مالک ہے۔انھوں نے دھونس سے کام لے کر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر اپنی ملکیت جتائی اور پھر اپنی مرضی سے ان نعمتوں میں جس کے چاہے حصے مقرر کیے اور اس میں مزید افترا کرتے ہوئے یہ جسارت کی کہ اسے اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا۔گویا جرم ایک نہیں بلکہ ردے پر ردہ چڑھتا گیا۔

جرائم کی اس فہرست کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ کے غضب کو حرکت ہوئی اور نہایت برہمی سے ارشاد فرمایا کہ تم ان جرائم کو معمولی سمجھتے ہو اور جن کے تم دامن گرفتہ ہو ان پر اعتماد کر کے یہ سمجھتے ہو کہ وہ تمھیں اللہ تعالیٰ کے غضب سے بچالیں گے۔یاد رکھو اللہ تعالیٰ اپنی ذات ذوالجلال کی قسم کھا کے کہتا ہے کہ تم نے جس طرح اللہ تعالیٰ پر افترا باندھا ہے، تم سے اس کے بارے میں ضرور جواب طلب کیا جائے گا۔اور چونکہ اس کا کوئی جواب ممکن ہی نہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تمھیں اس پر سخت ترین سزا دی جائے گی۔

وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ الْبَنٰتِ سُبْحٰنَهٗ ۙ وَلَهُمْ مَّا يَشْتَهُوْنَ ﴿۵۷﴾ (سورۃ النحل : ۵۷)

(وہ ٹھہراتے ہیں اللہ تعالیٰ کے لیے بیٹیاں، وہ ان چیزوں سے پاک ہے اور ان کے لیے تو وہ (بیٹے) ہیں جنھیں وہ پسند کرتے ہیں۔ ۵۷)

Marfat.com

شرک کا دُہرا گھناؤنا پن

جو آدمی شرک جیسی گری ہوئی حرکت کرتا ہے وہ مسلسل نیچے گرتا ہی چلا جاتا ہے۔توحید آدمی کو رفعت آشنا بناتی ہے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ سے رشتہ جوڑتی ہے اور صرف اسی کے آستانے کا راستہ دکھاتی ہے۔اور شرک انسان کو پستی کی طرف لے جاتا ہے کیونکہ وہ ہر آستانے پر جھکنا سکھاتا ہے اور بالآخر انسانیت سے بھی گرا دیتا ہے۔یہ بالکل دو انتہائیں ہیں جو انسان کا امتحان بن جاتی ہیں۔''جگر'' نے بالکل ٹھیک کہا:

گھٹے اگر تو بس ایک مشتِ خاک ہے انساں
بڑھے تو وسعتِ کونین میں سما نہ سکے

یہ شرک کی انتہائی گراوٹ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہراتے ٹھہراتے اس کے لیے بیٹیاں ثابت کرنے لگتا ہے۔کہاں کائنات کا خالق و مالک اور کہاں مخلوقات میں سے کوئی اس کا ہمسر اور پھر کہاں ربِ کائنات سب کی ضرورتیں پوری کرنے والا اور کہاں احتیاج کی یہ انتہا کہ اسے اولاد کا محتاج بنا دیا جائے۔اور پھر اس کمینگی پر تو جتنی لعنت بھیجی جائے کم ہے کہ جو لوگ اپنے لیے بیٹیوں کو عار سمجھیں وہ اللہ تعالیٰ کے لیے بیٹیاں ثابت کریں۔چنانچہ مشرکین کی اسی گراوٹ اور کمینگی کو نمایاں کرتے ہوئے فرمایا کہ ذرا ان کا حال دیکھو کہ یہ اللہ تعالیٰ کے لیے بیٹیاں ٹھہراتے ہیں اور خود اپنے لیے بیٹے پسند کرتے ہیں کیونکہ انھیں یہ گوارا نہیں کہ کوئی ان کا داماد بنے اور داماد بن کر گھر آئے۔لیکن اللہ تعالیٰ کے لیے سب کچھ گوارا ہے۔

شرم سے گڑ جا اگر احساس تیرے دل میں ہے

قریش میں خزاعہ اور کنانہ کے قبیلوں کا یہ اعتقاد تھا کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں۔سبحانہ کہہ کر اس کی تردید کر دی گئی۔اولاد تو انسان کے لیے ایک کمزوری ہے۔کبھی احتیاج کی صورت میں اور کبھی محبت کی شکل میں، اور اللہ تعالیٰ ایسی ہر کمزوری سے پاک ہے۔لیکن محولہ بالا قبیلے یہ سمجھتے تھے کہ بیٹیاں چونکہ باپ کی کمزوری ہوتی ہیں اور وہ ضد کر کے جو چاہیں منوا سکتی ہیں۔اس لیے ہم فرشتوں کی پوجا کرتے ہیں اور ان کے نام کی قربانیاں دیتے ہیں تاکہ اگر کبھی اللہ تعالیٰ ہم سے غضبناک ہو تو بیٹیاں ہمیں اس کے غضب سے بچا لیں۔قرآنِ کریم اس کی تردید میں جہاں اللہ تعالیٰ کے بے عیب ہونے کا حوالہ دیتا ہے وہیں قریش کے طرزِ عمل کو بھی دلیل بناتا ہے۔اور اگلی آیتِ کریمہ میں اس طرزِ عمل کو کھول کر بیان کیا گیا ہے۔

وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ﴿۵۸﴾ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَابُشِّرَ بِهٖ ؕ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِى التُّرَابِ ؕ اَلَا سَآءَ مَايَحْكُمُوْنَ ﴿۵۹﴾ (سورۃ النحل : ۵۸۔۵۹)

(اور جب ان میں سے کسی کو بیٹی کی خوشخبری سنائی جاتی ہے تو اس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے اور وہ گھٹا گھٹا رہتا ہے۔ ۵۸) اور وہ لوگوں سے چھپا پھرتا ہے اس بری خبر کے بارے جو اسے دی گئی ہے، سوچتا ہے کہ اس کو ذلت کے ساتھ رکھ چھوڑے یا اسے مٹی میں گاڑ دے، آہ! کتنا برا ہے وہ فیصلہ جو وہ کرتے ہیں۔ ۵۹)

صنفِ نازک سے متعلق بعض قبائل کا رویہ

صنفِ نازک کو مرد کے مقابلے میں پورے جزیرۂ عرب میں دوسرے درجے کی مخلوق سمجھا جاتا تھا۔عرب کے عام قبائل میں صنفِ نازک کے لیے حقوق کا کوئی تصور نہ تھا لیکن بعض قبیلوں میں تو اس کے وجود سے نفرت کی جاتی تھی۔خاص طور پر مضر، خزاعہ اور تمیم کے قبائل اپنی بچیوں کو زندہ درگور کر دیتے تھے۔ان کا طریقہ یہ تھا کہ جب بچی 6 سال کی ہو جاتی تو باپ جنگل میں جا کر گڑھا کھودتا اور بچی کی ماں کو حکم دیتا کہ اسے غسل کراؤ اور خوبصورت جوڑا پہناؤ، پھر وہ اسے لے کر جنگل کی طرف چل پڑتا۔گڑھے کے کنارے پہنچ کر نہایت سنگدلی سے بچی سے کہتا کہ اس گڑھے میں دیکھو۔وہ جھک کر گڑھے میں دیکھنے کی کوشش کرتی تو وہ اسے دھکا دے کر اس میں گرا دیتا۔وہ معصوم ابا ابا کہہ کر چلاتی رہتی، لیکن یہ

Marfat.com

سنگدل باپ ذرا رحم نہ کھاتا اور اس پر منوں مٹی ڈال کر دفن کر دیتا۔ اور اس طرح سے اسے تسکین ہو جاتی کہ جس داغ نے میرا چہرہ سیاہ کر دیا تھا، میں نے وہ داغ دھو ڈالا۔ اور جب تک بچی زندہ رہتی وہ اسی تصور میں گھٹا گھٹا رہتا کہ کب میں اس لعنت سے جان چھڑاؤں اور کب اس عار سے میرا دامن پاک ہوگا۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک شخص نے جو اسلام قبول کرنے حاضر ہوا تھا، اپنی بچی کو زندہ درگور کرنے کا واقعہ حضورؐ کو سنایا اور کہا میرے کانوں میں ابھی تک یہ الفاظ گونجتے ہیں کہ ابا میں آپ سے کھانے سے کو نہیں مانگوں گی، آپ سے کپڑے طلب نہیں کروں گی، خدا کے لیے مجھے نہ مارو، مجھے اس گڑھے سے نکال لیے۔ وہ چیختی رہی اور میں نہایت سنگدلی سے اس پر مٹی ڈالتا رہا، حتیٰ کہ اس کی آواز خاموش ہو گئی۔ آنحضرت ﷺ اس ظالمانہ واقعہ کو سن کر بے اختیار روئے، حتیٰ کہ آپ ﷺ کا دامن آنسوؤں سے بھیگ گیا اور آپ نے اس شخص سے فرمایا کہ اسلام اللہ تعالیٰ کی ایک ایسی نعمت ہے کہ اگر آدمی کے گناہوں سے زمین و آسمان بھی بھر جائیں لیکن اسلام قبول کرنے سے وہ سب معاف ہو جاتے ہیں۔ فرمایا تم ایک نئی زندگی شروع کرو اور پچھلی زندگی کو بھول جاؤ۔ آنحضرت ﷺ کی ذاتِ گرامی اور آپ کا پیغام دنیا میں رحمت بن کر آیا اور قرآنِ کریم کی ایک آیت نے انسانوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا کہ لوگو! کہ جب زندہ درگور کی جانے والی بچی قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑی ہوگی تو پروردگار نہایت جلال کے ساتھ اس سے پوچھیں گے کہ تمھیں کس جرم میں قتل کیا گیا تھا۔ اس سوال نے پورے عرب کو ہلا کے رکھ دیا اور پھر نبی کریم ﷺ کی تعلیم نے صنفِ نازک کے ساتھ ہمدردی اور غمگساری کی وہ ترغیب دی کہ بچیاں اللہ تعالیٰ کی رحمت قرار پائیں اور ان کا وجود ماں باپ کے لیے جنت کی نوید بن گیا اور انھیں وہ حقوق دیے گئے جس نے انھیں بھائیوں کے برابر لا کھڑا کیا۔

اسلام نے صنفِ نازک کو لاوارث عورت کے تصور سے اٹھایا اور اسے مردوں کی خواہشاتِ نفس کی بھینٹ چڑھنے اور پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے شرفِ انسانیت کا سودا کرنے کے تصور سے اٹھا کر چار رشتوں کا تقدس بخشا۔ (۱) وہ ماں ہے، تو اس کی نافرمانی حرام قرار دی گئی اور اس کے قدموں میں اولاد کے لیے جنت رکھ دی گئی۔ (۲) وہ بہن ہے تو وہ بھائیوں کی عزت و حرمت کی علامت اور ان کی غیرت کی آزمائش ہے۔ (۳) وہ بیٹی ہے تو ماں باپ کی شفقت اور محبت کی بھائیوں سے بڑھ کر مستحق اور وراثت میں برابر کی حقدار ہے۔ (۴) بیوی ہے تو وہ ویسے ہی حقوق رکھتی ہے جیسا شوہر حقوق رکھتا ہے اور آنحضرت ﷺ نے اس کے حقوق کی ضمانت دیتے ہوئے فرمایا کہ لوگو! اگر تم نے اپنی بیویوں پر ظلم کیا جنھیں تم نے اللہ تعالیٰ کے نام پر اپنی امان میں لیا ہے تو میں قیامت کے دن ان کی طرف سے تمھارے خلاف استغاثہ دائر کروں گا۔

لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ مَثَلُ السَّوْءِ ۚ وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۶۰﴾

(ان لوگوں کے لیے جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، بری تمثیل ہے، اور اللہ تعالیٰ کے لیے اچھی صفتیں ہیں اور وہی سب پر غالب بڑا دانا ہے۔ ۶۰) (سورۃ النحل: ۶۰)

مشرکین کا ایک اور جرم

مثل کا معنی تمثیل بھی ہوتا ہے اور صفت بھی۔ مشرکینِ مکہ بعض دفعہ پروردگار کے لیے تمثیل ایسی پیش کرتے تھے جو خالق کو نہیں مخلوق کو زیب دیتی ہے۔ اور صفات بھی اللہ تعالیٰ کی طرف وہ منسوب کرتے تھے جو انسانوں کی بھی گری ہوئی صفات ہیں۔ اس آیت میں پروردگار نے ارشاد فرمایا کہ ان کے کس کس جرم کا ذکر کیا جائے، وہ کسی جرم سے رکتے نہیں ہیں۔ ان کی جسارتوں کا سبب یہ ہے کہ وہ آخرت پر یقین نہیں رکھتے۔ اگر انھیں اس بات پر یقین ہو کہ قیامت آئے گی اور اللہ تعالیٰ کے سامنے پیشی ہوگی اور ہمیں اپنے اعمال کے بارے میں جواب دہی کرنا پڑے گی تو وہ کوئی بات کہنے اور کوئی کام کرنے سے سو دفعہ پہلے سوچیں۔ لیکن انھوں نے چونکہ ایسا ہر اندیشہ دل سے نکال رکھا ہے اس لیے جو جی میں آتا ہے کہہ گزرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف بیٹیوں کا انتساب اور خود اپنے لیے بیٹیوں کو باعثِ عار سمجھنا یہ دونوں باتیں بجائے خود کس قدر غلط ہیں اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف ان کا انتساب کیا جا رہا ہے، خود ان کی اپنی صفات کا عالم یہ ہے کہ اس اندیشے سے کہ بچوں کو کہاں سے کھلائیں پلائیں گے، بیدردی سے گڑھے میں پھینک دینا

Marfat.com

اورقتل کردینا یہ ان کی وہ صفت ہے جس پر سنگدلی بھی شرماتی ہے۔ حیوانات بھی اس سے گھن کھاتے ہیں کیونکہ وہ بھی اپنے بچوں کو محبت سے پالتے ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ کی صفات یہ ہیں کہ وہ نہ اولاد کا محتاج ہے اور نہ وہ کسی پر ظلم کرتا ہے۔ کافر اور مشرک بھی اسی کے دسترخوانِ کرم پر پلتے ہیں۔ وہ سب کو زندگی دیتا اور زندگی کے اسباب فراہم کرتا ہے۔ اس کا کمالِ علم، کمالِ قدرت، کمالِ حکمت، غناء مطلق اور ربوبیت کاملہ جیسی صفات انسان خود اپنی آنکھوں سے دیکھتے اور اپنے تجربات سے یقین رکھتے ہیں لیکن ان ظالموں نے اس کی طرف اگر کوئی چیز منسوب کی ہے تو وہ بھی ایسی اولاد جسے خود بھی پسند نہیں کرتے۔ وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ مَا يَكْرَهُوْنَ وَتَصِفُ اَلْسِنَتُهُمُ الْكَذِبَ اَنَّ لَهُمُ الْحُسْنٰى ؕ (اور وہ اللہ تعالیٰ کے لیے وہ چیزیں قرار دیتے ہیں جن کو اپنے لیے ناپسند کرتے ہیں اور ان کی زبانیں جھوٹ دعویٰ کرتی ہیں کہ ان کے لیے اچھا انجام ہے)۔

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ
مَّا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ
فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿٦١﴾
وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ مَا يَكْرَهُوْنَ وَتَصِفُ اَلْسِنَتُهُمُ الْكَذِبَ اَنَّ
لَهُمُ الْحُسْنٰى ؕ لَا جَرَمَ اَنَّ لَهُمُ النَّارَ وَاَنَّهُمْ مُّفْرَطُوْنَ ﴿٦٢﴾ تَاللّٰهِ
لَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ
فَهُوَ وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٦٣﴾ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ
الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِى اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةً
لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿٦٤﴾ وَاللّٰهُ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ
الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ﴿٦٥﴾ ع

رکوع: ۸ (اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کو ان کی حق تلفی پر فوراً پکڑ لیا کرتا تو زمین پر کسی جاندار کو نہیں چھوڑتا لیکن وہ انھیں ایک وقتِ مقرر تک مہلت دیتا ہے اور جب ان کا مقرر وقت آ جائے گا تو وہ ایک لحہ پیچھے ہو سکتے ہیں اور نہ آگے ہو سکتے ہیں۔ ٦١) اور یہ اللہ تعالیٰ کے لیے وہ چیز تجویز کرتے ہیں جو خود اپنی لیے ناپسند کرتے ہیں اور ان کی زبانیں جھوٹ بیان کرتی ہیں کہ ان کے

Marfat.com

لیے اچھا انجام ہے، یقیناً ان کے لیے آتشِ جہنم ہے اور انھیں دوزخ میں پہلے بھیجا جائے گا۔ ۶۲) اللہ کی قسم ہم نے آپ سے پہلے بھی مختلف قوموں کی طرف رسول بھیجے تو شیطانوں نے ان کے اعمال ان کی نگاہوں میں آراستہ کردیے تو اب وہی ان کا ولی ہے اور ان کے لیے ایک دردناک عذاب ہے۔ ۶۳) اور ہم نے آپ پر کتاب صرف اس لیے اتاری ہے تاکہ آپ ان پر اچھی طرح اس چیز کو واضح کردیں جس میں وہ مختلف ہوگئے اور یہ کتاب سراپا ہدایت و رحمت ہے، ان لوگوں کے لیے جو اس پر ایمان لائے۔ ۶۴) اور اللہ ہی نے آسمان سے پانی اتارا، پس اس سے زمین کو زندہ کیا، اس کے مرجانے (خشک ہوجانے) کے بعد، بیشک اس میں ان لوگوں کے لیے بڑی نشانی ہے جو بات کو سنتے ہیں۔ ۶۵)

وَلَوْيُؤَاخِذُاللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَّا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۶۱﴾ (سورۃ النحل : ۶۱)

(اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کو ان کی حق تلفی پر فوراً پکڑلیا کرتا تو زمین پر کسی جاندار کو نہیں چھوڑتا لیکن وہ انھیں ایک وقتِ مقرر تک مہلت دیتا ہے اور جب ان کا مقرر وقت آجائے گا تو وہ ایک لمحہ پیچھے ہوسکتے ہیں اور نہ آگے ہوسکتے ہیں۔ ۶۱)

مطالبۂ عذاب کا جواب اور آنحضرت ﷺ کو تسلی

سیاقِ کلام سے یہ بات واضح ہے کہ آنحضرت ﷺ نے جب قریشِ مکہ کو دیکھا کہ وہ کسی طرح بھی آپ کی دعوت قبول کرنے کے لیے تیار نہیں بلکہ ہر ممکن طریقے سے اس کا راستہ روک دینا چاہتے ہیں تو انھیں ان کی جسارتوں پر متوجہ کرنے کے لیے انھیں بتایا کہ جب بھی کسی قوم کی طرف اللہ تعالیٰ کا رسول آتا ہے اور قوم اس کی دعوت کو رد کردینے کا فیصلہ کرلیتی ہے تو پھر عموماً ایسی قوم پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آتا ہے۔ تم بھی آہستہ آہستہ اسی انجام کی طرف بڑھ رہے ہو۔ میں تمھاری بھلائی کے لیے تمھیں خبردار کرتا ہوں کہ اپنا طرزِ عمل بدلو ورنہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کا کوڑا تم پر بھی برس سکتا ہے۔ چنانچہ آپ کی اس وارننگ اور خبردار کرنے پر جب چند سال کا عرصہ گزر گیا تو قوم نے آپ کو تنگ کرنے کے لیے بار بار عذاب کا مطالبہ شروع کردیا۔ اور وہ زچ کرنے کے لیے پوچھتے کہ اگر واقعی نافرمانوں پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آیا کرتا ہے تو ہماری نافرمانیاں تو واقعی اس قابل ہیں کہ ان پر عذاب آئے، تو وہ عذاب آخر کہاں رک گیا ہے، پہنچ کیوں نہیں پا رہا۔ چنانچہ اس کے جواب میں ارشاد فرمایا جا رہا ہے کہ کسی فرد یا کسی قوم پر اللہ تعالیٰ کی گرفت یا اس کے عذاب کا ایک قانون ہے۔ عذاب ہمیشہ اس قانون کے مطابق آتا ہے۔ وہ قانون یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسے ہر اہم کام کے لیے ایک معین وقت طے کر رکھا ہے جب تک وہ معین وقت نہیں آتا اللہ تعالیٰ اس فیصلے کے نفاذ میں مہلت دیتا چلا جاتا ہے۔ عذاب مانگنے والے چاہے کتنی جلدی مچائیں، معین اور مقرر وقت آنے سے پہلے وہ عذاب کبھی نہیں آتا۔ اس معین وقت کو قرآنِ کریم کی زبان میں اجلِ مسمّٰی کہا گیا ہے۔ یہ اجلِ مسمّٰی کب آتا ہے اور اس کا وقت کون سا ہے اس کا علم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو نہیں۔ کلی کب چٹکتی ہے، پھول کب کھلتا ہے، دانے سے سوئی کب نکلتی ہے، شگوفہ کب پھوٹتا ہے، ان میں سے ہر ایک کی ایک اجل ہے اس سے پہلے اس کا ظہور نہیں ہوتا۔ اس طرح دانہ کب پکتا ہے، پھل میں کب مٹھاس پیدا ہوتی ہے، چولہے پر دیگچی میں کب ابال آتا ہے، آتش فشاں کب لاوا اگلنے لگتا ہے، ان سب کی ایک اجل ہے، تو دنیا میں کوئی چیز ایسی نہیں جس کے نتیجہ خیز ہونے کے لیے اللہ تعالیٰ نے کوئی اجل مقرر نہ کی ہو۔ اسی طرح قوموں میں اصلاح کا عمل کب شروع ہوتا ہے اور کب برگ و بار لاتا ہے، اس کے لیے بھی کچھ اسباب مقرر ہیں اور ایک اجل معین ہے۔ یہاں بھی یہی فرمایا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب اس وقت آتا ہے جب قوم کا ایک ایک فرد ہدایت قبول نہ کرنے میں یکسو ہوجاتا ہے اور ان کی قبولیت کے سوتے مردہ ہوجاتے ہیں۔ اگر اس سے پہلے عذاب آئے تو یہ اس قوم پر ظلم ہوگا کیونکہ ان میں وہ چند لوگ بھی شامل ہوں گے جن میں ابھی صلاحیت باقی تھی کہ وہ ایمان قبول کرلیتے لیکن ان کی مہلت عمل مکمل ہونے سے پہلے انھیں پکڑ لیا گیا۔ اہلِ مکہ کے بارے میں اللہ تعالیٰ کو علم تھا کہ اشرافِ مکہ نے اگرچہ آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کو ہجرت کرنے پر مجبور کردیا تھا لیکن مکہ کے بعض گھرانوں میں ابھی تک قبولیتِ ایمان کے امکانات باقی

Marfat.com

تھے۔ چنانچہ حالات نے بھی اس بات کی شہادت دی کہ 6 ہجری میں جس طرح حالات نے ابوبصیرؓ اور ان کے ساتھیوں کو ساحلِ سمندر پر پناہ لینے پر مجبور کردیا تھا اور چند ہی مہینوں میں ان کی تعداد 70 تک پہنچ گئی اور یہ تمام وہ لوگ تھے جو مکہ معظمہ میں رہتے ہوئے درپردہ مسلمان ہوچکے تھے لیکن ہجرت کے لیے انھیں مناسب موقع نہ مل سکا تھا۔ اگر ان جلد بازوں کی بات مان کر مکے پر عذاب نازل کردیا جاتا تو ایسے تمام لوگ مارے جاتے جو درپردہ مسلمان ہوکر مکہ معظمہ میں قیام پذیر تھے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے کہ وہ انسانوں کو پوری طرح سنبھلنے اور فیصلہ کرنے کا موقع دیتا ہے۔ لیکن وقتِ مقرر سے پہلے وہ کبھی انھیں سزا نہیں دیتا۔ اور جب وہ وقت آجاتا ہے جس کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے تو پھر اس کے نفاذ میں تقدیم وتاخیر نہیں ہوتی۔

آیتِ کریمہ میں دو باتیں مزید ارشاد فرمائی گئی ہیں جن کی طرف توجہ دینا ضروری ہے۔ ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ کی گرفت جس چیز پر آتی ہے اس کا نام اللہ تعالیٰ نے ظلم رکھا ہے۔ ظلم کہتے ہیں کسی چیز سے وہ کام لینا جس کے لیے وہ بنائی نہیں گئی۔ ہر چیز کو اس کے جائز مصرف سے ہٹا کر غلط مصرف میں صرف کرنا اس کے ساتھ ظلم ہے۔ انسان کے جسم کا اصل مصرف یہ ہے کہ اسے اس کے خالق ومالک کے سامنے جھکایا جائے۔ انسان کی صلاحیتوں اور اس کی قوتِ ارادہ پر ظلم یہ ہے کہ اسے غیر اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر مجبور کیا جائے۔ ایسے کسی بھی ظلم پر اگر اللہ تعالیٰ گرفت فرمانے لگتا تو زمین پر کوئی جاندار باقی نہ بچتا۔ کیونکہ کوئی جاندار ایسا نہیں جس سے کبھی نہ کبھی کسی کوتاہی کا صدور نہیں ہوتا۔ یہ پروردگار کا اتنا بڑا کرم ہے کہ وہ ہر کوتاہی پر پکڑنے کی بجائے سنبھلنے کا اور اپنی اصلاح کرنے کا موقع دیتا ہے اور ہر کوتاہی پر پکڑنے کی بجائے وہ اس وقت پکڑتا ہے جب کوتاہیاں انحراف کا راستہ اختیار کرکے سرکشی اور بغاوت کی انتہا کو پہنچ جاتی ہے۔ اور یہی وہ اجلِ مسمیٰ ہے جس کے بعد مہلت ختم کردی جاتی ہے۔

وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ مَا يَكْرَهُوْنَ وَتَصِفُ اَلْسِنَتُهُمُ الْكَذِبَ اَنَّ لَهُمُ الْحُسْنٰى ۭ لَا جَرَمَ اَنَّ لَهُمُ النَّارَ وَاَنَّهُمْ مُّفْرَطُوْنَ ﴿۶۲﴾

(اور یہ اللہ تعالیٰ کے لیے وہ چیز تجویز کرتے ہیں جو خود اپنے لیے ناپسند کرتے ہیں اور ان کی زبانیں جھوٹ بیان کرتی ہیں کہ ان کے لیے اچھا انجام ہے، یقیناً ان کے لیے آتشِ جہنم ہے اور انھیں دوزخ میں پہلے بھیجا جائے گا۔ ۶۲) (سورۃ النحل: ۶۲)

مشرکین کی حماقتیں اور خوش فہمیاں

اس آیتِ کریمہ میں مشرکین کے چند ایسے اعمال کا ذکر کیا گیا ہے جن میں سے ایک ایک اللہ تعالیٰ کے عذاب کو دعوت دینے کے لیے کافی ہے۔ لیکن یہ اللہ تعالیٰ کا کرم اور مہربانی ہے کہ انھیں بجائے عذاب کی نذر کرنے کے سنبھلنے کا موقع دیا گیا ہے۔ ان کے اعمال میں سب سے پہلا عمل جس کا ذکر کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اولاً تو اللہ تعالیٰ کو کسی کا شریک بنانا بجائے خود ایسا جرم ہے جو اللہ تعالیٰ کے غضب کو دعوت دینے کے مترادف ہے اور پھر اسی پر بس نہیں، وہ نہ صرف اللہ تعالیٰ کے شریک ٹھہراتے ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے لیے اولاد ثابت کرتے ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ کے لیے اولاد ثابت کرنا دوسرے لفظوں میں یہ کہنا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عظیم ذات کو بھی اپنی طرح محتاج اور فانی سمجھتے ہیں کیونکہ اولاد بجائے خود باپ کی احتیاج اور فنا پر دلیل ہے جبکہ اللہ تعالیٰ اس سے پاک اور مبرا ہے۔ اور دوسری جسارت ان کی یہ ہے کہ اولاد میں بھی اللہ تعالیٰ کی طرف مذکر اور مونث میں سے اسے منسوب کرتے ہیں جسے اپنے لیے عار اور شرم کا باعث سمجھتے تھے، یعنی اللہ تعالیٰ کے لیے بیٹیاں ثابت کرتے ہیں اور اپنے لیے بیٹے۔ اور تیسرا ان کا کارنامہ یہ ہے کہ اپنی تمام تر بداعمالیوں اور بداندیشیوں کے باوجود یہ سمجھتے ہیں کہ چونکہ دنیا میں ہمیں عزت حاصل ہے، ہمارے گھروں میں دولت کی ریل پیل ہے، ہمارے شب وروز عیش وعشرت میں گزرتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سے خوش اور راضی ہے۔ اس نے خوش ہوکر ہمیں دولتِ دنیا دی ہے، جنت بھی ہمیں ہی عطا کرے گا اور یہ مسلمان جو بیچارے نانِ شبینہ کے محتاج، چیتھڑوں میں ملبوس اور جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں، یہ دنیا میں ان کے افکار واعمال کی سزا ہے اور آخرت میں بھی یہ ایسی ہی سزا سے گزریں گے جبکہ ہم یہاں بھی عیش کررہے ہیں اور وہاں بھی عیش کریں گے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ انھیں ان خوش فہمیوں سے نکل آنا چاہیے یقیناً ان کے لیے قیامت کے دن جہنم کی آگ ہے اور انھیں جہنم میں ایسا پھینکا جائے گا کہ پھر بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت ان کی طرف التفات نہیں فرمائے گی۔

Marfat.com

مُّفْرَطُوْنَ افرط سے ہے۔اس کے دو معنی ہوتے ہیں (ا) کسی کو کسی حالت میں چھوڑ دینا اور پھر پلٹ کر اس کی خبر نہ لینا۔(۲) کسی جگہ پہلے پہنچا دینا۔ یہاں دونوں ہی مراد ہو سکتے ہیں کہ انھیں جہنم میں سب سے پہلے بھیجا جائے گا اور پھر پلٹ کر کبھی نہ دیکھا جائے گا کہ وہ کس حال میں ہیں کیونکہ وہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔

تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَهُوَ وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۶۳﴾

(اللہ تعالیٰ کی قسم ہم نے آپ سے پہلے بھی مختلف قوموں کی طرف رسول بھیجے تو شیطانوں نے ان کے اعمال ان کی نگاہوں میں آراستہ کر دیے تو اب وہی ان کا ولی ہے اور ان کے لیے ایک دردناک عذاب ہے۔ ۶۳) (سورۃ النحل:۶۳)

آنحضرت ﷺ کو مزید تسلی

اس آیت کریمہ میں نبی کریم ﷺ کو تسلی بھی دی گئی ہے کیونکہ قریشِ مکہ کی مخالفتوں اور ان کی ہدایت کو قبول نہ کرنے کے رویئے نے آنحضرت ﷺ کو بہت آزردہ کر رکھا تھا، تو آپ کو تسلی دی جا رہی ہے کہ آپ کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے وہ تاریخ مذہب کا پہلا واقعہ نہیں ہے، ہر دور میں بگڑی ہوئی امتوں نے ہمارے رسولوں کے ساتھ ایسا ہی رویہ اختیار کیا۔لیکن نتیجہ سب کو معلوم ہے کہ رسولوں کی دعوت غالب آئی اور کفر شکست کھا گیا یا کافر عذاب کا شکار ہوئے تو آپ کی دعوت اور مشن کو بہر حال غالب آنا ہے۔ یہ مشکلات وقتی ہیں، گزر جائیں گی اور اس کے بعد کامیابیوں کا سورج طلوع ہو گا۔

ان کے کفر پر اڑنے کا سبب شیطان کا تزئینِ اعمال ہے

دوسری بات یہ فرمائی جا رہی ہے کہ آپ جس طرح انھیں سمجھانے بجھانے کی کوشش فرما رہے ہیں اور جس طرح قرآنِ کریم ان کی ایک ایک بات کا جواب دے رہا ہے اور ان کے تمام اعتراضات کو دور کیا جا رہا ہے اس کے بعد انھیں ہدایت قبول کرنے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیے، لیکن قریشِ مکہ کا رویہ کہیں بھی تبدیل ہوتا نظر نہیں آتا۔ دور دور تک ان کے اندر قبولیت کے آثار نہیں ہیں۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے۔ آنحضرت ﷺ کی ذاتِ گرامی کی اپنی دلآویزی آپ کی زبان کی تاثیر قرآنِ کریم کا اعجاز کیا یہ سب کچھ ان کی ضد اور انکار کے سامنے بے بس ہو کر رہ گیا ہے۔اس کا جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا جا رہا ہے کہ جو روگ انھیں لگا ہے وہ کوئی نیا نہیں، ہر قوم اسی روگ میں مبتلا ہو کر برباد ہوتی رہی ہے۔ وہ روگ یہ ہے کہ ہر قوم اپنے اعتقادات میں ہمیشہ جامد ہوتی ہے۔ بالخصوص ایسی قوم جس کے پاس وحیِ الٰہی کی روشنی نہ پہنچی ہو اور جہالت نے علم پر غلبہ حاصل کر رکھا ہو، انھیں کوئی نئی بات سمجھانا اور ان کے اعتقادات کی اصلاح کرنا ہمیشہ مشکل ترین کام رہا ہے۔ اقبال نے اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا:

آئینِ نو سے ڈرنا، طرزِ کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

لیکن مزید اس کے ساتھ مشکل یہ پیش آتی ہے کہ شیطان کا ایک نہایت خطرناک حربہ جو ہمیشہ وہ جامد اور جاہل قسم کے جہلاء پر استعمال کرتا ہے وہی اس نے ان قوموں پر بھی کیا اور قریشِ مکہ پر بھی کر رہا ہے۔ وہ حربہ اس کا یہ ہے کہ ہمیشہ ایسے لوگوں کو ان کے اعتقادات نہایت خوبصورت، نہایت قابلِ قبول اور نہایت مفادات کی پاسبانی کرنے والے بنا کر وہ پیش کرتا ہے اور انھیں یقین دلا دیتا ہے کہ یہی تمھارے اعتقادات ہیں جن سے تمھاری انفرادی اور اجتماعی زندگی میں استحکام بھی ہے اور حُسن بھی۔ اگر تم نے انھیں چھوڑ دیا اور پیغمبر کی دعوت کے مطابق نئے خیالات اختیار کر لیے تو تم بے دین ہو جاؤ گے۔ اپنی آباؤ اجداد کے دین سے بیگانہ ہو جاؤ گے۔ تمھاری قوم میں انتشار پیدا ہو جائے گا۔ چنانچہ یہی حربہ وہ پہلے بھی کامیابی سے استعمال کرتا رہا اور اب بھی وہ استعمال کر رہا ہے۔ انسان نئی بات قبول کرتے ہوئے اور نئی دلیل اختیار کرتے ہوئے مشکل محسوس کرتا ہے۔ لیکن پرانے جمے ہوئے

Marfat.com

خیالات اوران کے حق میں دلائل بڑی آسانی سے قبول کرتا ہے۔ تو سابقہ امتوں نے اسی تزیینِ اعمال کے فتنے سے ٹھوکر کھائی اور اب یہ قریشِ مکہ بھی اسی فتنے کی زد میں ہیں اور شیطان سابقہ امتوں کی طرح آج ان کا بھی ولی ہے۔ لیکن آپ اطمینان رکھئے، کامیابی ان شاء اللہ تعالیٰ آپ کا مقدر ہے۔ یہ لوگ یہاں بھی ناکام ہوں گے اور قیامت کے دن ان کے لیے عذابِ الیم ہے۔

وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِى اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿٦٤﴾

(اور ہم نے آپؐ پر کتاب صرف اس لیے اتاری ہے تاکہ آپؐ ان پر اچھی طرح اس چیز کو واضح کر دیں جس میں وہ مختلف ہو گئے اور یہ کتاب سراپا ہدایت و رحمت ہے، ان لوگوں کے لیے جو اس پر ایمان لائے۔ ۶۴) (سورۃ النحل:۶۴)

آنحضرت ﷺ کی منصبی ذمہ داری

اس آیتِ کریمہ میں آنحضرت ﷺ کی منصبی حیثیت کو دو حوالوں سے واضح کرنا مقصود ہے۔ ایک حیثیت یہ کہ آپؐ یقیناً اللہ تعالیٰ کے رسول بن کے آئے ہیں اور آپؐ پر اللہ تعالیٰ نے آخری کتاب اتاری ہے جو کتابِ ہدایت ہے۔ اور یہ ایسی کتاب ہے جو زمین و آسمان کے درمیان آخری رابطہ ہے۔ اس کے بعد کوئی کتاب آ کر انسانوں کو یہ نہیں بتائے گی کہ اللہ تعالیٰ تم سے کیا چاہتا ہے، وہ کن باتوں میں راضی ہے اور کن باتوں پر ناراض ہو جاتا ہے۔ آپ چونکہ اس کتاب کے پیغمبر، رسول، منادا اور مبلغ ہیں تو آپ کا کام صرف یہ ہے کہ آپ یہ کتاب انسانوں تک پہنچا دیں۔ اس کی تعلیم دیں، اسے سمجھا دیں، اس کے مبہمات کو کھولیں، اس کے اجمالات کی وضاحت کریں، اس کی مشکلات کو آسان کریں، اس کی تھیوری کو عملی شکل میں ڈھال دیں، اس کے بعد آپؐ کا کام ختم ہو جاتا ہے۔ رہی یہ بات کہ لوگ اسے قبول کرتے ہیں یا نہیں، وہ ایمان لاتے ہیں یا انکار کرتے ہیں، آپ کا اس سے کوئی سروکار نہیں، آپؐ سے ہرگز یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ لوگ اس پر ایمان کیوں نہیں لائے، یہ سراسر بندوں کی ذمہ داری ہے۔

آپؐ کی منصبی ذمہ داریوں کے حوالے سے دوسری آپ کی حیثیت یہ واضح کی جارہی ہے کہ قریشِ مکہ کو اچھی طرح اس بات کا یقین کر لینا چاہیے کہ محمد (ﷺ) جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول بن کے آئے ہیں ان کی حیثیت صرف یہ نہیں ہے کہ آپ لوگوں کو کتاب پڑھ کر سنا دیں اور دین کی نصیحت کر دیں بلکہ آپ کی یہ حیثیت بھی ہے کہ اس کتاب کے متن کی تعلیم اور اس کے لیے ضروری تشریحات اور اس حوالے سے پیدا ہونے والے اعتراضات کا جواب اور لوگوں کے اختلافی امور کا حل اور اس میں قولِ فیصل اور صراطِ مستقیم کا تعین یہ صرف اور صرف آپ کی ذات سے متعلق ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کی کتاب اللہ تعالیٰ کا کلام ہونے کی وجہ سے حرفِ آخر ہے، اسی طرح آپ کی ذات اللہ تعالیٰ کا رسول ہونے کی وجہ سے دین کا آخری نمونہ اور اسوۂ حسنہ ہے۔ آپؐ کا ہر فیصلہ آخری فیصلہ ہے اور آپ کا ہر قول، قولِ فیصل اور قولِ محکم ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کی کتاب سے انحراف کفر اور گمراہی ہے اسی طرح آپؐ کی ذات سے انحراف بھی گمراہی ہے۔ ہدایت آپؐ کی ذات اور قرآن سے ملے گی، کیونکہ آپ کی ہی ذات سرتاپا ہدایت ہے۔ اس ہدایت کو قبول کرنے کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی رحمت اترتی ہے اور ظاہر ہے کہ یہ ہدایت اسی کو ملے گی جو اللہ تعالیٰ، اس کے رسولؐ اور اس کی کتاب پر ایمان لائے گا اور وہی شخص ہو گا جو اللہ تعالیٰ کی رحمت کا مستحق ہو گا۔

وَاللّٰهُ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ﴿٦٥﴾

(اور اللہ تعالیٰ ہی نے آسمان سے پانی اتارا، پس اس سے زمین کو زندہ کیا، اس کے مر جانے (خشک ہو جانے) کے بعد، بیشک اس میں ان لوگوں کے لیے بڑی نشانی ہے جو بات کو سنتے ہیں۔ ۶۵) (سورۃ النحل:۶۵)

Marfat.com

توحید کی دلیل تخالف

آنحضرت ﷺ کی دعوت تین اساسی باتوں پر مشتمل تھی جن کے قبول کر لینے پر ایمان کا دارومدار تھا۔ان تین باتوں میں پہلی بات ہے توحید، اور دوسری بات آخرت اور تیسری رسالت ہے۔اس آیتِ کریمہ میں آنحضرت ﷺ کی دعوت کے ان تینوں اساسی اصولوں کو دلائل سے ثابت کیا گیا ہے۔سب سے پہلی بات یہ ارشاد فرمائی کہ اللہ تعالیٰ آسمان سے بارش کی صورت میں پانی نازل فرماتا ہے۔بارش کے نازل ہونے کے نتیجے میں ہم دیکھتے ہیں کہ زمین فوری طور پر اس کا اثر قبول کرتی ہے اور جو لمبی قحط سالی کے نتیجے میں بالکل مردہ ہو چکی تھی اس میں تیزی سے زندگی کے آثار ابھرتے ہیں۔عرب میں چونکہ بارشیں بہت کم ہوتی تھیں اور بعض دفعہ کئی کئی سال تک بارش نہیں ہوتی تھی۔ہم اس خشک سالی کا صحیح طور سے تصور نہیں کر سکتے ممکن ہے تھر کے علاقوں میں اس کا تصور پایا جاتا ہو کیونکہ وہاں بھی بعض دفعہ عرصے تک بارشیں اترنے کا نام نہیں لیتیں اور ویرانی اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ پانی کے ذخیرے ختم ہو جاتے ہیں اور لوگ نقلِ مکانی پر مجبور ہو جاتے ہیں لیکن اتنی گہری خشک سالی کے بعد جب بارش نازل ہوتی ہے تو حیرت انگیز بات یہ ہوتی ہے کہ وہ زمین جس میں کل تک ریت اڑتی تھی اور ویرانیوں کا پہرہ تھا چند ہی دنوں میں وہ زمین مخملی لباس پہن لیتی ہے اور ہر طرف ہریاول نظر آتی ہے۔نباتات کی وہ جڑیں جو زمین کی تہوں میں کہیں خشک سو رہی تھیں ان میں زندگی انگڑائی لے کے اٹھتی ہے۔اس میں سب سے پہلی بات جو قابلِ توجہ ہے وہ یہ ہے کہ ذرا غور کیجیے کہ زمین اور آسمان میں آپس میں تخالف کی نسبت پانی اور مٹی آپس میں متضاد ہیں۔اور بھی کتنے عناصر ہیں جو باہمی ایک دوسرے کے متخالف ہیں، لیکن کس قدر حیرت کی بات ہے کہ یہ سب مل کر وہ فریضہ انجام دے رہے ہیں جس کی انجام دہی پر انہیں لگایا گیا ہے۔زمین اپنی زرخیزی بروئے کار لانے سے انکار نہیں کرتی، سورج اپنی کرنیں بکھیرنے سے انکار نہیں کرتا، پانی اپنے جود و کرم میں بخل سے کام نہیں لیتا، ہوا اپنی لوریوں میں کمی نہیں کرتی، سب مل کر انسانی ضرورتوں کو پورا کرنے میں اپنا اپنا فرض انجام دیتے ہیں۔یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ آسمان اور زمین دونوں میں ایک ہی خدائے حکیم و قدیر کا ارادہ کارفرما ہے۔اگر یہاں مختلف دیوتاؤں اور مختلف خداؤں کی حکومت ہوتی اور یہاں مختلف ارادے کارفرما ہوتے تو متخالف اور متضاد عناصر مل کر ایک خیرِ مطلوب کو کبھی بروئے کار لانے کے لیے مجبور نہ ہوتے۔ان میں یہ توافق اور مقصد کے شعور میں ہم آہنگی یقیناً اس لیے ہے کہ یہ سب ایک ارادے کے تحت کام کر رہے ہیں اور ایک ہی خدا ان پر حکمران ہے۔

حیات بعد الموت پر دلیل

دوسری بات یہ ثابت کی جا رہی ہے کہ دیکھو مردہ زمین پر اللہ تعالیٰ نے پانی برسایا تو اس میں زندگی لہلہانے لگی، خشک اور چٹیل میدان بارش کے چند چھینٹوں سے حیاتِ تازہ سے بہرہ ور ہو گئے، تو جس پروردگار کی قدرت کا یہ عالم ہے کہ اس کی بارش کے چند چھینٹے مردہ زمین کو زندہ کر دیتے ہیں تو کیا اس کی قدرت سے یہ بات بعید ہے کہ وہ مردہ مخلوق کو ازسرِنو زندہ کرے اور تمام لوگوں کو قیامت کے دن قبروں سے اٹھا کھڑا کرے اور حشر بپا کر دے۔

وحیِ الٰہی حیات بخش ہے

تیسری بات جس کی طرح توجہ دلانا مقصود ہے وہ یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ مردہ زمین کی زندگی کے لیے بارش نازل فرماتا ہے اور اس سے ہر طرف زندگی کے آثار دکھائی دینے لگتے ہیں، اسی طرح جب قومیں زندگی کے شعور سے بے بہرہ ہو جاتی ہیں اور وہ اپنے اللہ تعالیٰ کو بھول کر کفر کی موت قبول کر لیتی ہیں اور ہر طرف دلوں پر موت کے پہرے گہرے ہو جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ وحیِ الٰہی کی بارش نازل فرماتا ہے۔اللہ تعالیٰ کے رسول کی زبان سے ایک حیات بخش پیغام لوگوں تک پہنچایا جاتا ہے، جس کے نتیجے میں امکان پیدا ہو جاتا ہے کہ دلوں میں زندگی کے سوتے پھوٹنے لگیں لیکن اس کے لیے ایک شرط رکھی گئی ہے جسے اس آیت کے آخر میں بیان فرمایا گیا ہے۔ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ کہ جس طرح زمین پر زندگی کے آثار پیدا نہیں ہوتے تاوقتیکہ وہ بارش کو اپنے اندر جذب ہونے کا موقع نہ دے، اسی طرح انسانوں میں بھی وحیِ الٰہی سے وہ زندگی پیدا نہیں ہوتی جب تک لوگ اسے غور سے سننے اور قبول کرنے کی شرط پوری نہ کریں۔اگر اسے غور سے سنیں گے تو یقیناً اس سے اثر قبول کریں گے۔پھر یہ ممکن نہیں ہے کہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ ہدایت عطا نہ فرمائے۔

Marfat.com

وَإِنَّ لَكُمْ فِي الْأَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۖ نُسْقِيكُمْ مِمَّا فِي بُطُونِهِ مِنْ
بَيْنِ فَرْثٍ وَدَمٍ لَبَنًا خَالِصًا سَائِغًا لِلشَّارِبِينَ ﴿٦٦﴾ وَمِنْ
ثَمَرَاتِ النَّخِيلِ وَالْأَعْنَابِ تَتَّخِذُونَ مِنْهُ سَكَرًا وَرِزْقًا
حَسَنًا ۗ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ﴿٦٧﴾ وَأَوْحَىٰ رَبُّكَ
إِلَى النَّحْلِ أَنِ اتَّخِذِي مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا وَمِنَ الشَّجَرِ وَ
مِمَّا يَعْرِشُونَ ﴿٦٨﴾ ثُمَّ كُلِي مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ فَاسْلُكِي سُبُلَ
رَبِّكِ ذُلُلًا ۚ يَخْرُجُ مِنْ بُطُونِهَا شَرَابٌ مُخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُ فِيهِ
شِفَاءٌ لِلنَّاسِ ۗ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ﴿٦٩﴾ وَاللَّهُ
خَلَقَكُمْ ثُمَّ يَتَوَفَّاكُمْ ۚ وَمِنْكُمْ مَنْ يُرَدُّ إِلَىٰ أَرْذَلِ الْعُمُرِ
لِكَيْ لَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْئًا ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ قَدِيرٌ ﴿٧٠﴾

رکوع: ۹ (اور بیشک تمہارے لیے چوپایوں میں ایک عبرت ہے، ہم ان کے پیٹوں کے اندر کے گوبر اور خون کے درمیان سے تم کو خالص دودھ پلاتے ہیں جو نہایت خوشگوار ہے پینے والوں کے لیے۔ ٦٦) اور ہم کھلاتے ہیں کھجوروں اور انگوروں کے پھلوں سے بھی، تم ان سے نشہ کی چیزیں بھی بناتے ہو اور کھانے کی خوش ذائقہ اور عمدہ چیزیں بھی، بیشک اس میں بڑی نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو سمجھ سے کام لیتے ہیں۔ ٦٧) اور آپ کے رب نے شہد کی مکھی کے دل میں یہ بات ڈالی کہ تو پہاڑوں اور درختوں اور لوگ جو چھتیں اٹھاتے ہیں، ان میں چھتے بنا۔ ٦٨) پھر ہر قسم کے پھلوں سے رس چوس، پھر اپنے پروردگار کے ہموار راستوں پر چل، یوں نکلتا ہے ان کے پیٹوں سے مختلف رنگوں کا مشروب، اس میں لوگوں کے لیے شفا ہے، بیشک اس کے اندر بڑی نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو غور کرتے ہیں۔ ٦٩) اور اللہ ہی نے تم کو پیدا کیا اور پھر وہی تم کو موت دیتا ہے اور تم میں سے بعض ارذل عمر کی طرف لوٹا دیے جاتے ہیں تاکہ بہت کچھ جاننے کے بعد پھر کچھ نہ جانے، بیشک اللہ ہی علم والا اور قدرت والا ہے۔ ٧٠)

Marfat.com

وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۚ نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهٖ مِنْۢ بَيْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ ﴿٦٦﴾

(اور بیشک تمھارے لیے چوپایوں میں ایک عبرت ہے، ہم ان کے پیٹوں کے اندر کے گوبر اور خون کے درمیان سے تم کو خالص دودھ پلاتے ہیں جو نہایت خوشگوار ہے پینے والوں کے لیے۔ ٦٦)　(سورۃ النحل:٦٦)

ربوبیت کا فیضان دودھ کی صورت میں

آنحضرت ﷺ کی بعثت کے وقت انسان چونکہ اللہ تعالیٰ سے برگشتہ ہو چکا تھا، وہ اس کے ایک آستانے کو چھوڑ کر ہر آستانے پر ذلیل ہو رہا تھا۔ پروردگار ان نعمتوں کا ذکر فرما کر جو روزانہ انسان کے استعمال میں آتی ہیں اسے سوچنے کی دعوت دے رہا ہے۔ اس سے پہلے پانی کا ذکر فرمایا کیونکہ پانی انسانی ضرورتوں میں ہوا کے بعد سب سے بنیادی ضرورت ہے۔ اس کے حوالے سے بعض حکمتوں کی طرف اشارہ فرمایا۔ اب دودھ جیسی نعمت کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے جو عرب قوم کی غذاء کا ایک لازمی جز تھا اور عرب کی سرزمین پر اس سے بہتر کسی نعمت کا تصور بھی ممکن نہ تھا۔ کھجور اور دودھ ان کے لیے مکمل غذا تھی۔ وہاں کے گرم موسم کی تمازت کے مقابلے اور عرب جیسے وسائلِ رزق کی کمیابی کے شکار ملک کو فوری ضرورت پوری کرنے کے لیے اس سے بہتر غذا کے بارے میں سوچنا بھی ممکن نہ تھا۔ اور پھر اس آیتِ کریمہ میں صرف دودھ کا ذکر نہیں فرمایا بلکہ خود چارپایوں کو اللہ تعالیٰ کی ایک ایسی نعمت قرار دیا ہے جن کے اندر قدرت نے عبرت کا سامان رکھا ہے۔ عبرت کا معنی ہے، ایک حقیقت سے دوسری حقیقت تک پہنچ جانا۔ چارپایوں کی افادیت اور تخلیق کے بارے میں آدمی جتنا غور کرتا ہے اتنا ہی عبرت کا دروازہ کھلتا جاتا ہے۔ انھی چارپایوں میں ایک قسم ان جانوروں کی ہے جو سواری کے لیے بھی استعمال ہوتے ہیں اور دودھ کے لیے بھی۔ جب آدمی اس پر غور کرتا ہے جس کے نتیجے میں دودھ وجود میں آتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی قدرت یاد آتی ہے۔ پروردگار نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ جس طرح تم نباتاتی نعمتوں پر پلتے ہو، اسی طرح دودھ دینے والے جانور بھی چارہ کھا کے پلتے ہیں، لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ان کی صنفِ اناث میں قدرت نے یہ حیرت انگیز نظام رکھا ہے کہ اس کی غذا ایک طرف گوبر کی شکل اختیار کرتی ہے اور دوسری طرف خون میں ڈھلتی چلی جاتی ہے۔ جتنا خون ان کے جسم کی طاقت کے لیے ضروری ہے وہ ان کی شریانوں میں بھیج دیا جاتا ہے اور باقی کو دودھ کی شکل دے کر گوبر اور خون کے درمیان سے انسانی غذا کے لیے باہر بھیج دیا جاتا ہے۔ یہ اگرچہ خون اور گوبر کے درمیان سے گزر کے آتا ہے لیکن اس میں ان دونوں کی کوئی خصوصیت منتقل نہیں ہوتی۔ اس کا رنگ و بو، اس کی خاصیتیں اور اس کے مقاصد بالکل ان دونوں سے جدا ہوتے ہیں اور ایسا خوش ذائقہ کہ ہر پینے والا اس کو اپنے لیے خوشگوار محسوس کرتا ہے۔ یہ مشروب بھی ہے اور غذا بھی۔ اور کھجور کے ساتھ مل کر مکمل اور بہترین غذاء وجود میں آتی ہے کہ صحت کے نقطہ نگاہ سے شاید اس سے بہتر کوئی دوسری غذاء نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ذرا غور کرو کہ اگر دودھ جیسی خوشگوار چیز پیدا کرنے میں مختلف ارادے کارفرما ہوتے اور مختلف دیوتا ہر چیز کے تخلیقی عمل میں شریک ہوتے تو کیا خون اور گوبر کے اندر سے دودھ جیسی صاف اور پاکیزہ نعمت کا نکلنا ممکن تھا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، اس کی الوہیت اور اس کی حاکمیتِ مطلقہ کی کس قدر محکم لیکن سامنے کی مثال ہے۔

وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿٦٧﴾

(اور ہم کھلاتے ہیں کھجوروں اور انگوروں کے پھلوں سے بھی، تم ان سے نشہ کی چیزیں بھی بناتے ہو اور کھانے کی خوش ذائقہ اور عمدہ چیزیں بھی، بیشک اس میں بڑی نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو سمجھ سے کام لیتے ہیں۔ ٦٧)　(سورۃ النحل:٦٧)

ربوبیت کے کچھ اور مظاہر

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جس طرح ہم نے پانی کو زندگی کا ذریعہ بنایا اور غذاء کے لیے دودھ جیسی نعمت عطا فرمائی، اسی طرح ہم نے نباتات میں سے کھجور اور انگور جیسے پھل بخشے۔ یہ دونوں اپنے لطف و لذت اور تاثیر اور افادیت میں اپنی نظیر آپ ہیں۔ ان میں اللہ تعالیٰ نے دو خوبیاں رکھی ہیں جو بجائے خود انسان کا امتحان بھی ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ انسان کے لیے نہایت عمدہ رزق ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اس کے اندر شراب بن جانے کی صلاحیت بھی

Marfat.com

موجود ہے جس سے انسان کو اپنی سرمستیوں کا سامان ملتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ سے برگشتگی کے راستے پر پڑ جاتا ہے کیونکہ سکر عربی زبان میں خمر کے معنی میں استعمال ہوتا ہے لیکن رزق حسن سے اس طرف اشارہ کر دیا کہ ہم نے یہ نعمتیں تمہیں رزقِ حسن کے طور پر دی ہیں لیکن ان کے اندر ہم نے خمر بننے کی بھی صلاحیت رکھی ہے۔ اس کا فیصلہ انسانوں کی عقل پر ہے کہ وہ ان نعمتوں سے جسم کی افزائش اور روح کی آسودگی کا کام لیتے ہیں یا ہوش و خرد کے بگاڑ کا سامان کرتے ہیں۔ انسانیت کا راستہ کیا ہے، اس کا فیصلہ خود انسان کو کرنا چاہیے۔

مزید اس کی طرف بھی اشارہ فرمایا گیا ہے کہ انسان کی غذائی ضرورت کے لیے شاید پانی اور دودھ کافی ہوتا اور اگر مزید غذاء کی ضرورت ہوتی تو نہایت سادہ اور بے رنگ صورت میں غذاء مہیا کر دی جاتی، لیکن یہ کھجور کے قد آور درخت، اس کی روپہلی شاخیں اور انگوروں کی شاخوں کا گھنا اور ٹھنڈا سایہ اور پھر اس کا کھلتا ہوا حسن بجائے خود انسان کی عقل کو دعوت دینے کے لیے کافی ہے کہ تم ان میں سے ایک ایک بات پر غور کرو پھر اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات کا تصور ذہن میں لاؤ کہ وہ ایک ایسی خوش جمال، خوش خصال اور خوش نہال ذات ہے کہ جس سے جمال چھن چھن کے نکلتا ہے اور جود و کرم کی بارش ہوتی ہے لیکن کس قدر ستم ظریفی ہے کہ یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی شرک کا کاروبار جاری ہے۔

وَاَوْحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا وَّ مِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا یَعْرِشُوْنَ ﴿۶۸﴾ ثُمَّ کُلِیْ مِنْ کُلِّ
الثَّمَرٰتِ فَاسْلُکِیْ سُبُلَ رَبِّکِ ذُلُلًا ط یَخْرُجُ مِنْ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِیْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ ط اِنَّ فِیْ
ذٰلِکَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ ﴿۶۹﴾ (سورۃ النحل : ۶۸۔ ۶۹)

(اور آپ کے رب نے شہد کی مکھی کے دل میں یہ بات ڈالی کہ تو پہاڑوں اور درختوں اور لوگ جو چھتیں اٹھاتے ہیں، ان میں چھتے بنا۔ ۶۸) پھر ہر قسم کے پھلوں سے رس چوس، پھر اپنے پروردگار کے ہموار راستوں پر چل، یوں نکلتا ہے ان کے پیٹوں سے مختلف رنگوں کا مشروب، اس میں لوگوں کے لیے شفا ہے، بیشک اس کے اندر بڑی نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو غور کرتے ہیں۔ ۶۹)

وحی کا مفہوم

آیت کے شروع میں اَوْحٰی کا لفظ آیا ہے جس کا معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مکھی کی طرف وحی کی، اس سے ایک کھٹک سی پیدا ہوتی ہے کہ وحی تو انبیا کرام پر اترتی ہے، مکھی کی طرف وحی ہونے کا کیا مطلب۔ تو معلوم ہونا چاہیے کہ وحی کا ایک لغوی معنی ہے اور ایک اصطلاحی۔ لغت میں وحی خفیہ اور لطیف اشارے کو کہتے ہیں، اسی مناسبت سے یہ لفظ القاء اور الہام کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر مخلوق کے دل میں بھلائی کی کوئی مناسب بات اچانک ڈال دیتا ہے اور لغت میں اسے وحی کہا جاتا ہے۔ سائنسدانوں کی تمام ایجادات، ماہرین زراعت کے تمام فارمولے کسی بھی شعبہ زندگی سے متعلق لوگوں کے ذہن میں اچانک آنے والا خیال فطری رہنمائی کی مختلف شکلیں، یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے اچانک دل میں ڈالی جاتی ہیں اور اسے وحی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنی بعض مخلوقات کو تکوینی طور پر جو احکام دیتا ہے اسے بھی وحی ہی سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہاں بھی اسی معنی میں وحی کا لفظ استعمال ہوا ہے کہ مکھی جس طرح شہد تیار کرتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی سجھائی ہوئی سوچ ہے جو اس کے دل میں ڈالی گئی ہے۔ وحی جو انبیاء کرام پر اترتی ہے وہ وحی اپنی خصوصیات میں دوسری تمام اقسام سے مختلف ہوتی ہے۔ اس میں وحی کیے جانے والے کو پورا شعور ہوتا ہے کہ یہ وحی خدا کی طرف سے آ رہی ہے۔ اسے اس کا من جانب اللہ تعالیٰ ہونے کا پورا یقین ہوتا ہے، وہ عقائد اور احکام، قوانین اور ہدایت پر مشتمل ہوتی ہے۔ اور اسے نازل کرنے کی غرض یہ ہوتی ہے کہ نبی اس کے ذریعہ نوع انسانی کی رہنمائی کرے۔

Marfat.com

اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور وحدانیت کی دلیل

کائنات کی بڑی بڑی چیزیں اپنے جمال وجلال اور اپنی نفع رسانی کی وجہ سے لوگوں کی توجہ کا مرکز بنی رہتی ہیں لیکن عام طور پر چھوٹی چیزوں کو حقیر سمجھ کر لائق التفات خیال نہیں کیا جاتا۔ اور پھر مکھی جیسی چھوٹی سی چیز کے لیے کس کو فرصت ہے کہ اس میں سوچ بچار کرنے بیٹھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میری حکمت وقدرت کے جلوے صرف پہاڑوں، سمندروں، مویشیوں اور بلند وبالا درختوں میں ہی نظر نہیں آتے بلکہ ایک چھوٹی سی شہد کی مکھی بھی میری حکمتوں کی تجلی گاہ ہے۔ اس کے مختصر سے چھتے میں بھی ہمارے کرشموں کا مینا بازار لگا ہوا ہے۔ ذرا اس چھتہ کو دیکھو کس مہارت سے اس کو مسدس خانوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے جن کے تمام اضلاع اور سارے زاویئے مساوی ہیں۔ تمہارا کوئی ماہر انجینئر بھی مسطر اور پرکار کے بغیر ایسے مسدس خانے نہ بنا سکے پھر اس کے مختلف حصوں پر نظر ڈالو۔ کہیں تو نوزائیدہ بچوں کی قیام گاہ ہے، کہیں شہد کا ذخیرہ کیا جا رہا ہے، کہیں موم تیار ہو رہا ہے، کہیں خوراک کا گودام ہے پھر اس حیران کن نظم ونسق کو دیکھو جس کے ماتحت یہ کثیر التعداد مکھیاں یہاں آباد ہیں کسی متمدن ملک کی بہترین تربیت یافتہ فوج بھی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ ان میں ایک مکھی سب کی سردار ہے۔ دوسری مکھیاں اس کی فرمانبردار ہیں اور اس کے حکم بجالانے میں ذرا کوتاہی نہیں کرتیں، بعض خوراک لانے کے لیے متعین ہیں، بعض پہریدار ہیں، کیا مجال کہ کوئی اجنبی اندر قدم بھی رکھ سکے جو خوراک لانے پر مقرر ہیں۔ وہ اپنے چھتہ سے دور دراز مقامات پر اڑ کر جاتی ہیں۔ وہاں سے مختلف پھولوں، کلیوں، کونپلوں اور پتوں کا رس دن بھر چوستی رہتی ہیں اور پھر طویل مسافت طے کر کے اپنے چھتہ میں واپس آ جاتی ہیں نہ وہ راستہ بھولتی ہیں نہ لیٹ ہوتی ہیں اور نہ اپنے فرض کو انجام دینے میں کسی کاہلی کی روادار ہیں پھر جس حکمت وخوبی سے پھلوں کے چوسے ہوئے اس رس کو شہد بنانے کا عمل تکمیل پاتا ہے۔ وہ تو اتنا حیرت انگیز ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ انسان اتنے علمی کمال اور صنعتی ترقی کے باوجود کوئی ایسی مشینری تیار نہیں کر سکا جس کے ذریعہ وہ پھلوں وغیرہ کے رس سے شہد جیسا جوہر کشید کر سکے۔ غور طلب یہ امر ہے کہ اس چھوٹی سی مکھی کو یہ مہارت اور یہ کمال کس نے سکھایا۔ یہ باقاعدگی، نظم ونسق کی پابندی، اپنے فرائض کی ادائیگی، اپنے امیر کی اطاعت، یہ فنی نزاکتیں اور اس پیچیدہ کام کو انجام دینے میں اتنی نفاستیں یہ سب چیزیں اس حیوان کو کس نے تعلیم کیں۔ قرآنِ کریم بتاتا ہے کہ اے محبوب کائنات ﷺ یہ تیرے رب کی تعلیم ہے۔ اسی نے یہ سارے گر یہ سارے قاعدے اور یہ طریق کار اس مکھی کو سکھایا ہے اور اس کی دی ہوئی سمجھ سے وہ شہد جیسی نعمت بنا کر انسان کی خدمت میں پیش کرتی ہے۔ اس آیت میں وحی سے مراد الہام ہے یعنی وہ سمجھ جو اللہ تعالیٰ حیوانات وغیرہ کو عطا کرتا ہے جس سے وہ اپنے نفع و نقصان کو سمجھ سکتے ہیں اور اپنے طبعی فرائض خوش اسلوبی سے ادا کر سکتے ہیں۔ (ضیاء القرآن)

شہد سے متعلق بعض غور طلب نکات

شہد کا استعمال تو تمام دنیا میں ہوتا ہے، یہ ایک نہایت لذیذ، خوش رنگ اور خوش ذائقہ مشروب ہے۔ جس سے عرب بھی بتمام وکمال واقف تھے اور وہ پہاڑوں میں مکھیوں سے اپنی نگرانی میں شہد تیار کرواتے تھے۔ اس کے لطف ولذت سے کیونکہ سب واقف ہیں اس لیے قرآنِ کریم نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ البتہ اس کا ایک مخفی جوہر وہ اس کا شفا ہونا ہے اور عام طور پر لوگ اس سے واقف نہیں تھے اس لیے قرآنِ کریم نے اس کا بطور خاص ذکر فرمایا۔ آج کی جدید دنیا کا بھی یہ تجربہ ہے کہ شہد بہت سے امراض میں شفا ہے۔ لیکن اس میں مشکل یہ پیش آ رہی ہے کہ عرب میں تو یہ شہد مختلف قسم کی بوٹیوں اور پھولوں سے بنایا جاتا تھا۔ مکھیاں ان کا رس چوستی تھیں اور اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ صلاحیت سے کام لے کر اس کو شہد میں تبدیل کر دیتی تھیں۔ لیکن جن ملکوں اور جن علاقوں میں پھول اور بوٹیاں نسبتاً کم ہیں اور کماد کے بڑے بڑے کھیت یا چوقندر کی بہتات ہے وہاں مکھیوں کو اس کی کیا ضرورت ہے کہ وہ دور دور سے

Marfat.com

پھلوں اور پھولوں کا رس چوستی پھریں۔ ایسی صورت میں ان کا بنایا ہوا شہد شاید شفا نہ بن سکے۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمان اسے بطور ایک صنعت کے اختیار کریں۔ جدید سائنٹیفک انداز میں مکھیوں کی پرورش کی جائے۔ اپنے اپنے ملک اور علاقوں میں جن دوائیوں کی ضرورت ہو اور وہ جڑی بوٹیاں اپنے ہاں پائی جاتی ہوں انھیں باقاعدہ کاشت کیا جائے اور مکھیوں کو ان کا رس چوسنے کی آسانی مہیا کی جائے۔ چنانچہ وہ ان جڑی بوٹیوں اور پھلوں پھولوں سے رس چوس کر جو جوس نکالیں گی اس میں خالص گلوکوز ہوگا اور جو شہد تیار کریں گی وہ بغیر کسی آمیزش کے براہ راست مطلوبہ بیماری پر اثر کرے گی اور یہ ایسی مؤثر دوا ہوگا کہ دنیا کی کوئی لیبارٹری بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکے گی۔

یہ بات مسلمہ ہے کہ شہد کا خاصہ یہ ہے کہ وہ خود بھی نہیں سڑتا اور دوسری چیزوں کو بھی اپنے اندر ایک مدت تک محفوظ رکھتا ہے اور اسے اس قابل بنا دیتا ہے کہ دوائیں تیار کرنے میں اس سے مدد لی جائے۔ آج دوائیوں کی حفاظت کے لیے الکحل استعمال کی جاتی ہے جبکہ ہم جانتے ہیں کہ صدیوں تک شہد کو اسی مقصد کے لیے استعمال کیا جاتا رہا ہے تو آج جبکہ وسائل پہلے سے بہتر موجود ہیں تو ہم شہد سے یہ کام کیوں نہیں لیتے اور ناپاک الکحل کو اپنی دوائیوں میں داخل ہونے کا موقع کیوں دیتے ہیں۔ ہماری میڈیکل یونیورسٹیوں میں ایسے تجربات ہونے چاہییں جس سے ہم شہد سے مطلوبہ کام لینے میں کامیاب ہو سکیں۔

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ ثُمَّ يَتَوَفّٰىكُمْ ۙ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْ لَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْـًٔا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ﴿۷۰﴾

(اور اللہ تعالیٰ ہی نے تم کو پیدا کیا اور پھر وہی تم کو موت دیتا ہے اور تم میں سے بعض ارذل عمر کی طرف لوٹا دیے جاتے ہیں تاکہ بہت کچھ جاننے کے بعد پھر کچھ نہ جانے، بیشک اللہ تعالیٰ ہی علم والا اور قدرت والا ہے۔ ۷۰) (سورۃ النحل: ۷۰)

انسان کی ذات اور اس پر ہونے والی تبدیلیوں سے استدلال

وہ رب کائنات جس نے انسانوں کی تربیت کے لیے قسم قسم کی نعمتیں پیدا فرمائیں اور انسانوں کو وہ کچھ عطا کیا جو نہ صرف ان کی ضرورت تھا بلکہ خالصتاً اس کی عطا اور اس کی رحمت کا ظہور تھا۔ ان میں سے بعض نعمتوں کا ذکر کرنے کے بعد انسان کو جو سب سے بڑی نعمت دی گئی ہے اس کا ذکر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمھیں صرف نعمتیں ہی عطا نہیں فرمائیں بلکہ تمھیں زندگی بھی اسی نے بخشی اور تمھیں موت بھی وہی دے گا۔ آج تم جوانی کی سرمستیوں اور لن ترانیوں میں بالکل بھول چکے ہو کہ تمھیں زندگی دینے والا کون ہے اور ایک دن وہی تم سے زندگی چھین بھی لے گا۔ تم یہ سمجھتے ہو کہ تمھاری یہی حالت رہے گی، یہی جوانیوں کا لاابالی پن، یہی شریانوں میں دوڑتا ہوا پارہ اور دماغ میں ابلتے ہوئے رنگارنگ خیالات ہمیشہ تمھارے ساتھ رہیں گے۔ لیکن تم اپنے گردوپیش کو اگر غور سے دیکھو تو تمھیں نظر آئے گا کہ تم میں سے ایسے کتنے لوگ تھے جو علم کا حوالہ تھے اور جن کا علم و دانش تم سب کے لیے رہنما تھا اور آج وہ اپنی گزری ہوئی عمر کا نوحہ ہیں۔ انھیں کچھ معلوم نہیں کہ کل ہم کیا تھے اور آج کیا ہیں۔ انسانوں میں یہ تبدیلیاں پروردگار کی طرف سے صرف اس لیے آتی ہیں کہ انسان اپنے خالق کو پہچانے، وہ اس بات کو اچھی طرح مستحضر رکھے کہ میں جن نعمتوں پر اتراتا ہوں وہ اسی خالق کائنات کی دین ہیں اور اس کی قدرتِ کاملہ کا حال یہ ہے کہ وہ جب چاہے ان نعمتوں کو واپس لے سکتا ہے کیونکہ وہ علیم بھی ہے اور قدیر بھی ہے۔ اور میں محتاج بھی ہوں اور بے خبر اور جاہل بھی۔ اس کے باوجود ایسے جہلِ مرکب کا شکار ہوں کہ اپنی زندگی کے حقائق کا بھی ادراک کرنے سے قاصر ہوں۔

وَاللّٰهُ

فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ ۚ فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا

بِرَاۗدِّيْ رِزْقِهِمْ عَلٰي مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَاۗءٌ ۭ

Marfat.com

أَفَبِنِعْمَةِ اللَّهِ يَجْحَدُونَ ﴿٧١﴾ وَاللَّهُ جَعَلَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ
أَزْوَاجًا وَجَعَلَ لَكُم مِّنْ أَزْوَاجِكُم بَنِينَ وَحَفَدَةً وَ
رَزَقَكُم مِّنَ الطَّيِّبَاتِ ۚ أَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُونَ وَبِنِعْمَتِ اللَّهِ
هُمْ يَكْفُرُونَ ﴿٧٢﴾ وَيَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَمْلِكُ
لَهُمْ رِزْقًا مِّنَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ شَيْئًا وَلَا يَسْتَطِيعُونَ ﴿٧٣﴾
فَلَا تَضْرِبُوا لِلَّهِ الْأَمْثَالَ ۚ إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ
لَا تَعْلَمُونَ ﴿٧٤﴾ ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوكًا لَّا يَقْدِرُ عَلَىٰ
شَيْءٍ وَمَن رَّزَقْنَاهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا فَهُوَ يُنفِقُ مِنْهُ سِرًّا
وَجَهْرًا ۖ هَلْ يَسْتَوُونَ ۚ الْحَمْدُ لِلَّهِ ۚ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٧٥﴾
وَضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ أَحَدُهُمَا أَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ عَلَىٰ
شَيْءٍ وَهُوَ كَلٌّ عَلَىٰ مَوْلَاهُ أَيْنَمَا يُوَجِّههُّ لَا يَأْتِ بِخَيْرٍ ۖ
هَلْ يَسْتَوِي هُوَ ۙ وَمَن يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ ۙ وَهُوَ عَلَىٰ صِرَاطٍ
مُّسْتَقِيمٍ ﴿٧٦﴾

رکوع: ۱۰ (اور اللہ نے تم کو رزق میں ایک کو دوسرے پر برتری دے رکھی ہے تو جن کو برتری دی گئی ہے وہ اپنا رزق اپنے غلاموں کو نہیں دیتے کہ وہ اس میں برابر ہو جائیں تو کیا وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا انکار کرتے ہیں۔ ۷۱) اور اللہ تعالیٰ ہی نے پیدا فرمائیں تمھارے لیے تمھاری جنس سے عورتیں اور پیدا فرمائے تمھارے لیے تمھاری بیویوں سے بیٹے اور پوتے

Marfat.com

اور تمھیں پاکیزہ نعمتوں کا رزق بخشا، کیا یہ لوگ باطل پر ایمان لاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری کرتے ہیں۔ ۷۲) اور یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے سوا ان معبودوں کی بندگی کرتے ہیں جو انھیں آسمانوں اور زمین سے رزق دینے کا کچھ اختیار نہیں رکھتے اور نہ وہ کچھ کرسکتے ہیں۔ ۷۳) پس (اے مشرکو!) اللہ کے لیے مثالیں بیان نہ کرو، بیشک اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ ۷۴) اللہ ایک مثال بیان فرماتا ہے ایک غلام مملوک کی جو کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتا اور اس کی جس کو ہم نے اپنی جانب سے اچھا رزق دے رکھا ہے جس میں سے وہ پوشیدہ اور علانیہ خرچ کرتا ہے، (اب تم ہی بتاؤ) کیا یہ یکساں ہیں، شکر کا سزاوار اللہ ہے لیکن ان میں سے اکثر لوگ نہیں جانتے۔ ۷۵) اور اللہ ایک اور مثال بیان کرتا ہے، دو آدمی ہیں جن میں سے ایک گونگا ہے جو کسی چیز پر قادر نہیں ہے۔ اور وہ اپنے آقا پر ایک بوجھ ہے، جہاں کہیں بھی اس کو بھیجتا ہے، وہ کوئی بھلائی لے کر نہیں آتا، کیا وہ اور وہ جو عدل کا حکم دیتا ہے اور وہ ایک سیدھی راہ پر ہے، دونوں یکساں ہیں۔ ۷۶)

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعۡضَكُمۡ عَلٰى بَعۡضٍ فِى الرِّزۡقِ‌ۚ فَمَا الَّذِيۡنَ فُضِّلُوۡا بِرَآدِّىۡ رِزۡقِهِمۡ عَلٰى مَا مَلَـكَتۡ اَيۡمَانُهُمۡ فَهُمۡ فِيۡهِ سَوَآءٌ‌ ؕ اَفَبِنِعۡمَةِ اللّٰهِ يَجۡحَدُوۡنَ ۝۷۱ (سورة النحل : ۷۱)

(اور اللہ تعالیٰ نے تم کو رزق میں ایک کو دوسرے پر برتری دے رکھی ہے تو جن کو برتری دی گئی ہے وہ اپنا رزق اپنے غلاموں کو نہیں دیتے کہ وہ اس میں برابر ہوجائیں تو کیا وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا انکار کرتے ہیں۔ ۷۱)

انسان کے رویے سے استدلال

سابقہ آیتِ کریمہ میں یہ فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانی جسم و جان اور عمر اور علم اللہ تعالیٰ ہی کا عطا کردہ ہے۔ اس لیے ہر نعمت کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر مزید یقین پیدا ہونا چاہیے، اب اس آیتِ کریمہ میں بتایا جارہا ہے کہ رزق بھی وہی دیتا ہے اور یہ اس کی حکمت کا تقاضا ہے کہ اس نے رزق میں سب انسانوں کو برابر نہیں ٹھہرایا بلکہ کوئی امیر ہے اور کوئی غریب، کوئی حاکم ہے اور کوئی محکوم اور کوئی خدمت لینے والا ہے اور کوئی خدمت دینے والا۔ کیونکہ اگر وہ سب انسانوں کو رزق اور وسائلِ رزق میں برابر کردیتا تو دنیا کا نظام ابتر ہوجاتا۔ یہاں ہر شخص چاہے وہ کتنے ہی عظیم معاشرتی سٹیٹس کا مالک ہو، دوسرے کا محتاج ہے۔ امیر سے امیر آدمی حجام کے پاس اپنی وضع قطع درست کرانے کے لیے جاتا ہے۔ اسی طرح ہماری زندگی کی کتنی ضروریات ہیں کہ ہر شخص اپنے تئیں ان کا کفیل نہیں ہوسکتا۔ لباس کوئی تیار کرتا ہے اور کوئی پہنتا ہے، غلہ کوئی اگاتا ہے اور کوئی دوسرا کھاتا ہے۔ علیٰ ہٰذا القیاس ہر شخص کام لیتا بھی ہے اور کام دیتا بھی ہے۔ اور برابری اور ہر سطح کی مساوات فطرت کے خلاف بھی ہے اور حکمت کے بھی۔ یہ بات شاید اس لیے بھی فرمائی گئی ہے کہ قریشِ مکہ ہمیشہ اپنے برتر معاشی اور معاشرتی حالات کے حوالے سے مسلمانوں پر طنز کرتے تھے اور اپنے تئیں اللہ تعالیٰ کا مقرب خیال کرتے تھے۔ بہرحال کہنا یہ ہے کہ رزق بھی اللہ تعالیٰ کی دین اور عطاء ہے اور رزق میں تفاوت بھی اللہ تعالیٰ کی نعمت اور احسان ہے۔ اگر کوئی شخص صرف انھیں نعمتوں کو دیکھتے ہوئے منعمِ حقیقی کو پہچان لے تو اسے اللہ تعالیٰ کی معرفت میں کبھی دشواری پیش نہ آئے اور کبھی اس کی ذات و صفات میں شرک کا ارتکاب نہ کرے۔ لیکن یہ انسان کی کوتاہ فکری ہے کہ وہ ان سیدھی سادی باتوں سے شرک کے غلط ہونے پر یکسو نہیں ہوتا۔ اس لیے اس سے ایک قدم آگے بڑھتے ہوئے پروردگار نے ارشاد فرمایا کہ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے رزق اور وسائلِ رزق میں انسانوں کے درمیان بہت تفاوت رکھا ہے۔ ان میں ایسے بھی ہیں جنھیں اپنے مال و دولت کے وسعتوں کی خبر نہیں۔ اور ایسے بھی ہیں جو نانِ شبینہ کے محتاج ہیں۔ لیکن کیا آج تک مکہ کی سرزمین پر کوئی ایک واقعہ ایسا پیش آیا ہے کہ کسی بڑے سے بڑے رئیس نے اپنی تمام دولت اپنے غلاموں، غریب رشتہ داروں اور نوکروں چاکروں کو برابر سطح پر اس لیے تقسیم کردی ہو کہ ہم سب آپس میں برابر ہوجائیں جبکہ ان کی دولت ان کی اپنی پیدا کردہ نہیں، اللہ تعالیٰ کی عطاء اور بخشش ہے۔ اور پھر اس کی پائیداری کی کوئی ضمانت نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ آج ایک کے پاس ہو کل دوسرے کے پاس۔ لیکن وہ پروردگار جو

Marfat.com

خالقِ کائنات ہے اس کی تمام نعمتیں اس کی ذاتی ملکیت اور اس کی مخلوق ہیں جس پر کسی دوسرے کے حق کا وہم بھی نہیں ہوسکتا۔ تم اپنی دولت پر تو کسی دوسرے کی شرکت قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہو لیکن اللہ تعالیٰ کی صفات اور اس کے اختیارات میں تمھارا اصرار ہے کہ دوسری ان قوتوں کو شریک کیا جائے جن کو تم شریک کرنا چاہتے ہو۔ تمھارا یہ رویہ بجائے خود اللہ تعالیٰ کے احسانات کا انکار ہے۔ اس لیے آخر میں فرمایا کہ یہ جو اس قسم کی حرکتیں کرتے ہیں تو کیا یہ اللہ تعالیٰ کی نعمت یا احسان کا انکار کرتے ہیں، انھیں ایسا نہیں کرنا چاہیے۔

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَحَفَدَةً وَّرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ۭ اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَتِ اللّٰهِ هُمْ يَكْفُرُوْنَ ﴿۷۲﴾ (سورة النحل : ۷۲)

(اور اللہ تعالیٰ ہی نے پیدا فرمائیں تمھارے لیے تمھاری جنس سے عورتیں اور پیدا فرمائے تمھارے لیے تمھاری بیویوں سے بیٹے اور پوتے اور تمھیں پاکیزہ نعمتوں کا رزق بخشا، کیا یہ لوگ باطل پر ایمان لاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری کرتے ہیں۔ ۷۲)

بیوی بچوں کی نعمت بھی اللہ تعالیٰ کی عطا ہے

اللہ تعالیٰ کی مزید مہربانیوں اور نعمتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ جس طرح اس نے تمھیں فضل و کرم سے نوازا، اسی طرح اس نے تمھیں وجود بخشا، لیکن تمھیں تنہائی کی نذر نہیں ہونے دیا بلکہ تمھاری جنس سے تمھیں بیویاں بھی بخشیں۔ بیوی انسان کی رفیقۂ حیات ہے، تنہائیوں کی امین ہے، دکھ درد کی ساتھی ہے، شوہر کے لیے بہترین لباس ہے، لیکن یہ سب کچھ اس صورت میں ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ نے شوہر کی جنس سے پیدا فرمایا۔ اگر وہ کسی اور جنس سے ہوتی تو اس کے احساسات، اس کے میلانات، اس کی خواہشیں، اس کی مسرتیں، اس کی توانائیاں، اس کی خوشی اور غضب کے امکانات سب شوہر سے مختلف ہوتے تو باہمی ہم آہنگی کی بجائے اختلافات کی آگ دونوں کو بھسم کر ڈالتی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے دونوں کو ایک جنس سے پیدا فرما کر ہم آہنگی کے امکانات کو مکمل فرمادیا۔ میاں بیوی یقیناً ایک دوسرے کا لباس ہیں۔ باہمی محبت ہو تو ایک دوسرے کے لیے سوچتے ہیں اور ہر دکھ درد میں ایک دوسرے کے ساتھی ہوتے ہیں لیکن دونوں میں ایک دبی ہوئی خواہش انھیں کبھی کبھی پریشان کردیتی ہے، وہ اولاد کی خواہش ہے۔ ان کی فطرت کا تقاضا ہے کہ اللہ تعالیٰ اولاد کی صورت میں انھیں کھلونے دے جو زندگی کے لطف و لذت میں اضافہ کرے۔ اور گھر کی خاموشیوں کو مسرت کے گیتوں سے ہمکنار رکھیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فضل فرمایا کہ اولاد بھی عطاء فرمائی، پھر بعض دفعہ زندگی میں بیٹوں کو اولاد دے کر پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں سے گھر کا آنگن سجا دیا۔ ان میں سے ایک ایک فرد خوشیوں کی علامت بن کے آتا ہے۔ ہر نیا آنے والا نئی خوشی کی نوید ہوتا ہے۔ لیکن یہ اسی صورت میں ہے جب گھر کی ضروریات بھی میسر ہوں۔ اس لیے ارشاد فرمایا کہ پھر تمھیں اللہ تعالیٰ نے پاکیزہ نعمتوں کا رزق بخشا۔ ان تمام نعمتوں کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھیں یا اپنے تصور میں لائیں پھر فیصلہ کرو کہ پروردگار کے سوا یہ نعمتیں دینے میں کسی اور کا ہاتھ بھی ہے یا اور کوئی اس قابل ہے کہ وہ ان نعمتوں میں سے کچھ بھی عطا کرسکے۔ جب ان میں سے کوئی بات ممکن نہیں اور عطاء کرنے والی ذات ایک ہی ہے تو پھر کس قدر دکھ کی بات ہے کہ تم باطل پر ایمان لاتے ہو اور اللہ تعالیٰ کی نعمت کی ناشکری کرتے ہو یعنی شیطان کی پیروی کرتے ہو اور نبی کریم ﷺ پر ایمان لانے سے انکار کرتے ہو۔ (مقاتل) نے باطل سے شیطان مراد لیا ہے اور نعمت اللہ تعالیٰ سے آنحضرت ﷺ کی ذاتِ گرامی مراد لی ہے۔

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ شَيْـًٔا وَّلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ﴿۷۳﴾

(اور یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے سوا ان معبودوں کی بندگی کرتے ہیں جو انھیں آسمانوں اور زمین سے رزق دینے کا کچھ اختیار نہیں رکھتے اور نہ وہ کچھ کرسکتے ہیں۔ ۷۳) (سورة النحل: ۷۳)

Marfat.com

ایمان بالباطل کی تفصیل

یہ ایمان بالباطل اور ناشکری کی تفصیل ہے کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے سوا ان قوتوں کی پرستش کرتے ہیں جو زمین و آسمان میں کسی چیز کا اختیار نہیں رکھتے۔ نہ انسانوں کے پیدا کرنے میں انھیں کوئی دخل ہے اور نہ رزق دینے میں۔ نہ آسمان سے کسی چیز کے اتارنے پر قادر ہیں اور نہ زمین سے کسی چیز کے برآمد کرنے پر۔ انسان کے دکھ سکھ میں وہ کسی طرح کی مدد کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تو ایسے بے صلاحیت اور بے طاقت فرضی معبودوں کو لوگوں نے اللہ تعالیٰ کا شریک بنا رکھا ہے۔

فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ (سورۃ النحل : ۷۴)

(پس (اے مشرکو!) اللہ تعالیٰ کے لیے مثالیں بیان نہ کرو، بیشک اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ ۷۴)

صفاتِ الٰہی کے باب میں تمثیل سے احتراز کی ہدایت

ضرب المثل کا معنی ہے، ایک حال کو دوسرے حال سے تشبیہ دینا۔ اس آیتِ کریمہ میں شرک کا ایک بہت بڑا دروازہ بند کیا جارہا ہے۔ انسانوں نے جن راستوں سے شرک کے حوالے سے ٹھوکر کھائی ہے اور توحید کو نقصان پہنچایا ہے، ان میں ایک تشبیہ کا راستہ ہے۔ مثلاً کتنی مشرک قومیں ہیں جنھوں نے دنیوی بادشاہوں پر قیاس کرکے اللہ تعالیٰ کے لیے ان جیسی صفات تجویز کیں اور ان صفات سے اللہ تعالیٰ کو متصف ٹھہرایا۔ دنیوی حکمرانوں پر قیاس کرکے اپنے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان وسیلے قائم کیے کہ جس طرح کوئی بڑے سے بڑا حکمران ساری رعایا کو اپنے طور سے نہیں دیکھتا اور ان کے حالات سے براہِ راست واقف نہیں ہوتا، درمیان میں درجہ بدرجہ واسطے ہیں جو بادشاہ تک رعایا کی خبریں پہنچاتے اور رعایا پر بادشاہ کے احکام نافذ کرتے ہیں۔ اسی طرح بندوں اور ان کے خدا کے درمیان بھی کتنے واسطے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی حاکمیت میں شریک ہیں، انھیں بہت سے اختیارات حاصل ہیں۔ اس لیے ہمیں ان سے مانگنا چاہیے، ان کے نام کی قربانیاں دے کر انھیں خوش رکھنا چاہیے تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کو ہم سے خوش رکھیں۔ آپ نے محسوس کیا ہوگا یہ سارا شرک کا کاروبار تشبیہ کے تصور سے چلتا ہے۔ اس لیے یہاں انسانوں کو روک دیا گیا کہ تم اللہ تعالیٰ کی مثالیں بیان نہ کرو کیونکہ اس کی نہ کوئی مثال ہے اور نہ شبیہ۔ ساری مخلوقات اس کی غلام ہے۔ بڑی سے بڑی ذات بھی اس کی مخلوق ہے۔ مخلوق کو خالق سے تشبیہ دینا کون سی عقل مندی کی بات ہے اور مزید یہ بات بھی کہ تم نہ خدا کی ذات سے کماحقہ واقف ہو اور نہ اس کی صفات کو جانتے ہو۔ نہ تم یہ جانتے ہو کہ وہ کن کمالات سے متصف ہے۔ اپنی لاعلمی اور بے خبری سے جب تم کسی کو اس سے تشبیہ دو گے تو یقیناً گمراہی کا راستہ اختیار کرو گے۔

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّمَنْ رَّزَقْنٰهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا فَهُوَ يُنْفِقُ مِنْهُ سِرًّا وَّجَهْرًا ؕ هَلْ يَسْتَوٗنَ ؕ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (سورۃ النحل : ۷۵)

(اللہ تعالیٰ ایک مثال بیان فرماتا ہے ایک غلام مملوک کی جو کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتا اور اس کی جس کو ہم نے اپنی جانب سے اچھا رزق دے رکھا ہے جس میں سے وہ پوشیدہ اور علانیہ خرچ کرتا ہے، (اب تم ہی بتاؤ) کیا یہ یکساں ہیں، شکر کا سزاوار اللہ تعالیٰ ہے لیکن ان میں سے اکثر لوگ نہیں جانتے۔ ۷۵)

Marfat.com

اللہ تعالیٰ کی بیان کردہ تمثیل

اگر مثال ہی سننا چاہتے ہو تو اللہ تعالیٰ خود مثال بیان فرماتا ہے، اس کو سنو۔ ایک شخص ہے جو کسی کا زرخرید غلام ہے۔ وہ کسی چیز پر اختیار نہیں رکھتا، کسی بھوکے کو کھانا نہیں کھلا سکتا، کسی ننگے کو کپڑا نہیں پہنا سکتا، کوئی اس کے سامنے ٹھٹھر کر مر جائے وہ اس کی سردی کا علاج نہیں کر سکتا۔ کسی بیمار کے کام نہیں آسکتا، کیونکہ اس کے مالک نے اس کو کسی قسم کا نہ اختیار دیا ہے اور نہ حقِ ملکیت دیا ہے کہ وہ اپنی ملک سے کسی کی مدد کر سکے۔
اس کے مقابلے میں ایک دوسرا شخص ہے جو آزاد ہے، جسے حقِ ملکیت حاصل ہے جو آزادانہ تصرف کا حق رکھتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے اس کو رزق دے رکھا ہے جو صرف اس کی ضرورت کے لیے کافی نہیں بلکہ اس میں سے دونوں ہاتھوں سے محتاجوں اور ضرورتمندوں کی مدد کے لیے لٹاتا ہے۔ وہ لوگوں کے سامنے بھی غریبوں کی مدد کرتا ہے کیونکہ کوئی اسے روکنے کا حق نہیں رکھتا اور وہ چھپ کر بھی بے کسوں کے کام آتا ہے کیونکہ وہ غریبوں کے ساتھ انتہا درجہ اخلاص رکھتا ہے۔ ان دونوں کی حالت کو غور سے دیکھو اور دونوں کے اعمال کا جائزہ لو، کیا تمھاری نگاہ میں دونوں برابر ہیں۔
تمھارے اندر اگر انصاف کی ذرا بھی رمق ہے تو تم یقیناً یہ کہو گے کہ ایک بے اختیار غلام، ایک آزاد لوگوں سے اخلاص رکھنے والے ان داتا کے برابر کیسے ہو سکتا ہے۔ اگر تمھارے انصاف کا یہی فیصلہ ہے تو ہم ایک قدم آگے بڑھ کر تمھارے سامنے ایک اور معاملہ رکھتے ہیں کہ جن دو انسانوں کو تم آپس میں برابر قرار نہیں دے رہے ہو ان میں صرف فرق اختیارات کا ہے جبکہ وہ انسان ہونے اور مخلوق ہونے کے اعتبار سے دونوں برابر ہیں۔ اور بہت سی باتوں میں بھی بطورِ مخلوق کے ان میں یکسانیت پائی جاتی ہے، تو پھر سوال یہ ہے کہ تم مخلوقات میں سے کتنی شخصیتوں کو اللہ تعالیٰ کے برابر قرار دیتے ہو، اس کے اختیارات میں انھیں شریک سمجھتے ہو جبکہ وہ بھی اللہ تعالیٰ کی محتاج ہیں اور اپنی ضرورتیں بھی اللہ تعالیٰ ہی سے پوری کرتے ہیں، لیکن تم بجائے اللہ تعالیٰ سے مانگنے کے ان سے مانگتے ہو۔ کہاں رب العرش العظیم اور کہاں زمین میں بسنے والی ایک ادنیٰ مخلوق جن میں سے بہت سوں کے تم بت بنا کے پوجتے ہو اور سمجھتے یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں حقِ بندگی دے رکھا ہے۔ خدا لگتی کہو۔
اس کے بعد فرمایا، الحمدللہ! کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس مثال نے توحید اور شرک کو واضح کر دیا، خالق اور مخلوق کی حقیقت کھول دی اور جاننے والوں کے لیے علم کا یہ شعبہ آسان کر دیا، لیکن کیا کیا جائے کہ اتنی سامنے کی بات کتنے لوگوں کی نگاہوں سے آج تک مخفی ہے۔

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ اَحَدُهُمَآ اَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّهُوَ كَلٌّ عَلٰى مَوْلٰىهُ ۙ اَيْنَمَا يُوَجِّهْهُّ لَا يَاْتِ بِخَيْرٍ ۭ هَلْ يَسْتَوِيْ هُوَ ۙ وَمَنْ يَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ ۙ وَهُوَ عَلٰي صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿٧٦﴾

(اور اللہ تعالیٰ ایک اور مثال بیان کرتا ہے، دو آدمی ہیں جن میں سے ایک گونگا ہے جو کسی چیز پر قادر نہیں ہے۔ اور وہ اپنے آقا پر ایک بوجھ ہے، جہاں کہیں بھی اس کو بھیجتا ہے، وہ کوئی بھلائی لے کر نہیں آتا، کیا وہ اور وہ جو عدل کا حکم دیتا ہے اور وہ ایک سیدھی راہ پر ہے، دونوں یکساں ہیں۔ ۷۶)　(سورۃ النحل: ۷۶)

ایک دوسری تمثیل

شرک کی مذمت اور اس کی حقیقت کھولنے کے لیے اللہ تعالیٰ ایک اور نہایت آسان مثال بیان فرماتے ہیں، مقصد صرف یہ ہے کہ اشراف قریش تو اپنی برتری کے زعم میں کسی بات کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں اور ان کی تمام تر کوشش یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے رسول کی دعوت کو یا تو لوگوں تک پہنچنے نہ دیں اور یا وہ اس طرح پہنچے کہ جس میں خود ان نام نہاد بڑائی کے دعویداروں نے اس میں قسم قسم کی آمیزش کر رکھی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس طرح کی مثالوں کے ذریعے معمولی سے معمولی آدمی کے لیے بھی توحید کو سمجھنا آسان بنا رہے ہیں۔

Marfat.com

مثال یہ بیان فرمائی ہے کہ دو آدمی ہیں جن میں سے ایک پیدائشی طور پر گونگا بہرہ ہے، وہ کسی چیز پر قادر نہیں۔ نہ وہ سن سکتا ہے اور نہ بول سکتا ہے۔ حواس بھی معطل ہیں اور عقل سے بھی تہی دامن ہے۔ وہ اپنے آقا یا اپنے ساتھیوں پر بوجھ ہے کہ جو اپنے لیے بھی کمانے کے قابل نہیں، اس کا آقا اسے جہاں بھیجتا ہے کوئی نہ کوئی الزام اور طعن ہی لے کر لوٹتا ہے۔ اور دوسرا وہ شخص ہے جو حواس اور عقل میں کامل، معاملات میں نہایت گہری بصیرت رکھنے والا اور جب کہیں اسے معاملات میں فیصلہ کرنا پڑے تو نہایت منصف اور عادل اور زندگی کے رویئے میں صراط مستقیم پر چلنے والا، مکے کے چھوٹے بڑے لوگو! انصاف سے بتاؤ کہ کیا یہ دونوں برابر ہیں، حالانکہ دونوں مخلوق ہیں اور دونوں انسان ہیں۔ اس لحاظ سے بہت ساری چیزیں ان میں مشترک بھی ہیں، لیکن ان کی صفات میں فرق کتنا واضح ہے کہ تم انھیں یکساں قرار دینے کی جرأت نہیں کر سکتے، تو پھر خدا کے لیے بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ جو کائنات کا خالق ہے جو عرشِ عظیم کا مالک ہے اور جس کے تکوینی نظام میں اس کے حکم کے بغیر پتہ بھی نہیں ہل سکتا۔ تم نے اپنے بتوں اور اپنے دیوی دیوتاؤں کو اس کے برابر اور اس کا شریک کیسے ٹھہرا رکھا ہے۔

وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَاۤ اَمْرُ
السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ اَوْ هُوَ اَقْرَبُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى
كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۷۷﴾ وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ
لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ۙ وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۙ
لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۷۸﴾ اَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ مُسَخَّرٰتٍ فِىْ جَوِّ
السَّمَآءِ ؕ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ ؕ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ
يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۷۹﴾ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْۢ بُيُوْتِكُمْ سَكَنًا وَّجَعَلَ
لَكُمْ مِّنْ جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ بُيُوْتًا تَسْتَخِفُّوْنَهَا يَوْمَ ظَعْنِكُمْ
وَيَوْمَ اِقَامَتِكُمْ ۙ وَمِنْ اَصْوَافِهَا وَاَوْبَارِهَا وَاَشْعَارِهَاۤ
اَثَاثًا وَّمَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ ﴿۸۰﴾ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّمَّا خَلَقَ ظِلٰلًا
وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْجِبَالِ اَكْنَانًا وَّجَعَلَ لَكُمْ سَرَابِيْلَ

Marfat.com

تَقِيْكُمُ الْحَرَّ وَسَرَابِيْلَ تَقِيْكُمْ بَأْسَكُمْ ۭ كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ
عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ ﴿۸۱﴾ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ
الْمُبِيْنُ ﴿۸۲﴾ يَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ يُنْكِرُوْنَهَا وَاَكْثَرُهُمُ
الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۳﴾

رکوع: ۱۱ (اور آسمانوں اور زمین کا غیب اللہ ہی کے لیے ہے اور قیامت کا معاملہ پس آنکھ جھپکنے کی طرح ہے یا اس سے بھی جلدی، بیشک اللہ ہر چیز پر غالب ہے۔ ۷۷) اور اللہ نے تمھیں تمھاری ماؤں کے پیٹوں سے اس حال میں نکالا کہ تم کچھ نہیں جانتے تھے اور اس نے تمھارے لیے کان اور آنکھیں اور سوچنے والے دل بنائے تا کہ تم شکر گزار بنو۔ ۷۸) کیا انھوں نے کبھی پرندوں کی طرف نہیں دیکھا کہ وہ مطیع اور فرمانبردار بن کر اڑ رہے ہیں، ان کو بس اللہ ہی تھامے ہوئے ہوتا ہے، بیشک اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے ہیں۔ ۷۹) اور اللہ نے بنایا تمھارے لیے تمھارے گھروں کو آرام و سکون کی جگہ، اور بنائے تمھارے لیے جانوروں کی کھالوں سے گھر (خیمے)، جنھیں تم ہلکا پھلکا پاتے ہو، سفر کے دن بھی اور اقامت کے دن بھی اور اسی نے بنائے ہیں بھیڑوں کی صوف اور اونٹوں کی اون اور بکریوں کے بالوں سے مختلف گھریلو سامان اور استعمال کی چیزیں ایک وقتِ مقرر تک۔ ۸۰) اور اللہ ہی نے ان چیزوں سے جو اس نے پیدا کی ہیں تمھارے لیے سائے بنائے، اور تمھارے لیے پہاڑوں میں پناہ گاہیں بنائیں اور تمھارے لیے ایسے لباس بنائے جو تمھیں گرمی سے بچاتے ہیں اور ایسے لباس بنائے جو تمھاری جنگ میں تمھیں محفوظ رکھتے ہیں، اسی طرح وہ تم پر اپنی نعمتوں کی تکمیل کرتا ہے تا کہ تم فرمانبردار بنو۔ ۸۱) پھر اگر وہ اعراض کریں تو آپ کی ذمہ داری صاف صاف پہنچا دینا ہے۔ ۸۲) یہ اللہ کی نعمتوں کو پہچانتے ہیں پھر اس کا انکار کرتے ہیں اور ان میں اکثر ناشکرے ہیں۔ ۸۳)

وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَمَآ اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ اَوْ هُوَ اَقْرَبُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۷۷﴾

(اور آسمانوں اور زمین کا غیب اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے اور قیامت کا معاملہ پس آنکھ جھپکنے کی طرح ہے یا اس سے بھی جلدی، بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر غالب ہے۔ ۷۷) (سورۃ النحل: ۷۷)

مشرکینِ مکہ کی نارسائیوں پر تنبیہ

معلوم ہوتا ہے کہ قریشِ مکہ نے اپنی عادت کے مطابق قیامت کو سوالات کا نشانہ بنایا ہے۔ اور آنحضرت ﷺ سے اصرار کیا ہے کہ اگر قیامت واقعی آنے والی ہے تو آپ اس کے دن کا تعین کریں۔ جواب میں پروردگار نے ارشاد فرمایا کہ زمین و آسمان کے پوشیدہ حقائق کا علم تو صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ یہ کائنات جو ہمارے سامنے ہے انسانوں نے ہمیشہ اس کے بارے میں کچھ نہ کچھ جاننے کی کوشش کی ہے، مگر آج تک اتنا بھی نہ جان سکے

Marfat.com

جتنا سمندر سے چڑیا اپنی چونچ میں پانی بھر لیتی ہے۔ نہ اس کی وسعت کا اندازہ ہوسکا ہے اور نہ اس کی ابتداء کی خبر ہوئی ہے۔ اسی طرح اس بات کی خبر انسانی علم سے ماوراء ہے کہ اس کائنات کا خاتمہ کب ہوگا اور کب قیامت برپا ہوگی۔ لیکن ایک بات واضح ہے کہ کائنات کا نظام وانصرام جو اپنے اندر ان گنت مخلوقات کو سمیٹے ہوئے ہے اور جس کی وسعتوں میں بے شمار کرّے محو پرواز ہیں، آج تک کبھی کسی خرابی کا شکار نہیں ہوا۔ اس کے قانون تکوین میں اس کی مخلوقات کا ایک ایک گوشہ اس طرح بندھا ہوا ہے کہ کسی کو بھی سرمو انحراف کرنے کی جرأت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہم تو صرف ان چیزوں کو جانتے ہیں جنھیں ہمارے حواس محسوس کرتے اور ہماری عقل جانتی ہے۔ لیکن کائنات کے وہ گوشے جو ہماری حدود سے ماوراء ہیں اور اس کی وہ حکمتیں جو ہمارے علم سے پوشیدہ ہیں اور اس کے وہ مقاصد جن کے حصول کے لیے کائنات رواں دواں ہے، ان میں عافیت اسی سچائی میں ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ کے حوالے کردیا جائے اور یہی وہ بات ہے جس کی طرف آیت کے پہلے جملے میں اشارہ فرمایا گیا ہے۔

جو شخص اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم کی کوئی اتھاہ نہیں اور اس کے کمال قدرت کی کوئی انتہا نہیں اور اس کی حکمت ہمیشہ نئے سے نئے رنگ میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ اور جو شخص اس بات کا بھی ادراک رکھتا ہے کہ انسان کو دنیا میں ایک امتحان کے لیے بھیجا گیا ہے۔ اس امتحان میں سرخرو ہونے کے لیے اسے عقل دی گئی ہے، قوتِ تمیز بخشی گئی ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس کی رہنمائی کے لیے کتابیں نازل کی گئی ہیں اور رسول مبعوث کیے گئے ہیں۔ چنانچہ رسولوں کا آخری رسول آگیا ہے۔ اس طرح سے سلسلۂ رسالت رک گیا۔ کتابوں کی آخری کتاب آگئی، اس طرح وحیِ الٰہی روک دی گئی۔ اس بات کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ جس امتحان کے لیے انسان کو دنیا میں بھیجا گیا تھا اس کی صف لپیٹی جانے والی ہے۔ وہ وقت دور نہیں جب ہر چیز کے خاتمے کا اعلان ہوگا اور پھر ایک وقت آئے گا جب تمام انسانوں اور جنوں کو زندگی دے کر حساب کتاب کے لیے محشر میں جمع کیا جائے گا، اسی کو قیامت کہتے ہیں۔ اگر ہر نیکی صلہ چاہتی ہے، ہر قربانی اگر اپنی قیمت مانگتی ہے، ہر ظلم اپنی تلافی چاہتا ہے، ہر زیادتی انصاف کا تقاضا کرتی ہے تو قیامت کا وقوع یقیناً اخلاق کا تقاضا ہے۔ رہی یہ بات کہ اربوں کھربوں انسانوں کا دوبارہ زندہ کرنا، پھر ان کے تمام اعمال کا جائزہ لے کر عدل واحسان کی چھلنی سے گزارنا اتنا طویل عمل ہے جس کا وقوع پذیر ہونا خلافِ عقل معلوم ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسا سوچنے والا نہ تو اللہ تعالیٰ کے علم کی وسعتوں کو جانتا ہے اور نہ اس کی بے انتہا قدرتوں کا ادراک رکھتا ہے۔ اس کے سامنے انسانی امکانات کا ایک نمونہ ہے۔ اس لیے اسی پر قیاس کرکے ہر چیز کو رد یا قبول کرتا ہے۔ اس لیے پروردگار نے اس غلطی کا ازالہ کرتے ہوئے فرمایا کہ تم قیامت کے معاملے کو کیا جانو، تمہارے اندازے اپنی جگہ لیکن اللہ تعالیٰ کی قدرت کا حال یہ ہے کہ جب وہ اس کے برپا ہونے کا حکم دے گا تو وہ پلک جھپکنے سے بھی جلدی وقوع پذیر ہوجائے گی۔ دونوں دفعہ صور پھونکے جانے کے بعد اسی تیزی سے تبدیلی آئے گی، پھر حشر برپا ہونے کے بعد اسی سرعت سے حساب کتاب ہوگا۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرف کسی محدودیت یا کمزوری کو منسوب کرتا ہے وہ درحقیقت اس کے قادرِ مطلق ہونے پر یقین نہیں رکھتا۔ اس لیے آخر میں فرمایا کہ تمہارے ہر شبے کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔

وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ۙ وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۷۸

(اور اللہ تعالیٰ نے تمھیں تمھاری ماؤں کے پیٹوں سے اس حال میں نکالا کہ تم کچھ نہیں جانتے تھے اور اس نے تمہارے لیے کان اور آنکھیں اور سوچنے والے دل بنائے تاکہ تم شکرگزار بنو۔ ۷۸) (سورۃ النحل: ۷۸)

اَلْاَفْـِٕدَةَ فؤاد کی جمع ہے، جیسے غراب کی جمع اغربہ ہے۔ **اُمَّهٰت** ام کی جمع ہے۔ قاعدے کے اعتبار سے اس کی جمع اُمّات ہونی چاہیے لیکن تاکید کے لیے ھا بڑھا دی گئی ہے۔

Marfat.com

اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا اظہار

اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ادنیٰ سا اظہار انسان کا وجود ہے۔ انسان اس کائنات کا گلِ سرسبد ہے اور اس کے سر پر خلافت کا تاج رکھا گیا ہے۔ اسے فرشتوں کا مسجود ٹھہرایا گیا ہے۔ اس کی قوتِ تسخیر کے سامنے ایک دنیا سپر ڈال چکی ہے، لیکن یہ جب دنیا میں آتا ہے تو صرف ایک مضغۂ گوشت ہوتا ہے۔ بجز بھوک کے احساس کے ہر طرح کے احساس سے عاری، نادان اتنا کہ جس ماں کے پیٹ میں 9 ماہ گزار کے آیا ہے اس تک کو نہیں پہچانتا۔ باقی مخلوقات کے بچے پیدا ہوتے ہی اپنی ماں کو پہچانتے ہیں۔ بھینس کا بچہ لڑکھڑاتا ہوا چند گھنٹوں کے بعد ماں کا پستان چوسنے لگتا ہے، بلی کے بچوں کی جیسے ہی آنکھیں کھلتی ہیں، وہ ماں کا دودھ پینے لگتے ہیں۔ مرغی کڑ کڑ کرتی ہوتی چلتی ہے اور بچے اس کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں اور دانہ دنکا چگنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن انسان کا بچہ چونکہ حواس سے بالکل محروم ہوتا ہے اس لیے وہ ہاتھ پاؤں مارنے کے سوا اور کچھ نہیں کرسکتا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے جو ربوبیت بن کے جھلکتا ہے، وہ یہ کہ ایک طرف تو ہم دیکھتے ہیں کہ بچہ اپنی ماں تک کو نہیں پہچانتا اور کسی کھانے پینے کی چیز کا ادراک نہیں رکھتا، لیکن بھوک اسے اسی طرح پریشان کرتی ہے جیسے باقی مخلوقات کے بچوں کو، تو اللہ تعالیٰ کی قدرت کا کیا کہنا کہ جیسے ہی ماں اس کی بھوک کو محسوس کر کے اسے اٹھا کر اپنے سینے سے لگاتی ہے اور اپنا پستان اس کے منہ میں ڈالتی ہے تو وہ اسے بالکل اسی طرح چوستا ہے جیسے اسے اس کی پوری ٹریننگ دی گئی ہو۔ یہ خوبصورت مضغۂ گوشت جو ہر طرح کے علم سے نابلد ہے، آخر اسے دودھ پینا کس نے سکھایا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بے بسی بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ظہور ہے۔ اور اس کا دودھ پینا بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت کا اظہار ہے۔ اور پھر یہی کچھ نہ جاننے والا بچہ عمر کے ساتھ ساتھ پہلے حواس سے نوازا جاتا ہے۔ جب حواس کے بعد دوسری رہنمائی کی ضرورت پڑتی ہے تو اللہ تعالیٰ جوہرِ عقل کا فانوس اس کے اندر جلا دیتا ہے۔ یہ حواس اور عقل بڑھتے بڑھتے انسان کو وہاں تک پہنچا دیتے ہیں جہاں انسان اپنی کمزوریاں بھول جاتا ہے۔ اس کے علم کے لیے ایک سے ایک بڑی مسند سجائی جاتی ہے اور اس کی عقل و دانش نہ جانے کس کس سے خراجِ تحسین حاصل کرتی ہے۔ جب وہ علم و دانش کی مختلف وادیوں میں ایک سند کی حیثیت حاصل کرلیتا ہے تو آخر عمر کی اس حد کو پہنچ جاتا ہے جس کو ارزل العمر کہا گیا ہے جس کے بعد انسان سب کچھ جان کر سب کچھ بھول جاتا ہے۔ یہ علم کی دنیا کا امین اور رئیس عبرت کی تصویر بن کر رہ جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص بچپن سے لے کر آخر عمر تک انسان کا مطالعہ کرے تو اسے قدم قدم پر اللہ تعالیٰ کی قدرت یاد آتی ہے۔ اگر وہ کسی حد تک بھی عرفانِ ذات کی دولت سے بہرہ ور ہو تو وہ کبھی بھی قیامت کا انکار اس لیے نہیں کرسکتا کہ قیامت واقع کیسے ہوگی، یہ تو سراسر ناممکن بات معلوم ہوتی ہے۔

انسان کی ذات اللہ تعالیٰ کی قدرت کا شاہکار ہے۔ کسی مخلوق پر اتنے احسانات نہیں کیے گئے جتنے انسان پر کیے گئے ہیں۔ اس لیے فرمایا کہ ہم نے یہ تمام احسانات اس لیے کیے تاکہ تم شکر ادا کرو کہ ہر حال میں اسی کی بندگی بجا لاؤ، اسی کے کلمے کو بالا کرو، اپنی تمام صلاحیتوں کو اسی کے دین کی سربلندی کے لیے قربان کردو۔

اَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ مُسَخَّرٰتٍ فِيْ جَوِّ السَّمَآءِ ۭ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿٧٩﴾

(کیا انھوں نے کبھی پرندوں کی طرف نہیں دیکھا کہ وہ مطیع اور فرمانبردار بن کر اڑ رہے ہیں، ان کو بس اللہ تعالیٰ ہی تھامے ہوئے ہوتا ہے، بیشک اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے ہیں۔ ۷۹) (سورۃ النحل: ۷۹)

اللہ تعالیٰ کی فضائی نعمتوں کا ذکر

اللہ تعالیٰ اپنے کمالِ قدرت اور شانِ ربوبیت کی ایک اور نشانی کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرتوں کا انکار کرنے والے اور اللہ تعالیٰ کے رسول کی دعوت پر ایمان نہ لانے والے کیا نہیں دیکھتے کہ زمین سے کوئی کنکری یا پتھر اٹھا کر آسمان کی طرف پھینکا جائے تو وہ فوراً پلٹ کر زمین پر آتا ہے، کیونکہ زمین کی کشش اسے اپنی طرف کھینچتی ہے، لیکن کس قدر عجیب بات ہے کہ پرندے فضاء میں پَر پھیلائے تیر رہے ہیں۔ کبھی

Marfat.com

پَر سمیٹ لیتے ہیں اور کبھی پھیلا دیتے ہیں لیکن کبھی زمین پر گرنے نہیں پاتے۔ سوال یہ ہے کہ انھیں گرنے سے کون روکتا ہے۔ نہ اسے فضا اپنے طور پر تھام سکتی ہے، نہ ہوا روک سکتی ہے۔ ممکن ہے آپ یہ کہیں کہ ان کے پَروں کی ساخت ایسی بنائی گئی ہے جس کی وجہ سے وہ زمین پر گرنے سے محفوظ رہتے ہیں لیکن سوال پھر اپنی جگہ ہے کہ آخر ایسے پَر کس نے عطا کیے ہیں؟ یہ اس کی قدرت کا کمال ہے کہ ہر مخلوق کو جیسا بناتا ہے ویسا ماحول دیتا ہے اور جس طرح کے ماحول میں اسے رکھتا ہے ویسی صلاحیتیں اسے عطا کرتا ہے۔ پرندے فضا میں اڑتے ہیں تو انھیں پَر عطا کیے۔ مچھلیاں پانی میں تیرتی ہیں تو انھیں تیرنا سکھایا۔ حشرات الارض کوڑے کرکٹ میں رینگتے پھرتے ہیں تو انھیں رینگنا سکھایا۔ منطقہ حارہ کا ریچھ منطقہ باردہ میں نہیں پایا جاتا اور منطقہ باردہ کا ریچھ منطقہ حارہ میں نہیں پایا جاتا۔ ہر مخلوق کو مناسب ماحول، مناسب فضا اور مناسب صلاحیتوں سے بہرہ ور فرمانا اس کی ربوبیت کا تقاضا اور اس کی کمالِ قدرت پر شاہد ہے اور اس میں ایک سے ایک بڑھ کر نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا چاہیں۔ لیکن جو شخص اندھے کی طرح بجائے عقل سے کام لینے کے دوسرے کی لاٹھی کا سہارا لیتا ہے، بجائے حیرت انگیز مخلوق کو دیکھ کر خالقِ کائنات تک پہنچنے کے راستے ہی میں بسیرا کر لیتا ہے، ایسے شخص کا نہ دنیا میں اچھا انجام ہوتا ہے اور نہ آخرت میں ہوگا۔

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْۢ بُيُوْتِكُمْ سَكَنًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ بُيُوْتًا تَسْتَخِفُّوْنَهَا يَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَيَوْمَ اِقَامَتِكُمْ ۙ وَمِنْ اَصْوَافِهَا وَاَوْبَارِهَا وَاَشْعَارِهَآ اَثَاثًا وَّمَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ ۝۸۰ (سورۃ النحل : ۸۰)

(اور اللہ تعالیٰ نے بنایا تمھارے لیے تمھارے گھروں کو آرام و سکون کی جگہ، اور بنائے تمھارے لیے جانوروں کی کھالوں سے گھر (خیمے)، جنھیں تم ہلکا پھلکا پاتے ہو، سفر کے دن بھی اور قیام کے دن بھی اور اسی نے بنائے ہیں بھیڑوں کی صوف اور اونٹوں کی اون اور بکریوں کے بالوں سے مختلف گھریلو سامان اور استعمال کی چیزیں ایک وقتِ مقرر تک۔ ۸۰)

فیضانِ ربوبیت کا ذکر

اس آیتِ کریمہ میں اپنی فیضانِ ربوبیت کا ذکر کرتے ہوئے ان چیزوں کا ذکر فرمایا ہے جو بظاہر عام سی چیزیں ہیں اور جن چیزوں سے انسان کو روز کا واسطہ ہے، لیکن ان میں ایک ایک چیز اپنے اندر افادیت کا جو پہلو رکھتی ہے اس کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب وہ چھن جاتی ہے۔ یہ انسان کی فکری کمزوری ہے کہ جو نعمتیں اسے آسانی سے میسر آ جاتی ہیں اور یا وہ انھیں ہمیشہ سے اپنے گرد و پیش میں دیکھتا چلا آیا ہے وہ ان کی قدر نہیں کرتا، لیکن جب کبھی حالات کی ابتری یا کسی اور سبب سے وہی عام نعمتیں کمیاب ہو جاتی ہیں تو وہ پھر روتا اور چیختا ہے۔ اور ان نعمتوں کی قدر اسے اپنا احساس دلاتی ہیں۔ سب سے پہلے جس نعمت کا ذکر فرمایا، وہ گھر کا سکون ہے۔ پرندے بھی اپنا گھونسلہ بنا کے رہتے ہیں اور انسان بھی گھر کو اپنی بنیادی ضرورت سمجھتا ہے لیکن چونکہ عام طور پر یہ سہولت اور یہ ضرورت میسر رہتی ہے تو کوئی اس کا ذکر تک نہیں کرتا۔ لیکن اس کی قدر ان لوگوں سے پوچھیے جن کا اپنا کوئی گھر نہیں ہوتا۔

جس طرح افراد بے گھر ہوتے ہیں، اس طرح قومیں بھی بعض دفعہ بے گھر ہوتی ہیں، ان کا کوئی وطن نہیں ہوتا اور اگر وطن یا گھر ہو بھی تو وہ سکون کا باعث نہیں ہوتا۔ اس کی مثال دیکھنا ہو تو مقبوضہ کشمیر کے مسلمانوں کو دیکھ لیجیے۔ وہ بظاہر اپنے گھر رکھتے ہیں لیکن گھروں کا سکون نصیب نہیں۔ انھیں کچھ خبر نہیں کب فوجی درندے ان کے گھروں کا سکون برباد کرتے ہوئے ان کے کسی نوجوان لڑکے یا لڑکی کو اٹھا کر لے جائیں گے اور مدافعت کرنے پر گھر کو آگ لگا دیں گے۔ فلسطینیوں کو دیکھ لیجیے، جب سے ان کی زمین پر غاصبوں نے قبضہ کیا ہے گھروں کا سکون رخصت ہو گیا ہے۔ ان میں بڑی تعداد سالہا سال سے ملکوں ملکوں ماری پھر رہی ہے اور جو لوگ فلسطین میں بظاہر گھروں میں ہیں انھیں بھی اسرائیلی درندوں نے گھروں کے سکون سے محروم کر دیا ہے۔ اور آج کا عراق اور افغانستان اس حقیقت کی منہ بولتی تصویر ہیں کہ گھر کا سکون کتنی بڑی نعمت ہے اور ظالم اگر اس سے بھی محروم کر دے تو اس سے بڑی محرومی اور کوئی نہیں ہو سکتی۔

Marfat.com

ہمارا یہ وطن جب وجود میں آیا، اب کسے یاد ہوگا کہ اس کے لیے کتنے گھر چھوڑے گئے، کتنی لاشیں راستے میں بچھائی گئیں، کتنا خون بہایا گیا اور کتنی عفتوں کے چراغ بجھے۔ اس کی ہم نے بہت بڑی قیمت ادا کی۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں ایک گھر عطا کیا، لیکن اب پھر وقت کی آندھیاں اس کی بنیادیں اکھاڑنے کے درپے ہیں۔ اپنے نادان دشمن اس کی جڑوں میں ڈائنامیٹ بچھا رہے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر دماغ اور ہر دل میں یہ احساس روشن کیا جائے کہ

کون ارباب سیاست کو یہ سمجھائے ریاض
یہ شکستہ سا مکاں جیسا بھی ہے اپنا تو ہے

عرب میں چونکہ بارشیں بہت کم ہوتی تھیں اس لیے روز روز کی قحط سالی نے بیشتر عربوں کو خانہ بدوش بنا دیا تھا۔ جب پانی کی قلت ہوتی اور جانور چارہ نہ ملنے سے مرنے لگتے تو وہ پانی اور چارے کی تلاش میں مسلسل سفر میں رہتے۔ جہاں یہ دونوں چیزیں میسر آتیں وہاں پڑاؤ ڈال دیتے۔ چونکہ یہ اکھاڑ پچھاڑ ان کا شب و روز کا معمول تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے انھیں اپنا یہ احسان یاد دلایا کہ وہ اللہ تعالیٰ ہی ہے جس نے تمھیں ایسے جانور عطا فرمائے جو تمھاری بار برداری کے کام بھی آتے ہیں۔ تم ان کا دودھ بھی پیتے ہو۔ اور جب وہ ان دونوں ضرورتوں کے قابل نہیں رہتے تو تم ان جانوروں کی کھالوں سے خیمے بناتے ہو۔ یہ اللہ تعالیٰ کا کیسا کرم ہے کہ اس نے ان جانوروں کی کھالوں کو خیموں کے لیے موزوں بنا دیا اور تمھیں اس ہنر سے بہرہ ور فرمایا۔ چنانچہ سفر کے دوران کھالوں کے بنے ہوئے خیمے تمھیں ہر طرح کی سہولت تو مہیا کرتے ہیں، سایہ بھی دیتے ہیں، دھوپ سے بھی بچاتے ہیں، بارش کو بھی روکتے ہیں لیکن جب تم ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کا ارادہ کرتے ہو تو بڑی آسانی سے اٹھائے بھی جا سکتے ہیں اور انھیں اکٹھا کرنا بھی کوئی مشکل کام نہیں۔ اگر یہ تمھارے گھر جو تمھاری آسودگی کا باعث ہیں چمڑوں کی بجائے کسی بھاری بھرکم چیز کے ہوتے تو تمھارے لیے کس قدر مشکل کا باعث بنتے۔ اور پھر اسی پر بس نہیں اللہ تعالیٰ نے تمھیں بھیڑیں عطا فرمائی ہیں جن پر صوف پیدا کیا گیا ہے اور اونٹوں کی کھالوں پر اون اگتا ہے۔ چنانچہ ان سے تم مختلف قسم کے کپڑے بناتے ہو۔ بھیڑوں کی اون سے ہر طرح کا کپڑا عرب میں بنایا جاتا تھا۔ اسی طرح اونٹوں کی اون سے خاص قسم کا کپڑا ابھی بنتا تھا اور بعض گھریلو قسم کی چیزیں بھی بنتی تھیں، بکریوں کے بال نسبتاً ملائم ہوتے ہیں، اس لیے ان سے گھر کی وہ چیزیں بنائی جاتی تھیں جن میں کھردراپن نہیں ہوتا۔

اندازہ کیجیے بدویت کا وہ زمانہ جب عرب میں تمدن نے خاطر خواہ ترقی نہیں کی تھی کس طرح اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے ان کے لیے آسان کر دیا تھا۔ انھیں محدود سطح پر زندگی کی وہ تمام سہولتیں میسر تھیں جو زندگی گزارنے کے لیے ضروری ہیں لیکن اس کے لیے انھیں دور دراز ملکوں میں سفر کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ اپنے جانوروں ہی سے وہ ضرورتیں پوری ہو جاتی تھیں اور یہی وہ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے جس کا یہاں ذکر فرمایا جا رہا ہے۔

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّمَّا خَلَقَ ظِلٰلًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْجِبَالِ اَكْنَانًا وَّجَعَلَ لَكُمْ سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ وَسَرَابِيْلَ تَقِيْكُمْ بَاْسَكُمْ ۭ كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ ۝۸۱ (سورۃ النحل : ۸۱)

(اور اللہ تعالیٰ ہی نے ان چیزوں سے جو اس نے پیدا کی ہیں تمھارے لیے سائے بنائے، اور تمھارے لیے پہاڑوں میں پناہ گاہیں بنائیں اور تمھارے لیے ایسے لباس بنائے جو تمھیں گرمی سے بچاتے ہیں اور ایسے لباس بنائے جو تمھاری جنگ میں تمھیں محفوظ رکھتے ہیں، اسی طرح وہ تم پر اپنی نعمتوں کی تکمیل کرتا ہے تاکہ تم فرمانبردار بنو۔ ۸۱)

مزید چند نعمتوں کا ذکر

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر جو نعمتیں فرمائی ہیں ان میں سے مزید چند نعمتوں کا اس آیت میں ذکر فرمایا گیا ہے۔ گزشتہ آیت میں مذکورہ نعمتوں کی طرح یہ نعمتیں بھی انسانوں کے عام استعمال کی ہیں اور اکثر لوگوں کو میسر رہتی ہیں اور ان میں سے سب سے پہلے جس نعمت کا ذکر فرمایا ہے اسے تو عام طور پر نعمت سمجھا ہی نہیں جاتا۔ لیکن جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، انسان کی کمزوری یہ ہے کہ جو نعمتیں بڑی تگ و دو اور بہت کچھ خرچ کرنے کے بعد ملتی

Marfat.com

ہیں اسے تو انسان نعمت سمجھتا ہے، اس کی حفاظت بھی کرتا ہے اور اس کا بار بار تذکرہ بھی کرتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ نعمتیں دینے والے کا ذکر پھر بھی نہیں ہوتا۔ لیکن جو نعمتیں اللہ تعالیٰ نے نہایت سہل الحصول بنادی ہیں اس کا عام طور پر تذکرہ تک نہیں ہوتا۔

سب سے پہلے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا کیا کہنا ہے وہ تو وہ ذات ہے جس نے تمہارے لیے اپنی پیدا کردہ چیزوں کے سائے بنائے۔ تم جب محنت و مشقت کرتے ہو اور اپنے گھر سے دور حصولِ رزق کے لیے تکلیفیں اٹھاتے ہو یا جب سفر کی حالت میں دھوپ کی تکلیف اٹھاتے ہو تو نہ تمھیں گھر میسر ہوتا ہے اور نہ گھر جیسی اور سہولت۔ اس دور میں آج کی طرح نہ بس سٹاپ تھے اور نہ کہیں آرام گاہیں۔ سرائے کا تصور بھی بہت دیر بعد ذہنوں میں آیا۔ تمدن سے بالکل آزاد زندگی میں موسم کی شدت اور چلچلاتی دھوپ سے بچنے کے لیے کوئی ذریعہ اس کے سوا نہ تھا کہ انھیں ٹھنڈے سائے کی نعمت عطا کی گئی۔ پہاڑوں کے دامن اور درختوں کے سائے ان کے لیے راحت و آرام کی جگہ بن گئے۔ آرام دہ اور ٹھنڈے کمرے سے نکل کر کسی درخت کے نیچے جابیٹھنا آج کے دور میں راحت بخش نہیں۔ لیکن آج بھی دیہاتیوں سے پوچھیے جہاں گرمی کے دنوں میں نہ بجلی کا پنکھا چلتا ہے اور ساون بھادوں میں نہ ہَوا اپنا دامن کھولتی ہے۔ اس وقت عمارتوں اور درختوں کے سائے دیہاتیوں کے لیے زندگی سے کم نہیں اور وسیع وعریض بڑ کے درخت کے نیچے جھولتے ہوئے جھولے کسی تفریح سے کم نہیں۔ اور یہ ایسی نعمت ہے جس کے حصول کے لیے کوئی محنت بھی نہیں کرنا پڑتی۔ جس بدنصیب سے وطن چھوٹ جاتا ہے سایہ اس کے لیے بھی اپنا دامن پھیلائے رکھتا ہے۔ ٹھیک کہا کسی نے ؎

لیٹ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے
ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے

آیتِ کریمہ میں دوسری نعمت جس کا ذکر فرمایا گیا ہے وہ پہاڑوں میں پناہ گاہیں ہیں۔ عرب کی نہایت سادہ فطری اور تمدن سے بیگانہ زندگی میں جن نعمتوں کی بڑی قدر تھی ان میں ایک پہاڑ اور اس میں پائی جانے والی پناہ گاہیں بھی تھیں۔ عرب چونکہ نہایت وحشی اور خونخوار قسم کی صفات کے حامل تھے۔ اپنی بات پر اڑ جانا اور بات بات پر لڑ جانا ان کا معمول تھا۔ جس قبیلے کے پاس افرادی قوت کی فراوانی ہوتی وہ اپنی کثرتِ تعداد کے باعث دوسرے قبیلوں پر بھاری رہتا۔ عام طور پر چھوٹے قبیلے، بڑے قبیلوں سے حلیفانہ تعلقات قائم کرکے ان کی پناہ میں آجاتے۔ لیکن اگر کبھی کوئی بڑا قبیلہ کسی چھوٹے قبیلے کو ظلم کا نشانہ بناتا اور ان کے لیے آزادانہ زندگی گزارنا ناممکن بنادیتا تو پھر ان کے لیے پہاڑوں پر چڑھ جانا اور اس کی پناہ گاہوں میں شب و روز بسر کرنا ان کے لیے اللہ تعالیٰ کا بڑا انعام تھا۔ پہاڑ کی بلندی پر پتھروں سے مسلح ہوکر بڑی قوت کا بھی راستہ روکا جاسکتا تھا اور پہاڑوں میں غاروں اور پناہ گاہوں میں ضروری صفائی کے بعد زندگی گزاری جاسکتی تھی اور موسم کے شدائد سے بچا جاسکتا تھا۔ اسی لیے پروردگار نے ان کی ضرورتوں کو سامنے رکھتے ہوئے اپنی اس نعمت کا ذکر فرمایا۔

اس آیت میں جس تیسری نعمت کا ذکر فرمایا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے ایسا لباس اور ایسی پوشاک مہیا فرمائی جو گرمی سے تمھاری حفاظت کرتی ہے اور جنگ کی ہولناکی میں تلوار کی کاٹ کو روکتی ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ پوشاک کے حوالے سے گرمی سے بچاؤ کا ذکر تو فرمایا لیکن سردی کا ذکر نہیں کیا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ تمدن جس رفتار سے آگے بڑھا ہے اس میں سردی سے بچاؤ کا درجہ فروتر سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ کسی چیز میں بھی لپٹ کر سردی سے بچا جاسکتا ہے لیکن گرمی سے بچاؤ کے لیے لباس کا وجود میں آنا یہ تمدن کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ ایک اہم درجے کی چیز کا ذکر کرنے کے بعد کمتر چیز کے ذکر کی ضرورت نہیں رہتی۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ عرب میں گرمیوں کے موسم میں سب سے خطرناک چیز بادِ سموم کا چلنا ہے۔ اس ہَوا میں آگ کی تیزی ہوتی ہے۔ اس لیے یہ جسم کو جھلس کے رکھ دیتی ہے۔ عرب سفر کے دوران سب سے زیادہ اسی کے لیے فکرمند ہوتے تھے۔ اس لیے انھوں نے اپنے لباس میں اس سے بچاؤ کا انتظام کیا۔ تہبند اور لمبا کرتا، سر پر بڑا رومال جسے وہ پھیلا کر اپنے سر، گردن اور چہرے پر لپیٹ لیتے تھے تاکہ ان جگہوں کو ہَوا کے گرم تھپیڑوں سے محفوظ رکھا جاسکے اور سر کے اوپر رومال کو گرنے سے روکنے کے لیے ایک رسہ نما چیز سر پر باندھی جاتی تھی۔ رومال کو آج کل غترہ کہتے ہیں اور اس رسے کو عقال کہا جاتا ہے۔ عقال دراصل ایک موٹی رسی تھی جس سے اونٹ کا گھٹنا باندھا جاتا تھا تاکہ وہ بادِ صرصر کے تھپیڑوں سے تنگ آکر بھاگ نہ کھڑا ہو۔ جب بادِ صرصر چلنا شروع ہوتی تو عرب اپنے اونٹوں کو کسی پہاڑ یا ٹیلے کے دامن میں نشیبی جگہ میں ایک دائرے میں ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ کر بٹھاتے اور خود ان کے درمیان اپنے کپڑوں میں لپٹ کر لیٹ جاتے اور زائد کپڑے اونٹوں کے چہروں پر باندھ دیے جاتے۔ اس طرح سے موسم گرما میں بادِ صرصر سے بچاؤ کی تدبیر کی جاتی تھی۔ اور اسی تدبیر اور اسی ذریعے پر جسم اور جان کی بقا کا دارومدار اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس نعمت کا بطورِ خاص ذکر فرمایا۔

Marfat.com

مزید فرمایا کہ ہم نے ایسا لباس بھی عطا فرمایا جو تمھاری جنگ کی ہولناکیوں میں حفاظت کرتا ہے۔ اس سے مراد زرہ بکتر ہے۔ عرب لوہے سے زرہ بنانے کی صنعت پر قابو پا چکے تھے۔ یہ صنعت اگرچہ حضرت ہود علیہ السلام کے زمانے سے بھی پہلے پائی جاتی تھی جسے داوٗد علیہ السلام نے بام عروج تک پہنچایا۔ عرب اس سے بخوبی واقف تھے۔ اکہری اور دوہری ہر طرح کی زرہ بنانے پر قادر تھے اور یہی زرہ تھی جو جنگ میں ان کے لیے سب سے بڑا بچاؤ کا ذریعہ تھی۔ تلوار کی کاٹ اس پر کند ہو جاتی تھی۔ اور بعض دفعہ تلوار کے کاری وار سے انسان محفوظ رہتا تھا۔

ان عمومی نعمتوں کا ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ تم جس طرح درجہ بدرجہ تمدن کی سیڑھیاں چڑھ رہے ہو اس سے اللہ تعالیٰ تم پر اپنی نعمتوں کی تکمیل فرما رہا ہے۔ چنانچہ نزولِ قرآن کے چند سال بعد جب عرب میں اسلام کی حکومت قائم ہوگئی اور پھر یہ قدوسی صفات انسان اللہ تعالیٰ کی رحمت بن کر زمین کے بڑے حصے پر چھا گئے جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی وہ نعمتیں جو صرف سلاطین اور امراء کا حصہ تھیں، غریبوں کے گھروں میں بھی پہنچ گئیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے انسان آسودہ زندگی سے آراستہ ہو گیا اور نعمتوں کی جس تکمیل کی خبر دی گئی تھی وہ رفتہ رفتہ اپنے انجام کو پہنچ گئی لیکن اس کا جو نتیجہ سامنے آنا چاہیے تھا کہ انسان اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق اس طرح زندگی گزارنے لگے کہ جس میں وہ اللہ تعالیٰ ہی کا ہو کر رہ جائے اس کے لیے انسان آج بھی چشم براہ ہے۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَیْکَ الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ ﴿۸۲﴾ (سورۃ النحل : ۸۲)

(پھر اگر وہ اعراض کریں تو آپ کی ذمہ داری صاف صاف پہنچا دینا ہے۔ ۸۲)

پروردگار نے گزشتہ آیات میں جس جزرسی کے ساتھ انسانوں پر اپنی نعمتوں کا ذکر فرمایا ہے اس کے بعد اگر انسانوں سے پوچھا جائے کہ تم بتاؤ تمھارے خیال میں ان نعمتوں کا عطا کرنے والا کیا اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور بھی ہے۔ وہ یقیناً اپنے کفر کے باوجود اعتراف کریں گے کہ اللہ تعالیٰ ہی نے ان تمام نعمتوں کو پیدا فرمایا ہے۔ اس کے بعد برجستہ ایک اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ اگر ان تمام نعمتوں کا خالق اللہ تعالیٰ ہی ہے تو پھر تم نے دوسروں کو اس کا شریک کیوں بنا رکھا ہے اور اللہ تعالیٰ کے علاوہ جن کی تم پوجا کرتے ہو اس کا تمھارے یہاں کیا جواز ہے۔ لیکن اس سوال کے جواب میں بھی اگر وہ اپنے شرک پر اڑے رہیں اور وہ کسی طرح اپنے رویے کو بدلنے کے لیے تیار نہ ہوں تو پھر آنحضرت ﷺ کو تسلی دیتے ہوئے آپ کی ذمہ داری کی انتہا کو بیان فرمایا ہے جس کے بعد آپؐ سے کسی قسم کی بازپرس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپؐ کی ذمہ داری صرف یہ ہے کہ آپ لوگوں تک اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچا دیں اور اس طرح پہنچا دیں کہ کوئی بات ان کے لیے نہ مخفی رہے اور نہ مبہم رہے۔

یَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ یُنْكِرُوْنَهَا وَاَكْثَرُهُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۳﴾ (سورۃ النحل : ۸۳)

(یہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو پہچانتے ہیں پھر اس کا انکار کرتے ہیں اور ان میں اکثر ناشکرے ہیں۔ ۸۳)

یہ کفارِ مکہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو خوب پہچانتے ہیں، وہ ایسے بیوقوف اور کودن نہیں کہ یہ بھی نہ جانتے ہوں کہ ان نعمتوں کا دینے والا اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور ہے۔ البتہ یہ بات تعجب خیز ضرور ہے کہ وہ اس کا انکار کرتے ہیں۔ انکار دراصل اس بات کا نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ نعمتیں پیدا فرمائی ہیں اور وہی ان کا عطا کرنے والا بھی ہے۔ انکار اس بات کا ہے کہ نعمتوں کا عطا کرنے والا تنہا اللہ تعالیٰ نہیں بلکہ درمیان میں کچھ واسطے ہیں جن کی مدد سے ہم تک ان نعمتوں کا پہنچنا ممکن ہوا ہے کیونکہ ہم نے جن کو آج تک پکارا اور جن کی ہم پوجا کرتے رہے ان بزرگوں اور دیوتاؤں کے کرم سے یہ نعمتیں ہم تک پہنچیں۔ اگر وہ اس میں مداخلت نہ کرتے تو ممکن تھا کہ ہم ان نعمتوں سے نوازے نہ جاتے۔ اس لیے جہاں ہم پر ان نعمتوں کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کا شکر لازم ہے اس سے بڑھ کر ان بزرگوں اور دیوتاؤں کا شکر لازم ہے۔

حیرت ہوتی ہے کہ انسان جب بگڑ جاتا ہے تو کس طرح سامنے کی چیز کا بھی انکار کر دیتا ہے۔ کفار جانتے ہیں کہ یہ نعمتیں کہاں سے آئی ہیں لیکن اس کے باوجود درمیانی واسطوں کو دخیل مان کر اپنے شرک کا جواز پیدا کر لیا۔

Marfat.com

وَيَوْمَ نَبْعَثُ مِن كُلِّ أُمَّةٍ شَهِيدًا ثُمَّ لَا
يُؤْذَنُ لِلَّذِينَ كَفَرُوا وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُونَ ﴿٨٤﴾ وَإِذَا رَأَى الَّذِينَ
ظَلَمُوا الْعَذَابَ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ وَلَا هُمْ يُنظَرُونَ ﴿٨٥﴾
وَإِذَا رَأَى الَّذِينَ أَشْرَكُوا شُرَكَاءَهُمْ قَالُوا رَبَّنَا هَٰؤُلَاءِ شُرَكَاؤُنَا
الَّذِينَ كُنَّا نَدْعُو مِن دُونِكَ ۖ فَأَلْقَوْا إِلَيْهِمُ الْقَوْلَ إِنَّكُمْ
لَكَاذِبُونَ ﴿٨٦﴾ وَأَلْقَوْا إِلَى اللَّهِ يَوْمَئِذٍ السَّلَمَ وَضَلَّ عَنْهُم
مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿٨٧﴾ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَن سَبِيلِ
اللَّهِ زِدْنَاهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوا يُفْسِدُونَ ﴿٨٨﴾
وَيَوْمَ نَبْعَثُ فِي كُلِّ أُمَّةٍ شَهِيدًا عَلَيْهِم مِّنْ أَنفُسِهِمْ
وَجِئْنَا بِكَ شَهِيدًا عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ ۚ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ
تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً وَبُشْرَىٰ لِلْمُسْلِمِينَ ﴿٨٩﴾

رکوع: ۱۲ (اور یاد کرو جس دن ہم ہر امت میں سے گواہ اٹھائیں گے، پھر جن لوگوں نے کفر کیا ہوگا انھیں عذر پیش کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی اور نہ ان سے توبہ کا مطالبہ کیا جائے گا۔ ۸۴) اور جب وہ لوگ جنھوں نے ظلم کیا ہوگا عذاب کو دیکھ لیں گے تو نہ وہ عذاب ان سے ہلکا کیا جائے گا اور نہ وہ مہلت دیے جائیں گے۔ ۸۵) اور جب وہ لوگ جنھوں نے شرک کیا ہے اپنے شریکوں کو دیکھیں گے تو پکار اٹھیں گے کہ اے ہمارے رب یہی ہمارے وہ شرکاء ہیں جن کو ہم تجھے چھوڑ کر پکارتے رہے تو وہ شریک انھیں جواب دیں گے یقیناً تم جھوٹ بول رہے ہو۔ ۸۶) وہ اس دن اللہ کے آگے سپر ڈال دیں گے اور جو کچھ وہ افترا کرتے رہے تھے وہ سب ہوا ہو جائے گا۔ ۸۷) جن لوگوں نے کفر کیا اور دوسروں کو اللہ تعالیٰ کے راستے سے روکا ہم ان کے عذاب پر عذاب کا اضافہ کریں گے، اس وجہ سے کہ وہ فتنہ و فساد برپا کیا کرتے تھے۔ ۸۸) اور یاد کرو جس دن ہم ہر امت میں سے ایک گواہ ان پر انہی میں سے اٹھائیں گے اور آپؐ کو ان لوگوں پر گواہ بنا کر لائیں گے، اور ہم نے آپؐ پر کتاب اتاری ہے ہر چیز کو کھول دینے کے لیے اور وہ ہدایت اور رحمت اور بشارت ہے فرمانبرداروں کے لیے۔ ۸۹)

Marfat.com

وَيَوْمَ نَبْعَثُ مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ شَهِيدًا ثُمَّ لَا يُؤْذَنُ لِلَّذِينَ كَفَرُوا وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُونَ ﴿٨٤﴾

(اور یاد کرو جس دن ہم ہر امت میں سے گواہ اٹھائیں گے، پھر جن لوگوں نے کفر کیا ہوگا انھیں عذر پیش کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی اور نہ ان سے توبہ کا مطالبہ کیا جائے گا۔ ۸۴) (سورۃ النحل:۸۴)

اس آیتِ کریمہ میں تذکرہ اگرچہ دوسری امتوں کا ہو رہا ہے لیکن درحقیقت روئے سخن کفارِ مکہ ہی کی طرف ہے اور یہاں جس امت کا ذکر کیا جا رہا ہے جس پر ہر رسول کو بطورِ گواہ اٹھایا جائے گا اس سے مراد امتِ دعوت ہے، امتِ استجابت نہیں۔ یعنی اس سے وہ امت مراد ہے جس کی طرف رسول مبعوث ہوتا ہے اور اس کی ہدایت اور اصلاح کے لیے بھیجا جاتا ہے۔

رسولؑ اتمامِ حجت کا آخری ذریعہ ہے

اس آیت میں کہنا یہ مقصود ہے کہ اے مشرکینِ مکہ تم جو سابقہ بگڑی ہوئی امتوں کی طرح اللہ تعالیٰ کے نبی کی دعوت پر کان دھرنے کی بجائے ہر طرح کی مخالفت پر اتر آئے ہو اور اب تمھاری مخالفت اذیت رسانی کی آخری حدوں کو چھو رہی ہے۔ کاش تم چشمِ تصور سے دیکھ سکو کہ قیامت کے دن جب تمھیں اللہ تعالیٰ کے روبرو حاضر ہونا پڑے گا اور تم دیکھو گے کہ امتیں الگ الگ اپنے اپنے مواخذے کے لیے کھڑی ہوں گی تو اللہ تعالیٰ ہر اس امت کو جس نے رسول کی بات ماننے سے انکار کیا اپنے سامنے جوابدہی کے لیے بلائے گا اور ان سے پوچھے گا کہ بتاؤ تم نے میرے رسولوں کی دعوت قبول کرنے سے انکار کیوں کیا، تو وہ جواب میں ہزار طرح کے عذر پیش کریں گے۔ کہیں انکار سے کام لیں گے، کہیں پس و پیش سے، کہیں جھوٹ بولیں گے ہر ممکن طریقے سے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کریں گے تو اللہ تعالیٰ ان کے تمام اعذار کو غلط ثابت کرنے کے لیے ان کی طرف بھیجے ہوئے رسولوں کو بطور گواہ اٹھائیں گے اور ان سے پوچھیں گے کہ اب بتائیں کہ آپ نے اللہ تعالیٰ کا دین اور اس کا پیغام ان لوگوں تک پہنچایا تھا یا نہیں۔ چنانچہ رسول کی گواہی پر ان کا مقدمہ فیصل ہو جائے گا۔ اب وہ اس پر کچھ چیخ و پکار کرنا چاہیں گے۔ ہو سکتا ہے رحم و مروت کی بھیک مانگیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ رسول کی گواہی چونکہ آخری اور حتمی ہوگی اور اسی پر فیصلے کا انحصار ہوگا تو انھیں اس گواہی کے بعد ہر طرح کی زبان کھولنے سے روک دیا جائے گا۔ پھر آخری کوشش ان کی یہ ہوگی کہ ہمیں شاید معافی مانگنے کا موقع دے دیا جائے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان سے یہ فرمائش بھی نہیں کی جائے گی کہ تم اپنے جرائم کا اعتراف کر کے اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کی کوشش کرو۔ اسی کو عربی زبان میں استعتاب کہتے ہیں۔

مشرکینِ مکہ کو اس منظر کشی سے یہ بتانا مقصود ہے کہ تم حد سے بڑھنے کی کوشش نہ کرو۔ جو کچھ دوسری امتوں کے ساتھ پیش آنے والا ہے تمھارے ساتھ بھی وہی پیش آئے گا۔ تمھارا فیصلہ بھی نبی کریم ﷺ کی گواہی پر ہوگا۔ آج تم بڑھ چڑھ کر باتیں بنانے کی کوشش کر رہے ہو لیکن وہاں تمھاری یہ ساری کوششیں بیکار ثابت ہوں گی۔

وَإِذَا رَأَى الَّذِينَ ظَلَمُوا الْعَذَابَ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ وَلَا هُمْ يُنْظَرُونَ ﴿٨٥﴾

(اور جب وہ لوگ جنھوں نے ظلم کیا ہوگا عذاب کو دیکھ لیں گے تو نہ وہ عذاب ان سے ہلکا کیا جائے گا اور نہ وہ مہلت دیے جائیں گے۔ ۸۵) (سورۃ النحل:۸۵)

خودسروں کا انجام

یہ آج کے خودسر اور سرکش لوگ جو رسول کی دعوت کا نام سننے کے بھی روادار نہیں قیامت کو جب اپنے سامنے بھڑکتا ہوا جہنم دیکھیں گے تو ان کے پتے پانی ہونے لگیں گے۔ وہ کوشش کریں گے کہ عذاب اگر ٹل نہیں سکتا تو کسی طرح اس میں تخفیف ہو جائے تو کسی طرح کی تخفیف نہیں ہونے پائے گی حالانکہ دنیا کا کوئی عذاب ایسا نہیں جس میں وقت کے ساتھ ساتھ تخفیف نہ ہوتی ہو۔ تخفیف کمیت میں بھی ہوتی ہے اور کیفیت میں

Marfat.com

بھی۔ جو دن گزرتا جاتا ہے وہ عذاب سے منہا ہوتا جاتا ہے۔ اسی طرح وقت کے ساتھ ساتھ اس کی شدت میں بھی کمی آتی جاتی ہے لیکن یہ عجیب عذاب ہوگا کہ جیسے جیسے وقت گزرے گا عذاب کے ماہ وسال میں اضافہ ہوتا جائے گا اور شدت میں اور شدت آتی جائے گی۔ اور یہ بھی نہیں ہو سکے گا کہ انھیں تھوڑی بہت مہلت دے دی جائے۔ فیصلہ ہوتے ہی یہ لوگ اپنے انجام کے حوالے کر دیے جائیں گے اور پھر وہاں کے سخت گیر نگرانوں سے ان کو کبھی کوئی رعایت نہیں ملے گی۔

وَاِذَا رَاَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا شُرَكَآءَهُمْ قَالُوْا رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ شُرَكَآؤُنَا الَّذِيْنَ كُنَّا نَدْعُوْا مِنْ دُوْنِكَ ۚ فَاَلْقَوْا اِلَيْهِمُ الْقَوْلَ اِنَّكُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۚ ﴿٨٦﴾ (سورۃ النحل : ٨٦)

(اور جب وہ لوگ جنھوں نے شرک کیا ہے اپنے شریکوں کو دیکھیں گے تو پکار اٹھیں گے کہ اے ہمارے رب یہی ہمارے وہ شرکاء ہیں جن کو ہم تجھے چھوڑ کر پکارتے رہے تو وہ شریک انھیں جواب دیں گے یقیناً تم جھوٹ بول رہے ہو۔ ٨٦)

مشرکین اور شریکوں میں تو تکار

اس آیتِ کریمہ میں مشرکین سے ایک ایسی بات کہی جا رہی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قیامت کے دن مشرکین پر جو مصیبت پڑنے والی ہے وہ صرف عذاب ہی کی شکل میں نہیں ہوگی بلکہ جگ ہنسائی اور رسوائی کی شکل میں بھی ہوگی۔ جب وہ اپنے انجام کی طرف بڑھ رہے ہوں گے تو اچانک ان کی نظر پڑے گی کہ ایک طرف سے ان لوگوں کو ہانکتے ہوئے لایا جا رہا ہے جو دنیا میں انھیں اطمینان دلاتے رہے کہ تمھیں آخرت کی کوئی فکر نہیں ہونی چاہیے، ہم آخرت کی ضمانت دیتے ہیں۔ ہمارا کوئی دامن گرفتہ آخرت میں پکڑا نہیں جائے گا۔ ہمارا نام اور ہماری ذات آخرت میں کامیابی کا ذریعہ ہے۔ چنانچہ مشرکین نے یہ سمجھ کر کہ ہماری دنیوی اور اخروی کامیابیاں صرف ان شریکوں کے دم قدم سے ہیں تو زندگی بھر ان کی پوجا کی، ان کی اطاعت کی، ان کے پیچھے چلتے رہے اور انھی کی خدمت بجالاتے رہے۔ چنانچہ جیسے ہی ان کو دیکھیں گے کہ وہ بھی ہماری طرح اپنے گناہوں کی شامت میں پکڑے ہوئے ہیں تو چیختے ہوئے اپنے رب سے عرض کریں گے کہ اے ہمارے رب! یہی ہیں وہ لوگ جن کو ہم دنیا میں تیرے سوا پکارا کرتے تھے۔ انھیں کی ہدایت کے مطابق زندگی گزارتے تھے۔ ہماری گمراہی کا اصل سبب یہ ہیں۔ انھوں نے ہمیں راہ راست سے بھٹکائے رکھا۔ ہم ان پر اعتماد کرتے رہے اور یہ ہمیں گمراہ کرتے رہے۔ لیکن جیسے ہی وہ شرکاء ان کے الزامات کو سنیں گے تو وہ سختی سے ان کی باتوں کو جھٹک دیں گے اور صاف صاف کہیں گے کہ ہم نے تمھیں بالکل نہیں بہکایا، تم جھوٹ بولتے ہو۔ اس تردید کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ان کے شرک سے انکار کریں گے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے اگر اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہمیں شریک ٹھہرایا تو وہ ہمارے کہنے پر نہیں بلکہ یہ سب کچھ تمھارے اپنے خیالات کا فساد ہے، ہم نے تمھیں دیکھا تک نہیں لیکن تم نے نہ جانے کس طرح ہمیں اللہ تعالیٰ کا شریک بنا لیا ہے۔

وَاَلْقَوْا اِلَى اللّٰهِ يَوْمَئِذِ ۨ السَّلَمَ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿٨٧﴾ (سورۃ النحل : ٨٧)

(وہ اس دن اللہ تعالیٰ کے آگے سپر ڈال دیں گے اور جو کچھ وہ افترا کرتے رہے تھے وہ سب ہوا ہو جائے گا۔ ٨٧)

غور فرمایئے، مشرکین کا معاملہ آخرت میں عجیب صورت اختیار کر جائے گا۔ ان لوگوں نے زندگی بھر جن کے سہارے پر شرک کیا اور اللہ تعالیٰ کے نبیوں کی دعوت کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا اور اپنی ہر مشکل میں انھیں دیویوں اور دیوتاؤں کو پکارا اور زندگی بھر اسی خوش فہمی میں مبتلا رہے کہ ہمیں جو ملتا ہے انھیں بتوں یا انھیں دیوتاؤں کے توسل سے ملتا ہے لیکن اب جبکہ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے عجیب منظر دیکھیں گے جسے ہلکے سے ہلکے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے۔

توقع تھی وہ جن سے خستگی میں داد پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ کشتۂ تیغ ستم نکلے

Marfat.com

انھوں نے صاف کہہ دیا کہ تم جھوٹ بولتے ہو، ہم نے تم سے کب کہا تھا کہ تم ہماری پوجا کیا کرو۔ اور ہم قیامت کے دن تمھیں بچا لیں گے۔ اس پر مزید ستم یہ ہوگا کہ ان کے انکار سے ان کے عقیدے کا بھرم بھی کھل جائے گا جو انھیں اپنے آباؤ اجداد سے ورثے میں ملا تھا کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کے علاوہ جن کی پوجا شروع کر رکھی ہے یا جن کو ہم مصیبتوں میں پکارتے ہیں یہ ہمارا اپنا فیصلہ نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے انھیں اپنے اختیارات میں شریک کر رکھا ہے اور اللہ تعالیٰ ہی نے ہمیں اس کی اجازت دے رکھی ہے لیکن اب جبکہ یہ سارے پردے اٹھ جائیں گے تو وہ بازی ہارے ہوئے جواریے کی طرح اپنے حواس کھو بیٹھیں گے اور ہر طرح کی امید کا دامن چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کے سامنے سپر ڈال دیں گے اور ہر سہارا پادر ہوا ہو کر رہ جائے گا۔

اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ زِدْنٰهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا يُفْسِدُوْنَ ﴿۸۸﴾

(جن لوگوں نے کفر کیا اور دوسروں کو اللہ تعالیٰ کے راستے سے روکا ہم ان کے عذاب پر عذاب کا اضافہ کریں گے، اس وجہ سے کہ وہ فتنہ و فساد برپا کیا کرتے تھے۔ ۸۸) (سورۃ النحل:۸۸)

مشرکوں کے لیڈروں کے لیے مزید عذاب

جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے رسول کی دعوت کو ماننے سے انکار کر دیا اور اسی کفر کی حالت میں آخرت کو سدھار گئے انھیں تو اپنے کفر کی سزا ملے گی اور وہ سزا بھی پتہ کو پانی کر دینے والی ہے، لیکن جن لوگوں نے نہ صرف کہ اسلام قبول نہیں کیا بلکہ اپنی امکانی حد تک دوسروں کو بھی گمراہ کرنے کی کوشش کی اور ہر ممکن طریقے سے انھیں اسلام کی طرف آنے سے روکا۔ غلط فہمیاں پیدا کیں، الزامات کی دھول اڑائی، اپنا اثر و رسوخ استعمال کیا، مسلمانوں کو اذیتیں پہنچا کر دوسروں کو ہراساں کر دیا۔ یہ وہ کفار کے لیڈر ہیں جنھیں ان کے جرائم کے مطابق دوہری سزا ملے گی۔ کفر کی سزا تو دوسرے کفار کی طرح ہوگی لیکن دوسرے لوگوں کو گمراہ کرنے کی سزا اس سزا سے زائد ہوگی۔ کفر کی سزا ہمیشہ جہنم میں رہنا ہے اور اس سے زائد سزا کیا ہوگی یہ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ ابدی جہنم سب کے لیے یکساں ہوگا۔ البتہ یہ بات سمجھ میں آنے والی ہے کہ ایسے لوگوں کو عذاب بھی ملے اور ساتھ ساتھ رسوائی بھی ہو۔ اور دوسری صورت یہ ہے کہ عذاب میں شدت دوسرے لوگوں سے کہیں زیادہ ہو اور یہ دونوں صورتیں ایک ساتھ بھی ممکن ہیں۔ جہاں تک عذاب کی شدت کا تعلق ہے حدیث شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ جہنم کی ہر وادی کا عذاب شدت کے اعتبار سے دوسری وادی سے مختلف ہے۔ اسی طرح بظاہر تو اس میں آگ بھڑکتی ہے لیکن جہنم کی آگ اپنی تپش اور حدت میں یکساں نہیں۔ جہنم میں ایسی وادیاں بھی ہیں جن سے دوسری وادیاں پناہ مانگتی ہیں۔ اور ایسی آگ بھی ہے کہ جس کی ایک لپٹ سمندروں کا پانی بھاپ میں تبدیل کر دے۔ صورت کچھ بھی ہو یہ ایک حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ انصاف سے کام لے گا۔ جو کافروں کو عذاب دیا جائے گا وہ یقیناً ان کے سرداروں کو دیے جانے والے عذاب سے بہت ہلکا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی پناہ میں رکھے۔

اس آیت کے آخر میں سردارانِ کفار کی ایک خاص خصلت کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے جس کی وجہ سے وہ اس کے مستحق ٹھہرے ہیں کہ انھیں عام کفار کی نسبت کہیں زیادہ سزا دی جائے۔ اس خصلت کو یہاں فساد سے تعبیر فرمایا ہے۔ یوں تو کفر بجائے خود فساد ہے، فساد کی علامت ہے اور فساد کا ذریعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے احکام کو نہ ماننا بجائے خود اس کے خلاف بغاوت اور سرکشی ہے لیکن اس کے متوازی کسی اور کے احکام کو منوانا اور لوگوں پر اسے نافذ کرنا یہ اس سے بڑھ کر فساد کی شکل ہے۔ سردارانِ قریش صرف اسی بات پر مصر نہیں ہوتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے رسولؐ کی دعوت کو نہ مانا جائے بلکہ ان کا اصرار یہ بھی تھا کہ ہم جو اپنی ایک خانہ ساز شریعت بنا چکے ہیں۔ تحلیل و تحریم کا حق وہ اللہ تعالیٰ سے چھین کر دوسری قوتوں کو الاٹ کر چکے ہیں۔ قربانیوں تک میں دوسری قوتیں شریک ہو چکی ہیں۔ یہی وہ فساد کی چند در چند شکلیں ہیں جس نے انسانیت کی قسمت کو ایک سوالیہ نشان بنا دیا تھا۔

Marfat.com

وَيَوْمَ نَبْعَثُ فِي كُلِّ أُمَّةٍ شَهِيدًا عَلَيْهِم مِّنْ أَنفُسِهِمْ وَجِئْنَا بِكَ شَهِيدًا عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ ۚ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً وَبُشْرَىٰ لِلْمُسْلِمِينَ ﴿٨٩﴾ (سورة النحل : ۸۹)

(اور یاد کرو جس دن ہم ہر امت میں سے ایک گواہ ان پر انہی میں سے اٹھائیں گے اور آپؐ کو ان لوگوں پر گواہ بنا کر لائیں گے، اور ہم نے آپؐ پر کتاب اتاری ہے ہر چیز کو کھول دینے کے لیے اور وہ ہدایت اور رحمت اور بشارت ہے فرمانبرداروں کے لیے۔ ۸۹)

اس آیت میں جو مضمون بیان کیا گیا ہے وہ اس سے پہلے آیت نمبر 84 میں گزر چکا ہے۔ البتہ فرق دونوں میں یہ ہے کہ گزشتہ آیت میں ذکر دوسری امتوں اور ان کی طرف مبعوث کیے جانے والے رسولوں کا تھا۔ خطاب بظاہر انھیں سے تھا لیکن روئے سخن قریشِ مکہ کی طرف تھا۔ گویا قریشِ مکہ کو در حدیثِ دیگراں کے انداز میں بات سمجھائی جارہی تھی۔ اب اس آیتِ کریمہ میں براہ راست آنحضرت ﷺ سے خطاب کر کے فرمایا گیا ہے کہ جس وقت ہم دوسری امتوں پر گواہی کے لیے رسولوں کو کھڑا کریں گے اسی وقت آپؐ کو ہم اس امت پر گواہ کے طور پر لائیں گے۔ آپؐ براہ راست چونکہ اہلِ عرب کی طرف مبعوث ہوئے ہیں اس لیے آپؐ کی گواہی اہلِ عرب پر ہوگی کہ میں نے ان تک اللہ تعالیٰ کا دین بے کم و کاست پہنچا دیا ہے اور میں نے امانت کا حق ادا کر دیا ہے اور ان کے ساتھ خیر خواہی کرنے میں، میں نے کوئی کمی نہیں چھوڑی ہے۔ اس گواہی کے بعد جو لوگ اہلِ عرب میں سے ایمان نہیں لائے وہ پکڑے جائیں گے اور جو ایمان لا چکے اور دین کا حق ادا کیا وہ اپنے بہتر انجام کو پہنچیں گے اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے شادکام ہوں گے۔

آپؐ کی نبوت و رسالت نہ وقتی ہے نہ محدود۔ یعنی نہ تو آپؐ کسی خاص قوم کی طرف آئے ہیں اور نہ آپؐ ایک وقت کے لیے نبوت کے فرائض ادا کرنے کے لیے تشریف لائے ہیں بلکہ آپؐ کی رسالت تمام نوعِ انسانی کے لیے اور قیامت تک کے لیے ہے۔ آپؐ کی گواہی اہلِ عرب تک تو معاملے کو صاف کر دے گی اور اللہ تعالیٰ کی حجت تمام کر دے گی لیکن وہ لوگ جو جزیرۂ عرب سے باہر رہتے ہیں یا جو اگلی نسلوں میں پیدا ہوں گے ان کے بارے میں گواہی کون دے گا کیونکہ آپؐ کے بعد نہ کوئی نبی آئے گا اور نہ رسول آئے گا۔ چنانچہ اس ذمہ داری کا بار اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کی امت پر ڈالا اور انھیں شہداء علی الناس قرار دیا۔ چنانچہ اس پر ہم سورۃ البقرہ میں جو نوٹ لکھ چکے ہیں اس کا اعادہ مناسب سمجھتے ہیں۔

امت وسط کا فریضۂ منصبی شہادتِ حق

لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا ''امتِ محمدیہ کو ایک معتدل اور بہترین امت اس لیے بنایا ہے تاکہ وہ لوگوں پر حق کے گواہ بنیں۔'' یہ اس امت کا فریضۂ منصبی اور اس کے قیام کی ضرورت کا بیان ہے۔ اسی منصب پر بنی اسرائیل کو فائز کیا گیا تھا۔ انھوں نے مسلسل اللہ تعالیٰ سے کیے گئے عہد و پیمان توڑے۔ اس کی شریعت میں تبدیلیاں کیں، اس کی صراطِ مستقیم گم کر دی اور اس کے مقرر کیے ہوئے قبلہ سے منحرف ہو گئے اور جن شہادتوں کے وہ امین بنائے گئے تھے ان شہادتوں کا حق ادا کرنے سے منحرف ہو گئے۔ ایسی صورتحال میں نوعِ انسانی کی سب سے پہلی اور سب سے بڑی ضرورت اگر کوئی ہو سکتی تھی تو وہ یہی تھی کہ اللہ تعالیٰ ایک ایسی امت برپا کرے جو اللہ تعالیٰ کی سیدھی راہ پر قائم ہو جو خود عدل کی تصویر ہو، اور دنیا میں عدل قائم کرنے کے لیے اٹھے۔ اسی عدل و احسان کو قائم کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے جو دین بھیجا ہے اس دین کی خود بھی عامل بنے اور قیامت تک لوگوں کے سامنے اس دین کی گواہی بھی دے۔ سب سے پہلے اسی گواہی کے منصب پر اللہ تعالیٰ کے رسولؐ کو کھڑا کیا گیا تھا کہ ان کا طریقہ اور عمل امت کے لیے نمونہ بھی ٹھہرے اور سنت بھی بنے۔ آیئے اب دیکھتے ہیں کہ انھوں نے دنیا میں دین کی اس گواہی کا فرض کیسے انجام دیا۔ جب آپؐ دنیا میں نبوت دے کر مبعوث کیے گئے تو پوری دنیا میں ایک شخص بھی اللہ تعالیٰ کو ماننے والا، اس کی اطاعت کرنے والا اور اپنی زندگی کو اس کے احکام کے مطابق گزارنے والا موجود نہیں تھا۔ آپؐ نے جب لوگوں کے سامنے گواہی کا حق ادا کرتے ہوئے اعلان فرمایا کہ لوگو! اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہی حاکمِ حقیقی اس کائنات اور تم سب کا اصل مالک اور آقا ہے۔ تم اسی کا رزق کھاتے ہو، اسی نے تمھیں زندگی دی ہے، وہی تمھیں زندگی کی تمام نعمتیں عطا کرتا ہے، اسی نے تمھیں عقل و شعور سے بہرہ ور کیا ہے لیکن یہ عقل و شعور سے بہرہ ور زندگی اور یہ نعمتوں سے گراں بار زندگی اس لیے تو نہیں دی کہ ایک

Marfat.com

دن وجود میں آئے اور پھر خود رو پودے کی طرح مل دل کر ختم ہو جائے۔ اس نے ہر دور میں زندگی گزارنے کے لیے رہنما کتابیں بھیجیں، معلم اور مربی بنا کر رسولوں کو مبعوث کیا تا کہ وہ تمھیں زندگی گزارنے کا طریقہ سکھائیں اور یہ بتائیں کہ تمھارا آقا کن باتوں سے راضی ہوتا ہے اور کن باتوں سے ناراض ہوتا ہے۔ میں بھی اسی لیے بھیجا گیا ہوں اور مجھ پر ایک کتاب اتاری گئی ہے اور میں اپنی سچائی اور کتاب کے برحق ہونے کی گواہی دیتا ہوں۔ میری زندگی کا ایک ایک لمحہ، میری دل آویز شخصیت، میری بے داغ سیرت و کردار، دیانت اور امانت سے بھرپور میرے معاملات اور مکارمِ اخلاق سے روشن میرے طور اطوار تمھارے سامنے ہیں، میری زندگی کا ایک ایک لمحہ تمھارے سامنے گزرا ہے۔ ان میں کہیں بھی جھوٹ اور شک کا شائبہ نہیں، یہ وہ سچی گواہی ہے جو میں تمھارے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ ہم سب کی زندگی کا ایک ایک لمحہ محفوظ ہو رہا ہے۔ ہمارا کوئی عمل بھی ہمارے خالق و مالک کے علم سے باہر نہیں۔ ایک دن ایسا آئے گا جب وہ ہم سب کو اپنے سامنے کھڑا کر کے ہمارے اعمال کا حساب لے گا۔ سوچ لو اس وقت تمھارا جواب کیا ہوگا۔ میں نہایت ہمدردی اور خیر خواہی سے تمھارے سامنے وہ نسخۂ شفا پیش کر رہا ہوں جسے اللہ تعالیٰ نے مجھ پر اتارا ہے اور جس پر عمل کر کے تم اپنی زندگی اور آخرت کو سنوار سکتے ہو۔

لیکن اس کے جواب میں قوم نے وہی کیا جو ہر قوم اپنے پیغمبروں سے کرتی آئی ہے۔ زندگی کا کوئی دکھ ایسا نہیں جو آپؐ کو نہ پہنچایا گیا ہو۔ نماز پڑھتے ہوئے آپؐ کے سر پر اونٹ کی اوجھڑی ڈالی گئی جسے حضرت فاطمہؓ نے کسی کی مدد سے بڑی مشکل سے آپؐ کے سر سے اتارا اور آپؐ سر اٹھانے کے قابل ہو سکے۔ آپؐ کے گلے میں پٹکا ڈال کر آپؐ کی جان لینے کی کوشش کی گئی۔ آپؐ کے راستے میں کانٹے بچھائے گئے، آپؐ کے سر مبارک پر راکھ ڈالی گئی، لیکن آپؐ نے ہر تکلیف اٹھا کر اللہ تعالیٰ کا پیغام اس کے بندوں تک پہنچایا۔ وہ گالیاں دیتے رہے، آپؐ دعائیں دیتے رہیں۔ انھوں نے آپؐ کے لیے زندگی دشوار تر کر دی، آپؐ اللہ تعالیٰ سے ان کے لیے رحمتیں مانگتے رہے۔ مکہ نے جب بری طرح آپؐ کی طرف سے اپنے دل و دماغ بند کر لیے تو آپؐ نے طائف کا رخ کیا۔ لیکن طائف کے اوباشوں نے آپؐ کی دعوت کے جواب میں ظلم و بربریت کے سارے ریکارڈ توڑ ڈالے۔ طائف کا کوئی پتھر ایسا نہیں جس نے آپؐ کے جسم مبارک کے کسی نہ کسی حصے کو زخمی نہ کیا ہو۔ آپؐ کا وہ خون جس کا جواب کوثر و تسنیم میں بھی نہیں، آپؐ کے زخموں سے بہتا رہا۔ آپؐ کا وہ جسمِ اطہر جس کا ایک ایک رونگٹا عرشِ معلیٰ سے بھی افضل ہے، وہ زخموں سے خونچکاں ہوتا رہا۔ آپؐ کی وہ عزت و حرمت جس کے دامن میں فرشتے نماز پڑھنا فخر محسوس کریں ان اوباشوں کی زبانوں سے گھائل ہوتی رہی۔ آپؐ کی وہ شخصیت جس کا جواب پوری کائنات میں نہیں، اسے طائف میں بری طرح ہلکا کرنے کی کوشش کی گئی۔ پھر آخر ایک وقت آیا کہ آپؐ کو وطن بھی چھوڑنا پڑا۔ اللہ تعالیٰ کا گھر جو آپؐ کو دنیا کی ہر چیز سے زیادہ عزیز تھا اس سے بھی جدائی برداشت کرنا پڑی۔ مدینہ کی سرزمین نے آپؐ کی قدم بوسی کی لیکن دشمن نے یہاں بھی چین نہ لینے دیا۔ مسلسل آپؐ کو لڑائیوں میں جانے پر مجبور کیا گیا۔ آپؐ کے عزیزوں کے لاشے اٹھے، آپؐ خود میدانِ جنگ میں زخمی ہوئے، وہ دندانِ مبارک شہید ہوئے، جن سے قرآن پاک کی شعاعیں پھوٹا کرتی تھیں اس دہن سے خون بہا جس کا لعاب بیماروں کی شفا اور کڑوے پانی کو میٹھا کر دیتا تھا۔ سالوں تک جاں سپاری اور جاں فروشی کے جاں گسل لمحات سے گزرنے کے بعد وہ معاشرہ وجود میں آیا جو اس کائنات کا حاصل تھا۔ اس انسان نے جنم لیا صدیوں سے زندگی جس کی راہ تک رہی تھی۔ وہ عدالتیں وجود میں آئیں جہاں صرف اللہ تعالیٰ کا قانون فیصلے کرتا تھا۔ وہ بازار اور منڈیاں بنیں جہاں پر کاروبار کرنے والے اپنے سے زیادہ دوسروں کا خیال رکھنے والے تھے۔ وہ گلی کوچے وجود میں آئے جن میں جرم کا کوئی تصور نہیں تھا۔ شہروں کے شہر ایسے لوگوں سے معمور ہوئے جیسے لوگوں کو چشمِ فلک نے آج تک نہ دیکھا تھا۔ رت بدل گئی، موسم تبدیل ہو گیا، انسانیت کی قسمت سنور گئی۔ انسانی کو ایک ایسی بہار نصیب ہوئی جس میں صرف خدا خوفی، راست بازی، انسان دوستی، علم پروری اور آخرت کی جستجو کے پھول کھلتے تھے۔ 12 لاکھ مربع میل علاقے پر اس انقلاب کی ٹھنڈی چھاؤں پھیل گئی اور ڈیڑھ لاکھ کے قریب ایسے انسانوں کی ایک مضبوط قوم تیار ہو گئی جو حق کی سربلندی اور باطل کی سرکوبی کے سوا کوئی مقصد نہیں رکھتی تھی۔

تب آپؐ نے آخری حج میں لوگوں سے پوچھا کہ لوگو! ہو سکتا ہے اگلے سال تم مجھے نہ دیکھو۔ قیامت کے دن تم سے میرے بارے میں پوچھا جائے گا کہ جس شہادتِ حق کے منصب پر مجھے فائز کیا گیا تھا اس منصب کی ذمہ داریوں کو میں نے ادا کیا یا نہیں؟ کیا میں نے اللہ تعالیٰ کا دین تم تک پہنچایا؟ کیا میں نے امانت کا حق ادا کیا؟ میں نے تمھارے ساتھ خیر خواہی کی؟ ایک ایک سوال پر لوگ چیخ رہے تھے کہ یا رسول اللہ تعالیٰ! آپؐ نے اپنی ذمہ داری کا پورا حق ادا کر دیا۔ آپؐ نے تین دفعہ آسمان کی طرف انگلی اٹھا کر فرمایا کہ یا اللہ! تو گواہ رہ تیری مخلوق میرے بارے میں گواہی دے رہی ہے۔

Marfat.com

ظاہر ہے کہ آپ ہمیشہ کی عمر لے کر نہیں آئے تھے۔ 63 سالہ عمرِ طبعی اور 23 سالہ عمرِ رسالت گزار کر آپ اپنے اللہ تعالیٰ سے جا ملے لیکن وہ شہادتِ حق جس کی ذمہ داری آپ نے ادا کی تھی اسے بعد کی نسلوں کے لیے اس امت کے سپرد کر گئے جسے آپ نے تربیت کیا تھا اور آپ نے مختلف وقتوں میں یہ بات سمجھائی کہ لوگو! تم میں سے ہر نسل اس امانت کی ادائیگی کی ذمہ دار ہے۔ کل کو تم سے پوچھا جائے گا کہ جس طرح میں نے یہ حقِ امانت ادا کیا تھا کیا تم نے بھی ایسا ہی کیا؟ کیا تم نے ویسے ہی دکھ اٹھائے جیسے میں نے اٹھائے تھے؟ کیا تم نے اسی احساسِ ذمہ داری کا ثبوت دیا جیسے میں نے دیا تھا؟ کیا تم نے اللہ تعالیٰ کے دین کو گھر سے لے کر ایوانِ حکومت تک نافذ اور برپا کر کے یہ ثابت کیا کہ اللہ تعالیٰ کا دین اب بھی قابلِ عمل ہے؟ جس طرح آپ نے صحابہؓ کے سپرد یہ ذمہ داری کی اور انھیں بار بار اس کا احساس بھی دلایا۔ اسی طرح قرآنِ کریم کی یہ آیت قیامت تک آنے والے مسلمانوں کو یہ احساس دلاتی رہے گی کہ کل کو تم سے اسی ذمہ داری کے حوالے سے پوچھا جائے گا کہ تم نے اپنی اگلی نسل تک یہ امانت پہنچائی یا نہیں پہنچائی؟ کیا تم نے یہ ثابت کیا کہ ڈرنا صرف اللہ تعالیٰ سے چاہیے؟ بھروسے کے قابل صرف وہی ذات ہے، سر صرف اسی کے سامنے جھکنا چاہیے، امیدیں صرف اسی سے باندھنی چاہییں، آئین اسی کا واجب الاطاعت ہے۔ وہی ہے جو مطاعِ مطلق ہے۔ اس کے سوا کسی کی غیر مشروط اطاعت نہیں ہو سکتی۔ اس کے حکم کے مقابلے میں کسی کا حکم نہیں چل سکتا۔ اس کی اطاعت کا وہ طریقہ معتبر ہوگا جو طریقہ اللہ تعالیٰ کے رسولؐ نے چھوڑا ہے، جسے ہم سنتِ رسولؐ کہتے ہیں۔ قرآن بار بار پوچھتا ہے کہ لوگو! بتاؤ جو امانت حضورؐ اور آپؐ کے صحابہؓ چھوڑ گئے، وہ کہاں ہے؟ وہ ایثار، وہ استقامت، وہ ذاتِ رسالت مآبؐ سے بے پناہ محبت، جو حضرت ابوبکر صدیقؓ ہمارے حوالے کر گئے تھے، وہ کہاں ہے؟ حضرت فاروقِ اعظمؓ کا وہ عدل کہاں ہے؟ جو وہ دنیا کو دے کر گئے تھے اور حضرت عثمان غنیؓ کی وہ شرم و حیا جو ان کی شناخت بن گئی تھی، کہاں ہے؟ اور کہاں ہے وہ حضرت علیؓ کا فقر، جس پر انھیں فخر تھا اور جس کی انھوں نے وراثت چھوڑی تھی؟ اسلام کا وہ پورا نظامِ زندگی جو صحابہؓ کے گھروں سے لے کر ان کے معاشرے کے ایک ایک ادارے اور ان کی ریاست کے ایک ایک شعبے اور ان کی حکومت کے ایک ایک ایوان میں برسرِ اقتدار تھا۔ وہ ہم نے کہاں کھو دیا؟ ہمارے گھروں میں فقر نہیں سرمایہ داری ہے، ہمارے پاس عدل نہیں جانب داری ہے، ہمارے پاس رحم و مروت نہیں ظلم اور جہالت ہے، ہمارے پاس شرم و حیا نہیں ہر چوراہے پر ہم نے حوا کی بیٹیوں کو بے حیائی کی تصویر بنا کر اس طرح آویزاں کر دیا ہے کہ حیا کا جنازہ نکل گیا ہے۔ ہمارے نصابِ تعلیم سے قرآنِ کریم کی آیات کھرچی جا رہی ہیں۔ جہاد جسے اسلام کی چوٹی کہا گیا ہے وہ ایک گالی بن کر رہ گیا ہے۔ حکومت کے ایوانوں سے اللہ تعالیٰ کے دین کا مذاق اڑایا جاتا ہے اور طاقتور حکمرانوں کا کلمہ پڑھا جا رہا ہے لیکن قرآنِ کریم ہم سے بار بار کہہ رہا ہے کہ سوچو! کل کو حقِ شہادت کے حوالہ سے تم سے پوچھا جائے گا، کیا جواب دو گے؟

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ ۚ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ﴿٩٠﴾ وَأَوْفُوا بِعَهْدِ اللَّهِ إِذَا عَاهَدْتُمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْأَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللَّهَ عَلَيْكُمْ كَفِيلًا ۚ إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُونَ ﴿٩١﴾ وَلَا تَكُونُوا كَالَّتِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ أَنْكَاثًا تَتَّخِذُونَ أَيْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ أَنْ

Marfat.com

تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِيَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ ؕ اِنَّمَا يَبْلُوْكُمُ اللّٰهُ بِهٖ ؕ وَلَيُبَيِّنَنَّ
لَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۹۲﴾ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ
لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ يُّضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ
مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَلَتُسْـَٔلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۳﴾ وَلَا تَتَّخِذُوْٓا
اَيْمَانَكُمْ دَخَلًاۢ بَيْنَكُمْ فَتَزِلَّ قَدَمٌۢ بَعْدَ ثُبُوْتِهَا وَتَذُوْقُوا
السُّوْٓءَ بِمَا صَدَدْتُّمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَلَكُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۹۴﴾
وَلَا تَشْتَرُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ اِنَّمَا عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ
خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۹۵﴾ مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا
عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ ؕ وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِيْنَ صَبَرُوْٓا اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا
كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ
فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا
يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۷﴾ فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ
الرَّجِيْمِ ﴿۹۸﴾ اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى
رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۹۹﴾ اِنَّمَا سُلْطٰنُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يَتَوَلَّوْنَهٗ وَالَّذِيْنَ
هُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ ع

Marfat.com

رکوع: ۱۳ (بیشک اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے عدل کا، احسان کا اور اہلِ قرابت کو دیتے رہنے کا اور روکتا ہے بے حیائی، برائی اور سرکشی سے۔ تو وہ تمھیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم نصیحت قبول کرو۔ ۹۰) (اور اللہ تعالیٰ کے عہد کو پورا کرو، جب تم نے اس سے عہد کرلیا اور اپنی قسمیں نہ توڑو، انھیں پختہ کرنے کے بعد حالانکہ تم اللہ تعالیٰ کو اپنے اوپر گواہ بنا چکے ہو۔ بیشک اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو تم کرتے ہو۔ ۹۱) (اس عورت کی طرح نہ ہوجاؤ جس نے توڑ ڈالا اپنے سوت کو مضبوط کاتنے کے بعد اور تار تار کرڈالا، تم اپنی قسموں کو ایک دوسرے کو فریب دینے کا ذریعہ بناتے ہو تاکہ اس طرح ہوجائے ایک گروہ زیادہ فائدہ اٹھانے والا دوسرے گروہ سے، اللہ تعالیٰ تمھیں ان قسموں کے ذریعے آزماتا ہے اور وہ قیامت کے دن تم پر واضح کردے گا ان باتوں کو جن میں تم اختلافات کیا کرتے تھے۔ ۹۲) (اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو وہ تم سب کو ایک ہی امت بنا دیتا، لیکن وہ جسے چاہتا ہے راہ بھلا دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے راہِ راست دکھا دیتا ہے اور تم سے ضرور پوچھا جائے گا جو کام تم کرتے تھے۔ ۹۳) (اور نہ بناؤ اپنی قسموں کو ایک دوسرے کو دھوکہ دینے کا ذریعہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی قدم جمنے کے بعد اکھڑ جائے اور تم اس جرم کی پاداش میں کہ تم نے لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی راہ سے روکا بُرا نتیجہ دیکھو اور تمھارے لیے بڑا عذاب ہے۔ ۹۴) (اور اللہ تعالیٰ کے عہد کو متاعِ قلیل کے بدلے میں مت بیچو، جو کچھ اللہ تعالیٰ کے پاس ہے وہ بہتر ہے اگر تم جانو۔ ۹۵) (جو کچھ تمھارے پاس ہے وہ ختم ہوجائے گا اور جو کچھ اللہ تعالیٰ کے پاس ہے وہ باقی رہنے والا ہے۔ ہم ضرور صبر سے کام لینے والوں کو ان کے اجر، ان کے بہترین اعمال کے مطابق دیں گے۔ ۹۶) (جو کوئی نیک عمل کرے گا خواہ مرد ہو یا عورت اور وہ صاحب ایمان ہے تو ہم اس کو ایک پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے اور ہم ان کو ان کے بہترین اعمال کا صلہ دیں گے۔ ۹۷) (پس جب تم قرآن پڑھنے لگو تو شیطانِ رجیم سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگ لیا کرو۔ ۹۸) (بیشک اس کا ان لوگوں پر کچھ بھی زور نہیں چلتا جو ایمان لائے ہوئے ہیں اور اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں۔ ۹۹) اس کا زور صرف انھیں پر چلتا ہے جو اسے دوست رکھتے ہیں اور جو اللہ تعالیٰ کے شریک ٹھہرانے والے ہیں۔ ۱۰۰)

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ ۚ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۞ (سورة النحل : ۹۰)

(بیشک اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے عدل کا، احسان کا اور اہلِ قرابت کو دیتے رہنے کا اور روکتا ہے بے حیائی، برائی اور سرکشی سے۔ تو وہ تمھیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم نصیحت قبول کرو۔ ۹۰)

سابقہ آیات سے ربط

ہم جانتے ہیں کہ سورۃ النحل مکی سورت ہے اور مکی سورتوں کا اصل موضوع عقائد کی اصلاح ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ تمام مکی سورتوں میں توحید، رسالت اور آخرت پر مختلف اسالیب سے اس طرح زور دیا جاتا ہے کہ وہ دل و دماغ میں اترنے لگتے ہیں اور پھر مشرکین کی جانب سے اعتراضات کیے جاتے ہیں یا سوالات اٹھائے جاتے ہیں تو ان کا جواب دیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس سورت میں بھی انہی موضوعات پر بحث کی گئی ہے۔ البتہ گزشتہ رکوع کے آخر میں قریشِ مکہ کو ایک چونکا دینے والی بات کہی گئی ہے۔ وہ یہ کہ قیامت کے دن جب تمام امتوں کا فیصلہ کیا جا رہا ہوگا تو فیصلے کا دارومدار اس بات پر آکر ٹھہرے گا کہ جو رسولؑ ان امتوں کی طرف بھیجے گئے تھے، انھیں گواہی کے لیے بلایا جائے تاکہ معلوم ہو کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کا پیغام اپنی امتوں تک پہنچایا تھا یا نھیں، پھر اسی گواہی پر امتیں اپنے انجام کو پہنچ جائیں گی۔ چنانچہ قریشِ مکہ سے یہ کہا گیا کہ تمھارے فیصلے کے لیے نبی کریم ﷺ کو بطور گواہ اٹھایا جائے گا اور آپؐ سے پوچھا جائے گا کہ کیا آپؐ نے تبلیغ و دعوت کا حق ادا کیا۔ ادائے امانت میں کوئی کمی تو نھیں چھوڑی اور اپنی خیرخواہی میں کوئی دقیقہ

Marfat.com

چھوٹنے تو نہیں پایا۔ چنانچہ جب آپؑ پوری طرح گواہی دے چکیں گے تو تب اللہ تعالیٰ تمھیں جہنم میں بھیجنے کا حکم دے گا۔ سوچ لو، کہ آج جس کی بات تمھیں سننا گوارا نہیں اور جس کے لیے تم نے مکے کی سرزمین کو ایذا رسانی کی بھٹی میں تبدیل کر دیا ہے۔ قیامت کے دن اسی پیغمبر کی گواہی پر تمھارے فیصلے کا دارومدار ہے اور مزید یہ بھی فرمایا کہ پیغمبر جو دعوت لے کے آتا ہے اس کی سند اور اس کی تفصیل کے طور پر اللہ تعالیٰ ان پر کتابیں بھی اتارتا ہے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ پر ایک ایسی کتاب اتاری گئی ہے جس میں ہر دینی ضرورت کا بیان اور زندگی کے ہر شعبے میں ہدایت کا سامان اور اس کے نتیجے میں ایمان لانے والوں کے لیے رحمت اور بشارت بنا کے بھیجی گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ نہ سمجھا جائے کہ جب یہ آیت اتری ہے تو قرآنِ کریم کامل شکل میں نازل ہو چکا تھا کیونکہ ہم سب جانتے ہیں کہ قرآن کی تکمیل تو 23 سالوں میں ہوئی ہے جس کے ساتھ ہی آنحضرت ﷺ کی حیاتِ مبارکہ کی بھی تکمیل ہو گئی۔ البتہ اس وقت قرآنِ کریم مکی زندگی کی ضرورتوں کے مطابق نازل ہو چکا تھا اور عقائد کی ایک ایک ضرورت کو پورا کیا جا رہا تھا۔ انفرادی اور اجتماعی خیالات میں جہاں جہاں دراڑیں پڑ سکتی ہیں ان کے بارے میں بھی ہدایات دی جا رہی تھیں بلکہ میں یہ عرض کروں گا کہ اگرچہ مکی سورتوں میں ہمیں احکام نظر نہیں آتے۔ البتہ جہاں تک مکارمِ اخلاق کا تعلق ہے اس کا نزول تو نزولِ وحی کے فوراً بعد شروع ہو گیا تھا۔ چنانچہ ہجرتِ حبشہ کے موقع پر حضرت جعفر طیارؓ نے جو نجاشی کے سامنے تقریر کی ہے اس میں بتایا ہے کہ حضورؐ ہمیں مکارمِ اخلاق کی تعلیم دیتے ہیں۔ آپؐ اجتماعی زندگی کا قانون تو انھیں نہیں دے رہے تھے کہ ابھی ریاست قائم نہیں ہوئی تھی۔ حتیٰ کہ اسلامی معاشرہ بھی وجود میں نہیں آیا تھا۔ لیکن افرادِ انسانی کے طور اطوار کی درستی کے لیے جس اخلاقی تعلیم کی ضرورت تھی اور دماغوں اور دلوں کے تزکیہ کے لیے جن آداب کی ضرورت تھی وہ یقیناً مہیا کیے جا رہے تھے۔ قرآنِ کریم کی اس ترتیب اور اس اسلوب کو اگر سامنے رکھا جائے تو پھر یہ بات سمجھنا کوئی مشکل نہیں رہتا کہ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں جن اخلاقی اقدار کا ذکر کیا جا رہا ہے اس کا ربط سابقہ آیات سے کیا ہے۔ اور مزید یہ بتلانا بھی مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ کا آخری رسولؐ آخری دین کی جس دعوت کو تمھارے سامنے پیش کر رہا ہے وہ محض چند اصول اور نظریات کا نام نہیں بلکہ وہ ایک ایسی تربیت گاہ ہے جس میں یہ بات واضح کی جاتی ہے کہ ان اصولوں کی بنیاد پر تیار ہونے والا انسان، انسانی معاشرہ اور اسلامی ریاست کو چلانے والے افراد کس مزاج، کن عادات اور کونسی کی خوبیوں کا مرقع ہیں تاکہ اس سے تمھیں اندازہ کرنے میں آسانی ہو کہ انسانوں کے جس معاشرے میں آپ رہ رہے ہیں اور جس میں سوائے نفرتوں کے کوئی چیز دکھائی نہیں دیتی اس معاشرے میں اور اُس معاشرے میں جو اسلام پیدا کرنا چاہتا ہے اس کے بنیادی اخلاق اس آیت میں بیان کیے گئے ہیں۔ ان دونوں معاشروں میں آخر کیا فرق ہے؟

اس آیت کی اہمیت

آیتِ کریمہ میں تین باتوں کا حکم دیا گیا ہے کہ اور تین باتوں سے روکا گیا ہے، لیکن اخلاقی ستاروں کی اس کہکشاں پر جتنا آدمی غور کرتا ہے، حیرت میں ڈوبتا چلا جاتا ہے کہ جن بنیادی اخلاقیات کا حکم دیا گیا ہے وہ تمام اخلاق کی اساس معلوم ہوتے ہیں اور جن باتوں سے روکا گیا ہے وہ تمام منکرات کی جڑ معلوم ہوتے ہیں۔ اسلام کا تمام تر اخلاقی نظام انھیں اوامر و نواہی سے پھوٹتا ہے۔ اور پھر یہ کہ جس اعجاز اور جامعیت کے ساتھ ان 6 باتوں کو بیان فرمایا گیا ہے وہ بجائے خود حیران کر دینے والی بات ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کے زمانے کے بڑے بڑے کافر جو اپنی فصاحت و بلاغت میں عرب بھر میں سند کی حیثیت رکھتے تھے، جب ان میں سے کسی کے سامنے یہ آیت پڑھی گئی تو وہ حیران اور گنگ ہو کر رہ گیا۔ حضرت عکرمہؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے یہ آیت ولید بن مغیرہ کو پڑھ کر سنائی تو اس نے کہا یَا ابْنَ اَخِیْ اَعِدْ، میرے بھتیجے ایک بار پھر پڑھ کر سناؤ۔ آپؐ نے پھر اسے پڑھا، تو وہ کٹر دشمن ہونے کے باوجود کہنے لگا واللہ ان لہ لحلاوۃ وان علیہ لطلاوۃ وان اصلہ لمورق واعلاہ لمثمر وماھو بقول بشر بخدا یہ تو بڑی شیریں ہے، اس کا ظاہر بڑا رنگین ہے، اس کا تنا پتوں والا ہے اور اس کی شاخیں پھلوں سے لدی ہیں، بخدا یہ کسی بشر کا کلام نہیں۔ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نے فرمایا، یہ قرآن کی جامع ترین آیت ہے۔ اس میں ہر وہ اچھی چیز مذکور ہے، جس پر عمل کرنا ضروری ہے۔ اسی طرح ہر وہ بری چیز موجود ہے، جس سے اجتناب ضروری ہے۔ اب ہم اس آیت میں مذکور اوصاف میں سے ایک ایک وصف کو ذکر کرتے ہیں۔

Marfat.com

عدل کا مفہوم

1- سب سے پہلے جس بات کا حکم دیا گیا ہے، وہ ہے عدل۔ اس کا مفہوم سمجھنے میں بعض دفعہ کوتاہی کی جاتی ہے۔ عام طور پر اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے، انصاف اور برابری۔ پھر اسی سے غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ انصاف کا معنی ہوتا ہے، لین دین میں نصف نصف کر دینا۔ اس معنی سے یہ مفہوم اخذ کیا گیا ہے کہ دو آدمی ہوں یا دو گروہ، ان کے درمیان حقوق کی تقسیم نصف نصف کی بنیاد پر ہونی چاہیے حالانکہ ہر عقل رکھنے والا آدمی جانتا ہے کہ حقوق ہمیشہ نصف نصف کی بنیاد پر تقسیم نہیں ہوتے۔ اگر اس اصول کو تسلیم کر لیا جائے تو زندگی کے بیشتر شعبے فساد کا شکار ہو جائیں۔ اسی طرح اس سے یہ بات بھی اخذ کی گئی ہے کہ عدل کا معنی ہے مساویانہ تقسیمِ حقوق، حالانکہ یہ بات بھی سراسر فطرت کے خلاف ہے۔ مثلاً والدین اور اساتذہ کے درمیان معاشرتی اور اخلاقی مساوات، اسی طرح اعلیٰ درجے کی خدمات سرانجام دینے والوں اور کم تر درجے کی خدمت ادا کرنیوالوں کے درمیان معاوضوں کی مساوات کو کون مبنی برحق کہہ سکتا ہے۔ اس لیے یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ عدل کا مفہوم نہ انصاف ہے اور نہ برابری بلکہ عدل دو مستقل حقیقتوں سے مرکب ہے۔ ایک یہ کہ لوگوں کے درمیان حقوق میں توازن اور تناسب قائم ہو اور دوسرا یہ کہ ہر ایک کو اس کا حق بے لاگ طریقے سے دیا جائے۔ قرآنِ کریم اس بات کا حکم دیتا ہے کہ ہر شخص کو اس کے اخلاقی، معاشرتی، معاشی، قانونی اور سیاسی و تمدنی حقوق پوری ایمانداری کے ساتھ ادا کیے جائیں۔ اسلامی تاریخ میں مسلمانوں نے اس حوالے سے ایسی روشن مثالیں چھوڑی ہیں جس پر بجا طور پر مسلمان فخر کر سکتے ہیں۔ اسلامی شریعت نے جس طرح انسانوں میں حقوق کی تقسیم کی ہے اور حقوق میں جو توازن اور تناسب ملحوظ رکھا ہے، جدید دنیا آج تک اس کا صحیح ادراک نہیں کر سکی۔ اور پھر جس بے لاگ طریقے سے اسلامی عدالتیں عام انسانوں کو عدل مہیا کرتی رہی ہیں، وہ بجائے خود مسلمانوں کے لیے بہت بڑا سرمایہ ہے۔ آج کون سا ملک ہے جس میں حکمرانوں کو عموماً عدالتوں میں حاضری سے مستثنیٰ نہ رکھا گیا ہو اور کتنے ملک ہیں جہاں غریب کے دعوے پر کسی امیر یا حکمران کو سمن جاری کیے جاتے ہیں۔ اب تو اندھیر نگری کا عالم یہ ہے کہ بڑی قومیں جو دنیا کو اپنے طریقے سے چلانا چاہتی ہیں انھوں نے اپنے لیے زبردستی کچھ حقوق خاص کر لیے ہیں۔ جس ملک کے وسائلِ دولت پر چاہیں قبضہ کر لیں۔ اگر کوئی قوم مدافعت کے لیے کھڑی ہو جائے تو ان کا خون خاک کا رزق بنا دیا جاتا ہے۔ آج مسلمان ہونا سب سے بڑا جرم کہلاتا ہے جبکہ مسلمانوں نے عدل کے ہر راستے میں ایسی ہر تقسیم کو مٹا ڈالا تھا۔ حضرت عمر فاروقؓ کی عدالت میں ایک یہودی نے حضرت علیؓ کے خلاف کیس کیا۔ حضرت علیؓ نے اس بات پر ناگواری کا اظہار کیا کہ امیر المومنینؓ نے مجھے تو کنیت سے پکارا اور یہودی کا نام لے کر۔ اس سے یقیناً یہودی کو یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ اسلام شاید یہودی کو عدالتی معاملے میں مسلمان کے برابر نہیں سمجھتا۔ اگر آپؓ نے مجھے کنیت سے پکارا تھا تو اسے بھی کنیت سے پکارنا چاہیے تھا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ترکستان کے گورنر کو حکم دیا کہ تم نے چونکہ اسلامی احکام کے مطابق یہ علاقہ فتح نہیں کیا اور غیر مسلموں کے سامنے باقاعدہ اسلام پیش نہیں کیا گیا، اس لیے جتنا علاقہ فتح ہو چکا ہے وہ سب خالی کر دیا جائے۔ چنانچہ اس حکم کی تعمیل کی گئی۔ از سرِ نو مسلمانوں نے اس علاقے کے غیر مسلموں کے سامنے اسلام پیش کیا اور یہ صاف صاف کہا کہ اگر تم اسلام قبول کر لیتے ہو تو تم ہمارے بھائی ہو اور یہ ریاست تمھارے پاس رہے گی۔ بصورت دیگر ہم تم پر چڑھائی کریں گے اور پھر جو تلوار فیصلہ کرے گی، اس پر عمل ہو گا۔ اس طرح کے عدل کے واقعات مسلمانوں کے علاوہ دنیا کی تاریخ میں تلاش نہیں کیے جا سکتے۔

احسان کا مفہوم

2- دوسری چیز جس کا حکم دیا گیا ہے، وہ احسان ہے۔ احسان کا معنی ہے، کسی چیز کو بہتر سے بہتر صورت دینا، خوبصورت سے خوبصورت تر بنانا، خوب تر کی تلاش میں ہمیشہ مدارج ہوتے ہیں۔ آخری درجے تک کسی بھی چیز کو پہنچانے کی کوشش کرنا، یہ احسان ہے۔ عدل تو صرف حقوق میں توازن اور تناسب کو کہتے ہیں، لیکن اس سے آگے بڑھ کر حقوق کی ادائیگی میں حُسن پیدا کرنا، دوسرے کے جذبات کا زیادہ سے زیادہ لحاظ کرنا، خیر خواہی اور مروت کے جذبات کو حقوق کا لازمی حصہ بنا دینا اور معاملات کی دنیا میں فیاضی اور حُسنِ سلوک کو لازمی ٹھہرانا یہ سب احسان کے اجزا ہیں۔ اسلام نے زندگی کے

Marfat.com

تمام شعبوں میں جو آسودگی پیدا کی ہے اس کا اصل حُسن احسان سے پیدا کیا ہے اور صحابہؓ نے اس کے لیے نہایت درخشاں مثالیں بھی چھوڑی ہیں۔ مثلاً عبادت کے حوالے سے جب آپؐ سے پوچھا گیا کہ احسان کیا ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا کہ احسان یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو کہ گویا کہ تم اسے دیکھ رہے ہو، اور اگر یہ نہ ہو سکے تو یہ تو واقعہ ہے کہ وہ تمھیں دیکھ رہا ہے۔ عبادت کی آخری حد ایک انسان کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ عبادت کرتا ہوا خدا کو دیکھے اور یا اس بات پر یقین رکھے کہ خدا اسے دیکھ رہا ہے۔

معاملات کی دنیا کا احسان کیا ہے اور معاملات میں حُسن کس چیز سے پیدا ہوتا ہے۔ سیدنا حضرت حسنؓ کے یہاں مہمان آئے ہوئے تھے اور ان کا غلام دسترخوان پر مہمانوں کے لیے کھانا چن رہا تھا۔ حضرت حسنؓ تشریف فرما تھے۔ نہ جانے اس کا پاؤں کس طرح الجھا کہ اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا گرم شوربے کا پیالہ اچھلا اور حضرت حسنؓ کی کمر پر آ کر گرا۔ شوربے کی حدت سے یقیناً ناقابلِ بیان تکلیف ہوئی ہو گی۔ آپؓ نے نہایت غصے سے اس کی طرف دیکھا، وہ غلام بھی خاندانِ نبوت میں پلا ہوا نوجوان تھا۔ اس نے فوراً ایک آیت کا ایک جملہ پڑھا وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ کہ جو متقی لوگ ہیں، ان کی ایک صفت یہ ہے کہ وہ غصہ پی جایا کرتے ہیں۔ حضرت حسنؓ نے فوراً نگاہیں جھکا لیں۔ اس نے دوسرا جملہ پڑھا وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ اور وہ لوگوں کو معاف کر دیا کرتے ہیں۔ آپؓ نے فوراً فرمایا کہ جا میں نے تجھے معاف کیا۔ غلام نے دیکھا کہ لوہا گرم ہے بس ایک اور چوٹ لگانے کی ضرورت ہے۔ اس نے آیت کا آخری جملہ پڑھا وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ اور اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ آپؓ نے فرمایا کہ جا میں نے تجھے آزاد کیا۔ ہزار ہا روپے قیمت رکھنے والا غلام ایک لمحے میں آزاد ہو گیا۔ یہ ہے معاملات کی دنیا کا احسان، کہ خطا کرنے والا نوازا جا رہا ہے، صرف اس لیے کہ ایسا کرنے سے اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہوتی ہے۔

آنحضرت ﷺ کے اسوۂ حسنہ سے ہمیں ایک اور حیرت انگیز مثال ملتی ہے۔ آپؐ نے یہودی سے جَو کی ایک مقدار قرض لی اور واپسی کا وقت مقرر ہو گیا۔ یہودی واپسی کے وقت سے بہت پہلے مطالبے کے لیے آ پہنچا۔ آپؐ نے صرف اتنا فرمایا کہ ابھی تو ادائیگی کا وقت نہیں آیا، لیکن وہ اپنے مطالبے پر اڑا رہا، حتیٰ کہ اس نے بدتمیزی شروع کر دی۔ لیکن آپؐ نے کوئی جواب نہیں دیا، سر جھکا کے بیٹھے رہے۔ صحابہؓ بھی دم بخود دیکھ رہے تھے کہ آنحضرت ﷺ کوئی جواب نہیں دے رہے ہیں اور ہمارا از خود بولنا کہیں گستاخی نہ سمجھا جائے۔ وہ ظالم اس سے اور دلیر ہوا اور یہاں تک کہہ گزرا کہ تم جو آلِ عبدالمطلب ہو، تم تو سدا کے نادہند ہو، تم قرض لینا جانتے ہو لیکن تمھیں واپسی کی فکر نہیں ہوتی۔ اس پر حضرت عمر فاروقؓ ضبط نہ کر پائے، آپؓ نے اس یہودی کا گریبان پکڑ لیا اور نہایت برہمی سے اس کو ڈانٹا۔ اب آنحضرت ﷺ نے سر اٹھایا، بجائے یہودی کو کچھ کہنے کے حضرت عمر فاروقؓ کو سختی سے کہا کہ اسے چھوڑ دو۔ تم نے اس کے ساتھ زیادتی کی ہے، تمھیں چاہیے تھا کہ اسے بھی سمجھاتے اور مجھے بھی سمجھاتے کہ آپؐ نے اگر قرض لیا تھا تو آپ کو ادائیگی کی فکر کرنی چاہیے تھی۔ تم نے جو سختی کی ہے اب اس کا تدارک اس طرح ہو سکتا ہے کہ جتنا غلہ ہم نے اس سے قرض لیا ہے، اس کا ایک چوتھائی اسے زائد ادا کرو۔ اصل غلہ قرض کا بدلہ ہو گا اور زائد احسان ہو گا۔ یہودی وہاں سے اٹھا کسی چشمے پر غسل کیا اور واپس آ کر کہنے لگا کہ محمد (ﷺ) مجھے کلمہ پڑھاؤ، میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں۔ میں کتاب کا عالم ہوں، ہماری کتاب میں نبیؐ آخر الزماں کی جو علامتیں لکھی گئی ہیں، وہ سب میں آپؐ میں اب تک دیکھ چکا تھا، صرف ایک علامت باقی تھی کہ نبیؐ آخر الزماں کا حلم اور بردباری گستاخیاں کرنے والوں کو شکست دے دے گی۔ آج میں نے یہ علامت بھی دیکھ لی۔ اس لیے مسلمان ہوتا ہوں۔

مثالیں بہت ہیں سمجھنے کے لیے یہ بھی کافی ہیں۔ اس سے اندازہ کر لینا مشکل نہیں رہتا کہ ادائے حقوق کے علاوہ معاشرے کو خوبصورت بنانے اور افرادِ معاشرہ میں محبت اور آشتی کے پھول اگانے کے لیے ضروری ہے کہ عدل کے ساتھ ساتھ احسان پر بھی عمل کیا جائے۔

اہلِ قرابت کو دینے کا حکم

3- اس آیتِ کریمہ میں تیسری جس بات کا حکم دیا گیا ہے وہ غریب اہلِ قرابت کی مدد کرنے کا ہے۔ قرآن کریم کا اگر گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے نزدیک انسانی اصلاح کا دارومدار دو باتوں کی اصلاح پر ہے۔ ایک تو یہ کہ انسان کا تعلق اپنے اللہ تعالیٰ سے درست ہو جائے۔ اس کا سر اس کے آستانے کے سوا کسی اور آستانے پر نہ جھکے۔ وہ اس کی ذات و صفات پر ایسا یقین رکھے کہ اس کا دل صرف اسی کی محبت سے

Marfat.com

معمور ہو، وہ اسی کے خوف سے لرزے، اسی کا تقویٰ اختیار کرے، اسی پر بھروسہ رکھے اور اپنی ہر ضرورت کے لیے اسی کے سامنے ہاتھ پھیلائے اور اسی کی دی ہوئی ہدایت کے مطابق زندگی گزارے۔ دوسری چیز یہ ہے کہ انسان کا انسان سے تعلق درست ہو۔ وہ دوسرے انسان کے بارے میں اسی ہمدردی اور فکرمندی کے ساتھ سوچے جیسے اپنی ذات کے بارے میں سوچتا ہے۔ انسانی رشتوں کی عظمت کا لحاظ کرے اور قدرت نے مختلف ذمہ داریوں کے حوالے سے انسانوں میں جو واحدے (یونٹ) قائم کیے ہیں ان کی پاسداری کرے۔ انسانوں میں سب سے پہلا واحدہ آدمی کا اپنا گھر ہے جس میں اس کے بیوی بچے اور اس کے والدین ہیں یہ حقیقی اور مکمل طور پر اس واحدے کے تمام افراد کی ضرورتوں کا ذمہ دار ہے۔ اس کے بعد دوسرا واحدہ اہلِ قرابت کا ہے۔ ان میں مختلف درجات ہیں جو شخص قرابت کے اعتبار سے قریب ہے وہ ذمہ داری کے اعتبار سے بھی قریب ہے۔ اور جو قرابت کے اعتبار سے دور ہے، وہ ذمہ داری کے اعتبار سے بھی دور ہے۔ ماں باپ اور بیوی بچوں کے بعد سب سے پہلا تعلق اہلِ قرابت کا ہے، اس لیے انھیں دوسرے واحدے کا درجہ دیا گیا ہے اور ان کی ذمہ داریوں کو پہلے واحدے کے بعد سب سے اہم ترقرار دے کر یہاں اس کا حکم دیا گیا ہے۔ اہلِ قرابت کے تعلق ہی کو صلہ رحمی کہتے ہیں اور اس کی تاکید جس طرح قرآن و سنت میں کی گئی ہے وہ قرآن و سنت کے ہر طالب علم پر پوری طرح عیاں ہے۔ آنحضرت ﷺ نے یہاں تک فرمایا لایدخل الجنة قاطع "قطع رحمی کرنے والا جنت میں نہیں جائے گا۔" اور مزید یہ بات کہ اہلِ قرابت کی ذمہ داریوں کا احساس دلاتے ہوئے صرف نصیحت پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ یہ تاکید فرمائی کہ ہر صاحبِ استطاعت شخص اپنے مال پر صرف اپنی ذات اور اپنے بچوں ہی کے حقوق نہ سمجھے بلکہ اپنے رشتہ داروں کے حقوق بھی تسلیم کرے۔ ہر خوشحال آدمی اس بات کا پابند ٹھہرایا گیا ہے کہ وہ اپنے رشتہ داروں میں برابر نظر رکھے کہ ان میں کوئی شخص بنیادی ضروریات سے تہی دامن تو نہیں۔ اس کے نزدیک یہ بات انتہائی ناپسندیدہ ہے کہ خوشحال افراد تو عیش و عشرت کی زندگی گزاریں اور غریب اہلِ قرابت نانِ شبینہ کے بھی محتاج ہوں۔ قرابت داری چونکہ ایک واحدہ ہے، اس لیے اس واحدے کی ہر کڑی دوسری کڑیوں سے پیوست رہنی چاہیے اور کہیں بھی شکست و ریخت کا عمل سب کے لیے فکرمندی کا باعث ہونا چاہیے۔ اسلامی احکام کی روح کو دیکھتے ہوئے صاف محسوس ہوتا ہے کہ خاندان کے غریب افراد کو سنبھالا دینا، خاندان کے خوشحال افراد کی ذمہ داری ہے۔ اسلامی حکومت اس بات کی ذمہ دار ٹھہرائی گئی ہے کہ وہ مسلمان معاشرے کے عناصر ترکیبی پر نظر رکھے اور ہر عنصر کو اپنے حقوق ادا کرنے کا پابند بنائے۔ اسلام میں جس طرح میراث میں صرف بیوی بچوں اور والدین ہی کو شامل نہیں کیا بلکہ ذوی الارحام کو بھی شامل فرمایا ہے۔ اسی طرح ذوی الارحام کی ذمہ داریاں بھی ان پر ڈالی ہیں۔ خلفائے راشدین نے آنحضرت ﷺ کے ایسے ہی ارشادات سے ان ذمہ داریوں کو سمجھا اور اس کے مطابق فیصلے فرمائے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے ایک یتیم بچے کے چچازاد بھائیوں کو مجبور کیا کہ وہ اس کی پرورش کے ذمہ دار بنیں۔ اور ایک دوسرے یتیم کے حق میں فیصلہ کرتے ہوئے آپؓ نے فرمایا کہ اگر اس کا کوئی بعید ترین رشتہ دار بھی موجود ہوتا تو میں اس پر اس کی پرورش لازم کر دیتا۔ غور فرمایئے، جس معاشرے میں عدل کی کارفرمائی ہو اور کسی حق تلفی اور حق شکنی کو برداشت نہ کیا جاتا ہو بلکہ معاشرے کا ہر فرد آگے بڑھ کر اس طرح دوسروں کے حقوق ادا کرنے کی فکر میں ہو کہ جس سے ایثار کی روح جھلکتی دکھائی دیتی ہو، اور احسان کا جذبہ مہکتا ہو اور تمام افرادِ معاشرہ اپنے اہلِ قرابت کو اپنی ذمہ داری سمجھتے ہوں اور ہر غم اور خوشی میں چھوٹے بڑے برابر ایک ہی جذبہ سے شریک ہوتے ہوں تو یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ اس معاشرے میں محبت اور آشتی کے کیسے پھول کھلتے ہوں گے۔ اور کس قدر خوشحالی، آسودگی اور اطمینان کی گھٹا ان کے سروں پر سایہ کناں رہتی ہوگی۔

فحشآء کا مفہوم

اوپر کی تین بھلائیوں کے مقابلے میں تین بُرائیوں سے روکا گیا ہے۔ یعنی تین باتوں کا حکم دیا گیا ہے، جس سے اسلامی معاشرہ جنت بن سکتا ہے۔ اور تین باتوں سے روکا گیا ہے، جن سے رکنے میں اسلامی معاشرے کے لیے عافیت کی ضمانت دی جا سکتی ہے۔ ان تین میں سے پہلی بُرائی فحشآء ہے۔ کل قبیح من قول و فعل ہر وہ کام اور ہر وہ بات جو قبیح ہو اسے فحشآء کہتے ہیں۔ اس کا اطلاق تمام بے ہودہ اور شرمناک افعال پر ہوتا ہے یا یوں کہہ لیجئے کہ ہر وہ بُرائی جو اپنی ذات میں نہایت قبیح ہو اسے فحش یا فحشآء کہتے ہیں۔ مثلاً بخل، زنا، برہنگی، عریانی، عملِ قومِ لوط، محرمات سے نکاح کرنا، چوری، شراب نوشی، بھیک مانگنا، گالیاں بکنا اور بدکلامی کرنا وغیرہ۔ اسی طرح علی الاعلان بُرے کام کرنا اور بُرائیوں کا پھیلانا بھی فحش ہے۔ مثلاً جھوٹا پروپیگنڈا، تہمت تراشی، پوشیدہ جرائم کی تشہیر، بدکاریوں پر ابھارنے والے افسانے اور ڈرامے اور فلم اور عریاں تصاویر، عورتوں کا بن سنور کر منظر عام پر آنا، علی الاعلان مردوں اور عورتوں کے درمیان اختلاط ہونا اور سٹیج پر عورتوں کا ناچنا اور تھرکنا اور ناز و انداز کی نمائش کرنا وغیرہ۔ (تفہیم القرآن)

Marfat.com

قومیں جب زوال کا شکار ہوتی ہیں تو ان کے زوال کی انتہا یہ ہوتی ہے کہ ان میں سے کچھ لوگ بے حیائی کے کاموں پر اس قدر دلیر ہو جاتے ہیں کہ انھیں نہ اللہ تعالیٰ کا خوف رہتا ہے اور نہ بندوں سے حیا رہتی ہے بلکہ وہ اپنی بے حیائی پر اتراتے اور اسے اپنی ترقی کی علامت سمجھتے ہیں۔ حضرت علیؓ کا مشہور قول ہے کہ ہماری عید اس دن ہوتی ہے جس دن ہم گناہ کے ہر تصور سے محفوظ رہیں، لیکن ان لوگوں کے لیے وہ گھڑی، وہ وقت، وہ دن اور وہ رات انتہائی اذیت ناک ہوتی ہے جب ان کے سفلی جذبات کی تسکین کا سامان نہیں ہوتا۔

اور بیشتر لوگ وہ ہوتے ہیں جنھیں حیا اور بے حیائی اور نیکی اور بُرائی کی علامت بھول جاتی ہے۔ اور ان کے اندر سے یہ احساس مر جاتا ہے کہ ان دونوں میں کوئی فرق ہے بھی یا نہیں۔ وہ گناہ کو صواب اور صواب کو گناہ سمجھتے ہیں۔ انھیں اچھائی سے خوشی نہیں ہوتی اور بُرائی سے افسوس نہیں ہوتا۔ ان کے اندر ایک نیا معدہ اور نیا دل وجود میں آتا ہے جس سے ان کی ساری زندگی متاثر ہوتی ہے۔ آج جب ہم اپنی اجتماعی اور ملکی زندگی کو دیکھتے ہیں تو صاف نظر آتا ہے کہ ہم زوال کی تکمیل کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ کل تک جو چیز گناہ تھی اور شریف گھرانوں میں جس کا تصور بھی داخل نہیں ہو سکتا تھا، آج وہ ہر گھر کی زینت بن چکا ہے۔ بے حیائی ہماری خواب گاہوں تک پہنچ گئی ہے۔ مرد و زن کا اختلاط اب بُرائی نہیں فیشن بن گیا ہے۔ والی اللہ المشتکیٰ۔

منکر کا مفہوم

دوسری چیز جس سے منع کیا گیا ہے وہ منکر ہے۔ منکر کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ وہ معروف کا ضد ہے۔ معروف ان تمام اچھی باتوں کو کہتے ہیں جس کا ہر اچھی سوسائٹی میں چلن ہو۔ اور عقلِ سلیم جس کے صحیح ہونے پر ناطق ہو۔ وہ مزاج جو شریعت کے سانچے میں ڈھلا ہو وہ اسے قبول کرنے سے انکار نہ کرے۔ اس کے مقابلے میں منکر وہ ہوگا جو کسی اچھی سوسائٹی کا چلن نہ بن سکے، جسے عقلِ سلیم قبول کرنے سے انکار کرے۔ اور شریعت کے سانچے میں ڈھلا ہوا مزاج اس سے کراہت محسوس کرے۔

دوسرا مفہوم یہ ہے کہ منکروہ ہے جسے تمام سابقہ شریعتوں نے ناپسند کیا اور یا ماانکرہ الشرع بالنھی عنہ جس چیز کو شریعت اسلامی نے ناپسند بھی کیا ہو اور اس سے روکا بھی ہو۔ اس میں وہ تمام مکروہ چیزیں آجاتی ہیں جن سے آنحضرت ﷺ نے روکا یا آپؐ نے انھیں ناپسند فرمایا۔ چاہے آپؐ کی ناپسندیدگی نص صریح سے ثابت ہو یا دلالت و اقتضا سے۔

بغی کا مفہوم

تیسری چیز جس سے روکا گیا ہے، وہ ہے بغی۔ جس کے معنی سرکشی، تعدی، اپنی حد سے تجاوز کرنا اور دوسرے کے حقوق پر دست درازی کرنا۔ کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ آدمی اپنی طاقت اور اپنے زور و اثر سے ناجائز فائدہ اٹھا کر دوسروں کو دبانے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسی صورت میں اس کا تعلق حقوق العباد سے ہوگا۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی اپنی حدود کو نہیں پہچانتا اور اپنی بندگی کی حد کو پھلانگتا ہوا الوہیت کی حدود میں داخل ہو جاتا ہے۔ اور شرعی احکام کی پابندی کی بجائے اپنے احکام چلانے کی کوشش کرتا ہے یا ہوائے نفس کو اپنا معبود بنا لیتا ہے۔ یہ تمام سرکشی کی صورتیں ہیں جس سے بندگی کا تصور پامال ہو جاتا ہے۔

وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدْتُّمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَيْكُمْ كَفِيْلًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ ﴿٩١﴾ (سورۃ النحل : ۹۱)

(اور اللہ تعالیٰ کے عہد کو پورا کرو، جب تم نے اس سے عہد کر لیا اور اپنی قسمیں نہ توڑو، انھیں پختہ کرنے کے بعد حالانکہ تم اللہ تعالیٰ کو اپنے اوپر گواہ بنا چکے ہو۔ بیشک اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو تم کرتے ہو۔ 91)

Marfat.com

ایفائے عہد پر زور

گزشتہ آیتِ کریمہ میں کچھ اوامر و نواہی دیے گئے ہیں جن کی اصل روح مکارمِ اخلاق اور اخلاقی قدروں کی ہے۔ چنانچہ اب اسی سلسلے کی ایک اور اہم بات کی طرف توجہ دلائی جارہی ہے جس پر صرف اخلاقی قدروں کا ہی نہیں بلکہ پوری انسانی زندگی کی فلاح کا دارومدار ہے اور وہ ہے عہد کی پابندی۔ حکم دیا جارہا ہے کہ جب ایک شخص اسلام قبول کرتا ہے تو وہ کلمے کی صورت میں اللہ تعالیٰ سے کچھ عہد کرتا ہے جسے مختصر لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ میں عہد کرتا ہوں کہ میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو اِلٰہ نہیں بناؤں گا، کسی کو معبود نہیں سمجھوں گا، کسی کو حاکمِ حقیقی نہیں جانوں گا، کسی کے سامنے سر نہیں جھکاؤں گا، اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کا خوف دل میں نہیں آنے دوں گا، حقیقی محبت اسی سے کروں گا اور نفرت بھی ہر اس شخص سے کروں گا جو اللہ تعالیٰ کا دشمن ہوگا اور میں یہ عہد بھی کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اور بندوں کے درمیان ہدایت کا ذریعہ محمد (ﷺ) کو جانوں گا، انھیں کو اپنا آئیڈیل بناؤں گا، انھیں کی زندگی کو اپنا رہنما سمجھوں گا، انھیں کا اسوۂ حسنہ میرے لیے قانون ہوگا۔ اس عہد کے بعد ایک مسلمان کی زندگی یکسر دوسروں سے مختلف ہوجاتی ہے۔ وہ ایک خاص قانون کا پابند اور ایک خاص راستے کا مسافر بن جاتا ہے۔ اس کے اہداف بدل جاتے ہیں، اس کی منزل متعین ہوجاتی ہے۔ اس میں ذرا سی کمزوری اسلامی رشتے کی شکست وریخت کا سبب بنتی ہے اور دنیا و آخرت کا تصور بگڑ جاتا ہے۔

ایک شخص معاملات کی دنیا میں بہت دفعہ دوسروں سے معاہدے کرتا ہے اور ان معاہدوں کی توثیق کے لیے باہمی قسمیں بھی کھائی جاتی ہیں اور اسے مزید مؤکد بنانے کے لیے اللہ تعالیٰ کو گواہ بھی بنایا جاتا ہے۔ یہ ساری کاوشیں عہد کو پختہ کرنے کے لیے ہوتی ہیں کیونکہ اگر ایفائے عہد کا جذبہ مرجائے اور معاہدوں کا احترام باقی نہ رہے تو زندگی کے بیشتر معاملات ابتر ہو کے رہ جائیں۔ اس لیے یہاں بھی حکم دیا گیا ہے کہ جب آپس کے معاہدات کرو تو انھیں توڑنے کی غلطی نہ کرنا۔ ایک تو وعدہ شکنی اور معاہدہ شکنی بجائے خود جرم ہے اور مزید اس پر قسموں کو توڑنا اور اللہ تعالیٰ کو گواہ بنا کر اس کی مخالفت کرنا بہت بڑی جسارت ہے۔ ایسا کرنے کی کبھی کوشش نہ کرنا اور اگر ایسا کرو گے تو یاد رکھو اللہ تعالیٰ تمھارے اعمال سے واقف ہے۔ وہ ایک ایک عمل کو جانتا ہے اور اس کے مطابق سلوک کرے گا۔

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّتِيْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا ۭ تَتَّخِذُوْنَ اَيْمَانَكُمْ دَخَلًۢا بَيْنَكُمْ اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِىَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ ۭ اِنَّمَا يَبْلُوْكُمُ اللّٰهُ بِهٖ ۭ وَلَيُبَيِّنَنَّ لَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۹۲﴾

(اس عورت کی طرح نہ ہوجاؤ جس نے توڑ ڈالا اپنے سوت کو مضبوط کاتنے کے بعد اور تار تار کر ڈالا، تم اپنی قسموں کو ایک دوسرے کو فریب دینے کا ذریعہ بناتے ہو تا کہ اس طرح ہوجائے ایک گروہ زیادہ فائدہ اٹھانے والا دوسرے گروہ سے، اللہ تعالیٰ تمھیں ان قسموں کے ذریعے آزماتا ہے اور وہ قیامت کے دن تم پر واضح کردے گا ان باتوں کو جن میں تم اختلافات کیا کرتے تھے۔ ۹۲) (سورۃ النحل:۹۲)

قریش کے معاہدوں کی ایک بری مثال

اس آیتِ کریمہ میں خطاب تو مسلمانوں سے ہے لیکن اشارہ مشرکینِ عرب کے سیاسی چلن کی طرف ہے جسے وہ اپنے تئیں بڑی دور اندیشی اور سیاسی دانش کا مظہر سمجھتے تھے۔ مشرکینِ مکہ کا طریقہ یہ تھا کہ وہ اپنے قبائل کی ضرورتوں کے تحت قبائل سے معاہدات کرتے رہتے تھے اور یہ معاہدے دراصل ان کے آپس کی قوت کا مظہر ہوتے تھے۔ ایک چھوٹا قبیلہ اگر کسی بڑے قبیلے سے معاہدہ کرنے میں کامیاب ہوجاتا تو وہ اسے بہت بڑی کامیابی سمجھتا کیونکہ اب کسی دوسرے قبیلے کے لیے اس قبیلے پر حملہ کرنا آسان نہ تھا۔ باہمی معاہدہ کرنے والے قبیلے چونکہ ایک دوسرے کی قوت کا ذریعہ تھے، اس لیے ہر قبیلے کی خواہش ہوتی کہ میں کسی کمزور قبیلے سے معاہدہ کرنے کی بجائے کسی طاقتور قبیلے سے معاہدہ کروں۔ چنانچہ جب کبھی ایسا کوئی موقع پیدا ہوتا تو

Marfat.com

وہ فوراً اس موقعہ سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے۔ چاہے یہ نیا قبیلہ پہلے حلیف قبیلے کا دشمن ہی کیوں نہ ہو، حالانکہ معمولی عقل اور اخلاق کا آدمی بھی اس بات کو سمجھتا تھا کہ تم پہلے ایک قبیلے سے معاہدہ کر چکے ہو اب اس کی اجازت کے بغیر اس کے دشمن قبیلے سے معاہدہ کیسے کیا جا سکتا ہے۔ لیکن عرب ایسی باتوں کو ڈپلومیسی سمجھتے تھے جس میں کامیابی ان کے لیے بڑی عزت کی بات تھی اور یہ بالکل وہی سیاست ہے جو آج دنیا کا چلن ہے کہ تمھیں اپنے قومی مفادات اور قومی تحفظات کے لیے چاہے کیسا ہی جھوٹ بولنا پڑے اس کی پروا نہ کرو۔ اس لیے کہ اخلاقی باتوں کا تعلق انسانوں کی انفرادی زندگی سے ہے۔ اجتماعی زندگی میں صرف مفادات پیشِ نظر رہنے چاہئیں، اخلاقیات کی پروا نھیں ہونی چاہیے۔ چنانچہ قرآن کریم مشرکین کی کمزوری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مسلمانوں کو توجہ دلا رہا ہے کہ تم نئے نئے دائرہ اسلام میں داخل ہوئے ہو اور تم اس سے پہلے اسی دائرے میں زندگی گزار چکے ہو جس میں اخلاقیات کا گزر نھیں۔ لہٰذا اب تمھیں نہایت احتیاط سے زندگی گزارنا ہے۔ معاہدوں کی دنیا میں افراد اور اقوام کی پہچان ایفائے عہد سے ہوتی ہے۔ مفادات کو دیکھ کر کسی ایک قبیلے سے کیا ہوا معاہدہ توڑ دینا بدترین عہد شکنی ہے۔ جو بندوں سے عہد نھیں نبھاتا وہ اللہ تعالیٰ سے کیا ہوا عہد بھی پورا نھیں کر سکتا۔ ایسے ہی مواقع امتحان کی حیثیت رکھتے ہیں کہ معاہدے میں شریک اخلاقی اعتبار سے کس قدر بلند ہیں۔ اس لیے تم اخلاقی اعتبار سے جائزہ لیتے رہنا۔ کہیں تم میں بھی مفادات سے وابستگی اور ایفائے عہد سے بیپروائی پیدا تو نھیں ہو رہی۔ اور ان لوگوں کی طرح بننے کی کوشش نہ کرنا جن سے نکلنے کی اللہ تعالیٰ نے تمھیں توفیق بخشی ہے ورنہ تمھارا حال اس بڑھیا کا ہوگا جو دن بھر بڑی محنت سے سوت کاتتی ہے اور شام کو اسے تار تار کر کے پھینک دیتی ہے۔ تو ایسی بے سود محنت خسارے کے سوا اور کیا ہے۔ دنیا میں ہر طرح کے انسان ہیں جنھوں نے مختلف طریقے اختیار کر رکھے ہیں۔ تو اسی میں انسانوں کی آزمائش ہے۔ مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے اس آزمائش میں سرخرو ہونے کا موقع دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نہ کرے کہ اس میں کہیں دراڑ پڑے۔

وَلَوْشَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰـكِنْ يُّضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَلَـتُسْـَٔـلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۳﴾

(اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو وہ تم سب کو ایک ہی امت بنا دیتا، لیکن وہ جسے چاہتا ہے راہ بھلا دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے راہِ راست دکھا دیتا ہے اور تم سے ضرور پوچھا جائے گا جو کام تم کرتے تھے۔ ۹۳) (سورۃ النحل:۹۳)

جس طرح باقی دنیا کی قومیں اپنی قومی برتری، قومی مفادات کے حصول یا سیاسی وسائل کی فراہمی کے لیے ہر طرح کے فریب ڈپلومیسی کے نام سے کرنا جائز سمجھتی ہیں بلکہ ان کا جو لیڈر غلط سے غلط طریقے سے اپنے ملک کے لیے مفادات کے راستے نکالتا ہے اس کی زیادہ تحسین ہوتی ہے۔ اسے نہایت دانشور اور دنیا کی نبضوں پر ہاتھ رکھنے والا سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح مسلمان بھی دوسری قوموں کی ریس میں بعض دفعہ ایسی خرابیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ البتہ ان کے سامنے مفادات یا وسائل کا حصول نھیں ہوتا، وہ اسلام کی سربلندی اور امتِ مسلمہ کی توانائی کے لیے بعض دفعہ غلط ذرائع بھی اختیار کرتے ہیں۔ آج ایک قوم سے معاہدہ کیا کل کو دیکھا یہ معاہدہ ہمیں نقصان پہنچا سکتا ہے۔ خاموشی سے کسی دوسرے ملک سے بالکل اس کے برعکس کوئی سا معاہدہ کرنے سے دریغ نھیں کرتے جسے وہ مسلمانوں کے لیے زیادہ مفید سمجھتے ہیں۔ اور دلیل ان کی یہ ہوتی ہے کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں اپنی ذات کے لیے تو نھیں کر رہے، پیشِ نظر صرف اسلام اور مسلمانوں کا مفاد ہے۔ اس آیت میں یہ فرمایا گیا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ ہوتی کہ ساری دنیا میں صرف امتِ مسلمہ رہے اور وہی سربلند ہو چاہے اس کے لیے کیسے ہی غلط طریقے اختیار کرنا پڑیں تو پھر یہ کام تم پر چھوڑنے کی کیا ضرورت تھی، اللہ تعالیٰ خود یہ کام اپنی قدرتِ کاملہ سے انجام دے سکتے تھے اور ساری دنیا کی قوموں کے تشخصات کو توڑ کر ایک امتِ مسلمہ میں تبدیل کر سکتے تھے۔ لیکن یہ بات اللہ تعالیٰ کی مشیت کے خلاف ہے۔ اس نے زمین پر انسانوں کو بھیج کر ان کی عقل اور ان کی قوتِ تمیز کا امتحان لیا ہے۔ افراد اور قومیں اسی امتحان میں کامیابی یا ناکامی کے باعث گمراہ ہوتے یا ہدایت پاتے ہیں۔ اور اسی حوالے سے کل کو فیصلہ ہونے والا ہے۔ اور یہی وہ اصول ہے جس کے مطابق کل کو تم سے ضرور پوچھا جائے گا کہ تمھارا نامۂ اعمال کیا ہے۔

Marfat.com

وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اَيْمَانَكُمْ دَخَلًاۢ بَيْنَكُمْ فَتَزِلَّ قَدَمٌۢ بَعْدَ ثُبُوْتِهَا وَ تَذُوْقُوا السُّوْٓءَ بِمَا صَدَدْتُّمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَلَكُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۹۴﴾ (سورة النحل : ۹۴)

(اور نہ بناؤ اپنی قسموں کو ایک دوسرے کو دھوکہ دینے کا ذریعہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی قدم جمنے کے بعد اکھڑ جائے اور تم اس جرم کی پاداش میں کہ تم نے لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی راہ سے روکا بُرا نتیجہ دیکھو اور تمھارے لیے بڑا عذاب ہے۔ ۹۴)

مسلمانوں کو ایک اور بداخلاقی سے بچنے کی ہدایت

اس آیتِ کریمہ میں مسلمانوں کو ایک اور بداخلاقی سے بچنے کی ہدایت کی گئی ہے جس میں قریشِ مکہ تو ہمیشہ سے مبتلا تھے، یہ دراصل انھیں کی کہانی بیان کی جارہی ہے اور اس کے پردے میں مسلمانوں کو ان کوتاہیوں سے بچنے کی ترغیب دی جارہی ہے۔ وہ بداخلاقی یہ ہے کہ بعض دفعہ مشرکین کسی شخص سے معاہدہ کرتے ہوئے یقین دلانے کے لیے قسم کھاتے۔ سننے والا یہ سمجھتا ہے کہ اب تو اس معاہدے کے سچا اور مؤکد ہونے میں کوئی شبہ نھیں۔ لیکن قسم کھانے والا درحقیقت فریب دینے کی نیت سے قسم کھاتا۔ اس کے دل میں قسم کھاتے ہوئے وعدے کو پورا کرنے کا نھیں بلکہ پورا نہ کرنے کا عزم ہوتا تھا۔ وہ نہایت سنجیدگی کے ساتھ بظاہر مخاطب کو یقین دلاتا لیکن دل ہی دل میں وہ خوش ہوتا کہ میں نے جال پھینکا ہے بس تمھارے پھنسنے کی دیر ہے پھر دیکھو میں تمھارے ساتھ کیا کرتا ہوں۔ آیتِ کریمہ میں توجہ دلائی جارہی ہے کہ تمھیں کچھ اندازہ ہے کہ تمھارے اس رویے کا نتیجہ کیا نکل سکتا ہے۔ دو نتیجوں میں سے ایک سے مفر نھیں۔ یا تو سننے والا وقتی طور پر ضرور کہنے والے کی بات سے متاثر ہوگا اور اس کے بارے میں ممکن ہے اچھی رائے بھی قائم کرے، لیکن جب اسے ایک عرصے کے بعد معلوم ہوگا کہ وہ قسم تو دھوکہ دہی کی ایک چال تھی تو وہ ضرور غور کرنے پر مجبور ہوگا کہ یہ مسلمان جو بلند اخلاقی اقدار کے دعویدار ہیں ان میں سے ایک آدمی اگر اللہ تعالیٰ کا نام لے کر دھوکہ دیتے ہوئے شرم نھیں کھاتا تو آپ ان لوگوں اور ان کے مذہب کے بارے میں کیا رائے قائم کریں گے۔ یقیناً جس کے ساتھ ایسا کیا گیا ہے وہ اسلام اور مسلمان دونوں سے بیگانہ اور بدگمان ہوجائے گا۔ اور اس سے بڑا نقصان اور کیا ہوسکتا ہے۔

دوسرا نتیجہ جس کا احتمال ہوسکتا ہے اور اس کی اس ترجمے میں گنجائش بھی موجود ہے، وہ یہ ہے کہ جو شخص ایسا کرے گا اس کا اپنا قدم ثبات قدم کے بعد بھی پھسل جانے کا اندیشہ ہے۔ یعنی اس کا خطرہ موجود ہے کہ وہ اسلام کے دائرے سے نکل جائے۔ اگر ایسا ہوتا ہے تو غور فرمایئے کہ اس نے قسم سے دھوکہ دے کر اپنے لیے اور اسلام کے لیے کیا کمایا۔ یقیناً ایسے آدمی کے حصے میں بدترین عذاب آئے گا اور وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے سزا کا مستحق ہوگا۔

وَلَا تَشْتَرُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۭ اِنَّمَا عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۹۵﴾

(اور اللہ تعالیٰ کے عہد کو متاعِ قلیل کے بدلے میں مت بیچو، جو کچھ اللہ تعالیٰ کے پاس ہے وہ بہتر ہے اگر تم جانو۔ ۹۵) (سورۃ النحل: ۹۵)

اشتراء اور ثمن قلیل کا مفہوم

زمانہ قدیم میں بیع شراء یا خرید وفروخت عموماً اجناس کی صورت میں ہوتی تھی جس میں ہر ایک چیز مبیع بھی بن سکتی تھی اور ثمن بھی۔ اس لحاظ سے شراء کا معنی حقیقت میں مبادلہ ہوتا تھا یعنی دو چیزوں کا آپس میں تبادلہ اور پھر اسی سے آگے بڑھ کر یہ ترجیح کے معنی میں بولا جانے لگا کیونکہ خریدار ایک چیز لیتا ہے اور بیچنے والا ایک چیز دیتا ہے اور دونوں آپس میں دو چیزوں کا تبادلہ کرتے ہیں۔ لیکن اس کے پیچھے جو جذبہ کارفرما ہے وہ یہ ہے کہ لینے والا اپنے ثمن پر مبیع کو ترجیح دے رہا ہے اور بیچنے والا مبیع پر ثمن کو ترجیح دے رہا ہے کہ دونوں میں سے ہر ایک جس چیز کو ترجیح دے رہا ہے وہ اسے حاصل کرلیتا ہے، اسے اشتراء یا شراء کہتے ہیں۔ آیتِ کریمہ میں یہ بات فرمائی جارہی ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے عہد کو ثمنِ قلیل کے بدلے میں مت بیچو۔ مراد یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے

Marfat.com

ساتھ دین کی پابندی کا جو عہد کر چکے ہو اور جس کی تفصیلات کتاب اللہ میں موجود ہیں یہی درحقیقت تمہاری زندگی ہے۔ لیکن جب یہ کتاب اور اللہ تعالیٰ سے کیا ہوا عہد تمہاری زندگیوں میں اپنا وزن کھو دیتا ہے اور مادی زندگی تم پر غالب آجاتی ہے اور روحانی اور اخروی زندگی قصۂ پارینہ بن جاتی ہے تو پھر تم مادی زندگی کی ایک ایک بات کے بدلے میں روحانی اور اخروی زندگی یا دینی زندگی کی ایک ایک قدر کو چھوڑتے جاتے ہو۔ یہی دراصل اللہ تعالیٰ کے عہد کو ثمنِ قلیل کے بدلے میں بیچنا ہے۔ اور اس ثمن کو ثمنِ قلیل اس لیے کہا گیا ہے کہ تم روحانی اور اخروی زندگی کے مقابلے میں جس مادی زندگی کو پیش کرتے ہو وہ تمہارے نزدیک کتنی بھی قیمتی ہو لیکن حقیقت میں وہ آخرت کے مقابلے میں ثمنِ قلیل کہلانے کی بھی مستحق نہیں کیونکہ دنیا اور آخرت کا کیا مقابلہ۔ ایک باقی دوسری فانی۔ ایک کی عمر چند سال، دوسری کو زوال ہی نہیں۔ ایک کی نعمتیں بے مثال اور دوسرے کی نعمتوں کا کوئی بھروسہ ہی نہیں۔ تو جو شخص دنیا کو دین پر ترجیح دیتا ہے وہ دراصل بے شمار خزانوں کے بدلے میں چند دمڑیاں وصول کرتا ہے۔

تفسیر بحرِ محیط کے مصنف ابن عطیہ نے ایک اور بات فرمائی اور خوب فرمائی کہ اس آیتِ کریمہ میں ہر طرح کی رشوت کو حرام قرار دیا گیا ہے وہ اس طرح کہ ابنِ عطیہ کے نزدیک رشوت کی تعریف یہ ہے کہ **اخذ الاموال علی فعل ما یجب علی الاخذ فعله او فعل مایجب علیه ترکه** ''اس کام پر معاوضہ دینا جس کا کرنا لینے والے پر واجب ہو اور اس کام کے چھوڑنے پر معاوضہ دینا جس کا چھوڑنا اس کے ذمہ لازم ہو، یہ رشوت ہے۔'' (تفسیر بحرِ محیط: ص ۵۳۳ ج ۵)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب آدمی کسی ذمہ داری کو قبول کرتا ہے تو کچھ فرائض اس پر عائد ہوتے ہیں جنھیں کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اگر ان فرائض کا تعلق بندوں کے حقوق سے ہے تو بندوں کے حقوق کی ادائیگی اس کے ذمہ لازم ہے۔ اسی چیز کو اللہ تعالیٰ کا عہد کہا جاتا ہے۔ اسی طرح ہر صاحبِ منصب کو اس بات کا پابند کیا جاتا ہے کہ آپ فلاں فلاں کام نہ کرنے کے پابند ہیں۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ سے کیا ہوا ایک عہد ہے۔ چنانچہ جب ایک صاحبِ منصب کے پاس کوئی حق لینے والا اپنے حق کا مطالبہ لے کر آتا ہے جبکہ یہ مطالبہ پورا کرنا اس صاحبِ منصب کی ذمہ داری ہے اور یہ اللہ تعالیٰ سے کیے ہوئے عہد میں شامل ہے۔ لیکن صاحبِ منصب یہ کہتا ہے کہ میں تمہارا حق تمھیں نہیں دلاؤں گا جب تک تم مجھے اس کا معاوضہ نہ دو، یہ رشوت ہے۔ اسی طرح اگر وہ صاحبِ منصب اپنے محکمے کی کوئی چیز معاوضہ لے کر کسی شخص کو دے دیتا ہے جبکہ وہ اس کی حفاظت کا ذمہ دار ہے تو یہ بھی رشوت ہے۔ اور یہاں رشوت اللہ تعالیٰ کے عہد کو توڑ کر ثمنِ قلیل کی صورت میں وصول کی گئی ہے۔ چنانچہ اسی کا حکم دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے عہد کو ثمنِ قلیل کے بدلے میں نہ بیچو کہ تم جو رشوت کا مال لے رہے ہو اور ایسے کام کے بدلے میں لے رہے ہو جو تمہاری ذمہ داری تھی۔ یہ تمہارا اپنے اللہ تعالیٰ سے عہد تھا۔ سوچو تم نے ایک حقیر معاوضے کے بدلے میں کتنی بڑی متاع کو برباد کر دیا ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے حلال پر اکتفا کرنے والوں اور اللہ تعالیٰ کے وعدوں پر صبر کے ساتھ زندگی گزارنے والوں کے ساتھ بہت سے وعدے کر رکھے ہیں۔ ان وعدوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ایسے عطایا اور بخششیں ہیں آج تم جس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اگر تم ان کے بارے میں کچھ بھی جانتے ہوتے یعنی یقین سے جانتے ہوتے تو کبھی تم میں یہ کمزوریاں پیدا نہ ہوتیں۔

مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ ۗ وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِيْنَ صَبَرُوْٓا اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾

(جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ ختم ہو جائے گا اور جو کچھ اللہ تعالیٰ کے پاس ہے وہ باقی رہنے والا ہے۔ ہم ضرور صبر سے کام لینے والوں کو ان کے اجر، ان کے بہترین اعمال کے مطابق دیں گے۔ ۹۶) (سورۃ النحل: ۹۶)

اہلِ ایمان کے لیے بشارت

گزشتہ آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ سے تعلق اور اس کے عہد کے مقام و مرتبہ کو نمایاں کرتے ہوئے فرمایا کہ دیکھنا کبھی بھی اللہ تعالیٰ کے دین کی کسی بات کو دنیا کے خزف ریزوں کے بدلے میں بدلنے کی کوشش نہ کرنا۔ ساری دنیا کی دولت بھی اس کی ایک ایک آیت کے مقابلے میں ثمنِ قلیل سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ پھر اسی مضمون کو مزید واضح کرنے کے لیے اس آیتِ کریمہ میں فرمایا کہ تمھیں اگر ساری دنیا کے وسائل بھی میسر آجائیں وہ بہرحال فنا ہونے والے ہیں، لیکن تمہاری قربانیوں اور تمہارے اعمال کے بدلے میں جو کچھ تمھیں میسر آنے والا ہے وہ فانی نہیں، باقی اور ابدی ہے۔ خود غور کرو کہ ختم ہونے والی چیز اور باقی رہنے والی چیز کا کیا مقابلہ ہے۔ اور اگر اسے لینے کا اختیار دیا جائے تو دونوں میں

Marfat.com

سے کس کا انتخاب قرینِ عقل ہوگا؟ اور مزید یہ بات فرما کر اس مضمون کی قدر و قیمت میں ناقابلِ بیان اضافہ فرمادیا ہے کہ بلاشبہ دنیا میں جولوگ اللہ تعالیٰ کے دین کے احکام کے مطابق زندگی گزارتے ہیں اور شرک کے مقابلے میں توحید کا رویہ اپناتے ہیں انھیں قسم قسم کی تکلیفوں سے واسطہ پڑتا ہے، لیکن جولوگ دنیا کے مصائب پر صبر اختیار کرتے ہیں اور قدم قدم پر اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کو اپنی منزل بنا لیتے ہیں۔ اس آیت میں فرمایا گیا ہے کہ ہم ان کے اس صبر اور ثباتِ قدم کا قیامت کے دن جو اجر و ثواب دیں گے وہ ان کے بہترین اعمال کے مطابق ہوگا۔ ممکن ہے ثابت قدمی اور استقلال میں وہ کہیں کمزوری دکھا جائیں لیکن اللہ تعالیٰ ان کے اجر و ثواب میں کوئی کمی نہیں رہنے دے گا بلکہ اجر و ثواب پانے والے اپنے اعمال کی کم مائیگی اور اجر و ثواب کی بڑھوتری کو اللہ تعالیٰ کے شکر و امتنان کے اظہار میں رطب اللسان ہو جائیں گے۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۷﴾ (سورة النحل : ۹۷)

(جوکوئی نیک عمل کرے گا خواہ مرد ہو یا عورت اور وہ صاحبِ ایمان ہے تو ہم اس کو ایک پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے اور ہم ان کو ان کے بہترین اعمال کا صلہ دیں گے۔ ۹۷)

غلط فہمیوں کا ازالہ

وحیِ الٰہی یا دین کی رہنمائی کے بارے میں دنیا میں دو طرح کی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ ایک غلط فہمی تو یہ ہے کہ اہلِ دنیا یہ سمجھتے ہیں کہ اگر انسان زندگی ان ہدایات کے مطابق گزارے جیسے اللہ تعالیٰ کے نبیؐ کہتے ہیں تو پھر انسان ایک کامیاب زندگی نہیں گزار سکتا۔ قدم قدم پر شرعی اور اخلاقی رکاوٹیں انسان کے قدم روکتی ہیں۔ اسے جہاں بھی زیادہ سے زیادہ دولت کمانے کا موقع ملتا ہے تو شریعت اس کے سامنے حلال وحرام اور جائز و ناجائز کی زنجیریں لے کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ دنیا میں بہتر زندگی کے لیے دنیا طلبی کو مقصدِ زندگی بنانا پڑتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے نبیوں کی ہدایت اس سے ابا کرتی ہے۔ انسان چاہتا ہے کہ مجھے زندگی میں خوشیاں نصیب ہوں، مجھے کھل کھیلنے کا موقع ملے۔ میری خواہشات کے بروئے کار آنے کے مواقع پیدا ہوں۔ لیکن ایسے کتنے مواقع ہیں جن پر شریعت قدغن عائد کرتی ہے۔ ان چیزوں کو دیکھتے ہوئے دنیا کے سطحیت پسندوں نے یہ سمجھ لیا کہ اگر زندگی میں عیش کرنے ہیں تو پھر دین پر چلنے سے انکار کردو۔ اور اگر دین اور اخلاق کے مطابق زندگی گزارنی ہے تو پھر اپنی خواہشات کا گلا گھونٹ دو۔ یہ دونوں ایک ساتھ نہیں چل سکتے۔ اگر تم اسلامی شریعت کے اصولوں کے مطابق کاروبار کرتے ہو تو تمہارے گھر میں دولت کی ریل پیل کبھی نہیں ہو سکتی۔ اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے اس تصور کی اصلاح فرمائی، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جسے ہم کامیابی کہتے ہیں وہ اپنے اختیار کردہ اصولوں کے مطابق زندگی گزارنے کا نام ہے۔ اسلام سب سے پہلے ہمیں زندگی کی حقیقت سے آشنا کرتا ہے۔ اس کے بعد اس کے اہداف مقرر کرتا ہے، پھر زندگی کے ان راستوں کو کھولتا ہے جن پر چل کر اہداف حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ آدمی جیسے جیسے ان اہداف کے اصول میں آگے بڑھتا جاتا ہے ویسے ویسے اس کی زندگی میں آسودگی آتی جاتی ہے۔ وہ انسان کی اجتماعی زندگی میں اپنی بھلائی کے ساتھ دوسروں کی بھلائی بھی چاہتا ہے۔ وہ تجارت وصنعت میں اپنے اوقات کی قیمت کا تعین کرتا ہے، پھر دیانت وامانت کی اخلاق قدروں کو زندگی کا رہنما بنا کر تجارت وصنعت کو پھیلاتا چلا جاتا ہے اور زندگی کے فرائض کی پاسداری کو ذہن سے کبھی محو نہیں ہونے دیتا۔ اس فریم ورک میں جو زندگی گزرتی ہے اس میں خوشیاں پوری آب و تاب سے موجود رہتی ہیں۔ ترقی کے تمام امکانات اپنی جائز حدود میں ہر طرح انسان کی گرفت میں ہوتے ہیں۔ وہ اپنی زندگی کی حقیقت کو جاننے کے بعد یہ سمجھتا ہے کہ مجھ سے زیادہ خوش قسمت شاید ہی دنیا میں کوئی ہو۔ وہ اپنی خوش قسمتی، دولت کی فراوانی کے ساتھ ساتھ ادائے حقوق کی توفیق میں سمجھتا ہے۔ وہ انسانی آبادی کو جنگل میں منتشر درندوں کی بھیڑ نہیں سمجھتا بلکہ تمام انسانوں کو ایک اکائی اور ایک باپ کی اولاد اور ایک رب کے بندے سمجھتا ہے جو اپنے نفع و نقصان میں ایک دوسرے کے ساتھ شریک ہیں جن کی خوشیاں سب کی مشترک خوشیاں ہیں اور جن کے غم سب کے سانجھے غم ہیں۔ اس کے یہاں انفرادیت کا ایک خاص دائرہ

Marfat.com

ہے جس کے بعد وہ اجتماعیت میں گم ہو جاتا ہے۔ مسلمانوں کی آبادیاں جزیروں میں بٹی ہوئی آبادیاں نہیں بلکہ رواں دواں ندی کی طرح ہیں۔ اس کا مالدار بے پایاں لوگوں کے لیے کفالت کا ٹھنڈا سایہ ہے اور اس کا مزدور اور غریب شخص مالداروں کے لیے دعا گو ہے۔ غریب مالداروں سے حسد نہیں کرتا اور امیر اپنے آپ کو مالک نہیں بلکہ امین سمجھتا ہے۔ اگر شہر میں غلے کی کمی واقع ہو جاتی ہے تو حضرت عبدالرحمٰن ابن عوفؓ اپنے غلے کا تجارتی قافلہ روک لیتے ہیں۔ تاجر یکے بعد دیگرے آ کر بھاؤ چکانے کی کوشش کرتے ہیں تو آپؓ یہ کہہ کر ٹال دیتے ہیں کہ اس سے زیادہ بھاؤ لگ چکا ہے۔ اچانک آپؓ اعلان کرتے ہیں کہ تمام ضرورت مند اپنی ضرورتوں کے مطابق آ کر غلہ لے جائیں اور کسی سے قیمت وصول نہیں کی جائے گی کیونکہ مجھے یقین ہے کہ جو قیمت اس پر خرچ آئی ہے اللہ تعالیٰ مجھے اسے کئی گنا بڑھا کر لوٹائے گا۔

آنحضرت ﷺ نے جو اسلامی معاشرہ تیار کیا تھا یہ اس کی واحد مثال نہیں بلکہ اس میں سے ایک ایک شخص اپنے وسائل اور ہمت کے مطابق حضرت عبدالرحمٰن ابن عوفؓ جیسا جذبہ رکھتا ہے۔ اور یہ حیات طیبہ ہے جو پروردگار اپنے اوپر ایمان لانے والوں کو عطا کرتا ہے بشرطیکہ دل ایمان کی روشنی سے تابندہ ہوں اور عمل قدم قدم پر اسلامی شریعت کی ترجمانی کرتا ہو۔

دوسری غلط فہمی جس کا ازالہ کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ عورتوں کے ذہن میں یہ بات ڈالی گئی ہے کہ دنیوی اور اخروی تمام تر سعادتیں مردوں کے لیے ہیں عورتوں کا اس میں کوئی حصہ نہیں۔ چنانچہ ایسے ہی احساس کے ساتھ حضرت ام سلمہؓ نے آنحضرت ﷺ سے اسی سے متعلق سوال کیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ دونوں کے لیے ہر سعادت کا دروازہ کھلا ہے۔ انھوں نے کہا حضور! مرد دولت کماتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں لٹا کر درجات حاصل کرتے ہیں۔ آپؐ نے انھیں جو کچھ فرمایا، اس کا مفہوم یہ تھا کہ عورتیں بھی حق ملکیت رکھتی ہیں اور شرعی حدود میں رہ کر اس میں اضافہ بھی کر سکتی ہیں۔ حضرت ام سلمہؓ نے مزید پوچھا کہ مردوں کے لیے تو سب سے بڑی سعادت کا راستہ یہ ہے کہ وہ جہاد کریں اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں کام آئیں جبکہ عورتیں اس سے محروم ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ عورت کا جہاد حج ہے اور شاید ایک موقع پر یہ بھی فرمایا کہ عورت کی سب سے بڑی سعادت یہ ہے کہ وہ اپنی گود میں مجاہدین کو تیار کرتی ہے۔ ایک اچھی نسل، اچھی ماں کی گود میں پرورش پاتی ہے۔ تاریخ بھی ہمیں یہی بتاتی ہے کہ جو قوم اچھی مائیں پیدا نہیں کر سکتی، وہ اچھے جانشینوں سے محروم رہتی ہے۔ آنحضرت ﷺ کی ایسی ہی ہدایات ہیں جس نے مسلمان عورت کو ایک خاص سانچے میں ڈھال دیا۔ اس کی نظریں گھر سے باہر نہیں گھر کے اندر قوم کی تقدیر تیار کرنے لگیں۔ اس کے شب و روز نے اپنا موضوع اپنے بچوں کو بنایا۔ اس نے اس طرح بچوں کی تربیت کی کہ وہ بڑے ہو کر اپنی ذات کو موضوع بنانے کی بجائے اللہ تعالیٰ کے دین کی سربلندی کو اور انسانی زندگی کی آسودگی کو اپنا ہدف بنایا۔ وہ جب تک زندہ رہے اسلام اور مسلمانوں کی قوت بن کے زندہ رہے اور جب کبھی اسلام یا مسلمانوں پر نازک وقت آیا تو انھوں نے اس کی جڑوں میں خون دینے سے بھی گریز نہ کیا۔

حضرت خنساءؓ اپنے دور کی عظیم شاعرہ اور مسلمان معاشرے کے لیے نمونے کی ماں تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں چار بیٹے دیے۔ جب جنگِ قادسیہ میں حق و باطل کا معرکہ برپا ہوا تو آپؓ نے اپنے چاروں بیٹوں کو بلا کر فرمایا کہ بیٹو! میں نے آج ہی کے دن کے لیے تمھیں پالا تھا۔ تم اپنے حسب و نسب میں نہایت پاکیزہ ہو۔ میں نے تمھارے ماموؤں کے دامن پر کوئی دھبہ نہیں لگایا۔ میری آرزو ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے دین کی سربلندی کے لیے ایک ایک کر کے اس طرح جان دو کہ تم ہر لگنے والا زخم اپنے سینے پر کھاؤ تاکہ قیامت کے دن میں تم پر فخر کر سکوں۔ چنانچہ یہ چاروں بیٹے میدانِ قادسیہ میں جہاد میں شریک ہوئے اور ایک ایک کر کے مردانہ وار اسلام کی عزت و حرمت پر نثار ہو گئے۔ جب ان میں سے ایک بھائی زخم کھا کر گرنے لگتا تو دوسرے بھائی کو آواز دے کر کہتا کہ اماں سے کہنا کہ میں نے سینے پر زخم کھا کر جان دی تھی۔ قاصد جب ان کی شہادت کی خبر لے کر ان کے گھر پہنچا، ماں کو اطلاع ہوئی، فرمایا قاصد کو ذرا روکو۔ چنانچہ دو نفل نماز پڑھی پھر قاصد سے ملیں۔ اس نے بتایا کہ آپؓ کے بیٹوں نے مردانہ وار سینے پر زخم کھا کر موت کا سامنا کیا۔ آپؓ کو مبارک ہو۔ فرمانے لگیں جب تم پہنچے تھے میں سمجھ گئی تھی کہ تم میرے بچوں کی شہادت کی خبر لائے ہو۔ لیکن میں نے منت مانی تھی کہ بچوں کی شہادت کی خبر سن کر میں اللہ تعالیٰ کے حضور دو رکعت نمازِ شکرانہ پڑھوں گی۔ اس لیے میں نے پہلے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور پھر تم سے خبر وصول کی۔

یہی مائیں تھیں جن کی گود میں اسلام پلتا تھا

دونوں غلط فہمیوں کو دور کرنے کے بعد مزید فرمایا کہ ہم مسلمانوں کو دنیا میں بھی سربلند کریں گے اور آخرت میں ہم ان کے بہترین اعمال کے مطابق تمام اعمال کا اجر و ثواب دیں گے۔

Marfat.com

فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ﴿۹۸﴾ (سورة النحل : ۹۸)
(پس جب تم قرآن پڑھنے لگو تو شیطانِ رجیم سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگ لیا کرو۔ ۹۸)

شیطانی فتنوں سے پناہ مانگنے کی ہدایت

یہ آیتِ کریمہ دراصل تمہید ہے ان اعتراضات کے جواب کی جو دشمنانِ دین نے دین اور قرآن کے حوالے سے اٹھائے اور اگلی آیتوں میں ان کا جواب دیا جارہا ہے لیکن ان سے پہلے قرآنِ کریم کے بارے میں ضروری ہدایت دی جارہی ہے، وہ یہ کہ جب تم قرآن پڑھنے لگو یا دوسرے لوگوں کے سامنے قرآن پڑھ کر سنانے لگو تو سب سے پہلے شیطانِ رجیم سے اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آجاؤ، کیونکہ شیطان کا کام ہی یہ ہے کہ وہ قرآن پڑھنے والے کو بھی گمراہ کرنے کی کوشش کرتا ہے اور جسے قرآنِ پاک پڑھ کر سنایا جاتا ہے اسے بھی گمراہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ پہلے تو قرآنِ پاک پڑھنے والے کے دل میں عجیب وغریب وسوسے پیدا کرتا ہے کہ تم اس کتاب کی تلاوت کر رہے ہو پہلے اس بات کا یقین تو پیدا کرو کہ یہ کتاب فی الواقع اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے اور واقعی نبی کریم ﷺ پر نازل ہوئی ہے۔ اور پھر اس کی کیا ضمانت کہ یہ کتاب واقعی اسے طرح محفوظ رہی جیسے نازل ہوئی تھی۔ اسے دنیا میں آئے ہوئے صدیاں گزر گئیں، یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ اس میں دیا ہوا نظامِ زندگی آج بھی قابلِ عمل ہے۔ خود مسلمانوں کو موجودہ رویہ اس کتاب کے بارے میں سب سے بڑا سوال ہے۔ پوری امتِ مسلمہ میں کہیں بھی اس کا نظام مکمل طور پر نافذ نہیں۔ اگر یہ آج کے دور میں کام دے سکتا تو یہ کیسے ممکن تھا کہ مسلمان اسے ماننے اور اس سے عقیدت رکھنے کے باوجود کسی مسلمان ملک میں اس کا تجربہ کرنے کی کوشش نہ کرتے۔ ایسے ہی کتنے سوالات ہیں جو پڑھنے والوں اور سننے والوں کے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں اور انھیں قرآنِ کریم کی طرف لانے کی بجائے اور دور کر دیتے ہیں۔ اس کے علاج کے طور پر سب سے پہلے یہ حکم دیا کہ اس سے پہلے کہ شیطان کوئی وسوسہ اندازی کرے اور ہر ممکن طریقے سے اس کے پڑھنے والوں کو اس سے دور کر دے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگو کہ ہمیں اس کے شرور اور اس کے وساوس سے محفوظ فرما اور اس کی شیطنت کے غلبے سے محفوظ رہنے کے لیے ہمیں اپنی پناہ عطا فرما۔

اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۹۹﴾ اِنَّمَا سُلْطٰنُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يَتَوَلَّوْنَهٗ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ (سورة النحل : ۹۹۔۱۰۰)
(بیشک اس کا ان لوگوں پر کچھ بھی زور نہیں چلتا جو ایمان لائے ہوئے ہیں اور اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں۔ ۹۹) اس کا زور صرف انھیں پر چلتا ہے جو اسے دوست رکھتے ہیں اور جو اللہ تعالیٰ کے شریک ٹھہرانے والے ہیں۔ ۱۰۰)

مومنوں پر شیطان کا اثر نہیں ہوتا

یوں تو یہ سابقہ آیت کے مضمون ہی کی مزید وضاحت ہے، لیکن بالواسطہ طور پر قرآن پر ایمان لانے والوں کے لیے ضمانت اور ایک وعدہ بھی ہے۔ اور دوسرے لفظوں میں یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ایک تسلی بھی ہے۔ کہنا یہ ہے کہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شیطان کے وساوس اور اس کے حربے بہت شدید ہیں۔ وہ بڑے بڑوں کو چکرا دیتا ہے۔ اس کے الجھاووں سے بچنا آسان نہیں۔ لیکن صاحبِ ایمان لوگوں کو اطمینان رکھنا چاہیے کہ جن کے پاس حقیقی ایمان کی قوت ہے اور وہ یقین کی قوت سے اللہ تعالیٰ کو مانتے ہیں اور کوئی شک وارتیاب کا کانٹا ان کے یقین میں سوراخ نہیں کرسکتا۔ اور مزید یہ کہ وہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ ہی پر توکل کرتے ہیں۔ ان کی فکر کو بھی اللہ تعالیٰ پر بھروسہ ہوتا ہے اور ان کا عمل بھی اسی کے سہارے پروان چڑھتا ہے۔ شیطان اپنی ساری کوششوں کے باوجود ان پر اثر انداز نہیں ہوسکتا۔ ہاں جو لوگ دعویٰ ایمان کا کرتے ہیں لیکن بھروسہ انھیں شیطان پر ہے۔ ان کے قلبی رشتے شیطانی قوتوں سے استوار رہتے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کو ماننے کی بجائے نہ جانے کس کس کو اس کا شریک ٹھہراتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ انھیں اللہ تعالیٰ کی پناہ نصیب ہوگی یا نہیں، کیونکہ جو شخص اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اور اس کے دین کے بارے میں یکسو نہیں ہوتا، اللہ تعالیٰ کی رحمت بھی اس کے لیے اپنا دروازہ نہیں کھولتی۔

Marfat.com

وَاِذَا بَدَّلْنَآ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ ۙ وَّاللّٰهُ اَعْلَمُ
بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مُفْتَرٍ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۱﴾
قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ لِيُثَبِّتَ الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ﴿۱۰۲﴾ وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ
يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ ؕ لِسَانُ الَّذِيْ يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ
اَعْجَمِيٌّ وَّهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۰۳﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ
بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۙ لَا يَهْدِيْهِمُ اللّٰهُ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۰۴﴾ اِنَّمَا
يَفْتَرِي الْكَذِبَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ
هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ﴿۱۰۵﴾ مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ
اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ
صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۰۶﴾
ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ
لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۷﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى
قُلُوْبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ﴿۱۰۸﴾
لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۰۹﴾ ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ

Marfat.com

هَاجَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا ثُمَّ جٰهَدُوْا وَصَبَرُوْٓا ۙ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۰﴾

رکوع: ۱۴ (اور جب ہم ایک آیت کی جگہ دوسری آیت بھیجتے ہیں اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو کچھ وہ اتارتا ہے تو یہ کہتے ہیں کہ تم تو اپنے جی سے گھڑ لینے والے ہو بلکہ ان میں کے اکثر علم نہیں رکھتے۔ ۱۰۱) (کہہ دیجیے کہ اس قرآنِ کریم کو روح القدس نے تمہارے رب کی جانب سے حق کے ساتھ اتارا ہے تاکہ ان لوگوں کو جمائے رکھے جو ایمان لائے ہیں، اور یہ ہدایت و بشارت ہو خدا کے فرمانبرداروں کے لیے۔ ۱۰۲) (ہم جانتے ہیں کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس کو تو ایک انسان سکھاتا ہے اس آدمی کی زبان جس کی طرف یہ منسوب کرتے ہیں، عجمی ہے، اور یہ فصیح عربی زبان ہے۔ ۱۰۳) (بیشک جو لوگ ایمان نہیں لاتے اللہ تعالیٰ کی آیتوں پر اللہ تعالیٰ انھیں ہدایت نہیں دیتا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ ۱۰۴) وہی لوگ جھوٹ تراشا کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی آیات پر ایمان نہیں لاتے اور یہی لوگ جھوٹے ہیں ۱۰۵) (جو اپنے ایمان لانے کے بعد اللہ تعالیٰ کا کفر کرے بجز اس کے جس پر جبر کیا گیا ہو اور اس کا دل ایمان پر جما ہوا ہو، لیکن جو کفر کے لیے سینہ کھول دے گا تو ان پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہوگا اور ان کے لیے عذاب عظیم ہے۔ ۱۰۶) (یہ اس وجہ سے کہ انھوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دی اور اللہ تعالیٰ کفر اختیار کرنے والوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔ ۱۰۷) (یہی لوگ ہیں جن کے دلوں اور کے سمع و بصر پر اللہ تعالیٰ نے مہر کردی اور یہی لوگ ہیں جو آخرت سے غافل ہیں۔ ۱۰۸) لازماً یہی لوگ ہیں جو آخرت میں ناکام و نامراد ہوں گے۔ ۱۰۹) (پھر یقیناً آپ کا رب ان لوگوں کے لیے، جنھوں نے آزمائشوں میں ڈالے جانے کے بعد ہجرت کی، پھر جہاد کیا اور ثابت قدمی دکھائی تو ان باتوں کے بعد بیشک آپؐ کا رب بڑا ہی بخشنے والا اور رحمت والا ہے۔ ۱۱۰)

وَاِذَا بَدَّلْنَآ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ ۙ وَّاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مُفْتَرٍ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۱﴾

(اور جب ہم ایک آیت کی جگہ دوسری آیت بھیجتے ہیں اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو کچھ وہ اتارتا ہے تو یہ کہتے ہیں کہ تم تو اپنے جی سے گھڑ لینے والے ہو بلکہ ان میں کے اکثر علم نہیں رکھتے۔ ۱۰۱) (سورۃ النحل:۱۰۱)

ایک اعتراض اور اس کا جواب

مشرکینِ مکہ قرآنِ کریم کے حوالے سے نبی کریم ﷺ پر جو اعتراضات کرتے تھے ان میں سے ایک اعتراض کا ذکر اس آیتِ کریمہ میں کیا گیا ہے۔ مشرکینِ مکہ کا بنیادی طور پر اعتراض یہ تھا کہ اگر یہ کلام اللہ تعالیٰ کا ہے اور ایک مقرب فرشتہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے اپنے پیغمبرؐ کے سینے پر اسے نازل کرتا ہے تو ہونا یہ چاہیے کہ ایسے کلام میں کبھی تبدیلی نہ آئے، کبھی اس میں کسی قسم کا نسخ نہ ہونے پائے۔ نہ الفاظ کے حوالے سے اور نہ مفہوم کے حوالے سے۔ اس آیتِ کریمہ میں چونکہ لفظ آیت کا آیا ہے اور آیت کا مفہوم عام طور پر حکم سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے اس آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ جب ہم کوئی نیا حکم نازل کرتے ہیں اور پہلے نازل کردہ حکم کو بدل دیتے ہیں تو کفار یہ اعتراض کرتے ہیں، لیکن کفار کے اعتراض پر بحث کرنے سے پہلے توجہ طلب بات یہ ہے کہ یہ آیت مکی سورت ہے اور ہم جانتے ہیں کہ ہجرت سے پہلے جو سورتیں نازل ہوئی ہیں ان میں احکام کا نزول نہیں ہوا۔ احکام تو مدنی دور میں نازل ہوئے، تو پھر مکی دور میں آیات کے بدلنے کا کیا مفہوم ہے۔ اس سلسلے میں دو باتیں پیشِ نظر رہنی چاہئیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ ہجرت سے

Marfat.com

پہلے کی زندگی میں اگرچہ عام احکام نازل نہیں ہوئے لیکن اخلاق سے متعلق ہدایات اور احکام تو نازل ہوئے ہیں۔ ایک سے زیادہ صحابہؓ سے یہ روایت موجود ہے کہ آپؐ مکارمِ اخلاق کا حکم دیا کرتے تھے۔ کیا ان احکام میں تدریج کے حوالے سے نسخ نہیں ہو سکتا؟ لیکن ایک صورت یہ ہے کہ آیت سے مراد حکم نہ لیا جائے بلکہ اس سے مضمون مراد لیا جائے۔ اس صورت میں اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ قرآن کریم کوئی مضمون سمجھانے کے لیے کبھی ایک مثال سے کام لیتا ہے اور کبھی دوسری مثال سے کام لیتا ہے۔ کبھی اسے ریشمی لباس میں ادا کرتا ہے اور کبھی اسی کو سلگتے ہوئے الفاظ کا جامہ پہنا دیتا ہے اور انسانی شخصیت کی تعمیر میں کبھی وہ ایک ہدایت دیتا ہے اور کبھی دوسری ہدایت دیتا ہے۔ ایک معاملہ کا کبھی ایک پہلو پیش کیا گیا ہے اور کبھی اسی معاملے کا دوسرا پہلو سامنے لایا گیا ہے۔ ایک بات کے لیے کبھی ایک دلیل پیش کی گئی ہے اور کبھی دوسری دلیل، کہیں کسی جگہ ایک بات مجمل طور پر کہی گئی ہے اور دوسرے وقت میں اسی کو مفصل طور پر بیان کیا گیا ہے۔ ان میں بلاشبہ بعض دفعہ ایک بات کو بالکل بدل ڈالا گیا ہے لیکن عموماً اجمال اور تفصیل یا سادگی اور تاکید اسلوبِ کلام کا تقاضا ہوتا ہے جس شخص سے پہلی دفعہ بات کرنے کا موقع ملا ہے لیکن اس سے بات کرنے کا انداز نہایت ہموار اور رواں ہوگا کبھی شخصیت کی تعمیر کے لیے گفتگو میں تبدیلی کرنا پڑتی ہے جس طرح ایک طبیب اپنے نسخے کے اجزا میں تبدیلی کرتا ہے۔ خزاں کے بعد بہار، بہار کے بعد خزاں۔ ربیع کے بعد خریف اور خریف کے بعد ربیع۔ گرمی کے بعد سردی اور سردی کے بعد گرمی، یہ دنیا کے وہ حقائق ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کائنات کا حُسن ہیں اور انسانی زندگی نہ صرف اس سے متاثر ہوتی ہے بلکہ محظوظ بھی ہوتی ہے۔ قرآنِ کریم بھی انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا ایک نسخۂ کیمیا ہے جو انسانی ضرورتوں کے مطابق پروردگار نازل فرماتا ہے اور اس کے سامنے جس طرح ضرورتیں واضح ہیں اسی طرح اس کے مواقع بھی واضح ہیں۔ ہمارا علم چونکہ نارسا ہے ہمیں اس میں دشواری پیش آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں ایسی کوئی دشواری نہیں۔ یہ اہلِ مکہ کی کوتاہی فکر تھی کہ وہ اس حقیقت کو سمجھنے کی بجائے حضورؐ کو الزام دیتے اور آپؐ کو مفتر گردانتے تھے۔ بے علمی نے ہمیشہ ایسے ہی گل کھلائے ہیں۔

قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ لِيُثَبِّتَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ۝١٠٢

(کہہ دیجیے کہ اس قرآنِ کریم کو روح القدس نے تمھارے رب کی جانب سے حق کے ساتھ اتارا ہے تاکہ ان لوگوں کو جمائے رکھے جو ایمان لائے ہیں، اور یہ ہدایت و بشارت ہو خدا کے فرمانبرداروں کے لیے۔ ۱۰۲) (سورۃ النحل:۱۰۲)

قرآن ایک ہی مرتبہ نازل کیوں نہیں ہوا؟

مشرکینِ مکہ ایک اعتراض یہ بھی کرتے تھے کہ اگر یہ قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا تو اسے ایک ہی دفعہ نازل کر دیا جاتا کیونکہ اللہ تعالیٰ کو اس بات کی احتیاج نہیں کہ وہ پہلے سوچ کر ایک مضمون تیار کرے، پھر اسے الفاظ کا جامہ پہنائے، پھر اس کی نوک پلک سنوارے۔ یہ قرآنِ پاک تھوڑا تھوڑا دھیرے دھیرے اترنا۔ یہ تو انسانی کمزوری ہے کہ وہ ایک کتاب کی تیاری میں مدتوں صرف کر دیتا ہے۔ پروردگار نے نہایت قطعیت کے ساتھ آنحضرت ﷺ کو حکم دیا کہ آپ ان لوگوں سے کہہ دیجیے کہ قرآنِ کریم میری تیار کردہ کتاب نہیں جسے روح القدس نے اللہ تعالیٰ کی جانب سے میرے سینے میں اتارا ہے۔ روح القدس سے مراد حضرت جبرائیل علیہ السلام ہیں جو تمام فرشتوں کے سردار ہیں ان کا نام لینے کی بجائے روح القدس کا لفظ استعمال کر کے اہلِ مکہ کو توجہ دلائی ہے کہ جس عزیز ذات کے واسطے سے یہ قرآن اتارا گیا ہے وہ ایک پاکیزہ روح ہے جس سے کسی خیانت کا تصور بھی ناممکن ہے۔ رہی یہ بات کہ قرآنِ کریم تھوڑا تھوڑا کر کے کیوں نازل کیا گیا ہے۔ اس کی حکمت اتنی واضح ہے کہ صرف وہی شخص اس کے سمجھنے سے قاصر رہتا ہے جو اسلام دشمنی میں اندھا ہو چکا ہو۔

ہر پڑھا لکھا آدمی جانتا ہے کہ عرب قوم، اُمّی قوم تھی جو نہ لکھنا جانتے تھے اور نہ پڑھنا جانتے تھے۔ شہر بھر میں چند آدمیوں کا لکھا پڑھا ہونا بھی تعجب خیز تھا اور پھر ان کی بھی لکھنے پڑھنے کی استطاعت ایک پرائمری لڑکے سے زیادہ نہیں تھی۔ ایسی قوم کے افراد کے سامنے اگر قرآنِ کریم جیسی علمی اور ادبی کتاب نازل کر دی جاتی تو اولاً تو وہ اسے پڑھ ہی نہیں سکتے تھے اور اگر پڑھ لیتے تو اس کا مفہوم سمجھنا ان کے بس کی بات نہ تھی کیونکہ قرآنِ کریم

Marfat.com

ادبیاتِ عالیہ کی بلندترین کتاب تسلیم کی جاتی ہے اوران میں فکری گہرائی ایسی ہے کہ بعض دفعہ اسے سمجھنے کے لیے اس کے ایک ایک لفظ پر اعتکاف کرنا پڑتا ہے۔ اس کا ایک ایک جملہ اپنی معنویت میں گہرے سمندر سے کم نہیں، اس کے الفاظ کا حُسن تراشیدہ ہیروں کی طرح حیرت میں ڈبو دیتا ہے اور الفاظ کا دروبست بعض دفعہ نئے فکری پیمانوں کی بنیاد بن جاتا ہے۔ کتاب میں احکام اگرچہ بکھرے ہوئے ہیں لیکن ان کے اندر ایک ایسی تدریج اور ایک ایسا نظم و ضبط پایا جاتا ہے جسے سمجھنے کے لیے ابوحنیفہؒ جیسے لوگ بھی عاجزی سے سر جھکاتے ہیں۔ ایسی کتاب اگر ایک قوم کی تعمیر کے لیے نازل کی جارہی تھی تو انتہائی ضروری تھا کہ وہ تھوڑی تھوڑی کرکے نازل کی جاتی تاکہ اس کا ایک ایک لفظ، ایک ایک جملہ اور ایک ایک مفہوم دلوں میں اتارا جاتا، پھر عملی زندگی پر اس کا انطباق ہوتا۔ اور اس طرح سے وہ قومی زندگی میں ایک روح کی مانند سرایت کرتا۔ یہی وہ چیز ہے جسے تثبیت کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ اور اجتماعی زندگی میں اسی سے ہدایت کا سامان کیا گیا ہے اور پھر یہی چیز مسلمانوں کے لیے بشارت بن گئی۔

وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ ؕ لِسَانُ الَّذِیْ يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ اَعْجَمِیٌّ وَّهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِیٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۰۳﴾

(ہم جانتے ہیں کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس کو تو ایک انسان سکھاتا ہے اس آدمی کی زبان جس کی طرف یہ منسوب کرتے ہیں، عجمی ہے، اور یہ فصیح عربی زبان ہے۔ ۱۰۳) (سورۃ النحل: ۱۰۳)

آنحضرت ﷺ پر الزام کا جواب

دشمنی میں لوگ کیسے کیسے اعتراض اٹھاتے اور کیسی کیسی یاوہ گوئی کرتے ہیں، یہ اس کی ایک بدترین مثال ہے۔ قریشِ مکہ نے یہ ثابت کرنے کے لیے کہ یہ قرآن اللہ تعالیٰ کی کتاب نہیں اور عام انسانوں کو اس سے بدگمان کرنے کے لیے یہ کہا گیا کہ یہ کتاب اللہ تعالیٰ کی جانب سے کہاں اتری ہے، یہ تو مکے میں ایک غلام ہے جو پڑھا لکھا ہے اور پہلی آسمانی کتابیں جانتا ہے، وہ آنحضرت ﷺ کو سکھاتا پڑھاتا ہے۔ چنانچہ اس کی مدد سے حضورؐ کچھ عربی عبارت تیار کرتے ہیں اور اسے قرآن کے نام سے لوگوں کے سامنے پیش کردیتے ہیں۔ اس غلام کا نام کہیں جبر بیان کیا گیا ہے جو عامر بن الحضرمی کا ایک رومی غلام تھا۔ بعض لوگ خویطب بن عبدالعزیٰ کے غلام کا نام لیتے ہیں۔ ایک روایت میں یسار کا نام لیا گیا ہے جس کی کنیت ابوفکیہ تھی۔ بعض لوگ حضرت سلمان فارسیؓ کا نام لیتے ہیں۔ نام کچھ بھی ہو مقصود تو صرف یہ ہے کہ وہ اسے اللہ تعالیٰ کی کتاب ماننے کی بجائے کسی ایسے غلام کی طرف منسوب کرتے تھے جس کا آنا جانا آنحضرت ﷺ کے پاس تھا جو تورات اور انجیل پڑھنا جانتا تھا۔ قرآنِ کریم نے اس آیت کے پہلے ہی لفظ سے اس اعتراض کی لغویت کو نمایاں کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم اس اعتراض کو ایک عرصے سے سنتے رہے ہیں لیکن اس کا جواب دینا اس لیے پسند نہیں کیا کہ لوگ اس کی لغویت کو خود محسوس کرلیں گے۔ لیکن جب ہم نے محسوس کیا کہ اندھی دشمنی نے ہر نامعقول بات کو قبول کرنا شروع کردیا ہے تو اس کا جواب دینے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

جس شخص نے بھی قرآنِ کریم کی چند آیات سنی ہیں وہ چاہے اللہ تعالیٰ کے دین کا کیسا ہی دشمن کیوں نہ ہو، عرب ہونے کی وجہ سے اور عربی زبان جاننے کی وجہ سے اس سے اس بات کی امید نہیں کی جاسکتی کہ وہ قرآنِ کریم کی زبان کو دیکھنے اور پڑھنے کے بعد بھی اسے کسی ایسے غلام کا کلام سمجھ لیں جو غلام عربی نہیں بلکہ عجمی ہے۔ وہ شہر مکہ میں رہنے کی وجہ سے ممکن ہے عربی بول لیتا ہو لیکن قرآنِ کریم کی زبان صرف عربی نہیں بلکہ عربی مبین ہے جس کی مثال لانے سے عرب بھر کے فصحا عاجز ہیں۔ قریشِ مکہ نے اسلام دشمنی میں ہر پاپڑ بیل کے دیکھ لیا اور دشمنی کا ہر طریقہ آزما لیا حتیٰ کہ حرب و ضرب تک نوبت پہنچی لیکن وہ اس بات کے لیے کبھی تیار نہ ہوئے کہ قرآنِ کریم جیسی ایک سورت ہی بنا کے لے آئیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ قرآنِ کریم کی فکری گہرائی کو تو وہ کیا پاسکیں گے وہ اس کے الفاظ اور جملوں کی دلآویزی تک بھی اپنی رسائی ممکن نہیں سمجھتے۔ اپنی اس کم مائیگی کو تسلیم کرنے کی بجائے انھوں نے قرآنِ کریم کو بے اعتبار کرنے کے لیے ایک ایسی بات کہی ہے کہ جو ان کے اپنے لیے الزام بن کر رہ گئی اور یہ بات ثابت ہوگئی کہ جو لوگ دشمنی میں اندھے ہوجاتے ہیں ان سے بدتر سے بدتر کمینگی کی بھی توقع رکھی جاسکتی ہے۔

Marfat.com

اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۙ لَا يَهْدِيْهِمُ اللّٰهُ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۰۴﴾ اِنَّمَا يَفْتَرِى الْكَذِبَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ
بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ﴿۱۰۵﴾ (سورة النحل : ۱۰۴.۱۰۵)

(بیشک جو لوگ ایمان نہیں لاتے اللہ تعالیٰ کی آیتوں پر اللہ تعالیٰ انھیں ہدایت نہیں دیتا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔
۱۰۴) وہی لوگ جھوٹ تراشا کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی آیات پر ایمان نہیں لاتے اور یہی لوگ جھوٹے ہیں ۱۰۵)

ہدایت سے متعلق اللہ تعالیٰ کا قانون

آنحضرت ﷺ کی دعوت دین کی غیر معمولی مساعی کو دیکھ کر ہمیشہ یہ خیال دل میں پیدا ہوتا ہے کہ ایک طرف آنحضرت ﷺ کی انتہائی دلآویز شخصیت دوسری طرف قرآنِ کریم جیسی اعجازی شان رکھنے والی کتاب اور تیسری طرف لوگوں سے آپ کی انتہا درجہ ہمدردی و غمگساری اور چوتھی طرف ان کے ایمان کے لیے آپؐ کی غیر معمولی مساعی کو دیکھتے ہوئے یہ باور کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ آپؐ کے مخاطب آپؐ کی دعوت کو قبول کرنے کی بجائے آپؐ کی دعوت کا راستہ روکنے اور ہر ممکن طریقے سے آپؐ کی دعوت کو ناکام کرنے پر اٹھ کھڑے ہوئے اور پھر سالوں تک یہ کشمکش جاری رہی تا آنکہ آپؐ نے ہجرت فرمائی اور مدینہ طیبہ تشریف لے گئے۔ قرآنِ کریم نے جگہ جگہ اس نکتہ کو کھولا، اس کا حاصل یہ ہے کہ ہدایت کے جتنے ممکن ذرائع ہیں ہم ان تمام ذرائع کو بروئے کار لا کر انسانوں کے لیے ہدایت قبول کرنا آسان بنا دیتے ہیں۔ لیکن جب وہ بجائے قبول کرنے کے اس کا راستہ روکنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں تو پھر ہم انھیں ہدایت نہ دینے کا فیصلہ کر دیتے ہیں اور یہی وہ موقع ہے جب ان کی محرومی کا فیصلہ کرتے ہوئے ان کے دل و دماغ پر مہریں لگا دیتے ہیں۔ اب ان کی زندگی کذب اور جھوٹ کی تصویر بن جاتی ہے۔ جب تک انھیں موقع رہتا ہے وہ حق و باطل کی اس کشمکش میں جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ کہتے رہتے ہیں۔ اس سے اگلی آیت میں اسی کی مزید وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ بدبخت خود تو جھوٹ کا کاروبار کرتے ہیں لیکن ان کی زبانوں پر آنحضرت ﷺ کے لیے الزامات و اتہامات ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کی نبوت کا دعویٰ سراسر جھوٹ پر مبنی ہے اور اللہ تعالیٰ کی کتاب منزل من اللہ نہیں بلکہ نہ جانے اس میں کس کس کی قلمکاریاں شامل ہیں اور کتنے احکام ہیں جنھیں محض آنحضرت ﷺ نے خود گھڑا ہے۔ ایسی باتیں کرنا ان کا معمول بن گیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ پر یقین کرتا ہے اور اسے اس بارے میں بھی کوئی شبہ نہیں ہوا کہ ایک دن اللہ تعالیٰ کے روبرو حاضر ہو کر اپنے اعمال کا جواب دینا ہے۔ ایسے شخص سے کسی طرح ممکن نہیں کہ وہ زندگی کے کسی معاملے میں جھوٹ بولے۔ چہ جائیکہ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھے۔ اللہ تعالیٰ کا رسولؐ تو حق کا ترجمان، حق کی برہان اور منارۂ نور بن کر آتا ہے۔ اس کی شان اس سے بہت بلند ہے کہ اس کے بارے میں جھوٹ کا تصور کیا جائے۔ جو لوگ اس پر ایمان لاتے ہیں ان کی شان بھی یہ ہے جسے آنحضرت ﷺ نے بیان فرمایا۔ امام بیہقی نے شعب الایمان میں یہ حدیث نقل کی ہے کہ قِيْلَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ اَيَكُوْنُ الْمُؤْمِنُ جَبَانًا قَالَ نَعَمْ فَقِيْلَ لَهٗ اَيَكُوْنُ الْمُؤْمِنُ بَخِيْلًا قَالَ نَعَمْ فَقِيْلَ لَهٗ اَيَكُوْنُ الْمُؤْمِنُ كَذَّابًا قَالَ لَا نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا کیا مومن بزدل ہوتا ہے؟ فرمایا، ہاں۔ (ہو سکتا ہے) پھر پوچھا گیا کیا مومن بخیل ہوتا ہے؟ فرمایا، ہاں۔ پھر پوچھا گیا کیا مومن جھوٹا ہوتا ہے؟ فرمایا نہیں۔

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ
غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۰۶﴾ (سورة النحل : ۱۰۶)

(جو اپنے ایمان لانے کے بعد اللہ تعالیٰ کا کفر کرے بجز اس کے جس پر جبر کیا گیا ہو اور اس کا دل ایمان پر جما ہوا ہو، لیکن جو کفر کے لیے سینہ کھول دے گا تو ان پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہوگا اور ان کے لیے عذاب عظیم ہے۔ ۱۰۶)

Marfat.com

ارتداد اور عزیمت و رخصت

یہ آیتِ کریمہ اس وقت نازل ہوئی ہے جب مکہ مکرمہ میں ظلم اور اذیت کی چکی پورے زوروں سے چل رہی تھی۔ ایک طرف نبی کریم ﷺ اور آپؐ کی نبوت پر اعتراضات کی بارش کی جارہی تھی اور قرآنِ کریم کے بارے میں عجیب وغریب اشتباہات پیدا کیے جارہے تھے اور دوسری طرف غریب اور بے سہارا مسلمانوں کے لیے زندگی دشوار سے دشوار تر بنائی جارہی تھی۔ چنانچہ ان بڑھتے ہوئے مظالم کی وجہ سے اس بات کا امکان پیدا ہورہا تھا کہ مسلمانوں کو تشدد اور ظلم کے ذریعے ارتداد کے راستے پر نہ ڈال دیا جائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے بروقت اس کا نوٹس لیا اور ان لوگوں کے حوصلے بڑھائے جو اس راستے میں ہمت سے بڑھ کر صبر کا ثبوت دے رہے تھے اور وہ لوگ جن پر ظلم تمام انسانی پیمانوں کو توڑتا ہوا آگے بڑھتا جارہا تھا ان کے لیے کسی حد تک سانس لینے کا موقع پیدا کیا گیا، لیکن ساتھ ہی یہ بھی بتادیا گیا کہ اگر اس میں ذراسی بھی کوتاہی ہوئی تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ بہت عظیم ہے، اس میں گرفت ہوتے دیر نہیں لگتی۔

مسلمانوں نے اس راستے میں جو نقوشِ قدم چھوڑے ہیں وہ اس قدر درخشاں اور تاباں ہیں کہ قیامت تک قربانی وایثار کی تاریخ اس سے روشن رہے گی۔ کون نہیں جانتا کہ حضرت بلالؓ کو دہکتے انگاروں پر لٹایا جاتا یہاں تک کہ ان کی چربی پگھلنے سے آگ بجھتی۔ مگر ان کے ایمان میں کوئی تزلزل نہ آیا۔ حضرت خبابؓ کو بھی بارہا ایسے ہی مراحل سے گزرنا پڑا لیکن کیا مجال جو ان کی استقامت میں فرق آیا ہو۔ حضرت حبیب بن زید بن عاصمؓ جن کے بدن کا ایک ایک عضو مسیلمہ کذاب کے حکم سے کاٹا جاتا تھا اور پھر مطالبہ کیا جاتا تھا کہ مسیلمہ کو نبی مان لیں مگر ہر مرتبہ وہ اس کے دعویٰ رسالت کی شہادت دینے سے انکار کرتے تھے۔ یہاں تک کہ اسی حالت میں کٹ کٹ کر انھوں نے جان دے دی۔ عمار بن یاسرؓ ہیں جن کی والدہ حضرت سمیہؓ کو اس طرح شہید کیا گیا کہ ان کی ایک ٹانگ ایک اونٹ سے باندھ دی اور دوسری ٹانگ دوسرے اونٹ سے اور پھر دونوں اونٹوں کو مختلف سمتوں میں ہانک دیا۔ اور ابوجہل نے ان کے اندامِ نہانی میں نیزہ مارا۔ آپؓ کا جسم دو حصوں میں چر گیا لیکن آپؓ کی زبان سے کلمۂ طیبہ کے سوا اور کچھ نہ نکلا۔ اس کے بعد آپؓ کے والدِ گرامی حضرت یاسرؓ کو بڑی اذیتیں دے کر شہید کیا گیا۔ پھر حضرت عمارؓ کو پکڑا اور ایسی ناقابلِ برداشت اذیتیں انھیں پہنچائی گئیں کہ ان کے ہاتھ سے برداشت کا دامن چھوٹ گیا اور آپؓ نے جان بچانے کے لیے وہ سب کچھ کہہ دیا جو کفار ان سے کہلوانا چاہتے تھے۔ پھر وہ روتے ہوئے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یارسول اللہ ﷺ! مجھے اس وقت تک کافروں نے نہ چھوڑا جب تک میں نے آپؐ کو برا اور ان کے معبودوں کو اچھا نہ کہہ دیا۔ حضورؐ نے پوچھا کہ تم اپنے دل کی کیفیت کیا پاتے ہو۔ حضرت عمارؓ نے کہا مطمئنا بالایمان یعنی ایمان پر پوری طرح مطمئن۔ اس پر آنحضرت ﷺ نے اطمینان کا اظہار فرمایا اور یہ رخصت دی کہ اگر پھر بھی وہ کافر بھی ایسی ناقابلِ برداشت تکلیفیں پہنچائیں اور تم سے کسی کلمۂ کفر کا مطالبہ کریں تو تم وہی کچھ کہہ دو جو وہ کہلوانا چاہیں بشرطیکہ دل ایمان پر مطمئن ہو اور ایسی باتوں کی کراہت پوری طرح دل میں موجود ہو؟

حقیقت میں یہ بہت نازک معاملہ ہے۔ ایک طرف جان کو خطرہ ہے جسے کفار ترازو کے پلڑے میں رکھ کر مومن کا امتحان لے رہے ہیں اور دوسری طرف ایمان کی جان کنی ہے۔ ایذارسانی کا عمل یقیناً ناقابلِ برداشت ہورہا ہے، لیکن کیا ایسا ناقابلِ برداشت ہے جس کے لیے ایمان کو داؤ پر لگادیا جائے۔ اس میں ذراسی کوتاہی آخرت کی کھیتی کو اجاڑ سکتی ہے۔ جس شخص کو دہکتے انگاروں پر لٹایا گیا ہے اس کے لیے اس سے بڑھ کر تکلیف اور کیا ہوسکتی ہے۔ اور اگر وہ کافروں کی ایذاؤں سے ڈر کر وہ کچھ کہہ دیتا ہے جو وہ کہلوانا چاہتے ہیں تو اس کا بھی اندیشہ ہے کہ دل میں اپنی جان کے بچانے کا جذبہ ایمان پر غالب آجائے۔ ترازو کے دو پلڑوں میں ایک طرف ایمان اور اس کے مقتضیات ہیں اور دوسری طرف جان کو بچانے کی فکر ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی تقاضا ہے کہ جان بچانے کی اجازت ضرور ہے بشرطیکہ حوصلے جواب دے رہے ہوں لیکن یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ روش نہیں، وہ اہلِ عزیمت کو پسند کرتا ہے، اہلِ رخصت کو نہیں، البتہ رخصت کی اجازت دیتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ مسلمانوں نے نہایت خطرناک حالات میں بھی عزیمت پر عمل کرنا ضروری سمجھا۔

Marfat.com

جس طرح بیشتر صحابہ کرامؓ نے اپنی جان دے دی لیکن تختۂ دار پر بھی اپنے اسلام کا اعلان کرتے رہے۔ علامہ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں حضرت عبداللہ بن حذیفہؓ کا ایک ایمان افروز واقعہ لکھا ہے۔ آپ بھی پڑھیے اور غلامان مصطفیٰ علیه التحية و الثناء کی جان بازی اور سرفروشی کی داد دیجیے۔

حضرت عبداللہ بن حذیفہؓ کو رومیوں نے قید کرلیا اور اپنے سردار کے پاس لے آئے۔ اس نے آپؓ کو کہا عیسائی بن جاؤ، میں تمھیں اپنی حکومت میں سے بھی حصہ دوں گا اور اپنی بیٹی کا رشتہ بھی دوں گا۔ آپؓ نے فرمایا لو اعطيتني جميع ماتملك وجميع ماتملكه العرب على ان ارجع عن دين محمد ﷺ طرفة عين ماقبلت یعنی تو مجھے اپنی ساری دولت اور جائیداد اور سارے اہلِ عرب کی دولت اس شرط پر دے کہ میں ایک لمحہ کے لیے بھی اپنے نبی کریم ﷺ کے دین سے دست کش ہو جاؤں تو پھر بھی میں قبول نہیں کروں گا۔ اس نے دھمکی دی کہ میں تمھیں قتل کردوں گا۔ آپؓ نے فرمایا بصد خوشی۔ اس نے آپؓ کو سولی پر لٹکانے کا حکم دیا اور تیر اندازوں کو کہا کہ ان کے ہاتھ اور پاؤں پر آہستہ آہستہ چوٹیں لگاؤ۔ انھوں نے ایسا کرنا شروع کیا اور اس نے پھر عیسائیت قبول کرنے کی پیشکش کی۔ آپؓ نے انکار کردیا۔ پھر اس نے سولی سے اتارنے کا حکم دیا۔ پھر ایک تانبے کی دیگ کو آگ پر تپایا گیا اور ایک مسلمان قیدی کو حضرت عبداللہ کے سامنے اس میں پھینک دیا گیا اور اس نے وہیں تڑپ کر جان دے دی۔ اس دھمکی کے بعد پھر اس نے کوشش کی کہ یہ عیسائیت کو قبول کریں۔ آپؓ انکار کرتے رہے۔ آخر انھیں دیگ میں پھینکنے کا حکم دیا۔ جب جلاد انھیں اٹھا کر اس تپتی ہوئی دیگ کی طرف لے جا رہا تھا تو ثبات و استقامت کے اس پہاڑ میں اضطراب کی ہلکی سے جھلک نہ تھی۔ جب دیگ کے کنارے تک پہنچے تو آپؓ کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ بادشاہ کو خیال آیا کہ شاید اب اسلام کو چھوڑ کر میرا مذہب قبول کرلیں گے۔ اس لیے واپس لانے کا حکم دیا۔ رونے کی وجہ پوچھی۔ آپؓ نے فرمایا کہ میں اس لیے رو پڑا تھا کہ میری ایک جان ہے جسے رضائے الٰہی کے لیے اس دیگ میں ڈالا جا رہا ہے۔ کاش میرے پاس اتنی جانیں ہوتیں جتنے میرے جسم پر بال ہیں اور میں سب کو اپنے رب کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اس عذاب میں ڈال دیتا۔ بادشاہ نے آپؓ کو قید کردیا اور کھانا پینا بند کردیا۔ کافی دن بھوکا اور پیاسا رکھنے کے بعد کچھ شراب اور کچھ خنزیر کا گوشت ان کی طرف بھیجا لیکن آپؓ نے ہاتھ نہ لگایا۔ بادشاہ نے پھر اپنے دربار میں طلب کیا اور نہ کھانے کی وجہ پوچھی، آپؓ نے فرمایا حالتِ اضطرار میں اگرچہ اس کا استعمال حرام نہیں لیکن میں تجھے یہ موقع نہیں دینا چاہتا تھا کہ تو میرے ایمان کی کمزوری کے باعث اظہارِ خوشی کرے۔ بادشاہ نے کہا اس طرح کرو کہ میرے سر کو بوسہ دو اور میں تمھیں آزاد کردوں گا۔ آپؓ نے فرمایا کہ میرے ساتھ سارے مسلمان اسیروں کو آزاد کردو گے۔ اس نے کہا ہاں۔ چنانچہ آپؓ نے اس کے سر کو چوما۔ اس نے آپؓ کو اور تمام مسلمان قیدیوں کو آزاد کردیا۔ جب یہ سب حضرت فاروق اعظمؓ کے پاس پہنچے اور آپؓ کو یہ ماجرا سنایا تو آپؓ نے فرمایا حق على كل مسلم ان يقبل راس عبدالله بن حذيفة وانا ابدأ فقام فقبل راسه رضى الله عنهما ۔ کہ ہر مسلمان پر فرض ہے کہ عبداللہ کا سر چومے اور ابتدا میں کرتا ہوں۔ چنانچہ آپؓ نے کھڑے ہو کر ان کے سر کو بوسہ دیا۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۷﴾

(یہ اس وجہ سے کہ انھوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دی اور اللہ تعالیٰ کفر اختیار کرنے والوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔ ۱۰۷) (سورۃ النحل: ۱۰۷)

ارتداد کا سبب اور اس کا انجام

گزشتہ آیتِ کریمہ میں فرمایا گیا کہ جس نے ایمان لانے کے بعد ارتداد کا راستہ اختیار کیا اور پھر کفر کے لیے اس نے پوری طرح اپنا سینہ کھول دیا اور اس طرح سے اس نے مکمل طور پر اپنے آپ کو کفر کے حوالے کرکے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے خود کو محروم کرلیا۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں اس کا سبب بیان کیا گیا ہے کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے غضب کا شکار کیوں ہوئے۔ اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ انسان کے سامنے دو ہی راستے ہیں ایک یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت جو پیغمبروں کے واسطے سے آتی ہے اسے قبول کرکے زندگی کا وہ رویہ اپنالے جو اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور بندے کی بندگی سے وجود میں آتا ہے۔ یہی وہ طریقہ ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی رضا ملتی ہے اور اسی سے آخرت کی کامیابیاں نصیب ہوں گی۔ اور دوسرا راستہ یہ ہے کہ آدمی حیاتِ دنیا کو اپنی منزل بنا

Marfat.com

لے، اپنی خواہشات کو اپنا رہنما بنا لے، ضروریاتِ زندگی کو مقاصدِ حیات ٹھہرا لے اور ساری زندگی کولہو کے بیل کی طرح انھی ضروریات کے حصول میں کھپا دے۔ اسی میں ترقی اور دوسروں سے آگے بڑھنے کی خواہش کو اپنا منتہائے مقصود سمجھے اور وہ کبھی بھول کر بھی یاد نہ کرے کہ کبھی آخرت بھی آنی ہے اور اللہ تعالیٰ کے سامنے حساب بھی دینا ہے۔ ان دو راستوں میں سے پہلا راستہ ایمان کا راستہ ہے اور دوسرا راستہ ارتداد اور کفر کا راستہ ہے۔ جو شخص پہلا راستہ اختیار کرتا ہے وہ یقیناً اللہ تعالیٰ کے انعامات کا مستحق ٹھہرتا ہے اور جو شخص دوسرا راستہ اختیار کرتا ہے اس پر اللہ تعالیٰ کا غضب برستا ہے کیونکہ اس راستے پر وہ لوگ چلتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے غضب کے مستحق ہوتے ہیں اور ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ کبھی ہدایت کا راستہ نھیں دکھاتا۔

اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ طَبَعَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوۡبِہِمۡ وَ سَمۡعِہِمۡ وَ اَبۡصَارِہِمۡ ۚ وَ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡغٰفِلُوۡنَ ﴿۱۰۸﴾ لَا جَرَمَ اَنَّہُمۡ فِی الۡاٰخِرَۃِ ہُمُ الۡخٰسِرُوۡنَ ﴿۱۰۹﴾ (سورة النحل : ۱۰۸ . ۱۰۹)

(یہی لوگ ہیں جن کے دلوں اور کے سمع و بصر پر اللہ تعالیٰ نے مہر کردی اور یہی لوگ ہیں جو آخرت سے غافل ہیں۔ ۱۰۸). لازماً یہی لوگ ہیں جو آخرت میں ناکام و نامراد ہوں گے۔ ۱۰۹)

جو لوگ اسلام قبول کرنے کے بعد ارتداد کا راستہ اختیار کرتے ہیں وہ درحقیقت روشنی کے بعد اندھیروں کے مسافر بنتے ہیں۔ ان کی آنکھوں نے حقائق کو دیکھا لیکن انھوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ ان کے کانوں نے نغمہ ہائے سرمدی سنے لیکن انھوں نے اپنے کان بند کر لیے۔ ان کے دلوں نے انوارِ الٰہی کے جلوے دیکھے لیکن ان کی بصارت نے عبرت نہ پکڑی۔ ہر طرف سے کٹ کر صرف خواہشِ نفس کے راستے پر بڑھتے چلے گئے۔ ایسے لوگوں کی سزا اس سے مختلف کیا ہوگی کہ جن نعمتوں کی انھوں نے قدر نھیں کی وہ ان سے چھین لی جائیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے قانون نے ان کی ناقدری کی انھیں سزا دی اور آنکھ اور کان اور دل جو ہدایت کو اختیار کرنے کا ذریعہ ہیں ان سے انھیں محروم کر دیا۔ اور ان کو اس زندگی کے حوالے کر دیا جس میں زندگی سانس کی آمد و شد کا نام تو ہے لیکن ہدایت کا کوئی گزر وہاں نھیں ہوتا۔ وہ زندگی صرف غافل لوگ گزارتے ہیں، وہ اپنی ضروریاتِ زندگی کو مقصدِ زندگی سمجھ کر اس میں کھوئے رہتے ہیں۔

ثُمَّ اِنَّ رَبَّکَ لِلَّذِیۡنَ ہَاجَرُوۡا مِنۡۢ بَعۡدِ مَا فُتِنُوۡا ثُمَّ جٰہَدُوۡا وَ صَبَرُوۡۤا ۙ اِنَّ رَبَّکَ مِنۡۢ بَعۡدِہَا لَغَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۱۱۰﴾

(پھر یقیناً آپ کا رب ان لوگوں کے لیے جنھوں نے آزمائشوں میں ڈالے جانے کے بعد ہجرت کی، پھر جہاد کیا اور ثابت قدمی دکھائی تو ان باتوں کے بعد بیشک آپ کا رب بڑا ہی بخشنے والا اور رحمت والا ہے۔ ۱۱۰) (سورۃ النحل: ۱۱۰)

اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں کی تصویر

سابقہ آیاتِ کریمہ میں ان لوگوں کا انجام بیان ہوا جنھوں نے حیاتِ دنیا کو حیاتِ آخرت پر ترجیح دی۔ وہ خواہشاتِ نفس کی پیروی میں اس قدر اندھے ہو گئے کہ دنیا کی زندگی ان کا مقصود بن کر رہ گئی۔ دنیا کی دلچسپیاں اور دنیا کی بڑائیاں ان کا حاصلِ زندگی ٹھہریں۔ اولاً تو وہ ایمان کے قریب ہی نھیں آئے، اور اگر کبھی ایمان قبول کر کے مومنین کی صف میں شامل ہو گئے۔ تو جب بھی ایمان کی قیمت دینا پڑی اور اس راستے کی آزمائشوں سے واسطہ پڑا تو وہ ایمان چھوڑ کر بھاگ گئے۔ ایسے لوگ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں بدترینِ خلائق ہیں۔ ان کا انجام یقیناً اس کے سوا کچھ نھیں ہوگا کہ وہ آخرت میں ناکامیوں اور حسرتوں کی تصویر ہوں گے۔ لیکن اس کے برعکس اللہ تعالیٰ کے محبوب وہ لوگ ہیں کہ انھوں نے سوچ سمجھ کر ایمان قبول کیا اور پھر اس راہ میں آنے والی مشکلات کو اس راہ کی سنتیں سمجھ کر انگیخت کیا۔ بڑی سے بڑی آزمائش کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا پیغام سمجھا۔ دشمن نے ہر موقع پر اذیتیں پہنچا کر حوصلوں کو شکست کرنا چاہا لیکن وہ کبھی کامیاب نہ ہو سکے۔ لیکن جب ان کی تکلیفیں جان کنی تک پہنچ گئیں تو پھر ہجرت کے جانگسل مراحل کو خندہ پیشانی سے قبول کیا تاکہ اسلامی زندگی کے اختیار کرنے میں کوئی رکاوٹ پیش نہ آئے۔ ہجرت کے لیے وطن چھوڑنا پڑا، مال و دولت کی قربانی دینی پڑی، پرائے دیس کا غیر یقینی مستقبل اور ماحول اختیار کرنا پڑا۔ اجنبی لوگوں میں زندگی کے نئے امکانات تلاش کرنا پڑے۔ لیکن یہ سب کچھ نہایت خوشی سے برداشت کیا

Marfat.com

کیونکہ انھی قربانیوں کے صلے میں اللہ تعالیٰ کی رضا کی امید کی جا سکتی ہے۔ پھر ایک وقت آیا جب حق و باطل کا معرکہ شروع ہوگیا۔ جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے تعلق کی خاطر اور دین سے وابستگی کے لیے اپنا وطن چھوڑنے سے دریغ نہ کیا تھا اب یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ حق و باطل کی کشمکش میں حق کی سربلندی کے لیے اپنا سب کچھ قربان کرنے سے تأمل کرتے۔ چنانچہ انھوں نے مال سے بھی جہاد کیا اور جان سے بھی جہاد کیا۔ اس راستے میں جس چیز کا بھی مطالبہ ہوا اسے پیش کرنے میں ذرا تأمل سے کام نہ لیا۔ اور اس راستے میں جو مصیبتیں آئیں نہایت خندہ پیشانی سے انھیں قبول کیا۔ اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول اور دین کی سربلندی کے لیے یہی وہ سرمایہ ہے جو ہمیشہ مطلوب ہوتا ہے۔ جب یہ سرمایہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کردیا جاتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے تائید و نصرت اور رحمت و مغفرت میں دیر نہیں ہوتی۔ چنانچہ یہاں بھی آیتِ کریمہ کے آخر میں یہی فرمایا گیا کہ میرے بندوں نے چونکہ یہ سب کچھ میرے راستے میں جھونک ڈالا ہے، اب انھیں بتا دیجیے کہ آپ ؐ کا رب ان کے لیے بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

يَوْمَ تَأْتِيْ كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ
عَنْ نَّفْسِهَا وَتُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿١١١﴾
وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّاْتِيْهَا
رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا
اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿١١٢﴾ وَلَقَدْ
جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْهُمْ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ وَهُمْ
ظٰلِمُوْنَ ﴿١١٣﴾ فَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۪ وَّاشْكُرُوْا نِعْمَتَ
اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿١١٤﴾ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَ
الدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ
بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿١١٥﴾ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ
اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ
الْكَذِبَ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ﴿١١٦﴾ ؕ

Marfat.com

مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ۖ وَّلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۱۷﴾ وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا
حَرَّمْنَا مَا قَصَصْنَا عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ ۚ وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ
كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۱۸﴾ ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ عَمِلُوا السُّوْٓءَ
بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابُوْا مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْٓا ۙ اِنَّ رَبَّكَ مِنْ
بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۹﴾

رکوع: ۱۵ (جس دن آئے گی ہر جان اپنی ہی مدافعت کرتی ہوئی اور ہر جان کو وہی پورا پورا بدلہ میں ملے گا جو اس نے کیا ہوگا اوران کے ساتھ ذرا بھی ناانصافی نہیں کی جائے گی۔ ۱۱۱) (اور اللہ تعالیٰ نے ایک بستی کی مثال بیان کی ہے جو امن والی تھی اور اطمینان کی حالت میں تھی، اس بستی میں اس کا رزق فراغت کے ساتھ ہر طرف سے آتا تھا، لیکن انھوں نے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری کی، تو اللہ تعالیٰ نے ان کی کرتوتوں کی پاداش میں ان کو بھوک کا مزا چکھایا اور خوف کا لباس پہنادیا۔ ۱۱۲) (اور ان ہی میں سے ایک رسولؐ ان کے پاس آیا، پس انھوں نے اسے جھٹلایا، تو انھیں عذاب نے پکڑ لیا اور وہ خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے تھے۔ ۱۱۳) (تو اللہ تعالیٰ نے تمھیں جو چیزیں جائز و پاکیزہ دے رکھی ہیں، ان میں سے کھاؤ اور اللہ تعالیٰ کی نعمت کا شکر ادا کرو، اگر تم اسی کی پرستش کرتے ہو۔ ۱۱۴) (اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس نے تم پر حرام کیا ہے، مردار اور خون اور خنزیر کا گوشت اور جس جانور پر اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کا نام پکارا جائے، پھر جو کوئی مجبور ہو جائے اور وہ خواہش مند اور حد سے آگے بڑھنے والا نہ ہو تو اس کے لیے کوئی گناہ نہیں، اللہ تعالیٰ بخشنے والا نہایت مہربان ہے۔ ۱۱۵) (اپنی زبانوں کے گھڑے ہوئے جھوٹ کی بنا پر یہ نہ کہو کہ فلاں چیز حلال ہے اور فلاں چیز حرام کہ اللہ تعالیٰ پر جھوٹی تہمت لگاؤ، جو لوگ اللہ تعالیٰ پر جھوٹی تہمت لگائیں گے وہ ہرگز فلاح نہیں پلائیں گے۔ ۱۱۶) ان کے لیے چند روزہ عیش اور دردناک عذاب ہے۔ ۱۱۷) (اور جو یہودی ہوئے ان پر بھی ہم نے وہی چیزیں حرام کی ہیں جو ہم اس سے پہلے آپؐ کے سامنے بیان کر چکے ہیں اور ہم نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا وہ خود اپنی جانوں پر ظلم کیا کرتے تھے۔ ۱۱۸) (پھر بیشک آپؐ کا رب ان لوگوں کے لیے جنھوں نے نادانی سے برائی کا ارتکاب کیا پھر اس کے بعد انھوں نے توبہ کر لی اور اپنے آپ کو سنوار لیا، بیشک آپؐ کا پروردگار اس کے بعد بہت بخشنے والا اور نہایت رحم کرنے والا ہے۔ ۱۱۹)

يَوْمَ تَأْتِي كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِهَا وَتُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۱۱۱﴾

(جس دن آئے گی ہر جان اپنی ہی مدافعت کرتی ہوئی اور ہر جان کو وہی پورا پورا بدلہ میں ملے گا جو اس نے کیا ہوگا اور ان کے ساتھ ذرا بھی ناانصافی نہیں کی جائے گی۔ ۱۱۱) (سورۃ النحل:۱۱۱)

Marfat.com

آخرت کی یاددہانی

سابقہ آیاتِ کریمہ میں دوطرح کے لوگوں کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے، ایک تو وہ لوگ ہیں جنھیں حُبِ دنیا نے اندھا کردیا ہے، ان کے یہاں آخرت کا تصور ایک بہلاوے کے سوا کچھ نہیں۔ وہ دنیا ہی کو اپنے ارمانوں کا مرکز سمجھتے ہیں اور یہیں کی خوشیاں اور غم ان کے لیے فیصلہ کن ہیں۔ اس بنا پر ان کی سوچ کا محور دنیا کے سوا کوئی اور چیز نہیں ہوسکتا۔ جب کوئی شخص انھیں آخرت میں جواب دہی کے تصور سے ڈراتا ہے تو وہ اسے اپنا دشمن سمجھتے ہیں اور حقیقت بھی یہ ہے کہ آخرت کا تصور دنیا کے عیش وعشرت کے لیے دشمنی سے کم نہیں، جسے آخرت کی فکر لگ گئی وہ دنیا کے کام کا نہ رہا۔ اور جو دنیا میں گم ہوگیا وہ آخرت کے کام کا نہ رہا۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ نے جب مشرکینِ مکہ کو زندگی کی حقیقت اور آخرت کا احساس دلانے کی کوشش کی تو وہ نہ صرف آنحضرت ﷺ کی دشمنی پر تل گئے بلکہ انھوں نے ان لوگوں کو بھی اسلام کی طرف آنے سے روکا جو اسلام کی طرف مائل ہو رہے تھے، اور انھوں نے مکے میں ایک ایسا ہراس (Panic) طاری کردیا کہ مسلمانوں کے لیے زندگی گزارنا آسان نہ رہا۔ لیکن دوسری طرف ایسے لوگ بھی تھے جنھوں نے مردانہ وار حالات کا مقابلہ کیا۔ جب اللہ تعالیٰ کے رسولؐ پر ایمان لے آئے تو قدم قدم پر اس کی قیمت بھی ادا کی۔ انھیں اس راستے میں بڑی سے بڑی آزمائش سے دوچار ہونا پڑا لیکن انھوں نے شکایت تک نہ کی۔ جب اہلِ مکہ ان کی جان کے درپے ہوگئے تو انھوں نے وطن چھوڑ کر ہجرت کا سفر اختیار کرلیا۔ اس جانگسل سفر میں ہر طرح کی مشقت برداشت کی لیکن صبر کا دامن ہرگز ان کے ہاتھ سے نہ چھوٹا اور کبھی ان کو یہ خیال نہ ہوا کہ ہم جو قربانیوں کی تاریخ رقم کررہے ہیں اس کا کچھ صلہ بھی ملے گا یا نہیں۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں دونوں کے حوالے سے ایک بات فرمائی جارہی ہے کہ لوگوں کو یہ بات کبھی نہیں بھولنی چاہیے کہ اس دنیا کو ایک روز ختم ہونا ہے اور پھر قیامت کو وقوع پذیر ہونا ہے۔ وہاں ظالم بھی پیش ہوں گے اور مظلوم بھی۔ ظالموں کو ظلم پر سزا ملے گی اور مظلوم اپنی مظلومیت کا صلہ پائیں گے۔ کفار کو یہ سمجھ کر دلیر نہیں ہونا چاہیے کہ ہمیں پوچھنے والا کوئی نہیں اور ہم ہمیشہ جو چاہیں سو کرتے رہیں گے۔ اور اہلِ حق کو کبھی یہ نہ سوچنا چاہیے کہ ہماری قربانیاں رائیگاں جائیں گی۔ ان کا ایک ایک زخم وہاں پھول بن کر مہکے گا۔ اور ان کا ایک ایک دکھ آرام وراحت کا ابدی پیغام ثابت ہوگا۔ اور مزید یہ فرمایا کہ ان کافروں نے جن کو اللہ تعالیٰ کا شریک بنا رکھا ہے اور سمجھتے ہیں کہ قیامت میں وہ ان کے کام آئیں گے، انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ قیامت میں ہر حاضر ہونے والا شخص چاہے وہ کتنا عظیم کیوں نہ ہو، وہ نفسی نفسی پکار رہا ہوگا۔ کوئی کسی کے کام نہ آسکے گا۔ لیکن یہ بات طے ہے کہ وہاں کسی نیکی کرنے والا کا اجر ادھورا نہیں رہے گا اور کسی برائی کرنے والے کی سزا نا تمام نہیں رہے گی۔ دنیا میں کتنے ایسے لوگ گزرے ہیں جنھوں نے اللہ تعالیٰ کے راستے میں بڑھ چڑھ کر قربانیاں دیں لیکن ان کی قربانیوں کا صلہ دنیا کیا دے سکتی ہے۔ قیامت میں ان کی ایک ایک قربانی رنگ لائے گی اور آدمی تمنا کرے گا کہ کاش اللہ تعالیٰ کے راستے میں میری کھال قینچیوں سے کاٹی گئی ہوتی تاکہ آج میں اس کا بیش از بیش صلہ پاتا۔ اور ہر برا آدمی جس نے بڑی سے بڑی برائی کی سینکڑوں ہزاروں آدمیوں کا قاتل بنا، ہزاروں گھر اجاڑے، ہزاروں عزتوں کے فانوس گل کیے، لیکن دنیا میں کوئی عدالت اس کا جرم ثابت نہ کرسکی، اور اگر جرم ثابت ہوا بھی تو ایک جان رکھنے والا ہزاروں جانوں کا قصاص کیسے بن سکتا تھا۔ قیامت کے دن جس طرح اچھے لوگوں کو بہترین صلہ ملے گا، اسی طرح برے لوگ بھی اپنی مکمل سزا بھگتیں گے۔ ہزاروں لوگوں کا قاتل ہزار دفعہ پھانسی پر لٹکایا جائے گا، ہر دفعہ اسے نئی جان ملے گی جو قصاص میں چھین لی جائے گی اور کسی شخص سے ظلم نہیں کیا جائے گا۔ اس لیے آج اللہ تعالیٰ کے راستے میں چلنے والوں کے لیے ناامیدی کا کوئی موقع نہیں۔ اور مسلمانوں پر ظلم ڈھانے والوں کو بھی ناروا جسارتیں بڑی مہنگی پڑیں گی۔

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿١١٢﴾ (سورة النحل : ١١٢)

(اور اللہ تعالیٰ نے ایک بستی کی مثال بیان کی ہے جو امن والی تھی اور اطمینان کی حالت میں تھی، اس بستی میں اس کا رزق فراغت کے ساتھ ہر طرف سے آتا تھا، لیکن انھوں نے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری کی، تو اللہ تعالیٰ نے ان کی کرتوتوں کی پاداش میں ان کو بھوک کا مزا چکھایا اور خوف کا لباس پہنا دیا۔ ۱۱۲)

Marfat.com

قریہ سے مراد؟ اس میں تین آرا

قریشِ مکہ کو سمجھانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک بستی کی مثال دی ہے، لیکن یہ بستی کون سی تھی، اس کے بارے میں نہ تو قرآنِ کریم نے کوئی وضاحت کی ہے اور نہ احادیث پاک میں اس کا ذکر آیا ہے۔ البتہ آیتِ کریمہ کے اندر کچھ اشارات موجود ہیں جس سے بعض چیزوں کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے، لیکن اس بات کا تعین نہیں ہوسکتا کہ وہ بستی کون سی تھی۔

آیتِ کریمہ سے جو اشارے ملتے ہیں ان میں پہلا اشارہ یہ ہے کہ قریہ کا لفظ عام طور پر ایسی مرکزی بستی پر بولا جاتا ہے جس کے دائیں بائیں اڑوس پڑوس میں چھوٹی بستیاں موجود ہوں، جن کی ضرورتیں اس بڑی بستی سے پوری ہوتی ہوں اور لوگ اپنے معاملات کے لیے بڑی بستی کی طرف رجوع کرتے ہوں۔ اس سے یہ بات سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ یہ کسی ایسی بستی کا ذکر ہے جس کی حیثیت بڑے شہر کی تھی، ممکن ہے کہ یہ کسی ملک کا دارالحکومت ہو۔

دوسرا اشارہ یہ ملتا ہے کہ اس میں یہ فرمایا گیا ہے کہ اس بستی میں ساری نعمتیں میسر تھیں لیکن جب اس نے کفرانِ نعمت کیا تو اللہ تعالیٰ نے اسے بھوک کا مزا چکھایا اور خوف کا لباس پہنا دیا۔ الفاظ کے دروبست اور الفاظ کی ترتیب کو دیکھتے ہوئے اعلیٰ عربیت کا ذوق اس کی طرف رہنمائی کرتا ہے کہ اصل عبارت اس طرح ہے فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ طُعْمَ الْجُوْعِ وَاَلْبَسَهَا لِبَاسَ الْخَوْفِ اس سے ہمیں یہ اشارہ ملتا ہے کہ اس قوم پر جو عذاب آیا تھا وہ قومِ عاد و ثمود کی طرح کا نہیں تھا جس سے ان کی جڑ کاٹ دی گئی تھی بلکہ یہ ایک سخت قسم کی تنبیہ تھی جس سے انھیں سمجھانا مقصود تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ بستی کوئی بھی ہو اس پر آنے والے عذاب نے نہ بستی کو بالکل تباہ کیا اور نہ اہلِ بستی کو ہلاک کیا۔

1- اب ہم دیکھتے ہیں کہ مفسرین نے جو بستیاں مراد لی ہیں کیا یہ یہ دونوں قسم کے اشارے اس کی تائید کرتے ہیں یا نہیں۔ مفسرین کی ایک رائے یہ ہے کہ اس سے مراد قریہ سبا ہے۔ اس میں یقیناً بستی کے تمام لوازمات پائے جاتے تھے۔ قرآنِ کریم کی شہادت کے مطابق اس کے اردگرد دو رویہ سرسبز و شاداب باغوں کی قطاریں تھیں، جن میں نہریں بہتی تھیں، چشمے رواں تھے۔ اہلِ یمن نے ڈیم بنا کر آبیاری کا ایک مستقل سسٹم بنا رکھا تھا۔ چنانچہ جب اس قوم نے اللہ تعالیٰ کی ان بیش بہا نعمتوں کی ناشکری کی تو اس بستی پر خدا کا عذاب آ گیا۔ لیکن جب ہم اس بستی پر آنے والے عذاب کی تفصیلات کے دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ڈیموں کے ٹوٹنے کے باعث یہ بستی بالکل تباہ ہوگئی۔ ہر چیز برباد کردی گئی۔ جو لوگ بچ گئے وہ دوسرے علاقوں کی طرف ہجرت کر گئے اور یہ علاقہ مکمل طور پر بنجر ہوگیا اور یا ایسے درختوں کا ذخیرہ بن گیا جس میں انسانوں کی بجائے درندے رہ سکتے تھے۔ اس عذاب کو دیکھتے ہوئے یہ باور کرنا مشکل ہے کہ اس سے مراد قریہ سبا ہوسکتی ہے۔

2- بعض مفسرین کی رائے یہ ہے کہ قریہ سے مراد مکہ مکرمہ ہے۔ مکہ مکرمہ کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ وہ واقعی ایک مرکزی بستی کی حیثیت رکھتا تھا اور کعبۃ اللہ کا مقام ہونے کی وجہ سے اسے ایک مرکزیت حاصل تھی اور ہر طرح کا امن و اطمینان میسر تھا۔ اللہ تعالیٰ کے گھر کا ادب و احترام چونکہ تمام عرب کرتا تھا اس لیے کسی کی مجال نہ تھی کہ اس شہر پر حملہ کرتا جس میں اللہ تعالیٰ کا گھر موجود تھا اور اسی گھر کی وجہ سے ہر طرف سے اشیائے خورد و نوش فراوانی سے اس میں پہنچتی تھی۔ ان کے تجارتی قافلوں کے لیے کوئی روک ٹوک نہ تھی، لیکن پھر ان پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آیا۔ شہر اور گرد و پیش میں قحط پڑ گیا اور مسلمانوں کے مدینہ منورہ چلے جانے کی وجہ سے ان کی تجارتی سرگرمیاں محدود ہوگئیں، امن و امان تباہ ہوگیا اور مسلمانوں کے ساتھ ہر وقت تصادم کی کیفیت طاری رہنے لگی۔ اس رائے میں اور تو کوئی سقم دکھائی نہیں دیتا، البتہ یہ بات ضرور ہے کہ یہ سورت مکی ہے اور مفسرین کی اس رائے میں جس عذاب کا ذکر ہو رہا ہے اس کا تعلق ہجرت کے بعد سے ہے۔ ایک ایسا عذاب جو ہجرت کے بعد آیا ہو اس کا مکی سورت میں ذکر کیسے ہوسکتا ہے۔

3- مفسرین کی تیسری رائے یہ ہے کہ بستی سے مراد تو مکہ معظمہ ہی ہے۔ یہی حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کا بھی کہنا ہے۔ اور جس عذاب کا ذکر اس آیتِ کریمہ میں ہے وہ عذاب وہ ہے جو نبی کریم ﷺ کی موجودگی میں آپؐ کی دعا کے نتیجہ میں قحط کی صورت میں اہلِ مکہ پر مسلط ہوا تھا اور اس سے تمام اہلِ مکہ چیخ اٹھے تھے۔ قحط کی شدت کا عالم یہ تھا کہ لوگ اپنے جوتوں کے چمڑے تک کھانے پر مجبور ہوگئے تھے۔ چنانچہ اشرافِ قریش نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ یہ عذاب ٹل جائے تو ہم آپؐ پر ایمان لے آئیں گے۔ چنانچہ آپؐ کی دعا سے وہ عذاب ٹل گیا، لیکن اشرافِ قریش کا رویہ نہ بدلا۔

Marfat.com

وَلَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْهُمْ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

(اور ان ہی میں سے ایک رسولؐ ان کے پاس آیا، پس انھوں نے اسے جھٹلایا، تو انھیں عذاب نے پکڑ لیا اور وہ خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے تھے۔ ۱۱۳) (سورۃ النحل:۱۱۳)

سابقہ مضمون کی تائید

یہ آیت بجائے خود اس بات کی تصدیق کر رہی ہے کہ یہ بستی مکہ مکرمہ تھی اور ان پر عذاب نبی کریم ﷺ کی تکذیب کے نتیجہ میں آیا تھا اور عذاب وہ نہیں تھا جس سے بستیاں تباہ کر دی جاتی ہیں بلکہ عذاب آزمائش بن کر آیا تھا اور اس لیے آیا تھا کہ عذاب کے مصائب کی وجہ سے اشرافِ قریش کی گردنیں جھک جائیں۔ عام لوگوں کے دلوں میں ایک خوف پیدا ہو اور وہ اللہ تعالیٰ کے رسولؐ پر ایمان لے آئیں۔ چنانچہ جب اشرافِ قریش نے نہایت عاجزی سے آپؐ سے درخواست کی تو آپؐ نے ان کی خواہش کے مطابق دعا کی اور عذاب دور ہو گیا، مگر ان کی سرکشی اپنی جگہ پر قائم رہی۔

فَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّاشْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۱۴﴾

(تو اللہ تعالیٰ نے تمھیں جو چیزیں جائز و پاکیزہ دے رکھی ہیں، ان میں سے کھاؤ اور اللہ تعالیٰ کی نعمت کا شکر ادا کرو، اگر تم اسی کی پرستش کرتے ہو۔ ۱۱۴) (سورۃ النحل:۱۱۴)

قریشِ مکہ سے فرمایا جا رہا ہے کہ جن بستیوں کے رہنے والوں نے اللہ تعالیٰ کی صفتِ تحلیل و تحریم پر قبضہ کر لیا اور قانون سازی میں اس کے شریک بن گئے اور ایک خانہ ساز شریعت بنا ڈالی ان کا انجام تم نے دیکھ لیا۔ ابھی چند سال جس طرح قحط سالی کے تم پر گزرے ہیں تمھیں یہ بات یاد دلانے کے لیے کافی تھے کہ اللہ تعالیٰ کی گرفت کتنی شدید ہوتی ہے۔ اب یہ قحط تم سے ٹل چکا ہے تو اللہ تعالیٰ نے جو رزق تمھیں دیا ہے اسے حلال اور طیب سمجھ کر کھاؤ، اس میں اپنی مرضی سے تحلیل و تحریم کا حق استعمال نہ کرو۔ اور ایک ایک نعمت پر اللہ تعالیٰ کا شکر بجا لاؤ۔ جن قوتوں کو تم نے اس کا شریک بنا رکھا ہے، اس سے توبہ کرو۔ اور بالخصوص اس جسارت سے ہزار دفعہ پناہ مانگو کہ تم اپنی مرضی سے کچھ چیزوں کو حلال یا حرام ٹھہراتے ہو لیکن جب تم پر تنقید کی جاتی ہے تو تم اسے اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر دیتے ہو، یہ کتنی بڑی جسارت ہے۔ اللہ تعالیٰ کے تحلیل و تحریم کے حق کو خود استعمال کرنا شرک ہے اور اسے اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا کہ اس نے ہمیں ایسا کرنے کی اجازت دی ہے یہ تہمت ہے۔ شرک جیسا جرم اور پھر اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ایک ایسی ہولناک جسارت ہے جس کی قباحت اور شناعت کا اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔

اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾ (سورة النحل : 115)

(اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس نے تم پر حرام کیا ہے، مردار اور خون اور خنزیر کا گوشت اور جس جانور پر اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کا نام پکارا جائے، پھر جو کوئی مجبور ہو جائے اور وہ خواہش مند اور حد سے آگے بڑھنے والا نہ ہو تو اس کے لیے کوئی گناہ نہیں، اللہ تعالیٰ بخشنے والا نہایت مہربان ہے۔ ۱۱۵)

اس آیتِ کریمہ کی تشریح میں ہم نے سورۃ البقرہ آیت ۱۷۳ میں جو کچھ عرض کیا ہے، اسے یہاں نقل کر رہے ہیں۔

Marfat.com

ملتِ ابراہیمؑ میں حلال وحرام

روئے سخن مشرکین کی طرف ہے کہ تم نے جس طرح تحلیل وتحریم کا حق جو خالص اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اپنے لیے مباح کرلیا ہے اوراس کے نتیجے میں تم نے کتنی حلال نعمتیں ہیں جو حرام کرڈالی ہیں اور کتنی حرام چیزیں ہیں جو اپنے لیے حلال کرلی ہیں اوراس پر طرہ یہ ہے کہ تم اپنی اس خانہ ساز شریعت کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف منسوب کرتے ہو اور تم بات بات پر ملتِ ابراہیمؑ کے پیروکار ہونے کا دعویٰ کرتے ہو حالانکہ ملتِ ابراہیمی میں جو چیزیں حرام کی گئی تھیں وہ صرف وہ تھیں جو پیشِ نظر آیت میں ذکر کی گئی ہیں۔اس کے علاوہ جتنی چیزیں تم نے خود حرام کرڈالی ہیں اس کا ملتِ ابراہیم سے تو کوئی تعلق نہیں۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

اس آیتِ کریمہ اور بعض دوسری آیات سے بعض لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے اور یا وہ خواہشاتِ نفس کے تحت اپنے آپ کو اس غلط فہمی میں مبتلا رکھنا چاہتے ہیں کہ اسلام میں جو چیزیں حرام کی گئی ہیں وہ صرف وہ ہیں جن کا اس آیتِ کریمہ میں ذکر کیا گیا ہے یا سورۃ انعام کی ایک آیت میں اس سے بھی زیادہ وضاحت سے ذکر فرمایا گیا ہے۔

قُلْ لَّآ اَجِدُ فِیْ مَا اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّماً عَلٰی طَاعِمٍ یَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ یَّکُوْنَ مَیْتَةً اَوْ دَماً مَّسْفُوْحاً اَوْ لَحْمَ خِنْزِیْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقاً اُهِلَّ لِغَیْرِ اللّٰهِ بِهٖ (۱۴۵)

”کہہ دو! مجھے جو وحی کی گئی ہے اس میں تو کسی کھانے والے کے لیے بجز اس کے کسی چیز کو حرام نہیں پاتا کہ مردار ہو یا بہایا ہوا خون یا سور کا گوشت یہ چیزیں ناپاک ہیں یا پھر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتے ہوئے کسی چیز کو غیر اللہ کے نام پر ذبح کردیا جائے۔ ۱۴۵)

اس آیتِ کریمہ کے اگر سیاق وسباق کو سامنے رکھا جائے تو بات واضح ہوجاتی ہے کہ یہاں یہ نہیں بتایا جارہا کہ اسلامی شریعت میں کیا چیزیں حلال ہیں اور کیا حرام ہیں؟ بلکہ صرف یہ بات واضح کی جارہی ہے کہ تم نے ملتِ ابراہیم کا نام لے لے کر جن چیزوں کو حرام کررکھا ہے ان کا ملتِ ابراہیم سے تو کوئی تعلق نہیں ہے۔ملتِ ابراہیم میں اگر کوئی چیزیں حرام تھیں تو وہ صرف چار چیزیں ہیں، جن کا ان دونوں آیتوں میں ذکر کیا گیا ہے کیونکہ اگر ان آیات کو شریعتِ اسلامی کے حوالے سے دیکھا جائے کہ یہی چار چیزیں اسلامی شریعت میں حرام ہیں اوراس کے علاوہ کوئی چیز حرام نہیں۔تو یہ بات قرآنِ کریم کی دوسری آیات کے صریحاً خلاف ہے۔مثال کے طور پر دیکھیے! ان دونوں آیتوں میں میتۃ یعنی مردار کو حرام کیا گیا ہے۔اوراس کی جو تفصیل سورۃ مائدہ میں بیان کی گئی ہے اس میں مزید سات چیزیں بیان کی گئی ہیں۔

اَلْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوْذَةُ وَالْمُتَرَدِّیَةُ وَالنَّطِیْحَةُ وَمَآ اَکَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَکَّیْتُمْ وَمَا ذُبِحَ عَلَی النُّصُبِ وَاَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ ط

بعض دوسری آیات میں اور بھی بعض چیزوں کو حرام کیا گیا ہے۔اس لیے ان آیات سے یہ سمجھنا کہ اسلامی شریعت میں صرف یہی چیزیں حرام ہیں سراسر قرآنِ کریم کی وضاحتوں کے خلاف ہے۔ان آیات کا صحیح مفہوم وہی ہے جو ہم نے عرض کیا کہ مشرکین سے کہا جارہا ہے کہ ملتِ ابراہیم میں تو صرف یہ چیزیں حرام ہیں باقی چیزوں کو تم نے کیسے حرام کرڈالا؟ جبکہ تحلیل وتحریم اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور تم نے اپنے آپ کو اور یا اپنے بتوں کو اللہ تعالیٰ کی صفات سے متصف کرڈالا۔اس سے بڑا شرک اور کیا ہوسکتا ہے؟ اب ہم ان چیزوں کی تفصیل بیان کرتے ہیں جنھیں اس آیتِ کریمہ میں حرام قرار دیا گیا ہے۔وہ چار چیزیں ہیں۔ ۱: میتہ ”مردار“ ۲: خون ۳: لحم خنزیز ۴: وہ جانور جس پر غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو۔

ان چاروں چیزوں کی جو تشریحات قرآن وسنت میں دی گئی ہیں ہم نہائیت اجمال سے ان کا تذکرہ کرتے ہیں۔

Marfat.com

میتہ: اس سے مراد ہر وہ مردہ جانور ہے جس کے حلال ہونے کے لیے شریعت نے ذبح کرنے کی شرط لگائی ہے۔ جتنے بھی حلال جانور ہیں ہم انھیں اسلامی طریقے سے اگر ذبح کر لیں تو ہمارے لیے حلال ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر یہ ذبح کے بغیر طبعی یا غیر طبعی موت مر جائیں تو وہ مردار کہلاتے ہیں۔ البتہ دو طرح کے مردار ہیں جو اسلامی شریعت نے ہمارے لیے حلال ٹھہرائے ہیں۔ وہ تمام آبی جانور جنھیں شریعت نے حلال ٹھہرایا ہے ان کا مردار بھی ہمارے لیے حلال ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے: اُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ "تمھارے لیے سمندر کا شکار حلال کر دیا گیا ہے" اس کے لیے ذبح کرنا کوئی ضروری نہیں۔ ایک حدیث میں آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: "ہمارے لیے دو مردار حلال کر دیے گئے ہیں ایک مچھلی دوسرا ٹڈی"۔ مچھلی تو خشکی پر آ کر تھوڑی دیر کے بعد مر جاتی ہے۔ ٹڈی اگرچہ خشکی پر مرتی نہیں لیکن اسے بھی بغیر ذبح کیے آپ پکا کر یا بھون کر کھا سکتے ہیں۔ ہاں! البتہ مچھلی سڑ کر پانی کے اوپر آ جائے تو پھر وہ حرام ہو جاتی ہے۔

مردار کا جس طرح گوشت کھانا حرام ہے اسی طرح اس کی خرید و فروخت بھی حرام ہے۔ یہی حال تمام نجاستوں کا ہے۔ جس طرح ان کا استعمال حرام ہے اسی طرح ان کی خرید و فروخت اور ان سے نفع اٹھانا بھی حرام ہے۔ فقہا نے لکھا ہے کہ مردار جانور یا کوئی بھی ناپاک چیز خود تو مسلمان استعمال کر ہی نہیں سکتا، البتہ اس کے لیے یہ بھی جائز نہیں کہ وہ کسی جانور کو کھلائے۔ جانور اپنے طور پر گندگی کھا لیں جیسے مرغیاں نالیوں سے گندگی کھاتی رہتی ہیں، لیکن کسی مسلمان کے لیے اپنے اختیار سے کسی جانور کو گندگی کھلانا جائز نہیں۔ مجھے اس بات سے خیال گزرتا ہے کہ ہم جن مرغیوں کا گوشت کھاتے ہیں انھیں جو خوراک بڑے اہتمام سے ڈربوں میں بند رکھ کر کھلائی جاتی ہے، اس میں تو نہ جانے کتنی گندگیاں شامل ہوتی ہیں اور مردار کی کیا کیا آلودگیاں اس میں شامل کی جاتی ہیں۔ مجھے نہیں معلوم اس بارے میں ہمارے فقہاءِ کرام کیا فتویٰ دیتے ہیں۔ وہ مرغی جو آزادانہ باہر گھوم پھر کر ہر اچھی اور گندی چیز غذا کے طور پر کھاتی ہے اس کے لیے علماء کرام یہ کہتے ہیں کہ اگر اس کا گوشت کھانے کا ارادہ ہو تو اسے ایک دو دن گھر میں بند رکھنا چاہیے۔ تاکہ اس کی گندی غذا کا اثر دور ہو جائے۔ لیکن جو مرغیاں نہائت گندی خوراک سے پالی جاتی ہیں ان کے لیے کیا احتیاط کی جائے؟

میتہ سے متعلق احکام کی وضاحت

اس آیت کریمہ میں میتہ کے حرام ہونے کا حکم عموم کے ساتھ دیا گیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ میتہ کے تمام اجزا کا استعمال حرام ہے۔ لیکن دوسری آیتِ کریمہ کے ایک جملے نے اس کی وضاحت فرما دی ہے یا اس عموم میں خصوص پیدا کر دیا ہے۔ دوسری آیت میں عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗ کا جملہ شامل ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مردار جانور کے وہ اجزا حرام ہیں جو کھانے میں استعمال ہوتے ہیں۔ اس لیے مردار جانور کی ہڈی، بال، اون، جو کھانے کی چیزیں نہیں، یہ سب پاک ہیں اور ان کا استعمال بھی جائز ہے۔ قرآن کریم نے ایک اور جگہ جانوروں کے بال اور ان کے اون کو مطلقاً حلال اور جائز الانتفاع ٹھہرایا ہے۔ اون اور بالوں کی طرح ہڈی سے بھی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، لیکن اسے کھانے میں استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ ممکن ہے آپ کو تعجب ہو کہ ہڈی کو کھانے میں کون استعمال کر سکتا ہے۔ لیکن آپ کے علم میں یہ بات ہونی چاہیے کہ ہڈی کا برادہ اور اس کا پوڈر مختلف غذاؤں میں استعمال ہو رہا ہے اور یہ جیلی نام کی چیز جو گھروں میں بڑے شوق سے کھائی جاتی ہے، اس کے استعمال میں مردار کی ہڈیاں تک استعمال ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی پناہ! آج کے دور میں حلال و حرام کی پہچان کس قدر مشکل ہو گئی ہے۔ کھال میں چونکہ خون وغیرہ کی نجاست شامل ہوتی ہے اس لیے اسے دباغت سے پہلے حرام قرار دیا گیا ہے اور دباغت دینے کے بعد وہ حلال اور جائز ہے۔ اسی طرح مردار جانور کی چربی اور اس سے بنائی ہوئی چیزیں بھی حرام ہیں، ان کا استعمال یکسر ممنوع ہے اور خرید و فروخت بھی حرام ہے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری، حضرت ابو سعید خدری، حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہم اجمعین اور بعض دوسرے صحابہؓ نے مردار کی چربی کو صرف کھانے کے لیے حرام قرار دیا ہے، خارجی استعمال کے لیے اس کی اجازت دی ہے۔ اس لیے اس کی خرید و فروخت کو بھی جائز رکھا ہے۔ (جصاص) لیکن احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ ایسی چیزوں سے پرہیز کیا جائے۔

یہ بات یاد رہے کہ یہ جو کچھ کہا جا رہا ہے یہ ان حلال جانوروں کے بارے میں ہے جو بغیر ذبح کے کسی دوسرے طریقے سے مر جانے کی وجہ سے حرام ہوئے ہیں۔ رہے وہ جانور جو اپنی ذات میں حرام ہیں جیسے تمام درندے، تمام شکاری جانور، تمام مکروہ جانور، یا وہ جانور جن کو نجس العین قرار دیا گیا ہے جیسے کتا یا خنزیر وغیرہ ان کی کوئی چیز بھی حلال نہیں۔ ان کی ہر طرح کی خرید و فروخت ناجائز ہے۔ ان کی حرمت کا تعلق صرف کھانے پینے سے نہیں بلکہ ہر طرح کے استعمال سے بھی ہے۔

Marfat.com

اَلــدَّم :۔ دوسری چیز جس کو حرام کیا گیا ہے، وہ دم ''خون'' ہے۔اس آیتِ کریمہ میں دم کا لفظ مطلق استعمال ہوا ہے۔لیکن سورۃ انعام میں اس کے ساتھ مسفوح کا لفظ بھی آیا ہے۔ دمامسفوحا کا معنی ہے ''بہتا ہوا خون''۔اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر وہ خون حرام کیا گیا ہے جس میں بہنے کی صلاحیت ہو، جو جانور کے ذبح ہونے کے بعد خود بخود نکلتا ہے۔لیکن جو خون جانور کے بعض حصوں سے الگ نہیں ہوتا یا دھونے سے ختم نہیں ہوتا وہ حرام نہیں ۔خرگوش کا گوشت دھوتے رہیے پانی میں اس کے خون کی آمیزش ختم نہیں ہوگی۔اس لیے ایک حد تک دھونے کے بعد اسے چھوڑ دیا جاتا ہے ۔اگر اس کے اندر کوئی خون رہ جاتا ہے تو وہ حلال ہے۔اس لیے حضورؐ نے فرمایا: ''ہمارے لیے دو خون حلال کر دیے گئے ہیں، جگر اور طحال یعنی تلی''۔اسی طرح مچھر، مکھی، کھٹمل وغیرہ کا خون بھی ناپاک نہیں۔کھایا تو نہیں جاتا لیکن اس سے کپڑا پلید نہیں ہوتا۔ہاں اگر مقدار بڑھ جائے تو اسے دھونا چاہیے۔

جس طرح خون کا کھانا پینا حرام ہے اسی طرح اس کا خارجی استعمال بھی حرام ہے۔جس طرح تمام نجاسات کی خرید و فروخت اور اس سے نفع اٹھانا حرام ہے اسی طرح خون کی خرید و فروخت بھی حرام ہے اور اس سے حاصل کی گئی آمدنی بھی حرام ہے۔

انسان کی اصل تربیت اللہ تعالیٰ سے تعلق اور شرعی احکام کی پابندی کے بغیر ممکن نہیں۔یہی وجہ ہے کہ جہاں جہاں مذہب بے اثر ہو گیا ہے اور انسان نے اپنی ذات یا اپنے مفادات کو خدا کی طرح پوجنا شروع کر دیا ہے اور اس کے ذہن سے یہ بات نکل گئی ہے کہ میں اپنی ذات کو بھی اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے شعور سے ہٹ کر سمجھنے پر قادر نہیں ہوں وہیں وہیں ہم دیکھتے ہیں کہ معیارات بدل گئے ہیں غور و فکر کے انداز بگڑ گئے ہیں، حتیٰ کہ انسانی ذوق تک بہک گیا ہے۔انسان کی فطرتِ سلیمہ ہمیشہ طیبات کی طرف مائل ہوتی ہے۔ہر گندی چیز سے اسے گھن آتی ہے اسی لیے اسلامی شریعت نے خبائث کو حرام قرار دیا ہے۔لیکن تعجب ہوتا ہے کہ دنیا میں ایسے مہذب لوگ جو مدبر بھی مانے جاتے ہیں اور انھیں اپنی تہذیب پر بڑا فخر ہے۔وہ اپنا پیشاب تک پیتے ہیں۔ہندوستان کا ایک وزیر اعظم بڑے شوق سے یہ حرکت کرتا تھا اور اخباری نمائندوں کو ترغیب دیتا تھا۔انتڑیاں اور خون جو خبائث میں شامل تھے کتنے مہذب ملک ہیں جن کے نہایت تعلیم یافتہ لوگ ان دونوں کو اپنی غذا میں شامل کر چکے ہیں۔انتڑیوں میں خون بھر کر انھیں روسٹ کر لیا جاتا ہے اور پھر کاٹ کاٹ کر بڑے مزے سے کھایا جاتا ہے۔زندہ جانوروں کے بھیجے تک اس طرح کھائے جاتے ہیں کہ جانور شکنجے میں جکڑا ہوا نیچے تڑپ رہا ہوتا ہے اور صاحب بہادر بڑے شوق سے اسے تناول فرما رہے ہوتے ہیں۔

لحم الخنزیر :۔ تیسری چیز جو اس آیت میں حرام کی گئی ہے وہ لحم خنزیر ہے۔آیت میں حرمتِ خنزیر کے ساتھ لحم کی قید ذکر کی گئی ہے۔امام قرطبی نے فرمایا کہ اس سے مقصود گوشت کی تخصیص نہیں بلکہ اس کے تمام اجزا ہڈی کھال، بال، پٹھے سب ہی باجماع امت حرام ہیں۔لیکن لحم کا لفظ بڑھا کر اشارہ اس طرف ہے کہ خنزیر دوسرے جانوروں کی طرح نہیں ہے کہ وہ ذبح کرنے سے پاک ہو سکتا ہے۔اگرچہ کھانا حرام ہی رہے کیونکہ خنزیر کا گوشت ذبح کرنے سے بھی پاک نہیں ہوتا کیونکہ نجس العین بھی ہے اور حرام بھی ہے۔صرف چمڑا سینے کے لیے اس کے بال کا استعمال حدیث میں جائز قرار دیا گیا ہے۔

مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ :۔ چوتھی چیز جو حرام کی گئی ہے وہ مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ''وہ جانور جو غیر اللہ کے لیے نامزد کر دیا گیا ہو'' جس کی تین صورتیں متعارف ہیں۔ہم اس کی تفصیل معارف القرآن سے نقل کرتے ہیں۔

غیر اللہ کے لیے نامزدگی کی تین صورتیں

اول یہ کہ کسی جانور کو غیر اللہ کے تقرب کے لیے ذبح کیا جائے اور بوقت ذبح اس پر غیر اللہ کا نام لیا جائے۔یہ صورت باتفاق و باجماع امت حرام ہے اور یہ جانور میتۃ ہے۔اس کے کسی جز سے انتفاع جائز نہیں کیونکہ یہ صورت آیت مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ کا مدلول صریح ہے جس میں کسی کا اختلاف نہیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کسی جانور کو تقرب الی غیر اللہ کے لیے ذبح کیا جائے یعنی اس کا خون بہانے سے تقرب الی غیر اللہ مقصود ہو لیکن بوقت ذبح اس پر نام اللہ تعالیٰ ہی کا لیا جائے جیسے بہت سے ناواقف مسلمان بزرگوں، پیروں کے نام پر ان کی خوشنودی

Marfat.com

حاصل کرنے کے لیے بکرے، مرغے وغیرہ ذبح کرتے ہیں لیکن ذبح کے وقت نام اس پر نام اللہ تعالیٰ ہی کا پکارتے ہیں یہ صورت بھی باتفاق فقہا حرام اور مذبوحہ مردار ہے۔

مگر تخریج دلیل میں کچھ اختلاف ہے، بعض حضرات مفسرین وفقہا نے اس کو بھی مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ کا مدلول صریح قرار دیا ہے، جیسا کہ حواشی بیضاوی میں ہے:

فكل مانودى عليه بغيراسم الله فهوحرام وان ذبح باسم الله تعالىٰ حيث اجمع العلماء لو ان مسلما ذبح ذبيحة وقصد بذبحه التقرب الى غيرالله صار مرتدا وذبيحته ذبيحة مرتد

ہروہ جانور جس کو غیراللہ کے نام پر کردیا گیا وہ حرام ہے۔ اگرچہ بوقت ذبح اللہ تعالیٰ ہی کا نام لیا ہو۔ اس لیے علماء وفقہاء کا اتفاق ہے کہ کسی جانور کو غیراللہ کے تقرب کے لیے اگر کوئی مسلمان ذبح کرے تو وہ مرتد ہو جاوے گا اور اس کا ذبیحہ مرتد کا ذبیحہ کہلائے گا۔

نیز درمختار کتاب الذبائح میں ہے۔

ذبح لقدوم الامير ونحوه كواحد من العظماء يحرم لانه اهل به لغيرالله ولو ذكراسم الله واقره الشامى ص ۲۱۴ ج۵

کسی امیر یا بڑے کے آنے پر جانور ذبح کیا تو وہ حرام ہوگا کیونکہ وہ مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ میں داخل ہے اگرچہ بوقت ذبح اللہ تعالیٰ ہی کا نام لیا ہو اور شامی نے اس کی تائید کی ہے۔

بعض حضرات نے اس صورت کو مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ کا مدلول صریح تو نہیں بنایا کیونکہ وہ بحیثیت عربیت تکلف سے خالی نہیں، مگر بوجہ اشتراک علت یعنی تقرب الی غیراللہ کی نیت کے اس کو بھی ما اہل بہ لغیر اللہ کے ساتھ ملحق کر کے حرام قرار دیا ہے۔ احقر کے نزدیک یہی وجہ احوط اور اسلم ہے۔

نیز اس صورت کی حرمت کے لیے ایک مستقل آیت بھی دلیل ہے، یعنی وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ، نصب ان تمام چیزوں کو کہا جاتا ہے جن کی باطل طور پر پرستش کی جاتی ہے معنی یہ ہیں کہ وہ جانور جس کو معبودات باطلہ کے لیے ذبح کیا گیا ہے۔ اس سے پہلے وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ کا ذکر ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ما اھل کا مدلول صریح تو وہی جانور ہے جس پر بوقت ذبح غیراللہ کا نام لیا گیا اور ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ اس کے بالمقابل آیا ہے جس میں غیراللہ کے نام لینے کا ذکر نہیں صرف بتوں وغیرہ کی خوشنودی کی نیت سے ذبح کرنا مراد ہے۔ اس میں وہ جانور بھی داخل ہیں جن کی ذبح تو کیا گیا ہے غیراللہ کے تقرب کے لیے مگر بوقت ذبح اس پر اللہ کا نام لیا گیا ہے۔ (افادہ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ)

امام قرطبی نے اپنی تفسیر میں اسی کو اختیار کیا ہے، ان کی عبارت یہ ہے:

وجرت عادة العرب بالصياح باسم المقصودبالذبيحة وغلب ذلك فى استعمالهم حتى عَبَّربه عن النية اللتى هى علة التحريم (تفسير قرطبى ص ۲۰۷ ج۲)

عرب کی عادت تھی کہ جس کے لیے ذبح کرنا مقصود ہوتا ذبح کرنے کے وقت اس کا نام بلند آواز سے پکارتے اور یہ رواج ان میں عام تھا یہاں تک کہ اس آیت میں تقرب الی غیراللہ کو جو کہ اصل علت تحریم ہے اہلال کے لفظ سے تعبیر کر دیا۔

امام قرطبی نے اپنی اس تحقیق کی بنیاد صحابہ کرام میں سے دو حضرات حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے فتاویٰ پر رکھی ہے۔

Marfat.com

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے زمانہ میں فرزدق شاعر کے باپ غالب نے ایک اونٹ ذبح کیا تھا جس پر کسی غیر اللہ کا نام لینے کا کوئی ذکر نہیں۔ مگر حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اس کو بھی مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ میں داخل قرار دے کر حرام فرمایا اور سب صحابہ کرامؓ نے اس کو قبول کیا، اسی طرح امام مسلمؒ کے شیخ یحییٰ بن یحییٰؒ کی سند سے صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک طویل حدیث نقل کی ہے جس کے آخر میں ہے کہ ایک عورت نے حضرت صدیقہ سے سوال کیا کہ ام المومنین: ہمارے کچھ رضاعی رشتہ دار عجمی لوگوں میں سے ہیں اور ان کے یہاں تو روز بروز کوئی نہ کوئی تہوار ہوتا رہتا ہے۔ یہ اپنے تہواروں کے دن کچھ ہدیہ تحفہ ہمارے پاس بھی بھیج دیتے ہیں، ہم اس کو کھائیں یا نہیں؟ اس پر صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

اماماذبح لذلک الیوم فلا تاکلوا ولکن کلوا من اشجارھم(تفسیر قرطبی ص ۲۰۷ ج ۲)
جو جانور اس عید کے دن ذبح کیا گیا ہو وہ نہ کھاؤ لیکن ان کے درختوں کے پھل وغیرہ کھا سکتے ہو۔

الغرض یہ صورت ثانیہ جس میں نیت تو تقرب الی غیر اللہ کی ہو مگر ذبح کے وقت اللہ تعالیٰ کا نام لیا جائے۔ اول تو اشتراکِ علت یعنی نیت تقرب الی غیر اللہ کی وجہ سے مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ کے حکم میں ہے دوسرے وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ کا بھی مدلول ہے اس لیے یہ بھی حرام ہے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ کسی جانور کے کان کاٹ کر یا کوئی دوسری علامت لگا کر تقرب الی غیر الله اور تعظیم لغیر الله کے لیے چھوڑ دیا جائے، نہ اس سے کام لیں اور نہ اس کے ذبح کرنے کا قصد ہو بلکہ اس کے ذبح کرنے کو حرام جانیں یہ جانور مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ اور وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ دونوں میں داخل نہیں بلکہ اس قسم کے جانور کو بحیرہ یا سائبہ وغیرہ کہا جاتا ہے اور حکم ان کا یہ ہے کہ یہ فعل تو بنص قرآن حرام ہے، جیسا کہ آیت مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْۢ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ میں ان شاء الله تعالیٰ آئے گا۔

مگر ان کے اس حرام عمل سے اور اس جانور کو حرام سمجھنے کے عقیدہ سے یہ جانور حرام نہیں ہو جاتا بلکہ اس کو حرام سمجھنے میں تو ان کے عقیدہ باطلہ کی تائید و تقویت ہوتی ہے، اس لیے یہ جانور عام جانوروں کی طرح حلال ہے۔

مگر شرعی اصول کے مطابق یہ جانور اپنے مالک کی ملک سے خارج نہیں ہوا اس کا مملوک ہے اگرچہ وہ اپنے غلط عقیدہ سے یہ سمجھتا ہے کہ میری ملک سے نکل کر غیر اللہ کے لیے وقف ہو گیا، مگر شرعاً اس کا یہ عقیدہ باطل ہے۔ وہ جانور بدستور اس کی ملک میں ہے۔ اب اگر وہ شخص خود اس جانور کو کسی کے ہاتھ فروخت کر دے یا ہبہ کر دے تو اس کے لیے یہ جانور حلال ہے۔ جیسا کہ بکثرت ہندو اپنے دیوتاؤں کے نام پر بکری یا گائے وغیرہ کو اپنے نزدیک وقف کر کے چھوڑ دیتے ہیں، مندروں کے پجاریوں جوگیوں کو اختیار دیتے ہیں وہ جو چاہیں کریں، یہ مندروں کے پجاری ان کو مسلمانوں کے ہاتھ فروخت کر دیتے ہیں۔

یا اسی طرح بعض جاہل مسلمان بھی بعض مزارات پر ایسا ہی عمل کرتے ہیں کہ بکرا یا مرغا چھوڑ دیتے ہیں اور مزارات کے مجاورین کو اختیار دیتے ہیں وہ ان کو فروخت کر دیتے ہیں تو جو لوگ ان جانوروں کو ان لوگوں سے خرید لیں جن کو اصل مالک نے اختیار دیا ہے ان کے لیے یہ خریدنا اور ذبح کر کے کھانا اور فروخت کرنا سب حلال ہے۔

نذر لغیر اللہ کا مسئلہ

یہاں ایک چوتھی صورت اور ہے جس کا تعلق حیوانات کے علاوہ دوسری چیزوں سے ہے، مثلاً مٹھائی کھانا وغیرہ جن کو غیر اللہ کے نام پر نذر (منت) کے طور سے، ہندو لوگ بتوں پر اور جاہل مسلمان بزرگوں کے مزارات پر چڑھاتے ہیں۔ حضرات فقہا نے اس کو بھی......... اشتراک علت یعنی تقرب الی غیر اللہ کی وجہ سے مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ کے حکم سے قرار دے کر حرام کہا ہے اور اس کے کھانے پینے دوسروں کو کھلانے اور بیچنے خریدنے سب کو حرام کہا ہے، کتب فقہ بحر الرائق وغیرہ میں اس کی تفصیلات مذکورہ ہیں۔ یہ مسئلہ قیاسی ہے جس کو نص قرآنی متعلقہ حیوانات پر قیاس کیا گیا ہے، واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

Marfat.com

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ﴿۱۱۶﴾ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ۪ وَّلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۱۷﴾

(اپنی زبانوں کے گھڑے ہوئے جھوٹ کی بنا پر یہ نہ کہو کہ فلاں چیز حلال ہے اور فلاں چیز حرام کہ اللہ تعالیٰ پر جھوٹی تہمت لگاؤ، جو لوگ اللہ تعالیٰ پر جھوٹی تہمت لگائیں گے وہ ہرگز فلاح نہیں پائیں گے۔ ۱۱۶) ان کے لیے چند روزہ عیش اور دردناک عذاب ہے۔ ۱۱۷) (سورۃ النحل:۱۱۶۔۱۱۷)

تحلیل و تحریم کا حق صرف خدا کا ہے

گزشتہ آیات میں ہم تفصیل سے دیکھ چکے ہیں کہ تحلیل و تحریم کا حق صرف اللہ کریم کو حاصل ہے۔ اسی پر انسان کی تمدنی زندگی کا انحصار ہے۔ حکومتوں کو نہج اور جہت اسی سے ملتی ہے۔ منتخب ایوان اسی کی رہنمائی میں اپنا سفر جاری رکھ سکتے ہیں۔ اس حق میں اگر کسی کو شریک کر دیا جائے تو پوری تمدنی اور سیاسی زندگی تلپٹ ہو کر رہ جاتی ہے۔ اسی لیے اس آیتِ کریمہ میں زور دے کر یہ بات کہی گئی ہے کہ تمھاری زبانیں جس طرح بغیر کسی روک کے حلال و حرام کا ذکر کرتی رہتی ہیں، اپنی زبانوں کو لگام دو۔ تمھارے کہہ دینے یا تمھارے بڑوں کے فیصلہ کر لینے سے حرام حلال کا فیصلہ نہیں ہوتا۔ اگر تم ایسا کرتے ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھتے ہو اور اس پر تہمت لگاتے ہو کہ تم جو کچھ کہہ رہے ہو اس کی اجازت تمھیں اللہ تعالیٰ نے دی ہے، حالانکہ تم بھی جانتے ہو کہ تمھاری شریعت، تمھاری خانہ زاد ہے، تمھارے پاس اس کے لیے کوئی آسمانی سند نہیں۔ تم ملتِ ابراہیمؑ کا راستہ چھوڑ چکے ہو۔ تم نام اس کا لیتے ہو، لیکن عمل اپنی بدعات و خرافات پر کرتے ہو۔ تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھتے ہیں وہ کبھی فلاح نہیں پاتے، یعنی ایسی کامیابی انھیں نصیب نہیں ہو سکتی جو زندگی میں انھیں آسودگی دے سکے اور آخرت میں ان کے انجام کو اچھا کر سکے۔

بدنصیبی یہ ہے کہ لوگوں نے جس چیز کو فلاح سمجھا ہے وہ دنیا میں چند ٹکوں کا حصول ہے۔ انھیں اگر دولت کے نام سے کچھ خزف ریزے مل جاتے ہیں یا عیش و عشرت کے نام سے سفلی جذبات کی تسکین کا سامان مل جاتا ہے تو وہ انھیں اپنے لیے زندگی کی کامیابی سمجھتے ہیں، حالانکہ دنیا بھر کی کامیابیاں متاعِ قلیل کے سوا کچھ بھی نہیں۔

یہ مال و دولتِ دنیا، یہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گماں لا الٰہ الا اللہ
کیا ہے تو نے متاعِ غرور کا سودا
فریبِ سود و زیاں لا الٰہ الا اللہ

کاش اس فریب میں مبتلا ہونے والے یہ سوچتے کہ آخرت میں اس کا انجام عذابِ الیم کے سوا کچھ نہیں۔

وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا مَا قَصَصْنَا عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ ۚ وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۱۸﴾

(اور جو یہودی ہوئے ان پر بھی ہم نے وہی چیزیں حرام کی ہیں جو ہم اس سے پہلے آپؐ کے سامنے بیان کر چکے ہیں اور ہم نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا وہ خود اپنی جانوں پر ظلم کیا کرتے تھے۔ ۱۱۸) (سورۃ النحل:۱۱۸)

Marfat.com

اعتراض کا جواب

اس آیتِ کریمہ میں ان اعتراضات کا جواب دیا جارہا ہے جو سابقہ آیات میں بیان کردہ حلال وحرام کے حوالے سے بنی اسرائیل کی شریعت کی نسبت سے کئے جارہے تھے کہ تم کہتے ہو کہ ملتِ ابراہیمی میں صرف یہی چیزیں حرام تھیں جن کا ذکر محولہ بالا آیات میں ہوا جبکہ ہم جانتے ہیں کہ یہودی شریعت میں اور بھی بہت ساری چیزیں حرام تھیں جنھیں اس شریعت میں حلال کیا گیا ہے۔اس کے جواب میں اس آیت میں سورۃ الانعام کی آیت ۱۴۶ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے تو بہتر ہوگا کہ اس آیت کے بارے میں کوئی تفصیل جاننے کی کوشش کریں۔

جس آیت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ یہ ہے

آیت:۱۴۶ وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ ۚ وَمِنَ الْبَقَرِ وَ الْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَا اِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَآ اَوِ الْحَوَايَآ اَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ۭ ذٰلِكَ جَزَيْنٰـهُمْ بِبَغْيِهِمْ ۖ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ O

''اور جو یہودی ہوئے ان پر ہم نے سارے ناخن والے جانور حرام کیے اور گائے اور بکری کی چربی حرام کی بجز اس کے جو ان کی پیٹھ یا انتڑیوں سے وابستہ یا کسی ہڈی سے لگی ہوئی ہو یہ ہم نے ان کو ان کی سرکشی کی سزا دی اور ہم بالکل سچے ہیں۔''

یہود پر ان کی سرکشی کی وجہ سے بعض جانور حرام کر دیے گئے

تورات کے مطالعے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہود کی قوم تاریخ کے مختلف ادوار اور مختلف انبیاء ورسل کی بعثت کے زمانے میں مختلف حالات سے گزری ہے اور اس نے زمانے کے تلخ اور شیریں گھونٹ برابر پیئے ہیں اور ان کی تاریخ عروج وزوال کی ایک عبرت خیز اور دلچسپ داستان ہے۔لیکن ایک بات جو برابر ان کی زندگی کے حالات سے سامنے آتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کے سلسلے میں ان کی سرکشی ہے۔وہ اللہ تعالیٰ کے نبیوں پر ایمان بھی لاتے رہے لیکن جب بھی انکو موقع ملا بار بار ان سے سرکشی کا اظہار ہوا اسلیے قدرت کی طرف سے وہ متعدد دفعہ جزوی عذابوں کا شکار ہوئے۔کئی دفعہ اللہ تعالیٰ کا عتاب ان پر برسا اور انکو راہ راست پر چلانے کے لیے بعض دفعہ انھیں سخت احکام بھی دیے گئے۔انہی احکام کے سلسلے میں اس آیت میں ان محرمات کا ذکر کیا جارہا ہے جو بطور خاص یہود پر حرام تھے۔لیکن آیت کے آخری حصے میں صاف بتلا دیا گیا ہے کہ یہ احکام ان کی اصل شریعت کا حصہ نہیں تھے بلکہ انکی اصل شریعت تو شریعت محمدی ہی کا عکس تھی۔البتہ یہ جو سخت احکام ان میں آئے یہ انکی سرکشی کو کنٹرول کرنے کے لیے تھے یعنی اس کا مطلب یہ ہے کہ جو چیزیں ان پر حرام کی گئیں۔وہ اس وجہ سے نہیں تھیں کہ فی نفسہ ان چیزوں کے اندر حرمت کی کوئی علت موجود تھی بلکہ انکی حرمت میں اصل دخل بنی اسرائیل کے فسادِ مزاج کو تھا جسطرح ایک طبیب بسا اوقات کسی مریض کو ایک جائز وطیب چیز کے استعمال سے بھی روک دیتا ہے کہ اس سے اسکی صحت جسمانی کو ضرر کا اندیشہ ہوتا ہے۔اس طرح اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے اخلاقی فساد کے سبب سے سزا کے طور پر بہت سی جائز چیزیں بھی ان پر حرام ٹھہرا دی تھیں۔اس اخلاقی فساد کو قرآن کریم نے اس آیت میں بغی کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے جسکے معنی سرکشی کے ہیں بنی اسرائیل کی اس سرکشی کا ذکر تورات اور انبیا کے صحیفوں میں اس کثرت سے آیا ہے کہ آدمی پڑھتے پڑھتے اکتا جاتا ہے۔شریعت کا کوئی حکم ایسا نہیں ہے جسکو انھوں نے بخوشی قبول کیا ہو جو حکم بھی انکو دیا گیا اول تو انھوں نے اپنے سوالات کی کثرت ہی سے اس کو نہایت بوجھل بنا دیا جس کی ایک مثال سورۃ البقرہ میں گائے کی قصے میں گزر چکی ہے۔پھر اسکو مانا بھی تو اس سے گریز وفرار کی اتنی راہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کے نکال لیں کہ عملاً وہ حکم ان کیلیے بالکل بے اثر ہو کر رہ گیا۔ان کے اس فرار پسندانہ اور باغیانہ مزاج کا اثر قدرتی طور پر ان کی شریعت پر بھی پڑا جس طرح کسی سرکش جانور کا مالک اس کو سخت بندھنوں کے اندر رکھنے پر مجبور ہوتا ہے یا سرکش رعایا کا حکمران سخت قوانین نافذ کرتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ان سرکشوں کو نہایت سخت قوانین میں باندھا۔جن کو قرآن میں اصر واغلال یعنی بندھن اور طوق سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔توارت میں اسرائیلی شریعت کے احکام پڑھیئے تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔دوسری چیزوں سے قطع نظر صرف طہارت ہی

Marfat.com

کے احکام پڑھیے اور دیکھیے کہ حیض، نفاس، جنابت اور بعض بیماریاں مثلاً جریان اور برص وغیرہ لاحق ہوجانے کی صورت میں ان کو کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑتے۔ تو آدمی کا رواں رواں اس رب کا شکر گزار ہوتا ہے جس نے ہمیں ملت اسلام کی ہدایت بخشی جو ان تمام غیر فطری بندشوں اور پابندیوں سے پاک ہے۔
کھانے پینے کے باب میں بھی صرف وہی بندشیں نہیں تھیں جو بیان ہوئیں یہ بندشیں تو صرف چوپایوں کی حلت وحرمت کے متعلق بیان ہوئی ہیں اس سے زیادہ پابندی ان پر دریائی جانوروں کے معاملے میں تھی۔ احبار، باب ۱۱ سے معلوم ہوتا ہے کہ دریائی جانوروں میں سے جن کے پر اور چھلکے ہیں وہ ان کے ہاں جائز تھے باقی سب حرام تھے۔ اسی طرح پرندوں میں سے صرف شکاری پرندے ہی حرام نہیں تھے بلکہ قازیں، بط اور بگلے وغیرہ بھی حرام تھے۔
اس آیت کریمہ میں چنداں محرمات کا ذکر کیا گیا ہے جو یہود پر بطور خاص حرام کی گئی تھیں۔ ان میں سے ایک تو ایسے جانور ہیں جو ناخن رکھتے ہیں اور دوسری چیز جانوروں کی چربی۔ جہاں تک تعلق ہے ناخن والے جانوروں کا اس کا مفہوم سمجھنے کے لیے تورات کی تصریحات کو دیکھنا ضروری ہے۔ انھیں سامنے رکھیں تو اس کا مفہوم متعین کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود کے ہاں چوپایوں میں سے صرف وہ چوپائے حلال تھے جن کے پاؤں چرے ہوئے ہوں اور وہ جگالی بھی کرتے ہوں۔ اس روشنی میں ذِی ظُفُرٍ یعنی ناخن والے جانور کا مفہوم متعین کیا جائے تو اس سے مراد وہ جانور ہوں گے جن کے پاؤں چرے ہوئے نہیں ہیں بلکہ سُم کی شکل میں بالکل بند البتہ ان کے سامنے کے حصے پر ناخن ہیں۔ یہود پر اس طرح کے تمام جانور جیسا کہ کُل کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے علی الاطلاق حرام تھے۔ اس وجہ سے ان پر بعض وہ جانور بھی حرام ہوگئے جو ملت ابراہیمی میں جائز تھے مثلاً اونٹ اور خرگوش وغیرہ۔ دوسری چیز جو ان پر حرام کی گئی وہ ناخن والے جانوروں کی چربی تھی تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے ہر قسم کی چربی مراد ہے لیکن تھوڑا سا بھی غور کیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ جو چربی گوشت کے جز کی حیثیت رکھتی ہو۔ کمر، آنتوں یا ہڈیوں میں اس طرح شامل ہو کہ اس کو باآسانی الگ نہ کیا جاسکے اس کا کھانے والوں پر حرام کرنا یقیناً ایک ایسی سختی ہے جس کا انسانوں کے لیے تحمل بہت مشکل ہے اور عقل سے بھی بعید ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسے احکام نہیں دیے ہوں گے یہ تشدد یہود کے کاہنوں اور فقیہوں نے اپنی طرف سے بڑھایا ہوگا اور یہ اس تشدد پر ایک مزید اضافہ ہے، جو ان کی شریعت میں پہلے بھی کچھ کم نہ تھا۔ اسلیے قرآن کریم نے اس کی اصلاح کرتے ہوئے اور اصل حکم کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ ان پر ہم نے جو چربی حرام کی تھی وہ، وہ نہیں تھی جو کمر، آنتوں یا ہڈیوں میں اس طرح لگی ہوئی ہو کہ باآسانی ان کو الگ نہ کیا جاسکے۔

ثُمَّ اِنَّ رَبَّکَ لِلَّذِیْنَ عَمِلُوا السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِکَ وَاَصْلَحُوْٓا ۙ اِنَّ رَبَّکَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۱۹﴾ (سورة النحل : ۱۱۹)

(پھر بیشک آپ ؐ کا رب ان لوگوں کے لیے جنھوں نے نادانی سے برائی کا ارتکاب کیا پھر اس کے بعد انھوں نے توبہ کرلی اور اپنے آپ کو سنوار لیا، بیشک آپ ؐ کا پروردگار اس کے بعد بہت بخشنے والا اور نہایت رحم کرنے والا ہے۔ 119)

رحمت کا دریچہ

گزشتہ آیاتِ کریمہ میں پروردگار نے مشرکینِ مکہ کے مختلف اعتراضات کا جواب دیا اور ان کے مشرکانہ رویے پر تنقید بھی کی اور انھیں ان کے انجام سے بھی ڈرایا۔ اب اس آیت کریمہ میں اچانک ایک بشارت کے ذریعے رحمت کا روزن کھولا جارہا ہے اور ان لوگوں کو بہتر زندگی کی بشارت دی جارہی ہے، جنھوں نے آنحضرت ﷺ اور آپ ؐ پر ایمان لانے والوں پر ظلم توڑنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ ایسی ہی باتوں کو دیکھ کر آدمی کو بے ساختہ یقین کرنا پڑتا ہے کہ یہ کتاب اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل ہوئی ہے ورنہ کسی انسان میں یہ حوصلہ کہاں کہ وہ ان لوگوں کے لیے رحمت کے دروازے کھولے جو اس کے خون کے پیاسے ہوں اور وہ اس اللہ تعالیٰ کی رحمت کی نوید دے جس کی وحدانیت بھی انھیں گوارا نہیں۔ وہ ان کی تمام تر دشمنی اور اذیت رسانی کے باوجود انھیں یہ خبر دے رہا ہے کہ تم نے اپنی حماقت سے نبی کریم ﷺ اور مسلمانوں کو اپنا حریف سمجھ لیا ہے اور ہر ممکن طریقے سے انھیں نقصان پہنچانے میں لگے رہتے ہو اور جو آبِ حیات وہ تمھارے سامنے پیش کرتے ہیں تم اسے زہرِ قاتل سمجھتے ہو۔ وہ تمھیں دعائیں دیتے ہیں اور تم انھیں گالیاں

Marfat.com

دیتے ہو، ان کو اوران کے خدا کو از اول تا آخر تمھاری بہتری منظور ہے۔ اس لیے اس آیتِ کریمہ میں فرمایا گیا کہ اے پیغمبرؐ تیرا رب اپنی ربوبیت کا حوالہ دے کر ان نادانوں سے یہ کہتا ہے کہ جس طرح تمھارے رب نے تمھاری ہر طرح کی سرکشی کے باوجود تمھاری روزی بند نہیں کی اور اس کے ربوبیت کے فیضان میں کوئی کمی نہیں آئی، اسی طرح تم اب تک اپنی زندگی میں جو کچھ بھی برائیاں اختیار کر چکے ہو اور تم نے اپنی ہمہ گیر جہالت کے باعث نہ جانے کیسے کیسے تعصبات پال رکھے ہیں اور انھیں تعصبات کے نتیجے میں تم ہمارے پیغمبر پر ایمان لانے کے لیے تیار نہیں ہو حالانکہ وہ راتوں کو تمھاری ہدایت کے لیے دعائیں مانگتا ہے اور تم اس کے راستے میں کانٹے بچھاتے ہو۔ ہر طرح کا دکھ پہنچانے میں تمھیں دریغ نہیں لیکن یاد رکھو تم جو کچھ بھی کر چکے ہو بظاہر وہ ناقابلِ معافی دکھائی دیتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے تمھاری طرف سے التفات کو پھیرا نہیں۔ اس کا گوشۂ التفات برابر کھلا ہے۔ ادھر سے برابر آواز آرہی ہے کہ تم یہ سب کچھ کر چکنے کے بعد بھی اگر توبہ کر لو، آنحضرت ﷺ پر ایمان لے آؤ اور اپنی زندگی کی اصلاح کا عزم کر لو تو یقین جانو اس کی طرف سے مغفرت فرمانے میں دیر نہیں کیونکہ وہ بہت بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

إِنَّ إِبْرٰهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ
حَنِيفًا ۗ وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿١٢٠﴾ شَاكِرًا لِّأَنْعُمِهِ ۚ اجْتَبٰهُ وَ
هَدٰهُ إِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿١٢١﴾ وَآتَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۖ وَإِنَّهُ
فِي الْآخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِينَ ﴿١٢٢﴾ ثُمَّ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ أَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ
إِبْرٰهِيمَ حَنِيفًا ۖ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿١٢٣﴾ إِنَّمَا جُعِلَ
السَّبْتُ عَلَى الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِيهِ ۚ وَإِنَّ رَبَّكَ لَيَحْكُمُ بَيْنَهُمْ
يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿١٢٤﴾ اُدْعُ إِلٰى سَبِيلِ
رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ
أَحْسَنُ ۚ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيلِهِ وَهُوَ أَعْلَمُ
بِالْمُهْتَدِينَ ﴿١٢٥﴾ وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُمْ بِهِ ۖ
وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِينَ ﴿١٢٦﴾ وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا

Marfat.com

بِاللّٰهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ ﴿۱۲۷﴾
إِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ ﴿۱۲۸﴾

رکوع: ۱۶ (بیشک ابراہیم علیہ السلام ایک الگ امت تھے، اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار یکسوئی سے حق کی طرف مائل تھے اور وہ مشرکین میں سے نہ تھے۔ ۱۲۰) وہ اس کی نعمتوں کے شکرگزار تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو چن لیا اور سیدھے راستے کی طرف ان کی رہنمائی کی۔ ۱۲۱) اور ہم نے انھیں دنیا میں ہر طرح کی بھلائی عطا فرمائی اور وہ آخرت میں صالحین میں سے ہوں گے۔ ۱۲۲) (پھر ہم نے آپ کی طرف وحی کی کہ ملتِ ابراہیمؑ کی پیروی کیجیے جو بالکل یکسو تھے اور وہ مشرکین میں سے نہ تھے۔ ۱۲۳) (بلاشبہ سبت انھی لوگوں پر عائد کیا گیا تھا جنھوں نے اس کے باب میں اختلاف کیا، اور بیشک تمھارا رب ان چیزوں کے باب میں جن میں وہ اختلاف کرتے رہے ہیں قیامت کے روز ان کے درمیان فیصلہ فرمائے گا۔ ۱۲۴) (دعوت دو اپنی رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ، اور ان سے اس طریقے سے بحث کرو جو پسندیدہ ہو، بیشک آپ کا رب خوب جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹکا ہوا ہے اور وہ ان کو بھی خوب جانتا ہے جو ہدایت پانے والے ہیں۔ ۱۲۵) (اگر تم انھیں سزا دینا چاہو تو انھیں سزا دو، لیکن اس قدر جتنی تمھیں تکلیف پہنچائی گئی ہے، اور اگر تم صبر کرو تو یہ صبر کرنے والوں کے لیے بہتر ہے۔ ۱۲۶) (اور آپ صبر کیجیے اور نہیں ہے آپ کا صبر مگر اللہ تعالیٰ کی توفیق سے، آپ نہ تو ان پر رنجیدہ ہوں اور نہ ان کی چالوں سے جو یہ چلتے رہتے ہیں، پریشانی میں مبتلا ہوں۔ ۱۲۷) (بیشک اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے ساتھ ہے جنھوں نے تقویٰ اختیار کیا اور جو نیک کاموں میں سرگرم رہتے ہیں۔ ۱۲۸)

إِنَّ إِبْرٰهِيْمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا ؕ وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۲۰﴾ شَاكِرًا لِّأَنْعُمِهٖ ؕ اجْتَبٰهُ وَهَدٰهُ إِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۲۱﴾ وَاٰتَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ؕ وَإِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۲۲﴾

(بیشک ابراہیم علیہ السلام ایک الگ امت تھے، اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار یکسوئی سے حق کی طرف مائل تھے اور وہ مشرکین میں سے نہ تھے۔ ۱۲۰) وہ اس کی نعمتوں کے شکرگزار تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو چن لیا اور سیدھے راستے کی طرف ان کی رہنمائی کی۔ ۱۲۱) اور ہم نے انھیں دنیا میں ہر طرح کی بھلائی عطا فرمائی اور وہ آخرت میں صالحین میں سے ہوں گے۔ ۱۲۲) (سورۃ النحل: ۱۲۰۔۱۲۱۔۱۲۲)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تعارف

یہود و نصاریٰ اور مشرکین سب اپنی اپنی خرافات کی تائید میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نام استعمال کرتے تھے۔ یہود نے اپنے طور پر شریعت میں جو کمی بیشی کی تھی اسے وہ حضرت ابراہیم کی طرف منسوب کرتے تھے۔ اور عیسائیوں نے تو شریعت کا حلیہ ہی بگاڑ ڈالا حتیٰ کہ لحم خنزیر کو بھی اپنے لیے حلال قرار دے دیا۔ اس شوخ چشمی کے باوجود سہارا وہ بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ہی لیتے تھے اور مشرکینِ عرب تو حضرت ابراہیمؑ پر اپنی اجارہ داری

Marfat.com

سمجھتے تھے۔ان سب کی تردید کے لیے یہاں حضرت ابراہیمؑ کا ذکر اس طرح کیا جارہا ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جتنے گمراہ فرقے اپنا انتساب حضرت ابراہیمؑ کی ہی طرف کرتے تھے۔حضرت ابراہیمؑ کو ان سے کوئی تعلق نہ تھا۔اور وہ جو کچھ کہتے ہیں حضرت ابراہیمؑ پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں کیونکہ ان کے دنیا سے تشریف لے جانے کے صدیوں بعد یہودیت اور نصرانیت پیدا ہوئی۔اس لیے وہ نہ یہودی تھے اور نہ نصرانی۔تو یہودیت اور نصرانیت ان کی طرف اپنے آپ کو کیسے منسوب کرسکتی ہے اور یا انھیں اپنے میں سے کیسے قرار دے سکتی ہے۔جہاں تک مشرکینِ عرب کا تعلق ہے ان میں قریش اگرچہ ان کی اولاد ہیں اور وہ انھیں کے بنائے ہوئے بیت اللہ کے متولی بھی ہیں لیکن انھوں نے جس طرح اللہ تعالیٰ کے گھر کو ایک تیرتھ بنا کے رکھ دیا ہے اور ایک خانہ ساز شریعت اپنی طرف سے گھڑ کے حضرت ابراہیمؑ کے واسطے سے اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کردی ہے۔اس لحاظ سے ان کا بھی کوئی تعلق حضرت ابراہیمؑ سے نہیں ہے۔یہ الگ الگ امتیں ہیں جنھوں نے اپنے لیے الگ الگ شریعتیں بنا رکھی ہیں۔لیکن حضرت ابراہیمؑ وہ اپنی ذات میں خود ایک الگ امت تھے۔ان امتوں سے ان کا کوئی رشتہ نہیں تھا۔یہ ملتِ ابراہیمؑ کا نام ضرور لیتے ہیں لیکن یہ ملتِ ابراہیمؑ سے بیگانہ ہوچکے ہیں۔

لغتِ عرب میں امت کا لفظ متعدد معنی میں استعمال ہوتا ہے۔مثلاً (۱) وہ انسان جو تمام خوبیوں کا جامع ہو، (۲) امام اور پیشوا، (۳) علمبردارِ حق وصداقت، (۴) جو دنیا بھر سے الگ تھلگ ہو۔حضرت ابراہیمؑ ان تمام اوصاف کے اعتبار سے امت کہے جانے کے مستحق ہیں۔ان میں سے کون سی ایسی خوبی اور کمال ہے جس سے آپؑ متصف نہ تھے۔آپؑ کی امامت کی گواہی خود قرآنِ کریم نے دی۔آج تک تینوں آسمانی مذاہب آپؑ کو اپنا پیشوا سمجھتے ہیں۔ آپؑ اگرچہ فردِ واحد تھے لیکن آپؑ نے امتوں کی بنیادیں اٹھائیں۔آپؑ نے ایک ایسا گھر بنایا جو تمام دنیا کا سجدہ گاہ بنا۔آپؑ کی زندگی کے کارناموں اور قربانیوں نے وہ نقوش ثبت کیے جن سے امتوں نے استفادہ کیا ہے۔جب دنیا میں کہیں بھی ہدایت کا نور موجود نہیں تھا اور دنیا کفر اور شرک کے اندھیروں میں غوطے کھا رہی تھی۔تنہا حضرت ابراہیمؑ نے توحید کا چراغ روشن کیا اور اسے لے کر ملکوں ملکوں گھومے اور اپنی قربانیوں سے ہر جگہ توحید کے گہرے نقوش ثبت کیے۔آپؑ کے جن اوصاف نے انسانیت کو روشنی بخشی ہے یوں تو ان کا شمار ممکن نہیں لیکن ان میں سے بعض کا ذکر پروردگار نے فرمایا ہے وہ یقیناً انسانیت کا اثاثہ ہیں۔ان میں سب سے پہلی بات یہ فرمائی کہ حضرت ابراہیمؑ قانت تھے۔اس کا معنی ہے اطاعت گزار اور فرمانبردار اور دوسری بات فرمائی کہ آپؑ حنیف تھے۔یعنی ہر آستانے سے منہ پھیر کر صرف اللہ تعالیٰ کا ہوجانے والا۔ان دونوں صفات کے اعتبار سے دیکھا جائے تو حضرت ابراہیمؑ کی زندگی ایک ایسا نمونہ معلوم ہوتی ہے جس پر فخر تو کیا جاسکتا ہے لیکن اس کا اتباع آسان نہیں۔آپؑ نے اللہ تعالیٰ کے آستانے پر سر جھکایا اور اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کا عہد کیا تو مشیخیت کی گدی کو ٹھوکر ماردی۔وقت کے اقتدار نے آپؑ کو جھکانا چاہا۔آپؑ نے ان کے نام نہاد خداؤں کے سر پھوڑ ڈالے اور اقتدار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر چیلنج کرتے ہوئے کہا کہ میرا سر اس کے سامنے جھکتا ہے جس نے تجھے زندگی دی ہے اور جو تجھے موت دے گا۔وقت کی منہ زور قوتوں نے جب آپؑ کی زندگی چھیننا چاہی تو آپؑ نے آگ کے الاؤ میں کودجانے میں بھی تامل نہ کیا۔شہروں سے منہ موڑا اور وادیٔ غیر ذی زرع کو اپنا مسکن بنایا۔آپؑ کو دیکھ کر قدم قدم پر احساس ہوتا ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ کا فرمانبردار کس طرح ہر آستانے سے بے نیاز ہوتا ہے۔اور اللہ تعالیٰ سے لو لگانے والا کس طرح دنیا سے کٹ کر بھی خوش وخرم رہتا ہے۔مزید فرمایا کہ وہ مشرکین میں سے نہیں تھا جبکہ دنیا مشرکوں سے بھری ہوئی تھی۔وہ صرف اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر بجالانے والا تھا۔اہلِ دنیا میں سے کسی کا احسان لینا اسے گوارا نہ تھا۔جب اس نے ثابت کردیا کہ اس کا سب کچھ اس کے خدا کا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اسے برگزیدہ کیا اور نبوت کے لیے چن لیا اور دنیا کی امامت کا تاج اس کے سر پر سجایا اور صراطِ مستقیم کی اس کو ہدایت بخشی۔باوجود اس کے کہ کسی ملک کے اقتدار نے اسے برداشت نہ کیا تاہم ایک مخصوص علاقے میں اللہ تعالیٰ نے اسے ایسی عزت اور وجاہت عطا کی کہ وہ اس علاقے کا رئیس سمجھا جانے لگا اور کنعان اور اس سے ملحقہ علاقہ اس کی عملداری میں دے دیا گیا۔اللہ تعالیٰ نے ایسی صالح اولاد عطا فرمائی جن میں نبوت کا سلسلہ رواں دواں رہا، نئی نئی امتیں وجود میں آئیں۔آپؑ ہی کی اولاد کو دنیا کی امامت دی گئی۔حتیٰ کہ آخری تاجدارِ رسالت ﷺ بھی آپؑ کی اولاد میں سے آیا جس نے چند ہی سالوں میں جزیرۂ عرب پر اللہ تعالیٰ کے دین کا پرچم لہرادیا اور اس کے شاگردوں اور جانشینوں نے ایک محدود عرصے میں آدھی سے زیادہ زمین پر اللہ تعالیٰ اور اس کی حاکمیت کے نام کے ڈنکے بجادیے۔آخرت میں آپؑ کا شمار زمرۂ صالحین میں ہوگا، یعنی وہ گروہ جس میں اللہ تعالیٰ کے نبی اور رسول ہوں گے جو امتوں پر اللہ تعالیٰ کے گواہ بنا کر اٹھائے جائیں گے۔

Marfat.com

ثُمَّ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ؕ وَمَا کَانَ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ ﴿۱۲۳﴾ (سورۃ النحل : ۱۲۳)

(پھر ہم نے آپؐ کی طرف وحی کی کہ ملتِ ابراہیمؑ کی پیروی کیجیے جو بالکل یکسو تھے اور وہ مشرکین میں سے نہ تھے۔ ۱۲۳)

یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا غالباً سب سے بڑا اعزاز ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سیدالمرسلینؐ کو آپؐ کی ملت کے اتباع کا حکم دیا کیونکہ اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری اور غیراللہ سے یکسر لاتعلقی کا اعلیٰ معیار جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قائم کیا تھا اسے اگر آگے بڑھانا تھا تو یقیناً اس کے لیے آنحضرتؐ کی ذاتِ عزیز اور آپؐ کی عظیم امت کی ضرورت تھی۔ صاحب تاج العروس نے ملت کے لفظ کی تحقیق کرتے ہوئے لکھا کہ صحتِ عقائد، مکارمِ اخلاق، دعوت وارشاد کا حکیمانہ انداز، دلائل کی پختگی، بیان کی دلنشینی اور منکرین کے جور و جفا کے مقابلے میں حلم و بردباری یہ وہ ملتِ ابراہیمی ہے جس کے اتباع کا حکم اس آیت میں دیا جارہا ہے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے ان اوصاف کو جس طرح نئے سے نئے معنی پہنائے اور جس طرح ان کی درخشندگی کو فزوں تر کیا اور جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کاوشوں کو دنیا کے بیشتر حصے میں کامیابی کی بنیاد بنایا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپؐ کو ملتِ ابراہیمؑ کا حکم دینے کا مقصود کیا تھا اور اس کے نتیجے میں دنیا میں کیا کچھ عطا کرنا مقصود تھا۔

اِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ عَلَی الَّذِیْنَ اخْتَلَفُوْا فِیْهِ ؕ وَاِنَّ رَبَّکَ لَیَحْکُمُ بَیْنَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ فِیْمَا کَانُوْا فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۲۴﴾

(بلاشبہ سبت انھی لوگوں پر عائد کیا گیا تھا جنھوں نے اس کے باب میں اختلاف کیا، اور بیشک تمہارا رب ان چیزوں کے باب میں جن میں وہ اختلاف کرتے رہے ہیں قیامت کے روز ان کے درمیان فیصلہ فرمائے گا۔ ۱۲۴) (سورۃ النحل:۱۲۴)

سبت کا ملتِ ابراہیمؑ سے کوئی تعلق نہیں

اس آیتِ کریمہ میں یہود کے ایک اعتراض کا جواب دیا گیا ہے۔ وہ آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں پر یہ اعتراض بھی کرتے تھے کہ آپ لوگ ملتِ ابراہیمؑ کے داعی ہیں جبکہ یہودیت ملتِ ابراہیمؑ کی نمائندہ ہے اور آپ جانتے ہیں کہ یہودیوں میں سبت کا کس قدر احترام تھا اور اس روز کے لیے خاص احکام تھے، تو پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ آپ سبت کا احترام نہیں کرتے اور اس کا اس طرح اہتمام نہیں کرتے جس طرح اللہ تعالیٰ نے یہود کو حکم دیا تھا۔ اس آیت میں اس کا جواب دیا گیا ہے کہ اولاً تو یہود کا ملتِ ابراہیمؑ سے کوئی تعلق نہیں اور مزید یہ کہ سبت کا تعلق یہود سے ہو تو ہو، ملتِ ابراہیمؑ میں سے تو اس کا کوئی واسطہ نہیں رہا۔ اس لیے اس کے بارے میں احکام یہود ہی میں نازل کیے گئے اور انھیں کے ایک گروہ نے کھلم کھلا اس کی بے حرمتی کی تو وہ گروہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کا شکار ہوا، لیکن جب معاملہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک پہنچا تو انھیں سبت کے بارے میں ایسے احکام نہیں دیے گئے۔ اب جبکہ دین کی تکمیل ہو رہی ہے اور آخری رسولؐ تشریف لے آئے ہیں اور آخری کتاب نازل ہوگئی ہے تو اس امت کا سبت سے کیا تعلق۔ البتہ یہودیوں کو فکر اس بات کی ہونی چاہیے کہ انھیں چونکہ اس دن کے بارے میں خاص احکام دیے گئے تھے اور پھر انھوں نے ان احکام میں اختلافات پیدا کیے اور ہر گروہ نے اپنی بات پر اصرار کیا اور دوسرے کو گمراہ ٹھہرایا۔ جب ان سے اس بارے میں پوچھا جائے گا تو وہ اس کا کیا جواب دیں گے اور چونکہ وہ ان اختلافات میں کوئی کلمۂ عادلہ نہیں پاسکے اور آج تک انھیں اختلافات کا شکار ہیں، اب قیامت کے دن ہی اللہ تعالیٰ ان کے ان جھگڑوں کا فیصلہ کرے گا۔ عافیت کا راستہ یہی ہے کہ وہ آخری رسول پر ایمان لائیں اور اپنی کوششوں سے اسلام میں اپنے لیے یہ مقام پیدا کریں۔

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ؕ اِنَّ رَبَّکَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِیْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِیْنَ ﴿۱۲۵﴾ (سورۃ النحل : ۱۲۵)

(دعوت دو اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ، اور ان سے اس طریقے سے بحث کرو جو پسندیدہ ہو، بیشک آپؐ کا رب خوب جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹکا ہوا ہے اور وہ ان کو بھی خوب جانتا ہے جو ہدایت پانے والے ہیں۔ ۱۲۵)

Marfat.com

اس آیت کا پس منظر

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اور اس کے بعد کی آیات اس وقت نازل ہوئی ہیں جب حالات میں دو تبدیلیاں محسوس کی جارہی تھیں، ایک یہ کہ قریشِ مکہ کی جانب سے مسلمانوں پر اذیت رسانی کا عمل انتہاؤں کو چھونے لگا تھا۔ ان کے راستے میں کوئی روک باقی نہیں تھیں اور کسی رشتے کا پاس ان کے یہاں بے معنی ہو کر رہ گیا تھا۔ اندیشہ پیدا ہو رہا تھا کہ مسلمانوں میں اس بے پناہ اذیت رسانی کیخلاف کوئی ردعمل پیدا نہ ہو جائے کیونکہ مسلمانوں کے حالات اب ایسے نہیں رہے تھے کہ وہ خاموشی سے مار کھاتے رہیں، لیکن مسلمانوں کی طرف سے ردعمل کی صورت میں چونکہ دعوت الی اللہ کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ پیدا ہو سکتا تھا اس لیے پروردگار نے ضروری سمجھا کہ دعوت کے بنیادی اصول واضح کیے جائیں۔

دوسری تبدیلی یہ محسوس کی جارہی تھی کہ اب شاید ہجرت کا زمانہ دور نہیں، وہاں مسلمانوں کو ایسے لوگوں میں دعوت کا کام کرنا ہوگا جو قریشِ مکہ سے مختلف مزاج کے حامل تھے۔ اوس و خزرج اگرچہ قحطانی عرب تھے لیکن عدنانی عربوں سے بہت مختلف مزاج رکھتے تھے۔ پھر وہاں تین قبیلے یہود کے بھی آباد تھے، ان کا مزاج یکسر الگ اور ان کے تحفظات دعوت الی اللہ کے بالکل معارض۔ ایسے حالات میں ضرورت محسوس ہوئی کہ تبلیغ و دعوت کے آداب تفصیل سے واضح کر دیے جائیں۔

اس آیت کریمہ میں جو آداب ذکر فرمائے گئے ہیں ان کے دو عنوانات ہیں، دعوت بالحکمت اور موعظہ حسنہ، لیکن کبھی کبھی بحث اور جدال تک بھی نوبت پہنچ سکتی ہے۔ وہ اگرچہ دعوت کا لازمی تقاضا نہیں لیکن ضرورت بلاشبہ ہے۔ اس لیے بعد کی آیات میں صبر کے عنوان سے اس کے بارے میں ہدایات دی گئیں۔ عام طور پر حکمت سے مراد دلائل و براہین لیے جاتے ہیں اور موعظت حسنہ سے مخلصانہ اور خیر خواہانہ انداز میں تذکیر و تنبیہ مراد لی جاتی ہے۔ بعض اہلِ علم کا خیال ہے کہ حکمت کا مطلب یہ ہے کہ دانائی کے ساتھ مخاطب کی ذہنیت، استعداد اور حالات کو سمجھ کر نیز موقع و محل دیکھ کر بات کی جائے۔ اور عمدہ نصیحت کا مطلب یہ ہے کہ صرف دلائل پر اکتفا نہ کیا جائے بلکہ مخاطب کے جذبات کو بھی اپیل کی جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ ان دونوں اصطلاحات کو کوئی سا بھی لفظی معنی پہنا لیجیے، مقصود تو صرف یہ ہے کہ دعوت الی اللہ کے لیے جن جن نزاکتوں کا ملحوظ رکھنا ضروری ہے اور جیسے کچھ اس کے آداب ہونے چاہئیں اور داعی کو جیسا ہمدرد اور یقین کا حامل ہونا چاہیے اور اسلوب جیسا کچھ دلآویز ہونا چاہیے اور موقع و محل کی سمجھ اور گفتگو کے موضوع پر دلائل کا جیسا استحضار ہونا چاہیے، یہ سب چیزیں جمع ہوں تو تبلیغ و دعوت کی وہ صورت وجود میں آتی ہے جس کے بارے میں ہدایات دی جارہی ہیں اور نبی کریم ﷺ جس کے عملی نمائندہ تھے۔ چنانچہ اس لحاظ سے جب ہم اس موضوع پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ سید المرسلین خاتم النبیین ﷺ کی عظیم اور تابناک زندگی کا ہر عمل اپنی جگہ پر ایک معجزہ ہے۔ مگر بالخصوص تبلیغ آپ کا ایک ایسا عمل ہے کہ جس کی کامیابیوں کو دیکھ کر یقین کرنا پڑتا ہے کہ یقیناً آپ اللہ تعالیٰ کے رسول تھے ورنہ تبلیغ و دعوت کے لیے یہ جانفشانی اور پھر اس میں ہر ہر قدم پر حکمتِ تبلیغ کا لحاظ اور پھر ہر موقع کی مناسبت سے افراد اور قوموں کے مزاج کے اعتبار سے اس حکمت میں نئے نئے پہلوؤں کا اضافہ یہ صرف ایک اللہ تعالیٰ کے رسول ہی کی صفات ہو سکتی ہیں۔ وہی ذات والا صفات ایسی ہو سکتی ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے علمِ نبوت سے نئے نئے گوشوں کو کھولتی ہے اور تبلیغ و دعوت کے ہر میدان میں حکمت کے نئے پہلو اجاگر کرتی ہے۔

حکمت کا ایک پہلو

اس حوالے سے سب سے پہلے جو چیز سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ کو اللہ تعالیٰ کے پیغام کی تبلیغ اور اس کی دعوت کے لیے جس قوم سے واسطہ پڑا اس سے زیادہ جاہل، اجڈ، اپنی بات پر اڑنے والی، اپنے آباؤ اجداد کی روایات کی پاسداری کرنے والی اور اپنے باطل خیالات پر ہر طرح کی قربانی دینے والی اور پھر علم کی ہر شاخ سے تہی دامن قانون اور اخلاق کے الفاظ تک سے نابلد۔ خاص طور پر دینی اصطلاحات اور دینی مزاج سے کوسوں دور شاید ہی کوئی قوم گزری ہو۔ صدیاں بیت گئیں تھیں کہ اس خطے میں کوئی رسول مبعوث نہیں ہوا تھا۔ اس لیے توحید اور آخرت کا تصور ان کے لیے بالکل ایک اجنبی بات تھی۔ اس سخت صورت حال کو جب رسول اللہ ﷺ نے ملاحظہ فرمایا تو حیرت ہوتی ہے کہ آپ نے آغاز ہی میں دعوت و تبلیغ کے لیے

Marfat.com

جن حکمتوں کو ملحوظ رکھا اس کی گہرائی اور گیرائی پر جب نظر ڈالی جاتی ہے تو سوائے حیرت کے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ آپ نے اس قوم کی تمام منفی خصوصیات کو یکسر ایک طرف رکھ کر ان کی مثبت خصوصیات کو تلاش کیا اور آپ چونکہ خود عرب تھے اس لیے عربوں کی نفسیات کو پہچانتے ہوئے اس کا پورا لحاظ رکھا۔ آپ جانتے تھے کہ یہ لوگ دینی اصطلاحات اور لاہوتی مسائل سے تو واقف نہیں لیکن بات کی تہہ تک پہنچ جانے اور جلد سے جلد کسی حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد اس کا اعتراف کر لینے میں ان کو امتیاز حاصل ہے اسی طرح وہ قوت مشاہدہ اور عقل عام سے بہت حد تک بہرہ ور تھے۔ وہ عالم غیب اور اس کی نفسیات کو تو نہیں جانتے تھے لیکن فطری ماحول کی نزاکتوں کو خوب سمجھتے تھے چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے اپنی دعوت کے آغاز میں ان کی انہی خصوصیات کا سہارا لیا۔ آپ نے اپنی قوم کو اپنی بات سنانے کی خاطر جمع کرنے کے لیے وہی طریقہ اختیار کیا جو عربوں میں رائج تھا۔ عربوں کا قاعدہ تھا کہ جب کوئی شخص کوئی خطرہ محسوس کرتا یا اسے کسی دشمن کا خوف ہوتا تو وہ کسی پہاڑ کی چوٹی یا ٹیلے پر چڑھ کر بلند آواز سے پکارتا، یا صباحاہ، یا واصباحاہ......

لوگ اس کی آواز کو سن کر دوڑ پڑتے اور اپنے کام چھوڑ کر دشمن کا مقابلہ کرنے کے لیے نکل پڑتے۔ حضور اکرم ﷺ نے بھی کوہِ صفا پر کھڑے ہو کر یہ طریقہ اختیار فرمایا۔ یہ پہاڑ قریش کی آبادی سے قریب تر تھا۔ آپ نے وہاں سے آواز دی یا صباحاہ، لوگوں نے خطرے کی اس گھنٹی کو سن کر اس کی طرف دوڑنا شروع کیا۔ کہا جاتا ہے کہ اہل مکہ میں کوئی ایسا شخص نہیں تھا جو یہ آواز سن کر نہ آیا ہو اور جو خود نہ آسکا اس نے اپنے نمائندے یا قائم مقام کو بھیجا۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ عملی طور پر حضور ﷺ نے پہاڑ پر کھڑے ہو کر اپنے منصب کی حقیقت واضح کی۔

نبوت جو سراسر ایک علمی موضوع ہے آپ نے اس کو علمی انداز میں سمجھانے کی بجائے وہ انداز اختیار فرمایا جس سے عرب استفادہ کر سکتے تھے آپ نے انھیں پہاڑ پر کھڑے ہو کر عملاً یہ بات سمجھائی کہ تم پہاڑ کے دامن میں ہو۔ ظاہر ہے کہ صرف پہاڑ کے سامنے دیکھ سکتے ہو اس کے پیچھے نہیں دیکھ سکتے اور وہ خطرہ جو تمھارے لیے وبال جان بن سکتا ہے وہ پہاڑ کے پیچھے اور تمھاری نگاہوں سے اوجھل ہے اس کو وہ شخص دیکھ سکتا ہے جو پہاڑ کے اوپر کھڑا ہو کیونکہ اس کی نظر سامنے اور پیچھے دونوں طرف ہے۔ میری حیثیت یہ ہے کہ میں نوعِ انسانی کے مسائل ضروریات احساسات اور انفعالات کے ایک بلند و بالا پہاڑ پر کھڑا ہوں۔ اس کی زندگی کے بارے میں جو نقصانات پیش آسکتے ہیں وہ اس پہاڑ کے پیچھے ہیں۔ پوری نوعِ انسانی صرف پہاڑ کو دیکھ سکتی ہے لیکن اس کے عقب کو نہیں دیکھ سکتی۔ اس کو وہ دیکھے گا جو پہاڑ کے اوپر کھڑا ہو۔ وہ دنیا جس کو تم دیکھتے ہو وہ ظاہری دنیا ہے اور اس ظاہری دنیا کا انجام تو اس عالم غیب کے پہاڑ کے پیچھے ہے اور میں اوپر کھڑا دونوں کو دیکھ رہا ہوں اگر تم میری اس حیثیت کا اعتراف کر سکو تو میں تمھیں آنے والے خطرے سے آگاہ کر سکتا ہوں۔ اس طرح آپ نے وہ قوم جو صرف پیکر محسوس کو ماننے کی خوگر تھی اس کو مخصوص مثال کے ذریعے اپنی حیثیت سے آگاہ فرمایا۔ چنانچہ جب ان کو نبوت کی اصل حیثیت کا احساس ہو گیا تو اب اس کے بعد دوسری بات یہ تھی کہ ایسے بلند و بالا منصب پر کون فائز ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے وہی فائز ہو سکتا ہے جو اس بگڑے ہوئے معاشرے میں 40 سال گزار کر بھی سچائی کا مینار ثابت ہوا ہو۔ جس نے گندگی میں رہ کر بھی کبھی دامن کو گندہ نہ ہونے دیا ہو۔ جو اندھیروں میں رہ کر بھی دور تک دیکھنے کی صلاحیت رکھتا ہو چنانچہ آپ نے نہایت حکمت و دانش سے سب سے پہلے یہی سوال کیا کہ لوگو بتلاؤ تم میرے بارے میں کیا رائے رکھتے ہو۔ کیا تم نے کبھی مجھے جھوٹ بولتے سنا ہے میں نے کبھی کسی معاملے میں خیانت کی ہے۔ تمھیں کبھی مجھ سے کسی ناحق بات کا تجربہ ہوا ہے تو پورے مجمع نے بیک زبان یہ اعتراف کیا۔

کہا سب نے قول آج تک کوئی تیرا
کبھی ہم نے جھوٹا سنا اور نہ دیکھا

اس اعتراف حقیقت کا نتیجہ یہ ہے کہ جن لوگوں نے آپ کا پیغام ماننے سے انکار کیا اور آپ کی دعوت کو جھٹلایا وہ بھی ہمیشہ اپنی اس کمزوری کو محسوس کرتے رہے اور آپس میں جب انھیں باتیں کرنے کا موقع ملتا تو ایک دوسرے سے کہتے کہ بھائیو عجیب بات ہے کہ جس شخص نے لڑکپن کا زمانہ اور جوانی کے ایام ہم میں گزارے ہیں اور اس پورے چالیس سالہ دور میں ہمیں کبھی اس سے جھوٹ کا تجربہ نہیں ہوا اور بندوں کے معاملات میں کبھی اس نے خیانت نہیں کی تو کیا اب اس عمر میں پہنچ کر جب کہ اس کی جوانی ڈھل رہی ہے تو کیا وہ اللہ پر بہتان باندھے گا یعنی آپ کی حکمت تبلیغ نے جس طرح اپنے منصب اور اپنی حقیقت کو تسلیم کروایا اس سے ہمیشہ کے لیے آپ کے مخالفین اخلاقی طور پر آپ کے سامنے کمزور ہو گئے۔

اپنے منصب کی عظمت اور اپنی اخلاقی بلندیوں کا اعتراف کروانے کے بعد آپ کے جس عمل نے سب سے زیادہ لوگوں پر اثر ڈالا اور جسے حکمتِ تبلیغ کی جان کہنا چاہیے وہ تین چیزیں تھیں۔

Marfat.com

حکمتِ تبلیغ کی جان تین چیزیں

آپ نے مشرکینِ مکہ کے سامنے جب اپنی دعوت رکھی تو انھوں نے اس دعوت کا راستہ روکنے کے لیے جو ہتھکنڈے اختیار کیے اور جس طرح آپ کا تمسخر اڑایا گیا آپ پر عجیب و غریب پھبتیاں کسی گئیں۔ آپ پر الزامات اور اتہامات کا ایک طوفان اٹھایا گیا۔ حتیٰ کہ آپ اور آپ کے ساتھیوں کو جسمانی تشدد کا بھی نشانہ بنایا گیا۔ یہاں تک کہ راستوں میں آپ کے لیے چلنا گھر میں قیام کرنا اور کعبۃ اللہ کے سامنے کھڑے ہو کر نماز پڑھنا مشکل بنا دیا گیا۔ بالآخر آپ کے قتل کے منصوبے باندھے جانے لگے۔ آپ کو وطن سے نکالنے کے لیے تدبیریں ہونے لگیں لیکن یہ ساری بدتمیزیوں کے طوفان میں ہمیں کوئی ایک ایسا واقعہ بھی نہیں ملتا کہ حضور اکرم ﷺ کی استقامت میں اپنے موقف پر یقین و اطمینان میں اللہ پر توکل اور اعتماد میں کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی کمی آئی ہو۔ حتیٰ کہ جب بھی آپ کے ماننے والوں میں سے کسی نے پریشان ہو کر مخالفین کے لیے بددعا کی درخواست کی تو آپ نے اس پر خفگی کا اظہار فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ تم سے پہلے گزرنے والی قوموں میں جن لوگوں نے دعوت کا کام کیا وہ اس سے زیادہ سخت حالات سے دوچار ہو چکے ہیں۔ رہی یہ بات کہ اس دعوت کا انجام کیا ہوگا تو تم اپنی زندگی میں اس کے غلبۂ عمومی کو دیکھو گے اور صرف یہ مکہ ہی نہیں بلکہ قیصر و کسریٰ کی عظمتیں بھی تمہارے سامنے خم ہوں گی اور آج جبکہ راہ چلتے قافلے لوٹ لیے جاتے ہیں تم دیکھو گے کہ یہ خطہ امن کا گہوارہ بن جائے گا۔ آج جبکہ تمھیں کھانے کو نصیب نہیں ہوتا تم دیکھو گے کہ لوگ زکوٰۃ کے مستحقین کو ڈھونڈیں گے لیکن انھیں زکوٰۃ لینے والا کوئی نھیں ملے گا۔ اپنی دعوت اپنی بات اپنے رویئے اور اپنی پیش کردہ صداقت پر یہ بے پناہ اطمینان اور یہ حد درجہ استقامت بالآخر مخالفین کو سوچنے پر مجبور کر دیتی تھی کہ اگر اس دعوت میں کوئی نفسانی خواہش شامل ہوتی تو اس کے داعی اور اس کے پیروکار کبھی تو اس میں کوئی ترمیم کوئی سمجھوتہ اور کسی کمزوری کو قبول کر لیتے چنانچہ یہ استقامت کتنے لوگوں کے دل کھولنے کا باعث ہوگئی۔

اسی طرح دوسری چیز جسے حکمتِ تبلیغ کی جان کہنا چاہیے وہ یہ ہے کہ دشمنانِ حق کی طرف سے جیسے ابھی عرض کیا گیا کوئی ایسی اذیت کوئی ایسی مصیبت اور کوئی ایسا دکھ نہیں جو حضور اکرم ﷺ کی ذات والا صفات کو برداشت نہ کرنا پڑا ہو۔ مگر اس کے باوجود آپ کے دل میں کبھی ان کی طرف تنفر انتقام یا اشتعال کا کوئی ایک لمحہ بھی تلاش کرنے سے نہیں ملتا بلکہ اس کے برعکس ہم دیکھتے ہیں کہ وہ لوگ گالیاں دیتے ہیں۔ حضور ﷺ دعائیں دیتے ہیں وہ پتھر مارتے ہیں حضور ﷺ کی زبان مبارک سے ان کے لیے پھول جھڑتے ہیں۔ وہ آپ کی جان لینے کے درپے ہیں اور حضور ﷺ کو ان کی زندگیاں سنوارنے کی فکر ہے۔ انسانی فطرت ہے کہ بد سے بدتر دشمن بھی ہمدردی اور خیر خواہی کے مقابلے میں دیر تک کھڑا نہیں رہ سکتا اور جس کی خیر خواہی کا عالم یہ ہے کہ طائف میں اس پر پتھروں کی بارش کی جائے اور وہ زخموں سے نڈھال ہو کر بار بار غش کھا کر گرے۔ حتیٰ کہ جان بچانے کے لیے ایک باغ کی پناہ لینے پر مجبور ہو جائے اور جب اس کسمپرسی، بے بسی اور اذیت کے دوران پہاڑوں کا فرشتہ آ کر یہ کہے کہ حضور ﷺ مجھے اللہ تعالیٰ نے بھیجا ہے اگر آپ حکم دیں تو میں طائف کے دونوں پہاڑوں سے اس آبادی کو پیس ڈالوں تو حضور ﷺ فرمائیں کہ نہیں میں ان کے لیے بددعا نہیں کروں گا۔ مجھے امید ہے کہ یہ لوگ اگر خود نہیں تو ان کی اولاد سے خدا کے نام لیوا اٹھیں گے۔ چنانچہ یہ دنیا والوں کی عجیب و غریب خیر خواہی اور ہمدردی تھی جس نے آخر ان لوگوں کو بھی قدموں میں جھکنے پر مجبور کر دیا جو آپ کے بدترین دشمن تھے۔

تیسری چیز جسے آپ کی حکمتِ تبلیغ میں بڑی اہم حیثیت حاصل ہے وہ یہ ہے کہ آپ نے جس بات کا حکم دیا اور جس بات کی تبلیغ فرمائی خود سب سے پہلے اس پر عمل کر کے دکھایا بلکہ اس سے بڑھ کر اس پر عمل کر کے دکھایا۔ لوگوں کو اگر آپ نے مال کا چالیسواں حصہ راہ خدا میں دینے کا حکم دیا تو خود اپنے ساری پونجی پیش کر دی۔ دوسروں کے چھوڑے ہوئے مال میں اگر آپ نے قانونِ وراثت کے مطابق تقسیم کا حکم دیا تو خود اپنے پیچھے کوئی ترکہ تک نہیں چھوڑا۔ لوگوں کو اگر پانچ نمازیں پڑھنے کا حکم دیا تو خود آٹھ نمازیں پڑھیں اور تہجد آپ کے لیے فرض قرار دے دی گئی۔ اگر آپ نے لوگوں کو یہ سمجھایا کہ زندگی میں حقیقی اہمیت آخرت کو ہے دنیا ایک ضرورت ہے مقصود نہیں۔ تمھیں دنیا اور متاعِ دنیا سے دل لگانے کی بجائے بے رغبتی کا ثبوت دینا ہوگا تو خود آپ نے دنیا سے بے رغبتی کا ایسا اعلیٰ نمونہ پیش فرمایا کہ مولانا ظفر علی خان مرحوم کے الفاظ میں۔

Marfat.com

قدموں میں ڈھیر اشرفیوں کا لگا ہوا
اور تین دن سے پیٹ پر پتھر بندھا ہوا
ہیں دوسروں کے واسطے سیم و زر و گہر
اور اپنا یہ حال کہ ہے چولہا بجھا ہوا

بے رغبتی کی انتہا یہ ہے کہ آپ نے اپنی اولاد کے لیے زکوۃ تک کو حرام کر ڈالا اور حکومت اور ریاست امت مسلمہ کے پاس امانت چھوڑ گئے۔ آپ کی زندگی کا یہ رویہ وہ عملی تبلیغ ہے کہ جس کے بارے میں صحابہ کہتے تھے کہ ہم نے احکام تو قرآن حکیم سے سیکھے لیکن اس کی حقیقت حضور ﷺ کے اعمال سے سیکھی۔ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نماز میں خشوع وخضوع کیا ہوتا ہے یہ اس وقت معلوم ہوا جب رسول اللہ ﷺ کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا۔ آپ کے سینے سے ایسی آواز آتی تھی کہ جیسے ہنڈیا ابلنے سے یا چکی کے چلنے سے آتی ہے۔ بڑے سے بڑا دشمن بھی جب حضور ﷺ کی زندگی کی اس عملی تصویر کو دیکھتا تھا تو عبداللہ بن سلام جو یہودی عالم تھے اُن کی طرح پکار اٹھتا تھا کہ یہ چہرہ کسی جھوٹے آدمی کا نہیں ہو سکتا۔ مختصر یہ کہ آپ کے اعمال حقیقت میں آپ کی تبلیغ کی وہ حکمت ہے جس سے بڑھ کر کوئی تبلیغ مؤثر نہیں ہو سکتی۔

حکمتِ تبلیغ کا ایک اور پہلو

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حکمتِ تبلیغ کا تعلق دو چیزوں سے ہے۔ ایک آپ کی دعوت، منصب دعوت اور داعی کی حیثیت اور دوسری چیز ہے اسلوبِ دعوت۔ جس طرح آپ نے اپنی عملی زندگی اپنی خیر خواہی اپنی گہری دلسوزی، اللہ تعالیٰ پر بے پناہ یقین اور اعتماد اور مصائب کے مقابلے میں برداشت اور صبر اور ہر طرح کی برائی کے مقابلے میں حسنِ سلوک جیسی حکمتوں سے اپنی دعوت وتبلیغ کو آگے بڑھایا۔ اسی طرح اس تبلیغ ودعوت کے مؤثر ہونے میں حکمت کے ایک دوسرے پہلو کا بھی دخل ہے۔ جس کا تعلق اسلوب دعوت سے ہے اس میں جب ہم غور کرتے ہیں تو ہمیں چند حکمتیں بہت نمایاں دکھائی دیتی ہیں۔ سب سے پہلی چیز جو سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ دعوت وتبلیغ کے سلسلے میں ہر شخص کی ذہنی سطح اور اس کے مدارج عقلی کا پورا پورا خیال فرماتے تھے۔ شہری لوگوں سے ان کے انداز اور معیار کے مطابق گفتگو فرماتے اور دیہاتی اور بدوی لوگوں سے ان کی ذہنیت کے مطابق بات کرتے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس سلسلے میں بنی فزارہ کے ایک شخص کا ذکر کیا ہے جو بدوی تھا۔ وہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ میرے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا ہے جو سیاہ رنگ کا ہے میں نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے کیونکہ ہم میاں بیوی میں سے کوئی بھی سیاہ رنگ کا نہیں ہے۔ آنحضرت ﷺ نے اس کی سمجھ اور پیشہ کے مطابق جواب مرحمت فرمایا۔ اس سے پوچھا کیا تمھارے پاس کچھ اونٹ ہیں۔ اس نے کہا جی ہیں۔ آپ نے پھر دریافت فرمایا وہ کس رنگ کے ہیں۔ اس نے کہا سرخ رنگ کے۔ آپ نے اس پر سوال کیا کیا ان میں کوئی خاکستری رنگ کا یا کم سیاہ رنگ کا کوئی اونٹ بھی ہے اس نے کہا ہاں ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اب تم ہی بتاؤ کہ سرخ رنگ کے اونٹوں میں یہ سیاہی کیسے آگئی۔ اس نے اس کے جواب میں کہا ممکن ہے کہ اس کی نسل میں کوئی اونٹ خاکستری یا سیاہ رنگ کا ہو اور یہ اس کی جھلک آگئی ہو۔ جب بات یہاں تک پہنچی تو آپ نے یہ فرما کر اس کے شک کو دور کر دیا کہ تمھارے بیٹے کے معاملے میں بھی ایسا ہو سکتا ہے۔ یہ نسب کا کرشمہ ہے اور اس میں تمھاری بیوی کا کوئی قصور نہیں ہے اس طرح طبرانی کی روایت ہے کہ قریش کا ایک نوجوان جو حیوانیت کے جذبات سے مغلوب تھا۔ آنحضرت ﷺ کے پاس آیا اور کہنے لگا مجھے بدکاری کی اجازت فرما دیجیے۔ اس کا یہ کہنا تھا کہ حاضرین اس پر لپکے اور اس گستاخی پر اس کو خوب ڈانٹا۔ آپ نے یہ دیکھا تو فرمایا کہ اس سے تعرض نہ کرو اور اس کو اپنے قریب بلا کر پوچھا کہ کیا تم اس بات کو پسند کرو گے کہ جن رشتوں کا تم احترام کرتے ہو ان میں سے کسی کے ساتھ کوئی یہ بری حرکت کرے۔ اس نے کہا میں تو ایسا کبھی سوچ بھی نہیں سکتا۔ آپ نے فرمایا کہ تم جس برائی کا ارادہ کر رہے ہو وہ برائی بھی تو آخر کسی کی بہن اور بیٹی کے ساتھ ہی ہوگی اس کے بعد آپؐ نے اس کے لیے مغفرت کی دعا فرمائی۔ وہ اس سادہ تفہیم کے انداز سے جو اس کی ذہنی سطح کے عین مطابق تھی اس قدر متاثر ہوا کہ ہمیشہ کے لیے اس سے تائب ہو گیا۔ اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ حضور اپنی دعوت میں آسانی، تیسیر اور تدریج کو ملحوظ رکھتے تھے۔ آپ کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ احکام اور مسائل میں

Marfat.com

تنگی پیدا نہ ہونے پائے اور اس کی خاطر اپنے اللہ تعالیٰ سے دعا بھی فرماتے تھے اور جب دوسرے لوگوں کو کہیں تعلیم یا تبلیغ کے لیے بھیجتے تو ان کو بھی حکم دیتے کہ لوگوں کو تعلیم دو اور آسانی پیدا کرو اور مشکلات سے پرہیز کرو۔ ایک روایت میں ہے کہ آپ اغلوطات سے منع فرمایا کرتے تھے۔ امام اوزاعیؒ کہتے ہیں کہ اس سے مقصود یہ تھا کہ لوگوں کے سامنے مشکل و پیچیدہ مسائل بیان نہ کئے جائیں جن سے وہ کچھ اخذ نہ کرسکیں بلکہ صرف وہ باتیں بیان کی جائیں جن کو وہ آسانی سے سمجھ سکیں۔ بلکہ عجیب بات یہ ہے کہ حکمت تبلیغ کا دارومدار چونکہ اس بات پر تھا کہ اپنی دعوت کو لوگوں کے دماغوں میں اتارا جائے۔ اس لیے آپؐ بعض دفعہ حسب ضرورت گفتگو میں اپنے مخاطب کے لب ولہجہ کا بھی خیال رکھتے اور یہ بھی دیکھتے کہ اس کا تعلق کس قبیلے سے ہے اور اس قبیلے میں کس نوعیت کی زبان رائج ہے۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ آپ نے عاصم الاشعری سے گفتگو کرتے ہوئے فرمایا۔ لیس من امبر امصبیام فی امسفر (لیس من البر الصیام فی السفر) کہ سفر کے دوران روزہ رکھنا نیکی نہیں۔ لیکن چونکہ عاصم قبیلہ اشعر سے تعلق رکھتے تھے اور ان کی عادت یہ تھی کہ اکثر لام کو م کے ساتھ بدل دیتے تھے۔ چنانچہ آپ نے انہی کے لب ولہجہ میں بات فرمائی اور مقصود صرف یہ تھا کہ مخاطب بات کو پوری طرح سمجھ سکے۔ صحابہ روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ کی عادت میں یہ بات بھی تھی کہ جب کسی اہم دینی بات کو دل و دماغ میں اتارنا چاہتے تو عموماً اسے تین مرتبہ دہراتے تاکہ بات دل کی گہرائیوں میں اتر جائے۔ اس معاملے میں آپ کی احتیاط کا عالم یہ تھا کہ جس طرح آپ لوگوں کے لب ولہجہ اور احساسات کا خیال فرماتے تھے اسی طرح ان کی نفسیات کا بھی خیال فرماتے۔ انسانی فطرت ہے کہ آدمی ہر وقت بات سننے کے لیے تیار نہیں ہوتا اور اگر موقع بے موقع اسے بات سننے پر مجبور کیا جائے تو اس کا ذہن اس کا دل اسے قبول نہیں کرتا۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اسی حکمت کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ دلوں میں خواہشات اور میلانات ہوتے ہیں اور کسی وقت وہ بات سننے کے لیے تیار ہوتے ہیں اور کسی وقت وہ اس کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ لوگوں کے دلوں میں ان میلانات کے اندر داخل ہوکر اس وقت بات کہنی چاہیے جب وہ سننے کے لیے تیار ہوں۔ اس لیے کہ دل کا حال یہ ہے کہ جب اس کو کسی بات پر مجبور کیا جاتا ہے تو وہ اندھا ہوجاتا ہے اور بات قبول کرنے سے انکار کردیتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ اس کا ہمیشہ لحاظ رکھتے تھے اور ہر وقت اور موقع بے موقع وعظ و نصیحت سے احتراز فرماتے تھے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ وعظ و نصیحت میں تخول سے کام لیتے تھے۔ یعنی وقفہ دے کر بات کرتے تھے تاکہ روزانہ اور ہر وقت کی نصیحت سے طبیعتیں اکتا نہ جائیں۔

مختصر یہ کہ تبلیغ و دعوت چاہے انفرادی ہو یا اجتماعی اس کا تعلق دعوت اسلام سے ہو یا دعوت اصلاح سے، سامعین شہری ہوں یا دیہاتی مخاطب پیروکار ہو یا بدترین دشمن ہر حال میں آنحضرت ﷺ کی تبلیغ و دعوت اپنے اندر ایسی حکمت و دانش اور حکیمانہ اسلوب رکھتی ہے کہ جس کو جاننے اور سمجھنے کے لیے ایک زندگی چاہیے اور اس کو بیان کرنے کے لیے ایک سفینہ چاہیے اور یہی وہ حکمت و دانش ہی تھی جس کے نتیجے میں تبلیغ و دعوت کی کامیابی اور کامرانی کی وہ شکل آج ہمارے سامنے ہے کہ بڑے سے بڑا دشمن بھی اس بات کا انکار نہیں کرسکتا کہ جو پذیرائی جو وسعت اور جو قبول عام حضور ﷺ کی تبلیغ و دعوت کو مختصر عرصے میں نصیب ہوا اور پھر جس طرح اس نے دماغوں اور دلوں میں نفوذ حاصل کیا اور پھر جس کی وسعتوں کے سامنے ملکوں بلکہ براعظموں کی وسعتیں سمٹ گئیں وہ کسی اور دعوت کو آج تک نصیب نہیں ہوسکا مگر آہ اس پر جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے کہ جس دعوت کی بنیاد حکمت و دانش اور جس طریقہ دعوت کی بنیاد حکیمانہ اسلوب پر رکھی گئی تھی آج یہ دعوت بہت حد تک اس سے محروم ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ آج دوسرے مذاہب اور دوسری قوموں کو ہمارے اندر داخل ہوکر ارتداد اور الحاد کے لیے کام کرنے کے مواقع میسر ہیں۔ ہم دوسروں کو اس دعوت سے تو کیا متاثر کرتے اپنے گھر میں لگی ہوئی آگ کو بجھانا بھی ہمارے بس سے باہر ہورہا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم دوبارہ اپنی اس کھوئی ہوئی میراث کو پانے کی کوشش کریں اور وہی حکیمانہ اسلوب وہی حکمت و دانش وہی خیر خواہی وہی اعتماد و توکل کی بے پناہی وہی برائی کے مقابلے میں نیکی کا رویہ، الزامات اور اتہامات کے مقابلے میں اسی موعظہ حسنہ کا انداز اختیار کرکے ایک دفعہ پھر اتمام حجت اور شہادت حق کا فرض انجام دیں کیونکہ:

ہم کو بخشی ہیں خدا نے دُہری خدمتیں
خود تڑپنا ہی نہیں اوروں کو تڑپانا بھی ہے
خود سراپا نور بن جانے سے کب چلتا ہے کام
ہم کو اس ظلمت کدے میں نور پھیلانا بھی ہے

Marfat.com

وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ ؕ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۲۶﴾

(اگر تم انھیں سزا دینا چاہو تو انھیں سزا دو، لیکن اس قدر جتنی تمھیں تکلیف پہنچائی گئی ہے، اور اگر تم صبر کرو تو یہ صبر کرنے والوں کے لیے بہتر ہے۔ ۱۲۶) (سورۃ النحل:۱۲۶)

مکارمِ اخلاق کی تعلیم

ایک عام مسلمان کو بالعموم اور داعی الی اللہ کو بالخصوص جن مکارمِ اخلاق کا حامل ہونا چاہیے یہاں اس کی تعلیم دی جا رہی ہے۔ عام ہموار زندگی میں تو کبھی اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی، لیکن جب مسلمان طاقتور دشمنوں میں گھرے ہوئے ہوں تو ہر وقت ایسی صورتحال پیدا ہونے کا موقع ہوتا ہے کہ کوئی مخالف اٹھ کر بلاوجہ کسی مسلمان کو ظلم کا نشانہ بنائے۔ ایسی صورت میں ایک مسلمان کو کیا کرنا چاہیے۔ اگر حالات اس بات کی اجازت دیں تو پروردگار اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ جس نے تم پر زیادتی کی ہے تم ٹھیک ٹھیک اس زیادتی کا بدلہ لے لو۔ لیکن اس میں جو احتیاط لازم ہے وہ یہ ہے کہ تمھارے ساتھ جیسی زیادتی ہوئی ہے، ویسا ہی بدلہ لو۔ یہ مت کرو کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اگر کسی شخص نے انگلی کاٹی ہے تو اس کے بدلے میں انگلی کاٹی جائے، اس کا ہاتھ نہ کاٹ دیا جائے۔ یہ بدلہ لینا انسان کا فطری حق ہے اور انسانی اجتماعی زندگی کا تقاضا بھی، کیونکہ اگر ظلم کرنے والوں کو یہ یقین ہو جائے کہ ہم سے کوئی بدلہ لینے والا نہیں تو وہ کبھی بھی ظلم سے ہاتھ روکنے والے نہیں۔ لیکن یہاں مشکل یہ ہے کہ عموماً یہ ہوتا ہے کہ بدلہ لیتے ہوئے عدل و انصاف کے تقاضوں کو پوری طرح ملحوظ رکھنا آسان نہیں ہوتا۔ اگر ذرا سی بھی بے احتیاطی ہو گئی تو وہ شخص جو داعی حق بن کر اٹھا ہے اس کے لیے جواب دینا مشکل ہو جاتا ہے اور لوگ اس معمولی بات کو ایک الزام بنا دیتے ہیں۔ اس لیے احتیاط اور حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ سرے سے بدلہ لینے کا تصور ہی دماغ سے نکال دیا جائے۔ رہی یہ بات کہ ظالم کا ظلم پھر تیس دینے لگتا ہے اور آدمی کو کسی کل قرار نہیں آتا۔ اس لیے یہ بات بے حد ضروری ہے کہ ایک مومن کو یہ تربیت دی جائے کہ بدلہ لینا تیرا حق ہے لیکن بدلہ چھوڑ دینا ایک بہت بڑی فضیلت ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے بہت اجر و ثواب رکھا ہے۔ امام ترمذی نے اپنی کتاب میں حضرت حذیفہؓ کی روایت سے آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ اے اہلِ ایمان بے سوچے سمجھے لوگوں کی پیروی کرنے والے نہ بنو، کہ تم یہ کہو جیسے عام کہا جاتا ہے کہ اگر ہمارے ساتھ لوگوں نے اچھا برتاؤ کیا تو ہم بھی اچھا برتاؤ کریں گے بلکہ اپنے آپ کو اس بات کا خوگر بنا لو کہ اگر لوگ تمھارے ساتھ حُسنِ سلوک سے پیش آئیں تو تم بھی حُسنِ سلوک سے پیش آؤ۔ اور اگر لوگ تمھارے ساتھ برا اور ناروا سلوک کریں تو تم پھر بھی ان پر ظلم و زیادتی نہ کرو۔

وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ ﴿۱۲۷﴾

(اور آپؐ صبر کیجیے اور نہیں ہے آپؐ کا صبر مگر اللہ تعالیٰ کی توفیق سے، آپؐ نہ تو ان پر رنجیدہ ہوں اور نہ ان کی چالوں سے جو یہ چلتے رہتے ہیں، پریشانی میں مبتلا ہوں۔ ۱۲۷) (سورۃ النحل:۱۲۷)

صبر اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہوتا ہے

اس آیت میں خطاب اگرچہ نبی کریم ﷺ کو ہے لیکن روئے سخن عام مسلمانوں کی طرف ہے۔ مکہ معظمہ کی صورتحال کے پیشِ نظر یقیناً آپؐ کے لیے صبر ہی بہتر ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر حال میں اور ہر اذیت پر صبر کرنا بعض دفعہ ناممکن ہو جاتا ہے۔ عزتِ نفس، ضمیر کی آواز، بے بسی کا احساس بعض دفعہ انسان کو کچھ نہ کچھ کر گزرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ ایسی صورت میں صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑنا، اللہ تعالیٰ کی توفیق کے بغیر ممکن نہیں۔ یہی وہ صبر ہے جسے نماز کے ذریعے حاصل کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ جب آدمی پر ایسی کیفیت ہو تو اسے چاہیے کہ نماز کی نیت باندھ کر کھڑا ہو جائے۔ اپنی بے بسی کا واسطہ دے کر اللہ تعالیٰ کی قدرت کو آواز دے۔ ہر طرح کی حالت پر دل کا مضبوطی سے قائم رہنا صرف اسی کے ہمت دلانے سے ممکن ہے۔ جب

Marfat.com

اس کی طرف سے توفیق آ جاتی ہے تو پھر ممولے میں بھی شہباز سے لڑنے کی طاقت آ جاتی ہے اور پھر 313 میدانِ بدر میں ایک ہزار بہادروں کا بھرکس نکال دیتے ہیں۔ اقبال نے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا ۔

ہو صداقت کے لیے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کر

اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ ﴿۱۲۸﴾ (سورة النحل : ۱۲۸)

(بیشک اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے ساتھ ہے جنھوں نے تقویٰ اختیار کیا اور جو نیک کاموں میں سرگرم رہتے ہیں۔ ۱۲۸)

غلبے کی نوید

مسلمانوں کو عموماً اور داعیانِ حق کو خصوصاً اس بات کو اپنے دل میں بٹھا لینا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی معیت اور اس کی توفیق ان لوگوں کو میسر آتی ہے جو اپنے دلوں میں اللہ تعالیٰ کا تقویٰ پیدا کرتے ہیں، یعنی جن کے دلوں کا میلان ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی رضا کی طرف ہوتا ہے جن کے دل ہمیشہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ؐ کی محبت سے سرشار رہتے ہیں۔ ان کا ہر قدم نیکی کی طرف اٹھتا ہے اور ہر فیصلہ کرنے سے پہلے سو دفعہ سوچتے ہیں کہ اس میں میرے پروردگار کا حکم کیا ہے اور میرے رسول ؐ کی سنت کیا کہتی ہے۔ اور مزید یہ کہ وہ اپنے اعمال میں اس طرح تقویٰ کی روح بسائے ہوئے ہیں کہ وہ اپنی عبادات، اپنے معاملات اور آدابِ زندگی میں ہمیشہ اس تصور کو اپنے ساتھ رکھتے ہیں کہ میں اپنے اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہوں اور اگر یہ نہیں تو میرا خدا مجھے دیکھ رہا ہے۔ جس شخص کے ہر عمل میں یہ روح کارفرما ہو اس سے کسی برائی کا تصور ناممکن نہیں تو محال ضرور ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جنھیں تیار کرنا اللہ تعالیٰ کے رسول ؐ کے پیشِ نظر تھا اور آپ ؐ اس میں کامیاب رہے، اس پر تاریخ کا ایک ایک لفظ گواہ ہے۔ اور اگر تدبر سے کام لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس آیتِ کریمہ میں اسلام اور مسلمانوں کے غلبے کی نوید سنائی گئی ہے۔

صدق الله العظيم

اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ

کیا ایمان والوں کے لیے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

هُدًى لِّلنَّاس

سُوْرَةُ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ

Marfat.com

Marfat.com

تعارف

سُوْرَةُ بَنِیْٓ اِسْرَآءِ یْلَ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سورت کا خلاصہ

سورت کا نام

اس سورت کا معروف نام بنی اسرائیل ہے، جو اس کی ایک آیت سے ماخوذ ہے۔ اس کے علاوہ اس سورت کو اسریٰ اور سبحان کے ناموں سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ یہ نام محض اس سورت کی شناخت کیلئے ہیں، اس کا عنوان نہیں۔ اس میں 12 رکوع، 121 آیات اور 533 کلمات ہیں۔

اس سورت کی پہلی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورت اس وقت نازل ہوئی ہے جب معراج کا واقعہ پیش آیا۔ اور معراج کا واقعہ چونکہ مکہ معظمہ میں پیش آیا، اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ یہ سورت مکی ہے۔

مشہور روایات کے مطابق معراج کا واقعہ 12 سن نبوی میں پیش آیا جبکہ نبی کریم ﷺ کو لوگوں کے سامنے اپنی دعوت پیش کرتے ہوئے تقریباً 12 سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ دعوت کے اثرات کا دائرہ مکے سے باہر نکل کر بیشتر عرب قبیلوں میں اپنی جگہ بنا چکا تھا۔ کوئی قبیلہ شاید ہی ایسا ہو جس میں اس دعوت نے اپنے بہی خواہ پیدا نہ کیے ہوں۔ خود مکہ معظمہ میں وفادار جاں نثاروں کی ایک قابلِ ذکر تعداد وجود میں آچکی تھی جو بڑے سے بڑے خطرے سے پنجہ لڑانے کی ہمت رکھتی تھی۔ قریش مکہ اسلامی دعوت کے انہی اثرات کو دیکھتے ہوئے اس حد تک جھنجلا چکے تھے کہ اب وہ مزید اس دعوت کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ جلد اس نوزائیدہ دعوت کا خاتمہ کردیا جائے۔ لیکن ان کے سامنے رکاوٹ یہ تھی کہ انھیں ایسے داعی اور اس کے وفادار جاں نثاروں سے واسطہ پڑا تھا جو نہ جھکنا جانتے تھے اور نہ ڈرنا جانتے تھے۔ انھوں نے کئی دفعہ سازگاری کی کوئی نہ کوئی صورت نکالنے کی کوشش کی لیکن انھیں صاف بتادیا گیا کہ جس طرح ندی کے دو پاٹ آپس میں مل نہیں سکتے اور جس طرح اندھیرا اور اجالا ایک نہیں ہو سکتے، اسی طرح حق اور باطل میں کمپرومائز نہیں ہوسکتا۔ قریشِ مکہ پریشان تھے کہ اس دعوت کا داعی کسی طور بھی اپنی بات سے پسپا ہونے کے لیے تیار نہیں اور وہ اس میں ہماری کسی مرضی کو اہمیت دینا بھی پسند نہیں کرتا۔ اب ایک ہی صورت باقی رہ جاتی ہے کہ اس دعوت کو زبردستی مٹا دیا جائے لیکن اس کے لیے جو خطرہ درپیش تھا وہ یہ تھا کہ ایسا کوئی اقدام بھی قبائل کے درمیان جنگ پر منتج ہوگا اور اہلِ مکہ شاید اسے برداشت نہ کرپائیں۔ اسی کشش وپنج میں اگر ایک طرف ندوہ میں مسلسل اس دعوت کے استحصال کے لیے مشورے جاری تھے اور دوسری طرف اہلِ مکہ کو پابند کردیا گیا تھا کہ وہ نبی کریم ﷺ سمیت کسی مسلمان کو منہ نہ لگائیں۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے جب دیکھا کہ مکے نے اپنے کان اس دعوت کے لیے بالکل بند کرلیے ہیں تو آپؐ نے اس خیال سے طائف کا سفر کیا کہ ممکن ہے کہ اہلِ طائف میں سے کچھ دعوت کے ہمدرد میسر آسکیں اور اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہو تو وہاں اس کا مرکز بنایا جاسکے۔ لیکن اہلِ طائف نے جو کچھ آنحضرت ﷺ کے ساتھ کیا اور جس طرح دعوت اور داعی پر گہرے زخم لگائے آج تک تاریخ کے احساس سے

Marfat.com

اس کی وجہ سے خون رستا ہے۔ آپؐ نہایت مضمحل، زخموں سے چور اور مضطرب دل کے ساتھ واپس مکہ معظمہ تشریف لائے۔ مکہ کی سرزمین آپؐ کے لیے دشمن کی سرزمین بن چکی تھی۔ آپؐ کو دور دور تک بظاہر کوئی ہمدرد دکھائی نہ دیتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے نامساعد حالات میں آپؐ کو معراج سے نوازا تاکہ آپؐ صرف دل کی آنکھوں سے نہیں بلکہ بچشمِ سر دیکھ سکیں کہ اللہ تعالیٰ کی قدرتوں کی وسعتوں کا عالم کیا ہے اور وہ ذات آپؐ پر کس حد تک مہربان ہے اور آپؐ سے کتنا عظیم کام لینے والی ہے۔ رہی اہلِ مکہ اور دوسرے لوگوں کی مخالفتیں تو وہ آپؐ کے لیے کیا اہمیت رکھتی ہیں جبکہ آپؐ کی پشت پناہی اور رہنمائی کے لیے وہ ذات موجود ہے جس کے قبضۂ قدرت میں یہ تمام کائنات ہے اور جس کی قوتوں اور قدرتوں کا کوئی اندازہ نہیں کیا جاسکتا اور جس کی کائنات کی وسعتوں کو انسانی علم تو کیا، انسانی تصور بھی ناپ نہیں سکتا۔ چنانچہ اس عظیم سفر سے آپؐ یقین وایقان کی وہ قوت لے کر پلٹے جس کے سامنے دنیا کی کوئی طاقت ٹھہر نہیں سکتی اور کوئی بڑی سے بڑی مخالفت بھی ہراساں نہیں کرسکتی تھی۔

اس سورت میں بتایا گیا کہ پیغمبرؑ جس سرزمین کی طرف مبعوث ہوتا ہے جب وہ سرزمین شعلوں کے سوا ہر چیز اگلنے سے محروم ہوجاتی ہے تو پھر اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبرؑ کو ہجرت کا حکم دیتا ہے اور ایک نئی سرزمین کو پیغمبرؑ کی تبلیغ ودعوت کا میدان بنادیا جاتا ہے۔ آنحضرت ﷺ اگر ہجرت کرتے ہیں تو صاف نظر آتا تھا کہ مدینہ طیبہ دارالہجرت بنے گا۔ یہاں اگرچہ قحطانی عرب رہتے ہیں تو ان کے پڑوس میں یہود کے تین طاقتور قبیلے بھی آباد ہیں۔ آنحضرت ﷺ کی دعوت کو اب صرف عربوں ہی سے سروکار نہ تھا بلکہ یہود بھی آپؐ کے مخاطب بننے والے تھے۔ ایسی صورتحال میں ضروری تھا کہ نازل ہونے والی سورت میں ایک طرف تو اہلِ مکہ کو آخری تنبیہ کردی جائے اور دوسری طرف یہود جن کی طرف سے شدید مخالفت کا اندیشہ تھا انھیں تاریخ کا آئینہ دکھایا جائے اور ان پر یہ بات واضح کردی جائے کہ تم اپنی تاریخ میں کئی دفعہ ٹھوکریں کھاچکے ہو، کئی دفعہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کا کوڑا تم پر برس چکا ہے، پھر ان پر نازل ہونے والے عذابوں کی تفصیل بیان کرنا ضروری تھا تاکہ وہ اس سے انکار نہ کرسکیں۔ چنانچہ اس سورت میں انھیں واضح طور پر بتلایا گیا کہ تم نے کئی صدیوں تک پیغمبروںؑ کی دعوت کو پامال کرنے کی کوششیں کیں، ان کی تعلیمات سے انحراف تمھارا معمول بنا رہا اور پیغمبرؑ تمھیں باربار جھنجوڑتے رہے لیکن تمھاری سرکشی نے ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے غضب کو دعوت دی۔ کبھی تم اشوریوں کے ہاتھوں تباہ ہوئے اور کبھی اہلِ بابل نے تمھاری اینٹ سے اینٹ بجائی۔ اور پھر ایک وقت آیا کہ رومیوں نے تمھارا استیصال کرڈالا۔ اسلام کی صورت میں اب تمھیں سنبھلنے کا موقع ملا ہے، اس سے فائدہ اٹھاؤ اور اپنی قسمت بنالو اور پھر مسلمانوں کو چونکہ مدینہ منورہ جاکر نئی ضرورتیں پیش آنے والی تھیں، نئی سوسائٹی بنانا تھی، نئے معاشرے کی بنیادی اٹھانی تھیں حتیٰ کہ رفتہ رفتہ اسلامی ریاست کو وجود دینا تھا۔ ایسی صورت میں یہ بات ازبس ضروری تھی کہ یہ سورت جو سفرِ مدینہ کے لیے تمہید کی حیثیت رکھتی ہے، اس میں اسلامی ریاست کا منشور دے دیا جائے تاکہ لوگ اس مینیفیسٹو کو دیکھ کر اندازہ لگاسکیں کہ اسلامی ریاست جس کی بینادیں اٹھائی جارہی ہیں اس کی حقیقی شکل وصورت کیا ہوگی، وہ کیا حقیقی روح ہوگی جو اس کے اندر کارفرما ہوگی۔ اسی طرح چند ایسی بنیادی باتوں کا ذکر کیا گیا ہے جو کسی بھی ریاست کی کامیابی کی ضمانت بن سکتی ہیں۔

نبی کریم ﷺ کی حیثیت کو واضح کرتے ہوئے اشارہ کیا گیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی امامت وسیادت جو دو حصوں میں تقسیم ہوگئی تھی بنی اسرائیل کی قیادت حضرت اسحاق علیہ السلام کو دی گئی اور بنی اسماعیل کی قیادت حضرت اسماعیل علیہ السلام کو دی گئی، لیکن اب اس امانت کے دوبارہ اکٹھا ہونے کا وقت آگیا تھا۔ نبی کریم ﷺ نبی القبلتین بن کر تشریف لائے۔ آپؐ کی امت کا قبلہ تو بیت اللہ شریف ہوگا لیکن بیت المقدس کی وراثت و امانت کی متولی بھی یہی امت ہوگی۔ اسی کے ضمن میں یہ توجہ دلانا بھی مقصود تھا کہ قریش جنھوں نے اللہ تعالیٰ کے گھر کو جو توحید کا مرکز تھا بتوں کا تیرتھ بنا کر رکھ دیا ہے۔ اب ان کی تولیت کے دن ختم ہونے کو آئے ہیں۔ اب ان کے اقتدار کو اس سرزمین سے ختم کردیا جائے گا۔ اسی طرح بیت المقدس میں جو اللہ تعالیٰ کا گھر تھا اسے جس طرح یہود نے درندوں کا بھٹ بنادیا تھا۔ انھیں بھی اس کا اقتدار اس امت کے سپرد کرنا ہوگا اور اس طرح سے اس امت کو بتایا جارہا ہے کہ تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ تمھارا کام کتنا شدید اور کتنا عظیم ہے۔ تمھیں بت پرستی کے مرکزوں کو توڑ کر اللہ تعالیٰ کے گھروں کی حرمت کو دوبارہ قائم کرنا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی زمین پر اللہ تعالیٰ کے نظام کو قائم کرکے خلافتِ آدم کو مستحکم اور مکمل کرنا ہے۔

نئی بننے والی امت چونکہ عظیم مناصب کی حامل ہوگی، اس لحاظ سے اس کی تربیت بھی اسی سطح کی ہونی چاہیے۔ اس مقصد کی بجاآوری کے لیے اس سورت میں مختلف مواقع پر مختلف پیرایوں میں عقیدۂ توحید کو امت کے دل ونگاہ میں اتارنے کی کوشش کی گئی۔ اسے ایک بنیادی

Marfat.com

عقیدے کی حیثیت دے کر اس کو نقصان دینے والے تمام نظریات اور تصورات کا ابطال کیا گیا۔ توحید کے تصورات میں اس تصور کی بڑی اہمیت ہے کہ قسمتیں بنانا اور بگاڑنا صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ چنانچہ جن راہوں سے اس تصور کے بگاڑ کا خطرہ تھا ان پر انگلی رکھ کر اس امت کو متنبہ کیا گیا۔ اسی طرح انسانی مساعی کے حوالے سے انسان جن پر اعتماد کرتا ہے اور اس اعتماد کو اصل قوت قرار دینے لگتا ہے ان میں سے ایک ایک قوت کے راز کو کھولا گیا اور تمام قوتوں کے اصل سرچشمے کی خبر دی گئی ہے۔

انسان کی گمراہیوں میں سے ایک بہت بڑی گمراہی جو اس کی پوری زندگی کو متاثر کر دیتی ہے وہ اس کا دنیا اور دولتِ دنیا سے تعلق قائم کرتے ہوئے غیر متوازن ہو جانا ہے۔ چنانچہ ایک سے زیادہ آیات میں اس بات پر زور دیا گیا کہ تمھیں دنیا اور آخرت کی حقیقت پر غور کرنا چاہیے اور پھر مکمل شعور کے ساتھ فیصلہ کرنا چاہیے کہ تمھاری صلاحیتوں کا اصل رخ کس طرف ہونا چاہیے اور تمھارے علاقات کا جھکاؤ کس کے حق میں ہونا چاہیے اور یہ بات بھی واضح کی کہ جب دنیا کا مال و دولت اور اس کے مناصب زندگی کا ہدف بن جاتے ہیں اور انسان اسی کے حصول میں ڈوب کر رہ جاتا ہے تو انسانی زندگی کی حیثیت بدلے بغیر نہیں رہتی اور اگر اس تصور میں اصلاح نہ کی جائے تو یہ بڑھتے بڑھتے انسانی آبادیوں کی تباہی کا باعث بن جاتا ہے۔

جس طرح بنی اسرائیل کو ایک کتاب دے کر ان کی زندگی کے لیے رہنمائی مہیا کی گئی تھی اسی طرح اب اس نئی بننے والی امت کو بھی قرآنِ کریم کے نام سے آخری کتاب دے کر واضح کر دیا کہ تمھاری دنیا کی بھلائی اور آخرت کی سرفرازی کا دارومدار اسی کتاب کے اتباع پر ہے۔ اس کتاب کے بنیادی تصورات، اس میں بیان کردہ شریعت، اس کی عطا کردہ زندگی کے حقائق، اسی کے دیے ہوئے کامیابی کے اصول اور اسی کے ٹھہرائے ہوئے ناکامی وخسران کے اسباب اور اسی کے بتائے ہوئے انسانی سعادت وشقاوت کے پیمانے ہی تمھارا وہ اصل اثاثہ ہیں جن سے تم اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تعمیر کر سکتے ہو۔

بظاہر یہ سورت باقی مکی سورتوں کی طرح دین کے بنیادی تصورات کو بیان کرتی ہے، لیکن اس وقت چونکہ حالات اپنی طغیانی میں آخری حدوں کو چھو رہے تھے اور کفر نے اپنے تمام نقاب الٹ ڈالے تھے تو حالات کے تقاضوں کے مطابق اتمامِ حجت کے قرآئن واضح کر دیے گئے۔ اللہ تعالیٰ کے نبی کی دعوت کی حدود بھی واضح کر دی گئیں۔ مخالفین کو کھلی کھلی وارننگ دی گئی اور آنحضرت ﷺ کی ہجرت کی طرف واضح اشارات کیے گئے۔ نہایت ناگفتہ بہ حالات ہونے کے باوجود کھلے لفظوں میں اسلام کے غلبے کی خبر دی گئی، ایسی خبروں پر کفر کا بھڑک اٹھنا چونکہ قرینِ قیاس تھا اس لیے آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کو ہر طرح کے حالات پر صبر کرنے کا حکم دیا گیا اور صبر کا سب سے کارآمد اور مجرب نسخہ چونکہ نماز ہے اس لیے پانچ نمازیں فرض کی گئیں اور ہر حال میں حق پر قائم رہنے کی تاکید کی گئی اور ساتھ ہی ساتھ مخالفین کے ہر طرح کے اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے۔ اور قرآنِ کریم کے تدریج کے ساتھ نزول کی حکمتیں بیان کی گئی ہیں۔

حاصل کلام یہ کہ سورت بنی اسرائیل از اول تا آخر معراج شریف کے پس منظر، پیش منظر، تہہ منظر، معراج کے اسرار و حکم، بنی اسرائیل کی وسیع تاریخ عبرت، امتِ مسلمہ کی اساسی حکمتیں، مقاصدِ عظیمہ اور اللہ تعالیٰ کے یہاں سرفرازی اور سرخروئی اور دنیا میں فلاح وکامرانی کی آخری ضمانتیں، اسلامی سوسائٹی کی تعمیر وتشکیل کے لیے بنیادی احکام، اسلامی ریاست کے استحکام کے لیے ضروری ہدایات اور اس کا ابتدائی منشور، اخلاقیات کا ایک دستورالعمل، غرضیکہ زندگی کی اساسی ضروریات کے لیے، انفرادی اور اجتماعی زندگی میں جو ہدایات امتِ مسلمہ کے لیے ضروری ہیں ان میں سے بیشتر کو ذکر فرمایا گیا ہے اور نہایت استحکام اور اعتماد کے ساتھ امتِ مسلمہ کی کامیابیوں کی ضمانت بھی دی گئی ہے، لیکن شرط صرف یہ ہے کہ امت کے افراد اور ان کے اربابِ حل وعقد میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ اور اس کے دین سے ایسی وابستگی قائم رہے جس میں کبھی دراڑیں نہ آنے پائیں اور جس میں کسی تحفظِ ذہنی کا گزر نہ ہو اور کامل یکسوئی کے ساتھ اس مقصد اور اس رویئے کو اپنا لیا جائے جس کا نام سنتِ رسولؐ ہے۔ یہی اس سورتِ طیبہ کا اصل پیغام ہے اور یہی معراج شریف کی غائیت ہے۔

Marfat.com

اٰیَاتُهَا ۱۱۱	سُوْرَةُ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ مَكِّيَّةٌ	رُكُوْعَاتُهَا ۱۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ
اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا ؕ اِنَّهٗ
هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ ﴿۱﴾ وَاٰتَیْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنٰهُ هُدًی
لِّبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِیْ وَكِیْلًا ؕ ﴿۲﴾ ذُرِّیَّةَ مَنْ
حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ؕ اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا ﴿۳﴾ وَقَضَیْنَاۤ اِلٰی بَنِیْٓ
اِسْرَآءِیْلَ فِی الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِی الْاَرْضِ مَرَّتَیْنِ وَلَتَعْلُنَّ
عُلُوًّا كَبِیْرًا ﴿۴﴾ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَیْكُمْ عِبَادًا لَّنَاۤ
اُولِیْ بَاْسٍ شَدِیْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّیَارِ ؕ وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا ﴿۵﴾
ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَیْهِمْ وَاَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِیْنَ وَ
جَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ نَفِیْرًا ﴿۶﴾ اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ ۫ قف
وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا ؕ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِیَسُوْٓءٗا وُجُوْهَكُمْ
وَلِیَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِیُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا
تَتْبِیْرًا ﴿۷﴾ عَسٰی رَبُّكُمْ اَنْ یَّرْحَمَكُمْ ۚ وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا ۘ وَجَعَلْنَا

Marfat.com

جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ حَصِيْرًا ⑧ اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ
هِيَ اَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ
لَهُمْ اَجْرًا كَبِيْرًا ⑨ وَّاَنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ اَعْتَدْنَا
لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ⑩ ع

رکوع: ۱۔ (پاک ہے وہ ذات جو لے گئی اپنے بندے کو ایک رات میں مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ تک، جس کے گردونواح کو ہم نے برکت دی ہے تاکہ ہم دکھائیں اپنے بندے کو اپنی قدرت کی نشانیاں، بیشک وہی ہے سب کچھ سننے والا، سب کچھ دیکھنے والا۔ ۱) ہم نے اس سے پہلے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی تھی اور اسے بنی اسرائیل کے لیے ہدایت بنایا تھا، اس تاکید کے ساتھ کہ میرے سوا کسی کو اپنا وکیل نہ بنانا۔ ۲) تم ان لوگوں کی اولاد ہو جنھیں ہم نے نوح علیہ السلام کے ساتھ کشتی پر سوار کیا تھا اور نوح علیہ السلام ایک شکر گزار بندہ تھے۔ ۳) اور ہم نے اپنی کتاب میں بنی اسرائیل کو اس بات پر متنبہ کر دیا تھا کہ تم دو مرتبہ زمین میں فسادِ عظیم برپا کرو گے اور بڑی سرکشی دکھاؤ گے۔ ۴) پھر جب ان میں سے پہلی سرکشی کا موقع آیا تو ہم نے تمھارے مقابلے پر اپنی ایسے بندے اٹھائے جو نہایت زور آور تھے اور وہ تمھارے ملک میں گھس کر ہر طرف پھیل گئے، یہ ایک وعدہ تھا جسے پورا ہو کر ہی رہنا تھا۔ ۵) پھر ہم نے تمھیں ان پر غلبے کا موقع دے دیا اور تمھیں مال اور اولاد سے مدد دی اور تمھاری تعداد پہلے سے بڑھا دی۔ ۶) اگر تم نے بھلائی کی تو وہ تمھارے اپنے ہی لیے بھلائی تھی، اور برائی کی تو وہ تمھاری اپنی ذات کے لیے برائی ثابت ہوئی، پھر جب دوسرے وعدے کا وقت آیا تو ہم نے دوسرے دشمنوں کو تم پر مسلط کر دیا تاکہ وہ تمھارے چہرے بگاڑ دیں اور مسجد (بیت المقدس) میں اسی طرح گھس جائیں جس طرح پہلے دشمن گھسے تھے اور جس چیز پر ان کا ہاتھ پڑے اسے تباہ کر کے رکھ دیں۔ ۷) ممکن ہے تمھارا رب تم پر رحم کرے لیکن اگر تم نے پھر اپنی سابق روش کا اعادہ کیا تو ہم بھی اپنی سزا کا اعادہ کریں گے اور کافرِ نعمت لوگوں کے لیے ہم نے جہنم کو قید خانہ بنا رکھا ہے۔ ۸) حقیقت یہ ہے کہ یہ قرآن وہ راہ دکھاتا ہے جو بالکل سیدھی ہے۔ اور وہ بشارت دیتا ہے ان ایمان لانے والوں کو جو صالح اعمال کرے، بیشک ان کے لیے بڑا اجر ہے۔ ۹) اور بیشک جو لوگ آخرت کو نہ مانیں انھیں یہ خبر دیتا ہے کہ ان کے لیے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ ۱۰)

سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِيْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا ۭ
اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ① (سورۃ بنی اسرآءِیل : ۱)

(پاک ہے وہ ذات جو لے گئی اپنے بندے کو ایک رات میں مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ تک، جس کے گردونواح کو ہم نے برکت دی ہے تاکہ ہم دکھائیں اپنے بندے کو اپنی قدرت کی نشانیاں، بیشک وہی ہے سب کچھ سننے والا، سب کچھ دیکھنے والا۔ ۱)

Marfat.com

ا...... آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ سے اس سے پہلے بھی ایسے ایسے معجزات کا ظہور ہو چکا تھا کہ جس نے مسلمانوں میں اللہ کی ذات و صفات اور مغیبات پر یقین لانے میں اہم کردار ادا کیا تھا اور روح فرسا مخالفتوں کے ہجوم میں اللہ کے رسول کا یقین وثبات اور اللہ کی طرف سے آنے والی تائید ونصرت ان کی استقامت واستقلال کے لیے ہمیشہ معاون بنتی رہیں۔ لیکن واقعہ معراج تو ایسا محیر العقول اور حیرت انگیز واقعہ ہے کہ انبیاء کرام کی تاریخ میں ایسا گہرائی اور گیرائی رکھنے والا واقعہ اس سے پہلے کبھی نہیں گزرا۔ ہر رسول اپنے اپنے مقام کے مطابق سیر ملکوت سے نوازا گیا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں تو خاص طور پر فرمایا گیا کہ ہم نے ابراہیم کو **ملکوت السموات والارض** کو دیکھنے کا موقع فراہم کیا تا کہ وہ یقین لانے والوں میں سے ہو جائے۔ یعنی ان کا یقین جو پہلے سے موجود تھا اس میں بیش از بیش ترقی ہو جائے اور آپ اس مقام تک پہنچ جائیں جس مقام سے دنیا کی امامت کی جاسکتی ہے۔ لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام اور دیگر رسولانِ عظام کا کوئی واقعہ جن سے سابقہ آسمانی کتابیں معمور ہیں ایسا نہیں جسے اس معراج سے تشبیہ دی جا سکے۔ انبیاءِ کرام کے بیشتر اس طرح کے واقعات کا تعلق زمینی معاملات یا خواب کی کیفیات سے ہے۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ سفر بیت اللہ سے مسجد اقصیٰ تک اور مسجد اقصیٰ سے سدرۃ المنتہیٰ تک اور پھر عالم لامکان تک پھیلا ہوا ہے۔ اور پروردگار نے اگرچہ اس کی تفصیلات بیان نہیں فرمائیں اور یہ کام آنحضرت ﷺ پر چھوڑ دیا گیا لیکن اس واقعے کی خبر جس اہتمام سے دی ہے اسے دیکھ کر تو ذوق جھومنے لگتا ہے۔ اس سفر کی حیرت انگیزی اور محیر العقولی کے دو پہلو ہیں۔ ایک تو یہ کہ ایک ہی رات میں اتنا عظیم سفر کیسے وجود میں آ گیا۔ اور دوسرا یہ پہلو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے ایسے جہانوں کی سیر کی جو جہانِ دنیا سے اپنی نوعیت اور کیفیت میں بالکل مختلف تھے۔ وہاں کے احساسات اور وہاں کی کیفیات ایسی نرالی تھیں جس سے انسانوں کو کبھی سابقہ پیش نہیں آ سکتا۔ ہمارے خلانورد خلا کے سفر کے لیے نکلتے ہیں تو اس کے لیے ایک لمبی ٹریننگ اور ایک مخصوص لباس درکار ہوتا ہے اور پھر بھی کتنے لوگ ہیں جو اس میں ناکام رہ جاتے ہیں۔ حالانکہ خلا کا تعلق اسی دنیا سے ہے۔ لیکن حضورؐ تو وہاں تک پہنچے جہاں ہمارے خیال اور تصور کی بھی رسائی ممکن نہیں۔ پروردگار نے دونوں پہلوؤں کو اس طرح بیان فرمایا ہے کہ شک وشبہ کی ہر گرد چھٹ گئی ہے۔ آدمی کو سب سے پہلے جو شبہ لاحق ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ آخر ایک رات میں اور بغیر ظاہری اسباب کے یہ سفر کس طرح ممکن ہوا۔ اس کا جواب پروردگار نے صرف ایک لفظ میں دیا ہے۔ "سُبْحَانَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا الخ" (پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے کو ایک ہی رات میں لے گئی) زور لفظ "سُبْحَان" پر ہے کہ تمہیں یہ تو خلجان ہو سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک انسان ہونے کی حیثیت سے ایک رات میں اتنا عظیم سفر کیسے کر گئے؟ اور ان راہوں سے کیسے گزر گئے جو انسانی استطاعت سے ماوراء ہیں۔ لیکن کیا کسی صاحب عقل اور صاحب ایمان کو اس بات میں بھی شبہ ہو سکتا ہے کہ اگر اللہ کسی کو لیجانا چاہے تو اسے بھی دشواری ہو سکتی ہے۔ اس کے پیدا کردہ سورج کی روشنی ایک سیکنڈ میں ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل کی رفتار سے سفر کرتی ہے۔ اور اس کے فرشتے روزانہ زمین وآسمان کی پہنائیوں کو ناپتے ہیں اور یہ ناقابل عبور مسافتیں ان کے لیے کوئی حقیقت نہیں رکھتیں۔ جس خالق کی مخلوق کی قوت کا یہ عالم ہے اس خالق کی قدرت کا کیا عالم ہوگا؟ اس کے لیے تو سوچنا بھی مشکل ہے۔ اس لیے دعویٰ یہ نہیں کہ محمد کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک رات میں اتنا عظیم سفر کر آئے' بلکہ دعویٰ یہ ہے کہ وہ ذات آپ کو لے گئی جو ہر طرح کی نارسائیوں' کمزوریوں اور ناتمامیوں سے پاک ہے۔ اس کے بارے میں کسی عجز کا تصور کرنا کفر سے بڑھ کر گناہ ہے۔ اور جہاں تک دوسرے پہلو کا تعلق ہے کہ آپ نے اس ناقابل تصور جہان کا مشاہدہ کیسے کیا ہوگا تو سورۂ والنجم میں اس سفر کی طرف اشارے کیے گئے ہیں اور اس کا آغاز بھی اس آیت سے ہوتا ہے "مَا ضَلَّ صَاحِبُکُمْ وَمَا غَوٰی" (تمہارے صاحب (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) نے نہ راستہ گم کیا اور نہ وہ بہکے) یعنی جہاں جانا تھا جو دیکھنا تھا جہاں لے جایا گیا' کہیں بھی ان سے غلطی نہیں ہوئی۔ اور آگے جا کر فرمایا "مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی وَلَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّہِ الْکُبْرٰی" (نہ اس کی نظر بہکی نہ اچٹی' اس نے یقیناً اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں) اندازہ فرمائیے کہ جس سفر کے بارے میں اور جس جانے والے کی ہمت اور استطاعت اور مقام و مرتبہ کے بارے میں پروردگار اس اہتمام سے گواہی دے اور ذکر فرمائے اس کے بارے میں اس شبہے کا اظہار کرنا' کہ یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے یا اسے نیند کا واقعہ قرار دے کر خواب قرار دینا بڑی جسارت کی بات ہے۔ کیا کسی خواب کے واقعہ کو پروردگار اس اہتمام سے ذکر فرما سکتے ہیں اور پھر خوابیں ایک سے ایک حیران کن دیکھی جاتی ہیں' کبھی کسی نے خواب کے معاملے پر تعجب کا اظہار نہیں کیا اور نہ خالق کائنات نے کسی خواب کے بارے میں کبھی یہ فرمایا کہ "دیکھنے والے کی نگاہ نہ بھٹکی نہ اچٹی" تیز روشنی میں بعض دفعہ آنکھیں چندھیا جاتی ہیں اور آدمی پوری طرح منظر کو دیکھنے کی تاب نہیں لا سکتا لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نور کے سیلاب سے گزرے اور پروردگار گواہی دے رہے ہیں کہ آپ کی نگاہوں نے دیکھنے میں کوتاہی نہیں کی۔ مزید برآں بعض اہل علم نے

Marfat.com

اس کے دلائل دیتے ہوئے کہا کہ "سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلاً الخ" میں پروردگار نے یہ فرمایا ہے کہ "پاک ہے وہ خدا جو شبِ معراج میں اپنے بندہ یعنی عبد کو لے گیا" بندہ یا عبد کا اطلاق جسم وروح دونوں کے مجموعہ پر ہوتا ہے۔ تنہا روح کو عبد یا بندہ نہیں کہتے اس کا مطلب یہ ہے کہ معراج پر آپ کی صرف روح نہیں گئی تھی بلکہ جسم بھی گیا تھا۔ یعنی یہ سفر روحانی نہیں بلکہ جسمانی تھا۔

۲...... واقعہ معراج میں بیان کیا گیا ہے کہ آپ براق پر سوار ہوئے۔ آپؐ نے دودھ کا پیالہ نوش فرمایا۔ سوار ہونا' پینا یہ سب جسم کے خواص ہیں۔ اس لیے معراج جسمانی تھی۔

۳...... اگر واقعہ معراج ایک خواب ہوتا تو کفار اس کی تکذیب کیوں کرتے؟ انسان تو خواب میں خدا جانے کیا کیا دیکھتا ہے۔ محال سے محال چیز بھی اس کو عالم خواب میں واقعہ بن کر نظر آتی ہے۔

۴...... پروردگار نے قرآن کریم میں فرمایا "وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْیَا الَّتِیْٓ اَرَیْنٰکَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ" (اس مشاہدۂ معراج کو ہم نے لوگوں کے لیے معیارِ آزمائش بنایا ہے) اگر یہ عام خواب ہوتا تو یہ آزمائش کی کیا چیز تھی اور اس پر ایمان لانا کیونکر مشکل تھا؟

بعض لوگوں نے "وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْیَا الَّتِیْٓ اَرَیْنٰکَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ" کی آیت سے استدلال کرتے ہوئے کہا ہے کہ رؤیا عربی زبان میں خواب کو کہتے ہیں۔ اور پروردگار خود فرما رہے ہیں کہ "ہم نے آپ کو ایک رؤیا دکھایا" حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ رؤیا کا اطلاق صرف خواب پر نہیں ہوتا' بلکہ عربی میں "دکھاوا" کو کہتے ہیں یعنی جو دیکھنے میں آئے۔ قطع نظر اس سے کہ وہ دیکھنا خواب میں ہو یا بیداری میں۔ لیکن اس آیت میں جو رؤیا کا لفظ استعمال ہوا ہے اس کے بارے میں صحیح بخاری میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی تصریح موجود ہے کہ "رؤیا کے معنی مشاہدۂ چشم کے ہیں" یعنی آنکھ سے دیکھنے کے۔ روایت کے الفاظ یہ ہیں "عن ابن عباس رضی اللہ عنہ فی قولہ تعالیٰ "وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْیَا الَّتِیْٓ اَرَیْنٰکَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ" قَالَ هِیَ رُؤْیَا عَیْنٍ اُرِیَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ سَلَّمَ لَمَّا اَسْرٰی بِهٖ اِلٰی بَیْتِ الْمُقَدَّسِ" (ابنِ عباسؓ اس آیت کی تفسیر میں "ہم نے جو رؤیا تم کو دکھایا اس کو نہیں بنایا مگر لوگوں کے لیے آزمائش" کہتے ہیں کہ یہ آنکھ کا مشاہدہ تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دکھایا گیا جبکہ آپ کو رات کے وقت بیت المقدس لیجایا گیا) غور کیجیے کہ حضرت ابن عباسؓ سے بڑھ کر لغت عرب کا واقف کار اور کون ہو سکتا تھا۔ لیکن ابن عباسؓ اس میں متفرد نہیں بلکہ بڑے بڑے شعراء نے رؤیا کا لفظ مشاہدۂ چشم کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ راعی حماسی شاعر ہے۔ وہ کہتا ہے "فکبر للرؤیا وھش فؤادہ"

اور متنبی کا مصرعہ ہے "ورؤیاک احلیٰ فی العیون من الغمض"

ان دونوں شاعروں نے رؤیا کو مشاہدۂ چشم کے معنی میں لیا ہے۔

واقعہ معراج پر اعتراضات اور ان کا جواب

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ منکرین حدیث اس واقعۂ معراج پر جو اعتراضات اٹھاتے ہیں' نہایت اختصار سے ان کا جواب دے دیا جائے۔ ان کے تمام اعتراضات اس قابل نہیں کہ ان کا ذکر کیا جائے' البتہ دو اعتراضات ایسے ہیں جو کچھ وزن رکھتے ہیں۔

(ایک یہ کہ اس سے اللہ تعالیٰ کا کسی خاص مقام پر مقیم ہونا لازم آتا ہے۔ ورنہ اس کے حضور بندہ کی پیشی کے لیے کیا ضرورت تھی کہ اسے سفر کرا کے ایک مقامِ خاص تک لیجایا جاتا۔ دوسرا اعتراض یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دوزخ و جنت کا مشاہدہ اور بعض لوگوں کے مبتلائے عذاب ہونے کا معائنہ کیسے کرا دیا گیا جبکہ ابھی بندوں کے مقدمات کا فیصلہ ہی نہیں ہوا ہے۔ کیونکہ بندوں کے اعمال اور معاملات کا فیصلہ تو قیامت کے دن ہوگا تو قیامت سے پہلے اس کے ذکر کا کیا مطلب؟ دراصل یہ دونوں اعتراضات قلتِ فکر کا نتیجہ ہیں۔ پہلا اعتراض اس لیے غلط ہے کہ خالق اپنی ذات میں تو بلاشبہ اطلاقی شان رکھتا ہے' مگر مخلوق کے ساتھ معاملہ کرنے میں وہ اپنی کسی کمزوری کی بنا پر نہیں بلکہ مخلوق کی کمزوریوں کی بناء پر محدود وسائط اختیار کرتا ہے۔ مثلاً جب وہ مخلوق سے کلام کرتا ہے تو کلام کا وہ محدود طریقہ استعمال کرتا ہے جسے ایک انسان سن اور سمجھ سکے' حالانکہ بجائے خود اس کا کلام ایک اطلاقی شان رکھتا ہے۔ اسی طرح جب وہ اپنے بندے کو اپنی سلطنت کی عظیم الشان نشانیاں دکھانا چاہتا ہے تو اسے لے جاتا ہے اور جہاں جو چیز دکھانی ہوتی ہے اسی جگہ دکھاتا ہے۔ کیونکہ وہ ساری کائنات کو بیک وقت اس طرح نہیں دیکھ سکتا جس طرح خدا دیکھتا ہے۔ خدا کو کسی چیز کے مشاہدے کے لیے کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہوتی' مگر

Marfat.com

بندے کو ہوتی ہے۔ یہی معاملہ خالق کے حضور باریابی کا بھی ہے کہ خالق بذات خود کسی مقام پر متمکن نہیں ہے مگر بندہ اس کی ملاقات کے لیے ایک جگہ کا محتاج ہے۔ جہاں اس کے لیے تجلیات کو مرکوز کیا جائے ورنہ اس کی شانِ اطلاق میں اس سے ملاقات بندۂ محدود کے لیے ممکن نہیں ہے۔

رہا دوسرا اعتراض تو وہ اس لیے غلط ہے کہ معراج کے موقع پر بہت سے مشاہدات جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کرائے گئے تھے ان میں بعض حقیقتوں کو مثل کر کے دکھایا گیا تھا۔ مثلاً ایک فتنہ انگیز بات کی یہ تمثیل کہ ایک ذرا سے شگاف میں سے ایک موٹا سا بیل نکلا اور پھر اس میں واپس نہ جا سکا۔ یا زنا کاروں کی یہ تمثیل کہ ان کے پاس تازہ نفیس گوشت موجود ہے مگر وہ اسے چھوڑ کر سڑا ہوا گوشت کھا رہے ہیں۔ اسی طرح برے اعمال کی سزائیں جو آپ کو دکھائی گئی ہیں وہ بھی تمثیلی رنگ میں عالم آخرت کی سزاؤں کا پیشگی مشاہدہ تھیں۔

اس واقعہ میں مخفی بعض حکمتیں

اس سورت کی پہلی آیتِ کریمہ جس میں واقعۂ اسراء یا واقعۂ معراج کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس آیتِ کریمہ نے اس محیر العقول واقعے کی خبر دی ہے اور اس کی علت بیان کی ہے۔ لیکن حقیقت میں اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس میں کیا حکمت و بصیرت کی باتیں پوشیدہ ہیں۔ لیکن تھوڑے سے تدبر سے جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ اس آیتِ کریمہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی القبلتین ہونے کا اعلان فرمایا گیا ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے گھرانے کو دنیا کی سعادتوں اور برکتوں کا کلید بردار بنایا تھا اور ان کو ارض مقدس کی تولیت کا منصب عطا کیا تھا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دنیا کی امامت کا شرف عطا کر کے یہ بات واضح کر دی گئی تھی کہ آپ کی اولاد میں سے وہ لوگ اس امامت کے اہل قرار پائیں گے جو اس امامت کی اہلیت رکھیں گے' جو اللہ کے شکر گزار بندے' اس کی امانتوں کا حق ادا کرنے والے اور اس کے دین کے علمبردار ہوں گے۔ لیکن جو لوگ اس کے برعکس ظالم ہوں گے یعنی وہ اللہ کے دین کی علمبرداری کے بجائے اس کے نافرمان اور کفرانِ نعمت کرنے والے ہوں گے انھیں امامت کے منصب سے معزول کر دیا جائے گا۔ چنانچہ آپ کی اولاد میں دو بیٹے نمایاں ہوئے جن کو اللہ نے نبوت و رسالت عطا فرمائی' ۱۔ حضرت اسحاق ۲۔ حضرت اسماعیل۔ حضرت اسحاق کی اولاد' حضرت یعقوب علیہ السلام کی نسبت سے بنی اسرائیل کہلائی اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد بنی اسماعیل کہلائی۔ ارضِ مقدس کو ان دونوں بیٹوں کے درمیان تقسیم کر دیا گیا۔ شام کا ملک حضرت اسحاق علیہ السلام اور عرب کا ملک حضرت اسماعیل علیہ السلام کو دیا گیا۔ آغاز میں تو سب کا قبلہ بیت اللہ ہی تھا لیکن حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں جب اللہ کے حکم سے ہیکل سلیمانی (بیت المقدس) کی تعمیر ہوئی تو پھر بنی اسرائیل کا وہ قبلہ قرار پایا۔ اگرچہ بیت المقدس کا رخ بھی بیت اللہ یعنی خانہ کعبہ کی طرف تھا' لیکن متولی ہونے کے اعتبار سے ذمہ داریاں تقسیم ہو گئیں۔ انبیاءِ بنی اسرائیل کو بیت المقدس کی تولیت بخشی گئی اور آلِ اسماعیل کو بیت اللہ کی۔ آنحضرت ﷺ کی بعثت سے پہلے تک یہی تقسیم جاری رہی۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کو چونکہ تمام انبیاءِ کرام کے متفرق اوصاف و خصوصیات کا جامع بنایا گیا' اسی طرح حضرت اسحاق اور حضرت اسماعیل علیہما السلام دونوں کی برکتوں اور سعادتوں کا گنجینہ بھی ذاتِ محمدی کو ہی قرار دیا گیا۔ یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وراثت جو صدیوں سے دو بیٹوں میں بٹتی چلی آئی تھی وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پھر ایک جگہ جمع ہو گئی۔ اس طرح سے آپ کو دونوں قبلوں کی تولیت تفویض کی گئی۔ اور نبی القبلتین کا منصب عطا کیا گیا۔ اسی بات کی طرف اشارہ کرنے کے لیے آنحضرت ﷺ کو کعبہ اور بیت المقدس کی طرف نماز میں رخ کرنے کا حکم دیا گیا۔ اور معراج کے سفر میں آپؐ کو مسجد حرام سے اٹھا کر مسجد اقصیٰ پہنچایا گیا اور وہاں تمام انبیاءِ کرام کی آپؐ نے امامت فرمائی۔ اس طرح سے اعلان کر دیا گیا کہ آج کے بعد دونوں قبلوں کی امامت اور تمام امتوں کی قیادت سرکارِ محمدیؐ کو عطا کی جا رہی ہے۔ اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ بنی اسرائیل اپنے منصب سے معزول کیے جا رہے ہیں۔ آج کے بعد نجات کا دارومدار صرف اس بات پر ہو گا کہ کون آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاتا ہے؟ اور تمام دنیا کی قیادت و امامت بھی اس امت کے سپرد کی جائے گی۔ جو آنحضرت ﷺ کی دعوت پر ایمان اور آپؐ کے اتباع سے مشرف ہو گی۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیے کہ آج کے بعد دنیا کی دینی امامت و قیادت نہ بنی اسرائیل کے ہاتھوں میں ہو گی نہ بنی اسماعیل کے ہاتھوں میں بلکہ اب قیامت تک امامت کا تاج آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سر پر رکھا گیا ہے اور آپ کی نیابت اور جانشینی کا حق ان لوگوں کو ہو گا جو آپ پر ایمان لائیں گے اور آپؐ کا اتباع کریں گے۔ وہ حبشہ کا بلالؓ ہو یا روم کا صہیبؓ۔ وہ اس امت میں امامت کے منصب پر فائز ہوں گے لیکن ابوجہل اور ابولہب اور عتبہ و شیبہ قریشی اور آلِ اسماعیل میں ہونے کے باوجود جہنم کا ایندھن بنیں گے۔

Marfat.com

واقعۂ معراج کی تفصیلات

اب ہم اس واقعۂ معراج کی تفصیلات عرض کرتے ہیں جس کے ایک ایک واقعہ میں جہانِ معنی مضمر ہے۔ جس میں مسلمانوں کے لیے یقین و ایمان کی تربیت بھی ہے' آنے والے حالات کی راہنمائی بھی ہے اور سابقہ امتوں کے حوالے سے نصیحت وعبرت کا سامان بھی ہے۔ قرآن کریم نے اس واقعے کی تفصیلات کو ذکر نہیں کیا۔ قرآن اس واقعے کا مختصر ذکر کرنے کے بعد یہ بتاتا ہے کہ معراج کس غرض سے ہوئی تھی اور اللہ نے اپنے رسول کو بلا کر کیا ہدایات دی تھیں۔ اور حدیث اس بات کی وضاحت کرتی ہے کہ یہ محیر العقول واقعہ کس طرح پیش آیا اور اس کی تفصیلات کیا ہیں؟

اس واقعہ کی تفصیلات اٹھائیس اہم عصر راویوں کے ذریعے سے ہم تک پہنچی ہے۔ سات راوی وہ ہیں جو خود معراج کے زمانہ میں موجود تھے اور اکیس وہ ہیں جنھوں نے بعد میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی زبان مبارک سے اس کا قصہ سنا۔ ان تمام روایات میں اہم تر روایات تین بزرگوں کی ہیں۔ ایک حضرت ابوذر غفاری' دوسرے حضرت مالک بن صعصعہ اور تیسرے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہم۔

صحیحین اور بعض دیگر کتب کی روایات کو ملا کر معراج کے سوانح ومشاہدات کا جو ایک جامع اور نظر افروز سفر نامہ تیار ہوتا ہے ہم اسے اختصار سے لکھتے ہیں۔ مختلف احادیث میں اجمال وتفصیل کا فرق ہے۔ اور بعض روایات میں بعض واقعات کو ذکر نہیں کیا گیا۔ اس لیے ہم تمام روایات کو جمع کر کے اس کی تفصیل آپ کے سامنے عرض کر رہے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت کے منصب پر سرفراز ہوئے بارہ سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ باون برس کی عمر تھی' آپ حرم کعبہ کا وہ حصہ جو حطیم کہلاتا ہے اس میں آرام فرما رہے تھے کہ حضرت جرائیل علیہ السلام نازل ہوئے' آپ بیداری اور خواب کی درمیانی حالت میں تھے۔ وہ آپ کو اٹھا کر چاہِ زمزم پر لے گئے اور وہاں آپ ؐ کے سینہ مبارک کو چاک کیا اور قلب اطہر کو نکال کر زمزم کے پانی سے دھویا۔ اس کے بعد سونے کا ایک طشت ایمان وحکمت سے معمور لایا گیا۔ حضرت جرائیل علیہ السلام نے اس طشت سے ایمان وحکمت کے خزانے کو لیکر آپ ؐ کے سینہ میں رکھ کر اس کو برابر کر دیا۔

اس کے بعد آپ کی سواری کے لیے ایک جانور لایا گیا جس کا قد گدھے سے بڑا اور خچر سے چھوٹا تھا۔ سفید رنگ کا لمبا جانور جسے براق کہا جاتا تھا' برق کی رفتار سے چلتا تھا اور اسی نسبت سے اس کا نام براق تھا۔ اس کا ہر قدم وہاں پڑتا جہاں نگاہ کی آخری حد ہوتی تھی۔ آپ ؐ سوار ہونے لگے تو وہ چمکا' جبرائیل علیہ السلام نے تھپکی دے کر کہا ''دیکھ کیا کرتا ہے آج تک محمدؐ سے بڑی شخصیت کا کوئی انسان تجھ پر سوار نہیں ہوا۔'' پھر آپ ؐ اس پر سوار ہو گئے اور جبرائیل علیہ السلام آپ ؐ کے ساتھ چلے۔ پہلی منزل مدینہ کی تھی' جہاں اتر کر آپ ؐ نے نماز پڑھی' جبرائیل علیہ السلام نے کہا اس جگہ آپ ؐ ہجرت کر کے آئیں گے۔ دوسری منزل طورِ سینا کی تھی جہاں اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہمکلام ہوئے تھے۔ تیسری منزل بیت لحم کی تھی جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے۔ چوتھی منزل پر بیت المقدس تھا جہاں براق کا سفر ختم ہوا۔

اس سفر کے دوران ایک جگہ کسی پکارنے والے نے اپنی طرف بلایا' لیکن آپ ؐ نے توجہ نہیں فرمائی۔ جبرائیل علیہ السلام نے کہا ''یہ یہودیت کی طرف بلا رہا تھا۔'' دوسری طرف سے پھر بلانے کی آواز آئی' آپ ؐ اس کی طرف بھی متوجہ نہ ہوئے۔ جبرائیل علیہ السلام نے کہا ''یہ عیسائیت کا داعی تھا۔'' پھر ایک عورت نہایت بنی سنوری سامنے آئی اور اس نے آپ کو اپنی طرف متوجہ کیا' آپ ؐ نے اس سے بھی نظر پھیر لی۔ جبرائیل علیہ السلام نے کہا: ''یہ دنیا تھی۔'' پھر ایک بوڑھی عورت سامنے آئی' جبرائیل علیہ السلام نے کہا ''دنیا کی عمر کا اندازہ آپ اس کی عمر سے کر لیجیے۔'' پھر ایک اور شخص ملا جس نے آپ ؐ کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا' مگر آپ ؐ اسے بھی چھوڑ کر آگے بڑھ گئے۔ جبرائیل علیہ السلام نے کہا ''یہ شیطان تھا جو آپ ؐ کو راستے سے ہٹانا چاہتا تھا۔''

بیت المقدس پہنچ کر آپ ؐ براق سے اتر گئے۔ اور براق کو اس قلابہ میں باندھ کر جس میں انبیاء اپنی سواریاں باندھا کرتے تھے آپ ؐ نے مسجد اقصیٰ کے اندر قدم رکھا۔ اور وہاں دو رکعت نماز ادا کی۔ یہاں سے نکلے تو جبرائیل علیہ السلام نے شراب اور دودھ کے دو پیالے آپ ؐ کے سامنے پیش کیے۔ آپ ؐ نے دودھ کا پیالہ اٹھا لیا۔ جبرائیل علیہ السلام نے کہا ''آپ ؐ نے فطرت کو پسند کیا۔ اگر آپ ؐ شراب کا پیالہ اٹھا لیتے تو آپ کی امت گمراہ ہو جاتی۔''
اس کے بعد حضرت جبرائیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لے کر آسمان پر چڑھے۔ پہلا آسمان آیا تو دروازہ بند تھا۔ جبرائیل علیہ السلام نے دربان کو آواز

Marfat.com

دی۔ اس نے کہا ''کون ہے؟'' جبرائیل علیہ السلام نے اپنا نام بتایا۔ تو اس نے پوچھا ''تمھارے ساتھ اور کون ہے؟'' جواب دیا ''محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔'' پھر دریافت کیا کہ ''وہ بلائے گئے ہیں؟'' کہا ''ہاں۔'' یہ سن کر فرشتہ نے دروازہ کھول دیا اور ''مرحبا اور خوش آمدید'' کہتے ہوئے آپ کا پرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ یہاں آپ کا تعارف فرشتوں اور انسانی ارواح کی ان بڑی بڑی شخصیتوں سے ہوا جو اس مرحلہ میں مقیم تھیں۔ ان میں نمایاں شخصیت ایک ایسے بزرگ کی تھی جو انسانی بناوٹ کا مکمل نمونہ تھا۔ چہرے مہرے اور جسم کی ساخت میں کسی پہلو سے کوئی نقص نہ تھا۔ جبرائیل علیہ السلام نے بتایا ''یہ آدم علیہ السلام ہیں۔'' ان کے دائیں اور بائیں بہت سی پرچھائیاں تھیں۔ جب وہ داہنی طرف دیکھتے تو ہنستے اور جب بائیں طرف دیکھتے تو آبدیدہ ہو جاتے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا ''یہ کیا ماجرا ہے؟'' بتایا گیا کہ ''یہ پرچھائیاں نسلِ آدم ہیں۔ آدم اپنی اولاد کے نیک لوگوں کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اور برے لوگوں کو دیکھ کر روتے ہیں۔ پھر آپ کو تفصیلی مشاہدہ کا موقع دیا گیا۔ ایک جگہ آپ نے دیکھا کہ کچھ لوگ کھیتی کاٹ رہے ہیں' جتنی کاٹتے جاتے ہیں اتنی ہی وہ بڑھتی چلی جاتی ہے۔ پوچھا ''یہ کون ہیں؟'' بتایا گیا ''یہ خدا کی راہ میں جہاد کرنے والے ہیں۔'' اندازہ فرمائیے ابھی جہاد فرض نہیں ہوا' جہاد مدنی زندگی میں فرض ہوا ہے' لیکن مکی زندگی میں ہی بتا دیا گیا کہ مسلمانوں کی ترقی اور ان کی بقا کا دارومدار ان کے جذبۂ جہاد پر ہوگا۔ جب تک مسلمانوں میں جہاد کی روح باقی رہے گی ان کی عزت اور سرافرازی کے دن باقی رہیں گے۔ اور جب یہ دنیا کی محبت میں مبتلا ہو کر اللہ کے راستے میں جان دینے سے پہلو تہی کرنے لگیں گے اور زندگی حیوانوں کی طرح اشیاء خورد و نوش اور تعیشات میں تلاش کریں گے اس وقت ان کی ذلت کے دن شروع ہو جائیں گے۔ مسلمانوں کی تاریخ قدم قدم پر اس حقیقت کی گواہی دے رہی ہے کہ مسلمان موت سے کھیلتے رہے تو ہر لحاظ سے ترقی کرتے رہے اور جب موت سے ڈرنے لگے اور محض جینے کو زندگی سمجھنے لگے تو عزت نے ان سے منہ پھیر لیا۔

شہیدوں کے لہو سے جو زمیں سیراب ہوتی ہے
بڑی زرخیز ہوتی ہے بڑی شاداب ہوتی ہے

آپ آگے بڑھے تو دیکھا کہ کچھ لوگ ہیں' جن کے سر پتھروں سے کچلے جا رہے ہیں۔ پوچھا ''یہ کون ہیں؟'' کہا گیا ''یہ وہ لوگ ہیں' جن کی سرگرانی انھیں نماز کے لیے اٹھنے نہ دیتی تھی۔ مسلمان کا سر جب تک اللہ کے سامنے جھکتا ہے تو سرافراز رہتا ہے اور جب وہ اللہ کے سامنے جھکنے سے پہلو تہی کرتا ہے تو پھر وہ سر دنیا کی ٹھوکروں میں آ جاتا ہے۔ یہاں بھی کچلا جاتا ہے اور قیامت کے دن بھی کچلا جائے گا۔ کیونکہ

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

پھر آپ نے کچھ اور لوگ دیکھے جن کے کپڑوں میں آگے اور پیچھے پیوند لگے ہوئے تھے اور وہ جانوروں کی طرح گھاس چر رہے تھے۔ پوچھا گیا ''یہ کون لوگ ہیں؟'' کہا گیا یہ وہ ہیں ''جو اپنے مال میں سے زکوٰۃ نہ دیتے تھے اور غریبوں کے لیے خیرات نہ نکالتے تھے۔'' اس کا مطلب یہ ہے کہ انسانیت اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کا نام ہے اور اللہ کے راستے میں ہاتھ روک کے رکھنا حیوانیت ہے اس حیوانیت کے حامل لوگوں کو قیامت کے دن حیوانوں کی طرح گھاس کھانے پر لگا دیا جائے گا۔

پھر ایک شخص کو دیکھا کہ لکڑیوں کا گٹھا جمع کر کے اٹھانے کی کوشش کرتا ہے اور جب وہ نہیں اٹھتا تو اس میں کچھ اور لکڑیاں بڑھا دیتا ہے۔ پوچھا ''یہ کون احمق ہے؟'' کہا گیا ''یہ وہ شخص ہے جس پر امانتوں اور ذمہ داریوں کا اتنا بوجھ تھا کہ اٹھا نہ سکتا تھا' مگر یہ ان کو کم کرنے کی بجائے اور زیادہ ذمہ داریوں کا بار اپنے اوپر لادے چلا جاتا تھا۔ آج اپنے گرد و پیش میں دیکھیں' بالخصوص اربابِ حل و عقد کے حالات کا مشاہدہ کریں تو آپ کو قدم قدم پر ایک سے ایک بڑا احمق نظر آئے گا۔ جس وزیر کے پاس ایک محکمہ ہے اور اس کا حق اس سے ادا نہیں ہوتا لیکن اس کی کوشش یہ ہے کہ مجھے ایک چھوڑ کئی محکمے مل جائیں تاکہ میں اس کی مدد سے زیادہ سے زیادہ حرام اکٹھا کر سکوں۔ اسے اس بات کی کوئی فکر نہیں کہ ہر محکمے کی ایک ذمہ داری ہے اور اس میں نہ جانے کتنے ہزار لوگوں کے حقوق شامل ہیں۔ جن کی عدم ادائیگی پر قیامت کے دن سخت باز پرس ہوگی۔ لیکن وہ ایک لمحے کے لیے اس بات کو سوچنے کا روادار نہیں۔ نوکر شاہی کو دیکھ لیجیے عام ملازمین کو دیکھ لیجیے تعلیمی اداروں کے محترم اساتذہ کو دیکھ لیجیے' ہر شخص کئی کئی ٹوپیاں پہننے کی فکر میں ہے۔ اب ذمہ داری کوئی بوجھ نہیں رہی بلکہ ایک منفعت بخش کاروبار بن گیا ہے۔ اس تمثیل میں جس برائی کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے' اس میں اور ہماری حالت میں ایک

Marfat.com

فرق ضرور ہے کہ گٹھے میں نئی نئی لکڑیاں ٹھونسنے سے اٹھانے والے کی کمر ٹوٹتی ہے تو اسے اپنی غلطی کی سزا بھی ملتی جاتی ہے۔لیکن نئے نئے عہدوں کی تلاش اور نئی نئی ذمہ داریوں کا شوق اس سے اٹھانے والے کی تو کمر نہیں ٹوٹتی' البتہ جن کے حقوق ان ذمہ داریوں سے وابستہ ہیں ان کا سب کچھ ٹوٹ جاتا ہے۔لیکن اٹھانے والے کو قیامت کے دن اندازہ ہوگا کہ میں کتنا بڑا جرم کرتا رہا ہوں۔

آپؐ مزید آگے بڑھے تو آپؐ نے دیکھا کہ ایک پتھر میں ذرا سا شگاف ہوا اور اس سے ایک بڑا موٹا سا بیل نکل آیا۔پھر وہ بیل اسی شگاف میں جانے کی کوشش کرنے لگا' مگر نہ جاسکا۔پوچھا ''یہ کیا معاملہ ہے'' کہا گیا ''یہ اس شخص کی مثال ہے جو غیر ذمہ داری کے ساتھ ایک فتنہ انگیز بات کر جاتا ہے' پھر نادم ہو کر اس کی تلافی کرنا چاہتا ہے مگر نہیں کر سکتا۔'' یہ رویہ ہر اس غیر ذمہ دار شخص کا ہوتا ہے جسے اس بات کا یقین نہیں کہ میری زبان سے جو نکلتا ہے وہ لکھ لیا جاتا ہے اور قیامت کے دن مجھے اس کا جواب دینا ہوگا۔اور نہ اسے اس بات کا یقین ہے کہ میرے بات کہنے سے جسکی دل آزاری ہوئی ہے جب تک وہ مجھے معاف نہ کرے میں اس وقت تک اس گناہ کی گرفت میں رہوں گا۔اور قیامت کے دن اس کی سزا بھگتوں گا۔طرفہ تماشا یہ ہے کہ ہماری نئی تہذیب نے تو ان چیزوں کو سیاست کا چلن بنا دیا ہے۔پارلیمنٹ میں اس کی کھلی چھٹی دے دی گئی ہے' وہاں نہایت فتنہ انگیز باتیں ہوتی ہیں اور صرف اتنی بات سے ختم ہو جاتی ہیں کہ ''انھیں ریکارڈ سے حذف کر دیا جائے'' یا ایک شخص دوسرے کی توہین کرتا ہے' اس کی دل آزاری کا مرتکب ہوتا ہے اور اتنی بات کہہ کر فارغ ہو جاتا ہے کہ ''میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔'' حالانکہ کہے ہوئے الفاظ کبھی بھی واپس نہیں ہوتے جب تک وہ شخص معاف نہ کرے جس کی دل آزاری ہوئی ہے۔کیونکہ

حالِ دل جب کہہ چکے تو پھر پشیمانی ہوئی
بات اپنے منہ سے نکلی اور بیگانی ہوئی

پھر آپؐ نے کچھ اور لوگ دیکھے جن کے ہونٹ اونٹوں کے مشابہ تھے اور وہ آگ کھا رہے تھے۔پوچھا ''یہ کون ہیں؟'' کہا گیا ''یہ یتیموں کا مال ہضم کر جاتے تھے۔''

پھر آپ نے کچھ اور لوگوں کو دیکھا جن کے پیٹ بے انتہا بڑے اور سانپوں سے بھرے ہوئے تھے۔آنے جانے والے ان کو روندتے ہوئے گزرتے تھے مگر وہ اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتے تھے۔پوچھا ''یہ کون ہیں؟'' کہا گیا ''یہ سود خوار ہیں۔''

پھر کچھ اور لوگ نظر آئے جن کی ایک جانب نفیس چکنا گوشت رکھا تھا اور دوسری جانب سڑا ہوا گوشت جس سے سخت بدبو آ رہی تھی۔وہ اچھا گوشت چھوڑ کر سڑا ہوا گوشت کھا رہے تھے۔پوچھا ''یہ کون ہیں؟'' کہا گیا ''یہ وہ مرد اور عورتیں ہیں جنھوں نے حلال بیویوں اور شوہروں کے ہوتے ہوئے حرام سے اپنی خواہشِ نفس پوری کی۔

انہی مشاہدات کے سلسلہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات ایک ایسے فرشتے سے ہوئی جو نہایت ترش روئی سے ملا۔آپؐ نے جبرائیل علیہ السلام سے پوچھا ''اب تک جتنے فرشتے ملے تھے سب خندہ پیشانی اور بشاش چہروں کے ساتھ ملے' ان حضرت کی خشک مزاجی کا سبب کیا ہے؟'' جبرائیل علیہ السلام نے کہا ''اس کے پاس ہنسی کا کیا کام؟ یہ تو دوزخ کا داروغہ ہے۔یہ سن کر آپؐ نے دوزخ دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔یکایک آپؐ کی نظر کے سامنے سے پردہ اٹھا دیا گیا اور دوزخ اپنی تمام ہولناکیوں کے ساتھ نمودار ہو گئی۔

ان مشاہدات سے گزر کر پھر سفر شروع ہوا۔آپؐ دوسرے آسمان پر پہنچے۔یہاں آپ کی ملاقات حضرت یحییٰؑ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام سے ہوئی۔حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں آپؐ نے فرمایا کہ ''آپ میانہ قامت اور سرخ و سفید رنگ کے ہیں۔سر کے بال سیدھے اور لمبے ہیں' معلوم ہوتا ہے کہ ابھی حمام سے نہا کر نکلے ہیں۔حضرت عروہ ابن مسعود ثقفی رضی اللہ عنہ سے ان کی صورت ملتی جلتی ہے۔'' پھر آپ تیسرے آسمان پر پہنچے تو آپ کی ملاقات ایک ایسی شخصیت سے کرائی گئی جن کا حسن عام انسانوں کے مقابلہ میں ایسا تھا جیسا تاروں کے مقابلہ میں چودھویں کا چاند۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے بتایا ''یہ یوسف علیہ السلام ہیں۔'' چوتھے آسمان پر پہنچے تو حضرت ادریس علیہ السلام سے ملاقات ہوئی۔پانچویں پر حضرت ہارون علیہ السلام سے اور چھٹے پر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ملے۔حضرت موسیٰ علیہ السلام کا حلیہ بیان کرتے ہوئے آپؐ نے فرمایا ''ان کا قد لمبا ہے اور آپ کے بال الجھے ہوئے' گھونگھر والے ہیں۔ازوشنوہ کے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔'' ساتویں آسمان پر پہنچے تو ایک عظیم الشان محل

Marfat.com

المعمور کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔وہاں بے شمار فرشتے آتے اور جاتے تھے۔اس کے پاس آپ کی ملاقات ایک ایسے بزرگ سے ہوئی جو خود آپؐ سے بہت مشابہ تھا۔تعارف پر معلوم ہوا کہ آپ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔حضرت ابراہیم علیہ السلام بیت المعمور سے پیٹھ لگائے بیٹھے تھے۔جس طرح دنیا میں انسانوں کا قبلہ بیت اللہ ہے' بالکل اسی کی سیدھ پر بیت المعمور ہے جو فرشتوں کا قبلہ ہے۔اگر بیت اللہ سے بیت المعمور کی طرف خط کھینچا جائے تو بالکل ایک دوسرے کے متوازی نظر آئیں گے۔اس میں ہر روز ستر ہزار فرشتے داخل ہوتے ہیں اور عبادت کرتے ہیں۔کہا جاتا ہے کہ فرشتوں کے جس گروہ کو وہاں ایک دفعہ حاضری کا موقع ملا دوبارہ اس گروہ کی باری نہیں آئی۔اس کے بعد مزید ارتقاء شروع ہوا یہاں تک کہ آپ سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچ گئے۔جو پیشگاہِ رب العزت اور عالم خلق کے درمیان حد فاصل کی حیثیت رکھتا ہے۔سدرۃ المنتہیٰ کا لفظی معنی انتہاء کی بیری کا درخت ہے۔اللہ بہتر جانتا ہے کہ اسے یہ نام کیوں دیا گیا ہے۔اس درخت کی وسعت کا عالم یہ ہے کہ انسانی نگاہ اسے ناپ نہیں سکتی۔اس درخت پر شانِ ربانی کا پرتو ہے۔تجلیات کی اس پر بارش ہوتی ہے۔جب شانِ ربانی اس پر چھا جاتی ہے تو اس کی ہیئت بدل جاتی ہے۔اس میں حسن کی وہ کیفیت پیدا ہوتی ہے جس کو کوئی زبان بیان نہیں کر سکتی اور اس میں رنگ برنگ کے ایسے انوار کی تجلی نظر آتی ہے جن کو الفاظ ادا نہیں کر سکتے۔یہی وہ مقام ہے جہاں سے چیزیں نیچے زمین پر اترتی ہیں اور زمین سے چڑھ کر اوپر وہاں جاتی ہیں۔بعض بزرگوں نے اسے جنرل پوسٹ آفس سے تشبیہ دی ہے۔یہاں پہنچ کر جبرائیل علیہ السلام اصلی کمالی صورت میں آپؐ کے سامنے نمودار ہوئے۔اسی مقام کے قریب آپ کو جنت کا مشاہدہ کرایا گیا اور آپؐ نے دیکھا کہ اللہ نے اپنے صالح بندوں کے لیے وہ کچھ مہیا کر رکھا ہے جو نہ کسی آنکھ نے دیکھا' نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی ذہن میں اس کا تصور تک گزر سکا۔

سدرۃ المنتہیٰ پر پہنچ کر حضرت جبرائیل علیہ السلام رک گئے اور عرض کی ''حضور اب آگے آپ تنہا جائیں۔'' حضور نے حیرت سے فرمایا ''جبرائیل! یہ کیا بے وفائی ہے۔آپ ہمارا ساتھ کیوں چھوڑ رہے ہیں؟'' حضرت جبرائیل علیہ السلام نے عرض کی ۔

اگر یک سرِ موئے برتر پرم
فروغِ تجلی بسوزد پرم

(ترجمہ) ''اگر میں اس مقام سے آگے ایک بال برابر بھی بڑھا تو اللہ کی تجلی سے میرے پر جل جائیں گے۔'' چنانچہ آپ تنہا آگے بڑھے ایک بلند ہموار سطح پر پہنچے بارگاہِ جلال سامنے تھی۔پھر شاہدِ مستورِ ازل سے خلوت گاہِ راز میں ناز و نیاز کے وہ پیغام ادا ہوئے جن کی لطافت و نزاکت الفاظ کے بوجھ کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ادھر سے بندگی کا سرمایہ پیش کیا گیا اور ادھر سے اعزاز و اکرام کی بارش ہوئی۔بعض روایات میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اظہارِ عجز و نیاز کرتے ہوئے عرض گزار ہوئے ''التحیات لله والصلوٰت والطیبات'' (تمام قولی عبادتیں' تمام فعلی عبادتیں اور تمام مالی عبادتیں اللہ ہی کے لیے ہیں) اس کا مطلب یہ ہے کہ ۔

مرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں — مرے دل کی پوشیدہ بیتابیاں
مرے نالۂ نیم شب کا نیاز — مری خلوت و انجمن کا گداز
امنگیں مری آرزوئیں مری — امیدیں مری جستجوئیں مری
مرا دل مری رزم گاہِ حیات — گمانوں کے لشکر یقیں کا ثبات
یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر — اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر

ادھر سے جواب آیا ''السلام علیک ایها النبی'' (اے نبی! دنیا و عقبیٰ کی سلامتی اور خیر و فلاح کی ہر نعمت تجھ پر قربان) فرشتوں کو یہ خبر پہنچی تو انہوں نے درخواست کی ''السلام علینا و علیٰ عباده الله الصالحین'' (ہم پر سلامتی ہو اور اللہ کے تمام نیک بندوں پر) الٰہی ہمیں اور اپنے تمام نیک بندوں کو رحمت کی اس بارش سے محروم نہ رکھ اور ہم میں سے ہر ایک کو بقدرِ ہمت اور بقدرِ قسمت حصہ عطا فرما۔اس راز و نیاز کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شہادت کو دہرایا جس کے لیے آپ کو دنیا میں بھیجا گیا تھا۔ ''اشهد ان لا اله الا الله و اشهد ان محمدا عبده و رسوله'' (میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد اللہ کے رسول ہیں) اللہ کی الوہیت کی گواہی تو دنیا میں ہر رسول اور ہر پیغمبر نے دی اور ان کی گواہی زمین تک یا عالم مکان تک محدود رہی' لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی گواہی عالم لامکان میں گونجی۔آپؐ نے شہادت کا حق وہاں بھی ادا کیا

Marfat.com

جہاں آپ کے سوا کوئی نہ پہنچ سکا اور اللہ نے اپنے نام کے ساتھ آپ کے رسول ہونے کی گواہی جس طرح دنیا میں آپ سے اور آپ کے ماننے والوں سے ادا کروائی کہ جہاں بھی اللہ کا نام گونجتا ہے وہاں اللہ کے رسول کا نام بھی گونجتا ہے۔

وہ جس کا ذکر ہوتا ہے زمینوں آسمانوں میں
فرشتوں کی دعاؤں میں موذن کی اذانوں میں

اسی طرح حریم قدس میں اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ آپؐ کے نام کی گواہی دی گئی' یہ پہلا اور آخری موقع ہے کہ وہاں بھی اللہ تعالیٰ کے رسولؐ کا نام آیا۔ یہ تو وہ اعزاز ہے جس کا ذکر انسانوں تک پہنچا۔ اس کے علاوہ آپؐ کو کیا کیا اعزازات دیے گئے یہ اللہ تعالیٰ اور اس کا رسولؐ بہتر جانتا ہے۔

آنحضرتؐ اور آپؐ کی امت پر فضل وکرم کی بارش

اس کے علاوہ آپؐ کو جو عطیات مرحمت فرمائے گئے ہیں جس میں آپؐ کی امت بھی شریک ہے وہ چار ہیں۔ سورۃ بقرۃ کی آخری آیتیں عطا کی گئیں' جن میں اسلام کے عقائد وایمان کی تکمیل اور اس کے دور مصائب کے خاتمہ کی بشارت ہے۔ (۲) رحمت خاص نے یہ مژدہ سنایا کہ جو شخص بھی آپؐ کی امت میں سے شرک سے بچا رہا، اللہ تعالیٰ اسے ضرور مغفرت سے نوازیں گے۔ (۳) جو شخص نیکی کا ارادہ کرتا ہے اس کے حق میں ایک نیکی لکھی جاتی ہے اور جب وہ اس پر عمل کرتا ہے تو دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔ مگر جب برائی کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے خلاف کچھ نہیں لکھا جاتا اور جب وہ اس پر عمل کرتا ہے تو ایک ہی برائی لکھی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس کرم کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ نیکی پر اجر وجزا ملنا یہ نیکی کرنے والے کا استحقاق نہیں۔ اللہ کی مرضی ہے کہ وہ عطا کرے یا نہ کرے۔ لیکن جب کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہے تو وہ ایک بہت بڑی جسارت کا ارتکاب کرتا ہے۔ جتنی بڑی بارگاہ میں جسارت کی جاتی ہے اتنی بڑی سزا ملتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل اس قدر جوش میں ہے کہ نیکی کا ارادہ کرنے والے کو ایک نیکی عطا کردی جاتی ہے اور اس پر عمل کرنے والے کو ایک کے بدلے میں دس گنا دیا جاتا ہے۔ اور قرآن کریم کی شہادت کے مطابق یہ اجر وثواب سات سو گنا تک بھی جاسکتا ہے۔ لیکن برائی جس کا خمیازہ عقل کا تقاضا بھی ہے اور اس بارگاہ کی عظمت کا بھی' لیکن پروردگار اس قدر رحمت کا سلوک فرمارہے ہیں کہ جو شخص برائی کا ارادہ کرتا ہے اس سے درگزر کیا جائے گا اور جو شخص برائی کرگزرتا ہے اسے صرف ایک برائی کی سزا ملے گی۔ کس قدر بدنصیبی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو بخشش کا عظیم موقع اپنی امت کو لے کے دیا ہے اگر امت اس سے فائدہ نہ اٹھائے۔ اگر ایک امتی برائیوں سے کم بھی نیکیاں کرے جب بھی دس گنا اجر وثواب کے حساب سے نیکیاں کہیں کی کہیں پہنچ جائیں گی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن صرف وہ شخص پکڑا جائے گا جس نے شرک سے پرہیز نہیں کیا اور اگر اس نے کوئی نیکیاں کیں تو اخلاص اور صحیح طریقے سے نہیں کیں ورنہ اللہ کی رحمت سے امید کی جاسکتی ہے کہ گناہ گار بھی وہاں بخشے جائیں گے۔ سعدی مرحوم نے ٹھیک کہا ؎

شنیدم کہ در روزِ امید و بیم
بداں را بہ نیکاں بہ بخشد کریم

(۴) ہر روز 50 نمازیں فرض کی گئیں۔ آپؐ اللہ تعالیٰ کے ان عطیات کو لے کر جب واپس ہوئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے دریافت کیا کہ "بارگاہِ خاص سے کیا احکام عطا ہوئے؟" فرمایا "امت پر 50 وقت کی نمازیں فرض ہوئیں" حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا "میں بنی اسرائیل کا تلخ تجربہ رکھتا ہوں۔ آپؐ کی امت سے یہ بار اٹھ نہ سکے گا۔ آپؐ واپس جائیے اور کمی کے لیے عرض کیجئے۔" آپؐ واپس پلٹے اور عرض پرداز ہوئے "الٰہی! میری امت نہایت کمزور اور اس کے قویٰ نہایت ضعیف ہیں"۔ حکم ہوا کہ "دس وقت کی نمازیں معاف ہوئیں"۔ لوٹے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پھر واپس جانے کو کہا۔ آپؐ چند بار حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مشورے سے بارگاہِ الٰہی میں عرض پرداز ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ شب وروز میں صرف پانچ وقت کی نمازیں رہ گئیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پھر یہی مشورہ دیا کہ اب بھی مزید تخفیف کی درخواست کیجئے۔ آپؐ نے فرمایا "اب مجھے اپنے پروردگار سے شرم آتی ہے۔" ندا آئی "اے محمدؐ! میرے حکم میں تبدیلی نہیں'

Marfat.com

نمازیں پانچ ہوں گی لیکن ہر نیکی کا بدلہ دس گنا بخشوں گا۔ یہ پانچ بھی پچاس ہوں گی۔ میں نے اپنے بندوں پر تخفیف کر دی اور اپنا فیصلہ نافذ کر دیا۔ واپسی کے سفر میں آپ اسی سیڑھی سے اتر کر جس سے آپ چڑھ کے گئے تھے زمین پر تشریف لائے۔ بیت المقدس میں داخل ہوئے دیکھا کہ یہاں انبیاءِ علیہم السلام جمع ہیں۔ اور حضرت موسیٰ اور حضرت ابراہیم علیہما السلام نماز میں مصروف ہیں۔ آپؐ نے تمام انبیاءِ کرام علیہم السلام کو فجر کی نماز پڑھائی۔ پھر بیت المقدس سے آپ تمام منازل طے کرنے کے بعد مکہ معظمہ پہنچے اور صبح کو مسجد حرام سے بیدار ہوئے۔

کفار کا ردِ عمل

خانہ کعبہ کے آس پاس رؤسائے قریش کی نشست رہتی تھی۔ صبح کو آپؐ نے ان کے سامنے یہ واقعہ بیان کیا۔ تو ان کو سخت اچنبھا ہوا۔ جو زیادہ کور باطن تھے انھوں نے آپ کا مذاق اڑایا اور آپ کی تکذیب کی۔ بعض لوگوں نے مختلف سوالات کیے۔ ان میں سے اکثر شام کے تاجر تھے اور انھوں نے بیت المقدس کو بارہا دیکھا تھا اور انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پہلے بیت المقدس کو نہیں دیکھا۔ انھوں نے کہا کہ ہم ابھی اندازہ کر لیتے ہیں کہ آپ واقعی بیت المقدس گئے ہیں یا نہیں گئے۔ انہوں نے کہا ''یہ بتائیے کہ بیت المقدس کی شکل وصورت کیا ہے؟'' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ''میرے ذہن میں عمارت کا صحیح نقشہ نہ تھا' بہت بے قراری ہوئی' لیکن اللہ کی قدرت دیکھئے کہ اچانک آپ کی نظروں کے سامنے پوری عمارت جلوہ گر کر دی گئی۔ وہ سوال کرتے جاتے تھے اور میں اس کو دیکھ کر جواب دیتا تھا۔'' بعض روایات میں آیا ہے کہ جب یہ خبر مکہ معظمہ میں پھیلی تو بعض لوگوں کو خیال ہوا کہ حضرت ابو بکر کے پاس چلتے ہیں۔ وہ آپؐ کے دستِ راست ہیں اور ان سے پوچھتے ہیں کہ وہ اس خبر کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ وہ ایک عقلمند آدمی ہیں وہ ایسی خلافِ عقل بات کو کیوں تسلیم کریں گے؟ ہوسکتا ہے وہ ایمان سے پھر جائیں۔ اگر ایسا ہو گیا تو یوں سمجھئے کہ اس تحریک کی جان ہی نکل جائے گی۔ چنانچہ وہ تلاش کرتے ہوئے ابو بکر کے پاس پہنچے۔ انھوں نے یہ قصہ سن کر کہا ''اگر واقعی محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ واقعہ بیان کیا ہے تو ضرور سچ ہوگا۔ اس میں تعجب کی کیا بات ہے' میں تو روز سنتا ہوں کہ ان کے پاس آسمان سے پیغام آتے ہیں اور میں اس کی تصدیق کرتا ہوں۔'' کہا جاتا ہے اسی تصدیق کی وجہ سے حضرت ابو بکر کا لقب صدیق ہو گیا۔ بعض روایات میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے بعض آنے والے قافلوں کی بھی خبر دی۔ ان کی بعض علامتوں کو ذکر کیا۔ اور ایک قافلے کے بارے میں فرمایا کہ فلاں وادی میں فلاں قبیلہ کا قافلہ مجھے ملا' سب لوگ سو رہے تھے' میں نے ان کے برتن سے پانی پیا اور اس بات کی علامت چھوڑ دی کہ اس سے پانی پیا گیا ہے۔ ایسی ہی کچھ اور علامتیں بھی آپؐ نے ان کے سامنے بیان کیں اور وہ قافلے بھی آپ کی خبر کے مطابق واپس پہنچ گئے۔ ان تمام علامتوں کو دیکھ کر اور بیت المقدس کے بارے میں آپؐ کے ٹھیک ٹھیک جواب سن کر زبانیں تو بند ہو گئیں لیکن دل جو صرف ایمان کی قوت سے مطمئن ہوتے ہیں' وہ مطمئن نہ ہو سکے۔ وہ یہی سوچتے رہے کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ جو شخص مخبر صادق کی بات نہ مانے تو اس کا آخری سہارا عقلِ سلیم ہوتی ہے اور جو اس سے بھی محروم ہو جائے اور محض اپنی وقت واہمہ کے سہارے یہی کہتا رہے کہ ''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟'' تو اس کا جواب کسی دور میں بھی ممکن نہیں ہو سکا۔ اس دور کے وہمی بھی اپنے توہمات کی آگ میں جلتے رہے اور آج کا نام نہاد دانشور بھی اپنی عقل کے بند گنبد میں کڑھ رہا ہے۔

اس دل افروز اور سبق آموز سفرنامے کی ایک ایک تفصیل پڑھیے اور ساتھ ہی ذہن میں یہ بھی رکھیے کہ یہ سفر نامہ اس ذاتِ عزیز کا ہے جس کی بات کو سننے کے اہل مکہ روادار نہ تھے۔ ان کی سنگدلی اور اذیت رسانی کے باعث آپؐ نے طائف کا رخ کیا تو وہ بھی انہی کے بھائی بند تھے انھوں نے جو آپؐ کے ساتھ سلوک کیا وہ آپ سن چکے ہیں۔ آپؐ نے جس بے بسی سے طائف سے نکلتے ہوئے اپنے رب کو پکارا اور سراپا عجز و نیاز اور صبر کی تصویر بن کر اپنے رب سے التجا کی کہ اگر آپ اسی پر خوش ہیں کہ دوسرے لوگ میرا مذاق اڑائیں اور ان میں ہلکا کیا جاؤں تو مجھے تو ہر صورت میں آپ کی رضا عزیز ہے۔ میں اس صورتِ حال پر بھی خوش ہوں' لیکن میرے آقا تو ہی دیکھ یہ لوگ میرے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہیں۔ واپس آپؐ مکہ معظمہ تشریف لائے تو جب تک مطعم بن عدی نے آپ کو اپنی پناہ میں لینے کا اعلان نہیں کیا اس وقت تک آپؐ سرزمین مکہ میں قدم نہیں رکھ سکے۔ یہ بے بسی اور بے کسی کا

Marfat.com

زمانہ ہے۔اور اسی زمانے میں آپ کو یہ سفر پیش آتا ہے۔اس سفر میں جو سب سے پہلی بات محسوس ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دکھایا جارہا ہے کہ اللہ کی یہ کائنات کتنی وسیع وعریض ہے اور اسکی قدرت کس قدر بے پناہ ہے۔اہل مکہ نے اگر اپنے دل آپؐ کے لیے بند کر لیے ہیں تو آپ کو کیا خبر کہ قدرت آپ کے لیے کیا کیا امکانات پیدا کررہی ہے۔جس ذات کے استقبال کے لیے فرشتے چشم براہ ہوں اور جس کی عظمت کے سامنے کائنات کی بساط سمٹ کے رہ جائے اور جو حریم قدس تک بار پانے کی عزت سے نوازا جائے جب کہ اس سے پہلے کوئی بھی اس عزت کا مستحق نہ ہوا۔تو کیا اسے ہم ان ظالموں کے رحم وکرم پر چھوڑ دیں گے۔حق وباطل کی کشمکش کی یہ لازمی سنتیں ہیں جن سے آپ کو گزارا جارہا ہے۔آپؐ کو پہنچنے والی ایک ایک تکلیف تاریخ کے ادوار کو روشن کرے گی اور اس راستے پر چلنے والے انہی باتوں سے حوصلہ پائیں گے اور دنیا پر یہ بات آشکارا ہو جائے گی کہ حق کس قدر عظمتوں کا حامل ہے کہ اس کے لیے اللہ کے اُس آخری رسول نے تکلیفیں اٹھائی تھیں جس کے لیے پوری کائنات نے آنکھیں بچھائی تھیں۔اور دوسری یہ بات کہ حق وباطل کی کشمکش کا یہ سفر ایسا مشکل اور جانگسل ہے جس پر چلنے کے لیے پہاڑوں سے بڑھ کر استقلال کی ضرورت پڑتی ہے اور یہ استقلال و پامردی اور یہ جذبہ وحوصلہ اس بے پناہ یقین سے پھوٹتا ہے جس یقین کو دنیا کی بڑی سے بڑی تکلیف اور بڑے سے بڑا حادثہ کبھی شکست دینے پر قادر نہ ہو سکے۔یہ یقین اور ایقان صرف اللہ کے نبیوں کو دیا جاتا ہے اور ان کے اندر یہ بے پناہ قوت پیدا کرنے کے لیے ملکوت السمٰوات والارض کا مشاہدہ کرایا جاتا ہے اور مادی حجابات بیچ میں سے ہٹا کر آنکھوں سے وہ حقیقتیں دکھائی جاتی ہیں جن پر ایمان بالغیب لانے کی دعوت دینے پر وہ معمور کیے جاتے ہیں۔اللہ کی جانب سے آنے والی ایک ایک حقیقت پر وہ نہ صرف ایمان رکھتے ہیں بلکہ اس کی گواہی بھی دیتے ہیں۔کسی حقیقت کی گواہی دینے کے لیے محض ظن و گمان یا علم کافی نہیں ہوسکتا' بلکہ اس کے لیے وہ یقین وایمان درکار ہوتا ہے جس میں اضمحلال کا شائبہ تک نہ ہو۔اور یہ یقین صرف آنکھوں سے دیکھ کر حاصل ہوتا ہے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وسیع علمِ شریعت دے کر مبعوث کیے گئے تھے۔آپؐ پر زندگی کی وہ حقیقتیں بھی کھولی گئیں جن کا اظہار مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ ہو رہا ہے۔اسی لیے آپؐ کی معراج باقی رسولانِ گرامی کی معراج سے زیادہ وسیع وہمہ گیر رکھی گئی۔مثال کے طور پر خلانوردی اور چاند ومریخ کے سفر کا تصور بھی گزشتہ زمانوں میں کبھی کسی کو نہیں ہوا۔جو حقیقت بھی دنیا کے سامنے آئی اس کا تعلق زمینی حقیقتوں سے تھا۔لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد آہستہ آہستہ علم اور سائنس اس کی طرف بڑھتے گئے اور آج یہ ایک جانی پہچانی بات معلوم ہوتی ہے۔لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج نے اس کی طرف بھی اشارے کیے۔ابھی خلانوردی کی باتیں شروع نہیں ہوئی تھیں کہ اقبال نے اس اشارے کو سمجھتے ہوئے کہا۔

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

تیسری بات یہ کہ تھوڑے ہی عرصے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہجرت کا سفر پیش آنے والا تھا۔دار الہجرت میں جا کر آپ کو اسلامی ریاست کن اصولوں پر اٹھانی ہے اور آپؐ کا مینیفسٹو کیا ہوگا؟ اس کی ضرورت بھی آپؐ کو پیش آنیوالی ہے۔چنانچہ ہم عرض کر چکے ہیں کہ معراج کے اس سفر میں یا واپسی پر آپؐ پر سورہ بنی اسرائیل نازل ہوئی۔اس میں وہ تمام بنیادی احکام دے دیے گئے جن پر آئندہ آپؐ نے اسلامی معاشرت، اسلامی ریاست اور اسلامی اقدار کی عمارت تعمیر کرنی تھی۔

وَاٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتٰبَ وَجَعَلْنٰهُ هُدًی لِّبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِیْ وَکِیْلًا ۝ ذُرِّیَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ اِنَّهٗ کَانَ عَبْدًا شَکُوْرًا ۝ (سورة بنیٓ اسرآءِیل : ۲،۳)

(ہم نے اس سے پہلے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی تھی اور اسے بنی اسرائیل کے لیے ہدایت بنایا تھا، اس تاکید کے ساتھ کہ میرے سوا کسی کو اپنا وکیل نہ بنانا۔ ۲) تم ان لوگوں کی اولاد ہو جنھیں ہم نے نوح علیہ السلام کے ساتھ کشتی پر سوار کیا تھا اور نوح علیہ السلام ایک شکر گزار بندہ تھے۔ ۳)

Marfat.com

آیت کا ربط

گزشتہ آیتِ کریمہ میں واقعہ اسراء کو ایک آیت میں بیان کرنے اور اس کے اہداف کا ذکر کرنے کے بعد اچانک اس آیت میں بنی اسرائیل کا ذکر شروع کر دیا گیا ہے جو بظاہر عجیب سا معلوم ہوتا ہے اور آدمی حیران ہوتا ہے کہ ان دونوں آیتوں کا آپس میں کیا ربط ہے، لیکن اگر سورہ بنی اسرائیل کا مرکزی مضمون اور اس کا مدعا پیشِ نظر رہے تو پھر یہ غلط فہمی نہیں ہوتی۔ ہم اس سے پہلے یہ بات عرض کر چکے ہیں کہ یہ عظیم واقعہ 12 سن نبوی میں پیش آیا ہے اور یہ زمانہ وہ ہے جسے آنحضرت ﷺ نے عام الحزن قرار دیا تھا کیونکہ یکے بعد دیگرے چند دنوں کے فاصلے سے حضرت ابوطالب اور حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ نے اللہ تعالیٰ کو پیارے ہو چکے تھے۔ تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ حضرت ابوطالب تو بنی ہاشم کے سردار اور آنحضرت ﷺ کے حقیقی چچا تھے اور آپؐ کے لیے بہت بڑا سہارا تھے۔ انھوں نے آپؐ کی خاطر بڑی سے بڑی مخالفت کا سامنا کیا تھا۔ اسی طرح حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ اپنے خاندان کی ایک معزز اور مؤثر خاتون ہونے کی وجہ سے آنحضرت ﷺ کے لیے بے حد تسلی کا باعث تھیں۔ بہت دفعہ مشکل حالات میں ان کے خاندان کے بعض افراد نے نبی کریم ﷺ اور مسلمانوں کا ساتھ دیا، لیکن اب دونوں کے اٹھ جانے سے قریشِ مکہ کے سامنے ایسی کوئی رکاوٹ نہ تھی جو ان کے ارادوں کے راستے میں حائل ہو سکتی۔ چنانچہ اب وہ آزادی سے آپؐ کے قتل کے منصوبے باندھ رہے تھے اور مکہ میں تبلیغ و دعوت کا کام انھوں نے یکسر بند کر دیا تھا۔ ایسے حالات میں نبی کریم ﷺ کو اس سفر پر بلانا اور پھر واپسی پر آپؐ کا اہل مکہ کے سامنے اس کی تفصیلات بیان کرنا یہ بتانے کے لیے تھا کہ جو شخص بطور رسول تمھارے سامنے دعوتِ دین پیش کر رہا ہے اور تم اس کی اذیت رسانی پر دلیر ہوتے جا رہے ہو، تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ کس مقام و مرتبے کا حامل ہے، وہ ابھی ابھی بیت المقدس اور پھر اس کے بعد آسمانوں تک اللہ تعالیٰ کی عظیم الشان نشانیاں دیکھ کر آیا ہے۔ وہ جس طرح تمھاری طرف اللہ تعالیٰ کی کتاب لے کر آیا ہے اسی طرح بنی اسرائیل کی طرف بھی موسیٰؑ اللہ تعالیٰ کی کتاب کے ساتھ مبعوث ہوئے تھے اور آپؑ نے اپنی امت کو کتاب سے وابستگی کے ساتھ ساتھ توحید کی دعوت دی تھی اور اللہ تعالیٰ کے بارے میں خاص احکام دیے تھے لیکن جب انھوں نے اسے نظر انداز کیا تو تاریخ اس بات پر گواہ ہے کہ ان پر پھر کیسی قیامتیں گزریں۔ اس لیے اے مشرکینِ مکہ تم اگر یہ نہیں چاہتے ہو کہ تمھارا انجام بھی بنی اسرائیل جیسا ہو تو تم بنی اسرائیل کے طور اطوار سے پرہیز کرو۔ آگے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کے نبیؐ پر ایمان لاؤ اور اس کی کتاب کو وظیفۂ عمل بنا لو۔

چنانچہ اس آیت میں فرمایا گیا ہے کہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب عطا کی تھی، تو موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے والوں کو حکم دیا گیا تھا کہ تم اگر یہ چاہتے ہو کہ دنیا کی امامت و قیادت کے منصب پر فائز رہو اور تمھیں دنیا میں بھی عزت ملے اور آخرت میں بھی سرخرو ٹھہرو تو اس کی پہلی شرط تو یہ ہے کہ تمھیں اس کتاب کو کتابِ ہدایت سمجھنا ہوگا اور زندگی کی راہنمائی اس کتاب سے حاصل کرنا ہوگی' اس کا دیا ہوا ضابطۂ حیات تمھاری اجتماعی زندگی کا آئین اور دستور اور تمھاری انفرادی زندگی کا راہنما ہو۔ اس کا ایک ایک حکم تمھارے لیے واجب الاطاعت اور اس کی ایک ایک ہدایت تمھارے لیے واجب الاتباع ہونی چاہیے۔ انفرادی زندگی بھی اسی کے نور سے روشن ہو اور اجتماعی زندگی پر بھی اسی کی حکمرانی ہو۔ اور دوسری بات یہ فرمائی کہ دیکھنا اللہ کے سوا کسی کو وکیل نہ بنانا' وکیل اسے کہتے ہیں جس پر اعتماد اور بھروسہ کیا جائے' جس پر توکل کیا جائے' اپنی زندگی کے سارے معاملات جس کے سپرد کر دیے جائیں اور جس کی طرف ہدایت واستمداد کے لیے رجوع کیا جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عبادت اور بندگی تمھیں صرف اللہ کی کرنا ہوگی' مشکلات میں اسی پر بھروسہ' اعتماد اور توکل کرنا ہوگا' بے بسی اور بے کسی میں اسی سے مدد مانگنی ہوگی۔ تمھارا سر اس کے سوا کسی اور کے سامنے نہ جھکے اور تمھارا دستِ سوال اس کے سوا کسی اور کے سامنے نہ پھیلے۔ اسی کے نام کی سربلندی اور اسی کی کتابِ ہدایت کے نفاذ کے لیے تمھیں جہاد کرنا ہوگا۔ قرآنِ کریم نے بار بار بنی اسرائیل سے کیے گئے عہدوں کا ذکر کیا ہے جس میں ایسی ہی باتوں کو دہرایا گیا ہے' اور اس سے اگلی آیت میں اس پر دلیل قائم کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ تم ان لوگوں کی اولاد ہو جو طوفانِ نوح میں حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی پر سوار ہونے کی وجہ سے بچ گئے تھے۔ ذرا غور کرو ان بچنے والوں کو عذاب سے بچ جانے کا سبب کیا تھا؟ اور عذاب سے ہلاک ہونے والوں کی ہلاکت کی وجہ کیا تھی۔ غور کرو تو تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ جن لوگوں نے اللہ کو اپنا وکیل بنایا اور حضرت نوح علیہ السلام کی پیروی کی وہ اس عذاب سے بچ گئے اور جنھوں نے اللہ کو چھوڑ کر اور نہ جانے کس کس کو وکیل اور کارساز بنایا اور نوح علیہ السلام پر ایمان

Marfat.com

لانے سے انکار کردیا وہ اللہ کے عذاب کا شکار ہوئے اور پانی میں ڈبو کے ماردیے گئے۔ تم بھی اگر یہ چاہتے ہو کہ دنیا میں اس کے عذاب سے بچے رہو اور آخرت میں اللہ کی نعمتوں کے مستحق ٹھہرو تو پھر اللہ کے نبی اور اس پر نازل ہونے والی کتاب کی اطاعت واتباع سے منحرف نہ ہونا اور اللہ کے ساتھ کسی اور کو شریک نہ ٹھہرانا۔ لیکن بنی اسرائیل نے ان میں سے ایک ایک بات سے انحراف کیا اور اپنی انفرادی واجتماعی زندگی میں نہ صرف معصیت کے راستے پر چلے بلکہ اللہ کی ذات وصفات میں بالکل مشرکوں کی طرح شرک میں مبتلا ہوگئے۔ مشرکین مکہ کو یہ باتیں سنا کر یہ بتلانا مقصود ہے کہ تم نے جو شرک کا رویہ اختیار کر رکھا ہے اور اللہ کے رسول پر ایمان لانے کے لیے تیار نہیں ہو تاریخ کے اس آئینہ میں دیکھو کیا تمھیں اپنا انجام نظر نہیں آتا تم بھی یقیناً اسی انجام کو پہنچو گے جس سے بنی اسرائیل دوچار ہوئے اور مسلمانوں کو تاریخ کے اس سبق سے عبرت حاصل کرنے کی طرف توجہ دلائی جارہی ہے کہ آج تمھیں جس منصب پر فائز کیا جارہا ہے کل تک اسی منصب پر بنی اسرائیل فائز تھے' لیکن وہ اپنی نااہلی کے باعث اس سے محروم ہوگئے۔ دیکھنا تم ان راہوں پر چلنے کی کوشش نہ کرنا اور زندگی کا وہ رویہ نہ اپنانا جس نے بنی اسرائیل کو تباہ کیا۔ اس کے بعد کی چند آیات میں بنی اسرائیل کی تاریخ کے ان ادوار کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس میں وہ اللہ کی نافرمانی کے باعث اللہ کے عذاب کا شکار ہوئے۔ انھیں سنبھلنے کا موقع دیا گیا' دوبارہ ان پر نعمتوں کی بارش کی گئی لیکن وہ پھر بگڑ گئے۔ دوبارہ پھر اللہ کا عذاب آیا اور وہ بدترین مظالم کا شکار ہوگئے۔ اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری ان کے لیے ایک آخری موقع ہے وہ اس سے فائدہ اٹھا کر اپنی قسمت بنا سکتے ہیں' لیکن اگر انھوں نے اس سے فائدہ نہ اٹھایا تو وہ ذلت ونکبت کی دلدل میں ہمیشہ کے لیے اتار دیے جائیں گے۔

وَقَضَيْنَآ اِلٰى بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ فِى الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِى الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيْرًا ۝۴ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ
اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِىْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ ۭ وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا ۝۵

(سورۃ بنیٓ اسرآءِیل: ۴۔۵)

(اور ہم نے اپنی کتاب میں بنی اسرائیل کو اس بات پر متنبہ کردیا تھا کہ تم دومرتبہ زمین میں فسادِ عظیم برپا کروگے اور بڑی سرکشی دکھاؤ گے۔ ۴) پھر جب ان میں سے پہلی سرکشی کا موقع آیا تو ہم نے تمھارے مقابلے پر اپنی ایسے بندے اٹھائے جو نہایت زور آور تھے اور وہ تمھارے ملک میں گھس کر ہر طرف پھیل گئے، یہ ایک وعدہ تھا جسے پورا ہو کر ہی رہنا تھا۔ ۵)　(سورۃ بنیٓ اسرآءِیل: ۴۔۵)

بنی اسرائیل کی تاریخ اور درسِ عبرت

عربی زبان میں قَضَيْنَآ کے ساتھ جب اِلٰی کا صلہ آتا ہے تو وہاں اس سے پہلے ابلغنا یا اس کے ہم معنی کوئی لفظ محذوف ہوتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے بنی اسرائیل کو اپنے اس فیصلے سے آگاہ کردیا تھا کہ جب تمھارے اندر فساد ایک خاص حد تک پہنچ جائے گا اور اس وقت کے انبیائے اکرام تمھیں وارننگ بھی دیں گے تو اس کے بعد تم پر اللہ تعالیٰ کا عذاب ضرور آئے گا۔ اور یہ بات ہمارے علم میں ہے کہ ایسا دودفعہ ہوگا جب تم اللہ تعالیٰ کے سامنے بغاوت اور سرکشی اختیار کروگے۔ چنانچہ جب ہم پہلے صحفِ آسمانی میں وہ تفصیلات پڑھتے ہیں جو بنی اسرائیل کے انبیائے اکرام نے ان پر تنقید کرتے ہوئے ذکر فرمائی ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کوئی قابلِ ذکر ایسی برائی نہیں تھی جو بنی اسرائیل میں پیدا نہ ہوچکی تھی۔ انھیں پڑھ کر جہاں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کے فساد کی نوعیت کیا تھی، وہیں ہمیں خود اپنا جائزہ لینے کا بھی موقع مل سکتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے معاملات سارے انسانوں اور تمام امتوں سے مستقل اصولوں پر مبنی ہیں' اس کی کسی سے رشتہ داری نہیں' جو امت بھی وہی رویہ اختیار کرے گی جس کی پاداش میں کسی امت پر عذاب آچکا تو پھر اسے عذاب سے بےفکر نہیں ہونا چاہیے۔ سب سے زیادہ زور تو اس بات پر دیا گیا ہے کہ دوسری قوموں کے ساتھ مل کر انھوں نے وہ تمام قسم کا شرک اختیار کرلیا جو دوسری قوموں میں پایا جاتا تھا۔ بت پرستی کی' بعل پرستی کی' عجل پرستی میں مبتلا ہوئے' مختلف دیویوں کی پوجا کی اور ان کی پرستش ان کے لیے عبادت بن گئی۔ اور قدم قدم پر اللہ کے احکام سے سرکشی کا رویہ اختیار کیا۔ حقوق العباد کا احترام اٹھتا چلا گیا' رشوت عام ہوگئی' یتیموں اور بیواؤں کا مال کھانا

Marfat.com

ان کے لیے ایک محبوب مشغلہ بن گیا' غریبوں کے لیے زندگی گزارنا مشکل سے مشکل تر ہوتا گیا' شروع میں اللہ کی شریعت سے انحراف پیدا ہوا جو بڑھتے بڑھتے انکار تک جا پہنچا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عقیدے کی خرابی کے ساتھ ساتھ معاملات کی تمام خرابیاں ان کے اندر پیدا ہوگئیں' ہوسِ زر نے مختلف طریقے ایجاد کیے اور زندگی کا بگاڑ بڑھتا چلا گیا' بدکاری اور عیاشی ان میں عام ہوگئی' بے حیائی ثقافت کا حصہ بن گئی' دوسری قوموں کی تہذیب انکے یہاں عزیز ہوگئی اور اس کی نقل اتارنا فیشن بن گیا۔ ان کے معاشی معاملات میں سود کو رفتہ رفتہ اہمیت ملتی چلی گئی' جب کہ سود ان پر حرام کیا گیا تھا۔ اس پر انبیاءِ کرام نے بار بار انھیں ٹوکا' جھنجھوڑا' لیکن انھیں جب بھی موقع ملا انھوں نے انبیا کو قتل کرنے سے بھی دریغ نہ کیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کا بنیادی جرم جس کا ذکر آسمانی کتابیں کرتی ہیں وہ اللہ کی شریعت کی نافرمانی' اللہ کے احکام کو توڑنا' پیغمبروں سے دشمنی' انھیں قتل تک کرنے کی کوشش کرنا' کمزوروں پر ظلم اور عیاشی اور بدکاری تھی۔ اور ہوس زر کو زندگی کا مقصد بنا کر تمام حرام ذرائع کا اختیار کرنا تھا۔ ان بداعمالیوں کے باعث ان پر اللہ کا عذاب ٹوٹا۔ یہاں رک کر ذرا غور کر لیجیے کہیں یہ ساری خرابیاں اس امت میں تو در نہیں آئیں۔

پہلی دفعہ جب ان پر اللہ کے عذاب کا کوڑا برسا تو وہ آشوریوں اور اہل بابل کی طرف سے آنے والی وہ تباہی تھی جس نے انھیں کھیل کھیل کر کے رکھ دیا۔ اس سے پہلے کہ ہم نہایت اختصار سے اس کی کچھ تفصیل عرض کریں، یہ بتانا ضروری سمجھتے ہیں کہ قرآن کریم نے بنی اسرائیل کی طرف سے جس فساد کے برپا کرنے اور پھر اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والے عذاب کا جو ذکر فرمایا ہے، بائبل کے مجموعۂ کتبِ مقدسہ میں آج بھی اس کی تفصیلات موجود ہیں۔ صاف صاف بتایا گیا ہے کہ تم پر یہ تباہی آنے والی ہے لیکن قومیں جب بگڑتی ہیں تو وہ اپنے خیرخواہوں کی بات پر بھی کان دھرنا پسند نہیں کرتیں۔ اس سلسلے میں عبارتیں نقل کرنا تو بہت طوالت کا باعث ہوگا البتہ ہم حوالوں پر اکتفا کرتے ہیں۔ پہلے فساد پر سب سے پہلے تنبیہ حضرت داؤد علیہ السلام نے کی۔ زبور، باب 106، آیات 24-41، پھر جب یہ فسادِ عظیم رونما ہوگیا تو اس کے نتیجے میں آنے والی تباہی کی خبر حضرت یسعیا نبی نے اپنے صحیفے میں مندرجہ ذیل ابواب میں دی۔ باب 1، آیت 4-5...... باب 1، آیت 21-24...... باب 2، آیت 6-8...... باب 3، آیت 16-26، اسی طرح اور بہت سے ابواب میں یہ تنبیہات ملتی ہیں۔ پیغمبرؑ نہایت دلسوزی سے اپنی قوم کی بداعمالیوں کا نہ صرف نوحہ پڑھتے ہیں بلکہ انھیں برے انجام سے ڈراتے بھی ہیں، لیکن ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔

پھر عین وقت پر حزقی ایل نبی اٹھے اور انھوں نے یروشلم کو خطاب کرتے ہوئے کہا ''اے شہر تو اپنے اندر خونریزی کرتا ہے تاکہ تیرا وقت آجائے اور تو اپنے لیے بت بناتا ہے تاکہ تجھے ناپاک کریں۔ دیکھ اسرائیل کے امراء سب کے سب جو تجھ میں ہیں مقدور بھر خونریزی پر مستعد تھے۔ تیرے اندر انھوں نے ماں باپ کو حقیر جانا، تیرے اندر انھوں نے پردیسیوں پر ظلم کیا، تیرے اندر انھوں نے یتیموں اور حیوانوں پر ستم کیا، تو نے میری پاک چیزوں کو ناپاک جانا اور میرے سبتوں کو ناپاک کیا، تیرے اندر وہ ہیں جو چغل خوری کر کے خون کرواتے ہیں، تیرے اندر وہ ہیں جو بتوں کی قربانی سے کھاتے ہیں، تیرے اندر وہ ہیں جو فسق و فجور کرتے ہیں، تیرے اندر وہ بھی ہیں جنھوں نے اپنے رب کی حرم شکنی کی، تجھ میں انھوں نے اس عورت سے جو ناپاکی کی حالت میں تھی مباشرت کی، کسی نے دوسرے کی بیوی سے بدکاری کی، کسی نے اپنی بہو سے بدذاتی کی، کسی نے اپنے بہن، اپنے باپ کی بیٹی کو تیرے اندر رسوا کیا، تیرے اندر انھوں نے خونریزی کے لیے رشوت خواری کی، تو نے بیاج اور سود کیا اور ظلم کر کے اپنے پڑوسی کو لوٹا، مجھے فراموش کیا، کیا تیرے ہاتھوں میں زور ہوگا، جب میں تیرا معاملہ فیصل کروں گا...... ہاں میں تجھ کو قوموں میں تتر بتر کروں گا اور تیری گندگی تجھ میں سے نابود کردوں گا اور تو قوموں کے سامنے اپنے آپ میں ناپاک ٹھہرے گا اور معلوم کرے گا کہ میں خداوند ہوں۔ (باب 22، آیت 3-16)

یہ تھیں وہ تنبیہات جو بنی اسرائیل کو پہلے فسادِ عظیم کے موقع پر کی گئیں۔ پھر دوسرے فسادِ عظیم اور اس کے ہولناک نتائج پر حضرت مسیح علیہ السلام نے ان کو خبردار کیا۔ متی باب 23 میں حضرت مسیح کا ایک مفصل خطبہ درج ہے، وہ اپنی قوم کے شدید اخلاقی زوال پر تنقید کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔

''اے یروشلم! اے یروشلم! تو جو نبیوں کو قتل کرتا اور جو تیرے پاس بھیجے گئے ان کو سنگسار کرتا ہے، کتنی بار میں نے چاہا کہ جس طرح مرغی اپنے بچوں کو پروں تلے جمع کر لیتی ہے، اسی طرح میں بھی تیرے لڑکوں کو جمع کر لوں، مگر تو نے نہ چاہا۔ دیکھو تمھارا گھر تمھارے لیے ویران چھوڑا جاتا ہے۔ (آیت 37-38)

Marfat.com

پھر جب رومی حکومت کے اہلکار حضرت مسیح علیہ السلام کو صلیب دینے کے لیے لے جا رہے تھے اور لوگوں کی ایک بھیڑ جن میں عورتیں بھی تھیں روتی پیٹتی ان کے پیچھے جا رہی تھیں تو انھوں نے آخری خطاب کرتے ہوئے مجموعہ سے فرمایا: اے یروشلم کی بیٹیو! میرے لیے نہ روؤ بلکہ اپنے لیے اور اپنے بچوں کے لیے روؤ، کیونکہ دیکھو، وہ دن آتے ہیں جب کہیں گے کہ مبارک ہیں بانجھیں اور وہ پیٹ جو نہ جنے اور چھاتیاں جنھوں نے دودھ نہ پلایا، اس وقت تو پہاڑوں سے کہنا شروع کریں گے کہ ہم پر گر پڑو اور ٹیلوں سے کہ ہمیں چھپالو۔ (لوقا، باب 23 آیت 28۔30)

اب ہم اشوریوں اور اہلِ بابل کی طرف سے آنے والی تباہی کی کچھ تفصیلات عرض کرتے ہیں۔ تورات میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ کے سے بنی اسرائیل کو ہدایات دی گئی تھیں اور انھیں صاف صاف کہا گیا تھا کہ تم فلسطین فتح کرنے کے بعد دوسرے قوموں کے ساتھ رہنے بسنے اور ان کی اخلاقی و اعتقادی خرابیوں میں مبتلا ہونے سے پرہیز کرنا۔ لیکن بنی سرائیل جب فلسطین میں داخل ہوئے تو وہ اس ہدایت کو بھول گئے انھوں نے کوئی اپنی متحدہ سلطنت قائم نہ کی۔ وہ قبائلی عصبیت میں مبتلا تھے اور ان کے ہر قبیلے نے اس بات کو پسند کیا کہ مفتوحہ علاقے کا ایک حصہ لے کر الگ ہو جائیں۔ اس تفرقے کی وجہ سے ان کا کوئی قبیلہ بھی اتنا طاقتور نہ بن سکا کہ اپنے علاقے کو مشرکین سے پوری طرح پاک کر دیتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان قوموں کے ذریعے سے ان کے اندر شرک داخل ہو گیا اور اس کے ساتھ بتدریج دوسری اخلاقی گندگیاں راہ پانے لگیں۔ دوسری خرابی یہ پیدا ہوئی کہ جن قوموں کی شہری ریاستیں انھوں نے چھوڑ دی تھیں اور انھوں نے اور فلسطینیوں نے جن کا پورا علاقہ غیر مغلوب رہ گیا تھا، بنی اسرائیل کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کر لیا اور پے در پے حملے کر کے فلسطین کے بڑے حصے سے اُن کو بیدخل کر دیا حتیٰ کہ ان سے تابوتِ سکینہ بھی چھین کے لے گئے۔ آخر کار بنی اسرائیل کو ایک فرمانروا کے تحت اپنی ایک متحدہ سلطنت قائم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور ان کی درخواست پر حضرت سموئیل نبی نے 1020 قبل مسیح میں طالوت کو ان کا بادشاہ بنایا (سورہ بقرہ میں اس کی تفصیل موجود ہے)

اس متحدہ سلطنت کے تین فرمانروا ہوئے۔ طالوت، حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام۔ ان فرمانرواؤں نے اس کام کو مکمل کیا جسے بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد نامکمل چھوڑ دیا تھا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل پر دنیا پرستی کا پھر شدید غلبہ ہوا اور انھوں نے آپس میں لڑ کر دو الگ الگ سلطنتیں قائم کر لیں۔ شمالی فلسطین اور شرق اردن میں سلطنتِ اسرائیل، جس کا پایہ تخت آخر کار سامریہ قرار پایا۔ اور جنوبی فلسطین اور ادوم کے علاقے میں سلطنت یہودیہ جس کا پایہ تخت یروشلم رہا۔ ان دونوں سلطنتوں میں سخت رقابت اور کشمکش اول روز سے شروع ہوگئی اور آخر تک رہی۔

ان میں سے اسرائیل ریاست کے فرمانروا اور باشندے ہمسایہ قوموں کے مشرکانہ عقائد اور اخلاقی فساد سے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ متاثر ہوئے۔ حضرت الیاس اور حضرت یسع علیہما السلام نے اس سیلاب کو روکنے کی انتہائی کوشش کی مگر یہ قوم جس تنزل کی طرف جا رہی تھی اس سے باز نہ آئی۔ آخر کار اللہ کا غضب اشوریوں کی شکل میں دولتِ اسرائیل کی طرف متوجہ ہوا اور نویں صدی قبل مسیح سے فلسطین پر اشوری فاتحین کے مسلسل حملے شروع ہو گئے۔ اس پر مختلف انبیاءِ کرام نے بار بار اپنی قوم کو متحد ہونے اور اپنی اصلاح کرنے پر اکسایا اور تبلیغ و دعوت کا حق ادا کیا، مگر جس غفلت کے نشے میں وہ سرشار تھے وہ تنبیہ کی ترشی سے اور زیادہ تیز ہو گیا۔ یہاں تک کہ عاموس نبی کو شاہِ اسرائیل نے ملک سے نکل جانے اور نبوت بند کر دینے کا نوٹس دے دیا۔ اس کے بعد کوئی زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ خدا کا عذاب اسرائیلی سلطنت اور اس کی باشندوں پر ٹوٹ پڑا۔ 721 قبل مسیح میں اشور کے سخت گیر فرمانروا سارگون نے سامریہ کو فتح کر کے دولت اسرائیل کا خاتمہ کر دیا۔ ہزار ہا اسرائیلی تہ تیغ کیے گئے، 27 ہزار سے زیادہ با اثر اسرائیلیوں کو ملک سے نکال کر اشوری سلطنت کے مشرقی اضلاع میں تتر بتر کر دیا گیا۔ اور دوسرے علاقوں سے لا کر غیر قوموں کو اسرائیل کے علاقے میں بسایا گیا۔ جن کے درمیان رہ بس کر بچا کھچا اسرائیلی عنصر بھی اپنی قومی تہذیب سے روز بروز بیگانہ ہوتا چلا گیا۔ بنی اسرائیل کی دوسری ریاست جو یہودیہ کے نام سے جنوبی فلسطین میں قائم ہوئی، وہ بھی حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد بہت جلدی شرک اور بد اخلاقی میں مبتلا ہو گئی۔ مگر نسبتاً اس کا اعتقادی اور اخلاقی زوال دولت اسرائیل کی بہ نسبت سست رفتار تھا۔ اس لیے اس کو مہلت بھی زیادہ دی گئی۔ آخر کار 598 قبل مسیح میں بابل کے بادشاہ بخت نصر نے یروشلم سمیت پوری دولت اسرائیل کو مسخر کر لیا اور یہودیہ کا بادشاہ اِس کے پاس قیدی بن کر رہا۔ یہودیوں کی بداعمالیوں کا اسلسلہ اس پر بھی ختم نہ ہوا۔ آخر 587 قبل مسیح میں بخت نصر نے ایک سخت حملہ کر کے یہودیہ کے تمام بڑے چھوٹے شہروں کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ یروشلم اور ہیکل سلیمانی کو اس طرح پیوندِ خاک کیا گیا کہ

Marfat.com

اس کی ایک دیوار بھی اپنی جگہ کھڑی نہ رہی۔ یہودیوں کی بہت بڑی تعداد کو ان کے علاقے سے نکال کر ملک ملک میں تتر بتر کر دیا گیا اور جو یہودی اپنے علاقے میں رہ گئے وہ بھی ہمسایہ قوموں کے ہاتھوں بری طرح پامال ہو کر رہ گئے۔ یہ تھا وہ پہلا فساد اور پہلا عذاب جس کا ذکر قرآن کریم نے کیا ہے۔

ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَاَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَجَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ نَفِيْرًا ۞ اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِيَسُوْٓءٗا وُجُوْهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِيْرًا ۞ (سورة بنیٓ اسرآءیل : ۶۔۷)

(پھر ہم نے تمھیں ان پر غلبے کا موقع دے دیا اور تمھیں مال اور اولاد سے مدد دی اور تمھاری تعداد پہلے سے بڑھا دی۔ ۶) اگر تم نے بھلائی کی تو وہ تمھارے اپنے ہی لیے بھلائی تھی، اور برائی کی تو وہ تمھاری اپنی ذات کے لیے برائی ثابت ہوئی، پھر جب دوسرے وعدے کا وقت آیا تو ہم نے دوسرے دشمنوں کو تم پر مسلط کر دیا تا کہ وہ تمھارے چہرے بگاڑ دیں اور مسجد (بیت المقدس) میں اسی طرح گھس جائیں جس طرح پہلے دشمن گھسے تھے اور جس چیز پر ان کا ہاتھ پڑے اُسے تباہ کر کے رکھ دیں۔ ۷)

یہود کی تاریخ کا دوسرا دور

اس آیت کریمہ میں قرآنِ کریم بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہود کو پھر سنبھلنے کا موقع دیا۔ اسرائیل نام کی سلطنت کے لوگ تو اپنے اخلاقی واعتقادی زوال کی پستیوں میں گرنے کے بعد پھر نہ اٹھے، مگر یہودیہ کے باشندوں میں ایک بقیہ ایسا موجود تھا جو خیر پر قائم اور خیر کی دعوت دینے والا تھا، اس نے لوگوں میں اصلاح کا کام جاری رکھا۔ آخر رحمت الٰہی مددگار رہوئی، بابل کی سلطنت کو زوال آیا، 539 قبل مسیح میں ایرانی فاتح سائرس نے بابل کو فتح کیا اور اس کے دوسرے سال اس نے بنی اسرائیل کو اپنے وطن واپس جانے اور دوبارہ آباد ہونے کی اجازت دے دی۔ پھر حضرت عزیر علیہ السلام کو ایک فرمان کے ذریعے مجاز کیا گیا کہ وہ اپنے علاقے میں دین کا کام کریں اور حاکموں اور قاضیوں کو مقرر کرائیں۔ حضرت عزیر نے اس سے فائدہ اٹھا کر دین موسیٰ کی تجدید کا بہت بڑا کام انجام دیا۔ بائبل کی کتب خمسہ کو جن میں تورات ہے مرتب کر کے شائع کیا۔ ایرانی سلطنت کے زوال کے بعد اور سکندرِ اعظم کی فتوحات کے نتیجے میں ان کے لیے پھر دشواریاں پیدا ہوئیں۔ سکندر کی وفات کے بعد اس کی سلطنت جن تین سلطنتوں میں تقسیم ہوئی تھی ان میں سے شام کا علاقہ اس سلوقی سلطنت کے حصے میں آیا جس کا پایۂ تخت انطاکیہ تھا اور اس کے فرمانروا انٹیوکس ثالث نے 198 قبل مسیح میں فلسطین پر قبضہ کر لیا۔ یونانی فاتح جو مذہبا مشرک اور اخلاقاً اباحیت پسند تھے، یہودی مذہب اور تہذیب کو سخت ناگوار محسوس کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ 175 قبل مسیح میں انٹیوکس چہارم جب تخت نشیں ہوا تو اس نے پوری جابرانہ طاقت سے کام لے کر یہودی مذہب اور تہذیب کی بیخ کنی کرنی چاہی۔ چنانچہ اس کی تمام سختیوں کے باوجود یہودی اس سے مغلوب نہ ہوئے اور ان کے اندر ایک زبردست تحریک اٹھی جو تاریخ میں مکابی بغاوت کے نام سے مشہور ہے۔ حضرت عزیر علیہ السلام کی پھونکی ہوئی روح دینداری نے اپنا اثر دکھایا کہ یہودیوں کی اکثریت مکابیوں کے ساتھ ہوگئی اور آخر کار انھوں نے یونانیوں کو ملک سے نکال کر اپنی ایک آزاد دینی ریاست قائم کر لی جو 67 قبل مسیح تک قائم رہی۔ یہ ایک طویل عرصہ ہے جس میں قدرت ان کے شامل حال رہی، لیکن پھر رفتہ رفتہ ان کے اندر وہی پرانی عادتیں عود کر آئیں۔ حضرت عزیر علیہ السلام کا اخلاقی و دینی اثر کمزور ہونے لگا، آخر ان کے درمیان پھوٹ پڑ گئی اور انھوں نے خود رومی فاتح پومپی کو فلسطین آنے کی دعوت دی۔ چنانچہ پومپی 63 قبل مسیح میں اس ملک کی طرف متوجہ ہوا اور اس نے بیت المقدس پر قبضہ کر کے یہودیوں کی آزادی کا خاتمہ کر دیا۔ لیکن رومی فاتحین کی یہ مستقل پالیسی تھی کہ وہ مفتوح علاقوں پر براہ راست اپنا نظم ونسق قائم کرنے کی بہ نسبت مقامی حکمرانوں کے ذریعے سے بالواسطہ اپنا کام نکلوانا زیادہ پسند کرتے تھے۔ اس لیے انہوں نے فلسطین میں اپنے زیر سایہ ایک دیسی ریاست قائم کر دی جو بالآخر 40 قبل مسیح میں ایک ہوشیار یہودی ہیرود نامی کے قبضہ میں آئی۔ اس کی ریاست 4 قبل مسیح تک باقی رہی۔ آخر یہ ریاست تین حصوں میں تقسیم ہوگئی جو اس کے تین بیٹوں کے حصے میں آئی۔ 41 عیسوی میں ہیرود اعظم کے پوتے کو رومیوں نے ان تمام علاقوں کا فرمانروا بنا دیا جن پر ہیرود اعظم اپنے زمانے میں حکمران تھا۔ اس شخص نے

Marfat.com

برسراقتدار آنے کے بعد مسیح علیہ السلام کے پیروؤں پر مظالم کی انتہا کردی اور اپنا پورا زور خدا ترسی اور اصلاحِ اخلاق کی اس تحریک کو کچلنے میں صرف کر ڈالا جو حواریوں کی رہنمائی میں چل رہی تھی۔ چند ہی سالوں کے بعد حالات نے کروٹ لی اور یہودیوں اور رومیوں کے درمیان سخت کشمکش شروع ہوگئی۔ یہودیوں نے نہ جانے اپنی طاقت کا کیا اندازہ لگایا کہ 64ء اور 66ء کے درمیان کھلی بغاوت کردی، تو رومی سلطنت نے ایک سخت فوجی کاروائی سے اس بغاوت کو کچل ڈالا اور 70ء میں ٹیٹس نے بزور شمشیر یروشلم کو فتح کرلیا۔ اس موقع پر قتل عام میں ایک لاکھ 33 ہزار آدمی مارے گئے۔ 67 ہزار آدمی گرفتار کرکے غلام بنائے گئے' ہزار ہا آدمی پکڑ پکڑ کر مصری کانوں میں کام کرنے کے لیے بھیج دیے گئے' ہزاروں آدمیوں کو پکڑ کر مختلف شہروں میں بھیجا گیا تاکہ ان کو جنگلی جانوروں سے پھڑوانے' یا شمشیرزنوں کے کھیل کا تختہ مشق بننے کے لیے استعمال کیا جائے۔ تمام دراز قامت اور حسین لڑکیاں فاتحین کے لیے چن لی گئیں اور یروشلم کے شہر اور ہیکل کو مسمار کرکے پیوند خاک کردیا گیا۔ اس کے بعد فلسطین سے یہودی اثر و اقتدار ایسا مٹا کہ دو ہزار برس تک اس کو پھر سر اٹھانے کا موقع نہ ملا اور یروشلم کا ہیکل مقدس پھر کبھی تعمیر نہ ہوسکا۔ یہ تھی وہ سزا جو بنی اسرائیل کو دوسرے فسادِ عظیم کی پاداش میں ملی۔

عَسٰی رَبُّكُمْ اَنْ یَّرْحَمَكُمْ ۚ وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا ۘ وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِیْنَ حَصِیْرًا ۝

(ممکن ہے تمھارا رب تم پر رحم کرے لیکن اگر تم نے پھر اپنی سابق روش کا اعادہ کیا تو ہم بھی اپنی سزا کا اعادہ کریں گے اور کافرِ نعمت لوگوں کے لیے ہم نے جہنم کو قید خانہ بنا رکھا ہے۔ ۸) (سورۃ بنیٓ اسرآءِیل : ۸)

بنی اسرائیل کے لیے آخری موقعہ

اس آیتِ کریمہ میں بنی اسرائیل سے مخاطب ہوکر پروردگار ارشاد فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی بعثت تمھارے لیے ایک آخری موقع ہے۔ اگر تم نے اس سے فائدہ اٹھایا تو عجب نہیں کہ اللہ تعالیٰ تم پر رحم فرمائے، لیکن اگر تم نے اس سے فائدہ نہ اٹھایا یعنی اللہ تعالیٰ کے آخری رسول پر ایمان لانے کی سعادت حاصل نہ کی تو پھر اللہ تعالیٰ کا عذاب دوبارہ بھی حرکت میں آسکتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہود کی ایک مختصر تعداد کے سوا اس موقع سے فائدہ اٹھانا تو دور کی بات ہے۔ انھوں نے اس کی دشمنی پر کمر باندھ لی اور یہ عہد کرلیا کہ ہم جیتے جی آنحضرت ﷺ کی بات چلنے نہیں دیں گے۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا غضب بھڑکا اور اس نے وارننگ کے مطابق انھیں اس طرح ازسرِنو سزا دی کہ قبیلہ بنی قینقاع اور قبیلہ بنونضیر جلاوطن کیے گئے اور انھوں نے خیبر میں جاکر پناہ لی اور پھر نبی کریم ﷺ کی ہدایت کے مطابق انھیں خیبر سے بھی نکال دیا گیا اور حکم دیا گیا کہ جزیرۂ عرب کے باہر جاکر پناہ ڈھونڈو۔ البتہ بنوقریظہ 5 ہجری تک مدینہ منورہ میں رہے لیکن پھر جنگ خندق میں انتہائی خطرناک عہد شکنی کے نتیجے میں قتل کیے گئے۔

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ یَهْدِیْ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ وَیُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِیْنَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِیْرًا ۝ وَّاَنَّ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا ۝

(حقیقت یہ ہے کہ یہ قرآن وہ راہ دکھاتا ہے جو بالکل سیدھی ہے۔ اور وہ بشارت دیتا ہے ان ایمان لانے والوں کو جو صالح اعمال کرے، بیشک ان کے لیے بڑا اجر ہے۔ ۹) اور بیشک جو لوگ آخرت کو نہ مانیں انھیں یہ خبر دیتا ہے کہ ان کے لیے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ ۱۰) (سورۃ بنیٓ اسرآءِیل : ۹۔۱۰)

امتِ مسلمہ کی قسمت قرآنِ کریم سے وابستہ ہے

امتِ مسلمہ سے پہلے وہ امت جس کے سر پر امامت کا تاج رکھا گیا اور دنیا کی قیادت اس کے سپرد کی گئی وہ امتِ بنی اسرائیل تھی جن کی رہنمائی کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسا جلیل القدر پیغمبر بھیجا اور تورات جیسی کتاب اتاری اور ساتھ ہی یہ حکم دیا کہ تورات اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سنت بنی اسرائیل کے لیے رہنمائی کا حقیقی ماخذ ہیں۔ دیکھنا ان کی طرف سے غفلت نہ برتنا اور اللہ تعالیٰ کی ذات تمھارے لیے وکیل،

Marfat.com

کارساز، جائے پناہ، قوت کا سرچشمہ اور ماویٰ وملجا ہے۔ اس کے سوا کسی اور کو وکیل نہ بنانا۔ رہنمائی بھی اسی سے لینا اور بھروسہ بھی اسی پر کرنا۔ سر بھی اسی کے سامنے جھکانا اور اطاعت بھی اسی کی کرنا۔ جب تک تم اس روش کے پابند رہو گے اور اس عہد کو مضبوطی سے تھامے رہو گے، اس وقت تک دنیا کی کوئی قوم تم پر غالب نہیں آسکے گی اور تم ہی سربلند رہو گے۔ لیکن اگر تم نے کتاب وسنت کو پسِ پشت ڈال دیا اور اللہ تعالیٰ کے عہد سے روگردانی کی تو پھر دنیا کی قوموں کے ہاتھوں بار بار تمھیں سزا دلوائی جائے گی۔ لیکن اس کے بعد بنی اسرائیل نے جو کچھ کیا، قرآنِ کریم نے اس کی طرف اشارے کیے اور بائبل نے اس کہانی کو تفصیل سے اپنے صفحات پر پھیلایا اور ان کے رویئے کی پاداش میں جو سزائیں ان پر مسلط ہوتی رہیں اس کی پوری تفصیل تاریخ کے حوالے کردی۔ پروردگار نے اس کا حوالہ دے کر ارشاد فرمایا کہ جس طرح بنی اسرائیل کی تاریخ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اسوۂ حسنہ اور تورات کی تعلیم سے شروع ہوئی تھی اسی طرح امتِ مسلمہ کی تاریخ بھی نبی کریم ﷺ کی حیاتِ طیبہ اور اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب یعنی قرآنِ کریم سے شروع ہورہی ہے۔ اب قیامت تک انسانوں کی بھلائی اور اقدارِ انسانیت کی بقا اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کا دارومدار انہی دونوں سرچشموں پر ہے۔ اس آیتِ کریمہ میں بنی اسرائیل، مشرکینِ مکہ اور تمام دنیا کو دعوت دی جارہی ہے کہ اہلِ دنیا نے زندگی گزارنے کے لیے مختلف راستے تجویز کر رکھے ہیں اور مختلف پگڈنڈیاں بنا رکھی ہیں، لیکن انسانی تجربے نے ثابت کردیا ہے کہ ان میں سے کوئی بھی صراطِ مستقیم نہیں، ان میں سے کوئی بھی ایسا راستہ نہیں جو اللہ تعالیٰ تک پہنچانے والا ہو۔ ان پر چلنے والے پیچ در پیچ وادیوں میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔ اس لیے کہ رہنمائی کے لیے جو کتابیں آسمانوں سے اتریں وہ وقت کے ساتھ ساتھ تحریف اور ترمیم کی نذر ہوگئیں۔ بہت ساری کتابیں تاریخ کی دھول میں گم ہوگئیں اور جن کے محفوظ ہونے کا دعویٰ ہے، وہ حفاظت کے معیار پر پوری نہیں اترتیں اور جہاں تک انسانی کاوشوں کا تعلق ہے، وہ انسان کے اجتماعی ضمیر تک پہنچنے کی صلاحیت نہیں رکھتیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے وہ کتاب اپنے آخری رسول پر اتاری ہے جو قیامت تک باقی رہے گی اور جس کی تازگی اور شادابی پر کبھی کہنگی طاری نہیں ہوگی، جس کی رہنمائی کبھی نارسائی کا شکار نہیں ہوگی، جو انسانیت کی پیاس بجھانے کے لیے کبھی کم مائیگی کا شکار نہیں ہوگی بلکہ وقت جیسے جیسے آگے بڑھتا جارہا ہے اور نئے نئے مسائل پیدا ہوتے جارہے ہیں، قرآنِ حکیم کی ضرورت بھی بڑھتی جارہی ہے۔ کسی شاعر نے ٹھیک کہا۔

یہ بزمِ آب و گل جتنی کہ برہم ہوتی جاتی ہے
محمد کی شریعت اور محکم ہوتی جاتی ہے

یہ کتاب نہایت ذمہ داری کے ساتھ اپنے ماننے والوں کو ضمانت دیتی ہے کہ تم اگر اس کی تعلیمات کے مطابق زندگی گزارو تو تمھاری یہ حیات، حیاتِ طیبہ بن جائے گی اور تمھاری آخرت بھی سدھر جائے گی اور ساتھ ہی یہ تنبیہ بھی کرتی ہے کہ جو اس کتاب کے دیے ہوئے بنیادی تصور یعنی آخرت میں جوابدہی کو ماننے سے انکار کریں گے، ان کی دنیا بھی ہمیشہ مسائل کا شکار رہے گی اور آخرت میں انھیں جہنم کے عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا۔

وَيَدْعُ الْاِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَآءَهٗ بِالْخَيْرِ ؕ
وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا ﴿۱۱﴾ وَجَعَلْنَا الَّيْلَ وَالنَّهَارَ اٰيَتَيْنِ
فَمَحَوْنَآ اٰيَةَ الَّيْلِ وَجَعَلْنَآ اٰيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِّتَبْتَغُوْا فَضْلًا
مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ ؕ وَكُلَّ شَيْءٍ
فَصَّلْنٰهُ تَفْصِيْلًا ﴿۱۲﴾ وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ ؕ

Marfat.com

وَنُخۡرِجُ لَهٗ یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ کِتٰبًا یَّلۡقٰىهُ مَنۡشُوۡرًا ﴿۱۳﴾ اِقۡرَاۡ کِتٰبَكَ ؕ
کَفٰی بِنَفۡسِكَ الۡیَوۡمَ عَلَیۡكَ حَسِیۡبًا ﴿۱۴﴾ ؕ مَنِ اهۡتَدٰی فَاِنَّمَا
یَهۡتَدِیۡ لِنَفۡسِهٖ ۚ وَمَنۡ ضَلَّ فَاِنَّمَا یَضِلُّ عَلَیۡهَا ؕ وَلَا تَزِرُ
وَازِرَةٌ وِّزۡرَ اُخۡرٰی ؕ وَمَا کُنَّا مُعَذِّبِیۡنَ حَتّٰی نَبۡعَثَ رَسُوۡلًا ﴿۱۵﴾
وَاِذَاۤ اَرَدۡنَاۤ اَنۡ نُّهۡلِكَ قَرۡیَةً اَمَرۡنَا مُتۡرَفِیۡهَا فَفَسَقُوۡا فِیۡهَا
فَحَقَّ عَلَیۡهَا الۡقَوۡلُ فَدَمَّرۡنٰهَا تَدۡمِیۡرًا ﴿۱۶﴾ وَکَمۡ اَهۡلَکۡنَا مِنَ
الۡقُرُوۡنِ مِنۡۢ بَعۡدِ نُوۡحٍ ؕ وَکَفٰی بِرَبِّكَ بِذُنُوۡبِ عِبَادِهٖ خَبِیۡرًۢا
بَصِیۡرًا ﴿۱۷﴾ مَنۡ کَانَ یُرِیۡدُ الۡعَاجِلَةَ عَجَّلۡنَا لَهٗ فِیۡهَا مَا نَشَآءُ
لِمَنۡ نُّرِیۡدُ ثُمَّ جَعَلۡنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ یَصۡلٰىهَا مَذۡمُوۡمًا
مَّدۡحُوۡرًا ﴿۱۸﴾ وَمَنۡ اَرَادَ الۡاٰخِرَةَ وَسَعٰی لَهَا سَعۡیَهَا وَهُوَ
مُؤۡمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ کَانَ سَعۡیُهُمۡ مَّشۡکُوۡرًا ﴿۱۹﴾ کُلًّا نُّمِدُّ هٰۤؤُلَآءِ
وَهٰۤؤُلَآءِ مِنۡ عَطَآءِ رَبِّكَ ؕ وَمَا کَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحۡظُوۡرًا ﴿۲۰﴾
اُنۡظُرۡ کَیۡفَ فَضَّلۡنَا بَعۡضَهُمۡ عَلٰی بَعۡضٍ ؕ وَلَلۡاٰخِرَةُ اَکۡبَرُ
دَرَجٰتٍ وَّاَکۡبَرُ تَفۡضِیۡلًا ﴿۲۱﴾ لَا تَجۡعَلۡ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَقۡعُدَ
مَذۡمُوۡمًا مَّخۡذُوۡلًا ﴿۲۲﴾ ع

Marfat.com

رکوع: ۲۔ (اورانسان برائی کا اس طرح طالب بنتا ہے جس طرح اس کو بھلائی کا طالب بننا چاہیے، اور انسان بڑا ہی جلد باز ہے۔ ۱۱) ہم نے رات اور دن کو دو نشانیاں بنایا، سو ہم نے رات کی نشانی دھندلی کردی اور ہم نے دن کی نشانی کو روشن بنایا تا کہ تم اپنے رب کے فضل کے لیے کوشش کرو، اور تا کہ تم سالوں کی تعداد اور حساب معلوم کرسکو اور ہم نے ہر چیز کی پوری پوری تفصیل کردی ہے۔ ۱۲) اور ہم نے ہر انسان کا نصیبہ اس کے گلے کے ساتھ باندھ دیا ہے اور ہم قیامت کے روز اس کے لیے ایک رجسٹر نکالیں گے جس کو وہ بالکل کھلا ہوا پائے گا۔ ۱۳) لو پڑھ لو اپنا اعمال نامہ، آج تم خود ہی اپنا حساب کر لینے کے لیے کافی ہو۔ ۱۴) جو ہدایت کی راہ چلتا ہے تو وہ اپنے ہی لیے ہدایت کی راہ چلتا ہے اور جو گمراہی اختیار کرتا ہے تو وہ اپنے ہی اوپر وبال لاتا ہے اور کوئی جان کسی دوسری جان کا بوجھ اٹھانے والی نہیں بنے گی اور ہم عذاب دینے والے نہیں تھے جب تک کسی رسول کو بھیج نہ دیں۔ ۱۵) اور جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں تو ہم اس کے خوشحالوں کو امر کردیتے ہیں تو وہ اس میں خوب اودھم مچاتے ہیں، پس ان پر بات پوری ہو جاتی ہے، پھر ہم ان کو یک قلم نیست و نابود کر کے رکھ دیتے ہیں۔ ۱۶) اور نوح علیہ السلام کے بعد ہم نے کتنی ہی قومیں ہلاک کردیں اور تمھارا رب اپنے بندوں کے گناہوں سے باخبر رہنے اور ان کو دیکھنے کے لیے کافی ہے۔ ۱۷) جو دنیا ہی کا طالب بنتا ہے ہم اس کے لیے اسی میں جس قدر چاہتے ہیں جس کے لیے چاہتے ہیں آگے بڑھا دیتے ہیں، پھر ہم نے اس کے لیے جہنم رکھ چھوڑی ہے جس میں وہ خوار اور راندہ ہو کر داخل ہوگا۔ ۱۸) اور جو شخص آخرت کا طلبگار ہوتا ہے اور اس کے لیے پوری طرح جدوجہد کرتا ہے درانحالیکہ وہ مومن بھی ہو، پس یہی وہ لوگ ہیں جن کی کوشش مقبول ہوگی۔ ۱۹) ہر ایک کی ہم امداد کرتے ہیں، اُن کی بھی اور اِن کی بھی، آپؐ کے رب کی بخششوں سے اور آپؐ کے رب کی بخشش کسی پر بند نہیں۔ ۲۰) دیکھو ہم نے اِن کے ایک کو دوسرے پر کس طرح فضیلت دے رکھی ہے اور آخرت درجات اور فضیلت کے اعتبار سے کہیں بڑھ کر ہے۔ ۲۱) اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو شریک نہ کر، ورنہ تو سزاوار مذمت اور بے یار و مددگار ہو کر رہ جائے گا۔ ۲۲)

وَيَدۡعُ الۡاِنۡسَانُ بِالشَّرِّ دُعَآءَهٗ بِالۡخَيۡرِ ؕ وَكَانَ الۡاِنۡسَانُ عَجُوۡلًا ۝۱۱ (سورۃ بنیٓ اسرآءِیل : ۱۱)

(اور انسان برائی کا اس طرح طالب بنتا ہے جس طرح اس کو بھلائی کا طالب بننا چاہیے، اور انسان بڑا ہی جلد باز ہے۔ ۱۱)

مخالفین کا طرزِ عمل

روئے سخن قرآنِ کریم کے مخالفین کی طرف ہے جن کا طریقہ یہ تھا کہ بجائے آنحضرت ﷺ کی دعوت کو قبول کرنے یا اس پر سنجیدگی سے غور کرنے کے وہ اپنے خبثِ باطن کے اظہار یا آنحضرت ﷺ کو زچ کرنے کے لیے بار بار عذاب کا مطالبہ کرتے۔ نبی کریم ﷺ از راہِ ہمدردی و غمخواری جب انھیں یہ سمجھاتے کہ تم اللہ تعالیٰ کے دین کو مذاق مت سمجھو، اسی دین سے تمھاری زندگی وابستہ ہے، اسی سے تمھاری دنیا کی کامیابیاں ہیں اور اسی سے اخروی سعادتیں متعلق ہیں۔ اگر تم نے اسے قبول کرنے کی بجائے اس سے تمسخر کا رویہ جاری رکھا تو مجھے اندیشہ ہے کہ پہلی امتوں کی طرح تم پر اللہ تعالیٰ کا عذاب نہ ٹوٹے، تو وہ بدبخت بجائے اس سے فکرمند ہونے کے اس کا مذاق اڑاتے اور جب بھی آپؐ ان سے مخاطب ہوتے تو وہ عذاب کی بحث چھیڑ کے

Marfat.com

بیٹھ جاتے تو ان کی حماقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پروردگار ارشاد فرما رہے ہیں کہ انسان کا بھی عجیب حال ہے، وہ بجائے خیر کے طالب ہونے کے برائی طلب کرتا ہے، یعنی بجائے اس کے کہ وہ آگے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کے دین کو قبول کرے وہ اس کی بجائے عذاب کو دعوت دے رہا ہے حالانکہ بجائے خود یہ چیز کس قدر احمقانہ ہے اور مزید یہ فرمایا کہ نبی کریم ﷺ بار بار انھیں یہ بات سمجھا چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب کوئی کھیل نہیں، وہ تو زندگی کی جڑ اکھاڑ کے رکھ دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تو مخلوقات کے لیے انتہائی رحیم و کریم ہے اور انسان تو تمام مخلوقات میں گلِ سر سبد کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے کبھی بھی وہ انسانوں کو سزا دینے میں جلدی نہیں کرتا۔ مہلت پہ مہلت دیتا چلا جاتا ہے، لیکن جب وہ دیکھتا ہے (اور اس کا علم یقیناً ہر طرح کی غلطی سے پاک ہے) کہ اب ان لوگوں میں ایمان لانے کی کوئی رمق باقی نہیں رہی تو پھر وہ سزا دینے میں تامل نہیں کرتا۔ اس وقت یہ لوگ مہلت کے دور سے گزر رہے ہیں۔ بجائے اس کے کہ یہ اس سے فائدہ اٹھائیں وہ اور دلیر ہوتے جارہے ہیں لیکن انھیں اندازہ نہیں کہ ان کی جلد بازیاں، ان کے لیے کہیں تباہی کا باعث نہ بن جائیں۔

وَجَعَلْنَا الَّيْلَ وَالنَّهَارَ اٰيَتَيْنِ فَمَحَوْنَآ اٰيَةَ الَّيْلِ وَجَعَلْنَآ اٰيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِّتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ ؕ وَكُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِيْلًا ﴿۱۲﴾ (سورۃ بنیٓ اسرآءِیل : ۱۲)

(ہم نے رات اور دن کو دو نشانیاں بنایا، سو ہم نے رات کی نشانی دھندلی کر دی اور ہم نے دن کی نشانی کو روشن بنایا تاکہ تم اپنے رب کے فضل کے لیے کوشش کرو، اور تاکہ تم سالوں کی تعداد اور حساب معلوم کر سکو اور ہم نے ہر چیز کی پوری پوری تفصیل کر دی ہے۔ ۱۲)

ہدایت کے حصول کے لیے یہ نشانیاں کافی ہیں

آیتِ کریمہ کی تالیف و ترکیب پر غور کیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ فَمَحَوْنَآ اٰيَةَ الَّيْلِ کے بعد مُظْلِمَةً لِتَسْتَرِيْحُوْا یا اس کے ہم معنی الفاظ محذوف ہیں جن پر بعد کے الفاظ مُبْصِرَةً لِّتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ دلالت کر رہے ہیں۔

آیتِ کریمہ میں یہ فرمایا گیا ہے کہ تم یہ جاننے کے لیے کہ نبی کریم ﷺ اللہ تعالیٰ کے رسولؐ ہیں یا نہیں، اور آپؐ کا لایا ہوا دین سچا ہے یا جھوٹا۔ تم اس کے لیے بار بار کوئی نہ کوئی نشانی دیکھنا چاہتے ہو حتیٰ کہ عذاب کو بھی بطور نشانی طلب کرتے ہو۔ ان سے فرمایا جارہا ہے کہ تمھیں اگر کوئی نشانی ہی دیکھنا ہے تو یہ کیا ضرور ہے کہ تم عذاب ہی کی نشانی مانگو۔ کیا آفاقی نشانیاں کم ہیں؟ کائنات میں جدھر نظر دوڑاؤ، ایک سے ایک بڑھ کر نشانی دکھائی دیتی ہے۔ تم شب و روز کے طلوع و غروب کو دیکھو، اس سے بڑھ کر اور کیا نشانی درکار ہے۔ سورج کا وجود، اس سے نکلنے والی روشنی، اس کی حدت اور گرمی سے انسانی غذا کا تیار ہونا، پھر اسی کی کرنوں سے بادلوں کا وجود میں آنا، پھر اسی کی سیرابی سے پودوں کا پھلنا اور پھولنا، پھر اسی سے انسانی زندگی کے چولہے کا جلنا اور انسانی گاڑی کے پہیئے کا رواں دواں رہنا، ان میں سے کون سی چیز ہے جس سے بہتر اور کوئی نشانی ہو سکتی ہے۔ اور پھر اسی کے طلوع و غروب سے شب و روز کا وجود میں آنا، دن کی روشنی میں تمام انسانی امور کا انجام پانا اور انسانی سرگرمیوں کو بروئے کار آنے کا موقع ملنا، اور اس کے غروب سے سکون اور اطمینان کا در وا ہونا اور انسان کی قوتِ کارکردگی کی بحالی کا راستہ کھلنا اور آرام و راحت کے لیے پرسکون ماحول کا میسر آنا، کیسی حیرت میں ڈالنے والی نشانیاں ہیں کہ سورج نکلتا ہے تو معاشی سرگرمیوں کا دروازہ کھل جاتا ہے اور ڈوبتا ہے تو انسان کے لیے سکون کا پیغام لاتا ہے۔

حاصل کلام یہ کہ آدمی اگر دیدۂ بینا رکھتا ہو تو اس کی ہر شام، شامِ اودھ ہے اور اس کی ہر صبح، صبحِ بنارس ہے۔ ایسی نشانیوں کے ہوتے ہوئے اور نشانی مانگنا بے ذوقی کے سوا اور کیا ہے۔

مزید فرمایا کہ یہ بھی کیا کم نشانی ہے کہ سورج کے طلوع و غروب سے تم مہینوں اور سالوں کا حساب بھی معلوم کر لیتے ہو اور دوسرے حساب بھی جان لیتے ہو اور اگر یہ روز و شب کا فرق نہ ہوتا تو کسی چیز کے تعین کے لیے تم نشان اور علامتِ امتیاز کس چیز کو ٹھہراتے۔

اور مزید ہمارا احسان یہ ہے کہ زندگی کی الجھنوں میں رہنمائی کے لیے ہم نے جو کتاب اتاری ہے اس میں ہر چیز کی تفصیل بیان کر دی ہے تاکہ غور کرنے والے کے اطمینان کے لیے یہ کتاب ہی کافی ہو جائے۔

Marfat.com

وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِیْ عُنُقِهٖ ؕ وَنُخْرِجُ لَهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ كِتٰبًا یَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا ﴿۱۳﴾ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ؕ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْیَوْمَ عَلَیْكَ حَسِیْبًا ﴿ؕ۱۴﴾ (سورة بنیٓ اسرآءِیل : ۱۳، ۱۴)

(اور ہم نے ہر انسان کا نصیبہ اس کے گلے کے ساتھ باندھ دیا ہے اور ہم قیامت کے روز اس کے لیے ایک رجسٹر نکالیں گے جس کو وہ بالکل کھلا ہوا پائے گا۔ ۱۳) لو پڑھ لو اپنا اعمال نامہ، آج تم خود ہی اپنا حساب کر لینے کے لیے کافی ہو۔ ۱۴)

انسانوں کی فلاح وخسران کا مدار حُسنِ کردار پر ہے

عربی زبان میں طائر کا لفظ پرندہ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، لیکن اہلِ عرب دوسری مشرک قوموں کی طرح چونکہ پرندوں سے فال بھی لیتے تھے، اس وجہ سے یہ لفظ رفتہ رفتہ قسمت، حظ اور نصیبہ کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔

جیسا کہ عرض کیا کہ اہلِ عرب فالوں اور شگونوں کے بڑے معترف تھے۔ اسی میں وہ اپنی قسمت تلاش کرتے تھے۔ وہ کہیں جانے کا ارادہ کرتے یا کسی کام کرنے کا سوچتے تو اگر بلی راستہ کاٹ جاتی یا کوا آکر منڈیر پر بولنے لگتا یا صبح سویرے پرندوں کی آوازیں کانوں میں پڑنے لگتیں تو وہ اس سے اندیشہ ہائے دور دراز میں مبتلا ہو جاتے اور عموماً اس کام سے رک جاتے جس کا وہ ارادہ کر چکے ہوتے۔ قرآنِ کریم کے نزول سے اللہ تعالیٰ نے جو انسانوں کو ہدایات عطا فرمائی ہیں ان میں بنیادی بات یہ ہے کہ انسانوں کی فلاح وخسران کا انحصار طوطے کوے اور بلی چوہے پر نہیں بلکہ ان کے اپنے اعمال پر ہے۔ انسان کے زندگی کے وہ معاملات جن کا تعلق تکوین سے ہے ان کا سر رشتہ تو اللہ تعالیٰ کی حکمت کے ہاتھ میں ہے۔ رہے وہ معاملات جس سے انسان کی کامیابی یا ناکامی وجود میں آتی ہے اور جو انسان کی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں ان کا تعلق انسانی کردار سے ہے۔ اس لیے بجائے اس کے کہ آدمی غلط طریقوں سے اپنی قسمت معلوم کرتا پھرے اسے یہ دیکھنا چاہیے کہ میرے اعمال کیسے ہیں، میرے ایمان کی کیفیت کیا ہے، حقوق اللہ اور حقوق العباد کے ادا کرنے میں میرے عزم وحوصلہ کا عالم کیا ہے، میں اسلام اور خلقِ خدا کی طرف سے عائد ہونے والی ذمہ داریوں کو کس نگاہ سے دیکھتا ہوں۔

یہی چیزیں ہیں جن سے نامۂ اعمال تیار ہوتا ہے اور یہ نامۂ اعمال ہے جو ہر وقت انسان کی گردن میں معلق رہتا ہے یعنی ہر وقت اس کے ساتھ رہتا ہے اور یہی نامۂ اعمال قیامت کے دن ہر شخص کے ہاتھوں میں اس طرح دیا جائے گا کہ اس کا ایک ایک ورق کھلا ہوگا جسے وہ بڑی آسانی سے پڑھ سکے گا۔

یہی اعمال ہیں جن سے انسان کی دنیا بنتی ہے۔ اسی سے انسان عزت کے راستے پر چلتا ہے اور اسی کے نتیجے میں ذلت مقدر ہوتی ہے۔ اپنی ہی بداعمالیاں ہیں جو بعض دفعہ مصیبتوں کا باعث بنتی ہیں اور جب آدمی اللہ تعالیٰ کے سامنے شکایت کرتا ہے تو ادھر سے آواز آتی ہے ؎

جب میں کہتا ہوں کہ یا اللہ میرا حال دیکھ
حکم ہوتا ہے کہ اپنا نامۂ اعمال دیکھ

دنیا میں بھی اسی نامۂ اعمال کو دیکھنے کی ہدایت ہوتی ہے کہ تم اپنی بدحالی کی شکایت کرنے کی بجائے اپنے اعمال کی اصلاح کی فکر کرو۔ اسی کے نتیجے میں تمہاری دنیا کے احوال بدلیں گے۔ کتنی احادیث ہیں جن میں فرمایا گیا ہے کہ رزق میں تنگی، بارشوں کا وقت پر نہ اترنا، وباؤں کا پھوٹ پڑنا، حادثاتی موتوں کا بڑھ جانا، باہمی تعلقات کا بگڑ جانا، ملکی حالات کا غیر مستحکم ہو جانا، دشمن کا حملہ کر دینا اور ظالم حکمرانوں کا مسلط ہو جانا وغیرہ یہ سب انسانوں کی بداعمالیوں کا پھل ہیں۔ لیکن جب آدمی اپنے اعمال کی اصلاح کر لیتا ہے اور اس کی زندگی اسلامی شریعت کے اتباع میں گزرتی ہے تو حضرت عمر فاروق ؓ کی طرح بڑے ناز سے زمین پر پاؤں مار کر کہہ سکتا ہے (جب زمین میں زلزلہ آیا) ارے زمین تو کانپتی ہے، کیا میں نے تجھ پر عدل نہیں کیا؟

اسی طرح قیامت کے دن بھی انسان جب اپنے انجام کی فکر میں ہوگا تو اس کا نامۂ اعمال ہی اس کے ہاتھوں میں دیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ اسے پڑھ کے دیکھو۔ اسے پڑھنے کے بعد تم خود اپنا حساب کرنے کے لیے کافی ہو۔ تم خود اندازہ کر سکتے ہو کہ تمہارا یہ نامۂ اعمال تمہیں جنت کا راستہ دکھاتا ہے یا جہنم کا۔ غور فرمایئے، وہ معاشرہ جس میں صرف انتسابات کا سکہ چلتا تھا، حسب، نسب اور دولت رائج الوقت سکے تھے۔ اس میں قرآنِ کریم نے کیسا انقلاب آفریں اعلان فرمایا کہ آج کے بعد انتسابات نہیں چلیں گے، صرف کردار کا سکہ چلے گا، تقویٰ کی بات سنی جائے گی، محنت برگ وبار لائے گی، صاحبِ صلاحیت اپنی صلاحیت کے بل بوتے پر اپنے لیے راستہ بنائے گا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ایک ہندو شاعر بھی تسلیم کرنے پر مجبور ہوا

Marfat.com

جس کی حکمت نے یتیموں کو کیا دُرِّ یتیم
اور غلاموں کو زمانے بھر کا مولا کر دیا

مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۭ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۭ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ﴿۱۵﴾ (سورۃ بنیٓ اسرآءِیل : ۱۵)

(جو ہدایت کی راہ چلتا ہے تو وہ اپنے ہی لیے ہدایت کی راہ چلتا ہے اور جو گمراہی اختیار کرتا ہے تو وہ اپنے ہی اوپر وبال لاتا ہے اور کوئی جان کسی دوسری جان کا بوجھ اٹھانے والی نہیں بنے گی اور ہم عذاب دینے والے نہیں تھے جب تک کسی رسول کو بھیج نہ دیں۔ ۱۵)

ایک اور رعد آسا اعلان

یہ ایک اور رعد آسا قرآنِ کریم کا اعلان ہے جس نے عرب کی دھرتی کو ہلا کے رکھ دیا اور ان کی زندگی کی کامیابی و ناکامی کے تمام معیارات کو بدل ڈالا۔ حقیقت میں سابقہ آیتِ کریمہ میں جو کچھ فرمایا گیا ہے یہ اسی کی تائید اور تکمیل ہے۔

جو شخص ہدایت کا راستہ اختیار کرتا ہے وہ اپنے بھلے کے لیے کرتا ہے اور جو گمراہ ہوتا ہے اس کا وبال اسی پر پڑتا ہے۔ ہدایت اختیار کرنے والا کسی پر احسان نہیں کرتا اور گمراہی کا راستہ اختیار کرنے والا کسی کا کچھ نہیں بگاڑتا۔ اس لیے ہر آدمی کو یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ ہر انسان اپنی ایک مستقل اخلاقی ذمہ داری رکھتا ہے اور اپنی شخصی حیثیت میں اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہ ہے۔ اس ذاتی ذمہ داری میں کوئی دوسرا اس کے ساتھ شریک نہیں۔ اگر وہ کسی کے پیچھے لگ کے بگڑتا ہے تو اس کی ذمہ داری بھی اسی پر ہے۔ اور اگر وہ کسی کی دعوت کو قبول کر کے صحیح راستہ اختیار کرتا ہے تو وہ اس پر احسان نہیں کرتا بلکہ اپنے بھلے کے لیے سب کچھ کرتا ہے۔ اس لیے یہ تصور ذہن میں پیدا نہیں ہونا چاہیے کہ میرے بناؤ بگاڑ کا ذمہ دار فلاں شخص ہے بلکہ اس پر یقین رکھنا چاہیے کہ کوئی شخص بھی کسی کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ نہ کوئی کسی شخص کی کسی اچھائی میں کام آئے گا اور نہ کسی کی برائیاں اپنے سر لے گا۔ ہر لحاظ سے انسان اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے۔ یہ صحیح ہے کہ وہ اپنے گردوپیش سے بے نیاز نہیں رہ سکتا' لیکن یہ بات اس سے زیادہ صحیح ہے کہ اسے ہر وقت نگاہ اپنے اعمال پر رکھنی چاہیے کہ وہ خود کیا کر رہا ہے؟ یہ ذمہ داری تو ایک مسلمان پر ضرور ہے کہ وہ دوسروں کی اصلاح کی کوشش کرے۔ لیکن اس سے بھی پہلے اپنی اصلاح اس کے لیے زیادہ ضروری ہے۔ ایک آدمی اگر بیمار ہوتا ہے تو وہ جب بھی بات کرتا ہے تو اپنی بیماری کی کرتا ہے۔ ڈاکٹر کے پاس جائے گا تو اپنا علاج چاہے گا۔ ہسپتال میں اگر داخل کر دیا جائے تو اس کی خواہش یہ ہوگی کہ ڈاکٹر صاحب مجھ پر زیادہ توجہ دیں۔ اس کے دائیں بائیں لیٹے ہوئے مریض چاہے کیسی تکلیف میں ہوں لیکن اس کی خواہش یہی ہوگی کہ توجہ کا مرکز مجھے بنایا جائے۔ تو جس طرح ایک بیمار پہلے اپنی بیماری کی فکر کرتا ہے اسی طرح انسان کو ہر حال میں اپنے عمل کی فکر ہونی چاہیے۔ جس شخص یا جس قوم میں دوسروں کی برائیاں گننے کی عادت پڑ جائے اور اپنی طرف کبھی التفات نہ ہو اس کی تباہی اور بربادی کو دنیا کا کوئی عقل مند نہیں روک سکتا۔ اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''ہلک من قال ہلک الناس اوکما قال علیہ السلام'' (وہ شخص ہلاک ہو گیا جس شخص نے کہا کہ سب لوگ ہلاک ہو گئے) جیسے ہماری عادت ہے ہم ہمیشہ اس طرح کے جملے بولتے ہیں کہ ''سارا معاشرہ بگڑ گیا' ساری قوم تباہ ہو گئی'' لیکن کبھی اپنے اعمال کی فکر کرنے کی زحمت نہیں کرتے۔ حالانکہ اصلاح کا آغاز اپنی ذات سے ہونا چاہیے۔ یہ پہلا قدم اٹھے گا تو دوسرے قدم کے اٹھنے کی باری آئے گی۔

اس اساسی حقیقت کو بیان کرنے کے بعد آیتِ کریمہ کے آخر میں ایک ایسی بات ارشاد فرمائی گئی ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی حکمت اور رحمت کا اظہار ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہدایت اختیار کرنا یقیناً ہر شخص کی اپنی ذمہ داری ہے اور کوئی دوسرا شخص کسی کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا' لیکن یہ سراسر اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کی حکمت کا تقاضا ہے کہ جب لوگ اپنی ذاتی ذمہ داریاں ادا کرنے سے پہلو تہی کرتے ہیں تو بجائے عذاب دینے کے اپنا رسول بھیجتا ہے جو ان بے پرواہ اور گمراہ لوگوں کو راہِ راست پر لانے کی حتی المقدور کوشش کرتا ہے۔ اپنی پوری شخصیت کو اس کام میں جھونک دیتا ہے۔ تبلیغ و دعوت اور

Marfat.com

انذار و تبشیر کا کوئی طریقہ ایسا باقی نہیں رہتا جس سے وہ کام نہیں لیتا۔ اب اگر اس کے مخاطب لوگ بات سمجھنے اور راہِ راست اختیار کرنے کی بجائے اس کی جان لینے کے درپے ہو جاتے ہیں اور اپنے عمل سے ثابت کر دیتے ہیں کہ وہ کسی قیمت پر بھی حق کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہے تو تب اللہ تعالیٰ کا عذاب اس قوم پر اس طرح نازل ہوتا ہے کہ اس کی جڑ کاٹ کر رکھ دیتا ہے۔

وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا ۝١٦

(اور جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں تو ہم اس کے خوشحالوں کو امر کر دیتے ہیں تو وہ اس میں خوب اودھم مچاتے ہیں، پس ان پر بات پوری ہو جاتی ہے، پھر ہم ان کو یک قلم نیست و نابود کر کے رکھ دیتے ہیں۔ ۱۶) (سورۃ بنیٓ اسرآءِیل : ۱۶)

قوموں کی تباہی کا آخری سبب

اس آیتِ کریمہ میں اَمَرْنَا کا لفظ تحقیق طلب ہے۔ بعض علما کا خیال ہے کہ یہ اَمَرْنَا بمعنی اَمَّرْنَا ہے۔ یعنی ہم اس علاقہ کی حکومت سرکش اہلِ ثروت کے حوالے کر دیتے ہیں اور وہ دولت و اقتدار کے باعث فسق و فجور کا بازار گرم کر دیتے ہیں۔ بعض علما کی رائے یہ ہے کہ اَمَرْنَا کا معنی اَكْثَرْنَا ہے، لیکن بعض اہلِ لغت کا خیال ہے کہ اَمَرَ صرف حکم دینے کے ہی معنی میں نہیں آتا بلکہ بسا اوقات کسی کو ڈھیلا چھوڑ دینے اور مہلت دینے کے مفہوم میں بھی آتا ہے۔ آپ کسی شخص یا گروہ سے افہام و تفہیم کی کوشش کرنے کے بعد جب تنگ آ جاتے ہیں تو کہہ دیتے ہیں کہ جاؤ جو جی میں آئے کرو، بظاہر یہ امر ہی کا صیغہ استعمال ہوا ہے لیکن اس کا مفہوم حکم دینا نہیں بلکہ مہلت دینا ہوتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ بھی سرکش لوگوں پر اپنی حجت قائم کر چکنے کے بعد ان کو ڈھیلا چھوڑ دیتا ہے کہ وہ اپنا پیمانہ اچھی طرح سے بھر لیں۔

حقیقت میں معاشرے کے بگاڑ اور تباہی کے اسباب تو کئی ایک ہیں، لیکن ان میں وہ سبب جو کسی قوم کی تباہی و بربادی کے لیے فیصلہ کن ثابت ہوتا ہے وہ خوشحال، با اثر اور صاحب اقتدار لوگوں کا فسق و فجور میں مبتلا ہونا ہے۔ عوام اگر بگڑتے ہیں تو خواص ان کی اصلاح کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر نصیحت سے کام نہیں چلتا تو اہلِ اقتدار طاقت سے برائی کو ختم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ با اثر طبقہ ہمیشہ عوام کو فیڈ کرتا ہے۔ یعنی وہ لوگوں کے لیے رہنمائی فراہم کرتا ہے کہ صحیح کیا ہے اور غلط کیا ہے؟ تاکہ لوگ صحیح کو اختیار کریں اور غلط کو چھوڑ دیں۔ کبھی وہ یہ کام تعلیمی ادارے قائم کر کے کرتا ہے اور کبھی مختلف تقریبات کے ذریعے، کبھی مختلف طریقوں سے تہوار منا کر اور کبھی ثقافت کے نام سے مختلف مظاہرِ تہذیب اختیار کر کے۔ مختصر یہ کہ یہی طبقہ ہے جو ہر لحاظ سے خیالات کے ذریعے، پراپیگنڈے کے زور سے یا اثر و اقتدار کے بل بوتے پر عوام کو اپنی مرضی پر چلانے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن اگر یہ طبقہ بگڑ جائے تو پھر اس قوم کے سدھرنے کے امکانات بہت کم رہ جاتے ہیں۔ پھر ان لوگوں کے اٹھائے ہوئے فتنے پوری قوم کے لیے آزمائش بن جاتے ہیں۔ لہٰذا جو معاشرہ آپ اپنا دشمن نہ ہوا ہو اسے فکر رکھنی چاہیے کہ اس کے ہاں اقتدار کی باگیں اور معاشی دولت کی کنجیاں کم ظرف اور بداخلاق لوگوں کے ہاتھوں میں نہ جانے پائیں۔

مترفین کا اثر و اقتدار تو ہر دور میں سب سے موثر عامل رہا ہے، لیکن جمہوری نظام کے آ جانے سے تو اس کی خطرناکی میں کہیں اضافہ ہو گیا ہے۔ دولت کے بل بوتے پر انسانوں کی خرید و فروخت ہوتی ہے، احتسابی ادارے دولت کے زور سے استعمال کیے جاتے ہیں، ذرائع ابلاغ دولت کے ذریعے مترفین کے لیے راہیں ہموار کرنے کا کام کرتے ہیں۔ پھر بظاہر عوام ہی کی رائے سے یہ لوگ اقتدار کے محلات میں داخل ہو جانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور وہاں بیٹھ کر اپنی بگڑی ہوئی فکر کے مطابق فیصلے کرتے ہیں جس کے مطابق عوام کو ڈھلنا پڑتا ہے۔ یہاں قرآنِ کریم مترفین کے بگاڑ کو بنیادی سبب قرار دے رہا ہے۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس کا ادراک مسلمانوں میں کب پیدا ہوگا۔

Marfat.com

وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْۢ بَعْدِ نُوْحٍ ؕ وَكَفٰى بِرَبِّكَ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًاۢ بَصِيْرًا ﴿۱۷﴾

(اور نوح علیہ السلام کے بعد ہم نے کتنی ہی قومیں ہلاک کر دیں اور تمھارا رب اپنے بندوں کے گناہوں سے باخبر رہنے اور ان کو دیکھنے کے لیے کافی ہے۔ ١٧) (سورۃ بنیٓ اسرآءِیل : ١٧)

سابقہ آیتِ کریمہ میں بستیوں میں بسنے والوں کی تباہی و ہلاکت کا جو اصول بیان فرمایا گیا ہے اس کی تائید میں قومِ نوح سے استشہاد کیا جا رہا ہے، کیونکہ نوح علیہ السلام اس دھرتی پر پہلے اللہ تعالیٰ کے رسولؑ تھے۔ اور انھیں آدمِ ثانی بھی کہا جاتا ہے کیونکہ طوفانِ نوح کی ہمہ گیر تباہی کے بعد انھیں کی اولاد اور ان کے ساتھ کشتی پر سوار ہونے والوں کی اولاد سے دنیا آباد ہوئی۔

حضرت نوح علیہ السلام نے سینکڑوں سال تک اپنی قوم کو سمجھایا، انھیں راہ راست پر لانے کی کوشش کی لیکن ان کے مترفین یعنی خوشحال طبقے نے اپنے اثرات سے قوم کی اکثریت کو بگاڑ کر رکھ دیا۔ آپؑ کی تمام تر مساعیٔ جمیلہ کے باوجود قوم کا غالب حصہ کفر پر قائم رہا۔ چنانچہ جب ان کے خوشحال طبقے نے بگاڑ کی کوشش کو انتہا تک پہنچا دیا تو تب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسا عذاب آیا جس نے سب کچھ تباہ کر کے رکھ دیا۔

مشرکینِ مکہ کو قومِ نوح کی بربادی کی طرف اشارہ کر کے سمجھایا جا رہا ہے کہ تم اس راستے پر مت چلو جس راستے پر چل کر یہ قوم برباد ہوئی اور تمھارا خوشحال طبقہ وہ رویہ اختیار نہ کرے جس رویئے نے قومِ نوح کو عذاب تک پہنچایا اور یہ خیال نہ کرو کہ اللہ تعالیٰ شاید تمھارے حالات سے بے خبر ہے، وہ تمھاری ایک ایک حالت کو جانتا ہے، وہ خبیر بھی ہے اور بصیر بھی ہے۔ وہ جس طرح تمھارے حالات سے واقف ہے، اسی طرح تمھارے حالات کا عینی شاہد بھی ہے۔ جب وہ وقت آ جائے گا جو قوموں پر عذاب کے لیے مقدر کیا گیا ہے تو پھر اہلِ عرب کا فیصلہ کرنے میں بھی تاخیر نہیں ہوگی۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلٰىهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا ﴿۱۸﴾

(جو دنیا ہی کا طالب بنتا ہے ہم اس کے لیے اسی میں جس قدر چاہتے ہیں جس کے لیے چاہتے ہیں آگے بڑھا دیتے ہیں، پھر ہم نے اس کے لیے جہنم رکھ چھوڑی ہے جس میں وہ خوار اور راندہ ہو کر داخل ہوگا۔ ١٨) (سورۃ بنیٓ اسرآءِیل : ١٨)

اعمال کے متعلق سنت الٰہی

گزشتہ آیات سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ انسان کی دنیا اور آخرت کی کامیابی کا دارومدار ایمان و عمل پر ہے۔ یہاں نہ حسب و نسب کام آتا ہے اور نہ کوئی دوسرا سہارا ساتھ دیتا ہے۔ ہر شخص کی ذمہ داری ہے کہ وہ صحیح راستہ اختیار کرے اور برے راستے سے اجتناب کرے۔ لیکن جو شخص اس بنیادی نصیحت کو قبول نہیں کرتا اور ہدایت کی بجائے ضلالت کا راستہ اختیار کرتا ہے اسے اللہ تعالیٰ سنبھلنے کا موقع تو دیتا ہے لیکن بالآخر اس کا انجام جہنم ہے۔ قوموں کے لیے بھی وہی قانون ہے جو افراد کے لیے ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کا مورد بالعموم قومیں بنتی ہیں۔ ایک ایک فرد اس کا ہدف نہیں ہوتا۔ اس سے بظاہر یہ غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے کہ اگر دنیا کی ناکامی بھی ایمان و عمل ہی کی رہینِ منت ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ کافر کو شاید وسیع رزق بھی نہیں مل سکتا، اس کی روزی بھی تنگ کر دی جائے گی اور خوش حالی اور آرام و راحت کے تمام وسائل اس سے چھین لیے جائیں گے۔ اس آیتِ کریمہ میں اس غلط فہمی کو دور کیا گیا ہے کہ کافروں کو ہم دنیا کے سامان سے محروم نہیں رکھتے بلکہ بعض دفعہ ان کی آزمائش کے لیے دنیا انھیں زیادہ دی جاتی ہے۔ البتہ آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوگا اور دنیا میں بھی وہ وسائل کی فراہمی میں اس قدر آزاد نہیں ہوں گے کہ جتنے چاہیں فراہم کر لیں۔ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے، جتنا چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ تدبیر اور محنت سے وسائل میں کمی بیشی ہوتی ہے۔

وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ﴿۱۹﴾

(اور جو شخص آخرت کا طلبگار رہتا ہے اور اس کے لیے پوری طرح جدوجہد کرتا ہے درانحالیکہ وہ مومن بھی ہو، پس یہی وہ لوگ ہیں جن کی کوشش مقبول ہوگی۔ ١٩) (سورۃ بنیٓ اسرآءِیل : ١٩)

Marfat.com

دنیا کے طلبگار کے مقابلے میں اب آخرت کے طلبگار کی بات ہو رہی ہے کہ جو شخص آخرت کا طلبگار ہوگا یعنی وہ زندگی کا وہ رویہ اختیار کرے گا جو اللہ تعالیٰ کے آخری نبی اور اس کی آخری کتاب میں دنیا و آخرت کی کامیابی کے لیے تجویز کیا گیا ہے اور وہ پورے اخلاص کے ساتھ اسے اختیار کرے گا اور پیشِ نظر صرف اللہ تعالیٰ کی رضا ہوگی۔ اور یہ صرف خواہش کی حد تک نہ ہو بلکہ اس کے لیے ہر ممکن مساعی کو بھی بروئے کار لائے گا۔ اور اس راستے میں جو مشکلات آئیں گی انھیں برداشت کرنے میں اسے کوئی تامل نہیں ہوگا۔ اس راستے کا ہر کانٹا اسے پھول سے بڑھ کر عزیز ہوگا تو یہ وہ لوگ ہیں اللہ تعالیٰ جن کی زندگی کی کوششوں کو قبول فرماتا ہے۔ دنیا میں بھی انھیں آسودہ رکھتا ہے اور دل و دماغ کا سکون عطا کرتا ہے اور آخرت میں بھی اس کی جنت ان کی منتظر ہوگی۔

ان دونوں آیتوں میں مسلمانوں کو وہ بات یاد دلائی گئی ہے جو قرآنِ کریم میں بار بار دہرائی گئی ہے کہ اگر تمھارے پیشِ نظر صرف یہی دنیا اور اس کی کامیابیاں اور خوشحالیاں ہوں تو یہ سب کچھ تمھیں مل سکتا ہے مگر اس کا آخری انجام بہت برا ہے۔ مستقل اور پائیدار کامیابی جو اس زندگی سے لے کر دوسری زندگی تک کہیں نامرادی سے داغدار نہ ہونے پائے، تمھیں صرف اسی صورت میں مل سکتی ہے، جبکہ تم اپنی کوششوں میں آخرت اور اس کی باز پرس کو پیشِ نظر رکھو۔ دنیا پرستی کی خوشحالی بظاہر تعمیر کی شان رکھتی ہے مگر اس تعمیر میں ایک بہت بڑی خرابی کی صورت مضمر ہے۔ وہ اخلاق کی اس فضیلت سے محروم ہوتا ہے، جو صرف آخرت کی جواب دہی کا احساس رکھنے ہی سے پیدا ہوا کرتی ہے۔ یہ فرق تم دنیا ہی میں دونوں طرح کی آدمیوں میں دیکھ سکتے ہو۔ یہی فرق بعد کی منازلِ حیات میں اور زیادہ نمایاں ہو جائے گا۔ یہاں تک کہ ایک کی زندگی سراسر ناکامی اور دوسرے کی زندگی سراسر کامیابی بن کر رہے گی۔

كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ۭ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ۝

(ہر ایک کی ہم امداد کرتے ہیں، اُن کی بھی اور ان کی بھی، آپ کے رب کی بخششوں سے اور آپ کے رب کی بخشش کسی پر بند نہیں۔ ۲۰) (سورۃ بنیٓ اسرآءِیل : ۲۰)

کافر اور مومن سب کو رزق اللہ تعالیٰ دیتا ہے

اس آیتِ کریمہ کا سب سے پہلا لفظ "کُلًّا" کے بارے میں یہ جان لینا چاہیے کہ جب اس سے پہلے مختلف جماعتوں کا ذکر آئے جیسے یہاں آیا ہے تو یہ معرفہ کے حکم میں ہو جاتا ہے۔ یعنی اس سے وہ ساری جماعتیں مراد ہوتی ہیں جن کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔

گزشتہ آیتوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ طالبِ دنیا اور طالبِ آخرت کا ذکر آیا ہے اور دونوں کے بارے میں جو پروردگار کا طرزِ عمل ہے اسے بیان فرمایا گیا ہے۔ یہاں دونوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ بظاہر طالبِ آخرت اللہ تعالیٰ کا مومن بھی ہے اور فرمانبردار بندہ بھی۔ اور طالبِ دنیا خود غرض بھی ہے اور نافرمان اور باغی بھی۔ دونوں کی حالت دیکھ کر انصاف کا تقاضا یہ کہتا ہے کہ طالبِ آخرت کے لیے اللہ تعالیٰ کی عطا و بخشش کے دروازے کھلے رہنے چاہئیں اور طالبِ دنیا کو اللہ تعالیٰ کی کسی نعمت پر قدرت میسر نہیں ہونی چاہیے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں معاملہ برعکس دکھائی دیتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں پروردگار فرماتا ہے کہ کوئی دنیا کا طالب ہو یا آخرت کا، ہماری بخشش کے دروازے سب کے لیے کھلے ہیں، ہم بدترین نافرمان کی بھی روزی تنگ نہیں کرتے۔ رزق کا کوئی ایسا ذریعہ جو مومن کو میسر ہو، کافر کے لیے اسے بند نہیں کرتے۔ میدانِ عمل دونوں کے لیے یکساں ہے۔ کسی کو کسی پر کوئی ترجیح نہیں۔ اور یہ یکسانی ہم نے اس لیے رکھی ہے تاکہ قیامت کے دن جب آخرت کے انکار کرنے والے سے پوچھا جائے کہ تم نے آخرت کی تیاری کیوں نہ کی اور تم نے اللہ تعالیٰ کا حق کیوں نہ پہچانا تو وہ جواب میں یہ نہ کہہ سکے کہ مجھ پر اللہ تعالیٰ کا حق ہی کیا تھا، میری زندگی تو محرومیوں سے عبارت تھی۔ مومن کو نوازا جاتا تھا اور کافر کو تکلیفیں پہنچائی جاتی تھیں۔ اگر ہمیں بھی نعمتوں سے نوازا جاتا تو ہم بھی اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے اور بہت ممکن تھا کہ ہم ایمان کا راستہ اختیار کر لیتے۔ چنانچہ دونوں کو یکساں نعمت کے مواقع دے کر یکساں گراں بار کیا گیا، پھر جس نے اللہ تعالیٰ کا حق پہچانا اس کا حق بنتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کا حق پہچانے اور اخروی نعمتوں سے اسے مالا مال کر دے۔ اور جس نے نعمتوں سے تو مومن سے بڑھ کر حظ اٹھایا اور ہر چیز کو بے روک ٹوک پانے کی کوشش کی اور شریعت کی کسی پابندی کو کبھی قبول نہ کیا اور اپنی خواہشاتِ نفس کو پورا کرنے میں پوری زندگی گزار دی، قیامت کے دن خود اس کا ضمیر جبکہ وہ اپنی اصلی حالت پر آچکا ہوگا، اسے ملامت کرے گا کہ بتا آج تیرے پاس پروردگار کے انعامات کا کیا جواب ہے؟

Marfat.com

اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۭ وَلَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّاَكْبَرُ تَفْضِيْلًا ۝

(دیکھو ہم نے اِن کے ایک کو دوسرے پر کس طرح فضیلت دے رکھی ہے اور آخرت درجات اور فضیلت کے اعتبار سے کہیں بڑھ کر ہے۔ ۲۱) (سورۃ بنیٓ اسرآءِیل : ۲۱)

اونچ نیچ میں حکمت

اس آیتِ کریمہ میں ہر غور و فکر کرنے والے کو غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے کہ تم دنیا میں بسنے والے انسانوں کو دیکھو رزق میں، عزت میں، عہدہ ومنصب میں، شکل و صورت میں، طاقت اور قوت میں کس طرح ایک کو دوسرے پر برتری حاصل ہے۔ بظاہر انسان یہ چاہتا ہے کہ سب انسان برابر ہونے چاہئیں، لیکن وہ یہ بھول جاتا ہے کہ انسانوں کا ہر لحاظ سے برابر ہونا خلافِ فطرت بھی ہے اور خلافِ حکمت بھی۔ اگر سب لوگ برابر ہوتے تو دنیا کا نظام معطل ہو جاتا۔ کوئی کسی سے کسی کام میں تعاون نہ کرتا۔ اور یہ کسی طرح ممکن نہ تھا کہ ہر کام ہر آدمی بجا لاتا۔ قدرت کی تقسیم ہے کہ کوئی کپڑا بنتا ہے، کوئی کاشتکاری کرتا ہے، کوئی جوتا بناتا ہے، کوئی بال کاٹتا ہے، کوئی تعلیم دیتا ہے، کوئی تعلیم پاتا ہے، کوئی مزدوری کرتا ہے، کوئی مزدوری لیتا ہے، کوئی رہنمائی دیتا ہے، کوئی رہنمائی قبول کرتا ہے۔ یہی تقسیم انسانی زندگی کی ہمہ ہمی ہے۔ اسی سے یہاں کی سرگرمیاں وابستہ ہیں اور اسی میں انسان کی مسرتیں پنہاں ہیں۔ اور دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس اونچ نیچ اور تقسیم کے نتیجے میں انسانوں کی محنت اور سعی و کاوش کا حُسن جھلکتا ہے۔ محنت کرنے والا آگے نکل جاتا ہے، بیکار پیچھے رہ جاتا ہے۔ ذہانتیں نئے نئے راستے تلاش کر لیتی ہیں اور لکیر کا فقیر راستہ ناپتا رہتا ہے۔ جب ہم ان مصالح پر غور کرتے ہیں تو صاف نظر آتا ہے کہ سوائے اس تقسیم کے جسے جبراً پیدا کیا گیا ہے اور سوائے اس تفضیل کے جسے ظلم سے وجود دیا گیا ہے باقی ہر وہ تقسیم اور ہر وہ فضیلت جو فطری مساعی کا نتیجہ ہے وہ فطرت کا تقاضا بھی ہے اور خوشیوں کی ضمانت بھی۔ اسی طرح قیامت کے دن بھی سب لوگ یکساں مراتب کے حامل نہیں ہوں گے حالانکہ وہاں خوشیوں کا مسرتوں کے سوا کچھ نہیں ہوگا کیونکہ وہاں کی مسرتیں اور وہاں کے مناصب بھی دنیا کے ایمان و عمل کا نتیجہ اور عکس ہوں گے۔ اس لیے وہ بھی عین مبنی بر صداقت ہوں گے۔ مزید براں آخرت چونکہ دنیا کی نسبت بہت وسیع اور بہت عظیم ہے اس لیے وہ اپنے درجات و مراتب کے لحاظ سے بھی بہت عظیم ہوگی۔ یہ کہہ کر پروردگار نے اپنے بندوں کو شوق دلایا ہے کہ اگر تم جنت کے بیش بہا مناصب چاہتے ہو تو وہاں بھی ایک کو دوسرے سے آگے بڑھنے کے امکانات میسر ہیں۔ ایمان و عمل میں آگے بڑھنے کی کوشش کرو، قربانی و ایثار کی نئی نئی شمعیں جلاؤ۔ اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کے لیے ہمتوں کا آخری قطرہ تک نچوڑ دو، تو جنت کی بڑی سے بڑی نعمت کو حاصل کیا جا سکتا ہے۔

لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ فَتَقْعُدَ مَذْمُوْمًا مَّخْذُوْلًا ۝ (سورۃ بنیٓ اسرآءِیل : ۲۲)

(اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو شریک نہ کر، ورنہ تو سزاوارِ مذمت اور بے یار و مددگار ہو کر رہ جائے گا۔ ۲۲)

اس آیتِ کریمہ میں واحد کے خطاب سے محسوس ہوتا ہے کہ شاید نبی کریم ﷺ کو خطاب کیا گیا ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں، عربی زبان میں بعض دفعہ واحد کا خطاب جمع کے لیے بھی آتا ہے، لیکن اگر اس تصور کو بھی قبول کر لیا جائے کہ خطاب آنحضرت ﷺ سے ہے تو تب بھی یہ خطاب اس لحاظ سے آپ ؐ کو ہے کہ آپ ؐ نوعِ انسانی کے امام ہیں۔ آپ ؐ کو خطاب فرما کر پوری نوعِ انسانی کو متوجہ کرنا مقصود ہے کیونکہ ساری نوعِ انسان آپ ؐ کی امتِ دعوت ہے۔

توحید ہی بنیاد ہے

فرمایا یہ جا رہا ہے کہ دنیا اور آخرت کی کامیابیاں اور سرفرازیاں صرف ایک صورت میں ممکن ہیں کہ آدمی اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی اور کو شریک نہ ٹھہرائے۔ نہ اس کی ذات میں، نہ صفات میں، نہ حقوق میں، نہ افعال میں۔ وہ وحدہ لاشریک ہے، کوئی اس جیسا نہیں۔ ہم صرف اسی کے بندے اور اسی کے احکام کے غیر مشروط طور پر پابند ہیں۔ وہی ہمیں زندگی دینے والا ہے، وہی موت دے گا۔ دنیا بھی اس کے ہاتھ میں ہے اور آخرت بھی اس کے ہاتھ

Marfat.com

میں۔ ہر مخلوق کو وہی روزی عطا کرتا ہے۔ اسی کو حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنے بندوں سے کامل اطاعت کا مطالبہ کرے اور پھر قیامت کے دن ان کی زندگی کا حساب کتاب بھی لے۔ اور پھر اسی کے مطابق کسی کو جزا سے نوازے اور کسی کو سزا دے دے۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کے بارے میں ان بنیادی تصورات پر یقین نہیں رکھتا جسے توحید کہتے ہیں اس کا دینِ اسلام سے کوئی رشتہ نہیں۔ اور قرآنِ کریم کی تعلیم اسے کوئی فائدہ نہیں دے گی۔

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَ
بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ؕ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ
كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا
كَرِيْمًا ﴿۲۳﴾ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ
رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ؕ ﴿۲۴﴾ رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِيْ نُفُوْسِكُمْ ؕ
اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِيْنَ فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِيْنَ غَفُوْرًا ﴿۲۵﴾ وَاٰتِ
ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ﴿۲۶﴾
اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ؕ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ
لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا ﴿۲۷﴾ وَاِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَآءَ رَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ
تَرْجُوْهَا فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُوْرًا ﴿۲۸﴾ وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً
اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا ﴿۲۹﴾
اِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ
خَبِيْرًۢا بَصِيْرًا ﴿۳۰﴾ ع

Marfat.com

رکوع: ۳۔ (اور تیرے رب کا فیصلہ یہ ہے کہ اس کے سوا کسی اور کی بندگی نہ کرو، اور ماں باپ کے ساتھ نہایت اچھا سلوک کرو، اگر وہ تیرے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں ان میں سے ایک یا دونوں تو نہ ان کو اُف کہو اور نہ ان کو جھڑکو، اور ان سے شریفانہ بات کہو۔ ۲۳) اور ان کے لیے رحم دلانہ اطاعت کے بازو جھکائے رکھو اور دُعا کرتے رہے کہ اے میرے رب ان پر رحم فرما، جیسا کہ انھوں نے بچپن میں مجھے پالا۔ ۲۴) تمھارا رب خوب واقف ہے اس سے جو کچھ تمھارے دلوں میں ہے، اگر تم نیک رہو گے تو وہ رجوع کرنے والوں کو بڑا بخشنے والا ہے۔ ۲۵) اور تم قرابت دار کو اس کا حق دو اور مسکین اور مسافر کو بھی، اور مال کو اللے تللے نہ اڑاؤ۔ ۲۶) اللے تللے اڑا دینے والے شیطانوں کے بھائی ہوتے ہیں اور شیطان اپنے رب کا بڑا ہی ناشکرا ہے۔ ۲۷) اگر تمھیں اپنے رب کے فضل کے انتظار میں جس کے تم متوقع ہو ان سے اعراض کرنا پڑ جائے تو تم ان سے نرمی کی بات کہہ دو۔ ۲۸) تم اپنے ہاتھ کو اپنی گردن سے باندھے نہ رکھو اور نہ اس کو پوری طرح کھول دو کہ ملامت زدہ اور درماندہ ہو کر بیٹھ رہو۔ ۲۹) بیشک تیرا رب جس کے لیے چاہتا ہے رزق کو کشادہ کر دیتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے، بیشک وہی اپنے بندوں کی خبر رکھنے والا اور ان کو دیکھنے والا ہے۔ ۳۰)

وَقَضٰی رَبُّکَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاہُ وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا ؕ اِمَّا یَبْلُغَنَّ عِنْدَکَ الْکِبَرَ اَحَدُھُمَآ اَوْ کِلٰھُمَا فَلَا تَقُلْ لَّھُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْھَرْھُمَا وَقُلْ لَّھُمَا قَوْلًا کَرِیْمًا ﴿۲۳﴾ وَاخْفِضْ لَھُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَۃِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْھُمَا کَمَا رَبَّیٰنِیْ صَغِیْرًا ؕ ﴿۲۴﴾

(اور تیرے رب کا فیصلہ یہ ہے کہ اس کے سوا کسی اور کی بندگی نہ کرو، اور ماں باپ کے ساتھ نہایت اچھا سلوک کرو، اگر وہ تیرے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں ان میں سے ایک یا دونوں تو نہ ان کو اُف کہو اور نہ ان کو جھڑکو، اور ان سے شریفانہ بات کہو۔ ۲۳) اور ان کے لیے رحم دلانہ اطاعت کے بازو جھکائے رکھو اور دُعا کرتے رہے کہ اے میرے رب ان پر رحم فرما، جیسا کہ انھوں نے بچپن میں مجھے پالا۔ ۲۴) (سورۃ بنیٓ اسرآءِیل : ۲۳۔۲۴)

گزشتہ آیات میں چند تمہیدی نصیحتیں فرمائی گئی ہیں۔ اب یہاں سے ان بنیادی اصولوں کا ذکر شروع کیا گیا ہے جن پر آئندہ اسلامی ریاست اور معاشرے کی تعمیر ہونا ہے۔ یہ نبی کریم ﷺ کی دعوت کا وہ منشور ہے جس پر نئے اسلامی معاشرے اور ریاست کی فکری، اخلاقی، تمدنی، معاشی اور قانونی عمارت اٹھائی جانی ہے۔

عبادت اللہ تعالیٰ کا حق ہے

سب سے پہلی بات یہ ارشاد فرمائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ یہ ہے کہ تم لوگ اس کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کرو۔ عبادت اسلام کی ایک وسیع اصطلاح ہے۔ قرآنِ کریم نے عبادت ہی کو جنوں اور انسانوں کا مقصدِ تخلیق ٹھہرایا ہے۔ انبیاءِ کرام جس دعوت کو لے کے آئے اس دعوت کا عنوان صرف عبادت رہا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت تک کے انسانوں کی ہدایت کے لیے جس بات کی طرف دعوت دی اور جس پر زندگی بھر زور دیا وہ یہی عبادت ہے۔ قرآنِ کریم کی سورہ بقرہ میں جہاں قرآنِ کریم کی دعوت شروع ہوئی ہے اس کی پہلی آیت ہی یہ ہے "یایھا الناس اعبدوا ربکم" (اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تمھیں پیدا کیا اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا) یہ بھی یاد رہنا چاہیے کہ عبادت کے تصور میں صرف پرستش اور پوجا ہی شامل نہیں بلکہ اس میں غلامی اور بے چون وچرا اطاعت بھی شامل ہے۔ مقصود یہ ہے کہ پرستش بھی اللہ ہی کی کرو، اسی کی بے چون وچرا اطاعت کرو، اسی کے حکم کو حکم اور اسی کے قانون کو قانون مانو اور اس کے سوا کسی کا اقتدارِ اعلیٰ تسلیم نہ کرو۔ غلامی کے جتنے تصورات انسانوں نے اپنی فکر اور اپنی زبان سے رائج کیے اور اسے قانونی شکل دی اللہ کی اطاعت ان تمام تصورات پر محیط اور ان سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ جسے اگر سمیٹ کر کہا جائے تو یوں کہا جاسکتا ہے کہ ہر

Marfat.com

مسلمان اللہ کا غلام ہے۔ نہ اس کا جسم اپنا ہے نہ جان' نہ اس کی صلاحیتیں اور توانائیاں اپنی ہیں' نہ وہ اپنی جسمانی قوتوں کا مالک ہے' نہ اسے اولاد پر حق ملکیت حاصل ہے اور نہ وہ مال و دولت پر حق ملکیت جتانے کا مجاز ہے۔ یہ سب کچھ اللہ کی دین اور اس کا عطیہ ہے۔ وہی ان سب کا مالک ہے۔ مسلمانوں کے پاس یہ اس کی دی ہوئی امانت ہے۔ امانت میں ان حدود سے تجاوز کرنا جو امانت رکھنے والے نے عائد کردی ہیں اور یہ اپنی مرضی اس طرح استعمال کرنا جو امانت کو ملکیت بنا دے' یہ امانت داری نہیں خیانت ہے۔ ہم اپنی ان چیزوں میں اپنی مرضی کرنے کے ہرگز مجاز نہیں۔ زندگی اس نے ہمیں گزارنے کے لیے دی ہے تو گزارنے کے طریقے بھی عطا فرمائے ہیں۔ اس میں اپنی مرضی سے لکیریں کھینچنا' اپنی مرضی سے نقشے بنانا' اپنی مرضی سے اس کی اصول و ضوابط اور آداب وضع کرنا یہ بندگی اور غلامی کے خلاف ہے۔ اور پھر اس زندگی کے لیے از خود نصب العین اور مقصد زندگی متعین کرنا سراسر حدود سے تجاوز ہے۔ اور زندگی کے ہر شعبے کے لیے جو احکام دیے گئے ہیں انھیں کامل بندگی کے تصور کے ساتھ بجالانے کی بجائے ان کے خلاف دل و دماغ کی قوتیں صرف کرنا اس کے خلاف اپنے اعضاء و جوارح کو حرکت میں لانا بلکہ کھلم کھلا اس کے احکام کے خلاف زندگی کے معاملات کا فیصلہ کرنا سراسر اس کی عبادت' بندگی اور غلامی سے بغاوت ہے۔ اور پھر وہ تنگی اور ترشی' عسر و یسر اور امن اور خوف جس حال میں رکھے اس کے خلاف حرف شکایت زبان پر لانا یا اس کے سوا کسی اور کے سامنے دستِ سوال دراز کرنا اور کسی اور سے امیدیں باندھنا' محبت کسی اور سے کرنا' نفرت کا حوالہ کسی اور کو بنانا' دل کی دنیا کسی اور سے آباد کرنا' زندگی کے الجھے ہوئے مسائل میں اس کی دی ہوئی ہدایت کے برعکس کوئی اور ہدایت قبول کرنا اس کے آئین و قانون کو چھوڑ کر ملک میں وضعی قوانین کو نافذ کرنا' اسلامی تہذیب کے سوا دوسری تہذیبوں کو رائج کرنا اور پسند کرنا یہ سب وہ باتیں ہیں جو بندگی اور عبادت کے خلاف ہیں۔ مدینہ طیبہ پہنچ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی عبادت کے جامع تصور کو مسلمانوں کے دل و دماغ میں راسخ فرمایا اور اسی کو تہذیب' تمدن' اخلاق اور قانون کی بنیاد بنایا۔ اور اسی کو ریاست کا مقصد قرار دے کر ریاست کے تمام وسائل کو اس کی خدمت پر لگا دیا۔

انسانوں میں سب سے پہلا حق والدین کا ہے

اللہ کے بعد انسانوں میں سب سے مقدم حق والدین کا قرار دیا گیا ہے۔ اس لیے کہ دنیا میں آنے کا سبب والدین کے سوا اور کوئی نہیں۔ خالق تو اللہ کی ذات ہے' لیکن بظاہر جسمانی ظہور ہر شخص کا والدین کی وساطت سے ہوا اور مزید یہ بات کہ اللہ تعالیٰ انسان کو نہایت بے بسی کی شکل میں دنیا میں بھیجتا ہے' پیدا ہونے والا بچہ نہ سننے کی طاقت رکھتا ہے' نہ دیکھنے کی' نہ وہ پکڑ سکتا ہے' نہ سمجھ سکتا ہے۔ گوشت کا ایک خوبصورت لوتھڑا ہے جو کبھی مسکراتا ہے' کبھی روتا ہے۔ لیکن اپنے طور سے کسی بات پر قدرت نہیں رکھتا۔ والدین کا احسان یہ ہے کہ انھوں نے اس لوتھڑے کو پالا' پروان چڑھایا' تربیت کیا' اس کی ہر ضرورت پوری کی' انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا' ماں نے اپنا خونِ جگر اس کے گلے میں ٹپکایا' باپ کے کندھوں نے اس کا بوجھ اٹھایا' پھر دھیرے دھیرے اس عمر کو پہنچا جب وہ اپنے آپ کو سنبھالنے کے قابل ہوسکا۔ اتنے بڑے احسان کا بدلہ بڑے سے بڑا ہونا چاہیے۔ تو اللہ تعالیٰ نے عظیم بدلے کے طور پر ماں باپ کے حق کو سب سے مقدم رکھا۔ لیکن یہ حق انھیں نہیں دیا کہ وہ اللہ کی عبادت میں شریک کیے جائیں۔ ان آیات کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے والدین کے تین حقوق بیان فرمائے ہیں۔ (۱) حُسنِ سلوک۔ (۲) اطاعت۔ (۳) دعا۔

والدین کے تین حقوق میں سے پہلا حق حُسنِ سلوک ہے

حُسنِ سلوک ادائے حق سے ایک بالاتر چیز ہے۔ اس لیے کہ اس کا حقیقی تعلق اولاد کی فرمانبرداری کے جذبے اور حسن ذوق سے ہے۔ جتنا کسی کا ذوق اس لحاظ سے پاکیزہ اور نازک ہوگا وہ اتنا ہی حسن سلوک میں آگے بڑھ جائے گا۔ لیکن اس آیتِ کریمہ میں اس حسن سلوک کی طرف رہنمائی بھی فرمائی گئی ہے۔ فرمایا گیا کہ اگر ماں باپ تمھاری زندگی میں بوڑھے ہوجائیں تو ان کے بارے میں تمھارا رویہ یہ ہونا چاہیے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ بڑھاپے سے پہلے ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنے کی ضرورت نہیں یا یہ ان کا حق نہیں۔ بڑھاپے کا ذکر تو صرف یہ بتانے کے لیے کیا گیا ہے کہ یہی زمانہ ہے جس میں لوگوں کو ماں باپ بوجھ محسوس ہونے لگتے ہیں اور اسی میں وہ اولاد کی خدمت اور حسن سلوک کے زیادہ محتاج ہوتے ہیں۔ کیونکہ بڑھاپے میں انسان میں دو طرح کی تبدیلیاں آتی ہیں۔

Marfat.com

بڑھاپے میں آنے والی تبدیلیاں

۱......قویٰ مضمحل ہوجاتے ہیں۔اپنی مرضی سے چلنا پھرنا تو درکنار بعض دفعہ حرکت کرنا بھی مشکل ہوجاتا ہے۔ایسی صورت میں حسن سلوک کا تقاضا یہ ہے کہ انھیں نوکروں کے رحم و کرم پر نہ چھوڑ دیا جائے یا ان کی طرف سے بے پرواہی نہ برتی جائے' بلکہ اولاد کی ذمہ داری ہے کہ امکانی حد تک خود ان کی کمزوریوں اور ناتوانیوں کا مداوا بننے کی کوشش کریں۔

۲......دوسری تبدیلی ذہن اور عقل کی تبدیلی ہے۔ بڑھاپے میں بعض دفعہ آدمی ٹھیک بات کہنے اور سمجھ کر گفتگو کرنے کی صلاحیت سے بھی محروم ہوجاتا ہے۔اور یہ بات بہت حد تک صحیح ہے کہ بڑھاپے میں آدمی دوبارہ بچہ بن جاتا ہے۔ان دونوں تبدیلیوں کو سامنے رکھتے ہوئے پروردگار نے فرمایا کہ دیکھنا ایسی صورت حال میں اپنے ماں باپ کو اف تک بھی نہ کہنا۔یعنی اظہار بیزاری نہ کرنا۔ہوسکتا ہے کہ ان کے منہ سے رال ٹپک رہی ہو' ناک بہہ رہی ہو' آنکھیں تلچھٹ سے بھری ہوں' ممکن ہے وہ رفع حاجت بھی خود نہ کرسکیں۔ایسی حالت میں خدمت سے تنگ آجانا' انسانی فطرت سے بعید نھیں۔ دیکھنا ایسے وقت میں بیزاری کا اظہار نہ کرنا۔اور اگر وہ عقل اور ذہن میں فتور کے باعث بچوں جیسی حرکتیں کرنے لگیں' بلا وجہ کسی بات پر ضد کریں یا بار بار کوئی بات پوچھیں تو دیکھنا ان کو جھڑکنا نھیں۔ان سے ناراض نھیں ہونا۔ بلکہ جس طرح انھوں نے نہایت محبت اور پیار سے تمھیں اس وقت پالا جب تم گوشت کے ایک لوتھڑے کی طرح تھے۔ ہر طرح کی عقل اور سمجھ سے خالی' بستر پر گندگی' نہ کھانے کا ہوش نہ پینے کا سلیقہ' لیکن اس کے باوجود ماں باپ نے کیسی محبت سے تمھیں پالا' تم بھی اسی محبت کے جذبے سے دیکھ بھال کرنا۔

کہا جاتا ہے کہ ایک صاحب بوڑھے ہوگئے ۔ایک دن گھر کے لان میں بیٹھے تھے کہ جوان بیٹا آگیا۔جوان بیٹے کو پاس بٹھایا۔دیوار پر کوا بیٹھا تھا' اس کی طرف اشارہ کرکے پوچھا بیٹا یہ کیا ہے؟ بیٹے نے جواب دیا: ابا جان! یہ کوا ہے۔انھوں نے پھر پوچھا یہ کیا ہے؟ بیٹے نے پھر جواب دیا کہ یہ کوا ہے۔جب انھوں تیسری دفعہ پوچھا تو بیٹے کے لہجے میں تیزی آنے لگی۔حتیٰ کہ جب پانچویں دفعہ یہی سوال کیا تو بیٹے نے جھڑک کر کہا ابا جان یہ کیا ایک ہی سوال آپ بار بار کیے جارہے ہیں۔ میں کتنی دفعہ آپ کو جواب دے چکا ہوں۔ یہ صاحب اٹھے' اندر سے اپنی ڈائری اٹھا لائے۔ڈائری کا ایک صفحہ کھول کر بیٹے کے سامنے رکھ دیا۔اس پر لکھا ہوا تھا کہ ''میرا بیٹا چھوٹا سا تھا۔اسی صحن میں بیٹھے ہوئے اس نے مجھ سے دیوار پر بیٹھے کوے کے بارے میں پوچھا۔میں نے اس کو جواب دیا۔لیکن وہ بار بار مجھ سے پوچھتا ابا جان یہ کیا ہے۔میں جواب دیتا بیٹے یہ کوا ہے۔اس نے پچیس دفعہ یہ سوال کیا اور پچیس دفعہ ہی میں نے جواب دیا اور اتنی دفعہ جوب دینے کے بعد مجھے بہت خوشی ہوئی کہ میرا بیٹا بار بار مجھ سے پوچھتا ہے۔''

اندازہ کیجئے کہ باپ پچیس دفعہ جواب دیتا ہے تو اس کی محبت اور پیار میں کوئی کمی نھیں آتی ۔قرآن کریم کی اس آیت میں یہ کہا گیا ہے کہ تم بھی اسی جذبہ سے اپنے ماں باپ کی خدمت کرنا اور ہر طرح کی بات برداشت کرنا۔

والدین کا دوسرا حق اطاعت ہے

دوسرا حق جو اس میں بیان کیا گیا ہے وہ ہے ہر حال میں اپنے ماں باپ کی اطاعت کرنا اور ہر جائز حکم کو بجالانا۔ان کی مالی ضروریات کو پورا کرنا اور ہر جائز خواہش کو پورا کرنے کی کوشش کرنا اور پھر اس میں یہاں تک وسعت کی گئی کہ تمھارے والدین اگر غیر مسلم بھی ہوں وہ تمھیں کوئی اسلام کے خلاف بات کہیں تو اسے ہرگز نہ ماننا' لیکن ویسے ان کے ساتھ بھی اچھا سلوک کرنا۔ارشاد خداوندی ہے:

وَ اِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓی اَنْ تُشْرِكَ بِیْ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۙ فَلَا تُطِعْهُمَا وَ صَاحِبْهُمَا فِی الدُّنْیَا مَعْرُوْفًا (لقمان: ۱۵)

(اور اگر تیرے والدین تجھے مجبور کریں اس بات پر کہ تو میرے ساتھ کسی کو شریک کر' جس کا تجھے علم نھیں تو ان کی اطاعت مت کرنا' لیکن دنیا میں ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنا)

Marfat.com

رضاعی والدین بھی حُسنِ سلوک کے مستحق ہیں

پھر والدین کے اس رشتے کو اسلام نے رضاعی والدین تک وسعت دے دی ہے۔ یعنی جس خاتون کا دودھ پیا ہے وہ دودھ پینے والے کی رضاعی ماں کہلاتی ہے اور اس کا شوہر رضاعی باپ بن جاتا ہے۔ اور ساتھ دودھ پینے والا دوسرا بچہ رضاعی بھائی کہلاتا ہے۔ جس طرح حضرت حلیمہ سعدیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رضاعی والدہ تھیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے کہ آپ کی رضاعی والدہ یعنی حلیمہ سعدیہ تشریف لے آئیں۔ آپؐ نے اپنی چادر بچھا دی کہ اس پر تشریف رکھیں۔ پھر آپؐ کے رضاعی والد آئے تو آپؐ نے چادر کا دوسرا حصہ ان کے لیے بچھا دیا۔ اتنے میں آپؐ کے رضاعی بھائی بھی پہنچ گئے تو آپؐ نے ان کو ماں باپ کے درمیان بٹھایا۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اللہ کی نگاہ میں ماں باپ کا مقام و مرتبہ کیا ہے؟ اطاعت کا حکم دینے کے ساتھ ساتھ نافرمانی سے بھی منع فرمایا بلکہ نافرمانی سے روکنے کو قانونی حق کے طور پر تسلیم کیا۔ ارشاد فرمایا:

اِنَّ اللّٰہَ حَرَّمَ عَلَیْکُمْ عُقُوْقَ الْاُمَّھَاتِ

(اللہ نے تم پر ماؤں کی نافرمانی کو حرام کر دیا ہے)

ایک حدیث میں آتا ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ:

یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ مَا حَقُّ الْوَالِدَیْنِ عَلٰی وَلَدِھِمَا قَالَ ھُمَا جَنَّتُکَ وَ نَارُکَ

(کہ اے اللہ کے رسولؐ والدین کا ان کی اولاد پر کیا حق ہے؟ فرمایا وہ دونوں تمھاری جنت ہیں اور اور تمھاری جہنم ہیں)

یعنی اطاعت کرو گے تو جنت کے مستحق ٹھہرو گے اور نافرمانی کرو گے تو اس کی وجہ سے جہنم میں جانا ہوگا۔ ایک دوسری حدیث میں ہے:

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ، قَالَ رَسُوْلَ اللّٰہِ رَغِمَ اَنْفُہٗ رَغِمَ اَنْفُہٗ رَغِمَ اَنْفُہٗ قِیْلَ مَنْ، یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ مَنْ اَدْرَکَ وَالِدَیْہِ عِنْدَ الْکِبَرِ اَحَدَھُمَا اَوْ کِلَا ھُمَا لَمْ یَدْخُلِ الْجَنَّۃَ

(حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس آدمی کی ناک خاک آلود ہو، اس آدمی کی ناک خاک آلود ہو، اس آدمی کی ناک خاک آلود ہو یعنی وہ ذلیل ہو۔ پوچھا گیا کہ کون اے اللہ کے رسولؐ؟ فرمایا جس نے اپنے والدین کو بڑھاپے میں پایا۔ ان میں سے ایک کو یا دونوں کو اور پھر ان کی خدمت کر کے جنت میں داخل نہ ہوا)

ایک اور حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے باپ کی رضامندی کو اللہ تعالیٰ کی رضامندی ٹھہرایا اور باپ کی ناراضگی کو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی قرار دیا:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ رِضَی الرَّبِّ فِیْ رِضَی الْوَالِدِ وَ سُخْطُ الرَّبِّ فِیْ سُخْطِ الْوَالِدِ

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ کی رضامندی والد کی رضامندی میں ہے اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی والد کی ناراضگی میں ہے)

اور پھر والد کی نافرمانی کو نہ صرف اللہ تعالیٰ نے حرام ٹھہرایا بلکہ یہ بھی بتایا ہے کہ والد کی نافرمانی اتنا بڑا گناہ ہے کہ اس بات کا اندیشہ ہے کہ کہیں دنیا میں ہی اس کی سزا نہ دے دی جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

کل الذنوب یغفر اللّٰہ تعالیٰ منھا ماشاء الا عقوق الوالدین فانہ یجعل لصاحبہ فی الحیاۃ قبل الممات

(اللہ تعالیٰ تمام گناہوں میں سے جس کو چاہے گا معاف فرمائے گا مگر والدین کی نافرمانی کو معاف نہیں فرمائے گا۔ ممکن ہے کہ وہ نافرمان کو موت سے پہلے زندگی میں ہی سزا دے ڈالے۔)

Marfat.com

ماں چونکہ اولاد کی پیدائش میں اور بچپن میں ان کی تربیت میں زیادہ دکھ اٹھاتی ہے اور باوجود اس کے کہ اس کا تعلق صنفِ نازک سے ہے، لیکن وہ کس قدر حوصلہ مندی کے ساتھ اپنی اولاد کی ہر غلط بات اور بڑی سے بڑی خدمت کے بوجھ کو برداشت کرتی ہے۔ اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ماں کی خدمت اور حسنِ سلوک کا حق باپ کی نسبت سے تین گنا تم پر زیادہ ہے:

قَالَ رَجُلٌ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ مَنْ اَحَقُّ بِحُسْنِ صَحَابَتِیْ قَالَ اُمُّکَ ثُمَّ اُمُّکَ ثُمَّ اُمُّکَ ثُمَّ اَبَاکَ ثُمَّ اَدْنَاکَ ثُمَّ اَدْنَاکَ

(ایک آدمی نے کہا اے اللہ کے رسولؐ! میرے بہتر حق کا اور بہتر مصاحبت کا سب سے زیادہ حقدار کون ہے؟ فرمایا تمھاری ماں۔ اس نے پوچھا پھر کون؟ فرمایا تمھاری ماں۔ اس نے پوچھا پھر کون؟ کہا تمھاری ماں۔ پوچھا پھر کون؟ کہا تمھارا باپ اور پھر تمھارے اور درجہ بدرجہ قریبی رشتے دار۔)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ماں کے ساتھ حسنِ سلوک اور اطاعت کو باپ کی نسبت تین گنا زیادہ اہمیت دی۔

عہدِ نبوت کی ایک معروف شخصیت حضرت اویس قرنی ہیں، جو یمن کے علاقے قرن کے رہنے والے تھے۔ وہ اپنے علاقے میں کسی صحابی کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے۔ اور پھر انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیغام بھیجا کہ ''حضور میری والدہ بوڑھی ہیں، کوئی ان کی دیکھ بھال کرنے والا نھیں۔ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتا ہوں۔ ارشاد فرمائیے میرے لیے کیا حکم ہے؟'' آپؐ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ ''تم اپنی ماں کی خدمت کرتے رہو۔ میرے پاس آنے کی ضرورت نھیں۔''

ذرا غور کیجئے کہ ایمان کی حالت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے بہرہ ور ہونے والے کو صحابی کہتے ہیں اور یہ شرف صحابیت جو محض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے ملتا ہے، اس سے بڑھ کر کوئی شرف دنیا میں نھیں۔ ایک آدمی ساری عمر بھی اللہ کی عبادت کرتا رہے تو وہ ادنیٰ سے ادنیٰ صحابی کے برابر نھیں ہوسکتا۔

حضرت اویس قرنیؒ

تاریخ میں آتا ہے کہ حضرت عبداللہ ابن مبارک جو بڑے جلیل القدر محدث ہیں، ان سے کسی نے پوچھا ''امیر معاویہ؟ افضل ہیں یا کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز؟'' تو حضرت عبداللہ بن مبارک نے فرمایا کہ ''بھائی! تم نے ان دونوں میں عجیب تقابل کیا ہے۔ ان دونوں کا آپس میں تو کوئی مقابلہ ہی نھیں۔ کیونکہ حضرت امیر معاویہ صحابی ہیں وہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جہاد کے لیے نکلتے تھے تو جو مٹی اڑ کر ان کی ناک میں جاتی تھی جو مقام و مرتبہ اس مٹی کا ہے وہ بھی حضرت عمر بن عبدالعزیز کا نھیں ہوسکتا۔ کیونکہ بعد میں آنے والا بڑے سے بڑا شخص بھی شرفِ صحابیت سے ہمکنار نھیں ہوسکتا۔ اندازہ فرمائیں کہ اتنا بڑا شرف حضرت اویس قرنی نے ماں کی خدمت کی وجہ سے قربان کر دیا۔ کیونکہ ان کی والدہ زندہ رہیں اور وہ ان کی خدمت میں لگے رہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں باوجود اس کے کہ آپ ہمیشہ اس کے لیے تڑپتے تھے حاضر نہ ہوسکے۔ حتیٰ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انتقال فرمایا۔ لیکن ماں کی خدمت کی اطاعت کا جوان کو صلہ ملا اس پر جتنا بھی فخر کیا جائے کم ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا ''عمر! میرے بعد ایک شخص اس حلیئے کا جس کا نام اویس ہوگا، یمن سے آئے گا۔ تم اس کو تلاش کرنا۔ اگر وہ تمھیں مل جائے تو اس سے اپنے لیے دعا کرانا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو مستجاب الدعوات بنایا ہے۔'' یعنی اس کی دعائیں قبول ہوتی ہیں۔ آپؐ کو یہ شرف صرف اس وجہ سے ملا کہ آپؒ نے ماں کی خدمت کی۔ چنانچہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ تلاش جاری رکھی کہ جو بھی قافلہ یمن سے آتا آپؓ اس میں معلوم کرنے کی کوشش کرتے کہ اس نام اور حلیئے کا آدمی اس میں موجود ہے یا نھیں؟ چنانچہ آپؓ کو ایک دفعہ یہ خبر ملی کہ کوئی قافلہ یمن سے آیا ہے اور اس میں اس نام کے صاحب موجود ہیں تو آپ فوراً ان کے پاس تشریف لے گئے اور ان سے دعا کی درخواست کی۔ انھوں نے حیران ہو کر پوچھا کہ حضرت آپ مجھ سے دعا کراتے ہیں حالانکہ آپ کا مقام و مرتبہ تو معروف و معلوم ہے تو پھر آپ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے یہ سارا واقعہ بیان کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی نگاہ میں ایک ماں کا مقام و مرتبہ کیا ہے؟

Marfat.com

جہاد جو اسلام میں سب سے بڑی عبادت ہے، والدین اگر بوڑھے ہیں اور کوئی ان کی دیکھ بھال کرنے والا نہیں یا صرف اکیلی ماں ہے اور ان کی نگہداشت کرنے والا کوئی نہیں ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی خدمت کو جہاد پر اہمیت دی ہے۔ آپ درج ذیل دو احادیث کو ملاحظہ فرمائیں:

جَآءَ رَجُلٌ اِلَی النَّبِیِّ فَقَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اُجَاهِدُ قَالَ اَلَکَ اَبَوَانِ قَالَ نَعَمْ قَالَ فَفِیْهِمَا فَجَاهِدْ

(ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور کہا کہ اے اللہ کے رسولؐ! میں جہاد کرنا چاہتا ہوں۔ فرمایا کیا تمھارے ماں باپ ہیں؟ اس نے عرض کیا ہاں۔ فرمایا واپس جاؤ ان دونوں کے حوالے سے جہاد کرو یعنی ان دونوں کی خدمت کرو۔)

ان جاهمة جاء الى النبی صلی الله علیه و سلم فقال یا رسول الله اردت ان اغزو و قد جئت استشبرک فقال هل لک من ام قال نعم قال فالزمها فان الجنة عند رجلها

(کہ جاہمہ نامہ کا ایک شخص نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور کہا کہ اے اللہ کے رسول میں جہاد میں شریک ہونا چاہتا ہوں۔ میں اس لیے آیا ہوں تا کہ آپ سے مشورہ کروں۔ فرمایا کیا تمھاری والدہ ہیں؟ کہا ہاں۔ فرمایا جاؤ جا کر ہر وقت ان کی خدمت کرو۔ اس لیے کہ جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے۔)

ان دونوں احادیث میں والدین کو یا والدہ کی خدمت کو جہاد سے افضل قرار دیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ ان کے والدین یا ان کی والدہ کی نگہداشت کرنے والا اور کوئی نہیں۔ اس لیے آپ نے ان کو والدین کی خدمت یا ماں کی خدمت کو جہاد پر ترجیح دینے کا حکم دیا۔

ماں باپ کی خدمت اور جہاد

بات یہ ہے کہ اگر جہاد فرض نہ ہوا ہو بلکہ جہاد میں شرکت صرف ثواب کی نیت سے کرنا ہو تو پھر ایسے جہاد کے لیے تو ماں باپ کی اجازت ضروری ہے۔ لیکن اگر جہاد فرض ہو جائے جیسے جنگ تبوک میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر صحابی کو نکلنے کا حکم دے دیا تھا، ایسے جہاد کو فرض عین کہتے ہیں تو پھر سب کا جہاد پر نکلنا فرض ہو جاتا ہے۔ ہاں اگر ایسی صورت ہو کہ ماں باپ کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں اور وہ خود اپنے آپ کو سنبھال نہ سکتے ہوں اور اندیشہ ہو کہ بیٹے کے چلے جانے کی صورت میں ان کی موت واقع ہو جائے گی تو ایسی صورتِ حال میں ماں باپ کی دیکھ بھال جہاد سے زیادہ درجہ حاصل کر جاتی ہے۔

والدین کی اطاعت قانوناً بھی ضروری ہے اور اخلاقاً بھی

ماں باپ کی اطاعت کا ذکر ہو رہا ہے تو اس سلسلہ میں یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ اطاعت ایک تو خدمت کو کہتے ہیں۔ یعنی ماں باپ کی دیکھ بھال، نگہداشت، ان کی ہر طرح کی مدد اور تعاون، لیکن اطاعت کی دوسری صورت ان کے اخراجات کو برداشت کرنا ہے۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ماں باپ کو صرف مالی تعاون کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کی دیکھ بھال کرنے والے دوسرے بھی ہوتے ہیں تو اطاعت جس کو ہم نفقہ کہتے ہیں اولاد پر قانونی طور پر بھی ضروری ہے اور اخلاقی طور پر بھی۔ قانونی طور پر ضروری ہونے کا معنی یہ ہے کہ اگر کوئی اولاد والدین کی جائز ضرورتوں کو پورا نہیں کرتی تو حکومت کا فرض ہے کہ وہ عدالت کے ذریعے اس اولاد کو مجبور کرے اور اخلاقی طور پر ضروری ہونے کا مطلب یہ ہے کہ یہ ایسا جرم ہے جو مسلمان معاشرے میں قابلِ نفرت ہونا چاہیے۔ آخرت میں اللہ کے یہاں اس کی شدید باز پرس ہوگی۔ قرآنِ حکیم نے اولاد کو ماں باپ پر خرچ کرنے کا حکم دیا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کی تاکید فرمائی ہے اور دورِ خلافتِ راشدہ میں خلفائے راشدین نے اس کے بارے میں فیصلہ بھی فرمایا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ارشاد ہے:

Marfat.com

عَنْ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ اَنَّ اَتَاهُ رَجُلٌ فَقَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَنَّ لِیْ مَالًا وَ وَلَدَانِ وَ اَنَّ اَبِیْ یُحْتَاجُ اِلٰی مَالِیْ فَقَالَ اَنْتَ وَ مَالُکَ لِاَبِیْکَ

(حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور کہا کہ اے اللہ کے رسُولؐ میرے پاس مال اور دو بیٹے بھی ہیں اور میرے والدین میرے مال کے محتاج ہیں تو مجھے کیا کرنا چاہیے؟ آپؐ نے فرمایا تو بھی اور تیرا مال بھی تیرے باپ کا ہے)

اسی طرح حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ کے زمانے میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ کی خدمت میں ایک ایسے شخص کی شکایت کی گئی جو اپنے والدین کے اخراجات کے تحمّل میں کوتاہی کا ارتکاب کر رہا تھا تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسے حکم دیتے ہوئے یہی جملہ دہرایا یعنی " اَنْتَ وَمَالُکَ لِاَبِیْکَ " (تو بھی اور تیرا مال بھی تیرے باپ کی ملکیت ہے)

قرآنِ کریم نے اولاد کو جو والدین کی اطاعت اور خدمت کرنے کا حکم دیا ہے اس میں یہ قید بھی لگائی ہے کہ:

وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ (بنی اسرائیل: ۲۳)

(والدین کے سامنے فرمانبرداری کے بازو محبت سے جھکائے رکھو۔)

یعنی تم اپنے والدین کی خدمت ایک بوجھ سمجھ کر مت کرنا، بلکہ تمھاری فرمانبرداری کے بازو رحمت اور محبت سے ان کے سامنے پھیلے رہنے چاہئیں۔ یعنی جس طرح ماں باپ اپنی اولاد کو بوجھ سمجھ کر نہیں پالتے، بلکہ نہایت محبت اور پیار سے پالتے ہیں، بالکل اسی جذبے کے ساتھ اولاد کو بھی اپنے ماں باپ کی دیکھ بھال کرنی چاہیے اور اگر وہ ایسے ہی جذبے سے اپنے ماں باپ کی دیکھ بھال کریں تو یقین جانئے یہ خدمت اور یہ محبت سے کی ہوئی دیکھ بھال اتنا بڑا ذریعہ ہے کہ آدمی اگر کبھی کسی ایسی صورتِ حال میں گرفتار ہو جائے جس سے نکلنے کی بظاہر کوئی صورت نہ ہو تو اس عمل کے واسطے سے اگر دعا مانگے تو اللہ تعالیٰ اسے رد نہیں فرماتا۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک واقعہ بیان فرمایا:

ارشاد ہوا کہ تین مسافر راہ میں چل رہے تھے کہ اتنے میں موسلا دھار پانی برسنے لگا۔ تینوں نے بھاگ کر ایک پہاڑ کے غار میں پناہ لی۔ قضارا ایک چٹان اوپر سے اس طرح گری کہ اس سے اس غار کا منہ بند ہو گیا۔ اب ان کی بے کسی و بے چارگی اور اضطراب و بیقراری کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ ان کو موت سامنے کھڑی نظر آتی تھی۔ اس وقت انھوں نے پورے خضوع و خشوع کے ساتھ دربارِ الٰہی میں دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ ہر ایک نے کہا کہ اس وقت ہر ایک کو اپنی خالص نیکی کا واسطہ خدا کو دینا چاہیے۔ ایک نے کہا "یا الٰہی تو جانتا ہے کہ میرے والدین بوڑھے تھے اور میرے چھوٹے بچے تھے، میں بکریاں چراتا تھا اور انھیں پر ان کی روزی کا سہارا تھا۔ میں شام کو جب بکریاں لے کر گھر آتا تھا تو دودھ دوھ کر پہلے اپنے اپنے والدین کی خدمت میں لاتا تھا۔ جب وہ پی چکتے تب اپنے بچوں کو پلاتا تھا۔ ایک دن کا واقعہ ہے کہ میں بکریاں چرانے کو دور نکل گیا۔ لوٹا تو میرے والدین سو چکے تھے۔ میں دودھ لیکر ان کے سرہانے کھڑا ہوا، نہ ان کو جگاتا تھا کہ ان کی راحت میں خلل آجاتا اور نہ ہٹتا تھا کہ خدا جانے کس وقت ان کی آنکھیں کھلیں اور دودھ مانگیں، بچے بھوک سے بلک رہے تھے، مگر مجھے گوارا نہ تھا کہ میرے والدین سے پہلے میرے بچے سیر ہوں۔ میں اسی طرح پیالہ میں دودھ لیے رات بھر سرہانے کھڑا رہا اور وہ آرام کرتے رہے۔ خداوندا! اگر تجھے معلوم ہے کہ میں نے یہ کام تیری خوشنودی کے لیے کیا تو اس غار کے منہ سے چٹان کو ہٹا دے۔" یہ کہنا تھا کہ چٹان کو خود بخود جنبش ہوئی اور غار کے منہ سے تھوڑا سرک گئی۔ اس کے بعد باقی دو مسافروں کی باری آئی اور انھوں نے بھی اپنے نیک کاموں کو وسیلہ بنا کر دعا کی اور غار کا منہ کھل گیا۔

تیسرا حق دعا کرنا

اولاد پر ماں باپ کا تیسرا حق دعا کرنا ہے۔ اس کا تعلق والدین کی زندگی سے بھی ہے اور والدین کی زندگی کے بعد سے بھی۔ جب تک والدین زندہ رہیں تو آدمی حتی المقدور ماں باپ کی خدمت کرنے کے ساتھ ساتھ یہ دعا بھی کرتا رہے:

Marfat.com

رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا

(اے میرے پروردگار! تو ان پر رحمت فرما جس طرح انھوں نے بچپن میں مجھے پالا ہے۔)

اس میں اشارہ دو باتوں کی طرف ہے۔ ایک تو یہ کہ جو آدمی اپنے والدین کی خدمت کے ساتھ ساتھ ان کے لیے اس طرح دل سے دعا بھی مانگے گا تو یقیناً اس کے دل میں اپنے ماں باپ کی خدمت بوجھ نہیں بنے گی۔ اور پھر اس دعا سے ماں باپ کی محبت کا جذبہ ہمیشہ زندہ رہے گا اور وہ امکانی حد تک کبھی اس خدمت سے دریغ نہیں کرے گا اور دوسرا اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ دنیا میں ہر آدمی کے لیے بہت سے لوگ دعائیں مانگتے ہیں جن میں دوست احباب ہیں، بیوی ہے، بچے ہیں، ان کی دعاؤں میں یقیناً اخلاص بھی ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ بےلوث اور بےغرض دعا سوائے والدین کے اور کوئی نہیں مانگتا۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ ماں باپ کے اٹھ جانے سے بےلوث اور بےغرض دعائیں ختم ہو جاتی ہیں۔ اولاد چاہے کتنے پیار سے دعا مانگے لیکن کوئی نہ کوئی خواہش کہیں نہ کہیں چھپی ہوتی ہے۔ یہی حال بیوی اور دوست احباب کا بھی ہے، لیکن والدین جب دعا مانگتے ہیں تو اپنی ذات کی مکمل نفی کر کے دعا کرتے ہیں۔ تو یہاں خدمت کے ساتھ ساتھ جو دعا کا حکم دیا گیا ہے اور ساتھ والدین کا حوالہ بھی ہے تو اس میں شائد اس بات کی طرف متوجہ کرنا ہے کہ دیکھو تمھارے والدین نے جب تمھاری تربیت کی تھی اس میں جہاں ہر طرح کی دیکھ بھال، خیر خواہی، ہمدردی اور ایثار کا جذبہ کارفرما تھا وہیں اس میں تمھارے لیے بےلوث دعائیں بھی شامل تھیں۔ جن کا سلسلہ ان کی زندگی کے آخری سانس تک قائم رہا۔ وہ اپنے آپ کو بھول کر ہمیشہ تمھاری بھلائی اپنے رب سے مانگتے رہے۔ دیکھنا تم بھی ایسے ہی جذبے کے ساتھ اپنی ذمہ داریاں نبھانے کی کوشش کرنا اور جہاں تک زندگی کے بعد دعاؤں کا تعلق ہے اسے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ماں باپ کے بعد از وفات حقوق میں شامل فرمایا۔ ایک حدیث میں ارشاد فرماتے ہیں:

عَنْ اَبِیْ السَّيِّدِ السَّاعِدِیْ قَالَ بَيْنَمَا نَحْنُ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ اِذْ جَآءَ رَجُلٌ مِّنْ بَنِیْ سَلْمَةَ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ هَلْ بقی من بر ابوی شیء ابرهما مِنْ بَعْدِ مَوْتِهِمَا قَالَ نَعَمْ اَلصَّلٰوةُ عَلَيْهِمَا وَ الْاَسْتِغْفَارُ لَهُمَا وَ اِنْفَاذُ عَهْدِهِمَا وَ صِلَةُ الرَّحِمِ الَّتِیْ لَا تُوْصِلُ اِلَّا بِهِمَا وَ اِكْرَامُ صَدِيْقِهِمَا

(ابو سید الساعدی سے روایت ہے کہ ایک وقت جب ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے بنی سلمہ میں سے ایک شخص آیا اور اس نے دریافت کیا کہ یارسول اللہ کیا میرے ماں باپ کے مجھ پر کچھ ایسے حقوق ہیں جو ان کے مرنے کے بعد مجھے ادا کرنے چاہئیں۔ آپؐ نے فرمایا ہاں ان کے لیے خیر و رحمت کی دعا کرتے رہنا، ان کے واسطے اللہ سے مغفرت اور بخشش مانگنا، ان کا اگر کوئی عہد معاہدہ کسی سے ہو تو اس کو پورا کرنا، ان کے تعلق سے جو رشتے ہیں ان کا لحاظ رکھنا، اور ان کا حق ادا کرنا اور ان کے دوستوں کا اکرام واحترام کرنا۔)

بعد از وفات والدین کے حقوق

اس حدیث میں ماں باپ کے لیے دعا، اللہ سے ان کی بخشش کی طلب، بندوں میں سے کسی کے ساتھ اگر کوئی عہد معاہدہ ہو تو اسے پورا کرنا، ماں باپ کے تعلق سے جو جو رشتے بھی ہیں، ان کا لحاظ کرنا اور ان کا حق ادا کرنا اور زندگی میں ان کے جن کے ساتھ دوستی کے تعلقات تھے ان کا اکرام واحترام کرنا۔

یہ وہ حقوق ہیں جو ماں باپ کی وفات کے بعد بھی اولاد پر باقی رہتے ہیں تو ان میں سب سے پہلا حق ان کے لیے دعائے خیر و رحمت کرنا ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے کہ جب بھی موقع ملے تو آپ اپنے والدین کے لیے یہ دعا کرتے رہا کریں:

رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا

(اے میرے پروردگار! تو ان پر رحمت فرما جس طرح انھوں نے بچپن میں مجھے پالا ہے۔)

Marfat.com

اس کا فائدہ اس کے والدین کو قبر میں اور آخرت میں ان شاء اللہ جو ہوگا سو ہوگا خود اولاد کو بھی اس کا فائدہ جو پہنچتا ہے وہ یہ ہے کہ نافرمان اولاد کو بھی اس دعا کی وجہ سے اللہ تعالیٰ فرمانبردار اولاد میں شامل فرما دیتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ سَلَّمَ اِنَّ الْعَبْدَ لَیَمُوْتُ وَالِدَاہُ اَوْ اَحَدُھُمَا وَ اِنَّہٗ لَھُمَا لَعَاقٌ فَلَا یَزَالُ یَدْعُوْلَھُمَا وَ یَسْتَغْفِرُ لَھُمَا حَتّٰی یَکْتُبُہُ اللّٰہُ بَارًا

(حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی آدمی کے ماں باپ کا یا دونوں میں سے کسی ایک کا انتقال ہو جاتا ہے اور اولاد زندگی میں ان کی نافرمان اور رضامندی سے محروم ہوتی ہے لیکن یہ اولاد ان کے انتقال کے بعد سچے دل سے ان کے لیے اللہ تعالیٰ سے خیر و رحمت کی دعا مانگتی اور بخشش کی التجا کرتی رہتی ہے۔ (اور اس طرح اپنی قصور کی تلافی کرنا چاہتی ہے) تو اللہ تعالیٰ اس نافرمان اولاد کو فرمانبردار قرار دے دیتا ہی اور پھر وہ ماں باپ کی نافرمانی کے وبال اور عذاب سے بچ جاتے ہیں۔

اندازہ فرمائیے کہ اس سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کا کرم کیا ہوگا؟ دنیا میں کی ہوئی غلطیوں کی تلافی اور وہ بھی حقوق العباد کے حوالے سے متعلقہ لوگوں کی موت کے بعد، ظاہر ہے ایک ناممکن بات ہے لیکن پروردگار نے محض اپنے فضل و کرم سے نافرمان اولاد کی کوتاہیوں اور ان کی نافرمانیوں کا ازالہ اس صورت میں فرمایا کہ اگر وہ اپنی کوتاہیوں کو محسوس کرتے ہوئے اپنے لیے مغفرت مانگتے رہیں اور اپنے والدین کے لیے دعاؤں کا سلسلہ جاری رکھیں تو جہاں والدین کو قبر میں رحمت و سکون ملے گا وہاں اس اولاد کے بارے میں بھی امید کی جا سکتی ہے کہ یہ قیامت کے دن عذاب سے بچ جائے۔ جہاں تک والدین کے بعد از وفات دوسرے حقوق کا تعلق ہے اس کی پابندی بھی اولاد پر لازم ہے۔ یعنی انھیں ہر صورت میں اپنے والدین کے معاہدوں کی پابندی کرنی چاہیے۔ وہ اپنے عزیزوں سے جس طرح صلہ رحمی سے پیش آتے تھے، انھیں بھی اس میں کمی نہیں کرنی چاہیے اور زندگی میں جن لوگوں سے انھوں نے اپنی دوستی اور محبت کا تعلق قائم کیا تھا انھیں ان کا احترام ملحوظ رکھنا چاہیے اور اس کی کم سے کم صورت یہ ہے کہ آدمی اپنی ذاتی احباب کی فہرست میں اپنے والدین کے ملنے والوں کو بھی شامل کرے۔ پھر جس طرح مختلف تقریبات کے حوالے سے وہ اپنے احباب کو یاد رکھتا ہے اسی طرح وہ اپنی والدین کے احباب کو بھی یاد رکھے۔ اپنی والدہ کی سہیلیوں کو بھی مختلف اوقات میں تحائف بھیجتا رہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عمل ہمیں احادیث میں ملتا ہے کہ گھر میں جب کبھی آپ کوئی اچھا کھانا تیار کرواتے تو اپنے والدین کے احباب کو بھی یاد فرماتے۔ حتیٰ کہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی سہیلیوں کے گھروں میں بھی پکوان بھجواتے۔

ایک حدیث سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ماں باپ کے قریبی لوگوں سے حسن سلوک اولاد کے ذمہ صرف ماں باپ کا حق ہی نہیں، بلکہ خود اولاد کو اس سے یہ فائدہ پہنچتا ہے کہ اگر ان سے کوئی ایسا بڑ گناہ ہو جائے جس سے بظاہر بخشش کی کوئی صورت نظر نہ آتی ہو تو والدین کے قریبی لوگوں سے حسن سلوک کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ وہ گناہ بھی معاف فرما دیتے ہیں۔ یہ حدیث ملاحظہ فرمائیے۔

عَنْ اِبْنِ عُمَرَ اَنَّ رَجُلًا اَتَی النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ سَلَّمَ فَقَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اِنِّیْ اَصَبْتُ ذَنْبًا عَظِیْمًا فَھَلْ لِیْ مِنْ تَوْبَۃٍ قَالَ ھَلْ لَکَ مِنْ اُمٍّ قَالَ لَا قَالَ وَ ھَلْ لَکَ مِنْ خَالَۃٍ قَالَ نَعَمْ قَالَ فَبِرَّھَا

(حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ حضور! میں نے ایک بہت بڑا گناہ کیا ہے تو کیا میری توبہ قبول ہو سکتی ہے؟ اور مجھے معافی مل سکتی ہے۔ آپؐ نے پوچھا تمھاری ماں زندہ ہے؟ اس نے عرض کیا ماں تو نہیں ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ تمھاری کوئی خالہ ہے؟ اس نے عرض کیا ہاں خالہ موجود ہے۔ آپؐ نے فرمایا تو اس کی خدمت کر اور اس کے ساتھ اچھا سلوک کر۔ (اللہ تعالیٰ اس کی برکت سے تمھاری توبہ قبول فرمالے گا اور تمھیں معاف فرمادے گا)

Marfat.com

والدین کی اطاعت کی دنیوی برکات

آخر میں ہم یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ ماں باپ کی فرمانبرداری کے دنیوی اور اخروی نتائج کیا ہوں گے؟ جہاں تک دنیا میں اس کے نتیجہ خیز ہونے کا تعلق ہے اس کا ذکر ہم شروع میں کر چکے ہیں۔ کوئی معاشرہ بھی حفاظت اور تربیت کے حوالے سے مستحکم بنیادوں پر قائم نہیں ہو سکتا۔ جس معاشرے میں والدین کا مقام و مرتبہ محفوظ نہ ہو اور جس میں ماں باپ کے تعلق کو معاشرے کی ایک مضبوط بنیاد کے طور پر قبول نہ کیا جائے۔ لیکن جہاں تک اس کی دنیوی برکات کا تعلق ہے اس سلسلہ میں ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چند احادیث نقل کرتے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ماں باپ کی فرمانبرداری کی دنیا میں جو سب سے پہلی برکت سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی وجہ سے فرمانبرداری کرنے والوں کی عمر میں اضافہ فرماتا ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَ سَلَّمَ اَنَّ اللّٰہَ یَزِیْدُ فِیْ عُمْرِ الرَّجُلِ بِبِرِّ وَّالِدَیْہِ

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ماں باپ کی خدمت فرمانبرداری اور حسن سلوک کی وجہ سے آدمی کی عمر میں اضافہ فرما دیتا ہے۔)

دوسری دنیوی برکت یہ ہے کہ جو اولاد ماں باپ کی فرمانبرداری اور خدمت کرے گی اللہ تعالیٰ اس کی اولاد کو اس کی فرمانبرداری اور خدمت گزار بنا دے گا۔ اسی طرح جو لوگ پاکدامنی کی زندگی گزاریں گے اللہ تعالیٰ ان کی بیویوں کو پاکدامنی کی توفیق عطا فرمائے گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

عَنْ اِبْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَ سَلَّمَ بِرُّوْا اٰبَآءَ کُمْ یَبِرُّ اَبْنَآءُ کُمْ وَ عِفُّوْا تَعِفُّ نِسَآءُ کُمْ

(حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اپنے والدین کی خدمت اور فرمانبردری کرو، تمہاری اولاد تمہاری فرمانبرداری اور خدمت گزار ہوگی۔ اور تم پاکدامنی کے ساتھ رہو تمہاری عورتیں پاکدامن رہیں گی۔)

تیسرا دنیوی فائدہ یہ ہے کہ والدین کی خدمت سے اللہ تعالیٰ رزق میں وسعت عطا فرماتا ہے۔ ارشاد نبوی ہے:

عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ سَلَّمَ مَنْ اَحَبَّ اَنْ یُّبْسَطَ فِیْ رِزْقِہٖ وَ یُنْسَا لَہٗ فِیْٓ اَثَرِہٖ فَلْیَصِلْ رَحْمَہٗ

(حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو چاہتا ہے کہ اس کے رزق میں وسعت کی جائے اور اس کے اجل میں تاخیر کی جائے تو اپنا رشتہ پیوست رکھے۔)

مختصر یہ کہ والدین کے ساتھ حسن سلوک اور ان کی اطاعت اور بعد از وفات ان کے لیے رحمت و مغفرت کی دعائیں کرنا، ان کے معاہدوں کی پاسداری کرنا اور ان کے ملنے جلنے والوں سے اچھا رویہ رکھنا یہ وہ قدریں ہیں جن سے خاندان مضبوط ہوتا اور اہلِ خاندان کو معاشرتی تحفظ میسر آتا ہے۔ نتیجۃً معاشرے میں یکجہتی اور ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے۔ ایثار و محبت کی قدریں پروان چڑھتی ہیں اور معاشرے میں رہنے والے لوگ خوشحالی، خوش اطواری اور خوشگواری کی زندگی گزارتے ہین، لیکن اگر والدین کا یہ ادارہ متاثر ہوتا ہے تو اس کے نتیجے میں پلنے والے بچے ان تمام قدروں سے آہستہ آہستہ محروم ہو جائیں گے جن کا ابھی ہم نے ذکر کیا اور خودغرضی اور خودسری کی لعنتیں معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیں گی، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ معاشرہ اجتماعی سکون سے محروم ہو کر حیوانون کا ایک انبوہ بن جائے گا۔ اس لیے ہم اگر ایک زندہ قوم کی طرح اسلامی اطوار کے حامل بن کر ایک آبرومندانہ زندگی گزارنا چاہتے ہیں تو انتہائی ضروری ہے کہ والدین کے احترام اور حسن سلوک کو زیادہ سے زیادہ مضبوط کرنے کی کوشش کریں۔ باپ کو صحیح احترام اور حسن سلوک کو زیادہ سے زیادہ مضبوط کرنے کی کوشش کریں۔ باپ کو صحیح احترام دیا جائے، وہ نہ صرف گھر کا مرکز ہے، بلکہ وہ گھر کا سربراہ بھی ہے۔ جس طرح گھر بھر کی ذمہ داریوں کا بوجھ اس کے کندھے اٹھائیں اسی طرح بچے اسکے نقوش قدم کو بھی اپنے لیے ایک نعمت سمجھیں۔ اس لیے اسلام نے باپ کی طرف پاؤں

Marfat.com

پکارنے سے، اس کے آگے چلنے سے، اس کے سامنے بلند آواز سے بولنے سے اور اس کی رضامندی سے ہٹ کر فیصلہ کرنے سے منع فرمایا اور جہاں تک حسن سلوک کا تعلق ہے ماں کو باپ سے تین گنا بڑھ کر اس کا مستحق ٹھہرایا گیا۔ کیونکہ جو بے تکلفی اولاد کو اپنی ماں سے ہوتی ہے باپ سے نہیں ہوتی۔ البتہ رہنمائی کا فریضہ چونکہ باپ کو انجام دینا ہے اس لیے اولاد اور باپ میں ایک فرق رکھتے ہوئے اس کے احترام کی زیادہ تاکید فرمائی اور ماں کو حسن سلوک کے حوالے سے زیادہ سے زیادہ محترم بنایا گیا۔ بہر حال والدین ہی اولاد کی جنت بھی ہیں اور جہنم بھی۔ اور انہی کے حوالے سے معاشرہ بنتا بھی ہے اور بگڑتا بھی اور یہی وہ نعمت ہیں جن کی قدر کر کے قومیں دنیا میں سرفراز ہوتی ہیں۔

رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِیْ نُفُوْسِكُمْ ۚ اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِیْنَ فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِیْنَ غَفُوْرًا ﴿۲۵﴾

(تمھارا رب خوب واقف ہے اس سے جو کچھ تمھارے دلوں میں ہے، اگر تم نیک رہو گے تو وہ رجوع کرنے والوں کو بڑا بخشنے والا ہے۔ ۲۵)　(سورۃ بنیٓ اسرآءِ یل : ۲۵)

والدین کی خدمت کی انتہائی تاکید کے بعد بھی پروردگار نے اس آیت میں مزید ایک بات کی طرف توجہ دلائی ہے، وہ یہ کہ اگر تم والدین کی خدمت اوپرے دل سے کرتے رہے، محض یہ سمجھ کر کہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اور یا لوگوں کو خوش کرنے کے لیے، لیکن تمھارا دل اس میں شریک نہیں تھا تو یاد رکھو یہ خدمت اللہ تعالیٰ کے یہاں قبول نہیں ہوگی۔ اس کے لیے انتہائی پاکیزہ قلبی جذبہ، محبت اور دلی لگاؤ بھی بہت ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ خدمت کو بھی دیکھتا ہے لیکن اس کی نگاہ دلوں پر بھی رہتی ہے کہ خدمت کرنے والا کس طرح کے جذبات سے خدمت کر رہا ہے۔ البتہ اس میں ایک اطمینان کی بات بھی ہے کہ آیت کے دوسرے حصے میں فرمایا کہ اگر تم نے اپنے دلی جذبات کو درست رکھا اور دل سے خدمت بجالانے کی کوشش کرتے رہے اور ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ سے معافی بھی مانگتے رہے کہ کوئی کمی بیشی ہو جائے تو معاف فرما دیا جائے تو اللہ تعالیٰ کا کرم یہ ہے کہ ان جذبات کے ساتھ اگر خدمت میں کوئی کمی بھی رہ جائے تو اللہ تعالیٰ نظر کرم سے محروم نہیں کرتا بلکہ وہ ایسی تمام غلطیوں کو جو بے خیالی میں ہو جاتی ہیں معاف کرنے والا ہے۔

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِیْرًا ﴿۲۶﴾ اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ ۭ وَكَانَ الشَّیْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا ﴿۲۷﴾　(سورۃ بنیٓ اسرآءِ یل : ۲۶. ۲۷)

(اور تم قرابت دار کو اس کا حق دو اور مسکین اور مسافر کو بھی، اور مال کو اللے تللے نہ اڑاؤ۔ ۲۶) اللے تللے اڑا دینے والے شیطانوں کے بھائی ہوتے ہیں اور شیطان اپنے رب کا بڑا ہی ناشکرا ہے۔ ۲۷)

اہلِ قرابت کے حقوق

اللہ تعالیٰ کے حق عبادت اور والدین کے ساتھ حسن سلوک کے بعد تیسرا حق ذوی القربیٰ کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح عقیدہ توحید مسلمانوں میں ایک معنوی اور روحانی وحدت کی بنیاد بنتا ہے اور پھر عبادات اور دوسرے اسلامی احکام اپنے روحانی تسلسل کے ساتھ اس حصار کو مضبوط کرنے کا کام دیتے ہیں اسی طرح خاندان کی جو اکائی والدین کی صورت میں وجود پذیر ہوتی ہے اور پھر اس خاندان کی شاخیں اور برگ و باران کی ذات سے پھوٹنے لگتے ہیں اس اکائی کی حفاظت کے لیے ضروری ہے کہ اس کے کمزور تنوں کی حفاظت کی جائے اور اس کے چاروں طرف قرابت کی دیواریں اٹھائی جائیں۔ تاکہ ایک خاندان جب خاندانوں کے اشتراک کے ساتھ معاشرے میں تبدیل ہو اور پھر یہ بڑھتے بڑھتے اسلامی ریاست کی شکل اختیار کریں تو اس کی اکائیاں باہم ایک دوسرے سے پیوست اور ایک دوسرے کی محافظ ہونی چاہئیں۔ جس طرح ایک مضبوط تنے پر صنوبر کی شاخیں لہراتی ہیں اسی طرح اسی خاندان کے تنے پر اسلامی ریاست کی ایک ایک شاخ آزادی سے لہرانی چاہیے۔ اسلام اسی وحدت اور یک رنگی کو مضبوط کرنے کے لیے ایک ترتیب کے ساتھ احکام دیتا ہے اور اسی ترتیب کے ساتھ اسے آگے بڑھنے کے مواقع بہم پہنچاتا ہے۔ چنانچہ والدین کے رشتے سے جو صلہ رحمی کا رشتہ پھوٹا اسی نے حق قرابت کو جنم دیا۔ اور اسی قرابت نے ساتھ مل کر ایک خاندان کی بنیاد رکھی۔ یہ صلہ رحمی کی بنیاد اس وقت تک فعال صورت میں اپنا

Marfat.com

کردار ادا کرتی رہتی ہے جب تک کہ قرابت کے حقوق درجہ بدرجہ ادا ہوتے رہتے ہیں۔ اور اسی قرابت کی کوئی ایک شاخ یتیمی یا مسکینی کی شکل میں اگر کمزور ہونے لگتی ہے تو وہ اس کی کمزوری کے ازالے کی کوشش کرتے ہیں۔ قرآنِ کریم اور سنت طیبہ نے اس رشتے کے تحفظ کے لیے صلہ رحمی پر سب سے زیادہ زور دیا۔ اور قرآنِ کریم نے اہل کتاب کے جن مواعید اور مواثیق کا ذکر فرمایا ہے ان میں والدین کے بعد قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے حق کا ضرور ذکر فرمایا۔ ان کی اہمیت کا اندازہ اسی سے ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے باقاعدہ اس کے لیے عہد اور میثاق لیے اور قرآن کریم نے ایک سے زیادہ جگہوں پر حق عبادت کی ادائیگی کا حکم دینے کے ساتھ ساتھ ان رشتوں کے تحفظ کا بھی حکم دیا ہے۔ کیونکہ اگر ان رشتوں کا تحفظ نہ کیا جائے اور معاشرے کی ٹوٹتی ہوئی شاخوں کو نہ بچایا جائے تو اسلامی جماعت کی وہ اکائی جو والدین سے شروع ہو کر اسلامی ریاست سے مکمل ہوتی ہے وہ کبھی بھی دراڑوں اور شکست وریخت سے محفوظ نہیں رہ سکتی۔

صلہ رحمی کی اہمیت

عربی زبان میں قرابت کو رَحِم یا رِحْم کہتے ہیں اور قرابت کا حق ادا کرنے کو وصلِ رحم یا صلہ رحمی کہا جاتا ہے۔ اس صلہ رحمی کا مقام اور اہمیت اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں کیا ہی اس کا اندازہ چند احادیث سے ہوتا ہے۔ ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"الرحم شجنة من الرحمان قال اللّٰه تعالیٰ مَنْ وَصَلَکَ وَصَلْتُه وَ مَن قَطَعَکَ قَطَعتُه"

(رحم (حقِ قرابت) مشتق ہے رحمان سے۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے فرمایا کہ جو تجھے جوڑے گا میں اسے جوڑوں گا اور جو تجھے توڑے گا میں اس کو توڑ دوں گا)

یعنی انسانوں کے باہمی قرابت اور رشتہ داری کے تعلق کو اللہ تعالیٰ کے اسم پاک رحمان سے اور اس کی صفتِ رحمت سے خاص نسبت ہے اور وہی اس کا سرچشمہ ہے۔ اس لیے اس کا عنوان رحم مقرر کیا گیا ہے۔ اسی خصوصی نسبت ہی کی وجہ سے عنداللہ اس کی اہمیت ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے کہ جو صلہ رحمی کرے گا یعنی قرابت اور رشتہ داری کا حق ادا کرے گا اور رشتہ داروں کے ساتھ اچھا سلوک کرے گا اس کو اللہ تعالیٰ اپنی ذات سے وابستہ کرلے گا اور اپنا بنالے گا۔ اور جو کوئی اس کے برعکس قطع رحمی کا رویہ اختیار کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو اپنی ذات سے کاٹ دے گا اور دور اور بے تعلق کردے گا۔ یہی بات ایک دوسری حدیث میں بھی فرمائی گئی:

عن عبدالرحمان بن عوف قال سمعت رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه و سلم یقول قال اللّٰه تبارک و تعالیٰ اَنَا اللّٰهُ وَ اَنَا الرَّحمَانُ خَلَقتُ الرَّحِم وَ شَقَقتُ لَهَا مِن اسمِی فَمَن وَصَلَهَا وَصَلته وَ مَن قَطَعَ بَتَتُه

(حضرت عبدالرحمان بن عوف سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا۔ آپ فرماتے تھے کہ اللہ تبارک تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میں اللہ ہوں، میں الرحمان ہوں۔ میں نے رشتۂ قرابت کو پیدا کیا ہے اور اپنے نام رحمان کے مادہ سے نکال کر اس کو رحم کا نام دیا ہے۔ پس جو اسے جوڑے گا میں اس کو جوڑوں گا اور جو اس کو توڑے گا میں اس کو توڑ دوں گا)

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے احکامات اور مشیت سے پیدائش کا ایسا نظام بنایا ہے کہ ہر پیدا ہونے والا رشتوں کے بندھنوں میں بندھا ہوتا ہے۔ پھر ان رشتوں کے کچھ فطری تقاضے اور حقوق ہیں، جن کا عنوان اللہ تعالیٰ نے رحم مقرر کیا۔ جو اس کے نام رحمان سے مشتق ہے۔ یعنی دونوں کا مادہ ایک ہی ہے۔ پس جو بندہ انسان کی فطرت میں رکھے ہوئے اور اللہ تعالیٰ کے مقرر کیے ہوئے ان حقوق اور تقاضوں کو ادا کرے گا یعنی صلہ رحمی کرے گا اس کے لیے اللہ تعالیٰ کا اعلان ہے کہ وہ اس کو جوڑے گا۔ یعنی اس کو اپنا بنالے گا اور فضل و کرم سے نوازے گا اور اس کے برعکس کوئی قطع رحمی کا رویہ اختیار کرے گا اور قرابت کے ان حقوق کو پامال کرے گا جو اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائے ہیں اور انسان کی فطرت میں رکھے ہیں تو اللہ تعالیٰ اس کو توڑ دے گا یعنی اپنے قرب اور اپنے رحم و کرم سے محروم کردے گا۔ اس مفہوم کو استعارہ کے گہرے رنگ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اور طریقے سے بھی بیان

Marfat.com

فرمایا۔اس حدیث میں کلام کے تیور بہت تیکھے ہیں، جس سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں صلہ رحمی کس قدر اہمیت کی حامل ہے۔اور قطع رحمی کس قدر خطرناک نتائج کی حامل ہوسکتی ہے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

خلق اللّٰہ الخلق فلما فرغ قامت الرحم فاخذت بحقوی الرحمان فقال مه قالت ھذا مقام العائذ بک من القطیعة فقال الا ترضین ان اصل من و صلک و اقطع من قطعک قالت بلٰی یا رب قال فذالک

(اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا فرمایا جب پروردگار فارغ ہوئے تو رحم یعنی حقِ قرابت نے اٹھ کر پروردگار کا دامن پکڑ لیا۔پروردگار نے فرمایا بتا کیا بات ہے؟ حقِ قرابت نے کہا یہی جگہ قطع رحمی سے آپ کی پناہ لینے کی ہے۔پروردگار نے فرمایا کیا تو اس بات پر راضی نہیں کہ جو تجھے جوڑے میں اسے جوڑوں اور جو تجھے توڑے میں اسے توڑ دوں۔حقِ قرابت نے کہا کیوں نہیں اے رب میں اس پر راضی ہوں۔پروردگار نے فرمایا پھر یہی کچھ ہوگا)

اس حدیث سے اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب مخلوقات پیدا فرمائیں تو اسی دن حقِ قرابت کو باریابی کا موقع بھی دیا۔اس نے پروردگار کا دامن تھام کر یہ عرض کیا یا اللہ آج ہی اس بات کا فیصلہ ہوجانا چاہیے کہ اگر انسانی معاشرہ باقی رکھنا ہے تو اس کا تمام تر دارومدار میرے ساتھ گہری وفاداری پر ہونا چاہیے تو پروردگار نے اعلان فرمادیا کہ میں انسانوں کے ساتھ جو سلوک بھی کروں گا وہ تمھارے حقوق کی پاسداری کے حوالے سے کروں گا۔یہ رحم اور رحمان کے باہمی تعلق اور لفظی اشتراک کی طرف حدیث میں جو بار بار اشارہ کیا گیا ہے اسی طرح کا اشارہ ہمیں قرآنِ کریم میں بھی ملتا ہے۔سورۃ نساء میں ہے:

وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَ لُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ

(اور جس خدا کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو اس کا اور رشتوں کا خیال رکھنا)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اسی معاشرہ پر برستی ہے جن کے باہمی تعلقات بالخصوص قرابت کے تعلقات مضبوط اور باہم ایک دوسرے سے پیوست ہوں اور اگر ان میں دراڑیں پڑجاتی ہیں یا یہ خودغرضیوں کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں تو ایسا معاشرہ اللہ تعالیٰ کے رحم سے دور ہوجاتا ہے۔آج دنیا میں مسلمان جن حالات سے دوچار ہیں اور اللہ تعالیٰ کی رحمت وعنایات سے محرومی کا منظر جو ہر جگہ نظر آرہا ہے بلاشبہ وہ زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والی ہماری بہت سی بداعمالیوں کا نتیجہ ہے۔لیکن ان احادیث کی روشنی میں یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اس بربادی اور محرومی میں بڑا دخل ہمارے اس جرم کو بھی ہے کہ صلہ رحمی اور اس سے متعلق تعلیم وہدایات کو ہماری غالب اکثریت نے بالکل بھلا ہی دیا ہے اور اس باب میں ہمارا طرزِ عمل غیر مسلمانوں سے بھی بدتر ہے۔ہماری بدنصیبی کا عالم تو یہ ہے کہ رشتۂ قرابت جسے بار بار احادیث میں صلہ رحمی یا وصلِ رحم کا نام دیا گیا ہے ہم اس کا صحیح احساس پیدا کرکے اس کے تقاضوں کو بروئے کار لانے کی بجائے اس کے حقیقی تصور تک سے محروم ہوگئے ہیں۔حقیقت تو یہ ہے کہ ہم نے رشتۂ قرابت کو وصلِ رحم کی بجائے فصلِ رحم اور صلہ رحمی کی جائے قطع رحمی میں تبدیل کردیا ہے۔جاہلیتِ قدیمہ کی طرح اس رشتہ کو محبت ومودت کا ذریعہ بنانے کی بجائے ہم نے رقابت اور ہمسری کا ذریعہ بنالیا ہے۔اہلِ قرابت کی کامیابیوں پر خوشی اور مسرت کی بجائے ہم حسد کا شکار ہوکر دل گرفتگی کے اسیر ہوکر رہ جاتے ہیں۔ہمارے دیہات میں رحم وقرابت کے اس نازک اور محترم رشتے کو شریک کا نام دیا جاتا ہے۔جس کے نتیجے میں معاملہ صرف صحت مند مسابقت اور تنافس تک محدود نہیں رہتا۔بلکہ حسد وبغض سے گزر کر جدال وفساد تک پہنچ جاتا ہے۔شاید یہی وجہ ہے کہ قطع رحمی کو نہ صرف بہت بڑا گناہ قرار دیا گیا ہے بلکہ اسے دنیا میں اللہ کی رحمت سے محرومی اور آخرت میں جنت سے محرومی کا سبب قرار دیا گیا ہے۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

لَا یَدْخُلُ الْجَنَّةَ قَاطِعٌ

(قطع رحمی کرنے والا جنت میں داخل نہیں ہوگا)

Marfat.com

یعنی قطع رحمی اتنا بڑا گناہ ہے کہ اس گناہ کی گندگی کے ساتھ کوئی شخص جنت میں نہیں جا سکے گا۔ ہاں جب سزا پا کر اور اس کی تکلیفیں اٹھا کر اس گناہ سے پاک ہو جائے گا اور اللہ کی طرف سے اسے معافی مل جائے گی۔ تب اس کے لیے جنت میں جانا ممکن ہوگا۔ ایک اور حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کسی شخص کو شبِ قدر مل جائے یا کوئی اور ایسا لمحہ نصیب ہو جائے جس میں قبولیت دعا کا وعدہ فرمایا گیا ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ چند اشخاص ہیں جن کی دعائیں ایسے موقعوں پر بھی قبول نہیں ہوتیں اور ایسے مواقع پر بھی ان کے گناہ معاف نہیں ہوتے، جب تک وہ اپنی عادتِ بد سے باز نہ آ جائیں۔ ان بدنصیب لوگوں میں سے ایک وہ شخص ہے جو قطع رحمی کرتا ہے۔ یعنی اہلِ قرابت کے ساتھ اس کا تعلق مناسب نہیں ہے اور وہ ان کے حقوق ادا نہیں کرتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک اور ارشاد سے یہاں تک معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ عموماً ہر گناہ گار کو ارتکابِ گناہ کے بعد سنبھلنے کا موقع دیتے ہیں اور اس بات کی اسے مہلت دی جاتی ہے کہ وہ اپنی حالت درست کرنا چاہے تو کر لے۔ اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرنا چاہے تو مغفرت طلب کر لے، بلکہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بڑے سے بڑے مجرم کو بھی دنیا میں نہیں پکڑا جاتا بلکہ اس کی سزا آخرت میں اٹھا رکھی جاتی ہے۔ لیکن یہ قطع رحمی اتنا بڑا گناہ ہے کہ اس گناہ کے ارتکاب کرنے والے کو دنیا میں بھی سزا ملتی ہے اور آخرت میں بھی وہ اس کی سزا پائے گا۔

عن ابی بکرۃ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و سلم ما من ذنب احری ان یعجل اللّٰہ لصاحبہ العقوبۃ فی الدنیا مع ما یدخر لہ فی الأخرۃ من البغی و قطیعۃ الرحم

(حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کوئی گناہ اس لائق نہیں کہ خدا تعالیٰ اس کے مرتکب کو بہت جلد دنیا ہی میں اس کا بدلہ یا عذاب دے اور آخرت میں بھی اس کے عذاب کو جمع رکھے مگر دو گناہ ہیں، امام وقت کے خلاف بغاوت اور قطع رحمی)

صلہ رحمی صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کا ذریعہ ہی نہیں اور جنت میں داخلے کی ضمانت ہی نہیں بلکہ دنیا میں بھی اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ بہت سی نعمتوں سے سرفراز فرماتا اور بہت سی دنیوی نعمتوں سے نوازتا ہے۔ ان میں سے دو چیزوں کا ذکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں فرمایا:

عن انس قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و سلم من احب ان یبسط لہ فی رزقہ و ینساء لہ فی اثرہ فلیصل رحمہ

(حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو کوئی یہ چاہے کہ اس کے رزق میں فراخی اور کشادگی ہو اور دنیا میں اس کے آثارِ قدیم تا دیر ہیں (یعنی اس کی عمر دراز ہو) تو وہ (اہلِ قرابت کے ساتھ) صلہ رحمی کرے)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ صلہ رحمی یعنی اہلِ قرابت کے حقوق کی ادائیگی اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک وہ مبارک عمل ہے جس کے صلے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے رزق میں وسعت اور عمر میں زیادتی اور برکت ہوتی ہے۔ بظاہر رزق میں وسعت اور عمر میں زیادتی دو الگ الگ چیزیں اور بے جوڑ سے چیزیں معلوم ہوتی ہیں لیکن اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو ایک تعلق بھی ہے۔ وہ یہ ہے کہ جب آدمی اہلِ قرابت سے صلہ رحمی کرے گا اور حسن سلوک کرے گا تو اس کی دو ہی صورتیں ہیں۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ اہلِ قرابت کی مالی خدمت کی جائے اور دوسری صورت یہ ہے کہ اپنا وقت اور اپنی زندگی کا کچھ حصہ ان کے کاموں میں لگایا جائے۔ اس لحاظ سے رزق اور مال میں وسعت مال خرچ کرنے کا بدلہ ہے۔ اور زندگی کی مدت میں اضافہ اور برکت وقت خرچ کرنے کی جزا ہے اور اگر ظاہری نگاہ سے بھی دیکھا جائے تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ خاندانی جھگڑے اور خانگی الجھنیں جو زیادہ ترحق قرابت ادا نہ کرنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں اور آدمی کے لیے دلی پریشانی اور اندرونی کڑھن اور گھٹن کا باعث بنتی ہیں اور کاروبار اور صحت ہر چیز کو متاثر کرتی ہیں۔ لیکن جو لوگ اہلِ خاندان اور اقارب کے ساتھ صلہ رحمی کا برتاؤ کرتے ہیں اور ان کے ساتھ اچھا سلوک رکھتے ہیں ان کی زندگی طمانیت اور خوش دلی کے ساتھ گزرتی ہے اور ہر لحاظ سے ان کے حالات بہتر رہتے ہیں اور فضل خداوندی ان کے شاملِ حال رہتا ہے اور یہ اطمینان اور دلجمعی رزق میں وسعت اور درازیٔ عمر کا سبب بنتی ہے۔

Marfat.com

قطع رحمی دنیا و آخرت میں خسارے کا سبب ہے

جس طرح صلہ رحمی دنیا میں درازیِ عمر اور وسعتِ رزق کا سبب ہے اسی طرح قطع رحمی دنیا و آخرت کے نقصان اور خسران کا باعث ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے:

وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَ يَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ. اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ

(قرآنِ کریم کی ہدایت سے فاسق لوگ ہی محروم رہتے ہیں۔ فاسق وہ ہیں جو اللہ کے عہد کو توڑتے ہیں اور جن رشتوں کو اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے اسے کاٹتے ہیں اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں۔ یہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں)

اس آیت میں اللہ کے عہد کو توڑنے کے فوراً بعد حقِ قرابت کو توڑنے کا ذکر فرمایا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے عہد کو توڑنے یعنی اس کی بندگی سے انکار کرنے کے بعد دوسرے درجے کا اگر کوئی جرم ہو سکتا ہے تو وہ قرابت کے رشتے کو توڑنا اور قرابت کے حقوق ادا نہ کرنا ہے۔ یہ اتنا بڑا جرم ہے کہ ایسا کرنے والے کو فاسق کہا گیا ہے۔ فاسق فسق سے اسم فاعل ہے۔ فسق کا معنی ہے حدود اللہ سے تجاوز کر جانا کیونکہ عربی کا محاورہ ہے:

فسقت الرطبة عن القشرة

(کھجور کا چھلکے سے پھدک کر نکل جانا)

اسی سے فاسق کا مفہوم پیدا ہوا وہ شخص جو حدود اللہ سے پھلانگتا ہوا نکل جائے اور اللہ کے احکام کی پرواہ نہ کرے۔ ایسا آدمی اگر ایک طرف قرآنِ کریم کی ہدایت سے محروم رہتا ہے تو دوسری طرف دنیا اور آخرت میں ناکامی اور خسران اس کا مقدر ہے۔ ظاہر ہے اس سے بڑھ کر بدنصیبی اور کیا ہو سکتی ہے؟ اس بدنصیبی کا سبب قطع رحمی کے سوا اور کیا ہے؟

صلہ رحمی کی اہمیت و افادیت اور دنیا و آخرت میں اس کی وجہ سے کامیابی و کامرانی اور قطع رحمی کی قباحت و شناعت اور اس کی وجہ سے دنیا و آخرت میں ناکامی و رسوائی کی وضاحت کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ صلہ رحمی کی حقیقت کیا ہے اور اس کے تقاضے کیا ہیں اور قرآن و سنت نے اس سے متعلق کیا ہدایات دی ہیں؟

صلہ رحمی سے مراد یہ ہے کہ والدین کے حوالے سے جو ددھیالی اور ننھیالی رشتے وجود میں آتے ہیں اور پھر نکاح اور شادی خانہ آبادی کے بعد جو صہری رشتے اور روابط پیدا ہوتے ہیں ان سب رشتوں کا لحاظ کیا جائے ان سے روابط نبھانے کی کوشش کی جائے اور اگر تغیرِ حالات یا ناگہانی افتاد سے اہلِ قرابت میں کوئی کسی طرح کے تعاون اور اعانت کا ضرورت مند ہو تو بقدر مقدور دستِ تعاون دراز کیا جائے۔

اسلام اس میں معاملہ میں عام انسانی سطح سے بلند ہو کر اہلِ قرابت سے حسنِ سلوک کا حکم دیتا ہے۔ یعنی وہ صرف اس بات کا حکم نہیں دیتا کہ اہلِ قرابت کے حقوق ادا کیے جائیں کیونکہ یہ تو عدل کا تقاضہ ہے وہ تو احسان کا حکم دیتا ہے جو ادائے حقوق سے آگے کا مرحلہ ہے جود و کرم اور فیاضی جیسے الفاظ بھی شاید اس کا مفہوم واضح کرنے کے لیے کافی نہیں۔ اس معاملے میں اس میں اسلام نے جس ژرف نگاہی نزاکتِ احساس اور اخلاق کی انتہائی بلندی کا ثبوت دیا ہے۔ اس کا احاطہ کرنا تو ممکن نہیں چند ضروری ہدایات کا ذکر کرتا ہوں۔

ا......سب سے پہلی بات یہ کہ حقِ قرابت کی اہمیت اور شرعی حیثیت کے ادراک کے ساتھ ساتھ اہلِ قرابت کے رشتوں کا ادراک ہو۔ یعنی جو اہلِ قرابت رشتے میں بڑے ہیں، ان کے رشتے کے تقدس کا لحاظ کیا جائے اور جو عمر میں بڑے ہیں ان کی عمر کا احترام کیا جائے۔ چچا، تایا پھوپھی ماموں خالہ بھائی بہنیں سسر ساس بیوی کے بھائی یہ سب رشتے اپنی ایک عظمت اور تقدس رکھتے ہیں۔ انھیں کبھی مجروح نہ ہونے دیا جائے ان کی اولادیں اگر عمر میں بڑی ہوں تو احترام ملحوظ رکھا جائے اور اس میں بطورِ خاص اس بات کا خیال رکھا جائے کہ قرابت دار اور رشتے دار اپنے حقِ قرابت کی وجہ سے آپ کی

Marfat.com

طرف سے احترام خیر خواہی اور ہمدردی کے مستحق ہیں۔ان کی ذاتی حیثیت معاشرتی مقام اور مالی حالت کا اس میں کوئی دخل نہیں ہونا چاہیے۔آج کی گمراہیوں میں ایک گمراہی یہ بھی ہے کہ ہم میل ملاپ میں معاشرتی مقام، مالی حیثیت اور ذاتی وجاہت کو ہمیشہ اولیت دیتے ہیں۔اگر کوئی عہدہ و منصب اور اثر و نفوذ میں ہم جیسا یا ہم سے بڑھ کر ہے تو ہم سوچکر کاٹ کر بھی رشتہ ڈھونڈ نکالیں گے اور اگر کوئی ظاہری حیثیت میں فروتر اور مالی حیثیت میں بے مایہ آدمی ہے تو قریبی قرابت رکھتے ہوئے بھی ہم پہچاننے سے انکار کر دیں گے۔اسلام شدت سے اسے ناپسند کرتا ہے۔وہ صلہ رحمی یعنی حقِ قرابت کے احترام واہتمام کا حکم دیتا ہے۔یہی اس کے نزدیک تعلقات کی حقیقی بنیاد اور معاشرت کی حقیقی روح ہے۔

۲......اہلِ قرابت کے حقوق اور حسن سلوک کے ضمن میں صرف معاشرتی احترام کافی نہیں۔اگر یہ حسن سلوک کی بنیاد ہے اور اس پر باقی عمارت استوار کی جاسکتی ہے بلکہ اگر کوئی قرابت دار مالی دشواریوں کا شکار ہے تو آپ کی طرف سے زبانی احترام اس کی ضرورت کا مداوی نہیں ہوسکتا۔کیونکہ

باتوں سے کبھی درد کا درماں نہیں ہوتا
شبنم سے کبھی پیاس بجھائی نہیں جاتی

اس لیے قرآنِ کریم نے واضح طور پر ذوی القربیٰ کے لیے مالی اعانت کرنے کا حکم دیا اور پھر اس مالی اعانت کو خیرات یا احسان نہیں، بلکہ ان کا حق قرار دیا۔یعنی جب کوئی مالدار اپنے غریب رشتے دار کی مالی اعانت کرے تو کبھی یہ گمان نہ کرے کہ میں اس پر کوئی احسان کر رہا ہوں۔نہ اسے کبھی احساس جتلائے اور نہ اپنے دل میں کبھی ایسا خیال لائے، بلکہ یہ سمجھ کر اس کی مدد کرے کہ یہ اس کا میرے ذمہ حق تھا جو میں اسے لوٹا رہا ہوں۔جیسے جیسے یہ خیال اس کے ذہن میں پختہ ہوتا جائے گا ویسے ویسے اس کی یہ کیفیت ہوتی جائے گی کہ وہ خود ضرورت مند رشتہ داروں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر مدد کرے گا۔وہ اس بات کا انتظار نہیں کرے گا کہ ضرورت منداس کے دروازے پر آ کر دستِ سوال دراز کریں۔دیکھئے قرآنِ کریم اس معاملے میں کس وضاحت سے احکام دیتا ہے۔ارشاد ہوتا ہے:

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ. فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ

(اہلِ قرابت کو اس کا حق ادا کرو)

اور سچے مسلمان کی تعریف کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

وَ اٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّهٖ ذَوِی الْقُرْبٰی

(اور وہ محض اللہ کی محبت کی بناء پر قرابت داروں کو مال دیتے ہیں)

دیکھئے ان آیات میں دو باتیں ارشاد فرمائیں:

۱...... اپنے رشتے داروں کی مدد کرو کیونکہ یہ انکا حق ہے۔یہ حق ادا کرنا تم پر لازم ہے۔

۲...... سچے مسلمان محض اللہ کی رضا کے لیے رشتہ داروں کی مالی اعانت کرتے ہیں۔ان پر احسان نہیں کرتے۔مزید فرمایا:

یَسْئَلُوْنَکَ مَا ذَا یُنْفِقُوْنَ. قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَیْرٍ فَلِلْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ

(لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کیا خرچ کریں؟ کہہ دیجیے جو مال بھی تم خرچ کرو وہ (پہلے) والدین کے لیے ہے پھر اہلِ قرابت کے لیے)

یعنی مالی تعاون اور خدمت کے لیے سب سے اولین جگہ والدین ہیں اس کے بعد قرابت دار اور رشتے دار ہیں۔والدین تو خیر اولاد کی ذمہ داری ہیں۔اس کے علاوہ اگر آدمی مال خرچ کرنا چاہے حتیٰ کہ زکوۃ بھی دینا چاہے تو سب سے پہلے اور سب سے اہم مصرف اعزہ و اقرباء ہیں۔ان کو نظر انداز کر کے عام مسلمانوں کی مالی اعانت کرنا ہرگز مناسب نہیں۔

۳...... مسلمانوں میں جو اخلاقی کمزوریاں آئی ہیں،ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ہم بالعموم معاشرتی تعلقات اور میل ملاپ ان رشتہ داروں

Marfat.com

سے رکھتے ہیں جو ہم سے رکھتے ہیں۔ جو ہمارے یہاں آتے ہیں ہم ان کے یہاں جاتے ہیں۔ جو اپنی تقریبات میں ہمیں دعوت دیتے ہیں ہم اپنی تقریبات میں انھیں بلاتے ہیں۔ جو ہمیں نظر انداز کرتا ہے ہم بھول کر بھی اس کا نام لینا پسند نہیں کرتے گویا ہمارے معاشرتی تعلقات بھی ترازو کے تول پر چڑھے رہتے ہیں۔ جس میں تعلق محبت اور قرابت کی علامت نہیں، بلکہ اس ہاتھ لے اس ہاتھ دے۔ یہ سودا نقد بہ نقدی ہے، والا معاملہ ہے۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اصلاح کرتے ہوئے اور صلہ رحمی کی حقیقت واضح کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

لیس الواصل بالمکافی ولکن الواصل الذی اذا قطعت رحمہ وصلھا

(وہ آدمی صلہ رحمی کرنے والا نہیں جو (صلہ رحمی کرنے والے اپنے اقربا کے ساتھ) بدلہ کے طور پر صلہ رحمی کرتا ہے بلکہ صلہ رحمی کرنے والا وہ ہے جو قطع رحمی کرنے والے سے صلہ رحمی کرے)

صلہ رحمی تو ایک پاکیزہ جذبہ ہے جو اللہ تعالیٰ سے محبت اور اعزہ و اقرباء کے ساتھ ہمدردی و خیر خواہی کے نتیجہ میں وجود میں آتا ہے۔ لیکن اگر اسے دوکانداری اور معاوضہ کی صوت دے دی جائے تو پھر صلہ رحمی کا جذبہ فروغ پذیر ہونے کی بجائے روز بروز کمزور ہوتا جائے گا۔ آخر ایک دن ایسا آئے گا کہ اللہ کی یہ بستی جذبات اخوت و محبت کا مرکز اور انسانیت کا محور و منبع بننے کی بجائے ایک دوکان میں تبدیل ہو جائے گی۔ جب کہ اسلامی تعلیمات کا حاصل ایسے اخلاقی اوصاف پیدا کرنا ہے جو اللہ تعالیٰ کی صفات اور اخلاق کا عکس ہوں اور جن کے پس منظر میں اپنے خالق و مالک سے محبت اور خلق خدا سے ہمدردی و خیر خواہی کے جذبے کے سوا اور کوئی جذبہ کارفرما نہ ہو۔ بلکہ اسلام کی اخلاقی تعلیمات قدم بقدم جس طرح اپنے ماننے والوں کو اخلاقی بلندیوں کی طرف لے جانا چاہتی ہیں اس میں اس بدلے اور معاوضے کی خست کا تو کیا گزر ہو سکتا ہے البتہ اس میں ایسی ہدایات ضرور ہیں جس میں جذبۂ اخلاص و محبت نفی ذات تک پہنچ جاتا ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ سب سے افضل صدقہ کون سا ہے؟ آپؐ نے فرمایا جو ایک بے مایہ اپنی محنت کی کمائی میں سے اپنے کسی ایسے عزیز پر خرچ کرتا ہے جو اس کے خلاف اپنے دل میں عداوت رکھتا ہے۔ اندازہ فرمائیے۔ ایک بے مایہ یعنی غریب اور مفلوک الحال شخص جس کا کل سرمایہ دن بھر کی کمائی ہے جو اس نے اپنے جگر خون کر کے اپنے اہل و عیال کی ضروریات کے لیے مہیا کی ہے۔ وہ اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ کاٹ کر ایسے عزیز اور رشتہ دار پر خرچ کر رہا ہے جس سے رشتۂ محبت تو دور کی بات ہے اس کے برعکس وہ اپنے دل میں اس کے لیے عداوت اور دشمنی کے جذبات رکھتا ہے اور یہ اس کے ان جذبات سے واقف بھی ہے لیکن یہ پھر بھی اس پر خرچ کر رہا ہے۔ میں نہیں سمجھتا اس سے بڑھ کر اعزہ و اقرباء کے لیے صلہ رحمی کا کوئی اور مرحلہ بھی ہو سکتا ہے۔

۴...... انسانی فطرت اور انسانی داعیات و جذبات کے جاننے والے جانتے ہیں کہ آدمی اپنے اعزہ و اقرباء سے حسن سلوک کرتے ہوئے ان کی بے التفاتیوں کو بھی برداشت کر لیتا ہے اور اگر اللہ نے توفیق دی ہو تو اپنی ضرورتوں پر ترجیح بھی دے سکتا ہے اور اگر رحمت حق یاوری کرے تو دشمنوں سے پیار بھی کر سکتا ہے۔ لیکن ایک ایسے شخص کو برداشت کرنا چاہے وہ کتنا ہی قریبی عزیز کیوں نہ ہو بلکہ اس کے ساتھ حُسنِ سلوک کرنا اور مالی اعانت کرنا، جس نے اپنے محسن کی عزت پر حملہ کیا ہو اور جس کے طعن و تشنیع یا بدگمانی اور بدزبانی کے تیر خلعت عفت و عصمت کو تار تار کر رہے ہوں اگر ناممکن نہیں تو ممکن بھی نہیں، لیکن اسلام کی صلہ رحمی یعنی حق قرابت کی ادائیگی بلکہ حسن سلوک کے حوالے سے تعلیم و تاکید اس ناممکن کو ممکن ہی نہیں بلکہ امر واقع بنا کر یہ حکم دے رہی ہے کہ تمھارے ساتھ تمھارے قرابتدار کیسا ہی سلوک کریں تمھیں ہرگز ان سے بدسلوکی کی اجازت نہیں بلکہ اگر تم پہلے ان سے مالی اعانت کی صورت میں حُسنِ سلوک کر رہے تھے تو اب ان انتہائی ناگوار بلکہ بظاہر نا قابل برداشت حملوں کے بعد بھی تم اپنا رویہ ہرگز نہ بدلو۔ ارشاد فرمایا:

وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنكُمْ وَالسَّعَةِ أَن يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۖ وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا ۗ أَلَا تُحِبُّونَ أَن يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ

(تم میں جو لوگ بڑائی اور کشائش والے ہیں وہ قرابتداروں کو نہ دینے کی قسم نہ کھائیں، کیا تمھیں یہ بات پسند نہیں کہ اللہ تعالیٰ تمھیں معاف کر دے)

Marfat.com

آیت کا شانِ نزول

یہ آیت حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں اس وقت نازل ہوئی جب انھوں نے قسم کھائی تھی کہ وہ مسطح بن اثاثہ رضی اللہ عنہ کو کوئی نفع نھیں پہنچائیں گے۔ یہ مسطح حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے خالہ زاد تھے۔ حضرت صدیق اکبر ان کی ناداری کے سبب ان کے پورے خاندان کی مالی کفالت فرماتے تھے لیکن واقعہ افک میں منافقین کے پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر انھوں نے منافقین کی ہاں میں ہاں ملانی شروع کر دی اور حضرت صدیقہؓ سے متعلق نامناسب باتیں کھیں۔ حضرت کا ایسی باتوں سے دل گرفتہ ہونا ایک فطری امر تھا کیونکہ ان باتوں سے براہِ راست ان کی عزت پر حملہ کیا گیا تھا۔ کیونکہ حضرت صدیقہؓ آپ کی صاحبزادی تھیں۔ پھر منافقین نے براہِ راست آنحضرت ﷺ کے گھر کو نشانہ بنایا تھا جس کے اثرات ذاتِ نبویؐ اور منصب نبوت تک پہنچتے تھے۔ پھر مسطح کا اس مکروہ سازش میں اپنی سادگی سے شریک ہو جانا اس وجہ سے بھی تکلیف دہ تھا کہ وہ صدیق اکبر کے زیر بار احسان تھے۔ اور یہ محسن کشی کی بدترین مثال تھی جس کی ایک بدری صحابی سے ہرگز توقع نہ کی جا سکتی تھی۔ ان تمام اسباب نے مل کر حضرت صدیق اکبر کو انتہا درجہ آرزدہ کر دیا۔ چنانچہ جب قرآنِ کریم کی آیات حضرت عائشہؓ کی برأت میں نازل ہوئیں اور پروردگار نے حضرت مریم علیہا السلام کے بعد دنیا کی اس خوش قسمت ترین خاتون کی عفت و طہارت کی گواہی دی تو حضرت ابوبکرؓ نے قسم کھائی کہ وہ اب مسطح بن اثاثہ کی مالی کفالت نھیں کریں گے۔ تو اس پر قرآنِ کریم نے مداخلت فرمائی اور آپ کو اپنا رویہ تبدیل کرنے سے روک دیا۔ تاہم آپ کے دل کو چونکہ اس سے بہت چوٹ لگ چکی تھی اس پر اللہ نے تعالیٰ نے یہ انعام دیا "اَلَا یُحِبُّوْنَ اَنْ یَّغْفِرَ اللّٰہُ لَکُمْ" (کیا انھیں پسند نھیں ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے گناہ معاف کر دے) اسے سنتے ہی حضرت صدیق اکبر بول اٹھے: "بلی واللہ انا نحب ان تغفرلنا یا ربنا" (کیوں نھیں۔ اللہ کی قسم ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہمیں معاف فرما دیں۔ اے ہمارے رب!)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرابتدار اور اعزہ و اقربا چاہے کیسا ہی رویہ اختیار کیوں نہ کریں ان سے مالی تعاون اور حسن سلوک روکا نھیں جا سکتا۔

۵...... اہلِ قرابت کے ساتھ حسن سلوک کی یہ چار صورتیں ہیں جسے میں نے اپنے فہم کے مطابق عام انسانی احساسات اور ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے بیان کیا ہے۔ ورنہ اہلِ دل اور اہلِ نظر کے یہاں اس کا دامن مزید وسیع ہوگا۔ البتہ ایک بات واضح رہنا چاہیے کہ حسن سلوک کی یہ تمام صورتیں معاشرت اور عملی زندگی سے متعلق ہیں، بلکہ بیشتر صورتوں میں مسلم قرابتدار اور غیر مسلم قرابتدار برابر ہیں۔ یعنی دونوں سے حسن سلوک کیا جائے گا۔ البتہ ایک حق ایسا ہے جس کے عموم میں تو تمام قرابتدار شامل ہیں لیکن خصوصی طور پر یہ حق صرف غیر مسلم قرابتداروں یا دین بیزار مسلمانوں یا دین سے بے نیاز مسلمانوں کا ہے۔ جس کا قرآنِ کریم نے ان الفاظ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا:

وَ اَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ

(اپنے قریبی رشتہ داروں کو اللہ کے عذاب سے ڈرا)

اس حکم پر عمل کرتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قریبی عزیزوں کو کھانے پر بلایا اور ان کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوتی خطبے میں بطورِ خاص حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ، حضرت صفیہ بنت عبدالمطلب اور حضرت فاطمہ بتول رضی اللہ عنہما کے اسماء کا ذکر ملتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اہلِ قرابت کے جو حقوق پروردگار نے مقرر فرمائے ہیں ان میں صرف حسن معاشرت، ہمدردی، خیر خواہی اور مالی اعانت ہی نھیں، بلکہ ان سے بھی افضل ترین حق اسلام کی دعوت غیر مسلم قرابتداروں کے لیے اور تعلیم و تربیت دین سے بیزار اور اصلاح عقائد و اعمال کی دعوت مسلمان قرابتداروں کے لیے ہے۔ جس طرح دوسرے حقوق سے متعلق سوال ہوگا۔ اسی طرح اس اہم تر اور نازک تر حق سے متعلق بھی باز پرس ہوگی۔ ہماری حرماں نصیبی کی کیا انتہا ہے کہ اولاً تو ہم دوسرے حقوق میں بھی انتہا درجہ کے کاہل و غافل واقع ہوئے ہیں۔ لیکن جو خوش قسمت لوگ کسی حد تک ان کے لیے فکرمند اور عامل بھی ہیں انھیں بھی اس اہم ترین حق کا تو بالکل احساس نھیں۔ اگر آپ انھیں اس کا احساس دلائیں بھی تو وہ اسے ایک دقیانوسی بات سمجھ کر خندۂ استہزاء میں اڑا دیں گے حالانکہ کسی قوم کے افراد کا اصل سرمایہ اپنی شناخت اور تشخص کا شعور ہی ہوتا ہے اور اس کے بارے فکرمندی اور سعی و کاوش قوم کی زندگی اور روح کی طرح ہے۔ اقبال نے ٹھیک کہا تھا ؎

Marfat.com

قوم مذہب سے ہے مذہب جو نہیں تم بھی نہیں
جذبِ باہم جو نہیں محفلِ انجم بھی نہیں

اب تک کی قرآن وسنت سے ذوی القربیٰ کے حقوق اور صلہ رحمی کی بہت حد تک وضاحت ہو چکی اور اہلِ قرابت کے ساتھ حسن سلوک کے مراتب ومواضع بھی کسی حد تک بیان ہو گئے۔ اب آخر میں صرف ایک بات عرض کرنا مقصود ہے وہ یہ کہ ان باتوں کا تعلق صرف کتابی زندگی سے نہیں اور نہ ہی ان کی تاکید وترغیب صرف خیر القرون تک محدود رہی۔ بلکہ دوسری صدی ہجری کے آغاز یعنی حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کے زمانے سے لے کر آج تک قرانِ کریم کی ایک آیت جس میں تمام قرآنی اوامر اور منہیات کا خلاصہ آ گیا ہے اور جسے سن کر نہ جانے کتنے اہلِ زبان اس کی فصاحت و بلاغت اور جامعیت کی وجہ سے مشرف بہ اسلام ہوئے۔ جمعہ کے خطبات میں تلاوت کی جاتی ہے۔ اس آیت کے پہلے الفاظ ہیں:

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ وَ اِیْتَآءِ ذِی الْقُرْبٰی
(اللہ تمہیں حکم دیتا ہے عدل، احسان اور اہلِ قرابت (کے حقوق) ادا کرنے کا)

اس آیت میں عدل اور احسان تو ایسے حقوق ہیں جن پر تمام حقوق وفرائض کا دارومدار ہے۔ کیونکہ عدل یہ ہے کہ جس کا جو حق ہم پر عائد ہوتا ہے ہم بے کم وکاست اسے ادا کریں۔ خواہ صاحب حق کمزور ہو یا طاقتور۔ خواہ وہ ہم کو مبغوض ہو یا محبوب۔ اسی سے انسانی زندگی میں توازن اور اعتدال آتا ہے۔ جو انسانی زندگی کی بقا کی ضمانت ہے۔ احسان عدل سے ایک زائد چیز ہے۔ یہ صرف حق کی ادائیگی ہی کا تقاضہ نہیں کرتا بلکہ مزید برآں یہ تقاضا بھی کرتا ہے کہ دوسرے کے ساتھ ہمارا معاملہ کریمانہ اور فیاضانہ ہو۔ اس سے زندگی میں حسن، شائستگی، آسودگی اور ایثار کے جذبات وجود میں آتے ہیں۔ ان دو بنیادی باتوں کو بیان کرنے کے بعد ذوالقربیٰ کے حقوق ادا کرنے کا حکم دیا گیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عدل واحسان جن پر پوری معاشرتی زندگی کا دارومدار ہے ان کا سب سے پہلا محل اور ان کے سب سے بڑھ کر مستحق اہلِ قرابت ہیں، بلکہ ایک لحاظ سے وہ اس سے بڑھ کر استحقاق رکھتے ہیں کیونکہ عدل واحسان کے حقدار تو وہ ویسے بھی ہیں البتہ قرابت کا حق رکھنے کے باعث وہ مزید احسان یعنی حسن سلوک کے مستحق ہیں۔ اس مزید احسان کو صلہ رحمی سے تعبیر کیا گیا ہے اور امت نے قرآن وسنت میں اس کی ترغیب وتاکید کو محسوس کرتے ہوئے خطباتِ جمعہ میں مستقل طور پر شامل کیا تاکہ ہر جمعہ کو اس کی یاد دہانی ہوتی رہے اور امت اس سے غفلت کے باعث صلہ رحمی کے فیوض وبرکات سے محروم نہ رہ جائے اور قطع رحمی کا ارتکاب کر کے کسی محرومی اور تباہی سے دوچار نہ ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں قرابتداروں کے حقوق ادا کرنے اور بیش از بیش حسن سلوک کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ تاکہ امت صلہ رحمی کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کے انعامات وبرکات سے بہرہ ور ہو سکے۔

یتیموں اور مسکینوں کے حقوق

پیشِ نظر آیت کریمہ میں اہلِ قرابت کے بعد مسکین کا حق ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اگرچہ اس میں مسکین کے ساتھ یتیم کا ذکر نہیں لیکن قرآنِ پاک کی اکثر آیات میں معاشرتی حقوق کی جو ترتیب رکھی گئی ہے اس میں اہلِ قرابت کے بعد یتیموں اور مسکینوں کا ذکر ہے۔ کیونکہ یتیم اور حاجت مند لوگ اہلِ قرابت میں سے بھی ہو سکتے ہیں اور دیگر مسلمانوں میں سے بھی۔ اس لیے اس کی ٹھیک جگہ اہلِ قرابت کے پہلو میں ہی ہونی چاہیے تھی۔ مزید یہ کہ یتیم اور مسکین دونوں مسلمان معاشرے کی یکساں ذمہ داری ہیں، اس لیے ہم مسکین کے ساتھ یتیم کا بھی ذکر ضروری سمجھتے ہیں۔

یتیم اکیلے اور منفرد کو کہتے ہیں۔ جس سیپ میں ایک ہی موتی ہو اسے دریتیم کہتے ہیں۔ اس لحاظ سے یتیم وہ ہے جو بچپن یا لڑکپن میں یعنی بلوغ سے پہلے باپ کا سایہ سر سے اٹھ جانے سے اکیلا اور تنہا رہ جائے۔ قریبی عزیزوں کے رحم وکرم پر ہو یا معاشرہ کی ہمدردی و خیرخواہی کا محتاج ہو کر زندگی گزارنے پر مجبور ہو جائے۔

Marfat.com

مسکین مسکنت سے ہے۔ مسکنت کے لفظ میں عاجزی، درماندگی، بیچارگی اور ذلت کے مفہومات شامل ہیں۔ اس اعتبار سے مساکین وہ لوگ ہیں جو عام حاجت مندوں کی بہ نسبت زیادہ خستہ حال ہوں۔ جو اپنی ضروریات کے مطابق ذرائع نہ پارہے ہوں اور سخت تنگ حال ہوں۔ مگر نہ تو ان کی خودداری کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی اجازت دیتی ہو اور نہ ان کی ظاہری پوزیشن ایسی ہو کہ کوئی انھیں حاجت مند سمجھ کر ان کی مدد کے لیے ہاتھ بڑھائے۔ چنانچہ حدیث میں اس کی تشریح یوں آئی ہے:

المسکین الذی لم یجد غنی یغنیه و لا یفطن له فیتصدق علیه و لا یقوم فسأل الناس

(مسکین وہ ہے جو اپنی حاجت بھر مال نہیں پاتا اور نہ پہچانا جاتا ہے کہ اس کی مدد کی جائے اور نہ کھڑا ہو کر لوگوں سے مانگتا ہے)

گویا وہ ایک شریف، خوددار اور غریب آدمی ہے۔

یتیم اور مسکین دونوں ہی اپنی بے کسی اور درماندگی کی وجہ سے یکساں طور پر امداد و اعانت اور ہمدردی و خیر خواہی کے مستحق ہیں، لیکن یتیم مسکنت اور بیچارگی کے ساتھ ساتھ کم عمری اور صغر سنی کے باعث زیادہ ہمدردی و خیر خواہی کا مستحق ہے اور پھر مساکین مین ایک معقول تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہو سکتی ہے جنھیں یتیمی کی بے چارگی میں معاشرے نے سہارا دے کر اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے میں مدد نھیں دی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ زندگی کا بوجھ تو کسی نہ کسی طرح اٹھائے پھرے مگر ذلت و مسکنت سے پیچھا نہ چھڑا سکے۔ اس لیے قرآن کریم اگرچہ یتامیٰ اور مساکین دونوں کے حقوق پر زور دیتا ہے لیکن یتامیٰ کا ذکر پہلے کرتا ہے کیونکہ وہ اپنی اہمیت اور بے چارگی کے باعث یقیناً اولیت کے مستحق ہیں۔

قرآن پاک نے یتیموں اور مسکینوں کے حقوق اور خاندان اور معاشرے کے لیے ان کی اہمیت، ضرورت اور افادیت واضح کرنے کے لیے چار طریقے اختیار کیے، لیکن ہم صرف ایک حوالے تک گفتگو کو محدود رکھنا چاہتے ہیں۔

قرآن کریم نے سب سے پہلے مختلف اسالیب اور متعدد تاریخی حوالوں سے ایک نہایت اہم حقیقت کا انکشاف کیا ہے۔ وہ یہ کہ تاریخ میں کتنی عظیم قومیں منصہ شہود پر آئیں کہ صدیاں گذر جانے کے باوجود آج تک ان کے حیرت انگیز تاریخی آثار ان کی عظمت اور قوت کی گواہی دیتے ہیں۔ جن میں قومِ عاد ہے کہ جنھوں نے سب سے پہلے اونچے ستونوں پر عمارتیں کھڑی کرنے کا طریقہ اختیار کیا۔ بڑے بڑے قصر تعمیر کرنا ان کا من پسند مشغلہ تھا۔ قوت اور شان و شوکت کے اعتبار سے کوئی قوم اس وقت دنیا میں ان کی ٹکر کی نھیں تھی۔

پھر قومِ ثمود اٹھی جس نے پہاڑوں کو ادھیڑ ڈالا۔ پہاڑوں کو تراش کر خوبصورت عمارتیں بنانے والی شاید یہ پہلی قوم تھی۔ آج تک ان میں سے کئی عمارتوں کے آثار زندہ ہیں۔

پھر مصر کے فراعنہ ہیں جن کی جنگی قوت اور فوجوں کی کثرت بھی اپنی جگہ ایک حقیقت تھی لیکن اہرام مصر آج تک ان کی قوت و عظمت کی گواہی دیتے ہیں۔ آج کا ترقی یافتہ انسان تاحال ان کے فن تعمیر کی عظمت کے سامنے سرافگندہ و حیران ہے۔ یہ عظیم اور قوت و شوکت والی قومیں اللہ تعالیٰ کے عذاب کا شکار ہوئیں۔ عذاب کا کوڑا اس بری طرح سے ان پر برسا کہ وہ تاریخ میں عبرت کا نشان بن گئیں۔ قرآنِ کریم ان قوموں اور ان کی وجاہتوں کا ذکر کرنے کے بعد بتاتا ہے کہ ان کی تباہی و بربادی کا سبب اپنے خالق و مالک سے انحراف اور طغیان و معصیت کے ساتھ ساتھ معاشرے کے بے کس و بے بس اور سرافگندہ و درماندہ طبقات کی طرف سے بے پرواہی بلکہ ظلم تھا اور ان طبقات میں بطور خاص یتیم و مسکین کا وہ ذکر کرتا ہے کیونکہ جو معاشرہ یتیموں اور مسکینوں کا خیال نھیں کرتا اس سے باقی پسماندہ اور مظلوم طبقات کی دادرسی کی توقع نھیں کی جاسکتی۔ ارشاد خداوندی ہے:

كَلَّا بَل لَّا تُكْرِمُونَ الْيَتِيمَ وَلَا تَحَاضُّونَ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ

(ہرگز نھیں (ان قوموں کی تباہی کا سبب اور کچھ نھیں) بلکہ تم یتیم کی عزت نھیں کرتے اور مسکین کو کھانا دینے (ضروریات زندگی کی فراہمی) پر زور نھیں دیتے)

Marfat.com

یتیم اور مسکین کے حقوق کی عدم ادائیگی کا ذکر بطورِ خاص اس لیے بھی ہے کہ خاندان کسی بھی معاشرے کی اساس ہے۔ خاندان کی شکست وریخت معاشرے کی اور آخر کار پوری قوم کی تباہی پر منتج ہوتی ہے۔ خاندان کے ارکانِ اربعہ والدین، اولاد، زوجین اور اہلِ قرابت ہیں اور یتیم اگر خاندان ہی کا حصہ ہے یعنی بیٹا مرجانے کی صورت میں یتیم بچہ دادا کا پوتا ہے اور بھائی کی موت کی شکل میں یہ یتیم چچا کا بھتیجا ہے۔ اب اگر ایسے یتیم کے ساتھ بدسلوکی ہوتی ہے تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ خاندان میں کتنی دراڑیں پڑسکتی ہیں۔ جب تک یہ یتیم بچہ ظلم کی تصویر بن کر زندگی گزارتا ہے تو دوسرے اہلِ قرابت چاہے لفظی ہمدردی کے سوا کچھ نہ کریں لیکن اس یتیم کے ساتھ ہونے والے سلوک کو نہ صرف محسوس کریں گے بلکہ خاندانی تقریبات میں موضوعِ سخن بھی بنائیں گے اور کبھی کبھی زیبِ داستاں کے طور پر بھی ذکر کریں گے۔ ایسی صورت میں خاندانی روابط اور روابط کے استحکام پر جو اثرات مرتب ہوں گے وہ اہلِ نظر سے مخفی نہیں۔ یہ تو وہ اثرات ہیں جو شعوری اور غیر شعوری طور پر خاندان پر اثر انداز ہوں گے۔ لیکن اس کا ایک پہلو اور بھی ہے کہ یتیم بچہ اگر بے مروتی اور بدسلوکی کے سائے میں پروان چڑھتا ہے وہ دادا کی بے مروتی کو دیکھتا ہے تو خون کے گھونٹ پی کے رہ جاتا ہے کہ یہی میرے وہ دادا ہیں کہ میرے باپ کی زندگی میں سراپا محبت وشفقت تھے۔ وہ اپنے چچا اور تایا کے بدلے ہوئے رویہ کو دیکھتا ہے تو نہ جانے کیسے کیسے تاریک رجحانات اس کے رگ وپے میں اترتے چلے جاتے ہیں۔ بچپنے کی وہ عمر جسے پیار اور محبت کی ٹھنڈک میں بسر ہونا چاہیے جب بے التفاتی، بدسلوکی اور بے نیازی کی تیز دھوپ میں جلنے لگتی ہے تو اس نوخیز بچے کی محرومیاں خاندان سے نفرت، بزرگوں سے بدگمانی اور انسانی جذبات سے مایوسی میں ڈھلنے لگتی ہیں۔ عمر میں اضافے کے ساتھ ساتھ یہ محرومیاں دہکتے ہوئے انگاروں کی طرح دہکنے لگتی ہیں جو آخر کار بغاوت اور انتقام کی شکل اختیار کرلیتی ہیں اور معاشرہ جن سے بالواسطہ متاثر ہوتا ہے اور اگر اس یتیم بچے کی کفالت کرنے والے اپنے نہیں پرائے ہیں تو پھر یہ بچہ بڑا ہو کر براہِ راست معاشرے سے اپنی محرومیوں کا انتقام لیتا ہے۔ یہی یتیم بچے بڑے ہو کر مسکین کہلاتے ہیں کیونکہ بعد از بلوغ یتیم، یتیم نہیں رہتا۔ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جائے تو معاشرہ کا کارآمد اور معزز فرد بن جاتا ہے اور اگر خاندان یا معاشرے کی بے پرواہی سے ضائع ہو جائے تو معاشرے کے لیے ناسور بن جاتا ہے۔ غالباً اسی بات کی طرف قرآنِ کریم میں ارشاد فرمایا گیا:

اَرَاَیْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ

(اے مخاطب تو نے اس شخصیت کو دیکھا جو روزِ جزا کو یا جزا کے قانون کو جھٹلاتا ہے)

یعنی اسے اس بات سے انکار ہے کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا جب اعمال کی جزا و سزا سے گزرنا پڑے گا اور وہ اس بات سے انکار کرتا ہے کہ دنیا میں جزا و سزا کا قانون جاری ہے جیسا کرو گے ویسے بھرو گے یہاں کی ریت ہے۔

فَذٰلِکَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ

(اس شخص کے ایسے ہی خیالات کا نتیجہ ہے) کہ یہ یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کو کھانا دینے پر آمادہ نہیں کرتا)

اسی صورتحال کا نتیجہ ہے کہ محبت ومروت اور ایثار وہمدردی سے محروم یہ طبقہ (یتیم ومسکین) وقت آنے پر معاشرے سے انتقام لیتا ہے۔ جب یتیم کو چچا کے مظالم اور چچازاد بھائیوں کی بے اعتنائیاں یاد آتی ہیں تو وہ بڑا ہو کر چچازاد بھائیوں بلکہ تمام اہلِ قرابت سے اپنے زخموں کا انتقام لیتا ہے۔ اور اگر خاندان سے باہر معاشرہ بھی اس کی محرومیوں کا سبب بنتا رہا ہے تو وہ معاشرے کے افراد کو بھی زیادتیوں کا نشانہ بنا کر سکون حاصل کرتا ہے۔ یہ جو ہم نے نوجوانوں کو بینک لوٹتے، ڈاکے ڈالتے، عفتوں کے فانوس توڑتے اور عظمتوں کے چراغ بجھاتے دیکھتے ہیں یہ دراصل اپنی محرومیوں کا انتقام ہے اور پھر اس میں صرف یتامیٰ اور مساکین ہی شریک نہیں بلکہ بڑے اور خوشحال لیکن تہذیب خوردہ اور مغرب زدہ خاندانوں کے چشم وچراغ بھی ہیں جنھیں ان کی ماؤں نے اپنی سوشل مصروفیات اور بیگمات کی تفریحات کے باعث پیار نہیں دیا۔ بچے ان کے پیار کو ترستے رہے لیکن وہ صنفِ نازک کے حقوق حاصل کرنے اور عورت کا مقام بلند کرنے کے لیے دن بھر مختلف تقریبات میں شرکت اور اس کے لیے دن میں کئی کئی دفعہ لباس بدلنے کی مصروفیت کے باعث بچوں کے لیے وقت نہ نکال سکیں اور باپ جلبِ زر کی دوڑ اور کلبوں کی مصروفیت کی وجہ سے بچوں کو وقت نہ دے سکے۔ آج یہ بچے انسانی احساس سے تہی دامن انسانی معاشرے کو ادھیڑنے کھدیڑنے میں لگ گئے۔ تاریخ یہ سبق دیتی ہے کہ جو قومیں اپنے خاندان کے اجزا کو نہیں سمیٹتیں ان کے شیرازہ کو

Marfat.com

بکھرنے سے کوئی نھیں روک سکتا اور جو قومیں اپنے مساکین یعنی معاشرے کے گرے ہوئے اور پسماندہ افراد کو سہارا نھیں دیتیں یہی افراد معاشرے کے خلاف بغاوت کر دیتے ہیں۔ نیتجتاً معاشرہ خانہ جنگی کا شکار ہو کر قومی استحکام سے محروم ہو جاتا ہے۔ اب اس کو گرانے کے لیے چند حوادث ہی کافی ہوتے ہیں۔ مزید برآں قرآنِ کریم ہمیں یہ بھی آگاہی دیتا ہے کہ ایسی قومیں اور ایسے معاشرے جو یتامیٰ و مساکین کے حقوق کی پرواہ نھیں کرتے ان کی صرف دنیا ہی تباہ نھیں ہوتی ان کی آخرت بھی برباد ہو جاتی ہے۔ وہ انجام کار جہنم کا ایندھن بن جاتے ہیں۔ ارشادِ خداوندی ہے:

مَاذَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ

(اہل جہنم سے پوچھا جائے گا کس چیز نے تمھیں جہنم میں پہنچایا)

قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِينَ

(وہ کہیں گے ہم نمازی نھیں تھے اور ہم مسکین کو کھانا نھیں کھلاتے تھے)

انسانی اجتماعیت جب بگاڑ کا شکار ہوتی ہے تو اس میں یوں تو اہلِ قرابت کے حقوق بھی ادا نھیں ہوتے اور یتیموں اور مسکینوں کو بھی کوئی نھیں پوچھتا، تاہم اہلِ قرابت اور انھی میں سے کمزور طبقہ یتامیٰ اور مساکین اپنی قرابت کے باعث کچھ نہ کچھ توجہ کے مستحق ضرور سمجھے جاتے ہیں لیکن اس کے علاوہ بھی انسانی اجتماعیت کے ایسے اجزا بھی ہیں جو ناموافق حالات میں کوئی سا سہارا نھیں پاتے۔ اسلام چونکہ ایک ہمہ گیر اور دوررس اثرات کا حامل دین ہے اس لیے اس کی رحمت کی بارش نے کسی ایسے طبقے کو بھی محروم نھیں رہنے دیا جن کا عام طور پر کوئی سہارا نھیں ہوتا۔ انھی میں سے ایک طبقہ وہ ہے جنھیں ابن السبیل یعنی مسافر کہا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم نے اسے بھی پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں شامل فرمایا اور مسلمانوں کے حقوق میں اس کے حق کو بھی شامل کیا۔

مسافر کے حقوق

مسافر اندرونِ ملک یا بیرونِ ملک سے آنے والا کوئی شخص یا چند اشخاص جو کسی بھی نیک ارادے سے گھر سے نکلے ہوں چاہے وہ تبلیغی ارادے سے آئے ہوں یا تجارتی ارادے سے۔ گھومنے پھرنے اور سیر کرنے کے لیے یا کسی خاص علاقے کے تاریخی آثار دیکھنے یا کسی خاص علاقے میں خاص موسم سے محظوظ ہونے کے لیے۔ یہ تمام لوگ مسافر ہیں۔ ان میں دونوں طرح کے لوگ ہو سکتے ہیں۔ وہ بھی جو اپنے پاس سفری ضروریات کے لیے کافی سرمایہ رکھتے ہیں اور وہ بھی جو واجبی سا خرچ لے کر نکلے ہیں اور کسی وقت بھی ضروریات میں کمی کا شکار ہو سکتے ہیں۔ جو لوگ بظاہر اپنے ساتھ زرِ کثیر یا سہولیات کی ایک بڑی مقدار لے کر آئے ہیں یہ اندیشہ تو ان کے ساتھ بھی لگا ہوا ہے کہ وہ کسی نقصان یا کسی حادثے کا شکار ہو جائیں۔ ان کا سامان چوری ہو جائے، راستے میں ایکسیڈنٹ ہو جائے، کار تباہ ہو جائے، جسمانی طور پر کسی نقصان کا شکار ہو جائیں تو باوجود اس کے کہ یہ لوگ اپنی ذات میں مالدار اور معزز لوگ ہیں لیکن اب چونکہ حالات نے انھیں ضرورت مند اور حاجت مند بنا دیا ہے تو اسلام نے ان کو وہ حقوق عطا کیے جو ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کرنے کے لیے ضروری ہو سکتے ہیں۔

اب ایک صورت تو یہ ہے کہ آپ ان کی کوئی مالی مدد کر کے ان کو سفر کے قابل بنا دیں۔ یہ بھی عین سعادت کی بات ہے اور آنحضرت ﷺ نے مختلف ارشادات میں اور قرآنِ کریم نے اپنی مختلف آیات میں ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کرنے اور بھوکوں کو کھانا کھلانے اور ننگوں کو کپڑا پہنانے کی بہت فضیلتیں بیان فرمائی ہیں۔ لیکن دوسری صورت یہ ہے کہ وہ معاشرے کے پاس بطور مہمان آ جائیں اور معاشرہ انھیں اپنے پاس مہمان ٹھہرا کر ان کو سنبھالا دینے کی کوشش کرے۔

حقیقت یہ ہے کہ جب قرآنِ کریم نازل ہوا اور آنحضرت ﷺ کی بعثت مبارکہ ہوئی اس وقت انسانی معاشرہ اتنا تہی دامن نھیں تھا کہ وہ اپنی آبادی میں آنے والے مسافروں کو پناہ دینے اور ان کو کھلانے پلانے سے عاجز ہو۔ اسلام سے پہلے بھی عرب اپنی ساری برائیوں کے باوجود اس بات پر فخر کرتے تھے کہ ہم مہمانوں کی میزبانی کرتے ہیں۔ چنانچہ ہر آنے والا مہمان جس گھر کے سامنے آ جاتا وہ گھر اس کی میزبانی کرنا اپنے لیے باعث اعزاز

Marfat.com

سمجھتا۔ یہ بات معلوم ہے کہ عرب میں عام طور پر قحط سالی کا سماں رہتا تھا اور ضروریاتِ زندگی کی فراہمی میں بڑی دشواری پیش آتی تھی۔ باایں ہمہ عرب رات کو اپنے گھروں کے سامنے آگ جلائے رکھتے تھے تاکہ صحرا میں گزرنے والے مسافر اس کو دیکھ کر بے جھجک چلے آئیں اور وہ اس بات کا خیال نہ کریں کہ اس آبادی کے لوگ ان کو اپنے لیے بوجھ خیال کریں گے۔ یہ تو تہذیب نو کا ثمر ہے کہ پہلے مہمان خانوں اور سرایوں کا دور آیا اور آج ہوٹلوں کا دور ہے لیکن ان سہولتوں نے انسانی احساسات اور بنیادی اقدار سے مسلمانوں کو محروم کر کے رکھ دیا ہے۔ آج بھی آپ دیہات میں چلے جائیں دیہات میں باہر سے آئے ہوئے مزدور جو دن بھر اجرت پر کام کرتے ہیں رات کو وہ مسجد کے مہمان ہوتے ہیں۔ ان کا کھڑے ہو کر یہ کہہ دینا کافی ہوتا ہے کہ ہم مسجد کے مہمان ہیں، پھر نمازی ان کی ضروریات کے مطابق اپنے گھروں سے کھانا لے آتے ہیں۔ دیہات میں شاید ہی ایسی کوئی مسجد ہو گی جس کے ساتھ مسافروں ڈکو ٹھہرانے کے لیے مسافر خانہ نہ بنایا گیا ہو۔ لیکن ہمارے بڑے بڑے شہروں میں زندگی کا یہ اسلوب تقریباً ختم ہو کر رہ گیا ہے بلکہ یہ دیکھ کر اب تکلیف ہوتی ہے کہ بڑے بڑے گھر اور بڑی بڑی کوٹھیوں میں رہنے والے اولاً تو مہمان صرف اپنے رشتے داروں اور احباب کو سمجھتے ہیں حالانکہ ان کا حق بطور رشتے دار اور احباب کے ہے، بطور مہمان کے نہیں۔ مہمان تو اجنبی آدمی ہوتا ہے جو کسی ضرورت کے تحت کسی گھر میں بھی مہمان کے طور پر ٹھہرے اور دوسری چیز جو دیکھنے میں آتی ہے وہ یہ کہ ان بڑے بڑے گھروں میں صرف اتنے بیڈز اور سونے کے لیے پلنگ ہوتے ہیں جتنے ان کے گھر کے افراد ہیں۔ ان کے یہاں یہ تصور ہی عجیب سا ہے کہ کوئی شخص ان کے پاس آ کر رات گزارے۔ آپ رات کو بھی ان کے پاس جائیں تو وہ آپ کو چائے یا کوئی ٹھنڈا پلا کر فارغ کرنے کی کوشش کریں گے کیونکہ رات کا قیام اب ہمارے یہاں مہمانی میں داخل نہیں رہا۔ اندازہ فرمائیے کہ یہ کس قدر آنحضرت ﷺ کے ارشادات اور مسلمانوں کی روایات سے انحراف اور محرومی کی علامت ہے۔ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے:

مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَلْيُكْرِمْ ضَيْفَهٗ

(جو آدمی اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہیے کہ اپنے مہمان کی عزت کرے)

اکرامِ ضیف

مہمان کی عزت کرنے سے مراد یہ ہے کہ وہ مہمان کو اپنے لیے اللہ تعالیٰ کی رحمت جانے، اپنی بساط کے مطابق بہتر سے بہتر اس کے کھانے پینے اور رہنے کا انتظام کرے اور اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھنے کا معنی یہ ہے کہ وہ مہمان کے آنے سے یہ سمجھ کر دل گرفتہ نہ ہو کہ مہمان اس کے لیے مالی بوجھ ثابت ہو گا اور وہ اس کو کھانا کھلا کر مادی طور پر گراں بار ہو جائے گا بلکہ اسے یہ یقین ہونا چاہیے کہ جس اللہ تعالیٰ نے اسے کھانے کو دیا ہے وہ اس کو مہمان کے حصے کا بھی عطا کرے گا۔ اس لیے ہمارے یہاں مشہور ہے کہ مہمان ہمیشہ اپنی قسمت ساتھ لاتا ہے اور آخرت کے دن پر یقین رکھنے کا مفہوم یہ ہے کہ دنیا میں جزا اور سزا کا قانون نافذ ہے۔ جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔ یہ اس دنیا کا طریقہ ہے۔ اس لیے آج اگر تم اپنے مہمان کی خاطر داری کرو گے تو یقین جانو تمھیں بھی کسی نہ کسی وقت کسی کا اگر مہمان بننا پڑا تو اللہ تعالیٰ تمہاری اس نیکی کے بدلے کے طور پر تمہارے لیے بھی میزبانی کا انتظام فرمائے گا اور آخرت کے دن پر ایمان رکھنے کا دوسرا معنی یہ ہے کہ آج تم مہمان کی دیکھ بھال کرو، اس کو کھلاؤ پلاؤ، آخرت میں اللہ تعالیٰ تمھیں اس کے بدلے میں جنت کے پھلوں سے تمھاری مہمانی کرے گا۔ مہمانوں کے سامنے بہتر سے بہتر کھانا پیش کرنا مہمانی کے آداب میں شامل ہے اور انہی آداب میں سے ایک ادب یہ بھی ہے کہ مہمان اس میں سے جیسے اور جتنا بھی کھائے اس پر میزبان کو خوشی ہونی چاہیے۔۔ وہ اس بات کی کوشش یا خواہش نہ کرے کہ میں نے مہمان کے سامنے کھانا پیش تو کر دیا ہے اللہ کرے وہ کھانے کی بجائے اس کو ایسے ہی رہنے دے تاکہ اہلِ خانہ اس سے فائدہ اٹھائیں۔

مختصر یہ ہے کہ اچانک کسی صورت میں کسی بھی مسافر کو کوئی ضرورت پیش آ سکتی ہے۔ وہ اگرچہ اپنے گھر میں ایک متمول فرد ہے لیکن اب اسے حالات نے حاجت مند بنا دیا ہے۔ تم اس کی حاجت برآری کر کے یا اس کی مہمانی کر کے اللہ تعالیٰ سے اگر اجر و ثواب حاصل کر سکتے ہو تو تمھیں ضرور ایسا کرنا چاہیے کیونکہ معاشرے کی مضبوطی اور بہتری کے لیے یہ ایک ناگزیر بات ہے۔

Marfat.com

فضول خرچی کی ممانعت

آیتِ کریمہ کے آخر میں فرمایا کہ فضول خرچی نہ کرو، فضول خرچی کرنے والے شیطانوں کے بھائی ہیں۔ فضول خرچی کے معنی کو قرآن کریم نے دو لفظوں سے تعبیر فرمایا۔ ایک تبذیر اور دوسرے اسراف۔ تبذیر کی ممانعت اس آیت میں واضح ہے اور اسراف کی ممانعت ولاتسرفوا سے ثابت ہے۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ کسی معصیت میں یا بے موقع، بے محل خرچ کرنے کو تبذیر و اسراف کہا جاتا ہے اور بعض حضرات نے یہ تفصیل کی ہے کہ کسی گناہ میں یا بالکل بے موقع، بے محل خرچ کرنے کو تبذیر کہتے ہیں اور جہاں خرچ کرنے کا جائز موقع تو ہو مگر ضرورت سے زائد خرچ کیا جائے، اس کو اسراف کہتے ہیں۔ مختصر یہ کہ کسی معصیت میں خرچ کرنا، بے موقع اور بے ضرورت خرچ کرنا یا ضرورت سے زائد خرچ کرنا اسلام میں ممنوع ہے۔ اس حکم کی جو حقیقی روح ہے جس کی وجہ سے یہ ممانعت عائد کی جارہی ہے وہ یہ ہے کہ آدمی اپنی کمائی اور اپنی دولت کو صرف اپنے لیے ہی مخصوص نہ رکھے' اس کے ذہن میں یہ تصور پیدا نہیں ہونا چاہیے کہ میں اپنی کمائی ہوئی دولت کا مالک ہوں۔ بلکہ اس کا ایمان یہ ہونا چاہیے کہ دولت اللہ کی دین ہے' وہ کبھی خوش ہو کے دیتا ہے اور کبھی آزمائش کے لیے دیتا ہے۔ کسی مقصد کے لیے بھی دے وہ بہرحال اس کی ملکیت ہے' جس کے ہاتھ میں دولت ہے' وہ اس کا مالک نہیں' امین ہے۔ امین کو اس امانت میں تصرف کا اتنا اور ویسا ہی اختیار ہے جتنا اور جیسا اختیار مالک نے عطا کیا ہے۔ اگر وہ اس میں تجاوز کرے گا تو وہ حق امانت میں خیانت کا ارتکاب کرے گا۔ اس تصور کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ اپنی ضروریات' اعتدال کے ساتھ پوری کرنے کے بعد اپنے رشتہ داروں' اپنے ہمسایوں اور دوسرے حاجت مند لوگوں کے حقوق بھی ادا کرے۔ اجتماعی زندگی میں تعاون' ہمدردی' حق شناسی اور اور حق رسانی کی روح جاری و ساری ہے۔ ہر رشتہ دار دوسرے رشتہ دار کا معاون اور ہر مستطیع انسان اپنے پاس کے محتاج انسان کا مددگار ہو۔ ایک مسافر جس بستی میں بھی جائے' اپنے آپ کو مہمان نواز لوگوں کے درمیان پائے۔ معاشرے میں حق کا تصور اتنا وسیع ہو کہ ہر شخص ان سب انسانوں کے حقوق اپنی ذات پر اور اپنے مال پر محسوس کرے جن کے درمیان وہ رہتا ہو۔ ذوی القربیٰ' مسکین اور مسافر کے حق کی ادائیگی کا حکم دے کر پروردگار نے یہ بات واضح فرمادی ہے کہ ہر صاحب مال کے مال میں اس کے قرابتداروں' مسکینوں اور مسافروں کا بھی حق ہے۔ ''حق'' کے لفظ کا استعمال اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ یہ محض اخلاقی ذمہ داری نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک ایسا حق ہے جس کی ادائیگی صاحب مال پر لازم ہے۔ اگر کوئی شخص اس حق کو ادا نہ کرے گا تو وہ عنداللہ غصب حقوق کا مجرم ٹھہرے گا۔

منشورِ اسلامی کی یہ دفعات صرف انفرادی اخلاق کی تعلیم ہی نہ تھیں بلکہ آگے چل کر مدینہ طیبہ کے معاشرے اور ریاست میں انہی کی بنیاد پر صدقاتِ واجبہ اور صدقاتِ نافلہ کے احکام دیے گئے۔ وصیت اور وراثت اور وقف کے طریقے مقرر کیے گئے۔ سورہ النساء میں یتیموں کے حقوق پر نہ صرف زور دیا گیا بلکہ ان کی حفاظت کا انتظام بھی کیا گیا۔ ہر بستی پر مسافر کا یہ حق قائم کیا گیا کہ کم از کم تین دن تک اس کی ضیافت کی جائے اور پھر اس کے ساتھ ساتھ معاشرے کا اخلاقی نظام عملاً ایسا بنایا گیا کہ پورے اجتماعی ماحول میں فیاضی' ہمدردی اور تعاون کی روح جاری و ساری ہوگئی۔ مسلمانوں کی فکر مندی کا یہ عالم ہوگیا کہ ایک دوسرے کے گھروں کی پاسداری کرنے لگے۔ اور ہر ممکن طریق سے یہ جاننے کی کوشش کرتے کہ ہمارا کوئی بھائی ضروریات کے ہاتھوں پریشان تو نہیں۔ فجر کی نماز پڑھنے کے بعد بعض لوگ اپنی چھت پر چڑھ کر آواز دیتے ''لوگو! غور کرو ہماری اڑوس پڑوس میں رات کو کوئی شخص بھوکا تو نہیں سویا۔ ایسا نہ ہو اس کی وجہ سے اللہ کا عذاب اس بستی پر نازل ہوجائے۔'' خلفائے راشدین نے ہر شخص کی ضروریات کے لیے اپنے آپ کو کفیل سمجھا اور ہر یتیم اور مسکین اور غریب آدمی کو حق دیا کہ وہ امیر المومنین سے اپنی ضروریات کا مطالبہ کرسکے۔ اسی شدت احساس کے باعث حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے آہ کھینچتے ہوئے فرمایا تھا ''اگر فرات کے کنارے کوئی کتا بھی بھوکا مرگیا تو قیامت کے دن عمر سے پوچھا جائے گا۔''

وَاِمَّا تُعۡرِضَنَّ عَنۡهُمُ ابۡتِغَآءَ رَحۡمَةٍ مِّنۡ رَّبِّكَ تَرۡجُوۡهَا فَقُلۡ لَّهُمۡ قَوۡلًا مَّيۡسُوۡرًا ﴿۲۸﴾

(اگر تمہیں اپنے رب کے فضل کے انتظار میں جس کے تم متوقع ہو ان سے اعراض کرنا پڑ جائے تو تم ان سے نرمی کی بات کہہ دو۔ ۲۸)

(سورة بنیٓ اسرآءِیل : ۲۸)

Marfat.com

ایک نادر ہدایت

مالی معاملات اور باہمی تعلقات کی تربیت کے ضمن میں قرآنِ کریم نے اس آیتِ کریمہ میں ایک عجیب ہدایت دی ہے، وہ یہ ہے کہ سابقہ آیات میں تم نے دیکھ لیا کہ تمھارا مال و دولت تمھاری ملکیت نھیں، اللہ تعالیٰ کی امانت ہے، وہی اس کا مالک ہے، اسی کو حق پہنچتا ہے کہ وہ مال میں بندوں کے حقوق مقرر کرے۔ چنانچہ گزشتہ آیتِ کریمہ میں اس نے مال کے بارے میں ہدایات عطا فرمائیں۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں ارشاد فرمایا جارہا ہے کہ وہ لوگ جن کے حقوق تمھارے مال میں ہیں یا تمھیں جن کے ساتھ نیکی کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہ اگر تمھارے پاس ایسے وقت میں آئیں کہ تمھارا ہاتھ اس وقت خالی ہو اور تم دینے کی پوزیشن میں نہ ہوں اس لیے کہ ہر شخص کے مالی معاملات میں نشیب و فراز آتے رہتے ہیں۔ کبھی وہ دینے کی پوزیشن میں ہوتا اور کبھی لینے پر مجبور ہوجاتا ہے۔ لینے والے پرانی شہرت یا معمول کے مطابق اگر لینے کے لیے آجائیں تو خالی ہاتھ ہونے کی وجہ سے ان کے ساتھ سخت رویہ اختیار نہ کرو۔ صاف صاف معذرت کرلو۔ لیکن اگر تمھیں کہیں سے مال آجانے کی توقع ہو تو تم نہایت نرمی سے کسی آنے والے وقت کا وعدہ کرلو کہ اس وقت میں اس پوزیشن میں نھیں ہوں، امید ہے کہ تھوڑے عرصے میں اللہ تعالیٰ کرم فرمائے گا تو میں آپ کی مدد کرنے کے قابل ہوجاؤں گا۔ آپ اس وقت تک مجھے معذور سمجھیں، لیکن کسی صورت میں بھی لہجہ سخت نھیں ہونا چاہیے تاکہ آنے والے کے دل پر چوٹ نہ لگے اور اس کی عزتِ نفس مجروح نہ ہو۔

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا ﴿۲۹﴾ اِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ۭ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًۢا بَصِيْرًا ﴿۳۰﴾

(تم اپنے ہاتھ کو اپنی گردن سے باندھے نہ رکھو اور نہ اس کو پوری طرح کھول دو کہ ملامت زدہ اور درماندہ ہو کر بیٹھ رہو۔ ۲۹
بیشک، تیرا رب جس کے لیے چاہتا ہے رزق کو کشادہ کردیتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کردیتا ہے، بیشک وہی اپنے بندوں کی خبر رکھنے والا اور ان کو دیکھنے والا ہے۔ ۳۰) (سورۃ بنیٓ اسرآءِیل : ۲۹۔۳۰)

اعتدال کی ہدایت

ہاتھ باندھنا استعارہ ہے بخل کے لیے اور ہاتھ کو کھلا چھوڑ دینا استعارہ ہے فضول خرچی کے لیے۔ اس سے پہلے ارشاد فرمایا تھا کہ دولت چونکہ اللہ کی امانت ہے اس لیے اسے بے ضرورت، بے دریغ اور بے موقع اللّلے تللّوں اڑانا امانت میں خیانت ہے۔ اسی کو اسراف اور فضول خرچی کہا گیا ہے۔ اس میں اللہ کے حق میں دخل اندازی کی جاتی ہے، مال اس کا ہے لیکن مال پر قادر شخص یہ سمجھتا ہے کہ یہ مال میرا ہے۔ اس طرح وہ اپنے آپ کو اللہ کے برابر قرار دیتا ہے۔ اس لیے فرمایا گیا کہ ایسا شخص شیطان کا بھائی ہے۔ اور شیطان کا کام اللہ کی پیدا کردہ ہر چیز کو غلط مصارف میں استعمال کراکے غلط نتائج پیدا کرنا ہے۔ اور مال و دولت کے اثرات تو ہر معاشرے میں بے پناہ ہوتے ہیں۔ اسی سے خیر کی فضا پیدا کی جاسکتی ہے اور اسی سے شر کی اشاعت میں کام لیا جاسکتا ہے۔ فسق و فجور کے زیادہ تر اسباب مال و دولت کے غلط استعمال سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس لیے اسلام فضول خرچی سے سختی سے روکتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس غلط فہمی کے پیدا کرنے کی اجازت نھیں دیتا کہ خرچ کرنے سے ہاتھ بالکل روک لیا جائے اور یہ سمجھ لیا جائے کہ چونکہ اللہ نے مال خرچ کرنے سے روکا ہے اس لیے مال بالکل خرچ نھیں کرنا چاہیے۔ جائز ضرورتوں، جائز جگہوں اور حقوق کی ادائیگی میں بھی خرچ نہ کرنا بخل کہلاتا ہے۔ اور جس طرح فضول خرچی بہت سارے مفاسد کا سبب بنتی ہے اسی طرح بخل بھی ہر صاحب مال کی تعمیر سیرت میں بہت بڑی رکاوٹ بن جاتا ہے۔ جو شخص مال سے ناجائز حد تک محبت کرتا ہے وہ نہ اسے صدقاتِ واجبہ میں صرف کرے گا اور نہ صدقاتِ نافلہ میں، معاشرے کے غریب لوگ اس کے تعاون سے محروم ہوجائیں گے اور وہ خود معاشرے کی محبت سے محروم ہوجائے گا۔ اس طرح سے معاشرے کی عمارت میں ایسی دراڑ پڑے گی جو بڑھتے بڑھتے شکست و ریخت تک پہنچ سکتی ہے۔ اسلام کی نشر و اشاعت، اعلائے کلمۃ الحق کے بیشتر اسباب، مسلمان معاشرے میں کمزور افراد کی دیکھ بھال اور گرے

Marfat.com

ہوئے عناصر کو اٹھا کر دوبارہ زندگی کے دھارے میں لانے کی کوشش ان تمام باتوں کا دارومدار جود و سخاوت اور مال خرچ کرنے کے جذبے پر ہے۔ اور جب یہ جذبہ بخل میں تبدیل ہو جاتا ہے تو یہ تمام ضرورتیں اور تمام مقاصد بروئے کار آنے سے رک جاتے ہیں۔ اس لیے اسلام نے بخل کو بدترین برائی قرار دیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں تک فرمایا کہ بخیل آدمی جنت میں نہیں جا سکتا۔ اور ایسا بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے ایک مومن میں جو صفات بیان فرمائی ہیں ان کے حوالے سے کہا جا سکتا ہے کہ مومن میں بخل کبھی نہیں ہوتا۔

مدینہ میں جس اسلامی ریاست کو تشکیل دینا پیش نظر ہے اور جو اسلامی معاشرہ وجود میں آنے والا ہے واضح سی بات ہے کہ ایسی بدترین صفات کی وہاں کوئی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ اس لیے مدینہ طیبہ کی ریاست میں ان دونوں دفعات کے منشا کی صحیح ترجمانی مختلف عملی طریقوں سے کی گئی۔ ایک طرف فضول خرچی اور عیاشی کی بہت سی صورتوں کو ازروئے قانون حرام کیا گیا' دوسری طرف بالواسطہ قانونی تدابیر سے بے جا صرف مال کی روک تھام کی گئی۔ تیسری طرف معاشرتی اصلاح کے ذریعے سے ان بہت سی رسموں کا خاتمہ کیا گیا جن میں فضول خرچیاں کی جاتی تھیں۔ پھر حکومت کو یہ اختیارات دیے گئے کہ اسراف کی نمایاں صورتوں کو اپنے احکامی انتظامات کے ذریعے سے روک دے۔ آج اگر اسلامی حکومت قائم ہوتی تو بسنت جیسا نام نہاد تہوار' جس میں از اول تا آخر جانوں کے ضیاع اور مال کے اتلاف کے سوا کچھ نہیں، پر فوراً پابندی لگا دی جاتی۔ کیونکہ اسلامی حکومت ایک مسلمان کی جان کو اس قدر اہمیت دیتی ہے کہ رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر ایک طرف کعبہ گر رہا ہو اور دوسری طرف ایک مسلمان کا خون بہہ رہا ہو تو میں پہلے مسلمان کو بچانے کی کوشش کروں گا۔ تو جس تہوار کے نتیجے میں مسلمانوں کی گردنیں کٹیں' سڑکوں پر خون بہے' شرم و حیا کا جنازہ نکل جائے' چھتوں سے گر گر لڑکے بالے جانیں دیتے پھریں اور مختلف نقصانات کی شکل میں ضیاع مال کی انتہا نہ رہے' اس کی اجازت دینا ان آیات کی صریحاً خلاف ورزی ہے۔

اسراف کو روکنے کے ساتھ ساتھ زکوٰۃ و صدقات کے احکام سے بخل کا زور بھی توڑا گیا اور اس امر کے امکانات باقی نہ رہنے دیے گئے کہ لوگ زراندوزی کر کے دولت کی گردش کو روک دیں۔ ان تدابیر کے علاوہ معاشرے میں ایک رائے عام پیدا کی گئی جو فیاضی اور فضول خرچی کا فرق خوب جانتی تھی اور بخل اور اعتزال میں خوب تمیز کرتی تھی۔ اس رائے عام نے بخیلوں کو ذلیل کیا' اعتدال پسندوں کو معزز بنایا۔ فضول خرچوں کو ملامت کی اور فیاض لوگوں کو پوری سوسائٹی کا گلِ سرسبد بنا دیا۔

وَلَا تَقۡتُلُوۡۤا اَوۡلَادَكُمۡ خَشۡيَةَ اِمۡلَاقٍ‌ ؕ نَحۡنُ
نَرۡزُقُهُمۡ وَاِيَّاكُمۡ‌ ؕ اِنَّ قَتۡلَهُمۡ كَانَ خِطۡاً كَبِيۡرًا ﴿۳۱﴾ وَلَا تَقۡرَبُوا
الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَسَآءَ سَبِيۡلًا ﴿۳۲﴾ وَلَا تَقۡتُلُوا النَّفۡسَ
الَّتِىۡ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالۡحَـقِّ‌ ؕ وَمَنۡ قُتِلَ مَظۡلُوۡمًا فَقَدۡ جَعَلۡنَا
لِـوَلِيِّهٖ سُلۡطٰنًا فَلَا يُسۡرِفْ فِّى الۡقَتۡلِ‌ ؕ اِنَّهٗ كَانَ مَنۡصُوۡرًا ﴿۳۳﴾
وَلَا تَقۡرَبُوۡا مَالَ الۡيَتِيۡمِ اِلَّا بِالَّتِىۡ هِىَ اَحۡسَنُ حَتّٰى يَبۡلُغَ
اَشُدَّهٗ‌ ۖ وَاَوۡفُوۡا بِالۡعَهۡدِ‌ ۚ اِنَّ الۡعَهۡدَ كَانَ مَسۡـُٔوۡلًا ﴿۳۴﴾ وَاَوۡفُوا

Marfat.com

الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ
وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ﴿٣٥﴾ وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۭ اِنَّ السَّمْعَ
وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا ﴿٣٦﴾ وَلَا تَمْشِ
فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ۚ اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ
طُوْلًا ﴿٣٧﴾ كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا ﴿٣٨﴾ ذٰلِكَ مِمَّآ
اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ۭ وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا
اٰخَرَ فَتُلْقٰى فِيْ جَهَنَّمَ مَلُوْمًا مَّدْحُوْرًا ﴿٣٩﴾ اَفَاَصْفٰىكُمْ رَبُّكُمْ
بِالْبَنِيْنَ وَاتَّخَذَ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ اِنَاثًا ۭ اِنَّكُمْ لَتَقُوْلُوْنَ قَوْلًا
عَظِيْمًا ﴿٤٠﴾ ع

رکوع: ۴۔ (اور نہ قتل کرواپنی اولاد کو، ناداری کے اندیشہ سے، ہم ہی ان کو بھی رزق دیتے ہیں اور تم کو بھی، بیشک ان کا قتل بہت بڑا جرم ہے۔ ۳۱) اور زنا کے قریب بھی نہ جاؤ کیونکہ یہ کھلی ہوئی بے حیائی ہے اور نہایت برا راستہ ہے۔ ۳۲) اور نہ قتل کرو اس جان کو جسے اللہ تعالیٰ نے حرمت دی ہے مگر حق کے ساتھ، اور جس شخص کو ظلماً قتل کیا گیا تو ہم نے اس کے ولی کو اختیار دیا ہے تو وہ قتل میں حدود سے تجاوز نہ کرے کیونکہ اس کی مدد کی گئی ہے۔ ۳۳) اور یتیم کے مال کے قریب بھی نہ جاؤ مگر اس طریقہ سے جو اس کے حق میں بہتر ہو، حتیٰ کہ وہ اپنی پختگی کی عمر کو پہنچ جائے اور عہد کو پورا کرو کیونکہ عہد کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ ۳۴) اور جب تم ناپو تو ناپ پوری رکھو اور وزن صحیح ترازو سے کرو، یہی بہتر اور مآلِ کار کے اعتبار سے خوب تر ہے۔ ۳۵) اور اس کے درپے نہ ہوا کرو جس چیز کا تمھیں علم نہ ہو کیونکہ کان، آنکھ اور دل ان میں سے ہر ایک چیز کی پرسش ہونی ہے۔ ۳۶) اور زمین میں اکڑ کر نہ چلو، نہ تم زمین کو پھاڑ سکتے ہو اور نہ پہاڑوں کے طول کو پہنچ سکتے ہو۔ ۳۷) ان سب باتوں کی برائی تمھارے رب کے نزدیک نہایت ناپسندیدہ ہے۔ ۳۸) یہ وہ حکمت کی باتیں ہیں جو تیرے رب نے تجھ پر وحی کیں، اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی دوسرے کو اِلٰہ مت بناؤ کہ تم ملامت زدہ اور راندہ ہو کر جہنم میں

Marfat.com

جھونک دیے جاؤ۔ ۳۹) کیا تمھارے رب نے تمھارے لیے تو بیٹے مخصوص کیے اور اپنے لیے فرشتوں میں سے بیٹیاں بنالیں، بیشک تم ایک بہت بڑی بات کہتے ہو۔ ۴۰)

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ۭ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ﴿۳۱﴾

(اور نہ قتل کرو اپنی اولاد کو، ناداری کے اندیشہ سے، ہم ہی ان کو بھی رزق دیتے ہیں اور تم کو بھی، بیشک ان کا قتل بہت بڑا جرم ہے۔ ۳۱) (سورۃ بنیٓ اسرآءِیل : ۳۱)

قتلِ اولاد کی ممانعت

اس سے پہلے ارشاد فرمایا گیا کہ رزق کے خزانے اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ یہ اس کی مشیت ہے جس نے انسانوں میں رزق اور وسائل رزق میں تفاوت اور تفاضل رکھا ہے۔ وہ چونکہ حکیم ہے اس لیے خوب جانتا ہے کہ انسانوں میں مصنوعی طور پر رزق میں برابری کی کوشش اللہ تعالیٰ کے نظام میں دخل اندازی کے مترادف ہے۔ اس کی حکمت کا یہی تقاضا ہے کہ اگر انسانوں میں جدوجہد کے جذبے کو باقی رکھنا ہے اور افادہ و استفادہ کی روح سے انسانوں کے درمیان ایک تعلق کو پائیدار بنانا ہے تو اس کے لیے انسانی شکلوں، انسانی جسموں، انسانی صلاحیتوں، انسانی توانائیوں میں تنوع ناگزیر ہے۔ اور اسی سے پیدا ہونیوالا تفاوت بھی انسانی زندگی کا حسن ہے جسے ہم نادانی میں عدم مساوات کہہ دیتے ہیں۔ جس معاشرے میں بھی مصنوعی طریقے سے مساوات پیدا کرنے کی کوشش کی جائے گی وہ معاشرہ دیر تک باقی نہیں رہ سکتا۔

جس طرح افراد کو ان کی محنتوں کو دیکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ کم و بیش رزق عطا فرماتا ہے اسی طرح قوموں میں بھی رزق کی تقسیم اسی پیمانے سے ہوتی ہے۔ نہ افراد کو اس غلط فہمی میں مبتلا ہونا چاہیے کہ رزق کے خالق ہم ہیں اور نہ قوموں کو اس گمراہی کا شکار ہونا چاہیے کہ وسائل رزق کے مالک ہم ہیں۔ لیکن یہ انسانی حادثہ ہے کہ انسان اس غلط فہمی میں مبتلا ہو کر اپنے رزق کا بجٹ خود بنانے لگتا ہے اور جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ رزق صرف کمانے والے ہاتھوں سے وجود میں آتا ہے تو وہ ایسے افراد کو ختم کرنے کی کوشش شروع کر دیتا ہے جن سے کسب و اکتساب میں مدد نہیں لی جاسکتی۔ یہی وہ جہالت ہے جس کی وجہ سے دنیا میں قتلِ اطفال اور اسقاطِ حمل کے جرائم وجود میں آتے رہے۔ قدیم زمانے میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ لڑکیاں خاندان پر بوجھ ہوتی ہیں' کیونکہ وہ کمائی میں ہاتھ نہیں بٹاتیں۔ اس بوجھ کو کم کرنا ہماری ضرورت ہے۔ چنانچہ وہ یا تو لڑکی کو پیدا نہ ہونے دیتے یا پیدا ہونے کے بعد زندہ درگور کر دیتے۔ لیکن جیسے جیسے برائی کو علم و عقل کی سپورٹ ملتی گئی ویسے ویسے اس میں وسعت پیدا ہوتی گئی۔ پہلے صرف لڑکیاں اس کا شکار ہوتی تھیں' پھر آبادی کے حوالے سے ہر آنے والے کو روکنے کی کوشش کی گئی اور اس کے لیے اسقاطِ حمل یا قتلِ اطفال کو ذریعہ بنایا گیا۔ لیکن آج اسی برائی نے منع حمل یعنی ضبط ولادت اور منصوبہ بندی کا نام اختیار کر لیا ہے۔ اندیشہ وہی ہے جو قدیم زمانے میں تھا کہ ''آنے والے کو رزق کہاں سے ملے گا؟'' وہ بھی اپنے آپ کو رازق سمجھتے تھے آج بھی قومیں اپنے آپ کو وسائل رزق کا خالق سمجھتی ہیں۔ لیکن پیش نظر آیتِ کریمہ ان معاشی بنیادوں کو بالکل منہدم کر دیتی ہے۔ وہ صاف صاف حکم دیتی ہے کہ اپنی اولاد کو افلاس کے اندیشے سے قتل نہ کرو۔ قتل نہ کرنے سے مراد یہ نہیں ہے کہ پیدا ہونے کے بعد انھیں قتل نہ کرو' بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ اسقاطِ حمل اور منع حمل کی تدابیر بروئے کار مت لاؤ۔ تمھیں بجائے کھانے والوں کو گھٹانے کی کوشش کرنے کے وسائل رزق کو بڑھانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اسلام محدود طور پر تو میاں بیوی کو کمزور صحت یا کسی اور جائز سبب سے اولاد کو محدود رکھنے کی اجازت دیتا ہے لیکن اس کے لیے ذرائع ابلاغ کے ذریعے ایک ایسا ذہن تیار کرنا جس سے اولاد ایک زحمت بن کر رہ جائے اور ساتھ ساتھ ذہن میں یہ بات بیٹھتی چلی جائے کہ وسائل رزق کے پیدا کرنے والے ہم ہیں اور ہر آنے والا بچہ ہمارا دست نگر بن کے آتا ہے۔ یہ وہ طریقہ ہے جس سے بے حیائی بھی پھیلتی ہے اور اسلام کے تصورِ رزق پر چوٹ بھی پڑتی ہے۔ اور آدمی بجائے اللہ سے مانگنے کے اپنے ناخن تدبیر یا اپنی حکومت کو اپنا خالق سمجھ لیتا ہے۔ تاریخ اس بات کو ثابت کرتی ہے کہ اللہ نے کبھی کسی علاقے میں آبادی کی ضرورتوں سے کم وسائل رزق پیدا نہیں فرمائے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ وسائل انسانی جدوجہد کے انتظار میں ہوں۔

Marfat.com

البتہ ان وسائل میں کمی اس وقت محسوس ہونے لگتی ہے جب فاسد نظام اور فاسق ہاتھوں کی وجہ سے وسائلِ رزق کی تقسیم میں خیانت ہونے لگتی ہے اور کچھ لوگ ان وسائل پر اس طرح قابض ہو کر بیٹھ جاتے ہیں کہ عام لوگوں تک انکا فائدہ پہنچ نہیں پاتا۔ مجھے یاد پڑتا ہے غالباً ۱۹۷۴ء میں ملکی اور غیر ملکی زرعی ماہرین کی ایک ٹیم کو ملک کے وسائلِ رزق کے سروے کا کام سونپا گیا تھا' انہوں نے سروے کرنے کے بعد جو رپورٹ دی وہ یہ تھی کہ پاکستان کے زرعی وسائل اگر یہ تمام وکمال بروئے کار لائے جائیں (جن میں سے بیشتر پر جاگیرداروں کا قبضہ ہے) تو ایک کروڑ بارہ لاکھ افراد کی غذائی ضروریات کے لیے کافی ہو سکتے ہیں۔ اندازہ کیجئے ہماری تعداد شاید پندرہ کروڑ بھی نہیں۔ اور ان میں کھانے والوں کی تعداد بمشکل آٹھ کروڑ ہوگی۔ لیکن ہم گندم' چینی' اور نہ جانے کیا کیا باہر سے منگوانے پر مجبور ہیں۔ اس رپورٹ کو "ڈرلنگ رپورٹ" کہا جاتا ہے۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ہمارے وسائل رزق میں کوئی کمی نہیں اور نہ کبھی پروردگار کمی ہونے دیتا ہے البتہ ہمارے مسائل ان ہاتھوں کی وجہ سے ہیں جن کے نمائندے فوج' بیوروکریسی اور پارلیمنٹ میں موجود ہیں۔ جب تک ان کی اصلاح نہیں ہوگی اس وقت تک خاندانی منصوبہ بندی کرتے رہئے لیکن مسائل حل نہیں ہوں گے۔ اللہ کا نظام یہ ہے' وہ ایک طرف اپنے اوپر اعتماد' توکل اور اپنی ذات سے دعا کا حکم دیتا ہے اور دوسری طرف اپنے دین کی بالا دستی اور جہاد کا حکم دیتا ہے۔ ان دونوں کی اطاعت پر وسائل رزق کی کمی بیشی کا دارومدار ہے۔ وہ کبھی آبادی کو کم کرتا ہے کبھی وسائل رزق میں اضافہ کرتا ہے۔ لیکن یہ کام اس کا ہے جو ہم نے اپنے ذمے لے لیا ہے۔ اور جو کام ہمارا ہے ہم اسے کرنے کے لیے تیار نہیں۔ مدینے کی ریاست کی تاریخ گہری نظر سے پڑھ لیجیے' آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ ایک ایسا ملک جس میں وسائل نام کی کوئی چیز ہی نہ تھی ان کی غذائی ضرورتیں کیسے پوری ہوتی تھیں۔

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ﴿۳۲﴾ (سورۃ بنیٓ اسرآءیل : ۳۲)

(اور زنا کے قریب بھی نہ جاؤ کیونکہ یہ کھلی ہوئی بے حیائی ہے اور نہایت برا راستہ ہے۔ ۳۲)

منہیات میں سب سے پہلے قربتِ زنا کا ذکر

وہ اقدار حیا اور فضائل اخلاق جن پر اسلامی نظام کی عمارت استوار کی گئی ہے اور جن کی شکست وریخت اسلام کسی طور برداشت نہیں کرتا ان میں اہم ترین قدر شرم وحیا ہے۔ زنا سے اس بنیاد پر ضرب پڑتی ہے۔ اس لیے اسلام اسے ناقابل برداشت قرار دے کر انتہائی سخت سزاؤں کے ذریعے اس کا وقوع مشکل سے مشکل بنا دیتا ہے۔ اس نے حکم یہ دیا کہ زنا کے قریب نہ پھٹکو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کا مطالبہ صرف یہ نہیں کہ مسلمان معاشرے میں زنا کا ارتکاب نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس کا اصل مطالبہ یہ ہے کہ یہ بدترین فعل جن اسباب اور مقدمات کی وجہ سے ممکن ہوتا ہے انھیں ختم ہونا چاہیے۔ تعلیم کو ایسی باتوں سے پاک ہونا چاہیے جس سے سفلی جذبات کو غذا ملتی ہو۔ تعلیمی اداروں کے ماحول کو ایسا پاکیزہ ہونا چاہیے جس میں بے حیائی کے تصورات کے در آنے کا کم سے کم امکان ہو۔ ذرائع ابلاغ ایسے ہونے چاہئیں جن کے چلانے والے انتہا درجہ کے شرم وحیا کے مالک ہوں۔ وہ کسی بے حیائی کے شبے کو بھی برداشت کرنے کو تیار نہ ہوں۔ اور پھر افراد کو الگ ہدایات دی گئیں کہ تم اپنی آنکھوں کی حفاظت کرو۔ اپنے قلبی احساسات کو نامناسب مطالعہ سے آلودہ نہ ہونے دو۔ دل میں اللہ کا خوف اور اس کی محبت پیدا کرو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے اصحاب گرامی کی سیرت کا مطالعہ جاری رکھو۔ قدم کبھی کسی غلط جگہ کی طرف اٹھنے نہ پائیں۔ اس طرح سے انفرادی اور اجتماعی زندگی میں زنا اور محرکات زنا اور اسباب زنا کا خاتمہ کر دیا جائے۔

آیت کے دوسرے حصے میں زنا کی ممانعت کی دلیل بیان ہوئی کہ یہ کھلی ہوئی بے حیائی اور نہایت ہی برا راستہ ہے۔ کھلی ہوئی بے حیائی کے بارے میں کچھ کہنا تو بیکار ہے کیونکہ ہمیشہ سے انسانوں نے اسے کھلی بے حیائی قرار دیا۔ آج کے ترقی یافتہ دور کو چھوڑ کر ہر دور میں مرد وعورت کے آزادانہ تعلق کو کبھی گوارا نہیں کیا گیا۔ قرآن کی اسی ہدایت کے نتیجے میں زنا اور تہمت زنا کو فوجداری جرم قرار دیا گیا' پردہ کے احکام جاری کیے گئے' فواحش کی اشاعت کو سختی کے ساتھ روک دیا گیا' شراب اور موسیقی اور رقص وتصاویر پر (جو زنا کے قریب ترین رشتہ دار ہیں) بندشیں لگائی گئیں اور ایک ایسا ازدواجی قانون بنایا گیا جس سے نکاح آسان ہو گیا اور زنا کے معاشرتی اسباب کی جڑ کٹ گئی۔

Marfat.com

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِیِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا یُسْرِفْ فِّی الْقَتْلِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا ﴿۳۳﴾

(سورۃ بنیٓ اسرآءِیل : ۳۳)

(اور نہ قتل کرو اس جان کو جسے اللہ تعالیٰ نے حرمت دی ہے مگر حق کے ساتھ، اور جس شخص کو ظلماً قتل کیا گیا تو ہم نے اس کے ولی کو اختیار دیا ہے تو وہ قتل میں حدود سے تجاوز نہ کرے کیونکہ اس کی مدد کی گئی ہے۔ ۳۳)

قتل کی ممانعت اور اسلامی قانون کا مزاج

اندازہ فرمایئے قتل نفس کا ذکر کرنے سے پہلے زنا کی حرمت کا ذکر کیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی نگاہ میں کسی انسان کا قتل جو بہت بڑی برائی ہے زنا کی صورت میں کسی عفیفہ کی عفت اور حرمت کا قتل انسان کے قتل سے بھی بڑھ کر ہے۔ کاش مسلمان اس بات کو سمجھیں۔

بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں صرف کسی انسان کو قتل کرنے سے روکا گیا ہے' لیکن جن اہل علم نے اس سے خودکشی کی حرمت ثابت کی ہے ان کی رائے صحیح معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ جو شخص کسی شخص کو قتل کرتا ہے وہ بھی اللہ کی ایک حرمت کو قتل کرتا ہے کیونکہ اللہ نے نفس کو ایک حرمت دی ہے اور اس کا قتل حرام ٹھہرایا ہے۔ اسی طرح جو شخص اپنے نفس کو اپنے ہاتھوں قتل کرتا ہے وہ بھی حرمت نفس کو پامال کرتا ہے۔ کیونکہ اس کا نفس بھی ایک حرمت کا حامل ہے جسے اس نے قتل کر دیا۔ جان اپنی ہو یا کسی اور کی اس کا مالک اللہ ہے۔ جو آدمی بھی اسے اپنے ظلم کا نشانہ بناتا ہے وہ اللہ سے بغاوت کرتا ہے اور اس کی ایک مخلوق و مملوک چیز پر حملہ آور ہوتا ہے۔ لہٰذا جتنا بڑا جرم کسی دوسرے کو قتل کرنا ہے اتنا ہی بڑا جرم اپنے آپ کو قتل کرنا ہے۔ رہی یہ بات کہ آدمی بعض دفعہ حالات کے ہاتھوں تنگ آ کر خودکشی کرتا ہے تو یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ زندگی اللہ کی طرف سے ایک امتحان ہے اور دنیا ایک امتحان گاہ۔ اللہ تعالیٰ جس طرح بھی ہمارا امتحان لے ہمیں اس پر اعتراض کا کوئی حق نہیں۔ وہ اچھے حالوں میں رکھے تب بھی اس کا حق ہے اور وہ برے حالوں میں رکھے وہ بھی اس کا اختیار ہے۔ ہمیں تو بہرصورت امتحان دیتے رہنا چاہیے۔ اللہ نے جو آزمائش کا وقت رکھا ہے اس کو ختم کر کے امتحان گاہ سے بھاگ نکلنے کی کوشش بجائے خود غلط ہے۔ چہ جائیکہ یہ فرار ایک جرم عظیم کے ذریعے سے کیا جائے جسے اللہ نے صریح الفاظ میں حرام قرار دیا ہے۔

کسی صورت بھی کسی انسان کو قتل کرنا جائز نہیں۔ ہاں پانچ صورتیں ایسی ہیں جس میں کسی انسان کو قتل کرنا جائز ٹھہرایا گیا ہے۔

۱۔ قاتل کو قتل کرنا' جس پر قتل کا جرم ثابت ہو جائے۔ عدالت اس کے جرم کا اعلان کر دے اور حکومت اولیائے مقتول کو حق دے کہ یہ تمہارا مجرم ہے تم اسے چاہو تو قتل کر دو۔ یا ان کی رضامندی سے حکومت خود اسے قتل کر دے۔

۲۔ اسلامی حکومت کے باغیوں کو قتل کرنا۔ بشرطیکہ ان پر بغاوت کا جرم ثابت ہو جائے۔

۳۔ ایسے جرائم پیشہ لوگ جو ڈاکے ڈالیں' آبادیوں پر حملہ کریں' لوگوں کو قتل کریں۔ یہ جب گرفت میں آ جائیں تو انھیں قتل کرنا جائز ہے۔

۴۔ وہ شادی شدہ مرد یا عورت جو زنا کا ارتکاب کرے اور چار گواہوں کی گواہی یا ان کے اپنے اعتراف سے ان کا جرم ثابت ہو جائے' تو انھیں سنگسار کیا جاتا ہے۔

۵۔ وہ شخص جو اسلام سے مرتد ہو جائے۔ کسی شخص کو اسلام لانے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا لیکن اسلام لانے کے بعد اسلام سے نکلنے کی کوشش اسلامی حکومت سے بغاوت ہے۔ جس طرح ہر ملک اور ہر قانون کا باغی قابلِ سزا ہوتا ہے اسی طرح اسلامی قانون کا باغی بھی قابل سزا ہے۔ بشرطیکہ عدالتوں میں اسلامی قانون نافذ ہو اور اسلام کے مطابق اس کا کیس چلے۔

اس آیت میں یہ جو فرمایا گیا کہ ''جو شخص مظلومانہ قتل کیا گیا ہو اس کے ولی کو قصاص کے مطالبے کا حق عطا کیا گیا ہے پس چاہیے کہ وہ قتل میں حد سے نہ گزرے اس کی مدد کی جائے گی'' اس کا مطلب یہ ہے کہ قتل کے مقدمے میں اصل مدعی مقتول کے اولیاء یعنی اس کے وارث ہیں۔ حکومت ان کی مدد کرنے کی پابند ہے۔ اس لیے اولیاءِ مقتول کو اس کی اجازت نہیں کہ وہ جوش انتقام میں مجرم کے علاوہ دوسروں کو قتل کر دیں۔ یا ان کا قاتل ان کے سپرد کیا جائے تو وہ اس کو عذاب دے دے کر ماریں۔ یا مار دینے کے بعد اس کی لاش پر غصہ نکالیں۔ یا خون بہا لینے کے بعد پھر اسے قتل کر دیں۔ کیونکہ مقتول کے

Marfat.com

وارث مقدمے کے اصل مدعی ہیں انھیں شریعت نے یہ حق دیا ہے کہ وہ چاہیں تو قاتل کو قصاص میں قتل کر دیں چاہیں تو خون بہا لے لیں اور چاہیں تو معاف کر دیں۔ لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ خون بہا بھی لے لیں اور بعد میں موقع پا کر قاتل کو قتل بھی کر دیں۔ جیسے ہمارے ہاں عام طور پر ہوتا ہے۔ یہ حد سے گزر جانا ہے جس کی اسلام اجازت نہیں دیتا۔ اگر کوئی شخص ایسا کرتا ہے تو اسے قتل کے جرم میں پکڑا جائے گا اور سزا دی جائے گی۔

وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۠ وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا ۝

(اور یتیم کے مال کے قریب بھی نہ جاؤ مگر اس طریقہ سے جو اس کے حق میں بہتر ہو، حتیٰ کہ وہ اپنی پختگی کی عمر کو پہنچ جائے اور عہد کو پورا کرو کیونکہ عہد کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ ۳۴) (سورۃ بنیٓ اسرآءِیل : ۳۴)

مالِ یتیم کی حرمت

اس سے پہلے بھی میں ذکر کر چکا ہوں کہ اسلام نے پسماندہ طبقے کو جس طرح اٹھایا اور اس کی حفاظت کی اس میں سب سے زیادہ اہمیت یتیم کو دی گئی۔ سورہ النساء میں خاص طور پر ان کے حقوق کی ادائیگی پر زور دیا گیا اور انتظامی اور قانونی دونوں طرح کی جو تدابیر اختیار کی گئیں۔ قرآن کریم میں بھی جا بجا ان کا ذکر ہے اور احادیث میں اس کی ترغیب بھی دی گئی ہے۔ اس کی تفصیل حدیث اور فقہ کی کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔

ایفائے عہد کی ہدایت

آیت کے دوسرے حصے میں حکم دیا گیا کہ (عہد کی پابندی کرو، بے شک عہد کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔)

یہ بھی انفرادی اخلاقی ہدایت نہیں بلکہ جب اسلامی حکومت قائم ہوئی تو اسی کو پوری قوم کی داخلی اور خارجی سیاست کا سنگ بنیاد ٹھہرایا گیا۔ اسلامی اخلاق میں ڈپلومیسی کے نام پر وعدے کی خلاف ورزی اور جھوٹ بولنے کی کوئی گنجائش نہیں۔ سیاستدانوں میں یہ بات عام ہے کہ سیاسی وعدے پورا کرنے کے لیے نہیں ہوتے اور اپنی کہی ہوئی بات سے مکر جانا سیاستدان کا حق ہے۔ لیکن اسلام میں یہ ایک جرم ہے چاہے اس کا ارتکاب کوئی بھی کرے۔ اس لیے جس طرح عہد کی پابندی افراد کے لیے ضروری ٹھہری اسی طرح اسلامی حکومت بھی اس کی پابند رہی اور مشکل سے مشکل حالات میں بھی اسلامی حکومتیں عہد و پیمان کو نبھاتی رہیں۔ تاریخ میں نقل کیا گیا ہے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قیصر سے جنگ بندی کا ایک معاہدہ کیا اور یہ طے کیا گیا کہ فلاں تاریخ تک جنگ بند رہے گی۔ چنانچہ جب اس معاہدے کا آخری دن آیا تو آپؓ نے آخری دن کا سورج غروب ہوتے ہی اپنی فوجیں اس کی مملکت میں داخل کر دیں۔ بظاہر یہ معاہدے کی خلاف ورزی نہیں تھی کیونکہ معاہدے کی مدت گزر گئی تھی۔ فوجیں فتح کا پھریرا لہراتے ہوئے آگے بڑھتی جا رہی تھیں کہ پیچھے سے سرپٹ دوڑتا ہوا ایک سوار نظر آیا۔ اسے دیکھ کر امیر معاویہ رک گئے۔ جب وہ قریب آیا تو دیکھا کہ ایک مشہور صحابی عمرو بن عبسہؓ ہیں جنھوں نے ہاتھ بلند کیا ہوا تھا اور وہ بلند آواز سے کہہ رہے تھے کہ وفاء لا غدرا "وعدہ توڑنا نہیں پورا کرنا ہے۔" امیر معاویہؓ نے حیران ہو کر پوچھا کہ "ہم نے کون سا وعدہ توڑا؟" انھوں نے بتایا کہ "معاہدے کی مدت ختم بھی ہو جائے تب بھی حملہ کرنے سے پہلے دشمن کو بتلانا ضروری ہے۔ بے خبری میں حملہ کرنا یہ ایک طرح کی وعدہ خلافی اور معاہدے کی خلاف ورزی ہے۔" امیر معاویہ نے اسی وقت مفتوحہ علاقے خالی کر دیے اور فوجوں کو واپسی کا حکم دے دیا۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ صرف اخلاقی نصیحتیں نہ تھیں بلکہ اسلامی حکومتوں کے رہنما اصول تھے۔

وَاَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۝

(اور جب تم ناپو تو ناپ پوری رکھو اور وزن صحیح ترازو سے کرو، یہی بہتر اور مآل کار کے اعتبار سے خوب تر ہے۔ ۳۵)

(سورۃ بنیٓ اسرآءِیل : ۳۵)

Marfat.com

ایفائے کیل ووزن کی ہدایت

یہ ہدایت بھی صرف افراد کے باہمی معاملات تک محدود نہ رہی بلکہ اسلامی حکومت کے قیام کے بعد یہ بات حکومت کے فرائض میں داخل ہوگئی کہ وہ منڈیوں اور بازاروں میں اوزان اور پیمانوں کی نگرانی کریں اور تطفیف کو بزور بند کر دیں۔ پھر اسی سے یہ وسیع اصول اخذ کیا گیا کہ تجارت اور معاشی لین دین میں ہر قسم کی بے ایمانیوں اور حق تلفیوں کا سد باب کرنا حکومت کے فرائض میں سے ہے۔

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا ﴿۳۶﴾

(اور اس کے درپے نہ ہوا کرو جس چیز کا تمہیں علم نہ ہو کیونکہ کان، آنکھ اور دل ان میں سے ہر ایک چیز کی پرسش ہونی ہے۔ ۳۶) (سورۃ بنیٓ اسرآءِیل : ۳۶)

ظن وگمان کی بجائے علم کی پیروی کی ہدایت

"اس دفعہ کا منشا یہ ہے کہ لوگ اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی میں وہم و گمان کی بجائے علم کی پیروی کریں۔ اسلامی معاشرے میں اس منشاء کی ترجمانی وسیع پیمانے پر اخلاق میں، قانون میں، سیاست اور انتظام ملکی میں، علوم وفنون اور نظام تعلیم میں، غرض ہر شعبۂ حیات میں کی گئی۔ اور ان بے شمار خرابیوں سے فکر و عمل کو محفوظ کر دیا گیا جو علم کی بجائے گمان کی پیروی کرنے سے انسانی زندگی میں رونما ہوتی ہیں۔ اخلاق میں ہدایت کی گئی کہ بدگمانی سے بچو اور کسی شخص یا گروہ پر بلا تحقیق کوئی الزام نہ لگاؤ۔ قانون میں یہ مستقل اصول طے کر لیا گیا کہ محض شبہے میں کسی کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی جائے۔ تفتیش جرائم میں یہ قاعدہ مقرر کیا گیا کہ گمان میں کسی کو پکڑنا اور مار پیٹ کرنا یا حوالات میں دے دینا قطعی ناجائز ہے۔ غیر قوموں کے ساتھ برتاؤ میں یہ پالیسی متعین کر دی گئی کہ تحقیق کے بغیر کسی کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھایا جائے اور نہ مجرد شبہات پر افواہیں پھیلائی جائیں۔ نظام تعلیم میں بھی ان نام نہاد علوم کو ناپسند کیا گیا جو محض ظن و گمان اور لاطائل قیاسات پر مبنی ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ عقائد میں اوہام پرستی کی جڑ کاٹ دی گئی اور ایمان لانے والوں کو یہ سکھایا گیا کہ صرف اس چیز کو مانیں جو خدا اور رسول کے دیے ہوئے علم کی رو سے ثابت ہو۔" (تفہیم القرآن)

وَلَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا ۚ اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا ﴿۳۷﴾ كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَیِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا ﴿۳۸﴾ ذٰلِكَ مِمَّاۤ اَوْحٰۤی اِلَیْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ؕ وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتُلْقٰی فِیْ جَهَنَّمَ مَلُوْمًا مَّدْحُوْرًا ﴿۳۹﴾ (سورۃ بنیٓ اسرآءِیل : ۳۷، ۳۸، ۳۹)

(اور زمین میں اکڑ کر نہ چلو، نہ تم زمین کو پھاڑ سکتے ہو اور نہ پہاڑوں کے طول کو پہنچ سکتے ہو۔ ۳۷) ان سب باتوں کی برائی تمہارے رب کے نزدیک نہایت ناپسندیدہ ہے۔ ۳۸) یہ وہ حکمت کی باتیں ہیں جو تیرے رب نے تجھ پر وحی کیں، اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی دوسرے کو الٰہ مت بناؤ کہ تم ملامت زدہ اور راندہ ہو کر جہنم میں جھونک دیے جاؤ۔ ۳۹)

غرور وتکبر کی ممانعت

مراد یہ ہے کہ جباروں اور متکبروں کی روش سے بچو کیونکہ جو شخص اکڑ کر اور اترا کر چلتا ہے وہ زمین پر پاؤں مارتا ہوا اور گردن اٹھا کر چلتا ہے۔ یہ متکبروں اور مغروروں کی چال ہے۔ تم اللہ تعالیٰ کے عاجز بندے ہو تم بھی ان کی طرح نہ چلنا یعنی متکبر بننے کی کوشش نہ کرنا۔ ویسے بھی انسان کی حیثیت ہی کیا ہے؟ وہ زمین پر پاؤں مار مار کر چلتا ہے حالانکہ وہ زمین کو پھاڑ نہیں سکتا۔ اسی طرح وہ سینہ تان کر اور گردن اور سر اونچا کر کے چلنے کی کوشش کرتا ہے حالانکہ وہ پہاڑوں کی بلندی کو پہنچ نہیں سکتا۔ جس خدا کی قدرت یہ ہے کہ اس نے تمہارے پاؤں کے نیچے یہ طویل و

Marfat.com

عریض زمین بچھادی، جس کے اوپر بڑے بڑے جانور دوڑتے بھاگتے پھرتے ہیں اور کتنے چھوٹے چھوٹے حشرات رینگتے پھرتے ہیں، انہی جانوروں میں سے ایک تم بھی ہو۔ پھر یہ فلک بوس پہاڑ دیکھو جو تمھارے سامنے کھڑے کر دیے گئے ہیں۔ تم ان کی بلندیوں کو نہیں پہنچ سکتے تمھاری حیثیت تو ان کے مقابلے میں ایک گلہری جیسی بھی نہیں، تو اس کی زمین پر اکڑنے اور اترانے کا کیا فائدہ۔ آدمی کے لیے ضروری ہے کہ اپنی حیثیت کو پہچانے اور اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اس کے جلال کے سامنے ہمیشہ سرفگندہ رہے۔

یہ ہدایت بھی محض ایک نصیحت نہیں بلکہ انفرادی اور اجتماعی اخلاق کی بنیاد ہے۔ اسی ہدایت کا فیض تھا کہ مدینہ طیبہ میں جو حکومت اس منشور پر قائم ہوئی، اس کے فرمانرواؤں نے حکومت کی نازک ذمہ داری سنبھال کر بھی اپنے آپ کو درویش ثابت کیا۔ ان کے گورنروں کو بازاروں میں گھومتے ہوئے دیکھ کر لوگ ان کے سروں پر اپنا سامان رکھ دیتے تھے کیونکہ ان کی ظاہری حالت قلیوں سے مختلف نہیں تھی۔ ان کا بڑے سے بڑا سپہ سالار بھی اللہ کا ادنیٰ بندہ تھا۔ انہوں نے زمین کا نقشہ بدل ڈالا، لیکن کبھی بھی ان کی نشست و برخاست، چال ڈھال، لباس، مکان، سواری اور عام برتاؤ میں تکبر اور نخوت کا شائبہ بھی پیدا نہ ہوا۔

ان کی حکومت سے ہے فاش یہ رمزِ غریب
سلطنتِ اہلِ دیں فقر ہے شاہی نہیں

یہ ہے وہ چودہ نکاتی منشور جس کی بنیاد پر وہ اسلامی ریاست وجود میں آئی جس نے دنیا کو نئی تہذیب، نیا تمدن، نیا نظام، نئے اخلاق، نئے طور اطوار اور انسانیت کے نئے اصول مہیا کیے، جن اصولوں پر عمل کر کے صدیوں تک مسلمانوں نے دنیا کی قیادت کی اور وہ جہاں بھی گئے اپنے ساتھ انسانیت کا نیا شعور لے کے گئے اور کفر کی تاریکیوں میں نئی شمعیں جلائیں۔ لیکن افسوس جب یہ امت مسلمہ جسے دنیا کی امامت و قیادت کے منصب پر فائز کیا گیا تھا اپنی اصل حیثیت اور منصب گم کر بیٹھی تو رفتہ رفتہ آج اس حال کو پہنچ گئی ہے کہ وہ قومیں اسے ٹھوکریں مار رہی ہیں جنھیں چند سو سال پہلے مسلمانوں کے ایک جرنیل نے ٹھوکریں مار کر مشرقِ وسطیٰ سے نکلنے پر مجبور کر دیا تھا جو یورپ آج مسلمانوں پر ہر طرح کے مظالم توڑ رہا ہے اس نے کبھی مسلمانوں کو بری نگاہ سے دیکھنے کی جرأت نہیں کی تھی۔ انھیں آج اپنے تہذیب و تمدن پر ناز ہے اگر مسلمان اندلس میں نہ جاتے تو یورپ کو کبھی تہذیب کا شعور بھی پیدا نہ ہوتا۔ سقوطِ بغداد اور سقوطِ غرناطہ نے مسلمانوں کی علمی وراثت کو یورپ تک پہنچایا اور انہوں نے اس پر شب و روز محنت کر کے آج اپنے آپ کو دنیا کا سب سے بڑا ظالم ثابت کیا۔ آج ان کے پاس قوت ہے، لیکن وہ قوت ظلم کے لیے کام میں لائی جا رہی ہے۔ ان کے پاس علم ہے جسے تباہ کن آلات کی ایجاد کے لیے صرف کیا جا رہا ہے۔ ان کے پاس تہذیب ہے جس نے انسانیت کو ننگا کر دیا ہے۔ اس کے پاس تمدن ہے جس نے انسانوں میں طبقات پیدا کر دیے ہیں۔ وہ بڑی سے بڑی ایجاد کرنے اور بڑے سے بڑے معرکہ انجام دینے کی قدرت رکھتا ہے لیکن ابھی تک اس نے انسانوں کی طرح چلنا نہیں سیکھا۔ اس نے انسانوں کی طرح سوچنا نہیں سیکھا۔ اس نے انسانوں کی طرح حکمرانی کرنے کے آداب نہیں سیکھے۔ آج از سرِ نو ضرورت محسوس ہو رہی ہے کہ مسلمان اپنی ذمہ داری کو سمجھیں اور وہ مشعلِ حق لے کر اٹھیں جس کے نہ ہونے سے یہ دنیا اندھیرے میں ڈوبتی چلی جا رہی ہے اور ہر طرف شور مچا ہوا ہے کہ

یہ روشنی کا زمانہ یہ ظلمتوں کا ورود
اس انجمن کے خداؤ بڑا اندھیرا ہے

اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں عقیدۂ توحید سے اسلامی منشور کا آغاز فرمایا تھا جسے مدینہ میں اسلامی ریاست کی بنیاد بننا تھا۔ اور کیسی عجیب بات ہے کہ عقیدۂ توحید پر اس کا اختتام فرمایا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ توحید اسلام کی ساری تعلیمات کے لیے حصار اور شہر پناہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس حقیقت کے پیش پا افتادہ ہونے میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا کہ انسان کی شخصیت کی تعمیر کا آغاز اس بنیادی نکتہ سے ہوتا ہے کہ اس کا آقا کون ہے اور وہ کس کا بندہ ہے۔ اور انسانی اجتماعیت کا آغاز اور اختتام بھی اسی کا مرہونِ منت ہے کہ اس بات کا فیصلہ ہو جائے کہ ملک کا مقتدرِ اعلیٰ کون ہے اور وہ کون ذات ہے جس کے سامنے جس طرح سب جھکتے ہیں اسی طرح انسان کی مرضیات بھی سربسجود ہوتی ہیں اور وہی ذات ہے جسے آئین اور قانون دینے کا حق ہے۔ یہ حقیقت جیسا کہ میں نے عرض کیا آغاز بھی ہے اور اختتام بھی۔ اس لیے اس کا لازمی تقاضا تھا کہ بحث کو اسی سے شروع کیا جاتا اور اسی پر ختم کیا جاتا۔

Marfat.com

اَفَاَصۡفٰىكُمۡ رَبُّكُمۡ بِالۡبَنِيۡنَ وَاتَّخَذَ مِنَ الۡمَلٰٓـئِكَةِ اِنَاثًا ؕ اِنَّكُمۡ لَتَقُوۡلُوۡنَ قَوۡلًا عَظِيۡمًا ﴿۴۰﴾

(کیا تمھارے رب نے تمھارے لیے تو بیٹے مخصوص کیے اور اپنے لیے فرشتوں میں سے بیٹیاں بنالیں، بیشک تم ایک بہت بڑی بات کہتے ہو۔ ۴۰) (سورۃ بنیٓ اسرآءِیل : ۴۰)

شرک کی بدترین صورت

توحید کو ایک پیش پا افتادہ اور حقیقتِ ثابتہ کے طور پر پیش کرنے کے بعد مشرکینِ مکہ کے عقیدے پر گرفت فرمائی ہے کہ یہ کس قدر عجیب بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کا وجود، اس کی وحدانیت، اس کا حاکمِ حقیقی ہونا اور اس کا خالقِ کائنات ہونا سب سے بڑی حقیقت ہونے کے باوجود تم نے عقیدے کے طور پر جس بے ہودگی کو اختیار کر رکھا ہے اس کا اس حقیقت کے مقابلے میں کیا جواز ہے۔ فرشتے اللہ تعالیٰ کی نہایت محترم اور پاکیزہ مخلوق ہیں۔ وہ کارکنانِ قضاء وقدر بھی ہیں، لیکن اس سب کچھ کے باوجود وہ ایک مخلوق ہیں۔ مخلوق اور خالق کے درمیان آقا اور غلام کا رشتہ تو ہوسکتا ہے، خدائی میں شریک کا رشتہ تو نہیں ہوسکتا۔ کہاں خالقِ کائنات اور کہاں ایک معمولی مخلوق، کہاں وہ بے نیاز ذات اور کہاں سرتاپا احتیاج ایک مخلوق، کہاں وہ احد، صمد، حی اور قیوم ذات اور کہاں ایک فانی زندگی اور زندگی کی ضروریات کی محتاج ذات۔ جو قوم ان دونوں میں فرق کرنے سے عاجز ہے اس کی دماغی صلاحیت کے بارے میں کیا کہا جاسکتا ہے۔ اور اس پر بھی مزید ستم یہ ہے کہ تم بیٹوں کے مقابلے میں بیٹیوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہو۔ کتنے ایسے انسانیت کے دشمن ہیں کہ جب ان کو یہ خبر ملتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بیٹی عطا کی ہے تو شرم ساری سے ان کے چہرے سیاہ پڑ جاتے ہیں اور ذلت کے احساس سے لوگوں سے منہ چھپاتے پھرتے ہیں، لیکن ادھر حال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو خالقِ کائنات مانتے ہوئے بھی اس کے لیے بیٹیاں تجویز کی جارہی ہیں جو اپنے لیے باعث ذلت ہیں اور اپنے لیے بیٹے مخصوص کیے جارہے ہیں۔ ذلیل اور حقیر چیز ہمیشہ حقیر آدمی کی طرف منسوب ہوتی ہے اور عظیم چیزیں عظمت والوں کی طرف۔ ان کی ان جسارت ناروا اور بے ہودگی پر تو زمین پھٹ جانی چاہیے کہ حقیر چیز کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرتے ہیں اور عظیم اور عزیز چیز کی نسبت اپنی طرف۔ یہ کس قدر بڑی بات ہے جسے تم بار بار کہتے ہو اور اللہ تعالیٰ کی بردباری کا امتحان لیتے ہو۔

جمود فسادِ عقل کا باعث ہوتا ہے

اندازہ فرمائیے کہ جب کوئی قوم اپنے عقائدِ فاسدہ میں جامد ہو کر رہ جاتی ہے تو اسے بالکل سامنے کی باتیں بھی سمجھ میں نہیں آتیں۔ اولاً تو توحید اتنی بڑی حقیقت ہے کہ اس کے مقابلے میں شرک ایک بے حقیقت چیز ہے۔ اس لیے اس میں کبھی التباس نہیں ہونا چاہیے تاہم ہم تسلیم کیے لیتے ہیں کہ صدیوں تک شرک میں ملوث رہنے کی وجہ سے ان کے اندر توحید کا احساس مٹ گیا ہے، اس لیے وہ یہ بات سمجھنے میں دشواری محسوس کررہے ہیں، لیکن عزت وذلت اور اچھے اور برے انتساب کی شناخت قریش کے لیے تو کم از کم مشکل نہیں ہونی چاہیے کیونکہ یہ تو ان چیزوں میں بڑے حساس واقع ہوئے تھے لیکن شرک کی مسلسل آلودگی نے ان کی قلبی کیفیات کو اس قدر گدلا دیا ہے کہ وہ ہر طرح کی شناخت اور ہر طرح کے امتیاز سے بھی محروم ہو کر رہ گئے ہیں۔ ان کی اسی کیفیت کو قرآنِ کریم نے اگلی آیتِ کریمہ میں ایک دوسرے پہلو سے واضح فرمایا ہے۔

وَلَقَدۡ صَرَّفۡنَا فِىۡ هٰذَا الۡقُرۡاٰنِ لِيَذَّكَّرُوۡا ؕ وَمَا يَزِيۡدُهُمۡ اِلَّا نُفُوۡرًا ﴿۴۱﴾ قُلْ لَّوۡ كَانَ مَعَهٗۤ اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُوۡلُوۡنَ اِذًا لَّابۡتَغَوۡا

Marfat.com

إِلَىٰ ذِي الْعَرْشِ سَبِيلًا ﴿۴۲﴾ سُبْحَانَهُ وَتَعَالَىٰ عَمَّا يَقُولُونَ عُلُوًّا
كَبِيرًا ﴿۴۳﴾ تُسَبِّحُ لَهُ السَّمَاوَاتُ السَّبْعُ وَالْأَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ ط
وَإِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ وَلَٰكِنْ لَا تَفْقَهُونَ تَسْبِيحَهُمْ ط
إِنَّهُ كَانَ حَلِيمًا غَفُورًا ﴿۴۴﴾ وَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَ
بَيْنَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ حِجَابًا مَسْتُورًا ﴿۴۵﴾ وَجَعَلْنَا
عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً أَنْ يَفْقَهُوهُ وَفِي آذَانِهِمْ وَقْرًا ط وَإِذَا
ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْآنِ وَحْدَهُ وَلَّوْا عَلَىٰ أَدْبَارِهِمْ نُفُورًا ﴿۴۶﴾
نَحْنُ أَعْلَمُ بِمَا يَسْتَمِعُونَ بِهِ إِذْ يَسْتَمِعُونَ إِلَيْكَ وَإِذْ هُمْ
نَجْوَىٰ إِذْ يَقُولُ الظَّالِمُونَ إِنْ تَتَّبِعُونَ إِلَّا رَجُلًا مَسْحُورًا ﴿۴۷﴾
انْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوا لَكَ الْأَمْثَالَ فَضَلُّوا فَلَا يَسْتَطِيعُونَ
سَبِيلًا ﴿۴۸﴾ وَقَالُوا أَإِذَا كُنَّا عِظَامًا وَرُفَاتًا أَإِنَّا لَمَبْعُوثُونَ خَلْقًا
جَدِيدًا ﴿۴۹﴾ قُلْ كُونُوا حِجَارَةً أَوْ حَدِيدًا ﴿۵۰﴾ أَوْ خَلْقًا مِمَّا يَكْبُرُ
فِي صُدُورِكُمْ ج فَسَيَقُولُونَ مَنْ يُعِيدُنَا ط قُلِ الَّذِي فَطَرَكُمْ
أَوَّلَ مَرَّةٍ ج فَسَيُنْغِضُونَ إِلَيْكَ رُءُوسَهُمْ وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هُوَ ط
قُلْ عَسَىٰ أَنْ يَكُونَ قَرِيبًا ﴿۵۱﴾ يَوْمَ يَدْعُوكُمْ فَتَسْتَجِيبُونَ بِحَمْدِهِ
وَتَظُنُّونَ إِنْ لَبِثْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا ﴿۵۲﴾

Marfat.com

رکوع: ۵۔ (ہم نے اس قرآن میں طرح طرح سے لوگوں کو سمجھایا کہ وہ یاددہانی حاصل کریں لیکن یہ چیز ان کی بیزاری ہی میں اضافہ کئے جارہی ہے۔ ۴۱) کہہ دیجیے اگر اس کے ساتھ کچھ اور اِلٰہ بھی ہوتے جس طرح یہ کہتے ہیں تو وہ تلاش کرتے عرش والے کی طرف کوئی راستہ (چڑھائی کر دیتے) ۴۲) وہ پاک اور بہت برتر ہے ان باتوں سے جو یہ کہتے ہیں۔ ۴۳) اسی کی تسبیح کرتے ہیں ساتوں آسمان اور زمین اور جو ان میں ہیں۔اور کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح نہ کرتی ہو لیکن تم ان کی تسبیح نہیں سمجھتے، بیشک وہ بڑا بردبار اور بخشنے والا ہے۔ ۴۴) جب آپؐ قرآن پڑھ کر سناتے ہیں تو ہم آپؐ کے اور ان کے درمیان جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، ایک مخفی پردہ حائل کر دیتے ہیں۔ ۴۵) اور ہم ان کے دلوں پر پردہ ڈال دیتے ہیں کہ وہ اس کو نہ سمجھیں اور ان کے کانوں میں ثقل پیدا کر دیتے ہیں، اور جب آپؐ قرآن میں تنہا اپنے رب کا ذکر کرتے ہیں تو وہ نفرت کے ساتھ پیٹھ پھیر لیتے ہیں۔ ۴۶) ہم خوب جانتے ہیں جس غرض کے لیے یہ اسے سنتے ہیں، جب یہ آپؐ کی طرف کان لگاتے ہیں اور (ہم خوب جانتے ہیں) جب یہ سرگوشیاں کرتے ہیں، اس وقت یہ ظالم کہتے ہیں کہ تم ایک ایسے آدمی کی پیروی کر رہے ہو جس پر جادو کر دیا گیا ہے۔ ۴۷) دیکھئے یہ کس طرح آپؐ کے لیے مثالیں بیان کرتے ہیں، پس وہ گمراہ ہو گئے، اب وہ سیدھے راستے پر چل نہیں سکتے۔ ۴۸) اور کہتے ہیں کہ جب ہم ہڈیاں اور چورا چورا ہو جائیں گے تو ہم از سر نو اٹھائے جائیں گے۔ ۴۹) کہہ دیجیے کہ تم پتھر بن جاؤ یا لوہا، ۵۰) یا کوئی اور مخلوق جو تمھارے خیال میں ان سے بھی سخت ہو، پھر وہ کہیں گے کہ ہمیں کون دوبارہ زندہ کرے گا، کہہ دیجیے، وہی جس نے تمھیں پہلی مرتبہ پیدا کیا، پھر وہ آپؐ کے آگے سر ہلائیں گے اور کہیں گے کہ یہ کب ہوگا؟ آپؐ کہہ دیجیے کہ عجب نہیں کہ اس کا وقت قریب ہی آ پہنچا ہو۔ ۵۱) جس دن وہ تمھیں پکارے گا، تم اس کی حمد کرتے ہوئے اس کے حکم کی تعمیل کرو گے، اور تم یہ گمان کرو گے کہ تم نہیں رہے (دنیا اور برزخ میں) مگر تھوڑی سی مدت۔ ۵۲)

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِیَذَّكَّرُوْا ؕ وَمَا یَزِیْدُهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا ﴿۴۱﴾

(ہم نے اس قرآن میں طرح طرح سے لوگوں کو سمجھایا کہ وہ یاددہانی حاصل کریں لیکن یہ چیز ان کی بیزاری ہی میں اضافہ کئے جارہی ہے۔ ۴۱) (سورۃ بنیٓ اسرآءِیل : ۴۱)

تصریف کا مفہوم

تصریف کے معنی پھیرنے اور گردش دینے کے ہیں۔کسی حقیقت کو مختلف اسالیب اور گوناگوں طریقوں سے واضح کرنا کہ جس سے سمجھنے میں کوئی کمی باقی نہ رہ جائے، اسے تصریف کہتے ہیں۔یہ بالکل وہی بات ہے کہ جس کو انیس نے کہا تھا۔

اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں

قرآن کریم نے توحید کے مضمون کو اتنے مختلف طریقوں سے دل و دماغ میں اتارنے کی کوشش کی ہے کہ کوئی کند ذہن آدمی بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھے سمجھنے میں دشواری محسوس ہو رہی ہو۔یہ الگ بات ہے کہ کوئی متعصب اور ہٹ دھرم آدمی جو اپنی بات پہ ہر حال میں باقی رہنا چاہے، اسے سمجھانا ممکن نہیں ہوتا۔اسی طرح وہ شخص بھی جس نے زندگی ایک مختلف ماحول میں گزاری ہو جس کی وجہ سے اس کا ایک خاص ٹیسٹ بن گیا ہو۔اس کے عقلی پیمانے خاص اندازوں میں ڈھل چکے ہوں، اس کی ترجیحات یکسر بدل گئی ہوں، اس کے اندر آہستہ آہستہ اک نیا شخص وجود میں آجاتا ہے جو پہلے شخص سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔آپ اسے پہلے جیسا شخص بنانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ شخص پہلے شخص سے رشتہ کاٹ چکا ہے۔آپ اپنی کوشش میں کبھی کامیاب نہیں ہوسکتے۔جو بچے ملاوٹ زدہ چیزیں کھا کر جوان ہوئے ہیں انھیں خالص چیزیں بیمار کر دیتی ہیں۔بناسپتی گھی کھانے والا مکھن اور خالص گھی کی غذائیت سے نہ صرف کہ فائدہ نہیں اٹھا سکتا بلکہ اس کی خوشبو بھی اسے بدبو معلوم ہوتی ہے۔اقبال نے ٹھیک کہا:

Marfat.com

وہ فریب خوردہ شاہیں جو پلا ہو کرگسوں میں
اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسمِ شاہبازی

قرآنِ کریم نے بھی نہ جانے کتنے اسالیب بدل کر مشرکین کو عقیدۂ توحید سمجھانا چاہا اور شرک سے نفرت دلانا چاہی، لیکن بت پرستی اور شرک کی چند در چند آلودگیوں نے ان کے دل و دماغ اور ان کی روحانی قوتوں کو ایسا مسموم کیا کہ وہ صرف عقیدۂ توحید ہی کیا ہر خیر کی بات سے محروم ہو گئے۔

سمجھ میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے
ترے ذہن میں بت خانہ ہو تو کیا کہیے

اس محرومی کا نتیجہ یہ ہے کہ انھیں جیسے جیسے توحید کے قریب لانے اور یاددہانی حاصل کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے ویسے ویسے ان کے اندر حق کے خلاف جذبۂ تنفر پیدا ہوتا جاتا ہے۔ گویا کہ وہ قرآنِ کریم کی اس تشبیہ کی صحیح تعبیر ہیں۔ كَاَنَّهُمۡ حُمُرٌ مُّسۡتَنۡفِرَةٌ فَرَّتۡ مِنۡ قَسۡوَرَةٍ ۔

قُلۡ لَّوۡ كَانَ مَعَهٗۤ اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُوۡلُوۡنَ اِذًا لَّابۡتَغَوۡا اِلٰى ذِى الۡعَرۡشِ سَبِيۡلًا ﴿۴۲﴾

(کہہ دیجیے اگر اس کے ساتھ کچھ اور اِلٰہ بھی ہوتے جس طرح یہ کہتے ہیں تو وہ تلاش کرتے عرش والے کی طرف کوئی راستہ (چڑھائی کر دیتے) (۴۲) (سورۃ بنیٓ اسرآءِیل : ۴۲)

توحید پر ایک عقلی اور واقعاتی دلیل

اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی دلیل پیش فرمائی گئی ہے کہ مشرک لوگ کبھی تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسرے اِلٰہ ہونے کا دعویٰ کرتے تھے اور کبھی کائنات کے اس نظام کو کسی حکومت کے نظام پر قیاس کرتے ہوئے یہ کہتے کہ خدائے اعظم اور معبودِ اعظم تو ایک ہی ہے، البتہ اس کے نیچے بہت سی دیویاں اور دیوتا ہیں جن کو اس نے اپنے اختیارات سونپ رکھے ہیں۔ کوئی قسمتیں بناتا اور بگاڑتا ہے، کوئی زمین کی دیکھ بھال کر رہا ہے، کوئی آسمانوں کے نظام کو سنبھالے ہوئے ہے، کسی کے ہاتھ میں زندگی کا سررشتہ ہے اور کسی کے قبضے میں رزق کی کنجیاں ہیں۔ پروردگار ارشاد فرماتا ہے کہ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ اللہ کی ذات کی طرح اور بھی خدا ہیں تو اس سے زیادہ نامعقول بات اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ اس لیے کہ اس کائنات کا نظام خود بول رہا ہے کہ اس کی ایک ایک کڑی باہم ایک دوسرے کے ساتھ اس قدر پیوست ہے کہ اسے ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ایک دانۂ گندم اس وقت تک نہیں اگتا اور ایک گٹھلی سے اس وقت تک سوئی نہیں پھوٹتی جب تک تمام عناصر بروئے کار نہیں آ جاتے۔ زمین کی زرخیزی اپنا کام کرتی ہے، ہوا اپنا رول ادا کرتی ہے، سورج کی گرمی اپنی خدمت انجام دیتی ہے، پانی آبیاری کا فرض نبھاتا ہے، موسم اپنی ڈیوٹی سرانجام دیتا ہے۔ غرضیکہ پورے گردوپیش میں جس جس کو جو فرض سونپا گیا ہے وہ اسے ادا کرتا ہے تو ایک دانۂ گندم اگتا ہے۔ اور گھاس کا ایک تنکا سر اٹھاتا ہے۔ جس کائنات کے نظام کی وحدت کا یہ عالم ہو اس میں دوسرے خدا کی گنجائش کہاں۔ اگر یہاں دوسرا خدا ہوتا تو کبھی تو اس نظام میں کوئی تبدیلی آتی۔ سورج مشرق کی بجائے کبھی تو مغرب سے نکلتا، کبھی تو زمین کی گردش میں فرق آتا، کبھی تو چاند اپنے مدار کو چھوڑتا، کبھی ثوابت اور سیارے اپنے فرائض میں کمی کرتے، کبھی زندگی اور موت ایک دوسرے سے ہم عناں ہوتیں، کبھی دماغ اپنی حدود سے تجاوز کرتے، لیکن آج تک کسی چیز میں فرق واقع نہ ہونا، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس کائنات کا نظام ایک کے ہاتھ میں ہے اور وہی اس کائنات کا خالق بھی ہے اور حاکم بھی۔

اور اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ خدائے اعظم تو ایک ہی ہے لیکن اس کے نیچے بہت سے چھوٹے حکمران ہیں جن میں اختیارات کی تقسیم کر دی گئی ہے۔ تو پھر اس سوال کا کوئی جواب ہونا چاہیے کہ اس زمین کی تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ اس زمین پر حکومتیں بدلتی اور بگڑتی رہتی ہیں اور اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ ہر صاحبِ اختیار بڑے اختیار کی ہوس میں اپنی حدود سے تجاوز کرنے لگتا ہے۔ ہر صوبیدار مرکز کو ہتھیانے کی کوشش میں ہوتا ہے جس کے نتیجے میں مرکز کمزور ہو جاتا ہے اور صوبیدار خودمختار ہو جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک حکومت کئی حکومتوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ اس کائنات میں آخر یہ حادثہ کیوں نہیں ہوا جبکہ اقتدار کی فطرت کبھی نہیں بدلتی۔ سعدی مرحوم نے ٹھیک کہا:

Marfat.com

ہفت اقلیمے بگیرد پادشاہ
ہم چناں در بندِ اقلیمے دگر

کہ ایک بادشاہ اگر سات ملکوں پر بھی قابض ہو جائے تو اس پر بھی قناعت نہیں کرتا، وہ کسی اور ملک پر قبضہ کرنے کے بارے میں فکرمند رہتا ہے لیکن اس کائنات کے اختیارات رکھنے والوں نے آج تک کبھی کوئی ایسی کوشش نہیں کی۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ اقتدار کی فطرت بدل گئی ہے وجہ یہ ہے کہ اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا کوئی اقتدار کا مالک نہیں۔ دیوتا اور دیویاں محض ایجادِ بندہ ہیں جس کی کوئی حقیقت نہیں۔

سروری زیبا فقط ذات بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری

سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا ﴿٤٣﴾ (سورۃ بنیٓ اسرآءِیل : ۴۳)

(وہ پاک اور بہت برتر ہے ان باتوں سے جو یہ کہتے ہیں۔ ۴۳)

اللہ تعالیٰ ہر شرک سے منزہ ہے

مشرکین نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ جن مختلف قوتوں کو شریک کر رکھا تھا ان کی طرف اللہ تعالیٰ کی مختلف صفات بھی منسوب کر رکھی تھیں۔ کسی کو کسی قوت کا امین سمجھتے تھے اور کسی کو کسی قوت کا۔ اور انہی کے آئینہ میں وہ اللہ تعالیٰ کی صفات کو پہچاننے کی کوشش کرتے تھے۔ سبحان کلمۂ تنزیہ ہے۔ کسی لمبی چوڑی دلیل دینے کی بجائے پروردگار کا طریقہ یہ ہے کہ وہ لغو سے لغویات جو اس کی طرف منسوب کی جاتی ہے اسے رد کرنے کے لیے اس لفظ کا استعمال فرماتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم جن خرافات کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر رہے ہو، اللہ تعالیٰ ان سے ہر طرح سے پاک اور برتر ہے۔ کوئی شخص سورج اور چاند کے چہروں پر سیاہیاں پھینکنے کی کوشش کرے اور اپنے تئیں یہ سمجھے کہ میں شاید ایسا کر سکتا ہوں تو اس کا جواب یہ نہیں کہ اسے روشنی اور سیاہی کا سبق پڑھایا جائے بلکہ اس کا صحیح جواب یہی ہے کہ سورج اور چاند تمہاری اس لغو حرکت سے بہت بلند واقع ہوئے ہیں۔ نہ تم سورج کی روشنی کو ماند کر سکتے ہو اور نہ تم چاند کی چاندنی کو گدلا کر سکتے ہو اور اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرف جو ان مخلوقات سے بے حد بلند ہے کسی غلط بات کا انتساب اس سے بھی زیادہ حماقت ہے۔

تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ؕ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ﴿٤٤﴾ (سورۃ بنیٓ اسرآءِیل : ۴۴)

(اسی کی تسبیح کرتے ہیں ساتوں آسمان اور زمین اور جو ان میں ہیں۔ اور کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح نہ کرتی ہو لیکن تم ان کی تسبیح نہیں سمجھتے، بیشک وہ بڑا بردبار اور بخشنے والا ہے۔ ۴۴)

تمام کائنات اللہ تعالیٰ کی تنزیہہ کرتی ہے

مشرکین جو کچھ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کے بارے میں کہتے تھے اور شرک کی جو مختلف شکلیں انھوں نے اختیار کر رکھی تھیں لفظ سبحان سے ان تمام کو رد کر دینے کے بعد ایک اور حیرت انگیز دلیل ارشاد فرمائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ تم جو انسان ہو تمھیں تو اللہ تعالیٰ نے ایک محدود دائرے میں آزادی عطا کر رکھی ہے۔ تم چاہو تو اسے تسلیم کرو، چاہو تو اس ذات ذوالجلال کا انکار کر دو۔ اسی طرح تم چاہو تو اس کی وحدانیت کا اقرار کرو اور چاہو تو اس کی طرف تم قسم قسم کے شرکیہ اقوال و افعال کو منسوب کر دو۔ تمھاری اس زندگی میں تم پر کوئی جبر نہیں کیا جائے گا۔ لیکن تمھارے گردوپیش میں پھیلی ہوئی ایک وسیع دنیا ہے اور پھر تمھارے سروں پر گنبد آبگینہ رنگ جو چھتری تانے کھڑا ہے اور پھر اس کی مسلسل سات تہیں ہیں ان کے اندر نہ جانے کتنی مخلوقات بس رہی ہیں

Marfat.com

اور جس سمندر نے تمھیں گھیر رکھا ہے اس کے اندر بھی ایک دنیا آباد ہے۔ تم اگر انھیں جان سکو تو تمھیں اندازہ ہوگا کہ ان میں سے ہر مخلوق کو اللہ تعالیٰ نے تسبیح کا پابند کر رکھا ہے۔ اور پھر خالی تسبیح نہیں بلکہ ایسی تسبیح جس میں حمد بھی شامل ہے۔ فرق دونوں میں یہ ہے کہ تسبیح اللہ تعالیٰ کو ان تمام نسبتوں اور صفتوں سے بری اور بالاتر قرار دینے کا نام ہے جو اس کی اعلیٰ صفات اور شان کے منافی ہوں۔ یہ گویا ایک مکمل تنزیہہ کا عمل ہے لیکن جب تسبیح کے ساتھ حمد کا لفظ شامل ہو جاتا ہے تو پھر تنزیہہ کے ساتھ اثبات کا مفہوم بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ البتہ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر تمام کائنات اور اس کا ذرہ ذرہ تسبیح کر رہا ہے تو ہم اسے محسوس کیوں نہیں کرتے اور ہمارا دائرۂ علم اس سے تہی دامن کیوں ہے۔ قرآن کریم نے اس کے جواب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ جو تسبیح کرتے ہیں تم ان کی تسبیح کو سمجھ نہیں سکتے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی ایک رمز ہے۔ البتہ اس کے بعض پہلو ایسے ہیں جن کا کچھ نہ کچھ ادراک عقل و دانش سے ہوتا ہے اور کچھ صحبتِ نبوت اور اس راستے پر چلنے سے۔ جہاں تک عقل کا تعلق ہے وہ ہمیں یہ بات بتا سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ایک تکوینی نظام بھی ہے، جس کا اظہار ہر مخلوق اپنی زبانِ حال سے کر رہی ہے۔ چنانچہ وہی اس کی تسبیح ہے اور اسی کی وہ پابند ٹھہرائی گئی ہے۔ پہاڑ استادہ ہیں، چشمے ابلتے ہیں، آبشار گرتی ہے، پانی بہتا ہے، نباتات اگتی ہیں، درخت سرو قامت کھڑے ہیں، چرند دوڑتے ہیں، پرند اڑتے ہیں اور حشرات الارض رینگتے ہیں۔ ہر ایک کی اپنی ساخت، اپنی خوراک اور اپنا شغل ہے، وہ اسی کے پابند ہیں اور یہی پابندی ان کی تسبیح ہے۔ اگر ایک قدم آگے بڑھایا جائے تو وہ انسان جو اللہ تعالیٰ کو ماننے سے انکار کرتے ہیں لیکن ان کے معمولات اسی کے قانون کے پابند ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان پر نافذ کر رکھا ہے اور یہ پابندی ان کی تسبیح ہے۔ وہ پاؤں سے چلتے ہیں، دماغ سے سوچتے ہیں، ناک سے سونگھتے ہیں، ہاتھ سے پکڑتے ہیں، زبان سے بولتے ہیں، کانوں سے سنتے ہیں لیکن ایک احساس وہ ہے جو صحبتِ نبوت سے نصیب ہوتا ہے۔ آنحضرت ﷺ کی مٹھی میں کنکروں کا تسبیح پڑھنا، پہاڑوں کا حضرت داؤد علیہ السلام کے ساتھ صبح و شام تسبیح کرنا، پتھروں کا اللہ تعالیٰ کی خشیت سے گر جانا اور پھٹ جانا، یہ ان کی تسبیح ہے اور جس کا ادراک اللہ تعالیٰ کی دین ہے۔ حضرت امام بخاریؒ نے حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ ہم کھانے کی تسبیح کی آواز سنا کرتے تھے جبکہ وہ کھایا جا رہا ہو۔ اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کھانا کھاتے تو کھانے کی تسبیح کی آواز سنا کرتے تھے۔ صحیح مسلم میں آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ میں مکہ مکرمہ میں اس پتھر کو پہچانتا ہوں جو بعثت و نبوت سے پہلے مجھے سلام کیا کرتا تھا اور میں اب بھی اس کو پہچانتا ہوں اور اسطوانہ حنانہ کے رونے سے تمام لوگ واقف ہیں اور صحابہؓ نے اس وقت اسے ہچکیاں لیتے ہوئے سنا جب حضورؐ نے اسے اپنے ساتھ لگا کر پیار کیا۔

ان روایات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ زمین و آسمان کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتی ہے البتہ ہم ان کی تسبیح کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ جس پروردگارِ عالم کی تسبیح کائنات کی ہر مخلوق کر رہی ہے اگر انسانوں کی ایک محدود تعداد اسے ماننے سے انکار کر دے، یا اس کے ساتھ دوسروں کو شریک کرنے لگے تو اس کی شان میں کیا کمی آئے گی۔ البتہ ایک دوسرے پہلو سے دیکھا جائے تو اس حوالے سے اس کی شان میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ وہ پہلو یہ ہے کہ جب ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے نہ ماننے والے اور اس کے ساتھ شرک کرنے والے کتنے بے خوف ہو کر یہ سب کچھ کر رہے ہیں لیکن وہ خداوند ذوالجلال جو بے پناہ قدرتوں کا مالک ہے کبھی ان سے انتقام نہیں لیتا۔ اپنے نبیوں کے ذریعے انھیں بار بار سمجھانے کی کوشش تو کرتا ہے تاکہ وہ اپنے برے انجام سے بچ جائیں لیکن سزا دینے میں جلدی نہیں کرتا۔ اس لیے اس آیت کے آخر میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ بردبار ہے، ان کی ان باتوں اور حرکتوں سے ان پر آسمان گر پڑنا چاہیے تھا لیکن وہ بردباری کا ثبوت دے رہا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس کی مغفرت کے دروازے ہر وقت کھلے ہیں جب بھی زندگی بھر کے مجرم اس کے دروازے پر دستک دیتے ہیں تو کبھی انھیں مایوسی نہیں ہوتی۔

وَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا ﴿٤٥﴾ وَّجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ۭ وَاِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰٓي اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا ﴿٤٦﴾

(جب آپؐ قرآن پڑھ کر سناتے ہیں تو ہم آپؐ کے اور ان کے درمیان جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، ایک مخفی پردہ حائل کر دیتے ہیں۔ ۴۵) اور ہم ان کے دلوں پر پردہ ڈال دیتے ہیں کہ وہ اس کو نہ سمجھیں اور ان کے کانوں میں ثقل پیدا کر دیتے ہیں، اور جب آپؐ قرآن میں تنہا اپنے رب کا ذکر کرتے ہیں تو وہ نفرت کے ساتھ پیٹھ پھیر لیتے ہیں۔ ۴۶)
(سورۃ بنیٓ اسرآءِیل: ۴۵، ۴۶)

Marfat.com

ہدایت سے متعلق اللہ تعالیٰ کا قانون

ہم پیچھے پڑھ چکے ہیں کہ توحید کی حقیقت کو سمجھانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اسلوب بدل بدل کر اور مختلف پیرایوں میں مشرکین کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن تعجب کی بات ہے کہ ان کی اکثریت نہ صرف سمجھنے سے قاصر ہے بلکہ اس کی مخالفت میں ہر طرح سے کمر بستہ ہے اور آنحضرت ﷺ کی معجزانہ کاوشیں بھی ان پر اثر دکھاتی نظر نہیں آتیں۔ چنانچہ ان آیات میں اس بات کا جواب دیا گیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ایک قانون ہے کہ وہ اپنے بندوں کو ایک خاص حد تک تبلیغ و دعوت کے ذریعے پیغمبروںؑ کی معرفت دین کو پیش کرتا ہے۔ پیغمبرؑ اپنی تمام ممکن مساعی کو بروئے کار لاتے ہیں۔ ہمدردی و خیر خواہی کا ایک ایک قطرہ ان کے لیے نچوڑ دیتے ہیں۔ ان کی غلط سے غلط حرکت پر بھی مشتعل ہونے کی بجائے دعائیں دیتے اور تبلیغ و دعوت میں تیزی پیدا کر دیتے ہیں اور یہ کاوشیں چند دنوں تک نہیں رہتیں بلکہ سالوں پر محیط ہو جاتی ہیں۔ لیکن جب اس کے جواب میں مخالفین کی مخالفت بڑھتی چلی جاتی ہے اور وہ اذیت رسانی کی نہ صرف کہ آخری حدوں تک پہنچ جاتے ہیں بلکہ پیغمبرؑ کے قتل کے منصوبے بنانے لگتے ہیں تو تب اللہ تعالیٰ کا قانونِ ہدایت حرکت میں آتا ہے جس کی وجہ سے ان کے دلوں سے قبولیت کی استعداد چھین لی جاتی ہے۔ ان کے حواس اور ان کی عقل ہدایت کے لیے معطل کر دیے جاتے ہیں۔ پیغمبرؑ اور ان کی قوم کے درمیان ایسا باریک پردہ حائل کر دیا جاتا ہے کہ وہ پیغمبرؑ کو دیکھ کر بھی نہیں دیکھتے۔ ان کے کانوں میں ثقل پیدا کر دیا جاتا اور ان کے دلوں پر محرومی کے پردے تان دیے جاتے ہیں۔ اس کے بعد ہدایت اپنا کام چھوڑ دیتی ہے کیونکہ اس کا سر رشتہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، پیغمبرؑ کا کام دعوت و تبلیغ ہے، کسی کے دل کو بدلنا نہیں۔ یہ وجہ ہے کہ جس کی وجہ سے یہ لوگ قرآن سے فائدہ نہیں اٹھا رہے۔

دوسری آیت میں ان کے مرض کی شدت کو بیان کرنے کے لیے یہ بھی بتلایا گیا ہے کہ ان کے بگاڑ کا حال تو یہ ہے کہ انھیں اللہ تعالیٰ کی ذات کی نسبت بتوں سے زیادہ دلچسپی ہے۔ آنحضرت ﷺ جب قرآنِ کریم پڑھ کر سناتے ہیں جس میں اللہ تعالیٰ کی صفات کو بیان کیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کی گئی ہے تو بجائے خوش ہونے کے وہ اس لیے بگڑ جاتے ہیں کہ ہمارے بتوں کا تذکرہ کیوں نہیں کیا جا رہا، صرف اللہ تعالیٰ کی ہی حمد و ثنا کیوں کی جا رہی ہے۔ چنانچہ وہ نفرت سے بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ ان سے یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ وہ بے دلی ہی سے ہی سہی قرآنِ پاک کو سننے کی زحمت گوارا کر لیں۔

ہمارے قدیم مفسرین نے ان آیات کا شانِ نزول بیان کیا ہے اور ان کے چند خصائص بھی بیان کیے گئے ہیں، ہم اسے معارف القرآن سے نقل کرتے ہیں۔

آیات کا شانِ نزول

آیات مذکورہ میں سے پہلی و دوسری آیت میں جو مضمون آیا ہے اس کا ایک خاص شان نزول ہے جو قرطبی نے سعید بن جبیرؓ سے نقل کیا ہے کہ جب قرآن میں سورۃ تبت یدا ابی لہب نازل ہوئی جس میں ابولہب کی بیوی کی بھی مذمت مذکور ہے تو اس کی بیوی نبی کریم ﷺ کی مجلس میں گئی۔ اس وقت حضرت صدیق اکبرؓ مجلس میں موجود تھے اس کو دور سے دیکھ کر آنحضرت ﷺ سے عرض کیا کہ آپؐ یہاں سے ہٹ جائیں تو بہتر ہے کیونکہ یہ عورت بڑی بدزبان ہے۔ یہ ایسی باتیں کہے گی جس سے آپؐ کو تکلیف پہنچے گی۔ آپؐ نے فرمایا نہیں اس کے اور میرے درمیان اللہ تعالیٰ پردہ حائل کر دیں گے۔ چنانچہ وہ مجلس میں پہنچی مگر رسول اللہ ﷺ کو نہ دیکھ سکی تو حضرت صدیق اکبرؓ سے مخاطب ہو کر کہنے لگی کہ آپؓ کے ساتھی نے ہماری ہجو کی ہے۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے فرمایا کہ واللہ وہ تو کوئی شعر ہی نہیں کہتے جس میں عادۃً ہجو کی جاتی ہے تو وہ یہ کہتی ہوئی چلی گئی کہ تم بھی ان کی تصدیق کرنے والوں میں سے ہو۔ اس کے چلے جانے کے بعد حضرت صدیق اکبرؓ نے عرض کیا کہ کیا اس نے آپؐ کو نہیں دیکھا۔ آپؐ نے فرمایا کہ جب تک وہ یہاں رہی ایک فرشتہ میرے اور اس کے درمیان پردہ کرتا رہا۔

Marfat.com

دشمنوں کی نظر سے مستور رہنے کا ایک عمل

حضرت کعبؓ فرماتے ہیں کو رسول اللہ ﷺ جب مشرکین کی آنکھوں سے مستور ہونا چاہتے تو قرآن کی تین آیتیں پڑھ لیتے تھے۔اس کے اثر سے کفار آپؐ کو نہ دیکھ سکتے تھے۔وہ تین آیتیں یہ ہیں،ایک آیت سورۂ کہف میں ہے یعنی

إِنَّا جَعَلْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً أَن يَفْقَهُوهُ وَفِي آذَانِهِمْ وَقْرًا ﴿٥٧﴾

دوسری آیت سورۂ نحل میں ہے:

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ طَبَعَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ ﴿١٠٨﴾

اور تیسری آیت سورۂ جاثیہ میں ہے:

أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَٰهَهُ هَوَاهُ وَأَضَلَّهُ اللَّهُ عَلَىٰ عِلْمٍ وَخَتَمَ عَلَىٰ سَمْعِهِ وَقَلْبِهِ وَجَعَلَ عَلَىٰ بَصَرِهِ غِشَاوَةً ﴿٢٣﴾

حضرت کعبؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا یہ معاملہ میں نے ملک شام کے ایک شخص سے بیان کیا۔اس کو کسی ضرورت سے رومیوں کے ملک میں جانا تھا وہاں گیا اور ایک زمانہ تک وہاں مقیم رہا پھر رومی کفار نے اس کو ستایا تو وہ وہاں سے بھاگ نکلا۔ان لوگوں نے اس کا تعاقب کیا۔اس شخص کو وہ روایت یاد آ گئی اور مذکورہ تین آیتیں پڑھیں۔قدرت نے ان کی آنکھوں پر ایسا پردہ ڈالا کہ جس راستہ پر چل رہے تھے اسی راستہ پر دشمن گزر رہے تھے مگر وہ ان کو نہ دیکھ سکتے تھے۔

امام ثعلبی کہتے ہیں کہ حضرت کعبؓ سے جو روایت نقل کی گئی ہے میں نے رَے کے رہنے والے ایک شخص کو بتائی۔اتفاق سے ویلم کے کفار نے اس کو گرفتار کر لیا۔کچھ عرصہ ان کی قید میں رہا پھر ایک روز موقع پا کر بھاگ کھڑا ہوا۔یہ لوگ اس کے تعاقب میں نکلے مگر اس شخص نے بھی یہ تین آیتیں پڑھ لیں۔اس کا یہ اثر ہوا کہ ان کی آنکھوں پر ایسا پردہ ڈال دیا گیا کہ وہ اس کو نہ دیکھ سکے حالانکہ ساتھ ساتھ چل رہے تھے اور ان کے کپڑے ان کے کپڑوں سے چھو جاتے تھے۔

امام قرطبی کہتے ہیں کہ ان تینوں کے ساتھ وہ آیات سورۂ یٰسین کی بھی ملا لی جائیں جن کو آنحضرت ﷺ نے ہجرت کے وقت پڑھا تھا جبکہ مشرکین مکہ نے آپؐ کے مکان کا محاصرہ کر رکھا تھا۔آپؐ نے یہ آیات پڑھیں اور ان کے درمیان سے نکلتے ہوئے چلے گئے بلکہ ان کے سروں پر مٹی ڈالتے ہوئے گئے ان میں سے کسی کو خبر نہیں ہوئی۔وہ آیات سورۂ یٰسین کی ہیں۔

يٰسٓ وَالْقُرْآنِ الْحَكِيمِ إِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ عَلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ تَنزِيلَ الْعَزِيزِ الرَّحِيمِ لِتُنذِرَ قَوْمًا مَّا أُنذِرَ آبَاؤُهُمْ فَهُمْ غَافِلُونَ ۝ لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلَىٰ أَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ۝ إِنَّا جَعَلْنَا فِي أَعْنَاقِهِمْ أَغْلَالًا فَهِيَ إِلَى الْأَذْقَانِ فَهُم مُّقْمَحُونَ ۝ وَجَعَلْنَا مِن بَيْنِ أَيْدِيهِمْ سَدًّا وَمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَأَغْشَيْنَاهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُونَ ۝

امام قرطبی فرماتے ہیں کہ مجھے خود اپنے ملک اندلس میں قرطبہ کے قریب قلعہ منثور میں یہ واقعہ پیش آیا کہ میں دشمن کے سامنے بھاگا اور ایک گوشہ میں بیٹھ گیا۔دشمن نے دو گھوڑے سوار میرے تعاقب میں بھیجے اور میں بالکل کھلے میدان میں تھا کہ کوئی چیز پردہ کرنے والی نہ تھی مگر میں سورۂ یٰسین کی یہ آیتیں پڑھ رہا تھا۔یہ دونوں سوار میرے برابر سے گزرے پھر جہاں سے آئے تھے یہ کہتے ہوئے لوٹ گئے کہ یہ شخص کوئی شیطان ہے کیونکہ وہ مجھے دیکھ نہ سکے۔اللہ تعالیٰ نے ان کو مجھ سے اندھا کر دیا تھا۔　(قرطبی)

Marfat.com

نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَسْتَمِعُوْنَ بِهٖۤ اِذْ يَسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ وَاِذْ هُمْ نَجْوٰۤى اِذْ يَقُوْلُ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ﴿٤٧﴾ اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا ﴿٤٨﴾

(ہم خوب جانتے ہیں جس غرض کے لیے یہ اسے سنتے ہیں، جب یہ آپؐ کی طرف کان لگاتے ہیں اور (ہم خوب جانتے ہیں) جب یہ سرگوشیاں کرتے ہیں، اس وقت یہ ظالم کہتے ہیں کہ تم ایک ایسے آدمی کی پیروی کر رہے ہو جس پر جادو کر دیا گیا ہے۔ ۴۷) دیکھئے یہ کس طرح آپؐ کے لیے مثالیں بیان کرتے ہیں، پس وہ گمراہ ہو گئے، اب وہ سیدھے راستے پر چل نہیں سکتے۔ ۴۸) (سورۃ بنیٓ اسرآءِیل : ۴۷۔۴۸)

آنحضرت ﷺ کی باتیں قریش بُرے ارادوں سے سنتے تھے

گزشتہ آیات میں ہم نے پڑھا ہے کہ مشرکینِ مکہ اور اشرافِ قریش کبھی قرآنِ کریم کو سننا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے ان کا حواس اور ان کی عقلیں قرآنِ پاک سننے سے ماؤف ہو گئی ہیں۔ لیکن اس آیتِ کریمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کبھی کبھی بہت کان لگا کر قرآنِ کریم اور آنحضرت ﷺ کی باتوں کو سنتے تھے۔ لیکن یہ ان کا سننا قرآنِ کریم کی وضاحت کے مطابق ہدایت قبول کرنے کے لیے نہ تھا بلکہ محض اس لیے سنتے تھے تاکہ انھیں کوئی ایسی بات ہاتھ آئے جس سے وہ آنحضرت ﷺ اور قرآنِ کریم کے خلاف ڈھول اڑا سکیں، بدگمانیاں پھیلا سکیں اور لوگوں کے ذہنوں کو مسموم کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب یہ لوگ آپس میں سرگوشیاں کرتے ہیں اور انھیں باہم مشوروں کا موقع ملتا ہے اور وہ کوشش کرتے ہیں کہ قرآن اور صاحبِ قرآن کے خلاف کوئی بات بنا سکیں تو پھر اس کے سوا اور وہ کچھ نہیں کہہ پاتے کہ یہ ایک ایسے آدمی کی دعوت ہے جو سحر زدہ ہے۔ یعنی جو اپنے آپ کو پیغمبر کہتا ہے، اس کی اپنی حالت درست نہیں، اس پر کسی نے جادو کر دیا ہے اور وہ جادو کے اثرات سے نہ جانے کیا کچھ کہتا رہتا ہے۔ دوسری آیتِ کریمہ میں اسی بات کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ ہزار کوشش کے باوجود انھیں قرآنِ کریم اور صاحبِ قرآن کے بارے میں جب کوئی بات ایسی نہیں ملتی جسے وہ پراپیگنڈے کا موضوع بنا سکیں تو پھر آپؐ کے لیے مختلف مثالیں گھڑنا شروع کر دیتے ہیں۔ کبھی آپؐ کو مسحور کہتے ہیں، کبھی مجنون کہتے ہیں، کبھی شاعر کہتے ہیں اور کبھی کاہن کہتے ہیں۔ لیکن جب ان میں سے کوئی بھی سمجھدار آدمی اس پر اعتراض کرتا ہے جیسے ولید بن مغیرہ کے بارے کہا جاتا ہے کہ جب اس کے سامنے اس طرح کی باتیں کہی گئیں تو اس نے کہا کہ ہم شعر کے تمام اصناف سے واقف ہیں۔ قرآنِ کریم نہ شعر ہے اور نہ محمد (ﷺ) شاعر ہیں۔ کاہنوں کی بھی ہم نے باتیں سنی ہیں۔ آپؐ میں کاہنوں والی بھی کوئی بات نہیں۔ آپؐ کی ذہانت و فطانت کا مکے بھر میں کوئی جواب نہیں تو انھیں مجنون کیسے کہا جا سکتا ہے، تو تمام اشراف اس کے پیچھے پڑ گئے کہ پھر تم ہی بتاؤ ہم اسے کیا کہیں؟ تو اس نے بہت سوچ سمجھ کے جواب دیا، کہ اور تو کوئی بات کہنا مشکل ہے البتہ تم اسے مسحور، یعنی سحر زدہ کہہ سکتے ہو۔ یعنی یہ ایک ایسی بات ہے جو کسی کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ اس لیے کہ اس کی کوئی ظاہری علامتیں تو ہوتی نہیں۔ یہاں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے مخالفین کسی ایک الزام پر متفق نہیں۔ قرآنِ کریم اور آنحضرت ﷺ کی شخصیت کے سامنے وہ اپنے آپ کو بے بس محسوس کرتے ہیں۔ گمراہی سے نکلنا نہیں چاہتے اور مخالفت میں ان کے پاس کوئی ہتھیار نہیں۔ اس لیے مجبوراً جو جی میں آتا ہے کہہ گزرتے ہیں لیکن جب وہ یہ دیکھتے ہیں کہ اسلام آہستہ آہستہ اپنا راستہ بنا رہا ہے تو پھر جب کسی پر شبہ بھی ہوتا ہے کہ وہ اسلام سے متاثر ہو رہا ہے تو آخری یہی بات اسے سمجھانے کے لیے کہی جاتی تھی کہ یہ تو ایک سحر زدہ شخص کی باتیں ہیں جن سے تم متاثر ہو رہے ہو۔ یہ گویا ایک ایسے ذہن کی کہانی ہے جسے مخالفت نے بالکل اندھا کر دیا ہے اور مخالفت کے بے اثر ہونے نے اسے پاگل بنا دیا ہے۔ ان میں سے ہر شخص مخالفت کرنا چاہتا ہے لیکن مخالفت کا طریقہ سجھائی نہیں دیتا۔ سب مل کر باہمی مشاورت سے بھی کسی ایک بات پر جمع نہیں ہو پاتے تو ایسے لوگوں سے بجائے سر مارنے کے یہ بہتر ہے کہ انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ وہ وقت دور نہیں جب حقیقت ان کے سامنے کھل کر آ جائے گی۔

وَقَالُوْۤا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ﴿٤٩﴾ (سورۃ بنیٓ اسرآءِیل : ۴۹)

(اور کہتے ہیں کہ جب ہم ہڈیاں اور چورا چورا ہو جائیں گے تو ہم از سر نو اٹھائے جائیں گے۔ ۴۹)

Marfat.com

مشرکین کا اصل مرض

پیچھے ہم پڑھ چکے ہیں کہ مشرکین کا اصل مرض آخرت کا انکار تھا۔ انھیں اس بات میں سخت استبعاد معلوم ہوتا تھا کہ جب ہم فنا کی گھاٹ اتر جائیں گے اور ہمیں لحد میں اتار دیا جائے گا تو ایک مدت کے بعد یقیناً زمین ہمارے جسموں کو کھا جائے گی اور ہماری ہڈیاں ریزہ ریزہ ہو جائیں گی تو ہمیں کس طرح از سر نو زندہ کر کے اٹھایا جائے گا۔ ہمارا جسم نہ جانے مٹی کی کس تہہ میں مٹی بن کر شامل ہو چکا ہوگا۔ دوبارہ زندگی کس قالب میں ڈالی جائے گی۔

اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا

مذہب کے نام پر محض خیالی تصورات پر اصرار کرنا یہ تو کوئی اچھی بات نہیں، انھیں نہ جانے ہمیں ماننے پر کیوں مجبور کیا جا رہا ہے۔ صحیح بات یہی ہے کہ یہی زندگی حقیقی زندگی ہے، یہیں کی خوشیاں اور غم اپنی آخری حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے بعد کسی زندگی کا تصور خام خیالی کے سوا کچھ نہیں، ایسے سراب کی پیچھے بھاگنے کی کیا ضرورت ہے جو نہ عقل کی گرفت میں آتا ہے اور نہ اس کی کوئی توجیہ ممکن ہے۔ پروردگار نے دوسری آیت میں اس کا جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

قُلْ كُونُوا حِجَارَةً أَوْ حَدِيدًا ﴿٥٠﴾ أَوْ خَلْقًا مِمَّا يَكْبُرُ فِي صُدُورِكُمْ ۚ فَسَيَقُولُونَ مَنْ يُعِيدُنَا ۖ قُلِ الَّذِي فَطَرَكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ فَسَيُنْغِضُونَ إِلَيْكَ رُءُوسَهُمْ وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هُوَ ۖ قُلْ عَسَىٰ أَنْ يَكُونَ قَرِيبًا ﴿٥١﴾

(کہہ دیجیے کہ تم پتھر بن جاؤ یا لوہا، ۵۰) یا کوئی اور مخلوق جو تمھارے خیال میں ان سے بھی سخت ہو، پھر وہ کہیں گے کہ ہمیں کون دوبارہ زندہ کرے گا، کہہ دیجیے، وہی جس نے تمھیں پہلی مرتبہ پیدا کیا، پھر وہ آپ کے آگے سر ہلائیں گے اور کہیں گے کہ یہ کب ہوگا؟ آپ کہہ دیجیے کہ عجب نہیں کہ اس کا وقت قریب ہی آ پہنچا ہو۔ ۵۱) (سورۃ بنیٓ اسرآءِیل : ۵۰۔۵۱)

بعث بعد الموت پر دلیل

تم یہ سمجھتے ہو کہ جب ہم بوسیدہ ہڈیاں اور چورا چورا ہو جائیں گے تو ہمیں دوبارہ اس لیے زندہ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ بوسیدہ ہڈیاں یا ہڈیوں کا چورا زندگی کو قبول نہیں کر سکتا۔ پروردگار فرماتا ہے کہ تم اگر پتھر یا لوہا بھی ہو جاؤ یا اس سے بھی کوئی سخت چیز جس کے بارے میں تمھارا گمان ہو کہ وہ زندگی کو بالکل قبول نہیں کر سکتی تو یاد رکھو تمھیں پھر بھی دوبارہ زندہ ہونا ہوگا۔ وہ حیران ہو کر یا از راہِ استہزاء کہیں گے کہ ہمیں کون زندہ کرے گا؟ ان کے خیال میں بوسیدہ ہڈیوں یا ہڈیوں کے چورے میں دوبارہ زندگی کا پیدا کیا جانا ایک ناممکن سی بات ہے تو ان سے کہا جائے گا کہ تمھیں وہی پیدا کرے گا جس نے تمھیں پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا۔ تمھاری خود فریبی کا سبب یہ ہے کہ تم صرف یہ دیکھ رہے ہو کہ ہر مخلوق مرنے کے بعد مکمل طور پر فنا ہو جاتی ہے۔ یعنی مٹی بن کر گل سڑ جاتی ہے۔ اب اس میں دوبارہ زندگی کا پیدا ہونا ایک ناممکن بات ہے۔ لیکن تم یہ نہیں سمجھتے کہ جب تمھیں پہلی مرتبہ پروردگار عدم سے وجود میں لایا تو تمھارا نام و نشان تک نہ تھا۔ اب جبکہ تم دنیا میں زندگی گزار کے گئے ہو تو تمھارا ایک نام تو ہے، تمھارے آثار بھی ہیں، تمھیں تو نہیں معلوم لیکن اللہ تعالیٰ کو خوب معلوم ہے کہ تمھاری ریڑھ کی ہڈی کے بقیہ اجزاء کہاں ہیں۔ تم چاہے انھیں کیسا بھی گیا گزرا سمجھو اور اس میں اور زندگی میں کیسا بھی استبعاد محسوس کرو لیکن اللہ تعالیٰ کی قدرت کے سامنے ایسی کوئی چیز مانع نہیں ہو سکتی۔ وہ چاہے تو سرابیں حباب اٹھا سکتا ہے، وہ چاہے تو سمندر کو ایک لمحہ میں پایاب بنا سکتا ہے۔ اس کی قدرت سے قومیں فنا کے گھاٹ اتر جاتی ہیں اور مردہ زمین بارش کے چند چھینٹوں سے زندہ ہو جاتی ہے۔ اور اس کے حیات بخش پیغام سے قومیں از سر نو زندگی کا پیغام لے کر اٹھتی ہیں اور تاریخ میں اپنا نام چھوڑ جاتی ہیں۔ تمھیں جب تک اللہ تعالیٰ کی قدرت کا یقین نہیں آئے گا اس وقت تک قیامت تمھارے لیے ایک پہیلی بنی رہے گی۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ وہ لوگ رسول اللہ ﷺ کا جواب سن کر مذاق کے طور پر سر ہلائیں گے اور خندہ استہزاء کے ساتھ پوچھیں گے کہ اچھا کب آئے گا وہ لمحہ، جب قیامت آئے گی، تو اللہ تعالیٰ آنحضرت ﷺ کو حکم دے رہا ہے کہ آپ ان سے کہہ دیجیے کہ ممکن ہے کہ وہ لمحہ قریب ہی آ لگا ہو لیکن میں اس کے بارے میں تعین سے کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کسی کو اس کے وقوع کا یقینی علم نہیں دیا، لیکن تم یہ بتاؤ کہ اگر

Marfat.com

کسی چیز کے بارے میں یہ تو معلوم ہو کہ وہ ہو کے رہے گی لیکن یہ معلوم نہ ہو کہ وہ کب ہوگی تو کیا اس کا انکار کر دیتے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو تم اپنی موت کا انکار کیوں نہیں کر دیتے۔ کیونکہ ہر شخص جانتا ہے کہ موت آئے گی لیکن یہ کوئی نہیں جانتا کہ اس کی موت کا وقت کون سا ہے۔ محض وقت کا علم نہ ہونے کی وجہ سے کوئی شخص اپنی موت کا انکار نہیں کرتا، تو تم قیامت کا انکار کیسے کر سکتے ہو۔ رہی یہ بات کہ تم یہ کہو کہ ہمیں تو قیامت کے آنے کا یقین ہی نہیں تو اس کا کوئی علاج کسی کے پاس نہیں کیونکہ یہ ایسا علم ہے جس پر عقل تو شہادت دیتی ہی ہے، اخلاق بھی پکار پکار کر کہتے ہیں کہ قیامت کا آنا تکمیلِ اخلاق کے لیے انتہائی ضروری ہے لیکن اس کے علاوہ دنیا کی تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ جب بھی کبھی کوئی پیغمبر اہلِ دنیا کی اصلاح کے لیے آیا ہے اس نے قیامت کے آنے کی خبر ضرور دی ہے اور ہر قوم نے دوسری قوم تک اس صداقت کی امانت کو منتقل کیا ہے۔ افراد کی شہادتیں بعض دفعہ پایہٴ ثبوت سے گر جاتی ہیں لیکن اقوام کی شہادتوں کا انکار کرنا اپنے وجود کے انکار کے مترادف ہے۔

يَوۡمَ يَدۡعُوۡكُمۡ فَتَسۡتَجِيۡبُوۡنَ بِحَمۡدِهٖ وَتَظُنُّوۡنَ اِنۡ لَّبِثۡتُمۡ اِلَّا قَلِيۡلًا ۝٥٢

(جس دن وہ تمھیں پکارے گا، تم اس کی حمد کرتے ہوئے اس کے حکم کی تعمیل کرو گے، اور تم یہ گمان کرو گے کہ تم نہیں رہے (دنیا اور برزخ میں) مگر تھوڑی سی مدت۔ ۵۲) (سورۃ بنیٓ اسرآءِیل : ۵۲)

پروردگار براہِ راست کفار سے مخاطب ہو کر فرماتا ہے کہ آج جبکہ تم نبی کریم ﷺ کی بات سننے کے روادار نہیں ہو اور قرآنِ کریم سے رخ پھیر لیتے ہو اور تمھاری اکڑ روز بروز بڑھتی جا رہی ہے، اس وقت کیا کرو گے جب قیامت کے دن حضرت اسرافیل کے واسطے سے یا براہِ راست اللہ تعالیٰ تمھیں آواز دے گا کہ قبروں سے نکلو اور محشر میں پہنچ جاؤ۔ تو تم سب زندہ ہو کر میدانِ حشر میں اس طرح پہنچو گے کہ تمھاری زبانوں پر اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا ہوگی۔

فَتَسۡتَجِيۡبُوۡنَ بِحَمۡدِهٖ۔ استجابت کے معنی کسی کے بلانے پر حکم کی تعمیل کرنا اور حاضر ہونا ہے۔ کفار سے کہا جا رہا ہے کہ تمھیں قیامت کے دن جب بلایا جائے گا تو آج جبکہ تم کوئی بات سننے کو تیار نہیں ہو، اس وقت فوراً تم اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کرو گے۔ اور مزید یہ کہ صرف تعمیل ہی نہیں کرو گے بلکہ تمھاری زبانوں پر اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا جاری ہوگی۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ اس میں مسلم اور غیر مسلم کا کوئی امتیاز نہیں ہوگا۔ سب اللہ تعالیٰ کی تعریف کرتے ہوئے محشر کی طرف بڑھیں گے۔ امام تفسیر حضرت سعید بن جبیرؒ نے فرمایا کہ کفار بھی اپنی قبروں سے نکلتے وقت سُبۡحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمۡدِكَ کے الفاظ کہتے ہوئے نکلیں گے، مگر اس وقت کا حمد و ثنا انھیں کوئی نفع نہیں دے گا کیونکہ جب مرنے کے بعد زندگی دیکھیں گے تو غیر اختیاری طور پر ان کی زبان سے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے الفاظ نکلیں گے۔ وہ کوئی ایسا عمل نہیں ہوگا جس پر جزا مرتب ہو۔

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ حمد و ثنا صرف صاحبِ ایمان لوگوں کے ساتھ مخصوص ہے کیونکہ کافروں کے بارے میں تو قرآنِ کریم نے بتایا ہے کہ جب وہ قیامت کے دن اٹھیں گے تو یہ کہتے ہوئے اٹھیں گے کہ ہائے ہماری قسمت، ہمیں کس نے قبر سے زندہ کر اٹھایا۔ لیکن ان دونوں باتوں میں کوئی تعارض نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قبروں سے نکلتے وقت تو سب اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کریں گے، لیکن جب کافروں کو مومنوں سے الگ ہونے کا حکم دیا جائے گا تو اس وقت ان کی زبانوں سے وہ کلمات بھی نکلیں گے جس کا قرآنِ کریم میں ذکر کیا گیا ہے۔

امام قرطبی فرماتے ہیں کہ قبروں سے اٹھتے ہوئے بھی لوگ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کریں گے اور سب معاملات کا خاتمہ بھی حمد پر ہوگا۔ اور جب اہلِ محشر کے اعمال کا فیصلہ کر دیا جائے گا تو سب کی زبانوں پر اللہ رب العالمین کی حمد جاری ہو جائے گی۔

وَقُلۡ لِّعِبَادِىۡ يَقُوۡلُوا الَّتِىۡ هِىَ اَحۡسَنُ‌ؕ اِنَّ الشَّيۡطٰنَ يَنۡزَغُ بَيۡنَهُمۡ‌ؕ اِنَّ الشَّيۡطٰنَ كَانَ

Marfat.com

لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِيْنًا ﴿٥٣﴾ رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِكُمْ ۭ اِنْ يَّشَاْ يَرْحَمْكُمْ
اَوْ اِنْ يَّشَاْ يُعَذِّبْكُمْ ۭ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا ﴿٥٤﴾ وَرَبُّكَ
اَعْلَمُ بِمَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّٖنَ
عَلٰي بَعْضٍ وَّاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ﴿٥٥﴾ قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ
مِّنْ دُوْنِهٖ فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيْلًا ﴿٥٦﴾
اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ
وَيَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ ۭ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ
مَحْذُوْرًا ﴿٥٧﴾ وَاِنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوْهَا قَبْلَ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ
اَوْ مُعَذِّبُوْهَا عَذَابًا شَدِيْدًا ۭ كَانَ ذٰلِكَ فِي الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا ﴿٥٨﴾
وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّآ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ ۭ
وَاٰتَيْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا بِهَا ۭ وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰيٰتِ
اِلَّا تَخْوِيْفًا ﴿٥٩﴾ وَاِذْ قُلْنَا لَكَ اِنَّ رَبَّكَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ ۭ وَمَا جَعَلْنَا
الرُّءْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِي
الْقُرْاٰنِ ۭ وَنُخَوِّفُهُمْ ۙ فَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا طُغْيَانًا كَبِيْرًا ﴿٦٠﴾ ع

رکوع: ۶۔ (اور (اے پیغمبرؐ) آپؐ میرے بندوں کو حکم دیجیے کہ وہ ایسی باتیں کیا کریں جو بہتر ہوں، بیشک شیطان ان کے درمیان وسوسہ اندازی کرتا ہے، یقیناً شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔ ۵۳) تمھارا رب تمھیں خوب جانتا ہے، اگر چاہے تو تم پر رحم کرے اور اگر چاہے تو تم کو عذاب دے، اور ہم نے آپؐ کو ان کا ذمہ دار بنا کر نہیں بھیجا۔ ۵۴) اور آپ کا

Marfat.com

رب خوب جانتا ہے ان کو جو آسمانوں اور زمین میں ہے، اور ہم نے بعض نبیوںؑ کو بعض پر فضیلت دی ہے اور ہم نے داؤد کو زبور عطا فرمائی۔ ۵۵) (اے پیغمبر کہہ دیجیے! کہ پکارو ان کو جن کو تم نے اللہ تعالیٰ کے سوا معبود گمان کر رکھا ہے۔ وہ تو قدرت نہیں رکھتے، تم سے تکلیف دور کرنے کی اور نہ اسے ٹالنے کی۔ ۵۶) جن کو یہ پکارتے ہیں وہ تو خود ہی اپنے رب کے قرب کی طلب میں سرگرم ہیں کہ ان میں سے کون سب سے زیادہ قرب حاصل کرتا ہے، اور وہ اپنے رب کی رحمت کے امیدوار ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں، بیشک آپؐ کے رب کا عذاب چیز ہی ڈرنے کی ہے۔ ۵۷) اور نہیں ہے کوئی بستی مگر ہم اس کے ہلاک کرنے والے ہیں قیامت کے دن سے پہلے یا اس کو عذاب دیں گے، شدید عذاب، یہ بات کتاب میں لکھی ہوئی ہے۔ ۵۸) اور ہم کو نشانیاں بھیجنے سے نہیں روکا، مگر اس بات نے کہ پہلوں نے ان نشانیوں کو جھٹلایا، اور ہم نے قوم ثمود کو ایک اونٹنی دی، آنکھیں کھول دینے والی، تو انھوں نے اس پر ظلم کیا اور ہم نشانیاں بھیجتے ہیں تو ڈرانے ہی کے لیے بھیجتے ہیں۔ ۵۹) اور اس وقت کو یاد کرو جس وقت ہم نے آپؐ سے کہا تھا کہ بیشک آپ کا رب لوگوں کو گھیر چکا ہے اور ہم نے وہ دکھاوا آپ کو نہیں دکھایا، مگر لوگوں کے لیے آزمائش اور وہ درخت بھی جس پر قرآنِ کریم میں لعنت کی گئی ہے، اور ہم انھیں ڈراتے ہیں لیکن ان کے اندر سوائے ایک بڑی سرکشی کے کسی اور چیز کا اضافہ نہیں ہوتا۔ ۶۰)

وَقُلۡ لِّعِبَادِیۡ یَقُوۡلُوا الَّتِیۡ هِیَ اَحۡسَنُ ؕ اِنَّ الشَّیۡطٰنَ یَنۡزَغُ بَیۡنَهُمۡ ؕ اِنَّ الشَّیۡطٰنَ كَانَ لِلۡاِنۡسَانِ عَدُوًّا مُّبِیۡنًا ﴿۵۳﴾

(اور (اے پیغمبرؐ) آپؐ میرے بندوں کو حکم دیجیے کہ وہ ایسی باتیں کیا کریں جو بہتر ہوں، بیشک شیطان ان کے درمیان وسوسہ اندازی کرتا ہے، یقیناً شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔ ۵۳) (سورۃ بنیٓ اسرآءِیل : ۵۳)

مخالفتوں کے ہجوم میں مسلمانوں کو صبر کی تلقین

گزشتہ آیات سے یہ بات تو بالکل واضح ہوگئی ہے کہ مشرکینِ مکہ آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کی مخالفت میں انتہاؤں کو چھونے لگے تھے۔ قرابت یا مروت کی پاسداری ایک افسانہ بن چکی تھی۔ قریش جو ہمیشہ خونی رشتوں اور ہمسائیگی کے تعلقات کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے اب ان میں سے ہر رشتے کو نظر انداز کر چکے تھے۔ ادھر اہلِ کتاب بھی اس نئے آنے والے دین کی طرف سے بے فکر نہ تھے۔ انھیں جب بھی موقع ملتا وہ قریش کی پیٹھ ٹھونکتے تھے۔ آیت نمبر 47 سے اندازہ ہو چکا ہے کہ ان کی زبانیں پوری طرح بے روک ہو چکی تھیں اور طنز و تعریض کے نشتر مکمل بے رحمی کے ساتھ اپنے جوہر دکھا رہے تھے۔ ایسی فضا میں دو باتوں کا امکان بڑھ جاتا ہے۔ ایک تو یہ کہ مسلمان جب اپنے آپ کو مسلسل مصائب کا ہدف دیکھیں تو ان کے اندر نفسیاتی عوارض پیدا ہونے لگیں جس کے نتیجے میں وہ بجائے یکسوئی کے ساتھ مخالفتوں کا سامنا کرنے کے ایک دوسرے سے الجھنے لگیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ مصیبت ایک وقت میں انسانوں کو اکٹھا بھی کرتی ہے اور پھر ایک دوسرے سے بدگمان بھی کرتی ہے۔ مسلمانوں کے سروں پر اگرچہ اللہ تعالیٰ کا سایہ تھا اور ایک عظیم قیادت کی رفاقت انھیں میسر تھی، تاہم کسی نہ کسی نفسیاتی عارضہ کا شکار ہونا ناممکن نہ تھا۔ اس لیے ایک تو اس طرف توجہ دلانا ضروری تھا اور دوسری یہ بات کہ مخالفتوں کے ردِعمل میں اس بات کا بھی امکان تھا کہ صبر اور ضبط کا دامن کبھی کبھی مسلمانوں کے ہاتھ سے چھوٹنے لگے۔ جب مکے کے رہنے والے مکے کے ان باسیوں سے توہین آمیز سلوک کرنے لگیں جن کا قصور اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے دین پر ایمان لا چکے ہیں اور اپنے تمام رشتوں کو طاقِ نسیاں پر رکھ دیں اور اس سے بھی بڑی بات یہ کہ آنحضرت ﷺ کی ذاتِ گرامی کے بارے میں شرم اور وضع داری کا ہر رشتہ کاٹ دیں۔ ایسی صورتحال میں ان کی طنز و تعریض کے جواب میں مسلمان بھی جواب دینے کی کوشش کرنے لگیں اور کبھی کبھی ان کی مخالفتوں کا نوٹس بھی لیا جانے لگے۔ چنانچہ اس سے پہلے کہ مسلمان اس کیفیت سے دوچار ہوں پروردگارِ عالم نے اپنی کتاب کے ذریعے آنحضرت ﷺ کو حکم دیا کہ آپؐ میرے بندوں کے پابند کریں کہ مخالفین چاہے کچھ بھی کہیں اور وہ کیسی بھی غلط اور نازیبا باتیں کریں، آپؐ کو ان کے جواب میں بہتر، جائز اور مستحسن بات کے سوا

Marfat.com

کچھ نہیں کہنا چاہیے۔ ممکن ہے اس سے آپؐ کے جوشِ حمیت کو کچھ تسکین ملے، لیکن اس سے تبلیغ ودعوت کی روح کا مجروح ہونا بالکل سامنے کی بات ہے۔ مخالف ہمیشہ ایسی بات کہتا ہے جسے سننے والے کے لیے برداشت کرنا آسان نہیں ہوتا، لیکن اسے اس بات کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی کہ میری بات سے کسی کی عزتِ نفس مجروح ہوتی ہے، دلآزاری ہوتی ہے، بدنامی ہوتی ہے یا رشتوں کو نقصان پہنچتا ہے۔ لیکن اگر ایسی ہی بات مبلغ کے منہ سے نکل جائے اور ایسی ہی کوئی حرکت داعی سے سرزد ہو جائے تو مخالفین اسے نہ صرف کہ برداشت نہیں کرتے بلکہ اسے دعوت کی کمزوری کے لیے استعمال کرتے اور دعوت کی بدنامی کا باعث بنادیتے ہیں۔ تبلیغ ودعوت کی کامیابی کا راستہ ہمیشہ صبر، عفوودرگزر اور اعلیٰ اخلاق کے اندر سے گزرتا ہے۔ شیطان چونکہ سب سے زیادہ دین کا دشمن ہے کیونکہ اس کی زندگی ہدف ہی یہ ہے کہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے آستانے سے دور رکھا جائے۔ اس لیے اس کا سب سے بڑا نشانہ مبلغ اور داعی اِلی اللہ ہوتا ہے۔ جب لوگ اس کی توہین کرتے ہیں اور اس کو اذیت پہنچاتے ہیں تو وہ اس کے دل میں ایک ردِعمل اٹھانے کی کوشش کرتا ہے۔ اسے بار بار حمیت کا درس دیتا ہے اور ہر طرح کی زیادتی پر چپ رہنے کو کمزوری قرار دیتا ہے۔ چنانچہ اس صورتحال کی طرف توجہ دلانے کے لیے فرمایا کہ شیطان تمھارے دلوں میں وسوسہ اندازی کرے گا۔ وہ کبھی تمھیں دشمن سے لڑائے گا اور کبھی تمھارے اپنے اندر اختلافِ رائے پیدا کرے گا تاکہ تمھاری ہم آہنگی اور یکسوئی کو نقصان پہنچے۔ اور دشمن کو تمھارے ردِعمل کا بہانہ بنا کر اسلام پر برہنہ تنقید کا موقع ملے۔ اس لیے تمھیں یہ بات کبھی ذہن سے نکالنی نہیں چاہیے کہ شیطان تمھارا کھلم کھلا دشمن ہے۔ وہ ہر طرح سے کوشش کرے گا کہ تمھیں تمھارے راستے سے ہٹائے اور تمھاری منزل تم سے دور کردے۔ اس لیے تمھیں دعوت اِلی اللہ کا کام کرتے ہوئے پوری طرح بیدار رہنا ہوگا۔

رَبُّکُمْ اَعْلَمُ بِکُمْ ؕ اِنْ یَّشَاْ یَرْحَمْکُمْ اَوْ اِنْ یَّشَاْ یُعَذِّبْکُمْ ؕ وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ عَلَیْھِمْ وَکِیْلًا ﴿۵۴﴾

(تمھارا رب تمھیں خوب جانتا ہے، اگر چاہے تو تم پر رحم کرے اور اگر چاہے تو تم کو عذاب دے، اور ہم نے آپؐ کو ان کا ذمہ دار بنا کر نہیں بھیجا۔ ۵۴) (سورۃ بنیٓ اسرآءِیل : ۵۴)

حکمتِ تبلیغ

گزشتہ آیتِ کریمہ میں پروردگار نے آنحضرت ﷺ کے واسطے سے مسلمانوں کو جو ہدایت جاری فرمائی ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ مسلمانوں کو مخالفین کی باتوں اور اذیتوں سے اثر لینے اور اس پر کسی ردِعمل کا اظہار کرنے کی بجائے اپنی ساری توجہ تبلیغ ودعوت پر مرکوز رکھنی چاہیے۔ آپ کو ہر بات کہنے اور ہر کام کرنے سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ اس کا تبلیغ ودعوت پر کیا اثر پڑے گا اور غیرمسلم قبولیتِ ایمان کے سلسلے میں اس سے کیا اثر لیں گے۔ چنانچہ اس ہدایت کا اثر یہ ہوا کہ آنحضرت ﷺ اور مسلمان پہلے سے بھی بڑھ کر غیرمسلموں کے ایمان کے لیے بے چین رہنے لگے۔ رات دن دھیان اسی بات کا رہنے لگا کہ کس طرح ان کفار کو اسلام کی آغوش میں لایا جائے۔ ایسا کیا طریقہ اختیار کیا جائے کہ ان کے دل اس۔ کے لیے کھل جائیں۔ اس وارفتگی اور شیفتگی کا نتیجہ یہ نکلا کہ جیسے جیسے کافروں کی مخالفتیں بڑھنے لگیں، ویسے ویسے مسلمانوں کی فکرمندی اور دل گرفتگی میں اضافہ ہونے لگا۔ چنانچہ مسلمانوں کو ان کی تبلیغ ودعوت کی آخری حد واضح کرنے کے لیے یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی جس میں فرمایا گیا کہ کسی شخص کو اسلام کی دولت نصیب ہوگی یا نہیں اور کوئی اس بدنصیبی میں دنیا سے چلا جائے گا اور جو شخص اسلام کی آغوش میں آچکا ہے وہ واقعی اس میں ثابت قدم رہے گا۔ اسے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ کسی شخص کی ہٹ دھرمی دیکھ کر آپ اس کی طرف سے مایوس نہ ہوں۔ آپ کو اپنا کام جاری رکھنا چاہیے اور نہ آپ دل گرفتہ ہوں، کیونکہ جو شخص اس وقت آپ کی دعوت کو قبول نہیں کررہا ہے، ضروری نہیں کہ وہ کبھی بھی قبول نہ کرے۔ آنحضرت ﷺ چونکہ اس صورتحال سے سب سے زیادہ متاثر ہوتے تھے اس لیے آپؐ سے خاص طور پر فرمایا کہ آپؐ کو اس بات کا ذمہ دار بنا کر تو نہیں بھیجا گیا کہ یہ لوگ ضرور ایمان لائیں، ورنہ آپؐ سے جواب طلب کیا جائے گا۔ آپؐ اپنی مساعی جاری رکھئے اور ان کا انجام اللہ تعالیٰ پر چھوڑیئے۔

Marfat.com

وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِمَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۗ وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِیّٖنَ عَلٰی بَعْضٍ وَّاٰتَیْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ﴿۵۵﴾

(اور آپؐ کا رب خوب جانتا ہے ان کو جو آسمانوں اور زمین میں ہے، اور ہم نے بعض نبیوںؑ کو بعض پر فضیلت دی ہے اور ہم نے داؤد کو زبور عطا فرمائی۔ ۵۵) (سورۃ بنیٓ اسرآءِیل : ۵۵)

تفضیلِ انبیاء میں صحیح نقطۂ نظر

مذہبی مباحث میں عام طور پر جس بات سے بحث میں گرمی پیدا ہو جاتی ہے وہ ہر گروہ کا اپنے مقتداؤں کو سب پر فضیلت دینا ہوتا ہے، جس گروہ نے جسے اپنا رہنما اور پیشوا بنالیا ہے اور یا وہ اسے نبی سمجھ کر اس پر ایمان لے آیا ہے تو اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ میں اسے تمام رہنماؤں پر فضیلت دوں اور تمام انبیائے کرام سے اسے برتر ثابت کروں۔ مشرکینِ مکہ اگر چہ اپنے بتوں کے بارے میں خاصے حساس تھے۔ اسی طرح حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کو سب سے افضل مانتے تھے لیکن عموماً اس طرح کی بحثیں یہودی اٹھاتے تھے۔ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور دیگر چند پیغمبروں کو باقی سب سے افضل سمجھتے تھے۔ نبی کریم ﷺ نے جب نبوت کا دعویٰ فرمایا تو اولاً تو انھیں آپؐ کے دعویٰ ہی سے انکار تھا پھر جب معراج جیسے واقعات ان کے سامنے آئے اور انھیں اندازہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو کیسے کیسے مراتب سے نوازا ہے تو انھوں نے آنحضرت ﷺ کے بارے میں توہین آمیز رویہ اختیار کر لیا اور بار بار مسلمانوں کو اس بحث میں گھسیٹنے لگے کہ کہاں وہ اللہ تعالیٰ کے عظیم پیغمبرؑ جن کو دنیا مانتی ہے اور کہاں یہ صاحب جو نبوت کا دعویٰ کر رہے ہیں، ان کا ان سے کیا تعلق۔ مسلمانوں کو یقیناً ان باتوں سے تکلیف ہوتی اور وہ کچھ نہ کچھ کہنے پر مجبور ہو جاتے۔ اس آیتِ کریمہ میں پروردگار نے اصولی بات فرمائی کہ آج دنیا میں سوائے نبی کریم ﷺ کے اور کوئی اللہ تعالیٰ کا نبیؐ موجود نہیں۔ جو صدیوں پہلے گزر چکے ہیں تم ان کے بارے میں جو چاہو رائے رکھو، لیکن تم براہ راست ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتے، لیکن اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کی مخلوقات کو خوب جانتا ہے۔ آسمان میں اس کی پاکیزہ مخلوق فرشتے ہیں تو وہ ان کے بارے میں اور ان کے مقامات کے بارے میں تم سے زیادہ جانتا ہے۔ اسی طرح زمین پر اس نے ایک سے ایک بڑھ کر پیغمبرؑ بھیجے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس وقت کی دنیا کا امام بنایا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو شرفِ ہمکلامی بخشا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بینات عطا فرمائے اور حضرت داؤد علیہ السلام کو زبور عطا فرمائی۔ اللہ تعالیٰ ان تمام کے مقامات و مراتب سے آگاہ ہے۔ مسلمانوں کو یہ تعلیم دی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے جس پیغمبرؑ کو جو مقام دیا ہے تم اسے بیان کرو۔ اسی طرح آنحضرت ﷺ کو جو اعلیٰ مقامات عطا فرمائے ہیں، ان کا بھی ذکر کرو، لیکن کسی سے الجھنے کی ضرورت نہیں۔

آخر میں حضرت داؤد علیہ السلام کو زبور دیے جانے کا بطورِ خاص تذکرہ فرمایا ہے۔ اس کی دو وجہ ذہن میں آتی ہیں۔ (والعلم عنداللہ) پہلی وجہ تو یہ ہے کہ زبور آسمانی کتابوں میں واحد کتاب ہے جسے اللہ تعالیٰ نے منظوم نازل فرمایا۔ اور حضرت داؤد علیہ السلام کو لحنِ داؤدی عطا کیا۔ چنانچہ جب آپؑ زبور پڑھتے تھے تو پہاڑ آپؑ کے ساتھ تسبیح کرتے تھے اور پرندے اس سے مسحور ہو کر گرنا شروع کر دیتے تھے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام بادشاہ تھے اور بادشاہ بالعموم مذہب سے کوئی گہرا رشتہ نہیں رکھتے۔ اللہ تعالیٰ کی کتابوں سے ان کی دلچسپی واجبی سی ہوتی ہے۔ اس کے باوجود اللہ تعالیٰ کا انھیں ایک ایسی کتاب سے نوازنا جو ذکر اللہ کا باعث بن گئی اور آپؑ صبح و شام پہاڑوں میں اسے ترنم سے پڑھتے تھے۔ اس بات کے ضمن میں درحقیقت قریشِ مکہ کے ایک اعتراض کا جواب دینا بھی مقصود تھا۔ ان کا اعتراض یہ تھا کہ محمد (ﷺ) کیسے پیغمبر ہیں کہ جو کھاتے پیتے بھی ہیں، بیوی بچے بھی رکھتے ہیں، کاروبار بھی کرتے ہیں، بازار میں آنا جانا بھی ہے، خود ہی اشیائے خورد و نوش خرید کر گھر لے جاتے ہیں، یہ کام اللہ والوں کے تو نہیں ہوتے۔ وہ تو ایک کونے میں پڑے یادِ خداوندی میں مصروف رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے دین کی طرف بلاتے ضرور ہیں لیکن دنیا سے انھیں کوئی رغبت نہیں ہوتی اور ان کی ضروریات عام انسانوں کی ضروریات سے بالکل الگ ہوتی ہیں۔ پروردگار نے آخری جملے میں ارشاد فرمایا کہ یہود تو حضرت داؤد علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا پیغمبر مانتے ہیں اور یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ان پر زبور نازل ہوئی تھی حالانکہ وہ بادشاہ تھے اور مملکت کا کاروبار چلاتے تھے۔ تمھیں آنحضرت ﷺ کے ایک گھر چلانے پر اعتراض ہے، تو ان کا مملکت کا کاروبار چلانے پر اعتراض کیوں نہیں۔

Marfat.com

قُلِ ادۡعُوا الَّذِیۡنَ زَعَمۡتُمۡ مِّنۡ دُوۡنِہٖ فَلَا یَمۡلِکُوۡنَ کَشۡفَ الضُّرِّ عَنۡکُمۡ وَ لَا تَحۡوِیۡلًا ﴿۵۶﴾

(اے پیغمبرؐ کہہ دیجیے! کہ پکارو ان کو جن کو تم نے اللہ تعالیٰ کے سوا معبود گمان کر رکھا ہے۔ وہ تو قدرت نہیں رکھتے، تم سے تکلیف دور کرنے کی اور نہ اسے ٹالنے کی۔ ۵۶) (سورۃ بنیٓ اسرآءِیل : ۵۶)

اوپر کی آیات جملہ ہائے معترضہ تھیں، اب پھر توحید کے مضمون کو جہاں سے چھوڑا تھا وہیں ملایا جارہا ہے۔ مشرکین سے کہا جارہا ہے کہ تم جن قوتوں کو اللہ تعالیٰ کے علاوہ معبود سمجھتے ہو، انھیں پکارو، پھر دیکھو وہ تمھاری پکار کا جواب دیتے ہیں اور تمھاری کچھ مدد کرتے ہیں؟ اور اگر وہ تمھارے پکارنے پر تمھاری کوئی مدد نہیں کر سکتے اور تم سے کسی تکلیف کا ازالہ نہیں کر سکتے حتیٰ کہ اسے ٹال تک نہیں سکتے تو پھر تم نے انھیں اللہ تعالیٰ کا شریک کس مقصد کے لیے بنا رکھا ہے۔ علامہ قرطبی نے اس کا شانِ نزول بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جب قریش کو قحط میں مبتلا کر دیا گیا تو انھوں نے بارگاہِ رسالت میں حاضر ہو کر فریاد کی اور اپنی خستہ حالی کا تذکرہ کیا تو یہ آیت نازل ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو حکم دیا کہ ان سے دریافت کریں کہ جن معبودوں کی پرستش اور عبادت کرتے ہیں ان سے جا کر فریاد کیوں نہیں کرتے۔ پھر خود ہی بتا دیا کہ وہ بے چارے خود بے بس ہیں۔ اس مشکل وقت میں وہ تمھاری کوئی امداد نہیں کر سکتے۔ سوچنے کی بات ہے کہ جو خدا مشکل میں کام نہ آئے اور جو معبود مصیبت کو دور نہ کرے اس کی پوجا کرنے سے کیا حاصل۔

دو باتیں

آیت میں تدبر سے کام لیا جائے تو دو باتیں سمجھ میں آتی ہیں۔ ایک تو یہ بات کہ جس طرح غیر اللہ کو سجدہ کرنا اور اس کی پوجا پاٹ کرنا شرک ہے۔ اسی طرح غیر اللہ سے استمداد اور استعانت اور انھیں مدد کے لیے پکارنا بھی شرک ہے۔ دونوں میں عبادت ہونے کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ حق صرف اپنے لیے مخصوص رکھا ہے کہ اسی کو سجدہ کیا جائے، اسی کے سامنے دستِ سوال پھیلایا جائے اور اسی کو غیب میں پکارا جائے۔

دوسری یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ غیر اللہ سے مراد صرف بت نہیں بلکہ وہ تمام قوتیں اور تمام شخصیتیں ہیں جنھیں لوگ ہمیشہ عبادت یا استمداد کے لیے پکارتے رہے۔ چاہے وہ بت ہوں، چاہے وہ گزرے ہوئے بزرگ جن کی عقیدت میں لوگوں نے ان کے مجسمے بنا لیے، چاہے وہ فرشتے ہوں اور چاہے وہ مظاہر فطرت ہوں۔ ان کے ساتھ وہ معاملہ کرنا جو اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ کیا جاتا ہے بہر صورت شرک ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں اور دوسروں میں یہ فرق ضرور ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں سے دُعا چاہی جاتی ہے کیونکہ وہ بارگاہِ الٰہی میں تقرب کی وجہ سے عزت کئے جاتے ہیں اور ان کی دعائیں قبول کی جاتی ہیں اور یا بعض لوگوں کے نزدیک ان کی برکت سے دعا مانگی جا سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں ان کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات ان کی بندگی اور اطاعت کا لحاظ فرماتے ہوئے ان کی برکت کی لاج رکھتی ہے۔

اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ یَدۡعُوۡنَ یَبۡتَغُوۡنَ اِلٰی رَبِّہِمُ الۡوَسِیۡلَۃَ اَیُّہُمۡ اَقۡرَبُ وَ یَرۡجُوۡنَ رَحۡمَتَہٗ وَ یَخَافُوۡنَ عَذَابَہٗ ؕ اِنَّ عَذَابَ رَبِّکَ کَانَ مَحۡذُوۡرًا ﴿۵۷﴾ (سورۃ بنیٓ اسرآءِیل : ۵۷)

(جن کو یہ پکارتے ہیں وہ تو خود ہی اپنے رب کے قرب کی طلب میں سرگرم ہیں کہ ان میں سے کون سب سے زیادہ قرب حاصل کرتا ہے، اور وہ اپنے رب کی رحمت کے امیدوار ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں، بیشک آپؐ کے رب کا عذاب چیز ہی ڈرنے کی ہے۔ ۵۷)

ایک غلط فہمی کا ازالہ

مشرکینِ عرب فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں سمجھتے تھے اور یہ یقین رکھتے تھے کہ دنیا کی مشکلات میں بھی وہ بیٹیاں ہمارے کام آتی ہیں اور اگر واقعی قیامت ہوئی تو وہاں بھی وہ ہمیں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچالیں گی۔ وہ انسانوں پر قیاس کرتے ہوئے یہ گمان کرتے تھے کہ جس طرح بیٹیاں ضد کر کے اپنے باپ سے اپنی بات منوا لیتی ہیں، اسی طرح ہم جیسے بھی ہیں فرشتے بیٹیاں ہونے کی حیثیت سے ضد کر کے اللہ تعالیٰ کو راضی کر لیں گے اور ہمیں

Marfat.com

اس کے عذاب سے بچالیں گے۔اللہ تعالیٰ ان کی طرف اشارہ کر کے فرماتے ہیں کہ نادانو تم جن کے بارے میں یہ سمجھتے ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ سے جو چاہے منوا سکتے ہیں، گویا کہ پروردگار ان کی بات یا ان کی ضد کے سامنے مجبور ہو جاتا ہے حالانکہ تمھیں معلوم نہیں کہ فرشتے باوجود اس کے کہ اپنی خلقت اور سرشت کے اعتبار سے پاکیزہ اور معصوم واقع ہوئے ہیں، لیکن ان میں سے ہر ایک اپنی بندگی، اطاعت اور کارگزاری کے باعث اللہ تعالیٰ کا قرب ڈھونڈنے کی فکر میں رہتا ہے۔زیادہ سے زیادہ اس کی اطاعت بجالاتے ہیں اور اسی کو بارگاہِ ایزدی میں ذریعہ بنا کر تقرب کی تلاش کرتے ہیں۔اور اسی وجہ سے وہ اپنے رب کی رحمت کے امیدوار ہیں۔اور معصوم ہونے کے باوجود ہر وقت اپنے رب کے عذاب سے لرزاں و ترساں رہتے ہیں اور اس کی بے نیازیوں سے ڈرتے ہیں اور یہ ڈرنا کوئی بے جا بھی نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا عذاب چیز ہی ایسی ہے جس سے ڈرا جانا چاہیے۔اس کی مخلوقات میں جو چیزیں تکلیف پہنچا سکتی ہیں، انسان ابھی تک ان کی تکلیف اور ضرر رسانی سے اپنے آپ کو محفوظ نہیں کر سکا۔جب اللہ تعالیٰ کے حکم سے ان میں زور پیدا ہوتا ہے تو انسان کے سارے تحفظات دھرے رہ جاتے ہیں۔سیلاب آتا ہے تو بند ٹوٹ جاتے ہیں، آگ پھیلتی ہے تو فائر بریگیڈ کام نہیں کرتے، زمین پھٹتی ہے تو ہمارے تمام اسباب تحفظ کی بجائے اس میں دھنس جاتے ہیں۔چہ جائیکہ وہ تکلیف جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب بن کے آئے اسے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں ٹال سکتا۔لیکن مشرکین یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے خدا کے علاوہ کوئی اور بھی بچا سکتا ہے، اس سے بڑی کوئی بھول نہیں ہو سکتی۔

وَاِنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوْهَا قَبْلَ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ اَوْ مُعَذِّبُوْهَا عَذَابًا شَدِيْدًا ۭ كَانَ ذٰلِكَ فِي الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا ﴿۵۸﴾

(اور نہیں ہے کوئی بستی مگر ہم اس کے ہلاک کرنے والے ہیں قیامت کے دن سے پہلے یا اس کو عذاب دیں گے، شدید عذاب، یہ بات کتاب میں لکھی ہوئی ہے۔ ۵۸) (سورۃ بنیٓ اسرآءِیل : ۵۸)

عذاب سے متعلق سنت اللہ

گزشتہ آیات میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی دعوت کے جواب میں مشرکین آپؐ سے بار بار عذاب لانے کا مطالبہ کرتے تھے۔ان کے جواب میں ارشاد فرمایا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب کا نزول لوگوں کے مطالبے پر نہیں ہوتا بلکہ اس کا ایک قانون ہے، جب قانون اس کا تقاضا کرتا ہے تو عذاب نازل ہو جاتا ہے۔

جب اہلِ دنیا اپنی زندگی کو اللہ تعالیٰ کی بندگی سے بالکل آزاد کر دیتے ہیں اور ان کا ہر رشتہ اللہ تعالیٰ کے آستانے سے کٹ جاتا ہے جس کے نتیجے میں اقدارِ انسانیت رفتہ رفتہ دم توڑنے لگتی ہیں۔انسانی بستیاں درندوں کے بھٹ بن جاتی ہیں اور انسانوں کی شکل میں زمین پر ایک ایسی مخلوق وجود میں آتی ہے جو انسان کہلانے کے باوجود حیوانوں سے بدتر ہوتی ہیں۔ایسی صورتحال میں اللہ تعالیٰ انسانوں کی ہدایت کے لیے اپنا رسولؐ بھیجتا ہے اور رسولؐ کی رہنمائی کے لیے کتاب نازل فرماتا ہے۔اگر لوگ اللہ تعالیٰ کے رسولؐ پر ایمان لے آتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی رحمتیں برسنا شروع ہو جاتی ہیں اور زمین پر انسانیت اور بندگیٔ رب کی بہار آ جاتی ہے لیکن اگر انسان اللہ تعالیٰ کے رسولؐ پر ایمان لانے کی بجائے اس کی تکذیب پر تل جاتے ہیں اور آہستہ آہستہ اسے برداشت کرنے سے بھی انکار کر دیتے ہیں تو اب ان کے اعمال یقیناً اس بات کا تقاضہ کر رہے ہوتے ہیں کہ انھیں فنا کر دیا جائے لیکن اللہ تعالیٰ کی رحمت انھیں بار بار سنبھلنے کا موقع دیتی ہے۔بگڑے ہوئے لوگ اللہ تعالیٰ کے نبیوںؑ کو پریشان کرنے کے لیے بار بار عذاب کا مطالبہ کرتے ہیں بلکہ وہ ایک طرح سے اس کی چڑ بنا لیتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ انھیں مہلت پہ مہلت دیے چلا جاتا ہے کہ شاید یہ لوگ اس مہلت سے فائدہ اٹھائیں۔اس آیت کے شانِ نزول میں بھی کہا گیا ہے کہ اشرافِ قریش اکٹھے ہو کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے کہ اگر ہمارے چند مطالبات تسلیم کر لیے جائیں تو ہم آپؐ پر ایمان لے آئیں گے۔آپؐ نے پوچھا کہ مطالبات کیا ہیں؟ انھوں نے کہا مکہ معظمہ کے تمام نشیبی علاقوں کو ہموار کر دیا جائے تاکہ ہم اس میں کھیتی باڑی کر سکیں، پہاڑوں کو سونے کا بنا دیا جائے، یہ پوری وادی ایک چمن میں تبدیل کر دی جائے۔اسی دوران حضرت جبرائیل علیہ السلام حاضر ہوئے اور انھوں نے آکر عرض کیا کہ حضورؐ آپ ان کے مطالبات تسلیم کر لیجیے لیکن ایک شرط کے ساتھ کہ اگر یہ لوگ اس کے بعد بھی ایمان نہ لائے تو پھر یہ بدترین عذاب دیے جائیں گے۔آپؐ نے فرمایا کہ ہرگز نہیں، میں یہ چاہتا ہوں کہ پروردگار انھیں اور سنبھلنے اور سوچنے کی مہلت عطا

Marfat.com

فرمائے۔اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے رسولؐ عذاب کے رسولؐ بن کر نہیں آتے بلکہ ہدایت کے رسولؐ بن کر آتے ہیں۔اللہ تعالیٰ انھیں دنیا کی اصلاح کے لیے بھیجتا ہے لیکن جب دنیا اصلاح قبول نہیں کرتی بلکہ پیغمبرؑ کے قتل کے منصوبے باندھتی ہے تو پھر ایک وقت آتا ہے جب اللہ تعالیٰ اس قوم کو تباہ کر دیتا ہے۔اور ایسا وقت عموماً اس وقت آتا ہے جب کسی قوم کا خوشحال طبقہ کھل کھیلتا ہے اور کھلم کھلا منکرات کو فروغ دیتا ہے اور بے حیائی سرعام ناچنے لگتی ہے، انسانیت کی قدریں دم توڑ جاتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی شرم جاتی رہتی ہے۔تب ایسی بستی کو پروردگار تباہ فرمادیتے ہیں،لیکن جب تک یہ آخری فیصلے کا وقت نہیں آتا تو کبھی کبھی انھیں سزا دینے یا وارننگ دینے کے لیے چھوٹی موٹی سزائیں ان پر مسلط کی جاتی ہیں جنھیں اس آیتِ کریمہ میں عذاب کہا گیا ہے۔اصل عذاب تو قوم کی جڑ مار دیتا ہے اور اس کا نام و نشان نہیں چھوڑتا اور اس کی داستان عبرت بن کر رہ جاتی ہے۔لیکن جزوی عذاب وقتاً فوقتاً بھیجتا رہتا ہے تاکہ قوم اس سے سبق سیکھے۔اور یہ وہ قانون ہے جو اس کی کتابِ فیصلہ میں لکھا ہوا ہے اور اسی کے مطابق قوموں سے سلوک ہوتا ہے۔

وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّآ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ ؕ وَاٰتَيْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا بِهَا ؕ
وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰيٰتِ اِلَّا تَخْوِيْفًا ﴿۵۹﴾ (سورۃ بنیٓ اسرآءِیل : ۵۹)

(اور ہم کو نشانیاں بھیجنے سے نہیں روکا، مگر اس بات نے کہ پہلوں نے ان نشانیوں کو جھٹلایا، اور ہم نے قومِ ثمود کو ایک اونٹنی دی، آنکھیں کھول دینے والی، تو انھوں نے اس پر ظلم کیا اور ہم نشانیاں بھیجتے ہیں تو ڈرانے ہی کے لیے بھیجتے ہیں۔ ۵۹)

منہ مانگے معجزات نہ بھیجنے کی حکمت

آنحضرت ﷺ کے زمانے میں لوگوں کی ہدایت کے لیے زیادہ زور تفہیم پر دیا گیا۔آنحضرت ﷺ نے کوشش فرمائی کہ لوگوں کے دل و دماغ کو اپیل کی جائے اور ان کے اندر یہ بات اتارنے کی کوشش کی جائے کہ توحید ہی اس کائنات کی اصل حقیقت ہے۔شرک ایک فریبِ نفس کے سوا کچھ بھی نہیں۔انسانوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنی بندگی کے لیے پیدا فرمایا ہے۔وہ خالقِ کائنات ہے،اسے بجاطور پر یہ حق پہنچتا ہے کہ بندے اس کی غیر مشروط عبادت اور اطاعت کریں۔وہ چونکہ سب سے بڑا ہے اس لیے اسے ہی یہ بات زیب دیتی ہے کہ اس زمین پر اسی طرح اس کی حاکمیت قائم ہو جس طرح باقی کائنات پر تکوینی طور پر قائم ہے۔یہ وہ سامنے کے حقائق ہیں جنھیں لوگوں کے لیے سمجھنا کوئی مشکل کام نہیں۔اور جہاں تک اللہ تعالیٰ کے رسول کا تعلق ہے اس کی نبوت سے پہلے کی بے عیب زندگی اور پھر آپؐ کی دلآویز شخصیت اور آپؐ کے اُمی ہونے کے باوجود آپؐ کی زبان سے ابلتا ہوا علم کا چشمہ اور آپؐ پر نازل ہونے والی کتاب کی فصاحت و بلاغت اور اس کا پیش کردہ نظامِ زندگی جس میں نہ کوئی جھول ہے اور نہ اختلاف۔ان میں سے ایک ایک چیز اللہ تعالیٰ کے رسولؐ کی حقانیت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ان تمام حقائق کی موجودگی میں مزید کسی دلیل اور کسی نشانی کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی،لیکن لوگ اپنی عادت سے مجبور ہیں،وہ جب تک کوئی خرقِ عادت چیز نہیں دیکھ لیتے انھیں کسی کے رسولؐ ہونے کا یقین نہیں آتا۔ان کے ایسے ہی مطالبات پر متعدد دفعہ آنحضرت ﷺ سے معجزات کا ظہور ہوا،لیکن آخر اشرافِ مکہ نے منہ مانگی نشانیاں دکھانے پر اصرار شروع کر دیا۔اس پر اس آیتِ کریمہ میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے کسی نشانی کو دکھا دینا کوئی مشکل کام نہیں۔لیکن اس کا قانون یہ ہے کہ جب وہ کسی منہ مانگے معجزے یا نشانی کو ظاہر کرتا ہے اور قوم اسے دیکھنے کے بعد بھی ایمان لانے سے انکار کر دیتی ہے تو پھر اس قوم کو مزید زندہ رہنے کی اجازت نہیں دی جاتی اور اس پر اللہ تعالیٰ کا عذاب ٹوٹتا ہے۔چنانچہ اس کی تائید میں پروردگار نے قومِ ثمود کی مثال دی کہ ہم نے ان کے مطالبے پر ناقہ جیسی نشانی انھیں دکھائی جو آنکھیں کھول دینے والی تھی، جسے دیکھنے کے بعد اس بات میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا تھا کہ حضرت صالح علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے رسولؐ ہیں اور یہ ناقہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ظہور ہے۔لیکن ان ظالموں نے جب اسی بھی قتل کر دیا اور معجزے کی حرمت کا بھی پاس نہ کیا تو اللہ تعالیٰ کا غضب بھڑکا اور ان پر عذاب نازل ہو گیا۔

آیت کے آخر میں فرمایا کہ ہم جب بھی کسی قوم کی طرف کوئی نشانی بھیجتے ہیں تو انھیں متنبہ کرنے کے لیے بھیجتے ہیں تاکہ وہ اپنے آپ کو بدلنے کی کوشش کرے اور اللہ تعالیٰ کے پیغمبرؑ پر ایمان لے آئے۔مقصود انھیں تباہ کرنا نہیں ہوتا بلکہ ڈرانا ہوتا ہے،لیکن وہ جب اس پر مزید دلیر ہو جاتے ہیں تو پھر وہ زمین پر رہنے اور جینے کا حق کھو دیتے ہیں اور انھیں تباہ کر دیا جاتا ہے۔

مشرکینِ مکہ کو یہ سمجھانا مقصود ہے کہ تم منہ مانگی نشانیوں پر اصرار نہ کرو،کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ تمھاری تباہی کا باعث ہوں۔

Marfat.com

وَاِذۡ قُلۡنَا لَکَ اِنَّ رَبَّکَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ ؕ وَمَا جَعَلۡنَا الرُّءۡیَا الَّتِیۡۤ اَرَیۡنٰکَ اِلَّا فِتۡنَۃً لِّلنَّاسِ وَالشَّجَرَۃَ الۡمَلۡعُوۡنَۃَ فِی الۡقُرۡاٰنِ ؕ وَنُخَوِّفُہُمۡ ۙ فَمَا یَزِیۡدُہُمۡ اِلَّا طُغۡیَانًا کَبِیۡرًا ﴿٦٠﴾ (سورۃ بنیٓ اسرآءِیل : ٦٠)

(اور اس وقت کو یاد کرو جس وقت ہم نے آپؐ سے کہا تھا کہ بیشک آپؐ کا رب لوگوں کو گھیر چکا ہے اور ہم نے وہ دکھاوا آپؐ کو نہیں دکھایا، مگر ہم لوگوں کے لیے آزمائش اور وہ درخت بھی جس پر قرآنِ کریم میں لعنت کی گئی ہے، اور ہم انھیں ڈراتے ہیں لیکن ان کے اندر سوائے ایک بڑی سرکشی کے کسی اور چیز کا اضافہ نہیں ہوتا۔ ٦٠) ۔

ہدایت کے لیے چند نشانیوں کا ذکر

مشرکینِ مکہ کے نشانی کے مطالبہ کے جواب میں پروردگار نبی کریم ﷺ کو یاد دلا رہے ہیں اور بالواسطہ ان سے فرمایا جا رہا ہے کہ ہم نے نبی کریمؐ کی دعوت کے ان دنوں میں جب اشرافِ قریش نے آپؐ کی دعوت کو روکنے کے لیے ہر طرح کے ہتھکنڈے کو استعمال کرنا شروع کر دیا تھا اور وہ ہر قیمت پر اس دعوت کو ناکام کرنے پر تُل گئے تھے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبرؐ کے واسطے سے انھیں کہا تھا کہ تم اس دعوت کو روکنا چاہتے ہو لیکن ہم تمھیں بتائے دیتے ہیں کہ تم اس میں کامیاب نہیں ہو سکو گے تم نہ جانے کیا سمجھتے ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ آپؐ کے رب نے لوگوں کو اپنے گھیرے میں لے لیا ہے۔ یہ آپؐ کو مٹا دینے کی فکر میں ہیں حالانکہ یہ ہمارے نرغے میں ہیں۔ ان میں وہ لوگ بچیں گے جو ایمان لے آئیں گے اور باقی سب میدانِ کارزار میں مارے جائیں اور یا ایک دن آئے گا جب یہ آپؐ کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے ہوں گے۔ اور جیسا ہم نے کہا تھا آج کے حالات نے کچھ تو ثابت کر دیا ہے اور کچھ مزید ثابت ہو جائے گا۔ تم نشانی مانگتے ہو اس سے بڑی کوئی اور نشانی کیا ہو سکتی ہے۔ رہی یہ بات کہ پروردگار نے یہ بات کہاں فرمائی ہے کہ ہم ان میں سے بعض آیات کا حوالہ دیتے ہیں۔ سورۃ البروج میں ارشاد فرمایا بَلِ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا فِیۡ تَکۡذِیۡبٍ وَّاللّٰہُ مِنۡ وَّرَآئِہِمۡ مُّحِیۡطٌ مگر یہ کافر جھٹلانے میں لگے ہوئے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کو ہر طرف سے گھیرے میں لے رکھا ہے۔ اَوَلَمۡ یَرَوۡا اَنَّا نَاۡتِی الۡاَرۡضَ نَنۡقُصُہَا مِنۡ اَطۡرَافِہَا (سورۃ الرعد۔ ۴۱)۔ کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم سرزمینِ مکہ کی طرف بڑھ رہے ہیں، اس کے اطراف سے اس کو کم کرتے ہوئے۔

پھر جب فتوحات کا دور شروع ہوا تو قرآنِ کریم نے فتح مکہ کی پیشگوئی ان الفاظ میں فرمائی وَّاُخۡرٰی لَمۡ تَقۡدِرُوۡا عَلَیۡہَا قَدۡ اَحَاطَ اللّٰہُ بِہَا اور دوسری فتوحات بھی ہیں جن پر تم ابھی قادر نہیں ہو سکے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے احاطے میں لے لیا ہے۔

ان میں سے ایک ایک آیت ایک ایسی نشانی ہے جو ان حالات میں نازل ہوئی جب دور دور تک اس کی تعبیر دکھائی نہیں دیتی تھی اور لوگ اسے دیوانے کی بڑ سمجھتے تھے۔ لیکن پھر یہ حقیقت بن کر سامنے آئی اور اب قیامت تک اسے پڑھا جائے گا۔ اور اسے تسلیم کرنا پڑے گا کہ قریشِ مکہ کے سامنے ایسی نشانیوں کا ظہور ہوتا رہا ہے جو ان کی ہدایت کے لیے کافی تھیں لیکن وہ اس وقت تک آنکھیں بند کیے رہے جب تک فتح مکہ کے ساتھ ان کی عظمت سرنگوں نہیں ہو گئی۔

وَمَا جَعَلۡنَا الرُّءۡیَا ۔ الخ۔ اس سے مراد واقعہ معراج ہے۔ ہم رویاء کے لفظ پر اس سے پہلے بحث کر چکے ہیں کہ اس سے مراد آنکھوں سے دیکھنا ہے، خواب مراد نہیں، کیونکہ اگر خواب ہوتا تو لوگوں کے لیے فتنے کی کیا بات تھی، کیونکہ خواب تو ایک سے ایک دیکھے جاتے ہیں لیکن کوئی بھی اس کا انکار نہیں کرتا۔ یہ واقعہ بجائے خود نبی کریم ﷺ کی حقانیت اور دین کی صداقت کی کتنی بڑی دلیل ہے اور مزید یہ بات بھی کہ یہ ایک وارننگ بھی تھی جس میں اہلِ کتاب اور اشرافِ قریش دونوں کو یہ بتانا مقصود تھا کہ جو نبی اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمھارے اندر معبوث ہوا ہے وہ نبی القبلتین ہے۔ اب بیت المقدس اہلِ کتاب کی تحویل میں نہیں رہے گا اور بیت اللہ قریش کی تولیت میں نہیں رہے گا۔ اس عظیم ذات کی بعثت ہو گئی جو دونوں قبلوں کا نبی ہے اور جسے دنیا کی امامت بخشی گئی ہے۔ اس لیے اب جن قوتوں نے ان دونوں قبلوں پر زبردستی قبضہ جما رکھا تھا اور اپنی قیادت کا ڈھونگ رچا رکھا تھا انھیں اب اپنے پاؤں سمیٹنے ہوں گے۔

Marfat.com

وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِي الْقُرْاٰنِ وہ درخت جس پر قرآنِ کریم میں لعنت کی گئی ہے اسے بھی لوگوں کے لیے فتنہ بنایا گیا۔ اس درخت سے مراد زقوم کا درخت ہے جو دوزخ کی تہہ میں پیدا ہوگا اور دوزخیوں کی خوراک ہوگا۔ اسے ملعون اس لیے قرار دیا گیا ہے کہ یہ ان لوگوں کی خوراک ہوگا جو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور ہیں اور جن پر ہر وقت لعنت برستی ہے۔ اہلِ مکہ نے اس پر بڑا شور مچایا اور مذاق اڑاتے ہوئے کہا کہ ایک طرف تو یہ کہا جاتا ہے کہ دوزخ میں آگ کے سوا کچھ نہیں ہوگا اور آگ بھی ایسی شدید کہ جس کا آج اندازہ بھی نہیں کیا جاسکتا تو اس کے اندر کسی درخت کا پیدا ہونا، آخر اس کا کیا مطلب ہے؟ لیکن ان کے ذہن میں یہ بات نہیں آتی کہ اس کا پیدا کرنے والا نہ کسی سبب کا محتاج ہے اور نہ مناسب ماحول کا۔ وہ جس ماحول میں جسے چاہے پیدا فرمادے۔ اس میں بتانا تو صرف یہ ہے کہ اے اشرافِ قریش اگر تم نے ایمان کا راستہ اختیار نہ کیا تو تمھارا انجام وہ جہنم ہوگا جس میں زقوم جیسا درخت تمھارا کھانا بنے گا۔ پھر اس کے کھانے سے جو پیاس بھڑکے گی تو کھولتا ہوا پانی تمھیں پینے کو ملے گا۔ یہ سارے احوال اس لیے بیان کیے جارہے ہیں تاکہ تم غفلت کی نیند سے اٹھو اور اپنی عاقبت بنانے کے لیے جو کر سکتے ہو، سو کرو۔ لیکن کس قدر افسوس کی بات ہے کہ بجائے اس کے کہ یہ تخویف ان میں اثر انداز ہو اور وہ اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہوں، الٹا ان میں اثر یہ ہو رہا ہے کہ ان کی سرکشی پہلے سے بھی بڑھتی جارہی ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ جن کے دماغوں کے سانچے ایسے الٹے ہیں کہ سیدھی بات بھی ان کے دماغوں میں ٹیڑھی ہوجاتی ہے۔ تو ان سے کسی بہتری کی امید کیسے کی جاسکتی ہے۔

وَاِذْ قُلْنَا

لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ قَالَ ءَاَسْجُدُ لِمَنْ
خَلَقْتَ طِيْنًا ۚ ﴿۶۱﴾ قَالَ اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِيْ كَرَّمْتَ عَلَيَّ ۫ لَئِنْ
اَخَّرْتَنِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۶۲﴾ قَالَ
اذْهَبْ فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَاِنَّ جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمْ جَزَآءً مَّوْفُوْرًا ﴿۶۳﴾
وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ
بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ وَشَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ وَعِدْهُمْ ؕ
وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ﴿۶۴﴾ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ
سُلْطٰنٌ ؕ وَكَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا ﴿۶۵﴾ رَبُّكُمُ الَّذِيْ يُزْجِيْ لَكُمُ الْفُلْكَ
فِي الْبَحْرِ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ﴿۶۶﴾ وَاِذَا

Marfat.com

مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُونَ إِلَّا إِيَّاهُ فَلَمَّا نَجّٰكُمْ
إِلَى الْبَرِّ أَعْرَضْتُمْ وَكَانَ الْإِنْسَانُ كَفُورًا ﴿٦٧﴾ أَفَأَمِنْتُمْ أَنْ يَخْسِفَ
بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ أَوْ يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ثُمَّ لَا تَجِدُوا لَكُمْ
وَكِيلًا ﴿٦٨﴾ أَمْ أَمِنْتُمْ أَنْ يُعِيدَكُمْ فِيهِ تَارَةً أُخْرٰى فَيُرْسِلَ
عَلَيْكُمْ قَاصِفًا مِنَ الرِّيحِ فَيُغْرِقَكُمْ بِمَا كَفَرْتُمْ ثُمَّ لَا تَجِدُوا
لَكُمْ عَلَيْنَا بِهِ تَبِيعًا ﴿٦٩﴾ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ
وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيرٍ مِمَّنْ
خَلَقْنَا تَفْضِيلًا ﴿٧٠﴾

رکوع: ۷۔ (اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم (علیہ السلام) کو سجدہ کرو، تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے، وہ بولا کہ میں اس کو سجدہ کروں جسے تو نے مٹی سے پیدا کیا۔ ۶۱) اس نے کہا مجھے بتا یہ آدم (علیہ السلام) جسے تو نے مجھ پر فضیلت دی ہے (اس کی وجہ کیا ہے)، اگر تو نے مجھے روزِ قیامت تک مہلت دے دی تو جڑ سے اکھاڑ پھینکوں گا اس کی اولاد کو سوائے چند افراد کے۔ ۶۲) (فرمایا جا، چلا جا (جو مرضی ہو کر) جو ان میں سے تیرے پیرو بن جائیں گے تو جہنم تم سب کا پورا پورا بدلہ ہے۔ ۶۳) اور گھبرا دے ان میں سے جن پر تیرا بس چلے اپنی آواز (صوتی ہتھکنڈوں) سے، اور دھاوا بول دے ان پر اپنے گھوڑ سواروں اور پیادہ دستوں کے ساتھ، مال اور اولاد میں ان کا ساجھی بن جا اور ان سے جھوٹے وعدے کرتا رہ، اور شیطان ان سے وعدہ نہیں کرتا مگر مکروفریب کا۔ ۶۴) بیشک جو میرے بندے ہیں ان پر تیرا غلبہ نہیں ہو سکتا، اور آپ کا رب اپنے بندوں کی کارگزاری کے لیے کافی ہے۔ ۶۵) تمھارا رب وہ ہے جو تمھارے لیے سمندر میں کشتی چلاتا ہے تاکہ تم اس کا فضل تلاش کرو، بیشک وہ تمھارے حال پر بڑا مہربان ہے۔ ۶۶) اور جب تمھیں سمندر میں مصیبت پہنچتی ہے تو گم ہو جاتے ہیں وہ، جن کو تم پکارتے ہو، اللہ تعالیٰ کے سوا۔ پھر جب وہ تم کو خشکی پر پہنچا دیتا ہے تو تم روگردانی کرنے لگتے ہو اور انسان بڑا ہی ناشکرا ہے۔ ۶۷) کیا تم اس بات سے بے خوف ہو گئے ہو کہ وہ خشکی کے کنارے کو تمھارے سمیت دھنسا دے یا تم پر بادِ تند بھیج دے، پھر نہ پاؤ تم اپنے لیے کوئی کارساز۔ ۶۸) یا تم اس سے بے خوف ہو گئے ہو کہ تم کو دوبارہ سمندر میں لوٹائے، پھر بھیج دے تم پر کشتیوں کو توڑنے والی سخت آندھی، پھر وہ تمھاری ناشکری کی پاداش میں تم کو غرق کر دے، اور تم اس پر ہمارا کوئی پیچھا کرنے والا اپنے لیے نہ پاؤ۔ ۶۹) اور ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی، اور خشکی اور تری دونوں میں ان کو سواری عطا کی اور ان کو پاکیزہ چیزوں کا رزق دیا، اور ہم نے انھیں نمایاں فضیلت دی بہت سی چیزوں پر جن کو ہم نے پیدا فرمایا۔ ۷۰)

Marfat.com

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِکَۃِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ ؕ قَالَ ءَ اَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِیْنًا ۚ ﴿۶۱﴾

(اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم (علیہ السلام) کو سجدہ کرو، تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے، وہ بولا کہ میں اس کو سجدہ کروں جسے تو نے مٹی سے پیدا کیا۔ ۶۱) (سورۃ بنیٓ اسرآءِیل : ۶۱)

کفار کے انکار کا اصل سبب

سورۃ البقرہ میں اس آیت کی وضاحت اور قصہ ٔ آدم وابلیس تفصیل سے گزر چکا ہے۔ اس لیے اب اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ بہتر ہے کہ اس مقام کو نکال کر دیکھ لیا جائے۔ البتہ یہ سمجھنا ضروری ہے کہ یہاں یہ واقعہ کس غرض کے لیے لایا جارہا ہے۔ یہ آیت اور اس کے بعد کی آیات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قریشِ مکہ جو بظاہر اس وجہ سے ایمان نہیں لارہے تھے کہ انھیں شکایت یہ تھی کہ ہم جن معجزات کا مطالبہ کررہے ہیں وہ ہمیں دکھائے نہیں جارہے۔ جب تک ہم ایسی نشانیاں نہ دیکھ لیں جو آنحضرت ﷺ کی نبوت اور آپ ؐ کے دین کی حقانیت پر برہانِ قاطع کی حیثیت رکھتی ہوں، اس وقت تک ہم آپ ؐ پر ایمان نہیں لاسکتے۔ قرآنِ کریم نے ایک تو اس رکوع سے پہلے چند آیات میں بعض ایسے معجزات کا ذکر کیا جن کی حیثیت کسی طرح بھی برہان قاطع سے کم نہیں تھی اور ان معجزات کو دیکھ کر کوئی ایسا شخص جو اپنے دماغ میں عقلِ سلیم رکھتا ہو اور اپنے سینے میں قلبِ منیب رکھتا ہو، وہ ایمان لائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لیکن ان پر ان آیات کا بھی کوئی اثر نہ ہوا اور وہ برابر اپنی ہٹ پر قائم رہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اگر معجزات کی طلب صحیح نیت سے ہوتی تو محولہ بالا معجزات کے بعد مزید کسی معجزے کی طلب حماقت کے سوا کچھ نہ تھی۔ اب اس آیت کریمہ سے یہ بتایا جارہا ہے کہ ان کے ایمان کے راستے میں اصل رکاوٹ ان کے مطلوبہ معجزات نہیں بلکہ ان کا وہ تکبر اور غرور ہے جو انھیں آنحضرت ﷺ پر ایمان لانے سے روکتا ہے۔ اولاً تو انھیں یہ بات سمجھنا ہی مشکل ہورہا ہے کہ ایک بشر رسول بھی ہوسکتا ہے۔ وہ بار بار اس استبعاد کا ذکر کررہے ہیں کہ نبوت ایک ایسے منصب کا نام ہے جو کسی بشر اور انسان کو عطا نہیں ہوسکتا اور محمد (ﷺ) چونکہ ہماری طرح ایک بشر ہیں اس لیے ان کی طرف سے نبوت کا دعویٰ کرنا چھوٹا منہ بڑی بات کے مترادف ہے۔ جب قرآنِ کریم نے دلائل سے انھیں لاجواب کردیا کہ نبوت اور بشریت میں کوئی منافات نہیں بلکہ انسانوں کی طرف انسانوں کی ہدایت اور اصلاح کے لیے کسی انسان کا نبی بن کر آنا ہی عقل اور حکمت کا تقاضا ہے، تو تب انھوں نے ایک قدم پسپا ہو کر یہ کہنا شروع کردیا کہ چلیے اگر انسانوں میں سے کسی انسان کو رسول بننا تھا تو اس کے لیے یہ تو ہونا چاہیے تھا کہ کسی بڑے مالدار اور وقیع آدمی کا انتخاب کیا جاتا۔ مکہ معظمہ میں ایک سے ایک بڑا تاجر اور مالدار آدمی موجود ہے لیکن ان میں سے کسی کو اس منصب کا اہل نہیں سمجھا گیا۔ اسی طرح طائف میں ایسے تین سردار موجود ہیں جن کی بڑائی پر تمام عرب متفق ہیں۔ ان سب کو چھوڑ کر نبوت کے لیے اس شخص کا انتخاب کیا گیا جو یتیم پیدا ہوا، جس کے باپ نے وراثت میں ایک لونڈی اور ایک اونٹنی چھوڑی جس کی والدہ خشک گوشت کھایا کرتی تھی۔ 8 سال کی عمر میں جس کے سر سے دادا کا بھی سایہ اٹھ گیا، تب اسے ایک ایسے شخص نے اپنی آغوش میں لیا جو قلیل المال اور کثیر العیال تھا، اپنا ایک بیٹا حضرت عباس ؓ کو پالنے کے لیے دیا تھا اور دوسرے بیٹے کو جب حضور ؐ اپنے پاؤں پر کھڑے ہوئے تو آپ ؐ نے اپنی تحویل میں لے لیا۔ تو اس شخص نے یقیناً نبوت کے بعد آپ ؐ کا بہت ساتھ دیا اور ہر طرح کے مصائب میں آپ ؐ کی مدد کی، لیکن مالی حیثیت سے وہ آپ ؐ کے کسی کام نہ آسکتا تھا، تو ایسا نادار شخص جو بکریاں چرا کر اور وقت آنے پر دوسروں کے سرمائے سے تجارت کرکے اپنا پیٹ پالتا ہو، بڑے بڑے سرداروں کی موجودگی میں اس کی کیا حیثیت ہوسکتی ہے، تو اللہ تعالیٰ نے نبوت کے لیے کیا ایسے ہی نادار اور قلاش آدمی کو انتخاب کرنا تھا؟ چنانچہ ان کی نخوت اور رعونت انھیں کسی طرح بھی نبی کریم ﷺ پر ایمان لانے اور آپ ؐ کی برتری کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہونے دیتی تھی۔ قصہ ٔ آدم وابلیس لاکر انھیں یہ بتانا مقصود ہے کہ تم اس واقعہ کو غور سے دیکھو، کیا تم وہی رول ادا نہیں کررہے جو ابلیس کا رول تھا۔ اللہ تعالیٰ کی رحمتیں حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ تھیں۔ سیادت وامامت کا تاج حضرت آدم علیہ السلام کے سر پر رکھا گیا تھا اور خلافت سے انھیں نوازا گیا تھا، لیکن ابلیس صرف اس بات کی وجہ سے ان کے سامنے سجدہ ریز نہ ہوسکا کہ میں آگ سے پیدا ہوا ہوں اور آدم (علیہ السلام) مٹی سے پیدا ہوئے۔ میرا نسب آدم علیہ السلام کے نسب سے بلند ہے۔ ایک اعلیٰ نسب رکھنے والا کمتر نسب رکھنے والے کے سامنے کیسے جھکے؟ اس کی اسی رعونت نے اس کی آنکھوں پر ایسی پٹی باندھی اور اس کے دماغ میں ایسا اختلال

Marfat.com

پیدا کیا کہ وہ یہ بھی نہ سمجھ سکا کہ عزتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملتی ہیں، مادۂ تخلیق سے نہیں ملتیں اور ہمیشہ کے لیے برائی اور نحوست کی علامت بن کر رہ گیا۔ اور آج یہ قریش بھی اسی راستے پر چل رہے ہیں۔ انھیں اعتراف ہے کہ تمام انسانی عظمتیں، تمام روحانی قدریں اور تمام کردار کی خوبیاں محمد کریم علیہ السلام کے ساتھ ہیں، لیکن مالی اعتبار سے چونکہ ان کا ہاتھ خالی ہے تو ہم ایسے شخص کو قدر و منزلت اور عظمت کا حامل کیسے سمجھ سکتے ہیں۔ ہمارے نزدیک اصل قیمت حسب و نسب اور مال و دولت کی ہے۔ عظمت کا یہ تصور ابلیس کی ایجاد ہے اور ابلیس کے راستے پر چلتے ہوئے آج قریش اس کے وارث ہیں۔

قَالَ اَرَءَیْتَکَ هٰذَا الَّذِیْ كَرَّمْتَ عَلَیَّ٘ لَئِنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّیَّتَهٗۤ اِلَّا قَلِیْلًا ﴿۶۲﴾

(اس نے کہا مجھے بتا یہ آدم (علیہ السلام) جسے تو نے مجھ پر فضیلت دی ہے (اس کی وجہ کیا ہے)، اگر تو نے مجھے روزِ قیامت تک مہلت دے دی تو جڑ سے اکھاڑ پھینکوں گا اس کی اولاد کو سوائے چند افراد کے۔ ۶۲) (سورۃ بنیٓ اسرآءیل : ۶۲)

اَرَءَیْتَکَ کا مفہوم

اَرَءَیْتَکَ : علامہ زرکشی نے لکھا ہے کہ جب رَاَیْتَ پر ہمزہ استفہام کا داخل ہو جائے تو پھر یہ لفظ دیکھنے کے معنی میں مستعمل نہیں ہوتا بلکہ اس کا معنی اَخْبِرْنِیْ (مجھے بتا) ہو جاتا ہے۔

لَاَحْتَنِكَنَّ : اہلِ علم کا خیال ہے کہ جب ٹڈی کسی کھیت کو کھا کر چٹ کر جائے تو عرب کہتے ہیں احتنک الجراد الارض اس آیت میں بھی یہ لفظ اسی معنی کو ادا کرنے کے لیے استعمال ہوا ہے۔

ابلیس کے عزائم

قریش کو خصوصاً اور باقی تمام انسانوں کو عموماً توجہ دلائی جا رہی ہے کہ ابلیس کے جس راستے پر تم چل پڑے ہو، تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ اولادِ آدم کے بارے میں اس کے عزائم کیا ہیں، جس کا اظہار اس نے اللہ تعالیٰ کے سامنے اسی وقت کر دیا تھا جب اس نے قیامت تک کے لیے زندگی اور مہلت مانگی تھی۔ اس کے باوجود اگر اولادِ آدم سادگی اور بے اعتنائی کا ثبوت دیتے ہوئے ابلیس کے راستوں پر چلے تو پھر اس سادگی پر داد دیے بغیر نہیں رہا جا سکتا آج بھی ابلیس اور اولادِ آدم کے درمیان کشمکش جاری ہے اور قیامت تک جاری رہے گی۔ ابلیس اپنے ارادوں کے مطابق اولادِ آدم کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچانے کی تدبیریں کرتا رہے گا اور ہم اگر بجائے اس کا دفاع کرنے کے اس کے راستے پر چل کر اس کی معاونت کرتے رہیں تو اس سے بڑی حماقت اور کیا ہو سکتی ہے۔

ابلیس نے اللہ تعالیٰ سے قیامت تک کے لیے مہلت مانگتے ہوئے صاف صاف کہا کہ اگر آپ نے مجھے قیامت تک کے لیے زندگی دے دی تو میں آدم کی ساری ذریت کو چٹ کر جاؤں گا اور اس کو جڑ سے اکھیڑ پھینکوں گا اور یہ ثابت کر دوں گا کہ آدم اور اس کی اولاد میرے اور میری اولاد کے مقابلے میں کسی شرف کے حقدار نہیں۔ اس کی دشمنی کی داد دینی چاہیے کہ وہ اپنی دشمنی کو چھپا نہیں رہا اور پھر اس کا اظہار اس نے پہلے دن ہی نہیں کیا بلکہ اپنے مشن کے لیے اس کی کاوشوں میں کبھی کمی نہیں آئی۔ البتہ اولادِ آدم جس کے نمائندہ آنحضرت ﷺ کے زمانے میں قریش تھے، ان کی بھی داد دینی چاہیے کہ وہ ابلیس کے راستے پر چلتے ہوئے اس کے عزائم کی تکمیل میں اس سے بھی دو قدم آگے معلوم ہوتے ہیں۔

قَالَ اذْهَبْ فَمَنْ تَبِعَکَ مِنْهُمْ فَاِنَّ جَهَنَّمَ جَزَآؤُکُمْ جَزَآءً مَّوْفُوْرًا ﴿۶۳﴾ (سورۃ بنیٓ اسرآءیل : ۶۳)

(فرمایا جا، چلا جا (جو مرضی ہو کر) جو ان میں سے تیرے پیرو بن جائیں گے تو جہنم تم سب کا پورا پورا بدلہ ہے۔ ۶۳)

بارگاہِ خداوندی سے ذریتِ آدم کو ورغلانے کی جو مہلت ابلیس نے مانگی تھی، اسے دے دی گئی۔ اور ایک طرح سے کھلی چھوٹ دے دی گئی کہ انسانوں کو بہکانے کے لیے تو جو کرنا چاہتا ہے، کر گزر، تیرے راستے میں رکاوٹ نہیں ڈالی جائے گی۔ البتہ ایک بات یاد رکھ کہ جو لوگ تیری پیروی کریں

Marfat.com

گے انھیں بھی اور تمھیں بھی جہنم کی ایسی سزا دی جائے گی کہ تمھاری زندگی بھر کی کارگزاریوں کے بدلے کے لیے کافی ہوگی۔ تمھیں ممکن ہے یہ خیال ہو کہ قیامت تک کا لمبا عرصہ تم سزا سے بچے رہو گے، یہ تمھاری حوصلہ افزائی کا بہت بڑا ذریعہ بن جائے گا، لیکن تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ جس جہنم میں تمھیں ڈالا جائے گا وہ اتنی مکمل سزا اپنے اندر رکھتی ہے کہ جو اس لمبے فاصلے کو بھی سمیٹ لے گی اور سزا پانے والا چیخے گا کہ یہ سزا کی شدت صرف اس وجہ سے ہے کہ میں ایک طویل عرصہ سزا سے بچا رہا اور اپنی کوششوں سے اولادِ آدم کو بگاڑتا رہا۔

وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ وَشَارِكْهُمْ فِى الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ وَعِدْهُمْ ؕ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ﴿۶۴﴾ (سورة بنیٓ اسرآءِیل : ۶۴)

(اور گھبرا دے ان میں سے جن پر تیرا بس چلے اپنی آواز (صوتی ہتھکنڈوں) سے، اور دھاوا بول دے ان پر اپنے گھوڑسواروں اور پیادہ دستوں کے ساتھ، مال اور اولاد میں ان کا ساجھی بن جا اور ان سے جھوٹے وعدے کرتا رہ، اور شیطان ان سے وعدہ نہیں کرتا مگر مکر و فریب کا۔ ۶۴)

شیطان کے اضلال کی وسعت

اس آیتِ کریمہ کو دیکھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے پروردگار خود ابلیس کو وہ تمام راستے دکھا رہا ہے جن سے وہ انسان کو گمراہ کرنے کے لیے حملہ آور ہو سکتا ہے حالانکہ حقیقت یہ نہیں لیکن یہ بھی امر واقعہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو خوب معلوم تھا کہ شیطان انسانوں کو گمراہ کرنے کے لیے کون کون سے حربے استعمال کرے گا۔ اس لیے پروردگار نے انھیں اجمالاً انسانوں کی آگاہی کے لیے بیان فرما دیا تاکہ وہ ابلیس کی کارکردگی کو معمولی نہ سمجھیں اور اس سے بچنے کے لیے زیادہ سے زیادہ کوششیں بروئے کار لائیں اور زندگی کے ہر شعبے پر نظر رکھتے ہوئے شیطانی گھاتیں پہچاننے کی کوشش کریں اور زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہونا چاہیے جس میں خیر کی قوتیں برائی کی قوتوں کا سر کچلنے کے لیے یا ان کے دفاع کے لیے اپنے طور پر کوئی تیاری نہ کریں۔ چنانچہ شیطانی حربوں کو پروردگار نے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

(۱) شیطان کا سب سے پہلا حربہ جو وہ عموماً استعمال کرتا ہے وہ اس کی صوتی کاوش ہے جسے ہم ترغیب کی مختلف صورتیں قرار دے سکتے ہیں۔ حضرت عبداللہ ابن عباس ؓ نے اس سے مراد موسیقی اور گانا بجانا لیا ہے۔ ظاہر ہے کہ صوتی فسوں کاری کا اس سے بہتر اظہار اور کہاں ہو سکتا ہے۔ اسی سے سفلی جذبات ابھارے جاتے ہیں۔ زندگی کے سنجیدہ مشاغل سے نوجوانوں کو دور کیا جاتا ہے۔ مقاصدِ حیات کا شعور سب سے زیادہ اسی ذریعہ سے ختم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

صوت اور ترغیب کی ایک صورت وسوسہ اندازی بھی ہے۔ قدرت نے ابلیس کو اس کی خاص استطاعت بخشی ہے۔ ابلیس انسان کے خون کے ساتھ گردش کرتا ہے۔ وہ دل و دماغ کی ان سوچوں میں داخل ہو جاتا ہے جس کی دوسروں کو خبر بھی نہیں ہوتی اور آہستہ آہستہ دل و دماغ کو ان راستوں پر ڈالنے کی کوشش کرتا ہے جو برائی کی طرف جاتے ہیں۔ اس طریقے سے نہایت خاموشی سے تعلیمی نصاب کو بدلنے، تعلیم کے تصور کو تبدیل کرنے اور تربیت کو یکسر اس سے لاتعلق کر دینے اور لیکچرز کی مدد سے ذہنوں کو مسموم کر دینے کی تمام کاوشیں اس میں شامل ہیں۔

(۲) ابلیس کا دوسرا حربہ یہ ہے کہ وہ لادینی قوتوں میں ارتباط اور تنظیم پیدا کر کے اور ایک اجتماعی قوت کی شکل دے کر دینی قوتوں کے مقابل لا کھڑا کرتا ہے اور اس کے لیے اسے نہ طاقت استعمال کرنے سے گریز ہوتا ہے اور نہ بھاگ دوڑ سے۔ لاؤ لشکر چڑھا لانے اور پیادہ فوج کے ذکر سے شاید یہی مراد ہے کہ وہ ہر سطح پر اللہ تعالیٰ کے بندوں کو پسپا کرنے کا فیصلہ کرتا ہے بلکہ تاریخ کی روشنی میں دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ خیر و شر کے جتنے معرکے ہوئے ہیں ان میں ابلیس کے کارنامے صاف دکھائی دیتے ہیں۔ جنگِ بدر میں تو وہ ایک شیخ قبیلہ کی صورت میں ابوجہل اور دوسرے عمائدینِ قریش کے ساتھ اس وقت تک رہا جب تک فرشتوں کا نزول شروع نہیں ہو گیا۔ اس سے یہ بات ضرور معلوم ہوتی ہے کہ جہاں بھی حق و باطل کا معرکہ ہو گا وہ اپنے لاؤ لشکر سمیت باطل کا ساتھ دے گا اور خود اہلِ باطل بھی اسی کا لشکر ہوتے ہیں جنھیں وہ خاموشی سے

Marfat.com

تدبیریں سکھاتا ہے۔ اب تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک مدت سے اس نے اس راز کو پالیا ہے کہ بجائے ایک ایک مسلمان کو گمراہ کرنے کے ان اداروں کو گمراہ کیا جائے جو مسلمانوں کے دل و دماغ کو بنانے یا بگاڑنے کا کام کرتے ہیں اور ان کی فوجی قیادتوں کو راہِ راست سے ہٹا دیا جائے تو وہ خود اپنی طاقت کے زور سے مسلمانوں کے تمام اداروں اور ان کے خیر کے تمام ذرائع کو پابند سلاسل کر دیں گی۔

(۳) شیطان کا تیسرا اہم حربہ مسلمانوں کے مالی اداروں کو کرپٹ کرنا اور ان کے وسائل کو لادینیت کی خدمات پہ لگانا ہے۔ اسی طرح ان کے تمام تعلیمی اور تربیتی اداروں کو ایسے مشاغل میں الجھانا ہے جس سے بچوں کی تربیت کی بجائے ان کے بگاڑ میں اضافہ ہوتا چلا جائے۔ اور اس کام کو اس سلیقے سے انجام دینا ہے کہ مال کمانے والے کمانے کی محنت اٹھاتے رہیں لیکن ان کا کمایا ہوا مال شیطانی راہوں میں صرف ہوتا رہے اور وہ یہی سمجھتے رہیں کہ یہ سب کچھ ہماری ترقی یا ہمارے بھلے کے لیے ہو رہا ہے۔ اور جن اداروں میں بچے تربیت پا رہے ہیں بچوں کے ماں باپ خوش ہوتے رہیں کہ ہمارے بچے ماشاء اللہ کس طرح زیورِ تعلیم سے آراستہ کیے جا رہے ہیں، لیکن شیطان اپنے تئیں خوش ہے کہ ان کی تعلیم مکمل ہونے کے بعد وہ بچے نہ ماں باپ کے ہوں گے، نہ مسلمانوں کے، بلکہ ان کا رشتہ ابلیسی جماعت اور لادینی قوتوں سے ہوگا۔

(۴) شیطان کے پاس چوتھا حربہ انسان کو گمراہ کرنے کا جو سب سے زیادہ خطرناک ہے وہ یہ ہے کہ وہ انسان کو ہمیشہ وعدوں میں بہلاتا ہے۔ اسے ایسے ایسے سبز باغ دکھاتا ہے اور ایسے ایسے گمراہ کن نظر فریب اور دلکش لالچوں میں انسان کو مبتلا کر دیتا ہے کہ انسان کیمیاگری کی کوشش کی طرح ساری عمر اسی میں دھکے کھاتا رہتا ہے اور اس دلدل سے کبھی اسے نکلنا نصیب نہیں ہوتا۔ اسی لیے پروردگار نے آیت کے آخر میں متنبہ فرمایا کہ شیطان کے وعدے دھوکہ کے سوا کچھ بھی نہیں۔

اِنَّ عِبَادِیۡ لَیۡسَ لَکَ عَلَیۡہِمۡ سُلۡطٰنٌ ؕ وَ کَفٰی بِرَبِّکَ وَکِیۡلًا ﴿۶۵﴾ (سورۃ بنیٓ اسرآءِیل : ۶۵)

(بیشک جو میرے بندے ہیں ان پر تیرا غلبہ نہیں ہوسکتا، اور آپؐ کا رب اپنے بندوں کی کارگزاری کے لیے کافی ہے۔ ۶۵)

مخلص بندوں کو تسلی

گزشتہ آیت میں انسانوں کو گمراہ کرنے کے لیے شیطان کو جو مہلت دی گئی ہے اور جو وسائل دیے گئے ہیں انھیں دیکھ کر آدمی یہ سوچنے لگتا ہے کہ ان حربوں سے بچنا تو شاید انسان کے بس میں نہیں، تو یہ کیا بات ہوئی کہ ایک طرف تو انسان کو عبدیت کا حکم دیا گیا اور بندگی اس کا مقصد ٹھہرایا اور اسی پر اس کی دنیا و آخرت کی کامیابی کا دارومدار ٹھہرا اور دوسری طرف شیطان کو وہ کچھ دے دیا گیا جس کا مقابلہ انسان کے بس کی بات نہیں۔ پیشِ نظر آیت کریمہ میں اس خیال کے ازالے کے لیے ارشاد فرمایا گیا کہ شیطان واقعی گمراہ کرنے کے بہت وسائل رکھتا ہے لیکن اس سے یہ خیال مت کرو کہ وہ کبھی کسی کو زبردستی بھی گمراہ کرسکتا ہے۔ اس کا کام ترغیب دینا ہے لیکن جو اس ترغیب کو رد کر دے اور ایمانی قوت کا ثبوت دے شیطان اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ جو شخص کلمہ طیبہ پڑھ کر دائرۂ اسلام میں داخل ہو جاتا ہے اور تہیہ کر لیتا ہے کہ مجھے اسلامی زندگی گزارنی ہے اور میں کبھی شیطان کے رستے پر چلنا گوارا نہیں کروں گا تو اللہ تعالیٰ اسے اپنی حفاظت میں لے لیتے ہیں۔ اس کی نمازیں اس کے لیے پناہ گاہ بن جاتی ہیں، اللہ تعالیٰ کا ذکر اس کا ہتھیار بن جاتا ہے۔ وہ اگر کہیں شیطان کی اکساہٹ محسوس کرے تو لاحول پڑھنے سے شیطان کی تمام قوتیں ختم ہو کر رہ جاتی ہیں۔ وہ جب بھی اللہ تعالیٰ سے استعانت کرتا ہے ہمیشہ ادھر سے قبولیت استقبال کے لیے آگے بڑھتی ہے۔ جس طرح بھیڑیا آوارہ بھیڑ کو پکڑتا ہے۔ اسی طرح وہ مومن شیطان کے ہتھے چڑھتا ہے جو مومن کہلاتے ہوئے بھی ایمان کی بجائے شیطان کی راہوں پر چلنا پسند کرتا ہے۔ اس لیے اس آیتِ کریمہ میں تسلی دی گئی کہ میرے بندوں پر شیطان کا غلبہ کبھی نہیں ہوسکتا۔ اور پھر مزید یہ کہہ کر حوصلہ دیا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آ جاتا ہے اور اسلامی زندگی اختیار کر لیتا ہے اللہ تعالیٰ اس کا کارساز بن جاتا ہے اور اس کی کارسازی کے بعد پھر اس کے لیے کوئی خطرے کی بات نہیں ہوتی۔ ساری دنیا بھی دشمن ہو جائے اور تمام شیطانی قوتیں بھی اس کا تعاقب کرنے لگیں تو وہ بڑے اطمینان سے کہتا ہے کہ۔

کافی ہے اگر ایک خدا میرے لیے ہے

Marfat.com

رَبُّكُمُ الَّذِیْ یُزْجِیْ لَكُمُ الْفُلْكَ فِی الْبَحْرِ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِكُمْ رَحِیْمًا ﴿۶۶﴾

(تمھارا رب وہ ہے جو تمھارے لیے سمندر میں کشتی چلاتا ہے تاکہ تم اس کا فضل تلاش کرو، بیشک وہ تمھارے حال پر بڑا مہربان ہے۔ ۶۶) (سورة بنیٓ اسرآءِ یل : ۶۶)

انعاماتِ الٰہی کی فراوانی

سابقہ آیات میں شیطان کے ان عزائم کو ذکر کیا گیا جس کا اظہار اس نے قیامت تک کے لیے مہلت طلب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے حضور کیا جس کا ایک ایک لفظ انسان دشمنی کے زہر میں بجھا ہوا ہے، لیکن یہ کس قدر عجیب بات ہے کہ شیطان جس کی دشمنی میں کوئی شک وشبہ ہی نہیں، انسان ہمیشہ اس کی فرمانبرداری کی طرف لپکتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کی انسان دشمنی کو واضح کرنے کے بعد اپنے احسانات میں سے صرف ایک احسان کا ذکر فرمایا تاکہ انسانوں کو شیطان کا اتباع کرتے ہوئے کچھ تو شرم آئے کہ ایک طرف ان کا دشمن ہے اور اس کا اتباع کیا جارہا ہے اور دوسری طرف انسانوں کا پروردگار ہے کہ جس کی زمین اور زمین پر اگنے والی نعمتیں انسان کے کام و دہن کی خدمت کے لیے ہمہ وقت مصروف ہیں۔ اور صرف اسی پر بس نہیں بلکہ اس نے سمندر کے پانی کی بے پناہ قوت کو بھی انسانوں کے لیے مسخر کر دیا ہے۔ ہزاروں ٹن وزنی جہاز انسان سمندر میں اتارتا ہے لیکن سمندر کا پانی اسے اٹھانے سے انکار نہیں کرتا۔ وہ کون سی قوت ہے جس نے سمندر کو تسخیر کی زنجیریں پہنا دی گئیں۔ ظاہر ہے وہ اللہ تعالیٰ ہی کی قوت ہے۔ وہ کیسے ہلکے ہلکے انداز میں خراماں خراماں جہاز کو لے کر چلتا ہے۔ نہ اسے ٹھوکر لگتی ہے اور نہ وہ ہچکولے کھاتا ہے۔ اور اگر کہیں اٹھنے والی طوفانی موجیں اس کا راستہ روکتی ہیں تو تب بھی وہ انسانوں کی مدد کرتے ہوئے انھیں بخیریت تمام ان خطرات سے گزار دیتا ہے اور یہ سب کچھ وہ اس لیے کرتا ہے تاکہ انسان اپنے لیے سمندر کی نعمتیں حاصل کر سکے۔ سمندر نعمتوں کا ایک خزانہ ہے۔ جس میں غذائی ضرورتوں کا سامان بھی ہے اور تزئین و آرائش کے ذوق کی تسکین بھی۔ زمین کے بارے میں معلومات کا ذریعہ بھی ہے اور جغرافیہ کی جہتوں کو جاننے کا پیمانہ بھی۔ اللہ تعالیٰ کی ان تمام نعمتوں کو دیکھتے ہوئے آدمی یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہتا کہ وہ ذات جس نے زمین سے ہمارے لیے خزانے نکالے اور مظاہر فطرت کو ہمارے لیے مسخر کیا اور سمندر کو بھی ہماری خدمت اور رزق رسانی کے لیے لگا دیا وہ یقیناً سب سے بڑا رحیم اور اپنے بندوں پر سب سے بڑا مہربان ہے۔

وَاِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِی الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّاۤ اِیَّاهُ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىكُمْ اِلَی الْبَرِّ اَعْرَضْتُمْ ؕ وَكَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا ﴿۶۷﴾

(اور جب تمھیں سمندر میں مصیبت پہنچتی ہے تو گم ہو جاتے ہیں وہ، جن کو تم پکارتے ہو، اللہ تعالیٰ کے سوا۔ پھر جب وہ تم کو خشکی پر پہنچا دیتا ہے تو تم روگردانی کرنے لگتے ہو اور انسان بڑا ہی ناشکرا ہے۔ ۶۷) (سورة بنیٓ اسرآءِ یل : ۶۷)

انسان کی ناشکری

جس پروردگار نے زمینی قوتوں کے ساتھ ساتھ بحری قوتیں بھی انسان کے لیے ہموار کر دی ہیں اور ان کے خزانے انسانوں کے لیے وقف کر دیے ہیں۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ انسان ہمیشہ اپنے پروردگار کی مہربانیوں کو یاد رکھے اور اس کے سوا کبھی کسی آستانے پر نہ جھکے اور کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہ کرے، لیکن انسان کا عالم یہ ہے کہ جب کبھی سمندر میں سفر کرتے ہوئے کسی خوفناک طوفان سے واسطہ پڑتا ہے اور منہ زور ہوائیں اس کو ہڑپ کرنے کے لیے آگے بڑھتی ہیں۔ اس وقت شروع شروع میں تو اپنے نام نہاد خداؤں کو پکارتا ہے لیکن جب دیکھتا ہے کہ خطرہ سر پر آپہنچا ہے تو پھر اپنے تمام دیوی دیوتاؤں کو بھول کر ایک اللہ کو پکارتا ہے۔ اور اسی کے حضور گڑگڑا کر اپنی نجات وسلامتی کے لیے دعائیں کرنے لگتا ہے۔ ایسی حالت میں وہ کبھی غور نہیں کرتا کہ اگر وہ میرے نام نہاد خدا اور مصنوعی معبود کسی قدرت کے مالک ہوتے تو آج مجھے اللہ تعالیٰ کے سامنے دعا کے لیے ہاتھ کیوں پھیلانے پڑتے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ میں آج تک گمراہیوں میں ڈوبا رہا ہوں۔ آج اگر حالات کے دباؤ نے مجھے صحیح راستے پر لا ڈالا ہے اور

Marfat.com

میری فطرت صحیح کام کرنے لگی ہے تو مجھے ہمیشہ کے لیے مشرکانہ رویہ سے توبہ کرنی چاہیے، لیکن اس کے برعکس ہوتا یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ محض اپنے فضل و کرم سے اس کے سابقہ کرتوتوں کو نظرانداز کرتے ہوئے بخیریت تمام ساحلِ سمندر پر پہنچا دیتا ہے تو یک لخت اسے اپنی دیوی دیوتا یاد آنے لگتے ہیں اور ان کے نام کی دہائی دینے لگتا ہے۔ اللہ تعالیٰ مشرکین کو براہ راست خطاب فرما کر توجہ دلا رہے ہیں کہ اپنے رویئے پر بھی سنجیدگی سے غور کرو، کبھی تو اپنی فطرت کی صداؤں کو سنو اور اپنی عقل سے کام لینے کی کوشش کرو۔ اگر تمھارے تراشیدہ اور مصنوعی خداؤں میں خدائی قدرت کا کچھ بھی اثر ہوتا تو ان پُر خطر ساعتوں میں تمھارے دل ان کی طرف ہی مائل رہتے۔ ان مشکل لمحوں میں ان کی طرف سے تمھارا منہ موڑ لینا اور ایک ربِ قدیر کے حضور میں فریاد کرنا، کیا یہ اس بات کی کھلی دلیل نہیں کہ انسانی فطرت میں عقیدۂ توحید کی تخم ریزی کی گئی ہے۔ اور جب خارجی اور اجنبی اثرات اور دباؤ ختم ہوتے ہیں تو عقیدۂ توحید خود بخود بے نقاب ہو جاتا ہے۔ آخر میں پروردگار نہایت تاسف سے فرما رہے ہیں کہ اس کا کیا کیا جائے، انسان ہے ہی ناشکرا۔ تکلیف آتی ہے تو اپنے اصل مالک کو یاد کرتا ہے اور جب تکلیف گزر جاتی ہے تو پھر ناشکری اس پر غالب آ جاتی ہے۔

اَفَاَمِنْتُمْ اَنْ یَّخْسِفَ بِکُمْ جَانِبَ الْبَرِّ اَوْ یُرْسِلَ عَلَیْکُمْ حَاصِبًا ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَکُمْ وَکِیْلًا ﴿٦٨﴾ اَمْ اَمِنْتُمْ اَنْ یُّعِیْدَکُمْ فِیْهِ تَارَةً اُخْرٰی فَیُرْسِلَ عَلَیْکُمْ قَاصِفًا مِّنَ الرِّیْحِ فَیُغْرِقَکُمْ بِمَا کَفَرْتُمْ ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَکُمْ عَلَیْنَا بِهٖ تَبِیْعًا ﴿٦٩﴾ (سورۃ بنیٓ اسرآءِیل : ۶۸۔۶۹)

(کیا تم اس بات سے بے خوف ہو گئے ہو کہ وہ خشکی کے کنارے کو تمھارے سمیت دھنسا دے یا تم پر بادِ تند بھیج دے، پھر نہ پاؤ تم اپنے لیے کوئی کارساز۔ ۶۸) یا تم اس سے بے خوف ہو گئے ہو کہ تم کو دوبارہ سمندر میں لوٹائے، پھر بھیج دے تم پر کشتیوں کو توڑنے والی سخت آندھی، پھر وہ تمھاری ناشکری کی پاداش میں تم کو غرق کر دے، اور تم اس پر ہمارا کوئی پیچھا کرنے والا اپنے لیے نہ پاؤ۔ ۶۹)

اللہ تعالیٰ کے باغیوں سے چند سوالات

گزشتہ آیتِ کریمہ میں ہم نے پڑھا کہ مشرکین جب سمندر میں طوفان میں گھر جاتے ہیں تو اپنے بتوں اور دیوی دیوتاؤں کو بھول کر، بلکہ ان سے مایوس ہو کر صرف اللہ تعالیٰ کے سامنے گڑگڑاتے اور دعائیں مانگتے ہیں، لیکن جب اللہ تعالیٰ انھیں خیریت سے ساحلِ سمندر پہ پہنچا دیتا ہے تو وہ محسوس کرتے لگتے ہیں کہ اب سمندر کا کوئی طوفان ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا، تو پھر اپنے نام نہاد معبودوں کو پکارنے لگتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسروں کو شریک کرنے لگتے ہیں۔ مشرکین کی اس روش پر جو سراسر حماقت پر مبنی ہے پروردگار توجہ دلا رہے ہیں کہ تمھارا یہ خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور سلطنت شاید سمندر کے کناروں تک ہے، خشکی پر اس کا حکم نہیں چلتا۔ خشکی کے حاکم مشرکین کے بت یا دیوی دیوتا ہیں حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ کائنات کا پیدا کرنے والا پروردگار ہے اور کائنات کی ہر چیز کو سنبھالنے والا اور پناہ دینے والا بھی پروردگار ہے۔ جس طرح سمندر اس کے قبضۂ قدرت میں ہے اسی طرح زمین کا ایک ایک انچ بھی اس کے قبضے میں ہے، جس طرح سمندر کا طوفان اللہ تعالیٰ کے حکم کا پابند ہے، اسی طرح زمین کا ہر تغیر بھی اسی کے حکم کا پابند ہے۔ تمھیں اس سے بے خوف نہیں ہونا چاہیے کہ وہ زمین پر تمھارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا، وہ اگر چاہے تو تمھارے مکانوں سمیت تمھیں زمین میں دھنسا دے یا تم پر کوئی بادِ تند بھیج دے جو تمھیں تباہ کر کے رکھ دے۔ حَاصِبٌ اس بادل کو بھی کہتے ہیں جس سے ژالہ باری ہوتی ہے اور اس تیز ہوا کو بھی جو پتھروں کو اٹھا کر اہلِ زمین پر دے مارتی ہے یا سنگ ریزوں کی بارش کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا جا رہا ہے کہ وہ چاہے تو زمین میں دھنسا سکتا ہے اور چاہے تو بادل سے ژالے برسا کر سب کچھ تباہ کر سکتا ہے اور چاہے تو ایسی تیز ہوا چلا سکتا ہے جو سنگ ریزوں کی ایسی بارش کرے کہ انسانوں کے جسموں کے پرخچے اڑ جائیں اور اس کے مقابل میں کوئی چیز ٹھہر نہ سکے۔

دوسری آیت میں ارشاد فرمایا کہ تم ساحلِ سمندر پر پہنچ کر اس غلط فہمی کا شکار کیسے ہو گئے ہو کہ اب تم اللہ تعالیٰ کی گرفت سے نکل گئے ہو اور وہ تمھیں کبھی نہیں پکڑ سکتا، اس لیے اب اسے پکارنے کی ضرورت نہیں، نادانو! اس کے لیے کوئی بعید نہیں کہ وہ دوبارہ تمھارے دل میں بحری سفر

Marfat.com

کا شوق پیدا کرے اور پھر تم خود چل کر کسی بحری جہاز پر سوار ہو جاؤ اور پہلے کی طرح سمندر کا کوئی طوفان تمھارے جہاز کو آ گھیرے اور تم پھر اپنی روایت کے مطابق اپنے مصنوعی خداؤں کو بھول کر اپنے اللہ کو پکارو۔ لیکن اب وہ تمھیں نجات دینے کی بجائے تم پر ایسی ہوا بھیجے جو کشتیوں اور بحری جہازوں کو توڑ پھوڑ دیتی ہے جن کا ایک ایک تختہ سطح سمندر پر تیرتا پھرتا ہے اور پھر تمھارے کفر کے باعث تمھیں سمندر میں غرق کر دے۔ اور تمھارا کوئی حامی اور مددگار ایسا نہ ہو جو ہمت کر کے پروردگار کے رحم سے اپیل کر سکے۔ اس لیے عقل کی بات یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے غضب سے ہمیشہ لرزاں اور ترساں رہو، اس کے ساتھ کسی کا شریک مت ٹھہراؤ۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ۝۷۰ (سورۃ بنیٓ اسرآءِ یل : ۷۰)

(اور ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی، اور خشکی اور تری دونوں میں ان کو سواری عطا کی اور ان کو پاکیزہ چیزوں کا رزق دیا، اور ہم نے انھیں نمایاں فضیلت دی بہت سی چیزوں پر جن کو ہم نے پیدا فرمایا۔ ۷۰)

انسان کو ذمہ داری کی یاد دہانی

گزشتہ تین آیات میں پروردگارِ عالم نے جو بحری نعمتیں عطا فرمائیں اور بحری سفر کی سہولتیں دے کر بے شمار خزانوں کے راستے کھول دیے، ان کا ذکر فرمایا۔ اور ساتھ ہی ساتھ مشرکین کا وہ طرزِ عمل جو سراسر ناشکری سے عبارت ہے، اس کا ذکر فرما کر ان کو شرم دلائی اور ان کی حماقت پر انھیں متنبہ کیا۔ اب پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں انسان کو جو مجموعی طور پر نعمتیں عطا کی گئی ہیں اور انسان کو جو مقام و مرتبہ بخشا گیا ہے اس کا ذکر فرما کر انسان کو ذمہ داریوں کا احساس دلایا گیا ہے۔

انسان کا اگر قد و قامت دیکھا جائے تو وہ ایک ساڑھے پانچ اور چھ فٹ کا ایک کمزور سا وجود ہے جس کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ نے بڑے بڑے وجود پیدا کیے، لیکن اسے عقل و علم، گویائی، پاکیزہ صورت، معتدل قامت اور معاش و معاد کی تدابیر اور تمام چیزوں پر استیلا اور تسخیر عطا فرما کر اسے باقی اکثر مخلوقات پر جو فضیلت بخشی گئی ہے وہ ایک ایسی نعمت ہے جس کا انسان کبھی شکر ادا نہیں کر سکتا۔ اگر وہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ان صلاحیتوں پر ٹھیک ٹھیک عمل کر کے معرفتِ خداوندی کی دولت کو پا لیتا اور اس راستہ کو اختیار کر لیتا ہے، جو انبیا و رسل نے سکھایا ہے اور اپنے فرائض کو صحیح طور پر بجا لاتا ہے تو فی الحقیقت بحر و بر کا سلطان ہے۔ زمین کا خلیفہ اور مسجودِ ملائک ہے۔ اسی میں انبیا اور رسل پیدا ہوئے، حتیٰ کہ نبی کریم ﷺ کا وجودِ مبارک اس کے لیے سرمایۂ افتخار ہے۔ لیکن اگر یہ اپنی حیثیت گم کر دیتا ہے، بجائے اللہ تعالیٰ کا بندہ بننے کے مادہ اور شیطان کا بندہ بن کر رہ جاتا ہے۔ آخرت کو منزل بنانے کی بجائے دنیا کی محبت میں گم ہو جاتا ہے، تو پھر یہ اپنی ذات کے لیے ایک داغ سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ "جگر" نے ٹھیک کہا:

گھٹے اگر تو بس ایک مشتِ خاک ہے انساں
بڑھے تو وسعتِ کونین میں سما نہ سکے

انسان کی عظمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پروردگار نے ارشاد فرمایا کہ انسان کو ہم نے عزت عطا کی ہے، ورنہ وہ اپنی ذات میں اس قدر کمزور اور اس قدر ناتواں ہے کہ بہت سی دوسری مخلوقات کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ لیکن ہم نے اسے غیر معمولی صلاحیتیں دے کر بلند عزائم عطا کر کے عقل و علم کا شعور دے کر اور اس کے دل کو اللہ تعالیٰ کی معرفت دے کر اور اس کے احساسات کو محبت کی گہرائی بخش کر ہم نے وہ عزت عطا کی ہے جو بیشتر مخلوقات کو عطا نہیں کی۔ اسے زمین پر ہر قسم کی سواریاں دیں، چھکڑے سے لے کر ہوائی جہاز تک اس کے زیرِ استعمال ہیں۔ سمندر میں بھی اسے سواریوں سے نوازا، کشتیاں اس کی سیر کے لیے ہیں اور بحری جہاز اس کے سفر کے لیے۔ اس کا بے حساب تجارتی سامان انھیں جہازوں کے ذریعے ملکوں ملکوں پہنچتا ہے، اور انسانوں کی ضرورتوں اور ترقیات کے کام آتا ہے۔ اس طرح سے بر و بحر میں اسے طیبات کا وہ رزق عطا فرمایا گیا ہے کہ جس کا شمار ممکن نہیں، جس کے تنوع کو دیکھ کر آدمی کی عقل دنگ رہ جاتی ہے، پھر انسان کو قوتِ ایجاد دی گئی ہے جس نے ان نعمتوں میں غیر معمولی اضافہ کر دیا ہے۔ یہ سب کچھ انسان کو

Marfat.com

اس لیے عطا ہوا ہے تا کہ وہ ان نعمتوں کی قدر کرے، ان کا حق ادا کرے اور اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے زمین پر جن فرائض کی بجا آوری کے لیے بھیجا ہے ان کی فکر کرے۔ اور اللہ تعالیٰ کی زمین پر بجائے فساد برپا کرنے کے انسانوں کی خیر و فلاح کا انتظام کرے اور اللہ تعالیٰ کی ناشکری کرنے کی بجائے اس کا شکر گزار اور فرمانبردار بندہ بن کر رہے۔

يَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍۭ بِاِمَامِهِمْ ۚ فَمَنْ
اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ فَاُولٰٓئِكَ يَقْرَءُوْنَ كِتٰبَهُمْ وَلَا يُظْلَمُوْنَ
فَتِيْلًا ۝٧١ وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى
وَاَضَلُّ سَبِيْلًا ۝٧٢ وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ
اِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهٗ ۖ وَاِذًا لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا ۝٧٣ وَلَوْلَآ
اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْـًٔا قَلِيْلًا ۝٧٤ اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ
ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا ۝٧٥
وَاِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ لِيُخْرِجُوْكَ مِنْهَا وَاِذًا
لَّا يَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝٧٦ سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ
مِنْ رُّسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيْلًا ۝٧٧ ع

رکوع: ۸۔ (اس دن کو یاد رکھو جس دن ہم ہر گروہ کو ان کے رہنما سمیت بلائیں گے، سو جن کو ان کا اعمال نامہ دائیں ہاتھ میں دیا گیا تو وہ اپنے اعمال نامہ کو پڑھیں گے اور ذرا بھی ان کے ساتھ ناانصافی نہیں کی جائے گی۔ ۷۱) اور جو شخص اس دنیا میں اندھا بنا رہا وہ آخرت میں بھی اندھا ہو گا اور بہت گمراہ ہو گا۔ ۷۲) اور انھوں نے پختہ ارادہ کیا تا کہ وہ آپؐ کو برگشتہ کر دیں اس چیز سے جو ہم نے آپؐ کی طرف وحی کی ہے تا کہ آپؐ اس سے مختلف ہم پر افترا کر کے پیش کریں تب وہ آپؐ کو اپنا گہرا دوست بنالیں گے۔ ۷۳) اگر ہم نے آپؐ کو جمائے نہ رکھا ہوتا تو قریب تھا کہ آپؐ ان کی طرف کچھ نہ کچھ مائل ہو جاتے۔ ۷۴) اگر ایسا ہوتا تو ہم آپؐ کو زندگی اور موت دونوں کا دگنا عذاب چکھاتے، پھر آپؐ ہمارے مقابلے میں کوئی مددگار نہ پاتے۔ ۷۵) اور بیشک انھوں نے ارادہ کر لیا ہے کہ اس سرزمین سے آپؐ کے قدم اکھاڑ دیں تا کہ وہ آپؐ کو یہاں سے نکال دیں،

Marfat.com

(اور اگر انھوں نے یہ حماقت کی) تو آپؐ کے بعد یہ نہیں ٹھہریں گے، مگر تھوڑا عرصہ۔ ۷۶) یہی ہمارا قانون ہے ان کے بارے میں جنھیں ہم نے آپؐ سے پہلے رسول بنا کر بھیجا اور آپؐ ہمارے قانون میں کوئی تبدیلی نہیں پائیں گے۔ ۷۷)

یَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍۢ بِاِمَامِهِمْ ۚ فَمَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِیَمِیْنِهٖ فَاُولٰٓىِٕكَ یَقْرَءُوْنَ كِتٰبَهُمْ وَ لَا یُظْلَمُوْنَ فَتِیْلًا ﴿۷۱﴾

(اس دن کو یاد رکھو جس دن ہم ہر گروہ کو ان کے رہنما سمیت بلائیں گے، سو جن کو ان کا اعمال نامہ دائیں ہاتھ میں دیا گیا تو وہ اپنے اعمال نامہ کو پڑھیں گے اور ذرا بھی ان کے ساتھ ناانصافی نہیں کی جائے گی۔ ۷۱) (سورۃ بنیٓ اسرآءِیل : ۷۱)

یوم حساب کی ہولناکی

انسانوں کو ان کی ذمہ داریاں یاد دلانے کے بعد انھیں آخرت کا دن یاد دلایا گیا، جس دن اللہ تعالیٰ کی عدالت قائم ہوگی اور انسانوں کا ہر گروہ اپنے امام کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے روبرو حاضر ہوگا۔ كُلَّ اُنَاسٍ کا ترجمہ بعض اہلِ علم نے تمام انسان کیا ہے، یہ بھی صحیح ہے۔ اور یہ امرِ واقعہ بھی ہے کہ اس دن تمام انسانوں کو بلایا جائے گا۔ اور بعض اہلِ علم نے اس کا ترجمہ کیا ہے، ہر گروہ۔ کیونکہ اناس کا معنی انسانوں کا گروہ بھی ہے اور امام سے مراد ان کے لیڈر اور پیشوا ہیں۔ ہمارے یہاں امام کو بعض لوگوں نے خاص معنی پہنا دیے ہیں حالانکہ عربی زبان میں جو شخص بھی کسی فن کا ماہر ہوتا ہے، وہ امام کہلاتا ہے۔ جیسے ہم کسی کو امامِ لغت کہتے ہیں، کسی کو امامِ فقہ، کسی کو امامِ نحو، کسی کو امامِ حدیث، کسی کو امامِ تفسیر، علی ہذا القیاس جو شخص بھی آگے چلنے والا اور رہنمائی دینے والا ہے، اسے امام کہتے ہیں۔ اس لیے اس سے مراد وہ تمام لوگ ہیں جو کسی بھی معاملے میں رہنمائی کرتے رہے، چاہے وہ معاملہ ہدایت کا ہو اور چاہے سیاست کا۔ اس لیے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سیاسی لیڈروں کو ان کے گروہوں سمیت اور پیشواؤں کو ان کے مریدوں سمیت اپنی عدالت میں بلائے گا اور قرآنِ کریم میں بعض دوسرے مقامات پر یہ بتایا گیا ہے کہ وہاں لیڈر اور پیچھے چلنے والے ایک دوسرے سے لڑیں گے۔ پیچھے چلنے والے اپنے لیڈروں پر الزام لگائیں گے کہ انھوں نے ہمیں گمراہ کیا اور آج اس کی پاداش میں ہم اپنے بدترین انجام کو دیکھ رہے ہیں اور لیڈر براءت کا اظہار کریں گے کہ تم نے جو کیا تم خود اس کے ذمہ دار ہو، ہم نے تمھیں کب مجبور کیا تھا۔ ایسا ہی جھگڑا جعلی پیروں اور مریدوں میں ہوگا۔ یہاں تو صرف یہ بتایا گیا ہے کہ ہر ایک کے اعمال کا جب جائزہ لیا جائے گا تو نیک لوگوں کا اعمال نامہ ان کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا۔ یہ اس بات کی علامت ہوگی کہ ان کے اعمال اللہ تعالیٰ کے یہاں قبولیت کا مقام پا چکے ہیں اور یہ ان شاء اللہ تعالیٰ سرخرو ٹھہریں گے۔ قیامت کا دن ایک ہولناک دن ہوگا، لیکن اس تمام ہولناکی کے باوجود جو لوگ اپنے اعمال نامے کو اپنے دائیں ہاتھ میں دیکھیں گے انھیں دیکھتے ہی حوصلہ ملے گا اور وہ اس دن کی تمام تلخیاں بھول جائیں گے، اور نہایت خوشی سے اپنے اعمال نامے کے ایک ایک ورق کو دیکھیں گے اور جیسے جیسے پڑھتے جائیں گے ان کی خوشی میں اضافہ ہوتا جائے گا، کیونکہ وہ دیکھیں گے کہ ان کے ہر عمل پر زیادہ سے زیادہ جزا دی گئی ہے۔ البتہ یہاں اس بات کا ذکر نہیں کیا گیا کہ برے لوگوں کے اعمال ناموں کا کیا ہوگا، لیکن سیاق و سباق سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ انھیں ان کے اعمال نامے بائیں ہاتھ میں دیے جائیں گے۔ وہ انھیں دیکھتے ہی اپنے بال نوچیں گے اور اپنا منہ پیٹ لیں گے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ جس طرح پہلے گروہ کے بارے میں فرما رہے ہیں کہ ان کا ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی جائے گی یعنی ان کی ہر نیکی پر جزا دی گئی ہوگی۔ اسی طرح ان کے ساتھ بھی یقیناً کوئی زیادتی نہیں ہوگی، لیکن ان کے اعمال انصاف کے ترازو میں تلنے کے بعد خود ان کے لیے جہنم کا پیغام بن جائیں گے۔

وَ مَنْ كَانَ فِیْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰى فَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَ اَضَلُّ سَبِیْلًا ﴿۷۲﴾ (سورۃ بنیٓ اسرآءِیل : ۷۲)

(اور جو شخص اس دنیا میں اندھا بنا رہا وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا اور بہت گمراہ ہوگا۔ ۷۲)

Marfat.com

دنیا کی بے بصیرتی آخرت میں اندھے پن کا سبب بنے گی

اس آیت میں دوسرے گروہ کی طرف اشارہ ہے جنھیں اعمال نامہ بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا۔انھوں نے دنیا میں اندھوں کی طرح زندگی گزاری۔وہ آخرت کے معاملے میں اندھے بنے رہے۔جب دنیا میں انھوں نے آنکھیں نھیں کھولیں اور حقائق کا سامنا نھیں کیا تو آخرت میں بھی انھیں اندھا اٹھایا جائے گا۔وہ حیران ہوکر کہیں گے کہ ہم تو دنیا میں بینا تھے،ہمیں اندھا کیوں اٹھایا گیا تو پروردگار کی طرف سے انھیں جواب دیا جائے گا کہ جس شخص نے ہمارے ذکر سے اعراض کیا تو قیامت کے دن اس کا انجام یہی ہوگا کہ ہم اسے اندھا اٹھائیں گے۔اور اسے کہا جائے گا کہ چونکہ تم نے دنیا میں ہماری آیات کو دیکھنا پسند نھیں کیا تھا تو آج تمھارے رویئے کے مطابق ہم نے تمھیں اندھا اٹھایا ہے۔

اس آیت میں پیغام دیا گیا ہے کہ اگر قیامت کے دن بینائی چاہتے ہو تو دنیا میں آنکھیں کھول کر زندگی گزارو۔کھلی آنکھوں سے اللہ تعالیٰ کے دین کو دیکھو،اس کی نشانیوں کو دیکھو،اسے سمجھنے کی کوشش کرو تاکہ قیامت کے دن تمھیں برے انجام سے واسطہ نہ پڑے۔

وَ اِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهٗ ۖ وَاِذًا لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا ﴿۷۳﴾

(اور انھوں نے پختہ ارادہ کیا تاکہ وہ آپؐ کو برگشتہ کردیں اس چیز سے جو ہم نے آپؐ کی طرف وحی کی ہے تاکہ آپؐ اس سے مختلف ہم پر افترا کر کے پیش کریں تب وہ آپؐ کو اپنا گہرا دوست بنالیں گے۔ ۷۳) (سورۃ بنیٓ اسرآءِیل : ۷۳)

قریش کی سازشیں اور گھناؤنی تجاویز

کَـاد ۔ کی تحقیق میں اہلِ لغت نے مختلف باتیں کہی ہیں اور مختلف معنی بیان کیے ہیں۔علامہ بدرالدین زرکشی نے سید شریف رضی کی کتاب ''الغرر'' سے اس کے متعدد معنی بیان کیے ہیں جن میں سے ایک معنی کسی کام کا ارادہ کرنا ہے،اور یہاں یہی معنی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔اس سے اشرافِ قریش کے ان ارادوں اور سازشوں کی خبر ہوتی ہے جس کا ذکر بعض روایات میں کیا گیا ہے جس میں خاص طور پر بنو ثقیف کا نام لیا گیا ہے۔اہلِ مکہ نے جب دیکھا کہ کئی سالوں کی مسلسل مخالفت اور اذیت رسانی کے باوجود آنحضرت ﷺ کے تبلیغ و دعوت کے انداز اور آپؐ کی تعلیم کے بنیادی نکات میں کوئی تغیر پیدا نھیں ہوا۔آپؐ کے بقول جو کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپؐ پر اترتا ہے آپؐ اسے بلا کم و کاست لوگوں تک پہنچاتے ہیں اور آپؐ انھیں بنیادی عقائد کی دعوت دیتے ہیں جنھیں وحیِ الٰہی نے متعین کیا ہے اور شرک کی تمام اقسام پر آپؐ نہایت جارحانہ تنقید کرتے ہیں اور ہماری کسی مخالفت کو خاطر میں نھیں لاتے۔اور ساتھ ہی ساتھ ہم یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ اسلام کا اثر دھیرے دھیرے شہر مکہ کے اندر ہی نھیں باہر بھی ہر قبیلے میں پہنچ رہا ہے۔اس لیے اب ہمیں اپنا طریقِ مخالفت بدلنا چاہیے اور اس نوزائیدہ دین کے اثرات کو روکنے کی کوئی نئی تدبیر کرنا چاہیے۔چنانچہ انھوں نے تدبیر یہ سوچی کہ انھوں نے آنحضرت ﷺ سے قرآنِ کریم کے بعض احکام کو تبدیل کرنے کی استدعا کی اور یہ خواہش کی کہ آپؐ اپنی دعوت پیش کیجیے،لیکن اس میں ہمارے مشرکانہ عقائد کی بھی کسی نہ کسی حد تک جگہ پیدا کیجیے۔اگر آپؐ ہماری اس گزارش پر کسی حد تک آمادہ ہوجائیں تو ہم آپ کی مخالفت چھوڑ کر آپ کی دوستی کا راستہ اختیار کریں گے۔یہ نہایت گہری چال انھوں نے اس احتیاط اور ہوش مندی سے آنحضرت ﷺ کے سامنے پیش کی کہ آپؐ نے سوچنا شروع کردیا کہ اگر اس طریقے سے یہ لوگ اسلام کے قریب آتے ہیں تو یقیناً ہمیں کوئی ایسا راستہ نکالنا چاہیے۔کیا عجب کہ آہستہ آہستہ یہ لوگ دین کے مخلص پیروکار بن جائیں۔

اس میں کوئی شبہ نھیں کہ اللہ تعالیٰ کے نبی اپنی معصومیت کے باعث کسی ایسی بات کی طرف مائل نھیں ہوتے جسے دین نہ کہا جاسکے۔اور ان کی ہر کوشش اور ہر خواہش ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے دین کے تابع ہوتی ہے اور وہ کسی طرح بھی اللہ تعالیٰ کے احکام سے سرتابی نھیں کرتے۔لیکن اس کا یہ مطلب نھیں کہ کبھی ان کے اندر کوئی معمولی خیال بھی ایسا پیدا نھیں ہوسکتا جو معصومیت کے خلاف ہو۔ان کا کوئی عمل یقیناً شریعت کے خلاف نھیں ہوتا کیونکہ عصمت ان

Marfat.com

کی نگرانی کرتی ہے، لیکن طبیعت میں خیال کا پیدا ہوجانا اور وہ بھی نفس کے تقاضے کی وجہ سے نہیں بلکہ اشاعتِ دین کے تقاضوں کے باعث، اس کے امکان کو یہاں رد نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ آنحضرت ﷺ اپنی اندر لوگوں کے ایمان کے لیے شدید خواہش رکھتے تھے۔ چنانچہ اس کی خاطر وہ کفار کے ہر رویئے کو نظر انداز کردیتے تھے۔ ان کی اذیتوں اور یاوہ گوئیوں کے مقابلے میں ہمیشہ ان کے ایمان کے لیے قیامِ لیل میں اللہ تعالیٰ کے سامنے دعائیں مانگتے تھے۔ چنانچہ اسی جذبے نے آپؐ کو یہ بات سوچنے پر ہلکا سا آمادہ کردیا اور یہی وہ فتنہ ہے جس کی اس آیت میں خبر دی جارہی ہے، اور اس کے انداز سے معلوم ہو رہا ہے کہ اس کے پیچھے اہلِ مکہ کی کتنی جان توڑ کوششیں شامل تھیں۔

وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰکَ لَقَدْ کِدْتَّ تَرْکَنُ اِلَیْھِمْ شَیْئًا قَلِیْلًا ﴿۷۴﴾ اِذًا لَّاَذَقْنٰکَ ضِعْفَ الْحَیٰوۃِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَکَ عَلَیْنَا نَصِیْرًا ﴿۷۵﴾ وَاِنْ کَادُوْا لَیَسْتَفِزُّوْنَکَ مِنَ الْاَرْضِ لِیُخْرِجُوْکَ مِنْھَا وَاِذًا لَّا یَلْبَثُوْنَ خِلٰفَکَ اِلَّا قَلِیْلًا ﴿۷۶﴾ (سورۃ بنیٓ اسرآءِیل : ۷۴۔۷۵۔۷۶)

(اگر ہم نے آپؐ کو جمائے نہ رکھا ہوتا تو قریب تھا کہ آپؐ ان کی طرف کچھ نہ کچھ مائل ہوجاتے۔ ۷۴) اگر ایسا ہوتا تو ہم آپؐ کو زندگی اور موت دونوں کا دگنا عذاب چکھاتے، پھر آپؐ ہمارے مقابلے میں کوئی مددگار نہ پاتے۔ ۷۵) اور بیشک انھوں نے ارادہ کرلیا ہے کہ اس سرزمین سے آپؐ کے قدم اکھاڑ دیں تاکہ وہ آپؐ کو یہاں سے نکال دیں، (اور اگر انھوں نے یہ حماقت کی) تو آپؐ کے بعد یہ نہیں ٹھہریں گے، مگر تھوڑا عرصہ۔ ۷۶)

توجہ طلب باتیں

پہلی دونوں آیتوں میں چند باتیں بطورِ خاص نہایت توجہ چاہتی ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ قرآنِ کریم میں قریش جس تبدیلی کے خواہش مند تھے اس کے لیے انھوں نے محض آنحضرت ﷺ سے گزارش کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ نہایت عیاری اور دباؤ کے ساتھ آپؐ کے سامنے یہ تجویز رکھی اور ساتھ ہی ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ اپنے ایمان لانے کی یقین دہانی بھی کرائی۔ ان کا یہ وار اس قدر شدید تھا کہ پروردگار فرماتا ہے کہ اگر ہم آپؐ کو ثابت قدم نہ رکھتے تو آپؐ کچھ نہ کچھ ان کی طرف مائل ہوجاتے۔ اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ لادینی قوتوں کی وہ روایت جو قریشِ مکہ سے شروع ہوئی تھی اس میں ہر دور میں ایسی ہی کوششوں اور حشر سامانیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ البتہ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ خیر القرون کے بعد چند مواقع کو چھوڑ کر مسلمان اس طرح لادینی قوتوں کا مقابلہ نہیں کرسکے جو آنحضرت ﷺ کی سنت ہے۔ اقبال نے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اصل حقیقت کی طرف توجہ دلانے کی کوشش کی تھی۔

نہ ستیزہ گاہِ جہاں نئی، نہ حریفِ پنجہ شکن نئے
وہی قوتِ اسداللّٰہی وہی مرحبی وہی عنتری

اہلِ مکہ کی تمام کوششوں کے باوجود انھیں کامیابی نہیں ہوئی کیونکہ ان کا مطالبہ ابھی چل رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے وحی آگئی۔ اور آپؐ پر یہ بات پوری طرح واضح کردی گئی کہ قریش کے لیے آپؐ کے دل میں قبولیتِ ایمان کی خواہش اپنی جگہ، لیکن اس کے لیے ان کی کسی باطل خواہش کو قبول نہیں کیا جاسکتا اور اللہ تعالیٰ کی کتاب میں کوئی رد و بدل نہیں ہوسکتا، کیونکہ ایسی کوئی کوشش بھی اتنا بڑا جرم ہے کہ اگر اس کے کرنے والے سید الرسل بھی ہوں تو اللہ تعالیٰ انھیں بھی سخت عذاب کی وعید سنا رہا ہے اور اس طرح سے یہ بات قریشِ مکہ کو سنائی جارہی ہے کہ تم جس بات کی خواہش رکھتے ہو تمھیں اندازہ ہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں وہ کتنا بڑا جرم ہے اور اس کے نتیجے میں کتنا بڑا عذاب نازل ہوسکتا ہے۔

Marfat.com

عصمتِ انبیا کا مفہوم

اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ اگر ہم آپ ؐ کو ثابت قدم نہ رکھتے تو آپ ؐ کچھ نہ کچھ ان کے مطالبے کی طرف جھک جاتے لیکن ہم نے آپ ؐ کو جھکنے نہ دیا۔ یہ دراصل عصمت کی تعبیر ہے کہ ہم نے جو آپ ؐ کو معصومیت بخشی ہے اس کا تقاضا ہی یہی ہے کہ آپ ؐ مقامِ حق سے سر مو بھی اِدھر اُدھر نہیں ہو سکتے۔ اگر آپ ؐ کے دل میں اس سے مختلف کوئی بات آئے گی تو آپ ؐ کی معصومیت جس کے ہم محافظ ہیں وہ آپ ؐ کو اپنی جگہ سے ہلنے نہ دے گی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عتاب کا رخ آپ ؐ کی طرف نہیں بلکہ ہر اس شخص کی طرف ہے جو ایسی کسی کاوش کے حق میں ہو۔ چاہے وہ مشرکینِ مکہ ہوں اور چاہے آج کے دور کے نام نہاد مسلمان، جو اللہ تعالیٰ کی کتاب سے جہاد کے احکام نکالنے کے درپے ہیں۔ آنحضرت ﷺ کی تو تعریف کی جا رہی ہے کہ حالات کا تقاضا یقیناً یہ تھا کہ آپ ؐ کی طبیعت میں قریش کے مطالبے کی طرف میلان پیدا ہوتا، لیکن آپ ؐ چونکہ معصوم ہیں اس لیے اللہ تعالیٰ نے آپ ؐ کی معصومیت کی حفاظت کی جو آپ ؐ کی نبوت کا لازمی حصہ ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ثابت قدمی جس کا ذکر اس آیتِ کریمہ میں کیا گیا ہے، وہ فرع ہے معصومیت کی۔ اور معصومیت لازمۂ نبوت ہے۔ سرکارِ دو عالم ؐ کی عجیب شان ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عصمت کا ہاتھ ہر وقت آپ ؐ کے دائیں بائیں رہتا ہے۔ اس لیے آپ ؐ سے کسی غلط کام کے صدور کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود آنحضرت ﷺ کی پاکیزگیِ فکر اور رفعتِ خیال کا عالم یہ تھا کہ حضرت قتادہؓ فرماتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو آنحضرت ﷺ نے بارگاہِ ایزدی میں عرض کیا **اللھم لاتکلنی الی نفسی طرفة عین** (اے اللہ! مجھے چشم زدن کے لیے بھی اپنے نفس کے سپرد نہ کرنا)۔ ہمیں اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ جو شخص بھی دعوتِ حق کا فریضہ ادا کر رہا ہو اسے ہر لحہ ان آیات کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔ مبادہ اس سے ایسی کوئی فروگزاشت ہو جائے جو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا باعث بنے۔ اور ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے حضور التجا کرتے رہنا چاہیے **یاحیی یاقیوم برحمتک استغیث لاتکلنی الی نفسی طرفة عین واصلح لی شانی کله**

ہجرت کی طرف اشارہ

تیسری آیتِ کریمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ مکہ نے جب اپنی کوششوں کو ناکام ہوتے دیکھا اور آنحضرت ﷺ کو تبلیغ و دعوت میں مزید سرگرم پایا تو ان کا جوشِ غضب مزید بھڑکا۔ باہمی مشورے سے منصوبہ بندی کرنے لگے کہ آنحضرت ﷺ کو شہر سے نکال دیا جائے۔ قرآنِ کریم چونکہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے اور اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں کہ ان کی کون سے کوشش کامیاب ہوگی۔ اس لیے ان کے دوسرے منصوبوں کا ذکر نہیں کیا جس میں آنحضرت ﷺ کو قتل کرنا بھی شامل تھا۔ البتہ ان کے اس ارادے پر تنبیہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اگر انھوں نے آپ کو اس قدر پریشان کر دیا کہ آپ شہر چھوڑنے پر مجبور ہو گئے تو انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ پھر وہ بھی اس شہر میں ایک مختصر مدت کے سوا رہ نہیں سکیں گے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا رسول، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتمامِ حجت کے لیے آتا ہے۔ وہ جب تک اپنی قوم میں رہتا ہے تو اس کی قوم عذابِ الٰہی کے نزول سے بچی رہتی ہے، لیکن جب اس کی قوم کی اذیت رسانیاں اور سازشیں اسے نکلنے پر مجبور کر دیتی ہیں تو پھر وہ قوم اللہ تعالیٰ کے عذاب کے لیے غیر محفوظ ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا رسول اپنی قوم میں ایسے ہوتا ہے جیسے جسم میں روح ہوتی ہے۔ اور جب وہ ہجرت کر جاتا ہے تو یہ جسد بے روح ہو جاتا ہے۔ تو جس طرح جسدِ بے روح کو دیر تک گھر میں نہیں رکھا جا سکتا بلکہ اسے جلد ہی قبرستان میں دفن کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اسی طرح اہلِ مکہ سے کہا جا رہا ہے کہ تم نے اگر نبی کریم ﷺ کو یہاں سے نکلنے پر مجبور کیا تو تم اپنے آپ کو درحقیقت غیر محفوظ کر لو گے۔ تمہارا وجود بے روح ہو کر رہ جائے گا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جیسے ہی آنحضرت ﷺ نے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی تو ایک سال کے بعد ہی بدر کے میدان میں مشرکینِ مکہ کی صفِ اول کی قیادت قتل ہو گئی اور دوسری صف گرفتار ہو گئی۔ اور جنگِ خندق میں عرب بھر سے ان کا رعب و دبدبہ اٹھ گیا اور 8 سال کے عرصہ کے بعد جو کہ قوموں کی زندگی میں نہایت ناقابلِ ذکر عرصہ ہے مکہ فتح ہو گیا اور ایک ہی سال کے بعد مشرکینِ عرب کو عرب سے نکل جانے کا نوٹس دے دیا گیا۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ کی زندگی کے آخری دنوں میں پورا جزیرۂ عرب مکمل طور پر کفر اور شرک سے پاک ہو گیا۔ حضور ؐ ابھی مکے میں تھے جب یہ سورت

Marfat.com

نازل ہوئی ہے اور اس وقت یہ پیشگوئی کی گئی کہ حضورؐ کے یہاں سے تشریف لے جانے کے بعد یہ لوگ مکہ میں زیادہ عرصہ تک ٹھہر نہیں سکیں گے۔یعنی انھیں نکال دیا جائے گا۔تو اس وحی کے نزول سے نو دس سال میں اس پیشگوئی کی صداقت کو ہر شخص نے اپنی سر کی آنکھوں سے دیکھ لیا۔

سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيْلًا ﴿٧٧﴾

(یہی ہمارا قانون ہے ان کے بارے میں جنھیں ہم نے آپؐ سے پہلے رسول بنا کر بھیجا اور آپؐ ہمارے قانون میں کوئی تبدیلی نہیں پائیں گے۔ ۷۷) (سورۃ بنیٓ اسرآءیل : ۷۷)

پروردگار فرماتے ہیں، ہم نے گزشتہ آیت کریمہ میں جو کچھ کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے رسول کے ہجرت کر جانے کے بعد ان کی قوم بھی اپنے شہر یا اپنے ملک میں زیادہ دیر تک سکون سے نہیں رہ سکتی۔ اللہ تعالیٰ کی پکڑ ضرور آتی ہے یا اہلِ ایمان کی تلوار ان کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی ایک ایسی سنت اور قانون ہے جسے کبھی بدلتا نہیں دیکھو گے۔ تاریخ بھی اس پر شاہد ہے اور نبی کریم ﷺ کی سیرت بھی اسی کی گواہی دیتی ہے۔

اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ
الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ؕ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ
مَشْهُوْدًا ﴿٧٨﴾ وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ
رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ﴿٧٩﴾ وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِىْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّ
اَخْرِجْنِىْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّىْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا ﴿٨٠﴾
وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ؕ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ﴿٨١﴾
وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَلَا يَزِيْدُ
الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا ﴿٨٢﴾ وَاِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَ
نَاٰ بِجَانِبِهٖ ۚ وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يَـُٔوْسًا ﴿٨٣﴾ قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى
شَاكِلَتِهٖ ؕ فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا ﴿٨٤﴾

Marfat.com

رکوع: ۹۔ (نماز کا اہتمام کیجئے زوالِ آفتاب کے اوقات سے لے کر رات کے تاریک ہونے تک (نیز ادا کیجئے) فجر کی نماز، بیشک فجر کی نماز کا مشاہدہ کیا جاتا ہے۔ ۷۸) اور شب میں بھی تہجد پڑھو، یہ آپؐ کے لیے زائد ہے، توقع رکھئے کہ اللہ تعالیٰ آپؐ کو مقامِ محمود پر فائز کرے گا۔ ۷۹) اور دعا کیجئے! اے میرے رب، داخل کر مجھے عزت اور سچائی کا داخل کرنا، اور مجھے نکال عزت اور سچائی کا نکالنا، اور عطا کر مجھے اپنے پاس سے، اقتدار مدد کرنے والا۔ ۸۰) اور آپؐ اعلان کر دیجیے کہ حق آ گیا اور باطل مٹ گیا، او باطل تھا ہی مٹنے والا۔ ۸۱) (ہم قرآن میں سے جو اتارتے ہیں وہ ایمان والوں کے لیے شفا اور رحمت ہے اور ظالموں میں یہ اضافہ نہیں کرتا، مگر خسارے میں۔ ۸۲) اور جب ہم انسان پر اپنا انعام کرتے ہیں تو وہ اعراض کرتا اور پہلو بدل لیتا ہے۔ اور جب اس کو مصیبت پہنچتی ہے تو مایوس ہو جاتا ہے۔ ۸۳) کہہ دیجیے! ہر شخص اپنی روش پر کام کرتا ہے، پس تمھارا رب ہی بہتر جانتا ہے کہ کون زیادہ سیدھی راہ پر (گامزن) ہے۔ ۸۴)

اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ؕ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا ﴿۷۸﴾

(نماز کا اہتمام کیجئے زوالِ آفتاب کے اوقات سے لے کر رات کے تاریک ہونے تک (نیز ادا کیجئے) فجر کی نماز، بیشک فجر کی نماز کا مشاہدہ کیا جاتا ہے۔ ۷۸) (سورۃ بنیٓ اسرآءیل : ۷۸)

نماز کا حکم دینے کی وجہ

گزشتہ رکوع کی آخری آیات میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نہایت ناگفتہ بہ حالات سے گزر رہے تھے۔ مسلمانوں کی اکثریت حبشہ کی طرف ہجرت کر چکی تھی۔ کچھ لوگ مدینہ منورہ میں سکونت پذیر ہو چکے تھے۔ آنحضرت ﷺ کے ساتھ مسلمانوں کی نہایت مختصر تعداد مکہ معظمہ میں باقی تھی۔ اور دوسری طرف حال یہ تھا کہ قریشِ مکہ شب و روز منصوبے بنا رہے تھے اور کوئی نہ کوئی آخری اقدام کرنے کی فکر میں تھے۔ آنحضرت ﷺ کی زندگی سخت خطرے میں تھی۔ مکے والوں کا رویہ دیکھ کر آپؐ نے طائف کا رخ کیا کہ شاید وہاں اللہ تعالیٰ کے دین کے لیے کچھ انصار میسر آ جائیں، لیکن وہاں جو صورتحال پیش آئی، تاریخ کا ہر طالب علم آج تک اس سے تکلیف محسوس کر رہا ہے۔ حضورؐ مکہ معظمہ تشریف لائے تو حالات پہلے سے بھی زیادہ دگرگوں تھے۔ پروردگار نے گزشتہ آیات میں آپؐ کو تسلی بھی دی اور قریشِ مکہ کو وارننگ بھی۔ اس آیتِ کریمہ میں ایسے ناگفتہ بہ حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے آپؐ کو نماز کے اہتمام کا حکم دیا جا رہا ہے کیونکہ اس سے پہلے بھی ہمیں اسی کتابِ مقدس میں بتایا گیا ہے کہ مشکل سے مشکل حالات میں ایک مومن کے لیے ضروری ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ ہی سے مدد طلب کرے، کیونکہ بگڑے ہوئے انسانوں کی اکثریت سے محفوظ رکھنے والا اس کے سوا اور کوئی نہیں۔ اور اس سے مدد مانگنے کا سب سے اہم ذریعہ یہ ہے کہ رات کی تنہائیوں میں اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی بے بسی کا اظہار کیا جائے اور کافروں کے ناپاک ارادوں کو ناکام کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کی جائے۔ چنانچہ مدد طلب کرنے اور استعانت کا سب سے مجرب نسخہ جو قرآنِ کریم بار بار ذکر کرتا ہے اور یہاں بھی اسی کا حکم دیا گیا ہے، وہ نماز ہے۔ کیونکہ نماز ایک ایسی عبادت ہے جس میں کمزور سے کمزور انسان اللہ تعالیٰ کی کبریائی سے اپنا تعلق جوڑ لیتا ہے۔ وہ اپنی ذات میں قطرہ ہو کر سمندر کا حصہ بن جاتا ہے۔ نماز کا قیام اس کے اندر اولوالعزمی پیدا کرتا ہے۔ نماز کا رکوع صرف ایک ذات کے سامنے جھکنا سکھاتا ہے اور قومہ ساری دنیا کے سامنے تن جانے کی تعلیم دیتا ہے۔ اور سجود اور قعود عبودیت کا سارا اثاثہ اللہ تعالیٰ کے حضور ڈھیر کر کے قربانی و ایثار کا پیکر بن جانا سکھاتا ہے۔ اس طرح سے دل و دماغ میں ایک آسودگی اور دنیا کی قوتوں کی طرف سے بے نیازی اور اللہ تعالیٰ پر بے پناہ اعتماد اور توکل کی کیفیت پیدا ہوتی ہے کہ پھر ہر طرح کی مخالفتیں اس کے سامنے پتلیوں کا تماشا معلوم ہوتی ہیں۔

Marfat.com

نمازوں کی فرضیت

مشہور روایات کے مطابق یہ سورت معراج شریف کے بعد نازل ہوئی ہے اور روایات میں ہم یہ بات پڑھ چکے ہیں کہ معراج ہی کے سفر میں پانچ نمازیں مسلمانوں پر فرض کی گئیں۔ پہلے پچاس نمازوں کا حکم دیا گیا، پھر آنحضرت ﷺ کی بار بار کی گزارش پر پچاس کی بجائے پانچ رہ گئیں لیکن ساتھ ہی فرمایا مَا یُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَیَّ میرے یہاں حکم تبدیل نہیں کیا جاتا، پچاس نمازیں پچاس ہی رہیں گی، البتہ ہم نے یہ قانون بنالیا ہے کہ اس امت کے لوگوں کی ہر نیکی دس گناہ اجر پائے گی۔ اس اصول کے مطابق ایک نماز دس نمازوں کے برابر ہوگی۔ مسلمان پانچ نمازیں پڑھیں گے لیکن ہمارے یہاں اسے پچاس لکھا جائے گا۔ چنانچہ اس آیتِ کریمہ میں معلوم ہوتا ہے کہ انھیں پانچ نمازوں کے اوقات کی طرف اشارہ فرمایا گیا۔ اگر ہمارے سامنے نمازوں کے اوقات اور دوسرے احکام سے متعلق تفصیلات نہ ہوتیں تو ممکن ہے ہمارے لیے ان اشاروں سے نماز کے اوقات کا تعین مشکل ہوتا، لیکن اب جبکہ ہم پانچ نمازوں کی تفصیلات سے واقف ہیں تو ہم ان اشاروں کو سمجھ سکتے ہیں۔ چنانچہ علمانے اس کی تصریح کرتے ہوئے فرمایا کہ اس آیت میں دلوکِ شمس کے وقت نماز قائم کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے جب ہم الفاظ پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ''لام'' یہاں ''علیٰ'' کے معنی میں ہے جس کا معنی ہے ''پر''۔ اور ''دلوک'' زوال کو بھی کہتے ہیں اور غروب کو بھی۔ لیکن یہاں زوال کے معنی میں ہے۔ اس لحاظ سے آیت کا معنی ہوگا نماز قائم کیجیے، زوالِ شمس پر یعنی زوالِ شمس کے اوقات میں۔ چنانچہ جب ہم زوالِ شمس کو دیکھتے ہیں تو ہمیں اس کے زوال کے تین مدارج معلوم ہوتے ہیں۔ چنانچہ جب اس کا زوال شروع ہوتا ہے اس وقت تو وہ بالکل سروں پر ہوتا ہے۔ اس طرح سے پہلے زوال کو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ وہ وقت ہے جب سورج سمتِ راس سے مغرب کی طرف اترتا ہے۔ پھر وہ آہستہ آہستہ نگاہوں کے محاذات پر آجاتا ہے یعنی آنکھوں کی بالکل سیدھ میں۔ چنانچہ دوسرا زوال اس کا یہاں سے شروع ہوتا ہے، یہاں سے ڈھلتے ڈھلتے جب وہ افق کے کنارے پر پہنچتا ہے تو تیسرا زوال اس کا غروب کی شکل اختیار کر جاتا ہے۔ چنانچہ ان اوقات میں نماز قائم کرنے کا حکم دیا گیا ہے، تو مراد اس سے ظہر، عصر اور مغرب تین نمازیں ہیں۔ پہلے زوال سے ظہر کا وقت شروع ہوتا ہے، دوسرے سے عصر کا اور تیسرے کے بعد مغرب کا وقت ہو جاتا ہے۔

''غسق'' عربی زبان میں اندھیرے کے گہرا ہو جانے کو کہتے ہیں۔ غروبِ آفتاب کے بعد افق پر سرخی چھا جاتی ہے، پھر آہستہ آہستہ یہ سرخی سفیدی میں تبدیل ہو جاتی ہے، پھر سفیدی کی جگہ تاریکی لے لیتی ہے اور تاریکی جب گہری ہو جاتی ہے تو ہر طرف اندھیرا چھا جاتا ہے۔ یہ وہ وقت ہے جسے ہم عشاء کا وقت کہتے ہیں۔ اس طرح سے اس آیت کے پہلے حصے میں چار نمازوں کا ذکر فرمایا گیا ہے۔

وقرآن الفجر: قرآن کے لفظ کو اگر قرأ سے مصدر سمجھا جائے تو پھر اس کا معنی ہوگا، صبح کی نماز میں قرآنِ کریم کی تلاوت۔ اس سے شاید صبح کی نماز میں قرآن کی تلاوت کا خاص اہتمام کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور آنحضرت ﷺ کی سنت سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ فجر کی نماز میں خصوصی طور پر طویل سورتیں تلاوت فرمایا کرتے تھے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ قرآن سے نماز مراد لی جائے، کیونکہ قرآنِ کریم کا اسلوب یہ ہے کہ وہ کبھی نماز کے لیے صلوٰۃ کا لفظ استعمال کرتا ہے اور کبھی اس کے کسی اہم رکن کا ذکر کر کے نماز مراد لیتا ہے۔ کبھی قیام سے، کبھی رکوع سے، کبھی قرآنِ کریم کی تلاوت سے اور کبھی سجدے سے نماز مراد لی گئی ہے۔ اس طرح سے صبح کی نماز کی خاص اہمیت کا اظہار ہوتا ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ کَانَ مَشْهُوْدًا بیشک فجر کی نماز یا فجر کی تلاوت بڑی حضوری کی چیز ہے، یہ وہ وقت ہے جب دل و دماغ اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے یکسو ہوتے ہیں۔ اور دوسرا ترجمہ یہ ہے کہ فجر کی نماز کی گواہی دی گئی ہے یا اس کا مشاہدہ کیا جاتا ہے۔ مفہوم دونوں کا یہ ہے کہ جیسا احادیثِ مبارکہ میں وارد ہوا ہے کہ فجر کی نماز میں رات اور دن کے فرشتے حاضر ہوتے ہیں۔ رات کی ڈیوٹی ختم ہوتی ہے اور دن کی ڈیوٹی شروع ہو رہی ہوتی ہے۔ نماز میں دونوں کو جمع ہونے کا موقع ملتا ہے۔ اس لحاظ سے وہ نہایت خوشی اور مسرت سے مسلمانوں کے اجتماع کا مشاہدہ بھی کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے یہاں ان کی ذکر اللہ میں مشغولیت کی گواہی بھی دیتے ہیں۔

Marfat.com

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اس امت پر جو پانچ وقت کی نمازیں فرض فرمائی ہیں اس آیتِ کریمہ میں ان کے اوقات کی طرف اشارے فرمائے گئے۔ ظاہر ہے کہ اشاروں کی یہ زبان امت کی ضرورت کے لیے کافی نہ ہوسکتی تھی اس لیے پروردگار نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو آنحضرت ﷺ کے پاس بھیجا اور انھوں نے احادیث کی گواہی کے مطابق دو دن مسلسل بیت اللہ کے سامنے آنحضرت ﷺ کو تمام نمازیں پڑھائیں۔ پہلے دن تمام نمازیں اول وقت میں پڑھی گئیں اور دوسرے روز آخر وقت میں۔ اور پھر پلٹ کر حضرت جبرائیل علیہ السلام نے آنحضرت ﷺ سے کہا کہ یہ ہیں تمام انبیائے کرام کے نمازوں کے اوقات۔ آپؐ ان اوقات کے درمیان کے اوقات میں نمازیں پڑھیں۔ امت کے لیے بھی مسنون اوقات ہیں اور اس کی مزید تفصیلات آنحضرت ﷺ کے ارشادات میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

اوقاتِ صلوٰۃ کے تعین میں حکمت

ان اوقات میں سب سے زیادہ دو باتیں توجہ طلب ہیں۔ پہلی بات یہ کہ سورج کے معمولات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ سورج شب و روز کے تمام اوقات میں قیام، رکوع اور سجود میں رہتا ہے۔ اسی طرح وہ تمام چیزیں جن پر سورج کا عکس پڑتا ہے وہ بھی اس کے ساتھ ساتھ اپنے رب کے آگے برابر قیام، رکوع اور سجود میں رہتی ہیں۔ چنانچہ قرآنِ کریم کی بعض آیات میں بتایا گیا ہے کہ کوئی چیز ایسی نہیں جو اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا نہ کرتی ہو۔ اور مزید یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جو کچھ آسمان و زمین میں ہے وہ اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرتا ہے۔ حتیٰ کہ ہر وجود کا سایہ بھی صبح و شام اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ ریز ہوتا ہے۔ اس طرح سے انسان کو توجہ دلائی گئی ہے کہ تم بڑی بڑی قوتوں کے سامنے جھکتے ہو حالانکہ کائنات کی تمام چھوٹی بڑی چیزیں اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکتی اور سجدہ ریز ہوتی ہیں۔

نمازوں کے اوقات کو دیکھ کر یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نمازوں کے یہ اوقات مقرر کرنے میں ایک مصلحت شاید یہ بھی ہے کہ آفتاب پرستوں کے اوقاتِ عبادت سے اجتناب کیا جائے۔ آفتاب ہر زمانے میں مشرکین کا سب سے بڑا یا بہت بڑا معبود رہا ہے اور اس کے طلوع و غروب کے اوقات خاص طور پر ان کے اوقاتِ عبادت رہے ہیں۔ اس لیے ان اوقات میں تو نماز پڑھنا حرام کردیا گیا۔ اس کے علاوہ آفتاب کی پرستش زیادہ تر اس کے عروج کے اوقات میں کی جاتی رہی ہے۔ لہٰذا اسلام میں حکم دیا گیا کہ تم دن کی نمازیں زوالِ آفتاب کے بعد پڑھنی شروع کرو اور صبح کی نماز طلوعِ آفتاب سے پہلے پڑھ لیا کرو۔ اس طرح سے نماز کے ساتھ ساتھ اس کے اوقات بھی توحید کی نہ صرف تعلیم دیتے ہیں بلکہ اس کا علی الاعلان اظہار بھی ہیں۔

وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ﴿۷۹﴾

(اور شب میں بھی تہجد پڑھو، یہ آپؐ کے لیے زائد ہے، توقع رکھئے کہ اللہ تعالیٰ آپؐ کو مقامِ محمود پر فائز کرے گا۔ ۷۹) (سورۃ بنیٓ اسرآءیل : ۷۹)

ہم اس آیت کے پہلے حصے کی تشریح معارف القرآن سے نقل کرتے ہیں۔

تہجد کا معنی

وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ: لفظ تہجد ہجود سے مشتق ہے اور یہ لفظ دو متضاد معنی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس کے معنی سونے کے بھی آتے ہیں اور جاگنے بیدار ہونے کے بھی، اس جگہ وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ کے معنی یہ ہیں کہ رات کے کچھ حصہ میں قرآن کے ساتھ بیدار رہا کرو کیونکہ بِهٖ کی ضمیر قرآن کی طرف راجع ہے۔ (مظہری)

قرآن کے ساتھ بیدار رہنے کا مطلب نماز ادا کرنا ہے۔ اسی رات کی نماز کو اصطلاحِ شرع میں نمازِ تہجد کہا جاتا ہے اور عموماً اس کا یہ مفہوم لیا گیا ہے کہ کچھ دیر سو کر اٹھنے کے بعد جو نماز پڑھی جائے وہ نمازِ تہجد ہے، لیکن تفسیر مظہری میں ہے

Marfat.com

کہ مفہوم اس آیت کا اتنا ہے کہ رات کے کچھ حصے میں نماز کے لیے سونے کو ترک کر دو اور یہ مفہوم جس طرح کچھ دیر سونے کے بعد جاگ کر نماز پڑھنے پر صادق آتا ہے اسی طرح شروع ہی میں نماز کے لیے نیند کو مؤخر کر کے نماز پڑھنے پر بھی صادق آتا ہے۔ اس لیے نماز تہجد کے لیے پہلے نیند ہونے کی شرح قرآن کا مدلول نہیں پھر بعض روایات حدیث سے بھی تہجد کے اسی عام معنی پر استدلال کیا ہے۔

اور امام ابن کثیر نے حضرت حسن بصریؒ سے نماز تہجد کی جو تعریف نقل کی ہے وہ بھی اسی عموم پر شاہد ہے اس کے الفاظ یہ ہیں۔

قال الحسن البصری هوما کان بعدالعشاء و یحمل علیٰ مکان بعدالنوم (ابن کثیر)

(حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ نماز تہجد ہر اس نماز پر صادق ہے جو عشاء کے بعد پڑھی جائے البتہ تعامل کی وجہ سے اس کو کچھ نیند کے بعد پر محمول کیا جائے گا۔)

اس کا حاصل یہ ہے کہ نماز تہجد کے اصل مفہوم میں بعدالنوم ہونا شرط نہیں اور الفاظ قرآن میں بھی یہ شرط موجود نہیں لیکن عموماً تعامل رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرامؓ کا یہی رہا ہے کہ نماز آخر رات میں بیدار ہو کر پڑھتے تھے اس لیے اس کی افضل صورت یہی ہوگی۔

نماز تہجد فرض ہے یا نفل

نَافِلَةً لَّکَ لفظ نفل اور نافلہ کے لغوی معنی زائد کے ہیں۔ اسی لیے اس نماز اور صدقہ خیرات وغیرہ کو نفل کہتے ہیں جو شرعاً واجب اور ضروری نہ ہو جس کے کرنے میں ثواب ہے اور نہ کرنے میں نہ کوئی گناہ ہے اور نہ کسی قسم کی برائی، اس آیت میں نماز تہجد کے ساتھ نَافِلَةً لَّکَ کے الفاظ سے ظاہراً یہ سمجھا جاتا ہے کہ نماز تہجد خصوصیت کے ساتھ آنحضرت ﷺ کے لیے نفل ہے حالانکہ اس کے نفل ہونے میں آنحضرت ﷺ اور پوری امت سب ہی شریک ہیں۔ اسی لیے بعض حضرات مفسرین نے اس جگہ نافلہ کو فریضہ کی صفت قرار دے کر معنی یہ قرار دیے ہیں کہ عام امت پر تو صرف پانچ وقت کی نمازیں فرض ہیں مگر رسول اللہ ﷺ پر تہجد بھی ایک زائد فرض ہے تو یہاں لفظ نافلہ بمعنی فرض زائد کے ہے نفل کے عام معنی میں نہیں۔

اور تحقیق صحیح اس معاملہ کی یہ ہے کہ ابتداء اسلام میں جب سورۂ مزمل نازل ہوئی تو اس وقت پانچ نمازیں تو فرض ہوئی نہ تھیں صرف تہجد کی نماز سب پر فرض تھی اسی فرض کا ذکر سورۂ مزمل میں ہے۔ پھر شب معراج پانچ نمازیں فرض کر دی گئیں تو تہجد کی فرضیت عام امت سے تو باتفاق منسوخ ہو گئی اور اس میں اختلاف رہا کہ آنحضرت ﷺ سے بھی اس کی فرضیت منسوخ ہوئی یا یہ خصوصی طور پر آپؐ کے ذمہ فرض رہا اور اس آیت میں نَافِلَةً لَّکَ کے یہی معنی ہیں کہ نماز تہجد آپؐ کے ذمہ ایک زائد فرض ہے مگر تفسیر قرطبی میں ہے کہ یہ کئی وجہ سے صحیح نہیں اول یہ کہ فرض کو نفل سے تعبیر کرنے کی کوئی وجہ نہیں اگر کہا جائے کہ مجاز ہے تو یہ ایک ایسا مجاز ہوگا جس کی کوئی حقیقت نہیں۔ دوسرے احادیث صحیحہ میں صرف پانچ نمازوں کے تعین کے ساتھ فرض ہونے کا ذکر ہے اور ایک حدیث میں اس کے آخر میں یہ بھی مذکور ہے کہ شب معراج میں جو اول پچاس نمازیں فرض کی گئی تھیں پھر تخفیف کر کے پانچ کر دی گئیں تو اگر چہ عدد گھٹا دیا گیا مگر ثواب پچاس ہی کا ملے گا اور پھر فرمایا لَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَیَّ یعنی میرا قول بدلا نہیں کرتا جب پچاس کا حکم دیا تھا تو ثواب پچاس ہی کا دیا جائے گا اگر چہ عمل میں کمی کر دی گئی۔

Marfat.com

ان روایات کا حاصل یہی ہے کہ عام امت اور خود رسول اللہ ﷺ پر پانچ نمازوں کے سوا کوئی اور نماز فرض نہیں ہے۔ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ نَـافِلَـہ کا لفظ اگر اس جگہ فریضہ زائد کے معنی میں ہوتا تو اس کے بعد لفظ لَکَ کے بجائے عَلَیْکَ ہونا چاہیے تھا جو وجوب پر دلالت کرتا ہے لفظ لک تو صرف جواز اور اجازت کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

اسی طرح تفسیر مظہری میں صحیح اسی کو قرار دیا ہے کہ جب تہجد کی فرضیت امت سے منسوخ ہوئی تو رسول اللہ ﷺ سے بھی منسوخ ہوگئی اور سب کے لیے نفل رہے گا مگر اس صورت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر اس میں آنحضرت ﷺ کی خصوصیت کیا ہے۔ نفل ہونا تو سب ہی کے لیے ثابت ہے پھر نَـافِلَةً لَکَ فرمانے کا کیا حاصل ہوگا۔ جواب یہ ہے کہ حسب تصریح احادیث تمام امت کی نوافل اور تمام نفلی عبادات ان کے گناہوں کا کفارہ اور فرض نمازوں میں جو کوتاہی کی رہ جائے اس کی تکمیل کا کام دیتی ہیں مگر رسول اللہ ﷺ گناہوں سے بھی معصوم ہیں اور نماز کے آداب میں کوتاہی سے بھی، اس لیے آپؐ کے حق میں نفلی عبادت بالکل زائد ہی ہے جو کسی کوتاہی کا تدارک نہیں بلکہ محض زیادت تقرب کا ذریعہ ہے۔ (قرطبی ومظہری)

نماز تہجد نفل ہے یا سنت موکدہ

سنت موکدہ کے لیے جو عام ضابطہ فقہا کا ہے کہ جس کام پر رسول اللہ ﷺ نے عملاً مداومت فرمائی ہو اور بلا مجبوری کے نہ چھوڑا ہو وہ سنت موکدہ ہے بجز اس کے کہ کسی دلیل شرعی سے یہ ثابت ہو جائے کہ یہ کام آنحضرت ﷺ کے لیے مخصوص تھا عام امت کے لیے نہیں تھا۔ اس ضابطہ کا تقاضا بظاہر یہی ہے کہ نماز تہجد بھی سب کے لیے سنت موکدہ قرار پائے نہ کہ صرف نفل کیونکہ اس نماز پر رسول اللہ ﷺ کی مداومت سنت متواترہ سے ثابت ہے اور خصوصیت کی کوئی دلیل نہیں۔ اس لیے عام امت کے لیے بھی سنت موکدہ ہونا چاہیے۔ تفسیر مظہری میں اسی کو مختار اور راجح قرار دیا ہے اور اس کے موکد ہونے پر حضرت ابن مسعودؓ کی اس حدیث سے بھی استدلال کیا ہے جس میں آنحضرت ﷺ نے اس شخص کے بارمیں جو پہلے تہجد پڑھا کرتا تھا یہ ارشاد فرمایا کہ ''اس کے کان میں شیطان نے پیشاب کر دیا ہے'' اس طرح کی وعید اور تنبیہ صرف نفل میں نہیں ہوسکتی۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ سنت موکدہ ہے۔

اور جن حضرات نے تہجد کو صرف نفل قرار دیا ہے وہ اس مواظبت اور مداومت کو آنحضرت ﷺ کی خصوصیت قرار دیتے ہیں اور تہجد پڑھنے والے کے ترک تہجد پر جو زجر کے الفاظ ارشاد فرمائے وہ دراصل مطلقاً ترک پر نہیں بلکہ اول عادت ڈالنے کے بعد ترک کرنے پر ہیں کیونکہ آدمی جس نفل کی عادت ڈال لے باتفاق امت اس کو چاہیے کہ اس پر مداومت کرے۔ اگر عادت ڈالنے کے بعد چھوڑے گا تو قابل ملامت ہوگا کیونکہ عادت کے بعد بلا عذر ترک ایک قسم کے اعراض کی علامت ہے اور جو شروع سے عادی نہ ہو تو اس پر کوئی ملامت نہیں۔ واللہ اعلم۔

تہجد کی تعداد رکعات

صحیح بخاری ومسلم میں حضرت صدیقہ عائشہؓ کی روایت یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ رمضان یا غیر رمضان میں کبھی گیارہ رکعات سے زیادہ نہ پڑھتے تھے۔ ان گیارہ رکعات میں حنفیہ کے نزدیک تین رکعتیں وتر کی ہوتی تھیں باقی آٹھ تہجد کی۔

اور صحیح مسلم کی ایک روایت میں صدیقہ عائشہؓ کے یہ الفاظ منقول ہیں کہ رسول اللہ ﷺ رات میں تیرہ رکعتیں پڑھتے تھے جن میں وتر کی بھی شامل ہیں اور دو رکعتیں سنت فجر کی بھی۔ (مظہری)

Marfat.com

سنت فجر کو رات کی نماز میں بوجہ رمضان کے شمار کر لیا ہے۔ ان روایات سے معلوم ہوا کہ عام عادت رسول اللہ ﷺ کی یہ تھی کہ تہجد کی نماز میں آٹھ رکعات ادا فرماتے تھے۔ لیکن صدیقہ عائشہؓ ہی کی ایک روایت سے یہ بھی ثابت ہے کہ کبھی کبھی اس تعداد سے کم چار یا چھ رکعات پر بھی اکتفا فرمایا ہے جیسا کہ صحیح بخاری میں آپؐ سے یہ منقول ہے کہ حضرت مسروقؒ نے صدیقہؓ سے تہجد کی نماز کے متعلق دریافت کیا تو فرمایا کہ سات، نو اور گیارہ رکعات ہوتی تھیں۔ علاوہ سنت فجر کے (مظہری عن البخاری) حنفیہ کے قاعدہ کے مطابق تین رکعت وتر کی ہوئیں تو سات میں سے چار، نو میں سے چھ، گیارہ میں سے آٹھ تہجد کی رکعتیں رہ جاتی ہیں۔

نمازِ تہجد کی کیفیت

جو عام روایات حدیث سے ثابت ہے، وہ یہ ہے کہ ابتدا میں دو رکعت ہلکی مختصر قرأت کے ساتھ پھر باقی رکعات میں قرأت بھی طویل اور رکوع سجدہ بھی طویل ہوتا اور یہ طول بسا اوقات بہت زیادہ ہو جاتا تھا۔ کبھی کچھ کم (یہ خلاصہ ان روایات حدیث کا ہے جو اس جگہ تفسیر مظہری میں نقل کی گئی ہیں۔)

عَسٰی کا مفہوم

عَسٰٓی اَنْ یَّبْعَثَکَ رَبُّکَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا: عَسٰی کا لفظ عموماً امید و رجا، توقع اور ظنِ غالب کے اظہار کے لیے آتا ہے، لیکن جب اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اہلِ علم نے اس کا ترجمہ دو طرح سے کیا ہے۔ ایک یہ کہ اس کا معنی امید و رجا کی بجائے یقین ہو جاتا ہے۔ ''البرہان'' میں ہے عسیٰ ولعل من اللہ تعالیٰ واجبتان ترجمے کی دوسری صورت یہ ہے کہ عسیٰ کا تعلق جب اللہ تعالیٰ سے ہوتا ہے تو اس صورت میں امید و رجا کا تعلق اللہ تعالیٰ کی بجائے مخاطب یا متکلم سے ہو جاتا ہے۔ مثلاً عسیٰ ربکم ان یرحمکم اس کا ترجمہ ہوگا ''تم توقع رکھو کہ اللہ تعالیٰ تم پر رحم فرمائے گا۔'' پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں بھی یہ معنی نہیں ہے کہ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں مقامِ محمود پر کھڑا کرے گا بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ آپؐ امید رکھیں یا یقیناً اللہ تعالیٰ آپؐ کو مقامِ محمود پر فائز کرے گا۔ اس وضاحت سے یہ اشکال ختم ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نسبت سے امید یا توقع کا لفظ استعمال کرنا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے، کیونکہ وہ تو ہر بات کو جانتا ہے اور اس کے نزدیک ہر چیز معلوم اور معین ہے، تو ہم نے یہ بات واضح کر دی کہ ایسے مواقع پر عسیٰ کا تعلق اللہ تعالیٰ سے نہیں بلکہ بندوں سے ہوتا ہے اور یا پھر اس کا معنی امید و رجا نہیں بلکہ یقین ہوتا ہے۔

آنحضرت ﷺ کو تسلی اور مقامِ محمود کا وعدہ

نبی کریم ﷺ کو نماز کا حکم دے کر دراصل یہ بتلانا مقصود ہے کہ آپؐ جس طرح کے ناگفتہ بہ حالات سے گزر رہے ہیں وہ یقیناً نہایت اذیت ناک ہیں، لیکن ہم آپؐ کو یقین دلاتے ہیں کہ یہ حالات ہمیشہ نہیں رہیں گے، وہ وقت دور نہیں کہ یہ لوگ جنھیں آپؐ کی عزت گوارا نہیں اور آپؐ کی ہر طرح کی توہین پر انہیں قلبی مسرت ہوتی ہے، یہ آپؐ کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے ہوں گے اور آپؐ کی تعریف میں رطب اللسان ہو کر آپؐ سے جان کی امان مانگ رہے ہوں گے۔ اور بہت جلد وہ وقت آئے گا کہ عرب کے گوشے گوشے میں اذانوں میں آپؐ کا نام گونجے گا اور ہر کلمہ گو آپؐ پر درود و سلام بھیجے گا۔ اور جہاں تک آخرت کا تعلق ہے، وہاں آپؐ کو وہ مقام عطا فرمایا جائے گا، جسے مقامِ محمود کہا گیا ہے اور جو کسی اور پیغمبرؑ کو عطا نہیں کیا جائے گا۔ اس کی وضاحت فرماتے ہوئے خود آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: ھذا المقام الذی اشفع فیہ لامتی ''یہ وہ مقام ہے جس میں، میں اپنی امت کے لیے شفاعت کروں گا۔'' دنیا میں بھی آپؐ امت کے حال پر کس قدر مہربان تھے اور کس قدر ان کی عاقبت کا خیال رہتا تھا، اس سے روایات بھری پڑی ہیں۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ حضورؐ اپنی امت کی عاقبت سے متفکر ہو کر بے ساختہ روئے اور اللہ تعالیٰ سے امت کی مغفرت کی دعائیں مانگیں۔ اور بعض روایات میں (اگرچہ ان کی سند کمزور ہے) یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر آپؐ کو تسلی بھی دی اور امت کے بارے میں آپؐ کو راضی کرنے کا وعدہ بھی فرمایا۔

Marfat.com

مقامِ محمود صرف امت کے کام آنے کی جگہ نہیں بلکہ یہ وہ مقام ہے جہاں آپ ساری امتوں کی دستگیری فرمائیں گے۔احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ روزِ حشر جب ہر دل پر خوف و ہراس طاری ہوگا اور جلالِ خداوندی کے سامنے کسی کو دم مارنے کی مجال نہ ہوگی۔تمام انبیائے کرام نفسی نفسی پکارتے ہوں گے۔تمام امتیں حساب کے انتظار میں نہایت بے بسی کے ساتھ لرزاں اور ترساں کھڑی ہوں گی۔آخر کچھ لوگ ہمت کریں گے اور حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام تک کی خدمت میں حاضر ہو کر درخواست کریں گے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے حساب کتاب شروع کرنے کی التجا کریں، لیکن کہیں شنوائی نہیں ہوگی۔آخر کار حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس پہنچیں گے اور ان سے شفاعت کی التجا کریں گے۔آپ جواب دیں گے کہ میں خود تو آج لب کشائی کی جسارت نہیں کرسکتا، تم محمد (ﷺ) کے پاس جاؤ، مجھے امید ہے کہ وہاں تمھاری التجا سنی جائے گی۔چنانچہ لوگ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوں گے اور اپنی داستانِ غم پیش کریں گے۔آنحضرت ﷺ سن کر فرمائیں گے، انـا لهـا انـا لهـا ''ہاں، میں اس کے لیے ہوں۔'' آپ عرشِ عظیم کی طرف بڑھیں گے اور قریب پہنچ کر سر سجدہ میں رکھ دیں گے۔آپ فرماتے ہیں کہ اس وقت میں نہیں جانتا کہ میں اس وقت سجدہ میں اللہ تعالیٰ کو کن پیارے ناموں سے یاد کروں گا اور کن الفاظ میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کروں گا۔دیر تک سجدہ ریز رہنے کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے آواز آئے گی، یا محمد (ﷺ) **ارفع راسک قل تسمع اسئل تعط اشفع تشفع** ''اے محمد (ﷺ) اپنا سر اٹھائیے، کہیے، تمھاری بات سنی جائے گی، مانگیے، آپ کو دیا جائے گا، شفاعت کیجیے، آپ کی شفاعت قبول کی جائے گی۔'' اس طرح آپ تمام امتوں کی شفاعت فرمائیں گے اور آپ کی کرم فرمائی سے اللہ تعالیٰ کی رحمتِ بے پایاں کا دروازہ کھل جائے گا۔

قاضی عیاضؒ نے اپنی مشہور کتاب ''کتاب الشفا'' میں لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ پانچ شفاعتیں فرمائیں گے۔

1- شفاعتِ عامہ، جس سے مومن اور کافر، اپنے اور بیگانے سب فائدہ اٹھائیں گے۔
2- بعض خوش نصیبوں کے لیے بغیر حساب کے جنت میں داخل کرنے کی شفاعت فرمائیں گے۔
3- وہ موحد جو اپنے گناہوں کے باعث عذابِ دوزخ کے مستحق قرار پا جائیں گے، حضورؐ کی شفاعت سے بخش دیے جائیں گے۔
4- وہ گنہگار جنھیں دوزخ میں پھینک دیا جائے گا، حضورؐ شفاعت فرما کر ان کو وہاں سے نکالیں گے۔
5- اہلِ جنت کے مدارج میں ترقی کے لیے سفارش فرمائیں گے۔

حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: **انا سید ولد آدم یوم القیامة ولا فخر وبیدی لواء الحمد ولا فخر وما من نبی یومئذ الاتحت لواءی** ''میں قیامت کے دن تمام اولادِ آدم کا سردار ہوں گا، لیکن میں فخر نہیں کرتا، حمد کا پرچم میرے ہاتھ میں ہوگا اور تمام انبیائے کرام میرے جھنڈے کے نیچے ہوں گے، لیکن میں فخر نہیں کرتا۔''

سرکارِ دو عالم ﷺ کے بے شمار مقامات میں سے ایک یہ مقامِ محمود ہے جس کی آپ نے تفصیل دیکھی۔مشرکینِ مکہ کو بتایا جا رہا ہے کہ کاش تمھیں معلوم ہوتا کہ کتنی عظیم شخصیت تمھارے درمیان ہے لیکن تم اندھوں کی طرح اسے پہچاننے سے انکار کر رہے ہو۔

شاہدے در میانِ کوراں است
مصحفے در میانِ زندیقاں

وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْکَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا ۝۸۰

(اور دعا کیجیے! اے میرے رب، داخل کر مجھے عزت اور سچائی کا داخل کرنا، اور مجھے نکال عزت اور سچائی کا نکالنا، اور عطا کر مجھے اپنے پاس سے، اقتدار مددگار کرنے والا۔ ۸۰) (سورة بنیٓ اسرآءیل : ۸۰)

Marfat.com

ہجرت کی دُعا اور اس کا مفہوم

قریشِ مکہ کے رویئے کو دیکھ کر آنحضرت ﷺ ہر وقت اس کے انتظار میں تھے کہ کب اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھے ہجرت کا حکم ملتا ہے۔ حالات تیزی سے اس کا تقاضا کر رہے تھے لیکن آنحضرت ﷺ اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر مکہ معظمہ چھوڑنے کے مجاز نہیں تھے۔ آپؐ ہر طرح کے حالات کا نہایت پامردی سے مقابلہ کر رہے تھے، کہ پیشِ نظر آیتِ کریمہ نازل ہوئی۔ اس میں آپؐ کو ہجرت کی دعا سکھائی گئی ہے، جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ہجرت کا حکم اب زیادہ دور نہیں۔ دعا سکھانے کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان بپھرے ہوئے حالات میں آپؐ کو اس سے تسلی ملے گی، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی سنت یہ رہی ہے کہ جب بھی ابتر حالات میں وہ اپنے پیغمبروں کو تائید و نصرت کے لیے کسی دعا کا حکم دیتا ہے تو وہ درحقیقت دعا کی قبولیت کا اعلان ہوتا ہے۔ آپؐ کو اس میں بتا دیا گیا ہے کہ حالات کے تیور کچھ بھی ہوں، اللہ تعالیٰ ہر حال میں آپؐ کی حفاظت فرمائے گا۔ مکہ معظمہ سے خیر و عافیت سے نکلنا بجائے خود ایک بہت بڑی بات ہے، اور پھر دار الہجرت میں جو یقیناً ایک اجنبی شہر ہوگا وہاں کے لوگ اجنبی ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ وہاں کیسے حالات سے واسطہ پڑے، یہ بجائے خود پریشان کن باتیں ہیں، لیکن آپ کو دعا کے اسلوب میں اطلاع دے دی گئی کہ آپؐ کا نکلنا بھی عزت اور وقار کے ساتھ ہوگا۔ اور آپؐ کا داخل ہونا بھی نہایت شان کے ساتھ ہوگا۔ البتہ یہ بات حیران کن ہے کہ داخل ہونے کی بات پہلے کہی گئی ہے اور نکلنے کی بعد میں۔ حالانکہ سب سے پہلے نکلنے کی مہم درپیش ہے، کیونکہ دشمن ہر وقت نگرانی کر رہا ہے۔ اس کی مکمل کوشش ہے کہ آنحضرت ﷺ کو خیریت سے نکلنے نہ دیا جائے۔ بعض اہلِ علم کا خیال ہے کہ اس میں دراصل یہ بتانا مقصود ہے کہ نکلنا اور داخل ہونا دونوں ہی اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہر طرح کی خیریت سے عمل میں آئیں گے۔ لیکن نکلنا چونکہ مقصود نہیں، مقصود تو دار الہجرت میں داخل ہونا ہے اور اسے رفتہ رفتہ اسلام کا مرکز اور اسلامی ریاست کا دار الحکومت بنانا ہے۔ اس لیے اس کی ضمانت پہلے دی گئی کہ ہم نے ہر طرح سے اس کا انتظام کر دیا ہے۔ آپؐ وہاں پہنچیں گے تو ایک شاندار استقبال آپؐ کے انتظار میں ہوگا۔ بعض دیگر اہلِ علم کا خیال اس سے تھوڑا سا مختلف ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ یہاں دخول سے مراد دار الہجرت میں داخل ہونا نہیں بلکہ لوٹ کر مکہ معظمہ آنا ہے۔ دار الہجرت میں جانا وہ تو خروج کا لازمی نتیجہ ہے، اس لیے اس کا ذکر کرنے کا کیا حاصل۔ آنحضرت ﷺ کسی طرح بھی اللہ تعالیٰ کے گھر کی ہمسائیگی کو چھوڑنا پسند نہیں کرتے تھے اور مزید یہ کہ یہ شہر آپؐ مولد و مسکن بھی تھا اور حرم بھی۔ اس لیے جب بھی آپؐ تصور کرتے کہ مجھے اس شہر سے نکلنا ہوگا تو دل پر ایک چوٹ سی پڑتی۔ چنانچہ آپؐ کو تسلی دی گئی کہ آپؐ فکر نہ کریں، آپؐ کو نہایت عزت و وقار کے ساتھ اور صدق کی دولت لیے ہوئے اسی شہر میں دوبارہ فاتحانہ شان کے ساتھ لایا جائے گا۔ چنانچہ اس بات کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ جب آپؐ ہجرت کے سفر میں مکہ معظمہ سے کچھ فاصلے پر اس چوراہے پر پہنچے جہاں سے مدینے کو راستہ نکلتا ہے تو آپؐ مکہ معظمہ کو یاد کر کے آبدیدہ ہوگئے، تو حضرت جبرائیل علیہ السلام یہ آیتِ کریمہ لے کر نازل ہوئے۔ ان الذی فرض علیک القرآن لرادک الی معاد "بیشک جس اللہ نے آپؐ پر قرآنِ کریم فرض کیا ہے، وہ آپؐ کو پھر مکہ معظمہ لوٹا کے لائے گا۔"

ایک اور دُعا

آیت کے دوسرے حصے میں آپؐ کو ایک دوسری دعا سکھائی گئی ہے کہ الٰہی اپنی طرف سے ایک اقتدار کو میرا مددگار بنا دے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ میں جس عظیم مقصد کے لیے مبعوث کیا گیا ہوں، وہ محض دعوت اور نصیحت سے بروئے کار نہیں آسکتا۔ دنیا میں برائی کی قوتیں کبھی نیکی کو آگے بڑھنے کا موقع نہیں دیتیں۔ طاغوت کے پیروکاروں کے مضبوط جتھے قدم قدم پر حائل ہوتے ہیں۔ سلاطین کی حکومتیں نہ جانے کتنے ملکوں میں قائم ہیں جو اللہ تعالیٰ کی حکومت کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں۔ میرے پیشِ نظر فواحش و معاصی کے سیلاب کو روکنا اور تیرے قانونِ عدل کو جاری کرنا ہے، یہ کام میں بغیر اقتدار کی قوت کے نہیں کر سکتا۔ مکہ معظمہ میں نبی کریم ﷺ نے جب دیکھا کہ مسلمانوں پر اذیتیں بڑھتی جا رہی ہیں اور قریش کا غضب روز بروز تیز ہوتا جا رہا ہے تو آپؐ نے دعا فرمائی کہ یا اللہ! دو عمروں میں سے ایک عمر دے دے۔ عمرو بن ہشام دے دے یا

Marfat.com

عمر بن خطاب دے دے۔ اس کے بغیر کام چلنا مشکل ہو رہا ہے۔ اب چونکہ دار الہجرت پہنچ کر اسلامی ریاست کی بنیاد رکھنا تھی اور دنیا بھر کی مخالفتوں کا سامنا تھا۔ اس لیے اب اللہ تعالیٰ سے ایک ایسا اقتدار مانگا جا رہا ہے جو اللہ تعالیٰ کے دین کو قائم کرنے اور کلمۂ حق کو سر بلند کرنے اور نفاذِ شریعت کے مراحل کو آسان کرنے کے لیے مطلوب تھا۔ اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دین کے غلبے کے لیے اقتدار کے حصول کے لیے کوشش کرنا نہ صرف جائز بلکہ عین مطلوب ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے جس کی تائید نبی کریم ﷺ کی اس حدیث سے ہوتی ہے ان اللّٰہ لیزع بالسلطان مالایزع بالقرآن ''اللہ تعالیٰ حکومت کی طاقت سے ان چیزوں کا سدِ باب کر دیتا ہے جن کا سدِ باب قرآنِ کریم سے نہیں کرتا۔ آج ہم دیکھتے ہیں کہ لادینیت کا تیار کردہ ایک پرزہ جسے ہم اے سی کہتے ہیں، وہ پورے شہر کو کنٹرول کرتا ہے۔ اگر علمائے کرام بالاتفاق کسی شہر کو ہدف بنا کر اس کی اصلاح کے لیے سینکڑوں کی تعداد میں اس شہر میں کام کرنے کا فیصلہ کریں، لیکن جیسے ہی وہ راوی کے پل پر پہنچیں تو اے سی صاحب ایک آرڈر کے ذریعے شہر میں ان کا داخلہ بند کر سکتے ہیں یا ان کی زبان بندی کے احکام جاری کر سکتے ہیں یا انھیں نظر بند کر سکتے ہیں۔ اندازہ کیجیے کہ سینکڑوں علما اس شخص کے سامنے بے بس ہیں کیونکہ اس کے پاس اقتدار کی قوت ہے۔ ان علما میں بیشک محدثین ہوں، مفسرین ہوں، قرآنِ کریم کے حفاظ ہوں، بڑے بڑے فقیہ ہوں، لیکن اس ایک شخص کے سامنے ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ اقتدار جب چاہتا ہے حضرت یحییٰ علیہ السلام کا سر اڑا دیتا ہے اور حضرت مسیح علیہ السلام کو صلیب پر لٹکانے کا حکم جاری کر سکتا ہے۔ اس لیے جو لوگ دیانتداری اور ہوش مندی سے اسلام کو غالب دیکھنا چاہتے ہیں اور وہ وقت کے دھارے کو اسلام کے حق میں موڑنا چاہتے ہیں تو انھیں اس حقیقت کو سمجھ لینا چاہیے کہ وقت کی رفتار نصیحتوں سے نہیں رکتی، وقت کا دھارا دعوت سے نہیں پلٹتا۔ کسی بھی ملک میں تبدیلی لانے کے لیے جہاں اور بہت سارے عوامل کی ضرورت ہے، وہاں سب سے مؤثر عامل اقتدار ہے۔ مکہ معظمہ میں 13 سال تک دعوت کے نتیجے میں چند سو آدمی مسلمان ہوئے، لیکن مدینہ منورہ میں اقتدار کی قوت مل جانے کے بعد چند ہی سالوں میں پورا جزیرۂ عرب اسلام کی آغوش میں آ گیا۔ اور مزید نصف صدی گزرنے سے پہلے اسلام کا پھریرا نصف زمین پر لہرانے لگا۔

یہ کہنے کو تو دعائیں ہیں لیکن حقیقت میں اسلام کے غلبے کی پیشگوئیاں ہیں، جسے دیکھنے والوں نے چند ہی سالوں میں اپنی آنکھوں سے پورا ہوتے دیکھا۔

وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۚ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ﴿٨١﴾ (سورة بنیٓ اسرآءِیل : ۸۱)

(اور آپ اعلان کر دیجیے کہ حق آ گیا اور باطل مٹ گیا، اور باطل تھا ہی مٹنے والا۔ ۸۱)

حق کی فتح اور باطل کی شکست کا اعلان

سابقہ آیتِ کریمہ میں غلبۂ دین کی جو بات اشاروں میں کہی جا رہی تھی، اب آنحضرت ﷺ کو حکم دیا جا رہا ہے کہ آپ کھل کر اعلان کر دیجیے کہ اسلام کا راستہ روکنے والو! سن لو، تم اب اس شمع کو جلنے سے نہیں روک سکو گے۔ مشعل برداروں کا قافلہ دنیا کی تاریکیاں دور کرنے کے لیے نکلا ہے، تم ان سے مشعلیں نہیں چھین سکو گے۔ مستقبل اگرچہ ابھی تک تاریک پردوں میں ہے، اس لیے تم اسے دیکھ نہیں سکتے، لیکن جس نے یہ قرآن اتارا ہے اور مجھے اپنا رسول بنا کر بھیجا ہے اس کے سامنے کوئی چیز مخفی نہیں، وہ مجھے یہ اعلان کرنے کا حکم دے رہا ہے کہ حق آ گیا اور باطل مٹ گیا یعنی وہ وقت بہت قریب ہے جب حق پوری طرح جلوہ گر ہو گا۔ حق سے مراد وہ دینِ حق ہے جس کو لے کر قرآن آیا تھا اور باطل سے مراد وہ دینِ باطل ہے جس کو مٹانے کے لیے قرآن نازل ہوا تھا۔ چنانچہ اس اعلان کو 9 سال سے زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ نبی کریم ﷺ حق کا پھریرا لہراتے ہوئے مکہ معظمہ میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے۔ اور آپ جب اللہ تعالیٰ کے گھر میں داخل ہوئے جسے مشرکین نے بت خانہ بنا رکھا تھا۔ تو آپ کے ہاتھ میں ایک نیزہ تھا جس کی انی سے آپ بتوں کو توڑتے جاتے تھے اور زبان پر یہ آیت جاری تھی۔ لوگوں نے چند ہی سالوں بعد اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ جس غلبۂ حق کا اعلان کیا گیا تھا، وہ آج ان کے سامنے پورا ہو رہا ہے۔

Marfat.com

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے کہ باطل کا مٹ جانا یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ باطل خودرو جھاڑیوں کی طرح ہے۔ جس زمین کا کوئی وارث نہ ہو اور جس باغ کا کوئی مالی نہ ہو، جو اس کی نگہبانی کا فرض انجام دے، وہاں خودرو پودے، جڑی بوٹیاں اور جھاڑیاں پھیل جاتی ہیں۔ اور یہ اس وقت تک پھیلتی جاتی ہیں جب تک کوئی کسان یا کوئی باغبان اپنا فرض انجام دینے کے لیے نہیں اٹھتا۔ لیکن جب کوئی بھی شخص اپنا فرض انجام دینے کے لیے کسی یا درانتی لے کر اٹھ کھڑا ہوتا ہے تو پھر جھاڑیوں اور جڑی بوٹیوں کو تلف ہوتے دیر نہیں لگتی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہاں پھول کھلنے اور فصلیں لہلہانے لگتی ہیں۔ یہی حال حق و باطل کا ہے۔ انسانی فطرت میں باطل کے لیے قدرت نے کوئی گنجائش نہیں رکھی، لیکن جب اہلِ حق اپنا فرض انجام نہیں دیتے اور وہ فطرت کی زمین میں حق کی تخم ریزی نہیں کرتے اور اسے بیکار چھوڑ دیتے ہیں تو پھر جگہ جگہ باطل کی جڑی بوٹیاں اور جھاڑیاں سر اٹھانے لگتی ہیں۔ اور خاروخس اپنی جگہ بنا لیتے ہیں۔ جب نبی کریم ﷺ جو خلیفۃ اللہ تھے تشریف لے آئے اور آپؐ نے کشتِ حق کی تخم ریزی اور اس کی نگرانی کا فرض انجام دینا شروع کر دیا اور آپؐ کے ساتھ صاحبِ ایمان لوگوں کا قافلہ بڑھتا چلا گیا تو چند ہی سالوں میں زمین کی قسمت بدل گئی۔

رہا ڈر نہ بیڑے کو موجِ بلا کا
اِدھر سے اُدھر پھر گیا رخ ہوا کا

آج بھی یہ آیتِ کریمہ امتِ مسلمہ کے دعوت و ارشاد سے تعلق رکھنے والے دردمند لوگوں کو پکار رہی ہے کہ تم اپنے گردوپیش میں لادینیت اور فواحش کی جو یلغار دیکھ رہے ہیں اور جس طرح سے زمین کا سینہ بے حیائی کے خودرو پودوں اور جھاڑیوں نے روک لیا ہے اور جگہ جگہ اللہ تعالیٰ سے انکار کرنے والوں اور دین کے دشمنوں کے جتھے منظم ہو رہے ہیں اور گھروں سے لے کر منڈیوں اور بازاروں تک مسلمان معاشرے کا کوئی حصہ ایسا باقی نہیں رہا جو لادینیت کی لپیٹ میں نہ آچکا ہو۔ یہ صرف اس بات کا نتیجہ ہے کہ دین کی دعوت دینے والوں کو جس توانائی، دردمندی، جرأت و جسارت اور حکمت و بصیرت سے کام لینے کی ضرورت تھی اس میں کمی آگئی ہے۔ لادینیت اور بے حیائی خرگوش کی چال دوڑ رہی ہے اور ہم اپنے وسائل اور اپنی تگ ودو میں کچھوے سے بھی کم رفتار ہونے کے باوجود میٹھی نیند سو رہے ہیں۔ کہیں مادیت نے اپنا بسیرا کر رکھا ہے اور کہیں تعلیمی اداروں اور تربیتی مراکز میں الحاد اپنے پنجے گاڑ چکا ہے۔ ہم حالات سے نبرد آزما ہونے کی بجائے دین و دنیا میں تفریق کے قائل ہو چکے ہیں اور ہمارے اندر اس غلط فہمی نے بزدلی پیدا کر دی ہے کہ باطل اس قدر توانا ہو چکا ہے کہ اس کا راستہ روکنا ممکن نہیں رہا۔ یہ آیت ہمیں یہ شعور دے رہی ہے کہ باطل فطرت کی پکار نہیں۔ انسانی ضمیر کے لیے یہ اجنبی چیز ہے۔ اللہ تعالیٰ کی زمین اس کے لیے سازگار نہیں، لیکن جب اس زمین کا وارث سو جاتا ہے تو پھر جڑی بوٹیوں اور خودرو پودوں کو سر اٹھانے کا موقع مل جاتا ہے۔ ہر طرح کے منکرات پاؤں پسارنے لگتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ اس بات کا اعلان ہوتا ہے کہ اس باغ کے مالی کہیں سو گئے ہیں یا مر کھپ گئے ہیں۔ اس لیے اس امت کے دردمند لوگوں کو اس آیت کی پکار پر کان لگانے ہوں گے ورنہ قیامت کے دن شرمندگی اور دنیا میں ذلت کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا ۝٨٢

(ہم قرآن میں سے جو اتارتے ہیں وہ ایمان والوں کے لیے شفا اور رحمت ہے اور ظالموں میں یہ اضافہ نہیں کرتا، مگر خسارے میں۔ ۸۲) (سورۃ بنی اسرآءیل : ۸۲)

قرآن اہل ایمان کے لیے رحمت اور ظالموں کے لیے محرومی ہے

حق کے آجانے اور باطل کے مٹ جانے کا اعلان کر دینے کے بعد ارشاد فرمایا جا رہا ہے کہ قریش اپنے تئیں کچھ بھی سمجھتے رہیں اور وہ بیشک اپنے پندار کے گنبد سے باہر نکلنا پسند نہ کریں لیکن یہ حقیقت ہے کہ چند ہی سالوں میں اس ملک میں حق کا پھریرا لہرا رہا ہوگا اور یہاں کی لاقانونیت اور انسانوں کی منتشر بھیڑ ایک منظم معاشرے اور ایک مہذب ریاست کی شکل اختیار کر چکی ہوگی جس کا دستور اللہ تعالیٰ کی وہ کتاب ہوگی جسے قرآن کے نام سے نازل کیا جا رہا ہے اور جسے قریش کسی قیمت پر قبول کرنے کے لیے تیار نہیں لیکن ان بدنصیبوں کو معلوم نہیں کہ اس قرآن میں جو کچھ نازل ہو رہا ہے وہ انسان کے روحانی، اخلاقی اور عقلی روگوں کا مداوا ہے۔ اور انجام کار اللہ تعالیٰ کی رحمت کی ضمانت ہے۔ جیسے جیسے قرآنی تعلیمات پر ایمان و عمل بڑھتا جائے

Marfat.com

گا ویسے ویسے اللہ تعالیٰ کی رحمت کی گھٹا گہری ہوتی جائے گی۔ آج جبکہ ایمان لانا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے پھر یہی ایمان اللہ تعالیٰ کی رحمت کی ضمانت بن جائے گا۔ آج کا انسان امن کو ترستا ہے۔ جان مال اور آبرو ہر جگہ خطرے میں ہے، کمزور کے لیے کوئی جائے پناہ نہیں، ظالم کا ہاتھ پکڑنے والا کوئی نہیں۔ لیکن قرآنی نظام کے آجانے کے بعد نہ کوئی ظلم باقی رہے گا، نہ کوئی بدعنوانی باقی رہے گی۔ ہر طرح کے امتیازات مٹا دیے جائیں گے، انسانی دکھوں کو شفا ملے گی اور انسانی شقاوت رحمت میں تبدیل ہو جائے گی۔ لیکن جو لوگ کسی طرح بھی اس پر کان نہیں دھریں گے اور اپنی مخالفت اور مدافعت پر جمے رہیں گے قرآن کا نزول اور اس کی بالادستی ان کے لیے خسارے اور تباہی کا باعث ہوگی۔ ایک وقت آئے گا کہ اس ملک کی سرزمین ان کو جگہ دینے سے انکار کر دے گی۔ انھیں اسلام کی آغوش کے سوا کہیں پناہ دکھائی نہیں دے گی۔

وَاِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَی الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ ۚ وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يَـُٔوْسًا ﴿۸۳﴾

(اور جب ہم انسان پر اپنا انعام کرتے ہیں تو وہ اعراض کرتا اور پہلو بدل لیتا ہے۔ اور جب اس کو مصیبت پہنچتی ہے تو مایوس ہو جاتا ہے۔ ۸۳) (سورۃ بنیٓ اسرآءِیل : ۸۳)

انسان کا رویہ

اس آیتِ کریمہ میں انسان کا لفظ لا کر پروردگار نے عام انسانی رویئے کی بات کی ہے لیکن روئے سخن چونکہ قریش کے مفسدین کی ہی طرف ہے اس لیے ان کا نام لیے بغیر منہ پھیر کر انسان کے عام لفظ سے انھی کی کمزوری کو نمایاں کیا گیا ہے۔ انسان اپنی عادات واطوار میں عجیب واقع ہوا ہے کہ علم و دانش اور شعور و آگہی کے ہزاروں دعووں کے باوجود نہ تو اسے خیر وشر میں امتیاز کا ملکہ حاصل ہے اور نہ اسے اچھے اور بُرے حالات میں اپنے رویئے کو متوازن رکھنے کی صلاحیت ہے۔ کبھی خزف ریزوں کو ہیرے سمجھ بیٹھتا ہے اور کبھی ہیروں سے خزف ریزوں جیسا سلوک کرتا ہے۔ قریش حرم کے متولی ہو کر اپنی جہالت پر نازاں ہیں اور اس رویئے نے انھیں اس حد تک اندھا کر دیا ہے کہ قرآنِ کریم اور پرانے قصے کہانیوں میں تمیز نہیں کر پا رہے۔ آنحضرت ﷺ کی ذاتِ گرامی جو پتھروں کے ڈھیر میں ہیروں سے بڑھ کر چمک رکھتی ہے ان کی شناخت تک سے بے بہرہ ہیں۔ قرآنِ کریم اپنی بے بدل فصاحت و بلاغت کے موتی بکھیر رہا ہے، لیکن وہ زبان دانی کے دعووں کے باوجود اس کا منہ چڑاتے ہیں۔ وہ ذرا سے غور کرتے تو انھیں اندازہ ہوتا کہ قرآنِ کریم سے بڑھ کر دنیا میں کوئی نعمت نہیں ہو سکتی جس سے دنیا کی کامیابیاں بھی وابستہ ہیں اور آخرت کی کامیابیاں بھی، لیکن ان کی بدتمیزیوں کا حال یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ جب قرآن پڑھتے ہیں تو نہ صرف ان سے شائستہ اعراض کرتے ہیں جیسے شائستہ لوگوں کا کام ہوتا ہے بلکہ بے ہودہ لوگوں کی طرح پہلو بدلتے اور منہ پھیر لیتے ہیں۔

عام انسانی زندگی میں بھی ان کا حال یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ خوشحالی عطا کرتا ہے تو اس کے شکرگزار ہونے کی بجائے اکڑنے لگتے ہیں اور اگر کبھی بدحالی آپکڑتی ہے تو پھر مایوس ہو کر ڈگ ڈال دیتے ہیں۔ قرآنِ کریم سے ان کے رویئے کے پیشِ نظر اگر پروردگار انھیں کسی ابتلا میں مبتلا کرتا ہے تو مایوس ہونے لگتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے کسی اچھی بات کی کیا توقع ہو سکتی ہے۔ اس طرح سے آنحضرت ﷺ کو تسلی دی جا رہی ہے کہ آپ ان کے رویئے سے ہرگز دل گرفتہ نہ ہوں، یہ تو اپنی کمزوریوں کے مارے ہوئے لوگ ہیں، آپ ان کی اتنی پرواہ کیوں کرتے ہیں۔

قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰی شَاكِلَتِهٖ ۭ فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰی سَبِيْلًا ﴿۸۴﴾ (سورۃ بنیٓ اسرآءِیل : ۸۴)

(کہہ دیجیے! ہر شخص اپنی روش پر کام کرتا ہے، پس تمہارا رب ہی بہتر جانتا ہے کہ کون زیادہ سیدھی راہ پر (گامزن) ہے۔ ۸۴)

ہدایت قبول نہ کرنے والوں سے آخری بات

کُـل: نکرہ ہے، لیکن بعض مواقع پر یہ معرفہ کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ یہاں بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسے معرفہ کے طور پر استعمال کیا گیا، یعنی مراد اس سے وہی لوگ ہیں جن کی طرف قرآنِ کریم کا روئے سخن ہے۔

Marfat.com

شَاكِلَةٌ : کا معنی عام طور پر "طریقہ" کیا جاتا ہے۔ علامہ قرطبی کی تحقیق یہ ہے کہ مجاہد نے اس کا معنی "طبیعت" کیا ہے اور مقاتل نے اس کا معنی "جبلت" کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قریش اور دوسرے مشرکینِ مکہ آنحضرت ﷺ اور قرآنِ کریم کے بارے میں جو کچھ کر رہے ہیں وہ کوئی باعثِ تعجب نہیں۔ اس لیے کہ انھوں نے بت پرستی اور جہالت کے باعث اپنی جبلت اس حد تک بگاڑ لی ہے کہ جس طرح ملاوٹ والی غذا کھانے والا ملاوٹ سے پاک غذا ہضم نہیں کرسکتا اور جس طرح بُری صحبت میں بیٹھنے والا اچھی صحبت سے اعراض کرتا ہے، اسی طرح یہ لوگ بھی توحید اور آخرت کے تصور کو قبول کرنے سے عاجز ہیں۔ مکارمِ اخلاق کی تعلیم انھیں اجنبی معلوم ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ذکر ان کی طبیعتوں کے لیے بوجھ محسوس ہوتا ہے۔ یہ اپنی زندگی کو جس طریقے پر گزار رہے ہیں، اس سے مختلف طریقے پر چلنا ان کے لیے آسان نہیں۔ ویسے تو یہ بات کسی قوم کے لیے بھی آسان نہیں ہوتی جو ایک خاص طرز کی زندگی کے عادی ہو۔ لیکن ان کے جمود اور جہالت نے انھیں بالکل بے بس کر کے رکھ دیا ہے۔ اقبال نے ٹھیک کہا:

آئین نو سے ڈرنا، طرزِ کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

آنحضرت ﷺ سے فرمایا جارہا ہے کہ آپ اُن سے توقعات باندھنے کی بجائے اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیں اور ان سے صاف صاف کہہ دیں کہ تم میں تو یہ صلاحیت نہیں کہ تم یہ فیصلہ کرسکو کہ صحیح راستہ کیا ہے اور غلط کیا ہے۔ اگر کوئی ذات فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ اس لیے ہم یہ فیصلہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کرتے ہیں کہ وہی جانتا ہے کہ صحیح راستے پر کون ہے۔ اولاً تو اس نے اپنے علم کی سند دے کر مجھے مبعوث فرمایا اور مجھ پر اپنی کتاب اتاری۔ یہ میرے صحیح راستے پر ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ لیکن اگر تمھیں یہ دلیل اپیل نہیں کرتی تو پھر حالات بتا دیں گے کہ صحیح راستے پر کون تھا۔ بس چند سال تک انتظار کرو، تم ہر بات اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ
الرُّوْحِ ۭ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا
قَلِيْلًا ﴿٨٥﴾ وَلَىِٕنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ
لَكَ بِهٖ عَلَيْنَا وَكِيْلًا ﴿٨٦﴾ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۭ اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ
عَلَيْكَ كَبِيْرًا ﴿٨٧﴾ قُلْ لَّىِٕنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓي اَنْ يَّاْتُوْا
بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ
ظَهِيْرًا ﴿٨٨﴾ وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ۡ
فَاَبٰٓى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا ﴿٨٩﴾ وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ
لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ﴿٩٠﴾ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّ

Marfat.com

عِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ﴿۹۱﴾ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا
زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ﴿۹۲﴾ اَوْ يَكُوْنَ
لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ ۗ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ
حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ۗ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا
بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴿۹۳﴾

رکوع: ۱۰۔ (وہ آپؐ سے روح کے متعلق سوال کرتے ہیں، کہہ دیجیے! کہ روح میرے رب کے حکم سے ہے اور تم بس تھوڑا سا علم دیے گئے ہو۔ ۸۵) اور اگر ہم چاہیں وہ سب کچھ آپؐ سے چھین لیں جسے ہم نے آپؐ کی طرف وحی کیا ہے، پھر آپؐ اس کے لیے ہمارے مقابلے میں کوئی حمایتی نہ پاؤ گے۔ ۸۶) یہ آپؐ کے رب کی رحمت ہے، بیشک اس کا فضل آپؐ پر بہت بڑا ہے۔ ۸۷) کہہ دیجیے کہ اگر تمام انسان اور جن اس بات پر اکٹھے ہو جائیں کہ اس جیسا قرآن لا دیں تو وہ اس جیسا نہ لا سکیں گے، اگرچہ وہ ایک دوسرے کے مددگار بن جائیں۔ ۸۸) ہم نے اس قرآن میں لوگوں کو طرح طرح سے سمجھایا، لیکن اکثر لوگ انکار پر ہی اڑے ہوئے ہیں۔ ۸۹) اور انہوں نے کہا ہم تو تمھاری بات ہرگز نہیں مانیں گے جب تک تم ہمارے لیے زمین کو پھاڑ کر کوئی چشمہ نہ جاری کر دو۔ ۹۰) اور یا تمھارے پاس کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ نہ ہو جائے، پھر تم اس کے بیچ بیچ میں نہریں نہ دوڑا دو۔ ۹۱) یا تم ہم پر آسمان سے ٹکڑے نہ گرا دو جیسا کہ تم دعویٰ کرتے ہو یا اللہ اور فرشتوں کو سامنے نہ لا کھڑا کر دو۔ ۹۲) یا تمھارے لیے سونے کا ایک گھر نہ بن جائے یا تم آسمان پر نہ چڑھ جاؤ اور ہم تمھارے چڑھنے کا بھی یقین نہ کریں گے جب تک تم وہاں سے ہم پر کوئی کتاب نہ اتارو جسے ہم پڑھیں، اے پیغمبرؐ ان سے کہہ دیجیے پاک ہے میرا پروردگار، میں تو بس ایک بشر ہوں، اللہ کا رسولؐ۔ ۹۳)

وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ۗ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۸۵﴾

(وہ آپؐ سے روح کے متعلق سوال کرتے ہیں، کہہ دیجیے! کہ روح میرے رب کے حکم سے ہے اور تم بس تھوڑا سا علم دیے گئے ہو۔ ۸۵) (سورۃ بنیٓ اسرآءِیل : ۸۵)

روح سے متعلق سوال کا جواب سیاق وسباق کی روشنی میں

اگلی آیات میں ان اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے جو مخالفین قرآنِ کریم اور آنحضرت ﷺ کی رسالت کے حوالے سے کرتے تھے۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں ان کے ایسے ہی ایک سوال کا جواب ہے۔ جب نبی کریم ﷺ ان کے سامنے قرآنِ کریم کی تلاوت کرتے اور انھیں بتاتے کہ یہ آیات اللہ تعالیٰ کی کتاب کی ہیں جو مجھ پر نازل ہوئی ہے تو وہ مختلف طریقوں سے اس کا اثر زائل کرنے کی کوشش کرتے۔ انھیں کوششوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ

Marfat.com

وہ یہ پوچھتے کہ یہ قرآن تمھیں کون سکھاتا ہے یا کون لکھ کر دیتا ہے۔ اس لیے کہ وہ جانتے تھے کہ قرآنِ کریم کی زبان اور اس میں بیان کیے جانے والے مضامین نبی کریم ﷺ بلکہ پوری نوعِ انسانی کی بساط سے بلند ہیں۔ آنحضرت ﷺ انھیں میں پیدا ہوئے، پلے بڑھے اور زندگی کا بیشتر حصہ گزرا، اس لیے آپؐ کا علم اور آپؐ کی معلومات قریش سے مختلف نہ تھیں۔ قریش جب قرآنِ کریم میں ایک نئی صورتحال کا سامنا کرتے تو انھیں یہ سوال پریشان کرتا کہ آخر محمد (ﷺ) یہ باتیں کہاں سے سیکھتے ہیں اور یہ زبان انھیں کون سکھاتا ہے۔ چنانچہ یہی سوال انھوں نے آنحضرت ﷺ سے کیا۔ اس سوال سے ان کا منشا یہ تھا کہ یہ کتاب کہاں سے آتی ہے؟ اس کا منبع کیا ہے اور یا یہ پوچھنا تھا کہ اس کا لانے والا کون ہے؟ چنانچہ اس آیتِ کریمہ میں اس کا جواب دیا گیا ہے کہ اس کتاب کا تعلق وحیِ الٰہی سے ہے اور اسی وحی کو قرآنِ کریم نے روح کے نام سے یاد کیا ہے۔ اور یا اس کا مطلب یہ ہے کہ اس وحی کو لانے والا وہ فرشتہ ہے جسے روح کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اب رہی یہ بات کہ تمھیں اس روح کی حقیقت سمجھائی جائے تو یہ بات تمھارے لیے مشکل ہے۔ اس لیے کہ وحی اللہ تعالیٰ کے پیغمبر کے دل پر کیسے اترتی ہے اور اس کی کیفیت کیا ہوتی ہے؟ کیفیتیں کبھی کسی کو سمجھائی نہیں جاسکتیں۔ وہ وہی جانتا ہے جس پر وہ کیفیت وارد ہوتی ہے۔ وحی کی حقیقت سے اللہ تعالیٰ کے نبیوں کے سوا کوئی آگاہ نہیں ہوسکتا، کیونکہ کسی اور کو اس سے سابقہ نہیں پڑتا۔ اور جہاں تک وحی لانے والے فرشتے کا تعلق ہے، وہ بھی صرف نبیوں اور رسولوں پر اترتا ہے۔ ان کے علاوہ اس کی شناخت کسی اور کو حاصل نہیں۔

آیت کی تشریح میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس میں پہلی بات یہ ہے کہ یہ سیاق وسباق کے عین مطابق ہے۔ اس آیت سے پہلے بھی تین آیتوں میں قرآنِ کریم کا ذکر ہے۔ اور اس کے بعد کی تین آیتوں میں بھی قرآنِ کریم ہی کا ذکر ہے۔ اور یہ بات کسی طرح بھی قابلِ فہم نہیں ہوسکتی کہ سیاق وسباق سے بالکل تعلق توڑ کر درمیان میں ایک نئی آیت نازل کردی جائے۔

اور دوسری بات یہ کہ قرآنِ کریم نے خود روح کے بارے میں مختلف مواقع پر جو باتیں فرمائی ہیں ان میں یہ مفہوم بہت نمایاں ہے۔ چنانچہ سورۂ مومن میں فرمایا گیا ہے کہ یُلْقِی الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِہٖ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِہٖ ''وہ اللہ، اپنے حکم سے اپنے جس بندے پر چاہتا ہے روح نازل کرتا ہے، یعنی وحی نازل کرتا ہے۔'' سورۂ شوریٰ میں فرمایا گیا ہے کَذٰلِکَ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ''اور اسی طرح ہم نے آپؐ کی طرف ایک روح اپنے حکم سے بھیجی'' اس سے مراد وحی بھی ہوسکتی ہے اور حضرت جبرائیل امین علیہ السلام بھی ہوسکتے ہیں۔

اور تیسری یہ بات کہ سلف میں سے ابن عباسؓ، قتادہؒ اور حسن بصریؒ نے بھی اسی تفسیر کو اختیار کیا ہے۔ اور ابن جریرؒ نے اس قول کو قتادہؒ کے حوالے سے ابن عباسؓ کی طرف منسوب کیا ہے۔ اور صاحب روح المعانی حسنؒ اور قتادہؒ کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ ''روح سے مراد حضرت جبرائیل ہیں اور سوال دراصل یہ تھا کہ وہ کیسے نازل ہوتے ہیں اور کس طرح نبی کریم ﷺ کے قلبِ اطہر پر وحی کا القا ہوتا ہے۔''

روح کا مفہوم روایات کی روشنی میں

بعض مفسرین نے ہماری محولہ بالا گزارشات سے بالکل الگ یہ فرمایا ہے کہ مشرکینِ مکہ کا سوال وحیِ الٰہی یا ذریعۂ وحیِ الٰہی کے بارے میں نہیں تھا بلکہ روحِ حیوانی کے بارے میں تھا۔ ان کا مقصد روح کی حقیقت معلوم کرنا تھا کہ وہ کیا چیز ہے اور وہ کس طرح انسانی بدن میں آتی جاتی ہے اور کس طرح اس سے حیوان اور انسان زندہ ہوتے ہیں۔ اپنے اس خیال پر وہ دو احادیث سے استدلال کرتے ہیں۔ ایک کے راوی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں ایک روز نبی کریم ﷺ کے ساتھ مدینہ کے غیر آباد حصے میں چل رہا تھا اور آپؐ کے دستِ مبارک میں کھجور کی ایک شاخ تھی۔ آپؐ کا گزر چند یہودیوں پر ہوا۔ یہ لوگ آپس میں کہنے لگے کہ محمد (ﷺ) آرہے ہیں، ان سے روح کے بارے میں سوال کرو۔ دوسروں نے ہر چند منع کیا، مگر انھوں نے سوال کرڈالا۔ یہ سوال سن کر نبی کریم ﷺ لکڑی پر ٹیک لگا کر کھڑے ہوگئے، جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ آپؐ پر وحی نازل ہونے والی ہے۔ کچھ وقفہ کے بعد وحی نازل ہوئی تو آپؐ نے یہ آیت پڑھ کر سنائی۔

مسند احمد میں حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ قریشِ مکہ جو جا و بے جا سوالات رسول اللہ ﷺ سے کرتے رہتے تھے، ان کو خیال ہوا کہ یہود علم والے ہیں، ان کو پچھلی کتابوں کا بھی علم ہے، ان سے کچھ سوالات حاصل کیے جائیں جن کے ذریعہ رسول اللہ ﷺ کا امتحان لیا جائے۔ قریش نے یہود سے دریافت کرنے کے لیے اپنے آدمی بھیجے۔ ایک روایت میں ہے کہ انھوں نے کہا کہ تم ان سے روح کے متعلق سوال کرو۔ اور دوسری

Marfat.com

روایت میں ہے کہ انھوں نے اصحاب کہف اور ذوالقرنین کے بارے میں بھی سوال کرنے کے لیے کہا۔ روح سے متعلق روایت کو ابن کثیر نے نقل کیا ہے۔ اور حضرت ابن عباسؓ ہی سے اس آیت کی تفسیر میں یہ بھی نقل کیا ہے کہ یہود نے اپنے سوال میں یہ بھی کہا تھا کہ آپؐ ہمیں بتلائیں کہ روح پر عذاب کس طرح ہوتا ہے۔ اس وقت تک نبی کریم ﷺ پر اس بارے میں کوئی آیت نازل نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے اس وقت آپؐ نے فوری جواب نہیں دیا۔ پھر حضرت جبرائیل امین علیہ السلام یہ آیت لے کر نازل ہوئے۔ چنانچہ ان دونوں روایات سے یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ سوال وحی الٰہی کے بارے میں نہیں تھا بلکہ روحِ حیوانی کے بارے میں تھا۔ اور چونکہ یہ دونوں روایات صحیح ہیں اور خاص طور پر ابنِ مسعود کی روایت کو چونکہ صحیحین نے بھی روایت کیا ہے، اس لیے اسے ترجیح دی جاتی ہے اور اس روایت میں صاف صاف کہا گیا ہے کہ یہ آیت یہود کے جواب میں نازل ہوئی۔

تطبیق کی عاجزانہ کوشش

اس سے انکار کی مجال نہیں کہ یہود نے سوال کیا اور آنحضرت ﷺ نے وحی کی روشنی میں اس کا جواب دیا اور وہ وحی اس آیت کی صورت میں نازل ہوئی۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ کہا جائے کہ قرآن کریم میں یہ آیت جس سیاق وسباق میں آئی ہے اس سے مراد روحِ حیوانی ہے، ورنہ قرآنِ کریم کی ترتیب میں ایک بے ربطی پیدا ہوتی ہے۔ رہی دونوں باتوں میں تعارض کی بات تو اس کو ختم کرنے اور تطبیق دینے کے لیے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ یہ آیت تو مکہ معظمہ میں نازل ہوئی اور حضرت ابن مسعودؓ کا واقعہ مدینے میں پیش آیا۔ اس وقت یہود کے جواب میں آنحضرت ﷺ پر جو کیفیت طاری ہوئی اور اس کے بعد حضورؐ نے یہ آیت پڑھ کر سنائی، اس کا مطلب تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی کے ذریعے آپؐ کو توجہ دلائی گئی کہ اس بات کا جواب اس آیتِ کریمہ میں موجود ہے۔ اور آیتِ کریمہ میں جس طرح یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ وحی الٰہی امرِ ربی ہے، اسی طرح یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ روحِ حیوانی بھی امرِ ربی ہے۔ ایک آیت سے دو باتوں کا استنباط یقیناً روحِ قرآنی کے خلاف نہیں ہے۔ اس طرح سے دونوں تفسیروں میں تطبیق پیدا ہو جاتی ہے اور مفسرین کے درمیان اختلاف ختم ہو جاتا ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ روحِ حیوانی کی حقیقت کو جاننے یا سلجھانے کے لیے متعدد علما نے کاوشیں کی ہیں۔ ان میں شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی کا ایک مختصر سا رسالہ مختصر ہونے کے باوجود بڑی جامعیت اور اہمیت رکھتا ہے، لیکن یہ کہنے میں شاید کوئی مبالغہ نہ ہو کہ جس طرح ہمارے متکلمین اس موضوع پر دادِ تحقیق دے چکے ہیں، اسی طرح سائنسدانوں نے بھی اس میں بڑی وقیع کوششیں کی ہیں بلکہ سننے میں آیا ہے کہ انھوں نے بعض عجیب و غریب تجربات بھی کیے۔ لیکن وہ روح کے راز کو نہ پاسکے کہ وہ کیا چیز ہے جو انسان کے اندر سے نکل جاتی ہے۔ امرِ ربی نے اس عقدہ کی کشود آسان کردی کہ روح ایک امرِ ربی ہے یا یوں کہہ لیجیے کہ میرے پروردگار کے حکم سے ہے۔ وہ عام مخلوقات کی طرح نہیں جو مادہ کے تطورات اور توالد و تناسل کے ذریعے سے وجود میں آتی ہے بلکہ وہ بلاواسطہ اللہ تعالیٰ کے حکم "کُن" سے پیدا ہونے والی چیز ہے۔ اس کے بعد انسانی عقل و دانش کو سپر انداز ہو جانا چاہیے اور بے فائدہ مشقِ تحقیق سے ہاتھ اٹھالینا چاہیے۔

وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَیْنَا وَكِیْلًا ﴿۸۶﴾ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ؕ اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَیْكَ كَبِیْرًا ﴿۸۷﴾ (سورة بنیٓ اسرآءِیل : ۸۶.۸۷)

(اور اگر ہم چاہیں وہ سب کچھ آپؐ سے چھین لیں جسے ہم نے آپؐ کی طرف وحی کیا ہے، پھر آپؐ اس کے لیے ہمارے مقابلے میں کوئی حمایتی نہ پاؤ گے۔ ۸۶) یہ آپؐ کے رب کی رحمت ہے، بیشک اس کا فضل آپؐ پر بہت بڑا ہے۔ ۸۷)

وحی تصرفِ غیبی اور اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے

قرآنِ کریم کے سلسلے میں قریش آنحضرت ﷺ پر جو اعتراضات کرتے تھے ان میں بنیادی خیال یہ تھا کہ قرآنِ کریم اللہ تعالیٰ کی کتاب نہیں بلکہ یہ محمد (ﷺ) نے خود بنالی ہے۔ خود یا کسی کی مدد سے جتنا حصہ تیار کر لیتے ہیں وہ آکر ہمیں سنا دیتے ہیں اور اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کر دیتے ہیں۔ چنانچہ گزشتہ آیتِ کریمہ میں اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ قرآن کریم وحی الٰہی ہے جسے اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت

Marfat.com

جبرائیل امین علیہ السلام لے کر آتے ہیں۔ اس آیتِ کریمہ میں یہ فرمایا گیا ہے کہ تم اس کا الزام آنحضرت ﷺ پر رکھتے ہو حالانکہ ان کا حال یہ ہے کہ اس وحی کے نازل ہونے میں ان کا کوئی تعلق نہیں۔ انھیں کبھی اس کا خیال بھی نہیں آیا تھا کہ مجھ پر وحی آئے گی اور مجھ پر کوئی کتاب نازل ہوگی۔ ان کی مرضی اور خواہش کے بغیر اللہ تعالیٰ نے ان کا انتخاب فرمایا اور اس عظیم کام کے لیے ان کو چن لیا۔ اب جبکہ وہ اس کام کی انجام دہی میں شب و روز لگے ہوئے ہیں تو تب بھی اس وحی کے اترنے میں ان کا کوئی دخل نہیں، ہم وحی کا آنا بند کر دیں اور جو کچھ نازل ہو چکا ہے اسے واپس لے جائیں تو وہ زبردستی اسے روک نہیں سکتے۔ اور کوئی ایسی قوت نہیں جو اس سلسلے میں ان کی مدد کر سکے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے فیصلوں کے راستوں میں کوئی حائل ہونے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ وحی نہ کسی کی مرضی سے اترتی ہے نہ کسی کی مرضی سے جاری رہتی ہے۔ قرآن کا نزول اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی رحمت ہے جس کے لیے آنحضرت ﷺ کے قلبِ مبارک کا انتخاب کیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے آپؐ کی ذات پر اللہ تعالیٰ کا انتہائی فضل و کرم ہے۔ اس نے آپؐ کو وہ بلند مقامات عطا فرمائے ہیں ہم ان کا تصور کرنے سے بھی عاجز ہیں۔ قریش کی ساری مخالفتوں کے باوجود آپؐ کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی نیک نامی اور ایک ایسی شہرتِ دوام اور ایک ایسی مسلمہ فضیلت کا فیصلہ کر دیا ہے جس سے کبھی کسی پیغمبر کو بھی نہیں نوازا گیا۔ اللہ تعالیٰ کے مواہب اور افضال میں سے ایک یہ بھی ہے جس کا قرآنِ کریم نے ذکر فرمایا وَرَفَعْنَالَکَ ذِکْرَکَ چنانچہ آج ہم دیکھتے ہیں ؎

وہ جس کا ذکر ہوتا ہے زمینوں آسمانوں میں
فرشتوں کی دعاؤں میں موذن کی اذانوں میں

اور آخرت میں آپؐ پر جو انعامات کی بارش ہوگی اس کا ذکر ہم سابقہ رکوع میں پڑھ چکے ہیں۔ ویسے بھی پروردگار کا یہ فرمانا کہ آپؐ پر آپؐ کے رب کا فضل کبیر ہے۔ اس فضل کی وسعتوں اور عظمتوں کا تصور کرنا بھی انسان کی طاقت سے بہت بعید ہے۔ اس لیے کہ ہر متکلم اپنی حیثیت کے مطابق کسی چیز کو چھوٹا بڑا قرار دیتا ہے۔ ایک غریب آدمی جب یہ کہتا ہے کہ میرے پاس بڑی دولت ہے تو وہ چند ہزار سے زیادہ نہیں ہو سکتی، لیکن جب کوئی بادشاہ اس طرح کی بات کہتا ہے تو اس کو ہندسوں میں سمیٹنا بھی مشکل ہوتا ہے۔ اسی طرح جب اللہ تعالیٰ کسی چیز کو کبیر کے لفظ سے یاد فرماتے ہیں تو اس کے کبیر ہونے کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ﴿۸۸﴾ (سورۃ بنیٓ اسرآءِیل : ۸۸)

(کہہ دیجیے کہ اگر تمام انسان اور جن اس بات پر اکٹھے ہو جائیں کہ اس جیسا قرآن لا دیں تو وہ اس جیسا نہ لا سکیں گے، اگرچہ وہ ایک دوسرے کے مددگار بن جائیں۔ ۸۸)

قرآنِ کریم کا حیرت انگیز چیلنج

گزشتہ آیتِ کریمہ میں خطاب اگرچہ نبی کریم ﷺ سے تھا لیکن روئے سخن انھیں لوگوں کی طرف تھا جن کے سوال کا جواب گزشتہ آیت میں دیا گیا ہے۔ اس آیتِ کریمہ میں بھی انھیں سے فرمایا جا رہا ہے کہ جس ذاتِ عزیز پر وحی اترتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی کتاب نازل ہوتی ہے اس کی طاقت میں یہ بات نہیں کہ وہ وحی کو اپنی مرضی سے اپنے اوپر نازل کرے اور جب چاہے اسے روک دے۔ وہ تو اللہ تعالیٰ کے سامنے ایک بے بس اور بے اختیار بندہ ہے جسے خدا نے اس عظیم کام اور اس عظیم انعام کے لیے چن لیا ہے۔ اس کے بندہ ہونے کا عالم تو یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ اس پر نازل کردہ وحی کو واپس لے جائے تو وہ اسے ہرگز روک نہیں سکتا۔ حالانکہ اس وحی کو اس سے وابستگی ہے اور اسے وحی سے وابستگی ہے۔ اس پر اترنے والی کتاب اس کی رسالت کی تصدیق کرتی ہے اور بار بار اس کے فضائل بیان کرتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے اس کا خاص رشتہ ہے۔ بایں ہمہ وہ قرآن کے اترنے میں کوئی دخل نہیں رکھتا اور نہ قرآن جیسی کتاب لانے پر قادر ہے۔ تو باقی تمام جن و انس جن کا براہ راست وحیِ الٰہی سے کوئی تعلق نہیں اور وہ پروردگارِ عالم سے اس طرح کا کوئی تعلق نہیں رکھتے کہ وہ اس کی آواز سن سکیں یا اس کا کلام ان پر نازل ہو سکے۔ تو وہ یہ کیسے دعویٰ کر سکتے ہیں کہ یہ کتاب ان جیسے کسی

Marfat.com

انسان نے لکھ دی ہے اور کسی جن نے اس کی مدد کی ہے۔ چلیے تمھارا دعویٰ اگر قبول بھی کرلیا جائے کہ یہ کسی انسان کی کاوش کا نتیجہ ہے تو ہم تمھیں تمام انسانوں سمیت دعوت دیتے ہیں کہ تم اس قرآن جیسی کتاب بنا کے لاؤ۔ اور اس کی بھی اجازت دیتے ہیں کہ جن جنات کو تم اپنی مدد کے لیے پکارتے ہو، انھیں بھی اپنے ساتھ شامل کرلو۔ تم کبھی ایسا نہ کرسکو گے کیونکہ خالق کے کلام کا مقابلہ مخلوق کے بس کی بات نھیں۔

قرآن کریم کا یہ چیلنج پہلی دفعہ نھیں بلکہ پروردگار نے اس سے پہلے بھی قرآنِ کریم ہی کے اندر تین مقامات پر اسے دہرایا ہے۔ سورۂ بقرہ: آیات 23,24۔ سورۂ یونس: آیت 38۔ سورۂ ہود: آیت 12۔ ان تمام مقامات میں یہ بات کہی گئی ہے کہ تم اگر یہ سمجھتے ہو کہ قرآنِ کریم نبی کریم ﷺ نے خود تصنیف کرلیا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کا کلام نھیں اور ہمارا پیغمبر یہ غلط دعویٰ کررہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر نازل کیا ہے تو اس کا آسان حل یہ ہے کہ تم بھی اس طرح کی کتاب بنا کرلے آؤ۔ لیکن تقریباً ڈیڑھ ہزار سال گزرنے میں آئے، آج تک کفر اس کی ہمت نہ کرسکا۔ اور اگر کسی نے کوئی کوشش کی بھی تو اہلِ علم کی نگاہوں میں اس کا اپنا اعتبار جاتا رہا۔ اور عرب اپنی تمام تر زبان دانی کے دعووں کے باوجود کبھی اس کے لیے تیار نہ ہوئے۔ سوچنا پڑتا ہے کہ آخر قرآنِ کریم میں ایسی کیا بات ہے جس کی وجہ سے کوئی اس کی مثال لانے کی جرأت نہ کرسکا۔ تفصیل کے لیے آپ سورۂ بقرہ کی آیت 23 اور 24 پر ہماری گزارشات دروسِ قرآن میں نکال کے دیکھ لیجیے۔ اختصار سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ قرآنِ کریم اپنے حروف سے لے کر اپنے مضامین تک ہر چیز میں ایک معجزہ ہے۔ اس کے الفاظ اس لحاظ سے معجزہ ہیں کہ پورے قرآنِ کریم میں ایک لفظ بھی غیر فصیح نھیں جبکہ عربی زبان میں بیسیوں غیر فصیح الفاظ موجود ہیں۔ اس کے جملوں کی ساخت اور چستی اپنا جواب نھیں رکھتی۔ اس کے مرکبات کی ترکیب بے مثال ہے، اس کا اسلوب ایسا بے بدل ہے کہ اس کی نقل کرنا بھی ممکن نھیں۔ وہ شعر نھیں، لیکن شعر سے بڑھ کر اپنے اندر اپیل رکھتا ہے۔ اس کی عبارت میں ایک غنائیت ہے، توازن ہے، الفاظ میں ہم آہنگی ہے جو اپنے اندر ایسی تاثیر رکھتی ہے کہ جسے سن کر اہلِ زبان غلط فہمی میں اسے شعر کہہ اٹھتے تھے، اس کا باہمی ربط گہرا اور ٹھوس ہے، اس کے تاریخی مسلمات تنقید سے بالا ہیں، اس کی اخبار تاریخ کے مختلف ادوار میں اپنی صداقت منوا چکی ہیں، اس کا پیش کردہ نظامِ زندگی ہر طرح کے اختلاف اور باہمی تعارض اور تناقض سے معرا ہے، اس کا طرزِ استدلال اس قدر محکم ہے کہ اس کا جواب دینا سورج کو چراغ دکھانا ہے اور اس کے مباحث ہر طرح کے عیوب سے پاک ہیں۔ ایسی صفات سے مزین کتاب جن وانس کے بس کی بات کیسے ہوسکتی ہے۔ ایسا کلام صرف اللہ تعالیٰ کا ہوسکتا ہے، کسی اور کا نھیں۔

ایسے فصیح و بلیغ کلام کا نبی کریم ﷺ کی زبان سے ادا ہونا بجائے خود ایک معجزہ ہے۔ کیونکہ آنحضرت ﷺ انھیں خصوصیات کے حامل تھے جو ایک ذہین و فطین اُمی عرب میں ہوسکتی تھیں، کیونکہ آپؐ نے مکے کی فضا میں تربیت پائی اور زندگی گزاری تھی۔ اور پھر آپؐ نے زندگی کا بہترین حصہ اس طرح گزارا تھا کہ کبھی آپؐ سے ایسی کوئی بات سنی تک نھیں گئی تھی۔ آپؐ کا اندازِ کلام قرآنِ کریم کے اندازِ کلام سے یکسر مختلف تھا۔ آپؐ ان مسائل اور مضامین سے بالکل بے خبر تھے جنھیں قرآنِ کریم نے بیان کیا ہے۔ کتنے ایسے سوالات ہیں جو قریش و یہود کی جانب سے آپؐ سے کیے گئے، لیکن آپؐ اس کا جواب نہ دے پائے جب تک قرآنِ کریم نازل نہ ہوا۔ اور مزید یہ کہ آپؐ کی زبان آپؐ کا لب ولہجہ اور آپؐ کا اسلوب قرآنِ پاک کی زبان، لہجے اور اسلوب سے بالکل مختلف ہے۔ کیا عقل اس بات کو تسلیم کرسکتی ہے کہ ایک شخص چالیس سال تک جو زبان بولے وہ بالکل عربوں جیسی ہو، پھر وہ چالیس سال کے بعد بھی لوگوں سے جس زبان میں بات کرے وہ بھی لوگوں ہی کی زبان کے مطابق ہو۔ اور اپنی باتوں اور تعلیمات کو جس زبان میں امت کے لیے چھوڑ جائے وہ بھی قرآنِ کریم سے یکسر مختلف ہیں۔ کون عقل مند آدمی یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ قرآنِ کریم اس کا کلام ہے۔ آپؐ کی زندگی کے حالات کا ایک ایک ورق اور آپؐ کو جاننے اور پہچاننے والے ہزاروں آدمیوں میں سے ایک ایک آدمی اس بات کے گواہ ہیں کہ قرآنِ کریم کا آپؐ کی زبان پر جاری ہونا اور پھر 23 سال تک اس کا جاری رہنا اور آنحضرت ﷺ کا اس کی تعلیمات کو لوگوں تک پہنچانا اور راتوں کی نمازوں میں نہایت خشوع اور خضوع کے ساتھ اسے گھنٹوں کھڑے ہوکر پڑھنا اور اس کی دی ہوئی رہنمائی میں ایک معاشرہ کو وجود دینا، پھر اسی کی تعلیمات کے مطابق اسلامی ریاست کو تشکیل دینا اور پھر زندگی کے آخری لمحوں میں اسی کو اپنی امت کے سپرد کرکے اس امانت کا حق ادا کرنے کی تلقین کرکے جانا۔ کیا یہ باتیں یہ سمجھنے کے لیے کافی نھیں کہ یہ کلام اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل ہوا تھا اور آنحضرت ﷺ نے اسے اللہ تعالیٰ کا کلام سمجھ کر اس کے مطابق زندگی بھی گزاری اور لوگوں کو ہدایت بھی بخشی۔ اس لحاظ سے کہا جاسکتا ہے کہ قرآنِ کریم جس طرح اپنی ذات میں معجزہ ہے اسی طرح اپنے اثرات میں بھی معجزہ ہے اور یہی وہ اعجاز ہے جس کی مثال لانے سے دنیا عاجز ہے۔

Marfat.com

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِیْ ھٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ کُلِّ مَثَلٍ فَاَبٰٓی اَکْثَرُ النَّاسِ اِلَّا کُفُوْرًا ﴿۸۹﴾

(ہم نے اس قرآن میں لوگوں کو طرح طرح سے سمجھایا، لیکن اکثر لوگ انکار پر ہی اڑے ہوئے ہیں۔ ۸۹) (سورۃ بنیٓ اسرآءِ یل : ۸۹)

اللہ تعالیٰ کی بے پایاں رحمت اور انسانی رویہ

تصریف : کا معنی تو ''پھیرنا'' ہوتا ہے، لیکن جب اسے کلام میں اس طرح استعمال کیا جاتا ہے جیسے یہاں استعمال ہوا ہے تو پھر اس کا معنی ایک حقیقت کو مختلف اسلوبوں اور گوناگوں پیرایوں سے بیان کرنا ہوتا ہے۔ اور مِنْ کُلِّ مَثَلٍ سے اسی کی تاکید ہوتی ہے۔ لیکن بعض اہل علم کا خیال ہے کہ ضرب مثل سے مراد حکمت و معرفت کی بات کہنا ہے۔ اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس آیت میں فرمارہے ہیں کہ ہم نے قریشِ مکہ اور دوسرے لوگوں کو مختلف اسلوبوں اور گوناگوں پہلوؤں سے اور ہر طرح کی مثال سے کام لے کر سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اور قرآنِ کریم میں ہم نے حکمت و معرفت کے موتی بکھیرے ہیں۔ عقیدے کی ایک ایک بات کو مختلف طریقوں سے پانی کردیا ہے۔ انسانی فطرت کو مختلف مثالوں سے اجاگر کرنے کی کوشش کی۔ انسانی اعمال کے انجام کو قوموں کی تاریخ میں تول تول کر دکھایا ہے لیکن حیرت کی بات ہے کہ قریش کے رویئے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ چند سعید لوگوں کے علاوہ ان کا کفر بڑھتا ہی چلا گیا اور اب ان کا حال یہ ہے کہ ایسے ایسے مطالبات نبی کریم ﷺ سے کیے جارہے ہیں جو تاریخ میں وہ امتیں کرتی رہی ہیں جو مٹ جانے کے راستے پر چل رہی تھیں اور بالآخر مٹ گئیں۔

وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَکَ حَتّٰی تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ یَنْبُوْعًا ﴿۹۰﴾ اَوْ تَکُوْنَ لَکَ جَنَّۃٌ مِّنْ نَّخِیْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ
الْاَنْھٰرَ خِلٰلَھَا تَفْجِیْرًا ﴿۹۱﴾ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ کَمَا زَعَمْتَ عَلَیْنَا کِسَفًا اَوْ تَاْتِیَ بِاللہِ وَالْمَلٰٓئِکَۃِ قَبِیْلًا ﴿۹۲﴾
اَوْ یَکُوْنَ لَکَ بَیْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰی فِی السَّمَآءِ ؕ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِیِّکَ حَتّٰی تُنَزِّلَ عَلَیْنَا کِتٰبًا نَّقْرَؤُہٗ ؕ قُلْ
سُبْحَانَ رَبِّیْ ھَلْ کُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴿۹۳﴾ (سورۃ بنیٓ اسرآءِ یل : ۹۰۔۹۱۔۹۲۔۹۳)

(اور انہوں نے کہا ہم تو تمہاری بات ہرگز نہیں مانیں گے جب تک تم ہمارے لیے زمین کو پھاڑ کر کوئی چشمہ نہ جاری کردو۔ ۹۰) اور یا تمہارے پاس کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ نہ ہوجائے، پھر تم اس کے بیچ بیچ میں نہریں نہ دوڑا دو۔ ۹۱) یا تم ہم پر آسمان سے ٹکڑے نہ گرا دو جیسا کہ تم دعویٰ کرتے ہو یا اللہ اور فرشتوں کو سامنے نہ لا کھڑا کردو۔ ۹۲) یا تمہارے لیے سونے کا ایک گھر نہ بن جائے یا تم آسمان پر نہ چڑھ جاؤ اور ہم تمہارے چڑھنے کا بھی یقین نہ کریں گے جب تک تم وہاں سے ہم پر کوئی کتاب نہ اتارو جسے ہم پڑھیں، اے پیغمبرؐ ان سے کہہ دیجیے پاک ہے میرا پروردگار، میں تو بس ایک بشر ہوں، اللہ کا رسولؐ۔ ۹۳)

ایمان کے لیے قریش کی شرائط

ان آیات میں قریش اور دیگر مشرکین کے مطالبات بلکہ شرائط ذکر کی گئی ہیں جن کے ساتھ انھوں نے اپنے ایمان کو مشروط کر رکھا تھا کہ پہلے آپؐ یہ کارنامے ہمیں بروئے کار لا کر دکھائیں تب ہم مانیں گے کہ آپؐ واقعی اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں اور ہم آپؐ پر ایمان لے آئیں گے۔ اور اگر آپؐ ایسا نہیں کرتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپؐ اللہ تعالیٰ کے رسول نہیں۔ اب ذرا ان کے مطالبات غور سے دیکھیے۔

1- کہ آپؐ ہماری آنکھوں کے سامنے زمین کو پھاڑ کر ایک چشمہ نکال کر دکھائیں۔

2- یا یہ کہ دیکھتے ہی دیکھتے آپؐ کھجوروں اور انگوروں کے ایک باغ کے مالک ہوجائیں اور اس کے بیچ بیچ میں بہت سی نہریں نکال کر دکھائیں۔

Marfat.com

3- یا یہ کہ آسمان سے آپؐ ہم پر کچھ ٹکڑے گرادیں جیسا کہ آپؐ کہتے رہتے ہیں کہ اگر تم ایمان نہیں لاؤ گے تو تم پر آسمان سے عذاب آسکتا ہے اور یا یہ کہ اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کو ہمارے سامنے لاکھڑا کریں، ہم اپنی آنکھوں سے انھیں دیکھیں۔

4- یا یہ کہ آپؐ کے پاس ایک سونے کا مکان ہو یا آپؐ ہماری آنکھوں کے سامنے آسمان پر چڑھ جائیں، لیکن ہم اسے اس وقت تک نہیں مانیں گے جب تک آپؐ ہماری آنکھوں کے سامنے آسمان پر نہ چڑھیں اور پھر وہاں سے کوئی کتاب لے کر نہ آئیں جسے ہم خود پڑھ کر دیکھیں۔

ان مطالبات کو غور سے دیکھیے ان میں کہیں بھی سنجیدگی نظر آتی ہے۔ جن قوموں کو زندگی کے حقائق سے پیار ہوتا ہے اور وہ اپنی عاقبت کو سنوارنا چاہتی ہیں، کیا وہ اسی طرح کی باتیں کیا کرتی ہیں۔ لیکن قرآن کریم نے ان کے مطالبات کا جواب ایسے فصیح و بلیغ جملے میں ارشاد فرمایا ہے جس کی نظیر لانا انسان کے بس کی بات نہیں۔ بالکل ایک دوسرے پہلو سے ان پران کی غلطی واضح کی گئی ہے بشرطیکہ وہ اسے سمجھنا چاہیں۔ وہ پہلو یہ ہے کہ زمین سے چشمے نکالنا، کھجوروں اور انگوروں کے باغات پتھریلی زمین میں پیدا کر دینا اور بہت ساری نہروں کا رواں دواں کر دینا یا آسمان سے ٹکڑوں کا برسانا اور کسی کا آسمان پر چڑھنا اترنا اور اچانک سونے کا محل وجود میں آجانا، ان میں کون سا کام ہے جسے کرنے کا میں نے کبھی دعویٰ کیا ہو۔ یا ان میں سے کسی چیز کا میری دعوت سے تعلق ہو اور پھر جو میں پیغام تمھارے لیے لایا ہوں جس میں تمھاری دنیا اور آخرت کی بھلائی ہے ان میں سے کون سی بات ہے جو ان سے وابستہ ہے۔ میں نے ہمیشہ تمھیں اللہ تعالیٰ کی طرف بلایا، اس کی وحدانیت کی تعلیم دی، اس کی قدرت کاملہ کا بار بار تمھارے سامنے تذکرہ کیا، اسی سے ڈرنے اور اسی سے امیدیں باندھنے کی ترغیب دی، اسی کی بندگی میں شب و روز گزارنے کی تلقین کی اور میں نے اپنے آپ کو ہمیشہ ایک بشر اور بندے کی حیثیت سے تمھارے سامنے پیش کیا۔ یہ جن مطالبات کو تم لے بیٹھے ہو، کیا ان کا پورا کرنا کسی بشر کا کام ہوسکتا ہے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کی قدرت کے کام ہیں۔ وہی خالق کائنات ہے اور وہی جب چاہے بستیوں کو ویران کرسکتا ہے اور ویرانوں کو باغات میں تبدیل کرسکتا ہے۔ وہ چاہے تو سمندروں سے آگ اٹھنے لگے اور چاہے تو صحراؤں میں حباب تیرنے لگیں۔ میرا دعویٰ تو صرف یہ ہے کہ میں تمھارے طرح ایک انسان ہوں لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھے تمھاری ہدایت کے لیے رسول بنا کے بھیجا۔ مجھ پر ایک کتاب اتاری ہے، تم میری تعلیمات کو غور سے دیکھو، میری زندگی کے معمولات کو دیکھو، قرآن کریم کے دیے ہوئے نظام زندگی کو پڑھو، کوئی بات کہنی ہے تو ان سے متعلق کہو، کیونکہ یہ وہ باتیں ہیں جن کا تعلق میری رسالت سے ہے۔ رہی وہ باتیں جن کا مطالبہ تم مجھ سے کر رہے ہو، ان کا نہ میں نے دعویٰ کیا ہے اور نہ میرا ان سے کوئی تعلق ہے۔

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ یُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓی
اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴿٩٤﴾ قُلْ لَّوْ كَانَ فِی الْاَرْضِ
مَلٰٓئِكَةٌ یَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّیْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَیْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا
رَّسُوْلًا ﴿٩٥﴾ قُلْ كَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیْدًۢا بَیْنِیْ وَبَیْنَكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ
خَبِیْرًۢا بَصِیْرًا ﴿٩٦﴾ وَمَنْ یَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَمَنْ یُّضْلِلْ فَلَنْ
تَجِدَ لَهُمْ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِهٖ ؕ وَنَحْشُرُهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ عَلٰی
وُجُوْهِهِمْ عُمْیًا وَّبُكْمًا وَّصُمًّا ؕ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنٰهُمْ

Marfat.com

سَعِيْرًا ﴿٩٧﴾ ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا
عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ﴿٩٨﴾ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ
اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ
وَجَعَلَ لَهُمْ اَجَلًا لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۭ فَاَبَى الظّٰلِمُوْنَ اِلَّا كُفُوْرًا ﴿٩٩﴾ قُلْ
لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآئِنَ رَحْمَةِ رَبِّيْٓ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ
الْاِنْفَاقِ ۭ وَكَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا ﴿١٠٠﴾ ع

رکوع: ۱۱ (اور نھیں روکا لوگوں کو، اس بات سے کہ وہ ایمان لائیں جبکہ ان کے پاس ہدایت آ گئی، مگر اس چیز نے کہ انھوں نے کہا کیا اللہ تعالیٰ نے ایک بشر ہی کو رسول بنا کر بھیج دیا۔ ۹۴) اے پیغمبرؐ کہہ دیجیے! اگر زمین میں فرشتے اطمینان سے چلتے پھرتے ہوتے تو ہم ضرور آسمان سے کسی فرشتے ہی کو ان کے لیے پیغمبر بنا کے بھیجتے۔ ۹۵) کہہ دیجیے! کہ میرے اور تمھارے درمیان ایک اللہ تعالیٰ کی گواہی کافی ہے، بیشک وہی اپنے بندوں کو خوب جاننے والا ہے، خوب دیکھنے والا ہے۔ ۹۶) اور جس کو اللہ تعالیٰ ہدایت دے، پس وہی ہدایت پانے والا ہے اور جسے وہ گمراہی میں ڈال دے تو تم ان کے لیے اس کے سوا کسی کو مددگار نہ پاؤ گے، اور ہم ان کو قیامت کے دن اکٹھا کریں گے، ان کے مونہوں کے بل، اندھے، گونگے اور بہرے، ان کا ٹھکانہ جہنم ہے، جب کبھی اس کی آگ دھیمی ہونے لگے گی ہم اس کو مزید بھڑکا دیں گے۔ ۹۷) یہ بدلہ ہے ان کی اس حرکت کا کہ انھوں نے ہماری آیات کا انکار کیا اور کہا، کیا جب ہم صرف ہڈیاں اور ریزہ ریزہ ہو جائیں گے تو نئے سرے سے ہم کو پیدا کر کے اٹھا کھڑا کیا جائے گا؟ ۹۸) کیا انھوں نے غور نھیں کیا کہ جس اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا وہ قادر ہے اس بات پر کہ ان کے مانند پھر پیدا کر دے اور اس نے مقرر کر رکھی ہے ان کے لیے ایک مدت جس میں کوئی شک نھیں، پس ان ظالموں نے کفر کے سوا ہر بات سے انکار کیا۔ ۹۹) اے پیغمبرؐ کہہ دیجیے کہ اگر تم میرے رب کے خزانوں کے مالک ہوتے تو تم خرچ ہو جانے کے اندیشے سے ہاتھ روک لیتے، اور انسان بڑا ہی تنگدل ہے۔ ۱۰۰)

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴿٩٤﴾

(اور نھیں روکا لوگوں کو، اس بات سے کہ وہ ایمان لائیں جبکہ ان کے پاس ہدایت آ گئی، مگر اس چیز نے کہ انھوں نے کہا کیا اللہ تعالیٰ نے ایک بشر ہی کو رسول بنا کر بھیج دیا۔ ۹۴) (سورۃ بنی اسرآءِیل : ۹۴)

Marfat.com

نبی کی بشریت ایمان کے راستے کی رکاوٹ

رسول اللہ ﷺ کی جب رسول کی حیثیت سے بعثت ہوئی اور آپؐ نے اہلِ مکہ کے سامنے یہ دعویٰ کیا کہ میں تمھاری طرف خصوصی طور پر اور ساری دنیا کی طرف عمومی طور پر اللہ تعالیٰ کا رسول بن کے آیا ہوں۔ اور آپؐ نے اہلِ مکہ کو اپنی نبوت پر ایمان لانے کی دعوت دی۔ اور آپؐ نے دلیل کے طور پر سب سے بڑی بات جو ان سے فرمائی وہ یہ تھی کہ نبوت کوئی دیکھی جانے والی چیز نہیں اور نہ جسم سے ظاہر ہونے والی کوئی ایسی چیز ہے جسے لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں۔ اس کا تعلق نبوت کا دعویٰ کرنے والے کے کردار سے ہے۔ اگر اس کا کردار ایک پیغمبر کا کردار ہے اور اس نے زندگی بھر کبھی جھوٹ نہیں بولا او اپنی ۴۰ سالہ زندگی جو نہ صرف کہ لوگوں کے اندر گزاری بلکہ ان کی آنکھوں کے سامنے اس طرح گزاری کہ بچپن اپنی قوم کی گود میں گزرا، لڑکپن حرم میں کھیلتے کودتے گزرا، اس کے بعد آپؐ نے بکریاں چرائیں۔ ذرا بڑے ہوئے تو آپؐ نے اپنے چچا کے ساتھ بیرون ملک کا سفر کیا، جوانی آئی تو آپؐ تجارت کی طرف متوجہ ہوئے اور دوسرے تاجروں کے ساتھ مل کر تجارت فرمائی۔ حضرت خدیجہ طاہرہؓ نے آپؐ کی دیانت و امانت اور معاملہ فہمی کی شہرت سن کر اپنا مال آپؐ کے حوالے کر دیا اور اپنے کاروبار کا آپؐ کو مختار بنا دیا۔ پھر آپؐ نے شادی فرمائی، آپ کے بچے ہوئے۔ شہر میں دوسرے لوگوں میں آپؐ گھل مل کے رہے۔ حرم کی نشستوں میں آپؐ کا اٹھنا بیٹھنا رہا۔ بعض جنگوں میں آپؐ نے اپنی قوم کا ساتھ دیا۔ بے بس اور بے کس لوگوں کی مدد کے لیے مکے کے اہلِ خیر نے ایک معاہدہ کیا جسے حلف الفضول کہا جاتا ہے، آپؐ اس میں پیش پیش رہے۔ کہنا یہ ہے کہ آپؐ نے اپنی قوم اور اپنے شہر والوں کے ساتھ ایک بھرپور زندگی گزاری۔ آپؐ کی قوم آپؐ کے شب و روز کے معمولات سے مکمل طور پر آگاہ تھی۔ آپؐ کی زندگی ان کے لیے ایک کھلی کتاب تھی، جس کا ہر ورق ان کے سامنے تھا۔ جب آپؐ کو نبوت دی گئی تو آپؐ نے اپنی ذات اور اپنے کردار کو دلیل کے طور پر قوم کے سامنے پیش کیا اور کوہِ صفا پر چڑھ کے پوچھا کہ لوگو! تم پوری طرح میری زندگی سے واقف ہو، کیا تمھیں کبھی چالیس سالوں میں کسی ایک موقع پر بھی مجھ سے جھوٹ بولنے کا تجربہ ہوا ہے، میں نے کبھی کسی خیانت کا ارتکاب کیا، میں نے کبھی کسی کی دلآزاری کی، غور کیجیے جس شخص نے چالیس سال میں کبھی جھوٹ نہ بولا ہو اور زندگی کے شب و روز بادِ نسیم کی طرح بے عیب گزارے ہوں اور پھر وہ اپنی قوم سے صاف صاف پوچھتا ہو کہ بتاؤ تم میرے بارے میں کیا رائے رکھتے ہو۔ جب قوم نے اعتراف کیا کہ ہم نے کبھی آپ کو جھوٹ بولتے نہیں سنا تو تب آپؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے تمھاری طرف رسول بنا کے بھیجا ہے اور پھر آپؐ نے ان کے سامنے اسلام کا پیغام پیش کیا۔ قوم نے جب دیکھا کہ اس عظیم ذات میں کوئی ایسی بات نہیں جسے ہم بطورِ اعتراض پیش کر سکیں، کوئی ایسی کمزوری نہیں جو تلاش کے باوجود بھی لوگوں کے سامنے پیش کی جا سکے۔ البتہ ایک بات ہے کہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ نبوت و رسالت بہت بلند، بہت اعلیٰ و ارفع اور بہت نازک مقام ہے۔ اس مقام پر کسی بشر کا فائز ہونا، ایک ناقابلِ فہم بات ہے۔ کہاں زمین پر بسنے والا ایک معمولی انسان، اور کہاں نبوت و رسالت کا مقام، ان دونوں میں یکجائی نہیں ہو سکتی۔ نبی بشر نہیں ہو سکتا اور بشر کو نبوت نہیں مل سکتی۔ محمد (ﷺ) اپنی ساری خوبیوں کے باوجود نہ صرف ایک بشر ہے بلکہ ایک غریب آدمی بھی ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں پروردگار یہ فرما رہا ہے کہ جب ان کے سامنے ہدایت کھل کر آ گئی، قرآنِ کریم کی فصاحت و بلاغت نے انھیں گنگ کر کے رکھ دیا۔ آنحضرت ﷺ کی نہایت دلآویز شخصیت میں ہزار کوشش کے باوجود جب کوئی کمزوری تلاش نہ کر سکے تو آخری بات انھوں نے یہ کہی کہ ہم ایک بشر کو رسول ماننے سے معذور ہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک بشر کو رسول بنا کے بھیج دے انسان بھی عجیب واقع ہوا ہے۔ کبھی کبر کا شکار ہو کر نہ جانے اپنے آپ کو کیا سمجھنے لگتا ہے اور خدا کے سامنے جھکنے سے بھی انکار کر دیتا ہے۔ اور کبھی اس حد تک اپنی آپ کو گرا لیتا ہے کہ پتھر کے گھڑے ہوئے بتوں کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتا ہے اور عزتِ نفس سے محروم ہو کر بشریت کو ذلت کی علامت سمجھنے لگتا ہے۔ ذوق نے اسی کا ماتم کرتے ہوئے کہا تھا

بشر جو اس تیرہ خاکداں میں پڑا یہ اس کی اپنی فروتنی ہے
وگرنہ قندیلِ عرش میں بھی اسی کے جلوے کی روشنی ہے

Marfat.com

قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ﴿۹۵﴾

(اے پیغمبرؐ کہہ دیجیے! اگر زمین میں فرشتے اطمینان سے چلتے پھرتے ہوتے تو ہم ضرور آسمان سے کسی فرشتے ہی کو ان کے لیے پیغمبر بنا کے بھیجتے۔ ۹۵)　(سورۃ بنیٓ اسرآءِیل : ۹۵)

انبیا کے بشر ہونے کی حکمت

گزشتہ آیتِ کریمہ میں اہلِ مکہ کا آپؐ پر ایمان نہ لانے کا جو سبب بیان کیا گیا ہے اس آیتِ کریمہ میں اس کا جواب دیا گیا ہے۔ اور جواب اتنا سادہ، اتنا واضح، اتنا مسکت اور اتنا حکیمانہ ہے کہ اس سے بہتر جواب کے بارے میں سوچا بھی نہیں جاسکتا۔ جواب کا حاصل یہ ہے کہ تم یہ بتاؤ کہ زمین پر بسنے والے کیا انسانوں کے علاوہ کوئی اور مخلوق ہیں، کیا وہ فرشتے ہیں۔ اگر تو ایسا ہے تو پھر تو یقیناً اللہ تعالیٰ کو چاہیے تھا کہ ان کی ہدایت کے لیے کسی فرشتے کو بھیجتا لیکن جب زمین پر رہنے والے انسان ہی ہیں تو پھر ان کی ہدایت کے لیے انسان کے علاوہ کسی اور کو کیسے بھیجا جاسکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا رسول دنیا میں صرف زندگی گزارنے کے لیے نہیں آتا بلکہ وہ انسانوں کی اصلاح کے لیے آتا ہے۔ ایک ایک شخص کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کی بندگی کے جذبات پیدا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات کا صحیح شعور دماغوں میں اتارتا ہے پھر اسے اس کے مقصدِ زندگی سے آگاہ کرتا ہے۔ پھر انسانوں کو اجتماعی زندگی گزارنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے شریعت پہنچاتا ہے اور ان کی عملی زندگی پر اس کا انطباق کر کے دکھاتا ہے۔ زندگی کے تمام شعبوں میں اس طرح رہنمائی مہیا کرتا ہے کہ کہیں بھی انسانوں کو کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ جو لوگ اس کی رہنمائی کو قبول کرتے ہیں ان سے ایک معاشرہ تشکیل کرتا ہے اور اس نئے دین کی مخالفت کرنے والوں کی مخالفت کو برداشت کرنے اور ان سے عہدہ برآء ہونے کی تربیت دیتا ہے۔ حق و باطل کی یہ کشمکش اگر حرب و ضرب کے دور میں داخل ہوجاتی ہے تو اس میں بھی پوری طرح ان کی قیادت کرتا ہے۔ غرضیکہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کے جتنے مدارج ہیں ان میں ایک ایک مرحلے پر تربیت کا اس طرح سامان کرتا ہے کہ کہیں بھی رہنمائی کا جھول پیدا نہیں ہوتا اور ایک ایسی مکمل زندگی وجود میں آتی ہے جس سے بہتر زندگی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ تصور کیجیے کہ اگر بشر کی بجائے کسی فرشتے کو اس کام کے لیے بھیجا جاتا تو وہ اسے کیسے سرانجام دے سکتا تھا اور اس پر ایمان لانے والے اس سے کیا استفادہ کرسکتے تھے۔ نہ وہ نظر آتا کہ اس کی پیروی کرسکیں، نہ اسے بھوک لگتی، نہ اسے کسی تکلیف کا احساس ہوتا، نہ اس کے اندر انسانی احساسات ہوتے، نہ اس کی بیوی ہوتی، نہ بچے ہوتے، نہ اسے کھانے پینے کی ضرورت لاحق ہوتی، نہ اسے انسانی معاملات سے سابقہ پڑتا، تو وہ اسوۂ حسنہ جس کی رہنمائی اور پیروی میں امت کا کردار تشکیل پاتا ہے، وہ کہاں سے وجود میں آتا۔ اس لیے عقل اور حکمت کی بات اس کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتی کہ معلم، مربی اور پیغمبر مخلوق کی اسی صنف میں سے ہونا چاہیے جس صنف کی رہنمائی کے لیے اسے بھیجا جارہا ہو۔ نبی کریم ﷺ چونکہ انسانوں کی رہنمائی کے لیے دنیا میں تشریف لائے تو اس لیے آپؐ کو بشر پیدا کیا گیا۔ آپؐ اپنی ذات اور ذاتی ضروریات میں یقیناً باقی انسانوں کی طرح ایک انسان اور ایک بشر ہیں اور یہی ہمارا ایمان ہونا چاہیے لیکن اپنے کمالات اور مراتب کے اعتبار سے آپؐ خیر البشر ہیں جس کا ہمسر نہ کوئی انسان ہوسکتا ہے اور نہ کوئی فرشتہ ہوسکتا ہے۔

قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۢ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًا ۢ بَصِيْرًا ﴿۹۶﴾

(کہہ دیجیے! کہ میرے اور تمہارے درمیان ایک اللہ تعالیٰ کی گواہی کافی ہے، بیشک وہی اپنے بندوں کو خوب جاننے والا ہے، خوب دیکھنے والا ہے۔ ۹۶)　(سورۃ بنیٓ اسرآءِیل : ۹۶)

معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کرنے کی ہدایت

آنحضرت ﷺ سے فرمایا جارہا ہے کہ آپؐ اہلِ مکہ سے کہہ دیجیے کہ تمہیں نہ تو میرے کردار پر اعتراض ہے اور نہ تمہیں میری دعوت میں شبہ ہے۔ لے دے کے تمہیں میرے بشر ہونے پر اعتراض ہے۔ اس کا مکمل جواب گزشتہ آیتِ کریمہ میں دے دیا گیا۔ اگر نیت سمجھنے کی ہو تو

Marfat.com

اس سے زیادہ وضاحت کی ضرورت نہیں، لیکن اگر اس کے باوجود بھی تم اپنی بات پر اڑے ہوئے ہو تو پھر میں معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کرتا ہوں، کیونکہ اللہ تعالیٰ میرے اور تمہارے درمیان گواہی کے لیے کافی ہے۔ وہ خوب جانتا ہے کہ تمہارے ایمان نہ لانے کا سبب یہ ہے کہ تم بشریت اور نبوت کی حقیقت کو نہیں سمجھ سکے یا یہ محض تمہاری ضد اور انانیت ہے۔ اللہ تعالیٰ دلوں میں چھپی ہوئی نیتوں کو جانتا ہے۔ وہ بندوں کے ظاہر و باطن سے واقف ہے۔ فیصلہ آخر کار اسی کو کرنا ہے۔ اس لیے میں معاملہ اسی کے سپرد کرتا ہوں۔

وَمَنْ یَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَمَنْ یُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِهٖ ؕ وَنَحْشُرُهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ عَلٰی وُجُوْهِهِمْ عُمْیًا وَّ بُكْمًا وَّ صُمًّا ؕ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنٰهُمْ سَعِیْرًا ﴿۹۷﴾

(اور جس کو اللہ تعالیٰ ہدایت دے، پس وہی ہدایت پانے والا ہے اور جسے وہ گمراہی میں ڈال دے تو تم ان کے لیے اس کے سوا کسی کو مددگار نہ پاؤ گے، اور ہم ان کو قیامت کے دن اکٹھا کریں گے، ان کے مونہوں کے بل، اندھے، گونگے اور بہرے، ان کا ٹھکانہ جہنم ہے، جب کبھی اس کی آگ دھیمی ہونے لگے گی ہم اس کو مزید بھڑکا دیں گے۔ ۹۷) (سورۃ بنیٓ اسرآءِیل : ۹۷)

ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ کی سنت

قرآنِ کریم کی تمام تر وضاحتوں اور آنحضرت ﷺ کی بے پناہ کوششوں کے باوجود جب مشرکینِ مکہ ایمان لانے کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے تو آنحضرت ﷺ کے دل پر نہ جانے کیا گزرتی تھی۔ آپؐ جانتے تھے کہ یہ ایمان نہ لانے والے آج اس قدر اکڑفوں دکھا رہے ہیں اور کسی کی بات سننے کے روادار نہیں۔ کاش انھیں یقین آجاتا کہ ان کی یہ روش قیامت کو انھیں بہت مہنگی پڑے گی اور ان کا انجام بہت خطرناک ہوگا۔ آپؐ کی اس دل گرفتگی کو دیکھتے ہوئے پروردگار نے مختلف مواقع پر آپؐ کو تسلی بھی دی ہے اور ساتھ ہی ساتھ انکار کرنے والوں کو وارننگ بھی۔ چنانچہ یہاں بھی نبی کریم ﷺ کو اطمینان دلاتے ہوئے ارشاد فرمایا جارہا ہے کہ آپ کی تبلیغی مساعی میں کوئی کمی نہیں۔ لیکن ہدایت وہی پاتا ہے جسے اللہ تعالیٰ ہدایت دے اور جسے اللہ تعالیٰ گمراہ کردے، اللہ تعالیٰ کے سوا اس کی کوئی مدد کرنے والا نہیں۔ البتہ ساتھ ہی ساتھ یہ بات واضح فرمادی کہ ہمارے یہاں ہدایت و ضلالت کا ایک قانون ہے۔ وَنَحْشُرُهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ عَلٰی وُجُوْهِهِمْ عُمْیًا وَّ بُكْمًا وَّ صُمًّا میں اس سنت اللہ کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ جب کسی قوم میں اللہ تعالیٰ کا رسول مبعوث ہوتا ہے اور وہ اپنی قوم میں شب و روز تبلیغ و دعوت کے لیے جان لڑاتا ہے، اپنی صلاحیت کا ایک ایک قطرہ اس راستے میں نچوڑ دیتا ہے اور لوگوں کو ہر پہلو سے سمجھانے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن قوم پیغمبر کی دعوت پر غور کرنے کی بجائے اس کے انکار پر تل جاتی ہے۔ مزاحمت کا ہر طریقہ اختیار کرتی ہے، اذیت رسانی میں وہ دشمنوں سے بھی آگے بڑھ جاتی ہے، شرافت کی ہر قدر کو پامال کردیتی ہے، جو آنکھیں اللہ تعالیٰ کی نشانیاں دیکھنے کے لیے پروردگار نے عطا فرمائی ہیں اور جو زبانیں حق کی گواہی دینے کے لیے اور جو کان تبلیغ و دعوت کو سننے کے لیے دیے گئے ہیں وہ ان میں سے ہر ایک قوت کو اللہ تعالیٰ کے دین کا راستہ روکنے کے لیے استعمال کرتی ہے۔ پروردگار ایک مدت تک اس صورتحال کو برداشت کرتا ہے اور ایسے لوگوں کو مہلت دیتا چلا جاتا ہے۔ لیکن پھر ایک وقت آتا ہے جب اللہ تعالیٰ کا قانون حرکت میں آتا ہے اور ان کی محرومی کا فیصلہ کردیا جاتا ہے۔ ان کے دلوں پر مہر کردی جاتی ہے اور گمراہی کی چھاپ ایسی گہری کردی جاتی ہے جس سے نکلنا ان کے بس میں نہیں رہتا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کے غلط استعمال کی وجہ سے ان کی بینائی، ان کی شنوائی اور ان کی گویائی سلب کرلی جاتی ہے۔ آخر ان کا ٹھکانہ جہنم ہوتا ہے اور جہنم میں بھی ایسی سخت سزا ملے گی کہ جب بھی جہنم کی آنچ اور اس کی تیزی مدھم ہونے لگے گی، اسے تیز کردیا جائے گا تاکہ ان کے عذاب میں تخفیف نہ ہونے پائے۔ اور جہنم میں مونہوں کے بل گھسیٹتے ہوئے انھیں پھینکا جائے گا۔

Marfat.com

ذٰلِکَ جَزَاۗؤُهُمْ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ﴿۹۸﴾

(یہ بدلہ ہے ان کی اس حرکت کا کہ انھوں نے ہماری آیات کا انکار کیا اور کہا، کیا جب ہم صرف ہڈیاں اور ریزہ ریزہ ہو جائیں گے تو نئے سرے سے ہم کو پیدا کر کے اٹھا کھڑا کیا جائے گا؟ ۹۸) (سورۃ بنیٓ اسرآءِیل : ۹۸)

قیامت سے انکار کا نتیجہ

گزشتہ آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ کے قانون ہدایت وضلالت کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ جب انسان اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی صلاحیتوں سے قبولیتِ حق میں کام لینے کی بجائے حق کی مخالفت میں کام لینا شروع کر دیتا ہے اور سمجھانے بجھانے کی تمام کوششوں کے باوجود وہ پلٹنے کا نام نہیں لیتا تو تب اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی محرومی کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں مشرکینِ مکہ کے بگڑے ہوئے رویئے اور اللہ تعالیٰ کے دین سے مخالفت وعناد کے حوالے سے ان کی صرف ایک بات کا ذکر کیا جا رہا ہے کہ ان کا حال یہ ہے کہ متعدد مواقع پر قیامت کو دلائل سے ثابت کئے جانے کے باوجود جب بھی انھیں موقع ملتا ہے وہ بڑی بلند آہنگی سے یہ کہتے ہیں کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جب ہم مرنے کے بعد بوسیدہ ہڈیوں اور ریزہ ریزہ جسم کی صورت میں مٹی میں مل جائیں گے تو ہمیں اس وقت از سرِ نو زندہ کر کے اٹھایا جائے گا۔ یہ ایک ایسی ناقابلِ یقین بات ہے کہ جسے ماننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، لیکن پیغمبر بار بار ہم سے یہ بات منوانے پر تلا ہوا ہے۔ اے کاش انھیں احساس ہوتا کہ یہی ناقابلِ یقین بات واقعہ بننے والی ہے۔ سب لوگ زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے اور انکار کرنے والے اپنے بدترین انجام کو پہنچیں گے۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ قَادِرٌ عَلٰٓي اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ وَجَعَلَ لَهُمْ اَجَلًا لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۭ فَاَبَى الظّٰلِمُوْنَ اِلَّا كُفُوْرًا ﴿۹۹﴾

(کیا انھوں نے غور نہیں کیا کہ جس اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا وہ قادر ہے اس بات پر کہ ان کے مانند پھر پیدا کر دے اور اس نے مقرر کر رکھی ہے ان کے لیے ایک مدت جس میں کوئی شک نہیں، پس ان ظالموں نے کفر کے سوا ہر بات سے انکار کیا۔ ۹۹) (سورۃ بنیٓ اسرآءِیل : ۹۹)

قیامت کے لیے وقت مقرر ہے

گزشتہ آیتِ کریمہ میں پروردگار نے ان کے اس استبعاد کا ذکر کیا کہ ہم مر کر جب مٹی ہو جائیں گے تو ہمیں دوبارہ کیسے زندہ کیا جائے گا۔ تو اس کا جواب دیتے ہوئے اس آیتِ کریمہ میں پروردگار فرماتے ہیں کہ یہ لوگ ایمان کے نور سے تو محروم ہیں ہی تو کیا عام غور وفکر کی صلاحیت بھی کھو بیٹھے ہیں۔ اتنی بات تو ایک معمولی عقل کا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ یہ لوگ تسلیم کرتے ہیں کہ زمین وآسمان کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا اور وہی اس کا نظام چلا رہا ہے۔ تو جو ذات اس قدر قدرتوں کی مالک ہے تو اس کے بارے میں یہ بات سمجھنا کتنا مشکل ہے کہ وہ دوبارہ انسان کو از سرِ نو زندہ کرنے پر بھی قادر ہے۔ اگر کوئی شخص تاج محل کے معمار کے بارے میں یہ کہے کہ وہ اس کے گرے ہوئے ستونوں کو دوبارہ نہیں بنا سکتا تو سننے والا ہنسے گا کہ یہ کیسا بے وقوف آدمی ہے، جس شخص نے تاج محل بنایا کیا وہ گرے ہوئے ستون نہیں بنا سکتا، اس سے زیادہ حماقت کی بات اور کیا ہوگی۔

مشرکینِ مکہ کا ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ اگر قیامت کا آنا واقعی ایک حقیقت ہے تو پھر وہ آج تک آئی کیوں نہیں، آخر اسے کس چیز نے روک رکھا ہے۔ اس آیت کے دوسرے حصے میں پروردگار نے اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں کام الل ٹپ نہیں ہوتے، اس کے یہاں ہر کام کا ایک فیصلہ ہوتا ہے اور ہر فیصلے کے پیچھے ایک حکمت ہوتی ہے۔ قیامت کے لیے بھی اس نے ایک وقت مقرر کر رکھا ہے، لیکن اس کا علم اس کے سوا کسی اور کو نہیں۔ اور اس مقرر وقت پر قیامت کا آنا یقینی ہے۔ جب وہ وقت آ جائے گا تو نہ اس میں تقدیم ہوگی اور نہ تاخیر ہوگی۔ لیکن ان ظالموں کا

Marfat.com

کیا کیا جائے یہ قیامت کے وقوع پر ایک سے ایک دلیل سن چکے ہیں لیکن اس کے باوجود ان کے انکار اور کفر میں کوئی کمی نہیں آئی۔ انھیں ہر چیز سے انکار ہے لیکن اپنے جامد رویئے سے نہ انکار ہے اور نہ اس پر غور کرنے کے لیے تیار ہیں۔

قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآئِنَ رَحْمَةِ رَبِّيْٓ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ ؕ وَكَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا ﴿١٠٠﴾

(اے پیغمبرؐ کہہ دیجیے کہ اگر تم میرے رب کے خزانوں کے مالک ہوتے تو تم خرچ ہو جانے کے اندیشے سے ہاتھ روک لیتے، اور انسان بڑا ہی تنگدل ہے۔ 100) (سورۃ بنیٓ اسرآءِیل : ۱۰۰)

حضرت حکیم الامۃ تھانوی نے بیان القرآن میں اس جگہ رحمت رب سے مراد نبوت و رسالت اور خزائن رحمت و رسالت سے مراد کمالات نبوت لیے ہیں۔ اس تفسیر کے مطابق اس کا ربط آیاتِ سابقہ سے یہ ہوگا کہ تم جو نبوت و رسالت کے لیے بے سروپا اور بے ہودہ مطالبات کر رہے ہو اس کا حاصل یہ ہے کہ میری نبوت کو ماننا نہیں چاہتے تو کیا پھر تمھاری خواہش یہ ہے کہ نبوت کا نظام تمھارے ہاتھوں میں دے دیا جائے جس کو تم چاہو نبی بنالو۔ اگر ایسا کرلیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم کسی کو بھی نبوت و رسالت نہ دو گے بخل کرکے بیٹھ جاؤ گے۔ حضرتؒ نے اس تفسیر کو نقل کرکے فرمایا ہے کہ یہ تفسیر مواہب الٰہیّہ میں سے ہے کہ مقام کے ساتھ نہایت چسپاں ہے۔ اس میں نبوت کو رحمت کے ساتھ تعبیر کرنا ایسا ہوگا جیسا آیت اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَةَ رَبِّكَ میں بالاجماع، رحمت سے مراد نبوت ہی ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

قریش کی خست پر چوٹ

بعض اہلِ علم کا خیال یہ ہے کہ کفارِ مکہ کو قیامت اور بعث بعد الموت کا یقین اس لیے نہیں آتا تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی صفتِ تخلیق کو ماننے کے باوجود اس کی قدرتِ کاملہ کے بارے میں مذبذب تھے۔ ان کے ذہن میں یہ بات نہیں اترتی تھی کہ انسانوں کی مکمل تباہی کے بعد دوبارہ زندگی کیسے پیدا ہو سکتی ہے اور از سرِنو کائنات کی بساط کیسے بچھائی جاسکتی ہے۔ اس عدمِ یقین اور شک پر تعریض کرتے ہوئے پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں یہ فرمایا جارہا ہے کہ ایک طرف تو تم اپنے پروردگار کی قدرتِ کاملہ پر یقین نہ ہونے کے باعث بعث بعد الموت کے بارے میں متردد ہو اور دوسری طرف تمھارا حال یہ ہے کہ تمھاری خواہش یہ ہے کہ دنیا بھر کے خزانے تمھارے قبضے میں آجائیں حتیٰ کہ نبوت اور رسالت بھی تمھاری تحویل میں ہو اور ساتھ ہی ساتھ تمھاری تنگدلی اور بخل ایک جانی پہچانی سی بات ہے۔ تم تو اگر اپنے رب کے خزانوں کے مالک بھی بن جاؤ تو تمھیں ہر وقت یہ کھٹکا لگا رہے گا کہ اگر انھیں خرچ کیا گیا تو یہ ایک نہ ایک دن ختم ہو جائیں گے اور اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کی وسعت کا عالم یہ ہے کہ وہ اب بھی مخلوقات کو رزق دیتا ہے۔ اور جب دوبارہ زندگی کی بساط بچھائے گا تو پھر ابدالآباد تک ان مخلوقات کو رزق بہم پہنچائے گا اور بے حساب نعمتیں دے گا جنھیں اس وقت کی کائنات میں زندہ رکھا جائے گا۔ یہ تمھاری تنگدلی ہے جو تمھیں قیامت کو تسلیم کرنے سے بھی روکتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے رسولؐ کی عظمتوں کا اعتراف کرنے سے بھی۔ بخل کی وجہ سے ہر چیز کو حاصل کرنے کی خواہش تو رکھتے ہو لیکن حوصلہ مندی میں کمی کی وجہ سے حقائق کو تسلیم کرنے سے قاصر ہو۔ اللہ تعالیٰ کا معاملہ تمھاری تنگدلی کی وجہ سے تمھارے ساتھ تمھاری تنگدلی کے مطابق ہے۔ تم صرف خزف ریزوں کے اہل تھے تو اس نے تمھیں دنیا کے خزف ریزے دے دیے، لیکن نبوت جیسے فضل عظیم کے اہل چونکہ نبی کریم ﷺ تھے، اس لیے یہ عظیم دولت ان کو عطا کی گئی۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ تم اپنی طبعی کمزوری پر اصرار کرنے کی بجائے حقائق کا سامنا کرو اور اللہ تعالیٰ کے رسول کی عظمت کا اعتراف کرو۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ فَسْـَٔلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِذْ جَآءَهُمْ فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ

Marfat.com

اِنِّیْ لَاَظُنُّكَ یٰمُوْسٰی مَسْحُوْرًا ﴿۱۰۱﴾ قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَاۤ اَنْزَلَ هٰۤؤُلَآءِ
اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ بَصَآىِٕرَ ۚ وَ اِنِّیْ لَاَظُنُّكَ یٰفِرْعَوْنُ
مَثْبُوْرًا ﴿۱۰۲﴾ فَاَرَادَ اَنْ یَّسْتَفِزَّهُمْ مِّنَ الْاَرْضِ فَاَغْرَقْنٰهُ وَ مَنْ
مَّعَهٗ جَمِیْعًا ﴿۱۰۳﴾ لا وَّ قُلْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ لِبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اسْكُنُوا
الْاَرْضَ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ جِئْنَا بِكُمْ لَفِیْفًا ﴿۱۰۴﴾ ط وَ بِالْحَقِّ
اَنْزَلْنٰهُ وَ بِالْحَقِّ نَزَلَ ؕ وَ مَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّ نَذِیْرًا ﴿۱۰۵﴾ ۘ
وَ قُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّ نَزَّلْنٰهُ تَنْزِیْلًا ﴿۱۰۶﴾
قُلْ اٰمِنُوْا بِهٖۤ اَوْ لَا تُؤْمِنُوْا ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖۤ اِذَا
یُتْلٰى عَلَیْهِمْ یَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا ﴿۱۰۷﴾ لا وَّ یَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَاۤ
اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا ﴿۱۰۸﴾ وَ یَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ یَبْكُوْنَ وَ
یَزِیْدُهُمْ خُشُوْعًا ﴿۱۰۹﴾ السجدۃ قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَیًّا مَّا
تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۚ وَ لَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَ لَا
تُخَافِتْ بِهَا وَ ابْتَغِ بَیْنَ ذٰلِكَ سَبِیْلًا ﴿۱۱۰﴾ وَ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ
لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّ لَمْ یَكُنْ لَّهٗ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ وَ لَمْ یَكُنْ
لَّهٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَ كَبِّرْهُ تَكْبِیْرًا ﴿۱۱۱﴾ ع

Marfat.com

رکوع: ۱۲۔ (اور ہم نے عطا فرمائی تھیں موسیٰ (علیہ السلام) کو 9 کھلی ہوئی نشانیاں، آپ خود بنی اسرائیل سے پوچھ لیں کہ جب موسیٰ علیہ السلام ان کے پاس آئے تو فرعون نے ان سے کہا کہ اے موسیٰ (علیہ السلام) میں تم کو ایک سحر زدہ آدمی سمجھتا ہوں۔ ۱۰۱) (موسیٰ (علیہ السلام) نے جواب دیا کہ تو جانتا ہے کہ ان آیات کو نہیں اتارا، مگر آسمانوں اور زمین کے رب نے آنکھیں کھول دینے کے لیے، اور میں تو تم کو اے فرعون ہلاکت زدہ سمجھتا ہوں۔ ۱۰۲) پس فرعون نے ارادہ کیا کہ موسیٰ (علیہ السلام) اور بنی اسرائیل کو زمین سے اکھاڑ پھینکے، تو ہم نے اس کو اور جو اس کے ساتھ تھے سب کو غرق کر دیا۔ ۱۰۳) اور اس کے بعد ہم نے بنی اسرائیل سے کہا کہ اب تم زمین میں بسو، پھر جب آخرت کا وعدہ آ جائے گا تو ہم تم سب کو اکٹھا کر کے لائیں گے۔ ۱۰۴) اور ہم نے اس کو حق کے ساتھ اتارا، اور یہ حق ہی کے ساتھ اترا ہے، اور ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر بشیر اور نذیر بنا کر۔ ۱۰۵) اور قرآن کو ہم نے تھوڑا تھوڑا کر کے اتارا تا کہ آپ اسے لوگوں کو ٹھہر ٹھہر کر سنائیں اور ہم نے اس کو نہایت اہتمام سے اتارا۔ ۱۰۶) ان سے کہہ دیجیے کہ تم اس پر ایمان لاؤ یا نہ لاؤ، بیشک وہ لوگ جنھیں اس کے پہلے سے علم دیا گیا ہے، جب یہ قرآن ان کو سنایا جاتا ہے تو ٹھوڑیوں کے بل سجدہ میں گر جاتے ہیں۔ ۱۰۷) اور کہتے ہیں پاک ہے ہمارا پروردگار، بیشک ہمارے پروردگار کا وعدہ شدنی تھا۔ ۱۰۸) اور وہ روتے ہوئے ٹھوڑیوں کے بل گرتے ہیں اور یہ ان کے خشوع میں اضافہ کرتا ہے۔ ۱۰۹) کہہ دیجیے! اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر پکارو، جس نام سے بھی پکارو، سب اچھے نام اسی کے ہیں اور تم اپنی نماز کو نہ زیادہ جہری کرو اور نہ بالکل ہی سرّی، اس کے بیچ کا راستہ اختیار کرو۔ ۱۱۰) اور کہہ دیجیے کہ ہر طرح کی تعریف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے، جس کے نہ کوئی اولاد ہے اور نہ اس کی حکمرانی میں اس کا کوئی ساجھی ہے، اور نہ اس کو ذلت سے بچانے کے لیے کسی مددگار کی ضرورت ہے، اور اس کی بڑائی بیان کرو جیسا کہ اس کا حق ہے۔ ۱۱۱)

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ فَسْـَٔلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِذْ جَآءَهُمْ فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ اِنِّىْ لَاَظُنُّكَ يٰمُوْسٰى مَسْحُوْرًا ﴿۱۰۱﴾ (سورۃ بنی اسرآءیل : ۱۰۱)

(اور ہم نے عطا فرمائی تھیں موسیٰ (علیہ السلام) کو 9 کھلی ہوئی نشانیاں، آپ خود بنی اسرائیل سے پوچھ لیں کہ جب موسیٰ علیہ السلام ان کے پاس آئے تو فرعون نے ان سے کہا کہ اے موسیٰ (علیہ السلام) میں تم کو ایک سحر زدہ آدمی سمجھتا ہوں۔ ۱۰۱)

حضرت موسیٰ ؑ کو دیے گئے معجزات اور فرعون پر ان کا اثر

آیت 90 سے 93 تک ان معجزات کا ذکر گزر چکا ہے قریش جن کا مطالبہ کرتے تھے۔ یہ آیت اسی کا جواب معلوم ہوتی ہے۔ اس میں بتانا مقصود یہ ہے کہ قومیں معجزات دیکھ کر ضروری نہیں کہ ایمان کا راستہ اختیار کر لیں بلکہ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ جب وہ معجزات طلب کرتی ہیں تو ساتھ وعدہ بھی کرتی ہیں کہ ہم آپ پر ایمان لے آئیں گے، لیکن مختلف قسم کے معجزات دیکھنے کے باوجود وہ ایمان لانے کی بجائے اسے جادو قرار دے کر مسترد کر دیتی ہیں۔ نہ انھیں اپنا وعدہ یاد رہتا ہے اور نہ ان کے اندر ایمان کی طلب پیدا ہوتی ہے۔ مدت سے جو کفر ان کے اندر بس چکا ہے اسے نکالنا ان کے لیے انتہائی مشکل ہو جاتا ہے۔ فرعون کی قوم نے بھی مختلف وقتوں میں موسیٰ علیہ السلام سے مختلف معجزات دیکھے۔ یہاں قرآنِ کریم نے انھیں 9 سے معدود کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی تفسیر کے مطابق ان آیات سے معجزات ہی مراد ہیں جن کا انھوں نے اپنی تفسیر میں ذکر فرمایا ہے، وہ یہ ہیں (۱) عصائے موسیٰ، (۲) ید بیضا، اس سے مراد یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنا ہاتھ بغل میں داخل کر کے دباتے اور جب نکالتے تو وہ سورج کی طرح چمک رہا ہوتا، اور پھر یہ چمک مستقل نہیں تھی، جب اس معجزے کے ظہور کا مقصد پورا ہو جاتا تو وہ چمک غائب

Marfat.com

ہوجاتی۔(۳) حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان میں لکنت تھی جو دور کردی گئی، (۴) بنی اسرائیل کے گزرنے کے لیے سمندر کو شق کیا گیا، (۵) ٹڈی دل کا عذاب غیر معمولی وسعت کے ساتھ بھیجا گیا، (۶) طوفان آیا جس نے تباہی مچادی، (۷) فرعونیوں کے کپڑوں میں کثرت سے جوئیں پیدا کردی گئیں جس سے بچنے کی کوئی صورت ممکن نہ تھی، (۸) مینڈک مسلط کردیے گئے کہ ہر کھانے پینے کی چیز میں مینڈک داخل ہوجاتے تھے، (۹) خون کا عذاب بھیجا گیا، ہر کھانے اور پینے کی چیز خون آلود ہوکر رہ گئی۔

قریش سے کہا جارہا ہے کہ بنی اسرائیل تمھیں مختلف قسم کے معجزات طلب کرنے پر انگیخت کرتے ہیں۔ ذرا ان سے پوچھیے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے وقتاً فوقتاً یہ معجزات قومِ فرعون کو دکھائے تو کیا وہ ان معجزات کو دیکھ کر ایمان لے آئی یا اس راستے پر بڑھتی چلی گئی جس کے نتیجے میں بحرِ قلزم میں ڈوب کر فنا ہوگئی، تو کیا یہ بنی اسرائیل تمھیں بھی یہ مشورہ دینا چاہتے ہیں کہ تم بھی اسی راستے پر چلتے رہو اور آخر قومِ فرعون کی طرح اللہ تعالیٰ کے عذاب کا شکار ہوجاؤ۔

بنی اسرائیل سے یہ بھی پوچھیں کہ کیا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب فرعون کے سامنے اپنی دعوت پیش کی اور اسے اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی اور اس کے سامنے بعض معجزات کا ظہور بھی ہوا، عصائے موسیٰ کے کرشمے اس نے بار بار اپنی آنکھوں سے دیکھے، ید بیضا اس کے سامنے روشنی دیتا رہا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ ان سے متاثر ہوکر ایمان لے آتا، لیکن اس کے بالکل برعکس اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بدتمیزی کرتے ہوئے کہا کہ اے موسیٰ (علیہ السلام) میرا خیال تو یہ ہے کہ تم پر جادو کردیا گیا ہے جس کی وجہ سے تم عجیب و غریب باتیں کرتے ہو۔ ہم پیچھے پڑھ چکے ہیں کہ قریش نے بھی آنحضرت ﷺ کے بارے میں ان لوگوں سے یہی بات کہی جو آنحضرت ﷺ کی دعوت سے متاثر ہورہے تھے کہ تم ایک ایسے آدمی کی پیروی کرنا چاہتے ہو جو سحر زدہ آدمی ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ فرعون کی وہ روش جس نے بالآخر اسے تباہی کے راستے پر ڈالا قریش اسے اختیار کرچکے ہیں۔ انھیں سوچنا چاہیے کہ یہ روش انھیں کہاں تک پہنچا کے چھوڑے گی۔

ایک دوسری تفسیر

بعض مفسرین اس آیت میں مذکور تِسۡعَ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ کی تفسیر ایک اور طرح سے کرتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ ایک صحیح حدیث کے مضمون سے جسے ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور امام ترمذی نے اپنی جامع میں ذکر کرنے کے بعد اسے حسن صحیح کہا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آیات سے مراد یہاں وہ احکامِ عامہ ہیں جو ہر نبیؑ کی شریعت کی اساس ہیں۔ حدیث یہ ہے کہ حضرت صفوان بن عسالؓ نے کہا کہ ایک یہودی نے اپنے ایک دوست کو کہا، چلو اس نبیؐ کے پاس چلیں۔ اس کے دوست نے کہا کہ تم اسے اپنی زبان سے نبیؐ نہ کہو۔ اگر اس نے سن لیا تو بڑا خوش ہوگا۔ پس وہ دونوں آپؐ کی خدمت میں آئے اور سوال کیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو 9 آیاتِ بینات دی گئی تھیں، وہ کیا تھیں؟ تو حضورؐ نے جواب میں فرمایا کہ وہ یہ ہیں۔ (۱) اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، (۲) چوری نہ کرو، (۳) زنا نہ کرو، (۴) کسی کو بے گناہ قتل نہ کرو، (۵) کسی بے گناہ کو حاکم کے پاس نہ لے جاؤ تاکہ وہ اسے قتل کردے، (۶) جادو نہ کرو، (۷) سود نہ کھاؤ، (۸) کسی پاکدامن پر تہمت نہ لگاؤ، (۹) جنگ کے دن میدان سے بھاگو نہیں۔ اور اے یہودیو! تمھارے لیے خاص حکم یہ ہے کہ تم ہفتہ کے دن نافرمانی سے باز رہو۔ صفوانؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ کا یہ جامع جواب سن کر انھوں نے آپؐ کے دونوں مبارک ہاتھوں کو چوما اور دونوں مقدس پاؤں کو بوسہ دیا اور کہا کہ ہم گواہی دیتے ہیں آپؐ نبیؐ ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ پھر تمھیں میرا اتباع کرنے سے کیا چیز روکتی ہے؟ کہنے لگے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنے رب سے یہ دعا کی تھی کہ ان کی ذریت میں ہمیشہ نبی ہوتے رہیں اور ہمیں خطرہ ہے کہ اگر ہم آپؐ کا اتباع کرنے لگیں تو یہود ہمیں قتل کردیں گے۔

چونکہ یہ تفسیر صحیح حدیث سے ثابت ہے، اس لیے بہت سے مفسرین نے اسی کو ترجیح دی ہے۔ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ قریش کو جو بات سمجھانا مقصود ہے دونوں تفسیروں کے حوالوں سے اس میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ انھیں کہنا یہ ہے کہ ایمان قبول نہ کرنا اور اس کو معجزات کے ساتھ مشروط کرتے چلے جانا یہ خطرناک رویہ ہے جو تمھارے لیے تباہ کن ہوسکتا ہے۔ اسی طرح نبی کی تعلیمات پر کان نہ دھرنا بلکہ اس کی پُراز حکمت باتوں کو سحر یا جادو کا نتیجہ قرار دینا یہ فرعون جیسے لوگوں کی سوچ رہی ہے جس کے نتیجے میں وہ تباہ ہوئے۔ تم بھی اسی سوچ کے

Marfat.com

پیچھے چل رہے ہو۔ بجائے آنحضرت ﷺ کی دعوت پر غور کرنے کے تم نے آج تک ان کی تعلیمات کا مذاق اڑایا ہے اور قرآنِ پاک کا سننا تمھیں گوارا نھیں۔ سوچ لو اس کا انجام وہی ہوگا جو فرعون اور آلِ فرعون کا ہوا۔

قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بَصَآئِرَ ۚ وَاِنِّیْ لَاَظُنُّكَ یٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا ﴿۱۰۲﴾

(موسیٰ (علیہ السلام) نے جواب دیا کہ تو جانتا ہے کہ ان آیات کو نھیں اتارا، مگر آسمانوں اور زمین کے رب نے آنکھیں کھول دینے کے لیے، اور میں تو تم کو اے فرعون ہلاکت زدہ سمجھتا ہوں۔ ۱۰۲) (سورۃ بنیٓ اسرآءِیل : ۱۰۲)

حضرت موسیٰؑ کا فرعون کو جواب

اس آیتِ کریمہ کے لب و لہجہ اور تیوروں پر غور کریں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر کے نہایت جابر اور طاقتور حکمران کے سامنے کھڑے ہیں۔ اور وہ آپؑ کی توہین کرتا ہوا آپؑ کو مسحور قرار دے رہا ہے۔ بجائے اس کے کہ آپؑ اس کی حکومت اور اس کی ہیبت سے مرعوب ہوتے، آپؑ نے اسی انداز میں ترکی بہ ترکی جواب دیا، کہ اے فرعون! میں مسحور نھیں ہوں، میں تو اللہ تعالیٰ کا رسولؐ ہوں جس پر ایسی کتاب اتری ہے، جو حکمت کے خزانوں سے بھرپور ہے، جس میں انسانوں کے لیے بھلائی کے سوا کچھ نھیں۔ وہ ہماری دنیا اور آخرت کی ضامن ہے۔ مجھ سے جن معجزات کا ظہور ہو رہا ہے وہ بھی درحقیقت میرے پروردگار کی قدرت کا ظہور ہے۔ میں اس کا بندہ اور رسولؐ ہوں۔ میں وہی کہتا ہوں جو اس کا حکم ہوتا ہے اور اگر کسی معجزے کا مجھ سے ظہور ہوتا ہے تو وہ بھی اسی کی قدرت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ذرا غور کرو کہ جو اللہ تعالیٰ جیسی عظیم ذات کا نمائندہ بن کر تمھارے پاس آیا ہے وہ سحر زدہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اور کوئی بھی سحر اور جادو اس کے معجزات پر اور اس کی تعلیمات پر کیسے اثر انداز ہو سکتا ہے۔ البتہ تم میری دعوت کے مقابلے میں اور اس کی تائید میں میرے معجزات کو دیکھ کر بھی جو رویہ اختیار کر رہے ہو اس سے یہ بات ضرور معلوم ہوتی ہے کہ تم ایک شامت زدہ آدمی ہو۔ تمھاری شامت نے تمھیں گھیر رکھا ہے۔ تم بالآخر ہلاکت کی نذر ہونے والے ہو، لیکن تمھاری بدنصیبی یہ ہے کہ ہلاکت تمھارے سر پر تلی کھڑی ہے اور وہ تمھیں نظر نھیں آتی، لیکن میرے معجزات تمھیں سحر نظر آتے ہیں اور میری تعلیمات پر توجہ دینے کے لیے تم تیار نھیں ہو۔ تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ جو شخص بھی چاہے وہ کتنا بڑا حکمران ہو، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتا ہے، وہ اس مخالفت کے انجام سے کبھی نھیں بچ سکتا۔ اس کا مقدر ہلاکت کے سوا اور کچھ نھیں ہوتا۔

فَاَرَادَ اَنْ یَّسْتَفِزَّهُمْ مِّنَ الْاَرْضِ فَاَغْرَقْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ جَمِیْعًا ﴿۱۰۳﴾ وَّقُلْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ لِبَنِیٓ اِسْرَآءِیْلَ اسْكُنُوا الْاَرْضَ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ جِئْنَا بِكُمْ لَفِیْفًا ﴿۱۰۴﴾

(پس فرعون نے ارادہ کیا کہ موسیٰ (علیہ السلام) اور بنی اسرائیل کو زمین سے اکھاڑ پھینکے، تو ہم نے اس کو اور جو اس کے ساتھ تھے سب کو غرق کر دیا۔ ۱۰۳) اور اس کے بعد ہم نے بنی اسرائیل سے کہا کہ اب تم زمین میں بسو، پھر جب آخرت کا وعدہ آ جائے گا تو ہم تم سب کو اکٹھا کر کے لائیں گے۔ ۱۰۴) (سورۃ بنیٓ اسرآءِیل : ۱۰۳۔۱۰۴)

قریش کے لیے آئینہ

فرعون اور آلِ فرعون کی تمام تر سختیوں اور اذیتوں کے باوجود جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تبلیغ و دعوت کا سلسلہ نہ رکا اور آپؑ مسلسل اپنے مشن میں آگے بڑھتے رہے تو فرعون نے ارادہ کیا کہ انھیں سرزمینِ مصر سے نکال دے اور ایسی صورتحال پیدا کر دے کہ ان کے پاؤں اکھڑ جائیں اور وہ کسی طرح مصر میں رہنے کے قابل نہ رہیں اور ہجرت پر مجبور ہو جائیں، تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو نکالنا چاہا لیکن ہم نے اس کی اس جسارت کی پاداش میں اسے اور اس کے ساتھیوں کو اکٹھے بحرِ قلزم میں غرق کر دیا۔ اب ہم نے بنی اسرائیل سے یہ کہا کہ دیکھو تم پر اللہ تعالیٰ کا کتنا بڑا انعام ہوا ہے کہ ہم نے تمھیں فرعونیوں کے ظلم سے نجات دی ہے۔ اب تم اس زمین میں رہو،

Marfat.com

بسو۔ مراد اس سے ارضِ مقدس ہے جس کا بنی اسرائیل سے وعدہ تھا۔ لیکن ساتھ ہی انھیں یاد دلایا کہ اس انعام کو پانے کے بعد کہیں آخرت کے وعدے کو نہ بھول جانا۔ تمھیں اندازہ ہونا چاہیے کہ جس طرح ہم نے تمھیں وعدے کے مطابق ارضِ مقدس عطا کی ہے اسی طرح ہم ایک دن قیامت برپا کریں گے اور تم سب کو حشر کے میدان میں جمع کر دیں گے۔ لیکن افسوس کہ بنی اسرائیل اس وعدے کو بھول گئے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنی تاریخ میں بار بار اللہ تعالیٰ کے عذاب کا شکار ہوتے رہے اور آج وہ دنیا میں عبرت کا نشان ہیں۔

بنی اسرائیل کی تاریخ کا حوالہ دے کر درحقیقت قریش کو یہ بات سمجھانا ہے کہ جس طرح فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو سرزمینِ مصر سے اکھاڑ پھینکنے کی کوشش کی اور اس کے نتیجے میں تباہ ہو گیا، تم بھی اسی طرح نبی کریم ﷺ اور مسلمانوں کو اکھاڑ پھینکنا چاہتے ہو۔ تمھیں تاریخ کے اس آئینہ میں اپنا انجام دیکھنا چاہیے۔

وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ ؕ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا ﴿۱۰۵﴾ (سورۃ بنیٓ اسرآءِیل : ۱۰۵)

(اور ہم نے اس کو حق کے ساتھ اتارا، اور یہ حق ہی کے ساتھ اترا ہے، اور ہم نے آپؐ کو نہیں بھیجا مگر بشیر اور نذیر بنا کر۔ ۱۰۵)

دعوت کے سلسلے میں آنحضرتؐ کی ذمہ داری

سورۃ بنی اسرائیل کا مرکزی مضمون یہی ہے کہ ہم نے بنی اسرائیل کو ایک کتاب دی تھی، انھوں نے کتاب سے بے وفائی کی اور اس کے تقاضوں کو نظرانداز کیا تو تاریخ میں عبرت بن کے رہ گئے۔ اب ہم نے قرآنِ کریم نازل کیا جو ایک مضبوط راستے کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ اس امت کی بھلائی اور کامیابی اس کتاب کا حق ادا کرنے میں ہے۔ درمیان میں ضمنی مباحث چھڑتے رہے۔ اب گفتگو کو سمیٹتے ہوئے فرمایا جا رہا ہے کہ ہم نے اس قرآن کو حق کے ساتھ اتارا، اور یہ حق ہی کے ساتھ اترا۔ یعنی نہ اس کے بھیجنے میں اور اتارنے میں باطل کی کوئی آمیزش ہوئی ہے اور نہ یہاں اترنے میں کہیں باطل کو دراندازی کا موقع ملا ہے۔ اور یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ لوحِ محفوظ سے بیت العزت میں بھی حق کے ساتھ اتارا گیا۔ ہر طرح کی باطل کی آمیزش سے پاک۔ پھر اسی شان سے وہ زمین پر بھی آیا۔ اور وہ اپنی بے شمار خصوصیات کے باعث اپنی مثال آپ ہے۔ دشمن اس کی نظیر لانے سے اور باطل کسی بھی سطح پر اس کا مقابلہ کرنے سے عاجز ہے۔ اور وہ اپنی دلآویزی اور اثراندازی میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ ان خصوصیات کے باوجود اگر قریش اس کو قبول کرنے کی بجائے اس میں مین میخ نکالتے، قدم قدم پر رکاوٹیں کھڑی کرتے، اور عجیب وغریب مطالبات کرتے ہیں، تو آپؐ کو ایسے لوگوں کے بارے میں ہرگز پریشان نہیں ہونا چاہیے، آپؐ ان لوگوں کے ایمان کے ذمہ دار نہیں، آپؐ کو اللہ تعالیٰ نے بشیر اور نذیر بنا کر بھیجا ہے۔ ایمان لانے والوں کو بشارت سے نوازیں اور انکار کرنے والوں کو انذار کریں۔ اس کے علاوہ آپؐ کی کوئی ذمہ داری نہیں کہ آپؐ بلاوجہ اپنے آپ کو کوئی روگ لگا لیں۔

وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا ﴿۱۰۶﴾

(اور قرآن کو ہم نے تھوڑا تھوڑا کر کے اتارا تاکہ آپؐ اسے لوگوں کو ٹھہر ٹھہر کر سنائیں اور ہم نے اس کو نہایت اہتمام سے اتارا۔ ۱۰۶) (سورۃ بنیٓ اسرآءِیل : ۱۰۶)

قرآن کے بتدریج اترنے کی حکمت

یہ ایک اعتراض کا جواب ہے جو مشرکین کی طرف سے کیا گیا لیکن انھیں یقیناً بنی اسرائیل نے اس پر آمادہ کیا، کیونکہ مشرکین آسمانی کتابوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ بنی اسرائیل نے انھیں یہ بات سمجھائی کہ ہماری کتابیں تو یکبارگی نازل ہوئیں۔ اگر یہ صاحب اللہ تعالیٰ کے نبی ہیں تو ان پر کتاب ایک ہی دفعہ کیوں نہیں نازل ہوئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ محنت سے یا کسی کی مدد سے جتنا حصہ تیار کر لیتے ہیں وہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی کتاب کہہ کر سنا دیتے ہیں، پروردگار نے اس کا جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ ہم نے اس کتاب کو تھوڑا تھوڑا کر کے اتارا ہے، کیونکہ اگر ہم اسے یکبارگی مکمل

Marfat.com

کتاب کی شکل میں اتارتے تو آنحضرت ﷺ چونکہ اُمی ہیں اور آپؐ کی امت کی غالب اکثریت بھی اُمی ہے تو ان کے لیے اس کتاب کو محفوظ کرنا مشکل ہوجاتا۔ حکمت کی بات بھی یہ تھی کہ تبلیغ ودعوت کے نتیجے میں جیسی جیسی ضرورتیں پیش آتی جائیں اس کے مطابق قرآنِ کریم کی صورت میں ہدایات ملتی رہیں۔ اور جیسے جیسے مخالفت آگے بڑھے اور اذیتیں ناقابلِ برداشت ہونے لگیں تو حضرت جبرائیل اللہ تعالیٰ کے تسلی آمیز پیغامات لے کر اتریں اور اپنی ذات میں بھی آنحضرت ﷺ کے لیے تسکین کا باعث بنیں۔ اور جو مختلف سوالات مخالفین کی طرف سے کیے جائیں تو وقت پر اس کا جواب نازل ہونے پر مخالفین کو مطمئن کیا جاسکے۔ علما نے اس سلسلے میں بہت سی مصلحتیں لکھی ہیں، لیکن اس آیت میں قرآنِ کریم نے یہ کہا ہے کہ ہم نے اس لیے تھوڑا تھوڑا قرآنِ کریم نازل کیا ہے کہ یہ اہتمام کا تقاضا بھی تھا اور اس کتاب کی شان کے لائق بھی۔ اور مزید یہ بات کہ تعلیم وتربیت کی ضرورتوں میں سے ایک ضرورت یہ بھی تھی کہ آپؐ تھوڑا تھوڑا ٹھہر ٹھہر کر لوگوں کو پڑھ کر سنائیں تاکہ وہ اسے ساتھ ساتھ یاد کرتے چلے جائیں، اس سے ان کے عمل میں پختگی آئے، ایمان میں تازگی پیدا ہو اور دل میں خشیتِ الٰہی اترتی چلی جائے۔

قُلْ اٰمِنُوْا بِهٖٓ اَوْ لَا تُؤْمِنُوْا ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖٓ اِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا ۙ﴿۱۰۷﴾ وَّيَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا ﴿۱۰۸﴾ وَيَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ يَبْكُوْنَ وَيَزِيْدُهُمْ خُشُوْعًا ۩ ﴿۱۰۹﴾

(ان سے کہہ دیجیے کہ تم اس پر ایمان لاؤ یا نہ لاؤ، بیشک وہ لوگ جنھیں اس کے پہلے سے علم دیا گیا ہے، جب یہ قرآن ان کو سنایا جاتا ہے تو ٹھوڑیوں کے بل سجدہ میں گر جاتے ہیں۔ ۱۰۷) اور کہتے ہیں پاک ہے ہمارا پروردگار، بیشک ہمارے پروردگار کا وعدہ شدنی تھا۔ ۱۰۸) اور وہ روتے ہوئے ٹھوڑیوں کے بل گرتے ہیں اور یہ ان کے خشوع میں اضافہ کرتا ہے۔ ۱۰۹) (سورۃ بنیٓ اسرآءیل: ۱۰۷.۱۰۸.۱۰۹)

صالحین اہلِ کتاب کے رویئے سے آنحضرتؐ کو تسلی اور قریش سے بے نیازی

قریشِ مکہ کا آنحضرت ﷺ اور قرآنِ کریم کے ساتھ جو رویہ تھا وہ ہم سابقہ آیات میں پڑھ چکے ہیں اور جس طرح انھوں نے قدم قدم پر سوالات اٹھائے، ان کا جواب بھی ہماری نظروں سے گزر چکا ہے۔ اب ان سے ایک طرح سے منہ پھیر کر آنحضرت ﷺ سے فرمایا جارہا ہے کہ آپؐ ان کے رویئے کی پرواہ نہ کیجیے بلکہ انھیں صاف صاف کہہ دیجیے کہ تم قرآن پر ایمان لاؤ یا نہ لاؤ، تمھاری مصلحتیں اور تمھارا خبثِ باطن تمھارے راستے میں رکاوٹ بنتا ہے تو بنتا رہے، میرے اطمینان کے لیے یہ بات کافی ہے کہ اہلِ کتاب میں سے وہ گروہ جنھیں اللہ تعالیٰ نے عصبیت کی بیماری سے محفوظ رکھا ہے اور جو حقیقت میں صالحین کے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی کتاب کی حقیقی روح کو پہچان چکے ہیں ان کے سامنے جب یہ قرآنِ کریم پڑھا جاتا ہے تو وہ چونکہ اپنی کتابوں میں آنے والے نبی اور اس پر نازل ہونے والی کتاب کے بارے میں بشارتیں پڑھ چکے ہیں اور وہ عہد بھی ان کی نگاہوں میں ہے جو ہر پیغمبرؑ نے اپنی امت سے اس بات کا لیا تھا کہ اگر اس کی زندگی میں وہ آخری نبی تشریف لے آئیں تو وہ ان کی مدد کرے گی۔ چنانچہ وہ قرآنِ کریم کے آئینہ میں جب تمام پیشگوئیوں کا مصداق دیکھتے ہیں اور آنحضرت ﷺ کی ذاتِ گرامی میں وہ سراپا دیکھتے ہیں جس کی تصویر ان کی کتابوں میں کھینچی گئی ہے تو وہ یہ جان کر کہ آخری نبی تشریف لے آئے اور ان پر نازل ہونے والی وہ کتاب جو آخری بھی ہے اور سب سے عظیم بھی نازل ہوگئی تو وہ بے ساختہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے سجدہ ریز ہوجاتے اور اپنے رب کی تسبیح وتحمید میں ڈوب جاتے ہیں اور خود کلامی کرتے ہوئے اور یا لوگوں کو سناتے ہو۔ ے بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ آخرالزمان نبیؐ کا آنا اور اس پر قرآنِ کریم کا نازل ہونا، یہ تو اللہ تعالیٰ کا وعدہ تھا اور ہمارے ربِ کریم کے وعدے کبھی ٹلا تو نہیں کرتے، وہ تو ہمیشہ عمل میں آکر رہتے ہیں۔ اس لیے کتنے اطمینان اور فخر کی بات ہے کہ اس وعدے کا ظہور ہوگیا۔ سرکارِ دوعالم تشریف لے آئے اور وہ آخری کتاب آگئی جو خیرالکتب بھی ہے اور دنیا بھر میں انقلاب کا پیغام بھی۔ اور وہ جیسے جیسے قرآنِ کریم پڑھتے ہیں اور پھر اللہ تعالیٰ کے عہد اور اس کے ایفاء کو دیکھتے ہیں تو ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوجاتے ہیں اور ٹھوڑیوں کے بل زمین پر گر جاتے ہیں۔ اور یہ تصور ان کے دلوں میں جہاں احساسِ تفاخر پیدا کرتا ہے وہیں خشیتِ الٰہی کو بھی بڑھاتا ہے کہ کتنا عظیم ہے ہمارا رب جو کبھی اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا اور کتنی مہربان ہے وہ ذات جو ہماری رہنمائی اور ہدایت کے لیے ہمیشہ کتابیں اتارتی ہے۔

Marfat.com

حقیقت یہ ہے کہ جب بھی کسی کے دل پر قرآنِ پاک کی روح کا نزول ہوتا ہے اور وہ قرآن کی حقیقت سے آشنا ہوجاتا ہے اور وہ محسوس کرتا ہے کہ کہاں اللہ تعالیٰ کی حمید و مجید ذات اور کہاں زمین پر رہنے والا انسان کے نام کا کیڑا مکوڑا، لیکن کیا ٹھکانہ ہے اس کی رحمتوں کا کہ وہ اس انسان کو اپنی رحمتوں سے کبھی الگ نہیں فرماتا۔ یہ احساس جیسے جیسے دل کی گہرائیوں میں اترتا جاتا ہے، ویسے ویسے ایک مومن کی ذات پگھلتی جاتی ہے اور اس کی آنکھیں آنسوؤں کی جھڑیاں برسانے لگتی ہیں۔ آج یہ امت جو حوادث کا شکار ہے اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ اس میں رونے والوں کی کمی ہوگئی ہے۔ اب خشیتِ الٰہی سے دل پگھلتے نہیں اور خیر القرون میں اسی جنسِ بیش بہا کی فراوانی تھی اور حقیقت یہی ہے کہ ؎

عطار ہو رومی ہو، رازی ہو غزالی ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحرگاہی

اور جب یہ دولت نصیب ہوجاتی ہے تو پھر ایک مومن بڑی اپنائیت سے کہہ سکتا ہے کہ ؎

دولتیں مل گئی ہیں آہوں کی
ایسی تیسی مرے گناہوں کی

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۚ وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ﴿١١٠﴾ (سورۃ بنیٓ اسرآءِیل : ۱۱۰)

(کہہ دیجیے! اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر پکارو، جس نام سے بھی پکارو، سب اچھے نام اسی کے ہیں اور تم اپنی نماز کو نہ زیادہ جہری کرو اور نہ بالکل ہی سِرّی، اس کے بیچ کا راستہ اختیار کرو۔ ۱۱۰)

آیت کا شانِ نزول اور مفہوم

اس آیت کے شانِ نزول کے ضمن میں چند واقعات کا ذکر کیا جاتا ہے۔ ایک تو یہ کہ نبی کریم ﷺ اپنی دعوت میں سب سے زیادہ زور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر دیتے تھے اور توحید ہی آپ کی دعوت کا مرکزی نقطہ تھا۔ ایک روز نبی کریم ﷺ دعا میں مشغول تھے۔ ابوجہل نے سنا کہ آپ اپنی دعا میں یا اللہ اور یا رحمٰن کہہ کر اپنے رب کو پکار رہے ہیں تو اس نے شور مچا دیا کہ ہمیں تو اللہ تعالیٰ کے سوا دوسروں کو پکارنے سے منع کیا جاتا ہے اور خود حال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ رحمٰن کو پکار رہے ہیں۔ چنانچہ اس آیت میں اس کا جواب دیا گیا کہ اللہ اور رحمٰن ایک ہی ذات کے دو نام ہیں اور اسی طرح اس کے اور بھی بہت اچھے اچھے نام ہیں۔ تم جس نام سے بھی پکارو اس سے مراد اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے۔ تمہیں یہ غلط فہمی ہوئی کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی اور کو پکارا جارہا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ ہی کو مختلف ناموں سے یاد کیا جارہا ہے۔

دوسرا قصہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نماز میں بلند آواز سے تلاوتِ قرآن کریم فرماتے تو مشرکین تمسخر و استہزاء کرتے اور قرآن کریم اور حضرت جبرائیل امین اور خود اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخانہ باتیں کہتے اور بعض دفعہ شور مچانا شروع کردیتے۔ اس آیت کے دوسرے حصے میں آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کو تلقین فرمائی گئی کہ آپ اپنی نمازوں میں درمیان کی راہ اختیار کریں۔ نہ بہت بلند آواز سے قرآن کریم پڑھیں تاکہ مشرکین کو شور مچانے اور گستاخیاں کرنے کا موقع نہ ملے اور نہ اتنی پست آواز سے پڑھیں کہ نماز میں شریک لوگ بھی سن نہ سکیں۔ اس طرح سے اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے کا طریقہ بھی سکھایا اور مخالف حالات میں راستہ نکالنے کی حکمت بھی بتائی۔

وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِى الْمُلْكِ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِىٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا ﴿١١١﴾ (سورۃ بنیٓ اسرآءِیل : ۱۱۱)

(اور کہہ دیجیے کہ ہر طرح کی تعریف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے جس کے نہ کوئی اولاد ہے اور نہ اس کی حکمرانی میں اس کا کوئی ساجھی ہے، اور نہ اس کو ذلت سے بچانے کے لیے کسی مددگار کی ضرورت ہے، اور اس کی بڑائی بیان کرو جیسا کہ اس کا حق ہے۔ ۱۱۱)

Marfat.com

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ بنی عبدالمطلب میں جب کوئی بچہ زبان کھولنے کے قابل ہوجاتا تو اس کو آپؐ یہ آیت سکھانے کی ترغیب دیتے تھے۔

اتمامِ حجت اور اعلانِ حق

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ ایک روز میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ باہر نکلا، اس طرح کہ میرا ہاتھ آپؐ کے ہاتھ میں تھا۔ آپؐ کا گزر ایک ایسے شخص پر ہوا جو بہت شکستہ حال اور پریشان تھا۔ آپؐ نے پوچھا کہ تمھارا یہ حال کیسے ہوگیا؟ اس شخص نے عرض کیا کہ بیماری اور تنگدستی نے مجھے اس حال کو پہنچا دیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ میں تمھیں چند کلمات بتاتا ہوں، وہ پڑھو گے تو تمھاری بیماری اور تنگدستی جاتی رہے گی۔ وہ کلمات یہ تھے، تَوَكَّلْتُ عَلَى الْحَيِّ الَّذِىْ لَايَمُوْتُ اَلْحَمْدُلِلّٰهِ الَّذِىْ اِلٰى آخر الایہ۔

یہ آخری آیت ایک طرح سے مشرکین پر اتمامِ حجت بھی ہے اور ان کے تمام عقائد باطلہ کے مقابلے میں اعلانِ حق بھی، کہ مشرکین کچھ بھی کہتے رہیں، آنحضرت ﷺ کو حکم دیا گیا ہے کہ آپؐ یہ اعلان کر دیں کہ میں تمھارے سامنے توحیدِ کامل کا پیغام لے کر آیا ہوں۔ اس میں اس بات کے لیے کوئی گنجائش نھیں کہ اللہ تعالیٰ کی کوئی اولاد ہے، کیونکہ اولاد کی ضرورت زوال پذیر شخصیتوں کو ہوتی ہے جو اس بات کا اندیشہ رکھیں کہ بڑھاپے میں ہمیں کون سنبھالے گا۔ اللہ تعالیٰ ہر طرح کی احتیاج سے پاک ہے، اس کی ذات کے لیے کبھی زوال نھیں۔ وہ حی اور قیوم ہے، اس کی بادشاہی میں کوئی ساجھی اور شریک نھیں، پوری کائنات کا نظام اس کے احکام سے چل رہا ہے، کائنات کا ایک ایک ذرہ اس سے زندگی اور زندگی کے قیام کی بھیک مانگتا ہے۔ اسے شریک کی ضرورت تب ہوسکتی ہے جب اسے کائنات کے کسی گوشے میں اپنی حکومت اور نگرانی میں کمزوری کا اندیشہ ہو۔ وہ ایسے ہر اندیشے سے پاک ہے۔ کائنات کی ہر مخلوق اس کے خوانِ نعمت سے فیض پا رہی ہے۔ اس کے سامنے کائنات کا بڑے سے بڑا کُرّہ کمزوروں کی طرح تعمیلِ احکام کر رہا ہے۔ انسانوں اور باقی مخلوقات کی بڑائی اسی میں ہے کہ تم سب مل کر اس کی کبریائی کے نغمے گاؤ اور اپنے قلب و دماغ میں اس کی کبریائی کو راسخ کرلو اور دنیا کے علم و دانش پر یہ بات واضح کردو کہ دنیا کی تمام ابتری کا علاج صرف اس بات میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بڑائی اور اس کی کبریائی کو تسلیم کیا جائے اور زندگی کے ہر شعبے میں اس کو بنیادی اصول تسلیم کرکے زندگی کی تعمیر کی جائے۔

صدق الله العظيم

Marfat.com

Marfat.com